کارِ جہاں دراز ہے

قرۃ العین حیدر

کارِ جہاں دراز ہے

جلد اوّل، جلد دوم

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

کارِ جہاں دراز ہے

(جلد اوّل، جلد دوم) قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

KAR-E-JAHAN DARAZ HAI
(Vol. Ist & IInd)

BY

QURRATUL - AIN - HYDER

Year of Ist Edition 2003
ISBN 81-87667-59-1
Price. Rs. 600/-

کتاب کا نام	کارِ جہاں دراز ہے (جلد اوّل۔ جلد دوم)
مصنّفہ	قرۃ العین حیدر
سنہ اشاعت اوّل	۲۰۰۳ء
قیمت	۶۰۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan Delhi-6 (India)
Ph.: 3216162, 3214465 Fax:91-011-3211540
E-Mail: ephdelhi@yahoo.com

دوش و امروز کا یہ فسانہ میں اپنے بھائی سیّد مصطفےٰ حیدر کی ہونہار اولاد ــــ نورالعین، شہناز، ناہید، جلال حیدر (تین بہنیں اور ایک بھائی جنہوں نے س۔ایس۔پی کے مقابلوں میں کامیاب ہوکر نیا ریکارڈ قائم کیا) اور اُن سے چھوٹے ــــ عدنان، منصور اور سجّاد حیدر کے نام معنون کرتی ہوں۔ اکیسویں صدی زیادہ دُور نہیں۔ یہ بچیاں اور بچے آزادی کے بعد پیدا ہونے والی اس نسل میں شامل ہیں جو کارِ جہاں سنبھال چکی ہے یا سنبھالنے والی ہے۔ ہم لوگوں نے اور ہم سے پہلے والوں نے دنیا کو اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے اور اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ نئے لوگ اِکیسویں صدی میں پہنچ کر تاریخی عوامل کو شاید ہم سے بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

قرۃ العین حیدر

فہرست ابواب

☆ جلد اول

فصل اوّل

فصل دوم

فصل سوم

فصل چہارم

فصل پنجم

فصل ششم

فصل ہفتم

فصل ہشتم

○ فصل نہم

○ فصل دہم

○ فصل یازدہم

☆ جلد دوم

○ فصل دوازدہم

○ فصل سیزدہم

○ فصل چہاردہم

○ فصل پانزدہم

○ فصل شانزدہم

☆☆☆

تعارف

خداوند اکبر سمیعاً بصیرا   بقدرت علی کل شئی قدیرا
دہی موماں را اکرام وافر   بہ جنت نعیماً و ملکاً کبیرا
بمثل کلامت کہ گفتن تواند   ولو کان بعضاً بعض ظہیرا
کے راکہ نامش دہی برینش   بلطف تحاسب حساباً یسیرا
کمال حسینی بسا جرم دارد   توئی عفوکن یا لطیفاً خبیرا

اللہ کے نیک بندوں نے حمد و مناجات' عبادت و خدمت خلق میں زندگیاں تیر کر دیں۔ نہ دنیائے دوں بدلی نہ سلسلہ علت و معلول۔ اور فرشتے ہیں کہ لکھے چلے جا رہے ہیں۔ ناحق پکڑواتے ہیں۔ پلٹ کر بندہ خاکی سے نہیں پوچھتے کہ میاں! تم اشعریہ تھے یا معتزلہ یا لاادری۔ جبریہ ہو یا قدریہ۔ مومن ہو یا مشکک۔ کیونکہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور ایک موونگ فنگر ہے جو لکھ کر آگے سرک جاتی ہے۔

قلم ہاتھ میں دے دیا۔ لوح نہیں دی۔

۱۹۶۲ء کی برسات میں محلہ سادات سہ دری نہٹور ضلع بجنور (یو۔پی) کے دیران ڈھنڈار آبائی مکانات بارش کی جھڑی میں دھڑا دھڑ گرتے جا رہے تھے۔ جب کمترین وقائع نویس کے ذہن میں مندرجہ بالا خیالات آئے جن کا ملفوظات کمالیہ" میں کہیں ذکر نہ تھا۔ ہاتف نے آواز دی۔ ان مکانوں کے باسی' کہ اہل نظر تھے' سرحد پار تازہ عالیشان بستیاں آباد کر چکے۔ غم مخور۔ پھر وقائع نویس نے تین سو برس پرانے قلعہ محمود پور (ضلع مراد آباد) کو منہدم ہوتے دیکھا۔ بعد ازاں دو سو برس پرانے "دربار عظام" نہٹور کا دوسرا پھاٹک گرا اور جھیل کنارے کھڑی بوڑھی پلکھن طوفان باد و باراں کی نذر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یو۔پی اور بہار کے بیشتر قدیم' فیوڈل قصبات کا فی الوقت یہی نقشہ ہے۔ بالآخر ندا آئی' برخیز! نہٹور' لانگڑی' محمود پور۔ اردوئے شاہجہانی کے ان تین گمنام ویران خیموں کی روداد لکھ۔ بنگرا فیوڈل سماج اپنے افراد کو Delusions of Grandeur میں مبتلا رکھ کے' عمر طبعی کو پہنچ کر کس طور سے ختم ہوا۔ کھول آنکھ اور اسی محلہ سادات سہ دری میں صدیوں کے درماندہ بنکروں اور کاریگروں کی نئی خودداری اور خوشحالی کو ذرا دیکھ۔ کہ یہ نئے سماجی انقلاب کی ایک خوش آئند علامت ہے۔ مغنی کجائی کہ وقت گل......

"یہ انقلاب۔" میں نے بات کاٹی۔ "خاصا سست خرام ہے اور ادھوری علامتیں کافی نہیں۔ مجھے چیزوں کو جاننے کی ہمیشہ ٹوہ رہی۔ میر صاحب۔ خانصاحب اور نواب صاحب' رفعت پناہ' کیوں تھے اور ناحق چوٹ جولاہا کیوں کھاتا تھا۔ وجہ معلوم ہے۔ علاوہ ازیں' خواجگی اب بھی موجود ہے۔"

"البتہ۔ حقیقت کی دوسری جہات اور تہوں کی تلاش کے لئے ایک مشعل جلا۔ تہ خانوں میں اتر اور وقت کی اندرونی ہفت خواں طے کر۔"

جلد اول

تو ان کھنڈروں کے تہ خانوں میں سے ملفوظات اور تواریخ اور تذکروں اور شجروں کے انبار برآمد ہوئے اور حیرت ہوئی کہ تاریخی وقت سے منسلک عبرانی عربی روایت کے ورثاء نام اور واقعات کو ریکارڈ کرنے کے کتنے شائق اور ماہر اور عادی تھے۔

۷۴۰ء کے کوفے میں حضرت زیدن الورد (Zaid the Rose) کو جن کا چہرہ گلاب کی مانند تازہ تھا' شہید کرنے سے قبل خلیفہ وقت نے ان سے کہا تھا "زید! تم بہت حسین کہلاتے ہو۔ تمہارے لئے موت بھی حسین اور گلرنگ تلاش کروں گا۔"

جناب زیدؑ شہید کی اولاد مزید پر سیکیوشن سے بچنے کے لئے جارجیا تک منتشر ہوئی۔ جو محض ایک اور تاریخی اتفاق تھا۔ عین ممکن تھا کہ چند ایک بزرگ Establishment میں شامل ہو جاتے تو ۷۵۰ء کے بعد ان کو بنو عباس کے پرسیکیوشن سے بچنے کے لئے اموی پارٹی کے دوسرے افراد کے ساتھ اسپین (Spain) بھاگنا پڑتا اور آج ہم لوگ رومن کیتھولک اسپینیرڈ ہوتے۔ یہ نکتہ قابل غور ہے۔

اور حزب مخالف میں مستقل جمے رہنے کا انجام بھی ظاہر ہے ۱۲۱۶ء میں ابن اسفندیار نے تاریخ طبرستان (مترجمہ پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن) میں لکھا تھا کہ "خلیفہ المتوکل باللہ عباسی (۸۴۷ء–۸۶۱ء) کے بے پناہ مظالم سے بچنے کے لئے اولاد علیؑ ویرانوں اور کھنڈروں میں سرچھپاتی پھرتی تھی۔" اس وقت انھوں نے دور دراز کوہستان البرز کا رخ کیا۔ اعقاب حضرت عمر اشرفؒ بن امام زین العابدینؑ نے بحیرہ کیسپین کے ساحلی ممالک طبرستان و گیلان پر اپنی حکومت قائم کی۔ آل زید شہیدؒ بن امام زین العابدینؑ کے متعدد افراد نے جن میں سید حسین ابو عبداللہ محدث شامل تھے' ترمذ کو اپنا وطن بنایا۔ اب ان بزرگ کی اولاد میں سید کمال الدین بن سید عثمان ترمذی نے اگر ۱۱۸۰ء میں ترکمانیہ سے ہند کا رخ نہ کیا ہوتا تو آج ہم لوگ سوویٹ روس کے کمیونسٹ باشندے ہوتے۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

آج تقریباً دس برس ہوتے ہیں کہ اس داستان کے لئے کام شروع کیا۔ ضعیف العمر ماموں میجر سید آل حسنین مرحوم (وفات ۱۹۷۵ء) پروفیسر سید تہور علی نقوی (الن ماموں جو حسنین ماموں کے مانند اس قصے کا ایک کردار ہیں (وفات ۱۹۶۹ء) پھوپی زاد بہن اور بھائی بیگم فاطمہ الطاف حسین و سید عثمان حیدر (ایک اور کردار اور راوی)' مخدوم زادہ سید محمد یٰسین اور ان کے علاوہ سید تنظیم حسین زیدی نے کراچی سے بذریعہ خطوط دونوں کنبوں اور ان کی پرانی رسومات وغیرہ کے متعلق چند اہم معلومات فراہم کیں۔

شاہی فرامین سید شمیم حسین زیدی[1] نے نہٹور میں عنایت کئے۔ نوابزادہ سید ہدایت علی خاں سلمہ' اور سید حسین مہدی رضوی نے قدیم دستاویزیں محمود پور اور مراد آباد سے ارسال کیں۔ چند تصاویر زہرا حیدر (الہ آباد)' سید افتخار حیدر' سید امیر حیدر (نہٹور) پروفیسر سید مختار حسین نقوی (امروہہ) نور العین حیدر سلمہا' سید عثمان حیدر' سید امتیاز حیدر اور حسنہ لقمان حیدر (کراچی) نے مہیا کیں۔ ان تمام بزرگوں اور عزیزوں کی بیش بہا اعانت کی ممنون و مشکور ہوں۔ داستان کی بقیہ تاریخی و عمرانی تفصیلات کی جانکاری ناچیز کی اپنی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔

مستند لیکن بالافراط بیک گراؤنڈ میٹریل کو بے رحمی سے ایڈٹ کرتے ہوئے بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ ای۔ اے۔ پرنسپ جن کے بنائے ہوئے قوانین اراضی کی میر قائم علی نے ۱۸۵۷ء کے بعد پنجاب میں اصلاح و ترمیم کی' آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس کے وہ مستشرق بزرگ تھے جن کی مشہور English-Sanskrit Vocabulary ہیلی بری کالج کے ناشرین نے ہرٹ فرڈ میں غدر سے بہت پہلے شائع کی تھی۔ کہیں کہیں پر تذکرہ جات اولیاء اور لوک کتھائیں ایک دوسرے کی نشاندہی کرتی ملیں۔ پرتھوی راج راسا کے مطابق "بخاری سید" بھی جنگ میں شامل تھے۔ اور ملک ابراہیم (ابن کمال الدین ترمذیؒ) "نشانچی لشکر شہاب الدین غوری اور ان کے رفقاء کی شہادت" کی تفصیل مختلف تذکروں میں موجود تھی۔

باید دانست کہ عین اسی زمانے میں یوروپ کی خانقاہوں کے راہب' پادری' دیہات کے کسان' شہروں کے کاریگر اور بیروزگار غرباء' بچے' بوڑھے' منچلے امیر زادے سب اپنے اپنے بادشاہوں کی افواج میں بھرتی ہو کر صلیبی پھریرے اور گھوڑے اڑاتے ارض شام پہنچ رہے تھے اور وہاں شہید ہو کر آسمانی بادشاہت حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ Age of Faith کی ان لڑائیوں میں کام آنے والے سینٹ' نائیٹ' غازی' سلاطین و راجگان قرون وسطی کے مغرب و مشرق کے لئے' رزم نامے' بیلیڈ اور سلسلہ وار قصص کا ایک رومان پرور ذخیرہ مہیا کر گئے۔

موجودہ داستان مغربی ایشیا سے ہندوستان پہنچ کر اسی عہد دلاوری میں شروع ہوتی ہے۔ لیکن عمرانی لحاظ سے یہ زمانہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ اسی وقت سے ہماری مخلوط تہذیب اور زبان و ادب کی داغ بیل پڑنا شروع ہوئی۔

Age of Faith کی عوامی روایات اور رومانس میں ایک رقاصہ چترلیکھا ملی جس پر شہاب الدین غوری کے بھائی صاحب عاشق ہو گئے تھے۔ اور پرتھوی راج کی لڑکی "مسماۃ انیکادیوی" سے ملاقات ہوئی جو اپنی داسیوں کے ساتھ "تالاب ایکانبر" پر اشنان کے لئے آئی۔ تازہ ولایت مبلغ میر کمال الدین ترمذیؒ کو دیکھا۔ ان کی تعلیمات کے اثر سے "باطناً اسلام قبول کیا" اور مزار اس پاک بی بی کا متصل خانقاہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ قریب لاٹ کے روشن و ہویدا ہے۔"

جاننا چاہئے کہ شمالی ہند پر تورانی فوجی تسلط کے دور اولین میں ترکستان و ایران کے مشائخ اور ملٹری ایڈونچرر انبوہ در انبوہ یہاں پہنچ رہے تھے اور اس ملک کی فیوڈل راجپوت سوسائٹی تہ وبالا ہو رہی تھی۔ ان غیر محفوظ و متزلزل ایام میں مسلمان اور ہندو عوام کے لئے ان درویشوں اور ترک اور راجپوت فوجی سرداروں کا کلچر ہیرو اور فوک ہیرو بننا ناگزیر تھا۔ اس Traumatic عہد کی یاد دیرپا ہے۔ واضح ہو کہ اتر پردیش کے اکثر بوڑھے ہندو کسان اپنے پڑوسی مسلمانوں کو عادتاً آج تک "ترک" کہتے ہیں۔ اور سالار مسعود غازیؒ' امیر حمزہؒ وغیرہ کے محیر العقول کارنامے مسلمان کسان چوپالوں اور قصباتی بیٹھکوں میں آج بھی عقیدت و انہماک سے سنتے ہیں۔

اردو کو آج کل "GrassRoots" سے عاری محض شہروں کی زبان کہا جا رہا ہے۔ اور یو۔ پی اور بہار کے ان سینکڑوں نیم دیہی قصبات کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے جو علم و ادب کے مراکز رہ چکے ہیں اور جہاں کے عوام بھی یہی زبان بولتے ہیں۔ مزید برآں ضلع بجنور اتر پردیش کا وہ واحد ضلع ہے جہاں کے نوے فیصدی باشندے وہ اردو بولتے آئے ہیں جسے محض "کھڑی بولی" نہیں کہا جا سکتا۔ ضلع مراد آباد فردوس گوش ہے کہ اس کے عوام نہایت شگفتہ اور چٹخارے دار اردو بولتے ہیں۔ اودھ اور پورب یعنی بولیوں کے علاقوں کے برعکس، مغربی یوپی کے قصبات میں بہت حد تک وہ قدیم اردو مستعمل ہے جو اس نئی اردو سے مختلف ہے جو شہروں میں انیسویں صدی رائج ہوئی۔

اینتھرو پولوجی کی اصطلاح میں جس شے کو "کلچر پرسنلٹی" کہا جاتا ہے۔ زبان و لہجہ اس کا اہم جزو ہیں۔ شمال مغربی دو آبے کے لوگوں کی اس کلچر پرسنلٹی کی ایک ہلکی سی جھلک شاید آپ کو ایک قصبے نہٹور کی کہانی میں نظر آسکے گو یہ کہانی محض قدیم تاریخ اور قصبہ نہٹور پر مبنی نہیں ۱۹۴۷ء کے دمشق سے شروع ہو کر دیس دیس ہوتی ۱۹۷۶ء تک پہنچتی ہے۔

غیر معروف حیات یلدرم اس داستان کا ایک حصہ ہے۔ مرحوم نے نام و نمود، صلے و ستائش سے بے نیاز، ایک خاموش و قانع، لیکن ازحد متنوع زندگی گزاری۔ وہ ایک ایسے ادبی پیشرو اور تخلیقی ادیب تھے جن کو ہمارے بیشتر عظیم نقاد و ادبی مورخین و ادباء ہمیشہ محض "ترکی افسانوں کے مترجم" کہہ کر سرسری طور پر بات ٹال دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو تنقید و تاریخ نگاری نے مجھے ہمیشہ متعجب کیا۔ علاوہ ازیں خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اس درسگاہ کی جو ضخیم تواریخ بزبان انگریزی لکھوائی جا رہی ہیں ان میں یلدرم کا ذکر بھولے سے نہیں ملتا۔ ہمیں است آئین چرخ کہن۔

اس سوانحی ناول کے مختلف النوع ماخذوں میں والدہ مرحومہ کا وہ زبردست ذخیرہ رقعات بھی شامل ہے جس میں سے علامہ اقبال، مولانا محمد علی، نواب نصیر حسین خیال، شیخ عبدالقادر، منشی دیانرائن نگم، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور جانے کن کن مشاہیر کے خطوط شامل تھے جو ۱۹۴۷ء کی تباہی میں تلف ہوئے۔ باقیماندہ میں سے متعدد اس داستان میں شامل ہیں۔ بہت سے ابواب نذر سجاد حیدر کے "روزنامچے اور ایام گذشتہ" جو تہذیب نسواں لاہور میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اور عصمت کراچی میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء تک وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے اور یلدرم نمبر رسالہ پگڈنڈی مرتبہ مبارز الدین رفعت مرحوم سے اخذ کئے ہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، نے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم کا ایک مضمون (مطبوعہ تہذیب نسواں، جون ۱۹۱۲ء) اور جناب اکبر علی خان عرشی زادہ اوفیشل ڈائریکٹر رضا لائبریری رامپور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شمیم حنفی اور ڈاکٹر قمر رئیس نے یلدرم کے چند نایاب مضامین کی نقلیں فراہم کیں۔ "تاریخ سرکشی بجنور" مرتبہ شرافت حسین مرزا (ہندوستانی اڈیشن) مرسلہ جناب عرشی زادہ میں سید احمد خاں" کا خط بنام میر بندے علی ترمذی دستیاب ہوا جو اس کتاب کے

پاکستانی اڈیشن میں موجود نہیں اور نہ "مکاتیب سرسید" میں شامل ہے اور جو غالباً سرسید" کا قدیم ترین (مرقومہ ۵ مارچ ۱۸۵۴ء) شائع شدہ خط ہے۔ سرسید احمد خاں کے دیگر رقعات بنام میر بندے علی مدتیں گذریں ضائع ہو چکے ہیں۔

"آج کل" دہلی میں "کار جہاں دراز ہے" کے چند ابتدائی ابواب شائع ہونے کے بعد اس رسالے کے ایک قاری جناب عبیدالرحمٰن حامد صاحب نے ازخود سید جلال الدین حیدر مرحوم کے متعلق چند واقعات ٹونک سے لکھ کر مجھے بھیجے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی انعام یافتہ تازہ تصنیف "مطالعہ یلدرم" لاہور سے عنایت کی۔ سردار خشونت سنگھ "اڈیٹر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" نے "ریکارڈز آف خالصہ دربار مرتبہ سیتا رام کوہلی کا سراغ دیا۔ بھائی امیر حیدر اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے چند قدیم تحریریں پڑھیں۔ جناب جگن ناتھ آزاد نے "ذکر اقبال" کا ایک اقتباس فراہم کیا۔ میں ان تمام کرمفرماؤں کی بیحد ممنون ہوں۔

چچا مشتاق احمد زاہدی مرحوم کی پوتی اور ہندوستان کی منفرد مصور امینہ عکس (بنت جناب نور الدین احمد دہلوی مرحوم) نے جو خود اس داستان میں شامل ہیں گردپوش کا اسکیچ نیویارک سے تیار کر کے بھیجا جہاں وہ پچھلے دنوں اپنی تصاویر کی نمائش کے سلسلے میں گئی ہوئی تھیں۔ سلیڈ اسکول آف آرٹ، لندن، کی تربیت یافتہ اور ہفت زبان امینہ بیگم نے مرزا غالب کے علاوہ روس کے الیمین اور اخمتووا کے اشعار بھی مصور کئے ہیں اور ان کی تصاویر کی نمائشیں ماسکو، نیویارک، لندن، پیرس، کرائسٹ چرچ (نیوزی لینڈ) بنکاک اور نئی دہلی میں منعقد ہو چکی ہیں۔ چند سال قبل نیویارک میں ان کی "راگ مالا سیریز" اور "شیراز سائیکل" کی بالخصوص بہت دھوم مچی۔ اور ایسا ہونا چاہئے تھا۔ بچپن میں ہم لوگوں نے بھی یہی طے کیا تھا۔

مغرب میں کسی ادیب یا شاعر کا نام لیجئے۔ ہربرٹ ریڈ۔ ورجینا وولف۔ شان اوکیسی۔ ولیم پلومر۔ سراوزبرٹ سٹ ویل۔ الزبتھ بوون۔ اسپنڈر۔ اشروڈ۔ سارتر۔ سیمون دوبووا۔ (جوزف ہون، میسکھ پیرسن، ہربرٹ گورمین وغیرہ پروفیشنل سوانح نگاروں سے قطع نظر) اور ان کے لکھے ہوئے سوانحی ادب کا انبار آپ کو مل جائے گا۔

اس نوع کی درجنوں تازہ ترین کتابیں ہر مہینے انگلستان اور امریکہ میں چھپ رہی ہیں۔ اجتماعی ناول، رائیٹرز نوٹ بک اور فیملی ساگا ان کے علاوہ۔ ہمارے ہاں ان اصناف ادب پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ بالخصوص فیملی ساگا آج کل انگلستان میں ازحد مقبول ہیں۔ کیونکہ وہاں "فیملی" ختم ہو چکی ہے۔

ہان سویان انقلاب سے پہلے کے اپنے چینی مشترکہ خاندان کا نقشہ کھینچ چکیں۔ امریکہ میں اشکنازی یہودی کنبوں کے قصوں کا زور ہے۔ اشکنازی یہودی اور اینگلو سیکسن مسیحی دونوں متوازی سماج اپنی اپنی کھوج میں مصروف ہیں۔ بازیافت کی یہ کوشش جب معاشرہ متزلزل ہو زیادہ تندہی سے کی جاتی ہے۔

ذاتی طور پر میرا بیشتر ادب پروستین Le Cherche du Temps Perdu گمشدہ زمانوں کی تلاش پر مبنی ہے۔

جوں جوں یہ کہانی آگے بڑھتی گئی اس نے میرے لئے ایک ادبی ایڈونچر کی صورت اختیار کرلی۔

عرصہ ہوا جب رالف رسل نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک "لائف اینڈ ٹائمز" قسم کی چیز لکھنا چاہیئے۔ اس وقت اس کتاب کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہ آیا تھا۔ لیکن جب لکھنے بیٹھئے تو تکنیک اور صنف ادب آپ سے آپ بن جاتی ہے۔ اور حقیقت افسانے سے عجیب تر ہے۔ چنانچہ ایک "سوانحی ناول"۔

قارئین کی دلچسپی کی خاطر جلد اول میں اپنے والدین کے اور جلد دوم میں اپنے حلقہ احباب میں سے زیادہ تر ادبی شخصیتوں کا ہی ذکر کیا ہے۔ جلد اول ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتی ہے۔ جلد دوم (مع تصاویر) ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۶ء تک کا افسانہ ہے۔ اب فہرست ابواب بغور ملاحظہ فرمایئے اور فٹ نوٹس کو نظرانداز نہ کیجئے۔ شکریہ۔

ڈریگو مین سجاد حیدر کے دور کے تفصیلی مطالعے سے دلچسپی ہو تو ملاحظہ کیجئے برطانوی ملٹری اتاشیوں اور ڈریگومین کے باب عالی سے مراسلات۔ پبلک ریکارڈ آفس۔ لندن۔ اس کے علاوہ۔

The Last of the dragomans by Sir Andrew Ryan. (London 1951)

Dragomania– The Dragomans of the British Embassy in Turkey by Allan Cunningham (London 1961)

Ref: The young Turks– 1908–14 by Dr. Feroz Ahmed, Clarendon Press, Oxford, 1969.

فصل اول

فرات و جیحوں

میں دشت لوط کے کنارے کھڑا ہوں۔ کس طرف جاؤں؟ موت کہیں بھی، کسی راستے سے آسکتی ہے۔ چمکیلے خنجر کا وار، زہر کا بلوریں پیالہ، زنداں کے دروازے پر جلاد کی دستک۔

ممکن ہے زندہ بھی رہ جائیں۔ فرات سے جیحوں تک کا راستہ کچھ کم دشوار گذار تھا؟ لیکن اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اگر ماسید نبود مار اور جہاں جائے تنگ نہ بودے۔

جد[2] امجد نے حاکم وقت سے بغاوت کی تھی۔ مارے گئے۔ لاش قبر سے نکالی گئی۔ اسے صلیب پر لٹکایا گیا۔ پھر جلا کر اس کی راکھ فرات میں بہادی گئی۔ اللہ اکبر۔ اولاد غریب الوطن ہوئی۔ ہمارے سترہ سالہ بھائی یحیٰ نے خراسان پہنچ کر پھر کچھ ہنگامہ بپا کیا تھا۔ وہ بھی مارے گئے۔

ابو محمدؑ قاسم کہاں ہیں؟ ابو محمدؑ اسمٰعیل؟

در غربت افتاد۔

ابو اسحٰق ابراہیم؟

در غربت افتاد۔

آرمینیا اور گرجیستان۔ حبشہ اور بلخ۔ غزنی اور لاہور۔ در غربت افتاد۔

آذربائیجان، داغستان، کوہ قفقاز، یہودی اور نسطوری، خوفناک روسی اور چرکسی اور تاتاری مازندران کے گھنے جنگل اور دیوزاد اقوام کا مسکن ہیں عجم کا مہم جو ستم جن سے نپٹنے جایا کرتا تھا۔ اللہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔ کون کون کدھر نکل گیا۔ کیسی کیسی اجنبی اقوام کے درمیان جا بسے۔ آگے کیا ہوگا؟ ڈر لگتا ہے۔

فتح توران کو عرصہ ہو چکا۔ بخارا، سمرقند اور ترمذ میں عرب نو آبادیات قائم ہیں۔ دمشق و بغداد سے بہت دور ماوراالنہر میں شاید امن نصیب ہو۔

ایک وقت تھا کہ ہم آل حسنؑ و حسین مدینہ میں خاموشی سے رہتے تھے۔ مگر خدائی قسم منصور کے جاسوسوں نے ہماری زندگیاں تلخ کردیں۔

کہا جاتا ہے کہ اہل ایران اپنی شہزادی، شہربانو کی وجہ سے ہم سے محبت کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ سیاسی معاملات زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ میری سمجھ میں بہرحال کبھی نہ آئے۔

بلخ کے آتش کدے سرد ہو چکے۔ امیر سامان نے کلمہ پڑھ لیا۔ ویلم کے کریم بن شہریار نے کلمہ پڑھ لیا مگر ساسانیت ہے کہ بڑھتی جارہی ہے۔

حاکموں نے بادشاہت کے آداب اختیار کرلئے۔ سامان کے لڑکوں کو حکومتیں بخشی گئیں۔ نوح صمر

قند' احمد فرغنہ ' الیاس ہرات' سب نے اپنا شجرہ بہرام چوبیں سے جوڑا۔ سارے حاکم خود کو خسرو اور دارا کہلوا کر خوش ہو رہے ہیں۔ بخارا اور سمرقند گھوم کر آؤ تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کیسی بدلی ہے۔ سامانی دربار میں رودکی قصیدے پڑھتا ہے۔

شاہ ماہ است و بخارا آسماں   شاہ سرواست و بخارا بوستاں

ہائے ابوذر غفاری۔

ملک گیری 'کشور کشائی اور ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں۔ دیکھو طبرستان والوں کا کیا حشر ہوا۔ ہمارے رشتے دار تھے۔ خود کو داعی الحق کہلوایا' شاندار مدرسے قائم کئے۔ صاحب خطبہ و سکہ ہوئے۔ جاہ و جلال سے سو برس تک حکومت کی۔ انجام کار وہی ایک ضرب شمشیر۔ خراسان کے صفاریوں اور بخارا کے سامانیوں نے ان کا افسانہ کوتاہ کیا۔

یعقوب صفاری بہت عوام کا قائد بن کر اٹھا تھا۔ لوہار ہوں۔ جو کی روٹی کھاتا ہوں۔ مجھے خلیفہ بغداد کی پروا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ خود امیر بن بیٹھا۔

خیوا اور خوارزم اور کاشغر کے خاقان مسلمان ہو چکے ہیں۔ سامانی بھی گئے۔ کاشغر کے ایک خان نے بخارا فتح کیا۔

آل سامان کی بربادی میں ان کے ترک غلاموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے یہاں ایک ترک غلام تھا الپتگین نامی۔

یہ ترک غمزہ زن۔ کل ایک شاعر مجھ سے کہہ رہا تھا۔

ہم لوگ بلخ سے پچاس میل دور جیحوں کے کنارے ترمذ میں رہتے ہیں۔ سکندر کے زمانے کا شہر ہے۔ آتش کدے ویران پڑے ہیں۔ پیر مغاں اب میکدہ چلاتا ہے جہاں فارسی کے نئے شاعر روز شام کو جمع ہو کر عربوں اور ملاؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔

سرکاری اور علمی زبان عربی ہے۔ درس گاہوں میں عربی پڑھائی جا رہی ہے۔ البیرونی اور بوعلی سینا' ابن موسیٰ اور ابن فارابی کے زمانوں کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن نئی ایرانی قوم پرستی کی وجہ سے فارسی کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ ابوالقاسم فردوسی نے ہم عربوں کی کم تحقیر کی ہے! جانے کیا ہونے والا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ نئی اسلامی برادری ہے۔ فرغنہ اور زرفشاں کی وادیوں میں ترک آباد ہیں۔ ترکی بولتے ہیں۔ تاجک قدیم سغدیوں اور باختریوں کی اولاد ہیں۔ آل سامان نے وسط ایشیا کو تہذیبی لحاظ سے ایران سے ملحق کیا۔ اس خطہ میں تاجک فارسی پھیلی۔ ہم بھی عربی بولنا بھول گئے۔ عبا کو خیرباد کہا۔ ترکی اور تاجک فارسی بولتے ہیں۔ سرخ چوغے اور دھاری دار خلعتیں زیب تن کرتے ہیں۔ سخت سرد ملک ہے۔ پورے پورے چرمی جوتے اور سموری ٹوپیاں اور سموری قبائیں پہنتے ہیں۔ ٹوپی یا عمامے پر یہ ایک سبز رومال البتہ باندھ لیتے ہیں کہ نشان آل رسول ہے۔

یہاں گھوڑوں کی فراوانی ہے۔ میں نے ایک بار سوچا تھا۔ گھوڑوں کی تجارت شروع کروں۔ کچھ بزرگوں نے بلخ اور خوارزم کے مدرسوں میں پڑھا پڑھایا تھا۔ میرا دل بھی تجارت کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

عراق سے یہاں بہت سے صوفیا آن پہنچے ہیں۔ خانقاہیں اور تکیے آباد ہو رہے ہیں۔ ہم سادات نے ترمذ پر حکمرانی بھی کی۔ مگر صاف بات یہ ہے کہ حکومت ہمارے بس کا روگ نہیں۔

سلجوقیوں' تاجکوں' خوارزمیوں' غزنویوں' غوریوں میں مسلسل لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ شہر تاراج ہوتے ہیں۔ پھر تعمیر کر لئے جاتے ہیں۔

کفار نے طلوع اسلام سے قبل یہاں صنم خانے تعمیر کئے تھے۔ باختری یونانیوں نے ایک شخص کے مجسمے تراش کر اس کی پرستش شروع کی کہ نام اس شخص کا بت تھا۔ ہند قدیم کا ایک عارف تھا۔ بڑے حسین مجسمے تھے جو الحمدللہ اب ترمذ کی ریت پر بکھرے پڑے ہیں۔ بت نئی فارسی شاعری کی ایک تلمیح میں تبدیل ہو کر خود صحرائے ترکستان کی خاک میں مل گیا۔

ہمارے ترمذ میں اس وقت ایک سے ایک عالی شان عمارتیں موجود ہیں۔ مدارس' خانقاہیں' شفاخانے' مساجد' کارواں سرائیں۔ مکانوں پر انگور کی بیلیں پھیلی ہیں۔ بازاروں میں نہریں بہتی ہیں۔ باغوں میں انار اور سرو کے درخت لگے ہیں۔ جیحوں کی ساحلی ریت میں تربوز کے کھیت ہیں۔ شہر سے باہر کپاس لہلہا رہی ہے۔

ترمذ مدینۃ الرجال کہلاتا ہے کہ یہاں علماء اور صوفیا کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

ابھی ابھی طبل جنگ بجے گا یا غزنوی یا سلجوقی شہ سوار شب خون ماریں گے اور پل کی پل میں سب غارت ہو جائے گا۔ ہمارے بزرگوں نے کیا دہشت ناک زمانے دیکھے۔

سامانیوں کا جو ترک غلام الپتگین تھا۔ آج کل دستور یہ ہے کہ ان بانکے ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کج کلاہ صوبائی حاکموں اور خود مختار امراء کے حاجب یا مقرب خاص بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد آقائے خلافت بغداد کا جو حال ہے سو ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ الپتگین جو خراسان کا سپہ سالار مقرر ہوا تھا ایک شاہی خاندان کا بانی اور اپنے آقاؤں کا حاکم بن گیا۔ والد بزرگوار بتاتے ہیں۔ ان کے بچپن کی بات ہے جب الپتگین کے نامور غلام جانشین اور داماد امیر ناصرالدین سبکتگین نے یہاں ترمذ میں انتقال کیا۔

جیحوں سردیوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ دریا کے جنوبی ساحل کے سامنے قہستان کے برف پوش سلسلے ہیں۔ موسم سرما میں اوپر خوارزم سے یہاں تک کشتیوں کی آمد و رفت بند ہو جاتی ہے۔ موسم بہار میں ان کشتیوں پر اکثر دشت قپچاق کے غلام لائے جاتے ہیں۔ قہستان' اجڈ اور اکھڑ افغانوں کا علاقہ ہے۔ امیر ناصرالدین سبکتگین کے حیرت انگیز فرزند محمود نے ان کو ٹھیک کیا تھا۔ یمین الدولہ کی کیا عجیب و غریب شخصیت تھی۔ اس نے ایلک خانیوں اور سامانیوں کے چراغ گل کئے۔ غور فتح کیا۔ آل بویہ سے اصفہان چھینا۔ اس کے دربار اور اس کی علمی مجالس اور اس کی جود و سخا کے قصے' الف لیلوی ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد دنیا

تاریک ہوگئی۔ فرخی نوحہ کناں ہے۔ خیز شاہا کہ جہاں پر شغب و شور شدہ است۔ مگراب وہ کہاں جاگتا ہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

تاریخ کس طرح اپنے آپ کو اتنی یکسانیت سے دہراتی ہے۔ غزنی کا ایک ترک غلام انوشتگین' سلطان ملک شاہ سلجوقی کا ساقی تھا۔ اسے خوارزم کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس کے لڑکے نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ پوتے علاؤالدین خوارزم شاہ نے سمرقند اور بخارا مسخر کر لئے۔ لیکن جو حشر سامانیوں کا ان کے غلاموں نے کیا تھا وہی سلجوقیوں کا ہو رہا ہے۔ ورنہ طغرل بیگ' چغربیگ اور سلطان سنجر کا رعب و دبدبہ' شوکت و طاقت' جاہ و جلال کس کو یاد نہیں۔ غزنوی افواج کو شکست فاش دے کر خراساں انہوں نے کس آسانی سے تسخیر کر لیا۔ جس روز طغرل بیگ کا خطبہ نیشاپور کی جامع مسجد میں پڑھا گیا ہے میرے ایک دادا وہاں موجود تھے۔ مدرسے میں پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے پدر بزرگوار کو سلجوقیوں کی شان و شوکت کے قصے سنائے تھے۔

سلاجقہ کو ان کے اتابیگوں نے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ اتابیگ دراصل دشت قپچاق سے لائے ہوئے غلام اور جنوبی روس کی وادی اتل[3] کے ذہین اور شکیل باشندے ہیں۔ فوجی طاقت ان کے ہاتھ میں ہے۔ آذر بائیجان' فارس' آرمینیا' شام' موصل' دمشق' غرضیکہ ساری سلطنت سلجوقیہ پر ان کا تسلط ہے۔ اس وقت سلطان سنجر محض خراسان کا فرماں روا رہ گیا ہے۔ لیکن درباری شعراء اس کی بھی تعریف کے دریا بہانے میں مصروف ہیں۔

ایک وقت تھا کہ بلخ' جرجان' خوارزم اور طبرستان پر قابض ہونے کے بعد طغرل بیگ آل عباس کے بغداد میں "سلطان" کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔

قہستان میں فیروز کوہ کے غوریوں نے اہل غزنی کا زور توڑا۔ لاہور تک پہنچ کر غزنوی مملکت پر قابض ہو گئے۔ غزنی کے دربار میں ہمارے کچھ بھائی ہاتھوں ہاتھ لئے گئے تھے کہ خاقان' خوانین اور ملوک اور سلاطین کے اس دور میں سادات اور فقراء کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ بادشاہ وقت آل رسولؐ کا ادب کر کے ثواب کمانا چاہتا ہے۔

غزنوی اور غوری افواج کی مستقبل آمدروفت کی وجہ سے ہند کا راستہ کافی آسان ہوگیا ہے۔ اب تو یہی دھن ہے کہ بی بی بچوں کو ساتھ لے کر سفر پر نکلوں اور کفار کو دین مبین اختیار کرنے کی ہدایت کروں۔ خداوند بزرگ و برتر اس فقیر کے ارادے کو تقویت دے اور کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۔ جیحوں سے جمنا

سلسلہ نسب پدری سید عالی خاندان سید کمال الدین ترمذی کہ در کیتھل متصل تھانیسر از ولایت آمدہ سکونت کردہ اند بن سید عثمان ترمذی بن سید ابوبکر بن سید عبداللہ بن سید طاہر بن ابوطاہر بن سید عبداللہ بن سید علی زید بن سید حسین بن ابوعبداللہ بن سید احمد محدث بن سید عمر بن سید حسین ذوالدمعہ بن زید شہید بن زین العابدین علیہ السلام[4]

سید کمال الدین ترمذی ان اولین صوفیائے کرام میں سے تھے جو بارہویں صدی میں ہندوستان وارد ہوئے۔

قراخطائی سے ریشم و کتان کے چند تاجر بلخ و ہرات جاتے تھے۔ ان کا ساتھ ہوگیا۔ ایک خچر پر خیمہ لادا' ایک مشکیزہ' کتابوں کا بستہ' جانماز' تسبیح اور تلوار۔ جیحوں پار کر کے بلخ پہونچے۔

خراسان مشرقی صوبہ ہے۔ سورج یہاں سب سے پہلے نمودار ہوتا ہے۔ وسیع خشک چٹیل میدان' سرخ زمین' سرخ مٹی' سرخ چٹانیں۔

ایسی بے آب و گیاہ سرزمین نے کیسے کیسے ادباء' علماء' سپہ سالار اور سیاست داں پیدا کئے۔ تعجب ہوتا ہے۔ جب سورج نکلا تو دھوپ وسعت کی وجہ سے افق تا افق پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ خراسان طلوع خورشید کی سرزمین ہے۔

راقم الحروف نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شہنشاہ محمد رضا شاہ اور فرح پہلوی شہبانوئے ایران کے ہمراہ بذریعہ ہیلی کوپٹر و طیارہ خراسان کا دورہ کیا۔ اس خطے کے سپاٹ میدانوں اور ٹیلوں سے آج بھی اسی طرح کارواں گذرتے ہیں۔ جدید ترین آسائشوں والے شہر آباد ہو چکے ہیں۔ مگر مشہد اور طوس اور نیشاپور کی مساجد اور مدارس کے عباپوش علماء و سبز عماموں والے تسبیح پھیرتے بوڑھے جوان اور چادر پوش خانمیں یاد دلاتی ہیں کہ بارہویں اور بیسویں صدی کے درمیان وقفہ صرف ایک پل اور ایک آن کا ہے۔ پہاڑی راستے اور ندیاں اور سرو کے جھنڈ اور کھیت اس شدید وسعت اور سناٹے میں غیرفانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جو اس درے میں سے خچروں کی ایک قطار گذر رہی ہے' صافوں اور شلواروں والے مسافران پر سوار ہیں کہاں سے آتے ہیں اور کس طرف کا رخ ہے؟ کون ہیں اور کہاں سے اپنے سفر پر نکلے تھے؟

بلخ سے غزنی پہنچے' جسے علاؤالدین جہاں سوز جلا کر خاک کر چکا تھا۔ افغانستان سے نکلے دریائے اٹک' پنجاب' لاہور

شہر مختلف سا معلوم ہوا۔ اچانک چند قبریں اور ایک مسجد نظر آئی۔ جان میں جان آئی۔ اپنے یک جدی بھائی احمد توختہ ترمذی سے افسوس کہ ملاقات نہ ہو سکی۔ پنجاب سے چلے۔ ڈھیلی کے نزدیک پہنچے' راستے میں کئی قافلے چھوڑے' نئے مسافروں کا ساتھ ملا۔ کبھی تن تنہا پیدل تن بہ تقدیر' کبھی اونٹ یا خچر پر۔ درہم کی تھیلی قریب الختم تھی۔ طے کیا اب جو بستی دکھائی پڑے' اللہ کا نام لے کر وہاں قیام کیا چاہئیے۔

ایک علاقہ سرسبز و شاداب نظر آیا کہ مویشی کثرت سے چر رہے تھے۔ تالاب تھا۔ اہل ہنود کے صنم خانے۔ معلوم ہوا اس قصبے کا نام کیتھل ہے۔ علاقہ ہریانہ ندی کے کنارے اہل ہند کی ایک مشہور زیارت گاہ اور بت خانہ ہے۔ نزدیک ہی ایک مقام تھانیسر ہے۔ کیتھل کا خاص میدان کوروکھیشتر کہلاتا ہے۔ یہاں عہد قدیم میں ایک زبردست جنگ لڑی گئی تھی۔

مقامی زبان سے ناواقف' راہ میں کچھ الفاظ پنجابی کے سیکھ لئے تھے۔ ان سے کام چلایا۔ ترک

یہاں حد سے زیادہ بدنام ہیں۔ لفظ ترک سے لوگ سہم جاتے ہیں کہ مستقل حملے کر کے ان اقوام کو ہراساں کر رکھا ہے۔

جیحوں سے جمنا تک کا راستہ کچھ کم خطرناک تھا۔

بہرحال بمقام سیلہ گڑھ تالاب ایکانیر کے کنارے جھونپڑی ڈال کر ٹوٹی پھوٹی ہریانوی زبان میں تبلیغ شروع کر دی۔

مجھے ہے حکم اذاں۔

سید کمال الدین ترمذی چند سال کیتھل میں قیام کرنے کے بعد پدر بزرگوار سے ملنے کی خاطر دوبارہ عازم ترکستان ہوئے۔ گویا فرلو پر وطن جاتے ہیں۔ راستے میں سیاسی خلفشار شدید تھا۔ اس طرف ایران میں اسمعیلیوں نے آفت جوت رکھی تھی کہ وہ بھی ایک اور امام زادے اسمٰعیل کی امامت کے داعی تھے۔

۱۱۹۲ء میں سید کمال الدین ترمذی نے بی بی بچوں اور رفقاء کے ہمراہ دوبارہ قصد ہند کا کیا۔ راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لشکر جرار درہ خیبر کی طرف رواں ہے کہ سلطان شہاب الدین' علاؤ الدین جہاں سوز کے بھتیجے کا لشکر تھا۔ سلطان مع مقربین و سپہ سالار کے آن کر آپ سے ملاقی ہوا اور بولا کہ بے سروسامانی میں برائے تبلیغ دین مبین ہند جانا خالی از ملال نہیں۔ فرمایا کہ فقیر کو تائید ایزدی کافی ہے۔ بعد ازاں اپنے فرزند جرار سید ابراہیم کو سلطان کی فوج کے ہمراہ کیا۔ سلطان نے نشان اسلام مع خطاب ملک کے سید ابراہیم کو تفویض کیا اور سرہند پہنچ کر قلعہ ہانسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ فتح حاصل کی۔ سید ابراہیم مع رفقاء شہید ہوئے۔ مزار پرانوار اس نامدار کا قلعہ کے اندر موجود ہے۔ خانقاہ نشانچی کہلاتی ہے۔

فتح دہلی کے بعد بہ طلب سلطان شہاب الدین غوری' سید کمال الدین دہلی تشریف لائے۔ بعد ازاں قصبہ کیتھل میں دوبارہ قیام کیا۔ آپ کی توجہ سے ایک ہزار آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ خود ایک جنگ میں شرکت کر کے شہید ہوئے۔ سید موصوف کے ہمشیرزادے خواجہ سبز خط بھی ترمذ سے کیتھل وارد ہوئے۔ قصبہ صوفیائے کرام کا مسکن بنا۔ علاؤ الدین خلجی کے باب میں فرشتہ سادات کیتھل کا ذکر کرتا ہے۔

سید کمال الدین کے چند بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ حسام الدین' اولاد ان کی کیتھل' فیض آباد اور احمد آباد (گجرات) میں ہے۔

2۔ ملک سید ابراہیم' جنگ ہانسی میں پرتھوی راج چوہان کی فوج سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے اور شہید مرد کہلائے۔ ذکر ان کا اوپر آچکا ہے (یہ جو ہندوستان کے چپہ چپہ پر گمنام "شہید مردوں" کی قبریں ہیں جن پر اندھیری راتوں میں عقیدت مند آکر چراغ جلاتے ہیں' یہ وہی غریب الوطن سپاہی ہیں جو ان گنت جنگوں میں کام آئے)

3۔ نصیر الدین' برائے تبلیغ ملک بنگالہ کا سفر کیا۔ اولاد سلہٹ اور پورنیہ میں موجود ہے۔ میر قاسم نواب بنگال' میر نصیر الدین ابن سید کمال الدین ترمذی کی نسل دختری سے تھے۔

4۔ علیم الدین اول' ۱۱۹۴ء میں شہاب الدین غوری نے قنوج فتح کیا۔ علیم الدین اور دوسرے صوفیا وہاں جا پہنچے۔ سلاطین کی پالیسی شروع سے یہ رہی کہ مقبوضہ علاقوں میں سادات اور ترکوں کو آباد کرتے تھے۔ سادات کو عموماً قاضی بنایا جاتا تھا۔

ترمذی اور بخاری گوناگوں سادات اب جوق در جوق ہندوستان آنے شروع ہوئے۔ دور افتادہ گاؤں اور قصبوں میں آباد ہونے لگے۔ ہر طرف صوفیا' اور فقراء کی ریل پیل تھی۔ "میر علیم الدین اول منجانب سلطان عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔" مشہور صوفی سید شہاب الدین قنوجی میر علیم الدین کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے اخلاف زیادہ تر ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں آباد ہوئے۔

شمس الدین التتمش کو بدایوں کا گورنر بنا کر شہاب الدین غوری واپس گیا۔ راہ میں قرامطیوں کے ہاتھ مارا گیا۔ خاندان غلامان اور خلجیوں کے ادوار میں مزید علماء اور مشائخ وسط ایشیا اور ایران سے ہندوستان پہونچے۔ ۱۳۹۹ء میں خواجہ جہان نے سلطنت جونپور کی بنیاد ڈالی۔ کڑا (الہ آباد) اور قنوج اس نئی سلطنت کے صوبے تھے۔ سید علیم الدین کی پانچویں پشت میں سید العارفین' علیم الدین ثانی "سرکار جونپور میں عہدہ پنج ہزاری پر فائز ہوئے۔"

سید جلال الدین بخاری" اچھ تشریف لا چکے تھے۔ شاہان تغلق ان کے مرید تھے۔ یہ ان کے پوتے مخدوم جہانیاں" جہاں گشت کا دور تھا۔ سید علم الدین انکے خلیفہ مقرر ہوئے۔

"حضرت سید علیم الدین از بزرگان روزگار در لباس غنا کسب سلوک اہل تصوف را برپا میداشت اہل مرید مخدوم جہانیاں" بود حضرت شیخ اخی جمشید راجگیری" طریقہ مواخاں و مصاحبت و محرمیت داشت چنانچہ برائے اظہار اسلام بہ بلانوں (ضلع بارہ بنکی) آمد مخدوم اخی جمشید از اتحاد پاک نہاد۔ یہ بلانوں آمدہ بہ موافقت سید بنائے قلعہ انداخت"۔ (بحر زخار)

دلی کے تخت پر سے تغلق اور خلجی اترے اور لودھی آئے کہ افغان تھے۔ انھوں نے افغانوں کو سلطنت کی مختلف سرحدی چھاؤنیوں میں آباد کیا۔ پندرھویں صدی میں سکندر لودھی کا عہد احیاء علوم کا دور تھا۔ سید علیم الدین ثانی کے پڑپوتے سید صدر الدین نامور عالم تھے۔ سلطان سکندر کے دربار میں تخت شاہی کے دائیں جانب جگہ پاتے تھے۔ فرشتہ نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اولاد میں سید عبد الغنی اکبر اعظم کے صدر الصدور اور صاحب نوبت ہوئے۔

اولاد قصبہ پہانی ضلع ہردوئی اودھ میں آباد ہے۔[1]

5۔ سید جلال الدین غازی سید کمال الدین ترمذی کے صاحبزادے اس تذکرہ نویس فقیر حقیر پر تقصیر عاجزہ فدویہ کے مورث اعلیٰ ہیں۔ موصوف اس علاقے میں جا کر بسے جو بعد میں روہیلکھنڈ کہلایا۔ سید جلال الدین کے اخلاف میں سید اشرف گنج بخش' سید احمد' سید محمد' سید محمود اور سید حسن عسکری کا زمانہ پندرھویں صدی ہے۔ سید حسن عسکری کے صاحبزادے سید ضیاء الدین سرکار سنبھل میں چہار ہزاری تھے۔ ٹھاٹھ کرتے ہوں گے۔ موصوف کٹھیر راجپوتوں کو قابو رکھنے کے

---

[1] طلعت مسلم زیدی جو امریکہ میں رہتی ہیں سید عبد الغنی کی نسل سے ہیں۔

لئے قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں تعینات تھے۔ سید ضیاء الدین ترمذی کو ایک بغاوت فرد کرنے کے لئے مع لشکر پورب بھیجا گیا۔ معرکے میں کام آئے اور جیا شہید کہلائے۔

سید جیا شہید کا مزار جھوسی میں ایک پر فضا ٹیلے پر موجود ہے۔ جھوسی الہ آباد سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوش منظر گاؤں ہے۔ کبیر داس کے مرشد شیخ تقی یہاں کے رہنے والے تھے۔ جھوسی کی درگاہ میں متعدد گمنام مزار ہیں' عرس ہوتا ہے لیکن اہل قریہ اور مجاوروں کو کسی بزرگ کا نام ٹھیک سے معلوم نہیں۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے ہم جدی شاہ شعبان" کا مزار بھی غالباً یہیں ہے۔ ایک ٹیلے پر قدیم کھنڈر اور قبریں یقیناً عہد مغلیہ سے قبل کی ہیں۔ درگاہ کی نشیب میں جمنا بہتی ہے۔ دریا کے کنارے پر بڑی قسم کا درخت بے حد تناور اور انوکھا موجود ہے کہ اس کی مہیب جڑیں ساحل سے لے کر ٹیلے کی درگاہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ مخدوم جہانیاں اس کا پودا اپنے ساتھ بھکر (سندھ) سے لائے تھے۔ عجیب و غریب درخت ہے۔ نیشنل جیوگرافک میگزین والا دیکھ پاوے تو غش غش کرے۔

جیا شہید کے انتقال کی اطلاع جب سنبھل پہنچی میر حسن ان کے بیٹے نے ملازمت سے استعفے دیا اس وقت ان کا لاؤ لشکر میں ایک وفادار تیر گر ایسا تھا جو ان کا ساتھ چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ سابق منصب دار اور غریب تیر گر دونوں سنبھل سے نکلے اور درویشوں کی طرح پاپیادہ نہٹور واپس گئے۔

نہٹور میں اس وقت راجپوت' کائستھ اور بلئے آباد تھے۔ حکومت کی طرف سے پٹھان فوجی قصبے کی حفاظت کے لئے مقرر تھے۔ قاضی امروہے سے بھیجے جاتے تھے۔ (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اضلاع کا انتظام کتنا باقاعدہ تھا۔)

اس وقت قاضی چمن نہٹور میں تعینات تھے۔ سید حسن ترمذی کی پہلی شادی قاضی چمن کی بیٹی مہرالنساء سے ہوئی تھی .... ان کے لڑکے عارف لاولد رہے۔ دوسری شادی سعید النساء بیگم بنت سید احسن کیتھلی سے ہوئی تھی۔ ان کی ہزاروں ہزار اولاد سادات نہٹور کہلائی۔

وفادار تیر گر نے بھی شادی کر لی۔ اس کی اولاد نے محلہ تیر گراں بسایا۔ جو آج تک آباد ہے۔

بیشتر سادات نہٹور تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔

فرات سے جیحوں۔ جیحوں سے جمنا اور گنگا اور گومتی اور گاگن تک کے راستے کچھ کم پر پیچ اور پر خطر اور حیرت ناک تھے؟

۳۔ شکنتلا کا دیس

کمایوں اور گڑھوال کے دامن میں جہاں شکار گاہیں تھیں وہاں نیشنل پارک بن گئے۔ سبزہ زاروں میں ٹریکٹر چل رہے ہیں۔ ڈاک بنگلوں میں نامور شکاریوں' پرانے بھوتوں' جم کوربٹ' ظفر عمر اور سلطانہ ڈاکو کی داستانوں کی بازگشت ڈوبتی جاتی ہے۔ بجنور کے ڈھاک کے جنگلوں میں چھپے پیر زین العابدین' سید بوڑھا اور دھرم گڑھی کے قلعے کھنڈر ہو گئے۔

قائم چاند پوری کے وطن کا ایک تاریخی قصبہ باشٹہ عہد مغلیہ کے نامی صوفیاء اور علماء کے مزارات سے پر ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد بجنور سے جا کر دہلوی کہلائے۔ یلدرم' ڈاکٹر عبدالرحمن' شمس العلماء تاجور نجیب آبادی اور حافظ محمد ابراہیم اس ضلع کے باشندے تھے اور مدینہ اخبار یہاں سے نکلتا تھا۔ تذکروں میں ایسے خطوں کو مردم خیز کہا جاتا ہے۔[5] .... ہندوستان جنت نشان میں تاریخ کی اس قدر افراط ہے' کتنے لاتعداد افسانے اس ایک گمنام اور غیر اہم ضلع کے قصبوں اور گلی کوچوں میں پوشیدہ ہیں۔ اگر چشم بصیرت ہو تو ہر واقعہ سراسر حیرت و تنبیہہ غافلین ہے۔

بوڑھے وکٹورین انگریزوں نے مغل مورخین کی جگہ سنبھالی۔ ایک ایک قریے و شہر کی تاریخ مرتب کی۔ لوک کتھاؤں اور مستند دستاویزوں کا مطالعہ کیا۔ فارسی کتابیں ترجمہ کیں۔ نئی کتابیں لکھیں جن میں سے بیشتر اب قومی کتب خانوں کے گوداموں میں دیمک کی منتظر ہیں۔

جاننا چاہئے کہ علاقہ بجنور مطابق روایات قدیم کے راجہ بین نے آباد کیا۔ جو ایک چکرورتی فرمانروا تھا۔ اس سے منسوب گڑھیوں کی ٹھیکریاں بجنور' مراد آباد' بدایوں اور چمپارن اور شاہ آباد میں پائی گئی ہیں۔ موصوف غالباً راجہ رامچندر والئی ایودھیا کا ہمعصر اور نسلاً آدی واسی تھا۔ چنانچہ آریہ تسلط کے بعد برہمنوں نے اس کے خلاف کافی کچھ لکھا۔ وشنو پران میں آیا ہے کہ وہ برہمنوں کا دشمن تھا۔ لہٰذا رشیوں نے اسے ہلاک کیا۔

یہ امر حیرت افزا و عبرتناک ہے کہ عہد عتیق کے ان آدی واسیوں کی اولاد آج تک "نیچی جاتیوں" میں شامل ہے اور اتر پردیش کے مغربی اضلاع میں اہیر' بانس پھوڑ اور جنگلی قبائل بین بنسی کہلاتے ہیں۔

بجنور کے پچھم میں گنگا بہتی ہے' اتر میں چنڈی کی پہاڑی ہے۔ اس سرسبز علاقے میں جھیلوں اور ندیوں کی فراوانی ہے۔ اتر کی پہاڑیوں میں سے متعدد ندیاں نکلتی ہیں جن میں سے ایک کا نام گاگن اور ایک کا مالن ہے۔

جیا جو مہابھارت کا قدیم ترین اور اصل نام ہے اس میں لکھا ہے کہ رشی وشوامتر اور کنوا رشی (جنہوں نے شکنتلا کی پرورش کی) کے آشرم ہمالیہ کی ترائی میں تھے۔ اسی مالن کے کنارے جہاں آج قصبہ منڈاور ہے کنوا رشی کا آشرم واقع تھا۔

مہابھارت میں لکھا ہے کہ مہا پراکرمی راجہ دشینت ایک روز بغرض شکار بن میں گیا۔ پشو پنچھی گنجار رہے تھے۔ سروروں میں کنول کھلے تھے اور رشیوں کی کٹیوں پر بن لتائیں۔ راجہ چتون کی شوبھا دیکھتا جاتا تھا کہ آگے جا کر ایک آشرم مالنی ندی کے کنارے دکھلائی پڑا۔ چاروں اور گنجان ورکش۔ اگن کنڈ میں اگنی جل رہی۔ طوطے مینا' کبوتر' ہریل' کوکل' چکور کلول کر رہے تھے' ڈالیوں سے پھولوں کی ورشا ہوتی تھی۔ ایک رشی اگن کنڈ میں آہوتی دے رہے تھے۔ اور آگے ایک آشرم رمنیک دیکھا۔ کش کے آسن بچھے' ایک پرم سندر کنیا تپسوی روپ دھارے۔

یہ افلاس زدہ بے رنگ و بو منڈاور اس اسطوری شکنتلا کی جنم بھومی تھی۔ کشان عہد میں منڈ اور نارنجی لباس رائے بھکشوؤں کے "اوم منی پدمے ہوں" سے گونجار۔ میور بھیج میں استوپ تعمیر ہوئے۔ میور بھیج آج تحصیل نجیب آباد کا ایک معمولی قصبہ ہے۔

بسبب نیرنگی زمانہ صدیوں بعد دلی کے اگر والوں سے کہ اس علاقے کے حاکم تھے' سلطان قطب الدین ایبک نے منڈاور بزور شمشیر حاصل کیا اور ایک عالیشان مسجد تعمیر کروائی۔ بجنور کو صوبہ بدایوں میں شامل کیا گیا۔

تورانی دستور کے مطابق ایبک نے اپنے ایک غلام شمس الدین کو کہ وہ اس کا داماد بھی تھا حاکم بدایوں مقرر فرمایا۔ یہ ترک فرمانروا شب و روز دیکھتے تھے کہ حکمران کے بھائی بندوں کا توران و ایران میں ان کے غلامان و اتابیگان کے ہاتھوں کیا ہو رہا ہے مگر ان کی سمجھ میں ہرگز نہ آتا تھا۔

اہل اسلام کے ورود مسعود کے وقت زیادہ تر کٹیہر راجپوت بجنور میں آباد تھے۔ اس جہت سے یہ خطہ کٹیہر کہلایا۔ علاوہ ان کے باہمن بنئے اور بین بنسی یہاں بستے تھے۔ کٹیہر کو دلی اور بدایوں کے صوبجات میں تقسیم کیا گیا۔ راجپوت سردار حکومت دہلی سے ہمیشہ باغی رہے۔

۱۳۰۸ء میں لشکر مغول کے سپہ سالار علی بیگ گورگاں نے بجنور پر دھاوا کیا۔ امروہے کے قریب ملک کافور خواجہ سرا مستعد جنگ ہوئے۔ تاتاریوں نے شکست کھائی۔ لیکن ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور دلی پر قبضہ کر کے سمت بجنور بڑھے۔ سطح گنگا پر دہلوی سپاہ کی کشتیاں نمودار ہوئیں۔ مغول نے سب کو موت کے گھاٹ اتارا۔

ناظرین باتمکین! یہ تاتاری ماسکو پر شبخون مارنے کے ارادے سے نکلے تھے۔ راہ میں امیر نے سوچا اب روس کون جاتا پھرے۔ بجنور آپہنچے۔ عجیب لوگ تھے۔

چنڈی کے جنگلوں پر یلغار کر کے مغلوں نے ملک شیخا اور دوسرے مقامی سرداروں کو تہ تیغ کیا۔ ہردوار تلک کہ اہل ہنود کی نامی زیارت گاہ ہے خون کے دریا بہہ گئے۔ بالآخر جنگلوں کی اس بے سود جنگ سے اکتا کر امیر تیمور صاحبقران واپس چلا گیا۔ ہم یقیناً اس کے اس اقدام پر معترض نہیں۔

ازبسکہ سلاطین دہلی کی سیاست اور جنگیں حد درجہ پیچیدہ تھیں۔ یہ خطہ خصوصاً سنبھل وقتاً فوقتاً میدان کارزار بنا کیا۔ کٹیہر سردار رائے ہرسنگھ لودھیوں کے خلاف مستقل بغاوت کرتا تھا۔ علاقہ کٹیہر' رام گنگا کے اس پار واقع تھا۔ بجنور مرکزی حکومت دہلی سے وابستہ رہا۔ صدر مقام اس صوبہ کا سنبھل تھا۔ سلطان حسین شرقی والئی جونپور نے مبارک خاں حاکم سنبھل کو شکست دے کر صوبہ اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ شاہ حسین کی المناک تباہی و بربادی کے بعد سنبھل ایک بار پھر دہلی سے وابستہ ہو گیا۔

۱۴۹۳ء کا واقعہ ہے کہ کٹیہر راجپوتوں کی بغاوت فرد کرنے کے سلسلے میں سکندر لودھی بہ نفس نفیس سنبھل آیا اور چار سال یہاں مقیم رہ کر علمی مجالس' چوگان اور سیر و شکار سے دل بہلاتا رہا۔

گلشن سلطنت میں باد مخالف چلی' بابر بادشاہ تخت نشین ہوا کہ آل تیمور تھا۔ یہ نئے مغل فرغنہ اور

جیحوں کی تازہ ہوائیں ساتھ لائے۔ انہیں دیکھ کر بلخ و بخارا' ترمذ و بدخشاں' زرفشاں و سیحوں و جوئے مولیاں کی یاد تازہ ہوئی۔ اونچے چرمی جوتے پہنے' کج کلاہ' اولوالعزم' تعلیم یافتہ بانکی قوم تھی۔ لودھیوں نے جابجا افغان چھاؤنیاں قائم کی تھیں۔

افغان مثل غضبناک شیروں کے تھے۔ نصیر الدین ہمایوں بادشاہ ان کا زور کم نہ کر سکا۔ ۱۵۳۹ء میں ہیبت خاں نیازی اور دوسرے افغانوں نے مغل افواج کو دوآبے سے نکال کر شیر خاں سوری پٹھان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔

کٹیہر راجپوت اور افاغنہ' دونوں ایک سے ایک لڑاکے۔ ایک دوسرے سے اور مرکزی حکومت کے حاکموں سے جھڑپیں ہوتیں۔ بعد ازاں ترائی کے جنگلوں میں جا چھپتے۔ جب شیر شاہ بادشاہ ہوا' اس کے فرمان کے بموجب متعدد جنگل کاٹ ڈالے گئے۔ اس عاقل و دانا حکمراں نے انتظام صوبہ کیا۔ بعد اسلام خاں سوری پھر خرابی پیدا ہوئی۔

ہمایوں واپس آیا۔ آل چغتائی کا نیر اعظم اوج شرف پر طالع ہوا۔ ہمایوں نے بجنور مرزا عسکری اور بعد میں خان خاناں بیرم خاں کو عنایت کیا۔

الغ مرزا نے ہمایوں سے بغاوت کی تھی (الغ بزبان ترکی بڑے کو کہتے ہیں۔) فراخدل اکبر بادشاہ نے الغ مرزا کے دونوں فرزندان سکندر و محمود کو بجنور میں جاگیریں عطا کیں۔ جس وقت اکبر پنجاب میں اپنے باغی بھائی مرزا حکیم سے برسرپیکار تھا۔ محمود سلطان کے لڑکوں ابراہیم حسین و محمد حسین نے بجنور میں علم بغاوت بلند کیا۔ مغل صوبیدار حسین خاں ٹکریہ نے دونوں کی بخوبی خبر لی۔ طرفین سے تلوار چلی۔ مفسد صوبہ پنجاب فرار ہوئے۔

خبر پڑی کہ جونپور کے عرب بہادر نے بجنور پر دھاوا کیا' حاکم سنبھل حکیم عین الملک نے فوج ظفر موج روانہ کر کے حملہ آور کا مقابلہ کیا۔ عرب بہادر کمایوں کی پہاڑیوں میں روپوش ہوا۔ بعد ازاں قصبہ نہٹور کے پڑوس میں شیر شاہ سوری کے بسائے ہوئے قصبہ شیرکوٹ کے نزدیک قتل کیا گیا۔

خلاصہ' ان تمام صدیوں میں کہ یورش تاتار و شورش افاغنہ و چغتائیہ سے معمور ہیں۔ سید حسن ترمذی کی اولاد قصبہ نہٹور میں آباد' زمانہ کے مدوجزر دیکھا کی۔ سید حسن پندرھویں صدی میں سنبھل کے منصب سہ ہزاری سے دستبردار ہو کر کنار گاگن حجرے میں معتکف ہوئے تھے۔ اولاد ان کی کاشتکاری اور درس تدریس میں مشغول ہوئی۔ کچے پکے مکانات تعمیر کئے' محلے مسجدیں اور مکتب آباد ہوئے۔ عزیز و اقارب سارے دوآبے میں اور یک جدی سلسلے بہار و بنگال تک پھیلے تھے۔ تمام خانوادے تاجک' فارسی اور ترکی بولنا بھولے۔ اب برج اور پنجابی اور جاٹو اور اودھی اور پوربی اور جانے کیا کیا الم غلم ترکی فارسی عربی کے ساتھ ملا جلا کر بولتے ہیں۔ زبان کیا ہے چوں چوں کا مربہ کہئے۔

سموری ٹوپیاں' اونی فرغل اور قبائیں بقچوں میں رکھے رکھے کیڑوں کی نذر ہوئیں۔ جو رشتہ دار صاحب ثروت ہیں سو خلعتیں زیب تن کرتے ہیں۔ نادار موٹا جھوٹا گزی گاڑھا پہن کر اللہ کا شکر ادا کرتے

ہیں۔ خاندان بہرحال مثل اک محفوظ قلعے کے ہے۔ سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ رات کو بھوکا کوئی نہیں سوتا۔

بیبیاں جو ترکمانستان میں شہسواری کرتی تھیں اب اس قلعہ میں محصور ہوئیں کہ اجنبی ملک میں چار سو خطرہ ہی خطرہ تھا۔ کلاہ ترک کی، ململ کے دوپٹے اوڑھے۔ ہندوستاروں سے ہندوستانی زیورات گڑھوائے، اپنے آذربائیجانی آویزے ان طباع کاریگروں سے نقل کروائے کہ اب "جھمکے" کہلاتے ہیں۔

مرد جو اہل سیف ہیں راجپوت وضع کی پگڑی باندھتے ہیں۔

اہل قلم عمامے زیب فرق کرتے ہیں کہ شملہ ان کا بقدر علم رکھا جاتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں امرائے تاتار و خوانین کا شغرو سیاہ مغول کی دیکھا دیکھی شرفائے دلی و نواح پایہ تخت، چینی وضع کی چوٹیاں گوندھنے لگے تھے۔ اب عہد مغلیہ میں ترکستان و روم و ایران کے نئے نئے رواج مقبول خواص و عوام ہیں۔

عہد علاء والدین خلجی سے رسوم عروسی میں اہل ہنود کے طور طریقوں کی نقل کی جا رہی ہے۔ مولویوں نے بہتیرا منع کیا کہ بدعت ہے۔ مگر بیبیاں نہیں مانتیں۔ ٹونے ٹوٹکے، نیک و بد شگون، شب برات کا حلوہ، فاتحہ، آتش بازی کہ سلطان فیروز شاہ کے دور سے مروج ہوئی۔ نجومی، گھڑیال، رمال، نذر و نیاز و چراغی غرضیکہ شہر ترمذ کا کوئی باقیماندہ رشتے دار اگر نہٹور آ نکلے تو ریش پر ہاتھ پھیر کر کہے۔ بابا! نیاز تیغ سدو کیست؟

نومسلم راجپوت خاندانی بھاٹ شادیوں پر شجرہ نسب سناتا ہے۔

عہد اکبری میں انتظام صوبجات و اضلاع از سر نو کیا گیا۔ بجنور پندرہ پرگنوں میں تقسیم ہوا۔ سادات ترمذی کو جاگیر عطا ہوئی۔

ہندو زمیندار چودھری کہلائے۔

جلال الدین محمد اکبر کا دور خوشحالی سے معمور تھا۔ شکر اور گیہوں کی کاشت سہ چند ہوئی۔ اہل حرفہ کا کاروبار بڑھا۔ نہٹور خود کفیل قصبہ تھا۔ دارالسلطنت سے فاصلے کی وجہ سے قصبہ جات سیاسی انتشار سے نسبتاً محفوظ تھے۔ اس جہت سے دوآبہ، بہار، بنگال، پنجاب، سندھ، دکن، گجرات وغیرہ کے قصبے اپنے مدارس و خانقاہوں کے لئے مشہور ہوئے۔ مردم خیز کہلائے۔

اہالیان نہٹور اپنے قصبہ کو چھوٹا دہلی کہتے تھے۔ آئین اکبری میں علامہ ابوالفضل فرماتے ہیں۔ کہ علاقہ کے جاگیردار جنگ کے مواقع پر سپہ سالار عساکر مغلیہ کو چھ سو اسی شہسوار اور پانچ ہزار چار سو پیادے فراہم کرتے ہیں۔ جزاک اللہ۔

سادات ترمذی "دانشمندان[6] نہٹور" کہلاتے تھے۔ سید حسن ترمذی کے آباء واجداد میں سید اشرف "گنج بخش" کے لقب سے مشہور تھے۔ صاحبزادے ان کے سید علی "گھوڑا بخش"۔ وجہ یہ کہ سفر پہ جاتے تھے۔ راہ میں گدڑی پوش مسافر ملا کہ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا اور پیدل جاتا تھا۔ اس نے پوشاک طلب

کی۔ جامہ دیا۔ مزید فرمائش پر بٹوہ اشرفیوں کا حوالے کیا، اسلحہ جات بخشے، اس پر بھی وہ طالب رہا۔ بالآخر اپنا سمند شب رنگ عنایت کیا اور پاپیادہ نہٹور واپس آئے۔

ان کے اخلاف سید محمد علی نقی، عبدالمطلب، بہادر علی قادر علی، نادر علی، انور علی، منور علی اور حضرت آخوند امام بخش چنچھواں داڑھیوں، پٹکوں، گھیردار جاموں و دیگر پارچہ ہائے نفیس و طرحدار میں ملبوس اس نوع کے یک رخی کردار ہیں جو مغل تصاویر میں بادشاہ کے سامنے دورویہ ڈھال تلوار لگائے دوزانو بیٹھے نظر آتے ہیں، سبحان اللہ! تہذیب مغلیہ کی ہمہ گیری کا کیا عالم تھا کہ ایرانی، تورانی، ازبک، ترکمان، خوارزمی، راجپوت، مرہٹے، سکھ، افغان اور سادات عظام سب شکل و صورت، سج دھج، وضع قطع اور ملبوسات سے قطعاً یکساں معلوم ہوتے ہیں۔

صد حیف کہ چرخ کج رفتار کو یہ دور پر بہار ہرگز نہ بھایا اور ادبار و خانہ ویرانی نے اہل ہند۔۔۔

۴۔ وقائع عالمگیری

حضرات دور تیموریہ عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے آیئے عصا ٹیکے کمر خمیدہ ایک عالمگیر شاہی امیر سے ملاقات کرتے چلیں پھر نہ محی الدین اورنگ زیب ہوں گے نہ ان کے اراکین سلطنت، محض افسانے باقی رہ جائیں گے۔

شاہان دہلی بیوقوف ہرگز نہ تھے۔ سادات کی قدر کرتے تھے مگر ان کی بستیاں ہمیشہ دارالسلطنت سے ہو سکے سے زیادہ فاصلے پر آباد کرواتے تھے۔ مبادا یہ حضرات جو صدیوں سے خود کو حکومت کا حقدار سمجھتے آئے ہیں کہیں موقع پاتے ہی تاج و تخت پر قابض ہو جائیں۔ چنانچہ دلی کے قرب وجوار میں سیدوں کے قصبے ناپید ہیں۔ (جانسٹھ، ضلع مظفر نگر، پایہ تخت کے نزدیک ہے۔ ذرا توقف کیجئے اور دیکھیے کہ دو بھائی بہت جلد اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی کیا آفت جوتنے والے ہیں۔)

البتہ دلی کے قریبی اضلاع خصوصاً سرکار سنبھل کے متعدد سیدوں نے حکومت میں کافی رسوخ حاصل کیا۔

اٹھارویں صدی تک نہٹور ایک مثالی خود کفیل قصبہ تھا۔ چند ہزار نفوس کی صاف ستھری آبادی کے چھوٹے چھوٹے محلے محلّہ قاضیان میں میر حسن ترمذی کے ہمعصر قاضی چمن کی اولاد رہتی تھی۔[7]

میر حسن ترمذی کے مکان کے سامنے ان کے وفادار تیرگر کی اولاد کے گھر تھے۔ (محلّہ تیرگراں کے باسی اب آتشبازی کا سامان بناتے ہیں) آس پاس محلّہ حکیماں، شیخاں، خواجگان، میاں صاحبان وغیرہ آباد تھے۔ ان کے بعد محلّہ کلالاں، انصاریاں، ماہی گیراں (جو بستی کے دوسرے تالاب کے اس پار جھونپڑوں میں رہتے تھے) ہندو آبادی علیحدہ نہیں تھی۔ مسلمان محلوں سے ملحق محلّہ بھوجی کھاواں[8] غالباً ویجی ٹیرین جینوں کی آبادی تھی۔ پھر محلّہ کائستھاں، محلّہ بقالاں، محلّہ چودھریاں۔ ہر مسلمان محلے کی اپنی مسجد تھی، ہندو محلوں میں مہادیو جی اور ہنومان جی کے مندر تھے۔ عہد مغلیہ کی ہندو مسلم مفاہمت کی ایک روشن مثال۔[9]

فیوڈل نظام اور ہندو کاسٹ سسٹم کے زیر اثر جولاہوں اور کلالوں کو "نچلا طبقہ" سمجھا جاتا تھا۔ کلالوں کا قول تھا کہ ان کے جد اعلیٰ میر کلال امیر تیمور کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ امیر تیمور کے لشکر کے بچے کھچے لوگ یعنی قوم مغول کے افراد بھی بجنور خصوصا قصبہ نہٹور میں موجود تھے۔ انصاریان' شیخان و قریشی صاحبان' نورباف اور قصائی اکثر عرب نژاد تھے۔ اس معاشرے میں حکمران طبقے کا ہر فرد خود کو ولایتی گردانتا تھا۔ اسی طرح انگریزی دور میں وہ ہندوستانی جنہوں نے حاکموں کا مذہب اختیار کر لیا تھا عموما اپنا رشتہ انگلستان سے جوڑتے تھے۔ ہمارے معاشرے کے انصاری قریشی صاحبان وغیرہ بھی گویا اپنے وقت کے اینگلو انڈین تھے۔ خالص ولایتی آبادی سادات' مغلوں اور افغانوں پر مشتمل تھی۔ 10

وسط سترھویں صدی کا قصہ ہے کہ محلّہ سادات کی خوش منظر جھیل جو جوڑی کہلاتی ہے' اس کے کنارے میر حسن ترمذی کے پڑپوتے سید محمد تقی کا مکان تھا' اس کے عقب میں بانس کے گھنے جھرمٹ' جہاں سید محمد تقی نے مسافروں کے لئے سرائے تعمیر کروائی تھی۔ سرائے کا رخ بیرونی شاہراہ کی جانب تھا جو سیدھی دلی جاتی تھی۔ جھیل بھی سید محمد تقی کی ملکیت تھی۔

سید محمد تقی کے بیٹے کا نام سید عبدالمطلب تھا۔ سید عبدالمطلب کے دو لڑکے تھے۔ سید بہادر علی اور سید سعداللہ۔ موخرالذکر کہ ایک نہایت ذہین اور مہم جو نوجوان تھے۔ دونوں لڑکے میر حسن ترمذی کے قائم کردہ مدرسے میں پڑھ رہے تھے۔ انہی دنوں قصبے کے چند زور آور کلال سید محمد تقی کی جھیل پر قابض ہو گئے۔ اور اس کے کنارے اینٹوں کا بھٹہ قائم کر لیا۔

"فتنہ کلالاں" کی وجہ سے سید عبدالمطلب کو بہت پریشان ہونا پڑا۔ سرکار سنبھل کے قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش کیا۔ جب وہاں خاطر خواہ فیصلہ نہ ہوا تو فرزند اصغر سید سعداللہ کو مقدمے کے کاغذات دے کر دارالخلافہ روانہ کیا۔

چند سال بعد مقدمہ کا فیصلہ سید عبدالمطلب کے حق میں ہوا۔

فرمان شاہی
ظل للہ

.... تالاب و زمین حویلی متصل سرائے سیادت و مغفرت ماب سید محمد تقی ..... تالاب عظام واقعہ است۔ در آں تالاب کلالاں پڑادہ ہای پڑایند۔ بعد از مدت چند ایں تالاب مذکور بمقدار یک بیگہ پختہ از خاکستر پر شدہ تودہ ہائے کلاں .... در ملکیت ہیچ کس نبودہ لہٰذا بتصدق فرق مبارک بندگان حضرت بادشاہ نواب صاحب قبلہ....... بہ موجب استدعائے سیادت مآب سید عبدالمطلب ولد سید محمد تقی مذکور بجہت تعمیر حویلی مقرر کردہ بیہودہ دادہ شد کہ بخاطر جمع تودہ ہائے مذکور را از نشیب و فراز برابر ساختہ حویلی تعمیر نمودہ مسکن خود سازد و ہمیشہ در دعاگوئے ابدمدت استعمال ....

تحریر فی التاریخ ۹ محرم الحرام ۱۰۹۱ھ
بموجب فرمان شاہی برائے آگاہی.....

مہر بھگوان جیت مان سنگھ

اس کے بعد ہماری اچانک ملاقات سید سعداللہ عامل مالوہ سے ہوتی ہے کہ مع بی بی و فرزند مانڈو میں مقیم مالوہ اور بندیل کھنڈ کی بغاوتیں فرو کرنے کے انتظامات میں مصروف ہیں۔

سید سعداللہ کی بی بی نے مالوے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایک خورد سال فرزند چھوڑا کہ نام اس کا سید شریف علی تھا۔ بعد کچھ عرصے کے سید موصوف نے دوسری شادی کی۔ گوالیار میں تعینات تھے۔ اسیٔ زمانے میں وہاں ایک بزرگ سید امام علی شاہ باقری بغداد سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی سیدہ زہرا بانو سے بہ اجازت اورنگ زیب عالمگیر عقد کیا۔ جب فرزند تولد ہوا حسب قاعدہ مروجہ ولادت کی اطلاع پادشاہ کے حضور میں بھیجی۔ پادشاہ نے نام اسداللہ تجویز کیا۔ "نامش اسداللہ باید نہاد چرا کہ پدرش سعداللہ ہست" 11

۱۶۸۱ء میں جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مع خاندان امرائے دربار و افواج دکن کی مہم پر روانہ ہوا سید سعداللہ ہمراہ تھے۔ "سید سعداللہ در عہد سلطنت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نوراللہ مرقدہ'..... ملک دکن ہمراہ افواج تشریف بردہ در فتوحات متواتر حصہ کثیر فراہم آوردہ بہ"۔

۱۷۰۷ء ۳ مارچ کی صبح اورنگ زیب نے احمد نگر میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ شاہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ سید سعداللہ نے شہزادہ کام بخش کے تحت کام کیا تھا۔ وفات اورنگ زیب کا صدمہ کم جان لیوا تھا۔

کام بخش کی المناک موت نے وفادار نواب کو مزید دل گرفتہ کیا۔ سلطنت میں انتشار شدید پھیل چکا تھا۔ سید سعداللہ دلی واپس آگئے۔ بعد کچھ عرصے کے وطن مراجعت کی۔

"سید سعداللہ بیشتر سامان ریاست فراہم آوردہ مثل خرید جائیداد و تعمیرات پختہ چاہ.......... ممکن بود مہیا کردند بر کنارہ تالاب کہ ملکیت شاں بود چاہ و مسجد تعمیر بر کنا..............."۔

بعد وفات اورنگ زیب شہزادہ معظم بہادر شاہ اول اور شاہ عالم اول کے القاب کے ساتھ ۱۷۰۷ء میں تخت نشین ہوا۔ سید سعداللہ کے فرزند اکبر مولانا شریف علی اس کے عہد میں صوبیدار تھے۔ بنارس اور لکھنؤ میں تعینات رہے۔

بہادر شاہ اول نے ۱۷۱۲ء میں وفات پائی۔ اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی۔ سب مارے گئے پوتا فرخ سیر اورنگ نشین ہوا۔ دلی میں اب سادات بارہہ کا تسلط تام کا تھا۔

نواب سید سعداللہ نہٹور کے محل میں مقیم یاد الٰہی میں دن گذارا کئے۔ اکثر اپنے بھائی سید بہادر علی' بھتیجوں اور دوسرے عزیزوں کو دکن کی مہم کے قصے سنایا کرتے جو ہر ریٹائرڈ فوجی کی عادت ہے۔ عالمگیر کا تذکرہ کرتے تو طویل ریش آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ آہ سرد بھر کے فرماتے .... زندہ پیر جنتی تھا۔ مرد

مومن تھا"۔

کبھی کبھار خاص درباروں اور اہم تقریبات کے مواقع پر توشے سے اپنا درباری لباس اور خلعت نکال کر زیب تن کرتے' تلوار مرصع سجا کر دلی ہو آتے۔ وہاں اب آئے دن خون خرابہ ہو رہا تھا۔ سید موصوف ضعیف العمر عالمگیری ساتھیوں سے مل کر حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے۔ ان سب کی آنکھوں کے سامنے دولت چغتائیہ کے تار و پود بکھر رہے تھے۔ مگر یہ بوڑھے شیر بے بس تھے۔

فرخ سیر نے سید سعداللہ کو پرانی خدمات کے صلے میں مزید اراضی عطا کیں۔

فرمان شاہی

عاملان حال و استقبال پرگنہ نہٹور سرکار سنبھل مضاف صوبہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد محال جاگیر بدانند..... جہت احداث باغیچہ بسیادت و رفعت پناہ سید سعد اللہ متوطن نہٹور پرگنہ مذکور مرحمت نمودہ شد۔

۵ جلوس والا

مہر بیرم خاں

بیرم خاں فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی

سید سعداللہ نے مسافروں کے آرام کے لئے نہٹور میں باغات انبہ لگوائے جو آج تک ان کی اولاد کی ملکیت ہیں۔

محضر نامہ سید سعداللہ

..... اراضی در سواد قصبہ پرگنہ نہٹور بالائے گاگن سر راہ از مدتی حارج ...... افتادہ بود ..... جہت آرام خلق اللہ در آنجا باغیچہ برپا ساختہ ...... کہ سافران راہ و فقرائے باب اللہ میوہ و سایہ آں ....

مہر سید سعداللہ

مہر کردہ محمد فاضل ابن قاضی نور محمد خادم شرع محمدؐ

قسمت نامہ بمہر سیادت و رفعت پناہ میر سعداللہ

اقرار میکند معتبر و صحیح و شرعی سید سعداللہ ولد سید عبدالمطلب بن سید محمد تقی متوطن قصبہ پرگنہ نہٹور سرکار سنبھل بہ این وجہ کہ چوں ...... چہار پسردارم سید شریف علی پسر کلاں از یک بطن ..... درمیان خودہا قسمت کردہ گرفتند بر حیات مستعار دنیائے ناپائیدار بنائے اعتبار نیست .... حیات ..... حضور برادران و اقرباء و جماعۃ مسلمین بدست خود نوشتہ دادم کہ .... در فرزندان من خصومت و فتنہ نشود .... بنا بر آں

این چند کلمہ بطریق قسمت نامہ نوشتہ دادہ ام کہ ثانی الحجت گردد۔ مرقوم صفر.... وفات اورنگ زیب .... سید سعداللہ از حضور بادشاہ غازی سلطان محمد فرخ سیر نور اللہ ......

بوقت رحلت قسمت نامہ نواب سعد اللہ نے بمہر قاضی ابراہیم حسین فرزند اکبر مولوی شریف علی کی تحویل میں دیا۔ اس کے مطابق مولوی شریف علی کو دو حصے اور دوسری بی بی سید زہرا بانو باقری کے لڑکوں کو ایک ایک حصہ جائیداد کا ترکہ میں ملا۔ نہٹور سے ایک میل کے فاصلے پر اپنی جاگیر سکندر پور میں سپرد خاک کئے گئے۔ مدفن آج تک "بڑے سید کا مزار" کہلاتا ہے۔

مولانا شریف علی صوبیدار ابن سید سعد اللہ کا انتقال بھی نہٹور میں ہوا۔ قبر سکندر پور میں موجود ہے۔ مولینا کے چھوٹے سوتیلے بھائی سید اسداللہ وغیرہ بھی حکومت دہلی سے وابستہ رہے۔ ان کے متعلق سرکاری دستاویزیں بے حد کرم خوردہ ہیں یا روشنائی بہت مدھم پڑ چکی ہے۔ لہٰذا ان کے حالات تاریکی میں ہیں۔ مثلاً۔

سید اسداللہ و مسیح الحسن و محمد باقر پسران سید سعداللہ بن سید عبدالمطلب متوطن قصبہ نہٹور بکار ...... دارالخلافہ شاہجہان آباد...... ملکات و حویلیات و باغات واقع [illegible] ....

ربیع الاول ۱۱۳۶ھ ہجری مقدس — مہر خادم رسول الثقلین

قاضی ابراہیم حسین

"........ سید سعیداللہ بن سید اسداللہ ساکن قصبہ نہٹور بکار ... مضاف مستقرالخلافت اکبر آباد .... قطعہ زمین

۱۲۳۳ھ — مہر خادم شرع جمیل رسول اللہ

وغیرہ وغیرہ

قاضی پرگنہ نہٹور

القصہ عزیزو! اب وقت سحر' وقت مناجات ہے۔ دنیا آنی جانی ہے۔ یہ کاغذات بستے میں لپیٹ کر واپس طاق میں رکھ دو۔ اب طغرہ شاہی اور مہر قاضی خادم شرع جمیل رسول الثقلین کے بجائے اشتام پیپر کا زمانہ آیا چاہتا ہے جو دور کلکتے کے چھاپے خانوں میں چھپنے شروع ہو گئے ہیں۔

شمع بڑھاؤ۔ وضو کرو۔ تالاب کے کنارے حسین و جمیل مسجد میں نمازی جمع ہو رہے ہیں۔ دربار عظام کے پھاٹک سے نکل کر محلہ دربار اور حویلی اندر کے بوڑھے بچے جوان شبنم آلود گھاس پر چلتے مسجد کی سمت آ رہے ہیں۔ چند سال قبل نواب سید سعداللہ جریب ٹیکتے جھکے جھکے سے' سفید پوشاک میں ملبوس' بگلا ایسی سفید داڑھی آہستہ آہستہ چلتے مسجد پہنچتے۔ بعد نماز کنول کے پھولوں سے بھری وسیع جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر کبھی کبھی دوسرے ساحل پر نظر ڈالتے جہاں بانس کے لہر آلود جھرمٹ کے ادھر شاہراہ بل کھاتی دلی جاتی تھی۔ مدتیں گذریں اس سڑک پر سے گھوڑا دوڑاتے' دھول اڑاتے جوشیلے نوجوان سید سعداللہ اپنے والد کی جائیداد اور اس جھیل کا مقدمہ لے کر شاہجہاں آباد گئے تھے۔

سنو! اس شاہراہ پر پھر غبار اٹھ رہا ہے۔ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آتی ہے۔ گاگن کے اس پار سرخ لبادے اور چھجے دار ٹوپیاں پہنے فرنگی سپاہی بگل بجا رہے ہیں۔ یہ فرنگی کا فوجی بگل ہے یا صور اسرافیل؟

۵۔ اٹھارہویں صدی

قیامت کی گھڑی آن پہنچی۔ آفتاب سوا نیزے پر آیا چاہتا ہے۔ اب کہیں امن نہیں۔ فرنگی سپاہی بندوق کے توڑے چڑھائے چوطرفہ دندنا رہے ہیں۔ بے گناہ رعایا پر ہر طرح آفت ہے۔ صاحبان اولوالعزم مثل باد صرصر کے کشور ہند پر چھا گئے۔ امرائے ہند یا لہو و لعب میں مبتلا یا ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں۔

حافظ صاحب خلد آشیانی کے دادا داؤد خاں کہ علاقہ ان کا اولاً بریلی میں تھا افاغنہ کے پیشوا بنے۔ بیٹے علی محمد خاں نے سید برادران (یادش بخیر) اور سادات بارہہ کا قلع قمع کر کے دربار مغلیہ سے نواب کا خطاب حاصل کیا۔ بعد ازاں حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ نواب کو دو سال دلی میں قید رہنا پڑا۔ بارے احمد شاہ ابدالی کے حملے سے فائدہ اٹھا کر پایہ تخت سے فرار ہوئے۔ بجنور پہنچ کر نہٹور کے پڑوس میں دھام پور اور شیرکوٹ پر حملہ کیا۔ یہ قصبے اب تک نواب علی محمد کے پرانے دشمن صفدر جنگ نواب وزیر اودھ کی ملکیت تھے۔

روہیلوں کو کچلنے کے لئے صفدر جنگ نے مرہٹوں سے سازباز کی اور پٹھانوں کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ معاہدے کے بعد نواب نجیب خاں نے کہ نواب علی محمد کے جرنیل تھے دربار مغلیہ سے ۱۷۵۹ء میں بخشی سلطنت امیر الامراء نجیب الدولہ کا خطاب حاصل کیا اور نہٹور سے کچھ فاصلے پر نجیب آباد بسایا.....

۱۷۶۷ء میں گنگا پار سے سکھ آن پہنچے۔ نہٹور تک پہنچ کر لوٹ مار کی۔ سات برس قبل روہیل کھنڈ میں شدید قحط پڑا تھا۔ مرہٹہ گردی سے خائف و ترساں عوام اب فاقے بھی کر رہے تھے۔ ۱۷۷۱ء میں نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد مرہٹوں نے نجیب آباد پر یلغار کی۔ نواب کا مقبرہ گرایا۔ ۱۷۷۴ء میں نواب' وارن ہیسٹنگز بہادر کی افواج نے نواب اودھ کی طرف سے روہیلوں پر حملہ کر کے حافظ رحمت خاں کو شہید کیا۔ دوسرے ممالک افاغنہ سمیت بجنور سلطنت اودھ میں شامل کیا گیا۔

۱۸۰۱ء میں نواب شجاع الدولہ نے سارا روہیلکھنڈ ٹھاکے کمپنی بہادر کو بخش دیا۔ بجنور' مراد آباد' بریلی ایک کمشنری بنائے گئے۔ ۱۸۰۳ء میں بجنور پھر خشک سالی کا شکار ہوا۔ گیہوں کے لئے فساد بپا ہوئے۔ بیروزگاری عام ہوئی۔

سردار امیر خاں جو سنبھل کے نزدیک پیدا ہوئے تھے ہولکر کے جرنیل تھے۔ ۱۸۰۵ء میں انھوں نے انگریزی علاقے پر حملہ کیا۔ مراد آباد میں بصد کروفر داخل ہوئے اور شیرکوٹ اور دھام پور کی سمت بڑھے۔ لیکن لشکر ان کا بہت جلد بکھر گیا۔ اینگلو انڈین کرنل جیمز اسکنر نے جو سکندر صاحب کہلاتا تھا امیر خاں کا تعاقب کیا۔ فوجی سرداروں کی دنیا عجیب تھی یا تختہ یا تخت۔ لیکن آج ہر جگہ فرنگی ان پر غالب آ رہا تھا۔ یہ

فتوحات صاحبان عالیشان کے اقبال کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھیں۔ مرضی مولا یہی ہے کہ ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی پادشاہ غازی ملک فرنگستان کے پادشاہ جارج سوئم کے مطیع ہوں۔

فرنگی اب ایک عرصے سے روہیلکھنڈ میں براج رہا ہے۔ ہمیں تاتاریوں اور مغول اور افاغنہ اور ترکوں سے سابقہ پڑا۔ جنگ و جدال رہا۔ مگر اپنے ہم مذہب تھے۔ راجپوتوں سے واسطہ ہے کہ اپنے ہم وطن بھائی اور ہمسائے ہیں۔ امرائے ہنود فخریہ اپنے ناموں کے ساتھ شاہجہانی' عالمگیری' محمد شاہی لکھتے تھے۔ یہ گورا البتہ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا جانئے اس کے پاس کیا اسم اعظم ہے۔ چہار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ سنتے ہیں کہ خلیفۃ الاسلام سلطان روم اس کی ریشہ دوانیوں سے عاجز ہیں۔ شاہان قاچار کو اس نے نالاں کر رکھا ہے۔ زار روس اس کا نام سن کر تھر تھر کانپتا ہے۔

اس کے صاحب کمال ہونے میں ہمیں اس وقت شک نہ رہا جب اس نے بجنور ایسے دقیانوسی شہر کا نقشہ بدل دیا۔ کوٹھیاں' کمپنی باغ' ہسپتال' بنگلے۔ کہتے ہیں کہ گورا تاجر اول اول بنگال میں وارد ہوا اور بنگالی وضع کے پھونس کی چھتوں والے گھر اپنی رہائش کے لئے تعمیر کروائے جو بنگلہ کہلانے لگے۔ اب بجنور سول لائنز میں کلکٹر' جج' انجینئر' پادری' سول سرجن' کپتان پولس سب اپنے اپنے شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں۔

سینکڑوں حلال خور اور بین بنسی کرشان ہو چکا۔

صاحبان عالیشان کی ہر ادا نرالی ہے۔ مختصر اسلحہ جات مثلاً چاقو اور ایک نوع کے چہار شاخے کے ذریعہ لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھتے ہیں۔ ام الخبائث کے از حد شوقین۔ علاوہ ازیں ایک جھاڑی کہ آسام و بنگالہ کی پہاڑیوں پر اگتی ہے اس کی پتیاں ابال کر پیتے ہیں۔ نام اس مشروب کا چاء ہے کہ چینی لفظ ہے۔ ایک روز کلکٹر صاحب نے ہمیں بھی پیش کی۔ ہم نے پینے میں ذرا تامل کیا' کیونکہ ان مشرکین نصاریٰ کے ہاں لحم خنزیر پکتا ہے۔ لیکن ان کے بیرے نے جو مسلمان ہے چپکے سے ہمارے کان میں کہا کہ پیالیاں پاک و صاف ہیں۔

القصہ دودھ اور شکر ملا کر ہم نے چاء کا گھونٹ بھراء ذائقہ کڑوا معلوم ہوا۔ مگر مجبوراً پیالی ختم کرنی پڑی۔

صاحبان عالیشان پہلے سرخ لبادے کہ "کوٹ" کہلاتے ہیں پہنتے تھے۔ تنگ پائجامے' سفید جھالر والی آستینیں' ساٹن کے چوغے اور سر پر سفید بالوں کی ٹوپی جسے وگ بولتے ہیں۔ اب کوٹ اور پتلون زیب تن کرتے ہیں۔ بے روزگار مسلمانوں میں سے متعدد نے سول لائنز کے درزی' بیرے' خانساماں' خدمت گار کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

صاحبان پہلے ہندوستانی پوشاک بھی پہنتے تھے۔ اردو' فارسی بخوبی جانتے ہیں۔ ہندی عورات سے شادیاں کیں۔ اکثر کوٹھیوں میں آج بھی ایک "بی بی خانہ" احاطے میں ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

میمیں ان کی تابل دیدہیں۔ مثل حوران کوہ قاف۔ خلاصہ عجیب و غریب محیر العقول قوم ہے۔

حصول دیوانی کے بعد سے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ کاریگر تباہ ہو رہے ہیں۔ ریاستوں کے خاتمے کے بعد بے کاری عام ہوئی۔ فن سپہ گری مسلم شرفاء کا پیشہ تھا۔ اب امراء فاقے کر رہے ہیں' سپاہی کون رکھے۔

دلی والے مرزا سودا کیا صحیح فرما گئے ہیں کہ اس دور میں امیر' دولت مند سپاہی نوکر رکھتے تھے۔ سو آمد ان کی جاگیر سے بند ہو چکی۔ ملک کو مدتوں سے سرکشوں نے پسند کیا ہے۔ جو ایک شخص بائیس صوبوں کا خاوند تھا۔ اس کے تصرف میں اب فوجدارنی کول بھی باقی نہیں۔ امیر جو دانا ہیں انھوں زمانہ کا حال دیکھ کر خانہ نشیں ہوئے۔ سوزنی بچھی ہے۔ خوجہ کھڑا رومال جھلے ہے۔ حضور دو ایک ندیم اہل کمال بیٹھے ہیں۔ دھری ہے سامنے ایک پیک دان ایک تمبول۔

یہ تو حویلی کے اندر کا منظر ہے۔ باہر یہ حال کہ سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری' سوال دستخطی پھاڑ کر پنساری کسی کو آنولہ کسی کو کنول باندھ دیتا ہے۔ سلاطینوں نے تو بے دھاڑ چار رکھی ہے۔ جو شام کو بہر نماز مسجد میں جایئے تو وہاں چراغ نہیں' بجز چراغ غول۔ ان مکانوں میں الاغ رینگتے ہیں جہاں بہار میں ہنڈول سنا جاتا تھا۔

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم

آگرہ بازار میں نظیر دیکھتے ہیں کہ دوکاندار قطار اندر قطار قیدیوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ چھتیس پیشے والوں کے کاروبار بند ہیں۔ گرد و پیش میں قزاق لوٹ رہے ہیں۔ گھاٹ وار پار بند ہیں۔ صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں۔ میناکار مرتے ہیں' مصور کباب ہو چکے' باہمن مندروں کے بیچ سر پٹکتے ہیں۔ علم والے مدرسوں کے بیچ عاجز۔

کھویا رواس مکان میں کیسی ہوا چلی۔

۶۔ میرخانی گردی

نہٹور میں میر امام بخش ابن میر منور علی ترمذی ایک خستہ حال جاگیردار عزت سادات سنبھالے قصبے کے مشہور مدرسے میں کہ سید حسن ترمذی کے زمانے سے قائم ہے' لڑکے پڑھاتے ہیں اور چند ٹکے پیدا کرتے ہیں۔ آخوند جی کہلاتے ہیں۔ ذات ان کی سراپا خیر و برکت ہے۔ پابند احکام شرعی و صوم و صلوۃ بطریق حنفی' حالت موجودہ میں بھی صابر و شاکر' اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ حرف شکایت دنیا سپاسی زبان پر نہیں لاتے اور کسی نے ان کے چہرے پر ناشکری و تنگ دستی و قلت معاش کے آثار نہ دیکھے۔[12]

طوائف الملوکی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ ایک روز خبر پڑی کہ امیر خاں نے حملہ کر دیا۔ ۱۸۰۵ء کی بات ہے کہ "امیر خاں غارت گر برائے غارت گری و کشت و خون خلق اللہ کمربستہ با جماعت کثیر غارت گراں" نہٹور پہنچا۔ یک شبانہ و روز قصبے میں قیام کیا۔ یہ واقعہ محمد[13] خانی اور میرخانی گردی کہلایا۔ اہل قصبہ بخوف قتل و خون جا بجا منتشر ہوئے۔ کھیتوں' کھلیانوں اور جنگلوں میں جا چھپے۔ بہت سوں نے پرانے

کھنڈروں اور مقبروں میں پناہ لی۔

جس وقت امیر خاں کے پٹھان سپاہی لوٹ مار مچاتے محلہ سادات کی طرف بڑھ رہے تھے آخوند امام بخش نے اپنی بی بی سید آمنہ خاتون بنت سید مصاحب علی اور تینوں بچوں' بنی النساء' اللہ بندی اور علی بخش کو ساتھ لیا اور افتاں و خیزاں چھپتے چھپاتے مقبرہ مرزا مبارز اللہ خاں میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔

رات ہوئی' جنگل میں سیار بولے۔ مقبرہ میں بہت سے پناہ گزین کنبے جمع تھے۔ کسی بھی لمحے امیر خاں یا اس کے سپاہی آکر دھاوا بول سکتے تھے۔ چند بیبیاں زیوروں کی پوٹلیاں باندھ کر ساتھ لے آئی تھیں۔ صرف ایک مشعل روشن تھی جس کی روشنی میں اندھیرے گنبد کے اندر سے چمگادڑیں نکل کر اڑیں۔ دور سے بندوقوں کی آواز آئی۔ بزرگوں کو ابدالی کا زمانہ خوب یاد تھا۔ سنا تھا امیر خاں انگریز سے لڑتا ہے۔ انگریز سے سب لڑ رہے تھے۔ اس کا فائدہ کیا تھا۔ سارے ہندوستانی ایک دوسرے کا خون بہانے میں مصروف تھے۔ بی بی کی جھاڑو پھرے ان کم بختوں پر۔

اسی رات نیم تاریک مقبرے میں سیدہ آمنہ خاتون کے ہاں لڑکا تولد ہوا۔

آخوند امام بخش کے اس لڑکے کا نام بندے علی رکھا گیا۔ مکتب کے بعد آخوند جی نے لڑکے کو اعلی تعلیم کے لئے دلی روانہ کیا۔ کپڑوں کا بقچہ اور بوسیدہ کتابیں اور چند سکہ چہرہ شاہی کیسے میں رکھ کر میاں بندے علی سلمہ' بیل گاڑی پر دارالسلطنت روانہ ہوئے۔ دلی پہنچ کر مدرسہ فتح پوری میں داخل ہوئے۔ دوسرے غریب طلبہ کی مانند مسجد کے ایک حجرے میں مقیم درس نظامیہ کی تحصیل میں جٹ گئے۔

۱۸۰۳ء میں دلی پر باضابطہ برطانوی قبضہ ہو چکا تھا۔ نابینا' دکھیارا بادشاہ لال قلعہ میں پنشن خوار تھا۔ تین سال بعد راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کو لارڈ ہیسٹنگز کے حکم سے وہ سارے شاہی قاعدے اور رسومات ترک کرنی پڑیں جن سے کمپنی کے مقابلے میں مغلیہ برتری ظاہر ہوتی۔

میر بندے علی بھی کبھار جمنا پر جا کر بادشاہ کو دیکھ آتے جو بے چارہ پابندی سے جھروکہ درشن دیتا تھا۔ دلی کی شان و شوکت تھوڑی سی باقی رہ گئی۔ روایتی شاہجہاں آباد ابھی زندہ تھا۔ ایک مفلوک الحال قصباتی زمیندار کے سیدھے سادے لڑکے میر بندے علی پر تخت کی رنگینیوں اور عیش و عشرت سے بالکل ناواقف رہے۔ علاوہ ازیں مدرسے میں پڑھنے والے لڑکے یہ بھی نہ جانتے تھے کہ دلی کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ فرنگستان اور صاحبان فرنگ محض ایک طلسم تھا۔ یوروپ کے علوم و فنون و ایجادات' عالمی سیاست' جدید فلسفے اور نظریئے' شرفائے دلی اور ان کی ہونہار اولاد ان تمام خرافات سے مطلق بے نیاز' ناآشنا اور بے پروا اپنے روایتی مشاغل میں منہمک تھی۔ مدرسوں میں قرون وسطی کے علوم پڑھائے جا رہے تھے۔ حویلیوں میں شعر و شاعری اور مرغ بازی ہوتی تھی۔

میر بندے علی کو ایک پریشانی لاحق ہے۔ دلی سے واپس جا کر کیا کریں گے۔ وہ زمانہ نہ رہا کہ اپنی فوج جمع کر کے خود بھی ان خانہ جنگیوں میں شامل ہو جائیں۔ اپنا علاقہ جو دوسرے زیادہ طاقتور سرداروں نے چھین لیا بزور شمشیر واپس لیں۔ دوسروں کا علاقہ چھین کر دشمن کا زن بچہ کولہو میں پلوا کر گڑھی پر اپنا

پرچم لہرائیں۔

یہ لارڈ لیک کا عہد ہے۔ بڑے بڑے جغادری اس کے آگے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔ جسونت راؤ ہولکر کو اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ ہولکر کا سردار امیر خاں گورنر جنرل کا مطیع ہوا۔ فرنگی نے اسے ریاست ٹونک کا نواب بنا دیا۔ حلیف برطانیہ بنا۔ کریم خاں پنڈاری کو ایک ریاست عطا ہوئی۔ ایک کے بعد ایک پرانے دبنگ سرداروں کو فرنگی بازی گر، ریاستوں کی گدیوں پر بٹھاتا جا رہا ہے۔

ہماری نہ تو بڑی ریاست تھی، نہ ہم نے کہیں لوٹ مار کی جس کے عوض ہم کو ایک عدد تخت و تاج چھوٹا موٹا مل جاتا۔

اب سوال یہ ہے کہ نوجوان میر بندے علی اور ان کے چھوٹے بھائی احمد علی آج کی دنیا میں کریں کیا؟

۷۔ رباط کہن اور حویلی

"ہونے والی چیزوں کو لکھ کر قلم سوکھ گیا۔ اب یا سعادت ہے یا شقاوت۔"

منکہ میر بندہ علی ترمذی ابن حضرت آخوند امام بخش ترمذی فی الوقت ایک معمولی ملازم جان کمپنی بہادر کا ملک بندیل کھنڈ میں تعینات ہوں۔ اقوال مشائخ و صوفیا یاد کرتا ہوں۔ اور دل لرزتا ہے کہ ہمارے اجداد رباط کہن سے نکل کر حویلیوں میں آباد ہوئے۔ سو وہ حویلیاں ڈھے گئیں۔ منصب داروں کی کمان گر گئی۔ فی الوقت کالپی میں کنار جمنا ایک پھونس کے بنگلے میں مقیم، ایک بار پھر عالم تحیر میں ہوں۔ یہ تمہارا سورج جسے تم دیکھتے ہو یہ وہی سورج ہے جو قارون وہامان کے محلوں کے جھروکوں پر طلوع ہوا اور اب ان کی قبروں پر نکلتا ہے۔ بادشاہوں نے دنیا میں مضبوط محل بنائے۔ نہ بادشاہ رہے نہ محل۔ "پس روئے مبارک بریں فقیر آوردند فرمودند فرزند من ایں فوائد کہ گفتم بنویس۔"[14]

وقت تیغ قاطع و برہان درخشاں ہے۔ ہر سمت قبرستان پھیلے ہیں۔ سینکڑوں برس پرانے مزار اور وہ قبر جو کل بنی ہے اور میری اپنی قبر جو شاید کل ہی بن جائے، یا کسی اور دن۔ وہ پرانے مزار اور وہ تعمیر ہونے والی قبر ایک ہیں۔

ترمذ اور جارجیا اور طبرستان اور کیتھل اور جھوسی، سلہٹ اور قنوج اور نہٹور میں قبروں پر گھاس اگ آئی۔ کتبوں کے الفاظ مٹ گئے۔

دو فرنگی بھائی جو ڈینیل[15] صاحب کہلاتے تھے کچھ عرصہ گذرا سارے ہندوستان میں قدیم مساجد و مقابر و درگاہوں اور برگد کے درختوں میں پوشیدہ مندروں اور مزاروں کی تصاویر بناتے پھرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں بھلا کیا آئے گا۔

یہ کالپی اور للت پور اور اورئی اور باندہ اور ہمیر پور، چندیلوں، بندیلوں، بنگش پٹھانوں اور مرہٹوں کی رزم گاہ رہ چکے ہیں۔ کلاہ پوش فرنگی نے بحکم حضور فیض گنجور لارڈ کارنوالس بہادر نقشے بدل

دیئے۔ عہد شاہ عالم کے عہدیدار برطرف ہوئے۔ حاکم ضلع فوجداری کی جگہ کلکٹر نے لی۔ دیوانی میں صدر اعلیٰ صدر امین منصف مقرر ہوئے۔

جس وقت گورنمنٹ روہیلکھنڈ نے ہمیں نائب تحصیلداری پر نامزد کیا ان کو سب پہلے سے معلوم تھا۔ ضلع میں کون کون سے مقتدر خاندان ہیں۔ مالی حالت ان کی کیسی ہے۔ زمینداری سے کتنی آمد ہے۔ سیاسی رجحانات کیا ہیں۔ مجاہدین سید احمد بریلوی کا ساتھ کون کون دے چکا ہے یا دے رہا ہے۔

نوجوان شرفا کو کمپنی کی ملازمت پیش کرنے میں فریقین کے گوناگوں فوائد مضمر ہیں۔

القصہ ہم بھی داخل زمرہ خیر خواہان سرکار انگلیشیہ ہوئے۔ صورت معاش بخوبی نکلی۔ فی زمانہ ہزاروں بیکار و معطل خانہ نشین ہیں۔ سینکڑوں آوارہ وطن ہوئے۔

> برادر خورد میر احمد علی کمپنی بہادر کی ایک نیٹو پلاٹین میں میرٹھ چھاؤنی کے اندر معمولی سپاہی ہیں۔ ہمارے اجداد صاحب نوبت و لشکر رہے۔ ہم جوتے اتار کر حاکم ضلع کے سامنے جاتے ہیں۔ ہم بے چاروں نے دُنیا میں غوطہ مارا تھا۔

"ایک عزیز کہ عالم طیر[16] رکھتا ہے شب جمعہ کو دروازے کے آگے پہنچا۔ خانقاہ بادشاہ کی جہت سے اندر نہ آیا۔ ایک آدمی بھیجا۔ اس نے سلام کیا زمین چومی اور بولا کہ تم جو ہر لحظہ ملوک کا کھانا کھاتے ہو یہ وظیفہ جو فوت ہوتا ہے اسی سبب سے ہے۔ میں نے اس دن خان جہان کا کھانا کھایا تھا۔"[17]

حیف کہ ہم نے صدیوں ملوک کا نمک کھایا۔ اب وکٹوریہ کے نمک خوار ہیں۔

یہ جو بعض اصحاب کا قول ہے مذہب اسلام میں قطع علائق ممنوع ہے، اکابر، صوفیاء، راہبان مسیحی و اہل ہنود سے متاثر ہوئے، ہمارے نزدیک یہ نظریہ چنداں صحیح نہیں۔ کس واسطے کہ جب امت رسولؐ کے حاکموں نے طور طریق شایان عجم کے اختیار کئے خود کو بصد فخر و غرور خسرو و دارا کہلوایا وہ اور ان کے حاشیہ بردار مظالم غربا پر کرتے تھے تب آئمہ و اولیا نے اقتدار پرستی کے خلاف ایک تحریک گویا شروع کی۔

اور جو ہم نسل سے آئمہ و صوفیا کی ہیں ارکان دولت میں شامل ہو کر داخل طبقہ امراء ہوئے۔ لبادے کارچوبی طلائے مغرق زیب تن کرتے تھے۔ ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے۔ شیخینؓ اور اویس قرنی اور ابوذر غفاری کو بھولے تھے اور یہ سراسر فراموش کر چکے تھے کہ ملوکیت و شہنشاہیت کے معاملات عبرت ناک ہیں۔

دیکھو ہمارے یک جدی نواب قاسم علی خاں عالی جاہ ناظم بنگالہ نے کہ سید نصیرالدین ابن سید کمال الدین ترمذی کی نسل دختری سے تھے کس طرح متواتر شکست صاحبان عالی شان کی فوج سے کھائی۔

اگرچہ اپنی فوج کو موافق دستور انگریزی آراستہ کیا تھا مگر نہ سمجھے کہ لڑوانے والے صاحب کہاں تھے۔ چنانچہ ...... قبل از جنگ بکسر جناب عالی نواب شجاع الدولہ بہادر بنارس میں شیخ علی حزیں سے ملاقی

ہوئے۔ جناب شیخ نے سبب عزیمت پوچھا۔ عرض کیا قاسم علی خاں اپنی کمک اور حمایت کو لئے جاتے ہیں اور انگریز اس پر اصرار کرتے ہیں کہ تم شریک عالی جاہ نہ ہو بلکہ ہم سے ملک عظیم آباد بھی لے لو۔ کیا ضرور ہے۔ عبث اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا۔

شیخ نے بہ تبسم فرمایا کہ گو ان کی فوجیں قلیل اور یہاں فوج قاہرہ ہے مگر یہ آتش فرنگ ہیں۔ انہیں کم نہ جاننا چاہیئے۔ بظاہر ان کی بنیاد نظر نہیں آتی مگر باطن میں گاؤ زمیں سے گذری ہوئی ہے۔ تم نہیں جانتے ہمارے پیغمبرؐ نے عین حکمت سمجھ کر اس فرقہ ء خاص سے صلح کی تھی۔ دوسرے دن جناب شیخ نے اپنے حاضرین سے بہ افسوس کہا کہ اس جماعت سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ جنگ حمقاء بادانایان فرنگ۔

القصہ عالی جاہ اور جناب عالی شجاع الدولہ میں بگاڑ ہوا۔ نواب میر قاسم سوچتے تھے اب مرشد آباد واپس جاؤں اور انتظام انگریزی میں خلل ڈالوں تو مضائقہ نہیں۔ ایک دن جناب عالی نے کہلوا بھیجا کہ بادشاہ بقایائے صوبہ بنگالہ وغیرہ طلب فرماتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا' سبحان اللہ میں تو تمہارے بھروسہ پر بیٹھا ہوں۔ جو مجھ سے ممکن و مہیا ہوا اس میں قصور نہیں کیا۔ اب مجھے مقدور کہاں رہا۔ مجبور ہوں۔

دوسرے دن جنرل سمرو ملازم عالی جاہ میر قاسم وقت بد دیکھ کر لشکر جناب عالی میں چلا آیا۔ تیسرے دن خیمہ عالی جاہ کا محاصرہ کر لیا۔ انہیں ہاتھی پہ سوار کر کے لشکر جناب عالی میں پہونچایا۔ مال و اسباب' نقد و جنس سب ضبط سرکار جناب عالی ہوا۔ تمام رفقائے عالی جاہ نے نواب شجاع الدولہ سے موافقت دنیوی کر لی۔ ایک دن پیشتر لڑائی بکسر کے عالی جاہ نواب میر قاسم لنگڑی ہتنی پر سوار روانہ الہ آباد ہوئے۔ اور بہ جان واحد قید شجاع الدولہ سے نجات پائی۔ اس وقت بے کسی میں علی ابراہیم خاں نے ہزار روپے نقد اور گھوڑا اپنی سواری کا بھیجا لیکن عالی جاہ نے ازراہ غیرت قبول نہ کیا۔ بہ ہزار خرابی افتاں و خیزاں الہ آباد پہنچے۔ چھوٹے سے مکان کرایہ میں اترے۔ پھر لکھنؤ ہو کر روہیلکھنڈ آئے اور قید فرنگ سے محفوظ رہے۔

کہتے ہیں کہ عالی جاہ جب لکھنؤ میں اترے' خیمہ کنار دریائے گومتی زیر قلعہ مچھی بھون برپا ہوا تھا۔ ان کے سامنے ایک طرف قرآن دوسری طرف زنار ہنود رکھے تھے کہ اگر فتح نواب شجاع الدولہ ہوئی' زنار پہن لوں گا۔ یہاں تک کہ خبر شکست بکسر سنی۔

خلاصہ ملک افاغنہ میں بھی صورت قیام نہ ٹھہری۔ بعد چند روز کے پریشان و خستہ حال میانے میں سوار ہو شاہجہاں آباد پہنچے۔ نواب نجف خاں نے بڑے احترام سے اپنا مہمان کیا اور کہا کہ اب خیال ملک بنگالہ اور تصور عہدہ وزارت کو دل سے دھو کے حاضر شاہی رہنا غنیمت سمجھئے۔ بہرصورت آپ کی خدمت گزاری اور کفالت کو حاضر ہوں۔ بعد چند روز کے سبزی منڈی میں انتقال کیا۔ حضرت شاہ مرداں میں دفن ہوئے۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔ 18

جب نواب میر قاسم کا حال سنتا ہوں کہ کس قدر صاحب مروت و فیاض و عالی مرتبت تھے اور کس بے کسی و ناداری کے عالم میں مرے' تو دل خون ہوتا ہے۔

اور ایک ان مرحوم و مغفور خلد آشیانی کا کیا ذکر ہے والد مرحوم میر امام بخش فرماتے تھے ان کی

آنکھوں دیکھی بات ہے کہ دلی میں سب عمل دخل مرہٹوں کا تھا۔ بادشاہ کو وظیفہ ان کے گزارے لائق نہ ملتا تھا۔ ان سے قبل بادشاہ کو اندھا کیا گیا۔ قتل عام ہوئے۔ وزیروں نے جس کو چاہا ہلاک کیا۔ جس کو چاہا تخت پر بٹھایا۔ عین اس وقت ابو ظفر سراج الدین محمدؐ بہادر شاہ بادشاہ کی بے بسی کا کیا عالم ہے۔ اللہ اکبر۔

خدا کی قسم دنیا سے نفرت ہو چلی ہے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ ہمارے مورث اعلی سید حسن ترمذی اپنے چہار ہزاری والد میر ضیاء الدین غازی کی شہادت کی خبر سن کر گاگن کے کنارے ایک جھونپڑے میں جا بیٹھے تھے۔ ہم ان کے ترک علائق پر متعجب نہیں۔

شاہجہاں آباد کے ایک شریف زادے عالم فاضل سید احمد صاحب جو جنوری ۱۸۵۵ء سے ہمارے شہر بجنور میں صدر امین ہیں بہت درد مند انسان ہیں اور مسلم قوم کے زوال کی دہوہ کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ آج کل تاریخ بجنور لکھنے میں مشغول ہیں۔ بہت سے حالات ہم سے دریافت کر چکے ہیں۔ دو سال قبل جب ہم متھرا ضلع آگرہ میں تحصیل دار تھے سید احمد صاحب نے ہمیں بجنور سے لکھا تھا۔

"دریں روز ہا کتاب تاریخ ایں ملک تصنیف و تالیف میکنم و بضرورت آں دریافت حالات دیار و امصار از واجبات۔ لہذا امور متعلقہ ضلع متھرا کہ لائق دریافت بودہ اندبر ظہر نیاز نامہ ہذا درج کردہ خدمت عالی متصدع میشوم کہ بعد تحقیق و تفتیش کماینبغی بہ ہر عجلت بجیلہ کہ امکان داشتہ باشد بجواب پرچہ ہذا مطلع فرمایند و مثل جواب نیاز نامجات سابقہ ایں راہ براہ عنایت سرسری نہ پندار ندو بذل عنایت کردہ بہ مرحمت جواب ممنون فرمائیندو نقشہ مطلوبہ کہ ذکرش بر ظہر نیاز نامہ ہذا مندرج کردہ می اید۔ شنیدہ ام کہ منطبع شدہ و در آں ضلع بقیمت میسر آید۔ اگر ہمچناں باشد خریدہ لطف فرمایند۔ قیمتش ہر قدر کہ خواہد بود مع محصول ڈاک بعالیخدمت خواہد رسید۔"

۲۱ مارچ ۱۸۵۵ء

آج ہم اپنے کاغذات کا بستہ کھول کر بیٹھے تو یہ سید موصوف کے خطوط بھی نکل آئے۔ ہمیں بھی ماضی کی جستجو ہے۔ لیکن بادشاہوں کا حال دیکھ لیا فقیروں کے کوائف کا جویا ہوں۔

خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاری" ' خواجہ معین الدین حسن سنجری" چشتی کہ ہمارے جد امجد سید کمال الدین ترمذی" کے ہم عصر تھے' خواجہ قطب الدین بختیار کاکی" سید محمد بندہ نواز گیسو دراز" ' سید علی ہجویری" اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کی تصانیف پڑھتا ہوں اور بارگاہ ایزدی سے طالب بخشش رہتا ہوں۔

تعجب ہوتا ہے کہ اولیاء ماسلف ہندوستان میں کہاں کہاں پہنچے۔ اس بندیل کھنڈ میں کہ گھنے جنگلوں اور جنگجو گونڈوں اور قزاقوں کی سرزمین ہے ہم صاحبان عالی شان کے ہمراہ دورے پر جدھر جاتے ہیں اولیاء کے مزار دکھلائی دیتے ہیں۔ بدیع الدین زندہ شاہ مدار بھی در عہد فیروز شاہ تغلق کالپی میں رہ چکے ہیں

(صدافسوس کہ درویش جو ان کے نام لیوا ہیں وہ اب بندر اور ریچھ نچاتے پھرتے ہیں۔ شعبدے دکھاتے ہیں اور مداری کہلاتے ہیں)

ہمیر پور میں مبارک شاہ کا مزار ہے۔ راجو قتال برادر و خلیفہ مخدوم جہانیاں" کے خلیفہ تھے۔ چھتر سال بندیلہ آپ کا معتقد تھا۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ ان دنوں ان اطراف میں تین نوجوان حفاظ کی جو مخدوم کے بنی اعمام میں سے ہیں۔ بڑی شہرت ہے۔ نواب صاحب باندہ نے ان کا تذکرہ ہم سے کیا۔ ہمیں بھی ان سے ملاقات کا اشتیاق شدید ہوا۔

نواب صاحب کا قصہ بھی غریب ہے۔ گزشتہ صدی کی طوائف الملوکی نے ہزاروں کو بگاڑا اور سینکڑوں کو بنایا۔ سندھیا والئی گوالیار نے نظام الملک آصف جاہ کے لڑکے عماد الملک غازی الدین کو کالپی جاگیر میں دی (مرزا نوشہ دلی والے کے شاگرد نواب انوار الدولہ شفق انہیں عماد الملک کے پڑپوتے ہیں)

راجہ چھتر سال بندیلے نے کچھ علاقہ اپنا اپنے حلیف پیشوا باجی راؤ اول کو عطا کیا۔ محمد خاں بنگش کے خلاف بندیلے کی ایک جنگ میں اس کے خاندان کی ایک لڑکی کو پٹھان افواج نے اسیر کیا۔ باجی راؤ نے اسے قید سے رہا کر کے داخل رنواس کیا۔ ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نام اس کا شمشیر بہادر رکھا گیا۔ مذہباً مسلمان تھا لیکن باجی راؤ نے باندہ اسے جاگیر میں دیا۔ اس کا بیٹا علی بہادر تھا۔ مرہٹوں نے ۱۸۰۲ء میں یہ سارا علاقہ انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا۔

ادھر جھانسی کے مرہٹہ نیم خود مختار راجہ کی بیوہ لکشی بائی نے اپنے متبنّیٰ لڑکے کے حق تخت نشینی کی درخواست کلکتہ گورنمنٹ کو دی جو بوجہ وراثت کے پیچیدہ جھگڑوں کے نامنظور ہوئی۔ جھانسی حال ہی میں برٹش عملداری میں شامل کیا گیا جس کی وجہ سے ہم یہاں موجود ہیں۔ رانی صاحبہ کو پنشن دیدی گئی ہے۔ وہ ناراض اور غیر مطمئن شہر کے اندر اپنے محل میں رہتی ہیں۔

نواب علی بہادر کے صاحبزادے ذوالفقار بہادر انگریزوں سے لڑے۔ شکست کھا کر معاہدہ کیا۔ سرکار انگلشیہ نے باندہ کے باہر زمین اور تھوڑی سی فوج رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ موجودہ نواب علی بہادر ذوالفقار بہادر کے بھتیجے اور مرزا نوشہ کے دور کے قرابت دار ہیں۔ مرزا نے ان کے لئے فرمایا بھی ہے۔

غالبؔ خدا کرے کہ سوار سمند ناز   دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

نواب صاحب ہر سال ایک جلسہ قراءت منعقد فرماتے ہیں۔ دور دور سے قاری اس میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ کچھ برس قبل کا ذکر ہے کہ اس جلسے میں جب تمام قاریان گرامی تلاوت کلام مجید کر چکے تو ایک اجنبی ولایتی نے کھڑے ہو کر اجازت چاہی اور اس خوش الحانی سے تلاوت کی کہ سامعین اشک بار ہوئے۔

نام اس نوجوان کا حافظ سید محمد موسیٰ اور وطن سوات بنیر تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بخارا اور سمرقند کابل و سرحد کے قاریوں کا آج تک کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جلسے کے بعد نواب صاحب باندہ نے حافظ صاحب سے ان کا احوال دریافت کیا۔

انہوں نے آگاہ کیا۔ سید جلال الدین اعظم سرخپوش" ۱۱۹۸ء میں بمقام بخارا پیدا ہوئے تھے۔ خدابندہ میر بخارا کی لڑکی حلیمہ خاتون سے شادی ہوئی۔ بی بی اور فرزند سید محمد جعفر بخارا میں رہے۔ خود بعہد شمس الدین التمش سندھ شریف لائے۔ ملتان میں خرقہ خلافت شیخ بہاء الدین ذکریاؒ سے حاصل کیا۔ بھکر میں سید بدرالدین کی بیٹی سے عقد ہوا۔ سید احمد کبیر" پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۲ء میں بمقام اوچھ علاقہ بہاولپور رحلت فرمائی۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت" ابن سید احمد کبیر" کو خرقہ خلافت شیخ نصیرالدین چراغ" دہلوی نے عنایت فرمایا۔ سلاطین دہلی و گجرات آپ کے مرید تھے۔ مزار مبارک اوچھ شریف میں ہے۔ متعدد بیبیوں سے اولاد تمام اقلیم ہند میں پھیلی۔ کوئی سرکار و صوبہ اس سے خالی نہیں۔ وہ لوگ ماشاء اللہ مثل آفتاب ہیں۔

سید جعفر ابن جلال الدین سرخپوش" جو آبائی وطن بخارا میں سکونت پذیر تھے ان کے احفاد توران میں فی الوقت موجود ہیں۔ ان میں سے ایک سید نور محمد نے مع فرزند سید فیض محمد بخارا سے سوات بنیر مراجعت فرمائی۔ سید فیض محمد مارچ ۱۸۲۳ء کی جنگ نوشہرہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج اور اکالی بھولا سنگھ کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

سید فیض محمد کے صاحبزادے حافظ سید محمد ابراہیم عرف حاجی لالہ عساکر جنرل ہرن سنگھ نلوہ کا مقابلہ کرتے ہوئے دوسرے مجاہدین فی سبیل اللہ کے ساتھ بمقام جمرود اپریل ۱۸۳۷ء میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ مزار مرجع خلائق ہے۔

حاجی لالہ ایک مفلس و مقروض مولوی تھے۔ برائے ادائیگی رقم واجب الادا بیٹے ان کے حافظ محمد موسیٰ' والدہ ماجدہ' بھائیوں اور چھوٹی بہن مریم خاتون کو اپنے کوہستانی گاؤں واقع علاقہ یوسف زئی نزد پشاور میں چھوڑ کر بغرض تجارت برٹش انڈیا آئے۔ نجانے کس طرح باندہ آ پہنچے۔ تجارت میں ناکام رہے۔ اس وقت جامع مسجد باندہ میں مقیم تھے۔

حالات سن کر نواب صاحب باندہ بہت متاثر ہوئے۔ فرمایا کہ اپنے متعلقین کو باندہ لے آئیں۔ مسجد کی امامت پیش کی اور اس کے عوض قرضہ ادا کرنے کی پیشکش فرمائی۔ حافظ صاحب نے درخواست منظور فرمائی۔ روپیہ لے کر سرحد گئے' اور مع خاندان واپس تشریف لائے۔ جلسہ قراءت میں نواب صاحب باندہ کے رشتہ دار نواب کدورہ[19] بھی حافظ صاحب کے مداح ہوئے۔ جب حافظ صاحب سوات بنیر سے واپس تشریف لائے تو نواب صاحب کدورہ نواب صاحب باندہ سے اجازت لے کر انہیں اپنے ہاں لے گئے۔ یہ تینوں بھائی حافظ محمد موسیٰ' مولانا عزیز احمد اور مولوی محمد طاہر فارسی اور پشتو بولتے ہیں۔ ذرا سی بگھیلی اردو بھی سیکھ گئے ہیں۔ سلسلہ پیری مریدی کا یہاں بھی جاری کر دیا ہے۔

کدورہ کالپی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔

مجھ بندے علی نے شہرت ان کی روحانیت کی سنی اور قصد ملاقات کا کیا۔ بعد مغرب ہم کدورہ پہنچے

تو عجیب روح پرور نظارہ دیکھا۔ صحن مسجد میں ایک سرحدی مولوی تلاوت کلام پاک میں مصروف' دوسرے بھائی مٹی کے کونڈے میں آٹا گوندھ رہے تھے۔ مسجد کے طاق میں تیل کی کپی جلتی تھی۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا تھا۔ ہم گھوڑے سے اترے اور دل میں کہا' بندے علی یہ وہ طرز زندگی ہے جو صدیوں قبل ہمارے پرکھوں کا طرہ امتیاز تھا۔ اب ان تورانی پیرزادوں سے راہ و رسم بڑھانا ضرور ہے۔ جرنیلوں اور کمشنروں کی دنیا ہیچ پوچ ہے۔

خانوادۂ مخدومؒ کی ایک شاخ سے یہ اتفاقیہ ملاقات بہت خوب تھی کہ خود ہمارے بزرگ سید علیم الدین ثانی کو مخدوم جہانیاںؒ نے خرقہ خلافت عطا کر کے جونپور بھیجا تھا اور سلطان ابراہیم حسین شرقی نے ان کو پرانے امراء میں شامل کیا تھا۔

حافظ سید موسیٰ اور ان کے بھائیوں سے اکثر ہماری ملاقات رہی۔ پہروں خانہ مسجد میں بعد نماز مغرب گفتگو چار پیر چہاردہ خانوادے کی ہوتی تھی۔ طریقت علم دریا ہے۔ علوم سلوک و تحمل و اسمائے اعظم و ماہیت جن و بشر و مکاشفہ و ملکوت و جبروت ولاہوت و اسرار و وجد و خوف و قطبیت و محبوبیت و رویت و اذکار و ابتداء و انتہا۔۔۔۔ ہر علم کے مکمل حصول کے لئے عمر خضر چاہیئے۔

ہم عرصے سے پردیس میں مقیم ہیں۔ حرم رکھنے کا رواج ختم ہو چلا ہے۔ کس واسطے کہ شرفاء کے پاس اب نہ پہلی سی دولت ہے نہ فراغت۔ یوں بھی ہمارے گھرانے میں عموماً ایک سے زیادہ شادیاں نہیں کی جاتیں۔ ہم نے البتہ بوجوہ تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بیبیاں بفضل خدا حیات ہیں۔ دو خورد سال فرزند سید ابوالحسن اور عزیز حیدر سلمہ' اپنی ماں کے ساتھ نہٹور میں رہتے ہیں۔ یہاں پر خیر خواہوں نے کہا میر صاحب پردیس میں تنہائی دور کرنے کی غرض سے ایک شادی اور کر لیجئے کہ سلف سے ایسا دستور چلا آتا ہے اور شرعی گنجائش ابھی باقی ہے۔

انہی بہی خواہوں نے حافظ سید محمد موسیٰ کے ہاں ان کی چھوٹی ہمشیرہ سیدہ مریم خاتون کے لئے ہمارا پیغام بھجوایا۔ ہم ترمذی لوگ آٹھ سو سال ہند میں رہ کر بوجہ تمازت آفتاب ایسے ٹھیٹھ ہندوستانی بن گئے کہ فرنگی ہمیں بلیک مین کہتا ہے۔ یہ تازہ ولایت خاندان سرخ و سفید' بلند و بالا' صحت مند اور شاندار لوگ ہیں۔

حافظ صاحب نے پیغام منظور نہ کیا۔ نام سے ان کو شبہ ہوا کہ بندہ شیعان علیؓ کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہماری اطراف میں شیعہ سنی کی تفریق بہت زیادہ نہیں کہ خود ہماری برادری سادات نہٹور میں چند گھرانے اہل تشیع کے ہیں اور شادیاں بھی آپس میں ہوتی ہیں کہ سینکڑوں برس سے شادیاں فقط برادری میں کرنے کا دستور چلا آتا ہے۔ ہمارے نزدیک ضلع مراد آباد تو شیعہ اصحاب کی بہت بڑی اور تاریخی آماجگاہ ہے۔ مگر جاننا چاہیئے کہ نواح کابل و توران میں اہل سنت والجماعت اور فرقہ امامیہ کے مابین بدگمانی شدید ہے۔

القصہ ہم نے ایک ڈاک گاڑی سے جو روہیلکھنڈ جاتی تھی شقہ چند بزرگوں کو نہٹور روانہ کیا کہ بندیل کھنڈ تشریف لا کر ان سرحدی مولویوں کو اصل کوائف سے آگاہ کریں۔

کچھ عرصہ بعد (سفر پر خطر ہے۔ گو انسداد ٹھگی ہو چکا ہے۔ بندھیا چل کے علاقے میں ڈاکوؤں کی کثرت ہے) دو بزرگ نہٹور سے تشریف لائے اور کدورہ جا کر حافظ سید محمد موسیٰ سے ملاقی ہوئے۔ کمال طباعی سے ان کو سمجھایا کہ نام تحصیلدار صاحب کا بندے علی نہیں بلکہ بندہ علیؔ ہے اور بولنے میں علی ہو گیا۔ اور علیٰ اللہ تعالیٰ جل شانہ' کے اسماء میں سے ایک ہے۔ یہاں پر دانش مندان نہٹور کے ہم بھی قائل ہو گئے۔

حافظ صاحب نے اس تاویل پر یقین فرمایا ور ہمارا عقد ان کی بہن مریم خاتون سے شربت کے پیالے پر ہوا۔

بی بی مریم خاتون ازبسکہ صاحب فہم و فراست' علوم دین سے واقف اور شریف النفس' نیک طبع بی بی ہیں۔ ان کی علمیت پر البتہ ہم متعجب ہیں کہ ہمارے گھر کی بیگمات تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے جاگیری ماحول اور سرحد کے اس مولوی گھرانے کے طرز زندگی میں بعد المشرقین ہے۔ بہر کیف آج رخصت لے کر ہم زوجہ صاحبہ کو نہٹور لئے جاتے ہیں۔ گویا رباط کہن سے نکل کر حویلی کی سمت روانہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ انگریزی عملداری میں ظاہراً امن و بندوبست ہے لیکن گوئندے چند خفیہ شقے ایسے لے کر آئے ہیں جن سے......

۸۔ غدر ۱۸۵۷ء

مزاج ابتر تباہ ہو چکا۔ رات کے وقت آسمان پر سرخ مریخ دہک کے انگارہ ہو گیا۔ روزانہ دونوں وقت ملتے ایک مدار تارہ خلقت کو نظر آتا ہے۔ گاؤں گاؤں چپاتی بٹی۔ راتوں کے سناٹے میں ایک پراسرار فقیر بھیانک آواز میں صدا لگاتا پھرتا تھا۔

منکہ میر احمد علی ترمذی ابن حضرت اخوند امام بخش ترمذی نہٹوری میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھا جب کمان افسر نے حکم دانتوں سے کارتوس کاٹنے کا دیا۔ سپاہیوں نے انکار کیا۔ بغاوت شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد اتفاقیہ توپخانہ کا خلاصی لین میں سے گزرا اور بولا آج پریڈ کے میدان میں نہ ٹھہرنا' ہمیں حکم مل چکا ہے کہ باغیوں کو توپ سے اڑا دیں۔

دوسرے روز ایک صوبیدار نے انگریز افسر سے چغلی کھائی۔ فلاں فلاں مفسدین ہیں ان کو قید کیجئے۔ کمان افسر نے ستر سواروں کو جیل خانے میں ڈالا۔ بعد ازاں ان کو میدان میں لائے پابجولاں بازار میں سے گزارا۔ بالا خانوں پر سے ارباب نشاط نے غیرت دلائی کہ چوڑیاں پہن لو۔

دوسرے دن ۱۵ ماہ رمضان المبارک بعد نماز ظہر اس رسالے کے سپاہی مسلح ہو کر چھاؤنی پہنچے۔ بنگلوں میں آگ لگائی شدید نقصان جان و مال اہل فرنگ ہوا۔

ہم بھی اس معرکے میں شریک تھے۔ کیونکہ دین خطرے میں تھا۔

آدھی رات کو دلی مارچ کیا۔ ۱۶ تاریخ ماہ رمضان مطابق ۱۱ مئی ہمارے ایک سوار نے سمن برج کے جھروکے کے نیچے پہنچ کر میر فتح علی خاں داروغہ تخت شاہی سے بات کرنا چاہی۔ میر صاحب اس وقت کنار جمنا خضری دروازے کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ سلام پھیر کر انھوں نے استفسار کیا۔ "کیا کام ہے؟" سوار نے کہا۔ "فوج لایا ہوں۔ فوراً جہاں پناہ سے عرض کیجئے کہ ہم نے صاحبان کو میرٹھ میں قتل کیا' اب اسی ارادے سے دلی آئے ہیں۔"

بعد اس کے جو کچھ ہوا سارے عالم کو معلوم ہے۔

ہم اس معرکے میں جابجا لڑے۔ باڑھ بندوق کی گرار توپ کا مہ سو پڑنے لگا۔ ہم نے اپنے مورث اعلیٰ کے فرزند ملک ابراہیم نشانچی لشکر شاب الدین محمد غوری کو یاد کیا اور نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری بلند کر کے دشمنوں پر جا پڑے۔ متعدد فرنگیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔[20]

بہت جلد غدر دوآبہ میں پھیلا۔ خاص ہمارے وطن قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں ایک خفیہ جماعت قائم ہوئی۔ یہ بارہ ٹوپی والے کہلائے۔ ان میں سید کرامت حسین' سید الطاف حسین' سید عنایت حسین' میراں امتیاز علی اور نواب رحمت خاں وغیرہ شامل تھے۔ انھوں نے سرکاری چوکیوں پر شب خون مارے۔ سارے ضلع میں باغیوں نے مورچے کئے اور توپ کو آگ دی۔ تفصیل جنگ بجنور کی جو ہمارے برادر بزرگ بندے علی صاحب تحصیلدار کے دوست سید احمد دہلوی نے کہ اس وقت بجنور میں صدر امین تھے' رقم کی ہے۔ حالات چشم دید بیان کئے ہیں۔ واقعات صحیح ہیں لیکن انداز بیان میں رویے کا فرق ہے۔ سید موصوف روشن دماغ' عالم فاضل انسان ہیں۔ قوم کا شدید درد دل میں رکھتے ہیں۔ خیال ان کا یہ ہے کہ اس دور نکبت و ادبار میں حکومت انگلشیہ سے وفاداری مسلم قوم کے حق میں عین مناسب ہے۔

جس وقت ہنگامے کا بجنور میں آغاز ہوا۔ صاحب لوگ حسب معمول اپنی میم صاحبان اور بابا لوگ کو نینی تال اور کوہ مسوری بھیجنے والے تھے کہ یہ شہر انھوں نے کوہ ہمالہ کی چوٹیوں پر بطرز قصبہ جات ملک اسکاٹ لینڈ آباد کئے ہیں۔ سول لائنز بجنور میں صرف بیس عدد انگریز موجود تھا۔ مسٹر الگزنڈر شیکپیئر' کلکٹر ضلع جارج پامر' جنٹ مجسٹریٹ' ڈاکٹر نیٹ سول سرجن' جانسن صاحب' مرفی صاحب وغیرہ۔ نیٹو افسروں میں بابو کالی چرن انگریزی نویس کلکٹری' ڈاکٹر تارا چند سین اسسٹنٹ سرجن اور ہمارے سید احمد دہلوی صدر امین۔

سید موصوف فرماتے ہیں۔ "میرٹھ میں جو فساد اور نمک حرامی ۱۰ویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس کی خبر گیارہویں تاریخ تک بجنور پہونچی۔ بارہویں تاریخ کو یہ خبر مشہور ہوئی اور پے در پے اس کے آثار نمودار ہوتے گئے۔ یعنی کنار گنگا راہ لٹنے لگی اور آمد و رفت مسافروں کی بند ہو گئی۔ ۱۸ مئی کو ایک کمپنی تلنگوں کی جو سہارن پور سے مراد آباد جاتی تھی بجنور پہنچی۔ ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹا۔

"قیدی جیل سے نکل آئے۔ سب کے منہ دریا کی طرف تھے اور بھاگے جاتے تھے۔ کلکٹر خزانے پر

آیا۔ مجھ صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنویں میں ڈال دیا۔

"ہزارہا گوجر گنگا وار اور گنگا پار کے لوٹ مار مچاتے پھر رہے تھے۔ اسی روز شام کو نا محمود خاں[21] مع ساٹھ ستر پٹھان بندوقچی کے بجنور پہنچا۔ اس رات بجنور میں بڑا اندیشہ رہا۔ جناب شیکپیئر صاحب دام اقبالہ' اور جناب مسٹر جارج پامر جو اخلاق و عنایت ہمارے حال پر فرماتے تھے ان اخلاقوں اور عناتیوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈالی تھی کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا برا ہی برا دکھائی دیتا تھا۔"

تلنگے اب نگینے سے دھام پور پہنچے۔ وہاں ہر سکھ رائے لوہیا کے ہاں اس دن برات تھی۔ اس نے برات کا کھانا اور بہت اچھی اچھی مٹھائی تلنگوں کو دی۔ اس لئے انھوں نے وہاں کچھ فساد نہیں کیا اور مراد آباد چلے گئے۔ گوجر' جاٹوں' میواتیوں اور بنجاروں کی شورش کے سبب ضلع میں زیادہ تر غدر ہوا اور بجنور پر بھی ڈاکہ آنا مشہور تھا۔

"جو رئیسان ضلع حکومت کی کمک کو بلائے گئے تھے۔ ان میں سے چودھری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاجپور مع سپاہیوں کے احاطہ کوٹھی کلکٹر صاحب میں مقیم ہو گئے۔ دیہات لٹتے رہے۔ مختلف پرگنوں پر ڈاکے چڑھے۔ باغیوں نے جگہ جگہ لام باندھے۔ ۲ جون کو کپتان گف صاحب بمع سواروں کے میرٹھ سے خزانہ لینے آئے اور پچاس ہزار روپیہ کنوئیں سے نکالا۔ سوار کم تھے اور ڈاکے والوں کے غول کے غول جمع تھے۔ مگر صاحب موصوف بہ کمال بہادری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر براہ گھاٹ دارانگر میرٹھ چلے گئے۔ ۳۱ مئی تک سب اضلاع روہیل کھنڈ بگڑ چلے تھے۔"

اس پر خطر وقت میں سید احمد رات رات بھر کلکٹر ضلع کی کوٹھی پر پہرہ دیتے۔ کرسی پر بیٹھے رہتے یا ٹہلتے۔ ان کے سمجھانے بجھانے سے باغیوں نے انگریزوں کو زندہ چھوڑ دیا۔

"اب اس وقت اور کوئی مصلحت نہ تھی بجز اس کے کہ ضلع کمبخت نا محمود خاں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔" ۷ جون کی رات کو سارے صاحب میم لوگ مع سواروں کے ہاتھیوں پر سوار ہو کر میرٹھ روانہ ہو گئے۔ "سمجھو اس بات کو کہ وہ سب نمک حرام پرانے سوار گنگا کے کنارے پر سے نا محمود خاں کے پاس بھاگ آئے۔ نئے سوار ڑکی تک ساتھ رہے وہاں پہنچ کر بگڑ گئے۔"

نواب محمود خاں نے صبح ہوتے ہوتے "خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا' حکم نواب محمود خاں کا" کی منادی پٹوادی اور ضلع کا بندوبست شروع کیا۔ انھوں نے سید احمد اور دوسرے دیسی افسروں سے کہا کہ وہ حسب سابق اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ سید احمد کو آزاد حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی اور جاگیر پیش کی مگر سید موصوف نے انکار کر دیا اور نواب سے کہا "خدا کی قسم نواب میں تمہاری خیر خواہی کے لئے کہتا ہوں کہ تم اس ارادے کو دل سے نکال دو۔ حکام انگریزی کی عمل داری نہیں جائے گی۔"

اسی وقت منیر خاں جہادی نے نگینہ سے بجنور پہنچ کر انگریزوں کو شہر سے زندہ نکل جانے دینے کے جرم میں سید احمد خاں کو واجب القتل ٹھہرایا۔ پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر مدارس پر الزام لگایا کہ "عیسائی

مکتب ہر جگہ بٹھاتا پھرتا تھا۔ "منیر خاں نے سید احمد سے در مسئلہ جہاد بحث و مباحثہ کیا' پھر دلی چلا گیا۔

جون کے مہینے میں بریلی کی باغی فوج کی کمان صوبیدار بخت خان نے سنبھالی۔ حافظ رحمت خان کے بوڑھے پوتے خان بہادر خاں کو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے صوبہ کٹیہر کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ بہادر خاں نے راجپوتوں کا تعاون حاصل کیا۔ شوبھا رام بینا حکومت کا دیوان مقرر ہوا۔

اب انگریزوں نے پٹھانوں اور راجپوتوں کی آزاد مشترکہ حکومت ختم کروانے کے لئے ہندو بغاوت کا انتظام کیا اور پچاس ہزار روپیہ اس مقصد کے لئے کپتان گودانی کو دیا گیا۔ وہ ناکام رہا۔ مگر بجنور میں انگریز کے وفادار ہندو چودھری نواب محمود خاں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

سید احمد خاں لکھتے ہیں۔

"غلغلہ ہوا کہ بہادر خان نے فرمان حکومت ملک کٹیہار کا بادشاہ دہلی سے حاصل کیا۔ تا محمود خاں کو بڑا تردد ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ملک کٹیہار میں ضلع بجنور بھی شمار میں آجائے۔ چنانچہ عرضی بادشاہ کو بھیجی۔"

ادھر شیر کوٹ کے شیخ ماڑے خان اور احمد اللہ خاں نے شیر کوٹ کے سب سے مالدار آسامی چودھری امراؤ سنگھ سے مطالبہ ادائیگی مالگذاری کا کیا۔ ۲۷ جولائی کو توپ میگزین شیر کوٹ پہنچ گئے۔

عمدو خاں فرمان شاہی لے کر بجنور آئے کہ "فدوی خاص لائق العنایت والاحسان امیر الدولہ' ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ انگریزوں سے چھینا ہوا مال خزانہ فوراً دلی بھجوا دیں۔"

اس طرف احمد اللہ خاں نے امراؤ سنگھ سے روپیہ لے کر اپنا مطالبہ ایک لاکھ کا کر دیا۔ اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ احمد اللہ خاں نے حویلی پر توپ لگا دی۔ ماڑے خاں اور دوسروں نے حویلی لوٹی۔ بہت سے ہندو مارے گئے۔ امراؤ سنگھ نکل بھاگے۔ گڑھی فتح ہوئی' سارے چودھریوں نے مل کر احمد اللہ سے گڑھی چھیننے کا ارادہ کیا۔ دھام پور میں چودھری صاحبان توپیں لے کر جمع ہوئے۔ "دیمہ بدیمہ گنواری بگل یعنی ڈھول واسطے جمع ہونے اور لام بندی بجنے لگا۔"

سید احمد خاں صحیح فرماتے ہیں کہ اب تک بجنور میں تنازعہ عداوت یا مذہبی تکرار نہ تھی۔ چودھریوں کے یہاں مسلمان اور ہم مسلمان زمینداروں کے ہاں ہندو ملازم تھے۔ مگر اب باقاعدہ ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ شیر کوٹ کا مندر مسمار ہوا' کئی مسجدیں شہید ہوئیں۔ افواہ پھیلی کہ احمد اللہ نے محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے۔

شیر کوٹ کی دوسری لڑائی میں احمد اللہ کی سپاہ مغلوب ہوئی۔ اس کے بعد ہلدور کے چودھریوں نے بجنور پر چڑھائی کر دی۔ نواب محمود خاں کو بھاگ کر نجیب آباد جانا پڑا۔ چودھریوں نے کلکٹری کوٹھی پر قبضہ کر لیا جس میں اس وقت تک نواب محمود خاں فروکش تھے۔ گنواروں نے خوب سول لائنز کی کوٹھیاں لوٹیں۔

اب ڈونڈی پٹی "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم چودھری نین سنگھ بجنور والے اور ہلدور کے چودھریوں کا" ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے محلے لوٹنے شروع کئے۔

"مذہبی عداوت کا جو بیج شیر کوٹ میں بویا گیا تھا بہت بلند ہو گیا۔ چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ

اس بات کے درپے تھے کہ ہندو مسلمانوں کی تکرار نہ بڑھے۔ مگر وہ گنوار چودھریوں کی حیثیت کیا سمجھتے تھے۔"

نواب محمود خاں نے پھر بجنور پر فوج کشی کا بندوبست کیا۔

"دو دفعہ غلغلہ پڑا کہ نواب چڑھ آیا۔ چودھری نین سنگھ جو کنوئیں میں سے روپیہ تلاش کرنے کو بیٹھے تھے ایسے بے اوسان گھر پہنچے کہ سب کی جان ہوا ہو گئی۔" سید احمد خاں' سید تراب علی اور پنڈت رادھا کشن جواب تک اپنے اپنے مکانوں میں دروازے بند کئے بیٹھے تھے ان کو یقین ہو گیا کہ نواب ان کی جان نہیں بخشنے کا۔ چنانچہ یہ تینوں چودھری نین سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ ہلدور پہنچے اور وہاں سے انہوں نے اور چودھری صاحبان ہلدور نے میرٹھ عرضیاں بھیجیں کہ انگریزی فوج بجنور بھیجی جائے۔ وہاں سے مسٹر ولسن جج و اسپشل کمشنر کا جو خط آیا وہ قابل غور ہے۔

"رفعت و عوالی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ سلمہ' الرحمن۔ اس قدر ظلم و غارت گری جان و مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب رؤسا ہنود یک دل ہو کر کیوں ان کو نکالتے۔ اب تم سب ہنود نے اتفاق کر کے اس ظالم نواب کو نکال دیا۔ اب بفضل خدا سب تکالیف تمہاری جلد رفع ہو جاتی ہیں۔ شیکسپیئر صاحب بھی پہاڑ سے بلائے گئے ہیں اور ہم تھوڑی فوج معتبر لے کر عنقریب آویں گے۔ حال لگانے توپ کا آپ کے مکان پر بہ نسبت بھانجہ نواب ظالم جو آپ نے لکھا ہے سو اہل ہند جنہوں نے توپ نہیں دیکھی وہ توپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر یہ پٹھان لوگ تم اہل ہندو پر توپ لگا دیں تو یہ تدبیر کرنی چاہیئے کہ............" وغیرہ وغیرہ۔

سید احمد خان اور محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر ہلدور سے بجنور آئے اور ضلع کا انتظام بحکم ولسن صاحب اپنے ہاتھ میں لیا۔ "جب ضلع ہمارے سپرد ہوا میری رائے یہ تھی کہ پرانے الفاظ منادی کے یعنی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا' حکم کمپنی بہادر کا۔" بدلے جاویں اور پکارا جاوے کہ ملک ملکہ وکٹوریہ شاہ لندن کا تاکہ عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھیں کہ در حقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے۔ لیکن بلا اجازت حکام' اس باب میں رائے دیگر دوسرے وقت پر موقوف رکھی۔"

محمد رحمت خاں و سید احمد خاں نے ۱۷ اگست کی رپورٹ میں مسٹر جارج پامر کو مطلع کیا کہ سوا پرگنہ نجیب آباد سب طرف امن ہے۔ قصبہ نہٹور اور سیوہارہ وغیرہ میں کچھ لوگ بہ ارادۂ فساد جمع ہوئے تھے ان کو متفرق کرنے کے لئے تدبیریں کی گئی ہیں۔ محمود خاں جنگ کی تیاری میں مصروف تھے کہ محرم آ گیا۔ جس میں مزید فساد ہونا لازمی تھا۔ سکھ رجمنٹ مظفر نگر پہنچنے والی تھی۔

نگینہ میں بشنوئیوں[22] اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی۔ احمد اللہ خاں نے یکم محرم' ۲۲ اگست توپ نکالی۔ محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ نگینہ پہنچ کر بشنوئی سرائے پر توپ لگا دی۔ بشنوئی مکان جلا دیئے گئے۔ سید تراب علی تحصیلدار کے قتل کا حکم دیا۔ مگر چونکہ سب پٹھان سید کا قتل برا سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی جان بخشی ہو گئی۔ ۲۶ اگست کو احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے ہلدور پر چڑھائی کے ارادے سے نہٹور کوچ کیا۔

۲۷ اگست کو چودھری رندھیر سنگھ وغیرہ نقارہ بجاتے' نشان اڑاتے' توپ اور جزائیل کے ساتھ مقابلے کو روانہ ہوئے۔ نہٹور سے احمد اللہ خاں کا لشکر چلا۔ بان ندی پر مقابلہ ہوا۔ چودھری صاحبان پسپا ہو کر ہلدور میں داخل ہوئے۔ جہاں خندق کھدی تھی۔ دمدمہ بنا تھا۔ یہ توپیں لارڈ لیک نے نواب احمد بخش والی فیروز پور جھرکہ کو دی تھیں اور چودھریوں نے نیلام شمس الدین خاں کے وقت خریدلی تھیں' اب نواب کی توپ نے گولہ باری شروع کی۔ ہلدور میں زبردست آگ لگی۔ اس کے بعد احمد اللہ خاں بجنور آ گئے۔

احمد اللہ اور ماڑے خاں کا ارادہ تھا کہ ہلدور فتح کرکے تاجپور پر چڑھائی ہوگی۔ نہٹور میں منادی ہو گئی تھی کہ ہلدور اور تاجپور کی لوٹ معاف ہے۔ دوسرے روز ہلدور میں قتل عام ہوا۔ سارا ہلدور جل گیا۔ "پھونس کا نام ہلدور سے جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھونس کا تنکا اپنا گھونسلہ بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا۔"

اس وقت سید احمد دہلوی اور سید تراب علی ہلدور میں چودھریوں کی حویلی کے اندر پناہ گزیں تھے۔ ۲۹ کی رات بدقت تمام پیادہ پا وہاں سے نکلے اور باغیوں کی یورش جھیلتے' موت کے منہ سے بچتے میرٹھ پہنچے۔ ۳۰ اگست کو احمد اللہ خاں نے ہلدور پر حملہ کر دیا۔ لیکن جب گڑھی فتح نہ کر سکے تو نہٹور پہنچے۔ کیم ستمبر کو نہٹور سے بجنور کوچ کیا۔

ہلدور کے دوسرے معرکے کے بعد تمام ضلع پر نواب محمود خاں کا تسلط قائم ہو گیا۔ کچہری کی نئی مہریں بنیں جن پر "واللہ ملک السموات" بڑھایا گیا۔ سنہ عیسوی کے بجائے سنہ ہجری اور ضلع بجنور کے بجائے حکومت نجیب آباد لکھا گیا۔ نواب کے معتمد سعد اللہ خاں تحصیلدار نگینہ نواب کی طرف سے چودھریوں سے صلح صفائی کرنے کی غرض سے نہٹور گئے مگر چودھریوں نے صلح نہ کی۔ ۱۸ ستمبر کو ہلدور کے چودھری نواب سے پھر لڑے اور پھر ہار گئے۔ اب سعد اللہ خاں نے ان کو لکھا۔ غور فرمائیے کہ قدیم وضعداری اور اخلاق کا کیا عالم ہے۔

"چودھری صاحب مشفق و مہربان دوستاں سلمہ' اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام شوق واضح ہو خط تمہارا پہنچا۔ حال دریافت ہوا۔ ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ایام کچھ برے آ گئے ہیں۔ ورنہ ہرگز تم سے ایسی بات ظہور میں نہ آتی کہ تم مجھ سے اندیشہ کرتے ہو۔ اور میں تم کو اپنے فرزند سے کمتر نہیں جانتا۔ جبکہ تم میرے کہنے سے باہر ہو تو پھر کیا علاج کروں۔ چاہئے کہ بلا اندیشہ تم میرے پاس نگینہ چلے آؤ۔ اور اگر ایسی ہی لیت و لعل میں رہو گے خراب اور برباد ہو جاؤ گے۔ جب تم مجھ کو اپنا مربی جانتے ہو تو پھر کیا خوف ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

صلح صفائی کی اس کوشش کے بعد نواب محمود خاں کا بڑا بیٹا غضنفر علی خاں مع ماڑے خاں و لشکر کے نہٹور روانہ ہوا تاکہ اگر چودھری صاحبان حاضر نہ ہوں تو ہلدور پھر تباہ کر دیا جائے۔ اب نہٹور کے لیکھ راج سنگھ وغیرہ کے ذریعے چودھری رندھیر سنگھ کو پیغام بھیجا گیا۔ اور وہ نہٹور آنے پر راضی ہوئے۔ ۲۵ ستمبر کو انہوں نے نہٹور میں نواب غضنفر علی خاں سے ملاقات کی۔ ایک پیش قبض اور پچاس روپے گزرانے۔ غضنفر

علی خاں نے ایک دوشالہ بطور خلعت دیا۔ پھر چودھری امراؤ سنگھ بھی نجیب آباد گئے۔ نواب محمود خاں کو اشرفیاں نذر کیں۔ نواب نے دوشالہ عطا کیا۔

چودھری امراؤ سنگھ شیرکوٹ سے نجیب آباد روانہ ہوئے ہیں کہ غضنفر علی خاں اور ماڑے خاں نے دوبارہ ہندوؤں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ہلدور پر حملہ کیا گیا۔ ہلدور کی تیسری لڑائی میں گڑھی فتح ہو گئی۔ ۲ نومبر کو احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا۔ چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر کے نجیب آباد لے گئے۔ چودھریوں کے مکانات جلا دیئے گئے۔ ہلدور میں الو بولنے لگا۔

۲ نومبر کو ہلدور روانگی کے وقت شیخ ماڑے خاں نے چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور کو خط لکھا۔

"چودھری صاحب مشفق و مہربان کرم فرمائے من بہرحال نیاز منداں چودھری پرتاپ سنگھ سلمہ' اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق اینکہ ارادہ لشکر اینجانب بطرف تاجپور است کہ آں صاحب تدبیر رسد وغیرہ سازند چناں نشود کہ بہ کسے نہج تکلیف مردمان لشکر راشود۔ باقی خیریت است۔

فقط رقیمہ الشوق

ماڑے خاں۔ از مقام چاندپور"

یہ پروانہ ملتے ہی بے چارہ چودھری ڈر کر گڑھ مکتیشر چلا گیا۔

اب احمد اللہ خاں نے تحصیلداران ضلع کے نام پروانہ جاری کیا جو معافیات عہد انگریزی میں ضبط ہو کر جمع مقرر ہو گئی ہیں وارثان کو معاف و بحال رکھی جائیں گی۔

۱۶ فروری ۱۸۵۸ء کو شیکسپیئر و پامر صاحبان رڑکی پہنچے۔ چودھریان ضلع بجنور نے جو گنگا پار پناہ گزین ہو چکے تھے ان سے رڑکی جا کر ملاقات کی۔ رڑکی میں انگریز سرکار روہیلکھنڈ پر حملے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ادھر بجنور میں غضنفر علی خاں اور ماڑے خاں کے مابین نئی مقبوضات کی ملکیت کے بارے میں جھگڑے شروع ہو گئے۔

فتح لکھنؤ کے بعد سر کولن کیمپ بل نے فوج روہیلکھنڈ بھیجی۔ بریگیڈیر جونز کی قیادت میں گورا اور سکھ فوج نے ۱۴ اپریل کو گنگا پار اتر کر نواب محمود خاں کے لشکر کو شکست دی۔ نواب کے سپاہی منتشر ہو کر جنگلوں میں جا چھپے۔ جب انگریزی فوج مالن ندی پر پہنچی تو نواب کی طرف سے تین توپ کی آواز آئی۔ مگر نجیب آباد خالی ہو چکا تھا۔ شہر میں آگ لگا دی گئی۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں "نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح سے شہر کا جلانا منظور نہ تھا۔ شاید اتفاقیہ آگ لگی۔"

نواب محمود خاں کا محل بارود سے اڑا دیا گیا۔ ۲۳ کو نواب کے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو بحکم جنرل جونز گولی مار دی گئی۔ ماڑے خاں' احمد اللہ خاں اور دلیل سنگھ گوجر اور دوسرے باغیوں نے آخری مورچہ نگینہ میں لگایا۔ اس میں بھی سرکار کو فتح و نصرت حاصل ہوئی۔ شیکسپیئر و پامر صاحبان مع توپہائے غنیمت نگینہ بفتح و فیروزی بجنور میں داخل ہوئے۔ پھر انگریزی لشکر نے مراد آباد کوچ کیا۔ ۲۶ تاریخ

سے سید احمد نے کچہری صدر اپنی کھول دی۔ انتظام ضلع حیرت انگیز سرعت سے درست ہو گیا۔ تجارت جاری ہو گئی۔

گیارہ ماہ تک روہیلکھنڈ آزاد رہا۔ جب مئی ۱۸۵۸ء میں انگریزی افواج چاروں طرف سے روہیلکھنڈ میں داخل ہوئیں اس وقت خان بہادر خاں کے غازیوں اور ہائی لینڈرز کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ادھر سے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ، شہزادہ فیروز بخت اور ملکہ حضرت محل کی افواج نے شاہجہانپور پر حملہ کیا مگر بریگیڈیر جونز ظفرمند رہا۔ مولوی احمد اللہ شہید ہوئے۔ نواب محمود خاں کو کالے پانی کی سزا ہوئی مگر انھوں نے جیل میں انتقال کیا۔ بوڑھے خان بہادر خاں بریلی میں تختہ دار پر چڑھے۔ فرخ سیر کا نواسہ فیروز بخت مراد آباد میں خستہ حال فاقہ کرتا فقیروں کے بھیس میں لڑتا پھرا۔ آخر شکست کھا کر ایران چلا گیا اور سنتے ہیں وہاں سے زار روس کی عملداری میں پناہ لی۔ میں میر احمد علی یہ سب واقعات دہراتا ہوں تو دل خون ہوتا ہے۔

ہم اس جنگ میں کیوں ناکام رہے؟ مراد آباد برطانیہ کے وفادار نواب رامپور کے زیر اثر تھا۔ بجنور میں ہندو مسلم خانہ جنگی ہوئی۔ (گو سارے ہندو انگریزوں کے حمایتی نہ تھے۔ بجنور کے راجپوت باغیوں میں ہمارے رائے بھوپ سنگھ پیش پیش تھے۔) بغاوت کے بیشتر قائدین کے ذاتی مقاصد جداگانہ تھے۔ کچھ اپنا تاج و تخت واپس حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کوئی آپس میں متفق نہ تھا۔ ادبار نے عقلیں سب کی زائل کر دی تھیں۔ جنگ حمقاء باد انایان فرنگ۔

آپس کی پھوٹ ہندوستان کا پرانا خاصا ہے۔ اس پھوٹ نے اس سرزمین فردوس نشان کو ہمیشہ تباہ کیا۔

کجاست فکر حکیمے ورائے برہمنے؟

۹۔ باغی سپاہی

ایک شخص نامعلوم نحیف الجثہ، طویل القامت، سفید فام، سیاہ داڑھی، صورت سے خوش مزاجی اور نیک دلی ہویدا ہے۔ طالع سازگار ہو تو طبیعت باغ و بہار ہے۔ بذلہ سنج، ظریف طبیعت، ہنس مکھ، مگر قسمت یاور نہیں۔ کیا جانئے کون ہے۔ مسافر ہے یا رہزن ہے کہ مردان غیب سے ہے یا محض ایک خانماں برباد آوارہ وطن ہے۔

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کر اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

یہ روح عصر تو نہیں؟

بندوق سنبھالے منہ دلائی میں چھپائے سردی سے کانپتا بانس کے جھنڈ میں پہنچ کر راستہ بھول گیا۔ راستہ بھول کر ان جنگلوں میں مہاراجہ وشنیت کو شکنتلا مل گئی تھی۔ یہاں ہو کا عالم طاری ہے۔ گیدڑ چلا رہے ہیں۔ کہاں کی شکنتلا۔ سب خام خیالی، طلسم، واہمہ، داستان طرازی۔ حقیقت محض وہ ہے جسے لندن کلکتے اور بمبئی کے انگریزی اخباروں میں چھاپے کی کلیں کھٹاکھٹ چھاپ رہی ہیں۔ سیسے میں ڈھلے حروف سر سر کرتے زنانے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

صریر خامہ نوائے سروش وروش کچھ نہیں۔

شوالک پر کہرا اس طرح رواں ہے جیسے گنگا جی آنسو بہاتی شیوجی کی جٹاؤں میں واپس جاتی ہوں۔ بہت سیر دھرتی کی کرلی۔ بری جگہ ہے۔

کچھ فاصلے پر گاگن ندی نظر آئی۔ شخص مذکور نے آسمان کو دیکھا۔ ہلکی سی سرخی ابھی باقی تھی۔ کنارے پر جا کر اکڑوں بیٹھا۔ فوجی بوٹ اتارے۔ پٹیوں پر سے گرد جھاڑی۔ وضو کیا۔ نماز مغرب ادا کی۔ سلام پھیرا اور کچھ دیر تک وہیں گھاس پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس طرح جب وہ خاموش پانیوں کے کنارے بیٹھا صیہوں کو یاد کر کے روتا تھا۔ ناگاہ ایک ہیولا پانی کے برابر چلتا دھندلکے میں جاتا نظر آیا۔ معادل میں پکارا یا ابو العباس۔

سونچا جا کر قدم لے۔ رہبری کی التجا کرے۔ پھر خیال آیا۔ خاموشی بہتر ہے۔ اگر خواجہ خضرؑ ہیں ہدایت خود بخود مل جائے گی۔

کچھ دور جا کر ہیولا ٹھٹکا۔ پلٹ کر مسافر کی طرف بغور دیکھا اور یکلخت کہرے میں غائب ہو گیا۔

رات ہوئی۔ مسافر نے زنبیل میں سے تھوڑی سی بھنی مچھلی نکال کر کھائی۔ ٹین کے فوجی مگ میں پانی بھر کے۔ پیا اونی اوور کوٹ کی آستین سے منہ پونچھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ ندی کنارے سے اٹھا اور ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔

چلا چل چلا چل جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اچانک سامنے ایک شکستہ محراب نظر آئی۔ تھکا ہارا اس کے نیچے جا بیٹھا۔ عمارت منہدم ہو چکی تھی فقط محراب باقی تھی۔

شخص مذکور نے ٹانگیں پھیلائیں۔ کمر کھولی۔ پنڈلیوں کو دبایا۔ چلتے چلتے پاؤں سوج چکے تھے۔

چاند نکلا۔ عجیب بیہودہ سا چاند تھا۔ لاغر، فاقہ زدہ، یرقان کا مارا، اٹھائی گیرا، خدائی خوار۔

روشنی تیز ہوئی۔ گویا چراغ میں تیل پڑا۔ آسمان کے طاق میں رکھا کنول منور ہوا۔

ترائی کی سمت سے شیروں کے گرجنے کی آواز آئی۔

شخص مذکور نے اللہ اللہ کا ورد شروع کیا کہ "اللہ" اسم جلالی ہے۔

گرمی سی محسوس ہوئی۔ پھر سردی کی لہر آئی۔ دانت سے دانت بجنے لگے۔ آنکھیں بند کرلیں۔
آنکھیں بند کرلیں تو چند لمحوں بعد پپوٹوں کے اندر سرخ روشنی سی معلوم ہوئی جیسے مشعلیں جلتی ہیں۔

پھر ایسا لگا جیسے سامنے ایک چوک ہے۔ چاروں طرف کاشی اینٹوں کے مکانات۔ دیواریں ان کی سبز اور سمرقندی ٹائیلوں سے مزین۔ ان کی سفالی نقاشی تک بہت صاف دکھلائی دے رہی ہے۔ ایک مکان کہ سب سے اونچا تھا۔ اس کے پھاٹک پر ایک حبشی تازیانہ لئے مستعد ہے۔ چبوترے پر نفیری اور نقارے بجانے والے بندروں کی مانند اکڑوں بیٹھے ہیں۔

مکانوں کی آئینہ بندی کی گئی تھی۔ چوک کے وسط میں سفید رنگ کا سراپچہ تنا تھا۔ اندر کافوری شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ جاجم اور شطرنجی کے فرش پر صندلیاں رکھی تھیں۔ پیچھے ان کے مصور کاشانی پردے آویزاں تھے۔ بہت دھوم دھام معلوم ہوتی تھی۔

مگر سناٹا۔ آواز ایک سنائی نہیں دیتی۔ عجیب کرشمہ ہے۔ ایک محافہ لاکر ڈیوڑھی پر رکھا گیا۔ ایک گل چہرہ حسینہ' سرخ سفید رنگ' مصنوعی خال ذقن تھوڑی پر نمایاں' کلاہ ترکی کے نیچے متعدد باریک چوٹیاں گندھی ہوئی شانوں پر پریشان۔ تافتہ کی سرخ قبا کے اوپر اونی قلمی پہنے' مرصع زیورات' کلائیوں پر گوہر کش' گلے میں ست لڑا نقاب پوش نہیں تھی۔ لاہوری شال پستئی رنگ کی اوڑھے جس سے غازہ آلود چہرہ ذرا اوٹ میں تھا۔

محافے سے اتر کر پھاٹک کے اندر گئی۔ چوک رنگارنگ سامان سے بھر گیا۔ پٹارے' جامہ دان' بوغ بند' چھتری دار' نقرئی چھپر کھٹ جس پر زریں اوقچہ بچھا ہوا۔ اوقچے کے اوپر بستوق رکھے۔ نقرئی ظروف ٹوکروں میں پیچھے پیچھے لائے گئے۔ ہجوم بڑھتا گیا۔ مگر وہی خاموشی۔

آنکھیں اس ڈر سے نہ کھولیں کہ طلسم ختم نہ ہو جائے۔

یاد آیا کہ بچپن میں سنا تھا کہ بچپن میں ایک نادار بڑی بی سلائی کرکے بسر اوقات کرتی تھیں۔ ایک شام پالکی لے کر دو کہار آئے۔ بولے ہمارے ساتھ چلئے۔ صاحبزادی کی شادی کا جوڑا سینا ہے۔ ضعیفہ عفیفہ برقع سر پر ڈال پالکی میں سوار ہوئیں۔ پالکی بستی سے نکلی۔ بہت دیر ہو گئی۔ ضعیفہ نے گھبرا کر باہر جھانکا تو جنگل بیابان۔ کہاروں کے بجائے بکر گدھوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ پل کے پل میں بکر گدھوں نے جنگل کے اندر ایک محل کے سامنے جا اتارا کہ شاہ جنات کا قصر تھا وغیرہ وغیرہ۔

یا مظہر العجائب۔ کیا ہم نے ابھی ابھی جنوں کی کارفرمائی دیکھی؟

آنکھیں کھولیں تو وہی سنسان ڈھاک' کا جنگل۔ بغور دیکھا تو سامنے قدیم عیدگاہ نظر آئی۔ جس کی دیوار چاندنی میں چمک رہی تھی۔ یاد آیا کہ یہ جانی پہچانی جگہ ہے۔ یہیں سے علاقہ صادق پور شروع ہوتا ہے۔ اسی جگہ پر سید حسن ترمذی کی قبر تھی۔ جو پچھلی کسی یلغار میں مسمار ہوئی۔ اب اینٹوں کا ایک تودہ باقی ہے۔

جاڑوں کی ایسی ہی سرد اور طویل راتوں میں دادی اماں قصہ سناتی تھیں۔ "ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ہمایوں کے زمانے سے بھی پہلے اس جگہ پر قاضی چمن کا مکان تھا۔" بڑے ہو کر اس قدیم فارسی صحیفے میں پڑھا: "یہاں مدرسہ اسلامی و عربی فرماں روائے وقت کی طرف سے جاری تھا۔ سید ضیاء الدین جو سرکار سنبھل میں منصب چہار ہزاری افغانان پر فائز تھے اس قصبے میں تعینات تھے۔"

ضیاء الدین صاحب پھر واپس آگئے؟ وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔ فلاسفہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ہمارے سارے اجداد ہمارے اندر زندہ ہیں۔ جسمانی اور مابعد الطبیعاتی دونوں طرح۔

ہم خود اس وقت میر ضیاء الدین کی آنکھوں سے اس سرد ویرانے کو تک رہے ہیں۔ ضیاء الدین کی آنکھیں اور ہماری آنکھیں ایک ہیں۔ ہمارے ہاتھ کسی اور نگڑ دادا کے ہاتھ ہیں۔ دماغ' عقل و فہم یا نافہمی کسی اور پرکھے کی عقل یا نافہمی ہے۔

خون ہزارہا برس سے ان شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ تجدید الخلق۔ سوچ کر پھریری سی آجاتی ہے۔ مولانا روم نے کیا فرمایا تھا؟ کچھ ضرور فرمایا تھا۔ یاد نہیں آرہا۔ حافظہ کمزور ہو چلا۔

چہار ہزاری افغانان پر فائز تھے۔ مدرسہ پہلے قاضی ابو محمد بن قاضی قطب الدین عرف قاضی چمن کے زیر انتظام تھا۔ میر ضیاء الدین کے فرزند اکبر میر حسن اسی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ قاضی صاحب کی دوستی میر ضیاء الدین سے بہت استوار تھی۔ جیسے آج کل ضلع کے جج اور کلکٹر میں دوستی ہوتی ہے۔

سید حسن تکمیل تعلیم کے بعد منصب سہ ہزاری پر فائز ہوئے۔ قاضی صاحب نے اپنی دختر سیدہ مہرالنساء سے ان کے عقد کی خواہش ظاہر کی۔

کتاب میں لکھا ہے کہ میر ضیاء الدین نے چندے سکوت اختیار کیا۔

قاضی چمن نے متعدد بار یاد دہانی کرائی۔ بارے میر ضیاء الدین نے منظور کیا۔ سید حسن کی شادی بصد کروفر مہرالنساء خاتون سے ہوئی۔ بیٹی پیدا ہوئی۔ نام جاوید دولت رکھا گیا۔ کہ اب تک نام ترکستانی رکھے جاتے تھے۔

ایک لڑکا محمد عارف تولد ہوا۔ دونوں بہن بھائی ناکتخدا جوان مرے۔ مہرالنساء اولاد کے غم میں روتے روتے اللہ کو پیاری ہوئیں۔

بعد کچھ عرصے کے میر حسن بسلسلہ کار منصبی مع لشکر کیتھل روانہ ہوئے کہ اولین جائے ورود و قیام ان کے مورث اعلیٰ شاہ کمال الدین ترمذی" کا تھا۔ اس تاریخی قصبے میں متعدد اولیاء کے خانوادے آباد تھے۔ ان میں ایک خانوادہ شاہ جمال" کا تھا کہ امام باقر علیہ السلام کی اولاد تھے۔ ان کے اخلاف میں سید محمد احسن باقری کیتھلی سے سید حسن کی ملاقات ہوئی۔ ان کی بیٹی سیدہ سعید النساء کو بیاہ کر سید حسن نہٹور واپس تشریف لائے۔

قاضی چمن کے مشورے سے مدرسے کے مکان میں قیام کیا۔

کتاب میں آیا ہے کہ اس وقت مدرسہ عالیہ کی عمارات شہریار وقت کی طرف سے وقف تھیں۔

بعد ازاں میر ضیاء الدین کے نام منتقل کی گئیں۔ اسی اثناء میں' مشہور واقعہ ہے کہ میر ضیاء الدین شاہی فوج لے کر پورب روانہ ہوئے جہاں راجہ کھیرا گڈھ حکومت سے منحرف ہوا تھا۔ معرکے میں شہید ہوئے۔ بعد شہادت پدر میر حسن نے کہ سنبھل میں تعینات تھے ملازمت شاہی ترک کی۔ جب میر حسن اپنے پرودگار کی طرف لوٹے مزاران کانشور کے باہر جانب غرب اسی عید گاہ کے نزدیک تعمیر ہوا۔

لکھا ہے کہ سید حسن کے فرزند اکبر سید علی گھوڑا بخش کی شادی سیدہ شوکت النساء دختر سید محمد باقر عامل شاہی سے ہوئی' ان کے بیٹے سید محمد تقی نے سید اسد اللہ زیدی کی لڑکی فضیلت النساء سے عقد کیا۔ سید اسد اللہ زیدی بھی سرکار سنبھل میں عہدیدار اور امروہے میں تعینات تھے۔ سادات بارہہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ دور مغلیہ تھا۔

فتوئی اور اوور کوٹ کے باوجود ٹھنڈ سے جسم ہے کہ اکڑا جا رہا ہے۔ ایک ماچس جلائی جائے۔

چند خشک پتے اور ٹہنیاں جمع کر کے الاؤ سلگایا۔ ذرا جان میں جان آئی۔ ٹانگوں کو آرام ملا۔ نیم غنودگی طاری) ہوئی۔ شعلوں میں سرخ رنگ کی ایک فلک بوس عمارت سی نمایاں ہوئی۔ غور سے دیکھا تو قلعہ اکبر آباد تھا۔

جیسے ایک کنگھرا سا ہے۔ سنگ سرخ کا۔ اس میں ایک شاندار بزرگ کھڑے ہیں۔ ہو نہ ہو یہی مفتی صدر جہاں ہیں۔ نبیرہ کمال الدین ترمذی۔ وہی ہوں گے۔ وگرنہ ہمیں کیوں نظر آتے' رومی خلعت چار قب، اور دوشالہ ملائم اور گرم۔

کس قدر سردی ہے۔ لوئی ہماری شکستہ ہو چلی۔ بوٹ چلتے چلتے' بھاگتے بھاگتے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔

چند پتے تھے سو جل کر خاک ہوئے۔ ایک دیا سلائی اور جلایا چاہیئے۔

کیا خوشگوار دل خوش کن منظر ہے۔ آہاہا۔ مفتی صاحب مرصع خنجرو شمشیر خلعت خاصہ ڈانٹے کھڑے ہیں۔ بھئی بہت اچھے۔ زمرۂ علماء سے ہیں مگر مالا پہن رکھی ہے۔ اس کا لعل بدخشاں گو ہر شب چراغ کی مانند۔

تیلی ختم ہو گئی۔ تیسری جلائی تو اندھیرا تھا۔

مگر ہر فرد بشر اپنے حاضرات الخیال اپنا عالم رویا رکھتا ہے جس میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہم کسی دوسرے کی موت کی تکلیف نہیں چکھ سکتے' کسی اور کے خواب ہمیں نظر نہیں آتے۔ ہر انسان کے دن رات صبح شام لمحات منفرد اور علیحدہ ہیں۔

عذاب قبر وہ سزائیں جو تم بھگتو گے' اس حس کے ذریعے سو گے جو صرف تمہاری حس ہو گی اور جو زندگی میں تمہیں حاصل نہیں۔

اس عالم سے اس عالم تک خالص اذہان فرشتے اور وحی اور الہام اور رویا بن کر آتے ہیں۔

سہروردیؒ نے کہا تھا یا ابن العربیؒ نے؟

ابھی اجنہ کی ایک جماعت ادھر سے گزری۔ سب کی صورتیں مختلف۔ رجال الغیب ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ اخیار اور ابدال اور ابرار اور اوتار اور اقطاب کے گروہ آسمان پر چل رہے ہیں۔

سارا عالم قوس قزح میں تبدیل ہو گیا۔

لاہج۔ مازندران۔ تبریز۔ گنجہ۔ باکو [24] تیز ہواؤں کے راستے' ہزاروں میل دور شمس الدین لاہجی۔ محمود شبستری [25] نجم الدین کبریٰ۔ روزبہان شیرازی۔ اس وقت تک جانے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ دنیا سے بہت دور ان کا زمانہ ہو گیا اور وہ دنیا سے بہت دور چلے گئے' شاید معدوم ہو چکے ہوں۔ کیا پتہ!

ہمائے لاہوت کا آشیانہ کہاں ہے؟

مقام نصیرا۔ مقام محمودا۔ سب کی سیر کر لی۔ انوار پہلے سبز رنگ کے ظاہر ہوئے۔ پھر سپید۔ پھر عقیق۔ سب سے آخر میں نور سیاہ کے جبروت کا نور ہے۔

اپنے برزخ میں نہ معلوم کیا تھا۔ صورت شیخ۔ ذات وجود مطلق۔ صفات۔ ساتوں امام۔ حیات اور علم اور قدرت اور ارادہ اور سمع اور بصارت اور کلام سب مبہوت بے بس۔ ناکارہ۔

جل جلالہ'

جب یار لوگوں کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ کان بند کر کے اور کھلے کانوں صوت سرمدی بھی سن لیا کرتے تھے۔ جیسے پانی مسلسل اوپر سے گرتا ہو۔ اس شغل سے ربودگی اور بے خودی اور غیبت طاری ہوتی کہ فناء الفنا کا مقدمہ تھی۔

مگر یہ جہان رنگ و بو ہی بہت دشوار گزار ثابت ہوا۔ فناء الفنا اور بقاء البقاء تک کون پہنچتا۔

ذرا سنو تو۔ پانی کیا کہہ رہا ہے۔

یہ چوک جو سامنے ہے جو صرف مجھے نظر آتا ہے۔ اس میں ہجوم اسی طرح موجود ہے۔ مدرسے کے لڑکے' شیدی' احدی' کلاہ پوش' بلخی اور عباؤں میں ملبوس بخاری۔

بی بی مہر النساء بنت قاضی چمن نافذ کی سرخ قبا پہنے' سید حسن کی دلہن۔ پالکی ان کے پھاٹک کے اندر گئی۔ زمین کے اندر اتر گئی۔

بی بی جاوید دولت۔ حال شما چہ طوری خانم؟

خاموشی ازل ہے۔

سعید النساء۔ شوکت النساء۔ فضیلت النساء' کرن پھول اور جوشن اور نورتنے اور گلوبند پہنے چھم چھم کرتی ہوئیں۔ ہزار برس کی نیونی پالکیوں سے اتر رہی ہیں۔

بی بی جاوید دولت

بی بی گل رخ' گل چہرہ خاتون ماہ نور بیگم

مٹی' مٹی۔

گرگٹ۔ مکڑ۔ کانٹے۔

سلیمانؑ بادشاہ نے قصر بنوایا۔ اس کے شہتیر کو دیمک لگ گئی۔

ایک لکڑ پر بیٹھا مکڑ دن بھر میں رتی رتی کھائے۔ تو پانچ سو برس میں تیرہ سو برس میں، تین اور چار ہزار برس میں کتنا کھائے؟

قصیٰ [26] بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی سے لے کر عدنان ثانی تک اور ان سے کئی پیڑھی قبل عدنان [27] اول تک کہ جب بخت نصر کے ہاتھوں خاتون اقوام یروشلم بیوہ ہوئی۔ خدا نے مخالفوں کا سینگ بلند کیا۔ شہرپناہ کے دروازے زمین میں غرق ہوئے۔ فاتح نے حکم دیا۔ مفتوح شرفاء کو، قاصی علوم کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ قصر شاہی کے دربار میں کھڑے ہوں۔ اور ان قیدیوں میں دانیال تھا جس نے دجلہ کے کنارے بیٹھ کر اپنے رویا دیکھے۔

اور عدنان اول سے کئی پیڑھی قبل قیدار بن اسمٰعیل کا دادا ابراہیمؑ [28] سفید گدھے پر سوار باب عشتر سے گزرتے ہوئے اپنے رویا دیکھتا تھا۔

اور ان سب کا خون چار ہزار سال سے ہماری شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ اور ان انبیا کے رویا میں ہم سب شریک ہیں۔ لیکن آل یعقوبؑ کی قسم ان میں سے بہت سے رویا ایسے ہیں کہ ان کے اور ہمارے درمیان آنسوؤں کا مینہ مسلسل برس رہا ہے۔

عابد بیمار کتنا روئے۔ ساری عمر روتے گزری۔

مولا علیؑ نے کہا تھا! "جو کچھ میں جانتا ہوں تم کو بتاؤں تو تمہارا دل دہل جائے گا۔ باؤلے ہو جاؤ گے۔"

چاندنی عیدگاہ کی دیوار سے اتر گئی۔ محراب تنہا کھڑی ہے۔ اس کی دوسری طرف عالم ملکوت ہے۔

محراب خالی چوکھٹے کی مانند افق پر آویزاں ہے۔ ایک ایک کرکے اس کی اینٹیں گرتی ہیں۔ ایک اینٹ عموماً باسٹھ چونسٹھ سال میں دیوار سے گر کر خاک میں مل جاتی ہے۔

ابھی سب موجود تھا۔ ابھی سب غائب۔

خواب اور عقاب اور قرب اور بعد اور حضور اور غیب اور جب اس کا بھی علم نہ رہے تو فناء فنا۔ دیا سلائی کی ڈبیا ختم ہوگئی۔ بریلی کے بازار سے خریدی تھی۔

شخص نامعلوم اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بندوق کندھے سے لٹکائی۔ چاند ڈوبنے والا ہے۔

تاریکی خوفناک ہے۔

روشنی

اندھیرے میں دو درخت پھانسی کی مانند نظر آرہے ہیں۔ موت کسی بہانے سے آسکتی ہے۔ مرصع خنجر کا وار۔ زندان کے دروازے پر جلاد کی دستک۔

روشنی

باصرہ منور مقدم الغائب صدیوں کے راستوں پر بندہ خاکی کے ہمراہ ہے۔

پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا۔

سارے پرند قرآن پاک کے ایک ایک حرف کی تلاوت کرکے طلوع آفتاب تک سارا کلام مجید ختم کر دیں گے۔

صبح کاذب کے دھندلکے میں دو درخت پھر تختہ دار کی صورت نظر آئے۔ شخص نامعلوم نے دلی مسرت کے ساتھ مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

یا شیخ الغائب گواہ رہنا۔ سب گواہ رہنا۔ میں مسلمان کی موت مر رہا ہوں۔

لوئی سے چہرہ چھپا کر وہ شخص تیز تیز قدم اٹھاتا قصبے کی سمت روانہ ہوا۔

۱۰۔ کجا پیلتن اور کجا پائے مور

پانچ سو برس سے محلہ سادات اس سبز جھیل کے کنارے آباد ہے۔ پانچ سو برس سے افق پر بکھری شوالک کی پہاڑیاں چاند اور سورج کے سفر کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک طرح طرح کے رنگ بدلتی رہی ہیں۔ کاسنی، گلابی، سبز، زرد، خاکی، لاجوردی، سیاہ۔ سطح سمندر سے آٹھ سو فیٹ بلندی پر بسا ہوا قصبہ نشور خوشگوار اور خوش منظر قصبہ ہے۔ جھیل کے کنارے بانس کے جھنڈ سرسراتے ہیں۔ سطح آب پر سنگھاڑے اور کنول اور نیلوفر پھیلے ہیں۔ ایک طرف ڈونگی بندھی ہے۔ گرمیوں میں بچے یہاں پیراکی اور غوطہ زنی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک سرے پر مغل طرز تعمیر کا اونچا پھاٹک استادہ ہے۔

جھیل جوڑی کہلاتی ہے۔ اس کے کنارے آخوند امام بخش نے ایک پلکھن بوئی تھی۔ سو اب وہ چھتنار ہو چکی۔ اس پلکھن کے نیچے باراتیں آکر اتریں، بیٹیاں وداع ہوئیں، باراتیں چڑھیں، بہوؤں کے ڈولے لاکر اتارے گئے۔ اول منزل کے لئے ابد کے مسافر بھی یہیں سے اٹھائے جاتے ہیں۔

پلکھن کی چھاؤں اہل محلہ کے لئے کلب گھر کا کام دیتی ہے۔ ہمارے فری مشن، اس کے سائے میں مجلس آرائی کرتے ہیں۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب دور سے پن چکی کی آواز آتی ہے آم کے باغوں میں رہٹ چلتے ہیں اور کوئل کوکتی ہے۔ اس وقت یہاں کھری کھاٹوں پر چھڑکاؤ کرکے لوگ باگ تکیوں کے سہارے نیم دراز دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ غدر کے زمانے میں یہاں کبھی ہجوم رہتا تھا کبھی بالکل سناٹا۔ زخمیوں کے کھاٹ جراح اور طبیب کے انتظار میں یہاں لاکر رکھے جاتے۔ اسی چھتنار کے نیچے بہت سے جیالوں نے دم توڑا۔

ابھی طرفین سے بندوقیں بند نہیں ہوئیں۔ باغی جہاں تہاں نہتا فرنگی ملتا ہے مار ڈالتے ہیں۔ گو جانتے ہیں پکڑے گئے تو پھانسی سے مفر نہیں۔ دار پر کھینچے کو یہ بدنصیب سربلندی کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ تلاوت قرآن کرتے کھٹ کھٹ پھانسی کی سیڑھیاں چڑھ جاتے ہیں۔ بعض روتے اور واویلا کرتے ہیں۔ میدان حشر کا سماں ہے۔

سنسان گلیوں میں لوگ قضا کے منتظر بیٹھے ہیں۔

جنوری ۱۸۵۸ء کی اس یخ بستہ رات ایک سایہ کچے راستے پر نمودار ہو کر جھیل کی سمت بڑھا۔ نہ جانے کن دھندلکوں سے نکل کر آ رہا تھا۔ منہ دلائی میں چھپائے تالاب کے کنارے آن پہنچا۔ دور جولاہوں کی جھونپڑیوں پر کہرا تیر رہا تھا۔ ایک جنگم یعنی جین سادھو ڈنڈا سنبھالے کھڑاؤں پر کھٹ کھٹ کرتا پگڈنڈی پر سے گزرا۔ چند لمحوں میں صبح ہو جائے گی۔

بنجارا چاند جو رات بھر اونچے پھاٹک کے اوپر منڈلاتا رہا تھا پھیکا پڑ کر اچانک غائب ہو چکا تھا۔ جیسے ہوا کے سرد جھونکے سے شہ نشیں پر آویزاں قندیل بجھ جائے۔ سارے میں بڑا دہشت ناک سناٹا طاری تھا۔ سوتا سب سنسار جاگتا پاک پروردگار۔ شخص نامعلوم پھاٹک میں داخل ہوا۔ چند قدم آگے بڑھ کر ایک شاندار ڈیوڑھی پر پہنچا۔ مہیب چوبی دروازے پر دستک دی۔

نزدیک کی گلی میں کوئی کھانسا۔ شخص نامعلوم نے چوکنے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ دوبارہ دستک دی۔

چند منٹ بعد اندر کنڈی کھڑکھڑائی جیسے گھپ اندھیرے میں کوئی بڑی دقت اور خوف کے ساتھ تالا ٹٹولتا ہو۔ ایک نسوانی آواز بڑبڑائی۔ "جل تو جلال تو۔"

کواڑ کی درز میں سے ماما نے باہر جھانکا۔

"صاحب کمال تو۔" آواز حلق میں پھنس گئی۔ ڈیڑھ سال سے بمشکل کوئی رات ایسی جاتی تھی جب مصیبت' تباہی' موت' طرح طرح کے بھیس بدلے سامنے نہ کھڑی ہو۔

"آئی بلا کو۔"

"تحصیلدار صاحب ہیں؟" اجنبی نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ٹال تو۔"

"بڑی بی۔ اے بڑی بی۔" نووارد کی آواز میں ایسی لجاجت تھی کہ بڑھیا کا دل لرز گیا۔

"کون ہو میاں....؟"

"کلکٹر صاحب کا ہرکارہ ہوں گا اور کون۔ بجنور سے آیا ہوں سیدھا۔"

ماما کو یقین نہ آیا۔

"بڑی بی۔ تم گلشن تو نا ہو؟"

اصیل خاموش رہی۔ اللہ جانے کس جھاڑو پیٹے' سکھ فرنگی نے بھیجا ہے.... یا باغیوں کا جاسوس ہے گا۔

"اری نیک بخت۔ باہر پالا پڑ رہا ہے۔ میں تحصیلدار صاحب کے لئے پروانہ لایا ہوں۔ دروزہ تو کھولیو ذرا۔ تحصیلدار صاحب ہیں گے اندر؟"

"مجھے مالوم ہی نا بھیئے۔ میں تو جوڑی پار سے کل ہی آئی۔" ماما صفا جھوٹ بول رہی تھی۔ اجنبی

کو یک لخت طیش آ گیا۔ بندوق کی نال کواڑ پر ٹکا کر بولا' "تالا کھولیو سیدھی طرح۔"

"یا علیؑ مدد۔" ماما نے دہل کر فوراً تالا کھول دیا۔ نووارد نے کواڑ زور سے دھکیلا اور ڈیوڑھی کے اندر داخل۔ بوڑھی اصیل گرتی پڑتی سرپٹ صحن کی طرف بھاگی۔ اجنبی نے کنڈی چڑھا' دروازہ مقفل کیا اور ڈیوڑھی کے ایک کونے میں دبک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

دیوار کی دوسری جانب مویشی خانہ اور اصطبل تھا۔ بھوسے کی مہک سے اجنبی کو چھینک آ گئی۔ گھبرا کر چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور آیت الکرسی شروع کی۔

کچھ دیر بعد بندوق اٹھائے کنٹوپ اور دگلہ پہنے لالٹین ہاتھ میں لئے تحصیلدار صاحب ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے میں آ کر جھانکے۔ گرجدار آواز میں پوچھا۔ "کون ہے۔ ہینڈز اپ" دو نالی بندوق اجنبی کے رخ کر دی۔

شخص نامعلوم اپنی بندوق ایک طرف پھینک کر بھوسے کے ڈھیر پر سے اٹھا۔ آہستہ سے بولا۔

"السلام علیکم بھائی جان۔"

میر بندے علی نے ہکا بکا ہو کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا' کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ خستہ حال' پھٹے جوتے پہنے' گرد آلود' قزاقوں کی طرح منہ پر ڈھاٹا باندھا' مفرور قیدی سا' پیا سا' دلارا' ناززوں میں پلا بھائی احمد علی؟ دفورِ مسرت اور غم سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلا رندھ گیا۔ یا الٰہی خیر کیجیو۔ جانے غریب پر کیا بپتا پڑی۔ ہمیشہ کا خودسر' ضدی' خود رائے۔ کالوں کے غدر میں یہ سرپھرا جا کے باغیوں میں مل گیا تھا۔ خبر آئی تھی کہ دلی میں مارا گیا۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ احسان کہ زندہ ہے۔ اگر وہی ہے۔

"بھائی جان...." اجنبی نے مضبوط آواز میں دھیرے سے کہا۔

"ہم آپ کو ایک خوشخبری سنانے آئے ہیں۔"

"کیا...؟ سامنے آ کر بات کرو۔" ڈپٹ کر کہا۔ لالٹین اونچی کر دی۔ باغیوں کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔

"ہم کو سزائے موت مل چکی ہے۔ جام شہادت پینے والے ہیں ہم۔" اجنبی نے لوئی منہ سے پرے ہٹا کر روبرو آتے ہوئے کہا۔

میر بندے علی کو چکر سا آ گیا۔ کواڑ کا سہارا لیا۔

آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہی ہے' ہمیشہ کی طرح ہنس مکھ' بشاش۔ پہلے خیال آیا حسب عادت لطیفہ سنا رہا ہے۔ پھر حلیئے پر نظر ڈالی۔ پھانسی کا حلقہ آنکھوں کے سامنے کوندگیا۔ نیچے نظر گئی۔ ایک موٹے رسے کا ڈھیر حلقے کی صورت بھوسے کے انبار پر قدموں ہی میں پڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اب تک ۲۸ باغیوں کو پھانسی لگ چکی تھی۔ حلق سے آواز نہیں نکلی۔

شخص مذکور نے بڑے اطمینان و بشاشت سے' سرگوشی میں گفتگو جاری رکھی۔ "بھائی جان۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم جیل خانے سے نکل بھاگے۔ پھانسی تو پچھلے ہی مہینے لگنے والی تھی ہمیں۔ مگر ہم نے تہیہ

کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح ایک بار گھر آکر آپ سب کو خدا حافظ کہہ لیں' بھابیوں اور بچوں سے رخصت ہو لیں' تو بہتر ہو گا۔"

مارے تہذیب کے بڑے بھائی سے یہ تھوڑا ہی کہہ سکتے تھے کہ اپنے بی بی بچوں سے بھی رخصت ہو لیں۔ بی بی اور بڑا لڑکا سید جلال الدین[29] حیدر مین اس وقت اندر دالان میں روئی کے پردوں کے پیچھے محو خواب تھے۔ بے چاروں کو کیا پتہ کہ باہر کس قدر خوفناک ڈرامہ ہو رہا ہے۔ پھانسی کا سزا یافتہ شوہر اور باپ ڈیوڑھی میں موجود ہے۔

"چھوٹی بھابی[30] جان کی طبیعت اب کیسی ہے۔" نارمل آواز میں بات جاری رکھی گویا قید فرنگ سے نکل بھاگنا اور واپس کال کوٹھری میں جانے کا ارادہ رکھنا روز مرہ کی معمولی باتیں ہیں۔

"یہاں تک کیسے آئے؟" بندے علی نے بجھی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ لالٹین زمین پر رکھ دی۔

"بڑی ترکیب سے فرار ہوئے۔ لمبی داستان ہے۔ پھر کبھی سنائیں گے۔" اچانک خاموشی۔ پھر کبھی کب سنائیں گے؟ اجل تو بریلی جیل میں منتظر ہے۔ بہرحال بات پھر شروع کی۔ "پاپیادہ آئے۔ چھپتے چھپاتے۔ بڑی مشکلوں سے گاگن پر پہنچ کر راستہ ہی بھول گئے۔ نقشہ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ ہر طرف کھنڈر اور ملبے اور راکھ کے ڈھیر۔ بڑی غارت گری رہی یہاں؟ رات ہم نے عید گاہ والے جنگل میں سوتے جاگتے گزاری۔ خیریت رہی۔ اللہ کا شکر ہے اگر راہ میں کہیں پکڑ لئے جاتے سخت کوفت ہوتی۔ آپ کی زیارت نہ کرپاتے۔ بھابی صاحب اور دلہن بھابی کیسی ہیں؟" یہ دونوں سینئر بھابیاں میر صاحب کی پہلی دو بیبیاں تھیں۔ "سربلندی سے پہلے ہم سوچے کہ......"

اب جاکر میر بندے علی کے حواس ذرا قائم ہوئے۔ یکبارگی طیش آگیا۔ دبی آواز میں دانت پیس کر بولے "سربلندی کا بچہ۔ میاں صاجزادے جام شہادت نوش کرنے چلے ہیں۔ احمق اللذین۔ سارے سورماؤں' غازیوں کا حشر دیکھ لیا۔ آنکھیں نہیں کھلیں۔ زمانہ بھر کا بیوقوف۔ خبط الحواس۔ خبردار جو تختے کا نام لیا۔ ایسی طبیعت صاف کروں گا کہ سارا شوق شہادت ہوا ہو جائے..." یہ فرما کہ شخص مذکور کا ہاتھ پکڑ گھسیٹتے ہوئے صحن چمن کے اندر لے گئے۔ وہاں سے زنانخانے کی ڈیوڑھی میں پہنچے۔ چاروں طرف دیکھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ انار امرود اور یوکلپٹس کے درخت صبح کی ہوا میں سر سرائے۔ سفید مرغ' مرغی خانے کی چھت پر پہنچ چکے۔ شاگرد پیشے میں کھڑپڑ شروع ہو گئی تھی۔ اندر باورچی خانے میں صاحب' میم لوگ کے ناشتے کو تیاری کے لئے چولہا ابھی سے سلگ گیا تھا۔

یا مظہر العجائب! یہ صاحب میم لوگ کون؟

معزز ناظرین' انتظار کیجئے' صبر سے کام لیجئے۔

میر صاحب چھوٹے بھائی کو اسی طرح گھسیٹتے' زنانے صحن میں آکر ایک چور دروازے کی طرف لپکے جو ایندھن کے گودام کے عقب میں پوشیدہ تھا۔

دروازہ کھولا۔ نیچے ایک دم تاریک غار کی مانند زینہ تھا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے اس کی سیڑھیوں پر قدم

رکھا۔ پیچھے پیچھے دم بخود بھائی۔ ہاتھ ان کا مضبوطی سے اپنی گرفت میں رکھا۔ کہ کہیں صاجزادے ایک قلانچ بھر کے پھر بھاگ نہ نکلیں۔ انسانی دماغ کا کیا بھروسہ' نہ اس کی کوئی تھاہ۔ کیا کچھ نہیں کروا بیٹھتا۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں جو کچھ ملک میں ہوا وہ لوگوں کی الٹی سمجھ ہی کی وجہ سے تو ہوا۔

زینہ اتر کر تہہ خانہ تھا۔ اندھیرا گھپ۔ صرف ایک موکھے کے نیچے روشنی کی رمق نظر پڑی۔ وہیں ٹوٹی کھاٹ پڑی تھی۔ اس پر صاجزادے کو بٹھال دیا۔ فوراً اوپر آئے۔ باہر پہنچ کر دروازہ بند کیا۔ کنڈی چڑھائی۔ تالہ ڈالا۔ مرغی کا ایک ٹاپہ کھینچ کر دروازے کے آگے لگا دیا۔ ہاتھوں میں مٹی لگ گئی تھی۔ اسے نفاست سے جھاڑتے ہوئے صحن کی طرف بڑھے۔

حوض کے کنارے گل عباس کی جھاڑیاں تھیں۔ پودوں کے پیچھے ایک اندھا نیلے شیشوں والا روشندان نظر آتا تھا۔ اس کے پٹ کو ذرا سی جنبش ہوئی۔ دو نیلی ہراساں اور بے رونق آنکھوں نے باہر جھانکا۔ سنہرے بال ذرا سے جھلملائے۔ میر صاحب نے حمام میں سے لوٹا بھر کے حوض کی منڈیر پر رکھا اور روشندان کی طرف جھکے۔ بشاش آواز میں آہستہ سے کہا "گڈ مارننگ مسز کارلٹن۔"

"گڈ مارننگ ٹو یو میر صاحب۔" منحنی نحیف آواز۔

"ڈونٹ وری مسز کارلٹن۔ گاڈ از گریٹ۔ ایوری تھنگ آل رائٹ۔"

پٹ بند ہو گیا۔ میر صاحب نے منڈیر پر بیٹھ کر وضو کیا۔ دالان میں پہنچے۔ نماز کے تخت پر جا کھڑے ہوئے نیت باندھی۔

اس وقت تک نماز فجر کے لئے گھر بھر جاگ چکا تھا۔ میر صاحب کی چوتھی سب سے کم عمر سرحدی بی بی سیدہ مریم خاتون تخت کے پاس سے گزریں تو حیرت سے دیکھا کہ میاں سجدے میں پڑے زار و قطار رو رہے ہیں۔

مریم خاتون نے دوسرے تخت پر مصلے بچھا کر نماز ادا کی۔ خاموشی سے باورچی خانے کی طرف گئیں۔ مہمانوں کے لئے اپنے سامنے ناشتہ تیار کروایا۔ خاگینہ' پراٹھے' پھل' گاجر کا حلوہ' ربڑی۔ مسز کارلٹن تو نہاری تک ذوق و شوق سے کھانے لگے تھے۔

دھوپ نکلی۔ گلشن کی لڑکی گل چمن سینی سجا کر اٹھلاتی ہوئی دالان کی سمت چلی۔ چبوترے کی سیڑھیوں کے نیچے بڑے تہہ خانے کا دروازہ تھا۔ یہ تہہ خانہ موسم گرما میں خس خانے میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ گل چمن نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیچے اتری۔

وہ تینوں اپنی اپنی چارپائیوں پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دونوں میموں کے سر جھاڑ' منہ پہاڑ' حواس باختہ۔ معمر مرد نسبتاً مطمئن نظر آتا تھا۔

جھانسی سے جب ایام غدر میں میر بندے علی اپنی بی بی کو ہمراہ لے کر وطن آئے' رستے میں گنگا پار کے باغیوں نے اس انگریز کنبے کو گھیر لیا تھا۔ مارے ڈال رہے تھے۔ عین وقت پر میر صاحب نے جان پر کھیل کر انھیں بچایا۔ اپنی بیل گاڑی میں پردے کے اندر چھپا کر نہنور لائے۔ تب سے یہ لوگ تہہ خانے میں پناہ

گزین تھے۔ آفرین ہے میر صاحب کی ذہانت اور ڈپلومیسی پر کہ اتنا بڑا طوفان آکر گذر گیا۔ نہتور میں دمدمے بندھے، توپیں چلیں، چودھریوں اور پٹھانوں کی خانہ جنگی رہی مگر ان تین فرنگیوں کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

نماز کے تخت پر میر صاحب اب بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ گل چمن لونڈی کو تہہ خانے کی جانب سینی لے جاتے دیکھا۔ تلاوت ختم کرکے فوراً اٹھے۔ قرآن کو سر آنکھوں سے لگا کر رحل پر رکھا۔ سلیپر میں پیر ڈال باورچی خانے کی طرف لپکے۔ بی بی مریم خاتون پڑے پر بیٹھی دونوں بڑی سوکنوں اور ان کی اولاد کے لئے ناشتے کی سینیاں سجا رہی تھیں۔ جھانسی سے آتے ہی سب کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ سارا کنبہ ان کے حسن اخلاق کے گن گاتا تھا۔

میر بندے علی قریب جا کر جھکے، کان میں کہا "سنئے ایک اور پناہ گزین دوسرے تہہ خانے میں موجود ہے اس کا ناشتہ ہمیں دیدیجئے۔ ہم خود لے جائیں گے۔"

"ایک اور فرنگی....؟"

"جی ہاں بے چارہ کئی دن کا بھوکا پیاسا معلوم ہوتا ہے۔ لایئے۔ جلدی کیجئے۔"

عورت سے ہمیشہ راز چھپانا چاہیئے۔ عورت کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔

مریم خاتون نے فرمانبرداری سے ایک اور سینی سجائی۔ گرم گرم یخنی کا پیالہ ساتھ رکھا۔ میر صاحب نے کشتی اٹھائی اور چور دروازے کی طرف روانہ ہوئے۔

اپریل کے مہینے میں ہنگامہ فرو ہوا۔

امن قائم ہوئے تین چار دن ہی گزرے تھے کہ جلاد نے زنداں کے دروازے پر دستک دی۔

وہ بھی نور ظہور کا وقت تھا جب پھاٹک پر گھوڑے ہنہنائے۔ گھگھرا پلٹن یعنی ہائی لینڈرز کے دو گورے افسر سنگینیں چڑھائے ڈیوڑھی پر پہنچے۔ ان میں سے ایک نے انتہائی درشتی سے "کوئی ہائے" کی آواز لگائی۔

منشی جی زنانہ ڈیوڑھی پر گئے۔ گلشن کے ذریعے میر صاحب کو اطلاع دی۔

میر صاحب نماز فجر سے فارغ ہو چکے تھے۔ فوراً چوغہ پہن دستار باندھ بیرونی ڈیوڑھی کے چبوترے پر نمودار ہوئے۔ صاحب لوگوں کو سلام کیا۔

ایک گورے نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ڈپٹ کر پوچھا۔

"ویل۔ میر بندے، علی آپ ہائے؟"

"جی حضور۔"

"آپ نے اپنا مکان پر کسی کو چھپایا ہے؟"

"جی حضور۔"

گوروں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور گھوڑوں سے اترے۔

"کون ہے؟ کدھر ہائے؟"

"اندر تشریف لایئے۔"

میر صاحب پردہ کروا کے دونوں کو زنانے صحن میں لے گئے۔ نیم تاریک زینہ اتر کر بڑے تہہ خانے میں پہنچے۔

"ویل ڈیم۔"

"آئی نیور۔"

"گڈنس گریشس۔" گوروں نے کہا

"واٹ دی بلڈی ہل۔"

"گوڈ سیو دی کوئن۔ مسٹر کارلٹن نے نعرہ لگایا۔

مسز فلورا کارلٹن اور ان کی بھانجی مس جولیا تھارن ہل غش کھا کر گر پڑیں۔

میر بندے علی کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے مونچھوں میں مسکراتے رہے۔

گوروں نے چرٹ سلگائے۔ خود کو کچھ بیوقوف سا محسوس کیا۔ خفت مٹانے کے لئے میر صاحب کو ایک چرٹ پیش کیا۔

"نو تھینک یو سر۔ ہم محض پیچوان کے عادی ہیں۔ آپ کے لئے منگوایا جائے؟"

"اوہ... نیور مائینڈ۔" ایک گورے نے جز بز ہو کر کہا۔

دوسرا گورا زیادہ خرانٹ تھا۔ اپنے ساتھی سے بولا۔

"I still belleve that our information is correct. This crafty old man is making a boody fool of us."

پناہ گزین مسٹر کارلٹن نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ ان کے معزز میزبان انگریزی خوب سمجھتے ہیں۔ وہ انکا بے حد ممنون احسان تھا۔ جان بچائی تھی اور اتنے عرصہ کس قدر آرام و آسائش سے مہمان رکھا تھا۔

نئی نئی فتح کی وجہ سے گوروں کا دماغ آسمان پر تھا۔ موٹا زیادہ بدتمیز گورا میجر میک ڈانلڈ کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ میر صاحب کو غور سے دیکھا "میر صاحب ہم آپ کا بہت گریٹ فل ہے۔" پھر ذرا جھنجلا کر اسی نخوت سے مسٹر کارلٹن کو مخاطب کیا۔

"Please tell him we are damn grateful to him."

"جی ہم سمجھا۔ لیکن یہ ہمارا ڈیوٹی تھا۔"

میر صاحب نے بھی ذرا درشتی سے گوراشاہی اردو میں جواب دیا۔

"فائن۔ شاباش۔ اب آپ اپنا دوسرا ڈیوٹی پورا کرنا مانگتا۔ ایک دم جلدی۔" میجر میک ڈانلڈ نے کہا۔

"حکم.....؟" دل دھک سے رہ گیا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

"باغی احمد علی کو پیش کرنا مانگتا۔ ابھی ایک دم۔"

"جی صاحب؟"

"باغی احمد علی۔ جیل سے بھاگا۔ ایڈر چھپ گیا۔"

"باغی احمد علی..." میر بندے علی نے دہرایا۔ "میجر صاحب بہادر آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ باغی احمد علی اگر جیل سے بھاگا تو چنڈی کے جنگلوں میں روپوش ہو گا یا نیپال فرار ہو گیا ہو گا۔ وہ بے حد ذہین آدمی ہے۔ چھپنے کے لئے خاص نہٹور کیوں آئے گا۔ جہاں سے اسے تلاش کر لینا سب سے آسان ہے۔"

میجر ٹس سے مس نہ ہوا۔ کچی گولیاں نہ کھیلا تھا۔ یہ وہ سرکاری مخبر اناڑی تھا جس نے دسمبر کے اس سرد شام کے دھند لکے میں گاگن کے کنارے میر احمد علی کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تھا' جسے بے چارے میر احمد علی مارے تصوف کے خواجہ خضر سمجھے تھے۔

گل چمن مریم خاتون کے شیر خوار بچے عزیز حیدر کو گود میں لئے زینے کے سامنے سے گزری۔ بچے کو دیکھ کر معاً میر بندے علی کے دل میں ایک خیال کوندا۔ خداوند کریم دوسری اولاد دے سکتا ہے۔ دوسرا بھائی البتہ نہ ملے گا۔

فوراً اوپر گئے۔ عزیز حیدر کو گود میں لیا۔ واپس تہہ خانے میں آئے۔ پھر بڑے رعب سے بولے

"صاحبان آپ جانتے ہیں ہم کون ہیں؟"

"جانتا ہے۔ آپ ریٹائرڈ تحصیلدار اور زمیندار ہے اور کون ہے" میجر میک ڈانلڈ نے ترشی سے جواب دیا۔

دوسرے گورے نے جو میجر کی بدتمیزی سے نادم تھا اخلاقاً اضافہ کیا' "گورنمنٹ جانتا ہے۔ آپ لوگ روہیلہ کنٹری کا Baron بھی رہ چکا ہے۔"

میر صاحب نے سر ہلایا' "ٹھیک ہے مگر آپ کو ایک اور بات معلوم نہیں۔"

"کیا..........؟"

"ہم لوگ....." ڈرامائی انداز میں فرمایا' "ہم لوگ ایک دم پکا مخڈن لوگ ہے۔"

"اوہ ویل۔ سو....؟"

"مخڈن لوگ جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔"

پناہ گزین مسز کارلٹن نے فوراً میزبان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ یہ واقعہ تھا کہ یہ اہل ہند خصوصاً نیٹو جنٹری ہندو مسلمان آن پر جان دیتے تھے۔ پان کے بیڑے اٹھا کر عجیب عجیب قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کی ان کے ہاں شدید اہمیت تھی۔ بے تکے لوگ تھے اب تک سمجھ میں نہ آئے۔

"ہم لوگ جھوٹی قسم ہرگز نہیں کھاتا۔" میر بندے علی نے اب گویا باقاعدہ نفسیاتی جنگ شروع کی۔ گورے کچھ کچھ قائل اور ڈھلمل یقین نظر آئے۔ ایام غدر میں انہیں حریفوں اور وفاداروں دونوں کی عجیب و غریب ذہنیتوں اور انوکھی اخلاقی اقدار کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

میر بندے علی نے بات جاری رکھی' "اور ہم لوگ تو ہولی پروفٹ کی اولاد ہیں۔ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے۔ اب انھوں نے عزیز حیدر کو جلاد کے سامنے پیش کیا۔ پل کی پل کو آنکھیں بند کیں اور کہنا شروع کیا۔ "صاحب یہ ہمارا بیٹا........ ہمیں جان سے زیادہ پیارا ہے۔ آپ اگر صاحب اولاد ہیں۔ اور ہم اس بچے کی جان کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ باغی احمد علی جو ہمارا حقیقی چھوٹا بھائی ہے اس حویلی میں موجود نہیں۔ ہمیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے؟ جب غدر شروع ہوا اس سے بھی دو سال قبل اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اگر آپ اس قسم کا اعتبار کرتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ آپ اس ملک کے' ہم سب کی زندگیوں اور قسمتوں کے مالک اور مختار ہیں۔ اندر تشریف لے چلئے۔ حویلی کی تلاشی لے لیجئے۔"

میجر میک ڈانلڈ پسپا نظر آیا۔ رومال سے منہ پونچھا۔ مسز کارلٹن اور دونوں میمیں اس سے گٹ پٹ کرنے لگیں۔ تینوں میر صاحب کے حسن سلوک اور شرافت اور راست بازی کی تعریف کے دریا بہا رہے تھے۔

چند لمحوں میں پانسہ پلٹنے والا تھا۔ یہ ظالم میجر اندر جا کر تلاشی لے گا یا قائل ہو کر واپس چلا جائے گا۔

میر بندے علی بچے کو گود میں لئے لئے تھک کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جس طرح ڈوبتے ہوئے انسان کی نظروں کے سامنے اس کی ساری زندگی کے واقعات کوند جاتے ہیں میر صاحب نے اپنی حیات مستعار کا جائزہ لیا۔ سرکار انگلشیہ کی انتہائی نیک نامی سے ملازمت کی۔

آج یہ ٹٹپجا فوجی اس بدتمیزی سے پیش آ رہا تھا۔ کیونکہ گو ہم ان کے وفادار رہے مگر بہر کیف محکوم غلام قوم ہیں۔

زمانے نے کیا کچھ نہ دکھایا۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد' جب مدرسہ مسجد فتحپوری میں مولوی بنے۔ ملازمت ملی۔ باپ کے زمانے کی بگڑی ہوئی مالی حالت کو بنایا۔ زمینداری کا انتظام درست کیا۔ ایک بار پھر فارغ البالی کا منہ دیکھا۔ نئے مکان بنوائے۔ شادیاں کیں۔

اللہ تعالےٰ نے ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا۔ اور ایسی کڑی آزمائش میں بھی ڈال دیا۔ اس کی قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ بندہ مجبور محض ہے' دم مارنے کی مجال نہیں۔

معجزہ ہو گیا۔ میجر میک ڈانلڈ نے کھڑے ہو کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا' "میر صاحب! ہم آپ کی قسم کا رسپکٹ کرتا ہے اور آپ نے اس آنریبل فیملی کی جان بچائی ہے۔ ہم سمجھتا ہے مخبر ہم کو غلط خبر بولا۔ ہم آپ سے معافی مانگتا ہے۔ گڈ بائی اینڈ گڈ لک۔" ایک اور پر جوش مصافحہ۔

فرنگی کنبے کو ساتھ لے کر دونوں گورے حویلی نہٹور سے رخصت ہوئے۔

ناظرین باتمکین۔ یہ امر عجیب ہے کہ سید عزیز حیدر جس کی جان کی جھوٹی قسم باپ نے کھائی تھی چند روز بعد ہی اللہ کو پیارا ہوا۔

ستائیس ہزار مسلمان تختہ دار پر چڑھا۔ باقی کالے پانی بھیجا گیا۔ میر احمد علی آبائی حویلی کے چھوٹے

تہ خانے سے بڑے تہ خانے میں منتقل کر دیئے گئے۔ میر بندے علی کی راتوں کی نیندیں حرام تھیں۔ میاں احمد علی ایک دفعہ تو بچ گئے لیکن کسی وقت بھی دوبارہ پکڑے جاسکتے تھے۔

وفاداروں کو انعام و اکرام دینے کے لئے صاحب کمشنر بہادر نے دربار منعقد کیا۔ میر صاحب خلعت فاخرہ میں ملبوس دربار میں شامیانے کے نیچے اپنی کرسی پر موجود تھے۔ کچھ دیر بعد چوبدار نے ان کا نام پکارا۔ بھاری قدموں سے اٹھ کر کمشنر کے سامنے گئے۔

کمشنر نے نقرئی کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ اٹھا کر میر بندہ علی کو پیش کی' خطاب خان بہادری۔ باغیوں کی ضبط شدہ اراضی کے کاغذات کہ یہ اراضی ایک مستقل چھوٹی سی ریاست کے برابر تھیں۔ نفیس کاغذات اطلسی رومال میں ملفوف چاندی کی کشتی میں جھلملا رہے تھے۔ خان بہادری سرکار کی طویل خدمت کا صلہ۔ زمین فرنگی کنبے کی جان بچانے کا انعام۔ مسٹر کارلٹن کلکتہ گورنمنٹ کا اعلیٰ افسر تھا۔

میر صاحب نے کشتی دوبارہ میز کی سنہری جھالر دار عنابی مخملیں چادر پر رکھ دی۔ عزیز حیدر کی جان کی قسم کھانے کے بعد وہ قسمت سے کھیلنے کے عادی ہو گئے تھے۔

چوغے کے جیب سے فوراً وہ اشتہار نکالا جو میر احمد علی کی گرفتاری کے لئے اضلاع روہیلکھنڈ و اودھ میں جاری کیا گیا تھا۔ کمشنر نے اشتہار پر نظر ڈالی۔ معاملہ فوراً بھانپ گیا۔ رنگ اس کا لال بھبو کا ہوا۔

میر صاحب جھک کر گویا ہوئے "حضور والا۔ ان عنایات کے عوض باغی احمد علی کی جان بخشی۔"

صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور چوبدار کو اشارہ کیا کہ دوسرا وفادار پیش کیا جائے۔ چوبدار نے نقرئی سینی اٹھا کر میر صاحب کو تھمانا چاہی۔ میر صاحب نے اسے وہیں میز پر رکھ دیا اور سر اٹھائے سامنے دیکھتے اپنی کرسی کی طرف چلے گئے۔

چھ سو سال کا پروردہ فیوڈل غرور اور آن جو تحصیلداری کی فائلوں تلے دب گئی تھی یکبارگی جاگ اٹھی۔ یہ بدمعاش' فرعون و نمرود کی اولاد ہمیں انعام دینے چلے ہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ یہ بنئے' غاصب' مردود ہمیں انعام دیں گے۔

اس نازک وقت میں خطاب اور زمینداری کا انعام واپس کرنا کم مخدوش نہ تھا۔ وہابیوں کی جنگ ابھی جاری تھی۔ مگر میر بندے علی کرسی پر تنے بیٹھے رہے۔ اسی وقت طے کر لیا چھوٹے بھائی کے لئے پریوی کونسل تک اپیل کریں گے۔ کلکتہ کا سب سے بڑا بیرسٹر کھڑا کریں گے۔ ہمیں سمجھا کیا ہے۔ یہ کمینے گورے بھورے بھول گئے کہ ہم کون ہیں۔

مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ سامنے کئے جو غصے سے لرز رہے تھے۔ ان لمحات میں کسی پرانے چہار ہزاری منصب دار سگڑ دادا یا یقیناً مفتی صدر جہاں کی روح حلول کر گئی۔ جلال اور طیش کے مارے کانپ رہے تھے۔ قریب بیٹھے ایک چودھری صاحب نے پوچھا "میر صاحب خیر تو ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟" میر صاحب کو انعام کی کشتی واپس رکھ کر بغیر صاحب سے ہاتھ ملائے واپس آتے دیکھ کر دربار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ چودھری صاحب کی آواز سے چونک کر میر بندے علی نے نظریں اٹھائیں۔ کمشنر اب آخری وفادار کو خلعت

سے نواز رہا تھا۔ چوبدار نے اعلان کیا۔ دربار برخاست ہوا۔

ایک اور معجزہ' الہ آباد میں بڑے لاٹ صاحب نے بڑا دربار منعقد کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی نامے کا اشتہار جاری ہوا۔ اسی شاہی فرمان کے بموجب جن باقیماندہ باغیوں کی جان بخشی کی گئی ان میں میر احمد علی نہٹوری کا نام بھی شامل تھا۔

ضلع بجنور میں باغیوں کی ایک لاکھ ۶۳ ہزار ایکڑ اراضی بحق سرکار ضبط ہوئی۔ اس کا بڑا حصہ وفادار چودھریوں کو عطا کیا گیا۔ شیر کوٹ اور ہلدور کے چودھری صاحبان کو راجہ کا خطاب ملا۔ تاجپور کے چودھری صاحب کو ماضی میں سردار امیر خاں کے خلاف سرکار کی اعانت کے صلے میں راجہ بہادر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اب راجہ صاحب تاجپور کا لڑکا سیام سنگھ بغرض تعلیم انگلستان روانہ ہوا اور وہاں جا کر کرسٹان بن گیا۔ واپس آ کر ڈپٹی کلکٹر نامزد کیا گیا (اس نے تاجپور میں ایک شاندار کیتھیڈرل تعمیر کیا جو آج تک موجود ہے) تاجپور کے کنور شیوناتھ سنگھ بھی کرسٹان ہو گئے اور لندن جا کر بیرسٹر بنے۔

سادات کی ساڑھے پندرہ ہزار ایکڑ زمین بحق سرکار ضبط ہوئی۔ میر احمد علی کی جان بخشی ہو گئی مگر ان کی موروثی زمینداری بھی اس ضبط شدہ اراضی میں ضبط کر لی گئی۔

دکھیارے بہادر شاہ ظفر رنگون کے قید خانے میں پلنگ پر لیٹے حقہ پیتے رہے۔ مٹیابرج کلکتہ میں واجد علی شاہ اپنے "پری خانہ" میں رقت خیز مثنویاں اور اشعار قلمبند کرنے میں منہمک ہو گئے۔

اگر جنگ کرتا تو دس سال تک
مگر آخرش تھی شکست اور تھک
ہوں سیدھا مسلماں کہاں مکر و زور
کجا پیلتن اور کجا پائے مور

سدا رہے نام اللہ کا۔

۱۱۔ خراب کوچۂ سلطاں و خانقاہ فقیر

۱۸۸۰ء بھی قریب الختم ہے۔ ہماری روپوشی اور جان بخشی کا واقعہ آج افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ دلی کی گلیوں میں آل تیمور بیس سال سے بھیک مانگ رہی ہے۔ شیروں کے قالین بن گئے۔

حضرت شیخ حاتم بن عنوان اصم بلخی نے فرمایا تھا اگر عبرت چاہتے ہو تو دنیا کافی ہے۔ اگر وعظ چاہتے ہو تو موت کافی ہے۔

اس برس بھائی جان بھی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ گئے۔ ایسے بھائی آج کل کہاں۔ اپنے بیٹے کی قربانی دے کر ہماری جان بچائی۔ ساری زندگی کنبہ پروری میں گزاری۔ جب تک قویٰ نے کام کیا نوجوان عزیزوں کی سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریز حکام کے نام سفارشی خطوط یا سرٹیفکیٹ لکھا کئے۔ روہیلکھنڈ اور بندیلکھنڈ کے کمشنران بھائی جان کو حکومت صوبہ جات شمال و مغربی کا ایک اہم ستون کہتے تھے۔ ایک بار

ایک کلکٹر نے ان سے پوچھا' "ویل میر صاحب! ہمارا سمجھ میں نہیں آتا آپ جیسا لائل محمڈن جنٹلمین کا سگا بھائی اتنا بڑا مفسد اور باغی کیسے بنا۔"

ہم اب کیا بغاوت کریں گے۔ کب کے ہار مان چکے۔ تھک گئے۔

بندیلکھنڈ والوں کا اس وقت یہ حال ہے کہ نواب صاحب باندہ رانی لکشمی بائی کی حمایت میں لڑے۔ سو ریاست ان کی ضبط ہوئی۔ اب چار سو روپے ماہوار پنشن پاتے ہیں۔ علم دوست خاندان تھا۔ مرزا غالب سے عزیز داری تھی۔ منیر شکوہ آبادی ان کے ہاں ملازم تھے۔ بھائی جان مرحوم کے برادر نسبتی حافظ سید محمد موسیٰ یہیں پر ہیں۔ حافظ صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا عزیز احمد ولی اللہ ہیں۔ بہت سی کرامتیں مولانا صاحب کی ان اطراف میں مشہور ہو رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان اب صرف کرامات کی امید پر زندہ ہے۔

محض ہماری بھتیجی اور بہو سعید بانو بی بی کی ننھیال میں ستر اولیاء گزرے ہیں۔ ہمارے اپنے خانوادے کے اولیاء ان کے علاوہ۔ اتنے اولیاء بہت ہیں۔ خود ہم نے علم تصوف تھوڑا بہت ایک زمانے میں حاصل کیا تھا۔ نہٹور میں بھائی جان جنت مکانی کی بیٹھک میں جو سہ دری کہلاتی ہے ہم سارے نئے اخبار منگواتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ غدر کے قبل ہم لوگ کچھ نہ جانتے تھے۔ مغرب کے علوم ظاہر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

معلوم ہوا کہ ابراہیمؑ اور نوحؑ اور آدمؑ نہ تھے۔ ازل میں صرف بندر تھا۔ ہمارے اندر ہمارے اجداد زندہ نہیں محض ایک عدد گوریلا سانس لے رہا ہے۔ نقل کفر کفر نباشد۔

علمائے دین فتوے دے چکے انگریزی تعلیم حرام ہے۔ لیکن ہم خود جو پابند شرع مسلمان اور سزا یافتہ باغی ہیں اپنے بچوں کو دیو بند روانہ کرنے کے بجائے انگریزی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ کیونکہ اب ہم جانتے ہیں کہ مسلمان اگر جاہل اور پسماندہ نہ ہوتے اس عبرت ناک طور سے شکست نہ کھاتے۔

مگر صد افسوس کہ انحطاط کا وہی عالم ہے بلکہ پہلے سے زیادہ۔ تعویذ گنڈے' جھاڑ پھونک کی گرم بازاری ہے۔ مشائخ عظام کی درگاہیں اور فقراء کی خانقاہیں عیاشی اور نشہ بازی کے اڈے بن چکی ہیں۔

غدر سے پہلے صرف ہمارے ضلع بجنور میں ۴۷ فارسی' ۱۹ عربی مدارس اور ۸۹ پاٹھ شالے تھے۔ نہٹور کا سنسکرت پاٹھ شالہ دور دور تک مشہور تھا۔ ہمارے مورث اعلیٰ سید حسن ترمذی کا مدرسہ بند ہو چکا۔ اس کے لئے شہنشاہ ہمایوں نے جاگیر وقف کی تھی۔ جاگیرداروں کے زوال کے بعد مشہور مدارس سارے ہندوستان کے بند ہو گئے۔ ہمارا مدرسہ کب تک چلتا۔

ہمارے دونوں چھوٹے لڑکوں غلام حیدر اور حسین حیدر نے طبابت کی تعلیم حاصل کی ہے۔ تیسرے بیٹے کرار حیدر سلمہ' کو میڈیکل کالج لاہور بھیجا ہے۔ فرزند اکبر سید جلال الدین حیدر سلمہ' جب ہم حویلی نہٹور میں حسب حکم برادر بزرگ روپوش ہوئے' اس وقت صرف بارہ برس کے تھے۔ آج ماشاء اللہ جھانسی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس ہیں۔

ہم ان دنوں نور چشمی کے ہاں جھانسی میں مقیم عہد نو کا نظارہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف ایک لق ودق خاموش برآمدے میں آرام کرسی بچھالی ہے۔ اس پر بیٹھے عبرت حاصل کیا کرتے ہیں۔ چپڑاسی اخبار لا کر رکھ جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے برقنداز لیمپ روشن کرتے ہیں۔ باہر تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے۔ ایک دن اور ڈھلا۔ دنیا سے دور ہوئے۔ قبر کے اور نزدیک پہنچے۔

لیمپ کی روشنی سنہرے چوکھٹوں میں لگی رنگین سینریوں پر جھلملاتی ہے۔ دیوار پر ایک منظر کالپی کی جھیل کا ہے۔ کسی انگریز نے پنسل سے بنا کر بھائی جان مرحوم کو دیا تھا۔ جھیل کے کنارے ایک خستہ جان درویش کھڑا آسمان کو تک رہا ہے۔ عقب میں پیر روح اللہ شاہ کی شکستہ خانقاہ ہے۔

یہ سارا ملک جہانگیر نے ایک باندی کی اولاد کو بخش دیا تھا۔ پیر روح اللہ نے چھتر سال بندیلے سے خوش ہو کر اسے ایسی دعا دی کہ علاقے میں ہیرے اور پنے کی کانیں نکل آئیں۔

اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہتا آج ہم نے حافظ جی سے فال کھولی۔ فرمانے لگے۔

حافظا در کنج فقر و خلوت شب ہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قراں غم مخور

ہم بالکل تنہا رہ گئے۔ ہماری بی بی سیدہ شریف النساء بھی سفر آخرت اختیار کر چکیں۔

وہ مرحومہ ہمارے ایک جد اعلیٰ سید سعد اللہ کی نسل سے تھیں۔

جانے کیوں اس وقت سعد اللہ خاں کا خیال آگیا۔ یہ ہمارے پرکھوں کی عجیب عادت ہے کبھی کبھی پھرتے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔

حاضرات الخیال۔

سید سعد اللہ عامل شاہی تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ دکن گئے تھے۔

نور چشمی بکار منصبی شب و روز مصروف رہتے ہیں۔

ڈی۔ ایس۔ پی کوتوال شہر بھی ہے۔ انگریز سرکار نے مغل عہدوں کے نام برقرار رکھ کر ان کی اصل حیثیت ادنیٰ درجے کی کر دی ہے۔ داروغہ' جو ہندوستان و تاتار سے لے کر روس و ترکیہ تلک حاکم شہر تھا اب تھانیدار ہے۔ قاضی محض نکاح پڑھانے کے لئے رہ گیا۔ صوبے دار گورنر تھا۔ اب معمولی فوجی ہے۔ صدر الصدور آج معمولی سب جج ہے۔ شہنشاہ کے محل کا خان ساماں' اب صاحب کے باورچی خانے میں کھڑا جھال فریزی پکار رہا ہے۔ شاہی آبدار خانہ خشک ہوا۔ اب انگریزی کلب کی پینٹری آبدار خانہ کہلاتی ہے۔ اور اس کا نگراں ہیڈ آبدار کہ شراب کی بوتلوں کا انچارج ہوتا ہے۔

مغلیہ ملبوسات چپڑاسیوں اور ہرکاروں کو پہنائے ہیں۔ وہ جو دیوان تھا' تھانے میں دیوان جی بن کر بیٹھا ہے۔ میر بخشی' میر بحری' میر بری' میر منزل' میر توزک' میر عدل سب خواب و خیال ہوئے' احدی جو شاہوں کے اے۔ ڈی۔ سی تھے' اب کاہل کو کہتے ہیں۔

بائی راجپوتانہ کی عصمت ماب ستی ساوتری راجکماریوں اور رانیوں کا لقب تھا۔ دور تنزل میں دربار مغلیہ کے اندر رقاصاؤں کا اثر بڑھا۔ ان کو بائی کے خطاب ملے۔ آج تمام طوائفیں بائی جی کہلا رہی ہیں۔

بمبئی کے پارسیوں نے تھیٹر کمپنیاں کھولی ہیں۔ نوجوان لڑکے زنانہ سوانگ بھر کے شہر شہر مخرب اخلاق ڈرامے دکھلاتے پھر رہے ہیں۔ مسلمان روساء کی عیش پرستی کا وہی حال ہے۔ اب تھیٹر کمپنیوں اور بائیوں کی سرپرستی میں پیش پیش ہیں۔ شعرو شاعری، گل و بلبل کا واویلا حسب سابق زوروں پر ہے۔

خان جہاں اور خان خاناں اور راجہ راجگان کے خطابات مرحمت کرنے والے نہ رہے۔ اب محض خان بہادری اور رائے بہادری کو نیٹو باعث فخر سمجھتا ہے اور غنیمت جانتا ہے۔

خان بہادروں کا نیا معاشرہ پیدا ہو رہا ہے۔ پل کی پل میں خود ہم لوگ جاگیرداروں کے سماج سے نکل کر ڈپٹی کلکٹروں کی سول لائنز میں آگئے۔

ہندو مسلم فساد کہیں کہیں شروع ہو چکے ہیں جو دور مغلیہ میں قطعاً مفقود تھے۔ لیکن نئی پالی ٹکس اور پالیسی (انگریزی کے اچھے جامع الفاظ ہیں) کے باوجود شکر ہے کہ دونوں فرقوں میں حسب سابق دوستی اور اتحاد باقی ہے۔ ہندو احباب گہری دوستی کے باوجود چھوت چھات برتتے ہیں۔ مگر اندرونی تعصب ان میں ہرگز نہیں۔ ہم بھی ان کے چھوت چھات کے دستور کا احترام کرتے ہیں۔ برا نہیں مانا جاتا۔ صدیوں سے خود ہمارے گھرانے میں یہ رواج چلا آتا ہے کہ ہندو دوستوں کی دعوت کے لئے برہمن رسویا باہر بیٹھ کر بھوجن تیار کرتا ہے۔ رواداری اور حسن اخلاق ہماری پرانی ہندوستانی تہذیب کا طرہ امتیاز ہے۔

بہت ممکن ہے آگے چل کر یہ بھی نہ رہے۔

اس وقت تک سینکڑوں مجاہدین تختہ دار پر پہنچ کر سربلندی حاصل کر چکے ہیں۔ جب یہ مجاہدین انگریز کے خلاف جہاد کے لئے گاؤں گاؤں رضاکار جمع کرتے پھرتے تھے گزر ان کی جماعت کا ریاست رامپور میں ہوا۔ وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کی میم نے توجہ اپنے خاوند کی اس طرف دلائی کہ یہ مولوی ہماری حکومت کے خلاف اعلان جہاد کر چکے ہیں۔ اس کا سدباب لازم ہے۔ اس کے بعد ہی مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جنگ شروع کی۔

بھائی جان مرحوم کے پرانے دوست سید احمد دہلوی کے سیاسی نظریات سے ہم آج بھی متفق نہیں۔ گو ان کے اصلاحی کارناموں کے دل سے قدردان اور ان کے بے پایاں خلوص کے قائل ہیں۔ خود ہم جانتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہم باغیوں کی املاک ضبط ہوئیں اور میر صادق علی اور میر رستم علی ہمارے ہمسائے چاندپور کے رؤساء کا علاقہ بجرم بغاوت، سرکار نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور سید احمد خاں کو پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ سید موصوف کے مضامین ہم غور سے پڑھتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اپنے پوتوں کو علی گڑھ بھیجیں۔

سید جلال الدین حیدر سلمہ، کی شادی بھائی جان میر بندے علی مرحوم اور سیدہ مریم خاتون کی بیٹی

سعید بانو سلمہا سے ہم نے کی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے ان کی اولاد بھی دیکھ لی۔ سید اعجاز حیدر، صغریٰ فاطمہ اور چھوٹا لڑکا جو حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ نومولود کا نام سجاد رکھا گیا ہے۔

ان بچوں کو اور بھائی جان مرحوم کی اولاد کو خدا عمر خضر عطا فرمائے۔ بھائی جان کے دو بیٹے سید ولی حیدر اور سید اکرام حیدر بھی فی الوقت شہر للت پور میں مقیم ہیں۔

ہماری اکلوتی بیٹی ام سعید کی شادی جد بزرگ سید سعد اللہ خاں عالمگیری کے نگر پوتے سید صغیر حسین سے ہو گئی۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے۔

میاں اکرام حیدر کے علاوہ ہماری نئی پود نے اپنے نام کے آگے ترمذی لکھنا ترک کیا۔

اللہ اللہ۔ ترمذ کہاں رہ گیا؟

غدر سے پہلے جب ہم میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھے ایک بار کیتھل گئے تھے۔ شہر کرنال سے ۳۵ میل دور اشنان کا تالاب دیکھ کر سوچے یا الٰہی کمال الدین ترمذی انہی سیڑھیوں پر آن کر بیٹھے تھے؟ بہت عجیب سا لگا ان کے بعد سالار مسعود غازی اور تیمور لنگ وہاں پہنچے۔ ایران کے مجوسی کیتھل میں پناہ گزیں ہوئے۔ ماوراء النہر کے فقرا وہاں آن کے بسے۔ مٹی کہاں سے کہاں کھینچ لاتی ہے۔ اگر کمال الدین ترمذی کے جی میں یہ نہ سمائی ہوتی کہ ہندوستان چلیں تو ہم آج یہاں کاہے کو وکٹوریہ کی غلامی کر رہے ہوتے۔ ترمذ میں اگر چنگیز کی تباہ کاری سے بچ گئے ہوتے تو اس وقت بیٹھے زار روس کی غلامی کر رہے ہوتے آج اپنے پوتوں کو لندن بھیج کر بیرسٹری پڑھانے کے خواب نہ دیکھتے۔ ترمذ یا بخارا سے سینٹ پیٹرز برگ روسی پڑھنے کے لئے بھیجنے کے منصوبے بناتے۔ کیونکہ جب خدا نے مخالفین کا سینگ بلند کیا شہر پناہ کے دروازے زمین میں غرق ہوئے۔ فاتح نے حکم دیا مفتوح شرفاء کو قاصی علوم کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ قصر شاہی کے دربار میں کھڑے ہو سکیں۔[31]

والد مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ ان کی اولاد پر کیا گزرے گی۔ نہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پوتے کس قسم کی دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ والد مرحوم نے نوعمری میں جھیل کے کنارے ایک پلکھن بوئی تھی جو اب چھتنار ہے۔ دوسری پلکھن کا پودا ہم نے لگایا تھا۔ دونوں "چھوٹی بڑی پلکھن" کہلاتی ہیں۔ جب یہ چھوٹی پلکھن چھتنار ہو گی تب ہم نہ ہوں گے۔

کہ یہی وقت کا اٹل قانون ہے۔[32]

۱۲۔ نصیحت کا کرن پھول

امابعد۔ اس پر آشوب زمانے میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا لازم ہے۔ بیسویں صدی میں صرف انیس برس باقی رہ گئے۔ کانے دجال کی آمد آمد ہے۔ مشرکین عناصر پر بھی قابض ہو چکے۔ ٹیلی گراف کا تار جھنجھنا جھنجھنا کر قرب قیامت کی اطلاع دے رہا ہے۔ سمندروں پر دخانی جہاز اور زمین پر اسٹیم انجن ارواح خبیثہ کی مانند چنگھاڑتے پھرتے ہیں۔ ایک ایسا آلہ ایجاد ہوا ہے جو عکسی تصاویر مثل اصل

کے کھینچ لیتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے نئی روشنی کے چند احباب خصوصاً بابو صاحبان کلکتہ مافوق الفطرت کا یقین نہیں فرماتے بلکہ ہنسی اڑاتے ہیں۔ اپنے پرم ہنسوں اور یوگیوں کو بھولے ہیں۔

لیکن الحمد اللہ کہ ہمارے میر احمد علی ترمذی گو انگریزی تعلیم کے حق میں ہیں مذہب پر اسی راسخ العقیدگی سے قائم ہیں۔ اس وجہ سے ذرا امید بندھتی ہے کہ حالات زیادہ نہیں بگڑے۔ علاوہ ازیں ہنوز بہت سے ایسے بزرگان دین بھی ابھی موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے۔

باید دانست کہ ایک حیرت مذمومہ ہے اور ایک حیرت ممدوحہ۔ حیرت شک سے برعکس ہے۔ شک جہلاء کو ہوتا ہے اور حیرت عارفوں کو۔ حیرت حضور میں ہوتی ہے اور شک غیبت میں۔ اور مقامات توبہ میں اول توبہ ہے اور آخر حیرت۔ دیکھو حافظ سید محمد موسیٰ قادری نقشبندی[33] اپنی بھانجی سعید بانو اہلیہ سید جلال الدین حیدر کو جو اپنے پدر بزرگوار میر بندے علی کے انتقال کے غم میں سوگوار ہیں ۱۸۸۰ء میں کالپی سے کیا تحریر فرماتے ہیں۔

"قرۃ عینی سعید بانو زرقہا اللہ العصمتہ فی دارین داعی بالخیر حافظ محمد موسیٰ غفر اللہ بہ لوالدیہ کی طرف سے سلام دعا کے بعد معلوم کرو کہ اس سے پیشتر ایک پوست کارڈ تمہارا اور نور البصر سید جلال الدین حیدر کا آیا۔ حرفے کل الثلاثہ دریافت ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو و ہم کو و سب کو دونوں جہاں میں کنف و جوار و ظل حمایت میں رکھے۔

ہم نے تو اپنے احوال کو مخفی کرنا چاہا تھا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ہمتوں کو اب بالکل (؟) ہے اور رغبت فی الدنیا عن الاخر میں ...... (؟) رات دن پیٹ کا دھندا اور ہر وقت اس کا شغل و عمل اللہ تعالیٰ رحم فرمادے۔

مگر اب عندالاستفسار تمہارے نمونہ از خروارے لکھا جاتا ہے۔ ہمارے جد امجد تک تفاخر بالنسب حرام سمجھا جاتا تھا۔ اور واقعی ایسا ہی ہے۔ اللہ جل شانہ' اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے کہ جس وقت پھونکا جاوے گا صور تو نہ ہوینگے کچھ نسب اون کے درمیان میں اس دن اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ سارا دارو مدار تقویٰ پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ان اکرم عنداللہ اتقکم۔ یعنی بیشک تم میں بڑا بزرگ اللہ کے نزدیک تم میں کا بڑا پرہیزگار ہے۔ کیا اچھا کسی نے کہا ہے۔

ذات پات پوچھے نہ کوئے ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

اگرچہ ہمارے خاندان میں ستر بزرگوار اولیائے کاملین سے گزرے ہیں۔ اور باوجودیکہ قرب قیامت کی وجہ سے اب وہ حالت نہیں رہی مگر تاہم اب تک بفضل و کرم الٰہی کچھ کچھ اس کا سلسلہ باقی ہے۔ ہاں پر اب دیکھئے کیا ہوتا ہے رسی تو ہاتھ سے چھوٹ چکی۔ اگر وہی اپنا فضل و کرم کرے تو البتہ صورت نجات ہے۔

تمہارے چھوٹے ماموں میاں محمد طاہر عرف تراب شاہ" تو اکمل عصر علامہ دہر عارف زمانہ علوم ظاہر و باطن[34] میں یگانہ تھے۔ تمہارے منجھلے ماموں حاجی عزیز احمد کی باطنی حالت اہل بصیرت پر خوب روشن

ہے۔ تمہاری والدہ سیدہ مریم خاتون تو تمہیں یاد ہوں گی۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ جس خوبی و آداب کے ساتھ خشوع و خضوع سے روزمرہ عبادت و تلاوت کرتی تھیں مجھے یاد نہیں کہ جو مجھ سے ساری عمر میں کبھی اس طرح پر عبادت یا تلاوت کرتے بنی ہو۔ میر صاحب یعنی تمہارے والد (اللہ تعالیٰ بخشے) اکثر ان کے انتقال کے بعد روتے اور کہتے کہ حافظ جی میں اب تک کسی کا مرید نہیں ہوا ہوں۔ کیونکہ اس وقت تک بجز دو شخصیتوں کے اور کسی پر میرا اعتقاد نہیں۔ ایک تو وطن میں ایک بزرگ پر اعتقاد ہوا تھا۔ مگر میں اس وقت عالم شباب میں تھا۔ کسی طرح مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہ تھا۔ اس لئے میں نے ان سے بیعت نہ کی اور ایک ان پر۔ مگر میں ان کا اس لئے نہ ہوا کہ لوگ کہیں گے جورو کا مرید ہے۔

غرضیکہ ان کی ہر حالت ایسی تھی جیسے کسی بڑے کمّل کی ہوتی ہے۔ اور ازانجملہ یہ کہ کبھی انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے شوہر کی طرف پشت نہیں کی۔ کہتی تھیں کہ منجملہ حقوق شوہر کے ایک یہ بھی عورت پر حق ہے کہ کبھی شوہر کی طرف پشت نہ کرے۔ تمہاری نانی یعنی ہماری والدہ ماجدہ حضرت سعیدہ بیگم قدس سرہاکی اور کیا تعریف کروں۔ تمہاری والدہ نے انہیں سے ظاہری و باطنی تعلیم پائی تھی۔ کرامتیں ان کی بکثرت وقوع میں آئی ہیں۔ ان کے والد یعنی حضرت نانا بزرگوار ہمارے سید تاج محمدؒ پشاوری قدس سرہ جن کے منجملہ اور حالات کے ایک حالت یہ تھی کہ جب کبھی پانی نہیں برستا تو لڑکیاں آتیں اور کہتیں کہ کاکا صاحب ہم تمہارے اوپر پانی ڈالتے ہیں دعا کرو کہ پانی برسے۔ جونہی ان پر وہ پانی ڈالتیں وہ نہیں اللہ کے فضل و کرم سے پانی برسنے لگتا۔[35]

ہمارے ولایت میں دستور ہے۔ کہ جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی ولی کے مزار پر اسی مراد سے پانی ڈالتے ہیں کہ جیسی ان کی قبر میں ٹھنڈک پڑی ویسی ہی اللہ تعالیٰ ہمارے لئے پانی برسادے۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے پانی برساتا ہے۔ سو یہ کیفیت ان کی حالت حیات ہی میں دیکھنے میں آتی تھی۔

اور ان کی والدہ یعنی ہماری جناب نانی صاحبہ بی بی راضیہ قدس اللہ سرہاکی یہ کیفیت تھی کہ رات دن سجدہ ہی میں پڑی رہتی تھیں۔ شاید کسی وقت اس حالت سے فراغت پاتی ہوں۔ نانا تمہارے یعنی حضرت والد جناب محمد ابراہیم شہید قدس سرہ تو بہت بڑے عابد زاہد مقبل آخرت مجتنب عن الدنیا' ولی متقی' شجاع' سخی' باحیا' باوفا' متوکل' حاجی' غازی' شہید تھے' کرامات و فرق عادات اون کی نہایت مشہور و معروف۔

ان کے چھوٹے بھائی حضرت عمی میاں محمد صاحب قدس سرہ ولی مادر زاد تھے۔ اہل قبور کو عیاناً دیکھتے اور ان سے ہمکلام ہوتے۔ والد ان کے حضرت شاہ سید فیض محمد صاحب کہ ہمارے دادا تھے ایسی حالت میں ان کو منع فرماتے کہ ایسے امور کا اظہار نہ کرنا چاہئے۔ محبوب کے بھید کی ہرگز کسی کو اطلاع نہ ہونے پاوے۔

ان کے پدر بزرگوار ہمارے پردادا مولانا شاہ سید نور محمد صاحب پشاوری ملک پشاور میں اولیائے کبار میں مشہور ہیں۔ غرض کس کس کا حال لکھوں۔ حسب خواہش تمہارے اب اپنے اس سر سلسلہ کا ذکر کرتا ہوں۔ یعنی حضرت شیخ الشیوخ قطب دوراں امام زماں حضرت سید جلال الدین بخاری" بزرگ صاحب

توشہ جو صاجزادے حضرت سید ابوالموید بخاری کے ہیں اور وہ حضرت سید محمد بخاری ؒ کے اور وہ بچند سلسلہ حضرت امام محمد باقرؒ کے جو صاجزادے ہیں حضرت سید الساجدین امام زین العابدین کے اور وہ سبط نبی ابن المرتضے اسد اللہ الغالب امام الکونین حضرت ابی عبداللہ الحسین شہید کربلا کے۔ (طویل عربی عبارت) آمین آمین آمین۔"

حضرت حافظ محمد موسیٰ قادری نقشبندی کا تلخیص شدہ شفقت نامہ بھانجی کے نام تمام ہوا۔

سلطان ابراہیم بن ادھمؒ نے کہا تھا دنیا کے بادشاہ کہاں ہیں؟ آکر دیکھیں یہ معاملہ کیا ہے اور یہ کیسا کاروبار ہے تاکہ اپنے ملک اور حکومت سے انہیں شرم آئے۔

سیدہ سعید بانو کے زہد و تقوے کا یہ عالم تھا کہ گو ریل چل چکی تھی مگر چونکہ اس کی سواری میں خدشہ بے پردگی کا تھا وہ جھانسی اپنی ننیہال سے نہٹور مع بچوں کے بیل گاڑی میں آتی جاتی تھیں۔ موسم کی سختیاں دو ماہ کا طویل سفر، گرمی کی شدت پردے کی خاطر سب گوارا تھا۔ ان کی آواز ڈیوڑھی سے باہر کسی نے نہ سنی۔

سیدہ سعید بانو نے اپنے بچوں کو ان کی کم سنی میں داغ مفارقت دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب نہٹور میں انتقال ہوا اور نماز جنازہ پڑھی گئی گو میدان میں بے شمار آدمی تھے مگر غلغلہ تکبیروں کا میدان کے پرے تک سنائی دے رہا تھا۔ ماموں ان کے حافظ سید محمد موسیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور فرمایا کہ تکبیروں کا غلغلہ فرشتوں کا ہے۔

بعد سیدہ سعید بانو کی وفات کے آپ کے نامور شوہر خان بہادر سید جلال الدین حیدر نے عقد ثانی فرخ آباد کی ایک شیعہ خاتون سے کیا۔ ان کے اولاد نہ ہوئی۔

خان بہادر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید کرار حیدر مشہور ماہر امراض چشم تھے۔ خطاب خان بہادری کا ان کو لارڈ ڈیلنس ڈاؤن وائسرائے ہند نے عنایت کیا۔

ان بزرگوں اور ان کی اولاد[36] کے ہمراہ ہم خان بہادروں کے معاشرے میں داخل ہوں گے۔

۱۳۔ اجنہ قدیم و جدید

سبحان اللہ ہمارے جنات بھی کس قدر صاحب نظر ہیں۔ کس خوبی سے زمانہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ شاہجہانی محرابوں سے نکل کر جارجین ستونوں اور پرتگالی دروں میں داخل ہو گئے۔ کمپنی باغ کے درختوں پر چڑیلیں فروکش ہیں۔ سڑکوں کے کنارے گیس کے لیمپوں کی مدھم روشنی میں مسافروں کو آج بھی بیتال مل جاتے ہیں۔ اب تک ان بیتالوں کو مزید کتنی کہانیاں یاد ہو گئی ہوں گی۔

سینکڑوں فرنگی غدر میں ہلاک ہوا۔ کسی انگریزی قبرستان کے پاس سے آدھی رات کو گزریے یقیناً کسی صاحب کی روح سامنے آکر مکھن چینی کی فرمائش کرے گی۔ سر کٹے شہسوار جب چٹ چاندنی سارے میں پھیلی ہو ان سنسان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں جہاں چند سال قبل خوں ریز جنگیں لڑی گئی

تھیں۔

شہید مردوں کے مزاروں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔

جھٹ پٹے کے وقت کھیتوں میں دیوتا آواز دیتے ہیں۔ چیچک کی وبا ماتا کا قہر ہے۔

انسانوں کے بھیس میں اجنہ کے بچے علماء سے قرآن شریف پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔

اکثر جنات مٹھائی کے شوقین ہیں۔ ورنہ عموماً صرف ہڈیوں پر گزر کرتے ہیں۔ بے حد دراز قد ہیں اور ان کی پلکیں کبھی نہیں جھپکتیں۔

پیپل پر کی چڑیلیں وہ حلال خور یا چمارن وغیرہ عورات ہیں جو زچگی میں مریں یا زندگی میں ناشائستہ حرکات کی مرتکب ہوئیں۔ یہ چھل پائیاں ہوتی ہیں اور ناک میں بولتی ہیں۔

کالی بلی بھی ایک نہایت پر اسرار شے ہے اور ناگ کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ اپنے بارے میں ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ جو سانپ کا پتلا آٹے کا بنا کر دفینوں کی ہانڈی پر بٹھال دیا جاتا ہے۔ دفینہ کھود کر نکالئے فوراً زندہ ہو جاتا ہے۔ مال کا سانپ کہلاتا ہے۔

ایام غدر میں بہت سے لوگوں نے اپنی جمع پونجی لوٹ سے بچانے کے لئے جگہ جگہ دفن کر کے ان پر مال کے سانپ بٹھا دیئے۔ وہ لوگ مارے گئے یا ان کے وارث جلا وطن ہوئے۔ اماوس کی راتوں میں یہ ہانڈیاں زمین کے اندر چھن چھن کرتی سرکتی رہتی ہیں۔ یہ اوت کا مال کھود کر نکالنا پر خطر ہے۔ لکشمی ان کے لئے ہمیشہ ایک جان کی قربانی چاہتی ہے۔

قدیم شہروں اور قصبوں، بوسیدہ حویلیوں، فرنگی پلانٹرز کی لق و دق کوٹھیوں میں آسیب کی آبادی زیادہ ہے۔ کلکتہ بمبئی کے نئے صنعتی شہر ہیں وہاں ابھی ان کا گزر نہیں ہوا۔ فیکٹریوں اور یونیورسٹیوں کے جن ابھی نئے میل نہیں آئے۔

بہت سے فرنگی بھی روحانیت کے قائل ہیں۔ ایک تھیوسوفیکل سوسائٹی انہوں نے ولایت میں قائم کی ہے۔ ہمارے شہروں میں بھی فری مسن لاج کھلے ہیں۔ عوام انہیں جادوگر یا شیطان خانہ کہتے ہیں۔ خدا جانے وہاں کیا ہوتا ہے۔

ہمارے گھرانے کے چند بزرگوں کی بھی جنات سے پرانی ملاقات ہے۔

حضرات! اسی زمانے میں ایک انوکھے عالم باعمل کا غلغلہ ہوا کہ نام اس کا سید احمد خاں تھا۔ گو اس کے مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ وہ خود پیر سفید فام کا موکل ہے۔ بہرکیف اس شیخ کامل نے ایسی کرامت دکھائی کہ غدر کے بیس سال کے اندر اندر ہندوستانی مسلمان بچوں کے منہ سے شیکسپیئر کے مکالمے اور ورڈزورتھ کے اشعار ادا ہونے لگے۔ بائرن اور برک اور پروفیسر چکرورتی ان پر مسلط ہو گئے۔ شہر کول میں اس مرشد نے اپنا تکیہ قائم کیا۔ مریدوں کے حلقے اقلیم ہند میں پھیل گئے۔

اس درجہ بزرگی پر پہنچنے سے قبل کا مخفی احوال معلوم کرنا ضروری ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ جب ماہ اپریل ۱۸۵۸ء میں ہنگامہ بجنور فرو ہوا۔ سید احمد خاں صدر

الصدور کے عہدے پر مراد آباد میں تعینات ہوئے۔ اگلے سال اس شہر میں پہلی بار پبلک تقریر کی۔ ۱۸۶۲ء میں تبادلہ پورب دیس شہر غازی پور کا ہوا۔ یہ ابدال خود لکھتا ہے "غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیئر نے جو ہماری مصیبتوں میں شریک رہے تھے بعوض اور وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت تھا لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں۔

"چند روز میں اسی خیال اسی غم میں رہا اور آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا تو اس کو کسی قدر ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ میں اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں......"

۱۸۶۹ء میں سید احمد دہلوی لندن گئے۔ ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کی۔ مسلمانوں کے لئے ایک مدرستہ العلوم قائم کرنے کی تجویز مکمل کی۔ مولویانہ وضع ترک کر کے ترکی لباس اختیار کیا۔ نیم یورپین مرد بیمار ترکی اسلامیان ہند کا نیا آدرش بنا۔

۱۸۵۳ء کی جنگ کریمیا میں تیس ہزار ترکمان سخت کوش خاک و خون میں مل گیا تھا۔ مگر اس وقت ہندی مسلمان بیرونی دنیا سے بے خبر یا مصائب یا عیش کوشی میں مبتلا تھا۔ غدر کے بعد اچانک معلوم ہوا کہ آل تیمور کا چراغ گل ہو گیا۔ یعنی مشرقی ترکوں کی سلطنت جو ان کی مختلف نسلی شاخوں نے گیارہویں صدی سے یہاں قائم کر رکھی تھی تباہ و برباد ہوئی۔ لیکن اخبارات نے بتایا کہ آل عثمان یعنی مغربی ترک "روم" یعنی ترکی پر ہنوز حکمراں ہیں گو فرنگی طاقتیں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے میں مصروف ہیں۔ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ معزول ہوئے مگر مغرب میں خلیفۃ الاسلام سلطان ترکیہ ابھی فرمانروا ہیں۔ ترک روسیوں سے ۱۸۷۵ء میں پھر لڑے۔ ترکی جرنیل ہندی مسلمانوں کے محبوب ہیرو بنے۔

سید احمد دہلوی نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ توریہ کی سالگرہ کے روز علی گڑھ اسکول قائم کیا۔ انٹرنس جماعت تک پڑھائی شروع ہوئی۔ مسلمانان ہند کے دور جدید کا آغاز ہوا۔

۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے مدرسے کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۸۸۱ء میں بی۔اے اور ایم۔اے کی تعلیم شروع ہوئی۔

سید نے قوم کے سامنے چندے کے لئے جھولی پھیلائی۔ حالی، نواب محسن الملک، وقار الملک، شبلی، نواب اسمٰعیل خاں، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ "نورتنوں" نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ جگہ جگہ لیکچر دیتے پھرتے اور قدامت پرست مولویوں کے طعنے سنتے تھے۔

سارے ہندوستان سے بچے کول پہنچنا شروع ہوئے۔ وہاں ایک پرانی کوٹھی میں بیٹھا وہ سفید ریش مرشد جلالی وظیفہ ایسا پڑھ رہا تھا کہ پسماندہ قبائلی سرحد پنجاب اور سندھ فیوڈل یوپی اور بہار، تجارتی گجرات اور مہاراشٹر دور دراز بنگال و دکھن مدراس کے امیر اور نادار مسلمانوں کے بچے کھنچے چلے آتے تھے۔ سنی، شیعہ، پٹھان، پنجابی، بوہرے، خوجے، رئیس زادے، پیرزادے، سب کی سید احمد نے نیا پار کر دی۔ جو علی گڑھ اسٹیشن پر اترتا ایک نئے رنگ میں رنگ جاتا۔ بوٹی دار فرغل، دگلے اور انگرکھے اتار، ٹرکش کوٹ، علیگڑھ کٹ پاجامہ، ترکی ٹوپی ڈانٹتا اور نیچری فوج میں بھرتی ہو جاتا۔

نئی اپر مڈل کلاس کے رکن خان بہادر سید جلال الدین حیدر نے بھی اپنے چاروں بیٹوں کو جنہیں وہ اپنے چار گاؤں کہتے تھے مدرستہ العلوم میں بھیجا۔ سجاد حیدر (پیدائش ۱۸۸۰ء) ۲۱ نومبر ۱۸۹۲ء کو نویں کلاس میں داخل ہوئے۔ نصیرالدین حیدر دو سال چھوٹے بھائی ۱۴ دسمبر ۱۸۹۶ء کو نویں کلاس میں اور سب سے چھوٹے وحیدالدین حیدر اسی روز پانچویں کلاس میں شامل کئے گئے۔

سجاد حیدر، نصیرالدین حیدر، خواجہ غلام الثقلین، شوکت علی، محمد علی، سردار محمد حیات، مشتاق احمد زاہدی، سید رضا علی، سید ظہور حسنین، سب کے سب سید محمود کورٹ میں مقیم ایک زبردست لونڈھیار پارٹی کے اراکین بنے۔

خواجہ غلام الثقلین اور ان کے بھائی غلام الحسنین پانی پت سے آئے تھے۔ شوکت علی و محمد علی رام پور کے باشندے تھے۔ مشتاق احمد زاہدی ٹھیٹھ دلی والے تھے۔ سید رضا علی ضلع مراد آباد کے ایک افلاس زدہ شیعہ قصبہ کندرکی سے تعلق رکھتے تھے۔ سید ظہور حسین مراد آباد کے دقیانوسی شیعہ محلے سادات لانگڑی کے ایک ہونہار نوجوان تھے جو علی گڑھ کے ایک نامور کھلنڈرے اور فٹ بال کے کپتان بنے۔ سید سجاد حیدر کھیل کود سے بے نیاز کتابوں کے رسیا۔ دونوں کے فرشتوں کو علم نہ تھا کہ ایک روز میر ظہور حسنین موخر الذکر کے چچا سسر بنیں گے۔

اب سید ظہور حسنین رضوی کے تاریخی پس منظر کی داستان شروع کی جاتی ہے کہ یہ بھی گوناگوں حیرت انگیز و سبق آموز و دلچسپ واقعات سے ازاول تا آخر پر ہے۔

فصل اول تمام شد۔ فصل دوم کے اوراق میں داستان گو آغا کربلائی امام باڑے کی تہذیب کا نقشہ ہو بہو مثل فوٹوگراف کے کھینچ کر دکھلائیں گے۔

حوالہ جات

1۔ موصوف کے بھتیجے خالد حسین شاہ نے جو عرصہ بیس سال سے امریکہ میں مقیم ہیں دو سال قبل مع اپنی امریکن شاعرہ و صحافی بی بی لنڈا نیو یارک سے آکر نہٹور چند ہفتے قیام کیا اور ایک ناول بعنوان "ریفیوجی" دونوں نے مل کر لکھنا شروع کیا۔ اس کے پہلے حصے میں مصنف کی نہٹور سے ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کا موثر تذکرہ ہے مگر چونکہ ناول مغربی قارئین کے لئے لکھا گیا ہے خاندان نہٹور کے سلسلے میں زیب داستان کو کافی دخل ہے۔ "ریفیوجی" (۸ سو صفحات) حال ہی میں نیویارک سے شائع ہوا ہے۔

2۔ زید بن امام زین العابدینؑ ۷۴۴ء میں شہید کئے گئے۔ حسین ذوالدمعہ اور عیسیٰ موتم الاشبال کی اولاد فارس اور ماوراالنہر میں جا بسی۔ عمر اشرف کی آل اولاد طبرستان اور گیلان میں آباد ہوئی۔

3۔ واللہ۔

4۔ رسالہ تذکرۃ السادات از شیخ احمد بن محمود محمدی الاکبر آبادی۔ اس کتاب کے بیرونی شجرات کے ماخذ سید احمد اردبیلی، شیخ شریف الدین بن عبداللہ نقاب، علی بن زید ہراتی، ملا حسین واعظ کاشفی وغیرہ ہیں۔ ہندوستان کے شجرات کے ماخذ سید علی ہمدانی، مخدوم اشرف جہانگیرؒ، سید لعل محمد قطبی وغیرہ۔ یہ کتاب ابوالمظفر سلطان محمد معظم شاہ عالم اول لقب بہ بہادر شاہ اول (۱۷۰۷۔۱۷۱۲ء) کے دور میں لکھی گئی۔

5۔ آج کے دور میں کوثر چاندپوری اور ڈاکٹر گیان چند جین نے ادب میں نام پیدا کیا۔

6۔ امپیریل گزیٹر۔ سر سیدؒ نے اپنی کتاب میں لکھا: "وضعداران بجنور۔ شرفائے نگینہ۔ دانشمندان نہٹور۔"

7۔ آج ۱۹۷۶ء میں قاضی چمن کی اولاد میر حسن ترمذی کے مکان کے نزدیک اپنے آبائی گھر میں اسی طرح آباد ہے۔

8۔ ضلع بجنور جین مت کے پیروں کا بڑا مستقر ہے۔

9۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نہٹور میں آج تک ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔

10۔ نہٹور کا یہ عمرانی نظام ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ آج ۱۹۷۶ء میں بھی سوائے محلہ سادات کے بس کے بیشتر افراد پاکستان ہجرت کر چکے ہیں نہٹور کے مسلمان محلوں کی آبادی کم و بیش اسی طرح موجود ہے۔

11۔ تذکرہ سادات نہٹور از سید عابد حسین مرحوم

12۔ فارسی عبارت کا ترجمہ

13۔ پٹھان سردار محمد شاہ خاں۔

14۔ ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ (الدر المنظوم)

15۔ طامس اور ولیم ڈینیل (رائل اکیڈیمی لندن)

16۔ یعنی ہوا میں اڑتا ہے۔

17۔ ملفوظات جہانیاں جہاں گشتؒ

18۔ تاریخ اودھ از سید کمال الدین حیدر

19۔ نواب انوار الدولہ شفق۔

20۔ میر احمد علی "ترک سواراں راجہ گھورائے" میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ راجہ کون تھا اور اس کی ریاست کا کیا نام تھا۔

21۔ نواب نجیب الدولہ کے پڑپوتے 'نواب محمود خاں۔

22۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ کا معتقد فرقہ مخدومؒ کی جھم پیر کے نام سے پرستش کرتا ہے۔

23۔ نواب سید صدر جہاں سلطنت جلال الدین محمد اکبر و جہانگیر میں صاحب نوبت و صدر الصدور ہم پلہ وزرائے سلطنت تھے (تذکرہ سادات نہٹور) "میر صدر جہاں از علمائے است و مدتی مفتی بود۔ حالا صدر الصدور است۔ طبع نظم دارد" طبقات اکبری ۳۹۲ص بہ ذیل ذکر علماء و فضلاء کہ درایام سلطنت خلیفہ الٰہی در سواد اعظم ہند بودہ اند۔ امیر صدر جہاں صدر الصدور ہندوستان است و بفضائل کمالاتی موصوفست۔" بہ ذیل ذکر اسامی امرائے نامدار ۲۸۹ طبقات اکبری مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۲ھ (بشکریہ قاضی عبدالودود و عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ) توزک جہانگیری ص ۲۰۰

24۔ باکو۔ تیز ہوا کا راستہ (سوویت آذربائیجان)

25۔ آذربائیجان کے صوفی 'مصنف گلشن راز

26۔ رسول اللہؐ کے اجداد

27۔ عدنان اول کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔

28۔ اٹھارویں صدی قبل مسیحؑ

29۔ سید سجاد حیدر یلدرم کے والد

30۔ سیدہ مریم خاتون

31۔ عہد نامہ قدیم۔ صحیفہ دانیالؑ

32۔ کچھ عرصہ بعد میر احمد علی ترمذی نے جھانسی میں انتقال فرمایا۔

33۔ یہ سلسلہ بخارا و سمرقند میں بہت مقبول تھا۔

34۔ صوفیا کے روحانی تجربات پر لینن گراڈ یونیورسٹی' ہارورڈ' پرنسٹن' ڈیوک' اوکسفورڈ' کیمبرج وغیرہ میں ریسرچ کی جا رہی ہے۔ صوفیاء اور یوگیوں کے تجربات پر پیرا سائیکولوجی کی اصطلاح میں

Secondary Personality, Parthengenitic Symbolic Self, Psychic Perception, Psychic, Emanation, Electromagnetic Powers of the Human Psyche, Teleportation, Multiple Personality. Clear Guidance. وغیرہ وغیرہ کہلاتے ہیں۔

35۔ ہوا اور موسم پر اولیاء کے تصرف کا عقیدہ بہت قدیم ہے۔ پودوں کی نشوونما پر دعا یا لعنت کے اثرات ...... کے عقیدے کو چار امریکن یونیورسٹیوں میں جانچا جا رہا ہے۔ میک گل یونیورسٹی کے بیالوجسٹ ڈاکٹر گراڈ نے بیمار چوہوں اور پودوں پر دعا کے اثر کا تجربہ کیا ہے۔

36۔ خان بہادر سید کرار حیدر مرحوم کے ایک ہر دلعزیز پوتے کافی زمانہ تعلق سلسلہ مارکسیہ سے ہے۔ چراغ ہدایت حضرت لینن سے بیعت ہیں۔ خان بہادر سید جلال الدین حیدر مرحوم کی ایک پرنواسی کہ لندن اسکول آف اکنومکس میں زیر تعلیم ہیں۔ اسی سلسلے کے برحق فرقے ماؤیہ ملامتیہ سے عقیدت رکھتی ہیں۔

فصل دوم

۱— امام باڑہ

گاگن ندی نہٹور سے گزر کر ڈھاک اور سمبل کے جنگلوں میں سے بہتی ضلع مراد آباد میں داخل ہوتی ہے' یہاں پر اس ندی کے کنارے ایک اور کہنہ گاؤں آباد ہے کہ لانگڑی کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ شاہجہاں بادشاہ نے ایک خراسانی کنبہ کو جاگیر (معافی) میں عطا کیا تھا۔ گویا یہ پینتالیس میل لمبی ندی ایک طرف جیحوں اور دوسری طرف ہری رود کی نعم البدل ہے۔

حضرات! بے چاری لانگڑی کی اہمیت تاریخ عالم یا تاریخ ہندوستان و ایران تو کیا اس برطانوی صوبے میں بھی صفر تھی۔ لانگڑی' نہٹور' سنبھل' محمود پور' کندرکی' محض سنگ میل ہیں۔ نواح دلی اور مملکت ایران میں جا بجا شکستہ مینار اب بھی نظر آتے ہیں کہ ملوک گزشتہ نے مسافروں کی سہولت کے لئے بنوائے تھے جن میں اب کبوتر بستے ہیں۔

ناظرین۔ ان گمنام قریوں کے باشندگان میں سے چند ایک نے تھوڑا بہت پارٹ ڈرامے میں ادا کیا۔ الفرید تھیٹر کمپنی کے ناٹک کا سین بدلتا ہے۔ دوسرے ایکٹریا وہی تماشاگر پوشاک تبدیل کر کے گیس کے ہنڈوں کی روشنی میں سامنے آتے ہیں۔ ڈراپ سین کے بعد کمپنی کا منشی' کمپنی کی مشہوری اور پبلک کی دلبستگی کی خاطر دیا ناٹک لکھتا ہے۔

دیکھنے والے کی موت ہے۔

سارے زمانے یہاں ہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہم جیسے انسان تھے۔ لیکن دور حاضر سے ہم مانوس ہیں۔ ماضی حکایت بن جاتا ہے' ہر واقعہ' ہر کردار اہم ہے۔

سمجھنے والے کی موت ہے۔

ہندوستان کے لاکھوں گاؤں میں سے ایک چھوٹا سا گاؤں جس کے زمیندار شہر مراد آباد مغل پورہ حصہ اول محلہ سادات لانگڑی میں غدر کے بعد سے اپنی مسندوں پر سرنگوں بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ اس بے بضاعت لانگڑی کے تذکرے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھادوں میں لگنے والا میلہ' گاگن کے میٹھے خربوزے' چند پکے مکان' کچے جھونپڑے' بنیوں کی دوکانیں' چند مندر' دو مسجدیں' ایک امام باڑہ۔

اتنی کم بساط پر کوئی تاریخ لکھی جا سکتی ہے؟

آج چاند رات ہے۔ امام باڑہ روشن ہوا۔ لانگڑی کے نادار شیعہ منبر کے سامنے بوسیدہ چٹائیوں پر آن بیٹھے گلی پار برگد کے نیچے مولوی محمد سمیع اللہ نے لالٹین کی روشنی میں شہادت نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہندوؤں نے اپنے تعزیے سجا لئے۔ سبیلیں لگ گئیں۔

فرمایہ' اداس لانگڑی کی یہ چاند رات کون ایسی معنویت کی حامل ہے؟ اس قریے کا نام ہی آپ

کو صوبے کے نقشے پر نظر نہ آوے گا۔ بقول حضرت اکبر

جو گزرو گے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے

لیکن میں' سید علمدار حسین رضوی المشہدی عرف آغا کربلائی (کہ پانچ مرتبہ زیارت کربلائے معلی کا شرف حاصل کر چکا ہوں) غریب اور کثیرالاولاد اور سفید پوش یعنی ناداری کو چھپائے رکھنے میں ماہر۔ میں جو اس امام باڑے کا نگراں ہوں اور میں جو چھٹی تاریخ سے شہر جا کر قلیل معاوضے پر اپنے متمول عزیزوں کے ہاں مجالس پڑھوں گا۔ افلاس' صبرو قناعت اور عشق حسین میری دولت ہے۔ میں جو تیرہ سو (۱۳۰۰) برس کی تاریخ کے بے بہا خزانے کو اپنے نسلی حافظے اور خون میں محفوظ رکھتا ہوں۔ دنیا جیسی تھی میں نے اسے دیکھا۔

حضرات در سخن من معنی مشکل و غریب ہست۔ لیکن جب کڑیوں سے کڑیاں ملتی جاتی ہیں تو پردے اٹھتے ہیں۔

عشرے کی ویران صبح اس شکستہ امام باڑے کے دالان سے مستورات کی دلدوز فریاد بلند ہوگی۔ وا محمدا کشتہ شد حسینؑ۔ وا محمدا کشتہ شد حسینؑ۔

آنسوؤں کا فرات تیرہ سو برس سے بہہ رہا ہے۔ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے غلامان اہل بیت اظہار اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں گویا واقعہ کربلا آج کی بات ہے۔

مومنین آج ۱۸۹۶ء کی لانکڑی کا ۶۸۰ء کے کوفے سے کون سا ایسا گہرا تعلق ہے؟

وا محمدؐا۔ کشتہ شد۔

۲—قصہ اہلِ خراسان

یاد رہے کہ پچھلا وقت آج سے منسلک ہے۔ کوئی سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ ازل سے ابد تک وجود پیہم اور مسلسل اور مستقل ہے۔ ماضی کا ہر واقعہ ہم سے بہت نزدیک ہے۔ تاریخ کی مجموعیت اور تسلسل اور معنویت کا جس قدر شدید احساس ہم محزن لوگوں کو ہے' دنیا کی کسی قوم کو نہیں ہر واقعہ اور حادثہ موجود ہے۔ ہم حال میں زندہ ہیں لیکن ماضی میں اسی شدت کے ساتھ شامل ہیں۔ ہر زمانے میں ہم شریک رہے ہیں۔ بات مابعد الطبیعات کی طرف چلی جائے گی لہٰذا اب میں بنام ایزد بخشایندہ مہربان موضع لانکڑی کی داستان کا آغاز کرتا ہوں۔

ابو ہاشم بن محمد بن حنیفیہ کو ہشام بن مالک نے زہر کھلایا۔ وقت رحلت پیروؤں سے وصیت فرمائی۔ خراسان جاؤ اور وہاں کے لیڈروں سے مل کر آل عباس کے حصول خلافت کے لئے کوشش کرو۔

آل عباس کے حلیف پبلک سے چپکے چپکے کہتے پھر رہے تھے ابوالعباس کو ووٹ دو۔ خراسان میں اب تک بنی فاطمہ کے لئے کوشش جاری تھی۔ اب بنی عباس کے لئے کام ہونے لگا امیدوار کا نام اعلانیہ نہ

لیا جاتا تھا ورنہ دمشق گورنمنٹ امیدوار اور حامی دونوں کو جیل میں ڈال دیتی۔

تیرہ سو سال قبل کی سیاست اور آج کی ترقی یافتہ پالی ٹکس میں للہ مجھے بتلاؤ کیا فرق ہے؟ آج کیا زار روس' شاہ قاچار' سلطان روم اور یوروپ کے متعدد حکمرانوں کے خلاف اسی طرح کی سازشیں نہیں کی جا رہی ہیں؟

اس مخفی دعوت کی وجہ سے بہت افراتفری رہی۔ کہیں بنی فاطمہ کے لئے کام ہو رہا ہے۔ اندر خانہ کسی اور کنڈیڈیٹ کے لئے۔ واضح ہو کہ میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ جانے والے ہونہاروں کی خاطر نئی اصطلاحات استعمال کر رہا ہوں۔

یہ زبردست تحریک اس کامیابی سے اس زمانے میں چلائی گئی جب ریل تھی نہ تار۔ خراسان سے رپورٹیں کوفہ روانہ کی جاتیں۔ وہاں سے ان کا خلاصہ تیار کر کے حیمہ بھیجا جاتا جو دمشق کے قریب اینٹی امیہ ایجی ٹیشن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ تمام شیعان علیؑ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے حامی بن چکے تھے۔ ستر (۷۰) عدد نقیب تاجروں کے بھیس میں ساری خلافت میں پھیل کر چپکے چپکے حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔

ہشام بن مالک نے چند نقیب پکڑ کر پھانسی گھر بھجوا دیئے۔ بدامنی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ خراسان میں بابک خرمی نے اعلان کیا کاشتکاروں کو زمین دو' جاگیرداروں کا خانہ خراب ہو۔

داعی الکبیر ابو مسلم کو تھیٹر کا فن آتا تھا۔ سیاہ پوش فوج' سیاہ علم' تاریخ عجم کے حوالے۔ مرو کی پہاڑی پر گھپ اندھیری رات میں الاؤ دہکائے گئے۔ ڈرامائی انداز سے فوج کو یلغار کا سگنل ملا۔

خراسان کے پہاڑی راستوں پر سے دوڑتا ہزارہا کاشتکار مزدور فوج میں آشامل ہوا۔ متمدن انسان ہمیشہ اس امید پر زندہ رہا ہے کہ اگر موجودہ نظام بدل دیا جائے نیا نظام اس سے بہتر ہوگا۔

آج ہمارے امراء دور مغلیہ کی یاد میں آہیں بھر رہے ہیں۔ ایران میں دولت ساسانیہ کی یاد تازہ تھی۔ بیشتر زرتشتی امرا اسلام قبول کر چکے تھے۔ جدید اسلامی علوم سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ گویا انگریزی پڑھ رہے تھے۔ لیکن عرب تسلط سے ناخوش تھے۔

نئے پڑھے لکھے جوشیلے خراسانی نوجوان گویا بنگالی بابو تھے۔ بلخ کا دستور زادہ خالد برمکی نامی مسلمان ہو چکا تھا۔ دولتمند اور مقتدر خاندان تھا۔ عوام پر اس کا بہت اثر تھا۔ خالد بنوامیہ کے خلاف منظم بغاوت میں ابو مسلم کا دست راست بن گیا۔

۷۵۰ء میں آل عباس کی حکومت قائم ہوگئی۔ بعد ازاں ابو مسلم کا جو حشر ہوا سو ہوا۔ نظام نو قائم ہو گیا۔ تب جا کے علویوں کو احساس ہوا کہ چوٹ ہو گئی۔ لہٰذا از سر نو دعوت شروع کی۔ بے مایہ فقیر منش لوگ طاقتور حکومت سے ٹکر لیتے اور ہار جاتے۔ ادھر ایران میں نئی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ سونے کا نقلی چہرہ لگائے حکیم المقنع مع اپنے سپید جامگان خراسان کے سیب کے باغات میں سے نمودار ہوا۔ آذربائیجان کے تاکستانوں میں "سرخپوش" انقلابیوں اور زندیقوں نے خفیہ میٹنگیں شروع

کیں۔ نیشاپور میں سندباد مزدکی نے اودھم مچائی۔ مجوسی دانشور تھا۔ شہر کے چوراہوں پر کھڑے ہو کر جوشیلی تقریریں کرنے لگا۔ امیر غریب کا فرق مٹا دو کہنے لگا......... حاکم اور محکوم' عرب اور غیر عرب کی تفریق ختم کرو۔ عباسی حکومت امپیریلزم ہے۔ دیکھا آپ نے؟ یہ ہمارے انگریز بہادر اپنی برٹش ایمپائر لئے پھرتے ہیں۔

اب ہو یہ رہا تھا کہ علوی اور بنو فاطمہ پہلے کوفے کا رخ کرتے جو شیعہ انقلاب کا سینٹر تھا اور وہاں سے سیدھے ایران۔

فرار کے مختلف راستے تھے۔ کبھی بھیس بدل کر دیباو حریر کے تاجروں کے ساتھ ہو لیتے جن کے کارواں گھنٹیاں بجاتے دور دراز سمرقند اور کاشغر کی طرف رواں تھے۔ یہ قدیم "سلک روڈ" جنوبی عراق سے شروع ہو کر شمالی دشت کویر کے کنارے سے گزرتی مرو' بلخ اور قراچین جاتی تھی۔ اسی شاہ راہ کی ایک شاخ سیستان سے نکلتی قندھار اور وادی سندھ آپہنچتی تھی۔ قدیم ہخامنشیوں' اشکانیوں' ساسانیوں کے ادوار میں بھی لوگ باگ شاہی عتاب یا بیرونی حملوں سے بچنے کے لئے خراسان کی پیچ دار گھاٹیوں میں جا چھپتے تھے۔ زرتشتی وہاں گیارہویں صدی عیسوی تک چھپا کئے۔

خلیفہ مہدی کا بھائی اور جانشین ہارون رشید اناطولیہ میں باز نطینیوں کا حلیہ ٹھیک کرنے میں مصروف تھا۔ یوروپ کے اس جلیل القدر شہنشاہ یعنی فرمانروائے باز نطیم کو اپنے مراسلوں میں اطمینان سے "سگ رومی" کے لقب سے مخاطب کرتا تھا یعنی Dogs and Europeans not Allowed

اسی اثنا میں خبر پڑی کہ خراسان میں پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ خلیفہ نے اپنے فرزند مامون رشید کو مرو بھیجا۔ خود بھی مشرق کی سمت روانہ ہوا۔ یہ ۸۰۸ء کا واقعہ ہے۔ خلیفہ طوس کے نزدیک سندباد میں بیمار پڑا اور راہی ملک عدم ہوا۔

بغداد خراسان سے بہت دور ہے۔ ہارون رشید کی موت کی اطلاع پہنچتے ہی اس کا چھوٹا بیٹا امین الرشید تخت خلافت پر جا بیٹھا۔ مامون ایران میں تھا۔ دونوں بھائیوں کی افواج رے کے نزدیک ایک دوسرے سے بھڑ گئیں۔ مامون کے لشکر نے آگے بڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانی سپاہ کے تعاقب سے بچنے کی کوشش میں نوجوان امین نے دجلہ عبور کیا اور موت کے گھاٹ اترا.......

اے رود دجلہ.. اے رود دجلہ۔

خلیفہ مامون رشید مرو میں مقیم تھا۔ ۸۱۵ء میں اس نے فیصلہ کیا۔ خلافت آل رسولؐ کو واپس کر دی جائے۔ امام علی الرضا کو مدینے سے خراسان بلوا بھیجا۔

امام عالی مقام جس وقت نیشاپور پہنچے ہیں تمازت آفتاب کی وجہ سے آپ نے چہرہ مبارک پر چھتری کا سایہ کر رکھا تھا۔ خواص و عوام نے شہر سے باہر آپ کے استقبال کے لئے ہجوم کیا۔ محدثین شیخ ابو ذر رازی' محمد بن اسلم طوسی اور دوسرے علمائے نیشاپور نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر التجا کی' یا ابن رسولؐ اللہ' ہمارے ماں باپ آپ پر قربان۔ چہرے سے پردہ ہٹایئے تاکہ آپ کے غلام آپ کی زیارت کر

سکیں۔ امام فلک اقتدار نے التجا منظور فرمائی۔ آپ کے رخ روشن کو دیکھتے ہی مجمع نے گریہ وزاری شروع کی۔ لوگ خاک پر گر کر لوٹتے تھے اور امام کے خچر کے کھروں کو چومتے تھے۔

مرو میں المامون نے اعلان کیا کہ "میں اولاد عباس اور اولاد علیؑ میں کسی کو امام علی الرضا جیسا نہیں پاتا۔" جونہی یہ اطلاع بغداد پہنچی کہ امیرالمومنین نے امام رضا کو جانشین مقرر کیا۔ خاندان عباسیہ میں تہلکہ مچ گیا۔

مومنین۔ بلاد اسلامیہ کی دشت نوردی کرتے ہوئے اس فدوی کا گزر ایک بار مرو سے ہوا کہ یہ شہر جو کبھی "شاہ جہاں" کہلاتا تھا آج کورده ہے۔ میں نے بیرام علی اور سلطان سنجر میں مقابر پر فاتحہ پڑھی اور چاء خانوں میں خاموش بیٹھا رہا۔ ایک روز گلیوں میں آوارہ گردی کر رہا تھا کہ ایک نیلگوں کھنڈر نظر آیا۔ نجانے کیوں دل نے کہا شاید اسی جگہ وہ سرائے رہی ہو جس میں امامؑ والاقدر جلوہ افروز ہوئے تھے۔ لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ ناگاہ کان میں مولانا جامی کی کڑک دار آواز آئی۔ باادب۔ خبردار۔ سنبھل کے چلو کہ شہ کاخ عرفان[1] ان گلی کوچوں سے گزر چکے ہیں۔ روح تھرا گئی۔ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں۔ تصور میں دیکھا کہ روز عید ہے۔ المامون فرمان جاری کر چکا ہے کہ دولت عباسیہ کے سیاہ نشان اتار کر آل رسالت مآب کے سبز پرچم بلند کئے جائیں۔ امام معصومؑ سے خطبہ عید پڑھنے کی خواست کی ہے۔ باشندگان مرو جوق در جوق عید گاہ کی سمت جا رہے ہیں۔ ہر در و بام پر عورتوں اور بچوں کا ہجوم۔ مشتاق و منتظر۔ دولت کدے کے سامنے جم غفیر۔ آقاؑ ابھی باہر تشریف نہیں لائے۔ میں نے سوچا شاید زیارت نصیب میں ہو۔ دبے پاؤں بارگاہ امامؑ کی سمت بڑھا۔

مداح امیر ابن امیرؑ آ ؟ ہے۔ دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے۔

ایک گرجدار آواز کانوں میں گونجی۔ سیتاپور کی مجلس۔ میرزا کی آواز۔ لرزہ ساطاری ہو گیا۔ قدم بوجھل۔ یک لخت صحرائے قراقرم کی گرم گرم ریتیلی ہوا کا ایک تھپیڑا ایسا آیا کہ نخلستان مرد کی خنکی معدوم ہو گئی۔ گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔

آنکھیں کھولیں تو سامنے شکستہ مسجد۔ بغل میں گورا بارک۔

چوک میں زار[2] روس کے سپاہی قواعد پریڈ میں مصروف تھے۔ ایک خیمے کے سامنے روسی کمسریٹ کا ایک خچر میری طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس سنہری مونچھوں والا ایک روسی کپتان ایک تباہ حال ترکمان کو چابک مارتا تھا۔ ایک غریب خوجہ یعنی سید زادہ عمامے پر سبز رومال باندھے سر جھکائے آہستہ آہستہ شکستہ مسجد کی طرف جا رہا تھا۔

دوبارہ آنکھیں بند کیں۔

اب میں روسیوں کے غلام کرنل علی خانوف گورنر مرو کے عہد سے بہت دور ایک بار پھر ۸۱۸ء کے مرو میں موجود ہوں۔

سامعین جو آج ہو رہا ہے وہی اس وقت ہو رہا تھا۔ فقط کیلنڈر کی تاریخیں بدلتی جاتی ہیں۔

مامون الرشید دارالامارت کے حالات سے روشناس ہوا۔ عراق کا قصد کیا۔ مرو سے کوچ کر کے طوس پہنچا جہاں پر علی الرضا علیہ السلام نے اچانک انتقال فرمایا۔ شیعہ مورخ سید امیر علی کے خیال میں خلیفہ پر الزام بے بنیاد ہے۔

مامون نے امام والا تبار کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ روتا دھوتا عراق روانہ ہوا۔ یہ خلیفہ کہ اہل عجم کو دوست رکھتا تھا' ۸۳۳ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے بھائی اور جانشین معتصم باللہ نے ایرانیوں کے بجائے کرنل علی خانوف کے اجداد کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔

۸۷۸ء میں امام محمد مہدیؑ آخرالزماں' صاحب العصر قائم آل محمدؐ سامرہ میں مستور ہوئے۔

از محمدؐ تا محمد کبیر ہو کہ صغیر' داستان طولانی ہے۔

عجب نہیں کہ نظر بندئ مصور نے
پلٹ پلٹ کے دکھائی ہو ایک ہی تصویر

قصہ اہل خراساں کی طرف واپس آتا ہوں۔

المتوکل کیا مرا دولت عباسیہ کا آفتاب غروب ہوگیا۔ خراسان آزاد ہوا۔ امام اسمٰعیل بن امام جعفر صادقؑ کی اولاد نے مصر میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ شمالی ایران کے صوبے خود مختار ہو گئے۔ دیلم کے آل بویہ کہ پہلے زرتشتی امیرزادے تھے اور شیعہ مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ اب خلفائے بغداد کے حاکم بن گئے۔ خطبات جمعہ میں امیرالمومنین کے ساتھ سلطان دیلم کا نام پڑھا جانے لگا۔

۹۵۲ء میں معزالدولہ والئی دیلم نے عشرہ محرم کی یادگار منانے کی رسم کا اجرا کیا۔ آل بویہ کی ایرانی قوم پرستی اور تشیع نے ایرانی شیعیت کی روایات کی بنیاد ڈالی۔

گیارہویں صدی عیسوی میں غزنویوں نے فارس اور کرمان کے علاوہ سارے ایران اور ماوراالنہر پر قبضہ کرلیا۔

ہم آل امام رضاؑ نیشاپور میں رہتے تھے۔ جیحون پار ترمذ میں زیدی آباد تھے۔ خواجگان سہروردیہ نے ترمذ میں ایک عظیم خانقاہ قائم کی جس میں ٹریننگ لے کر نوجوان کبود پوش بغرض تبلیغ ہندوستان' چین' روس وغیرہ بھیجے جا رہے تھے۔ جیسے آج کل فرنگی مشنری یہاں باہر سے آتا ہے۔

خداوندلقا کی داستان ختم ہو جائے' باختر و خراسان کی طلسم ہوش ربا ختم نہ ہوگی۔ آتش کدے' یونانیوں کے مدارس' بودھ دیہار' ان روایات کا اثر ابھی باقی تھا کہ دسویں صدی عیسوی کے آغاز سے خرقہ پوش اور معتزلہ علماء کی چہل پہل شروع ہوگئی۔ پھر بخارا اور مرو میں ایک نئی زبان و ادب کا چرچا ہوا۔ روز ایک نئے شاعر کا نام سننے میں آتا تھا۔

طلوع اسلام سے قبل خراسان مقتدر دہقانوں یعنی جاگیرداروں کا ملک تھا۔ ان کے درباروں میں گرجدار آوازوں والے داستان گو قدیم سیستانی پہلوانوں کے قصے سناتے تھے۔ طوس کی گلیوں میں اکا دکا بوڑھے پھونس گدڑی پوش داستان گو پڑے پھرتے تھے۔ جانتے تھے ان کا زمانہ گزر گیا۔ ان کا آخری شہنشاہ

یزدگرد سوئم افتاں و خیزاں خراسان میں پناہ لینے آیا تھا۔ مارا گیا۔ اس سے ایک ہزار سال قبل جب سکندر نے دارا کو ہرایا تھا وہ دارائے بزرگ بھی اسی طرح افتاں و خیزاں خراساں آیا تھا۔ مارا گیا۔

آقائے ابوالقاسم اپنے مکان کے سامنے کسی بے کس پھٹے حال داستان گو کو رباب بجاتے بھیک مانگتے گزرتا دیکھتا اور غصے سے پیچ و تاب کھاتا تھا اور مزید جوشیلے اشعار رقم کرتا تھا۔

اور میں تو سمجھتا ہوں واقعہ' کربلا کو رزمیہ میں تبدیل کرتے ہوئے ہم نے بھی اسی قدیم خراسانی روایت کا اثر قبول کیا۔

امام زادوں کی حیثیت سے نیشاپور میں ہماری بہت توقیر تھی۔ غزنوی سپاہی چھاؤنی سے چل کر ہماری زیارت کے لئے آتے اور درود شریف پڑھتے۔ پٹھانوں کا آج تک یہی حال ہے۔ (انھوں نے توبلخ میں مولا علیؑ کا ایک روضہ بھی تعمیر کرلیا ہے جوق درجوق سنی ازبک' ترکمان' افغان "مزار شریف" زیارت کے لئے جاتا ہے۔)

مشہد نیشاپور سے ۹۵ میل دور تھا۔ یہاں سلطان محمود نے روضہ امام کا گنبد دوبارہ تعمیر کروایا۔ سلطان کی بیٹی نے اس پر حسین ٹائل لگوائے۔ پھر جو بادشاہ خراسان پر حاوی ہوتا سب سے پہلے آکر امام کے روضہ پر مزید سونا چاندی جواہرات جڑواجاتا۔

"جغرافیہ خلافت مشرقی" کے مصنف نے لکھا تھا' "نیشاپور کے مشرق میں مشہد امام رضاؑ واقع ہے۔ بیچ میں پہاڑوں کا سلسلہ حائل ہے۔ کچھ فاصلے پر طوس کے کھنڈر نظر آتے ہیں جو مشہد سے پہلے شہر تھا۔ طوس سے کچھ فاصلے پر سناباد کا بہت بڑا باغ ہے جس میں ہارون الرشید اور امام رضاؑ کے مزار ہیں۔ "مستوفی قزوینی پہلا مورخ ہے جس نے موضع سناد باد کا نام مشہد لکھا۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے پندرھویں صدی میں ذکر کیا کہ بیشتر رضوی یا قمی مشہد میں رہتے ہیں۔

خراسان پر ہر زمانے میں وسط ایشیائی حملہ آور ہوتے آئے ہیں۔ پہلے یہ خانہ بدوش تورانیوں اور متمدن ایرانیوں کا جھگڑا تھا۔ افراسیاب تورانی اور رستم ایرانی اس نسلی کشمکش کے دو علامتی کردار تھے۔ تورانی اب اسلام قبول کر چکے تھے اور مسلسل ملک گیری یلغار کرتے تھے۔

سلجوق ایک ترکمانی سردار تھا۔ جن دنوں بخارا کے آل سامان اور غزنویوں کے درمیان گھمسان کے رن پڑ رہے تھے سلجوق اور اس کے شہ سوار بھی میدان میں کود پڑے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے خراسان کا رخ کیا پھر سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔ یہ ترک بہت بانکے اور پر شکوہ حکمراں ثابت ہوئے۔ جناب امیر کی قسم سلاجقہ اعظم کا دور آج ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ کل حقیقت تھا۔

وہ الپ ارسلان ہے کہ گھوڑے پر اڑا چلا جا رہا ہے۔ وہ ملک شاہ سلجوقی آئے۔ وہ ان کا وزیر نظام الدین طوسی۔

صنوبروں کے نیچے گلیم بچھائے حکیم ناصر خسرو ہیں کہ سر جھکائے لکھے چلے جاتے ہیں۔ وہ حکیم سنائی آئے۔ وہ امام غزالی' انوری' عطار' کس کس کو یاد کرو۔

بازار میں خراسان کی سیاہ مٹی سے کوزہ گروں نے علامتوں کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر ایک کوزہ گڑھا گیا۔ ادھر کھٹ سے ایک رباعی تیار۔

اور سلطان سنجر بن ملک شاہ' شاعر' محدث' حامی علوم معارف' صاحب علم و دانش' پایہ تخت مرد میں محض ایک کتب خانے میں بارہ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ علماء و مشائخ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ خود کو خسروئے دوراں' سکندر سطوت' دارا حشم کہلوانے والے بادشاہوں کو مستقل ڈانٹتے رہتے ہیں۔

ایک بار ہمارے طوس میں قحط پڑا۔ کڑاکے کا جاڑا' پانی منجمد' ندیاں خشک' تنور سرد' سر جھکائے لوئیوں میں لپٹے انسان دھندلے سائے کی طرح بازاروں میں سے گزرتے۔ اپنی پوستین بیچ کر نان خریدتے۔ امام غزالی کو سلطان سنجر دربار میں مدعو کرتا تھا۔ ٹال جاتے تھے۔ ایک روز غصے میں آکر اس کو خط لکھا۔ "پادشاہا۔ اپنی بھوکی رعایا کی خبر لو اور عاقبت کی فکر کرو۔"

سلطان نے کان دبا کر ڈانٹ سن لی۔

ایک اور حقیقت یہ ہے کہ دولت سلجوقیہ کا بھی نام و نشان نہ رہا۔ ان کے بعد خوارزم شاہوں اور غوریوں کا نام و نشان نہ رہا۔ آل عثمان کا ہلال احمر گو اب تک لہرا رہا ہے اس کے بھی لالے پڑے ہیں۔

جس وقت سلطان سنجر کو خراسان میں قبیلہ ادغور کے ترکوں نے قید کیا ہے علماء و مشائخ قتل ہوئے' کتب خانے جلا دیئے گئے۔ مدارس میں گھوڑے بندھنے لگے۔ سلطان مرگیا۔ انوری نے رو رو کر والی سمرقند سے فریاد کی۔

به سمرقند اگر بگذری اے باد سحر ‏ ‏ ‏ ‏ نامۂ اہل خراساں بہ برخاقاں بر

اجی شاعروں کے رونے دھونے سے کبھی کچھ ہووے ہے۔

چنگیز جس کے نام کا مطلب "شاہجہاں" تھا آکر باقی کا صفایا کر گیا۔ جیحون کے گھاٹ پر اترا۔ ترمذ اور بلخ برباد کئے۔ چوتھے بیٹے تولوئی خاں کو بالشکر گراں ولایت خراساں روانہ کیا۔ تولوئی نام کتنا بے ضرر لگتا ہے جیسے اب او تولوئی۔

تولوئی نے اپنی قانون کی کتاب کھول کر دیکھی۔ اسے بند کیا۔ آگے بڑھا۔ منگول قانون میں یہ لکھا تھا فاتح کو چاہئے جو قوم فتح ہو اسے بے دریغ قتل کرے۔ پھر آگے چلے۔

بعد ازاں ہلا کو ابن تولوئی بلا کی طرح ایران و عراق پر نازل ہوا۔ خون کے دریا بہہ گئے۔ مسلمانان عالم آج تک تباہی بغداد یاد کر کے خون کے آنسو روتے ہیں۔

چچا سعدی نے رو رو کر لکھا تھا۔

خون فرزندان عم مصطفےٰ شد ریختہ
ہم براں خاکی کہ سلطاناں نہادندی جبیں

آج عباسیوں کے آخری نام لیوا محض ریاست بھاولپور صوبہ پنجاب کے نواب ہیں۔

........اے رود دجلہ۔ اے رود دجلہ

........شاہرخ مرزا کا ہرات

وہ بھی ایک وقت تھا۔

جامی۔ میر خوند۔ دولت شاہ۔ علی شیر نوائی۔ ملا حسین واعظ کاشفی کہ بیٹھے نسب نامہ سادات مرتب کر رہے ہیں۔

ایک بار پھر آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ درایں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔

سامنے سے سائبیریا اور دشت قپچاق کے شہسوار بگٹٹ چلے آ رہے تھے۔ سموری ٹوپیاں' فل بوٹ' اونی فرغل' تیز تیز چھوٹی عقابی آنکھیں۔ روسیوں والی زردی مائل سفید رنگت' پیچھے مہیب محل نما مندے کے پہیے دار خیموں کا شہر رواں۔ خوانین اردوئے معلّی کے رعب سے سارا مسیحی روس اور آدھا یوروپ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اے لیجئے چنگیز کی نامعقول اولاد پھر نازل ہو گئی۔

۳— باستان نامہ دہقان دانشور 3

محمد شیبانی خاں ازبک جوجی خان ابن چنگیز کی نسل سے تھا۔ ۱۵۰۴ء میں اس نے ایک تیموری شہزادے بابر نامی کو فرغنہ سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد ایک دن اپنے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس نے مغرب کی سمت نظر دوڑائی۔ اردو گاہ کے آگے پہاڑیاں اور ندیاں تھیں۔ نیلگوں برف پوش کوہسار' بھیڑوں کے گلے' کپاس کے کھیت' سبزہ زار' دور نیلی اور سبز نقاشی کا ایک مینار کھڑا تھا جو شاید طغرل یا سنجر یا جلال الدین خوارزم شاہ نے بنوایا تھا۔ اس کے آگے تورانیوں کی پرانی جولانگاہ........ ایران۔

مغربی ایران میں ایک صوفی شاہ صفی الدین اردبیلی گزرے ہیں کہ امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھے۔ ان کے خانوادے کے معتقدین زیادہ تر شیعہ آذربائیجانی ترک تھے۔ یہ ترک ائمہ اثنا عشریہ کی نسبت سے بارہ کنگوروں والی سرخ بانات کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ اس کی وجہ سے قزلباش یعنی سرخ ٹوپی والے کہلاتے تھے۔ شیخ حیدر صفوی کے لڑکے اسمٰعیل نے ان قزلباش ترکوں افشار' قاچار وغیرہ قبائل اور صوفیائے قراباغ کی مدد سے حکومت ایران کا تختہ الٹا۔ خود تبریز میں تخت نشین ہوا۔ (ہمارے بزرگوں کا خیال تھا کہ شاہان صفویہ بنے ہوئے سید تھے۔ خیر)

اسی اثناء میں شیبانی خاں کی مملکت سلطنت صفویہ کی سرحد تک پہنچ گئی۔ سرحدی چوکیوں پر آئے دن ازبک اور قزلباش سپاہیوں میں جھڑپیں رہتیں۔

بقول فرشتہ شاہ ایران نے شیبانی خان کو لکھا کہ سرزمین ایران و عراق فتح کرنے کے ارادے سے باز آئے اور یہ شعر لکھا

نہال دوستی بہ نشاں کہ کام دل بیار آرد
درخت دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

جواباً شیبانی خان نے تحریر کیا کہ بادشاہت کا دعویٰ کرنا اور حکمرانوں کے مقابلے پر آکر ان سے خط وکتابت کرنا اس شخص کے لئے مناسب ہے جس کے آباء واجداد حکمراں رہے ہوں۔ آق قونیلو ترکمانوں سے قرابت حاصل کر کے سلطنت کا داعی ہونا نہایت لغو حرکت ہے۔ ساتھ ہی شاہ اسمٰعیل کو ایک عصائے فقیری اور کاسہ گدائی بھیجا۔ تمہارا آبائی ورثہ یہی ہے۔ تم بھی گدائی کا پیشہ اختیار کرلو۔

شاہ اسمٰعیل صفوی نے جواب میں لکھا کہ اے بیوقوف اگر سلطنت کسی کی میراث ہوتی تو پیش دادیوں سے کیانیوں تک اور کیانیوں سے گھر گھر پھرتی چنگیز کے ہاتھ تک نہ پہنچتی اور خود تجھ کو یہ شرف حاصل نہ ہوتا۔ ٹھہر جا بے۔ اب میں تیرا سر قلم کرنے کے لئے پہنچتا ہوں۔ ساتھ میں چرخہ اور سوت ارسال ہے کہ تیرے باپ دادا کا پیشہ تھا۔ اسے اختیار کر۔

شاہ اسمٰعیل مع فوج خراسان آیا اور ازبکوں کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ شیبانی خان مارا گیا۔ کس قدر قہرناک رہا ہوگا۔ کہ بابر اور اسمٰعیل صفوی جیسے سورما اس سے لرزتے تھے۔ بابر نے اس مہم میں اسمٰعیل کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ جب اس کے بیٹے ہمایوں کو شیر خاں افغان نے ہندوستان سے بے دخل کیا وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل کے بیٹے طہماسپ کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے پہنچا۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ طہماسپ کو اس کے بھائیوں نے بھڑکایا کہ ہمایوں کو مدد نہ دے اور یاد دلایا کہ بابر شاہ اسمٰعیل سے قزلباش کمک لے کر گیا تھا اور قزلباشوں کو ازبکوں سے قتل کروا کے بھاگ آیا تھا۔ طہماسپ نے ارادہ بدل دیا مگر اس کی بہن سلطانہ بیگم نے ہمایوں کی یہ رباعی شاہ کو سنائی۔

ہستیم زجاں بندہ اولادِ علیؑ
ہستیم ہمیشہ شادباد زیادِ علیؑ
چوں سرِ ولایت زعلیؑ ظاہر شد
کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علیؑ

شاہ طہماسپ خوش ہوگیا۔ دس ہزار فوج قزلباش دے کر رخصت کیا۔

یہ بھی اڑ گئی کہ ہمایوں شیعہ ہوگیا۔ شیخ حمید سنبھلی ایک عالم صاحب تفسیر تھے۔ کابل میں جاکر ملے۔ ہمایوں سے جاکر کہا، "پادشاہم۔ تمام لشکر شمارا فضی دیدم۔ در ہر جا نام لشکریان شما دریں مرتبہ یار علیؑ، مہر علیؑ، کفش علیؑ وحیدر علیؑ یافتم وہیچ کس راندیدم کہ بنام یاران دیگر باشد"۔

غرضیکہ ہزارہا شیعہ اس لشکر کے ساتھ دیار ہند میں داخل ہوا۔ لیکن اصل فرقہ پرستی ہمایوں کی پوت بہو نور جہاں بیگم نے کی۔

ملکہ تو خیر ایرانی شیعہ تھی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہر ملک میں سنی تورانی حکمرانوں نے بھی سادات کی ہمیشہ بے حد قدر کی۔ علمی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان سے کیں۔ افواج کا کمانڈر انہیں بنایا۔ سپاہی دوسری نسل کے ہوتے۔ لشکر سادات کا کہلاتا تھا۔

مگر صد حیف کہ رستم وافراسیاب کا تفرقہ نہ گیا۔ اقلیم ہند میں جب یہ ایرانی تورانی کشمکش زیادہ

بڑھتی شیعہ مہم جو دکھن کا رخ کرتے۔ کیؤں نے وہاں سلطنتیں قائم کرلیں۔ ارے میاں پچھلے زمانوں کی عجب حالت تھی۔ جسے دیکھو سلطنت قائم کرلیتا تھا۔ خیر جی ان دکھنی شیعہ بادشاہوں نے بھی سب سے پہلے سفیر کہاں بھیجے! تبریز و اصفہان! ایران کی رسوم تعزیہ [5] اختیار کیں۔ جو دکھن سے نکلیں تو سارے ہندوستان میں پھیلیں۔

شاہان مغلیہ تورانی تھے پر متعصب نہ تھے۔ کیئوں کی مائیں یا بیگمات شیعہ تھیں۔ نور جہاں بیگم نے راجپوت پارٹی تورانی پارٹی دونوں کا زور کم کیا۔ مگر ہم کہانی سناتے ہیں آپ کو دور شاہجہانی کی۔

لاہور آگرے دلی کی کیا پوچھو ہو کیا شان تھی۔ یہ تو خیر عہد مغلیہ تھا۔ صدیوں قبل سلطان شمس الدین التمش کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے عصامی نے لکھا تھا، "میدان صحیح النسب' کاسبان خراسان زمین اور نقشبندان اقلیم چین اور عالمان بخارا نثراد اس وقت دلی میں جمع ہیں جو اس شہر کو کعبہ ہفت اقلیم بنا چکے ہیں" [6]

سترھویں صدی عیسوی میں ہمارے پرکھوں نے خراسان کو خیرباد کہا۔

دشت لیلیٰ اور سبزہ زار۔ روضۂ امام زادہ ماہ رخ' نخشب' بدخشاں' مسجد کبود' وادی ہری رود۔

سیب کے شگوفے۔ سرو وصنوبر کے جھرمٹ۔ سنائی اور جامی اور عمر خیام کی قبریں۔

شاہ خراسانؑ کے روضے سے بلند ہونے والی قرات کی سریلی لرزہ خیز آوازیں۔ دارالحفاظ میں عباپوش طلبہ کے ہجوم مسجد گوہر شاد کے حوض میں ترکان خطا کے حسین چہروں کے عکس۔ ایک دنیا تھی جو نظروں سے اوجھل ہوئی۔

آگرہ پہنچے۔ ہمارے میاں ظہور حسنین سلمہ' (جواب ماشاء اللہ سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں) کے پردادا میر معصوم علی لکھنوی نے اپنی کتاب "انشائے [7] معصوم" میں لکھا ہے کہ ان نیشاپوری بزرگ کے ایک لڑکے دارالحفاظ مشہد کے سند یافتہ عالم تھے۔ انڈیا کی ایرانی پارٹی کے کسی امیر کے ذریعہ قلعہ تک رسائی ہوئی۔ شہزادہ مراد کے اتالیقوں میں شامل کر لئے گئے۔ ان کا اصل نام "انشائے معصوم" میں درج ہے۔ اردوگاہ شاہجہانی کی زبان میں سید بڑے کہلاویں تھے جو اس زمانے کا عام لقب تھا۔

ایک روز شہزادے کو پڑھا کر اٹھے ہی تھے کہ بارگاہ شہنشاہی میں طلبی ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ کسی تورانی حریف نے شکایت تو نا جڑ دی۔ نادِ علیؑ کا ورد کرتے دیوان خاص میں پہنچے۔ شاہجہاں تخت پر بیٹھا تھا۔ (اور کہاں بیٹھتا زمین پر؟) امیر وزیر حاضر تھے۔ شاید کسی نئی مہم کا منصوبہ بن رہا تھا۔ یا جانے کیا ہو رہا تھا۔ مجالس ملوک سے ہمیشہ خائف اور مشتبہ رہنا چاہیے۔

سید بڑے نے بارگاہ عالی میں پہنچ کر کہا، "السلام علیکم!" واضح ہو کہ علماء بادشاہ کو ہمیشہ اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔ نہ زمیں بوسی نہ کورنش۔ شاہجہاں نے کہا "وعلیکم السلام مولانا۔ مابدولت آپ کو ملک کشمیر بھیجتے ہیں"۔

مولانا کو یقین ہوگیا کہ یہ ناگہانی حکم جلاوطنی ہے۔ دم بخود۔

بادشاہ نے کہا' "مولانا آپ تازہ وارد خراسانی دہقان [8] زادے ہیں۔ شوریدہ سر رعایا کو قابو میں رکھنا خوب آتا ہوگا!"

مولانا نے جواب دیا' "جہاں پناہ۔ میں امام زادہ بھی ہوں۔ آج تک کسی نے میری ایک نہ سنی۔ سب شوریدہ سری کرتے رہے۔"

سنتے ہیں بادشاہ زیر لب مسکرایا۔ بات ٹال گیا۔ ابرو سے حاجب کی طرف اشارہ کیا جس نے فرمان شاہی مولانا کی خدمت میں پیش کیا

قصہ یہ تھا کہ سنبھل کے مغل حاکم نے کٹھیر کے سردار رائے سکھ کو حال میں مطیع کیا تھا۔ رائے سکھ کی کچی گڑھی چوپال کہلاوے تھی۔ رام گنگا کے کنارے تھی۔ عہد اکبری میں چوپال نامی گاؤں اس پرگنہ کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ اسی جگہ پر ۱۶۳۲ء میں رستم خاں نے قلعہ تعمیر کیا جامع مسجد بنوائی اور نئی بستی کا نام رستم نگر رکھا۔ سنا ہے کہ اس کے بعد رستم خاں خوش خوش پایہ تخت آیا اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ ظل سبحانی کی خدمت میں پیش کی۔

شاہجہاں نے غصہ سے پوچھا "میرے حکم سے تجاوز کرکے تم نے چوپال کا نام رستم نگر کیوں رکھا اور مسجد کیوں بنائی"؟

رستم خان کا رنگ فق لیکن فوراً حاضر دماغی سے کام لے کر بادشاہ کو خوش کر دیا۔ بولا "جہاں پناہ غلام نے نئے شہر کا نام تو شہزادے کے نام پر مراد آباد رکھا ہے۔"

شاہان دہلی کا شروع سے دستور رہا تھا کہ مفتوح علاقوں پر سادات کو آباد کرکے مختلف کام ان کے سپرد کر دیئے تھے۔ القصہ سید بڑے فرمان شاہی ہاتھ میں لئے شاداں و فرحاں گھر لوٹے۔ خانم سے کہا' اضلاع میں کوئی جگہ لانکڑی ہے۔ ہم وہاں کے دہقان بنا دیئے گئے۔

بعد کچھ عرصے کے سید بڑے مع اہل و عیال و لشکر چوپال عرف رستم نگر عرف مراد آباد کی سرزمین پر آن اترے۔ سنبھل کی جگہ اب مراد آباد ضلع کا صدر مقام بن چکا تھا۔ نئی بستی میں مغل سپاہیوں کے کیمپ مغل پورے کہلا رہے تھے۔

لانکڑی پہنچ کر سب سے پہلے مسجد اور ماتم سرائے تعمیر کروائی۔ جس رات محرم کا چاند آم کے درختوں پر طلوع ہوا خراسانی خانموں نے بال بکھرائے' شمع کی روشنی میں کچے فرش پر بیٹھیں اور بلک بلک کر رونا شروع کیا۔

وامحمدا۔ کشتہ شد حسین۔

رام گنگا کے کنارے وہ سارا علاقہ جہاں آج مراد آباد کا چوک' ریلوے اسٹیشن اور گورنمنٹ ہائی اسکول ہے لانکڑی کی جاگیر میں شامل تھا۔ سید بڑے نے شہر آباد کرنے کی خاطر لوگوں کو یہ زمینیں مفت بانٹ دیں کہ وہ ان پر مکان بنا کر رہیں۔ باقی زمینیں سید بڑے کی اولاد نے دور انحطاط میں ایک کوڑی فی گز کے حساب سے بیچ کھائیں۔ محلہ سادات لانکڑی میں ان کے مکانات اور شہر سے باہر علاقہ لانکڑی باقی رہ گیا جو

"نسلاً بعد نسلاً" خاندان میں تقسیم ہوتا گیا۔

سید بڑے کے بیٹے ضدی اور تند مزاج مشہور تھے۔ اردو گاہ شاہجہانی کی زبان میں سید اڑے کہلاتے تھے۔

۴—گومتی

ایک خراسانی امیر نے کہ نام ان کا میر محمد امین کاظمی نیشاپوری [9] تھا' ماں ان کی شاہ عباس ثانی کے وزیر رضا قلی بیگ قزلباش کی بیٹی تھی' بی بی سے خانہ دامادی کا طعنہ سن کر ایران چھوڑا۔ شاہجہاں آباد پہنچے۔ فرخ سیر سے نواب سعادت خاں خطاب پایا۔ بعد قتل فرخ سیر (۱۷۱۹ء) بہ عہد محمد شاہ بادشاہ سلطنت میں فتنہ و شورش بڑھی۔ سرکشی شیوخ لکھنؤ اور بد انتظامی زمینداران اودھ میں اضافہ ہوا۔ تورانی پارٹی نے جو نواب سعادت خاں سے مخالفت مذہب اور ان کی ترقی جاہ سے حسد و رشک رکھتی تھی' بادشاہ کو پٹی پڑھائی کہ نواب کو بغرض بندوبست اودھ بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے خلعت صوبہ داری و خطاب برہان الملک عطا کر کے حکم دیا کہ لکھنؤ جائیں۔

مگر سرکاری فوج ہمراہ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ نواب والا شان منافقین کی اسکیم سمجھے۔ نظر بخدا کمر ہمت باندھی۔ پایہ تخت کے ایرانی شیعوں کو جمع کیا جو ہزاروں بیکار یا بازار میں مشغول ہر کسب تھے۔ سب نے یہ خوش خبری سن کر ہجوم کیا۔ نواب نے کہا۔ سنو میرے بھائیو۔ اگر اس وقت کے سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کرو گے خدا نے چاہا ایک روز پلاؤ بھی کھاؤ گے۔ کہتے ہیں کہ نواب کے ان سوکھے ٹکڑوں پر ہزارہا مغل (ایرانی) مفلس پریشان حال جمع ہو گیا' لمبی کالی ٹوپیاں سر پر رکھ' ولایتی تلوار کمر سے باندھ کر آغا صاحب بن گئے۔ نواب جب اپنی قوم کی بھرتی سے فارغ ہوئے' اپنے توپ خانے سے کچھ توپیں چنیں۔ گھر کے زیور بیچ کر بیل توپوں کے لئے خریدے۔ باجمعیت کثیر لکھنؤ پہنچے۔ بعد استیصال شیوخ قلعہ مچھی بھون میں داخل ہوئے۔ ایک شاندار سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سادات لانکڑی مراد آباد کے سید اڑے کے ایک پوتے میر رمضان علی کی شادی سادات بارہہ جان سٹھ میں ہوئی تھی۔ وہ بارہ بستی میں سکونت پذیر تھے جب غل ہوا کہ نواب برہان الملک شاہجہاں آباد سے نکل کر بفرمان محمد شاہی ملک اودھ پر چڑھائی کے لئے جاتا ہے۔ میر رمضان علی کہ ایک باہمت اور صاحب فراست نوجوان تھے فوراً ڈھال تلوار لگا گھوڑے پر سوار ہوئے اور منزلیں مارتے کہاں پہنچے۔ فرخ آباد جہاں نواب برہان الملک' بنگش پٹھان نواب کا مہمان تھا اور فوج کے لئے گھوڑے' اور ٹٹو خریدنے میں مشغول تھا۔

میر رمضان علی بھی پھٹے حال مغلوں کے لشکر میں شامل ہو لکھنؤ روانہ ہوئے۔۔

بعد فتح لکھنؤ میر رمضان علی نے دربار نواب سعادت خاں تک رسائی حاصل کی۔ لشکر سے نکل کر ۱۷۲۴ء کے لگ بھگ اعمال سرکار میں داخل ہوئے۔ ان کے بیٹے کا نام میر شیر علی تھا۔ ان کے بیٹے میر ببر علی

درباری و مجرئی ہوئے۔ ایک علاقہ امانی حاصل کیا۔

اصلیت اس کی یہ تھی کہ اکثر علاقہ جات سرکار سے اعمال کو امانی دیئے جاتے تھے۔ لیکن کسی کا علاقہ زیادہ کا نہ ہوتا تھا کہ صاحب قوت نہ ہو جائیں۔ بہت شرط مشروط پر علاقہ کا اجارہ دیا جاتا تھا کہ روپیہ سرکار کا علاقے میں نہ رہ جائے۔ اگر مستاجر پورا روپیہ ادا نہ کرتا قید کرلیا جاتا تھا اور بہت کچھ درگت اس کی بنتی تھی۔ مستاجران کا منصب موروثی نہ تھا۔ جاننا چاہیے کہ علامہ سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں نے پرگنوں کو چکلوں میں تقسیم کیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں "سرکار" کی جگہ چکلے نے لے لی۔ ۱۷۷۲ء میں بنگال سترہ اور اودھ سولہ چکلوں میں منقسم تھا۔ چکلے کا حاکم 'ناظم' 'عامل' چکلہ دار یا مستاجر کہلاتا تھا۔

۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ بہادر مسند نشین وزارت ہند ہوئے۔ انتظام صوبہ جات دور آصفی میں بہترین تھا۔ ناظم یا صوبہ دار ہر سال اپنا لشکر لے کر پہنچتا اور کسانوں سے مال گزاری وصول کرکے نصف خود رکھتا نصف خزانہ شاہی میں داخل کرتا۔ صوبے کا انتظام اس کے ذمے تھا۔ مفتی اثنا عشری اور دیگر عمال اس کے ماتحت تھے۔ چکلے دار کو حکومت سے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس کی فوج علاقے میں پولیس کا کام کرتی تھی۔ دیوانی و فوجداری کے مقدمے وہی فیصل کرتا تھا۔ ایک چکلہ دار کے ماتحت کئی اضلاع ہوتے تھے۔ بعد میں اس انتظام میں بہت ابتری پیدا ہوئی۔ اضلاع کی زرخیزی یا سیاسی اہمیت کی وجہ سے یہ عہدہ بعض اوقات کئی لاکھ روپے میں بادشاہ اودھ سے خریدا جاتا تھا۔ اس کے بعد چکلے دار اس علاقے کا خود مختار مالک بن جاتا تھا۔ (عہد نصیرالدین حیدر میں حکیم مہدی منتظم الدولہ نے اودھ کے اس ناقص انتظام میں اصلاحات کیں۔ مگر اس وجہ سے بادشاہ نے ان کو برطرف کردیا۔)

میر ببر علی ابن میر شیر علی (ابن میر رمضان علی) دور آصفی میں چکلہ دار تھے۔

۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خاں کی شکست و شہادت کے بعد انگریز کے قدم باضابطہ ہندوستان میں جمے۔ حافظ کا ملک روہیلکھنڈ[10] مع مراد آباد مملکت اودھ میں شامل کرلیا گیا۔

روہیلکھنڈ کے اودھ سے الحاق کے بعد میر ببر علی اپنے دادا میر رمضان علی کے بھولے بسرے رشتے داروں سے ملنے مراد آباد محلّہ لانگڑی والاں آئے۔ معلوم ہوا کہ لانگڑی (معافی) میں ہنوز پانچویں حصے کے حقدار ہیں۔

جب میر معصوم علی ابن میر ببر علی کی بیٹی منجھو بیگم سادات لانگڑی کے میر الف علی سے بیاہ کر مراد آباد آئیں اس وقت یہ شہر جان کمپنی کی عملداری میں شامل ہو چکا تھا۔

لکھنؤ میں میر ببر علی کی وفات کے بعد میر معصوم علی نے ایک عمدہ چکلہ داری و نظامت خریدا اور طریق معقول و سلامت روی سے بندوبست علاقہ جات میں مصروف ہوئے۔ میر معصوم علی کے فرزند اکبر میر قائم علی کا بیاہ بھی لانگڑی والوں میں میر یعقوب علی نقوی کی بیٹی امراؤ بیگم سے رچایا گیا۔

۱۸۳۸ء میں بعد محمد علی شاہ بادشاہ اودھ بمقام لکھنؤ میر قائم علی اور امراؤ بیگم کے ہاں میر مظہر علی رضوی پیدا ہوئے۔

یہاں کا تو قصہ یہ چھوڑا یہاں
سناتے ہیں اب ایک نئی داستاں

جب شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلی بار فوج انگریزی کی قواعد پریڈ کا مشاہدہ فرمایا سوچے اپنی جمعیت کے لشکر کو بھی اسی خوبی سے آراستہ کیا چاہیے۔ بعد ازاں اس عاقل و دانا حکمراں نے کمپنی بہادر کی بٹالین کے تربیت یافتہ متعدد افسران و سپاہ کو لاہور مدعو کیا۔ یہ سورما زیادہ تر پورب کے باشندے تھے۔ ان میں میر معصوم علی لکھنوی کے ایک اولوالعزم جانفشاں و جری بھتیجے میر نور الدین بھی شامل تھے۔ جو عساکر خالصہ میں داخل ہو کر عہدہ جلیلہ کرنیلی تک پہنچے۔ مہاراجہ نے توپ خانہ تمام تر مسلمان افسروں کے سپرد کیا۔ جنرل الٰہی بخش[11] خالصہ آرٹلری کے نامور سپہ سالار گزرے۔

"کیٹیلاگ ریکارڈز آف خالصہ دربار" فارسی سے ترجمہ از سیتارام کوہلی (پنجاب گورنمنٹ پریس۔ لاہور ۱۹۱۹ء) میں مختلف "کمپنی ہا" اور سکھ رجمنٹوں کے Pay Rolls کی فہرست کے ساتھ زمرہ "حاضران" کے اندر دو جگہ "ڈیرہ نورالدین" کا نام ملتا ہے۔ جب مختلف بٹالین پشاور اور دوسری چھاؤنیوں کو روانہ کی جاتیں اس وقت جو افسران ہیڈ کوارٹرز میں موجود رہتے "حاضران" کہلاتے تھے۔ "ڈیرہ" یا کیمپ مع اپنے نشانچی' دھونسانواز' وکیل' منشی اور سکھ گرنتھی کے افسر اعلیٰ کے تحت ہوتا تھا۔

اینگلو سکھ جنگ ۱۸۴۵-۴۶ء اور لاہور پر برطانوی قبضے کے بعد معاہدے کی رو سے رنجیت سنگھ کے نابالغ لڑکے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اپنے عساکر اور توپ خانے میں تخفیف کرنی پڑی۔ وہ توپیں جن کے ذریعے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا گیا تھا انگریز کمانڈر انچیف کے حوالے کردی گئیں۔

لاہور ۲۰ فروری ۱۸۴۹ء کو فتح ہوا۔ عین عشرہ محرم کے روز یہ اطلاع لکھنؤ پہنچی۔ ڈیوڈسن صاحب بہادر ریذیڈنٹ اودھ ایک بد دماغ اور تنک چڑھا انگریز تھا۔ اس نے میر حسن علی سفیر کو حکم دیا کہ توپ کی سلامی دی جائے میر صاحب نے عذر غم حسین کا کیا صاحب نے برہم ہو کر ان کو عہدہ سفارت سے فی الفور برطرف کیا۔

اللہ اللہ۔ ابو الفتح معین الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زمانہ محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی لاچاری اور بے بسی کا کیا عالم تھا کہ دسویں محرم کی رات فتح برطانیہ کی خوشی منانے کے واسطے خاص شہر لکھنؤ میں شلک سلامی چلی۔

وہ کئی سو ضرب توپ جو انگریزوں نے سکھوں سے چھینی تھیں لاہور سے کلکتہ روانہ کی گئیں تاکہ وہاں پر ہندوستانی رعایا کے سامنے ان کی نمائش کی جاوے۔ جس روز یہ اتواپ کانپور پہنچیں ظل سبحانی شاہ جمجاہ نے نواب امین الدولہ بہادر وزیر اعظم اور مشیر الدولہ مہاراجہ بال کرشن بہادر جسارت جنگ کو بخاطر ریذیڈنٹ بہادر کانپور روانہ فرمایا۔ جہاں کنپ پریڈ آراستہ ہوئی۔ کپتان فریزر نے ان اتواپ کا معائنہ کیا اور سلامی لی۔

"ریکارڈز آف خالصہ دربار" بعد مفتوح مہاراجہ دلیپ سنگھ ۱۸۴۸ء' فروری ۱۸۴۹ء فہرست

حاضران[12] میں ہماری ملاقات دوبارہ نورالدین صاحب سے ہوتی ہے۔

۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کے روز لارڈ ڈلہوزی نے سارے پنجاب پر اختیار کلی حاصل کیا۔ اس کے بعد خالصہ فوج کے بیشتر افراد کی طرح کرنل نورالدین شاہ بھی انگریز سرکار کے وفادار بنے اور مختلف معرکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن اس کے بعد کرنل نورالدین شاہ یا ان کی آل اولاد کا کچھ اتہ پتہ نہیں ملتا۔ جانے کہاں گئے۔ ان کے چچا میر معصوم علی نے اپنے خاندان اور اپنے زمانے کی تاریخ "انشائے معصوم" کے نام سے قلمبند کی تھی۔ شاید اس میں کرنل صاحب کا ذکر کیا ہو۔

میر معصوم علی نے بعہد سلطان عالم واجد علی شاہ لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ ان کی اچانک وفات کے بعد حسب قانون علاقہ نزول سرکار ہوا۔ ان کے بیٹے میر قائم علی کو دربار سے خلعت ماتم پرسی ملی مگر نظامت و چکلہ داری خریدنے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ بزرگوں نے جتنا کمایا اس سے دوگنا لٹایا۔ فضول خرچی گھٹی میں پڑی تھی۔ اجی ہم تو یہ جانتے ہیں جس نے دریائے گومتی کا پانی پیا' بار بہ عیش کوش کا تخت سے پابند ہوا۔

لکھنؤ میں عہد نواب سعادت علی خاں سے انگریزیت کی شدت تھی۔ پہلے کوئی کوٹھی و کوٹک کا نام نہ جانتا تھا۔ اب کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ کلکتہ سے یوروپین فرنیچر منگوایا جاتا تھا۔ شاہ نصیرالدین حیدر شاہان برطانیہ جیسی پوشاک زیب تن کرتے۔ فرانسیسی عورات بیگمات کے فرانسیسی وضع کے بال آراستہ کرتیں۔ چند امراء لندھن ہو آئے تھے۔ فری مسن لاج کھل گیا تھا۔ شاہی تعزیہ لندھن سے بن کر آتا تھا۔ لیکن حصول علوم فرنگ کا شوق کسی کو نہ تھا۔

میر قائم علی بھی انگریزی رنگ میں رنگے' مگر کمال عقل مندی سے۔ انگریزی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کرلی۔

چراغ سلطنت بجھا چاہتا تھا لیکن کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب عیش و عشرت میں غافل۔ ادھر میر معصوم علی کے سپاہیوں نے تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ سارے خاندان اور متوسلین کی ذمہ داری کم سنی میں میر صاحب پر آن پڑی۔

ایک روز ان کی بی بی امراؤ بیگم نے کہا "عہد شجاع الدولہ سے لے کر آج تک وفور عنایات شاہی رہا۔ کسی گھڑی عتاب شاہی بھی نازل ہو سکتا ہے۔ دنیا دام فریب ہے اور دشمن کمین میں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مولا مشکل کشا کا نام لے کر یہاں سے کوچ کیجئے۔ کیا جانئے کس وقت جو کچھ باقی ہے وہ بھی ضبط کرلیا جائے۔"

میر قائم علی نے بی بی کا مشورہ قبول کرنے میں تامل کیا مگر سپاہیوں کے مطالبے میں زیادتی ہوئی۔ اسلحہ جات' اسپ ولایتی' بنگلہ' خس خانہ' حویلی اونے پونے بیچ' سپاہ و ملازمین کی تنخواہیں اور قرضے ادا کئے۔[12] ماں بہنوں اور بچوں کو بہلی میں سوار کیا۔ تلوار اور طپنچہ سنبھال گھوڑے پر سوار ہوئے۔ لکھنؤ کو خیر باد کہا۔ مستورات زار و قطار روتی تھیں۔ سوا امراؤ بیگم کے' جو دل میں خوش تھیں کہ میکے واپس جاتی ہیں۔

قافلہ روہیلکھنڈ روانہ ہوا۔ اودھ سے نکلے۔ برطانوی عملداری میں داخل ہوئے۔ مراد آباد کے

قریب پہنچے۔ دور سے رام گنگا کا گھاٹ اور قلعے کی مسجد نظر آئی۔ ہم پہ ہے ختم شام غریبان لکھنؤ۔
یا حیدر کرار وقت مدد است۔

۵— رام گنگا

دوستو۔ زمانے کی سیر کر چکے۔ مراد آباد لانکڑی والاں واپس پہنچیے تو معلوم ہوگا کہ اہل محلہ ہنوز رستم خاں اور سید بڑے کے دور میں زندہ ہیں۔ قدامت پرستی ان حضرات پر ختم ہے۔ مکانات جو بزرگوں نے سترھویں صدی میں بنائے تھے انہی میں آج تک موجود ہیں۔ جو مکان ڈھے گئے ان کی جگہ نئے تعمیر کر لئے گئے یا اگر اتنا مقدور نہ ہوا تو انہی کی تھوڑی بہت مرمت کرلی گئی۔ مگر مجال ہے جو کسی نے اس محلے سے باہر قدم نکالا ہو۔ جیسا کہ پچھلے کسی باب میں عرض کیا گیا جاگیر لانکڑی میں وہ سارا علاقہ شامل تھا جہاں آج شہر کا ریلوے اسٹیشن' چوک اور گورنمنٹ کالج ہے۔ یہ ساری زمینیں دور تنزل میں لانکڑی والے ایک کوڑی فی گز کے حساب بیچ کھاپی کے برابر کر چکے۔ اب اسی اطمینان سے اپنی بیٹھکوں میں رونق افروز' سیاہ مخملیں ٹوپیاں اور بوٹے دار جامے یا نیم آستین پہنے حقے گڑگڑا رہے ہیں۔

محلے کا چوک مرکز کائنات ہے۔ اس کے بڑے پھاٹک کے اندر تین طرف امراؤ بیگم کے والد میر یعقوب علی' منجھو بیگم بنت میر معصوم علی لکھنوی کے شوہر میر الف علی اور دیگر عزیزوں کے مکانات ہیں۔

سامنے حکیم سید راحم علی کا گھر ہے۔ ان کے بیٹے حکیم اولاد علی اور مہدی علی ہیں اور ایک بیٹی اولیاء بیگم۔ اولاد علی ایک فرنگن بھی کہیں سے اڑا لائے تھے۔ کچھ عرصے زنانخانے میں پردہ نشین رہی۔ لاولد تھی۔ ایام غدر میں فرار ہوئی۔

سید اولاد علی کے دو بیٹے ہیں۔ فرزند علی اور ڈپٹی آل نبی۔ فرزند علی نے آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا۔ ان کی شادی امیر بیگم بنت نواب سید داؤد علی خاں دوئم والئی سری محمود پور سے ہوئی۔

اجی محمود پور والوں کا قصہ کہاں سے شروع کروں۔ پوری الف لیلیٰ ہے۔ آج برٹش راج میں بھی اگر قلعہ محمود پور کے اندر داخل ہو' لگتا ہے عہد مغلیہ میں پہنچ گئے۔ سچ ہے ہاتھی لٹ جائے تب بھی سوا لاکھ کا۔

ضلع مراد آباد میں یہ دو بڑی ریاستیں تھیں۔ ایک محمود پور۔ دوسری سہس پور بلاری۔ موخرالذکر بیشتر مسلم ریاستوں کی مانند مقروض تھی۔ اس کی آخری مالک ایک بھولی بھالی بیگم صاحبہ تھیں۔ وہ توج کو گئیں۔ پیچھے قرض خواہ مہاجن نے ڈگری کروالی۔ اس مہاجن کا بیٹا سہس پور بلاری کا راجہ بنا۔

ایک نیشاپوری فوجی مہم جو سید محمود نے سترھویں صدی میں مراد آباد سے پندرہ میل کے فاصلے پر محمود پور کی ریاست قائم کی تھی۔ سید محمود کے متعلق ایک قدیم تذکرے میں مرقوم ہے۔

"در ملک بنگالہ مراتب یافت و بطون رسیدہ و بوبکی و جٹ پورہ وغیرہ نہج موضع را مخلوط کردہ۔ محمود پور باسم خود کردو پسرش سید داؤد قلعہ و دیگر

عمارات رفیعہ آنجابنا ساخت ہم مصداق آثار پدید است صنادید عجم را"۔

شاہجہاں بادشاہ نے سید داؤد کو نواب اور خان کا موروثی خطاب اور محمود پور معافی کی سند عنایت کی۔

محمود پور کے اصالت محمود خاں اور شاہ علی خاں کی مہروں پر "۱۱۴۰ھ محمد شاہ بادشاہ غازی فدوی سید اصالت محمود خاں" اور "۱۱۸۷ھ شاہ عالم بادشاہ غازی سید شاہ علی خاں کندہ" ہیں۔ اصالت محمود خاں سنبھل کے گورنر بھی رہے۔ محلہ اصالت پورہ ان کے نام پر آباد ہے۔

عہد روہیلہ میں نواب دوندے خاں[13] نے قلعہ محمود پور پر حملہ کیا۔ طرفین سے توپ چلی مگر نواب محمود پور روہیلوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ریاست کا بیشتر حصہ پٹھانوں نے ہتھیا لیا۔ ۱۷۷۴ء میں روہیلہ شکست کے بعد جب روہیلکھنڈ کے حصے بخرے ہوئے نواب محمود پور، نے جان کمپنی کے حضور میں استغاثہ کیا مگر ریاست کا قلیل حصہ ان کو واپس ملا۔ موجودہ ریاست کی آمدنی محض تین لاکھ روپے سالانہ ہے۔

شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے ادوار میں نوابین محمود پور دربار اودھ سے وابستہ رہے۔ پھر روہیلکھنڈ پر سرکار انگریزی کا راج ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں مراد آباد کا ڈسٹرکٹ اور سشن جج مسٹر الکاٹ اودھ کے دور تسلط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نواب وزیر الملک بہادر کی عملداری کے تحت ایک رسالہ مرزا مدار علی بیگ کی کمان میں دیوان خانہ محمود پور میں تعینات تھا۔

شاہ علی خاں اصالت محمود خاں کے بھتیجے تھے۔ شاہ علی خاں لاولد رہے۔ ان کے بھتیجے نواب نجم الدین علی خاں تھے۔ نواب محمد داؤد علی خاں، نجم الدین علی خاں کے بیٹے تھے۔ انہی کی بیٹی امیر بیگم سے ہمارے حکیم سید راحم علی کے بیٹے حکیم فرزند علی کی شادی ہوئی۔

نوابین محمود پور غالباً دور مغلیہ میں یا عروج روہیلہ کے زمانے میں تقیہ میں سنی ہو گئے تھے۔ یا شروع سے سنی تھے۔ دربار اودھ کے تعلق سے شیعہ ہوئے۔ نواب محمد داؤد علی خاں کے بیٹے اور جانشین نواب سید محمد علی خاں کا ایک مقدمہ پریوی کونسل تک چلا۔ اس میں نواب صاحب نے اپنا ترکہ بموجب قانون محمدی شرع امام ابو حنیفہؒ طلب لیا تھا اور خود کو اس فقہ کا پابند بتایا۔

حکیم سید فرزند علی اور امیر بیگم (بنت نواب داؤد علی خاں) کے فرزند اکبر سید اولاد حسین کی شادی لکھنؤ میں ایک وثیقہ دار بیگم سے ہوئی ہے جو سرائے معالی خاں میں امام باڑہ الماس پہ رہتی ہیں۔ منجھلے بیٹے سید عاشق حسین ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ چھوٹے لڑکے سید ابراہیم حسین (پیدائش ۱۸۶۰ء) ہیں۔

نواب داؤد علی خاں کے فرزند اور جانشین نواب محمد علی خاں ہیں۔ مولوی عبد القادر غمگین رام پوری نے اپنے تذکرے میں سرسری ذکر کیا ہے کہ "ایک دن نواب فتح اللہ ولد دوندے خاں کے صاحبزادے سری محمود پور کے رئیس (نواب محمد علی خاں) کو لے کر ڈاکٹر فلاں[14] سے ملاقات کو گئے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے پرانے دشمن نواب دوندے خاں روہیلہ کی اولاد سے نوابین محمود پور کی دوستی ہو چکی تھی۔ کیوں نہ ہو۔ انگریز کے اقبال سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے

ہیں۔

نواب محمد علی خاں اولاد نرینہ نہیں رکھتے۔ دو بیٹیاں ہیں ولایتی بیگم اور حیدری بیگم۔ ان دونوں کی شادیاں اپنے دونوں بھانجوں سید عاشق حسین[15] اور سید ابراہیم حسین سے کیں۔

حکیم فرزند علی کے دوسرے بھائی سید آل نبی محکمہ انہار میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ بڑی وجیہہ اور شاندار شخصیت کے مالک ہیں۔ سچ پوچھو تو عمدہ ڈپٹی کلکٹری ہندی مسلمانوں کو بفضل خدا بہت راس آیا ہے۔

حکیم فرزند علی اور ڈپٹی آل نبی کی بہن اولیاء بیگم سید علی جان رئیس نگینہ سے بیاہیں۔ چو کنویں پر ان کا مکان ہے۔

سید علی جان کی پانچ بے حد خوب صورت بہنیں ہیں۔ نام ان کے لاڈو بیگم، جانی بیگم، عمدہ بیگم، محمدی بیگم اور اشرف جہاں ہیں۔ ایام غدر میں سید علی جان نے بہنوں سے کہا کہ جب گورے یا باغی مکان پر حملہ کریں توے کی سیاہی چہروں پر مل کر آنگن کے کنویں میں کود جائیو۔ دھاوے کی خبر پڑتے ہی یہ بچیاں جگمگاتے چہروں پر کالک تھوپ (کہ دشمن کی نظر پڑے تو وہ چڑیل سمجھ کر ڈر جائے) باؤلی میں کودنے کو تیار ہو گئیں۔

جناب عباس علمدار نے یاوری کی۔ حملہ آور باہر ہی سے لوٹ گئے۔ بہنوں کی جان بچی۔ ان پانچوں کی ایک بہن سید و بھی تھیں کہ ان کی اماں ممتوعہ تھیں۔ باندی گلشن نام تھا۔ زچگی میں مر کے چڑیل ہو گئی تھیں۔ اکثر بھری دوپہر میں صحن کے اندر بڑے کمرے میں کود آتی تھیں۔ کبھی پیپل کی شاخ پر بیٹھی نظر آتی تھیں۔ اب عرصے سے غائب ہیں۔

پانچوں بہنوں میں جانی بیگم کنواری جوان مر گئیں۔ کھانا پکا رہی تھیں، کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ان کے نام کا جوڑا کنبے میں ہر لڑکی کے جہیز سے نکال کر کسی مستحق غریب لڑکی کو دیا جاتا ہے۔

دوسری بہن عمدہ بیگم پر جن کا سایہ ہو گیا۔ بیاہ کے روز جب ان کو مایوں کی کوٹھری سے باہر لایا جا رہا تھا عین اس وقت وہ معقول جن ایک سانپ کی صورت میں نمودار ہوا اور کوٹھری کی دہلیز پر کنڈلی مار کے بیٹھ گیا۔ بارات واپس گئی۔ عمدہ بیگم اس کوٹھری سے نہ نکل پائیں۔ ساری عمر روزہ نماز میں گزار دی۔ آج تک وہ جن آس پاس موجود رہتا ہے۔

عمدہ بیگم کی چھوٹی بہن اشرف جہاں کی شادی سید اولاد علی کے بھائی سید مہدی علی سے ہوئی۔ میر فضل علی، تفضل علی، مصطفائی بیگم اور مرتضائی بیگم پیدا ہوئیں۔ ان سب سے آئندہ ملاقات ہو گی۔ (میر مہدی علی کے ایک جن سے نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ مراد آباد میں قلعے کی مسجد جنات کا خاص مسکن ہے۔ روز رات کو وہاں تہجد پڑھتے ہیں۔ نہایت شستہ اردو بولتے ہیں اور قیاس ہے کہ شیعہ ہیں۔)

اشرف جہاں سے چھوٹی محمدی بیگم کا بیاہ میر قائم علی کے بیٹے میر مظہر علی سے ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

ناظرین آپ کو یاد ہو گا کہ میر قائم علی ابن میر معصوم علی مع اہل و عیال انتزاع سلطنت سے کچھ ہی قبل لکھنؤ سے ہجرت کر کے مراد آباد آ گئے تھے۔ اگر یاد نہ ہو تو وہ باب پھر پڑھ لیجئے کہ غریب ہے۔ یہ بھی

یاد کیجئے کہ میر قائم علی انگریزی فیشن کے شائق تھے۔ لانگڑی والوں کی دقیانوسی ماحول میں دم گھبرایا۔ صندوقچہ جواہرات جو امراؤ بیگم لکھنؤ سے ساتھ لائی تھیں اس میں سے چند سکہ زرو جواہر نکال کر مہاجن کے ماتھ پر رکھے اور سکہ سفید ملکہ ٹوریہ کا اس سے لے لیا۔ انجینئر بلوایا۔ لانگڑی محلے کے نزدیک قلعہ کی مسجد سے چند قدم پر کوٹھی ڈاٹ کی اونچی چھتوں اور اونچی کرسی کی بنوانی شروع کی۔

انگریزی علاقے میں بڑے ڈاک خانے سے میل لگایا جاتا تھا۔ میر قائم علی کی کوٹھی بڑے ڈاکخانے سے ڈیڑھ میل دور تھی اور وہاں سے پانچ میل دور رام گنگا کے اس پار میر قائم علی نے دو گاؤں ہمیر پور اور جیت پور خریدے۔

کلکٹر ضلع کو میر قائم علی کی لکھنؤ سے آمد کی اطلاع ہو چکی تھی۔ اس نے تحصیلداری کا عہدہ پیش کیا۔ ایک روز کلکٹر کی چوکڑی کوٹھی کے سامنے آکر رکی۔ میر صاحب خلعت اور قلمدان سنبھالے اترے۔ امراؤ بیگم سے کہا ''ہم متصدی ہو گئے۔''

تو کیا وجہ کہ انگریزوں نے خلعت اور قلمدان کی رسم مغلیہ قائم رکھی تھی اور تحصیلدار کو اس وقت متصدی کہیں تھے۔

امراؤ بیگم کے دو سگے بھائی تھے۔ میر منور علی نقوی اور میر محبوب علی۔ منور علی کی ایک لڑکی کی شادی اورنگ زیب عالمگیر کے نامور وزیر نعمت خاں عالی کے حقیقی پڑپوتے معشوق علی [16] سے ہوئی تھی۔ باقی لڑکیوں کی شادیاں سینتوں میں ہوئیں۔

لاکھوی (معافی) میں میر منور علی اور محبوب علی کے علاوہ میر قائم علی کا بھی پانچواں حصہ تھا۔ لکھنؤ سے مراد آباد آجانے کے بعد سے وہ بھی جاگیر کی آمدنی کے حصے دار تھے۔ ان کے سگے سالے میر محبوب علی کو یہ شرکت ناگوار گذری۔ ایک روز اچانک تلوار سونت کر اپنی ڈیوڑھی سے نکلے اور للکار کر کہا ''قائم علی میں تمہارے بیٹے مظہر علی کو ابھی قتل کرتا ہوں ورنہ لانگڑی سے لادعوے لکھو۔''

بہن بہنوئی دونوں نے دہشت زدہ ہو کر فوراً لادعوے لکھ دیا۔ مگر دستاویز مرتب ہونے کے بعد میر قائم علی نے کہا ''لکھنو کے بعد مراد آباد بھی چھوٹا ہم سے۔''

میر قائم علی کی زبان سے جو لفظ نکلا ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے پورا کیا۔ چند روز بعد بحیثیت تحصیلدار کانپور تبادلہ ہو گیا۔ انگریزی دان تھے اور فیصلے انگریزی میں لکھتے تھے۔

کانپور میں تحصیل کا مکان جس میں مع امراؤ بیگم اور بچوں کے ٹکے تھے' بہت بوسیدہ تھا۔ برسات کا زمانہ تھا خود عدالت میں مقدمہ کر رہے تھے۔ اطلاع ملی کہ بیوی بچے سب مکان کے ایک کمرے میں جمع تھے۔ اس کی چھت گر پڑی۔ سب مرگئے۔ صرف مظہر علی ملبے میں سے زندہ نکلے۔

میر قائم علی کبھی مراد آباد واپس نہ آئے۔ ۱۸۵۶ء میں تسخیر پنجاب کے بعد حکومت نے دوآبہ کے برطانوی علاقے سے جن نیٹو افسروں کو منتخب کر کے پنجاب کے بندوبست کے لئے بھیجا ان میں میر قائم علی بھی شامل تھے۔

۶— راوی

۱۸۴۹ء میں تسخیر پنجاب کے بعد گورنمنٹ نے اس صوبے میں نہریں نکالنا شروع کیں۔ ۱۸۵۱ء سے بڑی دوآب یا ستلج راوی کنال کی کھدائی کا آغاز ہوا۔ یہ کام ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ ۱۸۵۹ء میں ملتان سے امرتسر تک ریل چلنے لگی۔

صوبے کے بندوبست کے لئے سرکار نے جو متعدد ہوشیار اور مستعد ''ہندوستانی'' افسر پنجاب بھیجے' ان میں میر قائم علی بھی تھے۔ ستلج راوی کنال کا مستقر گورداسپور تھا۔ ڈپٹی قائم علی وہیں تعینات کئے گئے۔

ہمارا ایک خاندانی قصاب تھا۔ لانگڑی والوں کے یہاں گوشت لاتا تھا۔ فصل پر اس کا حساب کیا جاتا تھا۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں سرکاری گواہ بنا کر اسے مراد آباد سے کہاں بھیجا گیا گورداسپور۔ وہاں ڈپٹی قائم علی کی عدالت میں پیش ہوا۔

(ڈپٹی کلکٹر کو پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کہتے ہیں) قصاب نے گواہی دی۔ لب و لہجہ سے فوراً پہچان گئے۔ پوچھا ''کہاں کے ہو؟''

بولا' ۔''میاں وہیں کا ہوں۔ مراد آباد کا۔''

پوچھا ''فلاں فلاں گھروں میں گوشت لاتے تھے۔''

بولا' ۔''جی ہاں۔ میاں اب بھی لاؤں ہوں۔''

ڈپٹی صاحب نے عدالت برخواست کی۔ قصاب کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ گلے لگایا خاطر تواضع کی۔ گھر لے جا کر کئی دن مہمان رکھا۔

قصاب بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائیں۔ ایک روز شام کو ڈپٹی صاحب کوٹھی کے باہر لان کے گول چبوترے پر مونڈھا بچھائے حسب معمول پیچوان کے کش لگا رہے تھے۔ قصاب آکر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

ڈپٹی صاحب اس سے مراد آباد کے حالات دریافت کرتے رہے۔

''اجی میاں کیا پوچھو ہو۔ غدر کے بعد واں کا تو نقشہ ہی پلٹ گیا۔ لوگ باگ بڑی بڑی جاگیریں لے کے بیٹھ گئے۔ ہم سے واں جیسے بدحال پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔''

''ہوں' ٹھیک کہتے ہو۔''

قصاب اب مطلب کی بات پر آنا چاہتا تھا کہ ڈپٹی صاحب نے پوچھا'

''کس کس کو جاگیریں مل گئیں بھئی؟''

''اجی میاں وہ آپ کے پڑوس میں بھینیا والے نا ہیں وہی بھینیا گاؤں جو آگرے والے خان بہادر تراب علی کی ملکیت ہے۔ (واضح ہو کہ سارے صوبہ میں مراد آباد اور بجنور ایسے اضلاع ہیں جن کے

نوے فیصد عوام اردو بولتے ہیں۔ اور خاص مفرس اردو بولتے ہیں۔)

"ہاں۔ ہاں وہی ڈپٹی تراب علی۔ جانتا ہوں۔ کیا ہوا ان کو؟" ڈپٹی قائم علی نے پوچھا۔

"اجی ہونا ہوانا کیا تھا۔ غدر کے دنوں میں یہ ڈپٹی تراب علی مرزا عابد علی اور سید احمد دہلوی تین پکے دوست تھے۔ سید احمد بجنور میں تھے۔ تینوں نے سرکار کی بڑی خدمت کی۔ تراب علی صاحب کو موضع بچھڑاؤں ملا اور مرزا عابد علی کو موضع نواڑی۔ اجی میاں" قصاب نے بات کا رخ پلٹا۔ "آپ گھر چل کر وہاں کا نیا نقشہ دیکھ لیجئے تا دنیا بھرے میں آپ کو تلاش کر لیا۔ اب غصہ تھوکئے۔ چلے چلئے۔ اب تو ریل گاڑیاں بھی چلنے لگی ہیں جگہ جگہ۔"

ڈپٹی صاحب چپ۔

قصاب نے ہمت کر کے پوچھا'

"میاں یہاں کسی پنجابن سے تو نکاح نا کر لیا آپ نے؟"

ڈپٹی صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

لیکن مراد آباد نہ گئے بلکہ میر مہدی علی کو بھی پنجاب بلوا کر تھانیدار لگوا دیا۔

خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای اڈیشنل کمشنر صوبہ پنجاب کی ایک نامور ہستی بنے۔ دنیا جانتی ہے پنجاب کے قوانین اراضی یعنی Revenue Laws کی تشکیل میں ان کا حصہ' ان کا سب سے مشہور کارنامہ ہے۔

ایک بار ان کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک کسان نے ایک مہاجن سے دو سو (۲۰۰) روپے قرض لئے تھے۔ مہاجن بارہ سو روپے سود مانگتا تھا۔ میر قائم علی نے اس معاملے کی اطلاع لفٹینٹ گورنر کو بھجوائی اور اراضی و مال کے قوانین مرتب کئے۔ ان کی ایک اہم شق یہ تھی کہ زمیندار کی جائداد غیر زمیندار (پنجاب میں زمیندار کسان کو کہتے ہیں) نہیں خرید سکتا۔ مہاجنوں کے پاس زمیندارا بہت کم تھا۔ اس وجہ سے اب وہ اس نئے قانون کے تحت مقروض کسانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل نہیں کر سکتے۔

امپریل گزیٹیر برائے ۱۸۹۱ء میں تفصیل درج ہے کس طرح قائم علی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گورداسپور نے ۱۸۷۰ء میں نیا قاعدہ مرتب کیا اور مسٹر پرنسپ کے بنائے ہوئے قوانین میں ترمیم کی۔ ایک نواب صاحب جنہوں نے اینگلو افغان جنگ کے بعد امیر یعقوب خاں والی کابل کو گرفتار کرنے میں انگریز کی مدد کی تھی جس کے صلے میں انہیں بہرائچ میں زمین دی گئی سو مربع یعنی ڈھائی ہزار ایکڑ زمین جو لفٹینٹ گورنر ان کو دے رہا تھا انہوں نے ان صاحب کو دلوا دی۔ ہم اگر ان کی جگہ ہوتے ایسا ہرگز نہ کرتے بلکہ کمال عقلمندی سے وہ سو مربعے خود قبول کر لیتے۔

امراؤ بیگم جو صندوقچہ جواہرات لکھنؤ سے لے کر چلی تھیں بہت چلا۔ میر قائم علی نے گورداسپور میں دریا کے کنارے کوٹھی اور دوکانیں بنوائیں۔ مارچ ۱۸۷۳ء میں بمقام گورداسپور وفات پائی۔

میر قائم علی کی ہردلعزیزی کی سب سے بڑی وجہ ان کے قوانین اراضی تھے۔ دوسرے یہ کہ نجیب الطرفین سید تھے اور پیر پرستی پنجابی عوام کی سرشت میں داخل ہے۔

چنانچہ میر قائم علی کا مزار ان کی کوٹھی کے احاطے میں بنایا گیا۔ سبز جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ عرس شروع ہو گیا۔ ہندو' مسلمان' سکھ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ان کے فیوض و برکات میں سے ایک یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ مزار کی خاک تھوڑی سی چاٹ لو چوتھی کی باری یعنی چوتھیا جاڑا جاتا رہتا اور بچھو کے ڈنک کا اثر بھی چلا جاتا۔

ناظرین! عربستان میں آل حسن و حسین شریف کہلاتی تھی۔ ایران میں امام زادے اور توران میں خواجہ اور خوجہ کہلائے' ہند میں آکر میراں اور میر ہوئے۔ سندھ اور پنجاب میں شاہ صاحب۔ اب انگریزی دور میں "ایس" اپنے نام سے پہلے لکھ کر خوش ہوتے ہیں

یہ زمانہ ڈپٹی قائم علی کے پوتے ایس ظہور حسنین کا ہے جو اس وقت مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے میدان میں فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ مجھ آغا کربلائی کی طویل داستان ختم ہوئی۔ اب ایس ظہور حسنین (مشہدی مراد آبادی) اور ایس سجاد حیدر (ترمذی نہٹوری) کے ساتھیوں سے علی گڑھ کا افسانہ سنیے گا۔ والسلام۔

حوالہ جات

1- مولینا عبدالرحمن جامی کی منقبت   شہ کاخ عرفاں' گل باغ احساں   دردرج امکاں' مہ برج تمکیں

2- ۱۸۸۴ء میں خوانین مرو کو مجبوراً زار روس کی اطاعت کرنی پڑی۔ ترکمان شکست کے بعد حکومت روس نے ایک داغستانی مسلمان افسر کرنل علی خانوف کو مرو کا گورنر مقرر کیا۔ آج یہ شہر بالکل ویران اور غیر آباد ہے۔

3- روایت یہ ہے کہ قدیم عجمی داستانیں نوشیرواں عادل نے اپنے کتب خانے میں محفوظ کروالی تھیں۔ یزدگرد سوئم نے دہقان دانشور (مہابھارت کے ویاس کی مانند یہ ایک علامتی نام معلوم ہوتا ہے) کو حکم دیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز تک کی تاریخ رقم کرے۔ فتح اسلام کے بعد یہ باستان نامہ فاروق اعظمؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا جنہوں نے اس کا ترجمہ عربی میں کروایا۔ جدید فارسی میں ترجمہ آل سامان کے عہد میں ہوا جس کی بنیاد پر دقیقی اور بعد میں فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔

4- ترکستان' ایران' ترکی وغیرہ کی مفصل تاریخ' ناچیز مصنفہ کے "درچمن ہرورتی دفتر حال دگر ست" میں ملاحظہ فرمائیے جس کے چند ابواب "نقوش" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں۔

5- تعزیت

6- رود کوثر از شیخ محمد اکرام

7- اس نایاب فارسی کتاب کا غالباً آخری نسخہ میر معصوم علی کے پڑپوتے میر نذر الباقر رضوی (نذر سجاد حیدر کے والد) کے انتقال کے بعد ۱۹۳۰ء تک مرحوم کے سامان کے ساتھ چودھری سر محمد ظفراللہ خاں کے ہاں لاہور میں موجود رہا۔ چودھری صاحب کے گھر میں چوری ہوئی۔ اس میں نذر الباقر صاحب کا اسباب بھی مع اس کتاب کے نکل گیا۔

8- خراسان کے جاگیردار۔

9- فرمانروایان اودھ مخلوط النسل قزلباش' قراقون لو اور قرایوسف ترک تھے۔ ان کے بزرگوں کو شاہانِ صفویہ نے نیشاپور میں جاگیر دی تھی۔

10- پنجاب کے مدبر میاں سر فضل حسین مرحوم کے دادا۔

11- حاضران کے چند مسلمان افسروں کے نام ملاحظہ ہوں۔ ڈیرہ الٰہی بخش' ڈیرہ حافظ بخش' ڈیرہ سلطان محمد خاں وغیرہ۔

12- سرشار نے فسانہ آزاد میں ایک چکلہ دار کی تصویر کشی کی ہے۔ دو سو روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے چکلہ دار تھے۔ "میں سمجھ گیا کہ شاہی کے ہیں۔"

13- وسط اٹھارویں صدی میں روہیلہ افغانوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے سردار نواب علی محمد خاں کمزور جاگیرداروں کے معاملات میں مداخلت کر رہے تھے۔ جاگیرداروں نے نواب قمرالدین وزیر اعظم دہلی سے شکایت کی۔ محمد شاہ بادشاہ نے راجہ ہرنند سنگھ گورنر مراد آباد کے نام حکم جاری کیا کہ روہیلوں کو کٹیہر سے نکالنے کا بندوبست کریں۔ راجہ ہرنند کے لشکر میں سادات محمود پور سرسی اور اطراف کے راجگان شامل ہوئے۔ لشکر اور توپ خانے نے اصالت پور جاری پرگنہ بلاری کے قریب ارل ندی کے کنارے قیام کیا۔ بڑی زبردست جنگ تھی۔ نواب علی محمد خاں کی بیس ہزار روہیلہ فوج کی قیادت حافظ رحمت خاں اور نواب دوندے خاں کر رہے تھے۔ راجہ ہرنند کا لشکر تیس ہزار کا کہا جاتا ہے۔ ۱۷۴۲ء ۱۹ محرم جمعرات کے روز صبح منہ اندھیرے جب شاہی افواج ابھی محو خواب تھیں روہیلوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ راجہ ہرنند مع نواب محمود پور اور دوسرے راجگان مارے گئے۔ علی محمد خاں نے سنبھل' امروہہ' چاندپور' نگینہ' بجنور' شاہجہانپور' بریلی سب پر قبضہ کر لیا۔
(اخبار الصنادید) از نجم الغنی خاں۔ بشکریہ اکبر علی خاں عرشی زادہ

14- مطبوعہ نقوش لاہور۔

15- نواب محمد علی خان نے اپنے نواسے یعنی عاشق حسین کے بیٹے معشوق علی خان کو متبنی کر کے ریاست کے تین حصے کئے۔ سید معشوق علی خان کی شادی نواب شمس آباد کی بیٹی سلطنت آرا بیگم سے کی جن کے دادا نواب دولھا شاہان صفویہ کی اولاد تھے۔ دادی جعفری بیگم اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر اعظم اودھ کی بیٹی تھیں۔

16- سید معشوق علی کی جاگیر دھنائی ضلع علی گڑھ میں تھی۔ ایام غدر میں سرکار انگلشیہ کی تحویل میں دی گئی جس کے عوض گورنمنٹ نے سید معشوق علی کے والد کی پنشن مقرر کر دی۔ یہ پرانے بزرگ انگریزی سے ناواقف تھے۔ جانے کیا ہیرا پھیری دشمنوں نے کی۔ جاگیر غائب۔ "وقائع نعمت خان عالی" ہاتھوں میں رہ گئے۔ سید معشوق علی کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں مراد آباد کے سر محمد یعقوب مرحوم نے گورنمنٹ کا بہت پیچھا کیا' مگر بے سود رہا۔ سید معشوق علی کے بیٹے سید محسن علی یو۔ پی میں ڈائرکٹر انیمل ہزبنڈری تھے۔ چند سال قبل الہ آباد میں انتقال کیا۔

فصل سوم

ا — نیچری فوج

چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے بوسیدہ فرغل میں ملبوس تاجیک نژاد بوڑھا پھونس قصہ گو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ مقبرہ مبارز اللہ خاں کے گنبد اور میر بندے علی ترمذی کے پھاٹک کے سائے طویل ہو چلے۔ دہشت زدہ ہو کر جھیل پار شہر خموشاں پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے قدر دان محو خواب ہوئے۔ اوروں نے دنیا سنبھالی۔ اپنے بھی اب اجنبی سے نظر آتے ہیں۔ یہ پیر مرد اس جہان گذراں کے ایک مختصر سے دور یعنی صرف بارہ سو (۱۲۰۰) سال کی ایک کہانی سنا رہا تھا۔ لیکن دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ نئے لوگ اس سے اکتا گئے۔ کسی کو اس کی حکایت کی مطلق ضرورت نہیں۔ لہٰذا کرم خوردہ شجروں کا بستہ لپیٹ کر عدم کی تاریکی میں لامکاں میں داخل ہو جائے گا۔ جہاں نہ گفتگو ہے نہ جستجو۔

محلہ سادات' حکیمان' خواجگان' تیرگراں وغیرہ وغیرہ کے نکڑوں پر نئی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے نصب کئے لیمپ ٹمٹماتے ہیں۔ گو کہیں کہیں اکا دکا مشعل اب بھی جل رہی ہے۔

فصل اول میں اس قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے دو بھائیوں میر بندے علی ترمذی و میر احمد علی ترمذی کا قصہ مع ان کے بزرگوں کی داستان کے بیان کیا گیا۔ غدر میں میر احمد علی کالوں کی باغی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ پھانسی کی سزا ملی۔ جان بخشی ہوئی۔ احمد علی کے بیٹے جلال الدین حیدر نے اپنے لڑکوں کو ان کے بچپنے ہی میں نیچری فوج میں بھرتی کر دیا۔ کہ زمانے کا تقاضا یہی ہے۔ کول کی نئی چھاؤنی میں یہ فوج تعینات ہے۔ اس کے سالار اعلیٰ نے چالیس سال قبل میر احمد علی اور ان کے رفقاء کی زبردست مخالفت کی تھی۔ وہ بھی وقت کا تقاضا تھا۔ مورخین' نقاد' سیاستدان' اہل بصیرت اپنے اپنے فیصلے بعد میں صادر کریں گے۔ اکبر نے فرمایا۔

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبال نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اٹھا شوق ترقی میں یہیں آیا

اس صورت حال میں مجبوری اور تضاد یہ ہے کہ لسان العصر خود بھی خان بہادر اور جج ہیں۔ اپنے بیٹے کو گوپامئو یا خیر آباد کے مدرسے بھیجنے کے بجائے لندن میں پڑھوا رہے ہیں۔

کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

اکبر موجودہ المیے کا یونانی کورس ہیں۔ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں۔ شیخ جی' بدھو' فتو' وفاتی اور بھائی صلو کا غم کھاتے ہیں۔ گورنر' کمپو' ڈنر' مس' کلیسا' بشپ' آنر' پانیر اخبار' کونسل' چندہ' بینڈ' مال روڈ' ہوٹل نئی کربناک علامتیں ہیں۔ ہر شعر پر دل خون ہوتا ہے۔

چند سال بعد زمانہ ایک اور دیو زاد کے ذریعے گرج کے پوچھے گا' اگر نہ تھا تو شریک محفل' وغیرہ

اور وہ دیو زاد بھی بقیہ دانشوروں کی مانند مشرق کے اس اجتماعی نوسٹیل جیا کا شکار رہے گا۔

ایک بات پوچھوں؟ مغل' مرہٹے' سکھ سب کے سب یورپین فوجی ماہرین سے اپنے لشکروں کی تربیت کروانے میں جٹ گئے تاکہ مزید ایک دوسرے کا خون خچر کر سکیں۔ کسی کو روس کے پیٹر اعظم یا مصر کے محمد علی کی مانند یوروپ کی یونیورسٹیوں اور جدید صنعتوں سے فائدہ اٹھانے کی کیوں نہ سوجھی؟ اب جو مارلیمن' براؤن' بک' آرنلڈ' ایونگ وغیرہ صاحبان گھاگ امپریلسٹ یا متعصب مشنری آپ کی ہونہار اولاد کو پٹی پڑھا رہے ہیں ان پر اعتراض کیوں' صاحب بات یہ ہے کہ گستاخی معاف' آپ کے محترم اجداد کو محض جاہ پرستی' ملوکیت اور اقتدار سے دلچسپی تھی۔

کہنے لگے' "تحقیر مولوی نہ کرمائے گریجویٹ۔"

مگر صاحب معاف فرمایئے گا۔ آج کی دنیا مولوی کے بس کا روگ نہیں۔

کشور ہندیک بیک قرون وسطیٰ سے نکل کر دور جدید میں داخل ہو چکا ہے۔ سید اور اس کے ساتھی سب کے سب جدید مولوی ہیں۔ اور نئی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان نئے مولویوں کی عظمت کا اندازہ آج سے نصف صدی بعد ہی ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اگر آپ صاحبان اب بھی غدر سے پہلے کی دنیا لئے بیٹھے ہیں' آج ۱۸۹۸ء کے برٹش انڈیا کے انڈر گریجویٹ نوجوانوں کے ذہنوں ان کے ولولوں اور دلچسپیوں کا اندازہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

۱۸۲۰ء کے لگ بھگ نوجوان میر بندے علی ترمذی بیل تانگے میں سوار ہو کر نہٹور سے دلی مدرسہ فتح‌پوری میں درس نظامیہ کی تکمیل کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

بوڑھا قصہ گو ۱۸۹۸ء کی ایک رات لالٹین ہاتھ میں لے کر اس کچے راستے پر چلتا نہٹور سے روانہ ہو کر دلی کے نواح میں کول پہنچتا ہے۔

دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کالج کی مسجد سے ابھی اذان کی صدا بلند ہو گی۔ میدان میں کرکٹ کھیلنے کے بعد لڑکے اپنے اپنے کمروں کی طرف جا چکے ہیں۔ لالٹین کی لو ذرا اونچی کرو تو سامنے کچی بارک ہے۔ ایک اور علامت۔ علامتوں سے بچو۔ خطرناک ہیں۔ جب مرہٹے دلی کے حاکم تھے سندھیا کی فوج یہاں متعین تھی۔ اب مرہٹے پونا اور بمبئی کے نئے کالجوں میں سر جھکائے وہی انگریزی نصاب پڑھنے میں منہمک ہیں جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں پڑھایا جا رہا ہے۔ میرے عزیزو۔ اس نکتے پر بھی غور کرو اور سر دھنو۔

بارش ابھی ہو کر تھمی ہے۔ سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں طاری ہے۔ کالج کی عمارتیں اندھیری رات میں برساتی جگنوؤں کی مانند مدھم مدھم جھلملا رہی ہیں۔ جب سید گزٹ لے کر اٹھے گھر گھر جا کر بھیک مانگی تب جا کر یہ چند گھروندے کھڑے کئے۔

پیر مرد تاجیک نژاد بیوقوف نہیں ہے۔ میکالے کا نام سن چکا ہے۔ عصا ٹیکتا سید ہالٹن لائبریری پہنچتا ہے جہاں لیمپ روشن ہیں۔ ایک میز پر بیٹھ کر بستے سے پہلے کاغذات نکالتا ہے۔ اچانک غصے سے ان کو

نیچے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پھر ذرا کی ذرا توقف کرتا ہے۔ ممکن ہے حاشیوں کے لئے ان قدیم ملفوظات' شجروں' حکایتوں' عجائب القصص کی حاجت ہو۔ جھک کر لرزاں ہاتھوں سے وہ کاغذ چنتا ہے۔ واپس داخل دفتر کر دیتا ہے۔ جب تک زندہ ہے انہیں حرز جان بنائے رہے گا۔ گو خراسان کے قدیم داستان طرازوں کی طرح جان گیا ہے کہ اس کا زمانہ ختم ہوا اور اب کوئی ابوالقاسم فردوسی' طوسی اس کی ترجمانی اور ہمنوائی کے لئے نہیں آئے گا۔

لیکن یہ کہن سالہ قصہ گو جس کا دوسرا نام وقت ہے بڑا کائیاں ہے۔ فرنگیوں کے بنوائے ہوئے اس کتب خانے میں داخل ہو کر اسے معلوم ہو چکا ہے کہ انداز بیان' موضوع اور اسالیب بدل گئے۔ یہ بھارت ورش ہے نہ ہندوستان جنت نشان۔ یہ برٹش انڈین ایمپائر ہے اور وہ خوداب وکٹورین انگلستان کے باسی تباسی اسالیب کی نقل کرنے والا ایک کولونیل ادیب۔ چنانچہ اب وہ "بطرز جدید" ناول لکھے گا۔

۲— کچی بارک

بیا اے خامۂ نیرنگ پرواز...... آہاہا مہتاب عالم تاب نے اچانک زمین و آسمان منور کر دیئے۔ ہوا لطیف و خوشگوار۔ دل میں عجیب مسرت و فرحت پیدا کر رہی ہے۔ ہمارا ناولسٹ دوست مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوتا لائبریری سے نکل کر صحن چمن سے گزرتا ایک بورڈنگ ہاؤس کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ چہار طرف زمین زمرد رنگ' کوہ زمرد کے ہم سنگ' تبارک اللہ۔ یہ باغ جناں ہے یا روضہ رضواں۔ در و دیوار ندرت باز' مشاط صباگلکار۔ سلیمانی ٹوپی پہن کر ہمارا ناولسٹ دوست ایک بلڈنگ کے ورانڈے میں پہنچ کر کمروں کمروں جھانکتا ہے۔ ہر روم کے اندر نوجوانان چمن مصروف مطالعہ ہیں۔ ایک دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکتا ہے۔ اندر کا سین دیکھتا ہے۔ اینٹوں کا فرش۔ سیلی ہوئی دیواروں کے نزدیک تین چارپائیاں' سرہانے بے روغن کی میزیں' ایک ایک کرسی۔ کھونٹیوں پر کپڑے' ٹرکش کوٹ' ترکی ٹوپیاں۔ چارپائیوں کے نیچے ٹرنک اور ڈاسن کے بوٹ۔

پچھلے سال ترکی اور یونان میں پھر جنگ چھڑی۔ ادہم پاشا یونانیوں کو شکست فاش دے چکے ہیں۔ بارہ تیرہ سال قبل جنگ روس و ترکیہ نے ہندی مسلمانوں کے لئے بہت ہیرو سپلائی کئے تھے۔ اس وقت وہ دیکھئے دیوار پر جنرل ادہم پاشا کی تصویر فریم میں مسکرا رہی ہے۔ یہ وہ بدبخت زمانہ ہے جب ہندوستان ۱۸۵۷ء کے سورماؤں کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ ان پر فخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترکی سلطنت مغلیہ کا بہترین جذباتی نعم البدل ثابت ہوا ہے۔

اس تصویر کے نیچے ایک تپائی پر بڑا لیمپ روشن ہے۔ اس کے چینی کے گلوب پر انگور کے خوشے بنے ہیں اور ایک قدیم یونانی حسینہ بربط بجا رہی ہے۔

برسات کی رات۔ پتنگے اور اللہ میاں کی بھینسیں یعنی بیٹل (انگریزی نام) لیمپ کے طواف میں مصروف۔ فرش پر لال بیگ یعنی کاکروچ (انگریزی نام) رواں ہیں۔

سچ پوچھئے تو بڑا خستہ حال سا ماحول ہے۔ مگر ایک نادار قوم نے اپنے نونہالوں کے لئے یہی میسر کر لیا غنیمت ہے۔ اسی سال چند ماہ قبل ہمارے قابل فخر محسن قوم ایجوکیشنسٹ آنریبل سرسید احمد خاں نے رحلت فرمائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تین نوجوان جنٹلمین اپنی اپنی چارپائیوں پر نیم دراز اسٹڈی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ آیئے ذرا نزدیک جا کر دیکھیں کیا پڑھ رہے ہیں۔ اوہو! یہ سرخ و سفید خوبرو نوجوان کون ہے؟ ہو نہ ہو یہی ہمارا ہیرو ہے۔ یعنی مسٹر ایس ایس حیدر۔ ہاتھ میں ایک ناول ہے جو کسی اجنبی زبان میں لکھا ہے۔ حروف مانوس نہیں لیکن زبان نہ عربی نہ فارسی۔ آہاہا۔ کیا خوب یاد آیا

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ۔۔۔ یہ تاریخ کہی ہے کسی ٹُرکی

تو شاید یہ ترکی ہے۔ خیر جو بھی ہے ابھی ہم اس کا پتہ چلا لیں گے۔

دوسرا ینگ جنٹلمین پانیرا خبار پڑھ رہا ہے۔ شکل سے جوشیلا اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کا نام محمد علی جوہر ہے۔ تیسرا نوجوان البتہ ہم نہ پہچان سکے۔

محمد علی:— (پانیر اخبار زمین پر پھینک کر) بھائی سجاد کیوں نہ اب سویا جائے۔

سجاد:— ضرور! لیمپ بجھا دو۔

محمد علی:— (دوسرے نوجوان سے) میاں صاحب زادے لیمپ بجھا دیجئے۔

وہی نوجوان:— آپ خود بجھا دیجئے۔ ہم سو رہے ہیں۔

محمد علی:— چراغ گل کرو میاں صاحبزادے۔

نوجوان اپنی بات دہراتا ہے۔ محمد علی زقند بھر کر میز کے قریب پہنچتے ہیں۔ لیمپ اٹھا کر لڑکے کے پاس لے جاتے ہیں۔ چشم زدن میں وہ بھی پلنگ سے کودتا ہے اور کمرے سے باہر۔ محمد علی لیمپ سمیت اس کے پیچھے۔ سجاد حیدر ان دونوں کے تعاقب میں۔ تینوں کا جلوس صحن میں پہنچتا ہے۔ دوسرے کمروں سے لڑکے نکل کر جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لڑکا سب سے آگے۔ چراغ بکف محمد علی نعرہ لگاتے اس کے پیچھے.........

ہمارے ینگ ہیرو سجاد حیدر جو ہمارے اولڈ ہیرو میر احمد علی ترمذی کے پوتے ہیں ۱۸۸۰ء میں بمقام قصبہ کانڈیر ضلع جھانسی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بنارس میں حاصل کی جہاں ان کے والد ماجد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ ۱۸۹۴ء میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کی نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ سید کے مدرسہ میں ہندو مسلمان لڑکے اکٹھے پڑھتے تھے۔ آدھا اسٹاف بنگالی ہندو اور کائستھ ٹیچروں پر مشتمل تھا۔ سجاد حیدر حساب میں کچے تھے۔ فرشتہ صفت استاد میر ولایت حسین نے جو ایم۔ اے۔ او کالجیٹ اسکول کے سکنڈ ماسٹر اور بورڈنگ ہاؤس کے نگراں تھے کلاس کے بعد سجاد حیدر کو بڑی لگن اور محنت سے یہ مضمون پڑھایا۔

اسکول کے سینیر بچے یونین کلب کے ممبر تھے۔ مگر اس کے مباحثوں میں شرکت کی انہیں ہمت نہ پڑتی تھی۔ میرولایت حسین نے ان کے لئے علیحدہ ڈیبٹنگ سوسائٹی قائم کی جس کا جلسہ ہر اتوار کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ہورسٹ کے کمرے میں منعقد ہوتا تھا۔ "محمد علی' سجاد حیدر اور راجہ مہندر[1] پرتاپ سنگھ اس سوسائٹی میں خوب تقریریں کرتے تھے اور بعد میں ملک کے بہترین اسپیکر ثابت ہوئے"۔

سجاد حیدر فی الوقت بی۔ اے میں پڑھ رہے ہیں۔ کالج کے سب سے خوش پوش طلبہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

کندرکی ضلع مراد آباد کے رضا علی ایف اے میں سجاد حیدر کے منجھلے بھائی نصیرالدین حیدر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی وحید الدین حیدر کے ایک ہم جماعت اور یار غار سید محمود[2] ابھی سے "محمود قوم" کہلا رہے ہیں۔

سید رضا علی:- میری پہلی ملاقات سجاد حیدر سے جولائی ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ بڑے بذلہ سنج تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انگریزی زبان کا اچھا ناول شاید ہی کوئی پڑھنے سے بچا ہو۔

نصیرالدین حیدر کے دوست محمد ادریس' عبدالوہاب (اے۔ ڈبلیو) زبیری اور محمد سلیمان تھے۔ نصیر کا بھی انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبے میں دوسرا نمبر تھا۔ مگر علی گڑھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی۔

ظفر عرف بال خوب کھیلتے تھے۔ بارہ بنکی کے چودھری نعمت اللہ اور پنجاب کے ملک زماں مہدی ہم سے تین درجے اونچے تھے۔ سید ابو محمد بھی اسی زمانے میں تھے۔ وہ بعد میں خان بہادر اور ممبر یوپی پبلک کمیشن ہوئے۔ بارہ بنکی کے ولایت علی بمبوق بھی ہم عصر تھے۔ انہوں نے بمبوق کلب قائم کیا۔ تحریر میں بلا کی شوخی تھی۔ بعد میں کامریڈ میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ عین جوانی میں انتقال کیا۔ مسعود الحسن "(مسعود ثانی)" بھی جواں سال مرے۔ مراد آباد کے محمد یعقوب (بعد میں سر یعقوب) اور سردار محمد حیات سجاد حیدر کے دوسرے ساتھی تھے۔

علی گڑھ میں اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون میں کمزور ہو تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر ریاضی سے بہت گھبراتے تھے۔

نواب حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاؤلی سرسید کے بے حد مخلص اور روشن خیال دوست تھے۔ ان کے والد ہجرت کر کے مکہ چلے گئے تھے جو اس زمانہ میں دولت عثمانیہ میں شامل تھا۔ وہیں نواب اسمٰعیل خاں نے ترکی پڑھی جو عربستان کی سرکاری زبان تھی۔ ترکی کے دلدادہ بن کر ہندوستان لوٹے۔ سرسید کے ڈرامے "تماشائے عبرت" میں ترک کا پارٹ انہوں نے ہی ادا کیا۔ سجاد ابھی ایف۔ اے کے طالب علم تھے۔ نواب اسمٰعیل خاں کے سکریٹری بن گئے۔ ان کو انگریزی پڑھاتے اور خود ان سے ترکی سیکھتے۔

نواب اسمٰعیل خاں علی گڑھ سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس کا نام "معارف" تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر سجاد حیدر۔ مولوی صاحب اور محمد علی نے سب سے پہلے

اردو داں اخبار میں حضرات کو سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی کی لذت سے آشنا کیا۔

سجاد حیدر معارف میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ بھی کرتے تھے ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک "معارف" میں سجاد حیدر نے چند طبع زاد افسانے لکھے۔

علی گڑھ کا پہلا دور ۱۸۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ دوسرے دور کا آخری سال ۱۹۱۵ء اور تیسرے کا ۱۹۳۵ء سمجھنا چاہئے۔ دوسرے دور کے طلبہ میں سجاد حیدر کا مرتبہ بلحاظ علمی قابلیت بہت بلند تھا۔ مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر و تقریر کے ذریعے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسرے کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے۔ کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مسٹر تھیوڈور بیک کے چہیتے طلبہ سب کھلاڑی تھے جن کو علمی مذاق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انگریزی پالیسی تھی کہ علی گڑھ کے لڑکوں کو سنجیدہ علمی مذاق سے دور رکھا جائے اور کھیل کود کا شوقین بنایا جائے۔ مسٹر بیک کہتے تھے کہ رنجیت سنگھ اور جام صاحب نوانگر کرکٹ کے کھلاڑی دادا بھائی نوروجی ممبر برطانوی پارلیمنٹ سے زیادہ اہم ہیں۔ جو "انجمن الفرض" کے لئے زیادہ چندہ جمع کرے اس کی بھی قدر کی جاتی تھی۔

محمد علی کی قدر اس وجہ سے تھی کہ وہ کرکٹ کے کپتان تھے۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم رجحان کو یہاں تک پھیلایا کہ ذوق ادب اور کھیل کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے مبحث پر شوکت علی نے "پنجاب آبزور" میں ایک مضمون لکھا تو بجائے اپنا نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے "مستنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔

اس ماحول میں سجاد حیدر کتاب کے کیڑے تھے۔ ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ کی موجودگی روا رکھی جاتی تھی مگر قابل تحسین نہ سمجھے جاتے تھے۔ خواجہ غلام الحسنین مورد عتاب رہے۔ مسٹر ماریسن نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے طلبہ کی قدر ان کی علمی قابلیت کے بموجب کی۔

بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے ہونہار ترین طلبہ میں تھا اور اپنی قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے۔ سجاد حیدر "انجمن اخوان الصفا" کے ممبر بھی تھے جو پروفیسر آرنلڈ نے قائم کی تھی۔ پروفیسر صاحب موصوف عربی عبا پہن کر کالج کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔

۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے جہاں وہ اقبال کے استاد بنے ۱۸۹۹ء میں پروفیسر تھیوڈور بیک کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ سر تھیوڈور ماریسن (بعد میں لارڈ ماریسن) کالج کے پرنسپل ہوئے۔

میرولایت حسین:- کالج کے احاطے کے قریب ایک مشنری لیڈی نے ایک بنگلہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور طلبہ کو اپنے حسن و اخلاق سے کشش کرتی تھی۔ ان کو انجیل کا درس دیتی تھی اور ان دنوں کے زیر بحث مضامین پر بھی ان کی رہنمائی کرتی تھی۔ سکریٹری کالج اور دیگر مقامی زعماء نے پرنسپل ماریسن سے

شکایت کی۔ پرنسپل نے طلبہ کو مشنری لیڈی کے ہاں جانے سے روک دیا۔ اس کے عوض اپنے ہاں "ایسے ریڈنگ سوسائٹی" قائم کی۔ اسٹاف کے بعض ممبران اور بعض سربرآوردہ طلبہ مثل سجاد حیدر، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، قریشی، علی احمد اور مجھ کو اس کا ممبر بنایا۔ ہفتے میں ایک دن ماریسن صاحب کی کوٹھی پر اس کا جلسہ ہوتا تھا۔

سید رضا علی:— لیڈی ماریسن نے چند طلبہ کو ستھرے مذاق کی خطوط نویسی سکھانے کے لئے درجہ کھولا۔ سجاد حیدر، ابو محمد، اعجاز علی، محمد ظریف اور میں موصوفہ سے درس لیتے تھے۔ طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہم ہفتہ میں ایک دن لیڈی صاحبہ کے بنگلے پر جمع ہوتے۔ لیکن چند روز بعد معلوم ہوا کہ لیڈی صاحبہ بجائے شائستہ خطوط نویسی کی تعلیم کے یہ درس دے رہی ہیں کہ ہندوستانی جب انگریز کو خط لکھے تو کیا طرز اختیار کرنی ہے۔ موصوفہ کے مزاج کی افتاد شاہانہ واقع ہوئی تھی۔ تھیں تو وہ پرنسپل کی بیوی مگر چاہتی تھیں کہ طلبہ ان کے ساتھ وہی برتاؤ کریں جو اس زمانے کے رئیس، کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کی میم کے ساتھ کرتے تھے۔ ساتھ ہی اس زمانے میں جو جلیل القدر انگریز علی گڑھ آتے اکثر سر تھیوڈور کے مہمان ہوتے اور پرنسپل صاحب ان سے اپنے خاص طلبہ کو ملواتے۔

سجاد حیدر کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو نظمیں اور مضامین انھوں نے لکھے وہ بڑے پر لطف ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک و قوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ "مرزا پھویا" سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کی امداد کے لئے سرسید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کرکے تقریریں کیں کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی امداد کرے اور اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجے۔ مرزا پھویا بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحربیانی کا یہ اثر ہوا کہ باپ نے مرزا کو علی گڑھ بھیجنے کا تہیہ کر لیا۔

مشتاق احمد زاہدی:

جس دن پہلی دفعہ یہ حضرت[3] یکے سے اتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے تو ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں کھیتلی جوتی، ہاتھ میں پاندان۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہہ دی، جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی۔ مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں ان کو "مرزا پھویا" کا خطاب دے کر ان کے حلیئے کو بدل دیا۔ "مرزا پھویا" سب سے پہلے علی گڑھ کالج کے ایک دو ورقی اخبار میں چھپی جو تفنن طبع کے لیے خفیہ طور پر دستی یا چھپا ہوا نکلتا تھا۔

سید سجاد حیدر سے میری دوستی کی ابتدا ۹۷-۱۸۹۶ء میں ہوئی جب ہم دونوں مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔

سجاد ادھر ادھر کی کتابوں کا مطالعہ تو بہت کرتے تھے مگر امتحان والی کتابوں کو محض ضرورتاً پڑھ لیتے

تھے۔ باوجود اس کے جب ایف اے کا نتیجہ آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد صاحب انگریزی اور فارسی میں تمام الہ آباد یونیورسٹی میں اول مگر ریاضی میں صفر۔

محمد علی کا وقت بھی کرکٹ کھیلنے والوں کی صحبت میں ضائع ہوتا تھا کیونکہ وہ عبداللہ کرکٹ کپتان کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم بہت ذہین تھے اس لئے امتحان میں پاس ہو گئے مگر نمبروں میں سجاد کا لگا نہ کھا سکے۔ محمد علی کی قابلیت آکسفورڈ میں داخل ہو کر چمکی۔ سجاد کی خاموش قابلیت اور طبعی انکساری کی وجہ سے کالج والے ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے ریاضی میں فیل ہو جانے سے ہر شخص اس مضمون کو بددعا دیتا تھا۔ ریاضی نے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع کر دیا جس کی وجہ سے وہ ساری عمر نہ پنپ سکے اور ملازمت کی دوڑ میں مقصود علی خاں اور زماں مہدی سے پیچھے رہ گئے۔ مگر طالب علمی کے زمانے میں ان باتوں پر کوئی غور نہیں کرتا اور باوجود اس ناکامی کے سجاد کی ہردلعزیزی اور شہرت میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ طلبا اور پروفیسروں کو سجاد سے ہمدردی اور زیادہ ہو گئی کہ افسوس ایسا قابل شخص ریاضی کی وجہ سے رہ جائے۔ چنانچہ بی اے میں ریاضی سے پیچھا چھوٹا تو سجاد تمام الہ آباد یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر پاس ہوئے۔

یونین میں تقریر کرنے کا شوق سجاد کو اسکول کے زمانے سے تھا۔ اخبار بینی کا بھی مرض تھا۔ اس لئے یونین کے سب اعزازی عہدے ان کو حاصل ہو گئے۔ یعنی سیلیکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے پھر لائبریرین، پھر سکریٹری۔ تقریر کرنے کا انعام اور کیمبرج پرائز حاصل کیا۔

مضمون نگاری[4] ایف اے سے بھی قبل شروع کی۔ انگریزی انشا پردازی میں بھی سجاد بی اے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے طلبہ اس زمانے میں انگریزی اچھی ہونے کا معیار یہ سمجھتے تھے کہ "پانیر" میں مضمون چھپ[5] جائے۔ اکثر طلبہ نے جن کو اپنی انگریزی پر ناز تھا سعی لاحاصل کی مگر سب سے پہلے سجاد کا ہی ایک مضمون شائع ہوا۔ ان کے بعد جن صاحب کا مضمون شائع ہوا وہ محمد علی تھے، جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس کے کئی سال بعد سید رضا علی کے خطوط جو اچھے طویل ہوتے تھے چھپنے لگے۔

راوی:

کالج میگزین ۱۸۹۱ء میں جاری ہوا تھا۔ بیگ صاحب کی وفات کے بعد ماریسن صاحب پرنسپل ہوئے میگزین پر بورڈنگ ہاؤس کے روپئے کا قرضہ دیکھ کر اسے بند کرنے کا ارادہ کیا۔ بورڈنگ ہاؤس فنڈ سے اسے دو سو روپیہ سالانہ کی امداد ملتی تھی۔ سید سجاد حیدر اور اسسٹنٹ پروفیسر عبدالقادر نے ارادہ کیا کہ میر ولایت حسین کے تعاون سے پرائیویٹ طور پر پرچہ نکالا جائے۔

ماریسن صاحب، پروفیسر پننگ، ولایت حسین، عبدالقادر اور سجاد حیدر کے پرائیویٹ پرچے کے طور پر اور تین سو اولڈ بوائز اور بہی خواہان کالج کے چار روپے سالانہ چندے کی رقم سے علی گڑھ منتھلی چھپنا شروع ہو گیا جس نے بعد میں علی گڑھ میگزین کی صورت اختیار کی۔

سجاد حیدر کی والدہ سعید بانو بنت میر بندے علی ترمذی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کالج کی چھٹیوں میں تینوں بھائی علی گڑھ سے اکثر مع محمد علی جو ہرا اپنے چچا خان بہادر سید کرار حیدر کے پاس خورجہ جایا کرتے تھے۔ محمد علی کو شکار کا شوق تھا۔ ہمیشہ بندوق ساتھ لے جاتے۔ خورجہ سے ڈاکٹر کرار حیدر کا تبادلہ رائے بریلی کو ہوا۔ یہی شغل تعطیلات میں محمد علی کا وہاں رہا۔

جولائی ۱۸۹۸ء میں ایک روز ڈاکٹر صاحب رائے بریلی میں کسی مریض کے پاس پہنچنے کی جلدی میں گھوڑا تیزی سے اڑائے لئے جاتے تھے۔ پل پر پہنچ کر اسپ بگڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سڑک پر گرتے ہی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ صرف ۳۵ سال عمر پائی۔

سجاد حیدر نے ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ امتحان الہ آباد جا کر دیا جاتا تھا۔ الہ آباد میں طاعون کی وبا پھیلی، امتحان کا سنٹر لکھنؤ منتقل کیا گیا۔ مارچ ۱۹۰۲ء میں نصیرالدین حیدر اور سید رضا علی نے کیننگ کالج لکھنؤ جا کر بی اے کے پرچے کئے۔ کیننگ کالج اس وقت قیصرباغ میں تھا۔ بی۔ اے کے بعد نصیرالدین حیدر پی۔ سی۔ ایس میں منتخب کر لئے گئے۔ سجاد حیدر نے علی گڑھ میں ایم اے اور قانون کے لئے دوبارہ داخلہ لیا۔ میاں وحید الدین حیدر کو ڈاکٹری پڑھنے کے لئے لاہور بھیج دیا گیا۔

شیخ عبدالقادر:— "میرے دوست سید سجاد حیدر جن کا غلغلہ بعد میں یلدرم کے نام سے ادبی دنیا میں بلند ہوا، ابھی یلدرم نہیں بنے تھے، اور نہ میں مدیر "مخزن" تھا۔ جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی، میں کالج سے نکل کر انگریزی اخبار "اوبزرور" کا اسسٹنٹ اڈیٹر تھا اور وہ علی گڑھ میں بی اے کر رہے تھے۔ اور اپنے اوقات فرصت میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے سکریٹری کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں علی گڑھ میں حاجی صاحب سے ملنے گیا تو سجاد حیدر ایک کونے میں علیحدہ میز کرسی لگائے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ حاجی صاحب نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے، "آیئے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں۔ آپ شبلی غمزدہ کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا، "ہاں مگر کیسے اور کہاں؟"

انہوں نے کہا، "ابھی اور یہیں!"

مولانا شبلی اس وقت حاجی صاحب کے ہاں مہمان تھے اور اس بنگلہ کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے جس کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر انہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا اور کبھی قلم کا ایک سرا منہ کے قریب ہوتا تھا جیسے فکر سخن میں ہیں۔

معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کو اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک مناسب اور جائز تھا۔ مگر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی۔ مجھے تو انہیں مصروف سخن دیکھنا ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ مدتوں نہیں بھولا۔ اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے مدتوں بھایا کہ مولانا کو فکر سخن کرتے دیکھنے میں انہیں جو لطف

آیا اس میں انھوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔

مولانا شبلی اپنے شاگردوں میں "شبلی غمزدہ" کے نام سے مشہور تھے کیونکہ وہ اپنے نام کے ساتھ "غمزدہ" لکھا کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ایسے استاد فن کو دیکھنا اور درس لینا سجاد حیدر کے مذاق کو مستحکم اور تیز بنانے کا باعث ہوا۔

وہ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو آزادی نسواں کا بہت حامی تھا۔ ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالی تھے۔ سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔ ایک دن جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے لئے برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد صاحب آتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکر اپنے گرد لگائے، جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں اور مجھ سے کہنے لگے، "کچھ نہ پوچھئے، میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں!"

میں نے پوچھا! "کچھ تو بتایئے کیا دیکھا ہے کہ طبیعت اس طرح زوروں پر ہے!" کہنے لگے، "ایک ایسی عورت[6] سے باتیں کر کے آ رہا ہوں جو آزادی کی حامی اور خود بھی آزادی پر عامل[7] ہے۔"

۳— بیچلرز لاج کی "خاتون"

"بی۔ اے"[8] کے بعد سجاد راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگپور گئے۔ مگر بعد میں گورنمنٹ نے راجہ صاحب کو علی گڑھ کالج بھیج دیا۔ ایک کوٹھی کرائے پر لی گئی۔ اس میں دو کمرے قانون کے طلبہ کے لئے مخصوص کئے گئے۔ سجاد کی کوشش سے مجھے اور مرحوم انعام الحق کو (جو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے انڈر سکریٹری ہوئے) جگہ ملی۔ ساری کوٹھی ہم تین دوستوں کے قبضے میں آ گئی۔ راجہ صاحب بے چارے شاگرد تھے۔ علیحدہ کمرے میں پڑے رہتے۔

کوٹھی کا نام "بیچلرز لاج" رکھا گیا۔ ہم تینوں کنوارے تھے اور یہ خیال زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں۔

اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کو نئی تہذیب بہت چڑھ گئی تھی۔ مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے محض نابلد تھیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا اور مغربی طرز زندگی سے سارے ہندوستان میں سوائے چند خواتین کے کسی کو واسطہ نہ تھا۔ ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ بیچلرز لاج میں جس طرح ہم صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں ہماری رفیقہ حیات بھی اس کی اہل ہو۔ اور چونکہ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی، اس لئے یہ خیال دل نشین ہو گیا تھا کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔

ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے اور مسلمان ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ بتدریج معراج ترقی تک پہنچانا ہم نے اپنا مقصد زندگی قائم کیا تھا۔

ڈگری لینے کے بعد ہم لوگ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ قانون کی کلاسیں محض علی گڑھ کالج سے وابستہ رہنے کا ایک بہانہ تھا۔ سوائے نئی دنیا بنانے کے کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ کالج کے نئے اور پرانے سر برآوردہ طلبہ کو ہر ہفتے کھانے یا چاء پر مدعو کیا جاتا۔ قوم کی کوئی مقتدر ہستی کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڑھ میں موجود ہوتی۔ ان کے فیضان صحبت سے استفادہ حاصل کیا جاتا۔

"تعلیمِ نسواں"

پردہ' مغربی طرز معاشرت' احکام شریعت' اسلام بحث کے موضوع ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے۔ جو تجاویز وہ پیش کرتے اس وقت وہ ناقابل عمل معلوم ہوتی تھیں۔ مثلاً ان کا خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے شائع کیا جائے۔ مسجدوں میں ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ پتلون اور بیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو۔ اگر جوتوں سمیت نماز پڑھی جائے تو بوٹ پر چڑھانے کے لیے غلاف موجود ہوں۔ اسلامی قانون وراثت میں وہ مشترکہ خاندان کے طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ اردو قرآن شریف' اردو نماز اور تقسیم وراثت پر سجاد کے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔

"شیخ محمد عبداللہ کے رسالے "خاتون" کے پہلے نمبر میں ہمارے کنوار گڑھ کے ممبر انعام الحق نے حقوق نسواں پر ایسا مضمون لکھا کہ جس کی دھوم مچ گئی۔ اور ہم تینوں اس رسالے میں لکھتے رہے۔"

شیخ محمد عبداللہ ایک کشمیری نوجوان سجاد حیدر سے چند سال سینئر تھے اور سرسید کے منظور نظر طالب علم رہ چکے تھے [9]۔ کسی کا سرسید اور بک صاحب پرنسپل کے یہاں مقرب ہونا آسان نہ تھا۔ تاہم عبداللہ اپنی ہوشمندی اور قومی دردمندی کے سبب سے سرسید کے حاضرباش اور بک صاحب کے عزیز شاگرد رہ چکے تھے۔

شیخ محمد عبداللہ علی گڑھ میں وکالت شروع کر چکے تھے جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انہیں شادی کی رائے دی ۱۹۰۲ء میں دلی کے ایک مغل گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی وحید جہاں بیگم بنت مرزا ابراہیم بیگ سے شادی ہوئی۔ بارات میں نواب محسن الملک' آفتاب احمد خاں' نواب صدر یار جنگ' مولوی حبیب الرحمن شیروانی' نواب سرسلطان احمد خاں اور خواجہ عبدالحمید کے والد خواجہ محمد یوسف وغیرہ شامل تھے۔

دلی میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ' حکیم اجمل خاں وغیرہ نے تقریب میں شرکت کی۔

"اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین' پروفیسر قانون' علی گڑھ کالج' جسٹس سید امیر علی اور بدرالدین طیب جی اور نوجوانوں میں سید سجاد حیدر اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ تعلیم نسواں کا کوئی حامی نہ تھا۔ سرسید لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف تھے ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا

شعبہ تعلیم قائم ہوا تھا مگر اس نے کچھ نہ کیا۔

"۱۹۰۲ء میں ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کے لئے سر آغا خاں اور علیا حضرت سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال تشریف لائیں۔ ایک شام میں نے دوستوں کو جمع کیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں' نواب سلطان احمد خاں' سید سجاد حیدر اور دوسرے اولڈ بوائز سے میں نے کہا کہ میں شعبہ تعلیم نسواں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس کا سکریٹری مقرر کر دیجئے۔ سب نے بالاتفاق رائے مجھے سکریٹری مقرر کیا۔

"عبداللہ بیگم نے بیبیوں کا جلسہ منعقد کیا اس میں مسز رضاء اللہ (شمس العلماء ذکا' اللہ کی بہو) اور سعید احمد بیگم نے نمایاں حصہ لیا۔ میں نے اخبارات میں تعلیم نسواں پر مضمون لکھنے شروع کئے۔ بے حد مخالفت کی گئی۔

"۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا اور پہلی بار عورتوں کو پردے کے پیچھے سے کانفرنس کی تقریریں سننے کا موقع دیا گیا۔ کانفرنس میں طیب جی خاندان کی عطیہ اور زہرا فیضی شریک ہوئیں۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور مولوی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار" بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ لاہور میں زنانہ نارمل اسکول جاری کریں مگر انھوں نے لاہور واپس جا کر اطلاع دی کہ اسکول جاری کرنے کا کوئی حامی نہیں۔ اس کے بعد میں نے اور عبداللہ بیگم نے طے کیا کہ علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا جائے۔

"مجھ کو ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے لکھنؤ جانا تھا۔ اس وقت تک مدرسہ جاری کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوا تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ لیکن ۲۰ دسمبر کو ڈاک کے ذریعہ بھوپال سے ایک سرکاری لفافہ ملا۔ علیا حضرت مرحومہ و مغفورہ عرش آشیانی نے میری ناچیز درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور مدرسے کے لئے سو روپے ماہوار کی مستقل امداد کا اعلان فرمایا۔ میں عطیہ نامہ لے کر لکھنؤ پہنچا اور مجھے امید تھی کہ نواب محسن الملک ضرور اس سے خوش ہوں گے۔ میں نواب صاحب سے راجہ سر تصدق رسول خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر جا کر ملا۔ نواب صاحب اس وقت کسی بات پر ناخوش بیٹھے تھے۔ بہت سے احباب ان کے پاس موجود تھے۔ میں نے نواب صاحب مرحوم سے بھوپال کے عطیے اور علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ جاری کرنے کا ذکر کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنے غیظ و غضب میں یہ سنتے ہی اپنی ترکی ٹوپی سر سے اتار کر چبوترے پر پھینک دی اور کہا' اب میرا علی گڑھ میں رہنا دشوار ہے۔ لوگ یوں ہی کالج کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب نہ جانے کیا کہیں گے راجہ صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کیا' آپ نوجوانوں کو مناسب نہیں ہے کہ بڈھوں کی مرضی کے خلاف کوئی کام کریں۔ آپ کو پہلے نواب صاحب سے مشورہ لینا چاہئے تھا۔ میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر چبوترے پر سے نواب صاحب کی ٹوپی اٹھا کر لایا اور ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ نواب صاحب اسی غصے کی حالت میں اٹھ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ میں نے ان سے کہا' گو پرانے خیال کے لوگ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں لیکن جدید نسل کے خیالات کا آپ نے

بالکل کوئی لحاظ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ دل سے تعلیم نسواں کے حامی ہیں نواب مسکرانے لگے اور فرمایا "جو کچھ میں نے کہا وہ بھی ٹھیک تھا اور جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ۔"[11]

"۱۹۰۴ء ہی میں میں نے ارادہ کیا کہ تحریک تعلیم نسواں میں جان ڈالنے کے لئے ایک رسالہ جاری کرنا چاہئے۔ سید سجاد حیدر، سید ابو محمد، احتشام الحق اور انعام الحق نے مجھ سے اتفاق کیا۔ رسالے کا نام غالباً سید سجاد حیدر یا خان بہادر ابو محمد نے تجویز کیا کہ "خاتون" ہونا چاہئے۔ "خاتون" کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔"

اسی سال علی گڑھ میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کے بانی شیخ عبداللہ تھے۔

"ہم تینوں[12] نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ کانفرنس ہمارے لئے کئی معنوں میں دلچسپ اور نرالی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں عطیہ فیضی جیسی ترقی یافتہ خواتین اور آبرو بیگم جیسی مشرقی علم و فضل میں یگانہ روزگار مستورات موجود ہیں۔ حامیان طبقہ نسواں کو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

"اسی زمانہ میں پروفیسر تھیوڈور ماریسن (بعد میں لارڈ ماریسن) پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج کے برطانوی کونسل اور پولیٹکل ریذیڈنٹ بغداد کے ہاں سے ترجمان کی مانگ آئی۔ بہت سے طلبہ نے درخواستیں دیں جن میں سے بعض ایسے تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل کو سلام کرنا تھا اور جو عربی کے ایم اے تھے۔ سجاد نے بھی درخواست دی۔ گو سجاد محض بی اے تھے اور پرنسپل ماریسن سے کبھی ملتے بھی نہ تھے۔ مگر ماریسن نے سب سے زیادہ سجاد کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں کے خیال میں غیر متوقع طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کے بغداد جانے سے بیچلرز لاج کا خاتمہ ہو گیا۔"

۴—باب عالی

"۲۶ مارچ ۱۹۰۴ء کو ہم کولار جہاز کے ذریعہ کراچی سے روانہ ہوئے۔ ۵ اپریل کو مسقط پہنچے۔ پہاڑی پہاڑ جن پر درخت کیا سوکھی گھاس کے پتے کا نشان نہیں اور اس پر مسقط کو دعوائے سلطانی ہے۔ ۸ اپریل کو بوشہر دور بین سے شہر کو دیکھا اور کچھ اچھا نہ پایا۔ ۱۹ اپریل ۷ بجے صبح۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ! ہم کس خطے میں جا رہے ہیں۔ رات بھر میں کیا طلسم ہوا۔ دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں۔ گلاب، نارنگی اور انار کے درخت۔ ہمارا سفینہ دجلہ و فرات کے مجموعہ پانی پر چل رہا ہے۔ ایک طرف ساحل ترکی ہے دوسری طرف ایران۔ یہ سرسبز سلسلہ یہاں سے بغداد چار سو میل تک جاری رہے گا۔

یہ حجاز یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں۔ اردگرد سینکڑوں میل تک کا چٹیل میدان۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرمستان ہیں جن کے سائے میں ہر قسم کے پھل اور پھول موجود ہیں۔

المحرہ کے بعد بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ، امرائے

بصرہ کے مکانات، حسین یہودی، ارمنی اور خال خال ترک عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کر لب دریا آتے ہیں۔ ہم دوڑ دوڑ کر سڑک کے کنارے ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔ مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہنچ گیا۔ اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم قرنطینہ پہنچا دیئے گئے۔ زندان کو چلے مچل مچل کر[13]"

اب وجد بارہ سو سال قبل مدینہ، کوفہ اور دمشق سے نکل کر افتاں و خیزاں دجلہ کے کنارے پہنچے تھے۔ کشتیوں میں سوار ہو کر عجم کی راہ فرار اختیار کی تھی۔ دشت لوط کے اس پار ماوراالنہر جیحون کے اس پار داغستان قراچل[14] جاگیری دور میں مدت مدید تک جہاں از گنگ تا سنگ[15] اجداد کا تسلط رہا۔

آج سے چھپن سال قبل دلی دروازہ، خونی دروازہ بنا تو کول میں وکٹوریہ گیٹ تعمیر ہوا۔ اس کی محراب کے نیچے سے کئی راستے نکلے۔ ان پر چلتے ترکی ٹوپی، فراک کوٹ پہنے نئے رہروؤں نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

اجداد کی قدیم دنیا اب برطانوی کولونیل آفس کی نئی اصطلاح "مڈل ایسٹ" اور محمد فاتح اور سلیمان اعظم کی سلطنت لارڈ کرزن کے "ایسٹرن کوئسچن" میں تبدیل ہو چکی تھی۔

دجلہ و فرات وہی ہیں۔ وہی سواحل عراقین۔ زوال بغداد کو آٹھ سو سال گزر چکے۔ لیکن دیکھو سلطان المعظم کا پرچم ہلالی بندرگاہ پر کس شان سے لہرا رہا ہے۔ برطانوی جہاز پر ضابطے کے مطابق یونین جیک کے ساتھ عثمانی نشان لگا دیا گیا ہے۔ ترک کسٹم افسر جہاز پر آ گئے ہیں۔ قرنطینہ کی عمارت میں رپ رپ پھر رہے ہیں۔

باب عالی[16] کے حکام۔ باب عالی کا نام سن کر ہی پھریری سی آتی ہے۔ جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ چوق[17] یشا خلیفۃ المسلمین، چوق یشا دولت عثمانیہ۔

لیکن وہ بھی دیکھو جہاز کے ڈیک پر بدمغ برطانوی افسر، سیاح، مشنری، سولا ہیٹ اوڑھے، سفید کوٹ پتلون میں ملبوس کہ خلیج فارس میں گرمی شروع ہو گئی ہے۔ کھڑے مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں۔ جانتے ہیں سارا عالم اسلام اب ان کا ہے۔

اے رود دجلہ۔ اے رود دجلہ!

ہندی نوجوان مدرستہ العلوم علی گڑھ کا گریجویٹ، نیا ادیب، سیاہ سوٹ، بغیر فریم کی عینک، برطانوی کولونیل معاشرے کا ہونہار سپوت کارپٹ بیگ ہاتھ میں لئے، ہارون رشید کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ اعرابہ سڑک پر سکون سے رواں ہے۔ دونوں طرف نیم یورپین وضع کے مکانات، اوائل بیسویں صدی کا بغداد۔ ترکی ناولوں کے کردار اکا دکا نظر آ جاتے ہیں۔ حکمران طبقے کے یوروپین ترک۔ نوکیلی شاندار مونچھیں۔ نیلی آنکھیں۔ باب عالی کے بانکے افسر۔ ان کی مہ جبیں حسین نقاب پوش خانمیں۔ زہرا، حمرا، خالدہ۔

گاڑی برطانوی کونسل خانے کے پھاٹک میں داخل ہوتی ہے۔

صرف سو سال قبل تک عثمانیوں کی شوکت و سطوت' جاہ جلال کا یہ عالم تھا کہ وہ برطانیہ' فرانس' روس اور دوسرے مغربی ممالک میں اپنے سفیر متعین کرنا کسرِشان سمجھتے تھے۔

کونسل خانے میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور ملکہ الگزینڈرا کی تصویر کے نیچے خرانٹ کونسل جنرل متعینہ بغداد و پولیٹکل ریڈیڈنٹ برائے ترکش لفٹننٹ کرنل ایل۔ ایس۔ نیومارچ بیٹھا ٹیلی فون پر وہائٹ ہال سے بات کر رہا ہے۔ پھر نووارد نوجوان ہندوستانی ذریگومین کے ذریعے مغرور عثمانی افسروں سے گفتگو کرتا ہے جو صرف فرنچ یا ترکی بولتے ہیں اور دل میں استہزا سے سوچتے ہیں۔ اب سالے تاجرو ہم غازی لوگ خدا کے پراسرار بندے سات سو برس سے جہانبانی اور کشور کشائی میں مصروف ہیں۔ چھ سو برس ہم نے تم تک چڑھے گوروں کو یوروپ میں زیرِ نگیں رکھا۔ بحیرۂ روم ہمارے لئے محض ایک ترکی جھیل تھی۔ ہم تم نو دوتیوں کو بھلا کیا خاطر میں لائیں گے۔

کرنل نیومارچ ایڈورڈین مونچھوں کے نیچے مسکراتا ہے۔ مردِ بیمار پر عالم نزع طاری ہے مگر نہیں جاتی۔

بغداد کی گلیوں میں درویشوں بھکاریوں اور فاقہ کشوں حمالوں کی ریل پیل ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ اور جناب عباسؑ اور بغداد میں غوث الاعظمؒ کے روضوں میں ہندی اور ایرانی زائرین کا جم غفیر۔ مسلمان محض دعاؤں اور عظمت رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کربلائے معلیٰ' نجف اشرف اور مشہد ہر جگہ سے حسبِ معمول گریہ وزاری کا شور بلند ہو رہا ہے اور بغداد' تہران اور قاہرہ کے یوروپین کلبوں میں آرکسٹرا بجتا ہے۔ تو کہنے لگے مستقبل کے علامہ اقبال کہ

ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

ارے صاحب ہم تو جانے کب سے معصومہؑ قم کے روضہ مقدسہ کی ضریح مبارک سے لپٹ کر چیخ رہے ہیں۔ السلام علیک یا بنت رسول اللہ السلام علیک یا بی بی یا خواہر امامؑ یا معصومہؑ۔ فریاد ہے۔ کوئی فریاد ہی نہیں سنتا۔ تہران کے کاخ گلستاں میں افروخ کلاہ مظفر الدین شاہ قاچار جلالۃ ملتہ والدین کا نازنینوں کی طرف حسب معمول کمال استغراق ہے' اور صاحب لوگ' مشنری لوگ' فوجی' سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سوئیز سے گزرتے مراقش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیمے لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت' سوا پسماندگی اور درماندگی' غلامی' ناداری' تباہی اور کیا نظر آتا ہے؟ السلام علیک یا بنت رسولؐ اللہ۔

چھ سو برس قبل ابن بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنار فرات شہر حلہ میں مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائم آل محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے۔ روز شام کو غروب آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا قائم المنتظر۔ رات گئے تک روتے چلاتے رہتے ہیں۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے۔ پھر وہ مایوس ہو کر

اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

مگر آج اے پاشاؤ' شریفو' آغاؤ' سیدو' خان بہادرو آج سارا دارالسلام سرگوں ہے۔ سب مل کر پکارو۔ اخرج یا صاحب الزماںؑ۔ اخرج یا حجت اللہ' یا قائم المنتظر۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ چپکے چپکے میٹنگیں کی جا رہی ہیں۔ تہران' استانبول' قاہرہ' بغداد کے قہوہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی امیہ کے خلاف' بنی عباس کے خلاف' بنو فاطمہ کے خلاف کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں۔ یہی کوچہ و بازار' یہی دشت و صحرا۔ یہی انسان۔ ان کے اب وجد۔

آج شاہان قاچار اور آل عثمان اور خاندان رامنوف اور اولاد وکٹوریہ کی باری ہے۔

تہران' استانبول' سینٹ پیٹرزبرگ' ماسکو' باکو' لندن' پیرس' کلکتہ ہر شہر میں سر پھرے لونڈے خفیہ مسکوٹ کر رہے ہیں۔ زمانہ خطرناک ہے۔

مستقبل کی محراب پر حریر کا پردہ اس طرح ساکت ہے اور نوجوان ایشیاء افریقہ اس کے سامنے کھڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے۔ اخرج یا صاحب الزماںؑ۔ اخرج یا روح انقلاب۔

۵ — نوجوان ترک

"۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء نماز جمعہ کے بعد سلطان المعظم مسجد سے نکل رہے تھے۔ کسی نے بم کا گولہ ان پر پھینکا۔ ۲۴ آدمی ہلاک ہوئے۔ سلطان المعظم بال بال بچ گئے۔ چہرے سے کسی قسم کا خوف و اضطراب ظاہر نہ ہوا۔ سلطان المعظم کے بچنے کی خبر پر لاہور میں مسلمانوں نے بعد نماز جمعہ شکرانے کے نفل پڑھے اور درگاہ حق تعالیٰ میں ان کی صحت اور سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں۔" تہذیب نسواں لاہور۔

"نوجوان عثمانیوں" کی خفیہ جماعت صدر اعظم علی پاشا کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں جب سلطان عبدالمجید دوم نے پریس پر مکمل پابندی عائد کی تو ترک انقلابیوں نے یوروپ میں بکھر کر وہاں سے رسالے اور کتابچے شائع کرنا شروع کئے جو ترکیہ اسمگل کئے جاتے۔ حکومت نے جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔

"انجمن اتحاد و ترقی' نوجوان عثمانیوں" کی جانشین جماعت تھی۔ یوروپ کی ترک انقلابی انجمنیں اس سے منسلک ہوئیں۔ نوجوان ترکوں کا پہلا اجتماع پیرس میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہ جماعت انڈر گراونڈ ہو گئی۔ نوجوان ترک خواتین بھی ان تنظیموں میں شامل تھیں۔

نوجوان ترکوں کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم اور زار نکولس دوئم نے ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے برطانیہ اور روس دولت عثمانیہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں یہ اطلاع ملتے ہیں مصطفےٰ کمال اور چند جوشیلے نوجوان فوجی افسروں نے ایک اور جماعت قائم کی جس میں انور بے' نیازی بے اور جمال بے شامل تھے۔

مصطفٰے کمال مع ساتھیوں کے پکڑ لئے گئے ۱۹۰۵ء میں قید سے رہا ہوئے۔ کرد بغاوت فرو کرنے کے لئے اپنی رجمنٹ کے ساتھ انہیں صوبہ شام روانہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں عصمت بے (مستقبل کے عصمت انونو) ملٹری کالج استنبول سے نکلتے ہی "نوجوان ترکوں" میں شامل ہو گئے۔

مصطفٰے کمال کا فوجی دستہ دمشق میں تعینات تھا۔ یہاں انہوں نے ۱۹۰۶ء میں ایک اور انڈر گراؤنڈ جماعت "وطن و حریت" کی بنا ڈالی۔ اس کی شاخیں یروشلم، حیفہ اور بغداد میں قائم کی گئیں۔

بغداد میں ڈریگومین سجاد حیدر کا وطیرہ یہ تھا کہ دفتر کے بعد کونسل خانے کے کلب جانے کے بجائے شہر کے ترک صحافیوں اور ادیبوں کے ساتھ وقت گزارتے۔ مصطفٰے کمال کی انجمن "وطن و حریت" کی شاخ بغداد کا پہلا جلسہ اپنے مکان پر منعقد کیا۔ باب عالی کے جاسوسوں کے خوف سے اپنا عرب ملازم مکان کے دروازے پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ہر ہفتہ یا فوری میٹنگ کے مواقع پر بے حد احتیاط برتی جاتی۔

یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء تک بسلسلہ ملازمت ایران، عراق، فلسطین و ترکی میں مقیم رہے۔[18] بغداد میں ایک مرتبہ سخت بیمار پڑے اور بغرض علاج ترکی گئے جہاں دیار بکر میں ترکی کی نئی جمہوری حکومت نے بہت بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا تھا۔

"خوش قسمتی سے انہیں دنوں غازی عصمت پاشا یعنی عصمت انونو وزیر اعظم ترکی نے ماسکو جاتے ہوئے دو دن کے لئے دیار بکر میں قیام کیا۔ دوسرے سرکاری اداروں کا معائنہ کرتے ہوئے اس ہسپتال میں بھی تشریف لائے۔ سب مریضوں سے مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے میرے پلنگ کے نزدیک۔ میرے بیٹنے پر میرے نام اور ملک کا کارڈ لگا تھا۔ ڈاکٹر زبانی ہر مریض کا تعارف کراتا جا رہا تھا۔ میرا نام معلوم کر کے عصمت انوالو نے فرانسیسی تلفظ کے ساتھ انگریزی میں مجھ سے پوچھا

Do you Know Yildrim Sajjad Hyder?

Yes, Your Excellency.

How? Are you related to him?

Yes, Your Excellency, He is my uncle.

Real uncle?

Yes, Your Excellency, My Mother's brother.

Do you write to him?

Yes, Your Excellency, I do.

Fine, when you write to him next do convey my Salam Alaik.

"اس کے چند منٹ بعد مزید باتیں کیں اور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن میں نے یہ واقعہ ماموں جان کو علی گڑھ لکھ کر بھیجا جس پر انہوں نے جواب میں مجھے لکھا کہ عصمت پاشا کو انہوں نے بندہ نوازی پر

شکریہ کا خط لکھا ہے۔

"Seven Days, Speech by Ghazi Mustafa Kamal Pasha"

اس زمانے میں انگریز بہادر نے ہندوستان میں BAN کر رکھی تھی۔ دوسرے ممالک میں بھی جہاں برطانوی تسلط تھا اس بات کی کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی کہ ہندوستانی اس مشہور کتاب کو ہاتھ نہ لگا پائیں۔ بغداد میں ایک مرتبہ ہمت کر کے میں سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری سے ملا اور ان سے اظہار مدعا کیا (اس وقت عراق میں انگریز کا ایسا دبدبہ تھا کہ وہ کتاب وہاں بھی بازار میں کہیں نہ بکتی تھی، لوگ آکر ترکی سفارت خانے سے خرید لیا کرتے تھے)۔ فرسٹ سکریٹری نے جا کر سفیر سے یہ کتاب لینی چاہی (جو ان کی تحویل میں رہتی تھی)۔ چنانچہ مجھے سفیر کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ موصوف نے بڑے اخلاق سے فرمایا کہ آپ ہندوستانی ہیں۔ یہ جرات کیسے کر رہے ہیں۔ اتنے میں فرسٹ سکریٹری نے میرا ملاقاتی کارڈ جو ان کے ہاتھ میں تھا سفیر کے سامنے رکھ دیا۔ ان کا مطلب شاید یہ رہا ہو گا کہ برطانوی سفارت خانے سے تعلق رکھتا ہوں اور وہاں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوں۔ لیکن سفیر موصوف نے کارڈ پر میرے نام کے ساتھ حیدر پڑھ کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور عصمت انونو والا سوال دہرایا۔

"Do you Know Effendi Sajjad Hyder Yildirim?"

میرا وہی جواب، "یس یور ایکسی لنسی!"

پوچھا! "ہاؤ ڈو یو نو دس گریٹ مین؟"

میرا وہی جواب، "سگے ماموں ہیں۔"

"سفیر صاحب نے بڑے جوش سے مصافحہ کیا اور چائے کا حکم دیا۔ میرے متعلق بہت کچھ دریافت کیا۔ پھر کہنے لگے آپ ہماری جدید حکومت کے ایک محسن کے عزیز ہیں۔ میں آپ کو یہ کتاب بطور تحفہ دوں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ آفندی یلدرم اس زمانے میں جب کہ ہم لوگوں کا شمار غداروں میں ہوتا تھا اور وہ بھی سفارت خانے میں بحیثیت Dragoman ملازم تھے ہم لوگوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے رہے اور رؤف پاشا سے ان کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ آفندی آج سے آپ ہم سب کے بھانجے ہیں!"

چوق یشا جمہوریہ ترکی!

۶— پریم چند سے پہلے

(پچھلے بیس تیس برس کے عرصہ میں ہندوستان میں بھی[19]) "ناول نویسی نے وہ سکہ جمایا کہ ہر اخبار ہر رسالہ ہر چھاپہ خانہ اور اگر مبالغہ نہ ہو تو ہر دماغ ناولوں سے بھر گیا ہے.... مرحوم "تہذیب الاخلاق" کو بھی اس باجرات حاکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا...... اور غالباً یہ فخر صرف ہندوستان کو

حاصل ہے کہ باوجودیکہ کل ملک اس طرف ڈھل پڑا پھر بھی اعلیٰ درجے کے ناول نویس نہ پیدا ہوئے۔ اعلیٰ درجے کے تو کیا معمولی اور ادنیٰ درجے کے بھی پیدا نہیں ہوئے۔

"اس وقت اردو میں ناول لکھنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے بھی جو چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں وہ افسوس کہ نصف درجن سے بھی کم ہیں۔ مگر بلحاظ قبول عام اور شہرت کے میں تو یہی تین نام زیادہ سنتا ہوں۔ یعنی شمس العلماء مولوی نذیر احمد، مولوی عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ۔

"...... یہ بحث کہ ان تینوں صاحبوں کے ناول کس حیثیت اور کس درجے کے ہیں نہایت نازک بحث ہے اور اس کا تصفیہ ایک شخص واحد کی رائے پر منحصر نہیں ہو سکتا۔ ہاں ناول کے مختلف معیار اور اقسام گنائے جاسکتے ہیں اور پھر یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ آیا وہ اس معیار پر ٹھیک اترتے ہیں یا نہیں۔

"...... آزاد لائق بھی ہیں، بہادر بھی ہیں لیکن بے طرح عاشق مزاج ہیں۔ اب اس لئے کہ ہیرو پر کسی قسم کا الزام نہ آئے یہ ترکیب نکالی جاتی ہے کہ ہر حسین لیڈی۔ خواہ وہ مسلمان ہو، ہندو ہو یا عیسائی ہو ان پر نظر ڈالتے ہی عاشق ہو جاتی ہے اور یہ حتی الامکان کسی کا دل نہیں دکھاتے۔

".......... تاریخی ناولوں میں بھی غلطیاں کی جاتی ہیں۔ ایک ناولسٹ جن کا شہرہ آج کل دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے (ان کے ناول میں) قدیم روما کے زمانے کا ذکر ہے اور ہیرو طب اور علم طبیعات پر بحث کرتا ہے اور ان کی کل تحقیقات اور ایجادوں کا معمولی طور پر ذکر کرتا ہے جو انیسویں صدی میں ہوئی ہیں۔

"........ پرانے قصوں میں تو کوئی شہزادہ چھت پر سوتا تھا اور عاشق ہونے کے لئے پری اڑ کر آیا کرتی تھی لیکن اب بہ مجبوری ضرورت زمانہ نے سوائے تصویر کے یہ سب باتیں بند کردی ہیں۔ اب یا تو تصویر کے ذریعے یا اٹھتے بیٹھتے کوئی جھلک نظر پڑ جانے سے عشق پیدا ہو جاتا ہے.........

"ایک اور بات ہے جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے توجہ نہیں کی یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ یا امیر ہونا کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے...... اکثر حقیقی نیکی غریبوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

"مگر ہمارے ناول نویسوں نے خیال کر لیا ہے کہ ہیرو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو، نوابزادہ ہو، شہزادہ ہو، غرضکہ اعلیٰ سوسائٹی کا ہو۔

"ابھی تک اردو میں غربت کی زندگی کا نقشہ کھینچا جانا باقی ہے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ محض غریب لوگوں کی زندگی کے متعلق ناول لکھے جائیں۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا لیکن جس کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے بڑی معلومات اور وسیع تجربے اور عمیق مشاہدے کی ضرورت ہے..... انگلستان کے اول درجے کے ناول نویس وہ لوگ ہیں جنھوں نے غریب لوگوں کے حالات کی تصویر کھینچنے میں کمال دکھایا ہے۔

"اردو لٹریچر اور تعلیم یافتہ مسلمان"۔ (معارف ستمبر ۱۹۰۰ء)

"ایسے وقت میں جبکہ اردو کے ساتھ خاص "احسانات" کئے جارہے ہیں جبکہ اردو کا مقابلہ ہندی سے ہو رہا ہے اور زمانہ اپنا دست شفقت اس نامراد حرماں نصیب اردو کے سر سے اٹھا کر ہندی کے سر پر رکھ دیا ہے، غرض ایسے نازک زمانہ میں اردو لٹریچر کی ترقی کے متعلق کچھ لکھنا جھونپڑے میں رہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا ہے۔"

۱۹۰۰ء مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔

۱۹۰۰ء "نشے کی پہلی ترنگ" (خلیل رشدی بے کا ترجمہ)

شیخ عبدالقادر نے ۱۹۰۱ء میں لاہور سے "مخزن" کا اجراء کیا۔ اسی سال جولائی کے شمارے میں سجاد حیدر کا دوسرا ترجمہ "فطرت جواں مردی" چھپا جو مفاخر بے کا افسانہ تھا۔ ۱۹۰۲ء تک تین ناولٹ "ثالث بالخیر"، "مطلوب حسیناں" اور "زہراء" ترکی سے ترجمہ کر کے شائع کئے۔ "ثالث بالخیر" کا دیباچہ۔

"میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ کروں۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر میں اردو میں اس لئے بھی ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب آرہا ہے وہ انھیں بھی پیش آچکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے اور اب کہاں ہیں...... گفتگو تو ضرور انوکھی ہے لیکن سنیے تو سہی غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد"

"ایک مغنیہ سے التجا" اردوئے معلیٰ علی گڑھ (فروری ۱۹۰۶ء)۔ "میں چاہتا ہوں" اردوئے معلیٰ مارچ ۱۹۰۶ء۔ "میرے دوستانے والے" اردوئے معلیٰ جنوری ۱۹۰۷ء۔

"پریم چند کے افسانہ نگاری شروع کرنے سے چار برس پہلے یعنی ۱۹۰۳ء تک وہ اس میدان میں اپنا مقام اور مرتبہ اس حد تک محفوظ کرا چکے تھے کہ نقادوں نے ان کے افسانوی اکتساب کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ رسالہ مخزن مارچ ۱۹۰۳ء میں "اردو زبان اور افسانہ نگاری" کے عنوان سے غلام بھیک نیرنگ کا ایک تفصیلی جائزہ شائع ہوا جو "زہراء" کے تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے۔ منشی پریم چند نے پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں لکھا جو اسی سال زمانہ کانپور میں شائع ہوا۔ خیالستان کی تین طبع زاد کہانیاں "دوست کا خط" "غربت و وطن" اکتوبر ۱۹۰۶ء اور "حضرت دل کی سوانح عمری" دسمبر ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شائع ہو چکی تھیں۔ "خارستان و گلستان و شیرازہ مخزن" جون اگست اور ستمبر ۱۹۰۶ء "نکاح ثانی" "سودائے سنگین" اور "صحبت ناجنس" (۱۹۰۷ء میں چھپے) کے لئے مصنف نے لکھا کہ ان کے مرکزی خیال ترکی سے لئے گئے ہیں ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۶ء کے قدامت پرست ہندوستانی مسلمان مغربی تہذیب سے بے انتہا بد ظن تھے۔ لیکن نیم یوروپین ترکی نسبتاً ترقی یافتہ معاشرے کے اس قدر دلدادہ اور عقیدت مند تھے کہ یلدرم نے آزادی نسواں وغیرہ کے متعلق اپنے انقلابی خیالات کو ترک برقعہ میں پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ کیونکہ بقول پطرس "جدید مذیست" یوروپین کے بجائے ترکی لیبل کے ساتھ زیادہ دلآویز نظر آسکتی تھی۔

"صحبت ناجنس" یا "لڑکیاں اور یوروپین تربیت" (مخزن۔ فروری ۱۹۰۶ء) خالص ہندوستانی

معاشرے کی کہانی ہے۔ گویہی صورت حال اس وقت ترکی میں بھی موجود تھی۔

ان افسانوں کا مقابلہ اصل ترکی تصانیف سے آج تک نہیں کیا گیا۔ بعد کی کتابوں کے برعکس (جن کے مصنفین نامق کمال بے وغیرہ کے نام مترجم نے لکھے ہیں) ان افسانوں کے اوریجن کا پتہ نشان نہیں دیا۔ مثلاً ایک غیر معمولی ناولٹ "آسیب الفت" (مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۰ء) کے سرورق پر بریکٹ میں صرف "ایک ترکی افسانہ" درج ہے۔ پطرس بخاری، "یہ محض ان کا حسن بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر استعمال کرنا پڑا۔"

از ڈاکٹر معین الرحمن نذر سنز لاہور۔

۱۹۴۳ء میں سید احمد شاہ بخاری پطرس:— "یلدرم کی وفات پر یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ہے۔ اردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا۔ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انہوں نے اردو مطابق وادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تازگی بخشی۔ اور گو ان کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے لیکن رنگ و روپ کی بہت سی لطافتیں جو انہوں نے پیدا کیں ابھی باقی ہیں.... خیالستان' اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی۔ آج ہم اس سے ایک سنگ میل کی حیثیت سے واقف ہیں۔ اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ خیالستان کے شستہ اور شائستہ حسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعے کی خاطر اس کتاب کی خاطر رجوع کرنا پڑے گا اور ہمیں ان خصوصیات کا سراغ ملے گا جنھوں نے بڑی حد تک اردو کو اس کا دم خم اور لوچ بخشا ہے۔

"......... یلدرم مسلمانوں کی نئی خود آگہی کے دھارے میں شامل تھے۔ وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور سمبل بھی۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ساری دنیا میں ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز سے باہر آکر ایک نئے طرز فکر اور طرز زندگی کی تزئین کی۔ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مورخ کو اس اولین دور میں اس قومی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کار فرما نظر آئے گی جو سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے۔

"اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی اور اس میں سجاد حیدر اور ان کے ہم عصر شریک نہ تھے۔ لہٰذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال" کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ اقبال" دونوں ادوار میں شامل تھے چنانچہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبان پر رہے۔

"سجاد حیدر اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیب نو پیدا کرنا چاہی اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید' مغرب و مشرق' سائنس اور مذہب' عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے۔ یہی نظریہ تھا جس نے علی گڑھ کالج کے لئے "اینگلو اورینٹل" کا نام اختراع کیا۔ اس نظریے کے چند مظاہر

نے اکبر الہ آبادی جیسے لوگوں کو بہت ملول کیا۔ مگر وقت آگے بڑھتا گیا اور جدید مدنیت کے پیغمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

"اس جدید مدنیت اور شائستگی کے لئے سجاد حیدر نے ایک متناسب اور مناسب طور پر ترقی پسندانہ نگارش جمیل سے اردو زبان کو روشناس کیا۔ ترکی ٹوپی' مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرز تحریر کی طرف جوش و خروش سے لپکی گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے۔ اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اس طرز تحریر میں وہ سب کچھ تھا جس کی انھیں آرزو تھی......... الفاظ عربی اور فارسی کے تھے لیکن اے لیجئے۔ پل کی پل میں اور ان کی سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا۔ گویا کسی نے ملٹن کے زور بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی۔

"قومی نشاہ ثانیہ کے ساتھ تجدید ماضی کے خواہش مند نوجوانوں نے اس نئے انداز تحریر کو بڑے غرور اور پیار سے اپنایا۔ ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ نفیس' ترقی پسند' نرم و نازک اور آزاد خیال تھا۔ مغرور اس وجہ سے تھے کہ یہ انداز بیان قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا' مشرقی تھا۔

"یلدرم کی متعدد کہانیاں اور ڈرامے تراجم ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اصل تصانیف سے ان تراجم کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس لئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم کی ہوئی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا حسن بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بناء پر مجھے شبہ ہے کہ تراجم دراصل تقریباً طبع زاد تخلیقات ہیں۔ اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے پس منظر نے دلائی۔ کیوں کہ جدید مدنیت یوروپین کی بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دلآویز نظر آتی تھی.........

"انھوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بناء ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے لیکن اپنی جگہ پر ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔[20]

۷— غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک سجاد حیدر (بقول شیخ عبدالقادر "ہندی مسافر") بغداد اور استانبول میں مقیم تھے۔ "سرکاری ملازم ہونے کے باعث انھوں نے اپنا قلمی نام یلدرم رکھا جو مشہور ترک سلطان بایزید (۱۳۸۹ء' سے ۱۴۰۳ء) کا لقب تھا کیونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر بجلی کی سی تیزی سے آگرتا تھا۔"[21]

"اس لفظ کے تلفظ پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ یلدرم کے معنی گرج کے ہوں گے نہ کہ محض برق کی چمک کے اگر اس کے معنی گرج کے لئے جائیں تو سجاد کے نام کے ساتھ یہ ہرگز موزوں نہ تھا۔ کیونکہ وہ خیالات کی بارش کرتے رہے مگر کبھی گرجے نہیں۔[22]

یہ بڑا خوشگوار اور ولولہ خیز زمانہ تھا۔ اردو والوں کو باہر کی ہوا لگ چکی تھی اور ان کی ذہنی دنیا وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ شیخ عبدالقادر یوروپ کی سیاحت پر نکلے اور وہاں سے لکھا۔

بخت آزمانے نکلو جنگل بسانے نکلو گھر سے نکل کے دیکھو

ہندوستان والو

باہمت پنجابی کسان اور کاروباری امریکہ اور کینیڈا تک میں جا بسا تھا۔ مخزن میں ایک مضمون کسی سید حاکم شاہ کا جزائر کنیری سے آیا۔ محض ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں شیخ محمد اقبال اور سید علی بلگرامی کیمبرج، علی گڑھ والے محمد علی اوکسفرڈ، شرف الحق اڈیٹر مدیر رسالہ لندن، لالہ لاجپت رائے روم اور یلدرم بغداد سے اپنی تخلیقات وطن بھیج کر مخزن میں چھپوا رہے تھے۔ ہندوستان میں اس رسالے کے مضمون نگار — داغ، خواجہ حسن نظامی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، سرور جہاں آبادی، طالب بنارسی، وحشت کلکتوی، ناظر کاکوروی، گوہر رامپوری، اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی، میر غلام بھیک نیرنگ، حسن لکھنوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید، محمد اکرام، راشد الخیری، ڈپٹی لال نظم، آغا شاعر قزلباش، آغا حشر کاشمیری وغیرہم اور ایک پردہ نشین نوعمر خاتون مس نذر الباقر۔

سجاد حیدر مخزن کے "نورتنوں" میں شمار کئے جاتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۰۰ء کے مخزن میں تصویر چھپی۔ سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی نے ایک نہایت رقت خیز "نثرپارہ" بعنوان "تصویر سجاد کو دیکھ کر" تحریر فرمایا۔

"سجاد! سجاد! کون سجاد؟ وہی فطرت شناس، آزاد سجاد، ظرافت پسند سجاد!! جس کی تصویر ہنستی بولتی اکتوبر کے مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ دلوں کو، مٹے ہوئے دلوں کو اپنی طرف بے طرح کھینچتی ہے۔ وہی روشن خیال سجاد جس کے مضامین کی نسبت بجا طور سے کہا جاتا ہے۔

عطا کیا طبع نکتہ رس نے ترے قلم کی سخنوری کو
خیال انوکھا، بیاں اچھوتا، زمیں نئی اور روش نرالی"

وغیرہ۔ وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ "ادب لطیف" بہت افسوسناک ہو سکتا تھا۔

از طرف لفٹننٹ کرنل ایل ایس نیو مارچ، پولیٹیکل ریذیڈنٹ برائے ٹرکش عریبیہ، و ہز بریٹنیک میجسٹیز کونسل جنرل متعینہ بغداد:—

مائی ڈیر سجاد حیدر

میں کل ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں اور چلنے سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے بغداد کے زمانہ قیام میں آپ نے جس طرح میری اعانت کی اس کا شکریہ ادا کر دوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اگر کبھی آپ کے اور میرے درمیان کوئی اختلاف رائے ہوا تو اسے ہم دونوں نے خوش اسلوبی سے ہموار کر لیا۔ آپ کے فرائض میں میرے ہمراہ مملکت عثمانیہ کے جو طول طویل دورے شامل تھے وہ یقیناً بہت صبر آزما

ثابت ہوئے ہوں گے۔ مگر ان سے آپ کے تجربات میں بھی اضافہ ہوا۔

مجھے امید ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں گے اور سلطنت عثمانیہ کے دوران قیام میں مجھے یقین ہے آپ مزید چند زبانیں سیکھ لیں گے اور یہ بھی قیاس کرتا ہوں کہ آپ انھیں بھی اسی روانی اور شگفتگی سے بولیں گے جس طرح آپ ترکی اور عربی بولتے ہیں۔

آپ کا مخلص

ایل۔ ایس۔ نیومارچ

"اکتوبر ۱۹۰۰ء میں والد ماجد نے ریاست ٹونک میں وفات پائی۔ ہم اس اطلاع پر رخصت لے کر نومبر کے مہینے میں وطن پہنچے۔ جنوری ۱۹۰۸ء میں دہرہ دون میں نظربند سابق امیر کابل کے اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ مقرر کئے گئے۔"

رسالہ "اولڈ بوائے" میں قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی[23]

آگئے سجاد حیدر آگئے قند مکرر آگئے
چھوڑ آئے اپنی ترکن کو وہاں رکھ کے وہ سینے پہ پتھر آگئے

"بغداد میں کئی سال تک اپنے فرائض منصبی نہایت شرافت اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ شرافت میں نے اس لئے کہا کہ[24] سیاسی کاموں میں بہت کچھ لگائی بجھائی کرنی پڑتی ہے اور اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کے گلے کاٹنے پڑتے ہیں مگر یہ کام سجاد حیدر نے نہیں کیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس اہم عہدے کے باوجود ان کو کوئی خطاب نہیں ملا۔ اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بن سکا۔"[25]

۸ — تاریخ خافی خاں

۱۹۰۸ء۔ اردوئے معلی علی گڑھ کے ایک شمارے میں مصر میں برطانوی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ مولانا حسرت موہانی پر مقدمہ چلا جو ہندوستان کا پہلا سیاسی مقدمہ تھا۔ دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔ یلدرم نے ان کے متعلق ایک مضمون لکھا۔[26]

مرزا پھویا مرد آہن بن چکے تھے جیل خانے میں چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھنے میں مشغول ہوئے۔ سجاد حیدر نے جو سابق امیر کابل کی نگرانی پر دہرہ دون میں تعینات تھے اور افغانستان میں برطانوی پالیسی کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکتے تھے خافی خاں کے فرضی نام سے لکھا:

"انیسویں صدی کے آخری برس اور اس سے ایک سال پیشتر جو لوگ علی گڑھ میں تھے ان کو یاد ہو گا کہ ان ایام کے نوادروں میں سے کوئی شخص بلحاظ شکل و شباہت، وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر

دلچسپ نہ تھا جس قدر نواح لکھنؤ کا ایک طالب علم جسے محبت اور مذاق نے "خالہ اماں" کا نام دیا تھا۔

"جس طرح صاحب عصر جدید کے والد مرحوم آہستہ .... خرام تھے مگر ضرورت کے وقت تیز بھی چل سکتے تھے اسی طرح فضل الحسن آہستہ بھی چل سکتے تھے اور نوع حیوانات کی اس عام صفت سے محروم نہ تھے۔

"علی گڑھ کالج نے اپنی ہستی کا منشاء پورا کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ہمیشہ چند تیز فہم حقیقت شناس ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کسی کیریکٹر کو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو ایک لفظ یا ایک نام سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

"ان اوصاف کے ساتھ ہی فضل ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ صوم و صلواۃ کی پابندی اس کی زندگی کا جزو ضروری تھی۔ مگر برخلاف عوام کے اس سے اس کی شیرینی طبع میں فتور نہیں آنے پایا۔ یہ بارہا دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم ہے اور نماز کا وقت بن بلائے مہمان کی طرح آ پہنچا۔ فضل مسکراتے ہوئے اٹھے' معذرت بھی کرتے جاتے ہیں اور وضو بھی۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کر پھر آ بیٹھے۔ مگر ایسی حالتوں میں نماز جلدی پڑھتے تھے۔ بلکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کلام مجید کی سورتوں کی بجائے ان کے اعداد بحساب ابجد پڑھ لیا کرتے تھے۔ بزرگان دین کے مزاروں کی ان کو ایسی ہی جستجو رہتی تھی جیسی بعض یاد رفتہ اساتذہ قدیم کے دیوانوں کی۔ دہلی اور آگرہ میں کم مزار ایسے ہوں گے جن کی جالیوں میں فضل نے چلے نہ باندھے ہوں۔

"غرض ان اوصاف کا نتیجہ سمجھو یا ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ "خالہ اماں" نے عدم کی راہ لی۔ اور اس کے بجائے "مولانا" بچے سے لے کر بوڑھے تک کی زبان پر جاری ہو گیا۔

"بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالفین تعلیم انگریزی میں اور ان میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ قطعاً انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے یہ کسی صحیفہ فرنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا یا لکھنا نہ آیا۔ حقیقت میں ان کا میلان طبع اردو اور فارسی کی طرف تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو بیگانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہو کر انھوں نے بی اے میں ریاضی پڑھی مگر یہ واقعہ ہے گو اس کا سننا نفاست پسند طبقوں کو ناگوار گذرے کہ اس موذی اور مسلمان کش مضمون کو انھوں نے صحت خانہ سے باہر کبھی برضاور غبت نہیں پڑھا۔ اس پر بھی اس امتحان میں ناکام نہیں رہے۔

اسی زمانے میں سید سجاد حیدر نے انجمن اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ ہفتے میں ایک مرتبہ اتوار کی شب کو ایک الگ مقام مقررہ فرش و فروش سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اراکین مجلس اور مشتاقان سخن خوش وضع انگرکھے' اچکنیں' شیروانیاں' اونی ٹوپیاں سروں پر دیئے ہوئے قرینے سے بیٹھ جاتے۔ شمع ایک ایک کے سامنے آتی اور وہ نظم و نثر کے تازہ پھول نذر کرتا۔ داد و تحسین اور آداب و تسلیمات کا انداز فنون لطیفہ

کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ ایسی انجمن کی ترقی کے لئے مولانا سے بہتر رکن کون ہو سکتا تھا۔ مولانا کی غزلیں مشاعرے کی جان اور ان کے مضامین مشاعرے کی روح و رواں خیال کئے جانے لگے۔ چنانچہ متروک الفاظ پر ایک سلسلہ مضامین جو عرصہ تک 'مخزن' میں چھپا کیا' اپنی جدت اور انداز تحریر کی دل نشینی کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا۔

"جب حسرت کا زمانہ تعلیم ختم ہونے کو آیا تو سید سجاد حیدر بیچلرز لاج میں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اردوئے معلٰی کے چراغ حیات کے لئے سحر قریب تھی۔ مگر فینکس کی طرح اردوئے معلٰی نے بھی مرتے مرتے ایک ایسی راگنی گائی جس کی آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ ایک عالیشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی۔ تمام ہندوستان کے شعرائے اردو کی خدمت میں شرکت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ اکثر اساتذہ عالی قدر نے دعوت قبول فرمائی اور اسٹریچی ہال میں جو ایک ربع صدی سے نثر سنتے سنتے تھک گیا تھا شاندار مشاعرہ ہوا۔ سپہر نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی حضرات مجروح و تسلیم کے علاوہ بہت سے چھوٹے بڑے ستاروں نے اپنا کمال دکھایا مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر بھی ہو گئے۔

"اگلی صبح خاتمہ سبق پر تھیوڈر ماریسن تھے اور فضل کا دامن۔ عقاب جیسے کسی کمزور چڑیا کو پکڑ کر آن واحد میں آسمان کی بلندی میں جا چھپتا ہے اس طرح ماریسن صاحب چہرے پر غصے کی (جو صاف بتاؤ معلوم ہوتا تھا) کیفیت پیدا کئے غریب فضل الحسن کو پکڑے ہوئے رواں دواں دفتر کی طرف لے گئے۔

"اتنے میں شیر غرایا" "تو کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟"

"ہنستی ہوئی اور لڑکھڑائی ہوئی آواز میں جواب ملا" "جی ہاں۔ ہم لوگوں کا معیار آپ سے کچ مچ مختلف ہے۔"

"مسٹر ماریسن جھنجھلا کر بولے یہ سراسر بکواس ہے۔ کئی پرانے طالب علم خلاف تہذیب اشعار پڑھے جانے کی مجھ سے ابھی شکایت کر چکے ہیں۔"

"تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اردوئے معلٰی نے بار دگر ترک وطن کیا۔ مولانا کو اب تک یقین ہے کہ پرانے طالب علموں سے ماریسن صاحب کی مراد "نیچرل شاعر" تھے۔"

"مگر اس علمی زندگی کے ساتھ ساتھ حسرت کے عادات میں ایک ایسا وصف نشو و نما پا رہا تھا کہ جس کا آخری نتیجہ علی گڑھ کے سیشن جج کی عدالت میں نظر آیا اور جس سے یہ معلوم ہو گا کہ وہ شخص کہ جو مذہب اور ادب میں ایسا قدامت پرست تھا پالیٹکس میں کانگریس کے مقدمۃ الجیش میں کیونکر شریک ہو گیا۔ یہ وہ وصف تھا جسے انگریزی محاورے کے مطابق 'صدائے بلند ترین کا ہم آہنگ ہو جانا کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ وصف فتنہ اثر ظاہر ہوا اور ہر مرتبہ مولانا کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا۔ شملے میں علی گڑھ کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڑھ کالج کے بنی اسرائیل اسی پر آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک گروہ کثیر تمام آلات موسیقی جو کالج میں دستیاب ہو سکتے تھے یعنی تھالیاں' لوٹے' گلاس' کھانے کی سینیاں بجا بجا کر

رات کی تاریکی میں شور محشر برپا کرتا تھا۔ فضل الحسن جنھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی بیٹ چھوا تھا نہ گیند پھینکا تھا یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لئے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیل کو حوالہ خاک کرکے سب سے آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے پروفیسروں حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد سیاہ میں جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے ان کا نام لکھ لیا گیا۔

"جون کی دوپہر تھی اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ مولانا شاید بستر استراحت پر تھے کہ ظہور وارڈ کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا۔ گھبرا کر ننگے سر اور ننگے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ اسکول کے کسی لڑکے کو ایک مالی نے آم چرانے کے شبہ میں مارا ہے اور کچھ لڑکے اس شقی کی تنبیہ کو نکلے ہیں۔ مولانا اسی ہیئت سے "پکڑو بدمعاش کو مارو بدمعاش کو" کا شور کرتے ہوئے اس یورش میں شریک ہو گئے۔ مالی تو خیر پٹا یا نہ پٹا مگر ادھر اس مہم کا واپس آنا تھا کہ ادھر اس عیار زماں نے بیسیوں درخت لنگڑے اور بمبئی کے تاراج کر دیئے اور کئی سو روپے جرمانہ بطور تلافی نقصان کالج کے طلبہ پر ہوا۔ اس یلغار کا سپہ سالار بیچارے مولانا کو قرار دیا۔ محض اس لئے کہ ان کا پہچاننا اوروں کی نسبت آسان تر تھا۔ فرد سیاہ ایک بار پھر نکلی اور مولانا کچھ عرصے کے لیے حکماً کالج سے رخصت کر دیئے گئے۔ سرآمد ضلع کوہان جناب میر عباس حسین صاحب پروفیسر نے کہ مہتمم باغات بھی تھے باغ لوٹنے پر فضل الحسن کو باغی لقب دیا اور فرمایا کہ "میاں مالی کی بداعمالی پر اس کی گوشمالی بیشک ضروری تھی مگر مالی نقصان تو بیچارہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"زمانہ تعلیم ختم ہوا تو وظیفہ قانون کے لئے مولانا نے درخواست کی۔ مسٹر ماریسن نے نہ دیا۔ بورڈنگ ہاؤس میں بدستور رہنے کی اجازت چاہی۔ اجازت نہیں ملی۔

"رسالہ اردوئے معلّٰی جاری ہوا۔ دنیائے ادب نے حیرت اور استعجاب سے دیکھا کہ ایک کم عمر نوجوان نے جو ابھی کل مکتب سے نکلا تھا صحائف اردو کے لئے کیسے نئے نئے راستے کھول دیئے ہیں۔ اپنے ذاتی رسالے کے ذریعہ جدید شاعری اور اس کے قدردانوں کو لے ڈالنا کون مشکل تھا۔ اکثر لحاظ سے پنجاب اس مفروضہ نیچرل شاعری کا مرکز تھا۔ مولانا حالی مدظلہ' العالی کا وطن ایک حیثیت سے پنجاب ہی تھا۔ چودھری خوشی محمد وہیں کے پہاڑوں سے قدیم شاعری پر پتھر برسایا کرتے تھے۔ چنانچہ 'جھاڑو' 'ٹوپی' اور لنگوٹی پر وہیں کے اخباروں میں طبع آزمائیاں ہوتی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نیا ستارہ' اقبال کی صورت میں طلوع ہوا تھا جس کی روشنی میں تسخیر کا عمل تھا۔ علی گڑھ منتھلی میں ایک مضمون "اردو زبان پنجاب میں" کا چھپنا مولانا کے لئے بہانہ ہو گیا۔ مہینوں تک کوئی پرچہ نہ نکلتا تھا جس میں فسانہ آزاد کے خوجی کی طرح حسرت اور ان کے تابعین کی سروہی اور کٹار مولانا حالی اور اقبال پر نہ چلا کی۔ ان شیران میدان سخن پر تو خیر یہ کیا اثر کر سکتی تھی تاہم جھوٹے مقلدوں کے سراسیمہ اور حواس باختہ کرنے کو یہی کافی بلکہ اس سے بڑھ کر تھے۔

"کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسبِ معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔

ایک صبح حسرت دو دوستوں کو لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلّٰی کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔ حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کئے اور مولانا حالی کو مخاطب کرکے حسرت اور اردوئے معلّٰی کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور "واہ۔ خوب لکھا۔" کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں' ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے ارے مولانا یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہنا شروع کئے' سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا۔ اور جتنی جلدی اپنے قلم کو روکیں اتنا اچھا ہے۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا کہ "نکتہ چینی اصلاح زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔"

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

مگر ابھی "ہم آہنگی صدائے بلند ترین" کے لئے ایک ایسا وسیع میدان باقی تھا جس کے لئے حسرت کے پاس دل اور زبان کے سوا کوئی قابلیت نہ تھی۔ یہ میدان میدان پالٹیکس تھا۔

"حسرت نے نگاہ غور سے دیکھا تو ایک طرف کروڑ مسلمانوں کو آیہ "**اطیعوا اللہ واطیع الرسول الو الامر منکم**" کے اثر سے **صُمٌّ بُکْمٌ** پایا۔ وفاداری کا گنو سالہ جو علی گڑھ کے سامری کے ہاتھوں نے تیار کیا تھا ان کی توجہ کو کسی دوسری طرف ہٹنے بھی نہ دیا۔ ادھر ۲۱ کروڑ ہندوؤں کو دیکھا کہ بحر مواج کی تلاطم میں ہیں اور کانگریس کے شور کے سامنے صور اسرافیل کا شور طوطی کی صدا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی محافظین فرد سیاہ کا سلوک یاد آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا کنستر لیا اور کانگریس کے نقار خانے میں جا کر بجانا شروع کر دیا۔ چندے یہ حالت رہی کہ گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کی بینڈ ماسٹری سے انحراف کا وہم و گمان بھی نہ گزرتا تھا مگر آخر کار یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اپنی آوازوں میں بگل سے کام لیتے ہیں۔

"اتنا معلوم ہوتا تھا کہ فیروز شاہ اور گوکھلے بھی دشمنان ملک نظر آنے لگے۔ پال اور تلک نیستان آزادی کے شیروں کی چنگھاڑ نے دل و دماغ پر کشش یہاں تک کہ گنگا جمنا سے گزر کر وادی نیل بھی حکومت برطانیہ کو برا کہہ اٹھی۔ تعزیرات ہند نے ان کو بھی وہیں پہنچا دیا جہاں نیستان آزادی کے شیر کو۔

"کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس ذہین اور طباع' نیک دل اور وطن پرست شخص کی موجودہ مصیبت پر افسوس نہ کرتے ہوں۔ جب تک آزاد تھا پورے طور سے آزاد تھا۔ اب قید میں ہے مگر اس کا

دل و دماغ اور روح ویسی ہی آزاد ہے۔ ڈھائی برس کی قید شدید سے ڈیڑھ برس کی قید سخت رہ گئی ہے۔ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن خدا چاہے تو یہ مصیبت بھی اس پر آسان کر سکتا ہے۔"

۹— افغان باقی! کہسار باقی!

جنوری ۱۹۰۸ء میں یلدرم نے امیر یعقوب خاں سابق شاہ افغانستان کے اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے دہرہ دون میں نجف علی خاں[27] سے اپنے عہدے کا چارج لیا پولٹیکل ایجنٹ انگریز تھا۔ اس کا تعلق براہ راست برٹش فارن آفس سے تھا۔ اینگلو افغان جنگ اور امیر یعقوب خاں کی معزولی یلدرم کی پیدائش سے پہلے کے واقعات تھے[28]۔ مگر آج ایک ۲۷ سالہ نوجوان ان بوڑھے شیروں کا انچارج بنا کر دہرہ دون بھیجا گیا تھا۔ برطانیہ کا اقبال عجیب و غریب کرشمے دکھا رہا تھا۔

موسم گرما میں وہ قیدی فرزند کوہستان چند ماہ کے لئے مع اہل و عیال دہرہ دون سے مسوری منتقل کر دیا جاتا۔

مسوری میں اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کی سرکاری کوٹھی کا نام Bellevue بل ویو تھا۔ نیاز فتحپوری بہ سلسلہ ملازمت مسوری میں مقیم تھے۔ اتوار کا دن اکثر بل ویو گزارتے۔ چند روز کے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی مسوری آکر اس صحبت میں شریک رہے۔ نیاز صاحب:— "میرے مخصوص ادبی ذوق کو ابھارنے میں یلدرم کا بڑا ہاتھ تھا۔ رومانی افسانہ نگاری میں انکی حیثیت یقیناً ایک موجد کی سی ہے اور میری مقلد کی سی۔ سلطان حیدر جوش کا مقصد کچھ رہا ہو۔ لیکن تھے وہ یلدرم کے مقلد۔ میں مسوری ہی میں تھا کہ جوش کا ایک افسانہ مخزن میں شائع ہوا۔ جب یلدرم سے اس کا ذکر آیا تو وہ صرف یہ فقرہ کہہ کر خاموش ہو گئے "تعریف کی سب سے بچی شکل تقلید ہے۔"

دفتر کوٹھی میں تھا۔ یلدرم شاہی قیدیوں کے ساتھ گزارتے۔ شعر و شاعری پر گفتگو رہتی جس نے بیشتر اسلامی سلطنتوں کو اکھاڑا۔ بغداد کے جاندار انقلابی ماحول کے بعد یہ عجیب غیر حقیقی سا وقت تھا۔ امیر کابل کی کوٹھی کے نیچے کہرا نیلے پہاڑوں پر پھیل جاتا۔ شہر کے بل کھاتے ہوئے راستوں پر گیس کی روشنیاں ٹمٹماتیں۔ بارش ہوتی تو لاؤنج کے شیشے دھندلا جاتے۔ آتش دان میں آگ کی روشنی زیادہ تیز معلوم ہونے لگتی۔ دوست محمد خاں کا پوتا' جری اور غیور امیر شیر علی کا بیٹا یعقوب خان مسند پر نیم دراز اکثر دن بھر چپ چاپ دیوان حافظ پڑھا کرتا' یہی یعقوب خان اپنی جوانی میں سارے وسط ایشیا میں ایک باغی اور رومینٹک شہزادہ مشہور تھا جس کی دلاوری کے افسانے تھے۔ مگر لارڈ لٹن لارڈ سیلس بری اور جنرل رابرٹس زیادہ قوی نکلے۔

سہ پہر کو اندھیرا پڑے ہندی نوجوان تیز تیز ہلکے پھلکے قدموں سے زینہ چڑھتا اوپر آتا۔ امیر کا قلیان تازہ کیا جاتا۔ خشک میوے اور تازہ پھلوں کے طشت کشمیری تپائیوں پر رکھے ہوتے۔ نقرئی سماوار آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں جھلملاتا۔ بغیر دودھ کی چائے اور قہوے کے فنجانوں کا دور چلتا۔

ایک سردار سابق امیر کے سامنے شطرنج کی بساط پھیلاتا۔ ہاتھی دانت کے صندوقچے میں سے مہرے نکالے جاتے۔ یعقوب خاں اور ہندی نوجوان اپنی اپنی چال سوچنا شروع کر دیتے۔ اکثر سوچتے سوچتے بوڑھا بادشاہ عقابی نظروں سے دریچے سے باہر دیکھتا۔ حد نظر تک پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں کے آخری سلسلے کے اس پار مغرب میں افغانستان تھا۔ پختونوں کا دیس۔ خوشحال خاں کے اشعار اس وقت بعید صحیح معلوم ہوتے تھے۔ جلاوطنی کا اتنا بڑا ناقابل عبور فاصلہ۔ کوئی بادصبا' کوئی سحاب رواں وہاں سے کربناک یادوں کے علاوہ کوئی پیغام نہیں لا سکتے۔ جلال آباد' کابل' قندھار۔ اپنا وطن' دادا کا قلعہ۔ وہ ضیغم صفت دادا جس نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔

وہ نیم تاریک ایوان' روشن صحن' مٹی کی فصیلیں' سکھ اور برطانوی جنگوں کی یادگار ڈھالیں۔ زنگ خوردہ توپیں۔ ناکامی۔ مایوسی۔ شکست۔ چنار کے درختوں سے گھرے ان آبائی قلعوں کے نزدیک اب برطانوی فوجی میس جگمگا رہے تھے۔ ۱۸۸۰ء آج کی بات ہے۔ وہ سارا لرزہ خیز المیہ اکثر رات کو خواب میں دہرایا جاتا ہے۔ جنرل رابرٹس کی دہشتناک آمد' برطانوی فوج کی یلغار' گھوڑوں کی ٹاپیں' میدان جنگ میں اللہ اکبر کے نعرے۔ برطانوی کیمپ میں شکست کا عہد نامہ' کاغذات پر لرزتے ہاتھوں سے دستخط۔ اکثر پچھلے پہر کو زندانیوں کا کارواں درہ خیبر کی سمت رواں ہوتا ہے۔ اونٹوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے مسوری کی سڑکوں پر گھنٹیاں بجاتی رکشائیں گزر رہی ہیں۔

اٹھائیس سال گزر گئے جب انگریزوں نے دوست محمد کے دوسرے پوتے عبدالرحمان کو اپنا مطیع امیر کابل تسلیم کیا۔ اس وقت تک امیر بخارا' امیر خیوا' امیر خوقند سب کی چھٹی روسی جنرل کاف مین کر چکا تھا۔

برادر ایوب خاں نہ مانا۔ لڑتا رہا۔ انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اپنی خستہ حال فوج کے ساتھ بے جگری سے لڑا۔ اس کو بھی جنرل رابرٹس نے دھوکہ سے قید کیا۔

امیر عبدالرحمان خان کی وفات کو بھی سات دن ہو چکے۔ اخباروں میں چھپا ہے کہ حبیب اللہ خان کچھ اصلاحات نافذ کرنے میں مشغول ہے۔ "اصلاحات" کی ہوا سارے مشرق وسطیٰ میں چل پڑی ہے۔ پچھلے سال برخوردار حبیب اللہ خاں علی گڑھ کالج آیا تھا۔ انتہائی پرجوش استقبال اس کا کیا گیا۔ ہندی مسلمان مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر فدا ہوا جاتا ہے۔ مستقل افغانوں' ترکوں' عربوں اور ایرانیوں کا غم کھاتا ہے۔ ان کی ترقی سے خوش اور ان کی ناکامیوں سے پژمردہ ہوتا ہے۔ ان کے لئے روتا' مسجدوں میں دعائیں مانگتا اور چندے جمع کرتا ہے۔ عجیب بات ہے ہم مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں نے کبھی ان بے چاروں کے متعلق سوچا بھی نہیں۔

اس سعادت مند ہندی سید زادے نے اپنا تخلص ہی ترکی رکھ لیا ہے۔ جوش و مسرت سے ترک انقلاب کے قصے سناتا ہے۔ کہتا ہے۔ یہ ۱۹۰۸ء ترک انقلاب کا سال ہے۔ ابھی ۲۳ جولائی کو خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم نے نوجوان ترکوں کے مطالبات منظور کر لئے۔ دولت علیہ کے عوام کو دستوری

حقوق عطا فرمائے۔

دستوری حقوق کیا شے ہے؟ عجیب اصطلاحات نئی پود نے ایجاد کی ہیں۔ بہت خون خرابہ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ شاہ قاچار نے اپنی رعایا کو کچھ "حقوق" عطا کئے ہیں۔ برادر زادہ عبدالرحمن خان کابل میں انگریزی کالج کھول رہا ہے۔

شہ ....

کشت ....

مات ....

سردار عمر خاں عرض کرتے ہیں۔ خاصہ تیار ہے۔ انگریزوں کا پنشن خوار امیر' اللہ کا نام لے کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مسند سے اٹھتا ہے۔ دوسرے کمرے میں دسترخوان بچھا ہے۔ بھاپ اٹھتی ہوئی قابیں لا کر رکھی جاتی ہیں۔ افغان ہمیشہ سے جمہوری رہا ہے۔ دسترخوان پر بوڑھا بادشاہ' بھائی بھتیجے' رشتہ دار اور خدام ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ جس حال میں رکھے اس کا شکر ہے۔

افغان باقی! کہسار باقی!! الحکم للہ! الملک للہ!

۱۰— اپنے وخت کا ابدال

۲۹ اکتوبر ۱۹۰۷ء وفات جلال الدین حیدر۔ اعمالنامہ میں سر رضا علی: "وہ بڑے نامور کوتوال تھے۔ مجھے پہلی دفعہ ۱۹۰۰ء میں بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت تک سید جلال حیدر کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔ چھوٹے طبقے کی عورتیں ان کے گیت بھی گاتی تھیں۔"

(۱۹۰۰ء کتابت کی غلطی ہے) سید صاحب بنارس میں ۱۹۰۵ء تک رہے۔ اس زمانے میں لکھنؤ' بنارس' بریلی اور شاید مراد آباد (یا الٰہ آباد) قماربازی کے عظیم الشان اڈے تھے۔ ان کی آمدنی میں کوتوال شہر کا حصہ تھا۔ کوتوال بنارس کا حصہ سنا ہے ایک لاکھ سالانہ تھا۔

رنجیت سنگھ ہیڈ کانسٹبل جو مسلمان ہو کر رنجیت خاں کہلاتا تھا اور خان بہادر صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھا' ایک بار ہمارے ہاں لکھنؤ آیا۔ بوڑھا پھونس ہو چکا تھا۔ دوپہر کو نیم تلے کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا اور ہم نونہالان چمن کو دادا جان مرحوم کے محیرالعقول قصے سنایا کرتا۔

"اجی وہ کوئی بندہ بشر تھا اپنے وخت کا ابدال تھا!"

"ابدال کون ہوتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ بھی ہوتے ہیں۔ چپ رہو۔ ہاں رنجیت خاں پھر کیا ہوا؟" ایک کزن نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ابا جان نے گیند دور پھینک دی۔ پھر کیا ہوا؟ گیند گم ہو گئی تو ابا جان رونے لگے۔ پھر کیا ہوا؟"

"وس لونڈے نے ہاتھ بڑھایا۔ اتنا لمبا کہ وہیں کھڑے کھڑے اچک کر دوسرے گھاٹ پر سے گیند

اٹھالی۔ جن کا لونڈا تھا۔ دادا تمہارے سے قرآن پڑھنے آیا کرے تھا۔ بس اس دن کے بعد سے نہ آیا۔ تمہارے ابا چچا سب حیران کہ لونڈا جو روز آکران کے سنگ گیند کھیلے تھا کہاں کو غائب ہو گیا۔"

ہم سب دریائے حیرت میں غوطہ زن ہوئے۔ رنجیت خاں نے آنکھیں نیم وا کر کے کہنا شروع کیا' "اجی ان ہاتھوں سے اشرفیوں کی تھیلیاں چھن چھن کرتی ہم نے اٹھائی ہیں۔ کوتوال صاحب کے حکم سے سب واپس۔ قمار خانوں کا ایک لاکھ سالانہ ان کے نام بندھا تھا۔ اگر لیتے۔ مگر حق حلال کی کمائی ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ نوے روپے مہینہ تم سب کے ابا چچاؤں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیں تھے۔ ساٹھ روپے میں تنگی ترشی سے بسر کریں تھے۔ کوتوالی کیا تھی خانقاہ تھی۔"

"ایک لاکھ روپیہ کتنا ہوتا ہے رنجیت خاں؟" میں نے سوال کیا۔

"افوہ اگر دادا جان مرحوم لے لیا کرتے سال کے سال تو حساب لگاؤ ہم لوگوں کے حصے میں کتنی خطیر رقم آتیں۔ رؤسائے کرام ہوتے سب کے سب۔" ایک کزن نے کہا۔

"توبہ کرو میاں توبہ۔" رنجیت خاں نے غصے سے کہا' "دادا اولیاء اللہ اور پوتے کے خیالاتوں کا یہ حال۔ رشوت کی کمائی کی لالچ۔"

ہم سب منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"مہاراجہ بنارس ان مرحوم کا چیلا تھا۔ ہر تقریب میں پہلے ان کا ہاتھ لگواتا۔ ہندو کی بارات کوتوالی کے نیچے سے گزرتی۔ دولہا گھوڑے سے اتر کر پیدل چلتا۔ تعظیم کی خاطر۔"

درست۔ مگر وہ ایک لاکھ روپے والی بات زیادہ دلچسپ تھی۔

جلال الدین حیدر صاحب ۱۹۰۵ء میں بنارس سے ریٹائر ہوئے۔ رخصتی جلسے میں "پنڈتان بنارس نے بزبان سنسکرت قصائد پڑھے۔ عوام نے طشت ہائے زرین و نقرئی اور مہاراجہ بنارس نے بندوق گراں بہا و شمشیر با قبضہ طلا مع کمر پیچ مرصع و دیگر اشیاء نفیس نذر کیں۔"

(تذکرہ سادات نہٹور)

۱۸۰۵ء میں جب سنبھل کے باشندے سردار امیر خان نے مع "لشکر غارت گراں" نہٹور پر حملہ کیا' جان بچانے کے لئے اخوند سید امام بخش مع اپنی حاملہ بی بی اور بچوں کے محلہ سادات سے ایک میل دور جنگل میں مقبرہ مرزا مبارز خاں کے اندر جا چھپے تھے۔ وہیں رات کے وقت ان کے فرزند میر بندے علی پیدا ہوئے۔ عزیزو! زمانے کے داؤ پیچ دیکھو۔ اور فلک کی حقہ بازی۔ لارڈ لیک نے سردار امیر خان کو ریاست ٹونک کا نواب بنا دیا۔ ٹھیک سو سال بعد میر بندے علی کے بھتیجے اور داماد جلال الدین حیدر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی عملداری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ سردار امیر خاں کے پڑپوتے نواب ٹونک نے ان کی نیک نامی کی شہرت سن کر فوراً اپنے کنے بلا لیا۔ ریاست کا آئی۔ جی بنایا۔ خواص و عوام میں مقبول ہوئے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں سید صاحب کے متعدد چشم دید واقعات کشف و کرامات کے راوی ہیں۔

لیکن عمر نے وفا نہ کی۔

بیان سید محمد نونگی مرحوم' استاد بزرگ مدرسہ علی گڑھ:

"ان کی وفات کے وقت میری عمر نو یا دس برس کی تھی۔ صرف دو باتیں یاد ہیں۔ شاید ابتدائی سردی میں مغرب کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی وفات کی اطلاع دی اور کہا کہ مرحوم نے وصیت کی تھی کہ مولوی سید حیدر علی کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس لئے اجازت چاہیئے۔

"خبر سن کر گھر والوں پر سناٹا چھا گیا۔ بچے بوڑھے سب غمزدہ تھے۔ جیسے کوئی اپنا چلا گیا۔ شہر میں عوام و خواص مرحوم کے خلوص و نیکی اور نرم دلی کے واقعات بیان کرتے اور روتے۔ جنازے میں ہندو مسلمان ہزاروں شریک تھے۔

"۱۹۱۷ء میں سید الطاف حسین مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ چند لڑکوں کی حرکتوں سے سخت ناراض ہوئے۔ کلاس میں تقریباً دو گھنٹے اچھائی اور برائی پر لیکچر دیا۔ نیک لوگوں میں جلال الدین حیدر صاحب مرحوم کی مثال دی اور فرمایا کہ پولس کا محکمہ ظلم اور رشوت کے لئے بدنام ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولس خصوصاً بے رحمی کے لئے مشہور ہیں لیکن جلال الدین حیدر اپنی مثال آپ تھے۔ سزا سے زیادہ اصلاح کا خیال کرتے اور ڈنڈے کے بجائے نرم زبان استعمال کرتے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو سارے شہر ٹونک میں کہرام تھا۔ بیوائیں' یتیم' غریب' بوڑھے' لاوارث اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے کہ جیسے ان کا بزرگ اٹھ گیا۔ سید صاحب مرحوم کی شرافت مری نہیں زندہ ہے۔ شریفوں کی شرافت زندہ رہتی ہے اور دوسروں کو شریف بناتی ہے۔"

مراد آباد پولس ٹریننگ اسکول میں سید صاحب کی تصویر لگی تھی اور ان کے کارنامے بطور اسباق پڑھائے جاتے تھے۔ مرحوم کے اندر غالباً کسی پرکھ ولی اللہ کی روحانیت عود کر آئی تھی۔ جیسا کہ اس تذکرہ کے آغاز میں واضح کیا گیا پہلے ہمارے ہاں صرف فقراء پیدا ہوا کرتے تھے۔ عادت ان کی یہ تھی جھولا لٹکا' ڈنڈا سنبھال' کھڑاؤں پہن' چل کھڑے ہوئے۔ جہاں موقع ملا کھڑے ہو کر آج کے عیسائی پادریوں کی طرح تبلیغ شروع کر دی۔ اور دن رات وظیفے پر وظیفے۔ چلّے۔ روزے۔ گذر اوقات کا ذریعہ فتوح یعنی بن مانگا نذرانہ جو لوگ دے دیں۔ شاہی حکام اور امراء سے اجتناب۔ فتوح میں سے جو بچا اسے تقسیم کرنا واجب۔

کبھی کبھی بادشاہ وقت بنجر زمینوں پر کاشت کی اجازت دے دیتا تھا۔ پوچھو بنجر زمین پر کاشت ہو سکے ہے؟ اسی قطع سے جد بزرگ میر کمال الدین ترمذی' ترمذ کی سہروردی مشنری ٹریننگ سنٹر سے فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ان کی اولاد میں چند پشتوں تک فقیری چلی۔ جب درگاہیں بنیں' فقیری [30] سرمایہ داری میں تبدیل ہوئی یا ان کی اولاد سلاطین کی حاشیہ بردار ہوئی۔ جاگیریں ملیں۔ گویا پیری کی برکت سے میری پائی۔

آخر میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے یا کمیونسٹ۔

اگر اپنے اجداد کی تصانیف ملفوظات کمالیہ [31] اور الدر المنظوم [32] کو غور سے پڑھتے یہ نوبت نہ

آتی جو اس وقت ہے۔

لیکن جلال الدین صاحب اپنی نیکی اور شرافت میں منفرد نہ تھے۔ اس معاشرے پر مذہب' روحانی اور اخلاقی اقدار کا گہرا اثر بھی باقی تھا۔ عموماً مسلمان ایمان دار اور ہندو دھرم کرم کے پابند ہوتے تھے۔ کردار کا کرائسس دور حاضرہ خصوصاً آزادی کے بعد کے حالات کی دین ہے۔

مرحوم کا ترکہ:۔ نہٹور میں ایک دو منزلہ مکان' غدر کی ضبطی سے بچی کچھ اراضی' فقط پانچ سو روپیہ نقد اور بیٹوں کے لئے ایک عدد نصیحت نامہ۔

چاروں لڑکے ("ہمارے چار گاؤں") برسر روزگار تھے۔ سید اعجاز حیدر متاہل تھے۔ میاں نصیر کی نسبت پھوپھی کی لڑکی وحیدہ بیگم سے ہو گئی۔ سب سے چھوٹے میاں وحید کا بیاہ اپنے ماموں سید اکرام حیدر ترمذی کی لڑکی سے ہو چکا تھا۔ میاں سجاد سمندر پار ہو آئے تھے اور شادی کو منع کریں تھے۔ اب ادھر سننے میں آرہا ہے کہ ایک انگریزی پڑھی لکھی لڑکی جو اخباروں تک میں چھپے ہے لوگ باگ اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ ونکا خاندان ہے تو کھرا سید یو۔ پی کا' مگر ہیں شیعہ' اور رہویں ہیں کالے کوسوں دور صوبہ سرحد میں۔ اب پتہ نہیں وہاں کے نقشے کیا ہیں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا میاں۔

حوالہ جات

1- آپ بیتی از میر ولایت حسین ۱۹۱۹ء میں خطرناک انقلابی راجہ مہندر پرتاب سنگھ رئیس ہاتھرس نے کابل میں "آزاد ہندوستانی حکومت" قائم کی۔ ماسکو جاکر لینن سے ملے وغیرہ۔ ابھی حیات ہیں۔ دہرہ دون میں رہتے ہیں۔

2- ڈاکٹر سید محمود

3- حسرت موہانی

4- مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے "اودھ اخبار" میں انگریزی مختصر افسانوں کے تراجم شائع ہوئے اور بعد میں خود ان کے رسالے "معارف" میں جس میں سید سجاد حیدر نے کچھ افسانے لکھے۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح دنیائے مغرب میں پو کو مختصر افسانہ نویسی کا موجد کہا گیا ہے۔ سید سجاد حیدر اردو زبان میں طرز جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں (شمس العلماء تاجور نجیب آبادی)

5- دیکھو جیسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا۔ بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجیے (اکبر الہ آبادی)

6- عطیہ فیضی

7- "میرے احباب" از سر عبدالقادر۔ لاہور سے براڈ کاسٹ ۱۹۴۹ء مطبوعہ "آہنگ" ریڈیو پاکستان کراچی۔

8- مشتاق احمد زاہدی کے ایک مضمون سے اقتباس

9- محمد مقتدی خاں شیروانی کے بارے مضمون سے اقتباس

10- سوانح عمری عبداللہ بیگم "از شیخ محمد عبداللہ مرحوم طبع ثانی باہتمام و نگرانی محمد مقوعرفی خاں شیروانی۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء

11- مدرسہ نسواں (علی گڑھ) ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا۔

12- مشتاق احمد زاہدی کے مضمون سے اقتباس۔

13- یلدرم کے ایک مضمون سے اقتباس

14- سلسلہ ہمالیہ

15- روہیلکھنڈ کا شمالی علاقہ

16- امپیریل حکومت ترکیہ کے لئے یورپین اصطلاح Sublime Porte

17- زندہ باد

18- "مشاہدات بلاد اسلامیہ" از محمودہ عثمان حیدر "ادارہ علم مجلسی" کراچی نے ۱۹۶۲ء میں دوبارہ شائع کی ہے۔

19- "ناول نویسی"۔ از سید سجاد حیدر۔ متعلم بی۔ اے کلاس۔ معارف۔ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء (طویل مقالے کے اقتباسات)

20- "سید سجاد حیدر یلدرم" از پطرس بخاری روزنامہ اسٹیٹسمین مئی ۴۳ء (تلخیص)

21- سید سلیمان ندوی

22- مشتاق احمد زاہدی کے ایک مضمون سے اقتباس

23- شاہد رعنا بھی رسوا کی امراؤ جان ادا سے پہلے کا لکھا ہوا ناول ہے۔

24- انڈین پولٹیکل ڈپارٹمنٹ۔ اس محکمے میں یلدرم کے دوست بچلرز لاج والے خان بہادر انعام الحق دہلوی مرحوم اور مرزا سکندر علی بیگ بھی ملازم تھے۔ موخر الذکر جنرل اسکندر مرزا کے نام سے چند سال پاکستان کے گورنر جنرل رہے۔

25- مشتاق احمد زاہدی کے مضمون سے اقتباس

26- یہ مضمون ستمبر ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا تھا۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اکبر علی خاں عرشی زادہ کو دیا جو انہوں نے نگار۔ رامپور جنوری ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

27- نجف علی خاں جالندھر کے باشندے تھے۔ ان کی نواسی روح افزا سجاد حیدر عصمت کی مضمون نگار ہیں۔ سجاد حیدر صاحب پاکستان فارن سروس کے سینئر ڈپلومیٹ ہیں۔ کچھ عرصہ نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں۔

28- نومبر ۱۸۷۸ء میں برطانیہ نے افغانستان پر حملہ کیا۔ امیر شیر علی کابل سے فرار ہوئے۔ ان کے فرزند اور جانشین امیر یعقوب خاں کو شکست کے عہد نامے پر دستخط کرنے پڑے۔ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کابل میں برطانوی پولٹیکل افسر اور برطانوی مشن کو قتل کیا گیا اور امیر یعقوب خاں کے بھائی ایوب خاں نے قندھار میں برطانوی فوج کو شکست فاش دی۔ جواباً جنرل رابرٹس نے قندھار مارچ کر کے افغان فوج کو تہ تیغ کیا۔ امیر یعقوب خاں اور ایوب خاں مع خاندان ہندوستان جلا وطن کیے گئے۔

29- کابل میں دو بھائی رہتے تھے جن کا رسوخ دربار شاہی میں تھا۔ جنگ جاری تھی۔ وہ دعوت کے بہانے امیر یعقوب خاں کو انگریزی کیمپ میں لے آئے۔ امیر دوبارہ اپنے کیمپ میں واپس نہ جا سکے۔ انگریزوں نے زبردستی صلح نامہ پر دستخط کروائے اور قید کر کے ہندوستان بھیج دیا۔ دوسری مرتبہ بھی ان دونوں بھائیوں نے یہی چالاکی سردار ایوب خاں کے ساتھ کی۔ بعد ازاں انگریزی فوج کے ہمراہ دونوں بھائی ہندوستان آگئے جہاں برٹش گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے صلے میں جاگیر عطا کی۔ جب انہوں نے اور زمین مانگی لفٹنٹ گورنر پنجاب نے کہا غداری کا انعام یہ کیا کم ہے جو اور مانگتے ہو۔ میر قاسم علی نے جو سو مربع ان کو دیے جا رہے تھے ان دونوں بھائیوں کو دلوا دیے۔ (فصل دوئم باب ۶ "راوی") یعقوب خاں دہرہ دون اور ایوب خاں لاہور میں نظر بند

کئے گئے۔ جب ایک مرتبہ دونوں غدار بھائی ان سے ملنے گئے سردار ایوب خاں نے اندر سے کہلوا دیا کہ دونوں کو خبردار کر دو۔ آئندہ نہ آئیں نہ میری کوٹھی کے سامنے سے گزریں گولی مار دوں گا۔"

(میجر سید آل حسنین مرحوم کے ایک خط سے اقتباس)

30- جلال الدین سرخ بخاریؒ اور مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بخاری کے سجادہ نشین (اوچھ شریف بھاولپور) پاکستان کے متمول ترین خاندانوں میں شامل ہیں۔ نام کے آگے بادشاہوں کی طرح اول۔ ثانی۔ ثالث۔ رابع وغیرہ لکھتے ہیں۔

31- ملفوظات سید کمال الدین ترمذیؒ۔

32- ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

فصل چہارم

ا—فلائینگ آفریدی

نوشہرہ چھاؤنی ضلع پشاور میں دریائے کابل کے کنارے واقع ہے۔ یہ سرد اور پر فضا خطہ عمرانی لحاظ سے افغانستان و توران سے قریب اور وادی گنگ و جمن سے اتنا دور ہے کہ شمال مغرب کے چاق و چوبند قوی ہیکل باشندے ستلج پار کے باسیوں کو "کالے ہندوستانی" اور "پوربیے" کہتے ہیں۔ فرحت بخش ہوائیں' ترکستانی اونٹوں کے قافلے' سرد چشمے' برف پوش پہاڑ' آسمان پر اڑتے باز۔ ہمیں ضرور جاننا چاہئے کہ اقبال نے اپنی امیجری کہاں سے حاصل کی۔

ہر سمت وہ میدان کار زار پھیلے ہیں جہاں سو سال سے شاہین صفت افغان اور پختون برطانوی افواج کا مقابلہ کر رہا ہے۔ مردان۔ درہ ملاکند۔ علی مسجد۔ سفید کوہ۔

درۂ خیبر کے اس پار سبزوار' دشت لیلیٰ' ناد علی' چہل زینہ' دلآرام' شہر بہلول' بالا مرغاب' قزل قلعہ' تخت زال' وادی سرخاب' شہر ضحاک' وادی پنج شیر' کوہ پہلوان' شہر غلغلہ۔ افغانستان کے شہروں اور وادیوں کے نام کس قدر افسانوی ہیں۔

افغانوں اور انگریزوں نے خون کے کئی دریائے سرخاب یہاں بہائے۔ ملاکنڈ' چک درہ' اٹک' قلعہ جمرود پشاور کے بازار قصہ خوانی میں بخارا اور سمرقند اور قندھار اور جلال آباد اور کاشغر اور مشہد سے کارواں اب بھی اترتے ہیں۔ چاء خانوں میں سماوار گرم کئے جاتے ہیں۔

موسم سرما میں پوندے اپنے گلے لیکر پہاڑوں سے اترتے ہیں اور صوبہ سرحد کی وادیوں میں بکھر جاتے ہیں۔ ماہ مارچ میں اچانک بہار آجاتی ہے۔

صوبہ سرحد کی چھاؤنیاں اپنی خوبصورتی اور شادابی کے لئے ساری برٹش ایمپائر میں مشہور ہیں۔ صاحب اپنی جان ہتھیلی پر لئے ان قلعہ بند بنگلوں میں بیٹھا ہے مگر باغبانی اور حسن کاری سے باز نہیں آتا۔

لیکن نوشہرہ چھاؤنی کے اندر کھپریل کی ڈھلوان چھتوں اور نازک کھمبوں والے بنگلوں میں سے ایک کے پھاٹک پر S.N.Bakar کی جو تختی چمک رہی ہے' کسی انگریز کا نام ہرگز نہیں۔ امام باڑہ لاکڑی ضلع مراد آباد کے ذاکر آغا کربلائی اگر زندہ ہوتے تو آپ کو بتاتے کہ یہ سید نذر الباقر رضوی کے انگریزی بجے ہیں اور ان ہی کی پردہ نشین صاحبزادی "مس نذر الباقر" نے عصری اردو ادب کے بازار قصہ خوانی سے ملحق ایک شہر غلغلہ آباد کیا ہے۔

چپراسی دریا پار سے ڈاک لے کر روز صبح گیارہ بجے مسز باقر کے بنگلے پر پہنچتا ہے۔ نو عمر سیالکوٹی ملازم غلام حسین پلندہ لے کر اندر جاتا ہے۔ زمانے کے عمر عیار نے نیا کرشمہ دکھایا ہے۔ اس زنبیل میں سے ایڈیٹروں کے خطوط برآمد ہوتے ہیں اور رسالوں کے پیکٹ۔ مخزن' الناظر' البشیر' پیسہ اخبار' تہذیب

نسواں، تمدن، شریف بی بی، خاتون، مس نذر الباقر جو پچھلے برآمدے میں بیٹھی یوریشین میم کا دیا ہوا "ہوم ورک" کر رہی ہیں، ایک لفافہ کھولتی ہیں:-

جناب بیگم صاحبہ تسلیم!

اس ایک ماہ کے عرصے میں ہم کو "خاتون" کے دو تین پرچے تیار کرنے ہیں کیونکہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ "خاتون" اب وقت پر نکلا کرے۔ اس لئے آپ کے پاس لکھتے ہیں کہ آپ کوئی عمدہ اور بڑا مضمون بھیج کر اس کام میں ہماری امداد فرمائیں۔ آپ کی آنکھوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تکلیف نازیبا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اس تکلیف دہی کو آپ معاف فرمائیں گی۔

مورخہ ۷ مئی ۷ء

بخدمت بنت نذر الباقر صاحبہ
نوشہرہ چھاؤنی

فقط نیاز مند
شیخ محمد عبداللہ
ایڈیٹر "خاتون" علی گڑھ

اب ہم مس نذر الباقر کی ڈاک یہیں چھوڑ کر سینما لینٹرن کے ذریعے ۱۸۷۵ء کے سیالکوٹ کا ایک بہترین سین بیزیوں والا بائیسکوپ لیڈیز اور جنٹلمین کو دکھلاتے اور لنگو فون آلے کے ذریعے گم شدہ آوازیں سنواتے ہیں۔

سینئے۔ مسز ایس این بیکر کے پردادا میر معصوم علی چکلہ [1] دار اودھ کے بیٹے خان بہادر میر قائم علی سی آئی ای کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف [2] سے اجازت تھی کہ سارے صوبے میں بے شک جس جگہ چاہیں اپنا اجلاس کریں۔ جس وقت آپ نے بمقام گورداسپور [3] ۱۸۷۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا فرزند ان کے میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے۔ (تحصیلدار اس زمانے میں میونسپلٹی کا چیئرمین ہوتا تھا، انکم ٹیکس لگاتا تھا اور مجسٹریٹ درجہ اول کا کام کرتا تھا)۔

قدیم اسلامی مدارس اور خانقاہوں کا یہ شہر اس گئے گزرے زمانے میں مردم خیز تھا۔

شمس العلماء مولوی میر حسن اور ایک کشمیری نژاد صوفی منش بزرگ شیخ نور محمد ایک چودھری [4] صاحب جن کے آباء سکھ سے مسلمان ہوئے تھے اور خواجہ غلام حاضر کے بزرگ جو چاء خانے اور سرائے کے مالک تھے میر صاحب کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ شیخ نور محمد کا فرزند محمد اقبال میر صاحب کے فرزند اصغر میر ظہور حسنین کا ہم عمر تھا۔ میر صاحب کے تینوں لڑکے فیض العسکری، نذر الباقر اور ظہور حسنین مع اقبال "بستے اٹھائے روز صبح اسکاچ مشن اسکول کا رخ کرتے اور پادریوں سے انگریزی اور میر حسن سے عربی فارسی پڑھتے۔ شیخ نور محمد میر مظہر علی کے ہاں بھی پارچہ دوزی کرتے تھے۔

میر فیض العسکری (ولادت ۱۸۵۸ء) سادات لانگڑی کے پہلے نوجوان تھے جنہوں نے انٹرنس پاس کیا۔ بعد ازاں تحصیل دار "لگ" گئے۔ میر نذر الباقر نے آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ سیالکوٹ چھاؤنی

میں سپلائی ایجنٹ کا کام شروع کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں میر ظہور حسنین انٹرنس کے بعد مدرستہ العلوم روانہ کئے گئے شیخ محمد اقبال اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے کر کے لاہور آگئے۔ اس کے بعد پڑھتے ہی چلے گئے۔ بے حد پڑھا۔

میر مظہر علی کے گھرانے والے "پنجاب کے ہندوستانی" ہیں۔ آج ۱۹۰۷ء میں نصف صدی ہونے کو آئی یہاں قیام ہے مگر کیا مجال ایک لفظ پنجابی کا زبان پر آجائے۔ بیبیاں بدستور گھر سواں فرشی پائجامے پہنتی ہیں۔ یہ صوبہ ہنوز "پردیس" ہے۔ اولاد کی شادیاں کنبے میں ہوتی ہیں اور دوسری اہم نجی تقاریب کی طرح مراد آباد جا کر منعقد کی جاتی ہیں۔ وہیں میر مظہر علی کی سالی اشرف جہاں بیگم کی لڑکیاں مرتضائی اور مصطفائی میر فیض العسکری اور میر نذر الباقر سے بیاہی گئیں۔ ان لڑکیوں کے بھائی میر فضل علی کا عقد میر مظہر علی کی اکلوتی بیٹی کنیز عباس عرف اکبری بیگم سے ہوا۔

اشرف جہاں بیگم کے شوہر میر مہدی علی قصور ضلع سیالکوٹ میں تھانیدار تھے۔ بعد میں کوتوال شہر لاہور۔ سیالکوٹ میں مصطفائی بیگم اور نذر الباقر کی لڑکی نذر زہرا بیگم ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئیں۔ میاں نذر الباقر فوجی کسریٹ ایجنٹ، فلائنگ آفریدی بنے۔ جگہ جگہ اڑے پھرتے تھے۔ مصطفائی بیگم سیالکوٹ میں ساس سسر کے پاس رہتیں۔ میر مظہر علی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاڈلی تین سالہ پوتی نذر زہرا کو شیخ نور محمد کا سیا ہوا سرخ ریشمی برقعہ اڑھا گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھلاتے اور صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہوا ہو جاتے۔ ماہر شہسوار تھے لیکن اجل بھی گھوڑے پر آئی۔ سیالکوٹ سے ملتان تبادلہ ہوا۔ ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے۔ ایک روز تحصیل لودھراں میں گھوڑا اڑاتے ایک سائیں سائیں کرتے جنگل سے گزر رہے تھے۔ ایک جاٹ سکھ نے، جو کسی مقدمے کی وجہ سے دشمن ہو گیا تھا، درخت کی آڑ سے بندوق چلا دی۔ گولی سر میں لگی۔ زمین پر گرتے ہی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ قصبہ لودھراں میں دفن کئے گئے۔ ۱۸۳۸ء میں بعد محمد علی شاہ بادشاہ اودھ شہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ مٹی کہاں سے کہاں کھینچ لے گئی۔

ملتان اس برصغیر کا سب سے بڑا گورستان اور قبر پرستی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ سوئم کے روز میر صاحب مرحوم و مغفور کے مرقد پر پر اسرار شکلوں والے قلندر چلم پیتے آن بیٹھے۔ ہفتے بھر میں باضابطہ تکیہ قائم ہو گیا۔ شاہ صاحب خلد آشیاں کی کرامات کا تذکرہ شروع ہوا۔ قبر پر سبز جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ سرہانے بیری کی ٹہنیوں میں دھجیاں اور کلاوے بندھ گئے۔ والد ماجد میر قائم علی شاہ سی آئی ای کے مزار پر بمقام گورداسپور برسوں سے سالانہ عرس ہو رہا تھا۔ لودھراں ضلع ملتان میں "مظہر علی شاہ پیر" کے مدفن پر جمعرات کی جمعرات قوالیاں شروع ہو گئیں۔

والد کی وفات کے وقت میر نذر الباقر سیالکوٹ چھاؤنی میں Vitling Agent تھے۔ فوجی گوداموں سے رسد فراہم کر کے سپلائی یونٹ کو روانہ کرتے تھے۔ طبیعت دار نوجوان تھے۔ بے تحاشا روپیہ کماتے اور اڑاتے چند سال بعد سیالکوٹ سے صوبہ سرحد پہنچے۔ ہندوستان کی اہم ترین چھاؤنیاں اسی پر خطر

علاقے میں واقع تھیں۔ حکومت برطانیہ کے لئے "سنٹرل ایشین کوئسچن" کا یہ نازک ترین دور تھا۔ جیحوں پار روسی ریچھ غراتا تھا۔ سرحدی پٹھان اونٹوں کے ذریعے امیر کابل حبیب اللہ خان کی امداد کے لئے خانہ ساز بندوقیں اسمگل کرنے میں مصروف تھے۔ ملا سرتوڑ فقیر اعلان جہاد کر چکے تھے۔ چھاؤنیوں کے طعام خانوں میں جنرل رابرٹ کی روغنی تصاویر کے نیچے کھڑے ہو کر فتح کے جام لنڈھانے کے بعد انگریز افسر پختونوں کا مقابلہ کرنے نکلتے اور گرجا گھروں میں لگی مقتولین کے ناموں کی برنجی تختیوں میں اضافہ کرتے۔ جاہل سر پھرے ایماندار مجاہدوں سے مقابلہ تھا جو میدان جنگ میں جاتے وقت اپنے گھر کا سارا اثاثہ بطور امانت کسی پیر کے مزار پر رکھ جاتے اور اسے کوئی نہ چراتا۔

مسلح گوروں سے لدی "فلائنگ آفریدی" ٹرین جمرود اور پشاور کے درمیان بھک بھک دھواں اڑاتی چلتی رہتی تھی۔

میر نذر الباقر خالصہ فوج والے اپنے بزرگ کرنل نور الدین شاہ[5] کی مانند ایک مہم جو اور جری انسان تھے۔ گورے چٹے، بلند قامت، وجیہہ، مورث اعلیٰ نیشاپور سے سو برس قبل آئے تھے لیکن میر صاحب چہرے مہرے سے ہنوز خراسانی آغا معلوم ہوتے تھے۔ پشتو اور افغان فارسی اور پنجابی میں برق، نفیس انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ ہندو مسلمان سکھ اور انگریزوں کا وسیع حلقہ احباب رکھتے تھے۔

۱۸۹۸ء میں ادھر دور دراز چین میں جنگ باکسر چھڑی۔ ادھر نوشہرہ چھاؤنی میں طبل جنگ بجا۔ بی بی بچوں کو برادر بزرگ میر فیض العسکری کے پاس تحصیل پنڈدادن خان ضلع جہلم پہنچا کر میر صاحب امام ضامن کی ضامنی اور گوڈسپیو دی کوئن کی گت پر رائل انڈین سپلائی کور کے ہمراہ عازم کینٹن ہوئے۔ سال بھر بعد بیش بہا نوادر کا انبار ساتھ لے کر واپس آئے۔ قدیم چینی تصاویر، جیڈ کے ظروف، منقش چوبی صندوق، اطلس کے پردے اور لبادے اور سیاہ بانات کی ایک وسیع اسکرین جس پر کارچوب سے قد آدم چینی کڑھے تھے۔

میر صاحب کی دریا دلی اور شاہ خرچی ضرب المثل بن چکی تھی۔ چینی تحائف کا بیشتر حصہ دوستوں میں بانٹ کر کچھ عرصہ بعد بوئر جنگ کے لئے جنوبی افریقہ روانہ ہوئے۔ وہاں سے آ کر بسلسلہ لوشائی برما۔

میر صاحب کے جود و سخا نے آفت مچا رکھی تھی۔ نصف صدی بعد راقم الحروف نے ایک شناسا کے ہاں لاہور میں ایک طویل و عریض ایرانی قالین دیکھا۔ انہوں نے بر سبیل تذکرہ بتلایا کہ ان کے والد کو کوئی خان بہادر نذر الباقر صاحب صوبہ سرحد میں تھے انہوں نے تحفتاً دیا تھا۔

چینی اسکرین نہ جانے کس طرح بچ گئی۔ اماں بتاتی تھیں کہ کوہاٹ کے بنگلے میں ڈرائنگ روم کے ایک سرے پر کھڑی رہتی تھی۔ اس کے مقابل میں آتش دان کے اوپر میر قائم علی کی رنگین تصویر آویزاں تھی جس میں وہ باضابطہ لکھنؤ کے شاہی زمانے کا لباس پہنے بیٹھے تھے۔ لاہور کے کسی فرنگی مصور نے بنائی تھی۔ مینٹل پیس کے وسط میں میر مظہر علی کا فوٹوگراف تھا جس میں وہ دوپلی ٹوپی، انگرکھے اور بیحد چوڑے عرض کے پائجامے میں جلوہ افروز تھے۔ دائیں جانب ان کے فرزند اکبر میر فیض العسکری طرے دار سرحدی صافہ، کلاہ، شلوار، فراک کوٹ کے ساتھ ٹائی باندھے کھڑے تھے۔ بائیں جانب میر نذر الباقر انگریزی فوجی وردی میں اور میر ظہور حسنین ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے یونیفارم میں۔ یہ پانچ تصویریں گویا تین نسلوں کی تہذیبی تاریخ کی عکاس تھیں۔

وہ نادر چینی اسکرین دہرہ دون تک ہمارے یہاں موجود تھی۔ بانات میں کیڑوں نے سوراخ کر دیئے تھے لیکن کارچوبی چینی اس طرح چٹیاں لٹکائے مونچھیں جھکائے آستینوں میں ہاتھ دیئے کنفیوشس کے فلسفے میں مستغرق تھے۔ اماں اکثر کہا کرتی تھیں "فلاں چیز جو پاپا چین سے لائے تھے" یا "جب پاپا چین گئے تھے"۔

پاپا پیدائشی روشن خیال تھے۔ ایک عدد یوریشین بڑھیا میم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ملازم رکھی تھی۔ بڑی لڑکی نذر زہراء کو ڈاکٹری پڑھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بہن ان کی اکبری بیگم غیر معمولی طور پر ذہین اور لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتی تھیں۔ مگر لکھیں تو چھپوائیں کہاں۔ زنانہ تحریر اور نام تک کا پردہ تھا۔ میر صاحب نے ان سے کہا، "بھینا، تم فکر نہ کرو، اس کا بھی بندوبست کرتا ہوں"۔ لاہور سے اخبار تہذیب نسواں جاری ہو چکا تھا۔ اس کے ناشر مولوی سید ممتاز علی کو خط لکھ کر بہن کے نام پرچہ جاری کروالیا۔ اکبری بیگم کی عید ہو گئی۔

اکبری بیگم کے شوہر میر فضل علی لاہور میں سرکاری ملازم تھے۔ دیور تفضل علی لاہور میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے۔ پنجابی مہم پسندی اور اولوالعزمی کی وجہ سے لاہور نے دلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں جدیدیت زیادہ سرعت سے قبول کی تھی۔ کالجوں، ادیبوں اور صحافیوں کا نیا مرکز بن چکا تھا۔

کہاں بے چارہ مراد آباد جو یادش بخیر صوبیدار رستم خاں اور سید بڑے کے عہد سے چند سال ہی آگے بڑھا تھا۔

۱۹۰۳ء میں میر نذر الباقر، مصطفائی بیگم، اکبری بیگم، میر فضل علی اور سارا کنبہ ایک بار پھر وطن پہنچا جہاں اکبری اور میر فضل علی کے پانچ سالہ بچے میر افضل علی کی سنتوں کی تقریب منائی جانے والی تھی۔

۴۔ محل سرا

میر قائم علی کے پرنواسے میر مہدی علی کے پوتے میر فضل علی کے سپوت جائے میر افضل علی کی سنتوں کی تقریب کے لئے نائی نائین محلے محلے "نویل[6]" پھیر آئے۔ سقے نے کلاوے میں آم کے پتے پرو کر قائم علی کی "محل سرا" کے صدر دروازے پر بندھروار باندھے۔ سامنے چوک میں کاشی پور کے نامی بھانڈ اور نقال جمع تھے۔ ڈیوڑھی پر چوپہلے، پالکیاں، ڈولیاں لالا کر رکھی جا رہی تھیں۔ اندر صحن میں کلاونت بچیاں[7] گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔ لڑکیاں۔ بالیاں اہلی گہلی پھرتی تھیں۔ صدر دالان میں رشتے دار بیبیاں پنجاب سے آئی ہوئی مہمانوں کو حیرت سے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرنے میں مشغول تھیں۔

"مصطفائی بھابی کی لونڈیوں نے جو پہن رکھا ہے، کیا کہلاوے ہے؟"

"گون اور جاکٹ۔"

"بال چھکائے ہوڑنیاں جیسی"۔

"کنواری بالیاں مانگ کاڑھنے لگیں۔"

"برقندازوں کی طرح کمر کس کے پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"

"پردیس میں رہ کر کرستان ہو گئے۔"

باہر کچھ فاصلے پر صوبیدار رستم خاں کی مسجد سے متصل میر قائم علی کی کوٹھی میں مردانہ تھا۔ بار بار شور مچا۔ بھائی فلاں آ گئے۔ چچا میاں تشریف لائے۔ اخاہ کنور صاحب۔ مزاج شریف۔

پھاٹک پر بگھیوں کا ہجوم۔ ایک راجہ صاحب باقاعدہ ہاتھی پر چڑھ کر آئے تھے۔

محل سرا کی ڈیوڑھی پر محمود پور کا ہاتھی کھڑا کان پھٹپھٹا رہا تھا۔ افضل میاں کی سواری کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ملازم اور محلے کے فالتو لونڈے لارے شور مچا رہے تھے۔ اے میاں شہزادے، چلے آتے ہو منہ اٹھائے، دیکھ کے چلو پیارے۔

اماں دیکھ رہا ہوں کیا نقشے ہو رہے ہیں۔

سید خاں کے گھر سے سواریاں آ گئیں۔ اتروالو۔

پیر غیب والے آ گئے۔

تکیہ گل شہید۔ قاضی کے آملی۔

اتنے میں غل مچا۔ محمود پور والے آ گئے۔

نواب سید محمد علی خاں کی بگھی کوٹھی کے پھاٹک پر رکی۔ پیادوں اور بلم برداروں کے جلو میں بہلیاں آگے بڑھ کر محل سرا کی ڈیوڑھی سے لگ گئیں۔ بال بال گج موتی پروئے نواب صاحب کی بیٹیاں ولایتی بیگم، حیدری بیگم صدر دالان میں داخل ہوئیں۔ بارہ سالہ نذر زہرا تصویر حیرت بنی۔ ان مغل تصاویر جیسی بہنوں اور بھاوجوں کو دیکھا جن کے باپ اور شوہر کچھ عرصہ قبل تک اپنے علاقے کے مجرموں کو سزائے موت دینے کا استحقاق رکھتے تھے۔ (ہاں بیٹا ملکہ نے ہمیں ایک خون معاف کر رکھا تھا۔ ایک روز حیدری بھابی نے بنوبی کو بتایا)۔ شہر مراد آباد گھسٹ گھسٹا کر انیسویں صدی تک آ پہنچا تھا۔ دوسرے رجواڑوں کی مانند محمود پور ابھی بڑے اطمینان سے اٹھارویں صدی میں موجود تھا۔

رات گئے سید محمد علی خاں کے دونوں پھوپی زاد بھائی ڈپٹی آل نبی اور نذر الباقر اندر آئے۔ اپنے چچا زاد بھائی آل نبی کو دیکھ کر اکبری بیگم کو اس غیر حقیقی ماحول میں اچانک بڑی تقویت سی محسوس ہوئی۔ سارے خاندان میں صرف وہی اکبری بیگم اور نذر الباقر کے ہم خیال تھے۔ ایک بوڑھا پھونس انگریز مشنری ٹیوشن کے لئے ملازم رکھا تھا جو پردے کے پیچھے سے ان کی اکلوتی بیٹی آل زہرا کو انگریزی پڑھاتا تھا۔ آل زہرا کا بیاہ اکبری بیگم کے علی گڑھ والے بھائی ظہور حسنین سے ہوا تھا۔ بے حد حسین اور نند سے کم ذہین نہ تھیں۔ طب بھی پڑھ رہی تھیں۔

نذر زہرا اور ثروت یعنی بنوبی پہلی بار پنجاب سے مراد آباد آئی تھیں۔ جب اسٹیشن سے محل سرا پہنچیں، سامنے ہی صحنچی میں آل زہرا چچی بالکل پری بنی ہیرا کنی کا دوپٹہ اوڑھے پلنگڑی پر بیٹھی بلیک ووڈ میگزین پڑھ رہی تھیں۔

تقریب میں پانی کی طرح روپیہ بہا۔ اکبری بیگم کی مجال نہ تھی کہ فضول خرچی، لغو رسموں اور اوہام پرستی کے خلاف احتجاج کریں۔ ان کے دیور میر تفضل علی کا کچھ عرصہ قبل لاہور میں انتقال ہوا تھا۔ کہا جا رہا تھا۔ بوا بچے دکھیا کو تو وہ غارت گئے جنات اڑا لے گئے۔

خود ان مرحوم کو بھی وہم ہو گیا تھا کہ دو جن ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میڈیکل کالج لاہور کے آخری سال میں تھے۔ جنات ضلع گورداسپور میں بھی نازل ہو جاتے، جہاں ان کے والد میر مہدی علی کوتوال تھے۔ پچھلے بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد تفضل میاں گورداسپور سے لاہور واپس جا رہے تھے۔ ریلوے پلیٹ فارم پر اچانک بولے۔ بھابی جان دیکھئے۔ دونوں آ پہنچے۔ کہہ رہے ہیں اب ہم تین ہو جائیں گے۔ لاہور کالج میں مردے کی چیر پھاڑ کر رہے تھے۔ نشتر کا زہر جسم میں سرایت کر گیا۔ اللہ کو پیارے ہوئے۔

یہاں محلہ لانگڑی والان میں میر مہدی علی کے آبائی مکانی کے زینے پر ایک جن کا قیام تھا۔ جب کبھی میر صاحب پنجاب سے آ کر اس مکان میں ٹکتے وہ پابند صوم و صلوۃ بندۂ آتشیں فجر کے وقت زینے پر سے للکارتا "مہدی علی اٹھو نماز پڑھو۔"

اکبری بیگم کو جس وقت یہ قصہ سنایا گیا وہ اسی مکان کے صحن میں کھاٹ پر بیٹھی تھیں۔ جھنجھلا کر بولیں، "دھرا تھا جن۔" لو بوا فوراً ان کے کان کا بالا کسی نے نوچ لیا۔ کیا دیکھتی ہیں سامنے کھونٹی پر لٹک رہا ہے۔

اکبری بیگم نے اپنی ننیال چوکنویں کی حویلی میں سب سے بڑی خالہ عمدہ بیگم کو دیکھا۔ اس وقت اسی برس کا سن تھا۔ غدر سے قبل نکاح ہوا تھا۔ عین برات کے دن ایک جن عاشق ہو گیا۔ رخصت نا ہونے دی۔ آج تک مصلے پر بیٹھی اللہ اللہ کر رہی تھیں۔

مالیخولیا۔ ہسٹریا۔ تپ دق۔ ہلی پردہ نشین عورتوں کے عام امراض تھے۔ باہر دیوان خانوں میں چوسر اور گنجفے کی بازیاں جمتی تھیں۔ مراد آباد اس وقت ہندوستان کا وی آنا کہلا رہا تھا۔ نامی گائیک، بین کار اور رباببیے جلسوں میں بلائے جاتے تھے۔ مقدمہ بازی محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر جائدادیں بسلسلہ فضول خرچی مہاجن کے ہاں رہن تھیں۔

چوک لانگڑی والان میں نیم کے درخت کے نیچے ایک کنواں ہے۔ اس کی کرامت یہ تھی کہ خاندان کے جس نونہال نے اس کا پانی پیا میٹرک سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔

اکبری بیگم پنجاب واپس گئیں۔ اپنے ناولوں "گلدستہ محبت" "شعلہ پنہاں" "عفت نسواں" اور "گودڑ کا لال" کے لئے وافر مسالہ ساتھ لیتی گئیں۔

"گلدستہ محبت" ان کا پہلا ناول تھا۔ عورتوں کے نام تک کا پردہ تھا۔ مصنفہ نے اسے "عباسی

"مرتضیٰ" کے فرضی مردانہ نام سے پبلک پریس مراد آباد سے چھپوایا۔ اب نایاب ہے [9]۔

"گودڑ کا لال [10]" غالباً ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد اس نے نئی مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کرلی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔ اس کے قارئین کو نہ یہ معلوم تھا کہ "والدہ افضل علی" کون ہیں اور نہ یہ کہ انہوں نے اس ناول کا پس منظر اور کردار کہاں سے حاصل کئے ہیں۔

۳۔ چپ کی داد

کم جولائی ۱۸۹۸ء ایک اہم تاریخ ہے۔ اس روز لاہور سے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی [11] نے زنانہ ہفتہ وار اخبار "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ ان کی بی بی محمدی بیگم (والدہ سید امتیاز علی تاج) نے اخبار کی ادارت سنبھالی۔

بہت جلد "تہذیب" سارے ہندوستان کے متوسط طبقے کے اردوداں مسلم گھرانوں میں پہنچنے لگا۔ اس کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنا شروع کردیئے جو تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے آج ستر برس بعد لکھے جانے والے بیشتر عام ناولوں سے کسی طرح کم نہیں۔

مخالفین کے اعتراضات کی وجہ سے نام کا پردہ ضرور تھا۔ چنانچہ "تہذیب" کے سرورق پر چھپتا تھا۔ "تہذیب النسواں جو کہ ایک شریف بی بی کی ادارت میں ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے۔" اکبری بیگم نے "والدہ افضل علی" اور نذر زہرا نے "بنت نذرالباقر" یا "مس نذر الباقر" کے نام سے لکھا۔ مردانہ اخباروں میں یہ بحث بھی چھڑی کہ کیا شریف مسلمان لڑکیوں کا خود کو انگریزی لقب "مس" سے یاد کرنا مناسب ہے یا سخت بیہودہ بات ہے۔

اصلاح لباس کی تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں "تہذیب" میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہم کیا پہنیں؟ "کھنچواں پاجامہ جس کی رسم اٹھتی جا رہی ہے یا شلوار۔ سب بہنیں اپنے اپنے لباس سے آگاہ کریں۔"

آبرو بیگم ہمشیرہ ابوالکلام آزاد بمبئی سے لکھتی ہیں' "میرے والد چالیس سال کے میں رہے۔ سولہ سال قبل کلکتے آئے۔ کلکتہ کی معزز خاتونوں کا لباس ساری اور شلوکہ ہے۔ میں دہلوی لباس کے مقابلے میں عربی لباس کی سفارش کرتی ہوں۔"

راحت خاتون بیگم بدرالدین طیب جی بحث میں حصہ لیتی ہیں اور زہرا فیضی کی والدہ امیرالنساء رقم طراز ہیں' "میں آپ کو اپنی چھوٹی لڑکی عطیہ خانم کے لباس کی تصویر بھیجوں گی۔ زبیدہ خانم لندن گئی تھیں وہاں ان کے لباس کی بہت تعریف ہوئی۔"

اکبری بیگم اور نذر زہرا بیگم نے گھرسواں بھاری پائجامے اور بھاری زیورات ترک کئے۔ ہلکے

چھلکے غرارے اور "گاؤن" مع دوپٹے کے خود ڈیزائن کر کے پہننے شروع کئے جو فیشن ایبل طبقے میں رائج ہوئے۔

نذر زہرا بیگم نے جدید طرز کا برقعہ ایجاد کیا۔ اس کا ذکر پھوپی نے ناول "گودڑ کالال" میں کیا۔

۱۹۰۵ء سجاد حیدر یلدرم کی پھوپی زاد بہنیں خان بہادر صغیر حسین کی لڑکیاں حمیدہ بیگم' وحیدہ بیگم چھوٹے چھوٹے مضامین "تہذیب نسواں" میں لکھتی ہیں۔ یلدرم کی چچا زاد بہن نثار فاطمہ بنت خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر "نصیحت منظوم" میں فرماتی ہیں۔

شکر اللہ کا کہ ہم علم سے ہیں بہرہ مند
اس سے بڑھ کر نہیں دولت مری پیاری بہنو
اچھا کرتی ہو منگاتی ہو جو "تہذیب" اخبار
اس سے بڑھتی ہے لیاقت میری پیاری بہنو

ن۔ ف۔ نہٹور ضلع بجنور

پلول سے ایک بی بی نے لکھا۔ "تہذیب" سے ہمیں بہت فائدے ہو رہے ہیں۔ پیشتر دنیا کے حالات کی خبر نہیں تھی' اب سب خبریں معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ مضمون میں نے بہت کوشش کر کے لکھا ہے۔ اگر اس میں کچھ غلطی نظر آئے تو آپ اور دوسری بہنوں سے معافی مانگتی ہوں۔"

مزید: "یہ میرا پہلا مضمون ہے جو بعد اصلاح برادر معظم کے روانہ کرتی ہوں۔ میری بہنو میں ایک شریف باشندہ بھوپال کی لڑکی ہوں۔"

بنت نذر الباقر اور چند خواتین نے زنانہ کانفرنس قائم کرنے کی تحریک شروع کی۔ ایک بی بی معترض ہوتی ہیں' "کوئی شخص سیڑھیاں طے کئے بغیر اچک کے نہیں چڑھ سکتا۔ ہم عورتیں پہلے ڈولی میں بیٹھتی ہیں' پھر گاڑی میں پھر ریل میں ہماری تعلیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے ہم ابھی اپنے آپ کو پڑھے لکھوں میں نہیں گن سکتے۔ ہماری چند بہنوں نے زنانہ کانفرنس کے لئے مردانہ رسالوں میں مضمون لکھنے شروع کردیئے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم پہلے زنانہ انجمنیں ہر شہر میں بنائیں۔"

عورتوں کی دلچسپیاں بدل رہی ہیں۔ اڈیٹر صاحبہ ایک نوٹ میں لکھتی ہیں' "ورزش اور تفریح طبع کے لئے کھیلوں کو دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری بہنوں کے تجربے میں جو کھیل آچکے ہیں ان کی ترکیبیں ہمیں لکھیں۔ غالباً ہمارے مسیحی بہنیں اس بارے میں بہتر لکھ سکیں گی۔ ایک کھیل مجھے پسند آیا ہے اسے پن پان کہتے ہیں۔ انگریزی کھیل ہے۔" برج کماری نہرو اور دوسری کشمیری برہمن اور کائستھ خواتین بھی اکثر مضمون لکھتی ہیں۔

۱۴ اپریل شالیمار باغ لاہور میں زنانہ جلسہ ہوا۔ باغبان پورے کی بیگمات اور اڈیٹر محمدی بیگم نے شرکت کی۔ دلی سے [12] سلطانہ بیگم آئی تھیں۔ کئی یورپین لیڈیاں بھی تھیں۔ ایک بہن فونوگراف لائی تھیں۔ اکثر لیڈیوں نے بیڈمنٹن کھیلا اور فونوگراف سنا۔

فاطمہ بیگم ہمشیرۂ آبرو بیگم اطلاع دیتی ہیں' "آبرو بیگم کی شادی ہونے والی ہے اور انہوں نے اشارۃً مجھے سخت تاکید کردی ہے کہ رسوم پر روپیہ برباد کرنے کے بجائے تعلیم نسواں پر خرچ کیا جائے۔"

۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس علی گڑھ میں ڈائس پر مولانا الطاف حسین حالی کھڑے "چپ کی داد" پڑھ رہے تھے اے ماؤ بہنو بیٹیو. دنیا کی زینت تم سے ہے

۴— چاند رات

اکبری بیگم اور ان کی نو عمر بھتیجی نذر زہرا دھاچوکڑی کے ماتم سے اجتناب کرتی تھیں۔ اب انہوں نے توہمات' بدعتوں' قبر پرستی اور تعزیہ پرستی کے خلاف اعلان جہاد کردیا "اے بی۔ یہ ذوالجناح کو جلیبی کھلا کر اس کے کان میں بات کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ذرا عقل کے کام لو بی بیو! بے چارہ گھوڑا امام حسین کو تمہاری درخواستیں کس طرح پہنچائے گا؟" (شیعوں سے خطاب)

"اے بی۔ یہ دریا وپری اور شیخ سدو کون چیز ہیں؟ بی شادی' دال چپاتی' میاں شاہ دریا' ماموں اللہ بخش' شاہ سکندر' پیر ہٹیلے پیر غیب؟ ہوش کی دوا کرو۔" (سنیوں سے خطاب)

خوش قسمتی سے اس خاندان میں تبرے کا رواج نہیں تھا اور سوگ سوئم کے روز اتار دیا جاتا تھا۔ ۹ ربیع الاول تک کا سوگ بہت بعد میں اہل لکھنؤ نے رائج کیا۔

اصلاح پرستی کے ساتھ ساتھ اکبری بیگم اور نذر زہرا بے حد شیعہ اور عاشقان حسینؑ بھی تھیں۔ پنجاب یا سرحد کے جس شہر یا چھاؤنی میں یہ خاندان مقیم ہوتا گھر میں اربعین تک کے لئے امام باڑہ سجایا جاتا۔ نقرئی علم' اطلسی پٹکے جو شاہی کے لکھنؤ اور لکڑ دادا میر معصوم علی چکلہ دار کے زمانے کی یادگار تھے اور جنہیں پردادا میر قائم علی ساتھ لیکر لکھنؤ سے نکلے تھے سال بھر صندوق میں محفوظ رہتے۔ جہاں جہاں میر نذر الباقر کا تبادلہ ہوتا وہ منقش چوبی صندوق قدیم عبرانیوں کے آرک کی مانند ساتھ ساتھ چلتا۔

چاند رات سے اس عارضی امام باڑے کی دہلیز پر بیٹھ کر اشرف جہاں بیگم 'مصطفائی' مرتضائی اور اکبری بیگم سیاہ ململ کے دوپٹوں میں منہ ڈھانپ زار و قطار رونا شروع کرتیں۔

واحمداً .... کشتہ شد حسینؑ .....

چار سو برس قبل ان کی لکڑ دادیاں' نانیاں جو دور صفویہ کے نیشاپور میں روضہ خوانی اور شبیہ خوانی کرتی تھیں اور جنہوں نے لانگڑی ضلع مراد آباد پہنچ کر سید بڑے کے بنوائے ہوئے امام باڑے کے کچے فرش پر بیٹھ کر اس پہلی چاند رات رونا شروع کیا تھا۔ ان خراسانی خانموں اور انیسویں صدی کی پروردہ ان ٹھیٹھ ہندوستانی بیگمات کے شدت گریہ میں رتی بھر جو فرق آیا ہو۔

واحمداً .... کشتہ شد حسینؑ ......

نگوڑے پردیس میں مراد آباد سے بارہ پتھر باہر اچھے ذاکر اور سوز خواں کہاں جڑتے۔ ضلع ہزارہ کی چند سرحدی اور پنجابی شیعہ بیبیوں کو بگھی اور تانگے بھیج کر شہر سے چھاؤنی بلوایا جاتا۔ وہ دھوتال پٹھانیاں

اور قزلباش خواتین ایسا دھماکے کا ماتم کرتیں کہ دل دہل جاتے۔ فارسی یا پشتو اور پنجابی میں دل دوز نوحے پڑھتیں۔ "ویر مسافر شام دی ویلا" پر جو چاند رات کو شمعوں کی روشنی میں پڑھا جاتا تھا خصوصاً بے انتہا رقت ہوتی۔

یو۔پی کے شیعہ گھرانوں کی عورتیں مرثیہ خوانی کی بدولت عموماً تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور اسی وجہ سے ذوق سخن بھی رکھتی تھیں۔ میرانیس گھٹی میں پڑے تھے۔ اشرف جہاں' مرتضائی' مصطفائی سب اردو داں تھیں۔ مرتضائی بیگم کا خط بہت پختہ تھا۔ مصطفائی نوحے بہترین پڑھتی تھیں۔ اکبری بیگم تو خیر ایک عالم فاضل بی بی تھیں۔ ان کی حدیث خوانی خاندان بھر میں مشہور تھی۔

چھٹی تاریخ سے پردے کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھ کر میر نذر الباقر مصائب کا بیان پڑھتے اور رومال آنکھوں پر رکھ کر خوب خوب روتے۔

ہر سال مصطفائی بیگم یہ تمنا کرتی تھیں کہ اس بار تو نہ ہو سکا' زندگی بخیر اگلے سال انشاء اللہ لکھنؤ میں محرم کرونگی اور چپ تعزیے کی زیارت کرکے ہی لوٹوں گی۔

میر نذر الباقر کے ڈرائنگ روم میں بھونپو والا آلا فونوگراف مع قوالیوں' نعتوں' تھیٹر کی "چیزوں" اور غزلوں کے ریکارڈوں کے موجود تھا۔ یہ "پلیٹ" جن کو عام نیو "توا" کہتا تھا صرف مردانہ دعوتوں کے موقعوں پر بجائے جاتے تھے۔ کنواری بالیوں کو تھیٹر کی چیزیں اور غزلیں سننے کی ممانعت تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھو اور نعتیہ قوالیاں سنو۔ ریکارڈ انگریزی موسیقی کے بھی تھے جیسے "انگریزی باجا" "انگریزی نقل ہنسی"۔ یہ لڑکیوں کے لئے جائز تھے کہ ان کو سننے سے انگریزی کی استعداد بڑھتی تھی۔

ایک توے میں قوال گاتا تھا کہ اے مسلمانو! مومنو! جو مسلمان بے نمازی مرے پڑھنا نہ اس کے جنازے پر تم نماز خاص جنت تاک توا رہا ہو گا۔ نوجوان مصطفائی بیگم جب یہ ریکارڈ سنتیں خوب روتیں کیونکہ اکثر علالت کی وجہ سے پنج وقتہ نہ پڑھ پاتی تھیں۔ کیا بھلی جنتی بیبیاں تھیں۔

۵— میجک لینٹرن

۱۹۰۷ء کی شب برات۔ اکبری بیگم قصور سے اپنے بھائی کے پاس نوشہرہ آئی ہوئی تھیں۔ آتے ہی مناہی کردی تھی۔ خبردار! آتشبازی پر جو روپیہ برباد ہوتا تھا' یتیم خانے بھیجا جائے۔ تازہ وارد مراد آبادی ماما سوسن[13] نے ایسی سونی شب برات کاہے کو دیکھی تھی۔ شام پڑے جب چراغ جلے وہ باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر بڑبڑایا کی "پنکی پڑے۔ ایسی گھپ اندھیری رات۔ بھنو مجھے تو وہم ہو رہا ہے۔"

"اماں۔ یہاں کی جو ریت دیکھی الٹی۔" سوسن کی لڑکی نسترن نے صاد کیا۔ وہ چولہے پاس بیٹھی جھپاجھپ رومالی چپاتیاں اتار رہی تھی۔ "نہ عرفہ کا حلوہ' نہ فاتحہ۔ مرنے والوں کی روحیں کیا کہتی ہوں گی۔"

سوسن نے آگے جھک کر اہمیت سے سرگوشی کی' "وہ ہمارے ہاں سارنپور کے وہابی نا ہیں۔ میں

جانوں یہ سب بھی وہابی ہو گئے۔"

نسترن نے آستین پر منہ پونچھ' جھاڑ جھنکار لٹیں ماتھے سے ہٹائیں اور آٹے کی پرات کی طرف متوجہ ہوئی۔ والدہ نے گفتگو جاری رکھی "لو بوا۔ دین اسلام بدعت ہے۔ بی بی کی صحنک' کونڈے' نذر نیاز سب سے چھٹی۔ آج میں نے غلام حسین سے کہا۔ میں نے کہا۔ بھیئے کل فجر کی نماز کے بعد چپکے سے تانگہ لاکر میرے ساتھ چلے چلیو دریا تلک۔ عریضہ ڈال آوں گی۔ کہنے لگا۔ لاؤ مائی۔ عریضہ مجھے دیدو۔ صبح کو چپڑاسی ڈاک لے جاتا ہے۔ تم کیوں تکلیف کرو۔ نگوڑا ایک تو پنجابی۔ اوپر سے سنی۔ میں نے سمجھایا۔ میرے چاند میں تو بارھویں امامؑ کے نام کا عریضہ دریا میں ڈالنے کو کہہ رہی ہوں۔ بولا۔ مائی سوسن یہ تو بدعت ہے۔ لوجی۔۔۔۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ میاں مصطفےٰ باقر۔ میاں افضل علی۔ اللہ رکھے۔ باؤڈک پھر رئے ہیں۔ شب برات کی رات اور نہ انار نہ پھلجھڑی اور گول کمرے میں بج رہا ہے فونوگراف......... وہ خلاف شرع تا ہے۔ شب برات کا حلوہ خلاف شرع ہے۔

اچانک نسترن کھلکھلا کر ہنسی' "ملا سرتوڑ فقیر!" اس نے نعرہ لگایا۔

"ایں؟" سوسن نے پوچھا۔

"اکبری بیگم تو بن گئیں ملا سرتوڑ فقیر۔" نسترن نے جواب دیا اور خوب ہنسی۔

باورچی خانے میں تیل کی ڈبیا ٹمٹمایا کی۔ یہ بھی یو۔ پی والوں کی عجیب و غریب وضع داری تھی۔ حویلی اندر کنول روشن باورچی خانے میں وہی دیوار سے ٹنگا تیل کا چراغ۔ یہاں بھی احاطے کے سرے پر "کچن" میں خانساماں جی دو ٹانگوں پر کھڑے انگریزی چولہے پر لالٹین کی روشنی میں "اسٹو" پکا رہے تھے۔ اندر دیسی باورچی خانے وہی تیل کی کپی اونٹ کی کھال والی۔ یہ بھی شاید ایک اور تاریخی Throw Back تھا۔

نسترن چولہے پاس سے اٹھی۔ دیوار پر اپنی پرچھائیں دیکھ کر ماں کی پرچھائیں سے مخاطب ہوئی' "اماں اماں۔ چلو چپکے سے پرچھائیں کا ٹونکا ہی کرلیں۔"

"اے تمہاری شامتیں آئی ہیں۔۔ کہ لیا اکبری بیگم نے تو آگ ہو جائیں گی۔"

"کوئی نہ دیکھنے کا۔ سب اندھے ہیں گے۔ میں لالٹین لاتی ہوں۔ تم چپکے سے چھٹوا' چنتن کو بلا لاؤ۔"

نسترن باہر بھاگی سوسن نے اپنے دونوں لڑکوں کو آواز دی۔ سب کے سب چوروں کی طرح دبے پاؤں صحن کی بجری پر چلتے بادام کے درخت کے نزدیک پہنچے۔ نسترن نے لالٹین کچھ فاصلے پر رکھی اور سب لالٹین اور دیوار کے درمیان ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ پرچھائیوں میں سب کے سر سالم۔ سوسن نے آسمان پر نظر ڈال کر مولا کا شکر ادا کیا۔ عین اسی وقت میاں مصطفےٰ باقر اور میاں افضل علی سیلرز سوٹ میں ملبوس ٹرائسکل چلاتے صحن میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے غلام حسین' ننھی بی اور بنو بی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سوسن بوا۔" بنو بی یعنی ثروت آرا بیگم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر تمہارے سب کے سر بھی صحیح ہیں۔"

"ہمارے سر....؟"

"جا کے اپنی پھوپھی سے نہ جڑ دینا۔ بات یہ ہے کہ شبرات کی رات' سب بندے بشر اہل اسلام کی قسمتوں کا فیصلہ ہو ہے۔ جو اگلی شبرات سے پہلے پہلے کینے والی بندی کے منہ میں خاک' شیطان کے کان بہرے سامنے قرآن درمیان۔ جو اگلے سال تک اس دنیا میں نہ رہے اس کا سر آج کی رات دیوار پر نظر نا آتا۔ اوپر ہی اوپر کو نکل جا ہے۔"

ننھی بی یعنی نذر زہرا بیگم کھلکھلا کر ہنسیں' "یہ کیا بیوقوفی کی بات ہے۔"

دفعتاً سب دم بخود رہ گئے۔ مصطفائی بیگم اسی لمحے پچھلے برآمدے کی سیڑھیاں اتر گھر سواں پائجامہ بڑی نزاکت سے دائیں بازو پر سنبھالے اور باورچی خانے کی سمت جا رہی تھیں۔ لالٹین کے سامنے سے گزریں۔ عمرو اں کی طرح ان کا سایہ دیوار کے اوپر نکل گیا۔

مصطفائی بیگم بادام کے درخت کے قریب پہنچ کر ٹھٹھکیں۔ نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ دیوار پر اپنا سر نظر نہ آیا۔ سہم گئیں۔ تینوں بچے سامنے موجود تھے۔ ان کی خاطر دل کڑا کر کے زور سے ہنسیں۔

ان کی والدہ اشرف جہاں بیگم اپنے کمرے میں حسب معمول چوکنی اور چوکس بیٹھی تھیں۔ اندر باہر کیا ہو رہا ہے سب خبر ان کو رہتی تھی۔ صحن میں سے بٹی کے قہقہے کی آواز آئی تو چونکیں۔ مصطفائی کبھی اتنی اونچی آواز سے اور ایسی کھوکھلی ہنسی نہیں ہنسیں۔ گرگابی پاؤں میں ڈال فوراً باہر آئیں۔ سامنے دیکھا۔ سب کے سر اللہ رکھے موجود۔ لونڈیا کا سر غائب۔ چکرا کر کھمبے تک پہنچیں۔ سوسن پر نظر پڑی۔ سہم گئیں۔ یہ اجڑا ٹونکا اسی حرافہ نے کیا ہے۔ برس پڑیں' "غارت گئی۔ مٹ گئی۔ جنم جلی۔ تیری بھتی میں نے کھائی۔ دور۔ دفان۔ کالا منہ۔

سوسن دہشت زدہ کھڑی تھی۔ لپک کر لالٹین اٹھالی۔ روشنی کے نئے زاوئے میں بھی بی بی کا سر ندارد۔

اشرف جہاں بیگم پھر للکاریں' "جو ہماری لونڈیا کو ہونے اس پر علم دار کا علم ٹوٹے۔"

بی بی دوبارہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ اتنے میں اکبری بیگم بھاوج کو آواز دیتی برآمدے میں آئیں۔ سامنے دیکھا۔ چراغ پا ہو کر بولیں' "شروع ہو گئی خرافات۔ اللہ جانے مراد آباد والوں کو کب عقل آئے گی۔" اچانک وہ بھی دم بخود۔

سوسن غریب لالٹین اٹھا' چور شکل' جھجکی جھجکی باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

مصطفائی بیگم مسکراتی ہوئی برآمدے میں آئیں۔ نند سے بولیں' "باجی میں خود ان جاہلانہ باتوں کو کب مانوں ہوں۔ اسی طرح تو خواہ مخواہ دل میں وہم بیٹھ جاتے ہیں۔" دیر تک بشاشت سے ہنسا کیں۔ بڑی بہادر بی بی تھیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال کے اندر اندر یعنی آئندہ شب برات سے بہت قبل ۲ جنوری ۱۹۰۸ء کی سرد برفیلی رات ایک مختصر سی علالت کے بعد مصطفائی بیگم کا انتقال ہو گیا۔

"باہر پہاڑوں پر برف پڑ رہی تھی۔ رات بھر کمرے میں تیز روشنی جلتی رہی۔ سرہانے مولوی صاحب قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ نرس نے پانچ سالہ بھائی کو سنبھالا۔ پاپا پلنگ کے قریب گر کر بیہوش ہو گئے۔ پردیس اور عالم تنہائی۔"14

بہت میلوڈریمٹک انداز بیان ہے۔ جذباتیت اور ڈرامے کا حساس اس خاندان کا خاصہ اور غالباً تشیع کی دین تھا۔ لیکن یہ وکٹورین میلوڈرامہ اس دور کے مردوں اور عورتوں کے لکھے ہوئے اردو ناولوں میں عموماً ملتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں "عصمت" کا اجرا ہوا۔ اس کے بانی علامہ راشد الخیری نے جو "مصور غم" کہلائے اس رویے کو عروج پر پہنچا دیا۔ خواجہ حسن نظامی کی "غدر کی ماری شہزادیاں" 'راشد الخیری اور خواتین ناول نگاروں کی مظلوم ہیروئنیں رومانی ہیرو ہر طرف دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سارا ہندوستان غم پسندی میں مبتلا تھا۔ اقبال کی گھن گرج نے اردو شاعری کی الم پرستی کو ذرا کم کیا لیکن ٹیگوریت اور رومانی کرب نے پھر آنسوؤں' آہوں اور ٹھنڈی سانسوں کا مینہ برسا دیا۔ کولونیل سماج کا ادیب و شاعر صرف رونا ہی جانتا ہے۔

مصطفائی بیگم کے بے وقت انتقال کے بعد گھر میں انگریزی تہذیب کے ضابطے سے سیاہ حاشیے والے اعلیٰ درجے کے پیڈ اور لفافے آ گئے۔

۷ جنوری ۰۸ء

میری پیاری غمزدہ بہن۔ تسلیم

مجھے گذشتہ شام آپ کا خط ملا اور اس خط کو میں ہاتھ میں لیتے ہی گھبرا گئی تھی۔ اور منہ سے نکلا خدا خیر کرے۔ مگر جب کھول کر دیکھا تو ایسی وحشتناک خبر پڑھی جس کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ کاش وہ کچھ دن اور بیمار رہتیں اور ہم تہذیبی بہنوں کو یہ ارمان باقی نہ رہتا کہ ہم کو ان کے لئے دعا کرنے کا موقع نہ ملا۔

خاکسار محمدیؐ

لاہور' ۱۷ جنوری

میری پیاری بہن۔ تسلیم

میں ایک خط پیشتر روانہ کر چکی ہوں۔ مجھے آپ کا خیال اور اس مصیبت کا جو آپ پر پڑی اور آپ کی امی کی جوانمرگی کا خیال آتا ہے تو بہت ہی رنج ہوتا ہے۔ ۳۲ سال کی عمر مرنے کے نہیں ہوتی۔

میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ پرسوں صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر تمہارے پاس پہنچوں گی مگر آج مجھے بہت زکام ہو گیا' اس صورت میں سفر کروں گی تو زیادہ بیماری کا خیال ہے کیونکہ آمد و رفت کے دونوں وقت ٹھنڈے ہیں۔ اللہ ہر طرح کی خیر رکھے تو اگلے اتوار کو حاضر ہوں گی۔ خدا آپ سب کا حامی و مددگار ہو اور صبر جمیل بخشے۔

ننھی بہن اور بھائی کو دعا کہئے۔

والسلام

خاکسار محمدی

محمدی بیگم کی عمر بھی مرنے کی نہیں تھی۔ کمسن سید امتیاز علی کو تنہا چھوڑ کر وہ چند ماہ بعد اسی سال اللہ کو پیاری ہوئیں۔

بعد مصطفائی بیگم کی وفات کے نیم تاریک صحن میں بادام کے درخت کے نیچے ان کی لحد پر جہاں انہیں مسافر بنایا گیا تھا چالیس راتوں تک لالٹین ٹمٹمایا کی۔ شاید وہی شب برات والی لالٹین تھی۔

۶—نانی اشرف جہاں بیگم

ایک وقت تھا کہ اشرف جہاں بیگم چو کنویں کی حویلی میں محفوظ و مامون بیرونی دنیا کی خبر نہ رکھتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں بھائی کے حکم پر پانچوں بہنیں چہرے پر توے کی کالک مل' باؤلی کی سیڑھیوں پر مستعد بیٹھ گئی تھیں۔ حملہ آور گورے چڑیلیں سمجھ کر الٹے پاؤں واپس بھاگ جائیں گے۔ آگے بڑھے باؤلی میں کود کر جان دے دیں گی۔ ۱۸۶۰ء میں لانگڑی والاں کے دہلوی حکیموں کے ہاں میر مہدی علی سے بیاہ ہوا۔ اس وقت شمالی ہند میں ریل چل چکی تھی۔ روز نماز کے بعد دعائیں مانگتیں یا رب العزت مراد آباد میں دھوئیں کی گاڑی آنے سے پہلے اس بندی کو دنیا سے اٹھا لیجیو۔ ۱۹۲۰ء تک زندہ رہیں جب پختونوں پر بم گرانے والی چیل گاڑیاں گڑگڑاتی ہوئی صوبہ سرحد میں ان کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

نانی اشرف جہاں بڑی خوددار طنطنے والی بی بی تھیں۔ انقلاب زمانہ کو بڑے وقار کے ساتھ قبول کر چکی تھیں لیکن جوان اولاد کی موت نے انھیں ہیبت زدہ کر دیا۔ پہلے کڑیل جوان تفضل علی کو دشمنوں نے ہوس لیا۔ اللہ جنت نصیب کرے میاں کو بہتیرا منع کیا تھا بچے کو عیسائیوں کے نرغے میں لاہور مت بھیجو۔ چولہے میں گئی ڈاکٹری۔ حکمت پڑھاؤ۔ دلی کے طبیبوں کا پڑپوتا' پردادا قلعے میں سلاطینوں کے معالج۔ پوتے پر یہ وقت پڑا کہ فرنگیوں نے اس سے لاشوں کی چیر پھاڑ کروائی۔ کھڑکھڑاتے ڈھانچے میرے لال کے سامنے کھڑے دانت نکوستے تھے۔ کوئی بد ارواح بچے سے لپٹ گئی۔ اپنی جان سے گیا۔ ان فرنگیوں کا حشر اللہ شمر یزید کے ساتھ کرے۔ لاٹ صاحب کی بھتی میں نے کھائی۔ قطامہ ملکہ کی بھتی میں نے کھائی۔۔۔

دراصل اشرف جہاں بیگم غدر سے قبل کی نسل والے دوسرے مسلمانوں کے مانند انگریزوں کو کسی طرح معاف نہیں کر سکی تھیں۔

بی مصطفائی کے مرنے کے بعد اشرف جہاں باؤلی سی ہو گئیں ""فلاں کی بھتی میں نے کھائی" تکیہ کلام بن گیا۔

کچھ عرصہ بعد نانی کو چپ لگ گئی۔ سر جھکائے تلے دانیاں اور لچھے چاروں طرف بکھیرے محرم کا گوٹا رکھنے کے لئے رنگ برنگے بٹوے اور علم پٹکے سیا کرتیں یا انگشت شہادت گھما گھما کر زیر لب دعائیں اور وظیفے دہراتیں۔ چاند رات سے امام باڑے کی چوکھٹ سے لگ کر ساکت و صامت بیٹھ جاتیں۔ بڑی بیٹی مرتضائی جو انمرگ بہن کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے نوشہرہ آ گئیں۔ بی مرتضائی لاولد تھیں۔ انھوں نے اور ان کے میاں تایا فیض العسکری نے نذر زہرا بیگم کو بیٹی بنایا تھا۔ تایا صوبہ سرحد میں دو مزید شادیاں کر

کے صاحب اولاد ہو چکے مگر بھتیجی پر بدستور جان چھڑکتے تھے۔

نوشہرہ چھاؤنی خطرناک آفریدی علاقہ میں واقع تھی۔ راتوں رات سوتی ہوئی میموں کو پٹھان اٹھالے جاتے۔

میر نذر الباقر عموماً دورے پر رہتے تھے۔ مزید حفاظت کے خیال سے کنٹونمنٹ کا بنگلہ چھوڑ کر لال کرتی بازار میں مکان لیا گیا۔ RedCoats کے زمانے میں چھاؤنیوں کے اندر یہ بازار آباد کئے گئے تھے۔ لال کرتی نوشہرہ کے فوجی کوتوال منور خاں انبالے کے باشندے تھے۔ میر صاحب کے کنبے کی ان کے گھرانے سے بہت گہری چھنی میر صاحب بچوں کے لاڈ پیار میں زیادہ تندہی سے مصروف ہو گئے۔ لڑکیوں کی ہر فرمائش الانذر بیگم کے شوق فوٹو گرافی کے کہ اس میں بے پردگی کا احتمال تھا انہوں نے پوری کی۔ دونوں لڑکیاں صحن کے اندر لیڈی سائیکل چلایا کرتیں۔

ننھی بی یعنی نذر زہرا بیگم کی آنکھیں بہت کمزور تھیں۔ ڈاکٹر کے حکم سے پڑھائی بند کی گئی۔ اب مضمون نگاری اور خط و کتابت کے لئے فرصت وافر تھی۔

مجلسی گفتگو کی مانند خط و کتابت ایک مہذب فن اور مشغلہ تھا۔ (انگریز خواتین بھی دن بھر ایک دوسرے کو "چٹیں" بھیجا کرتی تھیں۔) خط لکھنے کے لئے علیحدہ دن مقرر تھے۔

چھوٹے بھائی سید مصطفےٰ باقر کے رخسار میں ناسور ہوا۔ آپریشن کے لئے سارا خاندان ہوتی مردان ہسپتال گیا۔ نوشہرے سے ایک بی بی روزانہ خط لکھتیں۔ چوکیدار تانگے پر بیٹھ کر روز رات کو دریا پار خط ڈالنے جاتا۔ معرفت دیوان سنگھ اسسٹنٹ سرجن۔ ان بی بی کے خطوط نصیحت آمیز اور فارسی اشعار سے پر ہوتے تھے۔ جواب جلد نہ دینے کی شکایت میں ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

رنجیدہ رنجیدہ ازمن گناہ چہ دیدہ
دائم گنا کشیدہ از من چرا رنجیدہ

شعر و شاعری ہو رہی تھی۔ مولانا سید محمد مرتضےٰ ادیب نے بنت نذر الباقر کا ایک ابتدائی شعر کہیں درج کیا ہے۔

حسن صورت چند روزہ حسن سیرت مستقل
اس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں اس سے خوش ہوتا ہے دل

ایک بی بی ثروت آرا یعنی بنوبی کو لکھتی ہیں' "تم نے جو شعر زہرا[15] خانم کے لئے بنایا اس سے میں بہت خوش ہوئی کہ خدا نے خوب موزوں طبیعت دی ہے۔ شعر بنانے کی تعریف زہرا خانم کریں گی کہ بڑی شاعرہ ہے۔ تمہاری باجی تو مضمون نویسی پر ماہ تاباں ہو گئی ہیں اور تم شعر پر مہر درخشاں اور جس وقت بمبئی جاؤ گی موٹر کار پر تو آپ کی قدر شاعری پر ہو گی اور باجی کی قدر مضمون نویسی پر۔

"خاتون آگیا۔" سب مضمون میں کچھ آپ کا مضمون مجھ کو پسند آیا۔ باتیں مفید مطلب ہیں۔ جب بچے کو بخار ہے تو آپریشن کیوں کرایا جا رہا ہے۔"

خط کیا ہے ٹیلیفون پر بات کی جا رہی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں سہیلیوں سے گھنٹوں اسی قسم کی گفتگو فون پر کرتی ہیں۔

انہی دنوں ننھی بی یعنی مس نذر الباقر کے ایک مضمون کا ترجمہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے ہفتے وار رسالے میں کہ اب السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کہلاتا ہے شائع کیا گیا۔ اس پر مہارانی بڑودہ نے سونے کا تمغہ عنایت کیا۔

علیا حضرت نواب سلطان[16] جہاں بیگم والئی بھوپال نے (جو مسلم نشاۃ [illegible] کی ایک عظیم قائد تھیں اور اب یکسر فراموش کی جا چکی ہیں) بنت نذر الباقر کو اپنا سکریٹری بنانے کی خواہش کی [illegible] الباقر نے مودبانہ انکار فرمایا۔

۱۹۰۹ء میں مولوی سید ممتاز علی نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار "پھول" جاری کر کے بنت نذر الباقر کو اس کا اعزازی ایڈیٹر مقرر کیا۔ اخبار نوشہرے میں ایڈٹ ہو کر دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں مس نذر الباقر نے بچوں کے لئے باتصویر کتابیں "سلیم کی کہانی" "پھولوں کا ہار" "دکھ بھری کہانی" "ننھی رضیہ اور اس کی بکری" وغیرہ لکھیں اور پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے ان کتابوں کو اسکولوں کے اردو نصاب میں شامل کیا۔

"پھول"[17] اور دارالاشاعت پنجاب نے بچوں کے لئے اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا۔ محمدی بیگم مرحومہ کی "امتیاز کچھی' امتیاز بتیسی" اور مس نذر الباقر کی "سلیم کی کہانی" اور "پھولوں کا ہار" وغیرہ کہ [illegible] جاتی تھیں۔ یہ ساری کتابیں اب نایاب ہیں۔

مصنفہ کا پہلا اور مقبول ترین ناول "اختر النساء بیگم" دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔ "آہ مظلوماں" بھی شاید اسی سال چھپا۔ اس وقت اردو کے اکابر علامہ راشد الخیری' ڈاکٹر اقبال' شیخ عبدالقادر' سجاد حیدر یلدرم اور بنت نذر الباقر سمجھے جا رہے تھے[18]۔ "لیکن ایک مخلص نقاد یعنی مصنفہ کے چچا سید ظہور حسنین نے فرمایا۔

کالون ہسپتال' الہ آباد
۱۷ اپریل ۱۱ء

پیاری بی بی

تیرا خط ملا۔ بنو کی طرف سے سخت فکر ہے۔ اوس لاٹ صاحب کی بچی سے کہہ دے کہ بس اب اچھی ہو جائے۔ بہت لاٹ صاحب کی بچی نہ بنے۔

تو نے اپنی کتابوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ تو سن۔ "آہ مظلوماں" کی زبان میں پنجابیت بہت سرائیت کئے ہوئے ہے اور "اختر النساء بیگم" بھی اس سے پاک نہیں ہے۔ اختر النساء کا پلاٹ ابھی موجودہ ہندوستان کے قابل نہیں ہے۔ بعض بعض جگہ صاحبیت بہت چڑھی ہوئی ہے۔ بہرحال دونوں کتابیں اچھی ہیں اور میں تیری محنت کی داد دیتا ہوں۔

میں خدا کے شکر سے اچھا ہوں مگر ابھی اسپتال سے نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

والدعا

تیرا چچا ظہور

۱۹۰۸ء میں حیدر آباد دکھن کی موسیٰ ندی میں قیامت خیز طغیانی ہوئی۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا، سروجنی نائیڈو، لیڈی اکبر حیدری اور نواب عماد الملک کی بہو مسز طیبہ خدیو جنگ نے حیدر آباد میں ریلیف کا کام شروع کیا۔ سارے ہندوستان میں چندہ جمع کیا گیا۔ پنجاب و سرحد کے لئے مس نذر الباقر منتخب ہوئیں جو سرسید میموریل فنڈ اور مسلم یونیورسٹی فنڈ کے لئے صوبہ جات پنجاب و سرحد کی پراونشل سکریٹری بھی تھیں۔

مراد آباد

۴ فروری ۱۹۰۹ء

بی بی تمہارے سرسید میموریل فنڈ کے کاغذات تو پہنچ گئے مگر مجھے اون کے دیکھنے کی ابھی مہلت نہیں ملی۔ بہرحال مجھے تیری خوشی منظور ہے۔ جو کچھ تو کہے گی دیدوں گا۔ مگر کہہ دینا کس طریقے سے دوں۔ اس لئے کہ وہ تو بڑا قصہ ہے۔ جیسا بتا دے ویسا کروں۔ دوسرا پرچہ بند کا بند بڑی بھابی جان کو دے دو۔ خبردار جو دیکھا۔

والدعا

ظہور

بلگرام ہاؤس، حیدر آباد دکن

۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ

جناب بیگم صاحبہ۔ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ بی بی[19] کی صحت ایک عرصہ سے ناساز تھی لیکن ایک مہینہ قبل بہت بگڑ گئی۔ اب تک پلنگ سے اترنے اور چلنے پھرنے کی اونہیں اجازت نہیں ملی ہے۔

مسلم یونیورسٹی فنڈ کتاب رسید نمبر ۵۱۹۹ جو آپ نے روانہ فرمائی تھی اوس میں سے جس قدر (؟) لئے گئے ہیں مذکورہ کے ملاحظہ سے معلوم ہو جائے گا۔

رقومات جو وصول ہوئیں۔

بیگم صاحبہ نواب سر آسمان جاہ مرحوم	ایک ہزار
بیگم صاحبہ نواب ارسطو یار جنگ بہادر	ایک سو
بیگم صاحبہ خدیو جنگ بہادر	ایک سو
بیگم صاحبہ مولوی سید ہمایوں مرزا صاحب	ایک سو
بیگم صاحبہ مولوی اعجاز حسین صاحب وکیل گلبرگہ شریف	ایک سو

بیگم صاحبہ مولوی سید امیر حسن	پچیس
بیگم صاحبہ میرزا مہدی خان	پچیس
قادر النساء بیگم	پچیس
بیگم صاحبہ مولوی میر اصغر علی صاحب	دس
بیگم صاحبہ میرزا (؟) صاحب	دس
	۱۴۹۵

یہ جملہ رقوم بذریعہ بنک آف بنگال شاخ آگرہ کو یونیورسٹی فنڈ میں روانہ کر دی گئیں۔

بہت کچھ رقوم کا وعدہ ہوا ہے لیکن بوجہ طاعون بالفعل وصول ہونا ناممکن ہے۔ بہرحال چونکہ آپ کو کتاب اور حساب کی تعجیل ہے لہذا کتاب بذریعہ رجسٹری روانہ کی جا رہی ہے۔ بنک کے اصل رسائد میں نے اپنے پاس رکھ لئے ہیں۔ لیکن آپ کو اگر ان کی ضرورت ہو تو روانہ کردوں گا۔ زیادہ کیا تکلیف دوں۔

خاکسار

خدیو جنگ

حیدر آباد دکن

۲۸ اگست ۱۹۱۱ء

جناب ہمشیرہ صاحبہ معظمہ و مکرمہ

تسلیم۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت اب بفضلہ بہتر ہے اور دورے پر گئے ہیں۔ میں نے چندے کی فہرست آپ کی خدمت میں ارسال کر دی مگر ابھی بہت سا اس میں سے وصول ہونا باقی ہے۔ یہاں آسانی سے روپیہ جمع نہیں ہو سکتا ہیں تو حتی الامکان کوشش کر رہی ہوں۔ روپیہ جو میں نے بھیجا ہے وہ بانک میں علی گڑھ کے نام بھیج دیا۔ اس کی رسید بھی باقاعدہ آگئی۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ نو برس آگے میں نے ایک اسوسیاشن قائم کیا تھا اور چندہ جمع کر کے علی گڑھ بھیجا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ون روپی فنڈ قائم ہوا تھا اور میں نے کہا تھا کہ اگر سو (۱۰۰) بیبیاں ممبر ہوں گی تو سو (۱۰۰) روپیہ مہینہ ہوا۔ اس طرح سے اگر ہندوستان کے کل شہروں سے سو سو روپیہ بھیجا جائے تو کتنے سو ہو جائے گا۔ اس مہینے میں مسز امیر حسن صاحب نے ۲۵ روپیہ دیا اور مسز حاکم الدولہ صاحبہ نے سو روپیہ کا وعدہ فرمایا اور مسز سعد جنگ نے ۱۲۵ کا وعدہ فرمایا مگر ذی قعدہ کے قبل نہیں دیں گی۔

"تہذیب" پہلے میرے پاس آتا تھا۔ جب اس کی اڈیٹرس کا انتقال ہو گیا وہ بھی موقوف ہو گیا۔ آپ اس کو میرے نام پر جاری کرا دیجئے۔ البشیر بھجوا دیجئے گا جس میں آپ نے میری کاروائی چھپوائی ہے۔

آپ کا رسید کا پاکٹ مجھ کو ملا۔

خاکسار

طیبہ بیگم

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔ اسلامیان ہند جن کا سوز و ساز اسلامیان شرق اوسط و شمالی افریقہ کے سوز و ساز سے از حد وابستہ تھا حسب معمول غم و غصے سے بیتاب ہوئے۔ طرابلس کے زخمیوں کے لئے چندے جمع کئے گئے۔ اقبال نے شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

والی نظم پڑھی۔ تہلکہ مچ گیا۔ سامعین خون کے آنسو روئے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر اسی وقت "نیلام" کر کے روپیہ طرابلس فنڈ میں بھیجا گیا۔ سال بھر بعد جنگ بلقان چھڑ گئی۔ بنت نذر الباقر اور دوسری جدید خواتین نے طرابلس اور بلقان کے لئے خوب خوب چندے جمع کئے مرہم پٹی کا سامان اکٹھا کر کے ترکی بھیجا۔ بہت جوش و خروش اور ہنگامہ رہا۔

ان جدید خواتین میں بمبئی کے طیب جی خاندان کی لڑکیاں زیادہ خوش قسمت تھیں کہ بے پردہ گھومتی تھیں اور آئے دن انگلستان جاتی رہتی تھیں۔

جے راج باغ۔ وارڈن روڈ
بمبئی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۰ء

میری عزیز اور لائق بہن سلامت

تسلیم۔ آپ کا خیریت نامہ موصول ہوا۔ میری صحت نے دغا دیا اور اب تک روئے صحت پوری طرح ہویدا نہیں لیکن کچھ افاقہ ہے۔

ہزار شکر کہ آپ کی نسبت ایسے پڑھے گنے نوجوان سے ہو گئی ہے اور ان کی طبیعت اس قدر آزاد ہے۔ خدا آپ کو آئندہ زندگی میں سکھ دکھائے۔ آمین۔

الہ آباد اگزبشن[20] پر میں ڈرتی ہوں کہ نہ چل سکوں گی کیونکہ اب تک علیل ہوں مگر حضور نواب صاحب جنجیرہ میرے بہنوئی اور بھتیجا آصف ۸ دسمبر کو الہ آباد رخصت ہو گئے۔ وہ لوگ ۲۵ دسمبر تک قیام کر کے بنارس چلیں گے۔ پھر لکھنؤ۔

امید ہے کہ آپ کی ہمشیرہ خیریت سے ہیں اور خالہ صاحبہ بھی۔ آپ کی شادی کی تاریخ سے ضرور مطلع کیجئے۔

(تلخیص)

آپ کی بہن
زہرا

جن "پڑھے گنے نوجوان" سے بنت نذر الباقر کی نسبت طے ہو رہی تھی وہ بھی بڑا قصہ تھا۔ سال بھر سے قبل شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے ذریعہ پیغام آیا تھا۔ "لڑکے" کی جو تصویر قیام بغداد کے زمانے کی "مخزن" میں شائع ہوئی تھی نانی اشرف جہاں کو دکھلائی گئی۔ اس وقت وہ ہنکارا بھر کے حسب

معمول چپ سادھے رہی تھیں۔ لیکن جب سلسلہ جنبانی آگے بڑھا نانی دفعتاً دنیا میں واپس آگئیں۔ لوگوں کی بھتی کھانا القط۔ بیٹے اور بیٹی کی موت کا غم بھول' نواسی کے جوڑوں کی ماہرانہ سلائی ٹکائی میں منہمک ہو گئیں۔

میر نذر الباقر مع خاندان نوشہرے سے تبدیل ہو کر سیالکوٹ اور پھر کوہاٹ چھاؤنی آگئے۔ نانی نے ایک سے ایک حسین خوان پوش سی سی کر گھر بھر دیا۔ مگر گوڑا سلسلہ جنبانی ختم ہونے ہی میں نہ آوے۔ ایک روز جھنجلا کر انہوں نے اپنے داماد سے پوچھا' "میرے لال میرے چاند۔ دیوبندی مولوی کا کوئی خط آیا؟"

میر نذر الباقر ساس کو جو ان کی سگی خالہ بھی تھیں بہت چاہتے تھے اور اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ان کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے بولے' "خالہ جانی۔ دیوبندی مولوی یوں فرماتے ہیں کہ لڑکے کی دو شرطیں کڑی ہیں۔ اول یہ کہ نانی اشرف جہاں رئیسہ چوکنواں پہلے بغداد جاویں۔"

"اس بچے کے منہ میں شکر گھی۔ مجھ زبھاگی کو مولا جلد بلاویں"

"مولا نہیں خالہ' لڑکے کی شرط ہے کہ نانی پہلے بغداد جا کر بڑے پیر[21] کے مزار پر حاضری دیں۔ اس کے بعد۔"

نانی کا منہ اتر گیا۔ چپ رہیں۔ پان بنانا شروع کیا۔ پھر اچانک غصہ سے بولیں' "میاں مجھ سے آنا کانی تو کرو نہیں۔ میں جانوں برا چیتنے والوں نے بھانجی ماردی۔ میاں لونڈیوں کو دو چرخی چلانا تم نے سکھایا' کافر کرتی انہیں پہنائی۔ ڈاکٹری پڑھنے تم بھیجے دو تھے۔ باجی بیگم کا خط آیا ہے کہ تمہارے دشمن دوربار [illegible] یوں طوفان جوڑتے ہیں کہ سید نذر الباقر کی بیٹیاں کلب گھر جا کر گوروں کے ساتھ کھانا کھاویں ہیں۔ اللہ بری گھڑی سے بچاوے....."

میر صاحب بھی ذرا متفکر نظر آرہے تھے۔ مگر ساس کا دل رکھنے کے لئے بیٹھے ہنسا کئے۔

"بیٹا ایک سے ایک اچھے پیغام آئے۔ تم نے رد کئے۔ باجی بیگم کا نواسہ اللہ رکھے کیا برا تھا؟ تم باپ بیٹیاں' بی اکبری سب کے سب [illegible] کر باؤلے ہو گئے۔ اے میں پوچھوں ہوں اس میں خامی کیا تھی۔ ڈیوڑھی پر ہاتھی' اندر باہر نوکر [illegible] پلٹن۔ کہنے لگے گھر میں خوگیری بھرتی ہے۔ پوچھو اس گئے گزرے وقت میں بھی ان کے ہاں حبشی حبشنیں ملازم ہیں۔ کہنے لگے لکھنؤ کا چھیلا ہے۔ لمبے لمبے پٹے رکھے ہے۔ انٹرنس فیل ہے۔ مرغ لڑاتا ہے۔ اے اللہ کا فضل ہے۔ مرغے لڑاوے ہے۔ رئیس زادہ ہے اور کیا کرے۔ سگا رشتے دار۔ دیکھا بھالا۔ چلو خیر۔ پھر وہ آگرے شاہ گنج والے آل نبی بالسٹر کا رقعہ آیا۔ پٹیالے والے وزیر خلیفہ کا رقعہ آیا۔ وزیروں کا خاندان امیر کبیر۔ مگر میاں تم تو اس سنی لڑکے پر لٹو ہو گئے۔ کہنے لگے "نہٹوری کھرے سید ہیں۔" ہوں گے۔ بہت قابل ہے۔ بہت اچھے افسانے لکھے ہے۔ بیٹا ہمارے ہاں تو افسانے دکھیا اللہ بخشے آغا کربلائی سنایا کریں تھے۔ اب لاڈو بھی افسانے لکھ رہی ہیں۔ بھینا بھی اللہ مارے ناول لکھ لکھ کر گھر بھر رہی ہیں۔ ہماری تو مجال تھی کہ چہاردہ معصومینؑ کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا ہو۔"

اشرف جہاں بیگم پر اب جلال آچکا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر گئیں سیدھی نماز کے تخت پر۔ مصلے پر

بیٹھ کر بڑبڑاتے ہوئے فی الفور اللہ میاں سے لو لگائی۔

چند منٹ کے اندر اندر غلام حسین کمرے میں وارد۔ ہاتھ میں ڈاک کا پلندہ۔ میر صاحب جو ساس کی پلنگڑی پر گاؤ تکئے کے سہارے نیم دراز تھے فوراً اٹھ بیٹھے۔ ڈاک غلام حسین کے ساتھ سے لی۔ "دیوبندی مولوی" کا لفافہ مع "لڑکے" کے تازہ ترین خط کے موجود' جو مولوی صاحب نے میر صاحب کے نام لاہور سے ری ڈائریکٹ کیا تھا۔

لیکن مولوی سید ممتاز علی اور جدید فیشن کے صاحبزادے کی خط و کتابت از اول تا آخر بہت دلچسپ ہے۔ ناظرین اس کا مطالعہ فرمادیں تو ہرگز کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔ بلکہ فائدہ ہو گا۔

۷ — مناظرہ مابین مولینا و مسٹر

یلدرم .... بنام شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب

دہرہ دون

۱۴ اپریل ۱۹۰۹ء

مکرمی و معظمی۔ آداب عرض ہے

میں اولڈ بوائز ڈنر میں شریک ہونے کی غرض سے علی گڑھ گیا تھا۔ آج صبح یہاں واپس پہنچا اور آپ کا خط اس ڈاک میں پایا جو یہاں جمع ہو رہی تھی۔ حسبِ وعدہ مفصل عریضہ تقدیم کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اضلاع جن میں آپ کا وطن سہارنپور بھی شامل ہے کس قدر قدامت پرست ہیں۔ میرا قصبہ اس معاملے میں اپنے ہمخوار قصبوں سے بڑھا ہوا ہی ہے گھٹا نہیں اور اگرچہ میرا خاندان Progressive Conservatism کا مدعی ہے مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک Reacitionary Conservatism کا پابند ہے۔ قسمت نے مجھے' جو اپنے خیالات میں ریڈیکل ہے ایسے ماحول میں پیدا کیا جہاں میں جیسی لڑکی چاہتا تھا اس کا ملنا عسیرالحصول ہی نہیں ایک حد تک ناممکن الحصول ہے۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں شادی کا نہیں ہے تو میں نے اپنے مرحوم والد اور مرحومہ والدہ کی نافرمانی کی (اور افسوس ہے کہ) ان کو رنج دیا لیکن اپنی ضد پر قائم رہا۔

جب سے میں قسطنطنیہ سے واپس آیا ہوں اہل خاندان کی مجھ پر از سر نو یورش ہے۔

لیکن میں جس لیاقت کا طالب ہوں جو جگہ آپ نے تجویز فرمائی ہے (آپ کے فرمانے کے مطابق) وہاں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تجویز سے موافقت رکھتا ہوں لیکن خیر جگہ میں صورت شکل اور مزاج اور طبیعت کا حال ہمیشہ Second Hand ملتا ہے مجھے خوف ہے کہ یہ Third Hand نہ ہو۔

علاوہ ازیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ سید حامد حسین[22] صاحب وزیر اعظم پٹیالہ نے بھی اس جگہ اپنے لئے پیغام بھجوایا ہے۔ میں اپنے ذاتی حالات عرض کئے دیتا ہوں۔

1- میری عمر اس وقت تیس سال ہے۔

2- ہم چار بھائی ہیں اور ایک بہن۔ مجھ سے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر متاہل ہیں اور صاحب اولاد۔ وہ میرے سوشل خیالات کے مخالف ہیں۔ انہوں نے انٹرنس تک تعلیم پائی ہے۔ مجھ سے چھوٹے بھائی سید نصیرالدین حیدر بی اے بارہ بنکی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ۲۸ برس کی عمر ہے وہ میرے خیالات کے ایک حد تک موافق ہیں لیکن پردے کے موید۔ نصیرالدین حیدر سے چھوٹے بھائی سید وحید الدین حیدر میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتے ہیں۔ ان کی عمر ۲۳ برس ہے۔ یہ متاہل ہیں خیالات میں زیادہ لبرل ہیں۔

3- میری ملازمت پانچ برس کی ہے۔ ترقی کی بہت امید ہے۔ ہم بھائیوں کو ترکے میں ایک بڑا مکان ملا ہے اور کچھ آبائی اراضی۔ میرے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر کوتوال بنارس تھے۔ اور بعد میں سپرنٹنڈنٹ پولس رہے۔ انہوں نے بےحد ایمانداری سے کام کیا اور سوائے اس کے کہ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلائیں اتنا پس انداز نہ کیا کہ خود جائداد بناتے۔ میرے بڑے چچا خان بہادر سید کرار حیدر اسسٹنٹ سرجن تھے ۳۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ پھوپھا خان بہادر سید صغیر حسین ڈپٹی کلکٹر اور ماموں خان بہادر سید ابوالحسن ڈپٹی کلکٹر بہت بڑی زمینداریوں کے مالک ہیں۔ دوسرے عزیزوں کے عہدوں' زمینداریوں وغیرہ کے متعلق مزید تفصیلات اگر آپ چاہیں تو بھیج دوں گا گو میں اس کی مطلق ضرورت نہیں سمجھتا۔

4- صحت میری بہت اچھی نہیں اور اسپورٹس وغیرہ کی طرف میں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ میرا وقت زیادہ اکثر گزرتا ہے۔

آپ یہاں تشریف لانا چاہتے ہیں۔ اس کا مجھے شکریہ ادا کرنا ہے۔ لیکن آپ کیوں اس قدر دور دراز کے سفر کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں۔ میں آپ کے خطوط کا جواب جلد جلد دے رہا ہوں۔ بہرحال اگر آپ تشریف لانا چاہتے ہیں تو سیدھے دہرہ دون تشریف لائیے۔ میں ۲۸—۲۹ تک یہاں یقینی ہوں۔ اس کے بعد معلوم نہیں۔ غالباً دورے پر چلا جاؤں مگر دورے پر بھی آپ آسانی سے مجھ سے مل سکیں گے۔ کیونکہ میں جہاں ہوں گا وہاں کے قریب کے اسٹیشن پر آپ اتریں۔ میں سواری ہاتھی وغیرہ کا انتظام کر دوں گا اور آپ کیمپ میں تشریف لے آئیں۔

آخر میں پھر بصراحت عرض کئے دیتا ہوں کہ میں آپ کی اس تجویز کو بحالت موجودہ منظور کرتا ہوں۔

خاکسار

سید سجاد حیدر

دہرہ دون

۲۲ اپریل ۱۹ء

مکرمی آداب عرض ہے۔ پرسوں مجھے آپ کا دوسرا خط ملا۔ اور حسب الامر میں نے تین خط میر نذر الباقر صاحب، میر فیض العسکری صاحب اور میر ظہور الحسنین صاحب کے نام لکھے۔ گو آپ نے فرمایا تھا کہ اپنے سنی ہونے کا ذکر نہ کرنا۔ مگر میں نے لکھ دیا ہے کہ گو میں سنی ہوں مگر ہمارے خاندان میں شیعہ سنیوں میں آپس میں رشتے ہوتے ہیں۔ کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میرے بہت سے عزیز شیعہ ہیں۔ علاوہ ازیں میرے خاندان کا سنی ہونا چھپ تو سکتا نہیں۔ ہر شخص کو معلوم ہے۔ رہا خود میں سو میں اپنے ذاتی خیالات سے نہ سنی ہوں نہ شیعہ۔ کیونکہ خلافت کے معاملے کو محض ایک Academic Interest کی چیز سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں (برخلاف جمہور اہل سنت) کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت اسلام کے لئے مفید نہ تھی اور ان کا انتخاب نہیں ہونا چاہئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی میں حضرت عمرؓ کا شدت سے مداح ہوں۔ بحیثیت ایک سید کے میرا دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ حضرت علیؑ خلیفہ ہوتے اور ہمیشہ خلافت سیدوں ہی کو ملتی!

نذر الباقر صاحب اس قدر لبرل ہیں کہ وہ اس مہمل اور بے معنی بات کو کہ ہر شخص کو مذہب کے بارے میں Catechise کرتے پھریں بالکل ناپسند کرتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں (یا ہمارے آج کل کے مخالفین کی اصطلاح میں) یونہی سمجھ لیجئے کہ پکا نیچری ہوں۔ آگے چل کر قبر پرست یا پیر پرست بن جاؤں تو خبر نہیں۔

ایک مذہب رواجی ہوتا ہے اور ایک مذہب و عقیدہ قلبی۔ میں دشمنان اہل بیت کو دشمنان اسلام سمجھتا ہوں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک شخص جسے آل رسولؐ ہاشمی ہونے کا فخر حاصل ہو اس سلسلے میں کوئی دوسرا عقیدہ کیسے رکھ سکتا ہے۔

اوپر کے جملوں کو پڑھ کر خود مجھے ہنسی آتی ہے۔ معاملہ تو شادی کا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ دیکھا جائے کہ میری طبیعت مس باقر کی طبیعت سے میل کھا سکے گی یا نہیں اور بجائے اس کے کہ یہ تحقیقات کی جائے کہ مس باقر مجھ سے نفرت تو نہیں کرتیں (الفت کا تو نام ہی لینا فضول ہے) بحث یہ کی جاتی ہے کہ تم حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہو یا نہیں۔

ان تمام باتوں کا خیال کر کے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کو اختیار کامل دیدوں۔

سپردم بتومایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

خاکسار

سجاد حیدر

اسی اثنا میں یہ افواہ اڑ گئی کہ بنت نذر الباقر کی آنکھیں اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب وہ تقریباً نابینا ہیں۔

مسوری

۵ مئی ۱۹ء

مکرمی آداب عرض ہے۔ سامی ناموں کا شکریہ۔ جس شخص کو میں قول دے چکا ہوں کہ اس کا نام ظاہر نہ کروں گا اس کا نام آپ کو کس طرح لکھ سکتا ہوں۔ شاید آپ خود سے پسند نہ کریں گے۔ اس شخص نے خدانخواستہ اندھا ہوتا تو نہیں لکھا تھا جو آپ فرماتے ہیں کہ بھلا اندھے بھی مضمون لکھا کرتے ہیں۔ معاف فرمایئے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی بات کی پچ ہے۔

میں اب مسوری آگیا ہوں۔ اکتوبر تک یہیں رہوں گا۔

خاکسار

سجاد حیدر

بل دیو۔ مسوری

۲۷ مئی ۱۹ء

مکرمی و معظمی

سامی نامہ کا شکریہ عرض ہے اور دوسرے سامی نامے کا بھی جو ابھی ملا ہے۔

آپ کی ناسازی طبیعت کا حال سن کر تعلق خاطر ہے۔ رخصت اتفاقیہ کے لئے بھی مجھے دقتیں پیش آتی ہیں۔ یعنی اگر پولٹیکل ایجنٹ[23] صاحب یہاں ہوں تو میں جتنے دن چاہوں رخصت لے لوں۔ لیکن ان کی غیر حاضری میں میں کہیں نہیں جا سکتا۔ ایجنٹ صاحب آج کل ڈلہوزی گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے میرا یہاں سے ٹلنا دشوار ہے۔

آپ تبدیل آب و ہوا کے لئے ضرور اور فوراً تشریف لے آیئے۔ مکان سرکاری ہے اور اس میں کافی جگہ ہے۔ اس تحریک و دعوت میں میری خود غرضی بھی شامل ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ اس خط کے جواب میں مجھے آپ کی روانگی کا تار ملے۔

خاکسار

سجاد حیدر

بل دیو۔ مسوری

۲۳ جون ۱۹ء

مخدومی و مکرمی۔ آداب عرض ہے۔ عنایت نامہ پرسوں شام کو پہنچا۔ میں اسی وقت جواب دینا چاہتا تھا مگر برادر وحید کی طبیعت پھر اس قدر ناساز ہو گئی ہے اور لکھنؤ سے (جہاں ڈاکٹر عبدالرحیم کے پاس اس کا علاج کرایا جا رہا ہے) ایسی متوحش خبریں آ رہی ہیں کہ میں سخت پریشانی میں ہوں اور کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتا۔ خدا اسے صحت عاجل و کامل عطا فرمائے۔

اگر خدا کو یہ منظور ہے کہ میرا ان کا ساتھ ہو تو میرا ارادہ ہے کہ وہ پردے میں نہ رہیں[24] اس

وقت ہر شخص انہیں دیکھے گا۔ مگر ستم دیکھئے کہ مجھے اس وقت فوٹو کی طرف سے بھی ناامیدی ہے۔

اگر نذر الباقر صاحب کو باہر جائیں گے تو ظاہر ہے کہ گھر کے کچھ لوگ کچھ دنوں کے لئے مراد آباد آئیں گے— اس وقت میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی چچی اور بھابی کو ملنے کے لئے بھیجوں— وحید کی بیوی بہت فہیم اور سنجیدہ مزاج ہیں وہ بھی ساتھ ہوں گی—

خاکسار

سجاد

دہرہ دون

۱۲۷گست ۰۹ء

مکرمی— گرامی ناموں کا شکریہ—

ہز آنر لفٹننٹ گورنر یہاں آئے ہوئے ہیں— اس سلسلے میں کچھ تو اپنے کار منصبی کی وجہ سے مشغول رہا اور کچھ اس وجہ سے کہ مجھ پر مفت کا کام پڑ گیا ہے کہ دہرہ دون میونسپلٹی کا ممبر ہوں—[25]

آپ کے دونوں عنایت ناموں کا جواب عرض کرتا ہوں۔

میں اپنے تئیں کسی طرح بھی خلیفہ حامد حسین کے مقابلے میں قابل ترجیح نہیں پاتا۔ دولت میں، عزت میں وہ مجھ سے بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ ہاں شاید پڑھنے لکھنے کا شوق مجھے زیادہ ہے، انہیں اتنا نہیں۔

فوٹو گراف دکھانے کا قاعدہ اب خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں جاری ہو چلا ہے۔ اسی وجہ سے میرا خیال تھا کہ آپ لوگوں کو تصویر دکھانے میں عذر نہ ہو گا۔

خاکسار

سجاد

رفاہ عام پریس، لاہور

۱۸ ستمبر ۰۹ء

مکرمی معظمی۔ آپ کا عنایت نامہ شدید انتظار میں ملا۔

میں اپنی لڑکی[26] کو لے کر سیالکوٹ پہنچا۔ ہمشیرہ کو بھی بلوایا اور ہر روز کئی کئی پہروں تک دیکھا۔ اور اس میں کوئی بات وہم و شبے کی نہ رہنے دی۔ میری ہمشیرہ معظمہ بھی عزیزہ کو دیکھ کر بار بار اپنی حیرت ظاہر کرتی تھیں کہ ہیں ان آنکھوں پر کوئی اعتراض کرتا تھا۔

زیادہ مشکل یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کے دل میں شک ڈالا ہے کوئی ایک شخص خاص ہے جس نے عزیزہ کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ مخبر کا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ یہ یقیناً مخبر کی ہدایت سے ہوا ہو گا۔

اب آپ کسی عورت کو بھیج دیں۔ وہ ایک دن میں آپ کو مطمئن کر دے گی۔ عزیز وحید[27] میو ہاسپٹل ہی میں ہیں۔ وکٹر ونگ میں مریضان چشم رکھے جاتے ہیں۔ وہاں یورپین نرسز آنکھوں کے کام پر متعین ہیں۔ ان کو وحید ضرور جانتے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو بھیج دیں۔ ان سے بہتر کون دیکھ سکتا ہے۔ میرا

مطلب یہ ہے کہ آپ کا جو بھی شبہ ہوا میں اس کے دور کرنے اور پورا اطمنان دلانے کے لئے تیار ہوں۔ یورپین نرس، دیسی معمولی عورت، ہندو مسلمان، عیسائی جسے بھیجیں اس کے لئے وہاں تک رسائی پیدا کر سکتا ہوں۔

چونکہ آپ نے مجھے اکتوبر اور مارچ دونوں وقت کا اختیار دے دیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی طرف سے اکتوبر کا مہینہ مقرر کر دیا تھا۔ سید ظہور حسنین کو اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے رخصت کی درخواست کر دی۔ ایک دوست دوسرے دوست کو خبر کرتا جاتا ہے۔ اب آپ براہ عنایت تار سے اطلاع دیں اور اپنے بڑے بھائی صاحب کو لکھ بھیجیں کہ میں نے اطمنان کر لیا ہے آپ تاریخ مقرر کرائیں۔

سید ظہور حسنین الہ آباد سے آتے ہوئے میرے پاس ٹھہر کر سیالکوٹ جائیں گے۔

جواب کا منتظر اور نہایت مضطرب

ممتاز

رام باغ

۲۷ ستمبر ۱۹۰۹ء

مخدومی و مکرمی۔ آداب عرض ہے۔

مکرمت نامہ مسوری سے واپس ہو کر مجھے آج یہاں ملا۔ میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید میں دسمبر یا جنوری میں ملازمت سے استعفا دے کر ہندوستان ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اپنے مصائب میں کسی دوسرے کو کیوں شریک کروں۔

خاکسار

سجاد

مولوی ممتاز علی سمجھ گئے صاحبزادے بدک گئے ہیں اب انہوں نے ایک اور تکنیک استعمال کی ایک ہمدرد، ہمدم رفیقہ حیات انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔

"..... میں ۱۸۹۴ء میں سخت بیمار ہوا اور موت کے کنارے جا لگا۔ میرے والد ماجد بھی زندہ تھے۔ کئی بھائی بھی بہنیں بھی۔ (پہلی) بیوی بھی تھی۔ آہ میں کس طرح اس رفیق کی شب بیداریاں اور خدمت گذاریاں بیان کروں۔ منہ سے آہ نکلی اور وہ بستر سے اٹھی۔ کروٹ بدلی اور اس نے سوال کیا کہ کیا بے چینی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتا پلاتا دوا دیتا۔ میں سوؤں تو نگہبان بن کر جاگنا۔ نماز پڑھ کر اللہ سے دعائیں مانگنا۔ ڈاکٹر کے لئے نوٹس لکھنا۔ چارٹس تیار کرنا۔ ایک بات ہے جو میں بتاؤں ؟؟ میں مرض سے بچ گیا۔

مسز تامس آرنلڈ کو آپ جانتے ہیں۔ میری ان سے بہت دوستی تھی۔ وہ ایک شام میرے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرے اور کھانے کے مقررہ وقت پر کچھ منٹ گزر گئے۔ مجھ سے کہا کہ مسز آرنلڈ اب مجھے ڈانٹیں گی۔ آپ میرے ہمراہ چلئے میں ہمراہ گیا۔ انہوں نے تمام قصہ بیان کیا کہ انھیں مرض ٹیوبر کلاسس ہو گیا تھا۔ مسز آرنلڈ نے کس طرح ان کی خدمت اور نرسنگ کر کے انہیں بچایا۔ مسز آرنلڈ نے مجھ سے کہا کہ

میں ان کی بیوی ہی نہیں دوست بھی ہوں اور رفیق بھی۔

خاکسار

ممتاز علی

مسوری

۱۰ اکتوبر ۰۹ء

مخدومی و مکرمی۔ تسلیم

میں نے Annfield Tea Estate سے جہاں میں گیا ہوا تھا آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کے دوسرے روز ہی آپ کا تار پہنچا۔ میں Annfield میں ۷ اکتوبر تک رہا۔ ہز آنر لفٹنٹ گورنر کو وہاں ایک لنچ دیا گیا اور میری اس لنچ میں شرکت ضروری تھی۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ خان بہادر سید آل نبی کے ساتھ رشتہ کر دیا جائے گا۔ اور یہ کہ محض آپ کے اصرار سے میری طرف خیال ہوا تھا۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ میرا بھی خیال ہے کہ میں خان بہادر صاحب کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہوں۔ وہ ماشاء اللہ خان بہادر 'نامور وکیل' معزز و محترم اور شیعہ! مجھ جیسے کس مپرس آدمی کے (مجھے یہ عرض کرنے میں شرم نہیں کہ غدر ۵۷ء کے بعد سے ہمارا خاندان مزدوروں یعنی نوکری کرنے والوں کا خاندان ہے) پاس کیا ہے؟

دارم دلے' اماچہ دل؟ صد گونہ حرماں دربغل

زیادہ زیادہ السلام مع الاکرام

خاکسار

سجاد حیدر

رفاہ عام پریس۔ لاہور

۲۴ اکتوبر ۰۹ء

مکرمی و معظمی، تسلیم

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میر نذر الباقر کے گھر پورا ہندوستانی پردہ ہے' اور سادات بارہہ کی بچیوں کی تصویریں کھینچنا اب تک معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میر نذر الباقر لڑکیوں کی تصویر اتروانا ناجائز سمجھتے ہیں۔ تصویر دینا تو جدا بات ہے میں نے کبھی سنا تک نہیں کہ مس باقر یا ان کے گھر میں کسی لڑکی کا بھی فوٹو لیا گیا ہو۔ ہاں بعض اوقات ڈاکٹروں نے مثلاً ڈاکٹر بھگت رام سول سرجن کشمیر نے لڑکیوں کو بیماری میں دیکھا اور ان سے باتیں بھی کیں۔

عزیزہ بنت نذر الباقر کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی اور اس نے بہت شوق سے اخبار "تہذیب نسواں" خریدنا شروع کیا تھا۔ اس وقت سے میں اس عزیزہ کو اپنی حقیقی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا رہا۔ اس بے چاری کا بڑا بھائی رضا باقر مر گیا تھا۔ وہ مجھے رضا باقر کی طرح

سمجھنے لگی۔ اس تعلق خاطر کی وجہ سے جو مجھے اس بچی سے ہے میں نے رشتے کی کوشش کی اور اب کہ صرف تعین تاریخ کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا تھا' آپ کی فرمائش فوٹو کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ میں خود فوٹو کا قائل نہیں۔ بعض تصویریں خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ صاحب تصویر بد صورت نکلتا ہے۔ مدت کی بات ہے میں نے مولوی چراغ علی صاحب حیدر آباد کی تصویر دیکھی تھی اور ان کو خوبصورت نوجوان سمجھتا تھا۔ دیکھا تو شکل برعکس پائی۔

اس اثنا میں لوگوں نے یہ بھی مشہور کر دیا ہے کہ آپ کی اس سے نسبت طے ہو چکی ہے۔ عزیزہ کے پاس مسز اقبال 28' مسز عبد القادر 29' مس محبوب 30 عالم' وغیرہ کی طرف سے مبارکبادیں پہنچی ہیں اور یہ چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ ان غلط فہمیوں کی بنا پر یہ نسبت ٹوٹ گئی تو میں میر صاحب کو عمر بھر منہ نہ دکھا سکوں گا اور وہ میری ذلت و رسوائی ہو گی کہ خدا کسی کو نہ دے۔ میں اپنی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں پاتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو میں خود آپ کے پاس آؤں۔

جواب تار سے عنایت ہو۔

جواب کا منتظر اور نہایت مضطرب

ممتاز علی

میر ظہور حسنین بنام مولوی سید ممتاز علی صاحب

بدایوں

۲۵ اکتوبر ۰۹ء

مکرم بندہ۔ تسلیم

مسٹر ظفر عمر مجھ سے دریافت فرماتے تھے کہ بنت نذر الباقر کی بصارت کی کیا کیفیت ہے۔ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بات میں سجاد حیدر صاحب نے کچھ ان سے استمداد چاہی ہے۔ کیونکہ انہوں نے یہ فرمایا کہ میں اوسے مراد آباد بلواؤں تاکہ اون کی گھر میں سے جا کر بچشم خود اطمینان کر لیں۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں ان کو لکھ دیا کہ آنکھوں میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے۔ کمزور ضرور ہیں اور وہ بچی مراد آباد نہیں آئے گی۔

میں نے ظفر عمر صاحب پر ظاہر کر دیا کہ حقیقتاً خاندان والے اس رشتے پر آمادہ نہ ہوتے اور خان بہادر سید آل نبی وکیل آگرہ کو ترجیح دیتے ہیں جو شیعہ مذہب ہیں اور اون سے خاندانی تعلق ہے لیکن بھائی صاحب قبلہ میر نذر الباقر کو یہ رشتہ پسند ہے۔

آخر یہ کیا لغویت ہے کہ میں لڑکی کو مراد آباد بلا کر مسز ظفر عمر کو ملاحظہ کراؤں۔

میں صرف آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ کل الہ آباد واپس جا رہا ہوں۔

آپ کا نیاز مند ظہور حسنین

میر نذر الباقر بنام سید سجاد حیدر یلدرم

سیالکوٹ

۲۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء

برادر گرامی قدر سلمہ ' سلام علیکم

عرصے سے مجھے اتفاق تحریر خط نہیں ہوا۔ آپ کے محبت نامے کا جواب بھی نہ دے سکا۔ کچھ مکروہات زمانہ کچھ مقام سے غیر حاضری وغیرہ وغیرہ۔

بالعموم زمانہ میں شرفاء کی آبرو اور ناموس ایک ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی رشتہ و قرابت سے منسلک ہوں یا کوئی تعلق مابین نہ ہو مگر ایک زبردست تعلق شرافت حفظ ناموس و پاس آبرو کا رہتا ہے۔ میرا اور آپ کا خون بزرگوں کے خون سے پیوستہ ہے جن کی اولاد ہونا ہمیں سربلند کرتا ہے۔ میں نے مولوی ممتاز علی صاحب قبلہ کی خدمت میں تحریر کیا تھا کہ بہ قاعدہ قدیم آپ کی طرف سے کوئی بزرگ خاتون یا مرد تشریف لادیں اور اس رشتہ کی تکمیل کرجاویں جس کی غرض ہی یہی ہوتی ہے کہ بہت سے شکوک رفع ہوں اور قبل از تعلق قرابت و یگانگت وانس دونوں خاندانوں میں پیدا ہو جاوے۔ مگر مولوی ممتاز علی صاحب قبلہ نے بھی بہ استصواب آں برادر گرامی قدر ہمیشہ یہی لکھا اور اس پر مصرر ہے کہ کسی بزرگ خاتون اور بزرگ خاندان کا اتنی دور آنا دشوار ہے اور سید سجاد حیدر صاحب ان فضولیات کے پابند بھی نہیں ہیں۔ مولوی صاحب اس تحریک کے دوران سیالکوٹ تشریف لائے۔ ان کی صاحب زادی' بندہ زادی سے ملنے آئی۔ اور محض بزرگانہ محبت و مروت سے کسی طرح کا ہم لوگوں کو شک تک نہ آنے دیا کہ کیا غرض و غایت اس سفر کی ہے۔ اس کے بعد جیسا مولوی صاحب قبلہ نے فرمایا بسرو چشم منظور کرلیا۔ بعد طے ہونے ان سب مراحل کے' اب یہ کس قدر گرانبار خاطر ہے۔ چند معزز بے لگام خواتین نے لڑکی کی تصویر کے حصول کی کوششیں بھی کیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون شریف کلام مجید پر اعتقاد رکھنے والا ہوگا جو اپنی مستورات کی تصاویر کھنچوائے۔ **العظمة لللہ**

میں امید کرتا ہوں کہ میری تحریر کی بے ربطی اور زبان کے بے ضبطی کا برانہ مانیں گے۔ دل کو صدمہ پہنچا۔ عرض حال کردیا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا تحمل اور بردباری اس سے اعلیٰ وارفع ہے کہ میری یہ شکستہ قلمی اور پریشان گوئی آپ کو رنجیدہ کرے۔

دعاگو

نذر الباقر

بنام مولوی سید ممتاز علی صاحب

دہرہ دون

۲ جنوری ۱۹۱۰ء

مخدومی و مکرمی تسلیم

میں ایک ہفتہ کی رخصت لے کر وطن' دلی اور میرٹھ گیا تھا۔ واپسی پر آپ کے عنایت نامے ملے۔ یہ محض غلط ہے کہ میں نے ظفر عمر سے کہا کہ مسز ظفر عمر جاکر بنت نذر الباقر کو دیکھیں۔ یہ تجویز علی گڑھ کے چند دوستوں کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خلیفہ حامد حسین سے صرف اس بات پر ناراضگی ہوگئی کہ انہوں نے خفیہ طور پر ایک عورت کو دریافت حالات کے لئے بھیجا تھا۔

بہرحال ملتجی ہوں کہ آنریبل خان بہادر سید آل نبی کی جانب سے جو سلسلہ چھیڑا گیا ہے وہ آگے بڑھایا جائے۔

خاکسار

سجاد حیدر

۸- غلاطہ کابل[31]

لاہور

۲۸ اپریل ۱۹۱۰ء

مائی ڈیر سجاد حیدر

آج نئے پولٹیکل آفیسر کو چارج دینے سے قبل چاہتا ہوں کہ آپ کی اس رفاقت اور اعانت کا شکریہ ادا کروں جو مسوری اور دہرہ دون کے زمانہ قیام میں بسلسلہ خاندان افغانان مجھے آپ سے حاصل ہوئی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا کام آسان نہ تھا۔ کیونکہ آپ نے بحیثیت اسسٹنٹ پولٹیکل آفیسر نجف علی خاں سے چارج لیا تھا جو افغان سرداروں کے ساتھ ایک طویل مدت تک رہے تھے۔ لیکن آپ نے ساری مشکلات اور مسائل کو اس خوش اسلوبی سے حل کیا کہ سابق امیر اور ان کے تمام ساتھی آپ کے نہایت گرویدہ اور شائق ہو چکے ہیں۔ میری بہترین خواہشیں آپ کے ساتھ ہیں۔

آپ کا مخلص

سی۔ جے۔ ونڈھم

از طرف میجر سی۔ جے۔ ونڈھم

سابق پولٹیکل آفیسر برائے سردار محمد ایوب خاں و نگراں سردار محمد یعقوب خاں' معزول امیر کابل' حالیہ ریذیڈنٹ ریاست جودھ پور

اقبال نے خیالستان کو پنجاب یونیورسٹی کے بی۔ اے کے اردو نصاب میں شامل کروایا۔ جنوری ۱۹۱۱ء میں ہم چھ ماہ کی رخصت پر پھر سیاحت کے لئے ہندوستان سے نکلے۔

"اپنے کلاس فیلو ڈاکٹر سید محمد کی بے ریا پر صداقت مہمان نوازی اور ہیکل اخلاق و تواضع ہزہائی نس نواب جنجیرہ مس عطیہ فیضی اور ان کے خاندان کے التفاف و توجہات کے چھاپے دل پر لئے ہوئے" بمبئی سے جہاز پر چڑھے اور

"پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو
دل خانہ خراب کی باتیں"

اور

"ہمارا نام بھی لے کر پکار ہم بھی ہیں
لبیک! لبیک! لبیک!!!"

کہتے دوبارہ بلاد عثمانی کا رخ کیا۔ "سلوبوٹ ٹو چائنا" کا افسانوی دور کہ جنتوں کی مسافتیں ہفتوں اور مہینوں میں طے ہوتی تھیں۔ امپریل کولونیل عہد کے "ایسٹ آف سوئز" سے چلنے والے پی اینڈ او کے دخانی جہاز تھے یا بحری فردوس۔ "سمندر اور سوسائٹی دونوں پر لطف۔" راستے میں عدن کو جو باوجود دوربین کے "باغ" نظر نہ آیا' دور سے ہی سلام کیا۔ ارض فراعنہ پہنچے۔ سب سے پہلے اس شخص کے بت نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جس نے گو خدائی کا دعوے نہیں کیا لیکن نیچر کے کاموں میں عظیم الشان تبدیلی کر دی۔ دو براعظم جدا کر دیئے۔ دو سمندر ملا دیئے' موسیو لیسپ! یہ کامران فرہاد جوئے سوئز نکال کے اپنا آسمان کے تلے نام کر گیا۔"

(لیسپ دراصل بڑا چلتا پرزہ تھا۔ مصریوں کو خوفناک اقتصادی چوٹ دے کر برطانیہ اور فرانس کو مالا مال کر گیا۔ ۱۹۱۱ء سے تقریباً نصف صدی بعد قوم پرست مصری اس عظیم الشان مجسمے کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے تھے۔ لیکن وہ زمانہ ابھی بہت دور ہے۔

نہر سوئز کے دونوں طرف تیز زرد صحرا اور کھجور کے ہرے درخت دکھلائی دیتے ہیں۔ اور جگہ جگہ پر پانی کا رنگ بدلا کرتا ہے۔ نوے میل لمبی نہر میں جہاز جوں کی چال چلتا ہے۔ دن بھر چلتا رہتا ہے مگر کنال ختم ہونے میں نہیں آتی اور وقت کی آہستہ خرامی کا احساس گہرا ہوتا جاتا ہے۔ آج سے پینسٹھ (۶۵) برس قبل جہاز کی رفتار اور بھی کم ہوتی ہوگی۔)

"ہمارا جہاز نہر سوئز میں دن بھر چلا کیا۔ نہر کے کنارے پر ریلوے لائن اس قدر قریب ہے کہ جہاز سے دکھائی دیتی ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا' مجھے اسلامی ملک میں ریل دیکھنے کا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا میں کئی گھنٹے متواتر ڈیک پر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کوئی ٹرین گزرے۔

"یہ اژدر آہن' جس نے دنیا میں ایسے ایسے تغیرات پیدا کر دیئے...... ایک دفعہ اسے اپنی

دھماکے کی چال سے اس زمین پر چلتے ہوئے دیکھ لوں۔ میں نے ساڑھے تین سال بغداد میں گزارے۔ مگر وہاں بغداد ریلوے کی گونج تھی اور ریلوے ابھی نہیں پہنچی تھی۔"

(ترکی میں ریل ۱۸۵۶ء میں جاری ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۶ء سے اناطولیہ میں برطانوی اور فرنچ سرمایہ سے ریلیں چل رہی تھیں۔ ۱۲ اگست ۱۸۸۸ء کے روز جب اورینٹل ریلویز کی ٹرین (جو بعد میں اورینٹ ایکسپریس کہلائی) پیرس سے روانہ ہو کر دی آنا اور دولت عثمانیہ کے یوروپین صوبوں سے گزرتی قسطنطنیہ میں شاخ زرین کے ریلوے اسٹیشن پر پہونچی ترکی میں قومی جشن منایا گیا۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۹۰۲ء میں ایک جرمن کمپنی کو بغداد ریلوے کا ٹھیکہ دیا جس کی برطانیہ نے انتہائی مخالفت کی۔ برطانیہ اور جرمنی دونوں زوال پذیر دولت عثمانیہ میں اپنا اقتصادی اور سیاسی اقتدار بڑھانے کے درپے تھے۔ سلطنت ترکیہ کی زبردست تجارت اور عثمانی خاور میانہ میں تازہ دریافت شدہ تیل کا استحصال دونوں بڑی طاقتوں کا مقصد تھا۔ فرانس کے موسیو لیسپ نے خدیو سعید پاشا کو چونا لگایا تھا۔ نہر سوئز کی اقتصادیات کے ذریعے برطانیہ مصر کا خون چوس کر اس پر اپنا تسلط جما رہا تھا۔ جرمنوں کی بنائی ہوئی بغداد ریلوے نہ صرف نہر سوئز کی تجارتی حریف بن سکتی تھی بلکہ قیصر جرمنی اس کے ذریعے اپنی افواج ہندوستان پہنچا سکتا تھا۔ "برلن بازنطیم بغداد ریلوے" کے ذریعے ترکی میں جرمنی کا اثر اور بڑھ جاتا۔ کرپ امپریل ٹرکش نیوی کو تارپیڈو اور عثمانی افواج کو اسلحہ فروخت کر رہا تھا۔ اسی زمانے سے جرمن یہودیوں نے عثمانی فلسطین میں چھوٹی چھوٹی زرعی نو آبادیاں قائم کرنی شروع کیں۔ لہٰذا روس' برطانیہ اور فرانس نے بغداد ریلوے اسکیم کی شد و مد سے مخالفت کی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے اپنے مفادات پر زبردست ضرب پڑتی تھی۔ لیکن چونکہ بغداد ریلوے میں ترکی کا قومی مفاد بھی مضمر تھا "نوجوان ترک" اس کے حامی تھے۔)

"جتنی دیر میں ڈیک پر رہا ٹرین نہ گذری۔ جوں ہی ڈیک سے اتر کر نیچے گیا لوگوں نے کہا گذر گئی۔ پھر دوسری مرتبہ جا کر بیٹھا۔ کھانے کا وقت بھی گزر گیا۔ جب بھوک نے بہت ستایا۔ میں کچھ کھانے کے لئے نیچے اترا اور جھٹ ٹرین صاحب گھڑگھڑاتی ہوئی گذر گئیں۔ آخر تیسری مرتبہ ڈیک پر جا کر بیٹھا۔ اس مرتبہ اس محبوبہ مطلوبہ نے اپنا جمال دخان افزا مجھے دکھایا۔ ایک ترکی ٹوپی ٹرین کو لئے جا رہی تھی۔

"نہر سوئز کے ایک طرف بادیۃ الشام ہے۔ ایک طرف ریگستان مصر..... مصر اس سرے سے اس سرے تک ایک کشت زار ہے اور (ریگستان) نظر بد سے بچانے کے لئے کاجل کا ٹیکا...... مگر یہ کاجل کا ٹیکا .... "(مصر کو نہ بچا سکا)

آدھی رات کو پورٹ سعید کی زبردست بندرگاہ میں جہاز' موٹر کشتیاں آ جا رہی تھیں اور جہاز کی سیٹیوں کا تار بندھا ہوا تھا۔

"...... کیا یہ مصر کا شہر تھا یا اٹلی یا یونان کی ایک بندرگاہ؟ بازار' قہوہ خانے' ریستوران' لوقنطے یوروپینوں سے بھرے پڑے تھے۔ دوکان میں سب مال و اسباب یوروپ کا تھا' بیچنے والے بھی یوروپ کے تھے ...... پہلے ہی دن مجھے ثابت ہو گیا کہ اٹالین اور فرنچ اور گریک لوگ بیسویں صدی میں اہل مصر سے

بنی اسرائیل کا بدلہ لے رہے ہیں کہ آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد.....

"........ اب ہم اس ملک میں تھے جہاں برقع بازار میں 'اسٹیشن پر' سیر گاہوں اور ناچوں میں ہر جگہ نظر آتا تھا' ہندوستان کی طرح صرف عورتوں کے ویٹنگ روم اور اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم ہی پر اور وہ بھی بدرجہ آخر اور بدرجہ مجبوری' دکھائی نہیں دیتا........"

پورٹ سعید کے "محطہ" (اسٹیشن) پر "شیال" (قلی) نے "عفش" (بک) کیا اور "ناظر المحطہ للتسات التخلیص" (اسٹیشن ماسٹر فورلیڈیز بکنگ) وغیرہ الفاظ نے وہ فرحت بخشی جو بادیۃ المصر اور بادیۃ السودان میں ایک سانڈنی سوار کو نخلستان نظر آنے پر حاصل ہوتی ہے۔ ٹرین آئی تو اس کے ایک ڈبے پر لکھا تھا "للحریم۔" ہندوستان میں "صرف عورتوں کے لئے" دیکھتے دیکھتے طبیعت اس قدر اکتا گئی "للحریم" بہت بھلا معلوم ہوا۔

صبح کی ٹرین پر سوار ہو کر دن کے تین بجے قاہرہ کہنا چاہیے مصر پہنچے۔ کیونکہ اہل مصر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔ مصر کیا عجیب شہر ہے"..... "تیز رفتار برقی ٹراموے' گھوڑا گاڑیوں اور ان کی بسوں اور ٹریفک کی ریل پیل سے طبیعت پریشان ہوئی۔ کیونکہ "بڑے شہروں کی شان و شوکت اور امتزاج ثروت و فلاکت سے ہمیشہ گھبرایا"32

"ایک وطن سے دور دراز مقام میں یعنی قسطنطنیہ میں جہاں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وطن یاد نہیں آتا مگر جہاں میں رات دن وطن کی یاد میں اشکباری نہیں کرتا۔ اور میں کیا کوئی بھی نہ کرے گا۔ کل مارچ کا اولڈ بوائے ملا۔ سیر و سیاحت چھوڑ چھاڑ کے اول اسے از ابتدا تا انتہا ختم کیا۔ یہاں ایک یونیورسٹی قائم ہوئی ہے۔ اس کا نام "دار الفنون" ہے۔ اسے یوں بھی دیکھنے جاتا مگر اس میں میرے بغداد کے ایک دوست فہمی بک پروفیسر ہیں۔ ان کی وجہ سے اکثر جانا ہوتا ہے۔ کل جو گیا تو اولڈ بوائے کو بھی لیتا گیا اور وہاں پروفیسروں کو دکھایا۔ قدرتی طور پر ان سب نے نہایت شوق سے دیکھا اور اظہار مسرت کیا۔

"مگر ذرا پوچھئے تو کہ اعتراض کس بارے میں کیا؟ دو اعتراض تھے اور دونوں میری رائے میں صحیح۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ کالج کو شاندار بنانے کے لئے کم از کم دو منزلہ ہونا چاہئے۔ وسعت ہی کافی نہیں رفعت کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرا اعتراض آپ کے "اولڈ بوائے" پر تھا اور یہ اعتراض بالعموم اردو پر عائد ہوتا ہے۔ مجھ سے کہا کہ آپ ابھی پتھر کے چھاپے سے آگے نہیں بڑھے۔ اور یہ بڑا چبھتا ہوا ریمارک تھا۔ قائل۔ اگر ہمارا یہ دعوی ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں تو ہمیں لیتھو کو خیرباد کہنا چاہئے۔ ورنہ آپ کی کتابیں دیکھ کر اہل اسلام تبسم زیر لب سے آپ کی طرف دیکھیں گے۔

قسطنطنیہ میں حروف نسخ کا ٹائپ ایسا مکمل اور ایسا خوش خط ڈھالا جاتا ہے کہ اس کو دیکھ کر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ آنکھوں کو نور تو شاید شاعری سمجھی جائے اور رہے بھی' لیکن جب "دل کو سرور حاصل ہوتا ہے" کہتا ہوں تو میں اپنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہوں۔

یہ وہ ٹائپ نہیں ہے جس میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ چھپتا ہے۔ مگر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

کو ٹائپ میں چھپنے کی وجہ سے قابل ستائش سمجھتا ہوں۔ کاش ہمارے مطابع اس طرف متوجہ ہوں۔ میں رائے پیش کرتا ہوں کہ "اولڈ بوائے" ٹائپ میں چھپے' لیکن وہ استنبولی ٹائپ ہو۔

خاکسار

سید سجاد حیدر۔ از قسطنطنیہ 33

ہم نے استانبول میں ایک مضمون بعنوان "باقی جب میں جاگوں" لکھا۔ نیم آزاد و برقعہ پوش ترک خواتین میں سے اکثر نے چہروں سے نقاب الٹ رکھی تھی۔ حسب معمول مزے سے سڑکوں اور بازاروں میں گھومتی نظر آئیں۔ ایک صبح دار الخلافت کے یورپین حصے سے سقوطری جانے والے دخانی جہاز میں سامنے کی سیٹ پر ایک البانوی مولینا تسبیح جھلاتے آن بیٹھے۔ یورپین مولوی سے باتیں کرتے کرتے معاً مولوی ممتاز علی یاد آ گئے۔ غلاطہ کے پل سے گذر کر ہم ایک دوکان پر پہونچے اور برقعہ خریدا۔ مئی کے مہینے میں ہندستان لوٹ کر وہ برقعہ دلی میں مشتاق احمد زاہدی کے پاس رکھوا دیا۔

اہل ویو مسوری۔ میز پر مولوی ممتاز علی کے خطوط لاہور سے آئے رکھے ہیں۔ فرماتے ہیں میر نذر الباقر تصویر بھیجنے پر قطعی آمادہ نہیں ہیں۔ اگر آپ اپنی ہٹ پر قائم ہیں تو مجبوری ہے۔ ورنہ میں آپ کو کوہاٹ تشریف لے جانے کا مشورہ دوں گا تاکہ میر صاحب اور ان کے دونوں بھائی آپ سے ملاقات کر سکیں۔

لہذا چند روز بعد ہم کوہاٹ روانہ ہوتے ہیں۔"

کوہاٹ میں میر ظہور حسنین نے جو اسی غرض سے الہ آباد سے وہاں گئے تھے ایک روز شام کے وقت اندر جا کر خالہ اشرف جہاں سے کہا' "خالہ۔ وہ حضرت تصویر کی شرط تو چھوڑ رہے ہیں مگر اب الٹی میٹم دیا ہے کہ شادی کے بعد لونڈیا بے پردہ نہ کروانے کے۔ باہر گھمائیں گے۔ آزادانہ۔ میموں کی طرح کھلے منہ۔"

طعام شب کے بعد باہر مردانے میں دوبارہ مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ رات گئے اندر جا کر میر ظہور حسنین نے کہا' "خالہ۔ اب اس بات پر راضی ہوئے ہیں کہ لونڈیا ترکی برقعہ اوڑھ کر باہر نکلے گی۔"

"نگوڑی ترکی ٹوپی تو جانوں۔ ترکی برقعہ کیسا ہوے ہے؟"

"اس میں منہ کھلا رہتا ہے۔ وقت ضرورت کالی جارجٹ کی نقاب چہرے پر ڈال لی جاتی ہے۔ چلو شکر کرو خالہ بات تو کسی طرح طے ہوئی۔"

مئی ۱۹۱۲ء میں ایک روز مسوری سے مشتاق احمد زاہدی کے پاس تار پہنچا۔ "برقعہ فوراً پارسل کر دو۔"

۹-- دربار شاہ ولایتؒ

سارا قصبہ امروہہ ایک وسیع جھیل پر منعکس ہے۔ موسم بہار کی شفاف دھوپ میں قصبے کی قدیم مساجد و مقابر اور دو منزلہ مکانات کے گنبد' مینارے اور کنگورے نیلگوں سطح آب پر مغل اسکول کے کسی خوش رنگ لینڈ اسکیپ کی مانند جھلکتے ہیں۔ جاڑوں کے کہرے اور گرما کے گرد و غبار میں جھیل کے اس پار سے شہر کا یہی منظر وکٹورین انڈیا کا ایک مٹیالا لیتھوگراف معلوم ہوتا ہے جو کسی سنسان سرکٹ ہاؤس کے برآمدے میں آویزاں ہو۔

امروہہ جو پہلے اپنے اہل علم و دانش کی وجہ سے مشہور تھا اب لوگ اسے چند نامور فلمی شخصیتوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اسی طرح کہ بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم خلد آشیانی کا نام اب کسو کو یاد نہیں البتہ شرمیلا ٹیگور کہ بحیثیت عائشہ سلطان' موجودہ بیگم بھوپال کی بہو ہیں۔

جھیل کے پیش منظر میں وہ شاہراہ ہے جو دلی سے نکل کر نہٹور اور امروہے سے گذرتی مراد آباد جاتی ہے۔ اسی قدیم سڑک کے کنارے جو اب نیشنل ہائی وے نمبر ۱۲ ہے سید شرف الدین نقوی شاہ ولایتؒ کی سفید درگاہ آم کے گھنے باغ میں پوشیدہ ہے۔ اندر احاطے میں معتقدین کی بھیڑ جمع رہتی ہے جو ۱۹۷۳ء کے مسائل کے حل کی امید میں شاہ ولایتؒ کے ان مٹیالے کراماتی بچھوؤں کو بڑے دھیان سے دیکھتے ہیں جو مجاور نذرانے وصول کرنے کے بعد ایک چبوترے پر رینگنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ غالباً مولانا ابو الکلام آزاد نے کہیں ذکر کیا ہے کہ جب بخارا کی فصیلوں پر حملہ کر کے زار روس کی افواج فتح یاب ہو رہی تھیں امیر بخارا جامع مسجد میں ختم خواجگان کروانے میں مشغول تھے تاکہ اس کی کرامت سے روسی فی الفور واپس بھاگ جائیں۔

شاہ ولایتؒ کے مزار کے سرہانے ایک جالی دار مرمریں حجرہ ہے۔ اس کے اندر "آسیب زدہ" لڑکیوں پر "حال" آتا ہے تو وہ اپنے لمبے لمبے بال سنگ موسی کے فرش پر پٹکتی ہیں۔ حجرے کے سیاہ طاق میں پنجے کے سیندوری نشان کے سامنے گھی کا چراغ جلتا ہے۔ کیسا نشان ہے اور چراغ کیوں جلتا ہے اور موت و حیات کے اسرار کھوجنے والوں کو کون جانے گا!

مزار کی پائنتی ایک سایہ دار برگد صدیوں سے اسی طرح کھڑا عوامی عقائد کے گورکھ دھندوں اور باطنی احوال کی بھول بھلیوں کی پاسبانی کر رہا ہے۔ اس بزرگ اور عاقل برگد کی پیچیدہ جڑوں کے نیچے بی نجوئی کی قبر ہے۔ بی نجوئی شاہ ولائت کی صاحبزادی نے بادشاہ وقت کا پیغام نامنظور کر دیا تھا اور احوال باطنی کی بھول بھلیوں میں مگن رہتی تھیں۔ صبح سے شام تک ان پہنچی ہوئی بی بی کے مزار پر منت ماننے والی برقعہ پوش عورتوں کے سائے ڈولتے رہتے ہیں۔

سائے کے اوپر سائے۔

ہلاکو کے حملے سے تباہ شدہ بغداد کے ریفیوجی سید شرف الدین نقوی ہندوستان پہنچ کر نکلے تو کہاں

نکلے۔ مغربی دو آبہ کے اس سر سبز گاؤں میں جس کے باغوں کے آم اور اس جھیل کی روہو' مچھلیاں از حد پسند آئیں۔ (امروہہ کی وجہ تسمیہ) اون علیہ الرحمتہ کی اولاد جہاں آباد ہوئی وہ دربار شاہ ولایتؒ اور عرف عام میں لکڑا محلّہ کہلاتا ہے۔

نانکزی والے لکڑا محلّہ والوں کے قریبی رشتے دار ہیں۔

۱۹۷۳ء۔ محلّے سے متصل قبرستان میں کاسنی اور سفید خودرو پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان بکریاں چرتی ہیں۔ پگڈنڈی پر سے سائیکل رکشائیں آ رہی ہیں جن پر سوار بل بوٹم پائجامے پہنے برقعہ پوش لڑکیاں کالجوں کی طرف رواں ہیں۔ گلیوں میں سفید پوش نقوی اپنی اعلیٰ نسبی اور عسرت کا بوجھ کاندھوں پر اٹھائے سر جھکائے شکستہ در و بام کے نیچے سے گذر رہے ہیں۔ زمین و آسمان زندہ رہتے رہتے تھک گئے۔

مئی ۱۹۱۲ء۔ سید ظہور حسنین رضوی ایک نامی حکیم سے علاج کروانے کی غرض سے امروہے میں فروکش ہیں۔ چند سال سے بیمار چلے آتے ہیں۔ اس وقت دربار شاہ ولایتؒ کے ایک ڈھنڈار مکان میں ماندہ اور مضمحل پلنگ پر لیٹے نہ جانے کیا سوچتے ہیں۔ ہر انسان کا ذہن اس کا اپنا دربار شاہ ولایتؒ ہے جس کے اندر کراماتی عقرب رینگتے ہیں۔ فرشتے اترتے ہیں۔ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ انوار کی بارش ہوتی ہے۔ اور ہر انسان کے سر پر موت کے بوڑھے برگد کا سایہ مسلط ہے۔ جو کیا جانیے کس لمحے اس کی زندگی کو اپنی مہیب پیچیدہ جڑوں کے اندر کھینچ لے۔

اور ہر انسان کے دل میں ایک اندرونی محل سرا ہے جس کی ڈیوڑھی کے باہر دنیا کا شور و غوغا جاری رہتا ہے۔ لیکن اس محل سرا کے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے ڈھنڈار بارونق وسیع تنگ صحن میں فکروں' امیدوں' خواہشوں' مستقبل کے اندیشوں' مسرتوں' آلام' ایقان' شکوک' خوف اور از سر نو امید کی ریل پیل رہتی ہے۔ فکر فردا یا د ماضی۔ لیکن ماضی ہی کتنا لمبا چوڑا ہے؟ عمر انتالیس سال۔ ابھی ساری زندگی سامنے پڑی ہے۔ مرض تشویشناک اور تکلیف دہ' مگر ممکن ہے اللہ بچالے۔

پلنگ کے سرہانے میز پر دواؤں کی شیشیاں' کتابیں' کامریڈ کے پرچے۔ لڑکے جو ایک ساتھ کود کر بڑے ہوئے اچانک ان کے راستے دنیا میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ سیالکوٹ والا ہم مکتب لنگوٹیا یار کشمیری نژاد پنجابی لڑکا اقبال آج زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ سن سن کر جی خوش ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے ہم مکتب دونوں۔ رام پور یے بھائی لیڈری پر اتر آئے ہیں۔

لیکن اس وقت کامریڈ میں مولانا محمد علی کا تازہ اڈیٹوریل پڑھنے کے بجائے میر ظہور حسنین ڈاکئے کے منتظر ہیں۔ علی گڑھ کے ساتھی سجاد حیدر کا پیغام مناکحت جو لاڈلی بھتیجی کے لئے آیا اس کے شاخسانے بہت پریشان کن ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں اپنے محکمہ پولس اور علی گڑھ کے ساتھی ظفر عمر سے بدایوں میں مچیٹا ہوا۔ لاہور میں مولوی ممتاز علی سے کھٹا بخشی رہی۔ بڑے بھائی فوجی ہیں مگر مرنجاں مرنج۔ میر ظہور حسنین پولس کے آدمی ہیں اور بید دبنگ۔ مجال ہے کوئی بیجا بات کے اور وہ اس کی طبیعت صاف نہ کر دیں لیکن اس بیماری نے لاچار کر دیا۔

کروٹ بدل کر تازہ کا مرڈ اٹھایا۔ پھر رکھ دیا۔ اخبار کے نیچے صحیفہ کاملہ نظر آئی۔ ادب سے ہاتھ میں لی۔ اصل کا مرڈ عابد بیمار زین العابدین" تھے۔ صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاک کا وقت ہے۔ کیا جانیے کوہاٹ سے بھائی جان قبلہ کا خط نذر کے بیاہ کی تاریخ کے متعلق کیا آتا ہے۔

اگست ۱۹۷۳ء۔ شاہ ولایت" کی اولاد پروفیسر سید مختار حسین نقوی لکڑا محلے کے اندر اپنی آبائی حویلی میں رہتے ہیں۔ بصارت زائل ہو چکی ہے۔ ان کی پہلی بی بی منظور زہرا بیگم بنت سید ظہور حسنین رضوی کی جوانمرگی کو بھی بیالیس سال گذر گئے۔ مختار خالو کے مکان کی ایک کوٹھری میں تاریخ سادات امروہہ کی جلدوں کے اوپر ایک ضخیم البم' سنہری جلد پر ۱۸۶۹ء منقش۔ قدیم پوشاکوں میں ملبوس بزرگوں کے علاوہ اس البم میں پچپن چھپن تصاویر برطانوی لارڈ اور لیڈی لوگ کی ہیں اور فرنگی اسکالر' جج' بیرسٹر' حسینائیں' ٹوپ ہیٹ والے نوجوان' کلوک اور تلوار والے فوجی افسر۔ امپریل برطانیہ اور اوسکر وایلڈ کا لندن! چند تصویریں دستخط شدہ اور عموماً ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۵ء تک کی تاریخیں۔ اسٹیفرڈ ٹیک لین۔ میری ویب۔ اینی ہالینڈ۔ اڈیلا ہالینڈ (بجد حسین)۔ اے جی ہالینڈ (اوسکر وایلڈ کی سسرال؟)۔ اوسکر وایلڈ۔ ایچ ایم تگرج (بالکل میلکم تگرج کے ہمشکل۔ شاید دادا)۔ مسز اور مس تگرج میری میڈ۔ سوزن ٹیری (ایلن کی رشتے دار؟)۔ رائیڈنگ کے لباس میں اڈا کیمپسن۔ جن تصاویر پر دستخط نہیں جانے وہ حسین اور بانکے لوگ کون تھے۔

Where are The Snows of Yester Year? اور سید احمد علی (ابن نہٹور جنگ ابن دلاور جنگ ابن نواب سید محمد رضا خان مظفر جنگ نائب دیوان و نائب ناظم بنگال بہار و اڑیسہ) اور ان کی بی بی مارگریٹ اشرف النساء بیگم' فیلڈ مارشل اول رابرٹس کی بہن' اور ان کی اولاد احمدی بیگم (جو ایک مصری پاشا سے بیاہی گئیں) اور سید یوسف علی۔

اور نواب یوسف علی کی بیٹی سلطان آرا بیگم (اہلیہ ثانی سید مختار حسین نقوی) وہ سامنے صحنچی میں نماز عصر ادا کر رہی ہیں۔ ۱۷۷۲ء میں لارڈ کلائیو نے نواب مظفر جنگ کو معزول کیا تھا۔ ۱۷۹۲ء میں وارن ہیسٹنگز نے جاگیر مظفر پور ضبط کر کے دلاور جنگ کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر کی۔ گورنمنٹ ہر مرنے والے کے بعد اس کے ورثاء کی پنشن آدھی کرتی گئی۔ سلطان آرا بیگم کو پچیس روپے ماہوار وثیقہ ملتا ہے۔

کہ آئین جہاں۔

سلطان آرا ممانی کو اپنی انگریز دادی کے کنبے سے قطعی دلچسپی نہیں۔ "اے رہے ہوں گے کوئی۔ ہم سے مطلب۔" وہ لاپروائی سے کہتی ہیں۔ بعد نماز عصر اٹھ کر طعام شب کا انتظام کروانا شروع کر دیں گی۔ نابینا شوہر کی دیکھ بھال اور ناتی پوتوں کے لاڈ پیار میں مشغول رہیں گی۔ اور چراغ جلے پڑوس کے قبرستان میں جا کر زہرا بیگم اور سید ظہور حسنین رضوی کے مزار پر فاتحہ پڑھیں گی۔

مختار حسین خالو کی عمر اب ماشاء اللہ اسی برس کی ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کی گرمیوں کی ایک سہ پہر جب باہر لو چل رہی تھی' مختار خالو نے مجھے بتایا ۱۹۱۲ء کے موسم گرما کی ایک سہ پہر اسی گلی میں دفعتاً غل مچا ایک انگریز آیا ہے۔ کورٹ صاحب کا مکان ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ ہم سارے لڑکے بالے باہر بھاگے۔ پھاٹک پر ایک لمبا تڑنگا نوکیلی مونچھوں والا انگریز تانگے سے اتر رہا تھا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا کورٹ صاحب کی ڈیوڑھی کی سمت چلا گیا۔

لڑکوں کا غول اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ "صاحب" مردانے میں داخل ہوا۔ دالان میں سامنے ہی کورٹ صاحب بستر پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ "انگریز صاحب" لپک کر آگے بڑھا اور پلنگ پر جھک کر کورٹ صاحب سے لپٹ گیا۔ یہ تو چچا نذر الباقر تھے جو نذر باجی کے رشتے کے متعلق اپنے چھوٹے بھائی ظہور حسنین سے صلاح مشورہ کرنے کوہاٹ سے آئے تھے۔

تین چار روز بعد میر نذر الباقر برادر خورد کو اللہ حافظ کہہ کر ڈیوڑھی سے باہر آئے۔ میر ظہور حسنین کا پلنگ صدر دروازے کے سامنے بچھا تھا۔ وہاں سے گلی نظر آتی تھی۔ ان کے اکلوتے بیٹے گیارہ سال سید آل حسنین بڑے ابا کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے تانگے پر بیٹھے۔ دیکھتے دیکھتے تانگہ دربار شاہ ولایت" کی گلی سے نکل گیا۔

چند روز بعد کوہاٹ سے خط آیا۔ میر ظہور حسنین نے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر اس کا جواب لکھا۔

امروہہ

۹ جون ۱۹۱۲ء

جناب بھائی صاحب مخدوم و مکرم دام ظلکم۔ بعد آداب و تسلیمات دست بستہ کے عرض یہ ہے کہ میری علالت کے مد نظر اگر نذر کی رخصتی کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو برائے مہربانی مجھے فوراً اطلاع دیجئے۔ آپ اپنی جان کو ہرگز فکر و تردد میں نہ ڈالیں۔ بہت طوالت ہو گی۔ وہ سامان جہیز لاد کر نہٹور یا مسوری لائیں۔ لڑکی کا اصلی گھر [illegible] آباد ہے اور سامان جہیز اس کو یہاں سے دیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں فریقین کی آسانی ہے۔

بھائی صاحب[34] سے میری طرف سے دست بستہ عرض کر دیجئے کہ وہ جملہ سامان کی جو دینا مقصود ہو ایک فہرست لکھ کر مجھے بھیج دیں۔ میں یہاں پڑا پڑا ہی انشاء اللہ جیسے ممکن ہو گا سب انتظام کر لوں گا۔ میں نہیں عرض کر سکتا کہ اس موقع پر علیل ہونے اور آپ کی خدمت نہ کر سکنے اور آپ کا ہاتھ نہ بٹا سکنے کا مجھ کو کس قدر صدمہ ہے۔ مگر مشیت ایزدی میں چارہ کار نہیں ہے۔ زیادہ حد ادب

خادم

ظہور حسنین

۱۰— "دل انگلش رخ ترکانہ داری"

لو بیوی۔ یہ بھی سن لو۔ نہنوری سانچق کیا لائے ہیں۔ ایک عدد کالا ترکی برقعہ اور اللہ رکھے نوشہ میاں کی کتابوں کا سنہرا مجلد سیٹ۔ آگے آیت۔ ساڑھے چار عدد براتی۔ اللہ رکھے نوشہ کے بڑے بھائی بہنوئی ایک وہی دیوبندی مولوی[35] صاحب اور ایک مولوی صاحب کا چھوٹا بچہ[36]

خاک پڑی اصلاح معاشرت نہ ہوئی عذاب جان ہو گئی۔ تکواں جوڑے دونوں لونڈیوں کی پیدائش کے وقت سے تیار کئے جا رہے تھے۔ سب مقفل کر کے الگ رکھ دیئے گئے۔ دلہن بیگم نے سفید چینا سلک کا غرارہ پہنا ہے۔ جاکٹ اور گلابی ڈوپٹہ۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر چڑھی بیٹھی ہیں۔ مولوی مجتہد کیوں آئے ہیں' کسی چرسٹین نچر پادری کو بلوا لیا ہوتا۔

جہیز دکھانے کی بھی مناہی ہے۔ اے بی بیوں بھی مراد آباد میں کہنے والے کہہ رہے ہیں میر نذر الباقر نے پردیس میں لونڈیا کی شادی رچائی۔ جنگل میں مور نا چا کس نے دیکھا۔

لیکن ایک بار پھر نانی اشرف جہاں بیگم نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ جتنی دیر اندر باہر زنانہ مردانہ ڈنر ہوئے وہ مصلے پر بیٹھی دعا درود میں مشغول رہیں۔ اسی وقت دولہا کا نام آفتاب نوشہ تجویز کیا۔

باہر لان پر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ "اہل کوہاٹ[37] یلدرم کو دیکھنے کے بے چینی سے مشتاق تھے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کئے گئے تھے بہت سے لوگ بن بلائے آ گئے۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے کھانا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ خاموشی سے باغیچے میں ٹہلتے رہے۔ پاپا مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے۔ اس لئے ان کی نظر اس مجمع کی طرف نہ گئی۔ جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آ کر بیٹھے تو پاپا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہاں ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے جن میں سے پاپا کسی کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے (جو یلدرم کے زمانے کے علیگ اور بیرسٹر تھے) یلدرم سے کہا! زہے نصیب کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے۔ جس طرح آپ کو زیارت قاہرہ کی کشش مصر لے گئی تھی ہم کو زیارت یلدرم کی کشش بنوں اور ہنگو سے کوہاٹ لے آئی۔

"پھر ان نووارد صاحبان کی قطار نے آگے بڑھ کر یلدرم کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہو چکا تھا اور ان لوگوں کو یلدرم کی شکل اچھی طرح دکھائی نہ دے رہی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے قریب سے ایک گیس کی لالٹین اٹھا کر چہرے کے برابر کر دی اور با آواز بلند کہا" "اے مشتاقان دیدار یلدرم۔ دیکھئے دل انگلش رخ ترکانہ داری!"

"یہ سنتے ہی سب ایک ایک کر کے سجاد صاحب کے سامنے آتے گئے اور زیارت کرتے گئے۔ بیرسٹر صاحب بھاری لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑے رہے۔ بادامی رنگ کے چائنا سلک سوٹ میں ملبوس بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشہ بن رہا تھا۔ پاپا داماد کی ایسی شاندار قدر دانی سے خوش ہو کر قریب کھڑے مسکرایا کئے۔ بھائی ممتاز علی بھی وہیں موجود تھے۔"

اس ڈرامائی واقعے کے بعد پاپا نے ان تمام مہمانوں کو کھانا کھلوایا۔

"محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ کی شادی کتخدائی سید سجاد صاحب بی اے (علیگ) اسسٹنٹ پولٹیکل افسر (کوہ مسوری) سے ہو گئی اور ۱۸ ماہ حال کو وہ کوہاٹ سے رخصت ہو کر مسوری چلی گئیں۔

یہ تقریب پوری شرعی سادگی اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ عمل میں آئی۔ کوئی گانا بجانا آتش بازی یا بیہودہ رسوم کا نام نہ تھا۔ مولوی سید محسن علی صاحب لاہوری نے خطبہ نکاح پڑھا۔ خطبہ نکاح اس قدر لطیف تھا کہ ہمارا دل اسے اخبار میں چھاپنے کو چاہتا تھا مگر افسوس ہم اسے لکھ نہ سکے۔

اگرچہ آج کل سخت گرمی کا موسم ہے مگر حسن اتفاق سے نکاح کے روز تمام دن ابر رہا۔ شام کو عقد کے وقت پر لطف ابر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوہاٹ کے پہاڑوں پر بجلی چمک کر بارش کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔

بعد نماز مغرب عقد ہونے کے بعد نہایت تکلف سے جلسہ ضیافت ہوا۔ میر نذر الباقر صاحب کثیر الاحباب اور نہایت با اخلاق بزرگ ہیں۔ لاہور' گجرات' راولپنڈی' نوشہرہ' پشاور وغیرہ اطراف سے بہت سے احباب ہندو اور مسلمان آئے تھے۔ خاکسار راقم لاہور سے سجاد حیدر صاحب کے ہمراہ ہو لیا تھا۔ ضیافت نہایت پر لطف تھی۔ ہندو دوستوں کا جدا انتظام کیا گیا تھا اور نہایت قابل تعریف تھا۔

ایک بزرگ سفید ریش قزلباش پیر مرد مسٹر سجاد سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے سردار محمد یعقوب خاں (سابق امیر کابل حال مقیم مسوری) کے حالات پوچھتے رہے اور رخصت کے وقت ہمارے دوست نوشہ کو سورہ اخلاص کی یہ دعائیہ رباعی پڑھ کر سنائی۔

اے بہر کارے رفیقت قل ھو اللہ احد
وائے نگہبان تن و جان تو اللہ الصمد
لم یلد ارت ولم یولد بہر جادست گیر
لم یکن ناصر ترا بر سرلہ' کفواً احد

ایک نوجوان مسٹر احمد جان ہنگو ضلع کوہاٹ سے خاص طور پر مسٹر سجاد سے ملنے آئے تھے۔ نوعمر آدمی ہیں اور کچھ عرصہ سرحد ترکی و ایران پر رہ چکے ہیں۔ کبھی انگریزی بولتے کبھی فارسی کبھی پشتو کبھی پنجابی۔ وہ اس قدر دلچسپ آدمی تھے کہ مسٹر سجاد انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے اور میں اپنی طرف۔ رات کو سوتے وقت ان کی چارپائی کے پاس ایک طرف مسٹر سجاد کا پلنگ بچھا ایک طرف میرا۔ اب یہ مشکل کہ میری طرف کروٹ لے کر مجھ سے باتیں کریں یا مسٹر نوشہ سے۔ آخر میں نے یہ ترکیب نکالی کہ مسٹر سجاد کے کسی اور دوست کو سمجھا دیا کہ وہ مسٹر سجاد کو اپنی باتوں میں مشغول کر لیں۔ میں مسٹر احمد جان سے اہواز کی تعلیم نسواں معاشرت وغیرہ کے حالات پوچھتا رہا۔

اگلے دن میں اور مسٹر سجاد حیدر اور ان کے بہنوئی سید برہان حیدر کوہاٹ کے باغات اور چشموں کی سیر کو نکلے اور اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جس کی دوسری طرف یاغستان ہے۔ یہاں سرکار انگریزی کا

ملک ختم ہو جاتا ہے۔ ہم میں اتنی ہمت نہ تھی نہ اتنا وقت تھا کہ اوپر چڑھ کر خود مختار زمین کا نظارہ دیکھتے۔ لیکن میں نے اور مسٹر سجاد نے ایک چشمہ کے کنارے بیٹھ کر سرزمین حریت سے آتا ہوا پانی پیا۔

شام کو سات آٹھ بجے کے درمیان ہم سوار ہوئے اور ریل پر پہنچے۔ وہاں بہت سی تہذیبی بہنیں ویٹنگ روم میں جمع تھیں جو بنت نذر الباقر صاحب کو رخصت کرنے ریل پر آئی تھیں۔

نو بجے کے قریب ہماری گاڑی روانہ ہوئی۔ راہ میں راولپنڈی' گجرات' لاہور' امرت سر وغیرہ میں بھی بعض تہذیبی بہنیں اسٹیشن پر ملنے آئیں۔ بعض نے کھانا بھیجا بعض نے چاء۔ بعض تحائف لائیں۔

لطیفہ:- راستے میں کھانا کھاتے وقت ایک مزیدار لطیفہ ہوا۔ کسی اسٹیشن پر نوکر آکر ہمیں کھانا دے گیا اور پانی کی صراحی رکھ گیا۔ ہم نے کھانا کھانا تو شروع کر دیا۔ مگر برف لینے کا خیال نہ رہا۔ ٹرین میں برف تو موجود نہ تھی۔ اسٹیشن دور تھا۔ میرا لڑکا 38 کھانے" میں شریک تھا۔ اس نے کہا پچاس روپے دو آنے میں ایک سیر برف ابھی اسی لحظ مل سکتی ہے۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھا مگر مسٹر سجاد فوراً سمجھ گئے اور بچے کو فوراً شاباش دی۔ میں اس کو پہیلی قرار دے کر تہذیبی بہنوں سے اس کی بوجھ پوچھتا ہوں۔ اتا پتہ یہ ہے کہ جس ڈبے میں ہم سوار تھے وہ سکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔

آخر میں میں اپنے عزیز دوست مسٹر سید سجاد حیدر اور اپنی عزیز بہن نذر زہرا کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ میں اس اتحاد کو نہ صرف قران السعدین قرار دیتا ہوں۔ بلکہ قوم کے لئے مبارک فال سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ اتحاد تہذیبی گروہ کی تقویت' مدد اور ترقی کا موجب ہو گا اور وہ دونوں تعلیم نسواں کی خدمت میں آفتاب و مہتاب کی طرح چمکیں گے۔

خاکسار

سید ممتاز علی

تہذیب نسواں۔ لاہور۔ ۲۲ جون ۱۹۱۲ء

کوہاٹ

۱۸ جون ۱۹۱۲ء

ہمشیرہ مکرمہ معظمہ۔ آداب عرض۔ اگرچہ مسافر کے پیچھے اختتام سفر سے پیشتر خط لکھنا ہندوستانی خیال کے مطابق ٹھیک نہیں سمجھا جاتا لیکن اس خیال سے کہ مسوری پہنچتے ہی آپ کو دوسرے روز یہاں کی خیریت مل جائے۔ یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔

ابھی تک آپ راولپنڈی سے تو نہ گذری ہوں گی۔ وہاں بھائی بیلی رام آپ کو ہر طرح سے مدد دیں گے۔

بے چارہ پریشان باجی کا پریشان افضل 39

راولپنڈی

۲۰ جون ۱۹۱۲ء

میری پیاری ہمشیرہ

خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ دعا دیتا ہوں۔ امید ہے آپ اس دور دراز سفر کو طے کر کے بخیریت نام مسوری پہنچی ہوں گی۔ افسوس یہ ہے کہ میری پیاری بہن میرے اسٹیشن سے گذرے اور میں اس کی کچھ خدمت نہ کر سکوں لیکن یہ امر مجبوری تھا۔ اگر میں پہلے سے موجود ہوتا تو تل پھل سے آپ کی سیوا کا فخر حاصل کرتا۔ بڑھیا نے مجھے خط دینے کے بجائے لالہ برج لعل تھاپڑ کے حوالے کیا۔ جس نے پڑھ کر مجھے واپس کیا۔ میں آپ کے اسباب کی بلٹی کرنے' ٹکٹ وغیرہ لینے میں مشغول رہا۔ ایک حرف بھی لکھ کر آپ کی سیوا میں پیش نہ کر سکا۔ امید ہے معاف فرماؤ گی۔

بہن۔ رخصت کے وقت کوہاٹ میں آپ رو رہی تھیں۔ ادھر میرا کلیجہ بھی پاش پاش تھا اور آنسو برابر جاری تھے کیونکہ اس خادم کو آپ کے کنبے کے ساتھ غیر معمولی محبت ہے۔ میں میر صاحب کو اپنا ہی پاپا سمجھتا ہوں۔ اور آپ میری دو بہنیں ہیں اور چھوٹے میاں خدا سلامت رکھے میرا چھوٹا بھائی ہے۔ باجی جی سرگباش ہو چکی ہیں وہ میری والدہ تھیں جو مجھے ہر وقت یاد آتی ہیں اور میں سچے دل سے پرارتھنا کرتا رہتا ہوں کہ اس دیوی کو خدا سورگ نصیب کرے۔ میرا سہارا یا تو خدا پر یا میرے پاپا میر صاحب پر ہے۔ اس دنیا میں میں اکیلا صرف آپ لوگوں کے بھروسے پر جی رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر بھائی سجاد حیدر سے عرض کریں کہ وہ بھی اس دھرم کے رشتے کو نبھائیں۔ میں آپ لوگوں کا تاعمر خادم ہوں۔

آئندہ مارچ کو میرا ارادہ ہردوار آنے کا ہے۔ اگر حالات نے اجازت دی تو آپ کے درشن کو مع اپنی بیوی کے حاضر خدمت ہوں گا۔ بہن جی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے تو بلا تکلف مجھے لکھ دیں میں اپنی سنبھا شکتی کے انوسار اس کی تعمیل کروں گا۔ میں دعا گو ہوں کہ آپ کی تمام زندگی ہمیشہ خوشی میں گذرے جس کی ٹھنڈی ہوا مجھے بھی آتی رہے۔

بہن جی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر روز شام کو بھائی سجاد حیدر کے ہمراہ ہوا خوری کے لئے ضرور تشریف لے جایا کرنا۔ آپ کی طبیعت چونکہ کمزور ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چلنے پھرنے سے اچھی صحت ہو گی۔ ویسے آپ کے پردہ سسٹم میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ میری ناقص عقل نے یہ محسوس کیا ہے۔

بھائی سجاد حیدر صاحب کو دست بستہ آداب عرض کریں۔

آپ کا ناچیز بھائی

بیلی رام 40

لکڑا محلہ، امروہہ، ضلع مراد آباد

۲۳ جون ۱۲ء

میری پیاری بٹی

تمہارے پاپا کے خطوط قریب قریب ہر دوسرے تیسرے روز اس عرصے میں آتے رہے۔ خدا کی شان ہے کہ اس موقع پر اور میں علیل۔ بہرحال اوس کا شکر ہے کہ تو بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی۔ بٹی دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ کون کب تک ماں باپ کے ساتھ رہا ہے کہ تو رہتی۔

تیری چچی مراد آباد ہی میں ہیں۔ اون کی والدہ اور مصفی بی بی وغیرہ جوگی[41] پورے جا کر چادریں چڑھائیں گی اور ضیا بوا کو اس کی لونڈیا رقیہ کا پرسا دیں گی۔

تو نے اپنے نئے گھر کا حال تو کچھ لکھا ہی نہیں۔ مفصل لکھ کیسا مکان ہے اور تو نے اپنی تقسیم اوقات کیا کر رکھی ہے؟

ہاں تجھ سے تو میں نے مکان کو پوچھا اور اپنے مکان کا کچھ حال نہیں لکھا۔ سنو۔ میرا مکان کوئی دو سو برس کا بنا ہوا ہے۔ مکان کے پچھم کی طرف کھیت ہی کھیت ہیں۔ صحن بہت بڑا۔ ہماری مراد آباد کی محل سرائے سے زیادہ چوڑا۔ مکان کی چھت میں کوئی تختہ سلامت نہیں۔ مگر اللہ کی شان ہے کہ برسات کے زمانے میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا۔ کواڑوں کا نام نہیں اس لئے ہوادار خوب ہے۔ میں دن بھر اکیلا پڑا پڑا کڑیاں گنتا رہتا ہوں۔ کامریڈ یا کوئی اور اخبار آ گیا تو دیکھ لیا۔ بیماری کی وجہ سے اب بصارت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ آل حسنین سلمہ، میرے ہمراہ ہے۔ اوسے کل ہی معلوم ہوا کہ تیری شادی ہو گئی۔ بھائی جان کو اوس نے بڑا لمبا چوڑا خط شکایت کا لکھا ہے۔ اور کہتا تھا کہ میں باجی کو لکھوں گا۔ اونھوں نے بلا میرے کیسے شادی کر لی۔ جب اس سے کہا بیٹیاں کہیں کہا کرتی ہیں تو بولا کہ بی بی کے بیاہ کے رقعے تو باجی نے لکھے تھے۔

والدعا

تیرا چچا ظہور حسنین

۱۶ مارچ ۱۹۱۳ء

لاہور سے مراد آباد جانے والی ٹرین کے پلیٹ فارم پر وردی پوش میر نذر الباقر اور برقعہ پوش بہن اکبری بیگم مبہوت بھونچکے کھڑے ہیں۔ اینگلو انڈین گارڈ جھنڈی دکھاتا ہے۔ اکبری بیگم گھبرا کر زنانہ درجے میں سوار ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں اشکبار لالہ بیلی رام مسافروں کی بھیڑ چیرتے دوڑتے ہوئے آ کر "پاپا" سے لپٹ جاتے ہیں۔ پرسوں ان کے پیارے "چاچا ظہور" بھی سرگباش ہوئے۔

امروہے کی ہڑواڑ میں ایک نیا کتبہ:

سید ظہور حسنین رضوی

پیدائش ۱۸۷۳ء

وفات: ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء

۱۸ مارچ ۱۹۱۳ء

ڈاکیہ دربار شاہ ولایت" عرف لکڑا محلہ کے ایک سنسان مکان کے صدر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاتا ہے۔ گلی میں خشک پتے اور بگولے اڑ رہے ہیں۔ چند منٹ بعد ایک اداس صورت کمسن لڑکا نیکر اور چپل پہنے اندر سے دروازہ کھولتا ہے۔

"لو بھیئے" "تمہارے نام خط۔" ڈاکیہ رنجیدہ آواز میں کہتا ہے۔ رسید پر دستخط کرنے کے لئے کان کے پیچھے سے مختصر سی میالی پنسل نکالتا ہے۔

بچہ بڑی احتیاط اور احساس ذمے داری کے ساتھ دستخط کرنے کے بعد ذرا حیرت سے اپنے نام کا لفافہ کھولتا ہے جس پر گورنمنٹ ہاؤس الہ آباد کا طغرہ بنا ہے۔ اندر ہز آنر لفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کا تعزیت نامہ سید آل حسنین کے نام۔

"عزیز بیٹے۔ تمہارے پیارے والد کی بے وقت موت کی وجہ سے گویا برٹش گورنمنٹ کا ایک ستون گر گیا۔"

۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ء ۔ محترمہ اندرا گاندھی کو اپنا قیمتی ووٹ دیجئے۔

امروہے کی در و دیوار پر چسپاں اندرا کانگریس، اولڈ کانگریس، بی کے ڈی، آل انڈیا مسلم مجلس، آل انڈیا مسلم لیگ، بھارتیہ جن سنگھ، کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا۔ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسٹ) کے پوسٹروں، مشاعروں، عرسوں، قوالیوں، فلموں اور شیعہ سنی، اہلحدیث، مقلد، غیر مقلد، بریلوی، غیر بریلوی کے تنازعی جلسوں کے اشتہارات کے سامنے سے دلی اور نہٹور سے آنے والی شاہراہ پر یو۔ پی روڈ ویز کی بسیں لگاتار گذر رہی ہیں۔ جھیل، قبرستان اور درگاہ شاہ ولایت" کے سامنے سے گذرتی ان بسوں میں امروہے کے قالینوں اور مراد آبادی برتنوں کے نئے متمول مسلمان ایکسپورٹر اور کاریگر کھچا کھچ بھرے ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ۔ مخملی ٹوپیاں، مخملیں واسکٹیں۔ انداز میں روایتی ٹیں اور بانکپن۔ جس شستہ اور شگفتہ ٹکسالی اردو میں ضلع جگت اور ہنسی مذاق یا بحث تکرار میں، آپس میں مشغول ہیں وہ آج صرف ان اضلاع ہی میں سنی جا سکتی ہے۔

شاہ راہ پر سے اکا دکا فوجی گاڑی زن سے گذر جاتی ہے۔ جنرل لارڈ رابرٹ کا پرنواسہ جمہوریہ ہند کی فوج کا میجر بنگلہ دیش کے محاذ سے دربار شاہ ولایت" واپس آ کر والدین سے ملنے کے بعد اپنی چھاؤنی پر جا چکا ہے۔ اماں جنرل رابرٹ کو تو رکھو طاق پہ۔ ان کے بنائے ہوئے نقشے تو کب کے تلپٹ ہوئے۔ مگر صرف پچیس سال ادھر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے جو نئی لکیریں کھینچی تھیں وہ بھی تو غتر بود ہو گئیں۔

شام ہوتی ہے۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد مختار ماموں اندازے سے چلتے مردانے صحن میں بچھی

آرام کرسی پر آن بیٹھتے ہیں اور ہیچوان گڑگڑانے لگتے ہیں۔ دنیا اب انہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن خوب نظر آتی ہے۔

قریب کی تاریخی مسجد سے عشاء کی اذان کی صدا بلند ہوتی ہے۔ سلطان آرا ممانی کھانے کی ٹرے ماموں کے سامنے لا کر رکھتی ہیں اور کہتی ہیں ''نوش جان کیجئے۔'' رات گہری ہوتی ہے۔ پڑوس کے مکان میں چھپائی کے کارخانے کا مالک پاکستانی قوالی کا ریکارڈ جو وہ کویت سے لایا ہے بار بار بجا رہا ہے۔ سر لامکاں سے طلب ہوئی۔ کوئی حد ہے ان کے عروج کی۔...... کوئی حد ہے...... بلغ العلیٰ بکمالہ...... صلو علیہ و آلہ.....
سوئے منتہیٰ وہ چلے نبیؐ

دور پولس لائنز میں بگل بجتا ہے۔

سید ظہور حسنین رضوی مشہدی مراد آبادی علیگ کلف دار کڑکڑاتی وردی پر جگمگاتے کنگز پولس میڈل اور نیلسن میڈل اور قیصر ولیم میڈل (جو انھیں ایک جرمن شہزادے نے عنایت کیا تھا) لگا کر بنگال ڈاکے سے وائسرائے ہند کو محفوظ رکھنے کے لئے کلکتہ میں بڑے لاٹ صاحب کے جلو میں چلا کرتے تھے۔ ان کی شکستہ قبر پر اور ان کی جوان بیٹی منظور زہرا کی قبر پر جس کے کتبے پر نذر زہرا بیگم کے لکھے ہوئے المناک اشعار کندہ ہیں جھاڑ جھنکار اگ آئے ہیں۔ قبروں سے متصل سترھویں صدی کے کسی مغل سپہ سالار کی بنوائی ہوئی مسجد میں سے کچھ دیر بعد فجر کی اذان کی آواز بلند ہو گی۔ کیونکہ وہ رب ذوالجلال حی و قیوم ہے۔

''دل انگش رخ ترکانہ'' والا نوجوان ادیب' ننھی بیگم' فرنگی نما نذر الباقر' نوعمر میرا فضل کا 'خضر صورت سید ممتاز علی' ہونہار امتیاز علی تاج دور دراز قبرستانوں میں جھاڑ جھنکار' بیری کے درختوں 'سفید اور کاسنی خودرو پھولوں کی خاموشی میں کب کے کھو گئے۔ اور اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی۔

درگاہ شاہ ولایتؒ کے مرمریں حجرے میں آسیب زدہ لڑکیوں پر بدستور حال آ رہا ہے۔ طاق میں پنجے کے سیندوری نشان کے نیچے گھی کا چراغ جلتا ہے۔

پنجاب کے صوفی شاہ حسینؒ نے کہا تھا...... ''خاموش رہو۔ دنیا قابل ذکر جگہ نہیں۔''

حوالہ جات

1- فصل دوم۔ باب ۴ ''گومتی۔''

2- یہ اجازت نامہ امروہہ میں پروفیسر سید مختار حسین نقوی کے پاس محفوظ ہے۔

3- فصل دوم باب ۶ ''راوی۔''

4- چودھری سر ظفر اللہ خاں کا کنبہ۔

5- فصل دوم' باب ۴ ''گومتی۔''

6- نوید

7- میرا ثینس

8- فصل دوم باب ۵ ''رام گنگا''

9- ایک نسخہ راقم ایں سطور کے پاس موجود ہے۔

10- نسیم بکڈپو لکھنؤ نے چند سال ہوئے چوری اور سینہ زوری سے اس کا غیر قانونی ایڈیشن شائع کیا۔

11- مولوی سید ممتاز علی دیوبند ضلع سہارنپور کے رہنے والے اور سرسید کے دوست تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں لاہور آ کر پنجاب ہائی کورٹ میں مترجم مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۱ء میں رفاہ عام پریس قائم کیا۔ ''دربار اکبری'' اپنے پریس سے شائع کی۔

12- شمس العلماء ذکاء اللہ کی بہو۔ مزید تذکرہ آگے آئے گا۔

13- کنیزوں کے نام پھولوں پر رکھنا شاہی دستور تھا۔ شمالی ہند کا مسلم معاشرہ جو لال قلعہ کی تہذیب کا پیرو تھا اسی دستور کا پابند رہا۔ متعدد قدیم گھرانوں میں اس وقت تک حبشنیں بھی ملازم تھیں جو شاہی غلاموں اور کنیزوں کی اولاد تھیں۔

14- روزنامچہ۔ از نذر سجاد حیدر ''تہذیب نسواں'' ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء

15- زہرا فیضی۔

16- مولانا حالی نے اپنی عہد آفریں نظم ''چپ کی داد'' میں فرمایا تھا۔

گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا　　پر حل ہر ایک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
ہے جو مہم درپیش است غیب ہے اس میں نہاں　　تائید حق کا ہے نشاں امداد سلطان جہاں

17- ''پھول'' ایک ادیب ساز اخبار تھا۔ متعدد نامور ادیبوں نے بچپن میں اسی میں یہ لکھنا شروع کیا۔ بعد کے دور میں امتیاز علی تاج' عبدالمجید سالک' پنڈت ہری چند اختر' چراغ حسن حسرت' غلام عباس' حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی اس کے مدیر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ''پھول'' اور ''تہذیب'' دونوں بند ہو گئے۔

18- "دی حیدرز" از خلیل عزیزی۔ السٹرٹیڈ ویکلی آف پاکستان ۸ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔ مصنفہ نے شروع سے آخر تک اپنی کسی کتاب کا معاوضہ یا رائلٹی نہیں لی جو ایک انتہائی حماقت کی بات تھی۔

19- طیبہ بیگم (مسز خدیو جنگ) ہندوستان کی پہلی مسلمان گریجویٹ خاتون اور اس دور کی مشہور ناول نگار تھیں۔ ان کی اولاد میں نواب علی یاور جنگ (سابق سفیر ہند در فرانس و ریاست ہائے متحدہ امریکہ و موجودہ گورنر مہاراشٹرا) اور معصومہ بیگم نے نام پایا۔

20- آصف اے۔ اے۔ فیضی نامور عالم اسلامیات و سابق سفیر ہند برائے مصر۔ بمبئی میں رہتے ہیں۔

21- اہل تشیع سید عبدالقادر جیلانیؒ سے عقیدت نہیں رکھتے۔

22- خلیفہ سید حامد حسین کے والد مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سد محمد حسین کے بزرگ مہاراجگان پٹیالہ کے طبیب اور اتالیق رہے تھے۔ اس وجہ سے خلیفہ کہلاتے تھے۔ خلیفہ محمد حسین کے بڑے بھائی وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ محمد حسن کے مصنف اور "سیاحت نامہ ڈاکٹر برنیر" کے مترجم تھے اور سرسید کے دست راست رہ چکے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء منعقدہ علی گڑھ کے صدر رہے تھے۔ ان دونوں روشن خیال شیعہ بھائیوں نے علی گڑھ کالج میں شیعہ اور سنی مساجد الگ الگ بنانے کی شدید مخالفت کی تھی۔

23- میجر سی۔ ڈبلیو ونڈھم جو پہلے سردار محمد ایوب خاں کے پولٹیکل ایجنٹ تھے بعد میں سردار محمد یعقوب خاں سابق امیر کابل کے انچارج بنائے گئے۔ یلدرم اس وقت اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ تھے۔

24- یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ۱۹۰۹ء میں آج سے ٦٦ سال قبل جب مسلمان خواتین کی بے پردگی کا تصور بھی نہ کیا جاتا تھا یلدرم اپنی ہونے والی بیوی کو بے پردہ اور بے نقاب رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

25- دہرہ دون میونسپلٹی میں پرنسپل امپریل فارسٹ کالج اور اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ برائے امیر کابل کو لفٹننٹ گورنر یو۔ پی کی طرف سے نامزد کیا جاتا تھا۔

26- وحیدہ بیگم (لیڈی محمد یعقوب مرحومہ)۔

27- یلدرم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر۔

28- علامہ اقبالؒ کی بیگم۔

29- شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن کی بیگم۔

30- فاطمہ بیگم بنت مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار۔

31- غلاطہ کا پل گولڈن ہورن پر سے گذرتا ایشیائی استانبول یا اسقوطری کو شہر کے اسی حصے کے یوروپین کوارٹر پیرا سے منسلک کرتا ہے۔

32- "زیارت قاہرہ" تمدن دہلی جولائی ۱۹۱۱ء

33- "اولڈ بوائے" علی گڑھ جولائی ۱۹۱۱ء

34- مرتضائی بیگم اہلیہ میر فیض العسکری۔

35- شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی۔

36- سید امتیاز علی تاج

37- "سید سجاد حیدر یلدرم" از نذر سجاد حیدر، مطبوعہ ماہنامہ "ماہ نو" کراچی۔

38- سید امتیاز علی تاج۔

39- اکبری بیگم مصنفہ "گودڑ کا لال" کے صاحبزادے (مصنف تخیلات) بعمر پندرہ سال۔

40- یہ صاحبزادے آگے چل کر پنجاب کے نامور تاجر رائے بہادر بیلی رام بنے۔ بیلی رام بلڈنگ مال روڈ لاہور پر غالباً اب تک۔

41- ایک شیعہ زیارت گاہ۔ ضلع بجنور۔

42- بنگال کے اولین دہشت پسند انقلابی گروہ جو اردو پریس اور عوام میں "بنگالی ڈاکہ" کہلائے۔

فصل پنجم

۱— خیز کردر باغ دراغ قافلہ گل رسید

۲۱ جون ۱۹۱۲ء۔ دہرہ دون ریلوے پلیٹ فارم پانی سے تازہ تازہ دھلا تھا۔ جس وقت ٹرین پلیٹ فارم سے آن کر لگی اسپنسرز ریفرشمنٹ روم کے سامنے کھڑا ہجوم لپک کر آگے بڑھا۔ "یورپین درجوں" سے چند صاحب لوگ اترے۔ ہجوم ان کے برابر سے گذرتا ہوا ایک سیکنڈ کلاس ڈبے کے سامنے پہنچا۔ اونچی سنہری کلاہیں۔ بوسکی کی ہلکی آسمانی پگڑیاں۔ ترکی ٹوپیاں۔ بعض زین کے سوٹ پہنے تین انگریز۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں "انگلش" وضع کی پتلی کمروالی مخروطی نازک سی پھولوں کی ٹوکری تھی جس پر گلابی ریشم کا چوڑا فیتا بندھا تھا۔ پولٹیکل افسر مسٹر آر۔ ایچ نبلٹ[1] ڈپٹی کلکٹر دہرہ دون۔ سردار صاحبان (افغان)۔ سردار صاحبان (سکھ)۔ خان بہادر سید ظل حسنین (سروے آف انڈیا۔)

جولین رسٹ۔ برطانوی یہودی فوٹوگرافر نے تین تانگوں کے اسٹینڈ پر کیمرہ جما کر گروپ ترتیب دیا اور تصویر کھینچی۔

اسٹیشن کے باہر تانگے' بگھیاں اور موٹریں کھڑی تھیں۔ ایک وقت تھا جب صاحب لوگ غازی آباد تک ٹرین میں آکر بیل تانگے سے دہرہ دون پہنچتا تھا اور گھوڑوں' خچروں سے مسوری۔ اب ہر طرف ریلوں کی ریل پیل تھی۔ پہلے دہرہ دون اسٹیشن سے اسمتھ اینڈ روڈویل ایجنٹس کے ذریعے ٹمٹمیں اور ڈاک گاڑیاں راجپور تک کے لئے کرایہ پر لی جاتی تھیں۔ اب اسی کمپنی کی موٹریں مسافروں کو سیدھی مسوری پہنچا رہی تھیں۔

موٹروں میں سوار ہو کر قافلہ شہر روانہ ہوا۔ ایسٹرن کنال روڈ کے کنارے محلّہ کرن پور آباد تھا۔ اس میں بہت سے جلا وطن افغان شہزادے رہتے تھے۔ وہیں جھالو ضلع بجنور کے سید ظل حسنین صاحب کا مکان تھا اور اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ نجف علی خاں کی کوٹھی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں یلدرم کو امیر یعقوب خاں کا چارج دینے کے بعد وہ بحیثیت اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ امیر ایوب خاں لاہور بھیج دیئے گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کا فرنگی پولٹیکل ایجنٹ لاہور' دہرہ دون آتا جاتا رہتا تھا۔

سید ظل حسنین صاحب کے مکان کی ڈیوڑھی کے اندر ان کی خوش مزاج بی بی اور تعلیم یافتہ بٹی صادقہ بیگم ہار پھول لئے کھڑی تھیں۔ صحن میں پہاڑی سنگریزوں کا فرش تھا۔ جابجا گملے رکھے تھے۔ دیوار کے عین اوپر برف پوش ہمالیہ جگمگا رہا تھا۔ رات کو چودہ میل دور مسوری کا چراغاں نظر آیا۔

مسوری ۲۳ جون ۱۹۱۲ء[2] ہماری دو منزلہ کاٹیج بل ویو پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ بیڈ روم اور ان کے آفس کے سامنے خوبصورت باغیچہ ہے۔ آج صبح بھائی برہان حیدر سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ بھائی جان' آپا جان اور ان کے چاروں بچے ڈرائنگ روم میں منتظر تھے۔ نندوئی دبلے پتلے سے نوجوان ہیں۔ سفید پتلون'

زرد ریشمی قمیض' دھاری دار ٹائی۔ دونوں لڑکے سلطان حیدر اور عثمان حیدر اور لڑکیاں زبیدہ اور فاطمہ خاتون بہت ہی خوش نظر آرہی تھیں۔ چودہ سالہ زبیدہ غیر معمولی طور پر حسین بچی ہے۔

چاء پیتے پیتے موسم تبدیل ہوگیا۔ اچانک گھٹا اٹھی۔ بادل کمرے میں گھس آئے۔ بھائی جان نے دروازے اور کھڑکیاں بند کیں اور سگریٹ پینے کی مجھ سے اجازت طلب کی۔ دو سالہ فاطمہ خاتون کرسی پر کھڑے ہو کر مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

آپا جان صغرٰے فاطمہ اکلوتی بڑی نند بجائے ساس کے ہیں۔ تعلیم یافتہ سمجھ دار۔ سوائے پردے کے کسی پرانی رسم کی پابند نہیں۔

۲۵ جون: آج امیر کابل کے ہاں دعوت تھی۔ آپا جان نہیں جانا چاہتی تھیں۔ زبیدہ کو ساتھ بھیج دیا۔ چند قدم پر شاہی خاندان کی عالی شان کوٹھی ہے۔ جوں ہی اس کے برآمدے میں ہمارے ڈانڈیاں رکھی گئیں اندر سے کابلی ماماَئیں پردے لے آئیں جو دونوں ڈانڈیوں پر تان دیئے گئے۔ تب میں اور زبیدہ اندر گئے۔ ایک بڑے کمرے میں دروازوں اور کھڑکیوں پر بھاری ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ چند خوبصورت عورتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ آتش دان کے قریب نہایت حسین و جمیل بیگم پر تکلف لباس میں گاؤ تکئے کے سہارے بڑی شان سے متمکن تھیں۔ ہم نے قریب جا کر السلام علیکم کہا۔ بادشاہ بیگم مسکراتی ہوئی اٹھیں اور مجھے گلے لگا لیا۔ بولیں ہم تو بہت دنوں سے آپ کے منتظر تھے اور اب چار دن سے گھڑیاں گن رہے تھے۔ پھر شہزادی صاحب آئیں۔

"بادشاہ بیگم زیوروں سے لدی ہوئی تھیں۔ بہت خفا ہوئیں کہ آپ اتنی سادہ کیوں ہیں۔ آیئے آپ کو کابلی دلہن بناؤں۔"

قصہ مختصر نذر بیگم کا بادشاہ بیگم نے خوب سنگھار پٹار کیا۔ شام کو جب دونوں ممانی بھانجیاں گھر پہنچیں دو افغان کنیزیں خوانوں میں کابلی جوڑے لئے پہلے سے حاضر تھیں۔ بہت سخت الف لیلوی واقعات تھے۔

یلدرم کا کام محض یہ تھا کہ روزانہ گرمیوں میں شملہ اور جاڑوں میں کلکتہ وائسرائے بہادر کو امیر کی خیریت کا تار بھیج دیں۔ روز صبح دس بجے امیر کا "دربار" لگتا تھا جس میں ان کے ساتھی افغان حسب مراتب بیٹھتے تھے۔ یلدرم کو اس میں حاضر ہونا بھی ضروری تھا۔ ان کے پہنچنے پر امیر یعقوب خاں تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ نوجوان افسر بے حد نادم ہوتا تھا اور امیر دہراتے تھے "آل رسول" کا ادب واجب ہے۔" سادات سے یہ بے پناہ عقیدت سوائے افغانوں اور پٹھانوں کے کسی مسلمان قوم میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ غالباً اس قوم کی سادگی اور دینداری ہے۔ (اقبال" افغانوں کے اسی جوش ایمان اور سادگی پر عاشق تھے۔)

جلاوطن بادشاہ کے اس فرضی دربار میں کون سے بڑے معاملات طے ہوتے ہوں گے۔ یلدرم اکثر اپنے دونوں کمسن بھانجوں سلطان حیدر اور عثمان حیدر کو ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ معزولی سے قبل امیر

کابل کو "ہز میجسٹی" کا خطاب حاصل نہیں تھا' کمزور مشرقی حکمرانوں کو یہ خطابات برٹش فارن آفس ہی سے دیئے جاتے تھے۔ (بعد میں ہز میجسٹی امان اللہ خان شاہ افغانستان نے اپنے رعب داب سے برطانیہ کے غرور کا بھرتہ بنایا۔) لیکن یلدرم' سردار یعقوب خان کا دل بڑھانے کے لئے انہیں ہمیشہ "یور میجسٹی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور وہ بے چارہ بوڑھا خوش ہو جاتا تھا۔ سابق امیر نے نوجوان اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ سے انگریزی پڑھنی بھی شروع کر رکھی تھی۔

دہرہ دون کی طرح مسوری بھی تقریباً انگریزی شہر تھا (اسی وجہ سے ضلع میں انگریز کلکٹر کے علاوہ ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے افسر ہمیشہ انگریز تعینات کئے جاتے تھے) سڑکوں پر صبح شام فرنگی بچوں کی قطاریں گذرا کرتیں جو ان کانونٹ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے جو یہاں غدر سے کئی برس قبل قائم کئے گئے تھے۔ اتوار کو صبح صبح گرجا گھروں کے گھنٹے بجتے۔ پیرا سول لگائے بائبل سنبھالے میمیں ڈانڈیوں اور رکشاؤں میں بیٹھی عبادت کے لئے جاتی نظر آتیں۔ تنک چڑھے انگریز گھوڑے دوڑاتے۔ پہاڑی نیٹو کی حالت میدانی نیٹو سے بھی زیادہ تباہ تھی۔ گدڑی پوش قلیوں کو صاحب "پہاڑی فالتو" کے نام سے یاد کرتا تھا۔ لائبریری بازار میں انگریز یہودیوں اور پارسیوں کی دوکانیں تھیں۔ سوائے ہوٹل۔ مہاراجگان اور نوابین کوٹھیاں۔ یہ ایمپائر کے عروج کا زمانہ تھا۔ تین سال قبل بجلی کی روشنی آگئی تھی۔ رات گئے تک سارا پہاڑ جگمگاتا۔

بل دیو کی گلینز ڈاسٹڈی کے اندر برقی لیمپ کی روشنی میں یلدرم رات گئے تک بیٹھے لکھا پڑھا کرتے۔ الماریوں میں ترکی' فارسی' عربی' انگریزی کتابوں کے انبار جمع تھے اور قسطنطنیہ اور قاہرہ اور طہران سے آنے والے رسالے اور اخبار۔ مشرق وسطیٰ کے حالات سرعت سے بدلتے جا رہے تھے۔ چند سال میں سارا نقشہ تلپٹ ہونے والا تھا۔

یو۔ پی اور دلی کے بیشتر گھرانوں کی مانند اس خاندان کو بھی اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ دینیات اور فارسی تعلیم کا لازمی حصہ تھی۔ بچوں کو "جیک اینڈ جل" کے بجائے اردو فارسی اشعار ازبر تھے۔ بیت بازی محبوب مشغلہ تھی۔

بیت بازی میں زبیدہ خاتون ہمیشہ جیت جاتی تھیں۔

ایک شام باہر موسلادھار مینہ برس رہا تھا۔ گول کمرے میں آتشدان کے سامنے کافی خشک میوے اور شعر و شاعری سے شغل کیا جا رہا تھا۔ یلدرم خود اپنی شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ آپا جان نے بھاوج سے شکایت کی "سجاد میاں پنسل سے لفافوں کی پشت پر ادھر ادھر کے کاغذوں پر شعر لکھ کر بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں۔ میں یہاں آئی تو چن چن کر اٹھا لیتی ہوں۔ ان کے وہ شعر نہ جانے کس طرح محفوظ رہ گئے جو رسالوں میں چھپ جاتے ہیں۔ اب آپ صفائی کروانے سے پہلے ردی کی ٹوکری ضرور دیکھ لیا کیجئے گا۔"

زبیدہ نے چہک کر کہا' "ممانی جان ہمیں ماموں جان کا پورا مرثیہ داغ زبانی یاد ہے۔ جب داغ کا انتقال ہوا تھا ماموں جان بغداد میں تھے۔ وہیں کہا تھا۔ مخزن میں چھپا تھا۔ سنائیں؟ بس پہلا شعر یاد نہیں۔"

اس کے بعد زبیدہ نے فوراً کھڑے ہو کر سلیقے سے پڑھنا شروع کیا"

پاس نہ آئے مرے' اب نہیں اس کا دماغ — پھیلی ہے پھیلا کرے' نکہت مشک تتار
میرے لئے اس کے بل' افعی و کژدم کے بل — اب نہ پریشاں کرے' مجھ کو کبھی زلف یار
میں تو سمجھتا ہوں ہے' خندہ گل زہر خند — سوگ میں ہیں سبزپوش' باغ کے سب برگ و بار
اپنے ہی جب باغ کی ہو گئی چپ عندلیب — اپنی نوا سنجیاں' اب نہ سنائے ہزار
تجھ کو چھپا دے گا آج' میرا یہ سیلان اشک — دجلہ! نہ طغیانی کر حد سے نہ بڑھ زینہار
واسطہ اللہ کا' اے بلغائے عرب — تم کو نبی ؐ کی قسم اے فصحائے تتار
آج ذرا کے لئے' چپ رہو' خاموش رہو — رونے دو دل کھول کر' دل میں بھرا ہے بخار
تم کو بتاؤں میں کیا' روتا ہوں کیوں اس طرح — دل سے نکلتی ہے کیوں آیا حزیں بار بار
آہ کہ گھٹی میں جو اپنی پڑی تھی زبان — جس پہ میں دل سے فدا جس پہ میں دل سے نثار

شاعر بے مثل آج اس کا جہاں میں نہیں
خالی مکاں ہے' مکیں 'ہائے مکاں میں نہیں

کس کو سناؤں یہاں' اپنی حزیں داستاں — کوئی نہیں ہم نوا' کوئی نہیں ہم زباں
نغمہ بلبل بہت' مینا کی قلقل بہت — غیر کی یہ انجمن' غیر ہی کا بوستاں
ان کو ہنسی سے ہے کام' عیش سے ہیں بامراد — پوچھتے ہیں تیری کیوں آنکھیں ہیں یوں خونچکاں
کیسے بتائیں تمہیں' کاہے کا ہے غم ہمیں — ہو گیا خاموش آہ! بلبل ہندوستاں
نالہ مرا دل خراش آہ مری ناز پاش — تم ہو مگر نابلد' بہرے ہیں کروبیاں
خاک دکن تو نے آہ' لے لئے آغوش میں — بھیجے تھے قدرت نے دو' اردو کے جو باغباں
تیرا بھی اے شاعری دور تھا یہ آخری — آج تو رخصت ہوئی' ہند کو کر کے سلام

داغ نہیں دہر میں' دل ہے ہر اک داغ داغ
شعر کا ویراں ہے گھر' نظم کا گل ہے چراغ

کوہ منصوری کی اس طوفانی رات کسی کو معلوم نہ تھا کہ صرف چار سال بعد پری پیکر زبیدہ خاتون خود اللہ کو پیاری ہو کر ایک مرثیے کا موضوع بن جائیں گی۔

چند ہفتے بعد آپا جان مع شوہر اور بچوں کے نہٹور واپس گئیں۔ شروع اگست میں نذر بیگم کوہاٹ روانہ ہوئیں۔ کچھ دن بعد یلدرم کا خط پہنچا.... پھوپھا جان اور ہماری دوسری بہنیں آپ سے ملنے مسوری آئی ہیں۔ فوراً پہنچئے۔ غلام حسین کو ساتھ لے کر کوہاٹ سے چلیں۔ راہ میں لاہور سے مولوی ممتاز علی کے فرزند اکبر سید حمید علی اور بنی وحیدہ بیگم کو ساتھ لیا۔ نوجوان قافلہ مسوری روانہ ہوا۔

"مغرب کے قریب ہماری ڈانڈیاں بل دیو کے پھاٹک پر پہنچیں۔ یلدرم بنگلے پر ہمارے منتظر تھے۔ پہلے حمید علی گھوڑے سے اترے' پھر ہم دونوں ڈانڈیوں سے نکلیں۔ سارے میں شفق کی سرخی پھیلی ہوئی

تھی اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ بادلوں کا رنگ سرخ تھا[3]۔"

سیڑھیوں پر یلدرم کی پھوپھی زاد بہنیں حمیدہ اور وحیدہ اور چچا زاد بہن نثار فاطمہ منتظر کھڑی تھیں۔

وحیدہ ممتاز علی کا یلدرم سے پردہ تھا۔ وہ برقعے میں لپٹی لپٹائی سرعت سے زینے کے اوپر چلی گئیں۔ چھوٹی نندوں سے ملنے کے بعد نذر بیگم' یلدرم کے پھوپھا خان بہادر سید صغیر حسین کو سلام کرنے ڈرائینگ روم میں گئیں۔ راستے میں میاں سے پوچھا' "پھوپھا جان سے کس طریقے سے ملوں' بزرگ ہیں شاید گھونگھٹ میں دیکھنا پسند کریں۔"

جواب ملا'۔ "ہمارے ہاں گھونگھٹ کا رواج نہیں اور پھوپھا جان بہت روشن خیال ہیں۔"

پھوپھا جان نے خود ہی سلام علیکم کہا اور اشرفی رونمائی میں دی۔

قدیم وجدید کی یہ کشمکش قدم قدم پر تھی۔ ان نئی روشنی کے نوجوانوں کو مستقل یہ فکر لاحق تھی کہ بزرگوں کو اپنے جدید طریقوں سے ناخوش نہ کریں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بزرگ خود کافی ماڈرن ہو گئے تھے۔ حمیدہ بیگم' وحیدہ بیگم اور نثار فاطمہ نہٹور کے شدید پردے میں رہتے ہوئے خوب پڑھ لکھ چکی تھیں۔ بچپن سے "تہذیب نسواں" میں مضمون لکھ رہی تھیں اور اچھے شعر کہتی تھیں۔ حمیدہ بیگم کی نسبت یلدرم کے جوانمرگ چچا خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر کے صاحبزادے سید نثار حیدر زیدی سے طے ہو چکی تھی۔ وحیدہ بیگم کی شادی یلدرم کے منجھلے بھائی سید نصیرالدین حیدر سے ہونے والی تھی۔ ڈپٹی صغیر حسین اولاد نرینہ نہ رکھتے تھے اور ان کی تین لڑکیاں ان کی وسیع جائداد کی وارث تھیں۔

رشتے داروں کے نہٹور واپس جانے کے بعد وحیدہ ممتاز علی بل دیو میں رہ گئیں۔ سید حمید علی کا کالج کھلنے والا تھا۔ وہ لاہور روانہ ہوئے۔

کلکتے سے کچھ مہمان آئے۔ پردے کی وجہ سے زنانہ مردانہ کھانے ناشتے کا انتظام نذر بیگم کو علیحدہ علیحدہ کرنا پڑا۔ ان کے جانے کے بعد یلدرم نے کہا' "بہت برا معلوم ہوتا تھا۔ آپ اور وحیدہ دیہاتی خواتین کی طرح دوسرے کمرے میں دبکی رہیں۔ کل سے آپ کو آزاد [4] کے سامنے ہونا پڑے گا۔ عام طور پر بے پردہ پھرنا آپ کو منظور نہیں۔ لیکن میرے خاص خاص دوستوں کے سامنے آپ کو ہونا چاہیے [5]۔"

ایک روز آزاد نے میزبان خاتون سے سوئی دھاگا مانگا کہ شیروانی میں بٹن ٹانکنا ہے۔ موصوفہ نے کہا' "لائیے میں ٹانکے دیتی ہوں۔" حیرت سے فرمایا' "ارے آپ کو سینا پرونا بھی آتا ہے۔ میرا خیال تھا صرف مضمون لکھنا ہی جانتی ہیں۔"

اکتوبر میں منجھلے دیور سید نصیرالدین حیدر مسوری تشریف لائے۔ نہایت شگفتہ مزاج اور دلچسپ۔ بڑے بھائی کے ہم شکل۔ خوبصورت' سفید رنگت' گھنگریالے بال۔ لیکن بھائی کے برعکس موسیقی کے دلدادہ۔ بھابی سے فوراً دوستی ہو گئی۔

"سیزن" ختم ہونے والا تھا۔ چھ مہینے سابق شاہ افغانستان کو دہرہ دون میں رکھا جاتا تھا۔ ۱۵ اکتوبر کو

سارا قافلہ دہرہ دون روانہ ہوا۔ پہلے شاہی کارواں چلا۔ اس کے ساتھ ساتھ بل دیو کے کیں۔ آگے آگے گھوڑوں پر دونوں بھائی سجاد و نصیر جو باری باری قرآن شریف حمائل کرتے۔ ڈانڈیوں میں نذر بیگم اور مس ممتاز علی۔ پیچھے خچروں پر اسباب و ملازمین۔

مسوری اور دہرہ دون کے آدھے راستے میں راجپور واقع ہے۔ یہاں کئی فرنگی ہوٹل اور "روڈ ہاؤس" تھے جنہیں انگریز بڑھیاں چلاتی تھیں۔ یہاں تازہ دم ہو کر مسافر آگے چلتے تھے۔ پرنس آف ویلز ہوٹل میں گھنٹہ بھر قیام کر کے قافلہ کلوش ڈون ویلی میں داخل ہوا۔

دہرہ دون میں امیر یعقوب خان کی کوٹھی کے وسیع باغ میں یلدرم اور ان کے گھر والوں کے لئے خیمے نصب کئے گئے۔ قناتوں سے پردہ دار صحن بنا۔ بہت سے درخت قناتوں کے اندر آ گئے۔ "وحیدہ ممتاز علی دن بھر باغ میں بلبل کی طرح چہکا کرتیں۔"

کچھ عرصہ بعد کرزن روڈ' ڈالن والا' کی ایک کوٹھی میں منتقل ہوئے جس کا نام رسپنا تھا۔ خوش منظر اور پرسکون ڈالن والا میں زیادہ تر پنشن یافتہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی کوٹھیاں تھیں۔ پہلو میں پہاڑی ندی رسپنا شور مچاتی بہتی رہتی تھی۔ اس کے دوسرے کنارے پر ترائی کے شیر آ کر رات کو پانی پیتے۔ اس وقت تک گڑھوال اور دہرہ دون کے اضلاع گھنے جنگلوں سے پٹے پڑے تھے جن میں شیروں' چیتوں' ہرنوں کی آبادی وافر تھی۔ رات کے سناٹے میں شیروں کے گرجنے کی آواز ڈالن والا میں صاف سنائی دیتی تھی۔

دہرہ دون میں کانونٹ اور مشن اسکولوں کی افراط تھی مگر مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک مدرسہ نہ تھا۔ مصلح طبقہ نسواں نوجوان خاتون نے چند بیگمات کو جمع کر کے ایک عدد "انجمن حامی تعلیم نسواں" قائم کی۔ چار چار آنے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ ایک دولت مند مسلمان تاجر سے کوٹھی مفت حاصل کر کے اسکول کھولا۔ پہلے ہی روز چھپن لڑکیاں آ گئیں۔

کہاں عظیم الشان جیزس اینڈ میری کانونٹ کہاں یہ غریبا مئو مدرسہ' جس کے لئے دس دس روپے ماہوار کی برقعہ پوش استانیاں رکھی گئیں۔ مدرسے کے اجرا کی اطلاع عبداللہ بیگم و شیخ عبداللہ کو علی گڑھ بھیجی۔ وہ نہال نہال ہوئے۔

۲— سلطان جہاں منزل

ادھر کچھ دنوں سے شیخ محمد عبداللہ' نذر سجاد حیدر اور چند دوسرے حضرات و خواتین ایک آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کی تحریک کر رہے ہیں۔ ایک اخبار نے لکھا "جب سے یہ تحریک کی گئی ہے بہت سی گوشہ نشین خواتین میں ایک جوش سا پیدا ہو گیا ہے۔ خدا نہ کرے بنت نذر الباقر اور ان کی ہم خیال لڑکیوں اور بیگمات کو اس میں کامیابی ہو۔ یہ بیجا آزادی کا پیش خیمہ ہے۔"

لیکن "خاتون" میں لیڈیز کانفرنس کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ علیا حضرت سلطان جہاں بیگم علی گڑھ

تشریف لاکر مسلمان لڑکیوں کے پہلے دارالاقامہ کا افتتاح کرنے والی ہیں۔

"علی گڑھ ۲۴ مارچ ۱۹۱۴ء لاہور، دہلی، مراد آباد، آگرہ، بمبئی، کلکتہ، میرٹھ سے بیبیاں جوق در جوق چلی آرہی ہیں۔ مسلمان عورتوں کا اتنی بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہونا ایک یادگار واقعہ ہے۔ عبداللہ بیگم خود مہمانوں کے استقبال کے لئے اسٹیشن جاتی ہیں۔ دن رات ہر ٹرین سے بیبیاں ہیں کہ چلی آتی ہیں۔ سب کو گرلز اسکول کی نئی عمارت میں ٹھہرایا جارہا ہے۔ ہم لوگ ان سے شوقِ ملاقات میں بے تابانہ اپنے کمروں سے نکل آتے ہیں۔ عبداللہ بیگم دن رات کی محنت سے اس قدر تھک گئیں تھیں کہ آخری روز اسٹیشن پر نہ جاسکیں۔ لیکن جس وقت معلوم ہوا کہ دلی سے چند بیگمات تشریف لائی ہیں ان کو اتروانے پھاٹک تک گئیں وہیں غش آگیا۔ ہم لوگ پھاٹک کی طرف دوڑے انھیں اٹھا کر لائے۔ اس کے بعد انھوں نے آرام نہیں کیا۔

۲۸ مارچ ۱۹۱۴ء سرکار عالیہ بھوپال سے تشریف لے آئیں۔ آج پاسو ہاؤس سے آن کر آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کے دفتر سلطان جہاں منزل کا افتتاح فرمایا۔ یہ عمارت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کوشش اور علیا حضرت کے عطیے سے تعمیر کی گئی ہے۔ آج ہی ٹرسٹیان ایم۔ اے۔ او کالج کی طرف سے اسٹریچی ہال میں سرکار عالیہ کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔

۲۹ مارچ۔ ہماری اس کامیابی سے مخالفین کے جگر شق ہیں۔ کیا روح پرور مسرت افزا وقت تھا جب علیا حضرت کی صدارت میں ہماری آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہو رہا تھا۔ بیگم حبیب الرحمن خان شیروانی سکریٹری تجویز ہوئیں۔ عبداللہ بیگم اسسٹنٹ سکریٹری۔ میری عزیز دوست راحیلہ خاتون شیروانیہ نے تھوڑی سی دیر میں بہت سی بیویوں کو کانفرنس کا ممبر بنالیا۔

رات کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ہاں سرکار عالیہ کا ڈنر تھا۔ میری منہ بولی بھتیجی وحیدہ ممتاز علی، رضیہ مسعود الحسن، نازلی بیگم ہرہائی نس جنجیرہ زہرا فیضی وغیرہ کی شرکت سے یہ کھانا بہت پرلطف ہو گیا۔ بعد میں ازراہ شفقت علیا حضرت نے کچھ دیر ڈرائنگ روم میں قیام کر کے ہم لوگوں کو عزت بخشی اور نصیحت آمیز گفتگو فرمائی۔

۳۰ مارچ۔ آج سرسیدؒ کی قابل تعظیم بہو محمود بیگم مد ظلہا نے مجھے، وحیدہ اور بیگم رضا علی وغیرہ کو لنچ پر مدعو کیا۔ اس نئے زمانہ کے نئے لباسوں والی بیبیوں میں محمود بیگم صاحبہ قدیم دہلی کے پرعظمت لباس میں نمایاں شان رکھتی تھیں۔ مجھ کو تو بالکل ملکہ وکٹوریہ کی ہم شکل معلوم ہوئیں۔

سرسیدؒ کی بھتیج بہو بیگم نواب محمد علی صاحب زوردار مردانہ قہقہہ لگاتی تھیں جس سے کمرہ گونج اٹھتا تھا۔ یو۔ پی میں لباس اور پردے میں اصلاح کی تحریک آپ ہی کے گھر سے شروع ہوئی ہے[6]۔"

۳ — ہلٹن لین

تسخیر پنجاب کے بعد برطانوی حکومت نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کمسن بیٹے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو

کچھ عرصہ مسوری میں نظربند رکھنے کے بعد انگلستان روانہ کیا تھا۔ تسخیر افغانستان کے بعد ۱۸۸۳ء میں سردار دوست محمد خاں کے پوتے سردار محمد یعقوب خاں کو بھی نارتھمبرلینڈ رجمنٹ کے چار افسروں کی نگرانی میں لایا گیا۔ مفتوح امیر کو مسوری کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ روزانہ فرنگی پولٹیکل ایجنٹ کی معیت میں شہسواری کے لئے جاتے تھے۔ ہندوستانی اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کو اس سلسلے میں شاید قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس مردِ حر نے فرار کو ناکام کوشش کی۔

وہ فرزند کہستان گھوڑا بہت تیز دوڑاتا تھا۔ فرنگی افسر کو اس کا ساتھ دینے میں خاصی دقت ہوتی۔ ایک بار لائبریری بازار کے چوراہے پر پہنچ کر فرنگی افسر نے گھوڑا روکا اور کسی دوسرے گورے سے بات چیت میں مشغول ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو قیدی غائب۔ ہڑبڑا کر گھوڑا دوڑایا۔ سردار یعقوب خاں اپنے اسپ کو ایڑ لگا کر کب کے ہوا ہو چکے تھے۔ اور دور راجپور روڈ پر نشیب کی سمت اڑے چلے جارہے تھے۔

پولٹیکل افسر نے تعاقب کیا اور ونسنٹ ہل واپس لایا۔ امیر نے مسکرا کر کہا کہ گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا۔ افسر خاموش رہا اور ہانپتے کانپتے اپنے دفتر جا کر حضور وائسرائے کو شملہ تار دیا۔ اگر شاہی قیدی دوبارہ ایسی حرکت کرے تو اس کے ساتھ کس قسم کی کاروائی کی جائے۔ شملہ سے تار آیا۔

Do not Hurt one Hair of his Head

لیکن اس کے بعد افغان بادشاہ نے فرار کی کوشش کبھی نہ کی۔ عمر عزیز کا طویل حصہ نظربندی میں گزار کر ایک روز چپکے اجل کو لبیک کہا۔ روح شاید سرعت سے دور افغانستان کے پہاڑوں کی سمت پرواز کر گئی۔

۱۹۱۳ء میں مسئلہ کانپور کے بعد سے مسلم سیاسی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ امیر کی وفات کے فوراً بعد ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ لیڈر علی محمد خان راجہ محمود آباد نے گورنمنٹ سے یلدرم کی خدمات اپنے لئے حاصل کیں اور انھیں اپنا پولٹیکل سکریٹری مقرر کیا۔ "وہ درحقیقت ایسے نیک بندے تھے کہ برطانوی پولٹیکل سروس کے قابل ہی نہ تھے ورنہ کہیں سے کہیں پہنچتے۔ اور ایسی ملازمت کے اہل تھے جس میں لکھنے پڑھنے کا کام ہو[7]۔" اپنے فرض منصبی کے علاوہ علی گڑھ کی بہت سی ذمہ داریاں مفت اپنے سر لے رکھی تھیں اور ان میں بڑی خوشی سے جان کھپاتے رہتے تھے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کا ٹرسٹی مقرر کیا گیا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد کے لئے سیاسی تقریریں لکھنا یقیناً ایک دلچسپ کام ہوگا۔ بی بی اس ملازمت سے بہت ناخوش تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میاں کسی اعلیٰ سرکاری عہدے کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے۔ "ذرا بھائی انعام الحق اور دوسرے دوستوں کو دیکھئے۔ خود چلے چونتیس سال کی عمر میں کسی راجہ کی چاکری کرنے۔ یہ بھی نہیں کہ نئے نئے کالج سے نکلے ہیں جو کام ملا کر لیا۔"

"راجہ کی چاکری؟ علی محمد خاں بہت پرخلوص قومی لیڈر ہیں۔ آج کل گوکھلے، موتی لعل نہرو، جناح سب نے اپنے اپنے پولٹیکل سکریٹری مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ قومی اتحاد کی تحریک کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسی

قسم کا کام کرنا بہت ضروری ہے۔" میاں نے نرمی سے سمجھایا۔ پھر حسب عادت خاموش ہو گئے۔ لیکن متعجب کہ بی بی اتنا سیاسی شعور رکھتی ہیں' لڑکپن سے خود قومی کاموں میں مصروف ہیں اور اس وقت کسی ان پڑھ اسنوب (Snob) عورت کی طرح خفا ہیں۔

"آپ سرکاری ملازمت شروع ہی سے نہ کرتے۔ اپنے دلارے حسرت کی طرح جیل میں بیٹھے چکی پیسا کرتے۔" بیوی نے جل بھن کر کہا اور اسباب باندھنے میں مصروف ہو گئیں۔ افغان شہزادیوں سے بچشم پر نم رخصت ہو' نوزائیدہ بچی فلک اختر' آیا اور ملازموں کو ساتھ لے' دہرہ دون کو خیرباد کہا۔

لکھنؤ میں راجہ صاحب کی طرف سے حضرت گنج کے قریب ہلٹن لین میں کوٹھی دی گئی تھی۔ نیا حلقہ احباب دلچسپ ثابت ہوا۔ ضلع جونپور کے سید وزیر حسن آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور شہر کے اندر نواب قمرجہاں کی حویلی خاقان منزل میں رہتے تھے۔ ان کی اور ان کے چھوٹے بھائی اصغر حسن جج کی بیوی سے سخت بہناپا ہو گیا۔ ان کے علاوہ قدوائی خاندان' شاہد حسین و مشیر حسین' شیخ و بیگم حبیب اللہ (شیخ صاحب ریاست محمود آباد کے مینجر تھے) چودھری نعمت اللہ' چودھری نبی جان وغیرہ وغیرہ۔ قیصر باغ میں تعلقہ داران اودھ کے مکانات تھے۔ بہت سے دوست بنارسی باغ' سکندر باغ اور حضرت گنج کے اطراف میں رہتے تھے۔ لکھنؤ نئی سیاسی' سماجی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔

میاں کی گوناں گوں اصول پرستیوں کی مداح تھیں۔ اور ان کی وجہ سے نالاں بھی رہتی تھیں مثلاً ایک خفیہ فہرست بنی تھی۔ ہرماہ تنخواہ ملنے پر چھوٹی چھوٹی رقمیں متعدد حاجتمند لوگوں کو بطور وظیفہ چپکے سے منی آرڈر کر دیتے تھے۔ خود کو ریاستی عملے کا فرد نہیں گردانا لہٰذا محمود آباد کی موٹروں اور بگھیوں کو ذاتی ضرورت کے لئے استعمال نہیں کرتے تھے وغیرہ۔

ایلیٹ روڈ
کلکتہ ۵ جون ۱۹۱۴ء

پیاری بہن سلمک اللہ تعالیٰ

گو میں رہی رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہی

کثرت اشغال و ہجوم و پریشانی اور اشتداد مرض اس وقت بھی فراغ بال حاصل نہیں ہے اور نہ کامل صحت ہے۔ زندہ ہوں اور آپ سی فخر قوم بیبیوں کے لئے صرف دعا ہوں۔

آپ نے یونیورسٹی فنڈ کے لئے میرے خط میں جو کچھ لکھا تھا' اچھا لکھا تھا اور جن لوگوں کی نظروں سے گذارنا میرا منشاء تھا وہ گذارا بھی۔ اب اثر خواہ کچھ ہو۔

نہ رود میخ آہن در سنگ

بچی کی پہلی سالگرہ مبارک ہو۔ فلک اختر مبارک اور سعد نام ہے۔ اب میرے بچوں کے نام سنئے۔ آپ کے بھائی کا نام زاہد ہے [8]۔ اسی مناسبت سے میرے بڑے لڑکے کا نام شاہد [9] ہوا۔ پھر اوس مناسبت سے مشہود پر شہید ہوا۔ لوگوں نے عذر کیا تو آپ کے بھائی نے کہا شہادت ایسی نعمت کیا سب کو ملتی ہے۔

میرے بھائی عبداللہ المامون سہروردی نے نام رکھا حسن حسین۔ آپ یہ سن کر خوش ہوئے گا کہ میں نے اپنے چھوٹے لڑکے حسین شہید [10] کو بھی آج اکیس دن ہوئے تکمیل تعلیم کی غرض سے انگلستان روانہ کر دیا ہے۔ لڑکوں کو شروع سے لاطینی فرانسیسی وغیرہ سکھائی گئی تھیں۔ بڑا لڑکا انگلستان میں قانون پڑھ رہا ہے اور کئی ابتدائی امتحانات امتیاز سے پاس کئے ہیں مگر اس چھوٹے کو میں نے سویلین بنانے کے لئے تیار کیا تھا۔ عربی اور اٹالی بھی سیکھی۔ اوس نے کلکتہ یونیورسٹی سے اعزاز حاصل کیا۔ اس کا سن انیس سال کا ہے۔ میں سول سروس میں بھیجنے کو تھی کہ بہی خواہوں نے خدمت کو آزادی پر کسی طرح ترجیح نہ دی اور اس کو بھی قانون کے لئے بھجوا دیا۔ یوں تو علم و فن جس نے حاصل کیا وہ برباد ہونے والی شے نہیں مگر اس چھوٹی عمر میں اوس کو اتنا نہ پڑھواتی مگر انجام یہی تھا۔ اب خیر جس نیت سے بھیجا گیا ہے اللہ تعالیٰ اوس میں اوس کو کامیاب کرے۔

آپ کے ناول شمسہ کو ہم لوگ ہر مہینے بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ والدعا

آپ کی خیر طلب
خجستہ

اس وقت قانون واحد پیشہ تھا جس میں ہندوستانی معراج ترقی پر پہنچ سکتے تھے۔ لہٰذا متمول والدین اپنے نونہالوں کو مستقل لندن بھیجا کرتے تھے۔ سید وزیر حسن کے فرزند اکبر سید علی ظہیر بھی اسی سال بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان روانہ کئے جا رہے تھے۔

گرمیوں میں شملہ حضور وائسرائے کا مستقر تھا۔ اہم سیاسی لیڈر وہیں جایا کرتے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد شملہ جاتے۔ دلی اور لاہور کی "سوسائٹی" بھی وہیں پہنچتی۔

خالہ مرتضائی بیگم اور ثروت آراء کوہاٹ سے لکھنؤ آئی ہوئی تھیں۔ جون کے مہینے میں کنبہ "سیزن" کے لئے شملہ روانہ ہوا۔ وہیں ۱۴ جولائی کے روز سید جواد حیدر پیدا ہوئے۔ "بچے کو دیکھ کر سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بڑا موٹا تازہ سرخ و سفید رنگ' سنہری بالوں اور معمولی وزن سے دوگنا بچہ تھا۔ دوسرے روز بیگم وزیر حسن دیکھنے آئیں۔ گود میں لے کر کہا۔ ماشاء اللہ چھ مہینے کا معلوم ہوتا ہے۔ میرا بچہ بنے [11] تو اب خدا کے فضل سے پانچ مہینے کا ہو گا۔ اتنا ہی ہے [12]۔"

بچے کے لئے بیگم وزیر حسن نے لکھنؤ سے آیا منگوائی۔ پندرہ روز بعد خالہ مرتضائی بیگم اور ثروت آراء پنجاب واپس گئیں اور شمس العلماء سید ممتاز علی کی بیٹی وحیدہ جن کی شادی کچھ عرصہ قبل مراد آباد کے سید محمد یعقوب [13] سے ہوئی تھی' بچے کی دیکھ بھال کے لئے مراد آباد سے شملہ آ گئیں۔

اگست ۱۹۱۴ء جنگ چھڑ گئی۔ ایک روز کوہاٹ سے میر نذر الباقر کا تار شملہ پہنچا۔ خالہ اشرف جہاں' بھابی مرتضائی بیگم' بیٹی ثروت' بیٹے مصطفےٰ باقر اور یتیم بھتیجے آل حسنین کو سیالکوٹ' بہن اکبری بیگم اور بہنوئی میر فضل علی کے سپرد کر کے Batman غلام حسین کے ہمراہ فرانس محاذ جنگ پر جاتے ہیں۔ نذر بیگم تار ملتے ہی آیا اور بچوں سمیت شملہ سے سیالکوٹ روانہ ہوئیں۔

پھوپھی اکبری بیگم کے شوہر میر فضل علی نذر بیگم کے سگے ماموں اور نانی اشرف جہاں کے سپوت ان دنوں سیالکوٹ میں جوڈیشل رجسٹرار تھے۔ ان کا اکلوتا لڑکا میر افضل علی فورمین کرسچین کالج میں پڑھ رہا تھا۔ پاپا بندرگاہ کراچی سے روانہ ہوئے تھے۔ اخباروں میں سمندری جنگ کے متعلق وحشت انگیز خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ جب نانی اشرف جہاں ساری دعائیں وظیفے کر چکیں تو ایک رات دستور کے مطابق بال کھول' ننگے پیر' ننگے سر صحن میں کھڑے ہو' فریادی ماتم شروع کیا۔ اس کے باوجود پاپا کا نہ خط نہ تار۔ روز جرمن سب مرین برطانوی جہاز ڈبو رہے تھے۔

اس اثنا میں ایک روز گھڑی پہ قیامت آئی۔

"سیالکوٹ ۴ نومبر ۱۹۱۴ء آج کچہری سے واپس آکر ماموں عصر کی نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ اچانک دل کا شدید دورا پڑا۔ گھر پر اس وقت کوئی ملازم بھی موجود نہ تھا۔ ہندو ہمسائے کے ذریعہ معمولی سا ڈاکٹر بلوایا۔ سول سرجن کو بلا کر لانے کے لئے اوور کوٹ پہن کر باہر نکلی کہ تانگہ کرکے چھاؤنی جاؤں۔ اتنے میں پڑوس کا ڈاکٹر آگیا۔ ماموں کا معائنہ کیا اور برآمدے میں آکر آہستہ سے بولا "بہن جی شاہ جی کا ہارٹ فیل ہو رہا ہے۔ چند منٹ کے مہمان ہیں۔ سول سرجن آکر کیا کرلے گا۔" الٹے پاؤں اندر بھاگی۔ پیچھے پیچھے میں۔ چند منٹ بعد سر اٹھا کر کہا' "بہن جی۔ شاہ جی نے پران تج دیئے[14]۔"

گھر میں کہرام مچ گیا۔ محلے ٹولے والوں کو خبر پڑی۔ پڑوس کی ایک غریب بیوہ اندھی دھندی ضعیفہ جو میر صاحب مرحوم کی منہ بولی بہن تھیں' شٹل کاک برقع سر پر ڈال لاٹھی ٹیکتی برآمدے تک پہنچیں اور وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر بین کرنے لگیں۔ "ہائے میرے ویرا...... بھن ویا دھی پترانوں تیرے سپرد کر کے لام تے گیا سی۔ تو خود کیڑی لام تے ٹرگیوں........ وے بھرجائی۔ تو وی جوانی وچ رانڈ ہوگیوں........ ہائے اب اے بہن کتھے رلن گے۔ اناں دا کیڑا اولی وارث ہوسی۔ ہائے ویرا.......... چناں۔"

جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں یہ لرزہ خیز بین بیحد ہولناک معلوم ہوئے۔

اندر چودہ سالہ آل حسنین مبہوت سب کے چہرے تکا کئے۔ پچھلے سال امروہہ میں گھر کا یہی منظر تھا جب جوان چالیس سالہ باپ نامراد دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ آج سر دھر پھوپھا بھی دغا دے گئے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

نانی اشرف جہاں سرد آنگن میں نکل گئیں۔ للکار کر اندھیرے آسمان کو مخاطب کیا' "مولا بلہاری جاؤں۔ اجل نے کیا مجھ نگوڑی ہی کا گھر دیکھ لیا ہے؟ میاں تفضل علی گئے میں کچھ نہ بولی۔ بی مصطفائی گئیں۔ میں نے آقا آپ سے شکایت نہ کی۔ کہئے تو اب بھی صبر کرلوں........" اسی وقت سات قرآن درمیان اللہ ہزاری عمر کرے چھوٹے داماد کا خیال آگیا۔ اسی رو میں ڈپٹ کر ایک پرسہ دینے والی مہمان بی بی سے فرمایا' "اے پوچھو ہم سے مطلب؟ لو کا لگے۔ تم مشرک کٹو مرد آپس میں ٹکر ناگہانی موا فوجی بگل بجا اور اللہ رکھے میاں نذر الباقر او بچی بنے چلے فرنگی کے دشمنوں سے لڑنے صف شکن علی شاہ۔ اے بیوی تم سے کیا چھپانا۔ چین ماچین پنچ انچیوں سے وہ بھڑ گئے۔ حبشیوں' آدم خوروں کے نرغے میں اب سے دور' افریقہ انھیں بھیجا گیا۔ جھپ جالئے۔ برمیوں سے جا کر وہ نپٹے۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناوے۔ جان ہتھیلی پر رکھیں ہندوستانی اور گھر بھڑے چوتے گوروں کا۔"

کسی نے آہستہ سے کہا' "نانی چپکی رہو۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ کسی مخبر نے اطلاع کردی' ابھی پولس آن کر ہم سب کو چبوترہ دکھلاوے گی۔"

"جھلسا لگاؤں' پاپوش پہ مارتی ہوں۔ میں نہ دبتی سہمتی کسی سے۔"

لوگ بھول چکے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء میں سترہ سالہ اشرف جہاں توے کی سیاہی چہرے پر مل' گوروں سے مقابلے کے لئے تیار ہوگئی تھیں۔ اب پھر انھوں نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ ستری بستری ہو چکی تھیں۔ یکبارگی' آنسو پونچھ سارے گھر میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھومی گھومی پھریں۔ کمرے کمرے اہل محلہ مرد عورتوں کا ہجوم تھا۔ اندر باہر مردانہ ہوگیا تھا۔ تجہیز و تکفین کی بندوبست کیا جا رہا تھا۔ مرنے والے شاہ جی کا نوجوان بیٹا گھر پر موجود نہ تھا۔ محلّہ کے بڑے بوڑھوں نے فوراً سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ قرآن خوانی شروع کی جا چکی تھی۔

نانی اشرف جہاں آخر جا کر پچھلے برآمدے میں نماز کی چوکی پر ٹک گئیں جس پر مرحوم بیٹے کی جانماز بچھی تھی۔ کوتا بھی الٹا ہوا تھا۔ مراد آبادی لوٹے میں نماز عصر کے لئے وضو کا پانی موجود تھا۔ نانی نے لوٹے پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ دیر تک آہستہ آہستہ بڑبڑایا کیں' قیصر ولیم کی بھتی میں نے کھائی۔ شاہ جارج کی بھتی میں نے کھائی۔ لاٹ صاحب کی بھتی میں نے کھائی۔"

سوئم کے بعد بڑے داماد میر فیض العسکری آن کر سب کو اپنے ساتھ جہلم لے گئے۔ نذر بیگم روتی دھوتی گئیں۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دن بھر ویران ہوائیں چلتیں۔ ہلٹن لین کی کوٹھی کے گرد کھڑے یوکلپٹس کے درخت کھڑکھڑایا کرتے۔ پانیر اخبار محاذ جنگ کی تشویشناک خبروں سے پر رہتا۔ بالآخر ایک روز صبح کی ڈاک میں پورٹ سعید' فوجی سنسر اور پنجاب کے مختلف ڈاک خانوں کی مہروں سے لپا پتا ایک موٹا لفافہ آن پہنچا۔ پاپا نے جن کو علم نہ تھا کہ ان کے جاتے ہی گھر کا گھروا ہوگیا' لفافہ بہنوئی کے نام سیالکوٹ بھیجا تھا۔ جہاں سے وہ ضلع جہلم کی کسی تحصیل ری ڈائریکٹ کیا گیا۔ وہاں سب عزیزوں نے اپنے اپنے نام کے خط پڑھنے کے بعد وہی پلندہ ہلٹن لین لکھنو روانہ کردیا تھا۔

۴—فلائینگ آفریدی کے خطوط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحیرہ قلزم
قریب نہر سوئز
۲۸ اکتوبر ۱۹۱۴ء

میری پیاری نھو بنو— خدا تمہیں ہمیشہ ہمیشہ خوش و خرم رکھے— الحمد للہ بفضل الٰہی تندرست ہوں اور سمندر کی ہوا نے میری صحت پر بہت اچھا اثر کیا— ورنہ بہت سے آدمیوں کا دو تین روز تک ذرا پتلا حال رہا— غلام حسین کا بھی دو روز سر چکرایا— میں اللہ کے فضل سے ہٹا کٹا جہاز پر دوڑتا پھرتا رہا۔ کل ۲۹ اکتوبر کو ڈاک کی پہلی تھیلی ہندوستان روانہ ہو گی۔ سوئز نہر سے جائے گی اس لئے آج جوئے جہاز پر مارا مار خط لکھ رہا ہے۔ اس وقت بیالیس (۴۲) جہاز ہمراہ جا رہے ہیں۔ رات کو سمندر میں دیوالی اور دن کو عجب گہما گہمی چار جنگی جہاز آگے پیچھے دائیں بائیں چل رہے ہیں۔ انگریزوں کی فتح ہو رہی ہے۔ روز جہاز پر خبر پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے جہاز کا نام تارا ہے—

۱۶ اکتوبر کی شام ہم کراچی سے روانہ ہوئے۔ میں نے چار تار لکھ دیئے تھے کہ روانہ کئے جاویں۔ خدا جانے تار والوں نے بھیجے یا نہیں۔ ایک بھائی صاحب قبلہ فضل علی کو سیالکوٹ' ایک افضل سلمہ' کو لاہور۔ میاں افضل نے کہا تھا' کہ جہاز کا نام ضرور لکھئے گا— سوار ہوتے وقت خبر نہ تھی۔ سوار ہونے کے بعد سوائے تار کے اور کوئی ذریعہ نہ تھا صبح سے شام تک دوڑ بھاگ میں تھک کے چور ہو گیا تھا۔ کچھ کھانے کو نہ ملا.. رات کو کھانا نہایت پر تکلف جہاز میں کھایا۔ صبح اٹھ کر چائے کی پیالی اور دو توسٹ۔ ساڑھے آٹھ یا نو بجے حاضری۔ ایک بجے ٹفن۔ چار بجے چاء۔ رات کے آٹھ بجے ڈنر۔ روز سمندر کے کھاری پانی سے نہاتا ہوں۔ کچھ میری چمڑی پہ رونق سی آگئی ہے۔

کل ایک خلاصی جنگلے کے باہر کھڑا کچھ کام کر رہا تھا کہ سمندر میں گر گیا۔ اوسی وقت کئی جہازوں پر سے چھوٹی کشتیاں سمندر میں اوتر پڑیں۔ نہ اوسے ڈوبنے دیا نہ مرنے دیا۔ نکال لائے۔ سب جہاز کھڑے ہو گئے تھے۔

آج کل کا نظارہ قابل دیکھنے کے ہے۔ صدیوں میں بھی اس قدر جہازوں کو اکٹھے چلنے کا موقع نہ ملا ہو گا۔ اللہ اللہ! ایک ایک جہاز کے بنانے میں کیا بیس بیس لاکھ بھی خرچ نہ ہوا ہو گا۔ کئی ایک تو بڑی لاگت کے جہاز ہیں۔ بادشاہوں کے کمروں کی کیا سجاوٹ ہو گی جو جہاز کے کمروں میں نفاست اور سجاوٹ برتی ہے۔

اس وقت ہمارا جہاز بڑا تیز چل رہا ہے۔ کوئی تیرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے۔ لیکن چونکہ سمندر متلاطم نہیں اس لئے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ جہاز رواں ہے۔

تمہارے خط تو مجھے ملنے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ کیسے مل سکتے ہیں؟ مگر پتہ بتائے دیتا ہوں' شاید مل جاویں۔

Care of Presidency Postmaster Bombay.

To S.N.Bakar

Supply Agent

Supply Column

2nd Cavalry Brigade

Indian Expeditionary Force 'A'

آج ایک خط قبلہ بھائی صاحب سید محمد فیض العسکری صاحب کو بھی لکھوں گا۔

غلام حسین کا چہرہ بھی رونق پر آگیا ہے۔ سمندر کی آب و ہوا بڑی تندرست کرنے والی چیز ہے۔ بٹی پان کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ میموں نے کئی کمیٹیاں بنائی ہیں۔ ان میں سے ایک کمیٹی نے ہمارے جہاز والوں کو چیزیں بھیجیں۔ تفصیل سنو۔ مختلف رنگ کے ہلکے کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں' دو دو خانوں کی۔ ان میں سوت کے اور ٹین کے بٹن' سوئیاں' سفید اور خاکی دھاگہ' کسی میں چار پانچ چھالیا کی ڈلیاں' کسی میں کچھ کسی میں کچھ۔ ہاں تمباکو کی بیڑیاں جو سگریٹ کی طرح پینے کی ہوتی ہیں وہ سپاہیوں کے لئے۔ کوئی تین من کے قریب ملتان کی پینڈ کھجوریں۔

لو میں لکھ رہا ہوں اور سر پر چوبدار کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے' "سر بریکفاسٹ از ریڈی۔"

اب حاضری کھا کے لکھوں گا۔

بھیا[15] کو ذرا میری بچیوں اور بچوں کا دھیان رکھنا۔ کہیں کھلانے پلانے میں کنجوسی کرو اور میری عمر بھر کی جائیداد بھائی کی مرے۔ ہاں تمہارا کیا ہے تم اپنے میاں تک کو کھانے کو نہیں دیتیں مجھ غریب کے بچوں کی کیا پرواہ کرو گی۔ خدا کو منظور ہوا اور لدا پھندا سرخ رو آیا تو تمہیں خوب لاد دوں گا۔ پر میرے بچوں کو کھلاتی پلاتی رہنا۔

میاں مصطفےٰ باقر۔ تم تو اب اسکول جاتے ہو گے۔ اچھا ہم ایک بات کہیں اگر مان لو تب۔ اب تو پاپا دور ہیں۔ اون کا کہنا ضرور ماننا چاہئے۔ دور جو ہوئے۔ صبح کو مکھن کھا لیا کرو اور دودھ پیا کرو۔ چاء نہ پیو۔ بس۔ ہاں مکھن بہت سا کھایا کرنا۔ اتنا کھاؤ کہ پھوپھی گھبرا اٹھیں۔ آل حسنین[16] طوبعرہ سیالکوٹ ہیں یا مراد آباد چلے گئے؟ اگر مراد آباد نہ گئے ہوں تو تمہارے ساتھ اسکول میں داخل ہو گئے ہوں گے اور تم دونوں بھائی روزانہ مدرسے جاتے ہو گے۔ میاں میرے آل حسنین کا بڑا خیال رکھنا۔ دیکھنا کہیں آزردہ نہ ہو۔ اپنی خوشی اوس کی خوشی سمجھو۔ وہ میرا بیٹا ہی نہیں میرا دل اور جگر ہے اور میاں تم میرے بیٹے ہو۔ بیٹے کا کام ہے کہ باپ کے دل اور جگر کی پرداخت کرے۔

دونوں جیتے رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اے میری اماں کی اماں بڑھیا خالہ[17] خدا تجھے ہمیشہ سلامت رکھے اور تو اپنے شہزادے کے لئے دعائیں مانگتی رہے۔ خالہ دیکھو میری خود غرضی۔ ہوا جو کمسریٹ ایجنٹ۔ جیتی رہو گی تو دعائیں دیتی رہو گی۔ یہ تو میری اپنی غرض ہے کہ خدا اس قدر کم از کم جناب کی عمر دراز کرے کہ جب میں فاتح و منصور ہرا بھرا لدا پھندا لال گلال واپس آؤں تو میری اماں خالہ سب سے پہلے دروازے پر آکر دھاؤں دھاؤں روئے اور میں کھلکھلا کر ہنسوں۔

جناب مخدومہ و معظمہ بھابھی جان دام اللہ الطافہا۔

میں کیا عرض کروں اور کس طرح عرض کروں کہ میں باینہمہ معصیت آپ ہر دو بزرگوں کے لئے رب العالمین کی درگاہ میں ہمیشہ ہمیشہ یہ دعا کرتا ہوں کہ گو میرے ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر اوس مرے مالک کا شکر ادا ہونا ناممکن ہے کہ جس نے آپ اور بھائی صاحب قبلہ جیسے ماں اور باپ عطا فرمائے۔ الحمد للہ علی نعماہ و افضالہ و اکرامہ۔ جناب میری زندگی سے بے فکر رہیں۔ میں پورے بھروسے سے کہتا ہوں کہ ابھی میری موت نہیں آئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمام مشکلات کاٹ کر صحیح و سلامت بفضل الٰہی بخیریت جناب کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف اور سعادت حاصل کروں گا۔ مرنے والی صورتیں ہی اور ہوتی ہیں۔ بھابھی جان جس وقت سیالکوٹ سے چلا ہوں اس وقت تک آپ کو معلوم نہیں ریل کے سفر میں اور اب جہاز پر کتنے ہاتھ میرے واسطے دعا اور سلامتی اٹھتے رہتے ہیں۔ جس نے کبھی میری شکل بھی نہیں دیکھی وہ بھی بیمار پڑا ایسی کہہ رہا ہے" "شاہ جی سے کہو۔ میر صاحب سے کہو۔ مجھے آکر دیکھ جائیں۔"

میں جاتا ہوں' پوچھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے یہ تکلیف ہے .... اچھا گھبراؤ مت۔ ابھی لو۔ جو ضرورت ہو لوگوں سے مل ملا کر اس کی آرزو پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر نہ ہو سکے تو پیسے خرچ کر کے۔

اس شخص کو جسے اس امر کا فخر ہو کہ علیؑ کا پوتا بنے دوسروں کی حاجت روائی کی کوشش میں کب دریغ ہو سکتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ جناب کے خادم باقر کے اس وقت جہاز پر اس قدر دعاگو ہیں کہ اللہ ہر ایک کو دے۔ تو کیا ایسی حالت میں کوئی یقین کر سکتا ہے کہ میرا بال بھی بیکا ہو گا؟

غلام حسین کی ماں آوے تو اسے یقین دلا دیجئے گا کہ الحمد للہ غلام حسین بخیریت ہے۔

آہ! اسلامی گمشدہ نشان دیکھتے جا رہے ہیں اور کیفیت جو دل کی ان کو دیکھ کر ہوتی ہے وہ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے مقبوضات اب اغیار کی ملکیت ہیں۔

بخدمت جناب میر فضل علی صاحب قبلہ تسلیم عرض ہے۔

خادم احقر

نذر الباقر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء

لو بیٹیو۔ لوگ باگ جہاز پر کہہ رہے ہیں کہ آج عید ہے۔ کئی مجھے مبارکباد دے گئے۔ خدا جانے ہے کہ نہیں۔ اگر ہے تو میں بھی تم سب کو دعا دیتا ہوں کہ خداوند کریم خیر و عافیت سے یہ سال اور ایسے سینکڑوں سال خالہ' نانی' ماموں اور تایا ابا کے زیر سایہ اپنے اپنے گھر خوش و خرم بسر کرو۔

جہاز آج دوپہر تک نہر سوئیز میں داخل ہو جاوے گا۔ ہوا ایسی تیز ہے کہ ٹوپیاں اڑی جاتی ہیں مگر سمندر پر سکون ہے۔ جہاز تیز چل رہا ہے اس لئے ہوا زور سے لگتی ہے۔

لو اب جب دوسری ڈاک کے جانے کا وقت آوے گا تو انشاء اللہ پھر لکھوں گا۔

خدا حافظ۔ دعاگو

نذر الباقر

۵—یا حیلۂ افرنگی یا حملہ ترکانہ

۱۹۱۴ء - ۱۹۲۰ء ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ۔ باب عالی کے جگمگاتے فانوس ایک ایک گر کے بجھتے جا رہے ہیں۔ جو سراپا ناز تھے' ہیں آج مجبور نیاز۔

گرد صلیب گرد قمر حلقہ زن ہوئی۔ ہوائیں ان کی فضائیں ان کی' سمندر ان کے' جہاز ان کے۔ بچا لے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ لے گئے تثلیث کے فرزند۔۔ یا مقتدی تاتار افغانی امام۔ سید السادات مولانا جمال۔ پس چہ باید کرد۔۔ اے درویش سودانی؟

نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر۔۔ قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں۔ البتہ شریف حسین جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی بھی مخبری کرتا ہے۔ کوئی شکری حصار ورنہ میں محصور ہو گیا۔ کوئی بندہ حرمالٹا میں اسیر ہوتا ہے۔ صدا آئی کہ میں ہوں روح تیمور۔ اگر محصور ہیں۔

خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش۔

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے

البتہ مصطفیٰ کمال' عصمت پاشا' نور بے' خالدہ خانم۔

جوانان تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے۔

ہندی مسلمان اپنے نوزائیدہ لڑکوں کے نام انور پاشا' جمال پاشا' کمال پاشا' مدحت پاشا رکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ ناقہ ماختہ و محمل گراں

عساکر عثمانیہ کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا۔

بغداد والے انور پاشا روس پہنچے۔ بالشویک فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

انقلاب روس و الماں دیدہ ام۔ شور در جان مسلماں

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا۔ اگر عثمانیوں پہ کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے۔ جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں۔

ہمارے محمد علی چچا۔ چاند تارے والی ٹوپی اوڑھے فرغل ڈانٹے جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بھکاریوں اور فاقہ کش مغل شہزادوں کی بھیڑ میں کھڑے کوچ کا بگل بجا رہے ہیں۔ ہوتا ہے جادہ پیما۔

سوختہ ساماں ہندی کلمہ گو جوق در جوق دار الحرب سے ہجرت کر رہا ہے۔ غریب الوطنی۔ مزید فاقہ کشی۔ بربادی۔ ناکامی۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر ڈوبے۔

بیشمار دیو بندی مولینا۔ ذہن پرست انقلابی۔ جوشیلا قوم پرست۔ سر پہ کفن باندھ جیل میں گھس گیا۔ پھانسی چڑھا۔ کابل۔ تاشقند۔ ماسکو۔ برلن۔ امریکہ فرار ہوا۔ یہاں اور وہاں بھوکوں مرا۔ مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

بولی اماں محمد علی کی۔۔۔

ہزار ہا غریب ہندی مسلمان خدا رسولؐ کا عاشق فرنگی سے مقابلہ کرنے کوچہ و بازار کھیت کھلیان سے نکلا۔ گلے میں حمائل شریف۔ ہاتھ میں ستو کی پوٹلی۔ کہ جہاں میں نان جویں پر ہے مدار قوت حیدری۔ مارا گیا۔ قید خانہ میں بند ہوا۔ کالے پانی بھیجا گیا۔ فراموش ہوا۔ آج گمنام ہے۔ نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

کشور ہند کی مساجد میں بروز جمعہ سلطان وحید الدین و سلطان عبد الحمید خامس کے نام کا خطبہ بصد جوش و خروش و رقت ہنوز پڑھا جا رہا ہے۔ امیر المومنین۔ خلیفۃ المسلمین۔ سلطان المعظم پائندہ باد۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔

کشور ہند کا عام غیر مسلم خلافت کو برطانیہ کی "مخالفت" سمجھا اور سرکار کی "خلافت" کرنے میدان عمل میں کود پڑا۔ ہندو مسلم بھائی بھائی۔ ہندو مسلم اتحاد زندہ باد۔ گاندھی جی کی جے۔

چنانچہ اے میرے غیور فیصلہ تیرا ہے کیا۔ خلعت انگریز یا پیراہن چاک چاک؟ تو بھی اے فرزند کہستاں اپنی خودی۔

بلے بلے۔ خوب می شناسم آغا۔ امیر حبیب اللہ خاں برادر زادہ امیر یعقوب خاں مرحوم امیر کوہ منصوری آؤٹ۔ افغان باقی کہسار باقی الحکم للہ! الملک للہ!

امیر امان اللہ خاں۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔

ہز مجسٹی جلالۃ الملۃ والدین امیر المومنین امیر امان اللہ خان خلد اللہ ملکہ' کا برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ۔

پشاور چھاؤنی سے اڑنے والے پتلے پتلے مچھروں کی طرح بھنبھناتے برطانوی بمبار طیارے۔ ہرات و کابل و غزنی کا سبزہ نورس۔

فورتھ اینگلو افغان وار

شہ۔ مات

نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی۔

محمد فاتح اور سلیمان اعظم کی سلطنت یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے نقشوں سے معدوم ہوئی۔ قاہرہ' جدہ' بغداد' دمشق' یروشلم پر یونین جیک اپ' ہلال احمر ڈاؤن۔ فلسطین پر یورپین صیہونیوں کی یلغار۔ اے فلسطینی جواں۔ تری دوانہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں۔ فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے۔ اے جا۔ کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں۔

٦—نواب سرہار کرٹ بٹلر کا لکھنؤ

یو۔ پی کا گورنر سرہار کرٹ غلطی سے انگلستان میں پیدا ہو گیا تھا۔ طبعاً لکھنؤ کا تعلقہ دار تھا۔ ایک تو اس میں اٹھارویں صدی کی جان کمپنی کے کسی انگریز "نباب" کی روح حلول کر گئی تھی۔ دوسرے سفید دیونے کان میں پھونک دیا تھا کہ تعلقہ داران اودھ جو تحریک آزادی میں گھس گئے ہیں ان کے لئے ایسی اندر سبھا سجاؤ کہ لال بال پال گوکھلے نہرو جناح سب بھول جائیں۔ (اس قابل ذکر شخص کا باپ بھی ایک گھاگ مدبر تھا۔ اور بھتیجا برطانیہ کا چانسلر آف ایکسچیکر بنا) سرہار کرٹ' علی محمد خاں راجہ صاحب محمود آباد اور موتی لعل نہرو دونوں کا یار غار تھا۔ راجہ صاحب سے دوستی کی وجہ سے الہ آباد چھوڑ کر بعد میں اس نے لکھنؤ کو صوبے کا دار الحکومت بنایا۔ "نواب بٹلر" کہلاتا تھا۔ راجہ صاحب نے اس کے نام پر اپنے نئے محل کا نام "بٹلر پیلس" رکھا۔

ادھر بسلسلہ ہندو مسلم اتحاد' کانگریس اور لیگ کے جلسے ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ ۱۹۱۵ء کے اجلاس کے لئے راجہ صاحب محمود آباد' سید وزیر حسن' سید رضا علی اور ریلد رم بمبئی گئے۔

تاج محل ہوٹل

۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء

السلام علیکم

میں نے چاہا کہ رات کو بیٹھ کر خط لکھوں گا مگر رات کھانے کے بعد لوگ آنے شروع ہو گئے۔ پھر خواجہ عبد المجید' وزیر حسن اور ایک حیدر آبادی دوست مسز اصغر آگئے۔ ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے اتنے میں چمکتی دمکتی سروجنی نائیڈو آگئیں۔ رات کے بارہ بجے تک ہم لوگوں سے شاعرانہ پر مذاق باتیں کرتی رہیں۔ ان کے لباس سے بھی ان کے شاعرانہ مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ تم ان سے مل کر بہت خوش ہو گی۔

آج سے لیگ کا سالانہ اجلاس شروع ہو گا۔ کل ایک بڑا واقعہ یہ ہوا کہ وزیر حسن' راجہ صاحب محمود آباد کو کانگریس کے اجلاس میں لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ اب میرا خیال ہے اسلامی اخبارات راجہ صاحب پر پھر لے دے کریں گے۔

وزیر حسن کے بڑے زور ہیں۔ رضا علی' آل نبی[18] سب کو خوشامدی گورنمنٹ کا غلام کہتے ہیں۔ کہتے ہیں جتنے بڈھے یا بڈھے خیالات کے لوگ قوم میں ہیں ان سب کو نکال دینا چاہیئے۔

کانگریس کے جلسے میں پارسی اور مرہٹہ خواتین کا مجمع تھا۔ سب ایک جگہ بٹھائی گئی تھیں اور میں نے اخبارات میں پڑھا کہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے خیر مقدم کا راگ گاتی تھیں۔ میں اس وقت پہنچا جب صرف تقریریں ہو رہی تھیں۔

سجاد

مسلم لیگ کے اسی اجلاس کے موقعے پر سروجنی نائیڈو نے سر رضا علی سے کہا' "مسلمان جلسوں کی خصوصیت اور کچھ ہو نہ ہو' یہ ضرور ہے کہ آپ لوگ لباس بہت اچھا پہنتے ہیں۔"

سید رضا علی نے جواب دیا' "سلطنت تو کھو چکے۔ اب لباس بھی اچھا نہ پہنیں؟"

سر وزیر حسن مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی حسو باجی لکھنو میں جاپلنگ روڈ پر اپنی کوٹھی نور منزل میں تن تنہا رہتی ہیں۔ ان کے شوہر[19] کا انتقال ہو چکا ہے۔ چند سال قبل ایک جوان لڑکے نے ڈھاکہ میں رحلت کی۔ بڑے داماد مہاراجہ علی محمد خاں کی دوسری بیگم کے صاحبزادے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان جاتے وقت اماں' حسو باجی کے ہاں چند کیبن ٹرنک اور بیش قیمت ولایتی برتنوں کے متعدد سیٹ رکھ گئی تھیں۔ انھوں نے جو سامان چند روز قبل دہرہ دون سے بذریعہ مال گاڑی لاہور بھیجا تھا ستمبر کے مہینے میں وہ مال گاڑی راستے میں کہیں لٹ لٹا گئی۔ باقی سامان "آشیانہ" دہرہ دون کی ضبطی کے ساتھ غتربود ہوا۔ حسو باجی بیس برس تک باقی ماندہ امانت کی حفاظت کیا کیں۔ ۱۹۶۷ء میں میں لکھنؤ گئی تو انھوں نے الماریوں سے نکلوا نکلوا کر چینی برتنوں کے انبار پچھلے سنسان برآمدے میں میرے سامنے رکھوائے۔ ایک کیبن ٹرنک خاندانی تصاویر اور پرانے خطوط سے پر نکلا۔ کیبن ٹرنک کھولنے سے قبل ایک ٹین کے سرخ ڈبے پر نظر پڑی۔ ڈبے کے ڈھکن پر بورنیا سوپ گڈونز مانچسٹر" لکھا تھا اور نیچے عہد نواب ہارکرٹ بٹلر کے "وائٹ ویز" حضرت گنج کا لیبل۔ اندر ایک اطلسی "بو" اور ایک موتیوں کا سبک فرانسیسی بٹوہ۔ حسو باجی دفعتاً اپنی والدہ اور نذر خالہ کو یاد کر کے رونے لگیں۔

"بوبو اور نذر خالہ اس زمانے کی فیشن ایبل سوسائٹی کی لیڈر تھیں۔ نذر خالہ دلی والا غرارہ پہنتی تھیں جو انہوں نے لکھنؤ میں رائج کیا۔ بوبو انگلش ڈریس کے اوپر دوپٹہ اوڑھتی تھیں۔ ایڈورڈین گاؤں کی طرز کا غرارہ نذر خالہ نے خود اختراع کیا تھا۔ جھالردار۔ اس کی کلیاں گاؤن کی مانند پشت پر ہوتی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی بو (Bow)۔ نذر خالہ غرارے پر بلاؤز پہن کر پیٹی لگاتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ترمیم شدہ غراروں کا فیشن ہوا۔

"ہم لڑکیاں تنگ پائجامے پہنتی تھیں۔ مسلم اسکول میں بھی زیادہ تر تنگ پاجامے پہنے جاتے تھے۔

جج کرامت حسین نے پہلے الٰہ آباد میں کرامت گرلز اسکول قائم کر کے اپنی ذاتی جائیداد کی آمدنی پانچ سو روپے ماہوار اس کے لئے وقف کی۔ وہ بہت بڑے محسن قوم تھے۔ لیکن آج لوگ ان کو بھی بھول چکے ہیں۔ جید عالم اور قانون دان تھے۔ بارہ بنکی کے ایک خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں جب انہوں نے مسلم گرلز اسکول کھولا' راجہ صاحب محمود آباد نے قیصر باغ میں چودھری نصرت علی سندیلے کے ایک تعلق دار کا مکان اس کے لئے کرایہ پر دلوا دیا۔ ایک نو مسلم انگریز بی بی' مس آمنہ پوپ ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں۔ اسکول میں سب سے پہلے جو لڑکیاں داخل ہوئیں' بٹن[19] باجی اور میں' چودھری نبی اللہ کی لڑکی جنت' خود جسٹس کرامت حسین کی نواسی سکینہ' جسٹس سمیع اللہ بیگ کی لڑکی کشور' چچا رضا علی کی لڑکی ہاجرہ' چودھری محمد علی رودلوی کی چاروں لڑکیاں کجن' الن' ہما' چھبن۔ ہم سب بورڈنگ ہاؤس میں داخل کئے گئے۔ صرف بٹن باجی گھر پر رہیں۔ باضابطہ چوپلے پر بیٹھ کر کہاروں اور خدمت گاروں کے ساتھ آتی تھیں۔ جنت باجی بھی ڈے اسکالر تھیں۔ ان کی ایک رشتے کی نانی بحیثیت محافظ فٹن پر روزانہ ان کے ساتھ آتی تھیں۔ بمبئی سے نواب صاحب جنجیرہ کی لڑکی شمو بورڈنگ ہاؤس میں آئی تھی۔

"جس دن اسکول کھولا گیا افتتاحی جلسے میں ہم لڑکیوں نے مولانا صفی کی نظم پڑھی' جو انہوں نے اسی موقعہ کے لئے لکھی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے"

یہ بچیاں ہماری' یہ بے زبان گائیں
اس راستے چلیں گی جس راہ ہم چلیں
یہ ہونہار بیلیں' نازک بہت ہیں دیکھو
بے التفاتیوں سے مرجھا کے رہ نہ جائیں
یہ مدرسہ صفی ہے سرمایہ کرامت
تعلیم و تربیت سے کیوں فیض ہم نہ پائیں
فیاضیوں کو سن کر ہم دے رہے ہیں دل سے
راجہ علی محمد خاں آپ کو دعائیں

"پہلے آٹھ دس روز تک لڑکیوں کے لئے کھانے کے خوان بج کر راجہ صاحب کے ہاں سے بورڈنگ ہاؤس آتے رہے۔ پھر اپنا باورچی خانہ شروع کیا گیا۔ جج کرامت حسین کے قومی جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بورڈنگ ہاؤس کا سارا خرچ خود اٹھاتے تھے۔ صرف پڑھائی کی فیس لی جاتی تھی۔ حالانکہ سب لڑکیاں خوشحال گھرانوں کی تھیں۔ ہوسٹل انہوں نے اس لئے قائم کیا تھا کہ گھروں سے اسکول آتے جاتے میں کوئی لڑکیوں کو اغوا نہ کر لے۔ اس کے باوجود مولویوں نے مولانا کرامت حسین کے خلاف کفر کے فتوے عائد کئے اور اسکول کو بدنام کیا۔ شہر کے لونڈے اسکول کی عمارت کے نیچے کھڑے ہو کر تھیٹر کی غزلیں گایا کرتے۔ اس وجہ سے ہمارا اسکول قیصر باغ سے نثار علی صاحب کی کوٹھی نمبر ۱۱۸ وزرم روڈ منتقل کیا گیا۔

"۱۹۱۶ء میں نذر خالہ اور بوبو نے انجمن تعلیم المسلمات قائم کی۔ اس کی اراکین مسلم گرلز

اسکول اور اس کی بورڈنگ ہاؤس اور باورچیخانے کا باقاعدہ ہر ہفتے معائنہ کرتی تھیں۔

"اسی سال جسٹس کرامت حسین کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک اسکول میں صرف پچاس لڑکیاں تھیں۔ اس کے باوجود مرنے سے پہلے مرحوم بے حد مسرور تھے کہ بفضل خدا پچاس لڑکیاں تو ہیں[20]۔"

فرانسیسی بٹوے میں سے مزید چند خط بر آمد ہوئے .... "سجاد حیدر نے ۱۸۹۸ء سے تین سال تک مجھ سے انگریزی ادب پڑھا۔ اپنے ہم عصر طلبا میں سب سے زیادہ نامور اور غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ میرے کالج چھوڑنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن ارباب کالج نے ان کے بارے میں مجھے جو اطلاعات بھیجی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نو عمری کے زمانے میں ان سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں ان کو انھوں نے بخوبی پورا کیا ہے۔ ان کی اعلیٰ سیرت و کردار اور کالج کے پرنسپل کے ان پر اعتماد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھیں سنٹرل پرونسز کے ایک محمڈن راجہ کا اتالیق منتخب کیا گیا ہے۔ سجاد حیدر ایک تندرست و صحتمند نوجوان ہیں اور روزانہ باقاعدہ شہسواری کے عادی ہیں۔

ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ

۲۳ مئی ۱۹۰۲ء

پروفیسر آف فلاسفی، گورنمنٹ کالج لاہور۔

ناگپور کے ان "محمڈن راجہ" اعظم شاہ کا تذکرہ فصل سوم باب ۳ "بیچلرز لاج کی خاتون" میں کیا جا چکا ہے۔

از طرف مسٹر جسٹس ایچ۔ ٹی۔ بوڈیم۔ جج مدراس ہائی کورٹ

ادیار۔ مدراس

۱۳ اپریل ۱۹۰۲ء

جناب عالی

مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت مسرت ہے کہ آپ نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس کے سلسلے میں بیحد خلوص اور محنت سے کام کیا۔ آپ نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے لئے جو پمفلٹ لکھا وہ بے انتہا اہم اور مفید ثابت ہوا اور اسے آپ نے نہایت عمدہ انگریزی میں لکھا۔

آپ کا مخلص

ایچ۔ ٹیوڈر بوڈیم[21]

از طرف سر تھیوڈور موریسن، سابق پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ و حال ممبر کونسل سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لنڈن۔

سجاد حیدر جس زمانے میں میرے شاگرد تھے مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ہندوستانی انڈر گریجویٹ کی حیثیت سے ان کی انگریزی کی قابلیت حد سے زیادہ غیر معمولی تھی۔ انگریزی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور بہت نفیس انگریزی لکھتے اور بولتے ہیں۔

(تلخیص)

تھیوڈور موریسن

از طرف جیرالڈ گارڈنر براؤن، سابق پروفیسر ایم اے او کالج علی گڑھ۔ حال پرنسپل اندور کالج۔

"سجاد حیدر نے ۱۹۰۱ء میں بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد قانون اور ایم اے کے لئے پڑھا۔ لیکن امتحانات نہیں دیئے۔ ۱۹۰۴ء میں وہ بحیثیت ڈریگومین برطانوی کونسلیٹ جنرل بغداد گئے جہاں اس وقت موجود ہیں۔ میں ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۴ء تک بہت اچھی طرح ان سے واقف رہا۔ ایم اے او کالج نے اپنی پوری تاریخ میں جو چند بہترین طالب علم پیدا کیے وہ بلاشبہ ان میں سے ایک ہیں اور میرے خیال میں ۱۸۹۹ء کے بعد کے بہترین طالب علم ہیں۔ کالج میں ان کو غیر معمولی طور پر عمدہ شہرت حاصل تھی۔ لیکن ان کی موجودہ ملازمت ایسی نہیں ہے جس کے وہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے مستحق ہیں۔ وہ اس ملازمت سے چنداں خوش نہیں ہیں اور میں چاہتا ہوں انھیں ایسی ملازمت ملے جس میں ترقی کا امکان ہو۔ وہ بیحد ذہین نوجوان ہیں اور ایسے حس مزاح (Sense of Humour) کے مالک ہیں جو ہندوستان میں بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔"

(تلخیص)

از طرف ایل پٹنگ۔ انڈین ایجوکیشنل سروس۔

کلکتہ

۱۷ دسمبر ۱۹۰۷ء

مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت مسرت ہے کہ مسٹر سجاد حیدر بی اے علی گڑھ میں میرے شاگرد تھے۔ اس زمانے میں کلاس روم اور بورڈنگ ہاؤس (جس کا میں نگراں تھا) دونوں میں میرا ان سے سابقہ رہا اور ان کی اہلیت اور کردار نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر ذہین نوجوان ہیں اور ان کی انگریزی کی قابلیت بھی غیر معمولی ہے۔ ان کا ادبی ذوق آرٹ کے ایک عام طالب علم کے مقابلے میں کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک جنٹلمین ہیں اور اس وجہ سے استادوں اور طلبہ کے حلقوں میں یکساں طور پر مقبول رہے۔ ان کی صلاحیتیں اور ایک انتہائی بلند اور صالح کردار ان کو زندگی میں بہت دور تک لے جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ ان کو دنیا میں وہ مواقع حاصل ہوں گے جن کی وجہ سے وہ اپنی افتاد طبع کے بموجب خدمت خلق کر سکیں۔

لولین پٹنگ

سابق سینئر پروفیسر اور پرووسٹ

ایم اے او کالج۔ علی گڑھ

پٹیالہ

۱۱ جون ۱۹۱۵ء

السلام علیکم! آج پٹیالہ پہنچا۔ شام کو سات بجے کی گاڑی سے واپس جاؤں گا اور انبالہ میں راجہ صاحب سے ملوں گا۔ ۱۳ جون کو لکھنؤ۔

خلیفہ حامد حسین[22] کی بیوی حیدر آباد سے تین چار مہینے کے لئے آگئی ہیں۔ کہتے ہیں ان کی ماں

مجبور کر رہی ہیں کہ اولاد کے لئے دوسری شادی کرلوں۔ میں ہچکچاتا ہوں۔ مگر تلاش میں ہوں۔

سجاد

۳۹۔ راجپور روڈ، نئی دہلی

۲۱ مارچ ۱۹۱۶ء

السلام علیکم

آج صبح ٦ بجے یہاں پہنچ گیا۔ آتے ہی راجہ صاحب کے لئے اسپیچ لکھی۔ دس بجے تک وہ طیار ہوئی۔ اس کے بعد کھانے پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد راجہ صاحب کونسل گئے۔ مجھے اسٹیشن جانا ہے۔

مسز وحید[23] کی خیریت لکھنا۔ بھائی آل مصطفیٰ[24]، پھوپھی[25] کو لکھنؤ پہنچادیں گے۔ انہیں لکھنؤ شیعہ کالج کے جلسے کے لئے آنا ہی ہے۔

صادق علی خاں کی گاڑی آگئی۔ لو خدا حافظ!

سجاد

۷ — عیش باغ

پیش منظر

ہلٹن لین

۳۱ مارچ ۱۹۱۸ء

السلام علیکم۔ ایک خط بھیج چکی ہوں۔ بچی کی طرف سے سخت فکر ہے۔ میاں کو بھیج کر ڈاکٹر بلواؤں گی۔ شہر کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ کی کورٹ کی میٹنگ کس روز ہے اور علی گڑھ سے کب چلیں گے؟ پاپا کی لڑائی کی میعاد ختم ہونے میں نہیں آتی۔ سارا زمانہ واپس آرہا ہے۔ پاپا ہی کو نہیں آنا ملتا۔ سیالکوٹ کے ایک شخص صفدر کا بھائی بصرہ اور فرانس سے لوٹا ہے۔ اس نے بھائی انعام اللہ سے پاپا کے بہت تکلیف دہ حالات بیان کئے ہیں کہ بعض بعض دن صرف چاء پر گذر کرنا پڑی۔ لوگ کہتے ہیں پاپا فرانس میں عیش کر رہے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ان کی جان کو آرام ہو۔

مچھروں کی بہتات ہے۔ چوہوں کی طرح آج کل مچھر بھی خطرناک ہیں۔

پریشان حال

نذر

ڈھائی سالہ گل رعنا پولیو میں گرفتار تھیں۔ جس کا غالباً اس وقت تک علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ غیر معمولی طور پر حسین، سنہرے بال، نیلی آنکھیں۔ ٹانگیں جواب دیتی جارہی تھیں۔ دن بھر چپ چاپ بیٹھی گڑیوں سے کھیلا کرتیں۔ نانی اشرف جہاں مع چھوٹی نواسی ثروت آراء اور نواسے مصطفیٰ باقر، بڑے داماد

میر فیض العسکری کے ہاں جہلم سے لکھنؤ آگئی تھیں۔ مصطفیٰ باقر کو اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ میڈیکل سائنس نے آج جیسی ترقی نہیں کی تھی۔ اور ملک میں وباؤں اور مہلک امراض نے بچوں اور جوانوں کی اموات کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ احباب میں شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی بیٹی مولوی محمد یعقوب کی دلہن وحیدہ اور بتیس سالہ ولایت علی بمبوق، خاندان میں بڑے بھائی سید اعجاز حیدر اور بہنوئی سید برہان حیدر، سب جوان جہان ایک کے بعد ایک اللہ کو پیارے ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم کر گئے۔ طاعون، ملیریا، ہیضہ، مرگ انبوہ تھا۔ گھروں سے جنازے ایسے نکل رہے تھے جیسے شادی بیاہ کے موسم میں باراتیں چڑھتی ہوں۔ قبرستان اور شمشان گھاٹ پر ہروقت بھیڑ لگی رہتی۔ نانی اشرف جہاں نے "فلاں کی بھتی میں نے کھائی" کہنا چھوڑ دیا تھا۔ حق دق بیٹھی تھیں۔

ہلٹن لین میں مقیم یلدرم کے یتیم بھتیجے ممتاز حیدر اور یتیم بھانجے عثمان حیدر، مصطفیٰ باقر کے ساتھ اسکول جاتے تھے۔ مصطفیٰ باقر اپنے پاپا کی فرانس سے واپسی کی گھڑیاں گن رہے تھے۔

گرمیاں شروع ہوئیں۔ لڑکوں کا اسکول بند ہوگیا۔ احاطے میں یوکلپٹس کے خشک پتے کھڑکھڑانے لگے۔ "لال پانی" سے بھرے تسلے سامنے کے برآمدے میں رکھ دیئے گئے تھے۔ جو باہر سے آتا پہلے اس کے ہاتھ دھلوائے جاتے۔ شام پڑے جب ہوا میں خنکی آتی، کھڑکھڑاتے کلف دار سفید لہنگے والی آیا، بنتی، گل رعنا کو باہر سرو کے درختوں سے گھرے سبزے پر لے کر آتی۔ تینوں لڑکے کچھ دیر اس بے چاری پری تمثال معذور بچی کے ساتھ کھیلنے کے بعد ہاکی، فٹ بال میں مصروف ہو جاتے۔ اخیر اپریل کی ایک شام ہاکی کھیلتے کھیلتے مصطفیٰ باقر کی گیند دور برگد کی طرف لڑھکتی چلی گئی۔ مصطفیٰ باقر اور ممتاز حیدر اس کے پیچھے پیچھے دوڑے۔ جھاڑیوں میں بہت تلاش کیا نہ ملی۔ مصطفیٰ باقر نے چیک کر بنتی کو آواز دی "آیا تمہارا بڑھوا منگل والا الو معلوم ہوتا ہے ہماری گیند لے گیا۔"

"توبہ کرو بھیا توبہ۔ شیطان کے کان بہرے!" بنتی نے گل رعنا کی پہیوں والی کرسی روش پر دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔ "الو کے کان بہرے کہو۔" مصطفیٰ باقر ہنس کر بولے۔ بنتی نے بتا رکھا تھا کہ پچھلے بڑھوا منگل کے دن سے سات روز سات رات ایک نھوا لو برابر بولت رہا۔ جون کسی منئی کا نام او کے کان میں پڑ جائے اوہی رٹا کرت ہے۔ اگلے بڑھوا منگل سے پہلے پہلے او کا ہونس لیت ہے۔ ہم بیگم صاحب سے اتنا کہن لڑکن کی، بیٹا کی نجرا تار دیجئے وہ مانت ہی ناہیں۔"

نانی اشرف جہاں بنتی کی قطعاً ہم خیال تھیں مگر اس سائنٹفک زمانے میں ان کی کون سنتا تھا۔

دوسرے روز قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ صبح کے ناشتے کے بعد مصطفیٰ باقر اور ممتاز حیدر دونوں کو اچانک الٹیاں آنا شروع ہوئیں۔ منٹوں میں دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ فوراً بلرام پور ہسپتال پہنچایا گیا۔ یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں دونوں نوجوان داخل کئے گئے۔ نذر بیگم اور ثروت آراء کرسیوں پر بیٹھ کر دعا و درود میں مصروف ہوئیں۔ ڈاکٹر بار بار کمرے میں آکر نو عمر مریضوں کے ناخن دیکھتے۔ سجاد حیدر مبہوت اور چپ چاپ برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ایک اپنے جوانمرگ بھائی کا لڑکا۔ دوسرا بیوی کا اکلوتا

بھائی۔ مگر اجل نے رشتے ناتے کا کس روز خیال کیا ہے۔

ڈاکٹروں نے کمرے میں آکر پھر دونوں کے ناخن دیکھے۔ عثمان حیدر نے باہر آکر چپکے سے پوچھا۔

"آپ بار بار ناخن کیوں دیکھتے ہیں؟"

"اگر ہیضے کے مریض کے ناخن نیلے پڑ جائیں وہ نہیں بچتا۔" ایک ڈاکٹر نے جواب دیا۔

دوسرے روز صبح تک سید مصطفےٰ باقر کے ناخن نیلے پڑ چکے تھے۔

اس جوانمرگ کے ماموں زاد بھائی سید ابراہیم حسین خاں والئی محمود پور حکیم صاحب عالم سے علاج کروانے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ بلرام پور ہسپتال کے نزدیک ایک مکان لے کر اس میں ٹکے تھے۔ وہ دونوں پچھاڑیں کھاتی ہوئی بہنوں کو ہسپتال سے اپنے ہاں لے گئے۔ نماز جنازہ کے لئے ایک "جناب" یعنی مجتہد کو بلوایا۔ سیاہ شامیانے والا تابوت گورستان روانہ ہوا۔

پس منظر

سولہ سالہ سید مصطفےٰ باقر رضوی اس ڈراؤنے شہر خموشاں میں سپرد خاک کر دیئے گئے جہاں میر رمضان علی سے لے کر میر معصوم علی تک ان کے سارے اجداد دفن تھے۔ اجی کے معلوم۔ کون تھے۔ کیا تھے۔ کدھر گئے۔ اب کہاں ہیں۔

ایک بوڑھے نابینا فاقہ زدہ حافظ جی نئی قبر کے سرہانے چالیس روز تک قران خوانی کے لئے بٹھال دیئے گئے۔ اول منزل کر کے جب لوگ واپس گئے حافظ جی نے اپنی لاٹھی کچی مٹی میں نصب کی اور ہل ہل کر تلاوت کلام مجید شروع کر دی۔

حافظ جی کو دن اور رات کا فرق معلوم نہیں تھا۔ مغرب کی اذان پر اٹھے۔ لاٹھی ٹیکتے۔ قبروں کے کتبے ٹٹولتے ٹٹولتے نزدیک کی قدیم مسجد تک چلے گئے۔ نئی قبر اکیلی رہ گئی۔

سورج ڈوبا تو ایک دم گھپ اندھیرا چھا گیا۔ کیا پتہ اس تاریک رات جب ملکہ جہاں کے سیاہ مقبرے کے پیچھے سے سولہویں کا چاند طلوع ہوا تو ناگ پھنی کی جھاڑی کے نیچے دھنسی سیاہ غار ایسی قدیم قبر میں سے میر معصوم علی چکلہ دار اودھ نے جھانکا ہو۔ شکل سے پہچان گئے۔ نگوڑ پوتا ہے۔ ماشاء اللہ سے کیا چاند ایسی صورت پائی ہے۔ قمر بنی ہاشم ابوالفضل عباس کا سایہ اس پر قائم رہے۔ بے ساختہ بولے "جیو ہزاری عمر ہو۔" پھر کھسیانی ہنسی ہنسے۔ خاک آلود کھوپڑی کے نیالے پتھر دانت اندھیرے میں فاسفورس کی طرح چمکے۔

نو عمر لڑکا ہیبت زدہ ہوا۔ مگر فوراً مودبانہ کہا' "ہاؤ ڈو یو ڈو سر۔"

جھینپ کر فرمایا "میاں ادھر کو سرک آؤ۔ ادھر جنت کی کھڑکی کھلی ہے۔"

"میں تو ابھی ابھی مرا ہوں اور آپ فرماتے ہیں ہزاری عمر ہو۔" لڑکے نے یکلخت غصے سے کہا۔ رک گیا۔ پھر بولا' "مرنا تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ میں تو اپنے پاپا کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

ابھی ان کا لندن سے خط آیا ہے کہ میرے لئے ہوائی بندوق لا رہے ہیں اور بہت ساری چیزیں۔ اتنے سارے پکچر پوسٹ کارڈ بھیجے ہیں اور لکھا ہے مجھے پڑھنے کے لئے لندن یا کیمبرج بھیجیں گے۔ یہ دیکھئے کیم ندی کی تصویر انھوں نے بھیجی ہے۔ اور یہ ٹرنٹی کالج کا پھاٹک۔ یہ رہا۔" لیکن ہاتھ خالی۔ سرد اور ساکت لڑکا رونے لگا۔

فرمایا' "کوئی نہیں بچنے کا' بیٹے۔ کوئی نہیں بچنے کا۔"

"جب مجھے اتنی جلدی مرنا تھا تو پیدا ہی کیوں ہوا تھا؟"

میر معصوم علی خاموش۔ کیا جواب دیتے۔

نگوڑ پوتے نے پھر برافروختگی سے کہنا شروع کیا' "میرے چاروں طرف ناگ سرسرا رہے ہیں اور آپ فرماتے ہیں جنت کی کھڑکی۔ وہ بڑے میاں حافظ جی بھی چلتے بنے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"مرے کے ساتھ کوئی نہیں مرا کرتا بیٹے۔"

"جی.........؟ اب مجھے سنائی بھی کم دے رہا ہے۔ کانوں میں عجیب عجیب سی آوازیں گونج رہی ہیں۔ ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کون ہیں؟"

"تمہارا لگڑ دادا۔ میرے بچے کلمہ پڑھو۔"

"پڑھ تو رہا ہوں دادا ابا۔"

خاموشی

کچھ دیر بعد لڑکے نے پھر کہا "دادا ابا میں نے دینیات میں پڑھا تھا فشار قبر ہوتا ہے۔ وہ بھی ہو گا؟"

"تم معصوم ہو بیٹا۔ کلمہ پڑھو۔"

"اور دادا ابا۔ اب کیا منکر نکیر بھی آئیں گے؟"

"کلمہ اور درود شریف پڑھتے رہو میرے بچے اور سب سوالوں کا جواب اچھی طرح دینا۔"

"جی بہت اچھا۔ میں دادا جان کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا ہوں۔ آئی مین۔ آتا تھا۔"

لڑکے نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

اچانک آنسو غائب۔ آنکھیں شیشہ۔ نگڑ دادا' نگڑ پوتا۔ ایک آن میں دونوں معدوم۔

پیش منظر

"السلام علیک یا اہل قبور" سید انعام اللہ شاہ نے نئی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ مرحوم مصطفےٰ باقر کے پھوپھی زاد بھائی میر افضل علی نے شیعہ طریقے سے قبر پر داہنا ہاتھ رکھ کر دعائیں پڑھنی شروع کیں۔ تمازت آفتاب کی وجہ سے آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ دونوں خوش پوش نوواردوں کے آس پاس بھکاریوں کی بھیڑ لگ گئی۔ تانگہ کچھ فاصلہ پر درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ فاتحہ

خوانی سے فارغ ہو کر دونوں نوجوان پگڈنڈی پر آئے۔ "ہلٹن لین واپس چلو بھائی۔" میر افضل علی نے کوچوان سے کہا۔

گھر پہنچے۔ بھائی جان قیصرباغ جا چکے تھے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ان کے بھتیجے ممتاز حیدر کی زندگی بچ گئے۔ اسی صبح بلرام پور ہسپتال سے گھر واپس آئے تھے۔ اپنے کمرے میں لیٹے تھے۔ ہسپتال کے وارڈ میں برابر کے پلنگ پر سے ان کے پیارے دوست مصطفےٰ باقر کی لاش اٹھی تھی۔ اس صدمے نے ممتاز حیدر اور عثمان حیدر دونوں کو بھونچکا کر رکھا تھا۔ نذر باجی اور ثروت آراء اپنے کمرے میں مبہوت بیٹھی تھیں۔

"باجی اس جگہ کو عیش باغ کیوں کہتے ہیں؟" میر افضل علی نے پوچھا۔

"شاہی کے جمانے میں ہوا ں بڑا بھاری میلہ لگت رہا۔" بنتی نے جواب دیا۔

افضل علی نے آہستہ سے کہا "میاں کی قبر کے آس پاس ناگ پھنی کی جھاڑیاں ہیں۔"

"باجی جان۔ ایک ناگ سر سراتا ہوا آیا اور تانگے کے پائیدان سے سر پٹکنے لگا۔ نامعقول مجاور کھیسیں نکال کر بولا۔ اجی حضت یہ تو قبروں کا رکھوالا ہے۔ ایک روپیہ دے جایئے اسے دودھ کھلائیں گے۔" انعام اللہ شاہ نے کہا۔[26]

دونوں بہنیں دہل کر رونے لگیں۔ دونوں نوجوانوں نے گریہ وزاری میں شرکت کی۔ اب انعام اللہ نے تخت پر سے وہ کاپی بک اٹھائی جس میں ثروت آراء سر جھکائے بھائی کا مرثیہ لکھ رہی تھیں

ارمان میں تھیں بہنیں ترا بیاہ کریں گی۔ سہرا نہ دکھایا
بے نام و نشاں کر کے چلے جاتے ہو بھیا۔ انصاف ہے یہ کیا
وہ پھول سا چہرہ جو دکھائی نہیں دیتا۔ آنکھیں ہوئیں خونبار
بہنیں تو ترے واسطے کرتی تھیں مہیا۔ مخمل کے بچھونے
اور بھاگیا تم کو فرش خاک پہ سونا۔ کیوں، اچھے بتاؤ
معصوم کی تربت پہ رہے سایہ رحمت۔ اے خالق اکبر
صدقے میں حسینؑ اور حسنؑ ابن علیؑ کے جنت میں جگہ دے
حضرت علی اکبرؑ کے تصدق میں اسے رکھ۔ سائے میں علیؑ کے

انعام اللہ شاہ نے کاپی بک بند کر دی۔ وحشت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ نزدیک میز پر صحیفہ کاملہ رکھا تھا۔ اسے کھولا۔ سرورق پر "سید ظہور حسنین رضوی۔ لکڑا محلہ۔ امروہہ" کے دستخط ثبت تھے۔ اوراق پلٹتے گئے۔ ایسی حمد جو ہمارے لئے عالم برزخ کی تاریکیوں کو روشن کر دے۔ رحمت نازل کر اس فرشتے پر جس کے جھڑکنے کی آواز سے بجلی کی کڑک سنائی دیتی ہے اور جب اس کی آواز سے گرجنے والے بادل چلنے لگتے ہیں اور گرنے والی بجلیاں چمکتی ہیں۔

...... اپنی عمر کا حساب پورا کیا۔

...... قبر میں امتحان لینے والا ملک رومان

...... موت کے بعد کے مراحل کے لئے وہ تیار ہیں۔

...... وہ پروردگار۔ جس کی عجیب و غریب شان کبھی ختم نہ ہو گی۔

...... بارالہا رحمت نازل فرما محمدؐ اور ان کی آل پر اور زمانے کی مصیبتوں کی تیز دھار اور شیطان کے جال اور بادشاہ کے ظلم کی سختیوں سے ہمیں پناہ دے۔

انعام اللہ صفحات پلٹتے رہے۔

...... ہمارا پردہ جو تو نے دنیا میں رکھا ہے اسے آخرت کے دن چاک نہ کرنا۔

...... یہ ناچیز بندہ ایک عبد مطیع کی طرح تیرے دروازے پر کھڑا شرمندگی کے ساتھ ایک محتاج فقیر کی حیثیت سے سوال کر رہا ہے۔

...... میرے دن برگشتہ ہو گئے ہیں اور عمل کا زمانہ ختم ہو چلا۔ اور عمر کی مدت انتہا تک پہنچنے کو ہے اور اس کو یقین ہو گیا کہ اب بغیر تیری ملاقات کے چارہ نہیں اور تجھ سے بھاگ کر وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ توتوبہ کا ذریعہ ڈھونڈ کر تیری ملاقات کو نکلا...... اب حالت یہ ہے کہ کمر کو جھکائے اور سر کو نیہوڑائے تیرے سامنے حاضر ہے۔

...... اے وہ معبود جو فریادیوں کی حالت کی تصدیق میں گواہیوں کا محتاج نہیں۔

...... اے پروردگار میں تیرے سامنے اتنا روؤں کہ میری پلکیں گر جائیں اور اس قدر گریہ کروں کہ آواز بند ہو جائے اور اتنی دیر تیری حضوری میں کھڑا رہوں کہ پیروں پر ورم آجائے اور اتنا جھکوں کہ ریڑھ کی ہڈیاں اکھڑ جائیں اور تمام عمر خاک پھانک کر بسر کروں اور آخر عمر تک راکھ کا پانی پیا کروں ...... تب بھی اپنے گناہوں میں سے ایک گناہ کے مٹائے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

انعام اللہ شاہ نے لرز کر کتاب بند کر دی۔ قادیانی تھے۔ چپکے سے افضل علی سے پوچھا "یہ کون صاحب تھے جو اتنا روتے تھے؟"

"امام زین العابدینؑ!"

سید انعام اللہ بے انتہا رقیق القلب تھے۔ رومال نکال کر خود زار زار رونا شروع کر دیا۔ ثروت آراء نے چاء بنا کر پیش کی۔ انعام اللہ نے نعرہ لگایا "ربا۔ ربا۔ میر نذر الباقر کی نسل ختم ہو گئی۔" بہنیں پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔ افضل علی نے نذر بیگم سے کہا "باجی ماموں کو ہرگز اطلاع مت بھیجنا۔ وہ جرمن کی گولی سے نہیں مرے۔ اب مر جائیں گے۔"

انعام اللہ کمرے میں ٹہلنے لگے۔ بنتی ان کے لئے پانی کا گلاس لے کر آئی۔ انعام اللہ سے کوئی خون کا رشتہ نہ تھا مگر اس گھرانے پر جان نثار کرتے تھے۔ ان کے حقیقی چچا شمس العماء پروفیسر میر حسن سیالکوٹی (علامہ اقبالؒ کے استاد) نذر بیگم، مصطفےٰ باقر، ثروت آراء کے دادا اور میر افضل علی کے نانا میر مظہر علی کے دوست تھے۔ انعام اللہ کے والد نے احمدیت اختیار کر لی تھی وہ اور چودھری ظفر اللہ خاں، میر افضل علی کے بچپن کے دوست اور ہم مکتب تھے اور سیالکوٹ میں اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ تینوں اب لاہور[27]

میں رہتے تھے۔ میر افضل علی نے ایف سی کالج سے ایم اے کیا تھا۔ ثروت آراء سے منگنی ہو چکی تھی۔
مصطفےٰ باقر کے تیجے کے چند روز بعد وہ دونوں بہنوں کو مع نانی اشرف جہاں اپنے بڑے ماموں میر فیض العسکری کے ہاں فیروز پور لے گئے۔

پنجاب گرمی میں بھن رہا تھا۔ درد سر کی مریض ثروت آراء بیمار پڑ گئیں۔ نذر بیگم علاج کے لئے ان کو فیروز پور سے لاہور لے کر آئیں۔

"نمبرے ریلوے روڈ لاہور یکم جون ۱۹۱۸ء گرمی یہاں بھی شدید ہے۔ دوپہر کو تاج کالج میں ہوتے ہیں۔ بھائی جان ممتاز علی اپنے کام میں مصروف گرمی کے لمبے دن۔ دوپہر کا سناٹا۔ دل پریشان۔ کل میں اور ثروت بھائی انعام اللہ کے ساتھ لکھنؤ واپس جا رہے ہیں۔

"لکھنؤ ۸ جون ۱۹۱۸ء مسٹر جناح کی شادی ہو گئی۔ مع اپنی پارسی دلہن راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں مہمان ہیں۔ اس شادی کا ایک چرچا ہے۔ جگہ جگہ ان کی پارٹیاں ہو رہی ہیں۔ آج بیگم وزیر حسن کے ہاں دعوت ہے۔ صبح آئی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں۔ تمہارے بھائی کا چہلم ہو چکا۔ شام کو دونوں آجانا۔ دل بہل جائے گا۔ لیکن بھلا ہم غم نصیب شادی کی دعوتوں میں جاتے پھریں گے؟"

۸۔ حکیم الامتؒ اور جھوائی ٹولے کا نسخہ

میاں مصطفےٰ باقر کے مرنے کے بعد ان کے اسکول کا رزلٹ آیا۔ آٹھویں کلاس میں فرسٹ پاس ہوئے تھے۔ ہیضے کی وبا میں ایسی کمی نہیں آئی۔ بھتیجے ممتاز حیدر تو اللہ کے فضل سے اچھے ہو گئے۔ لیکن اب بھانجے عثمان حیدر کو کالرا ہو گیا۔ ماموں، ممانی نے متوحش ہو کر بار بار ان کے ناخن دیکھنا شروع کئے۔ فوراً گاڑی بھیج کر جھوائی ٹولے کے نامی طبیب حکیم عبدالوالی کو بلوایا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ حالت تشویشناک نہیں۔ ان کا نسخہ بندھوایا گیا۔ دوا ماموں ممانی وقت پر خود کھلاتے رہے۔

اسی ہفتے علامہ اقبالؒ مصطفےٰ باقر کی تعزیت کے لئے لاہور سے تشریف لائے۔ رات کو اس ہوادار برآمدے میں ان کا پلنگ بچھتا جہاں عثمان حیدر سوتے تھے۔ دن میں دو چار بار عثمان حیدر کے کمرے میں جا کر علامہ ان کی مزاج پرسی کرتے۔

ڈاکٹر اقبالؒ کو لکھنؤ آئے دو تین روز ہوئے تھے کہ علی محمد خاں راجہ محمود آباد نے ان کی زبردست دعوت کی۔ وہاں خوب ڈٹ کر شاعر مشرقؒ نے لکھنؤ کا مرغن نوابی ماحضر تناول فرمایا۔ رات کے گیارہ بجے بلتن لین واپس آئے۔ کپڑے تبدیل کئے۔ برآمدے میں جا کر اپنے پلنگ پر سو رہے۔

رات کے ڈھائی بجے جو ان کے نالہ ہائے نیم شبی کا وقت تھا۔ افلاک سے جواب آنے کے بجائے پیٹ میں اٹھا زور کا درد۔ شدت کی مروڑ۔ سویٹ نے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ میزبانوں کو زحمت نہ دینے کے خیال سے چپکے لیٹے رہے۔ نزدیک کے پلنگ پر نو عمر عثمان حیدر بے خبر سو رہے تھے۔

اقبال نے آہستہ سے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ وہاں سے تیسری بار لوٹ کر آئے۔ برآمدے کی لائٹ

جلائی۔ عثمان حیدر کے سرہانے میز پر حکیم عبدالوالی کی دوا کا قدح رکھا تھا آپ اس کی چوتھی خوراک پی گئے۔ پھر لیٹ رہے۔

پھر غسلخانے گئے واپس آکر مزید دو خوراکیں نوش جان کیں۔

کھٹر پٹر سے عثمان حیدر کی آنکھ کھل گئی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے بستر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری اور اپنے ناخنوں کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مصطفےٰ باقر مرحوم کے ناخن نیلے پڑنے کا قصہ انہیں بتایا جا چکا تھا۔

عثمان حیدر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ادب سے دریافت کیا "ڈاکٹر صاحب خیریت؟"

بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "مجھے بھی کالرا ہو گیا۔ جا کر سجاد کو جگا دو۔"

اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ باغ میں چڑیوں نے گنجارنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی اور بارش کی آمد آمد تھی۔ عثمان حیدر نے تیر کی طرح جا کر دوسرے برآمدے میں ماموں جان کو جگایا۔ اس وقت ڈاکٹر اقبالؒ نیم جان سے اپنے پلنگ پر لیٹ چکے تھے۔ ماموں نے فوراً آکر منفرد روزگار مہمان کی یہ حالت دیکھی۔ حواس باختہ۔ سرپٹ پیدل پھاٹک کی طرف بھاگے۔

لکھنؤ کا انگریز سول سرجن کرنل برڈ ووڈ نزدیک ہی ایبٹ روڈ پر رہتا تھا۔ اس کو جا کر جگایا۔ کرنل بھاگم بھاگ بلتن لین پہنچا۔ انجکشن لگایا۔ مریض کی تسلی تشفی کی۔

آدھ گھنٹے بعد علامہ پر غنودگی طاری ہوئی۔ کرنل برڈووڈ نے نسخہ لکھا۔ مشتاق بیرا حضرت گنج سے دوا بنوا کر لایا۔ دو گھنٹے بعد علامہؒ کو پھر اسہال شروع ہو گیا۔ اس وقت تک ڈرائیور آچکا تھا۔ وہ حکیم عبدالوالی کو لینے جھوائی ٹولے گیا۔

حکیم صاحب بوکھلائے ہوئے بلتن لین پہنچے۔ کرنل برڈووڈ کی شیشی دیکھی۔ پھر نسخہ لکھنے بیٹھے۔ علامہؒ نے تکیہ سے سر اٹھا کر نسخہ ملاحظہ فرمایا۔ بولے "حکیم صاحب یہ دوائی تو میں پہلے ہی آدھی بوتل پی چکا ہوں۔"

حکیم صاحب ہکا بکا اقبال کو دیکھنے لگے۔ عثمان حیدر والی بوتل اٹھائی۔ اس میں پوری چھ خوراکیں کم تھیں۔

شاعر مشرقؒ نے بھولپن سے فرمایا "حکیم صاحب بات یہ ہوئی کہ میں نے سوچا یہ لڑکا کم عمر ہے اس کی خوراک سے چار گنا زیادہ مجھے کھانی چاہئے۔ جبھی فائدہ ہو گا۔"

حکیم عبدالوالی نے زوردار قہقہہ لگایا "ڈاکٹر صاحب آپ واقعی فلسفی ہیں۔ خدا نے بڑی خیریت کی۔ اگر دوا ایک خوراکیں اور پی ہوتیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔"

شام تک علامہ کی حالت سنبھل گئی۔ لیکن ان کی علالت کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ بلتن لین میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ راجہ صاحب محمود آباد، مشیر حسین قدوائی، جسٹس سمیع اللہ بیگ، سید وزیر حسن صبح شام آکر مزاج پرسی کرتے۔ حکیم عبدالوالی اور کرنل برڈووڈ روزانہ آیا کئے۔

پانچویں دن راجہ محمود آباد نے فرسٹ کلاس کا درجہ ریزرو کروا کے دو ملازموں کے ساتھ علامہ اقبال" کو لاہور روانہ کیا۔ بیشتر اہل لکھنؤ اقبال" کے زیادہ معتقد نہ تھے لیکن ان کی روانگی کے وقت کئی سو پرستاروں کا ہجوم اسٹیشن پر موجود تھا۔ یلدرم لاہور تک ان کے ہمراہ گئے۔[29]

۹— ترکی ٹوپی اور انگریزی ہیٹ

"جرمن کی لڑائی اختتام پر ہے۔ بلٹن لین میں پھاٹک کے سامنے سے گھڑ سوار فوجی دستے اور توپ گاڑیاں گذرتی رہتی ہیں جنہیں گھوڑے کھینچتے ہیں۔ چھ برس قبل جب جنگ بلقان کا زور تھا اور ماموں جان جوش میں میرے نانا جان جلال الدین حیدر مرحوم کی حویلی نشور فروخت کر کے بلقان فنڈ میں دیئے ڈالنے پر تلے بیٹھے تھے ہم لوگ بل ویو مسوری[30] میں رہتے تھے۔" بھانجے عثمان حیدر نے کہا "ہمارے پڑوس میں مہاراجہ بھوپندر سنگھ والی پٹیالہ کی کوٹھی تھی۔ اس میں ہز ہائی نس کی یورپین رانی براجمان تھیں۔ میم صاحب پہلے ایک معمولی انگریز بینڈ ماسٹر مسٹر کپو کی بیوی تھیں۔ پھر مہاراجہ کی منظور نظر بن کر ان کے حرم میں داخل ہوئیں۔ مزاج آسمان پر پہنچ گئے۔ اخبار جنگ بلقان کی خبروں سے پر تھے۔ گوری بد دماغ اقوام کا ایک مشرقی قوم یعنی ترکوں سے مقابلہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں روس پر جاپان کی فتح نے اہل ہند کو باغ باغ کر دیا تھا۔

ہاں ترقی نہ رکے ملک طلوع خاور   ساری دنیا کی ہے تعریف کا سہرا ترے سر
مشرقی عزت و حرمت کو سنبھالا تونے   سارے عالم کو تحیر میں ڈالا تو نے
کہتے تھے کچھ نہیں ان میں لیاقت باقی   اب تنازع البقا کی نہیں طاقت باقی
صفحہ ہستی سے ناپید ہوا چاہتے ہیں   قعر گمنامی میں یہ جلد گرا چاہتے ہیں
اب نہ جہد اور مجاہد کی تمنا رکھو   اب نہ عالم کی نہ زاھد کی تمنا رکھو
اب نہ محمود نہ چنگیز نہ اکبر ہوں گے   ہوں گے گراب تو نپولین و سکندر ہوں گے
اب نہ کنفیوشش و سکیا کا زمانہ ہوگا   اب نہ فارابی و سینا کا زمانہ ہوگا
ہاں مگر طعنے نہ تھے برچھیوں سے کچھ کم   یہ مطاعن! یہ شماتت یہ ستم اور یہ غم!
دھوم ہے دھوم کہ مشرق کا دلارا اٹھا   پہلوان ایشیا کا سب سے پیارا اٹھا
مائل جنگ ہے بے جان ہوا جاتا ہے   شرق کے نام پہ قربان ہوا جاتا ہے
ایک بچہ ہے ادھر اور ادھر خرس عظیم   ایک تارے کے مقابل میں ہے شیطان رجیم
ایک بجلی ہے کہ خیرہ ہے نظر عالم کی   مدعی نے بھی تو تدقیق نظر کم کم کی
بحروبر کانپ رہے ہیں کہ کیا ہوتا ہے   کہتے ہیں' یوں کوئی مصروف وغا ہوتا ہے
قالب مردہ مشرق میں پھر آتی ہے جاں   حاسد افسردہ ہیں دشمن کے خطا ہیں اوساں[31]

اب ۱۹۱۲ء میں جس روز یورپین محاذ پر ترکوں کی کامیابی کی خبر آتی ہندوستانی 'کیا ہندو کیا مسلمان' چپکے چپکے خوش ہو لیتے۔ علی گڑھ سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مسوری آئے ہوئے تھے اور سوائے میں

ٹھہرے تھے۔ مولانا محمد علی بھی ہفتہ بھر کے لئے ہمارے ہاں بل ویو میں مہمان تھے۔ اکثر صبح کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ہوٹل سے ٹہلتے ہوئے آجاتے اور بریکفاسٹ ہمارے ہاں کرتے۔ اس وقت میز پر صاحبزادہ صاحب' مولانا محمد علی اور ماموں جنگ بلقان پر زور شور سے تبصرہ کرتے۔ میں اور سلطان بھائی بڑے غور سے ان صاحبان کی گفتگو سنا کرتے۔ ترکی کمزور پڑ چکا تھا۔ اور یورپین طاقتوں کے گٹھ جوڑ کے مقابلے میں ہارتا جا رہا تھا۔

بل ویو کے مہمان تو چلے گئے مگر ترکی کی متوقع شکست کی خبریں سن سن کر ہم دونوں بھائیوں کا غم و غصے اور جوش و خروش سے برا حال تھا۔ میں اس وقت تیرہ سال کا تھا۔ بھائی سلطان حیدر مجھ سے دو سال بڑے تھے۔

انہی دنوں مہاراجہ بھوپندر سنگھ کی میم نے ازراہ تذلیل و تمسخر اپنے ملازموں کو ترکی ٹوپیاں اڑھادیں۔ شام کے وقت وہ اپنی ڈانڈی پر اکڑفوں کے ساتھ ہوا خوری کے لئے نکلتی اور قلی اور وردی پوش نوکر ترکی ٹوپی اوڑھے ساتھ ساتھ چلتے۔ مسوری کی مال پر چہل قدمی کرتے انگریز یہ منظر دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔

میں اور سلطان بھائی مہاراجہ صاحب کی گوری مسٹریس کی اس حرکت پر بھنا گئے۔ کباڑی کی دوکان سے ایک انگریزی ہیٹ خرید لائے۔ اسے بل ویو کے مہتر کو پہنا کر تاکید کی جب تم جھاڑو پاٹ لے کر سڑک پر نکلو یہ ہیٹ برابر پہنے رہنا۔ وہ کھیسیں نکال کر مان گیا۔

تیسرے روز اس آسٹرین عورت کا تاربوش پوش ملازم خط لے کر ماموں جان کے پاس بل ویو پہنچا۔ ریاست پٹیالہ کے کریسٹ والے دبیز لیٹر ہیڈ پر لکھا تھا "آپ کے بچوں نے بھنگی کو انگریزی ہیٹ پہنا کر مجھ پر چوٹ کی ہے۔" ماموں جان نے خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے بھانجوں کی اس شرارت سے بہت خوش تھے۔

میم صاحب نے اب کمشنر میرٹھ ڈویژن سے شکایت کی جو مسوری آیا ہوا تھا۔ کمشنر نے ایک شام کلب میں ماموں جان سے ذکر کیا۔ ماموں جان نے نرمی سے کہا "میم صاحب نے خود بڑی نامناسب حرکت کی ہے۔ اپنے نوکروں اور قلیوں کو ایک آزاد جری قوم کا نیشنل ہیڈ گیر پہنا کر وہ کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں؟ میرے نزدیک یہ ایک لیڈی لائیک فعل نہیں ہے۔"

کمشنر ایک سلجھا ہوا معقول انگریز تھا۔ اس نے کہا "میں ان کے ملازموں کی ترکی ٹوپیاں اتروا دوں گا' مگر آپ بھی اپنے بچوں کو منع کر دیجئے۔"

دوسرے روز میم صاحب کے خادموں کی ترکی ٹوپیاں اتر گئیں۔ جواباً بل ویو کے مہتر کی ولایتی ہیٹ بھی اس کے سر پہ سے غائب ہو گئی۔

لیکن میم صاحب کو ضد چڑھ گئی تھی۔ میں سینٹ جارجز کانونٹ اسکول بارلوگنج میں پڑھتا تھا۔ اس اسکول میں ہر سال صرف دو ہندوستانی بچے کمشنر کی سفارش پر لئے جاتے تھے۔ ماموں جان نے اپنے انگریز

پولٹیکل افسر سے کہلوا کر مجھے سینٹ جارجز میں داخل کروایا تھا۔

ہزہائی نس مہاراجہ بھوپندر سنگھ کی میم نے کمشنر سے جو بارلوگنج اسکول کمیٹی کا صدر تھا یہ شکایت جڑی کہ عثمان حیدر نہایت شریر اور شیطان لڑکا ہے اور انگریز لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ اس لئے فوراً اسکول سے اس کا نام خارج کر دیجئے۔

کمشنر نے شام کو پھر مسوری کلب میں ماموں جان سے کہا۔ اس مرتبہ ماموں جان کبیدہ خاطر گھر واپس آئے مجھے بلا کر نرمی سے ڈانٹا' وہ ترکی ٹوپی اور ہیٹ والا معرکہ بالکل بجا تھا۔ لیکن لڑکیوں کو نہیں چھیڑنا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ انگریز بچے مجھے بلیک مین' نگر بوائے کہہ کر چڑاتے ہیں۔ میں بھی ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہوں۔

ترکی ٹوپی اور ہیٹ والا قصہ مسوری کی انگریز سوسائٹی میں مشہور ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ہتک کا بدلہ لینے کے درپے تھے۔ اب جناب ہمارے اوپر انکوائری کمیٹی بیٹھی۔

کمیٹی میں تین خواتین بھی شامل تھیں۔ کمشنر میرٹھ ڈویژن کی میم' خود میری ممانی جان نذر سجاد حیدر' اور انسپکٹر آف اسکولز جو ایک بنگالی ہندو خاتون تھیں۔ ان بنگالی بی بی کی ہمدردی بھی تمام تر میرے لئے تھی۔

اگر میں قصور وار ہوتا مجھے یقیناً سزا ملتی۔ لیکن انگریز "Fair Play" کا بھی قائل تھا۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ زیادتی میری نہیں تھی۔ ریلوے والوں کے چند اینگلو انڈین بدتمیز لڑکے مجھے بہت تنگ کرتے تھے اور لڑکوں کے سیکشن کی ایک اینگلو انڈین استانی مہاراجہ پٹیالہ کی میم کی مصاحب تھی۔ اس نے میم صاحب کے اکسانے پر میرے خلاف یہ فتنہ کھڑا کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کمشنر صاحب کے حکم کے بموجب وہ استانی لیپاپوتی کی خاطر بل دیو آئی۔ ماموں جان اور ممانی جان سے میٹھی میٹھی باتیں کیں اور مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ چند روز بعد اس کا تبادلہ نینی تال کر دیا گیا۔

یہ ۱۹۱۲ء کا قصہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں۔ میں اور بڑے ماموں جان اعجاز حیدر مرحوم کے بیٹے ممتاز حیدر' ماموں سجاد حیدر کے پاس ہلٹن لین لکھنؤ میں مقیم اپنے چہیتے دوست مصطفےٰ باقر مرحوم کی موت سے حد درجہ ملول تھے۔ کوٹھی پر عجیب بھیانک سی اداسی طاری تھی۔ برطانیہ فتح یاب ہوا تھا اور سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ایک روز میں دوپہر کے کھانے کے لئے اسکول سے لوٹا' سائیکل سے اترا ہی تھا کہ ایک انگریز بہادر نظر آئے جو ہماری کوٹھی کے وسیع کپاؤنڈ میں سے ٹہلتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ میں سمجھا ماموں جان سے ملنے آئے ہوں گے اتنے میں ماموں جان برآمدے میں نکل آئے۔ صاحب بہادر کو دیکھا اور آواز دی۔ آپ ٹریس پس کر رہے ہیں واپس جایئے۔

صاحب بہادر چونک کر ٹھٹھکے۔ آئی ایم سوری' کہا اور اپنا سا منہ لئے واپس لوٹ گئے۔

میں اس وقت نیکی کی جون میں تھا۔ میں نے کہا "ماموں جان اس نے آدھا راستہ تو طے کر لیا تھا'

گذر جانے دیا ہوتا"

انہوں نے جواب دیا! "آپ ذرا کسی انگریز کے بنگلے سے اس طرح ٹریس پس کر کے دیکھئے تو پتہ چلے گا۔ اس قوم سے کسی حالت میں دب کر نہیں رہنا چاہئے۔ انگریز سے جتنا ڈرو اتنا ہی تم پر رعب جمائے گا۔ نڈر ہو کر مقابلہ کرو صرف نرم ہی نہیں دوست ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات ذاتی طور پر بہترین دوست ثابت ہو گا۔ انگریزوں کے رعب میں تو آنا ہی نہیں۔"

ماموں جان نے بعد میں یہ بھی کہا تاریخ کا ایک قانون ہے۔ محکوم قوم غیر ملکی آقا کی نئی اور توانا تہذیب سے متاثر ہو کر اس کی بیشتر خوبیوں کی معترف رہتی ہے۔ ایک حد تک اس کا تمدن' طور طریقے اختیار کر لیتی ہے' لیکن ایک مدت بعد اس کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کرتی ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں بھی آقا اور محکوم کا یہ عجیب و غریب Love-Hate رشتہ قائم ہے۔

اس Love-Hate رشتے کی مثالیں مجھے خود ماموں جان کے گھر میں ملتی رہتی تھیں اور یہی حال ہندوستان کے اکثر اوپری متوسط طبقے کے گھرانوں کا تھا جو مغربی تہذیب اختیار کر چکے تھے لیکن برطانوی اقتدار سے مدافعت بھی کرنا چاہتے تھے۔

ممانی جان کے محمود پور معافی والے کزن' نواب سید معشوق علی خان کی شادی ریاست شمس آباد کی نواب سلطنت آرا بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب سلطنت آرا بیگم کے نوعمر بھتیجے سید فرخ حیدر[32] اپنے والد محترم کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے۔ اپنے آبائی مکان واقع سعادت گنج میں ٹھہرے۔ ایک دن ہلٹن لین ممانی جان سے ملنے تشریف لائے۔ دوسرے روز انہوں نے ممانی جان کے چچا زاد بھائی سید آل حسنین سے کہا' "ارے میاں نذر باجی تو بالکل میم صاحب ہیں۔ میں مشرقی تہذیب کے بھنورے میں پلا آدمی' ان کے ہاں کے انگریزی ٹھاٹ باٹ دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہاں رفتار گفتار' قدم قدم پر مغربیت اور یہاں اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بھائی بران مانا۔ نذر باجی انتہا سے زیادہ ولایتی ہو گئی ہیں۔"

نواب فرخ حیدر میرے اور آل حسنین کے ہم عمر تھے لیکن اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر اعظم اودھ کے پڑپوتے کی حیثیت سے ایک گم شدہ تمدن کے آخری نام لیواؤں میں سے تھے اور ان کا یہ ردعمل بالکل قدرتی اور جائز تھا۔

لیکن اسی زمانے میں ماموں جان کے بتائے ہوئے دوسرے تاریخی قانون' کی ایک مثال یعنی گورے آقا کے نمائندوں سے جھگڑا رونما ہوا۔ اس کا بڑا لطیفہ رہا۔ ممانی جان طبعاً الم پرست اور قنوطی تھیں۔ مصطفےٰ باقر کی رحلت کو ڈھائی مہینے گذر چکے تھے۔ ہر سال گرمیوں میں شملہ جاتی تھیں۔ مگر اس سال رنج و غم میں اضافہ کرنے کے لئے کسی سنسان پہاڑ کی تلاش میں تھیں۔ سید انعام شاہ نے سولن تجویز ا ممانی جان اکثر رات کو باضابطہ وکٹورین Escritoire کے سامنے بیٹھ کر چاندی کی بل ڈاگ نما دوات میں قلم ڈبو ڈبو کر بڑی جناتی لکھائی میں روزنامچہ رقم کرتی تھیں۔ "معرکہ سرکٹ ہاؤس" اس میں یوں قلمبند کیا۔[33]

"سولن۔ ۱۴ جولائی ۱۹۱۸ء بھائی انعام مکان کی تلاش میں مصروف ہیں۔ ہم لوگ اس ریسٹ

ہاؤس میں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔ آج صبح صبح اطلاع ملی کہ لفٹنٹ گورنر پنجاب لاہور سے شملہ جاتے ہوئے یہاں رک کر لنچ کھائیں گے۔ صبح سے سرکاری اہلکاروں نے آکر کہنا شروع کیا کہ ڈاک بنگلہ فوراً خالی کر دیجئے۔ لیکن سولن میں نہ کسی سے شناسائی نہ کوئی اچھا ہوٹل۔ شام کو ایک ڈپٹی صاحب تشریف لائے۔ بہت اصرار کیا۔ خدا کے لئے میرے گھر ہی چلی چلئے۔ لیکن گورنر صاحب کے لئے سرکٹ ہاؤس خالی کر دیجئے۔

چق کے پیچھے سے میں نے جواب دیا۔ دیکھئے صاحب جب تک کوئی اچھی جگہ نہ مل جائے میں تو یہ ڈاک بنگلہ چھوڑنے کی نہیں۔ گورنر صاحب آتے ہیں آنے دیجئے۔ صرف ایک کمرہ میرے پاس رہنے دیجئے باقی پانچ آپ درست کروالیجئے۔ گورنر صاحب بارہ بجے آئیں گے۔ تین بجے شملہ روانہ ہوں گے۔ ان چار گھنٹوں میں آپ کو کوئی باہر نظر نہ آئے گا۔ آپ سمجھ لیجئے یہ کمرہ آپ کے ڈاک بنگلے میں ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد جو گذرے گی وہ ہم جانیں۔ آپ دخل نہ دیجئے۔

ڈپٹی صاحب نے حیران پریشان ہو کر بھائی انعام اللہ سے کہا "یہ تو بہت ہی عجیب مزاج کی خاتون ہیں۔ ذمہ داری میری ہے۔ اب میں کیا کروں؟" بڑبڑاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

"باجی جان۔" بھائی انعام نے کہا "یہ گورنر پنجاب کا معاملہ ہے۔ بات بڑھانا نہیں چاہئے۔"

"بھائی انعام۔" میں نے جواب دیا "آپ چار دن کے لئے جائیے سیالکوٹ۔ بیوی بچوں سے مل آیئے۔ میں جو کچھ گذرے گی خود تنہا مقابلہ کرلوں گی۔ یہ لوگ مجھے کمزور ہندوستانی عورت سمجھ کر تنگ کر رہے ہیں۔ اب تو میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

اتنے میں ایک گھڑسوار انسپکٹر پولیس نازل ہوئے۔ میں کمرے میں چق کے پیچھے کھڑی تھی۔ بھائی انعام اللہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ انسپکٹر صاحب نے ان سے فرمایا "صاحب مہربانی سے ان بیگم صاحبہ کو میرا اسلام کہیں اور یہ کہ آج رات سے پہلے پہلے ڈاک بنگلہ خالی کر دیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

میں نے اندر سے جواب دیا "آپ بھی تشریف لے جائیے اور کمرہ خالی کروانے کی جو تدبیر ذہن میں آئے کرلیجئے۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کر لیا اور مغرب کی نماز شروع کر دی۔

نماز کے بعد کھانا منگوایا۔ نوکروں سے کہا "دن کا کھانا صبح دس بجے سے پہلے تیار کر کے گیارہ سے چار بجے تک شہر میں گھومو پھرو۔ ٹھیک چار بجے آکر چائے دینا۔"

دوسرے روز ٹھیک بارہ بجے لفٹنٹ گورنر پنجاب مع اسٹاف وارد ہوا۔ چار گھنٹے تک ممانی جان کے کمرے سے ملحق کمروں میں اس نے دن گذارا۔ ممانی جان مع ثروت آرا' بچوں اور بنتی آیا کمرے میں قلعہ بند بیٹھی رہیں۔ بھائی انعام اللہ کو بھی سولن کی سیر کو بھیج دیا۔ ایک بجے سر مائیکل اڈوائر نے لنچ کھایا۔ پھر پون گھنٹے تک برابر کے بیڈ روم میں سے اس کے خراٹوں کی آواز آتی رہی۔ ٹھیک تین بجے باہر موٹریں اسٹارٹ ہونا شروع ہو گئیں۔

تاریخ کا دوسرا قانون یہ ہے کہ محکوم قوم اپنے ترقی یافتہ بیرونی آقاؤں سے متاثر ہو کر اپنے

پسماندہ معاشرے میں اصلاحات کی سعی کرتی ہے۔ ہندوستان میں یہ عمل راجہ رام موہن رائے کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ خود اپنے گھر میں ہم لڑکپن سے ممانی جان اور ان کی ہوشمند سہیلیوں کی سرگرمیاں دیکھتے آرہے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس ۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں اس کا چوتھا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اب ممانی جان نے تعداد ازدواج کے خلاف مہم شروع کی۔ لکھنؤ کانفرنس میں ممانی جان اور بیگم جہاں آراء شاہنواز نے عورتوں سے دستخط حاصل کئے کہ وہ کسی ایسے شخص کو جس کی پہلی بیوی موجود ہو' بیٹی نہ دیں گی "خواہ وہ شخص بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔"

طبقاتی شعور وغیرہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ مگر اسی اجلاس میں ممانی جان نے یہ تجویز پاس کرائی کہ متمول بیبیاں زرق برق کپڑے اور زیور پہن کر جلسوں میں شرکت نہ کریں۔ اس سے معمولی حیثیت کی بہنوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے عورتوں نے قومی جلسوں میں سادہ کپڑے پہننے شروع کئے۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کے مابین معاہدہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں علی محمد خاں راجہ محمود آباد کو انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت پیش کی گئی۔ لیگ اور کانگریس کا یہ اتحاد برطانوی حکومت کی مصلحت کے بالکل خلاف تھا۔ "نواب سرہارکرٹ بٹلر نے راجہ صاحب پر زور ڈال کر انہیں کانگریس کی صدارت قبول کرنے سے روک لیا۔ قومی سیاست سے علیحدہ کرنے کی غرض سے مہاراجہ اور سر کا خطاب دلوایا اور یو۔پی گورنمنٹ کا ہوم ممبر مقرر کر دیا۔ گویا ترکی ٹوپی سے انگریزی ہیٹ پھر جیت گئی۔

جب ہنگامہ خیز سیاست نہ رہی۔ ماموں جان مہاراجہ صاحب کے پولٹیکل سکریٹری رہ کر کیا کرتے۔ سرہارکرٹ مہاراجہ صاحب کی ناک کا بال تھا۔ خصوصاً اس وقت ان کو خوش کرنے کے لئے وہ جو کہتے کر دیتا۔ لیکن ماموں جان نے حسب عادت کسی قسم کی سفارش حاصل نہیں کی۔ مہاراجہ علی محمد خاں نے ۱۹۱۴ء میں یو۔پی گورنمنٹ سے ان کی خدمات مستعار لی تھیں ضابطے کے مطابق ۱۹۱۸ء کے آخر میں یو۔پی سول سروس میں شامل ہو کر سلطانپور ڈپٹی کلکٹری کا چارج لے لیا۔

ممانی جان ان کی اس فقیر منشی اور ترقی کے لئے تگ و دو نہ کرنے کی عادت سے ایک بار پھر جز بز ہوئیں۔ سلطانپور پہنچ کر مرحوم بھائی کی یاد میں ایک عدد ناول لکھنا شروع کر دیا جو 'حرماں نصیب' کے عنوان سے مقبول ہوا[34]۔

لاہور

۲۳ اگست ۱۹۱۹ء

میری پیاری پھوپھی تسلیم

کھانے کے بعد سے آپ کی تصنیف "بھائی کی یاد میں" دیکھ رہا ہوں۔ اس کی سادگی میں اس قدر درد اور تاثیر ہے کہ کچھ حد نہیں۔ آپ نے اسے قلم برداشتہ لکھا ہے مگر پھر بھی خوب لکھا۔ میں آپ کی انشاء پردازی کا تو ہمیشہ سے قائل ہوں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اتنی توقع نہ تھی کہ ایک ہندوستانی عورت اتنی پیاری

چیز لکھ سکتی ہے اور بغیر انگریزی ناولوں کا مطالعہ کئے ہوئے۔

(تلخیص)

آپ کا بھتیجا

امتیاز[35]

۱۰— فلائنگ آفریدی کی واپسی

گڈ اولڈ مراد آباد۔ پکیڈلی سرکس کے ٹیوب اسٹیشن سے نکل کر ٹرین معاً سید بڑے سید اڑے کی دنیا میں واپس پہنچ گئی۔ خان بہادر سید نذر الباقر رضوی پھرتی سے پلیٹ فارم پر اترے۔ قلیوں سے اسباب اٹھوا، فل بوٹ پر بید کھٹکھٹاتے باہر آئے۔ دو گاڑیاں کیں۔ ایک پر کیبن ٹرنک لدوائے دوسری پر خود سوار ہوئے۔ بیٹے اور نواسوں کے لئے ولایتی تحائف کا صندوق سامنے کی سیٹ پر رکھوالیا۔

گاڑی چرخ چوں کرتی محلہ مغلپورہ اول روانہ ہوئی۔ اپنے مریل گھوڑے سے زیادہ منحنی کوچوان باقاعدہ اونگھ رہا تھا۔ دنیا بدل گئی۔ تہ وبالا ہو گئی۔ الحمدللہ مراد آباد جوں کا توں ہے۔ گھر واپس پہنچنے کی جلدی اور خوشی میں کھڑکی سے سر نکال کر آواز دی، "ذرا تیز ہنکاؤ بھائی میرے!" کوچوان نے جھک کر نووارد کا بغور ملاحظہ کیا۔ اطمینان سے جواب دیا، "میاں ذرا دم لیجئے۔ کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔"

اصل فلسفہ حیات غالباً یہی تھا جس سے اہل مراد آباد صدیوں سے واقف تھے۔ میاں ذرا چھری تلے دم لیجئے ایسی بھی کیا جلدی۔ جو ہونا ہے وہ ہوتا رہے گا۔ ہو کر رہے گا۔ بے صبری سے فائدہ؟

مخ مخ چلتی جھلملیوں والی بند گاڑی مغل پورہ اول کے چوراہے پر پہنچ کے گورنمنٹ ہائی اسکول اور مسجد رستم خاں کے عین مقابل "کوٹھی ڈپٹی قائم علی" کے سامنے رک گئی۔

گاڑی سے اترتے ہی پھاٹک کے ایک ستون پر نظر پڑی جو ذرا ترچھا سا ہو گیا تھا۔ کوٹھی مرمت طلب ہے۔ ویسے میاں مصطفےٰ باقر اس میں آن کر کہاں رہیں گے۔ انشاءاللہ دو سال بعد لندن، پھر بیرسٹری کی پریکٹس کے لئے لاہور۔

آناً فاناً محلے میں خبر پڑ گئی۔ محل سرا سے بوا سوسن کا لڑکا چھٹوا دوڑا آیا۔ منٹوں میں عزیز اقارب کا مجمع لگ گیا۔ دعا سلام کے بعد چپ چاپ سب مل کر گاڑیوں سے سامان اتروانے میں بے طرح مشغول ہو گئے۔

"میاں۔ آپ نے تو لکھا تھا پرسوں کے پہلے دن آویں گے۔" چھٹوا نے کہا۔

"ہاں۔ بیٹے۔ تین روز پہلے ہی پہنچ گئے۔ اور بندہ خدا۔ میاں مصطفےٰ باقر ہم سے ملنے یہاں آنے والے ہیں۔ کوٹھی پر سفیدی تو کرا دی ہوتی۔"

سب چپ۔ خان بہادر صاحب اپنی دھن میں بید کھٹکھٹاتے محل سراء کی سمت بڑھے۔ راستے میں آبائی امام باڑہ نظر پڑا۔ ٹھٹھک کر اندر جھانکا۔ نیم تاریک ہال میں ضریحوں کے نزدیک ایک سایہ سا ڈول رہا تھا۔

اس پرچھائیں نے آہٹ پر نووارد کو دیکھا۔ پلٹ کر جناب علی اکبرؑ کے علم کے سامنے رکھا نقرئی شمعدان روشن کیا۔ دوبارہ مڑ کر گرجدار آواز میں کہا، "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ مزاج شریف۔ آپ؟"

"فدوی کو آغا مشہدی کہتے ہیں۔ ابن آغا کربلائی۔"

"اخاہ۔ آغا کربلائی۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔"

"بوٹ اتار دیجئے۔ بھائی صاحب۔"

دفعتاً وہ سیاہ پوش اجنبی۔ آغا مشہدی ابن آغا کربلائی بہت پر اسرار معلوم ہوا۔ اب وہ جناب علی اصغرؑ کے سبز گہوارے کے سامنے شمع روشن کر رہا تھا۔ اچانک، جیسے کوئی ہز ماسٹرز وائس فونوگراف کے ریکارڈ پر سوئی رکھ دے اس نے ایک قدیم آواز میں، پروفیشنل انداز سے زیارت پڑھوانا شروع کر دی۔ السلام علیک یا ابن رسولؐ اللہ۔

پھر اسی دبنگ لہجے میں آغا مشہدی ابن آغا کربلائی نے مطلع کیا، "بھائی صاحب۔ آپ کے فرزند ارجمند میاں مصطفےٰ باقر مرحوم کے چہلم پر اس امام باڑے میں ایصال ثواب کی مجلس کروائی جا چکی ہے۔"

میر نذر الباقر مراد آباد میں مہینہ بھر رکے۔ نور کے تڑکے بید سنبھال رام گنگا کی جانب نکل جاتے۔ کبھی راہ میں ٹھٹھک کر کوٹھی میر قائم علی کی بیرونی دیوار کی لکھوری اینٹوں کو بید کی نوک سے چھو کر زیر لب گننے لگتے۔ معصوم علی، قائم علی، مظہر علی، ظہور حسنین۔ مصطفےٰ باقر۔

کنار دریا پہنچ کر قلعہ رستم خاں کی شکستہ فصیل کے سائے میں ایک پتھر پر بیٹھ جاتے اور چپ چاپ ندی کو دیکھتے رہتے۔ دونوں بیٹیاں نذرا اور ثروت، سلطانپور سے آ گئی تھیں۔ جس روز ان لڑکیوں کے ساتھ کوہاٹ سدھارنے والے تھے صبح منہ اندھیرے ساحل پر جا کر اپنے مخصوص پتھر پر بیٹھ گئے۔ رام گنگا کے کنارے مندروں میں گھنٹے بج رہے تھے اور ناقوس پھونکا جا رہا تھا۔ وسیع دریا پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ یہ دریا نزدیک کمایوں کے برفپوش پہاڑوں سے نکل کر شیروں کی کچھاروں کے سامنے سے گزرتا جنوب مشرق کے سبزہ زاروں کی سمت رواں تھا۔ میر صاحب نے واسکٹ کی جیب سے نکال کر زنجیر والی گول گھڑی پر نگاہ کی اور اٹھے۔ نم ریت پر ثبت اپنے بوٹوں کے نشانات پر واپس چلنا شروع کیا۔ ان نشانوں کو بید کی نوک سے چھوتے اور گنتے گئے۔ سیالکوٹ۔ میراں شاہ۔ وزیرستان۔ پشاور۔ نوشہرہ کوہاٹ میں باغ اور ڈپو[36] خود بنوایا تھا۔ سرو کے درخت لگوائے۔ باغ میں سرد اور شیریں پانی کا چشمہ بہتا ہوا گرتا خراسان کو ہی سے شروع ہو گیا۔

نقوش قدم شمار کرتے آگے بڑھتے گئے۔ چین۔ برما۔ جنوبی افریقہ۔ عراق۔ مصر۔ فرانس۔ انگلستان۔ عیش۔ ہجر۔ عزت۔ دولت۔

دولت؟ جناب امیرؑ نے کہا تھا، "خدا کی قسم دنیا میرے نزدیک بکری کی چھینک سے بھی کم وقعت ہے۔"

دفعتاً سامنے سے کنور نریش پرشاد آتے دکھائی دیئے۔ شوالے میں آرتی کے بعد پیشانی پر قشقہ لگوا زیرِ لب اشلوک پڑھتے ساحل کی ریت پر خراماں چلے آتے تھے۔ نزدیک پہنچے۔ پرانی ہندوستانی تہذیب کے پروردہ دونوں صاحبان جھک جھک کر آداب بجا لائے۔ کنور صاحب نے افسردہ آواز میں دریافت کیا' "میر صاحب کل ہم نے اخبار نیرِ اعظم میں پڑھا حکومت ہند نے جنگی خدمات کے صلے میں آپ کو پنجاب کے اندر کئی مربع زمین پیش کی ہے' مگر آپ نے واپس کر دی۔ لکھا ہے آپ نے فرمایا کہ میرا اکلوتا بیٹا مر گیا میں مربعے لے کر کیا کروں گا۔ یہ خبر درست ہے؟"

"جی ہاں۔ کنور صاحب۔ بکری کی چھینک۔"

"جی؟"

"بکری کی چھینک بھائی صاحب۔" اور چینیوں کی طرح آستینوں میں ہاتھ دے کر اخلاقاً جھکے۔ کنور صاحب اور تردد سے انہیں دیکھا۔

کوہاٹ

۲۹ دسمبر ۱۹۱۸ء

اسلام علیکم۔ آپ کے دوست فلاں نے جو سفارش چاہی ہے اس کے بارے میں پاپا کو سخت افسوس ہے ورنہ پاپا کمی کرنے والے نہیں۔ غیروں کو نوکر کروایا ہے۔ یہاں آئے تو جنرل نیا تھا۔ جب تک کئی بار ملاقات ہو کر دوستی نہ ہو جائے کسی دوسرے صوبہ کے طالب علم کے لئے جسے جنرل نہ جانتا ہو کیسے سفارشی خط لکھ سکتا ہے۔ شروع دسمبر میں....... کا خط پاپا کے نام آیا کہ ایک خط جنرل سے لکھوا کر لفٹننٹ گورنر پنجاب کے پاس لے جایئے۔ مجھے اپنا متبنیٰ بتایئے اور کہئے کہ میں بوڑھا ہوں۔ ایک بیٹا تھا وہ مر گیا۔ اب یہ میرا بیٹا ہے۔ اسے ضرور ڈپٹی کلکٹری دو۔ میری خدمات جنگ کے صلے میں۔ خیر پاپا یہ سب بھی کر لیتے۔ مگر ادھر وہ مصروف ادھر جنرل دورے پر۔ بارہ دسمبر کی تاریخ نکل گئی۔

دہلی کا سفر کیسا رہا؟ ڈھائی دن میں کسی جلسے میں تو نہ جا سکے ہوں گے۔ کانگریس اور لیگ سے تو آپ الگ ہیں۔ کون کون دوست ملا؟ مسز جناح' مسز نائیڈو' عطیہ فیضی وغیرہ سے ملنا ہوا؟ آج کل تو انعام الحق' مشتاق زاہدی' ابو محمد' شاہد حسین' وزیر حسن' سب کا دلی میں جمگھٹا ہو گا۔ اور آپ کے چہیتے دوست فلاں خوب موتی جان کا مجرا سننے جاتے ہوں گے۔ سب حال لکھئے ذرا ذرا گل رعنا اچھی ہے۔ نہنور کا لکھئے۔ خدیجہ کی شادی کیسی رہی۔ پاپا بنو اور افضل کے نکاح کی تاریخ مقرر کرنے کی فکر میں ہیں۔

خاکسار نذر

۱۱— حکایہ لیلےٰ و مجنوں

میر نذر الباقر کے اکلوتے بھانجے میر افضل علی نے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے اور فورمین کرسچین کالج لاہور سے بی اے کیا تھا۔ بہنوئی کے اسلوب سے ازحد متاثر تھے اور مخزن میں مضمون

لکھا کرتے تھے۔

"متاعِ حیات لیلے[37] تمہیں یاد ہو گا سال گذشتہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے بی اے میں کامیاب فرما کر تمہارے والد بزرگوار سے سرخرو کیا تھا تو میں نے بصد منت تمہارے اور اپنے محترم بزرگ کی خدمت گرامی میں ایک درخواست گزرانی تھی۔ جس کا جواب محاربات فرنگ کے ایک دور دراز نامعلوم مقام سے میرے قصورِ امید پر بم کی طرح گرا تھا۔ کیونکہ اس میں رقم تھا کہ سرکار ابد قرار کا حق نمک ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اختتام جنگ تک اپنی جان ہتھیلی پر رکھے غنیم روسیاہ کے مقابلے پر اڑے رہیں۔ اور آثار جدال و قتال سے معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب فتح و نصرت کا نوشتہ دیر بارگاہ رب العزت سے ہمارے شہنشاہ بجاہ کے نام صادر ہونے والا ہے۔ پس تم عقل و ہوش کو قائم رکھ کر فرمانبردار بچے کی طرح پھر کالج میں داخل ہو جاؤ اور ہماری مراجعت تک ایم اے کی انتہائی ڈگری بھی حاصل کر لو........

یہاں تک لکھ پایا تھا کہ چق اٹھی۔ میرے اصولی دشمن' جذبات الفت سے ناآشنا' مذہبی ہیجان کے تنگ دائرے میں محصور' اپنے فرقے کو ناجی اور باقی تمام دنیا کو دوزخ کا ایندھن سمجھنے والے' کھانستے کھنکھارتے کمرے میں آداخل ہوئے۔ سلام علیکم کہہ کر دھم سے کرسی پر گر پڑے۔

قیس:— فرمایئے حاجی صاحب۔ آپ کی تو قلب ماہیت ہو گئی۔ ابھی ایک ماہ ہوا زیارت ہوئی تھی تو یہ نورانی چہرہ اس خس و خاشاک سے پاک تھا۔

حاجی جوشف:— خدا سے ڈرو۔ شریعت میں ٹھٹھا کرتے ہو۔ چند روز ہوئے ہمارے گاؤں کی ایک نابالغ لڑکی کو پادریوں نے عیسائی کر لیا۔ اس واقعے سے ایسا متاثر ہوا ہوں کہ عملاً و شکلاً مسلمان بننے کا تہیہ کر لیا ہے۔

قیس:— جزاک اللہ! شکلاً تو ماشاء اللہ مجاہدین کے زمرے میں شامل معلوم ہوتے ہیں لیکن اعمال میں بھی تبدیلی ہوئی؟

حاجی جوشف:— ارے میاں دن بھر دوکان میں جان کھپاتا ہوں۔ نماز باجماعت نہیں ہو سکتی۔ اکیلے پڑھنے میں وہ لذت کہاں۔ دیکھو آہستہ آہستہ پابند ہو جاؤں گا۔ چلو آج اہلحدیث اور شیعوں کا مسئلہ خلافت پر معرکہ کا مباحثہ ہو گا۔ قبلہ مولوی صاحب ہماری طرف سے بولیں گے۔

قیس:— میں مباحثے کا اصولاً مخالف ہوں اور مسئلہ خلافت ایسا پیش پا افتادہ جھگڑا ہے کہ اس میں وقت صرف کرنا سعی لاحاصل ہے۔ خلفاء' انبیاء کی طرح مامور من اللہ نہیں' محض نوزائیدہ مذہب کی شیرازہ بندی اور انتظام سلسلہ قائم رکھنے کے لئے شورنے سے نصب خلافت ہوتا رہا ہے۔ تیرہ سو سال بعد آنے والی نسلوں پر زمانہ ماضی کے امرائے ملت کا اقرار یا انکار کیا اثر ڈال سکتا ہے۔

حاجی جوشف:— کالج کی تعلیم نے آپ کو اسلام سے قطعی بے بہرہ کر دیا ہے۔ لوجی۔ اگر آج ہم اپنے مشاہیر کی حرمت پر جانیں نہ لڑا دیں تو فردائے قیامت میں مالک یوم الآخرت کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اچھا اگر آپ نہیں چلتے تو بندہ کا سلام ہے۔

"ہاں۔ میں کیا لکھ رہا تھا۔ میرے تمام خیالات پراگندہ کر دیئے۔ پس بموجب حکم کالج میں داخل ہو گیا ہوں.....

"اے لو ایک اور مصیبت آئی۔ (پہلے چغتائی اور ان کے بعد ایک اور ہم جماعت "مظہر الاسلام 38" ہوسٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔)

مظہر الاسلام:- سنو۔ آج ہم ایک خاص نیکی کے ارادے سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ دیکھو تم دنیا میں بالکل اکیلے ہو۔ صحرانورد تمہارا لقب ہے۔ ہر وقت کی تنہائی تمہیں زیادہ مجنوں بنا رہی ہے۔ آؤ ہمارے سلسلے میں شامل ہو جاؤ۔ میرے مرشد سے بیعت کر لو۔ ایک بڑی محکم برادری میسر آجائے گی۔ توشۂ آخرت بھی مہیا کر لوگے۔

قیس:- سنو حضرت۔ میں اسلام کو ایک ہمہ گیر مذہب سمجھتا ہوں۔ آپ لوگ اس کے دائرے کو نقطے سے زیادہ وسعت نہیں دے سکتے (وغیرہ وغیرہ)"

پطرس اور امتیاز علی تاج گورنمنٹ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ انعام اللہ شاہ کے نام قیس نے "جنم سے خط 39" بھیجا۔ اور "جوانا مرگ" کے عنوان سے "بلاغت اللہ" کی فرضی موت پر فلسفیانہ موشگافیاں اور پر لطف چھیڑ چھاڑ کی۔

"بلاغت اللہ فطرتاً مجلسی واقع ہوا تھا........ اس کا ہمہ گیر دماغ کبھی کسی مسئلہ کو سمجھنے سے عاجز نہیں ہوا۔ مجمع اضداد میں ہر شخص اسے اپنا ہم مذاق تصور کرتا تھا.... دوستوں پر جان قربان کرنا اس کی زندگی کا بہترین پہلو تھا۔ .... اس کی پیدائش ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں اسے سن شعور ہی سے علمی مشاغل میں اپنے تئیں فنا کرنے کی تعلیم ملنی شروع ہو گئی تھی......... اس کے چچا 40 ہندوستان کے معرکۃ الآراء علماء میں شمار کئے جاتے تھے ..... اس جان ہار نے جب آنکھیں کھولیں تو پہلی نگاہ فقہ و حدیث کی گریباں گیر صد زبان کتابوں پر پڑی)۔ اب وہ بجائے کھلونوں کے کتابوں کے شیرازے توڑ پھوڑ کر دل خوش کر لیا کرتا تھا...... وہ مرحوم تو جو کچھ اپنے چچا سے علمی مجالس کے دوران سنا کرتا تھا جب تک ہم جولیوں کو سنا کر اپنا مرید نہ کر لے شاعر جیسے القائی پیغامبر کی طرح بے قرار رہا کرتا تھا..... بالغ ہونے پر وہ ایک زمانے تک اپنی تحقیق کے بل پر اپنے علامہ روزگار چچا سے بھی منحرف رہ چکا تھا......

"........ اب وہ پھر مباحثوں میں اپنے چچا کا دست و بازو بن گیا۔ آہ عین اس وقت جبکہ اس کے چچا نے جان توڑ کوشش سے اسے اسلامی مبلغ اور اپنا نائب اور وارث 41 بنا لیا تھا موت کے ناشناس ہاتھ نے اس کے چچا کو روحانی فرزند اور دوستوں کو جاں نثار یار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔

"مجھے خوف ہے کہ یہ سطور پڑھنے والے میرے بیان سے کہیں مرحوم کو کٹھ ملانہ سمجھ لیں۔ اللہ اللہ وہ تو محض اس کا مذہبی وجدان تھا۔ ورنہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں ناکام نہیں رہا........ سب سے زیادہ انہماک اس سے افکار عاشقانہ میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک روز بڑے یاس کے لہجے میں کہنے لگا۔ ہندوستان میں رہ کر کامیاب عشق ناممکن ہے۔ "42

سید انعام اللہ شاہ نے میٹرک سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔ لیکن بلا کے ذہین تھے۔ میر افضل علی کے دوسرے دوست شمشاد حسین جنگ عظیم کے خاتمہ پر آئی۔ سی۔ ایس نامزد ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں ضلع بھاگلپور میں شکار کھیلتے ہوئے اتفاقیہ بندوق کی گولی کا شکار ہوئے۔ ان کی ایک بیٹی بدر بعد میں لیڈی ظفر اللہ بنیں۔ شمشاد حسین' انعام اللہ' چودھری ظفر اللہ خاں یہ سب نوجوان پکے احمدی تھے۔ میر افضل علی ان سب کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود کے گھر چھٹیاں گذارنے اکثر قادیان جایا کرتے۔ "تخیلات" کے سارے مضامین انہوں نے زمانہ طالب علمی میں لکھے۔

میر افضل علی نے محمود غزنوی پر مقالہ لکھ کر ایف۔ سی کالج سے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کے ماموں میر نذر الباقر کے محاذ جنگ پر جانے کے فوراً بعد ان کے والد میر فضل علی اچانک چل بسے۔ کالج چھوڑتے ہی تلاش معاش میں سرگرداں ہوئے۔ چودھری ظفر اللہ کے اصرار پر سرکاری اخبار "حق" کے ہیڈ مترجم کی جگہ کے لئے درخواست دی۔ یہ اخبار حکومت پنجاب نے جنگی پروپیگنڈہ کے لئے جاری کیا تھا۔

تقرری کے خط میں ان کو نائب مترجم کی ملازمت کے لئے مدعو کیا گیا۔ معلوم ہوا ہیڈ ٹرانسلیٹر کے لئے حکیم احمد شجاع نے درخواست دی تھی۔ وہ لے لئے گئے۔ افضل علی بہت دل برداشتہ ہوئے۔ چودھری ظفر اللہ کے سمجھانے سے نائب مترجم کی نوکری کر لی۔

چھ ماہ بعد حکیم احمد شجاع نے استعفے دیدیا۔ افضل علی ہیڈ مترجم بن گئے۔ "حق" کے انگریز نگراں منتظمان نے جنگ کے خاتمہ پر ایک عدد سند اور تمغہ تھما کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نامزد کروا دیا۔ ڈپٹی کلکٹری شمالی ہند کے نوجوان کی نیلم پری تھی۔ (اقبالؒ نے ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان دیا تھا۔)

۱۹۲۰ء میں پنجاب گورنمنٹ نے افضل علی کا انکم ٹیکس افسر کی حیثیت سے روہتک میں تقرر کیا۔ بھائی قیس مع "تخیلات" سرکاری فائیلوں کے صحرا میں ہمیشہ کے لئے کھو گئے۔ فرفر انگریزی بولتی "لیلےٰ" نے مسز افضل علی کا روپ دھار کر گھر سنبھالا۔ والدہ اکبری بیگم اور دادی اشرف جہاں ساتھ رہنے کے لئے روہتک آگئیں۔

کہاں تک جیتیں نانی' بہت جی لیں۔ بیٹے تفضل علی' فضل علی' بیٹیاں مصطفائی' مرتضائی' نواسے مصطفےٰ باقر' بھانجے ظہور حسنین' پرنواسے جواد حیدر اتنے جنوں کی بھتی تو انھوں نے کھائی۔ ۱۸۵۷ء میں چو کنواں مراد آباد پر گوروں کی یلغار انھوں نے دیکھی۔ ۱۹۲۰ء میں جب اللہ کے گھر سدھاریں روہتک میں کوٹھی کے باہر سڑک پر کانگریس اور خلافت والوں کا جلوس ان ہی گوروں کی اولاد کے خلاف نعرے لگاتا ہوا جا رہا تھا۔

آخر وقت میں سنا ہے نانی اشرف جہاں بالکل خبطی ہو گئی تھیں۔ مگر کیا پتہ وہی بالکل صحیح الدماغ رہی ہوں۔ دنیا ہی باؤلی تھی۔ مرنے سے پہلے گھر والوں کو آگاہ کرتی گئیں "بیوی۔ دنیا کے کسی دیس میں گوڑے ہندوستان کے علاوہ پھوٹ' نام کا پھل پیدا نہ ہوتا۔ میں کہے دوں ہوں۔ یہ ہندو مسلمان آج بھائی

بھائی ہاکا ہلڑ مچا رہے ہیں۔ کوئی دن جاتا ہے یہی نتھے آپس میں کٹے مریں گے۔ دیکھ لیجیو۔"

۱۲— مثنوی ماڑے نامہ

محلہ سادات سہ دری نہٹور میں یہ سامنے کو دربار عظام کا محل نا کھڑا ہے۔ اب سے دور غدر ۵۷ء میں بارہ ٹوپی والوں نے اس میں "آزاد حکومت" قائم کری تھی۔ صدر میراں امتیاز علی وزیر مالیات سمجھو قاضی شبو وزیر خزانہ چودھری انوپ سنگھ اور وزیر دفاع عنایت حسین۔ یہ صاحب پشاوری پٹھان تھے خونخوار۔ بیس گز گھیر کی شلوار۔ تباہ کن مونچھیں۔ تو بوا اس فری نہٹور گورنمنٹ نے گیارہ مہینے تلک گاؤوں سے مالگذاری وصول کری۔ دربار عظام کے صحن میں عدالت لگتی۔ باہر کے پھاٹک پر کید کی شاخ میں یہ موٹا رسہ لٹکا دیا گیا تھا۔ بارہ ٹوپی والے جس شامت کے مارے کو چاہتے فرنگی کا جاسوس قرار دے کر پھانسی دے دیتے۔ باون برس ادھر کی میر خانی گردی سے بدتر سماں تھا۔ اوپر سے آ پہنچا شیرکوٹ کا ماڑے خاں۔ ہندو مسلمان میں تلوار چل گئی۔ ۱۲۲ اگست ۱۸۵۷ء مسٹر جارج پامرجنٹ مجسٹریٹ بجنور نے میراں امتیاز علی و دیگر روسائے نہٹور و نگینہ کو شقہ بھیجا' "معلوم ہوتا ہے مابین قوم مسلماناں و قوم ہنود شہر تمہارے میں اندیشہ فساد ہونے کا ہے اس وجہ سے سرکاری فوج عنقریب واسطے بندوبست کے بھیجی جاتی ہے۔"

فرنگیوں نے اپنے علاقوں میں جگہ جگہ "ڈاک بنگلے" بنوائے تھے جہاں ڈاک گاڑیاں ٹھہر کر آگے چلتی تھیں۔ غدر کی وجہ سے خبر رسانی کا سارا انتظام درہم برہم تھا۔ پوچھو جنٹ صاحب کو ہندو مسلم جھگڑے کی اطلاع پہلے ہی سے کیسے ہوگئی۔ کیا وحی آتی تھی ان پر؟

خیر جی یہ تو سب سمجھنے بوجھنے کی باتیں ہیں۔ جب ہرکارہ یہ شقہ لے کر نہٹور داخل ہوا میراں امتیاز علی اس وقت بارہ ٹوپی والوں کے سرغنہ بنے دندنا رہے تھے انہوں نے ہرکارے کو مار بھگایا۔ نواب محمود خاں کے کمانڈر ماڑے خاں دربار عظام میں مہمان تھے۔ پلکھنوں کے نیچے لشکر کی دیغیں کھڑک رہی تھیں۔ محلہ کا بچہ بچہ اونچی بنا پھرے تھا۔

اب سنو کہ جب خواجہ صابر" کلیر والے کی درگاہ پر مسلمان حسب معمول قوالی پر سر دھن رہا تھا۔ چند میل کے فاصلے پر رڑکی میں فرنگی انجینئرنگ کالج قائم کر چکے تھے اور ان کا گڑھ کپتان آبپاشی کی نہریں کھدوا رہا تھا۔ نہٹور کی گاگن ندی سے بھی نہر نکالی گئی۔ اور کائستھ اور بنگالی اوورسیروں کی نگرانی میں پل باندھا جانے لگا۔ پل ابھی ادھورا تھا کہ غدر شروع ہوگیا۔ گاگن کنارے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی اینٹوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ ماڑے خاں وہ ساری اینٹیں محلہ سادات اٹھوا لائے۔ قلعہ بندی کری اور ایک عدد توپ دربار عظام کے پھاٹک پر نصب کر کے لگے مونچھوں پر تاؤ دینے۔

ماڑے خاں ضلع بجنور کے مختلف مورچوں پر انگلش کی فوجوں کے خلاف بھی خوب لڑے۔ ان کی شان میں مثنوی ماڑے نامہ لکھی گئی جو نہٹوریوں کو مدتوں ازبر رہی اس کا ایک شعر تھا۔

وہ ایسا لڑا در صف کار زار
کہ رستم لڑا اور نہ اسفند یار

۱۸۵۷ء کی "جنگ آزادی" کا حشر جو ہوا سو ہوا البتہ گاگن کے ادھورے پل کی باقیماندہ اینٹوں سے چند مردان حر نے اپنے لئے ایک دو مکان ضرور بنوا لئے۔

اب دوبارہ آئیے ۱۹۱۹ء کی طرف کو۔

کہنے لگے عشق کی تقویم میں اور زمانے بھی ہیں۔ تو سنئے۔ ۱۲۵۶ء سقوط بغداد' ۱۴۹۲ء بربادی اندلس' ۱۸۵۷ء زوال مغلیہ ان سانحوں کے مانند ۱۹۱۹ء میں دولت عثمانیہ کا خاتمہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک TRAUMATIC المیہ ثابت ہوا جس نے علی گڑھ اور اوکسفورڈ کے مسٹر محمد علی کو مولینا بنا چاند تارے کی ٹوپی اور فرغل پہنا ہندی مسلمانوں کے پہلے عوامی لیڈر کی حیثیت بخش دی۔ وہ بھی ایسا لڑا در صف کار زار۔ لیکن تلوار کی جگہ تقریر۔ کیونکہ اہل ہند نہتے کئے جا چکے تھے۔ یہ بڑے غم و اندوہ کا زمانہ تھا۔ جس میں ماضی کی ساری بدبختیاں حال کے المیہ سے منسلک ہو کر طویل نوحہ بن گئی تھیں۔

دلی میں ایک بوڑھے' افلاس زدہ مغل شہزادے سفید براق داڑھی' سرخ و سفید نورانی چہرہ' سر پر چوگوشیہ سبز ٹوپی' سال کے سال صبح عاشور اپنا تصنیف کردہ مرثیہ جگر پاش انداز سے پڑھنے کے بعد سامعین سے درخواست کرتے' "بھائیو میں کس خاندان کا نام لیوا ہوں۔ میرے بزرگوں کے لئے دعائے مغفرت اور میرے لئے دعائے خیر کرنا۔" شہزادے کے یہ الفاظ سن کر حاضرین مجلس (جس میں پرانی دلی کے وضعدار ہندو شرفاء بھی کثیر تعداد میں شامل ہوتے تھے) زار و قطار روتے۔

لیکن نہ بھولنا کہ بقول نانی اشرف جہاں مرحومہ پھوٹ نام کا پھل بھی صرف اسی دیس میں پیدا ہوا ہے۔ سیاسی نظریاتی منیوژن' تکرار' نفاق اماں دور کیوں جاؤ ۱۸۵۷ء میں خود تمہارے بجنور کے اندر ہندو مسلم باغیوں میں کم جوتا چلا؟ قصبے کے قصبے ملیامیٹ ہوگئے۔ اور وہیں پر عصر رواں کا یہ نقشہ ہے گا کہ منڈاور' شیرکوٹ' چاند پور' تاجپور' دھام پور' سیوہارہ' نگینہ' نہٹور کے سارے ہندو مسلمان سورما زیادہ سے زیادہ سرکاری عہدے حاصل کرنے کی دوڑ میں سرگاڑی پیر پیسہ کئے دے رہے ہیں۔ راجہ صاحب تاجپور نے تو سن ستاون کے بعد اتنی وفاداری دکھائی کہ خود ہی کرسٹان ہوگئے۔ ان کے پوتے نے حال میں دو گاؤں ایک دن میں فروخت کر کے نینی تال میں گورنر کی زبردست دعوت کری تاکہ اس کی لڑکی کے ساتھ رقص فرما سکیں۔ کجاست فکر چکیے و رائے برہنے۔ کہنے لگے۔

غازیان سادات نہٹور کو بھی سرکاری ملازمت خوش آئی تھی لیکن ۱۹۲۰ء نے عجیب منظر دکھلایا۔ خان بہادر جلال الدین حیدر مرحوم کی کمسن نواسی فاطمہ خاتون درجن بھر خان بہادروں کے محلہ سادات سہ دری میں گھر گھر جا کر خلافت فنڈ کے لئے چندہ جمع کر رہی تھیں۔ مارے قوم پرستی کے ہندی پڑھ رہی تھیں اور ان کی چچا زاد' پھوپھی زاد' ماموں زاد کنواری پردہ نشین بہنیں جمعہ کے جمعہ گھر کے صحن میں جمع ہو کر

سیاسی جلسے اور تقریری مقابلے کرتی تھیں۔ فاطمہ خاتون کے بڑے بھائی عثمان حیدر مولانا محمد علی کے والنٹیر بن چکے تھے۔ جب علی برادران مع والدہ دورہ کرتے نہٹور آئے عورتوں نے اپنے زیور اتار کر بی اماں کے حوالے کئے۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء کی مشہور دعا "انگریزوں کا عبادت خانہ گرجا" ایک بار پھر دہرائی جانے لگی۔

۱۹۲۰ء سے چند برس قبل کا قصہ سنو۔ گرمیوں کے موسم میں مشیر حسین قدوائی' سید وزیر حسن' علی محمد خاں راجہ محمود آباد اور سجاد حیدر الہ آباد میں پنڈت موتی لعل نہرو کے ہاں چند دن کے لئے گئے۔ پہلے روز کا ذکر ہے شام کا وقت تھا لیکن باہر آگ برس رہی تھی۔ جواں سال سجاد حیدر بسلسلہ کانگریس لیگ اتحاد راجہ صاحب محمود آباد کی ایک تقریر لکھنے میں محو تھے۔ کمرے میں حبس طاری تھا۔ اتنے میں موتی لعل نہرو کا نو عمر ولایت پلٹ بیٹا اتفاقیہ اس کمرے میں آیا۔ بولا ارے آپ اتنی گرمی میں بیٹھے ہیں اور برقی پنکھا چلا کر باہر چلا گیا۔ یہ اسی طرح بیٹھے اپنی دھن میں لکھا کئے۔ چند منٹ بعد ایک ملازم آکر کمرے میں لونڈر چھڑک گیا۔

سجاد حیدر غسل خانے میں گئے اسے بھی لونڈر سے معطر پایا۔ رات کو مشیر حسین قدوائی نے کہا۔ میاں یہاں تو غسل خانے بھی فرنچ لونڈر سے مہک رہے ہیں۔

کہ یک بیک اس معطر عشرت کدے کی ہوا بدل گئی۔ ہوا کے رخ بھی بدلنے لگے مگر پرانی وضعداریاں نہ بدلیں۔ جواہر لعل نہرو مہاراجہ محمود آباد کو ان کے آخر وقت تک "چچا" کہا کئے۔

سرہار کرٹ بٹلر نے جواہر لعل کو جیل بھجوایا۔ مگر پنڈت موتی لعل سے دوستی کا دم بھرتا رہا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا۔ اکیس سالہ عثمان حیدر مولانا محمد علی" کے ہمرکاب تھے "موتی لعل نہرو' جواہر لعل' مولانا ابوالکلام آزاد' عمر سبحانی' سروجنی نائیڈو اور موتی لعل نہرو کے بھانجے جن کا نام شاید پنڈت کیلاش نرائن تھا ایک رات طعام شب پر سب موجود تھے۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا ذکر نکلا۔ جواہر لعل نے سروجنی نائیڈو اور مولانا آزاد کو مخاطب کرکے دفعتاً کہا۔ صاحب وضعداری بھی بڑی چیز ہے۔ پچھلے دنوں میں لکھنؤ سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ[43] کے اسٹیشن پر سجاد حیدر صاحب مل گئے۔ وہ شاید سلطان پور جا رہے تھے۔ اسٹیشن پر میری وجہ سے زبردست ہجوم تھا۔ سجاد صاحب دوسرے پلیٹ فارم پر تھے۔ بھیڑ کے دھکے کھاتے تیز تیز چلتے آکر بڑی گرمجوشی سے ملے۔ میں نے کہا جناب مجسٹریٹ صاحب اب سی۔ آئی۔ ڈی آپ کی مخبری کردے گی۔ ہنس کے فرمایا دیکھا جائے گا۔

میرا ایک پرانا دوست آج کل پرتاب گڑھ کا ایس پی ہے۔ شاید میری وجہ سے پولیس کے انتظام کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میری نظر پڑتی تو فوراً آڑ میں ہو جاتا۔ سجاد صاحب کی ٹرین کا وقت تنگ ہو رہا تھا وہ خدا حافظ کہہ کر اپنی عادت کے مطابق سر جھکائے تیز تیز چلتے پل کی طرف روانہ ہوگئے۔[44]

یہ قومی جدوجہد اور اتحاد کا بڑا سنہرا دور تھا۔ لیکن تاکے ایک بار پھر وہی ہوا جو بکسر میں پلاسی میں خود ہمارے لوکل ماڑے خاں کے وقت میں ہوا تھا۔ وقت رحلت نانی اشرف جہاں کیا غلط کہہ گئی تھیں۔

اور جب بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا۔۔۔۔۔۔۔ تو بعد کچھ عرصے کے حکیم الامت" نے للکار کر دریافت کیا۔

عنبیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی؟
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

لہو کے دریا ۱۹۴۶ء' ۱۹۴۷ء میں بہنے والے تھے۔ لیکن ۱۹۳۳ء میں جب سید عثمان حیدر و محمودہ خاتون کا گزر یروشلم سے ہوا۔ مسجد اقصیٰ کے نزدیک پہنچے۔ زار زار رونا شروع کیا۔ ایک غریب الوطن کا مزار نظر آیا۔

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

تاجک نژاد داستان گو رئیس الاحرار" اور سجاد حیدر کے زمانہ طالب علمی کا قصہ سنانے وکٹورین اردو ناولسٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تھا۔ حادثات و واقعات کے الاؤ کے سامنے بیٹھا یہ پیر جہاندیدہ جس کا دوسرا نام وقت ہے اب سیاسی مبصر یعنی پولیٹکل کمنٹیٹر کہلا رہا ہے۔

اے خوانین اردوئے جدید ۱۹۷۶ء آپہنچا۔ زمانے کے دشت قپچاق میں باد مخالف نے اردوئے معلیٰ کو آپ کا نیست و نابود کیا۔ لیکن یہ ضعیف العمر ترکمانی خراسانی کوچہ گرد گویا ویران خیمہ گاہوں کی راکھ کرید کر اپنے رباب پر جو کچھ سنانا چاہتا ہے اسے گوش ہوش سے سنتے رہو۔

حوالہ جات

1 مصنف "۱۹۴۲ء میں اعظم گڑھ کی بغاوت" یو۔پی کے نامور سویلین تھے۔

2 "روزنامچہ" از نذر سجاد حیدر "تہذیب نسواں" ۱۱۵گست ۱۹۴۲ء

3 "روزنامچہ۔"

4 نہ معلوم یہ کون سے آزاد کا ذکر ہے۔ یلدرم کے تین دوست اسی نام کے تھے۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک وہ کلکتے والے نواب سید محمد آزاد جن کے صاجزادے سید حسن موتی لعل نہرو کے سکریٹری رہے۔ تیسرے بمبئی کے مشہور بیرسٹرایم کے آزاد جو اتنے خوبصورت تھے کہ ان کی تصویر کے پکچر پوسٹ کارڈ بکتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اماں نے شاید بتایا تھا کہ یہ مسوری والے مہمان ابوالکلام آزاد تھے۔

5 روزنامچہ "تہذیب نسواں" ۱۹۴۲ء ۱۹ ستمبر و ۱۷ اکتوبر

6 روزنامچہ۔ تہذیب نسواں۔ ۲۱ نومبر ۴۲ء

7 "سجاد حیدر یلدرم" از مشتاق احمد زاہدی۔ مطبوعہ رسالہ ادیب۔ دہلی ۱۹۴۳ء

8 ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ کی پھوپھی جسٹس سرزاہد سہروردی کی بیگم۔

9 ڈاکٹر شاہد سہروردی مرحوم۔

10 حسین شہید سہروردی مرحوم سابق وزیر اعظم پاکستان۔

11 سید باقر ظہیر۔ بنے یعنی سید سجاد ظہیران سے چند سال بڑے تھے۔

12 "روزنامچہ" تہذیب نسواں۔ لاہور اکتوبر ۱۹۴۲ء

13 لیڈی محمد یعقوب نے ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔

14 "روزنامچہ" تہذیب نسواں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء

15 اکبری بیگم بہت کفایت شعار تھیں۔

16 میر نذر الباقر کے چھوٹے بھائی سید ظہور حسنین کا بعمر چالیس سال ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ آل حسنین ان کے کم سن اکلوتے بیٹے تھے۔ (فصل چہارم باب ۹)

17 نانی اشرف جہاں بیگم

18 یہ وہی آگرہ والے آنریبل آل نبی تھے جن کا پیغام نذر بیگم کے لئے آیا تھا۔ (فصل چہارم۔ باب مناظرہ مابین مولانا و مسٹر۔)

19 سید نذیر حسین مرحوم ریٹائرڈ پی سی ایس۔ سر رضا علی مرحوم کے برادر نسبتی تھے۔

20 سرو زیر حسن کی بڑی صاجزادی سید عبدالحسن مرحوم ریٹائرڈ پی سی ایس کی بیگم اور ڈاکٹر نورالحسن موجودہ وزیر تعلیم حکومت ہند کی والدہ۔

21 یلدرم نے سال بھر قبل بی اے کیا تھا اور بیچلرزلاج علی گڑھ کے مکین تھے اور چند دوسرے اولڈ بوائز کے ساتھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے ایم اے او کالج کی طرف سے کام کر رہے تھے۔ اس خط سے ظاہر ہوا کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس برطانوی حکومت کے ایماء اور اعانت سے منعقد کی جاتی تھی۔ جسٹس بوڈیم نے مدراس میں کانفرنس کے اس سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی۔ ان صاحب نے مدراس پریذیڈنسی کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں بہت کام کیا تھا اور ان کوششوں نے مدراس مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی صورت اختیار کی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے انگریز صدر پروفیسر تھیوڈور موریسن ہوئے جنہوں نے ۱۹۰۴ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی۔

22 ملاحظہ ہو فصل چہارم باب ۶۔ مناظرہ مابین مولینا و مسٹر۔

23 چھوٹی بھاوج اور ماموں زاد بہن بیگم وحید الدین حیدر۔

24 نذر بیگم کے کزن اور ان کی چچی آل زہرا بیگم کے چھوٹے بھائی جو یلدرم کے عزیز دوست تھے۔

25 اکبری بیگم

26 ماخوذ از "ایام گذشتہ" از نذر سجاد حیدر "عصمت" کراچی ستمبر ۱۹۵۷ء

27 دیکھئے فصل چہارم باب ۱ "فلانگ آفریدی۔"

28 "روزنامچہ" از نذر سجاد حیدر۔ "تہذیب نسواں" مطبوعہ ۲۸ مارچ ۱۹۴۳ء

29 بشکریہ سید عثمان حیدر صاحب۔ کراچی۔

30 دیکھئے فصل پنجم باب ۱۔ "خیزد رباغ دراغ قافلہ گل رسید۔"

31 "بڑی جاپان بڑی" (تلخیص) یلدرم از بغداد۔ مطبوعہ مخزن۔ لاہور

32 موجودہ نواب [illegible] آباد۔ دیکھئے فصل دوم باب نمبر ۵۔ "رام گنگا"

33 مطبوعہ "تہذیب نسواں" لاہور۔ ۱۳ اپریل ۱۹۴۳ء

34 بشکریہ سید عثمان حیدر صاحب۔ کراچی۔

35 سید امتیاز علی تاج مرحوم۔

36 کوہاٹ، پاکستان میں یہ باغ اور ڈپو آج تک موجود ہے۔

37 پیام قیس از میر افضل علی۔ مطبوعہ مخزن۔ لاہور ۱۱۹ء؟

38 "مظہر الاسلام" کے پردے میں مرزا بشیرالدین محمود احمد بول رہے ہیں جو میر افضل علی کے ہم جماعت تھے اور بعد میں خلیفہ ثانی سلسلہ احمدیہ بنے۔

39 یہ مضمون "اردو کا بہترین انشائیہ ادب" (مکتبہ جدید لاہور ۱۹۶۴ء) میں شامل ہے۔

40 شمس العلماء میر حسن سیالکوٹ (دیکھئے فصل پنجم باب نمبر ۲ "عیش باغ۔"

41 "بلاغت اللہ" ایک مرکب کردار ہے۔ کیونکہ اس میں انعام اللہ شاہ کے علاوہ مرزا بشیر الدین

محمود کی جھلک بھی واضح ہے۔

42 تلخیص از "تخیلات۔" نوجوان مصنف نے اس کی ایک کاپی جناب مالک رام کو بھی دی تھی۔

43 یہ واقعہ غالباً جون ۱۹۲۰ء کا ہے جب اودھ کے کسان، زمینداروں کے مظالم کے خلاف احتجاجی مارچ کرتے الہ آباد گئے تھے اور اس کے بعد جواہر لعل نہرو نے پرتاب گڑھ اور اودھ کے دوسرے اضلاع کا طوفانی دورہ کیا تھا۔

44 بشکریہ سید عثمان حیدر۔

فصل ششم

نہ صفاہاں نہ سمرقند

موسم بہار ۱۹۶۹ء میں اشتراکی جمہوریہ ترکمانیہ کے شہر عشق آباد کی طیران گاہ کے وسیع سائبان پر انگوروں سے لدی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور اندر انگور کی بیلوں سے معمور صحن چمن کی روشوں پر قباپوش ترکمان اور تاجک لڑکیاں مصروف گل گشت تھیں۔ عمارت کے بالائی برآمدے میں تاجک اور ترکمان انجینئر اور سائنس داں عورتیں اور مرد چینی کے گول پیالوں میں چاء پی رہے تھے۔ اس وقت راقم الحروف کو ایک ناقابل فراموش تصویر نظر آئی۔

سنسان سائبان کی ایک بنچ پر وہ بیٹھا تھا۔ سیاہ قبا میں ملبوس۔ سر پر انتہائی عظیم الجثہ سیاہ قراقلی۔ وہ سفید ریش شاندار ترکمان بوڑھا شاہانہ وقار کے ساتھ بنچ پر خاموش بیٹھا سامنے سپاٹ میدان اور وسیع افق کو دیکھ رہا تھا اور عشق آباد سے نیوکلر سائنس کے مرکز ترمذ جانے والے طیارہ کا منتظر تھا۔ وہ رفیع الشان پرشکوہ ترکمان یا تاجک بزرگ شاید جس کا نام چمن زمین لی ہو، اس تاجک پیر مرد کے بنی اعمام میں سے تھا جو آپ کو یہ کہانی سنا رہا ہے۔

شہر ترمذ سے باہر آمو دریا پر فکر کی کشتی نازک رواں ہوئی۔ اور بوڑھے قصہ گو نے رباب اٹھا کر گانا شروع کیا۔

نسیم سحر سرد ہے
اور طائر فلک نغمہ زن
دراز ریش
ایرانی
ملا کی اذان
اور طلوع آفتاب سے
داغستان منور
گھوڑے اپنے آقاؤں کو دیکھ کر خوشی سے ہنہنائے
جنگجو سردار جمع ہوئے
اس وقت
قرابوداق نے
قزیق خوجہ سے کہا

فتح کی خوشی میں
تمہیں ایک قصہ سناؤں [1]

سنو میرے خاقان۔ قزلق بے نے کیا قصہ سنایا [2]۔
آج سے پونے بارہ سو برس ادھر کا ذکر ہے۔ دمشق میں خلفائے بنوامیہ نے سادات کی جانیں ضیق میں ڈال رکھی تھیں اور وہ بھاگ بھاگ کر یا عرب افواج کے ہمراہ ماوراء النہر آرہے تھے۔ اور یہاں رہ کر دوسرے عربوں کے ساتھ بادیۃ الشام کی یاد میں آہیں بھرتے تھے۔ ترکستان پر سو برس سے چین کا تسلط تھا اور یہاں پر تعینات چینی افسر اور سپاہی اپنے وطن کی یاد میں آنسو بہاتے تھے۔
ایک نوجوان چینی شاعر سین شین نے جو مشرقی ترکستان کے شہر طرزان میں تعینات تھا' لکھا:۔
(تاجک! بوڑھے نے رباب چھیڑا)
اجنبی سرزمین
برف پوش جھیل
جہاں خزاں میں صرف جنگلی بطخیں نظر آتی ہیں'
اور گرمیوں میں جھینگر نہیں گاتے
میں اپنے دیس سے ہزاروں میل دور ہوں
اور ان تین برسوں میں کچھ بھی نہیں ہوا۔
سرد شمالی ہوائیں
اکتوبر کا برفپاش تاتاری آسمان
اچانک
جیسے دفعتاً ایک رات باد بہاری چلنے لگے اور ہزارہا درختوں پر ناشپاتی کے شگوفے کھل اٹھیں۔
شمال کی ہوا مسہری کے پردوں میں اپنی راہ تلاش کرتی ہے۔
اور سموری لحاف اور فرغل
اور زرہ بکتر سرد ہو جاتے ہیں
صحرائی جھیل کے جنگلے پر
برف کی جھالر
آسمان پر منجمد سرمئی بادل
جانے والے مہمانوں کو خیمے میں
شراب پیش کر کے
ہم بربط اور تبتی بانسری بجاتے ہیں

ان کے جانے کے بعد راہیں برف سے پٹ گئیں
دور نکڑ پر ایک سنتری
تن تنہا' چٹان کی طرف منہ کیے
دن بھر کھڑا رہتا ہے
میرے آنسو
میرے گھوڑے کی ایال پر ٹپ ٹپ گرتے ہیں
اور تاتاری ریت چہرے کو کاٹے ڈالتی ہے
لیکن ایک نوجوان' بغیر دولت کمائے
بغیر عہدے حاصل کیے
صرف سیاہی کی تختی اور موقلم پر گذر نہیں کر سکتا [3]۔
ترکوں نے چینی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے سمرقند میں تعینات عرب افواج سے مدد کی درخواست کی ۷۵۱ء میں چینیوں پر عرب فتح کے بعد عربوں نے چینی جنگی قیدیوں سے سمرقند میں فن کاغذ سازی سیکھا۔ اور سنو میرے خان۔ اس معمولی غیر معروف واقعے سے کیا نتیجہ نکلا۔ عربوں نے ساری دنیا میں کاغذ پھیلا دیئے۔ اور سارے عالم میں بڑے بڑے دارالعلوم اور کتب خانے قائم کر ڈالے۔ سمرقند' بخارا' خیوا' خوارزم' ترمذ' نیشاپور' اصفہان' تبریز' بغداد' دمشق' قاہرہ' دلی' ملتان۔
قرطبہ' غرناطہ اور صیقلیہ کی درسگاہوں میں پڑھ کر جب مغربی یوروپ اور انگلستان کے طلبہ اور اساتذہ واپس جاتے تبھی فارغ التحصیل سمجھے جاتے۔ پھر اے میرے خاقان ان مدارس اور کتب خانوں میں الو بولنے لگے اور اقوام عالم کو علم سکھانے فرنگی خان اعظم نے اپنی نئی مقبوضات میں نئے مدرسے کھلوائے۔
یہ ۱۹۲۰ء ہے۔ چینی شاعر سین شین اور دراز ریش ایرانی ملا دونوں کے ملکوں میں ہنگامے بپا ہیں۔ مغربی ترک آغا پٹ گئے۔ ہمارے ترکستان میں سوویٹ حکومت قائم ہو رہی ہے اور اس سے قبل کہ میں بخارا کے مدرسہ میر عرب کا سند یافتہ خادم زادہ عبدالرشید ترمذی' سہروردی نقشبندی کا مرید ڈاکٹر اے۔ مخدوموف میں تبدیل ہو کر ترکمان اکیڈیمی آف سائینسز میں شامل ہو جاؤں چند گیت اور سنتے جاؤ۔
اس وقت قراچل کے اس پار کشور ہند میں بھی تہلکہ مچا ہوا ہے۔ سید احمد خاں کے مدرسہ کا ایک ہندو بچہ کابل میں "آزاد ہند حکومت" قائم کر چکا ہے۔ بہت سے ہندو بچے اور مسلمان زادے پاپیادہ براہ افغانستان و ترکمانیہ وازبکستان کا مرید لینن سے ملنے ماسکو کی طرف رواں ہیں۔
سبزہ زار ہند میں سید احمد خاں کے مدرسہ کو سفید خان اعظم یونیورسٹی کا درجہ دینے کے حق میں نہ تھا۔ بالآخر اسے یہ رتبہ امسال ملا۔ ہندی مسلمان بڑا خوش ہے کہ اس نے۔ نہ صفاہان نہ سمرقند۔ بلکہ نیا اوکسفرڈ قائم کر لیا۔ لیکن اسی برس ترک فلک نے حالات اس طور سے پلٹے چند اہل نظر نے اسی نئے اوکسفرڈ کے مقابلے میں اپنے دماندر پر عارضی اردو گاہ میں ایک اور جامعہ قائم کر لیا۔

اب آگے سنو خواجہ خواجگان چمن زمین لی اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔

۲— دوسرا کعبہ

۱۷ دسمبر ۱۹۲۰ء - علیا حضرت ہرہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال چانسلر، مہاراجہ سر علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد وائس چانسلر اور سید سجاد حیدر یلدرم مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر کیے گئے۔ موخر الذکر کی خدمات یو۔پی گورنمنٹ سے مستعار لی گئی تھیں۔ موصوف کہ علی گڑھ کو "دوسرا کعبہ" کہتے تھے۔ سلطان پور سے وہاں پہنچ کر انتہائی گرمجوشی اور عقیدت کے ساتھ نئی یونیورسٹی کی خدمت میں منہمک ہوئے۔

علی گڑھ میں تین خس پوش بنگلے برابر برابر میں بنے تھے جن میں وائس چانسلر، پرووائس چانسلر اور رجسٹرار فروکش ہوئے۔

"۱۹۲۱ء کے علی گڑھ میں ایک مسلمان خاتون بے نقاب نہ نکل سکتی تھی۔ میں نے اور باغبان پورہ لاہور کی میاں فیملی کی بیگم محمد شریف [4] نے ہمت کی۔ پھر نواب محسن الملک کے بھتیجے ڈاکٹر ہادی حسن حیدر آباد سے شادی کر کے لائے۔ ہم تینوں نے مخالفت کے تیروں کی پرواہ نہ کی۔ شام پڑے کھیتوں میں ٹہلنا شروع کیا۔ دن میں قریب کی کوٹھیوں میں جانے لگے۔ پہلے تین چار، پھر دس بارہ بیبیاں اسی ہمت کی ہو گئیں [5]"

غیر مردوں سے بے پردہ ملاقاتیں۔ غالباً مسوری میں "ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ کھڑکی میں سے پنڈت جواہر لعل نہرو نے جھانکا، اور بولے، اخوہ پلاؤ کی خوشبو باہر تک آرہی ہے۔ وہ اور نوجوان دلہن کملا چہل قدمی کر کے آرہے تھے [6]۔"

علی گڑھ میں گاندھی جی خواجہ عبدالمجید کے ہاں آن کر ٹکے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی نے بڑے دلدوز معرکوں کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا۔ خیموں میں کلاسیں لگیں۔ مولانا محمد علیؒ اسرار خودی اور رموز بے خودی کا درس دیتے۔ ایک ایک شعر کی تفسیر کرتے، روتے رلاتے اور سند میں قرآن و حدیث نقل کرتے۔ خودی اتنی بیدار ہوئی کہ "حضور وائسرائی صاحبہ سے ملاقات کر کے بھی چنداں خوشی نہ ہوتی تھی۔"

"شملہ [7]۔ جب سروجنی نائیڈو کانگریس کے اجلاس کے لئے لکھنؤ تشریف لائی تھیں ان سے کئی بار مل چکی تھی۔ گو عمر میں ان سے بہت چھوٹی تھی مگر وہ پہلی ملاقات میں بہت محبت سے ملی تھیں۔

"میں اور مسز [8] نائیڈو اسی طرح کھڑی تھیں کہ لیڈی ہرنام سنگھ تیز قدمی سے ہماری طرف آئیں اور کہا جلدی چلئے ہرا کسلنسی سے مل لیجئے۔ وہ فوراً جا رہی ہیں۔

"اس شرف ملاقات کی میرے اور مسز نائیڈو کے دلوں میں کچھ زیادہ قدر نہ تھی مگر میزبان کی خوشی کی خاطر بادل ناخواستہ ان کے ساتھ ہو لئے۔ وائسرائی صاحبہ کے حضور میں پیش کیے گئے۔ مسز نائیڈو

شاید موصوفہ سے حیدر آباد میں مل چکی تھیں۔ میں پہلی بار ملی۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد ہم لوگ وہاں سے اٹھ آئے اور لیڈی ہرنام سنگھ سے رخصت ہوئے۔ مسز نائیڈو نے مجھے اپنے دل پسند نرگس کے تختے کی طرف لے جا کر رکشا میں سوار کروایا۔

"اسی وقت مسز طیب علی اکبر نیچے آگئیں۔ ہم دونوں سروجنی دیوی سے رخصت ہو کر رکشا میں روانہ ہوئے۔ مسز طیب علی اکبر کو میں نے ان کی کوٹھی پر اتارا۔ خود اپنے ہوٹل پہنچی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اندر گئی تو میز پر شام کی ڈاک کے ساتھ لیڈی ذوالفقار کا انویٹیشن کارڈ رکھا ملا۔

"------ لیڈی ذوالفقار کی کوٹھی نوبہار میں دریچوں سے آتے ہوا کے جھونکوں اور ڈھلتے سورج کی کرنوں سے کمرہ معطر اور روشن ہو رہا تھا۔ لاہور کی کئی ملنے والی بیگمات سے ملاقات ہوئی۔ باغبان پورہ کی میاں فیملی کی چند خواتین، بیگم ڈیرا، بیگم صاحبہ ممدوٹ۔ چند استاد گویے اور قوال بھی حاضر تھے۔"

بیبیاں سن رہی ہیں قوالی

اکبر غریب ۱۹۲۱ء میں غیرت قوی سے زمین میں ہمیشہ کے لئے گڑ چکے تھے۔ اور جگندر نے کیسے پتے کی بات کہی۔ نوبہار کے نیچے ذوالفقار علی خاں کا موٹر خموش تھا۔

بخدمت بیگم نذر سجاد حیدر صاحبہ
نمبر ۷ ریلوے روڈ۔ لاہور

رجسٹرارز آفس
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
۲۱ جنوری ۱۹۲۳ء

السلام علیکم

آج اتوار ہے۔ میں گھر پر ہوں۔ گھر آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ابھی غسل کر کے نکلا ہوں۔ زکام ہو رہا ہے۔ آج ڈاکٹر انصاری [9] کے پاس دہلی جاتا مگر کونسل کی میٹنگ ہے۔ راجہ صاحب آرہے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کا خط آیا ہے کہ وہ ۲۴ تک دہلی میں ہیں لہٰذا ارادہ کرتا ہوں کہ ۲۳ کو دلی ہو آؤں۔ کل اس کا فیصلہ ہو گا کہ ابوالحسن میرے اسسٹنٹ رجسٹرار مقرر کیے جائیں۔ ۷ فروری کو نیشنل یونیورسٹی [10] کا کانوکیشن ہے۔ باہر سے بہت سے لوگ آنے والے ہیں۔

سجاد

علی گڑھ
۱۲ فروری ۱۹۲۳ء

السلام علیکم

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری

سے استعفےٰ دے دیا ہے۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ان کی جگہ نواب مزمل اللہ خاں وائس چانسلر مقرر کئے جائیں۔

تم فوراً چلی آؤ۔ ۲۲ کو بمبئی جانا ہے۔

سجاد

تاج محل ہوٹل۔ بمبئی۔ ۲۷ فروری ۱۹۲۳ء [11]

آج بھائی مرتضےٰ علی خان صبح سے آ گئے۔ شام کو چاء ہم نے کمرے میں منگوالی اور اس کے بعد باہر نکلے سامنے اپالو بندر پر ایک شریف صورت بزرگ ترکی ٹوپی اور اچکن پہنے ہماری طرف بڑھتے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر ان سے لپٹ گئے۔ ان کی مولویانہ طرز سے مجھے خیال ہوا میرا بے پردہ ساتھ ہونا انہیں معیوب معلوم ہو گا۔ چنانچہ ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ مولوی صاحب نے فرمایا "اسلام علیکم بیگم صاحبہ۔ آپ برسوں میرے رسالہ کی مضمون نگار رہی ہیں۔ میرے لئے اجنبی نہیں۔"

یہ حضرت شاہ دلگیر تھے۔ آگرہ والے۔ ایڈیٹر نقاد۔ ہم لوگ ایک کشتی پر بیٹھ کر تھوڑی دور گئے۔ جب سمندر کے سیاہ پانی اور موجوں کے شور سے بچہ گھبرا گیا تو واپس لوٹے۔ بچے کو سوپ پلا کر سلا دیا۔ ہم چاروں نے نیچے جا کر کھانا کھایا۔ اسی وقت ڈانس شروع ہو گیا۔ شاہ دلگیر فوراً اٹھ کر بھاگے۔

۲۸ فروری! ایوان رفعت میں سمندر کے کنارے چاء کا انتظام تھا۔ عطیہ بیگم نے کہا آپ علیحدہ بیٹھ کر فیضی رحمین میرے شوہر سے باتیں کیجئے۔ ان کے خیالات معلوم کر کے خوش ہوں گی۔

اس نو مسلم یہودی کی باتوں سے واقعی حیرت ہوئی۔ ہر ہر طریق سے وہ ثابت کر رہے تھے کہ اسلام نے عورت کو کل مذاہب سے زیادہ حقوق دیئے ہیں۔

رات ہو گئی۔ سامنے سمندر پر دور ایک جہاز گذرتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی روشنیوں کو خوش ہو ہو کر دیکھتا ہوا بچہ وہیں بنچ پر سو گیا۔

ایوان رفعت۔ بمبئی

۱۶ اپریل ۱۹۲۳ء

محترمہ میری معزز بہن سلامت

امید ہے کہ چھوٹا بچہ اچھا ہو گا۔ کاش کچھ دن اور آپ لوگ ٹھہر سکتے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے بعد مدت مدید ملاقات نصیب ہوئی۔

میری آرزو ہے کچھ عرصہ علی گڑھ میں قیام کر کے میری مہربان کرم فرما بہنوں کے ساتھ مل جل کر اپنی قوم کی بچیوں کے واسطے راہ نجات تجویز کی جائے۔ خیر یہ تو قصہ بہت طویل اور پیچیدہ ہے۔ خدا کوئی دن کرے گا اس وقت ارمان دلی پورے ہوں گے۔

جناب بھائی سجاد صاحب کو سلام۔ پیارے بھانجے [12] کو دیدہ بوسی مع خالہ کی دعا کے۔ بیگم خواجہ عبدالمجید کو سلام۔ ہمشیرہ بالقابہ بہت بہت سلام فرماتی ہیں۔

(تلخیص)

آپ کی محبتی بہن

زہرا

۳—ایک خوفناک پکچر پوسٹ کارڈ

استنبول

مائی ڈیر سجاد بھائی۔ السلام علیکم

میں سیاحت پر ادھر آیا ہوا ہوں۔ بے حد ممنوں ہوں گا اگر آپ اپنے ترک احباب کے نام تعارفی خطوط مجھے بھیج دیں۔ خصوصاً رؤف پاشا کے نام جن سے آپ کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ایک خط میں نے محمد علی صاحب کو بھی لکھا ہے۔ خط کے پتے پر میرا نام مصطفےٰ صغیر لکھئے گا۔ اور یہی نام تعارفی خطوط میں بھی لکھئے۔

والسلام۔ خاکسار

صغیر بیگ

مسجد صوفیہ کا یہ پکچر پوسٹ کارڈ جاڑوں کی ایک کہر آلود صبح رجسٹرار زہاؤس میں موصول ہوا۔ جان محمد بیرہ ڈاک لے کر سیدھا کھانے کے کمرے میں گیا جہاں ناشتے کی میز پر حسب معمول شور مچ رہا تھا۔ پھونس والے بنگلے میں ایک زبردست لونڈہار پارٹی بسلسلہ تعلیم مقیم تھی۔ بھانجے سلطان حیدر و عثمان حیدر۔ بھتیجے سعید الدین حیدر۔ بھتیجے داماد سید محمد عالم۔ نذر بیگم کے دو عدد رشتے کے نوجوان چچا غضنفر علی نقوی و تسور علی نقوی عرف لڈن والن۔ چچا زاد بھائی آل حسنین بہنوئی کے ہاں رہنے کے بجائے ایس۔ ایس ویسٹ میں مقیم تھے۔ عثمان حیدر سیاسی نوجوان تھے اور میاں سعید حیدر اور لڈن والن موسیقی و اسپورٹس کے دلدادہ۔ ان سب کی گرو نذر بیگم تھیں جنہیں لونڈہار پارٹی نے بوجہ ان کی مرعوب کن جارحانہ شخصیت سارہ برن ہارٹ کا خطاب دے رکھا تھا۔

صاحب خانہ نے پکچر پوسٹ کارڈ پڑھنا شروع کیا۔ عثمان حیدر ان کے مقابل میں بیٹھے تھے۔ رنگین تصویر پر نگاہ پڑی۔ دریافت کیا "ماموں جان۔ یہ کارڈ کہاں سے آیا ہے؟"

"خدا خیر کرے۔ مصطفےٰ صغیر بیگ کا خط ہے۔" ماموں جان نے آہستہ سے کہا اور کارڈ جیب میں رکھ کر دفتر چلے گئے۔

"جامعہ ملیہ اسلامیہ ابھی دلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ مولانا محمد علیؔ کا قیام زیادہ تر علی گڑھ میں رہتا تھا۔ ان کا اصول سا ہو گیا تھا روز رات کے دس بجے پیدل ماموں جان کے پاس آیا کرتے تھے۔ لارڈ حیات جامعہ کے رجسٹرار تھے وہ اکثر مولانا کے ہمراہ ہوتے۔

"لارڈ حیات علی گڑھ کی ایک دلچسپ شخصیت تھے۔ مشہور پہلوان محمد حسن کے بیٹے زمانہ طالب علمی سے لارڈ حیات کہلاتے تھے کہ طبعاً انگریز تھے۔ اور ماموں جان' ابوالحسن اور مسعود نامی کی مانند صرف رینکن کے سلے ہوئے سوٹ زیب تن کرتے تھے لیکن قومی تحریک نے کایا پلٹ دی تھی۔ مولینا محمد علی کے ہمزاد بن چکے تھے۔ روز رات کو جب مولینا رجسٹرار زہاؤس تشریف لاتے لارڈ حیات ہاتھ میں لالٹین لئے آگے آگے چلتے۔

"جس روز استانبول سے یہ پراسرار کارڈ آیا رات کو دونوں صاحبان حسب دستور ہمارے ہاں پہنچے ماموں جان کے آفس روم میں یہ TRIO جمتا تھا۔ کمرے کے دروازے اندر سے بند کر لئے جاتے تھے۔

"چونکہ مصطفیٰ صغیر بیگ ایک مشتبہ ہستی تھے، مجھے صبح سے کرید لگی ہوئی تھی۔ اس رات جب ماموں جان کے دفتر کے دروازے اندر سے بند ہوئے گو مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا میں چپکے سے ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور درز میں سے جھانکا۔

"مولانا محمد علی نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا، "سجاد۔ اس مردود کا خط تمہارے پاس بھی آیا ہے؟"

"ماموں جان نے میز کی ایک مقفل دراز کھولی اور اس میں سے نکال کر وہ پکچر پوسٹ کارڈ مولانا کو تھما دیا۔ مولینا نے ایک خط ماموں جان کے حوالے کیا اور گویا ہوئے۔ بدمعاش نے دونوں کو ایک ہی مضمون لکھا ہے۔۔ لیکن تم سے رؤف پاشا کے نام تعارفی خط کی فرمائش غور طلب ہے۔

"اس بدذات نے خط لکھنے کی جرات ہی کیسے کی۔ کیا ہم لوگ اس کی ہسٹری سے واقف نہیں؟' ماموں جان نے کہا۔

"ہسٹری کیا ہسٹری شیٹ' لارڈ حیات نے غصہ سے کہا اور چند گالیاں بزبان انگریزی۔

"میرا ہاتھ لگنے سے کواڑ میں ذرا سا کھٹکا ہوا۔ ماموں جان نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں سرپٹ بھاگا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ کر دم لیا۔

کندرکھی ضلع مراد آباد نے ایک طرف سرسید رضا علی جیسا لائق انسان پیدا کیا۔ بدقسمتی سے مرزا مصطفیٰ صغیر بیگ بھی اسی قصبے کے باشندے تھے۔ گورے چٹے۔ حرفوں کے بنے۔ تیز طرار۔ ایم۔ اے۔ او کالج کی ایف اے کلاس میں ماموں نصیرالدین حیدر کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ جب ماموں نصیر پی۔ سی۔ ایس میں منتخب ہو کر بریلی تعینات ہوئے بیگ صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ آپ تحصیل بیڑی ضلع بریلی کی عدالت تحصیلدار میں نائب ناظر ہو گئے تھے۔

"لارڈ کرزن وائسرائے ہند علی گڑھ آئے۔ اولڈ بوائز کی جانب سے ڈنر دیا گیا۔ اس ڈنر میں شرکت کے لئے مصطفیٰ صغیر بیگ بریلی سے تشریف لائے۔ لاٹ صاحب سے شرف باریابی حاصل کیا۔ لارڈ کرزن ایک گھاگ' فوراً بھانپ گیا کہ کس قماش کے آدمی ہیں۔ کلکتہ واپس جا کر اس نے بیگ صاحب کو بلوا بھیجا۔ برطانوی سیکرٹ سروس کی ٹریننگ کے لئے لندن چلتا کیا۔

"ہندوستان سے واپس جا کر لارڈ کرزن برطانوی وزیر امور خارجہ مقرر ہوئے۔ سیکرٹ سروس براہ راست ان کے ماتحت تھی۔ مصطفیٰ صغیر بیگ نے بڑے 'کارنامے' انجام دیئے۔

"مرزا صاحب کی سسرال خورجہ میں تھی۔ برسوں بعد خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی کو ان کے داماد نیاز اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر للت پور نے ۱۹۳۴ء میں بتلایا کہ جب مرزا صاحب بسلسلہ "فرائض خصوصی" لندن میں مقیم تھے خورجہ میں اپنا بنگلہ بنوانے کی خاطر اس کا نقشہ اور ماڈل پیرس کے ایک معمار سے تعمیر کروایا تھا اور بیش قیمت فرنیچر کا آرڈر لندن کی مختلف دوکانوں کو دے رکھا تھا۔ قیام جمہوریہ ترکی کے بعد

بیگ صاحب کو بذریعہ زہر خورانی مصطفیٰ کمال پاشا کو ختم کرنے کی مہم پر انگورہ بھیجا گیا۔

"مرزا صاحب ایک متمول ہندوستانی سیاح کی حیثیت سے ترکی میں وارد ہوئے اور جمہوریہ کے نئے تعلیمی اداروں کو گراں قدر عطیات سے نوازنا شروع کیا۔ ایک جلسے میں اتاترک انگورہ یونیورسٹی کے لئے چندے کی اپیل فرما رہے تھے۔ مرزا صاحب نے فوراً بھاری چیک کاٹ کر پیش کر دیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا ان کے مشکور ہوئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی سے بے پناہ ہمدردی ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"لیکن رؤف پاشا جو ترکی انٹیلجنس کے سربراہ تھے' مرزا صاحب کی غیر معمولی داد و دہش سے مشتبہ ہو چکے تھے۔ ادھر جنگ بلقان کے زمانے سے ماموں جان کے نام ترکی سے ہندوستان آنے والے خطوط سنسر کئے جا رہے تھے۔ رؤف پاشا نے کسی خفیہ ذریعے سے ماموں جان کو مصطفیٰ صغیر بیگ کے بارے میں خط بھیجا۔

"اب یہ پکچر پوسٹ کارڈز موصول ہونے کے بعد ماموں جان اور مولانا محمد علی نے خلافت کی انڈر گراؤنڈ کے ذریعے رؤف پاشا کو خبردار کیا۔ چند روز بعد اطلاع ملی کہ مرزا مصطفیٰ صغیر بیگ کو گرفتار کر کے برطانیہ کی جاسوسی کے جرم میں بمقام انگورہ پھانسی دے دی گئی۔

"قید خانے میں ترکی انٹیلجنس مرزا صاحب آنجہانی سے کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کی پاداش میں ان کے آقاؤں نے مرزا صاحب کی وہ ساری دولت جو انہوں نے لندن کے ایک بنک میں جمع کی تھی ضبط کی۔ آنجہانی کی بیوہ بچوں کے لئے پچاس روپے ماہوار کی پنشن مقرر کی گئی یا اس کے بدلے دس ہزار روپے نقد۔

"مرزا صاحب کے دو بھائی تھے۔ انہوں نے بیوہ بھاوج کو یکمشت رقم قبول کرنے کا مشورہ دیا جو بہت جلد دونوں صاحبان نے فسق و فجور میں اڑا دی۔ کچھ عرصہ بعد وہ دونوں 'بیوہ' بچے سب ایک ایک کر کے مر گئے۔ مشہور مسلم لیگی لیڈر مولانا عمر دراز بیگ مراد آباد میں مصطفیٰ صغیر کے پڑوسی تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے مرزا صاحب کا گھر کھنڈر ہو گیا۔ مصطفیٰ صغیر بیگ کی ترکی تمام ہوئی۔

"ان ذاتِ شریف کے متعلق اردو میں ایک دو کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن کسی میں ان کے صحیح حالات درج نہ تھے۔ ایک کتاب میں انہیں پشاور کا باشندہ بتایا گیا تھا۔

"برطانوی انٹیلجنس کچھ کم کائیاں نہ تھی۔ ماموں جان کی سروس کے خفیہ ریکارڈ پر سب کچھ درج ہوتا جا رہا تھا۔

"اسی زمانے میں ایک روز اخباروں میں آیا کہ جرمنی نے اورینٹ ایکسپریس نامی ایک لگژری ٹرین چھوڑی ہے جو ایک سو بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے اور برلن سے استانبول تک جاتی ہے۔

"صبح بریکفاسٹ کی میز پر اخبار پڑھتے ہوئے ماموں جان نے یہ خبر ہم سب کو سنائی اور بڑے جوش سے کہا' "بس ہم اسی ٹرین پر ترکی جائیں گے۔"

"ماموں جان اپنی بیرونی سیاحت کے لئے چھ ماہ کی چھٹی کی درخواست دے چکے تھے۔ لندن میں مشہور زمانہ ویمبلی اگزیبیشن لگنے والی تھی اور ممانی جان کو نمائش دکھانے کے لئے ہمراہ لے جانے کا پروگرام

بنایا تھا۔

"اس زمانے میں فارن اسکالرشپ' ٹریول گرانٹ اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے مفت دعوت نامے مفقود تھے۔ ماموں جان ہر چوتھے پانچویں سال شوق سیاحت میں اپنا ذاتی روپیہ اڑا دیا کرتے تھے۔ اس وقت ناشتہ کرتے کرتے اورینٹ ایکسپریس کی تصویر جو اخبار میں چھپی تھی بڑے شوق سے ہم لوگوں کو دکھانے لگے۔ میں نے سب سے زیادہ دلچسپی اور اشتیاق کا اظہار کیا۔ لیکن ممانی جان کا چہرہ اتر گیا۔ ماموں کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ اس وجہ سے وہ ان کی مسلسل سیاحتوں سے نالاں اور متفکر تھیں۔

"ایک صاحب نے جو ہمارے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے فرمایا' "بھائی سجاد۔ جب روپیہ زیادہ ہو جاتا ہے اسے اسی طرح فضولیات میں برباد کیا جاتا ہے۔ آپ اتنی مرتبہ باہر ہو آئے ہیں اب پھر جانے کی کیا ضرورت ہے؟'

"ماموں نے حیرت سے انہیں دیکھا گویا سیاحت کو کوئی شخص فضولیات' کیسے کہہ سکتا ہے۔ میز پر جمع سارے رشتہ داروں نے بھی ان کی مخالفت کی۔ صرف میں جو ان کی طبیعت کو سمجھتا تھا اورینٹ ایکسپریس میں سفر کے تصور سے بہت خوش تھا۔ لیکن اسی روز دہلی سے پاسپورٹ بن کر آیا اسے دیکھ کر ماموں جان کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ پاسپورٹ پر سے ترکی کا نام کاٹ دیا گیا تھا۔

"ماموں نے دلی جا کر بڑی مشکل سے اجازت حاصل کی۔ لیکن روانگی سے قبل علی گڑھ کے انگریز کلکٹر مسٹر فاؤلر نے ان کو سلام بھیجا۔"

"ماموں جان جب اس سے ملنے گئے اس نے کہا' یہ خیال رکھئے گا ممکن ہے کہ ترکی میں آپ کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔"

تنبیہہ پریشان کن تھی لیکن ....

"میں کیا بتاؤں ان پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ میں نے کہا' سید صاحب سفر طویل بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ کیسی گذرے گی۔ فرمایا' "ترکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے۔ یہ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھئے گا کیسا رقصاں و شاداں واپس آتا ہوں[13]۔"

"ممانی جان لندن روانگی سے قبل چار سالہ مصطفےٰ حیدر کو اس کی خالہ ثروت آراء کے پاس روہتک چھوڑنے گئیں۔ وہاں پہنچ کر بچے کو ایک دم چپ لگ گی۔ ممانی نے جن کے چار خورد سال بچے مر چکے تھے دہل کر ماموں کو خط لکھا' "میں فوراً ولایت نہیں چل سکتی۔ ببو کو میرے جانے کے غم میں چپ لگ گئی ہے۔ وہ ذرا بہل جائے تو دوسرے جہاز سے آجاؤں گی۔ آپ جائیے۔"

"ماموں جان نے تار دیا' "ببو میاں کو ساتھ لے کر اسی جہاز سے چلو۔"

روہتک سے تار آیا' "بچے کو زکام ہو گیا ہے۔ آپ جائیے۔ میں اگلے جہاز سے بچے کے ساتھ آتی

ہوں۔ ناچار ماموں جان تنہا بمبئی روانہ ہو گئے[14]۔"

۴—دوش رفتم بہ تماشائے خرابات فرنگ

S.S AQUIELEA

۲۰ مئی ۱۹۲۴ء

السلام علیکم

آج جہاز پر پانچواں دن ہے۔ دوسرے دن سمندر میں بہت خفیف تلاطم تھا۔ خواتین کو چکر آنے لگے۔ کھانے کے کمرے میں کوئی خاتون نہ آئی۔ سوائے ایک بڑھیا بنگالن کے جو اس قدر مضبوط تھی کہ اس کے شوہر کو چکر آرہے تھے اور وہ مزے سے مٹن چاپ اڑا رہی تھی۔

دلی کے ایک ساہو کار تاجر ہمسفر ہیں "گلاب سنگھ بلاقی داس گوٹے اور کلابتون والے"۔ جہاز پر پارسی اور پارسنیں بہت ہیں۔ اور وہ بڑھیا بنگالن۔ خاوند سفید لمبی داڑھی والا بڈھا ہے۔ میرا خیال تھا پادری ہو گا۔ ڈاکٹر نکلا۔

ڈکسن[15] ہیں۔ مگر وہ ڈکسن جو علی گڑھ میں روزانہ میرے گھر پر آتا تھا اب مجھ سے کم ملتا ہے۔ میں بھی ہندوستانیوں سے مل رہا ہوں۔ ڈیک پر بچے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ مائیں ان کے ساتھ کھیل رہی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر تم اور ببو جی یاد آئے مگر تم مارے احتیاط کے ببو جی کو کھیلنے سے روکتیں۔

فرسٹ کلاس پارسنوں اور ہندو بیبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب دولت ہندوستانیوں کے پاس آرہی ہے یا زیادہ صحیح یہ کہ اب دولت کا صحیح استعمال انھوں نے سیکھ لیا ہے۔ سکنڈ اور تھرڈ کلاس میں عرب ہیں ایرانی ہیں ہندوستانی ہیں۔ اور ایک خستہ حال انگریز مع بیوی بچے کے۔ معلوم نہیں کون ہے۔ کوئی سو بجر ہو گا۔

ببو جی کو اب پڑھانا شروع کر دو۔ تھوڑا تھوڑا کھیل کے ذریعے۔ اور اپنی روانگی کی تیاری کرو۔

بحر پیما دریا نورد

سجاد

۲۴ مئی ۱۹۲۴ء

------ عدن آیا۔ لوگ جہاز سے اتر کر شہر دیکھنے گئے۔ میں نہ گیا۔ عدن میں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ خوف ہوا کہیں پھر بخار نہ آجائے۔ ہم بحر احمر میں داخل ہو گئے۔ شدید گرمی ہے مگر دن بھر ڈیک پر ہوا چلتی رہتی ہے۔

عدن پر تین کشتیاں مسافروں کی ہمارے جہاز پر آئیں۔ عورتیں گوری' انگریزی لباس' اعلیٰ درجے کا فیشن ایبل سوٹ مرد پہنے ہوئے۔ سر پر ترکی ٹوپیاں' میں سمجھا فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں۔ سب تیسرے درجے میں گئے۔ یہ سب یہودی اور یہودنیں تھے۔

۲۶ مئی ۱۹۲۴ء

------ آج صبح سویز پہنچے۔ جہاز سے کوئی پچاس آدمی سویز سے بذریعہ ریل قاہرہ گئے۔ پورٹ سعید میں جہاز پر آجائیں گے۔ میں نہیں گیا۔ طبیعت خراب ہے اور قاہرہ دیکھ چکا ہوں۔ خدا حافظ

ہوٹل میٹروپول۔ نیپلز

یکم جون ۱۹۲۴ء

------ پورٹ سعید سے خط لکھ چکا ہوں۔ وہاں ہم لوگ دو گھنٹے کے لئے اترے تھے۔ چار دن بعد ۳۰ مئی کو جزیرہ سسلی پہنچے۔ اس جزیرہ کو دور سے دیکھ کر اقبال نے کہا تھا۔ وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار ------ اقبال P.&.O. کمپنی کے جہاز سے گئے تھے۔ ہمارا اطالوی جہاز وہاں تین گھنٹے ٹھہرا۔ اتر کر شہر CATANIA کی سیر کی۔ ایک نئی دلفریب دنیا تھی مگر زبان نہ جاننے کی وجہ سے گونگوں کی طرح پھرتے رہے۔ کل ۳۱ مئی صبح آٹھ بجے ہمارا جہاز نیپلز پہنچا۔ بحمد اللہ کہ ہمارا سفر بحر ختم ہوا۔ دلی کے تینوں سوداگر ساتھ ہیں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے۔

کل POMPEII دیکھا۔ شہر کے کھنڈر موجود ہیں۔ کمرے۔ ان کے اندر خم شراب، گھڑے رکابیاں، چراغ۔ باہر سڑکیں۔ بیحد عبرتناک نظارہ تھا۔ VESUVIUS میں سے اب بھی دھواں نکل رہا ہے مگر اسی کے نیچے شہر نیپلز پھر انسانوں نے آباد کر لیا ہے۔ اور اس میں بے خوف و خطر مصروف عیش و زر پرستی ہیں۔

کل صبح دس بجے Roma جائیں گے۔

ڈکسن کا ساتھ یہاں سے چھوٹ گیا۔ اب غالباً لندن میں اس سے ملاقات ہو۔

ہوٹل رائل، روم نمبر ۳۰

۳ جون ۱۹۲۴ء

پرسوں شام چار بجے یہاں پہنچے۔ اس ہوٹل کے مینجر وغیرہ انگریزی بولتے ہیں۔ کل Vatican دیکھا جہاں پوپ رہتا ہے۔ کیا عجیب مقام ہے۔

آج سینٹ پیٹر کا گرجا دیکھا۔ یوروپین بیبیاں شدت سے بت پرستی میں مشغول نظر آئیں۔ سینٹ پیٹر کے پاؤں چومتی تھیں اور آنکھوں سے لگاتی تھیں۔

کلوپیٹرا اور مارک انٹنی کی ملاقات کی ایک بڑی تصویر ایک مشہور قدیم مصور کی دیکھی۔ رومائے قدیم کے دیوتاؤں کے نہایت عمدہ بت لاتعداد یہاں پر جمع ہیں۔

دلی کے آثار قدیمہ سے زیادہ روما کے آثار قدیمہ انسان کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

کل صبح ہم یہاں سے پیرس روانہ ہو رہے ہیں۔ راستے میں Genoa جو اٹلی میں ہے اور Geneva جو سوئٹزرلینڈ میں ہے دونوں کو دیکھنے کا ارادہ ہے۔ خدا حافظ۔

LYONS, FRANCE

11-6-24

السلام علیکم

روم سے خط لکھ چکا ہوں۔ یہاں کے مشہور گرجے دیکھے۔ یہاں کا قبرستان یوروپ بھر میں عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ مردے دفن ہیں اور ان کے بت نہایت عمدہ سنگ مرمر کے اوپر کھڑے ہیں۔

GENOA سے GENEVA پہنچے۔ بے چارہ سلطان جسے مصطفےٰ کمال پاشا نے نظر بند کر دیا ہے، سوئٹزرلینڈ میں آکر پناہ گزین ہوا ہے MANTRAUX میں رہتا ہے۔ اسے بھی جا کر دیکھا۔ مفصل حال زبانی سناؤں گا۔ اسے دیکھ کر بہت ترس آتا تھا[16]۔

سوئٹزرلینڈ سے کل یہاں آئے۔ ہر دوسرے دن نئی زبان ملتی ہے۔ ایک سکے کی قیمت سمجھ نہیں پاتے کہ دوسرا اپنا سکہ جماتا ہے۔ یہاں کے معمولی سے معمولی ہوٹل ہندوستان کے بڑھیا سے بڑھیا ہوٹلوں سے بہتر ہیں۔ آج لیوں میں گوٹے کا ایک بڑا کارخانہ دیکھا۔ ہندوستان کی عورتیں گوٹا لچکا پہنتی ہیں۔ وہ یہاں سے بن کر جاتا ہے۔ عبرت! دہلی کے سیٹھ جو ہمسفر ہیں اسی کارخانے سے گوٹا منگاتے ہیں۔ اس لئے مالک کارخانہ نے بیحد تواضع کی۔ اپنی موٹر میں لے گیا۔ تین گھنٹے تک پھرا کے سارا کارخانہ دکھایا۔

HOTEL MASSILIA

PARIS

۲۰ جون ۱۹۲۴ء

السلام علیکم

ہم اتوار ۱۵ جون کو Lyons سے صبح ساڑھے سات بجے چلے اور پانچ بجے شام پیرس پہنچے۔ دوسرے دن میں ایک سخت مشکل میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں زمین کے نیچے نیچے جو ریل جاتی ہے۔ اس میں کسی جیب کترے نے جیب سے وہ لفافہ نکال لیا جس میں میرا واپسی کا ٹکٹ اور دو سو پانچ پاؤنڈ کا ڈرافٹ تھا۔ صبح مجھے معلوم ہوا کہ جیب سے یہ چیزیں غائب ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسی وقت دوڑا دوڑا ٹامس کک کے دفتر گیا۔ یہ ڈرافٹ میں نے بمبئی سے لیا تھا اور ٹامس کک لندن سے وصول کرنا تھا۔ خوف یہ تھا کہ چور لندن جا کر یہ ڈرافٹ پیش کرے گا اور میرا جعلی دستخط کر کے روپیہ حاصل کر لے گا۔

اسی وقت لندن تار دیا۔ کل وہاں سے جواب آیا کہ ابھی تک چور نہیں پہنچا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اب واپسی ٹکٹ کا معاملہ باقی ہے۔ بمبئی دفتر جہاز کو لکھا ہے۔ اس وقت میں VERSAILLES جا رہا ہوں۔

۱۲ جون

--------- آج بارہ بجے دن کی گاڑی سے ہم لوگ لندن جا رہے ہیں۔ شام کو پہنچیں گے۔

C/o Thomas Cook & Sons

Ludcate Circus

London

23-7-24

-------میں اگلے مہینے قسطنطنیہ جاؤں گا۔ سر علی امام اور لیڈی امام بھی یہاں ہیں۔ کل کھانے پر بلایا تھا۔ وہاں حبیب[17] اللہ بھی تھے۔ برسٹل میں رہتے ہیں۔ مجھ سے کہا اگلے اتوار کو برسٹل آنا۔ مسز حبیب اللہ اور لڑکوں سے ملنا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ مگر اتوار کو بقر عید تھی میں نے سوچا Woking کی مسجد میں مسلمانوں کا اچھا مجمع ہو گا۔ اسے دیکھنا چاہیئے۔ حبیب اللہ کو معذرت لکھ دی۔ وہ ۲۸ جولائی کو لندن آئیں گے۔

ووکنگ کی مسجد میں ہندوستانی' انگریز مسلمان' ترک' عرب' مصری سب تھے۔ خواجہ کمال الدین کے لڑکے نے نماز پڑھائی اور انگریزی میں وعظ کہا۔

حبیب اللہ کہتے تھے کہ لڑکی[18] کو ساتھ لانے کی وجہ سے خرچ بہت زیادہ ہوا اور ایک قسم کی قید بھی رہی۔

بشیر احمد[19] اور مسز بشیر احمد سے یہاں بالکل ملاقات نہیں ہوئی۔ اور سب سے ملنا ہوا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہیں۔ کیمبرج اور اوکسفورڈ بھی ہو آیا۔ آفتاب احمد خاں سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ ان کا لڑکا[20] پاس ہو کر لفٹیننٹ ہو گیا۔ وہ ۱۸ اگست کے جہاز سے ہندوستان جا رہے ہیں۔

ہاں چار دن ہوئے مس پوپ سر علی امام کے ہاں ملی تھیں۔ امریکہ گئی تھیں وہاں سے صرف ایک ہفتے کے لئے لندن آئی تھیں۔ تمہیں بہت پوچھتی تھیں۔

گذشتہ جمعہ کو MARGATE گیا۔ مگر دن بھر بارش ہوا کی۔ شام کو واپس آ گیا۔

نمائش دیکھی۔ بہت عمدہ ہے۔

یہاں کی زندگی ہمارے ملک کی زندگی سے کس قدر مختلف ہے۔ مرد عورت سب کام میں لگے ہوئے ہیں۔ سب کام جو مرد کرتے تھے اب عورتیں کرتی ہیں۔ مزدور پارٹی کا زور ہے۔ مزدور پارٹی کی عورتیں اب مطالبہ کر رہی ہیں قانوناً یہ حق ملنا چاہیئے کہ بچوں کی تعداد اپنے اختیار میں رکھیں۔ دوسری عورتیں اس کے خلاف ہیں اور کہتی ہیں ہمارا قومی فرض ہے کہ ملک کی صحت مند آبادی کو بڑھائیں۔ غرضیکہ خوب بحثیں ہو رہی ہیں۔

لیڈی ڈاکٹروں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس میں ایک ترک ڈاکٹر صفیہ عالی خانم بھی آئی ہوئی ہیں۔

آج شام کو مسز اینی بسنٹ کے پبلک کام کی پنجاہ سالہ جوبلی ہے۔ مسز بسنٹ آئی ہوئی ہیں۔ ان کے ایشیائی اور یوروپین مداحوں کی طرف سے جلسہ ہو گا۔

ویمبلی کی نمائش میں ہندوستانی کثرت سے آئے ہیں۔ اور بعض اپنی ہیئت کذائی سے لندن کا تماشہ بنے ہوئے ہیں۔ لندن نمائش میں ایک "محل حسن" بھی ہے جو پیرز سوپ کمپنی کی طرف سے بنایا گیا ہے۔

تاریخ میں جو مشہور حسین عورتیں گذری ہیں ان کا لباس پہنا کر چند لڑکیوں کو بٹھا دیا گیا ہے۔ دیکھنے والوں سے درخواست کی جاتی ہے اپنی رائے کاغذ پر لکھ کر دیتے جائیں۔ نمبر اول' دوم' سوم' وغیرہ کس کو قرار دیتے ہیں۔ میں نے "کلوپٹرا" کو نمبر اول قرار دیا۔ اس کا کاغذ ملفوف کرتا ہوں۔

یہاں کی زندگی کی جدت اور ندرت کا طلسم بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان ایک قسم کی تھکن محسوس کرنے لگتا ہے اور یہاں کی نفسی نفسی کو دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے۔

لندن

۲۴ جولائی

-------کل شام اس جلسے میں جو مسز بسنٹ کے لئے کیا گیا تھا' گیا۔ کئی ممبران پارلیمنٹ نے جن میں چند خواتین بھی تھیں تقریریں کیں۔ مسز بسنٹ کی تعریف کے پل باندھے۔ سر علی اور لیڈی امام بھی آئے تھے۔

بیحد افسوس ہے کہ تم اب تک یہاں نہیں پہنچ سکیں۔

I,ORMAND MANSION

GREAT ORMANO

STREET,LONDON.

۳۱ جولائی ۱۹۲۴ء

-------مسٹر و مسز حبیب اللہ برسٹل سے پرسوں آئے۔ رات کا کھانا کل ان کے ساتھ کھایا۔ کل مسز حبیب اللہ میرے سامنے آئیں۔ لکھنؤ میں پردہ کرتی تھیں۔ تم کو پوچھتی رہیں۔ اب تو خوب انگریزی بولتی ہیں۔ ایک پورا مکان کرایہ پر لیا ہے۔ میرا اور ان کا ساتھ اب ہندوستان واپسی کے وقت ہو گا۔ وہ وینس سے جہاز پر سوار ہوں گے۔ میں اسی جہاز سے ایک ہفتہ بعد پورٹ سعید سے روانہ ہوں گا۔

کل رات کے کھانے پر مہاراجہ صاحب محمود آباد کے سالے محمد الیاس نے بلایا ہے وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے والے ہیں۔

بارہ بنکی سے غضنفر کا خط آیا ہے' انگلستان آنے والے ہیں۔ مگر مجھ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں اگست کا مہینہ جرمنی' آسٹریا' ہنگری وغیرہ میں گذاروں گا۔ ستمبر قسطنطنیہ اور انگورہ میں۔ ۱۷ اکتوبر کو پورٹ سعید سے اٹلی کے جہاز CRACOVIA میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہوں گا۔ تم بہرحال نہ پہنچیں۔ اب انشاء اللہ انگلستان کے دوسرے سفر میں تم اور چھبو جی ساتھ ہوں گے۔ خدا حافظ

۵— اورینٹ ایکسپریس

ستمبر ۲۴ء میں اسی جہاز CRACOVIA سے عبدالرحمن صدیقی اور خواجہ عبدالمجید کے بھتیجے عبدالحمید یوروپ روانہ ہوئے۔ اے۔ حمید کیمسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے برلن جا رہے تھے جہاں ذاکر حسین

خاں اور سید عابد حسین سال بھر قبل سے حصول تعلیم میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر تارا چند برلن اسکول آف فارن لنگویجز میں اردو پڑھا رہے تھے۔ پرانے انقلابی ڈاکٹر غفار خیری 'ستار خیری' مولوی برکت اللہ اور یلدرم کے ایم۔ اے۔ او کالجیٹ اسکول علی گڑھ کے ہم جماعت راجہ مہندر پرتاب بھی برلن میں ڈنے ہندوستان آزاد کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ یہ لوگ ان سرپھرے نوجوانوں میں سے تھے جو ۱۹۱۴ء سے قبل سے یوروپ اور امریکہ جاکر آزادی وطن کے لئے پر خطر جدوجہد کرتے اور جلاوطنی و ناداری کے مصائب بخوشی برداشت کرتے تھے۔

"میرے پیارے ہم خیال بھانجے عثمان۔ اس وقت اورینٹ ایکسپریس کی رفتار بالکل ایک سو بیس میل ہے۔ کہیں کہیں ذرا کم ہو جاتی ہے۔ رفتار کا میٹر سامنے لگا ہوا ہے۔ اور تم بہت یاد آرہے ہو۔ کیونکہ میرے اس ٹرین پر سفر کرنے کی خوشی صرف تم کو تھی۔"

اورینٹ ایکسپریس[21] بہت جلد ایک پراسرار افسانوی اور رومینٹک چیز بننے والی تھی جس کی پیرس سے قسطنطنیہ تک کی مسحور کن مسافت کے متعلق ناول لکھے جاتے ہیں اور فلم بنتے ہیں۔

قسطنطنیہ یونیورسٹی میں وزیر تعلیم خالدہ ادیب خانم کی فرمائش پر بزبان ترکی ایک لیکچر "ترکیہ --- کل اور آج" دیا' جو پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد بذریعہ ریل انگورہ --- افیون --- مولانا روم کا قونیہ۔

داغستان تارس وسایلیشیا کے صنوبروں میں سے گزرتی ہوئی ٹرین جنوب مشرقی اناطولیہ کے شہر ادانہ پہنچی جہاں زمانہ بغداد کے "نوجوان ترک" دوست فخری بے اب بحیثیت جنرل فخری پاشا ملٹری گورنر تھے۔

وزیراعظم رؤف پاشا کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے یلدرم جس وقت ادانہ ریلوے اسٹیشن پر اترے پلیٹ فارم پر فوجی بینڈ اور استقبالیہ کمیٹی موجود پائی۔ سوچے کوئی غیر ملکی وی۔ آئی۔ پی اسی ٹرین پر یوروپ سے آیا ہوگا۔ اتر کر ایک طرف کو ہو گئے۔ بینڈ بجنا شروع ہوا۔ متوقع رہے کہ اب یوروپین وی۔ آئی۔ پی ٹرین سے اترے گا۔ جنرل فخری پاشا نے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ تعجب سے دریافت کیا۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ کو غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مجھے کوئی اور شخص سمجھ کر یہ دھوم دھڑکا کر رہے ہیں۔

بعد ازاں ادانہ ملٹری کالج میں استقبالیہ جلسہ ہوا۔

ادانہ سے حلب' دمشق' بیروت' ۱۶ اکتوبر کو پورٹ سعید۔ سوائے دو پکچر پوسٹ کارڈوں کے برلن سے ادانہ تک کے سارے خطوط تلف ہو چکے ہیں۔

ہندوستان واپس پہنچ کر بوجہ منکسرالمزاجی کسی سے ادانہ کے واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ہمدرد کے نامہ نگار مقیم قسطنطنیہ نے خبر بھیجی جو مولانا محمد علی نے شائع کی۔

لندن تک ہر خط میں بی بی سے پوچھا کیے تم مع چھبو میاں کب تک پہنچ رہی ہو تاکہ میں اسی لحاظ

سے آئندہ پروگرام بتاؤں۔ لیکن یہاں حسب معمول زبردست کنفیوژن پھیلا ہوا تھا۔

روہتک میں مصطفٰے حیدر عرف چھبو میاں کا نزلہ اچھا ہوا تو ان کی خالہ ثروت آرا بیمار پڑ گئیں۔ نذر باجی ان کو فوراً سولن لے گئیں۔ وہاں مراد آباد سے چچا غضنفر علی نقوی عرف لڈن میاں اپنے بیاہ میں لے جانے کے لئے آن پہنچے۔ فوراً ان کے ساتھ رات کی گاڑی سے روانہ ہوئیں۔ ٹرین میں جھبا جھب سہرا تصنیف کیا"

نوشہ بنا غضنفر' چمکے فلک پہ اختر جھک جھک کے چومتا ہے کیا ماہتاب سہرا

صبح چار بجے چوک لانکڑی والا پہنچے۔ نوشہ کے والد ڈپٹی اصغر علی کے مکان میں سوتا پڑا تھا۔ صحنوں اور دالانوں میں قطار اندر قطار پلنگ بچھے تھے۔ ابر گھرا کھڑا تھا۔ اذان سے پہلے پہلے سارے گھر میں جاگ ہو گئی۔ شادی کا ہنگامہ شروع ہوا دوسرے روز مرد بارات لے کر ردولی روانہ ہوئے۔ چودھری محمد علی کی گلرو اور "فرفر انگریزی بولتی" بنی زہرا کو رخصت کرا کے لائے۔

نذر باجی سولن واپس پہنچیں تو ثروت نے کہا' "باجی لاہور سے بھائی حمید علی کا تار آیا ہے۔ میں انگلستان روانہ ہو رہا ہوں فوراً میرے ساتھ چلی چلئے۔ پھوپھا یوروپ میں جس جگہ ہوں گے وہاں پہنچا دوں گا۔"

جھٹ پٹ رخت سفر باندھنا شروع کیا کہ مراد آباد سے نوشہ میاں لڈن کا خط پہنچا۔ بیرسٹری پڑھنے لندن جا رہا ہوں فوراً ہمراہ چلی چلئے۔ اتنے میں ثروت آرا پھر بیمار پڑ گئیں۔ ساتھ ہی زوروں کا طوفان آیا۔ سولن کے پہاڑ منہدم ہوئے۔ مکان گر گئے۔ شملہ کالکا ریلوے لائن بہہ گئی۔ سڑکیں بند ہو گئیں۔

جب تک راہیں کھلیں کھلیں میاں کا خط انگورہ سے موصول ہوا فلاں تاریخ ہندوستان کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ دونوں بہنیں واپس روہتک پہنچیں۔

سہری کھائے لی جا رہی تھی۔ میر افضل علی جو لڑکپن سے بہنوئی کی ہیرو ورشپ کرتے آئے تھے خوش خوش کمرے میں داخل ہوئے' "بمبئی سے بھائی جان کا تار آیا ہے۔ رضا اللہ صاحب کے ہاں دلی پہنچ رہے ہیں۔"

کوچہ پنڈت کے اندر حویلی شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ مرحوم کے صحن میں ان کی بہو سلطانہ رضاء اللہ چبوترے پر بیٹھی وضو کر رہی تھیں۔ باہر دیوان خانے میں انجینئر رضاء اللہ (جو مخزن میں مزاحیہ مضمون لکھا کرتے تھے) اور میر افضل علی بمبئی سے آنے والی ٹرینوں کے اوقات دیکھنے کے لئے ٹائم ٹیبل کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ صدر دروازے پر کھٹکا ہوا۔ مردانے سے رضاء اللہ کے زوردار قہقہے کی آواز آئی۔[22]

۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو علی گڑھ واپس پہنچے۔ رشید احمد صدیقی نے کہا۔ "سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ جسم میں توانائی' چہرے پر بشاشت اور سرخی آگئی تھی۔ میں نے پوچھا' "ترکی میں کوئی تبدیلی پائی؟" فرمایا' "شروع سے آخر تک تبدیلی

ی تبدیلی نظر آئی [23]۔"

۶—جنرل فخری پاشا کی ڈولی

۱۹۲۵ء میں رجسٹرار شپ کی پنج سالہ معیاد ختم ہونے پر یلدرم دوبارہ رجسٹرار منتخب کیے گئے۔ اسی سال جامعہ ملیہ دلی منتقل ہوا۔ ترکی میں قیام جمہوریہ کی وجہ سے تحریک خلافت کمزور پڑ چکی تھی، لیکن سودیشی اور کھادی کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ نذر سجاد حیدر چند سال سے کھادی کی ساریاں پہن رہی تھیں۔ سید مصطفےٰ حیدر کے لئے ایک آئیرش بڑھیا مس کیتھلین چیو بطور گورنس مقرر تھی، جو بذریعہ مس آمنہ پوپ (جو ایک نو مسلم انگریز خاتون تھیں) کہیں سے منگوائی گئی تھی۔ مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار، کھانا اور کھادی کے فراک۔ وہ خود ایک سخت آئیرش اور ہندوستان پرست ضعیفہ تھی۔

ہفتہ وار قوم [24] دہلی۔ ۲۰ نومبر ۲۵ء

ہز ایکسلنسی فخری پاشا اور بیگم فخری پاشا کا علی گڑھ میں ورود

(از جناب منظور زہرا صاحبہ بنت ظہور الحسنین رضوی مرحوم)

پرسوں ۱۴ نومبر، دس بجے دن کے ہز ایکسلنسی اچانک بے خبر یہاں تشریف لائے۔ اپنی موٹر کار پر جو انہیں کابل سے یہاں لائی ہے۔ رجسٹرار صاحب کی کوٹھی پر تشریف لائے...... سب موٹر سے اتر کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ ملازم نے جو نئی وضع کی بیوی دیکھی نذر سجاد صاحبہ کو یہ خبر دی کہ ایک سیاہ پوش بیوی ہیں مگر منہ کھلا ہے اور رنگ میموں کا سا ہے........ پھر تو بے حد خوشی ہوئی کہ ایک ترک بیگم کی زیارت نصیب ہوئی۔ مگر بڑی دقت یہ تھی کہ دونوں آپس میں گفتگو نہیں کر سکتی تھیں۔ خیر جس وقت تک سجاد حیدر صاحب موجود رہے ترجمانی کرتے رہے۔ جناب فخری پاشا تو فارسی جانتے ہیں..... اس کے بعد اشاروں میں یا ایک دو فارسی اور انگریزی الفاظ کی مدد سے کچھ باتیں ہوئیں۔ خانم صاحبہ نے ہندوستان کے شدید پردے پر سخت تعجب و اظہار افسوس کیا اور فرمایا کہ ہندوستان پہنچ کر آپ پہلی مسلمان خاتون سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ نذر سجاد صاحبہ نے کہا۔ آپ کو لاہور میں بہت سی تعلیم یافتہ بیویاں ملتیں مگر آپ تو خاموشی کے ساتھ ہوٹل میں وہاں کا وقت گزار کر تشریف لے آئیں۔

لباس بالکل انگریزی قطع کا تھا۔ فراک جس پر سیاہ لمبا اوور کوٹ، اور سر پر، چونکہ سفر میں تھیں، سیاہ کریپ کا رومال لپٹا ہوا تھا جس کو اپنے خیال میں برقعہ سمجھ کر حامیان پردہ ذرا مطمئن ہو گئے تھے۔ اگر کوئی ہندوستانی مسلمان بیوی اس طرح یونیورسٹی کو دیکھنے آتیں تو ہمارے اکابرین قوم یقیناً پولس سے ذلیل

کرائیں اور یونیورسٹی کے احاطے میں قدم نہ رکھنے دیں اور بس چلے تو پھانسی دے دیں۔ مگر اب خاموش تھے۔ عالی جناب فخری خانم صاحبہ بہت سے اہالیان یونیورسٹی کے ساتھ کھلے منہ معائنہ فرماتی پھر رہی تھیں اور کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ سنا ہے کہ خانم صاحبہ نے خاص خاص اصحاب سے ہاتھ ملائے۔ میں سوچتی ہوں کہ اس وقت ان صاحبوں کے دلوں پر کیا گزری ہو گی۔ شاید دل اور ہاتھ خدا کے قہر و غضب کے خوف سے لرز رہے ہوں گے کہ ایک مسلمان خاتون کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ہے جن کے خیال میں نبض دکھانے کے لئے پردہ نشین کا ہاتھ حکیم کے ہاتھ میں دینا بھی گناہ عظیم ہے۔

آج کل میں مسلم یونیورسٹی اور گرلز اسکول دیکھنے کے لئے علی گڑھ آئی ہوئی ہوں مگر اب تک عمارات کالج نہیں دیکھ پائی۔ رات کو بھی سہم سہم کر نکلنا ہوتا ہے۔ مسجد تک دیکھنا مشکل ہے۔ لوگ ٹوکتے ہیں۔

جنرل فخری پاشا ان دنوں کابل میں ترکی کے سفیر تھے۔ علی گڑھ میں ان کی بے اطلاع آمد پر یلدرم نے یونیورسٹی میں ان کا شاہانہ استقبال کروایا۔ جنرل صاحب نے یونین میں لیکچر دیا۔

نذر سجاد نے جو اپنی مہمان نوازی کے لئے مشہور تھیں، صبح و شام یوروپین اور ہندوستانی ڈشیں یکساں تعداد میں تیار کروائیں۔ اور ان کی چچازاد بہن منظور زہرا نے فن طباخی کے کمالات دکھائے۔

وہ ترک غازی برآمدے میں کھڑا چرٹ پیتا تھا کہ سامنے سڑک پر ایک سرخ پردوں والی ڈولی جاتی نظر آئی۔ سوچا ٹروپیکل انڈیا کا کوئی عظیم الجثہ پرندہ پنجرے میں چڑیا گھر لے جایا جا رہا ہے۔ ترکتازی سے ایک زقند بھر کے "اسٹاپ --- اسٹاپ" چلاتا پھاٹک کی سمت دوڑا۔

کہاروں نے دیکھا ایک گورا صاحب لال مونچھوں والا روکنے کا حکم دے رہا ہے۔ گھبرا کر پالکی فوراً زمین پر رکھ دی۔ جنرل "مری۔ مری۔" کہہ کر لپکا اور پردہ اٹھایا۔

اندر بیٹھی بی بی نے جو ایک نوکیلی مونچھوں، نیلی آنکھوں والی وجیہہ صورت کا کلوز اپ ڈولی کے اندر دیکھا تو بجائے "عجب تیر و کمال ترکانہ [illegible]" کہنے کے دہل کر زور سے چیخیں۔ ترک فاتح ان سے زیادہ متحیر ہو کر پیچھے ہٹا۔ حواس باختہ مکان کے اندر جا کر خاتون خانہ سے کہا۔---- "خانم۔ ترکیہ کے تاریک ترین دور میں بھی عورتوں کو پنجروں میں بند نہیں کیا گیا۔"

بعد ازاں وہ مرد غازی مع خانم تاج محل ملاحظہ کرنے آگرہ روانہ ہو گیا۔

کانوکیشن اور سالانہ نمائش کے زمانے میں رجسٹرار ہاؤس میں مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے احاطے میں خیمے لگا دیئے جاتے تھے اور مس کیتھلین چیو پھرکی کی طرح گھومتی تھیں۔ جلسہ تقسیم اسناد ایک عظیم الشان، روح پرور، ولولہ خیز تقریب تھی۔ نقاب پوش چانسلر، وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار کار چوبی چوغوں میں ملبوس جلوس کی صورت میں وقار سے چلتے ڈائس پر پہنچتے۔ خطبہ عربی میں پڑھا جاتا۔ اس پر شکوہ نظارے سے متاثر ہو کر اکثر حاضرین اشکبار ہوتے۔

لیکن کانوکیشن کی اس تقریب میں بحکم علمائے کرام خواتین کی شرکت منع تھی۔

بخدمت جناب وصل بلگرامی صاحب 'ایڈیٹر ماہنامہ "مرقع"۔ لکھنؤ

جناب[25] اڈیٹر صاحب۔ میرا دل جلتا اب بند ہو چکا ہے یا اس قدر جلا ہے کہ اب خاک میں آگ لگ ہی نہیں سکتی۔ مردوں سے الجھنا میرا کام نہیں لیکن مولانا صاحبان کمزور بے زبانوں کو گالیاں تک دے دیتے ہیں۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ علی گڑھ میں کانوکیشن کے موقع پر پردہ کا انتظام نہیں کیا جاتا؟ مولانا حضرات کا کہنا ہے کہ اگر بیبیاں برقعہ پہن کر آئیں بذریعہ پولس نکالی جائیں گی۔ ان مولاناؤں کے خوف سے ارباب یونیورسٹی پردے کا بندوبست نہیں کرسکتے۔ اس مختار کل فرقے سے الجھنا بے سود ہے۔ خواہ مخواہ جمعیت العلماء کے ممبروں کے دوبدو ہو کر گنہگار ہونا ہے۔ وہ خود ہمارا احترام کریں نہ کریں علماء واجب التعظیم ہیں۔ وہ ہمارے شرعی حقوق آزادی سے خوب واقف ہیں مگر مصلحتاً ہمارا آزادانہ مساوات سے علم حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ مولانا مسعود الرحمن ندوی بھی نہیں چاہتے۔

"مولانا! آزاد نویس خواتین نہیں چند نقاب پوش مرد ہیں جو بیہودہ مضامین فرضی ناموں سے لکھ کر اس بے زبان صنف پر لعنت ڈلواتے ہیں۔ بھائی اختر شیرانی نے بہارستان کی تازہ اشاعت میں ان برقع[26] پوش حضرات کے نقاب الٹ دیئے ہیں۔

بہرحال مولانا میں اپنے خیالات کی اشاعت ضرور کروں گی۔ مچھلیاں بھی کسی وقت پانی سے سر نکال لیتی ہیں۔ ہمیں یہ بھی منع ہے۔ والسلام

نذر سجاد حیدر

پنجروں سے نکل کر اکا دکا محبوس چڑیا بی اے' ایم اے کا امتحان دینے علی گڑھ آنے لگی تھی اور رجسٹرار ز ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پرچے کرتی تھی۔ نذر سجاد بطور INVIGILATOR خاموش پاس بیٹھی سویٹر بنتی رہتی تھیں۔ گھڑی سامنے رہتی تھی۔ کیا مجال جو گھریلو معاملہ سمجھ کر لڑکی مزید چند منٹ کی اجازت مانگ لے۔ علی گڑھ کی پہلی ایم اے حیدر آباد کی پاشا صوفی بیگم تھیں۔

پرچے یونیورسٹی سے بہت دور رازداری کے ساتھ چھپوائے جاتے تھے۔ ہر سال رجسٹرار صاحب اس مقصد کے لئے چپکے سے مدراس یا بمبئی جاتے۔ ۱۹۲۵ء میں مع بیگم اور اسسٹنٹ رجسٹرار ابوالحسن بمبئی گئے۔ کار کا حادثہ ہوا۔ کئی ہفتے سینٹ جارج ہسپتال میں داخل رہے۔ علی گڑھ واپس آکر گرمیوں کی تعطیلات میں چھوٹے بھائی نصیر الدین حیدر کے ہاں دہرہ دون گئے اور ڈالن والا میں ایک وسیع اور خوبصورت کوٹھی خرید کر اس کا نام آشیانہ رکھا۔ حکومت نے انکم ٹیکس کے دفتر کے لئے اس کا آدھا حصہ ایک سو پچیس روپے ماہوار پر لے لیا۔ آدھے حصے میں بھائی منتقل ہوئے۔ ان کی بچیاں عذرا' حمیرا' زہرا مع اپنی ہم عمر خالہ نفیسہ جیزس اینڈ میری کانونٹ میں داخل تھیں۔ سیاہ یونیفارم سیاہ موزے پہن ہیٹ لگا اسکول جاتی تھیں۔ پہلا سازمانہ ہوتا اب تک پردے میں بٹھال دی گئی ہوتیں۔

اسی موسم گرما میں مسوری کے سوائے ہوٹل میں چند مسلمان خواتین بال روم میں رقصاں نظر آئیں۔ "عوام ایسے ہی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم اور بے پردگی کے خلاف ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کو کالجوں اور اسکولوں سے اٹھا چکے ہیں۔ مسلمان عورتوں کے بال روم میں ناچتے دیکھ کر سخت افسوس ہوتا۔ آخر تفریح کے اور بھی ہزار طریقے ہیں۔ سیروشکار' ٹینس' اسکیٹنگ' گالف۔"

نذر سجاد حیدر نے لکھا۔ ان کا اور ان کی ساتھی مصلحین کا مخاطب عموماً وہ طبقہ تھا جو "ٹینس اسکیٹنگ اور گالف" کے مشاغل اختیار کرسکتا تھا۔

یلدرم گاہے بگاہے کامریڈ میں جمہوریہ ترکی کے متعلق کالم لکھتے تھے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۲۵ء کے روز دہلی میں کامریڈ اور ہمدرد کی سالگرہ منائی گئی جس میں حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر انصاری اور سروجنی نائیڈو نے شرکت کی۔ لیکن ملکی سیاست کے دھارے تیزی سے بدلتے جارہے تھے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۲۵ء کو مولانا محمد علی نے پہلی بار ہندو مسلم اختلاف پر جامع مسجد دہلی میں تقریر کی۔ گو "شدھی سنگھٹن" کے مقابلے میں "تحریک تبلیغ و تنظیم" کی مخالفت فرمائی۔ جدوجہد آزادی کے سمبل کی حیثیت سے آل انڈیا خلافت کمیٹی ابھی زندہ تھی مگر اس کے فنڈ میں روپیہ ختم ہوچکا تھا۔

مراد آباد میں جب مولوی سر محمد یعقوب کی بہن سے قاضی عبدالغفار کی شادی ہوئی تھی دولہا میاں نے سلامی کا سارا روپیہ خلافت فنڈ کے لئے مولانا شوکت علی کی نذر کردیا تھا۔ اب ہندی مسلمان جمہوری ترکی اور مصطفےٰ کمال کے عشق میں مبتلا ہوچکے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی محمد یعقوب جو وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے وائس پریذیڈنٹ تھے' کسی سرکاری کام سے لندن گئے۔ واپسی میں مصطفےٰ کمال پاشا کی زیارت کی آرزو لے کر انگورہ پہنچے۔ تعارفی خطوط برطانوی وزیر اعظم اور برطانوی سفیر متعینہ ترکی سے حاصل کرچکے تھے۔ اتاترک اس زمانے میں بے حد مصروف تھے اور بلا ضرورت لوگوں سے ملتے نہ تھے۔ مولوی صاحب نے یلدرم کو لکھا: "بھائی میرے۔ میری یہ آرزو کسی طرح تم ہی پوری کروادو۔" رؤف پاشا کی جگہ اب عصمت انونو وزیر اعظم تھے۔ یلدرم نے عصمت انونو' جنرل فخری پاشا اور وزیر تعلیم خالدہ ادیب خانم کو خط لکھے۔ تینوں نے سر یعقوب کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ عصمت انونو کی سفارش پر کمال اتاترک نے خصوصی ملاقات کا شرف مولوی صاحب کو بخشا۔

"بھائی میرے غازی مصطفےٰ کمال پورے بیس منٹ مجھ سے ہم کلام رہے۔" مولوی صاحب نے غلامستان ہند واپس آکر احباب سے کہا۔ دلی میں اسمبلی کا ایک معرکتہ الآرا اجلاس ہو رہا تھا جس کی وجہ سے سر یعقوب کا گھر مسافر خانہ بنا ہوا تھا۔ مرحوم اپنی زندہ دلی اور خوش اخلاقی کے لئے مشہور تھے۔ سارے مہمانوں کو پکڑ پکڑ کر اتاترک سے ملاقات کا قصہ اس طرح سناتے گویا اللہ میاں سے مل کر آرہے ہیں۔

"ان کے زمانے عجیب۔ ان کے فسانے عجیب۔ اے خوانین اردوئے جدید۔ یاد رکھنا۔ یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔" تاجک نژاد داستان گو نے ایک آہ سرد بھر کر بجھتے الاؤ کی چنگاریوں پر پھونک مارتے

ہوئے کہا۔

۷ — چوروں کا کلب

چچا ظفر عمر مرحوم کیا کیا ناول لکھ گئے۔ "بہرام کی گرفتاری" "نیلی چھتری" "لال کنھور" "چوروں کا کلب۔" خود نواح علی گڑھ میں دیہاتی چوروں کی ایک منڈلی قائم تھی جس کے اراکین گھپ اندھیری راتوں میں یونیورسٹی پہنچ کر نقب زنی کیا کرتے تھے۔ نذر سجاد حیدر کے ہاں علی گڑھ کے آٹھ سالہ قیام میں سات بار چوری ہوئی۔ لیکن عجیب طبیعت پائی تھی۔ رات کو ڈریسنگ روم کا بیرونی دروازہ اکثر چوپاٹ رہتا تھا تاکہ تازہ ہوا اندر آتی رہے۔ اسی ڈریسنگ روم میں صندوق رکھے رہتے تھے۔ متواتر چوریوں کے باوجود ان کو کسی محفوظ کمرے میں منتقل نہ کیا گیا۔

آخری چوری میں سارے کپڑے نکل گئے۔ صرف لباس شب خوابی بچا جو پہنے ہوئے تھیں۔ صبح کو پہننے کے لئے مسز بٹ نے اپنے کپڑے بھیجے۔ خالی سوٹ کیس کوٹھی کے پیچھے کھیت میں ادھر ادھر پڑے ملے۔

پھر ایک گریجویٹ چور آیا۔

اماوس کی ایک خنک رات پھونس والے بنگلے پر عجیب قسم کا سناٹا طاری تھا۔ سارا گھر تاریک پڑا تھا۔ صرف آفس روم میں روشنی جل رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھٹ کھٹ کی آواز آجاتی تھی۔

ساڑھے بارہ کا عمل رہا ہو گا۔ جب دو نوجوان احاطے میں داخل ہوئے۔ برآمدے میں پہنچ کر سائیکلیں دیوار سے ٹکائیں۔ پائجامے کے پائینچے سے کلپ نکالتے ہوئے ایک نوجوان نے کہا، "بڑے ابا یہ آدھی رات کو کیا کھڑپڑ کر رہے ہیں۔"

"بھائی جان شاید کوئی تاکہ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" دوسرے نوجوان الن میاں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "چپکے سے کھسک لو، دیکھ لیا تو دیر میں لوٹنے پر پھر ڈانٹ پڑے گی۔"

"اماں مشاعرے ہی میں تو گئے تھے۔" پہلے نوجوان سید سعید الدین حیدر نے کھس پھس کی۔

اچانک الن میاں ایک جست لگا کر آفس روم کی سمت لپکے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر جا کر کھڑکی میں جھانکا اندر ایک شخص مفلر میں سر منہ لپیٹے آہنی الماری کا تالہ توڑنے میں بے طرح منہمک تھا۔ الن میاں نے یا علی کہہ کر کے کھڑکی توڑی اور غڑاپ سے اندر۔ چور سے ہاتھاپائی شروع۔ یونیورسٹی کا منحنی سا طالب علم بوکھلا گیا۔ اتنے میں سعید حیدر بھی اندر کود آئے۔ دونوں نے مل کر چور کو رسی سے باندھا۔ سعید میاں نے سرعت سے اندر جا کر بڑے ابا کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ خاموشی۔ گھبرا کر بڑی اماں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اور پھوپھی جی دونوں انٹا غفیل تھے۔ بڑی اماں کے بیڈ روم سے ملحق مس کیتھلین چیو کا کمرہ تھا۔ بڑی بی رات کو تلاوت انجیل مقدس کے بعد سوتی تھیں۔ وہ اس وقت کھلی ہوئی ضخیم بائبل پر سر ڈالے سنا رہی تھیں۔ سعید میاں نے ہڑبڑا کر باری باری سب کو جھنجھوڑا۔ حواس باختہ باہر

بھاگے۔ سائیکل پر بیٹھ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ہوا ہو گئے۔ اس اثنا میں الن میاں شاگرد پیشے سے ملازموں کو جگا کر لائے۔ پولس بلوائی۔

شخص نامعلوم نے کسی ترکیب سے شام کو پینٹری میں پہنچ کر پانی کے اس جگ میں خواب آور سفوف ملا دیا تھا جو مقصود بیرہ کھانے کی میز پر لے جانے والا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گھر کے نوجوان لڑکے سرشام سے یونین کے مشاعرے میں جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا اگر یہ سفوف ذرا زیادہ مقدار میں پڑ گیا ہوتا کوئی فرد صبح قیامت تک نہ جاگتا۔

اس آہنی الماری میں ایم اے کے سالانہ امتحان کے پرچے مقفل تھے۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ حسب معمول یلدرم کے پسندیدہ نوجوان خواجہ غلام السیدین، خواجہ منظور حسین اور جلیل احمد قدوائی صبح سے آگئے۔ اس غیر معمولی واقعے پر خیال آرائی کرنے کے بجائے اتوار کے معمول کے مطابق ان نوجوانوں میں سے ایک سے کہا۔ "آیئے جناب اب کاغذ قلم لے کر بیٹھ جایئے۔" اور حسب عادت ٹہل ٹہل کر ایک کتاب دیکھتے گئے اور برجستہ ترجمہ لکھوانا شروع کیا۔ "جلال الدین خوارزم شاہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

۸ — آرکیڈیا

صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ دن ڈھلے بادلوں کی دھند چھٹی۔ بندوقیں سنبھالے پانچ لمبے تڑنگے شکاری نالے کی پلیا پر نمودار ہوئے۔ چند قدم چل کر ایک گل پوش ولا کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ ان کے فل بوٹ اور چار خانے کیپ اور برساتیاں پانی میں بھیگی ہوئی تھیں۔ پیچھے پیچھے ایک ملازم مرغابیوں کا تھیلا اٹھائے آرہا تھا۔

عین اسی وقت ولا کے عقبی اور جنوبی پگڈنڈی پر چلتی چار خواتین نفاست سے ریشمی چھتریاں سنبھالے باغ میں پہنچیں۔۔۔ انہوں نے ریشمی ملبوسات اور ریشمی موزے اور رنگ برنگے موتیوں اور نقلی پتھروں سے مزین اونچی ایڑی کے سبک ولایتی جوتے پہن رکھے تھے اور چلنے میں ان کے لباس نم گھاس پر سرسراتے تھے۔ دور پہاڑوں پر بارش کی دھند کا سنہرا غبار اٹھ رہا تھا۔ اور ہوا میں تازہ خوبانیوں کی مہک تھی۔ قریب کے بنگلے میں ایک بل ٹیریر بھونکا۔

فضا کیتھرین مینسفیلڈ یا ایلزبیتھ بوون کے افسانوں کی سی ہے۔ اگر آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ برطانوی عہد کا سرحدی شہر ایبٹ آباد ہے تو آپ بگل بجاتے سرخپوش شہسواروں اور ان کے آگے آگے لومڑیوں کے تعاقب میں دوڑتے ہاؤنڈز کے ضرور متوقع ہو سکتے ہیں اور ویبر کی موسیقی کے بھی۔

لیکن شکاری خان بہادر میر نذر الباقر، ان کے بھتیجے آل حسنین اور ظہور العسکری اور کزن لڈن اور الن تھے نفیس خواتین نذر زہرا، ثروت آرا، منظور زہرا اور ان کی پھوپھی اکبری بیگم جو پڑوس میں

مرزا سکندر علی اور بیگم کے ہاں "لیڈیز ٹی پارٹی" میں ککمبر سینڈوچ کھا کر اور بلجین لیس کے نیپکن سے انگلیوں کی پوریں پونچھ کر واپس آ رہی تھیں۔ مرزا صاحب جو کچھ عرصہ قبل تک علی گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ رہے تھے ان دنوں ایبٹ آباد میں تعینات تھے اور ربع صدی بعد بازی گر زمانہ انہیں نئی مملکت پاکستان کا گورنر جنرل اور پریذیڈنٹ بنانے والا تھا۔

ایک فورڈ موٹر باہر آن کر رکی اور صاحب خانہ میر افضل علی گھر میں داخل ہوئے۔

بادل چھٹے' شکاری لوگ ہاتھ منہ دھو کپڑے تبدیل کر برآمدے میں نکلے۔ غلام حسین نے کینوس کی کرسیاں باہر گول چبوترے پر رکھیں۔ اکبری بیگم نے باورچی خانے میں جا کر مرغابیاں بھنوائیں۔ پڑوس کی کوٹھی سے سفید ریش میجر کلدیپ سنگھ کو بلوایا گیا۔ نوجوان غیر شادی شدہ اور انٹرنس کی طالب علم منظور زہرا بنت ظہور حسنین مرحوم نے کافی بنا کر میجر صاحب کو پیش کی۔ ان کے بڑے ابا میر نذر الباقر جو آج سے صرف بیس برس قبل کنواری لڑکیوں کی تصویر کھنچوانا گناہ عظیم سمجھتے تھے خوش و خرم بیٹھے چرٹ پیا کیے۔ بازی گر زمانہ خیالات اور نظریات بدل چکا تھا۔

میجر کلدیپ سنگھ نے مرغابی کی ایک ٹانگ سگار کی طرح منہ میں ٹھونس کر لڈن میاں سے کہا' "برخوردار اب ایک شاندار غزل ہو جائے۔" تو اندر سے ہارمونیم منگوایا گیا۔ لڈن اور الن دونوں بھائیوں نے تھیٹر کی تازہ ہٹ' غزل شروع کی۔

تو وہ گل خوبی ہے اے جلوہ جاناں
ہر گل ہے ترا بلبل ہر شمع ہے پروانہ

یونانی اساطیر میں جنت ارضی کو آرکیڈیا کہتے تھے جو یونان قدیم کے ایک پہاڑی ضلع کا نام تھا۔ آرکیڈین مناظر یوروپین نشاط ثانیہ کے مصوروں کے محبوب موضوع رہے۔ طمانیت اور سکون کامل کی کیفیت کے لئے انگریزی میں ایک دلچسپ اصطلاح "ہونکی ڈوری" استعمال کی جاتی ہے۔ یونانی آرکیڈیا کے باسی مستقل ہونکی ڈوری رہتے تھے۔ اسی عالم میں چبوترے پر کھانے کے بعد صبح تین بجے تک قوالی ہوا کی۔ چاند سرو کے درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ میر افضل علی چپکے سے نماز تہجد کے لئے چلے گئے جو وہ نو برس کی عمر سے پڑھتے آئے تھے۔

صبح صبح علی گڑھ سے بھائی سجاد حیدر آن پہنچے۔ ڈرائنگ روم کے دریچے پر خوبانی کا درخت جھکا ہوا تھا۔ جس کی ایک شاخ ذرا خم کرو تو اندر آجاتی تھی۔ آٹھ سالہ مصطفےٰ حیدر بریکفاسٹ کے وقت اس شاخ کو اندر کھینچ لیتے اور خوبانیاں توڑ توڑ کر سب کو دیا کرتے۔

مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے شام کی چاء کے لئے ثروت آرا بیلوں سے ڈھکے برآمدے میں چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں اس طرح لگواتیں جیسے انگریزی ہوٹلوں میں ہوتی ہیں۔ ہر میز پر پھولوں سے بھری ٹوکری نما گلدان دھرا ہوتا۔

ہفتہ بھر بعد بھائی سجاد ہندوستانی اکیڈمی کے سالانہ اجلاس کے لئے الٰہ آباد روانہ ہو گئے۔ لڈن' الن' حسنین' منظور زہرا اور نذر باجی نے "ہندوستان" واپس جانے کی تیاری کی۔

پاپا یعنی بوڑھے میر نذر الباقر فوج سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ چھوٹی بیٹی اور داماد کے پاس رہتے تھے۔ کیونکہ داماد ان کا سگا بھانجا تھا۔ اور کہاں جاتے۔ بیٹا مصطفےٰ باقر زندہ ہوتا تو اس کے پاس رہتے۔

جس وقت عزیز' حویلیاں ریلوے اسٹیشن روانہ ہو رہے تھے ساس بہو اکبری بیگم اور ثروت آرا برآمدے کے ستون سے لگی آنسو بہایا کیں۔ شاید ان کی چھٹی حس کو معلوم ہو گیا تھا کہ ایسا خوشگوار وقت دوبارہ نہیں آئے گا۔

فروری میں پاپا بہن اور چھوٹی بیٹی کے ہمراہ نمائش کے لیے علی گڑھ آئے۔ اتوار کے روز شکار کھیلنے سکندرہ کی طرف جایا کرتے۔ ایک شام گھر واپس پہنچتے ہی برآمدے میں بندوق پھینک بائیں بازو کو پکڑ کرسی پر ٹک گئے۔

ڈاکٹر نے فالج کا خطرہ بتایا۔ اعزہ واحباب عیادت کے لئے علی گڑھ پہنچے۔ شروع مئی میں ڈاکٹر نے دہرہ دون جانے کی رائے دی۔ جہاں لے جانے کے لئے انعام اللہ شاہ کو لاہور تار بھیجا گیا۔ دہرہ دون میں آشیانہ کرایہ پر اٹھا ہوا تھا۔ خان بہادر اختر محمد خاں خورجوی ہاؤس ایجنٹ نے آرکیڈیا نامی کوٹھی کا بندوبست کیا۔

ٹرین ڈون ویلی میں داخل ہوئی۔ پاپا نے کہا' "سبحان اللہ۔ بٹی اللہ نے کیا حسین مقام تمہیں رہنے کو دیا ہے۔ اگر اچھا ہو گیا تو میں بھی ایک کوٹھی خرید کر یہیں رہوں گا۔"

ٹرین اسٹیشن کے نزدیک پہنچی۔ پاپا نے فوجی مستعدی سے بال درست کئے۔ ٹائی باندھی۔ کوٹ پہن کر تیار ہوئے۔ ٹرین اسٹیشن پر رکی۔ پاپا انعام اللہ شاہ کے سہارے پلیٹ فارم پر اترے۔ بہن' دونوں لڑکیوں اور ملازموں نے ناشتے اور دوالوں کی ٹوکریاں اٹھائیں۔

یونان کی اسطوری آرکیڈیا کے باسی ہمیشہ خوش و خرم رہتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مایوسی' رنج والم' بیماری اور فنا انسان کا مقدر ہیں۔ لیکن انسان کف افسوس ملتا ہے تو ہاتھوں سے امید کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔

انگریزوں نے اپنے وطن کے دیہاتی مکانوں کی طرح ہندوستان میں پہاڑی بنگلوں کے نام بھی "آرکیڈیا" رکھے۔ لیکن مر کھپ گئے۔ آرکیڈیا کرزن روڈ کا انگریز مالک کب کا قبرستان آباد کر چکا تھا۔ لیکن اس کا نصب کیا ہوا PAN کا مرمریں مجسمہ باغ کے وسط میں اب بھی موجود تھا۔ کوٹھی کے موجودہ مالک ریاست نابھ کے ایک سردار صاحب تھے۔

علی گڑھ والے خواجہ عبدالمجید کے خسر نواب سربلند جنگ سابق چیف جسٹس حیدر آباد دکن بغرض علاج آرکیڈیا کے پڑوس میں مقیم تھے۔ خواجہ بیگم ان کی تیمار داری میں مصروف تھیں۔ اکثر غروب آفتاب کے وقت دونوں بزرگ آرکیڈیا کے برآمدے میں آرام کرسیوں پر نیم دراز اپنے مشترکہ امراض کے

متعلق تبادلہ خیالات کرتے یا ایک لائق فائق دہلوی طالب علم احمد علی [27] کی باغیانہ گفتگو دلچسپی سے سنتے۔ (جو قریب کی ایک کوٹھی میں گرمیاں گذار رہے تھے) نذر بیگم نے آرکیڈیا میں ڈارک روم بنوالیا تھا۔ وہ ان سب کی تصویریں کھینچا کرتیں اور مراد آباد اور لاہور سے عزیز آتے جاتے رہتے۔

ایک رات انعام اللہ شاہ کھانا کھاتے کھاتے بولے "باجی جان وہ کوٹھی کہاں ہے ریپنا جس میں آپ ۱۹۱۲ء میں رہی تھیں۔ چلئے دکھلا کر لائیے۔ اسی وقت۔"

طبیعت میں بلا کی جلد بازی تھی۔ فوراً باجی کے ساتھ ریپنا پہنچے۔ پھاٹک بند تھا۔ مہندی کی باڑ کو جانچا۔ اور جست بھر کے احاطے کے اندر۔ سر نکال کر فرمایا "باجی جان تشریف لائیں۔"

وہ بھی کود کر اندر گئیں۔ ایک کتا بھونکا۔ چوکیدار چور چور للکارتا ہوا دوڑا۔ کتے نے سید انعام اللہ شاہ کی شلوار کا پائینچہ جھپٹ لیا۔ چوکیدار سے فرمایا "پہلے اس موذی کو بھگاؤ۔ اور صاحب کو جا کر بولو۔ آپ کے پرانے دوست آئی۔ ایل۔ شاہ لاہور سے آئے ہیں۔"

چوکیدار نے کہا "صاحب، میم صاحب باہر گیا ہے۔"

"اچھا ہمارا سلام بولنا۔ اب پھاٹک کھولو۔" باغ میں جا کر ریپنا کو ملاحظہ کیا۔ باہر نکلے۔ سرمئی کرزن روڈ چاندنی میں چمک رہی تھی۔"

اچانک نذر باجی نے گھبرا کر کہا، "بھائی انعام۔ میرا بروچ۔ سارے زیور چور لے گئے۔ یہی ایک قیمتی چیز بچ رہی تھی۔"

"باجی جان۔ اللہ مالک ہے۔" جھک کر سڑک پر ڈھونڈنا شروع کیا۔

"اگر الجھ کر باڑ میں گر گیا تو کیا ملے گا۔" باجی نے تاسف سے کہا۔ دونوں منہ لٹکائے آرکیڈیا واپس پہنچے۔ انعام اللہ شاہ نے پاپا سے کہا، "پاپاجی۔ انشاء اللہ صبح کو بروچ باجی کو ضرور مل جائے گا۔"

"اب تم پر بھی وحی نازل ہونے لگی۔" اکبری بیگم نے ہنس کر پوچھا۔ (انعام اللہ شاہ قادیانی تھے) صبح منہ اندھیرے نہ جانے کس طرح جا کر بروچ ڈھونڈلائے۔ کیا عجب ہے ان کے پاس بھی ایک آدھ فرشتہ آتا ہو۔

پاپا کی طبیعت سنبھلتی جا رہی تھی۔ پڑوس میں نواب سربلند جنگ کی حالت دفعتاً بگڑ گئی۔ جس روز یونانی علاج کے لئے انہیں دلی لے گئے ہیں اس کے چوتھے دن اخبار میں ان کی وفات کی خبر آگئی۔

دوپہر کو برآمدے میں اکبری بیگم اور مشتاق بیرہ پاپا کو کھانا کھلا رہے تھے۔ احمد علی اسٹیٹسمین پڑھ کر سنانے میں مصروف تھے۔ معاً انہوں نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔ لیکن شام تک پاپا کو پتہ چل گیا۔ میر افضل علی کا تبادلہ ایبٹ آباد ڈیرہ اسمٰعیل خاں ہو چکا تھا۔ صبح کو پاپا نے بیٹیوں سے کہا، "یہاں سردی بڑھتی جا رہی ہے میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں جانا چاہتا ہوں۔"

اسی روز علی گڑھ سے خط آیا۔

۱۱۱ اکتوبر ۱۹۲۸ء — السلام علیکم

نواب [28] صاحب نینی تال جا رہے ہیں۔ شاید مجھے یا ابوالحسن کو ساتھ لے جائیں۔ اس عرصے میں تم پاپا کو لاہور پہنچا آؤ۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ پاپا کی حالت اب بہتر ہے۔ جھبو جی کی پڑھائی میں چھ ماہ سے گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ان کا اسکول کھلے ایک مہینہ ہو چکا۔

اب میرے چھ مہینے کے سفر کی باری آتی ہے۔ یکم مارچ ۲۹ء سے رخصت کی درخواست دی ہے۔ طہران و شیراز کے خواب دیکھ رہا ہوں۔

وقت آنست کہ پرسی خبر از شیرازم

سجاد

ڈیرہ اسمٰعیل خاں روانگی کی شام پاپا کرسی پر بٹھال کر آرکیڈیا سے باہر لائے گئے۔ ڈوبتے سورج کی سرخ کرنوں نے آرکیڈیا کے چمن میں ایستادہ پین کا مجسمہ گلرنگ کر دیا تھا۔ شام کا بسیرا لینے والے پرندوں کی چہکار سے باغ دفعتاً گونج اٹھا۔ چل خسرو گھر اپنے۔

۹— فلائنگ آفریدی کی روانگی

نمبرے ریلوے روڈ، لاہور کے ڈرائنگ روم میں پاپا کا پلنگ بچھایا گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے گھر پہنچتے پہنچتے رات کے دس بج چکے تھے۔ ملنے والوں کا مجمع لگا تھا اور بڑی چہل پہل تھی۔ پاپا چکوتھی کے شوقین تھے۔ مولوی ممتاز علی سے فرمایا، "مولوی صاحب ڈاکٹر ہون نے چلتے چلتے تاکید کی تھی کہ روز رات کو گنڈیریاں کھایا کرنا۔"

سید انعام اللہ سنتے ہی ہوا ہو گئے۔ پون گھنٹے بعد تین سیر گنڈیریاں لئے لنگڑاتے ہوئے واپس آئے۔ شلوار کے پائینچے پارہ پارہ اور ٹخنے لہولہان۔ فرمایا۔ بازار بند ہو چکا تھا۔ گنڈیریوں کی تلاش میں ایک تاریک گلی میں جا پہنچا۔ وہاں کتے بہت تھے۔

اسٹیمر ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سمت رواں تھا۔ دریائے سندھ پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ جہاز پر فورٹ سنڈیمن اور بنوں کے مسافر سوار تھے۔ ایک بار پھر صوبہ سرحد کی فرحت بخش ہوائیں، کھلی ہوا میں اڑتے باز، حد نظر تک پانی آیا۔ سندھ اپنے طویل سفر میں مصروف تھا۔

نیا باندھو کنار دریا۔

پاپا کو اسٹیمر سے کرسی میں بٹھال کر اتارا گیا۔

میر افضل علی کی کوٹھی روزینا ہاؤس میں گل داؤدی کھل چکے تھے۔ پاپا کے بیڈ روم کے سامنے مختصر برآمدے میں صبح سے تیز دھوپ آجاتی تھی۔ ثروت آرا نے اپنی ساس اکبری بیگم سے کہا، "پھوپھی عجب اجاڑ سا برآمدہ ہے۔ دیکھ کر ہول آتا ہے۔"

پاپا کی حالت بہتر ہونے پر نذر بیگم ایک روز علی اصبح علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئیں۔ پاپا اسی برآمدے کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہوئے۔ بھورے اونی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ایک بار ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا اور اندر اپنے پلنگ پر جا لیٹے۔

بارہ میل دور سندھ کے کنارے پہنچتے پہنچتے سورج نکل آیا۔ ساحل کے چاء خانوں کی بنچوں پر کنٹوپ اور دگلے پہنے مسافر جہاز کے بھونپو کے منتظر بیٹھے تھے۔ بھاپ اور کہرے کی وجہ سے ہر چیز دھندلی دھندلی سی معلوم ہوتی تھی۔ جب جہاز چلا کنارے پر کھڑے دراز قد افضل علی کی پگڑی کا شملہ کہرے میں چند لمحوں تک چمکتا رہا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈیرہ اسمٰعیل خاں

۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء

باجی جانی السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

ڈاکٹر جے دیال ابھی ابھی آئے تھے۔ ماموں کا بلڈ پریشر 170 نکلا۔ اطمینان دلا گئے ہیں لیکن آپ کو یقین تھوڑا ہی آئے گا۔ اب تو ماموں خوب مرغی مچھلی کھاتے ہیں۔ لاکھ کہو باجی وصیت کر گئی ہیں کہ گوشت مت دینا۔ وہ کہتے ہیں سفید گوشت کا کوئی حرج نہیں۔ گھڑیوں شفا اتر رہی ہے۔

غلام ازل
افضل

۳۰ نومبر کی صبح پاپا ختم ہو گئے۔

بڑے بھائی کی موت کے روز سے اکبری بیگم کو اپنی خالہ اشرف جہاں والی چپ لگ گئی۔ گم سم سارے کام کرتیں۔ اشرف جہاں بیگم کی مانند ایک آدھ ہنکارا بھر دیتیں یا اشاروں سے بات کا جواب دیتیں۔ چہلم کی فاتحہ اور ایصال ثواب کی مجلس کے انتظامات مکمل کروانے کے بعد وہ نماز کے تخت پر چپ چاپ دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں۔ گویا دنیا میں جتنے کام انہیں کرنے تھے سب نپٹا لئے۔

اکبری بیگم اپنا رول ادا کر چکی تھیں۔ پچیس تیس برس قبل اپنے بھر اصلاح معاشرت کا بیڑہ انھوں نے اٹھایا تھا۔ لیکن ہندوستانی سماج "گودڑ کا لال" کے دور سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ دنیا کو اب اکبری بیگم کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

خان بہادر میر نذر الباقر رضوی کے چالیسویں کے تیسرے روز بوقت ظہر اکبری بیگم "والدہ افضل علی" کی حرکت قلب اچانک بند ہو گئی۔

نیا باندھو

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے اجاڑ بھورے چٹیل قبرستان میں تازہ تازہ سفیدی والی دو قبریں برابر برابر دھوپ میں چمکنے لگیں۔

کنار دریا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈیرہ اسمٰعیل خاں

۲۴ جنوری ۱۹۲۹ء

باجی جانی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ

واضح ہو کہ میں نے ماموں کا سارا مال و متاع خیرات کر دیا۔ کچھ چیزیں جو بچ رہی ہیں ظفر اللہ خاں کے ہاں بھیجے دیتا ہوں کہ اپنے گودام میں محفوظ کر لیں۔ وہاں سے آپ چاہیں تو منگوا لیجئے گا۔ ورنہ ظفر اللہ کو لکھ دوں گا کہ راہ خدا میں دے دیں۔ اماں کا سامان بھی خیرات کر دیا۔ ثروت کو علی گڑھ بھیج کر خود دورے پر جاتا ہوں۔

غلام ازل
افضل

ایک ماہ بعد چودھری ظفر اللہ خان کے مکان میں چوری ہوئی۔ ان کے سامان کے ساتھ دنیاوی اثاثہ میر نذر الباقر کا نکل گیا۔

بکری کی چھینک

۱۰—بیا کہ نوبت بغداد

یکم فروری ۱۹۲۹ء کو چھ ماہ کی رخصت منظور ہوتے ہی سید سجاد حیدر نے اپنے ہم زلف میر افضل علی کو لکھا کہ ثروت آرا کو ایران' عراق و ترکی لے جانے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے جواباً بذریعہ تار جہاز کا کرایہ اور سفر خرچ کی رقم ارسال کی۔ اب سجاد حیدر تو شیعہ بی بی اور سالی کو ان ہی کی خاطر کربلا لئے جاتے ہیں اور بی بی کی یہ ضد کہ ہرگز نہیں جاؤں گی۔ پاپا مر گئے۔ پھوپھی مر گئیں۔ میں سیر سپاٹے کرتی پھروں؟ چپ چاپ رخت سفر باندھنے میں مشغول ہوئے۔ سیاحت پر نکلنے سے قبل ہمیشہ اپنے بھائیوں سے ملنے جاتے تھے۔ میرٹھ روانہ ہوئے جہاں میاں نصیرو میاں وحید تعینات تھے۔

پانچویں روز ڈاکٹر وحید الدین حیدر کا خط علی گڑھ پہنچا" "بھابی جان۔ آپ نے بھائی جان کو تنہا سفر پر بھیج کر سخت غلطی کی۔ یہاں آتے ہی بیمار پڑ گئے۔ ذرا بہتر ہوتے ہی کراچی چل دیے۔ ایران۔ مصر اور ترکی کا پروگرام بنا کر گئے ہیں۔ اور صحت قطعاً اس لائق نہیں۔

نذر بیگم نے ہڑبڑا کر جہاز کا پروگرام دیکھا ابھی اس کے چھٹنے میں چار دن باقی تھے۔ فوراً ایس۔

ایس ویسٹ سے آل حسنین کو بلوایا۔ رات کی ٹرین سے مع ثروت و آل حسنین براہ لاہور کراچی کا رخ کیا۔

تیسری صبح کراچی پہنچ کر ثروت کو لیڈیز ویٹنگ روم میں چھوڑا۔ آل حسنین کے ساتھ کیماڑی پہنچیں۔ معلوم ہوا جہاز دو بجے بمبئی سے آئے گا۔ آل حسنین بندرگاہ پر بھائی جان کو بے سود تلاش کرتے پھرے۔ پھر ریلوے اسٹیشن میکلوڈ روڈ واپس آئے۔ ثروت کو ہمراہ لے کر ایک بجے دوپہر دوبارہ کیماڑی کے پھاٹک پر پہنچے۔ سامنے سے حاجیوں کے غول چلے آ رہے تھے۔ اچانک آل حسنین چلائے۔ "باجی۔ وہ رہے بھائی جان!"

ایک وکٹوریہ میں بیٹھے چلے آتے تھے۔ سبز رنگ کا کمبل اوڑھے۔ پاؤں میں پنجابی جوتے۔ عجیب قطع بنائی تھی۔ بتایا علی گڑھ سے بوٹ پہن کر چلے تھے۔ میرٹھ میں انگوٹھا دکھنے لگا (جو گاؤٹ کا پیش خیمہ تھا) دلی سے پنجابی جوتے خرید کر پہنے۔

"کمال ہے۔ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"ہم بھی چل رہے ہیں ساتھ۔"

"پاسپورٹ بنوا لئے؟"

"اے ہے۔ اس کا تو خیال ہی نہ آیا۔"

سکون سے کہا' "اچھا میں انتظام کرتا ہوں لیکن اس جہاز سے چلنا ممکن نہیں۔ اگلے سے آیئے گا۔" وکٹوریہ سے اتر کر انگوٹھے کے درد کے باوجود حسب عادت تیز تیز چلتے جہاز کے دفتر روانہ ہوئے۔ کچھ دیر بعد آ کر کہا' "جہاز تین گھنٹے بعد آئے گا۔ اس سے بہرحال نہیں جا سکتے۔ اگلے سے اکٹھے چلیں گے۔"

پیلس ہوٹل روانہ ہوئے۔ کراچی جم خانہ کے سامنے سر عبداللہ ہارون کے ایک عزیز کھڑے تھے انہوں نے پہچان لیا۔ شام کو لیڈی ہارون ہوٹل پہنچیں۔ سب کو اپنے گھر اٹھا لے گئیں۔

وہاں پہنچتے ہی سجاد حیدر صاحب کے دانت میں شدید درد اٹھا۔ بخار آ گیا۔ ہفتہ بھر بعد بغرض علاج دوبارہ میرٹھ واپس لوٹے۔

میرٹھ میں برادر خورد کے علاج سے افاقہ ہوا۔ بھائیوں نے اصرار کیا علی گڑھ واپس جائے۔ جھنجلا کر ایک روز خود اپنا بستر باندھا۔ رات کی ٹرین سے کراچی روانگی کا اعلان کیا۔ آخری روزے تھے۔ بھاوجوں نے التجا کی۔ بھائی جان کم از کم عید کر کے ہی جایئے۔ ایران کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ جیٹھ جواباً کار کا دروازہ کھول اس میں جا بیٹھے۔

اسٹیشن پہنچ کر بے صبری سے ریل کی پٹڑی کو دیکھنے لگے۔ دور سے انجن کی تیز روشنی نظر آئی۔ پھرتی سے بنچ پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہمت اور اشتیاق دیکھ کر چھوٹے بھائیوں کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ڈاکٹر وحید نے کہا' "ٹرین ابھی بہت دور ہے بھائی جان' آپ کمزور ہیں ذرا بیٹھے رہیے۔" جواباً تیزی سے چلتے جس جگہ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ رکنے والا تھا۔ وہاں جا کھڑے ہوئے۔

کراچی میں عید کی وجہ سے بہت گہما گہمی تھی۔ پیلس ہوٹل سے دوسری صبح سویرے کیماڑی

پہنچے۔ ٹھیک دس بجے دور سے جہاز آتا دکھائی دیا۔ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔

ایرانی بندرگاہ ابادان میں اتر کر سید مصطفٰے حیدر کو شہر کی سیر کرائی۔ بصرے سے ٹرین پکڑ کر ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد بغداد وارد ہوئے۔ اسٹیشن سے دو عربانہ یعنی بگھیاں کیں۔ دجلہ کے کنارے کنارے چلتے قافلہ میجسٹک ہوٹل پہنچا۔

عراق جنگ عظیم کے بعد سے انگریزوں کے زیر تسلط تھا۔ ۱۹۰۴ء کے بغداد کے ترک حکام کے بجائے اس وقت میجسٹک ہوٹل انگریز آقاؤں سے پر تھا۔

چند روز بعد ایک پرانے دوست نواب تقی حسن لکھنوی جو بغداد میں تجارت کرتے تھے ہوٹل سے اپنے تخت الف لیلوی مکان میں اٹھا لے گئے جس کی سیڑھیاں باقاعدہ دجلہ میں اترتی تھیں۔ وہاں پر تکلف خاطروں سے دم گھبرایا۔ بذریعہ ٹرین قصر شیریں' موصل اور طہران جانے کی تیاری کی۔

عین وقت پر ثروت آرا جو درد سر کی دائمی مریض تھیں بیمار پڑ گئیں۔ ایک روز بغداد کی ہندوستانی انجمن نے دعوت کی۔ وہاں ایک پنجابی علیگ میاں محمد اسحٰق نے جھپٹ لیا اور شہر سے بیس میل دور اپنے فارم ہاؤس پر لے گئے۔ میاں صاحب بغداد میں کنٹریکٹر تھے اور گھی دودھ کی تجارت کرتے تھے۔ ثروت آرا وہاں بھی نہ سنبھلیں۔ طے کیا گیا کہ مع آل حسنین دونوں بہنیں بعد میں طہران پہنچیں۔ خود ایران کے لئے رخت سفر باندھا[29]۔

ہمدان

۲۱ اپریل ۱۹۲۹ء

السلام علیکم

آج صبح کرمان شاہ سے روانہ ہو کر بخیریت تمام رات کے دس بجے یہاں پہنچا۔ راستہ دشوار گذار پہاڑیوں پر ہو کر ہے۔ ہمدان ایک وادی میں واقع ہے۔ پہاڑ ہیں جن پر اب تک برف ہے۔ ہمدان پرانی قسم کا شہر ہے جس کے مقابلے میں بغداد پیرس معلوم ہوتا ہے۔ دن بھر پھر کر اسے دیکھ ڈالا۔ کل صبح انشاء اللہ طہران روانہ ہو جاؤں گا۔

یہاں سے طہران دو دن کا راستہ ہے اور قزوین جو راستہ میں ہے وہاں نہ ٹھہروں گا۔ مغرب کے وقت طہران پہنچ جاؤں گا۔

ہوٹل وکٹوریہ

طہران۔ ۲۴ اپریل ۱۹۲۹ء

السلام علیکم

ہم تینوں ہندوستانیوں (یعنی میں' شیخ محمود اور فریدون پارسی) نے اس ہوٹل میں قیام کیا۔ آج

پارسی ایک دوسرے ہوٹل میں اٹھ گیا۔ ہوٹلوں میں آج کل جگہ نہیں' آج رضا شاہ پہلوی کی تاجپوشی کی سالگرہ ہے۔ شہر میں جشن اور چراغاں ہے۔ میں دن بھر ان حضرت کی تلاش میں پھرا جن کے نام الن خط لائے تھے۔

یہاں خوب سردی ہے۔ شہر دہرہ دون کی طرح چاروں طرف برف پوش پہاڑوں سے گھرا ہے۔ یہ پہاڑ شہر سے بالکل ملے ہوئے ہیں۔ تہران پر آبادی نہیں۔ ہندوستانی یہاں بالکل نہیں ملتے۔ کوئی پرانا شناسا بھی نہیں۔ (نامکمل)

حوالہ جات

1 بحوالہ جیوفری لوئیس۔ دیدے قورقت نامہ

2 قرون وسطیٰ کی اوغور "داستان طرازی کا انداز"

3 بحوالہ آر تھرویلی۔ "منگولوں کی خفیہ تاریخ"

4 میاں افتخار الدین مرحوم کی ساس۔

5 اور

6 "روزنامچہ" تہذیب نسواں۔ لاہور۔

7 "روزنامچہ"۔ کرم خوردہ تہذیب نسواں لاہور۔ سن اور تاریخ نامعلوم۔

8 بیگم عائشہ غلام حسین بٹ نے حال ہی میں راقم الحروف کو بتایا کہ یہ واقعہ غالباً ۱۹۲۳ء کا ہے۔

9 ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔

10 جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

11 "ایام گذشتہ" از نذر سجاد حیدر۔ عصمت کراچی ۱۹۵۰ء

12 سید مصطفےٰ حیدر جو ۱۹۲۰ء میں سلطان پور میں پیدا ہوئے تھے۔

13 "گنج ہائے گرانمایہ"۔ از: رشید احمد صدیقی۔

14 از قلم سید عثمان حیدر صاحب۔ کراچی۔

15 مسٹر ڈکسن۔ مسلم یونیورسٹی میں شاید انگریزی کے پروفیسر تھے۔

16 ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور سلطان عبدالحمید جلاوطن کئے گئے۔

17 شیخ محمد حبیب اللہ منیجر ریاست محمود آباد۔ ضلع بارہ بنکی کے باشندے تھے۔

18 اب تزئین فریدی مشہور پاکستانی خاتون لیڈر۔

19 میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں۔

20 بعد میں جنرل انیس احمد۔

21 پہلی جنگ عظیم سے قبل دولت عثمانیہ میں ریلوے لائنز کی یوروپین سیاست کے متعلق دیکھئے گذشتہ فٹ نوٹ۔

22 ماخوذ: از "ایام گزشتہ" عصمت۔ کراچی۔

23 "گنج ہائے گرانمایہ" از رشید احمد صدیقی۔

24 ایڈیٹر قاری عباس حسین ۱۹۲۵ء میں نذر سجاد حیدر کا ناول "وفادار" بالاقساط شائع ہو رہا تھا۔

25 مطبوعہ مرقع لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۲۶ء

26 غالباً اسی زمانے میں چند ادیبوں نے "طاہرہ دیوی شیرازی" اور آمنہ دیوی پریاگی" کے فرضی

نامو‌ں سے عریاں نویسی شروع کی تھی۔

27 بعد میں مصنف "انگارے"۔ "ٹوائیلائٹ ان ڈیلی" وغیرہ

28 نواب سر مزمل اللہ خاں شیروانی

29 ماخوذ از "ایام گذشتہ" عصمت کراچی۔ پچھلے دونوں ابواب بھی "ایام گذشتہ" سے اخذ کئے گئے ہیں۔

فصل ہفتم

ا۔ او بہ صحرا رفت

"سید صاحب نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو جوڑ توڑ بالکل نہ آتا تھا[1]۔"

۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں مولانا محمد علی نے لکھا تھا' "سید سجاد حیدر کی جگہ کا بھی حریص نہیں ہوں۔ اور ہمدرد نے تو اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی اظہار افسوس کر دیا تھا کہ جو ایک مرد واحد علی گڑھ میں ادبی شہرت رکھتا ہے' اس تک کو وہاں رکھنا لوگوں کو گوارا نہیں۔ تاہم مجھے ان کی تنخواہ پر نہیں ان کی ادبیت پر رشک ہے۔ لیکن وہ ادب کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ اور ہم بے ادبی کے لئے۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

میں نے ہمدرد جاری کرتے وقت انہیں اس کی اڈیٹری کی دعوت دی تھی۔ مگر وہ قبول نہ ہوئی۔

"۱۹۲۹ء میں رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی۔ جس کے بعد سجاد حیدر نہایت اعزاز کے ساتھ رجسٹرار شپ سے سبکدوش ہو کر دوبارہ تعزیرات ہند کی دنیا یعنی یو۔پی سول سروس میں واپس آگئے[2]۔"

ہردوئی

ستمبر ۱۹۲۹ء

ڈیر جلیل۔ سلام مسنون

آپ سے رخصت ہو کر بخیریت پہنچا۔ پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر۔

اردو ایم۔ اے اور آنرز کا کلاس کھلنا علی گڑھ کی روایات کے عین مطابق ہو گا۔ اور وہ دن بہت مبارک ہو گا جب ایسا ہو جائے۔ رہا آپ احباب کی یہ کوشش کہ مجھے (اردو ڈپارٹمنٹ کے لئے) علی گڑھ دوبارہ لائیں۔ مجھے اس کی کامیابی میں شبہ ہے۔ خداوندان یونیورسٹی -- ملاتے ہیں اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے۔

آپ کا چاہنے والا

سجاد

جون ۱۹۲۹ء علی گڑھ میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ تعطیلات کی وجہ سے یونیورسٹی سنسان ہو چکی تھی۔ رجسٹرار ہاؤس کے باغ کے پھول پتے اور پودے مرجھا گئے تھے۔ مشرق وسطیٰ سے لوٹ کر نذر بیگم

اور ثروت آرا خواجہ عبدالمجید کے ہاں نکیں۔ علی گڑھ پہنچتے ہی دوستوں نے ملنے کے لئے آنا شروع کیا۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں سب سے پہلے عبداللہ بیگم خواجہ عبدالمجید کے ہاں پہنچیں۔ بولیں "آپ دونوں نے کالی ساریاں کیوں پہن رکھی ہیں۔ باپ اور پھوپھی کا سوگ کب تک منائیں گی۔"

ثروت آرا نے کہا "سفر کے خیال سے ملگجی ساڑیاں پہن لی تھیں۔"

عبداللہ بیگم نے خواجہ بیگم سے رنگ کی پڑیاں مانگیں۔ غسل خانے کی بالٹی میں فیروزی پڑیا گھول کر دونوں بہنوں کے سفید دوپٹے اور ساریاں رنگ ڈالیں۔

نذر بیگم نے رجسٹرار زہاؤس سے سامان اور فرنیچر مال گاڑی میں لدوا کر ہردوئی بھیجا اور مع ثروت و خواجہ بیگم سولن روانہ ہوئیں۔

ہاؤس ایجنٹ سردار گلاب سنگھ نے "سنی سائیڈ" نامی کوٹھی کا انتظام کیا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں سولن سے ہردوئی پہنچیں۔ یہاں کی کوٹھی میں پہلے سول سرجن رہتا تھا۔ چند روز بعد جانے والا تھا۔ وہ دو کمروں میں منتقل ہوا۔ کھانا ساتھ کھاتا۔ ویجی ٹیرین تھا۔ اس کا کھانا الگ پکوایا جاتا۔

پڑوس میں اکبر الہ آبادی کے بیٹے عشرت حسین رہتے تھے۔ دوسری طرف ولایت علی بمبوق مرحوم کے چچا ممتاز احمد قدوائی کی کوٹھی تھی۔ وہ ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن ان کے کانگریسی بیٹے رفیع احمد قدوائی پنڈت موتی لعل نہرو کے سکریٹری ہو گئے تھے۔ (مسولی ضلع بارہ بنکی والوں کا یہ سارا کنبہ قوم پرست تھا۔ بمبوق مرحوم کی بیٹی انیس فاطمہ کی شادی رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی سے ہوئی تھی۔ چند سال قبل جب ان کی لڑکی پیدا ہوئی گھر کے بیشتر مرد جیل گئے ہوئے تھے۔ لڑکی کا نام آزادی رکھا گیا) عقب میں سروزیر حسن کے بھائی سید اصغر حسن جج مقیم تھے۔ شام کو ان کی لڑکیاں اور ثروت آرا بیڈمنٹن کھیلتیں۔ غرارے پہنے بیڈمنٹن کھیلتی لڑکیاں عجیب منظر رہا ہوگا۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں یلدرم کا تبادلہ بحیثیت اسسٹنٹ ریونیو کمشنر پورٹ بلیر جزائرانڈمان کا ہو گیا۔ نذر بیگم نے جو بیحد سخت ہاؤس وائف تھیں اور ایک ایک چیز سینت کر رکھتی تھیں اب گھر کا سارا انگڑ کھنگڑ مال گاڑی پر لدوا کر لکھنؤ بھیجا اور اسے چینا بازار گیٹ میں عائشہ غلام حسن بٹ کے ہاں رکھوانے لکھنؤ روانہ ہوئیں۔ علی گڑھ میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے یلدرم کو الوداعی ڈنر دیا۔ جس میں صادق حسن صادق نے ایک طویل نظم پڑھی۔ مطلع

اس لئے ہے آج مے خانہ کے در پر جمگھٹا
ایک بڑی بھٹی کے میکش ہو گئے ہیں ایک جا

مقطع

ترک وفارس کی تھی سیاحی جوانی کے لئے
اب بڑھاپے میں ہوس ہے کالے پانی کے لئے

اس کے بعد چینا بازار گیٹ لکھنؤ پہنچے۔ چاندنی راتیں تھیں۔ باہر پلنگ بچھتے اور کھانا چبوترے پر

کھایا جاتا۔ اور رات گئے تک باتیں ہوتیں۔ (عائشہ غلام حسن علی گڑھ والے لارڈ حیات کی بھتیجی تھیں) چار روز بعد نذر بیگم سولن گئیں۔ خود کلکتہ روانہ ہوئے۔ بڑے بھائی کی لڑکی صدیقہ خاتون کے ہاں پارک سرکس میں قیام کیا۔ صدیقہ بی بی کی شادی چند ماہ قبل سید احمد رشید دہلوی سے ہوئی تھی۔ کلکتہ میں کار خریدی اور کالے پانی کے لئے جہاز پکڑا۔

پورٹ بلیر

۳۱۔ مئی ۱۹۳۰ء

السلام علیکم

۲۴ کی شام کو میں اور احمد رشید جہاز پر گئے۔ اسباب رکھوایا۔ ایک جنگلی سا نوکر مل گیا تھا بیس روپے ماہوار اور کھانے پر اسے جہاز پر چھوڑا۔ شہر واپس گئے۔ کھانے کے بعد نو بجے رات کے گھر سے بندرگاہ روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر صدیقہ بی بی نے موٹر چلانا شروع کیا۔ ۱۱ بجے رات کے صدیقہ اور احمد رشید جہاز سے واپس گئے۔ صبح چار بجے ایس۔ ایس۔ مہاراجہ روانہ ہوا۔ ۲۸ کو ۵ بجے شام یہاں پہنچے۔ بیحد خوبصورت جزیرہ ہے۔ سمندری ہوا ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ موسم معتدل ہے۔ رات کو کمرے میں سوتے ہیں۔

سردار بلونت سنگھ جسپال جن سے چارج لینا ہے جہاز پر آئے تھے۔ ڈاک بنگلے میں ٹھہرایا اور چاء بھجوائی۔ دوسرے روز اپنے گھر لے گئے۔ مسز بلونت سنگھ تھوڑی تھوڑی انگریزی بول لیتی ہیں اور بہت روشن خیال بی بی ہیں۔

مسٹر کیوور مدراسی عیسائی محکمہ زراعت کے سربراہ کل اپنے گھر اٹھا لے گئے۔ اب ان کا مہمان ہوں۔ ۲ جون کو جسپال کلکتہ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کے بنگلے میں منتقل ہو جاؤں گا۔ دو منزلہ نہایت وسیع مکان سمندر کے کنارے پہاڑی پر واقع ہے۔ مچھر نہیں ہیں۔ بلونت سنگھ کل مجھے چارج دیں گے۔

یہاں ایک بہت بڑا انگریزی کلب ہے۔ اس میں شامل ہونا لازمی ہے۔ پچیس روپیہ ماہوار اس کا چندہ دینا ہوگا۔

اب سنو ۲۴ مئی کو کلکتہ میں زاہدی کا خط ہردوئی ہوتا ہوا بھاولپور سے آیا۔ وہ مجھے ریاست میں ایک اچھی نوکری پر بلانا چاہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا تھا تم منظور کر لوگے۔ میں نے کلکتہ سے جواب دیا کہ کاش ایک ہفتہ پہلے تمہارا خط آتا تو میں یہاں ہی نہ آتا۔

پھبو جی کی تعلیم کا کیا انتظام ہوا۔ تمہارے گورداسپور والے مقدمے کا کیا ہوا۔

یہاں پہنچ کر دوسرے دن چیف کمشنر سے ملا۔ کام یہاں ہلکا ہے مگر دورہ زیادہ کرنا ہوگا۔ انگریزوں کی دعوتیں کرنا اور شراب پلانا بھی ضروری ہے۔ اچھا ہوا جو تم نے کھانے کا سیٹ ساتھ کر دیا۔ کچھ فرنیچر بلونت سنگھ سے خرید لیا ہے۔ باقی تم آ کر خرید لینا۔

سجاد

۲۶ جون ۱۹۳۰ء

السلام علیکم

کل شام جہاز آیا اس سے ڈاک ملی۔ ایک مہینہ ہم لوگ بغیر خطوں کے یہاں رہے۔ عجیب کیفیت ہے۔ عالم تنہائی لق و دق مکان۔ کام بہت کم ہے۔ نہ کوئی ڈھنگ کا ملنے والا۔ کلب میں شام کو بڈھے انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتا ہوں۔

زاہدی کا تار آیا تھا کہ تم شملہ میں انڈر سکرٹری مقرر ہو گئے۔ میں نے تار دیا کہ یہاں کوئی حکم نہیں پہنچا۔ رضا علی کو بھی تار دیا۔ معلوم ہوا خبر غلط تھی۔ کاش جب ہردوئی میں تھا تب تقرر ہو گیا ہوتا۔

میں کشاں کشاں یہاں آیا ہوں اور رہائی کی ترکیبیں سوچ رہا ہوں۔ سول سرجن کو بتلایا کہ ذیابیطس کی شکایت ہے۔ یوروپ جا کر علاج کروانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔ یوروپ کے کسی خاص معالج سے علاج کروانے کی خواہش ظاہر کرو تو میں چھٹی کی سفارش کر سکتا ہوں۔ اگر تمہاری رائے ہو کہ میں ولایت جانے کے لئے چھٹی لوں تو یہ تار دیدو۔ YES APPLY۔ میں نے زاہدی کو تار دیا ہے کہ میرے فارن سکریٹری بھاولپور مقرر ہونے کے سلسلے میں تازہ ترین خبر کیا ہے۔ اگر ان کا جواب آیا کہ ریاست کی طرف سے گورنمنٹ کو درخواست دیدی گئی ہے تو میڈیکل سرٹیفکٹ پر چھٹی نہ لوں گا۔ خدا کرے یہاں سے نجات مل جائے ورنہ میری رائے ہے کہ تم اور بنوبی فوراً یہاں چلی آؤ۔

امید ہے بھبوجی کی پڑھائی باقاعدہ ہو رہی ہوگی۔ بنو کو سلام و دعا۔

سجاد حیدر

۲۔ شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظارہ[3]

ثروت آرا بیگم عرف بنو جب صبح اٹھ کر دریچے سے باہر نظر ڈالتیں ہماچل کے پہاڑوں پر کہرا تیرتا ہوتا اور سامنے ریلوے اسٹیشن کا دھواں اسی دھندلکے میں تحلیل ہوتا جاتا یہاں تک کہ دھوپ نکل آتی۔ سنی سائیڈ کے شیشوں والے برآمدے پر دھوپ بہت جلد آجاتی تھی۔ عین نیچے گہری کھائی میں ایک آبشار نیلی لکیر سا معلوم ہوتا۔ "سنی سائیڈ" شملہ کالکا ریلوے لائن کی ایک سرنگ کے اوپر واقع تھی۔ ریلوے اسٹیشن دو سرنگوں کے درمیان تھا۔ دوسری سرنگ کے اوپر مسلم قبرستان تھا جہاں ایک چھوٹی سی تربت میں گل رعنا دفن تھیں۔

رات کو ٹرینیں سرنگ میں سے گڑگڑاتی ہوئی گذرتیں تو "سنی سائیڈ" کا فرنیچر مرتعش ہو جاتا۔

صبح کو مقصود بیرہ چاء کی کشتی لاتا۔ بنوبی اٹھ کر بہن کے بچوں کی دیکھ بھال میں لگ جاتیں۔ اپنی خالہ مرتضائی کی طرح لاولد اور بہن کی اولاد پر جان چھڑکتی تھیں۔ خوش خلق اور تسخیر قلوب کی ماہر اور دائم المریض خاتون تھیں۔ میاں ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے تبدیل ہو کر پشاور جا چکے تھے۔ ابھی طے نہ کر پائی تھیں کہ پشاور جائیں یا تبدیل آب و ہوا کے لئے پورٹ بلیر۔ فی الحال لکھنؤ والے سرور زیر حسن کے بھتیجے علی جواد کی

نسبت اپنی ایک سہیلی سے طے کروانے میں مشغول تھیں۔ سید علی جواد لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور "سنی سائیڈ" میں مقیم تھے۔

سولن میں ان دونوں بہنوں کی بہت سی سہیلیاں موجود تھیں۔ سلطانہ رضاء اللہ، بیگم خواجہ عبد المجید، عائشہ غلام حسن بٹ اور کپور تھلے والے کرنل اصغر علی کی لڑکیاں قمر اور اختر۔ ان دونوں میں سے ایک کے شوہر نجم الحسن بولتی فلم "جوانی کی ہوا" کے ہیرو بن گئے تھے۔

ثروت آرا اس روز صبح دس بجے کے قریب سلطانہ رضاء اللہ سے ملنے نشیب میں گئیں۔ واپسی میں چڑھائی پر سانس پھول گیا۔ گھر پہنچتے ہی ذرا دم لینے کے بعد اس کنبے کی "ٹی پارٹی" کے انتظام میں منہمک ہو گئیں جن کے ہاں سید علی جواد کی بات چل رہی تھی۔

شام کو وہ بیبیاں ڈگشائی سے آئیں۔ ان کے جانے کے بعد رات کے کھانے پر ثروت آرا علی جواد سے دیر تک باتیں کیا کیں۔ میز کے وسط میں گلاب کے پھولوں سے بھرا واز رکھا تھا۔ دوسری طرف خود بیٹھی تھیں۔ ریلوے انجن کی تیز روشنی دریچے میں سے ہوتی میز پر آ پڑتی تھی۔ پھر شائیں شائیں کرتا انجن آگے نکل جاتا۔

نیچے سرنگ میں سے ایک ٹرین تیزی سے گذری۔ میز لرزنے لگی۔ کچھ دیر بعد ایک اور ٹرین آئی۔ اس کے انجن کی روشنی سامنے قبرستان کے اونچے کتبوں پر پڑی جو دریچے میں سے صاف نظر آتے تھے۔

"توبہ ہے۔" ثروت آرا بیگم نے کہا! "یہ ریلیں جیتے اور سوتے لوگوں کو تو کیا قبروں میں پڑے مردوں کو بھی چین نہیں لینے دیتیں۔"

چاند نکلا۔ سارا گورستان روشن ہو گیا۔ ثروت نے علی جواد سے کہا، "آیئے ذرا ٹہلتے ہوئے گل رعنا کی قبر تک ہو آئیں۔"

"بنو باجی۔" علی جواد نے جواب دیا، "رات کے وقت بھلا کہیں قبرستانوں میں جاتے ہیں۔"

پھر وہ کافی بنانے لگیں۔ اس مرتبہ انجن کی روشنی میں قبرستان سے گذرتے ٹیلی گراف کے کھمبے چمک اٹھے۔

ثروت آرا بیگم نے کہا، "مجھے اکثر خیال آتا ہے وائسرائے بہادر کے پاس جو خفیہ اطلاعات شملہ جاتی ہیں یہ قبرستان کے مردے پہلے ہی سن لیتے ہوں گے۔"

علی جواد نے قہقہہ لگایا۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔

پلنگ پر لیٹنے کے گھنٹہ بھر بعد ثروت آرا نے بڑی بہن کو جگایا، "باجی۔ ہمیں جانے کیسا لگ رہا ہے۔ عجیب سا۔"

نذر باجی نے اسپرٹ ایمونیا کے قطرے دوا میں ملا کر دیے۔

صبح کو سورج سر پر آگیا۔ مقصود بیرے نے برآمدے میں جاکر کھنکارا۔ دوسرے کمرے میں جاکر بڑی بیگم صاحب سے کہا' "بنوبی ابھی تک سو رہی ہیں۔ ناشتے کے لئے جگا دوں؟" دوبارہ جاکر پکارا' "بنوبی۔ بنوبی!" ہڑبڑا کر بڑی بیگم صاحب کو آواز دی اور ننگے پاؤں ڈاکٹر کو بلانے بھاگا۔

دوسرے ملازم سودا سلف لینے بازار جاچکے تھے۔ علی جواد حسب معمولی ہوا خوری کے لئے گئے ہوئے تھے۔ گھر پر مکمل خاموشی چھا گئی۔ سورج برآمدے پر تیزی سے چمک رہا تھا۔ نذر بیگم نے چھوٹی بہن کے اوپر سرخ کشمیری شال ڈال دی اور ڈاکٹر کی راہ دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر میں ثروت آرا بیگم نے آنکھیں کھولیں۔ نذر بیگم نے جلدی سے کہا' "بنو ابھی ڈاکٹر صاحب آتے ہوں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ تم رات تھک بہت گئی تھیں۔"

بنوبی بولیں' "باجی۔ کھڑکی میں ایک بزرگ بیٹھے ہیں سبز نقاب پہنے۔"

"کوئی بھی تو نہیں۔ کھڑکی میں صراحی رکھی ہے۔" نذر باجی نے جواب دیا۔

بنوبی نے پھر آنکھیں موند لیں۔ غنودگی میں چلی گئیں۔ اور پھر نہ جاگیں۔

پرانے معالج ڈاکٹر دوار کا ناتھ کھوسلہ برآمدے میں داخل ہوئے۔

علی جواد خوش خرم سیٹی بجاتے سنی سائیڈ لوٹے اس وقت ڈاکٹر کھوسلہ اور مقصود دریچے میں کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔

علی جواد نے مقصود سے کہا' "تم کو اگر قرآن شریف پڑھنا آتا ہو تو بیٹھ کر پڑھو میں ابھی آتا ہوں۔" اور غسل کروانے کے لئے لداخی شیعہ عورتوں کو لانے ڈاکٹر کھوسلہ کے ساتھ باہر چلے گئے۔

دس بجے وقت مقررہ پر موہن لال بھلہ صاحب بھبوجی کے ٹیوشن کے لئے آن پہنچے۔ انہیں نذر باجی نے گھڑوں اور تختوں کا بندوبست کرنے بازار بھیجا۔ مقصود قبرستان کے نگراں مولوی صاحب سے ملنے روانہ ہوا۔ وہاں سے لوٹ کر بنوبی مرحومہ کی الماری کے اوپر رکھا قرآن شریف اتارا۔ سرہانے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ پرانا وفادار ملازم روتا جائے۔ تلاوت کلام پاک کرتا جائے[4]۔

آدھ گھنٹے بعد سر اٹھا کر دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ پہاڑی مزدور سرنگ کے اوپر قبرستان میں ایک نئی قبر کھودنے میں جٹ چکے تھے۔ ان کے کدال خنک دھوپ میں چمک رہے تھے۔ "سنی سائیڈ" پر موت کا سناٹا طاری رہا۔

ڈیڑھ سال قبل ثروت آرا نے اپنی علالت کے بعد چچازاد بھائی آل حسنین کو روزیتا ہاؤس' ڈیرہ اسمٰعیل خان سے لکھا تھا' "میں اچھی ہوں۔ میاں زندگی میری لمبی ہے۔ نانی اشرف جہاں سے کم تو جیوں گی نہیں۔ تم بھی آزمالینا۔"

میرا فضل علی بلک بلک کر روتے سولن پہنچے۔ آل حسنین' ان کی والدہ آل زہرا بیگم' الن مراد آباد سے کلکتہ میل میں رات کو سوار ہو کر دوسرے روز سولن وارد ہوئے۔ احباب لاہور سے آئے۔ "سنی سائیڈ" مہمانوں سے بھر گیا۔

پورٹ بلیر

۸ جولائی ۱۹۳۰ء

۳۰ جون کو آٹھ بجے صبح تمہارا تار پہنچا جس سے سکتے میں پڑ گیا۔ بنو کے انتقال کی خبر اس قدر غیر متوقع تھی کہ میں سمجھا تار میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ فوراً چھٹی کی درخواست دی۔ چیف کمشنر نے کہا اگرچہ مجھے تمہارے ساتھ بیحد ہمدردی ہے۔ مگر محض اس بنا پر کہ تم اس حادثہ کے بعد اپنی بیوی کی تسلی اور گھر کے انتظام کے لئے جانا چاہتے ہو رخصت نہیں دی جاسکتی۔ ہاں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ سے ملنے پر چھٹی مل سکتی ہے۔ چنانچہ اب میڈیکل بورڈ بیٹھے گا۔ امید ہے چار مہینے کی چھٹی مل جائے گی۔ اگر مل گئی تو پہلے جہاز سے روانہ ہو جاؤں گا۔

ابھی یہ نظم قلم سے بنو کا مرثیہ مل کر نکلی ہے۔ اسے نیرنگ خیال میں بھیج رہا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ اس نظم سے تمہارا غم اور تازہ ہو جائے گا۔ خدا تمہیں صبر دے۔

تمہارا شریک غم سجاد

۲۷ جولائی ۱۹۳۰ء

السلام علیکم۔ ۷ جولائی کا آل حسنین کا خط مجھے پرسوں کے جہاز سے ملا۔ بنو مرحومہ کی اچانک موت کے حالات معلوم ہوئے۔ مجھے اگر رخصت نہ ملی تو ۱۱ اگست کے جہاز سے سرکاری ڈیوٹی پر کلکتہ جاؤں گا۔ ۱۶ کو پہنچ کر تار دوں گا۔ تم کلکتہ آجانا۔

چچی صاحبہ کی خدمت میں آداب

سجاد حیدر

نذر بیگم کلکتہ نہیں پہنچیں۔ تین ہفتے کی چھٹی پر سولن آئے۔ انڈمان لوٹنے سے قبل بہن اور بھائیوں سے ملنے میرٹھ چلے گئے۔ بیشتر عزیز و اقارب تین ماہ تک "سنی سائیڈ" میں مقیم رہے۔ برسات کے بعد قبر پختہ کرانے انعام اللہ شاہ پھر لاہور سے تشریف لائے۔ کتبہ لاہور سے بنوا کر لائے تھے۔ اس کنبے کے جوانا مرگوں کی قبریں بنوانا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں مصطفےٰ باقر مرحوم کی قبر عیش باغ میں انہوں نے بنوائی تھی۔ اب دن بھر وہ اور الن میاں دھوپ میں چھتریاں لگائے کھڑے مزدوروں کی نگرانی کرتے۔

اکتوبر کا مہینہ آیا۔ سرنگ کے اوپر بکھری قبروں نے خزاں کی پتیوں کی لحاف اوڑھ لئے۔

نذر بیگم نے پورٹ بلیر کے لئے رخت سفر باندھا۔ خدا حافظ کہنے کے لئے چودھری ظفر اللہ خاں' امتیاز علی تاج' ڈاکٹر بہادر علی شاہ وغیرہ وغیرہ سولن آئے۔

پلیٹ فارم پر کھلونا ایسی ٹرین آکر رکی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ اسٹیشن کے دائیں طرف والی سرنگ پر دور "سنی سائیڈ" نظر آرہا تھا۔ دوسری سرنگ کے اوپر قبرستان میں ثروت آرا فضل علی کی اونچی مسقف قبر صاف دکھلائی دے رہی تھی۔ ایک انجن سیٹی بجاتا شائیں شائیں کرتا آکر زمین سے لگ گیا۔

اینگلوانڈین گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے عزیزوں اور دوستوں نے رومال لہرانے شروع کئے۔

ٹرین کچھ دور چل کر قبرستان کے نیچے والی تاریک سرنگ میں داخل ہوئی اور گھڑگھڑ کرتی دوسری طرف روشنی میں جانکلی۔ بنوبی کا مزار یک لخت آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

شملہ کالکا ریلوے لائن پر ایک نظارہ۔

سولن سے مراد آباد لکھنؤ۔ لال کرتی پہنچ کر چھوبی بیمار پڑ گئے۔ لہٰذا کلکتہ کے بجائے بغرض علاج اورئی جہاں ڈاکٹر وحید الدین حیدر میرٹھ سے ٹرانسفر ہو کر آچکے تھے۔

اورئی میں بھتیجے کی صحت یابی کے بعد ان کے چھوٹے چچا جان انہیں سیر کرانے کالپی لے گئے۔

"غدر سے پہلے" انہوں نے بھتیجے سے کہا' "ہمارے نانا میر بندے علی ترمذی یہاں تعینات تھے۔"

کالپی کی جھیل میں چاروں طرف سرکنڈے جھکے ہوئے تھے اور ابلق اور لم ڈھینگ کنارے پر مراقبے میں مصروف تھے اور ڈاکٹر وحید الدین حیدر سولا ہیٹ پہنے بندوق سنبھالے کشتی پر سے مرغابیوں کا شکار کرتے تھے۔

بندیل کھنڈ کے گھنے پر خطر جنگلوں میں ہر طرف شکاریوں کی گولیاں سنسنا رہی تھیں۔ غضنفر علی نقوی عرف لڈن جو انڈین پولس کے مقابلے میں اول آئے تھے اس وقت نزدیک للت پور میں تعینات تھے۔ ایک روز وہ نذر باجی کو اورئی سے سیدھے شکار کے کیمپ لے گئے۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ لڈن میاں کی دلہن زہرا نے اس ہفتے دو شیر مارے تھے۔ رات کو شیر کے دہاڑنے کی ہیبت ناک آوازیں کیمپ میں آتیں۔ ایک یخ بستہ صبح سول سرجن اورئی کا چپڑاسی ڈاک لے کر اس جنگل بیابان میں وارد ہوا۔

پورٹ بلیر

۱۶۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

السلام علیکم

میں نے تمہیں بلانے کے لئے میاں وحید کو خط لکھا تھا اور اس میں چیک بھی ملفوف کر دیا تھا۔ تمہارا تار ملا۔ میں نے فوراً تار دیا کہ براہ مدراس چلی آؤ۔ اس پر تمہارا تار ملا کہ مدراس سے نہیں آسکتی۔ اب ۸ فروری کو کلکتہ سے آؤ۔ ۲۴ نومبر کے جہاز سے چلتیں تو انتظام درہم برہم نہ ہوتا۔ بیچارے احمد رشید کا خط آیا ہے کہ میں الٰہ آباد سے بھاگا بھاگا کلکتہ پہنچا لیکن چچی جان نہ آئیں۔

یہاں موٹر کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔ دورہ بھی کرائے کی موٹر میں کرنا پڑتا ہے۔ نئی موٹر کلکتے میں پڑی ہے۔ بہت قیمتی اور بھاری موٹر ہے۔ ایک گیلن میں چودہ میل چلتی ہے۔ میاں نصیر کی ایک گیلن میں ۳۰ میل جاتی ہے۔ میں نے نصیر کو لکھا تھا وہ اسے لے لیں اور اپنی مجھے

دیدیں۔ تم نے وہ خط انہیں بھجایا نہیں۔ آج جہاز کا ایک اور پروگرام ملفوف کرتا ہوں۔ اگر ممکن ہوا تو خود ہندوستان آجاؤں گا۔

سجاد

ایک روز سہ پہر کے وقت لڈن میاں برجس پہنے گھوڑے پر سوار بگٹٹ شکار گاہ میں داخل ہوئے۔ گھوڑے سے اتر کر ایک خیمے کا پردہ اٹھاتے ہوئے آواز دی' "باجی جان۔ بھائی وحید کا ہرکارہ آیا ہے۔ فوراً اورئی چلئے۔ بھائی جان پورٹ بلیر سے آگئے۔"

۳۔ بعبور دریائے شور

تعزیرات ہند میں سب سے پہلے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا غدر ۱۸۵۷ء کے جانبازوں کے لئے مقرر کی گئی تھی اور ایشیا کا سب سے بڑا زنداں سیلولر جیل ان کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ ایس۔ ایس۔ مہاراجہ نے جس وقت کلکتہ سے لنگر اٹھایا اور عرشہ پر بینڈ نے "رول بریٹینیا" بجایا اس وقت جہاز کے "ہولڈ" میں متعدد دہشت پسند سیاسی قیدیوں کو مقفل کیا جا چکا تھا۔

چند روز بعد افق پر وہ مرجانی جزیرے نمودار ہوئے۔ پھر جہاز پورٹ بلیر کی جیٹی سے جالگا۔ بینڈ نے دوبارہ "رول بریٹینیا" بجایا۔

سرسراتے پام اور "پگوڈا ٹری" ناریل کے جھرمٹ اور ٹروپیکل پہاڑ۔ اسکاٹش پلانٹرز کی نو آبادیاں پورٹ کارنوالس' آبرڈین' ایلفنسٹن ہاربر۔ ربر کے جنگلات۔ قہوہ اور فیلاسن کے کھیت جن میں ہزاروں ہزار قیدی بیگار میں مصروف تھا۔

انڈامان ملایائی بھاشا کے ہندومان کی انگریزی شکل ہے۔ جزیروں کے ہنومان بے چارے بندر نما وحشی زہر آلود تیروں سے شکار کھیلنے میں مصروف تھے اور آگ کے استعمال سے ناواقف تھے۔ انڈامان نکوبار کا آخری جزیرہ ڈچ ایسٹ انڈیز سے صرف اسی میل دور ہے۔

ہمارا مکان جو "بڑا بنگلہ" کہلاتا ہے اونچے چوبی کھمبوں پر استادہ ایک سرسبز پہاڑی پر جھلملاتا ہے۔ سامنے ربر کے درختوں کا جھرمٹ ہے۔ پہاڑی پر چھالیا اور کاجو کے درخت سرسراتے ہیں۔ برآمدے کے خلیجی دریچوں سے سمندر نظر آتا ہے۔ باغ کی ڈھلوان پر نیلے پردوں والی سفید سرکاری لانچ بندھی کھڑی ہے۔ اس پر سوار ہو کر ابا جان دوسرے جزیروں کے دورے پر اور کبھی "دم والا کوٹ" پہن کر سرکاری تقریبوں میں جاتے ہیں۔

نچلی منزل میں جو چوبی کھمبوں کے جنگل پر مشتمل ہے مسلح گارڈ کے علاوہ مختصر سا فائر انجن اور آگ بجھانے کا عملہ مستعد رہتا ہے۔ حکومت ہر طرح کے انتظام سے لیس ہے۔ ایک تو یہ کہ زلزلے اکثر آتے رہتے ہیں۔ لکڑی کے بنگلوں میں آگ لگ سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کیا جانیئے کس وقت بفرض محال غدر شروع ہو جائے یا کوئی سیاسی مفسد سرکاری افسروں کے بنگلوں کو آگ دکھا دے۔ پورٹ بلیر بذریعہ لاسلکی

کلکتہ سے منسلک ہے۔ مسٹر رابرٹ و گنیز انگریز ریڈیو آفیسر اپنے کیبن میں چوکس بیٹھا رہتا ہے۔ پڑوس کے بنگلے میں ایک انگریز افسر مسٹر برن مقیم ہے۔

بڑا بنگلہ کے آٹھ عدد سرکاری ملازموں میں سے بیشتر پنجابی کسان ہیں جنھوں نے بسلسلہ زر' زمین' زن قتل و خون کئے۔ اب بڑے دیندار اور نیک مسلمان ہیں۔ نور محمد بیرہ پنج وقتہ کا پابند ہے۔ بری منہ سویرے سر پر رومال باندھے پچھلے زینے پر سورج کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور بنگلے کے چوبی فرش کو شیشے کی طرح چمکاتا ہے۔

برآمدے کے ایک کونے میں پرانی وضع کا ٹیلی فون رکھا ہے۔ پھاٹک پر مسلح سنتری ٹہلتے ہوئے بار بار بندوق کا دستہ بجاکر آواز دیتا ہے "ہالٹ حکم صدر۔ "یعنی "ہالٹ ہو کز دیر!"

رات کو دور سمندر میں روس آئی لینڈ کی روشنیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں چیف کمشنر کرنل فیرار رہتا ہے اور اس کی میم آئے دن پارٹیاں دیتی ہے جن میں شرکت کے لئے اماں لانچ میں سوار ہو کر جاتی ہیں۔

۲۱۔ جولائی ۱۹۳۰ء

ڈیر جلیل

انڈامان کا جزیرہ بہت بدنام ہے مگر یہاں عیش بھی ہے۔ کالے آدمیوں کے لئے نہیں جن کی قسمت میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں' بلکہ انگریزوں کے لئے۔ ان کی آبادی الگ ہے۔ بنگلے ہیں۔ سبزہ ہے۔ کلب ہے جس میں میمیں اور انگریز ہر طرف نظر آتے ہیں۔ مگر ہندوستانی شاذ و نادر۔ میں بھی اس کلب میں شامل کر لیا گیا ہوں مگر چونکہ نہ ناچنا آتا ہے نہ پینا الو کی طرح بیٹھا رہتا ہوں۔

میری سستی دیکھئے۔ اب تک یونیورسٹی سے امتحان کا معاوضہ اور سفر خرچ وصول نہیں کیا۔ اور مجھے تاریخیں یاد نہیں۔ عظمت الٰہی کو لکھا ہے میرائی۔ اے بل اور نیز زبانی امتحان کے معاوضے کا بل بنا کر بھیج دیجئے۔ نہایت ممنون ہونگا۔ ایک میٹنگ اردو ڈپارٹمنٹ کی اٹینڈ کی تھی۔ دوسری مرتبہ زبانی امتحان لینے علی گڑھ گیا تھا۔

ہاں۔ وہ نظم "آج تو ماٹل مقصود ہوا خوب ہوا۔" جو سیدین کی شادی پر لکھی تھی علی گڑھ میگزین میں بھیج دی تھی۔ شائع ہو گئی ہو تو میگزین کی ایک کاپی مجھے بھجوا دیجئے۔

خاکسار

سجاد حیدر

پورٹ بلیر میں اسکول نہیں تھے۔ صاحب لوگ کے بابا لوگ پڑھنے کے لئے ولایت بھیجے جاتے تھے۔ بھبوجی کی تعلیم کا حرج ہو رہا تھا۔ تازہ پانی عنقا تھا۔ جہاز پر سوڈا واٹر کی بوتلیں کلکتے' مدارس' رنگون سے آتی تھیں۔ پانی کی جگہ پی جاتی تھیں۔ نہ جانے جیل کے قیدی اور باقی ساری آبادی کس طرح گذر کرتی تھی۔

جزائر انڈمان و نکوبار کی رنیویو کمشنری کا "چانس" چھوڑ کر ایک بار پھر ہندوستان واپس جانے کی

درخواست دی۔ غازی پور تبادلے کا حکم ملتے ہی ذاتی فائر بریگیڈ' مسلح گارد وغیرہ کے ٹھاٹ باٹ چھوڑ پہلے جہاز سے ہندوستان واپس ہوئے۔

آگئے سجاد حیدر کالا پانی کاٹ کے [5]

گورا چاند روڈ' انٹالی پارک سرکس میں صدیقہ بی بی کا مکان موتی کے پردوں سے مزین اور صحن پام کے گملوں سے سرسبز تھا۔ کمروں میں محمڈن اسپورٹنگ کلب کے گروپ فوٹو آویزاں تھے۔ باہر تازہ ماڈل کی نیلے رنگ اور سیاہ مڈگارڈز والی "لینڈو باڈی" اوک لینڈ کھڑی تھی جس کی آدھی چھت سامنے سے کھل سکتی تھی۔ کھڑکیوں میں کٹ گلاس کے گلدان آویزاں تھے اور سیٹیں سرمئی مخمل کی تھیں۔ اسے پچھلے برس کالے پانی جاتے وقت خریدا تھا۔ صدیقہ بی بی کے گورکھپوری خانساماں کے ذریعے اس کا ہم وطن ڈرائیور منگوایا گیا۔ موصوف کا نام بشیر خاں تھا۔ مراد آباد سے سید آل حسنین کا ارجنٹ تار باجی کے نام پہنچا۔ گورداسپور میں مقدمے کی تاریخ پڑ گئی ہے۔ جلد از جلد وہاں پہنچئے۔ بشیر خاں کو موٹر اور شاہ منیر عالم کے نام خط دے کر غازی پور روانہ کرنے کے بعد گورداسپور کا عزم کیا۔

۴۔ گورداسپور کی پیرزادی

نذر زہرا بیگم کے پردادا خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای۔ بالقابہ مراد آباد اور گورداسپور میں خاصی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ ضلع مراد آباد میں ان کے دو عدد گاؤں جیت پور اور حمیر پور اغیار خورد برد کر چکے۔ گورداسپور کی دوکانیں' سرائے اور باغات انبہ مرحوم و مغفور کے دو پوتوں میر فیض العسکری اور میر ظہور حسنین مرحوم کے ترکے میں شامل تھے۔ کوٹھیاں مراد آباد اور شہر گورداسپور کی منجھلے پوتے میر نذر الباقر مرحوم کی اولاد یعنی اب صرف مسماۃ نذر زہرا بیگم زوجہ سید سجاد حیدر کے حصے میں آئی تھیں۔ گورداسپور کی کوٹھی پر اغیار نے دعوے دائر کر رکھا تھا۔ دوکانوں پر (جو سید آل حسنین کی ملکیت تھیں) مسمی سردار اچھر سنگھ قابض تھے۔ اور ان سب سے مقدمہ بازی مسماۃ نذر زہرا اور سید آل حسنین بی اے' ایل ایل بی کا خاص مشغلہ تھا۔

لاہور سے میر افضل علی اور سید انعام اللہ شاہ کو ہمراہ لئے داخل گورداسپور ہوئے۔ اسٹیشن سے دو تانگوں میں سوار ہو کر لب دریا ایک سنسان لق و دق کوٹھی پر پہنچے۔ میر افضل علی نے جیب سے کنجی نکال کر صدر دروازے کا قفل کھولا۔ بھائیں بھائیں کرتے گول کمرے میں' جس کی نیلے تھوتھے کی قلعی سفید پڑ چکی تھی نوواردوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

اچانک انعام اللہ شاہ نے نعرہ لگایا' "ربا۔ ربا۔ آج۔ میر نذر الباقر کی اولاد میں سوائے باجی جان کوئی وارث اس کوٹھی کا زندہ نہیں۔ مصطفےٰ باقر۔ بنو باجی۔ دنوں کو تو نے اٹھالیا۔ ربا دے ربا۔"

یہ فریاد سنتے ہی باجی جان اور افضل علی نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ خود گریہ و بکا میں شریک ہوئے۔

سجاد حیدر جو جذباتیت کے معاملے میں اپنے نہٹوری خاندان کے مانند ہی برٹش اور متوازن تھے چپ چاپ تینوں کے ساتھ ساتھ ایک کمرے سے دوسرے ڈھنڈار کمرے میں گھومتے پھرے۔ کبھی کبھی ٹھٹک کر دیواروں پر لگے بھاری فریموں والے نیالے زرد انگلش پرنٹ دیکھنے لگتے۔ ڈائننگ روم کے آتش دان کے اوپر ایک وسیع و عریض لیتھو گراف تر موگھاٹ کے معرکے کا آویزاں تھا۔ کہ گھوڑے پر سوار جنرل نکلسن سیالکوٹ اور جہلم کے باغیوں کا بھرتہ بنا رہا ہے۔ بتاریخ ۱۲۔ جولائی ۱۸۵۷ء۔

ایک سائیڈ روم میں بڑی دو آب کنال کے پرانے فارسی اور اردو سرکاری کاغذات کا انبار فرش پر پڑا تھا وہیں پر نکلسن سائیں اور لارنس صاحب کے عہد کا نیم شکستہ فرنیچر انبار کی صورت میں موجود تھا۔ اگر یہ سامان' تصاویر اور کاغذات محفوظ کر لئے جاتے آج چنڈی گڑھ میوزیم میں رکھنے کے قابل ہوتے۔

دفعتاً ایک طرف سے پر اسرار کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ اینٹوں کے فرش پر عصا بجاتے کھانستے کھنکارتے کمر خمیدہ بوڑھے لپوسہ سفید ریش بزرگ۔ کشمشی رنگ کا پگڑ' لمبا کوٹ' شلوار' پشاوری چپل گول کمرے میں داخل ہوئے۔ کراری آواز میں فرمایا' "السلام علیکم!" پیچھے پیچھے خدام کھانے کے خوان لئے اندر آئے۔

"برخوردار۔ میں شاہ صاحب مرحوم کا دوست نیاز مند الطاف حسین شاہ ہوں۔" پیر مرد نے اس طرح کہا گویا میر قائم علی ابھی ابھی دوسرے کمرے سے نکل کر آتے ہی ہوں گے (مرحوم نے ۱۸۷۷ء میں رحلت فرمائی تھی) خدام نے کمروں کی کھڑکیاں کھولیں۔ تازہ ہوا کے جھونکے داخل ہوئے۔ شہر کے دو طرفہ وہ نہریں بہہ رہی تھیں جن کی کھدائی کے انتظام کے سلسلے میں میر قائم علی لکھنوی ۱۸۵۶ء میں کانپور سے یہاں بھیجے گئے تھے۔ بڑی پر فضا جگہ تھی۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ڈپٹی قائم علی نے رام گنگا اور گومتی کنارے واپس جانے کے بجائے ستلج اور راوی کو اپنایا۔ یہیں جئے اور یہیں دفن ہوئے۔

باہر باغ کے ایک گوشے میں بیری تلے ڈپٹی صاحب کا لپا پتا سفید مزار اسبز چادر سے ڈھکا دور سے نظر آرہا تھا۔ سبز جھنڈیاں دریائی ہوا میں سرسراتی تھیں۔ چبوترے پر جلوہ افروز مجاور نے تسبیح ہزار دانہ جھلاتے ہوئے عقابی نگاہوں سے اجنبی مہمانوں کو تاکا۔ اپنی طرف آتے دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہوئے۔

درگاہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی' "مزار پر انوار پر عرصہ تک شامیانہ لگا رہا۔ پھر معتقدین نے چندہ کر کے قبہ تعمیر کروایا۔ شاہ صاحب کے وصال مبارک کے بعد جو قرآن خواں مقرر ہوا تھا اس کی فوتیدگی کے بعد والد مرحوم مقرر ہوئے۔ اب خادم انچارج ہے۔ ہر طرح کی مرادیں یہاں سے بفضل الٰہی پوری ہوتی ہیں۔ چوتھیا جاڑے کو شفا بے اولادوں کو اولاد۔ ہندو مسلمان سبھی اس بابرکت بیری کے پتے توڑ توڑ کر لے جاتے ہیں۔

"کمال ہے واقعی۔" سجاد حیدر صاحب نے خشکی سے کہا۔

مجاور صاحب نے جن کے رشتہ دار کوٹھی پر قابض ہونا چاہتے تھے' بات جاری رکھی۔ "مرشد زادے میر مظہر علی علیہ الرحمتہ کے مزار سے بھی فیوض جاری ہیں لودھراں شریف ضلع ملتان میں۔ مگر کیا

عرض کروں۔ میر قائم علی شاہ کے پوتے۔ مظہر علی شاہ کے تینوں صاحبزادے بداعتقادے لاابالے نکل گئے۔ بی بی معاف فرمائیں۔ آپ کے والد مرحوم اور دونوں چچا ایک آدھ باری یہاں آئے۔ جائداد سے کوئی دلچسپی ان کو نہیں۔ اس کی نگرانی ہم لوگ ہی کرتے ہیں۔ فصل پر تینوں بھائیوں کو پھل فروٹ بھیج دیا کرتے تھے۔ جب میرے اباجی فوت ہوئے میں مختار بنا۔ اس ساری جائداد کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تھی۔ تینوں بھائیوں نے فروخت نہ کی۔ مجھ سے فرمایا دادا کی نشانی ہے پڑی رہنے دو۔ اس وقت ہی بیچ ڈالتے۔ آج بی بی اس مقدمہ بازی کے خرچ اور دردسر سے بچ گئی ہوتیں۔"

بی بی جن صاحب سے مقدمہ لڑ رہی تھیں وہ ان مولوی صاحب کے رشتہ دار تھے۔

موسم بہت خنک تھا۔ شام کو سجاد حیدر زکام میں مبتلا ہو گئے۔ رات پڑے الطاف حسین شاہ اپنے گھر سے کھانے کی سینیاں اٹھوائے تشریف لائے۔ نذر بیگم نے ان سے کہا' "واہ دادا جان۔ ہمارے پردادا کے مزار پر سنا ہے مریض آکر شفایاب ہوتے ہیں یہاں تو لوٹا الٹا گھوم گیا۔"

"توبہ توبہ بٹی ایسے کلمات ناواجب زبان سے نکالیں۔ سردی کی وجہ سے برخوردار کو ذرا سی چھینک آئی اور آپ کا ایمان ڈول گیا۔"

سجاد حیدر نے ان جنتی بزرگ کا دل رکھنے کے لئے کہا' "دادا جان آپ مجھے بھی مقدس بیری کا ایک پتہ منگوا دیجئے۔"

"بہت خوب ابھی لیں!" شاہ صاحب نے کہا اور خوش خوش عصا ٹیکتے فوراً باہر گئے۔

دوسرے روز جمعرات تھی۔ مزار پر صبح سے بھیڑ لگ چکی تھی۔ ناشتے کے بعد سجاد حیدر' افضل علی' انعام اللہ اور نذر بیگم فاتحہ پڑھنے باغ میں پہنچے۔ اسی وقت دو بگھیوں پر سوار چند دولت مند خواتین شٹل کاک برقعوں میں ملفوف چادریں چڑھانے درگاہ پر حاضر ہوئیں۔ الطاف حسین شاہ اپنی ٹمٹم پر تشریف لا چکے تھے۔ ماشاءاللہ سن شریف نوے (۹۰) سال کا تھا۔ اے۔ ای۔ سی رہ چکے تھے۔ پینتیس برس سے پنشن پا رہے تھے اور شہر کی مقتدر ہستی تھے۔ انہوں نے برقعہ پوش خواتین سے فرمایا' "بی بیو خوش نصیب ہو۔ زیارت کر لو۔ ہمارے پیر صاحب کے پڑپوتے میر افضل علی شاہ اور پڑپوتی بی بی نذر سجاد۔"

"اور پڑپوت داماد میر سجاد حیدر شاہ۔" سید انعام اللہ شاہ نے متانت سے اضافہ کیا۔

خواتین نے آگے بڑھ کر بے پردہ پیرزادی کے پیر چھوئے۔ ایک بی بی نے اس حقیر فقیر کو گود میں اٹھایا۔ مرشد زادی کو ساتھ لے کر مجاور صاحب کے حجرے کی طرف چلیں۔ اندر جا کر مرشد زادی کو پلنگ پر بٹھایا۔ خود نقاب الٹ کر فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔

نذر بیگم نے گھبرا کر کہا' "ارے آپ لوگ نیچے کیوں بیٹھی ہیں۔"

"اسی تو اڈے کول بیٹھنے دے لائق آں؟"

نذر بیگم دفعتاً آگ بگولہ ہو کر اٹھیں' "سنئے میں پیرزادی ہرگز نہیں ہوں۔ اور یہ صاحب جن کی قبر آپ لوگ پوج رہی ہیں پیر ویر بالکل نہیں تھے۔"

مستورات نے بھونچکی ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"خدا جانے اس حرفتی مجاور نے آپ لوگوں کو کیا اول فول بتا رکھا ہے۔ غور سے سن لیجئے۔ میرے پر دادا غدر سے پہلے کانپور میں تحصیلدار تھے۔ پنجاب آکر ڈپٹی کلکٹر وغیرہ ہو گئے۔ سرکار کی خدمت کی اور خطاب پائے۔ کسانوں کی بھلائی کے لئے قانون بنائے۔ مگر ولی اللہ کہاں سے ہو گئے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بڑی جہالت کی بات ہے۔ ان کی قبر کی پرستش نہیں کرنی چاہئے۔ آپ لوگوں کو۔"

وہ مومن بیویاں سمجھ گئیں کہ کرسٹانوں کے اثر میں آکر پیرزادی کا ایمان خراب ہو چکا ہے۔ لیکچر کا مطلق نوٹس نہیں لیا اور اسی رات کھانے کے پر تکلف خوان سجا کر اپنے گھر سے کوٹھی پر بھجوائے [6]۔

۵۔ بشنو خروش ننگ لا

راقم الحروف پیرزادی کے لئے روایت ہے حسنین ماموں اور الن ماموں نے اذان و اقامت کانوں میں پھونکی اور سن شریف چھ روز کا تھا جب بوجہ علالت شدید رنگ نیلا پڑا۔ اسم نیلوفر رکھا گیا۔ طبیب نے ایک پہلوان ہبوڑن شہر آگرہ سے بطور انا منگوائی۔ کہ خانہ بدوش (اور غالباً جرائم پیشہ) قبیلہ ہبوڑان سے تعلق رکھتی تھی۔

بعد کچھ مدت کے خالو میر افضل علی نے نیلوفر منسوخ فرما کر زریں تاج طاہرہ کے اسم گرامی پر نام قرۃ العین رکھا۔ وہ ایک ناعاقبت اندیش خاتون تھی جو مار کر کنویں میں پھینکے جانے سے قبل۔

توچو فلس ماہی حیرتی چہ زنی زبحر و جودم
بنیش چو طوطی و دمبدم بشنو خروش ننگ لا

قسم کے اشعار قلمبند کرتی تھی۔

خداوند کریم نے اپنے فضل و کرم سے VIDEO_TAPING یادداشت عطا کی۔ چنانچہ اڑھائی برس کی عمر سے چند مناظر ذہن میں محفوظ ہیں۔

ایک بہت بڑا روشن کمرہ' سبزبانات کی وسیع میز' اس پر کاغذات' سفید جھالر دار فراک۔ ابا جان نے اٹھا کر کاغذوں پر بٹھایا۔ ابا جان کی آواز. یہ ہمارا پیپر ویٹ ہے۔

ایک نم' تاریک سے غسل خانے کا دروازہ۔ کالی عینک پہنے شاہد بھائی دانتوں پر برش کر رہے ہیں۔ "آپ کا کیا نام ہے؟"

"طوطا۔" (روایت ہے کہ احقر بیحد باتونی تھی اور طوطا کہلاتی تھی۔ خود اپنا اصل نام یہی سمجھتی تھی)

ایک بڑا سا ہوٹل۔ فرکوٹ پہنے اماں۔ ڈائننگ ہال میں انگریزوں کی باتوں اور چھری کانٹوں کا شور۔

مراد آباد۔ الن ماموں کی آواز۔ جھجھو جھونٹے۔ ماموں موٹے۔ ممانی کھوٹی۔

نہٹور۔ دادا جان کے مکان کا برجی والا کمرہ۔ تیز برقی روشنی۔ بھابی محمودہ بھورے سموری کوٹ میں بڑا سا بٹن ٹانک رہی ہیں۔

مراد آباد۔ سر رضا علی کا مکان رات کا وقت زنانی مجلس۔ غریب عورتوں کا ہجوم۔ ایک موٹی سی لڑکی حصے بانٹ رہی ہے۔ پھر قہقہہ لگا کر اماں سے کہتی ہے "دیکھا آپ نے ان سب کو حصے دیئے۔ دوسرے دروازے سے پھر آگئیں۔" (یہ بڑا کربناک منظر رہا ہو گا)

الموڑہ۔ "سورج ہاؤس" کے نیچے گہری وادی۔ میں مستقل روئے جا رہی ہوں۔ غصہ ور حسنین ماموں اٹھا کر جنگلے سے نیچے لٹکا دیتے ہیں۔ "چپ ورنہ نیچے پھینک دوں گا۔" آل زہرا نانی۔ گھر سواں پائجامہ گورا سفید رنگ۔ دہل کر دوڑتی ہیں۔ "ہے! ہے! لونڈیا کھڈ میں گر جائے گی۔"

دہرہ دون بھائی اور میں اماں کے ساتھ اوک لینڈ میں ایک سڑک پر سے گذر رہے ہیں۔ دفعتاً اماں کہتی ہیں "وہ سامنے جواہر لعل نہرو بیٹھے ہیں۔ غور سے دیکھ لو۔"

دور برآمدے میں ایک صاحب سر کے پیچھے ہاتھ رکھے آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ہم لوگ احاطے کی دیوار کی طرف دوڑتے ہیں۔ اماں بھی اتر آتی ہیں۔ وہ صاحب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ چند منٹوں تک انہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر اپنے رستے چلے جاتے ہیں۔

ایک ریلوے اسٹیشن۔ رات کا وقت۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رکی کھڑی ہے۔ چچی وحیدہ پلیٹ فارم پر موجود ہیں۔ ان کا مسکراتا شفیق چہرہ۔ ایک گڑیا کمپارٹمنٹ کی دہلیز سے اندر سرکا دیتی ہیں۔

لاہور نمبرے ریلوے روڈ۔ دارالاشاعت پنجاب پھاٹک کے ایک طرف شاید "پھول تہذیب" کے دفاتر۔ اندر کیارہ سا۔ صحن چمن۔ اندھیرا سا ڈرائنگ روم۔ پیانو۔ میں پیانو کے پردوں پر انگلیاں مارتی ہوں۔ دبلے پتلے عینک لگائے امتیاز بھائی اشارے سے منع کرتے ہیں۔

یہ منظر صرف اتنا ہی یاد ہے۔ باقی "ایام گذشتہ" سے۔

نمبرے ریلوے روڈ انارکلی کے قریب شہر کے وسط میں واقع ہے۔ ماموں انعام اللہ شاہ وہاں آکر بچہ ہا کو بازار لے جاتے اور خوب الا بلا کھلاتے۔ احقرہ بیمار پڑ گئی۔ بھوک بند۔ تیز بخار۔ اب بے چارے ماموں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے۔ ڈاکٹر پہ ڈاکٹر بلا کر لائیں۔ ایک نیا مرض پیدا ہوا۔ کھانا پینا ترک اور چپ کا روزہ۔ مولوی ممتاز علی' بھائی حمید علی' امتیاز علی تاج' انعام اللہ' نوازش علی شاہ سب کے سب کھانے کے لئے خوشامدیں کر رہے ہیں۔ یہاں ایک ہی جواب "حلق نہیں کھلتا۔" ڈاکٹر نے کہا" اچھا چمچی سے حلق کھولیں؟" اشاروں سے وہی جواب ''حلق نہیں کھلتا۔''

ڈاکٹر صاحب چائلڈ سائیکولوجی سے واقف تھے۔ چال بھانپ گئے۔ ادھر خاکسار نے بعمر تین سال تاڑ لیا کہ ڈاکٹر صاحب بھی کافی چلتے پرزے ہیں۔ بولے '' بی بی۔ بیشک تم بھی مجبور ہو گیا کرو۔ تمہارا حلق ہی نہیں کھلتا۔ اور یہ بھلے لوگ زبردستی تمہیں دودھ ساگودانہ کھلانا چاہتے ہیں جس سے تم کو نفرت ہے۔ ہیں نا؟ بالکل ٹھیک!"

کمرے کے باہر جا کر انہوں متحیر آواز میں اماں اور مولوی صاحب سے کہا' "آپ کو معلوم ہے کہ اسے ساگودانہ برا لگتا ہے۔ اور آپ لوگ وہی ٹھنسائے جانے پر مصر ہیں۔ اس نے اپنے بچاؤ کی یہ ترکیب نکال لی۔ اسے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ آپ سرہانے میز پر انگور سنترے اور انار کا رس رکھ کر غائب ہو جائیے۔ اور اسے یہ بھی نہ معلوم ہونے پائے کہ آپ لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ اس نے پھل کھالئے ہیں۔ نیپکن سے ڈھک کر رکھیئے گا۔ میں فیس کریم بھیجتا ہوں۔ اس سے کہئے خود ہونٹوں پر لگالے۔ یہ ایک بہانہ ہے۔ آج ہی سے کھانا شروع کردے گی اور خود بتائے گی کہ دوا لگانے سے حلق کھل گیا۔ اپنی ضد پوری کرنے اور خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے دو دن سے بھوکی پڑی ہے۔"

وہ ایک نہایت سمجھ دار طبیب تھا۔ اس کی ہدایت پر عمل کیا گیا اور خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ شام کو انعام اللہ ماموں آئے۔ میں نے ان سے کہا' "دوا لگانے سے تھوڑا تھوڑا حلق کھل گیا۔ اس عجیب و غریب مرض کی خبر دوستوں میں پھیل چکی تھی۔ رات کو لیڈی ذوالفقار علی خاں دیکھنے آئیں۔ ناچیز آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں ربن لگانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ معلوم ہو گیا تھا کہ مزاج پرسی کے لئے مہمان آرہے ہیں۔ حلیہ درست کرلینا چاہئے۔

"لیڈی ذوالفقار یہ تیز فہمی دیکھ کر بہت خوش ہوئیں [7]۔ "یا ہران کا موئز دم بخود کھڑا تھا۔

٦۔ کولونیل سوشل لائف ایسٹ آف سوئیز

سنسناتے گیس کی سرد نیلگوں روشنی میں مسٹر آر۔ ایچ نبلٹ کنارے والی پلیٹ پر سر جھکائے وقار کے ساتھ گنگا کی مچھلی شیفلڈ کے چھری کانٹے کے ذریعہ نوش کرنے میں منہمک تھے۔ سفید براق صافے کی زرد اور سرخ نواڑی پٹی پر "ایس۔ ایچ" کا نقرئی مونوگرام لگائے سفید چپکن پر چوڑی زرد و سرخ نواڑی پٹی باندھے ننگے پیر دبے پاؤں چلتے دوسرا کورس سرد کرنے کے لئے پلیٹیں بدلتے عبدل مسٹر نبلٹ کے نزدیک پہنچے۔

طویل میز کے دونوں جانب میجر گیرڈ (آئی۔ ایم۔ ایس) سول سرجن ضلع و مسز گیرڈ' مسٹر جمیل خاں (انڈین پولس)' صاحبزادہ و بیگم رشید الظفر خان' مسٹر و مسز فلپ مرفی' مسٹر امجد علی منیجر اوپیم فیکٹری و مسز امجد علی' مس حمید جہاں بی اے (لندن) انسپکٹر آف اسکولز' ڈاکٹر زبیدہ صالح انچارج فی میل ہسپتال' ڈاکٹر و مسز سین رائے' اور صاحب خانہ و خاتون موجود تھے۔ اس وقت موضوع گفتگو وہ طیارہ تھا جو چند روز بعد برائے مظاہرہ ہوا بازی غازی پور آنے والا تھا۔

میز کے وسط میں گلاب مہک رہے تھے۔ ایک سائیڈ بورڈ پر ساس بوٹ اور فنگر بول رکھے تھے۔ فنگر بولز میں گلاب کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ مدتوں قبل اسی عمیق ڈرائنگ روم میں فری میسن فرنگی اپنے پر اسرار ڈنر کھاتے تھے۔ عام نیٹو آج بھی اس کوٹھی کو "جادو گھر" کے نام سے یاد کرتا تھا۔ باہر لارڈ کارنوالس کا عظیم الشان مقبرہ استادہ تھا۔ سن وفات ۱۸۰٦ء بعارضہ ہیضہ۔ مقبرے کی مرمریں دیواروں پر فرنگی

افسروں اور نیٹو سپاہیوں کی سنگی تصاویر توڑے دار بندوقیں الٹی کئے سرنگوں تھیں۔ مرمریں قبر پر مرمریں فرشتے پر جھکائے سایہ فگن تھے۔ اوپر کارنوالس کے مرمریں بت کے دونوں جانب ایک ہندو اور ایک مسلمان نیٹو کے مجسمے نصب تھے نیچے میزان عدل۔ بڑا علامتی گروپ تھا۔

فاتح اعظم جو بہار اور مشرقی دو آبے کا استمراری بندوبست کرتا دورے پر غازی پور آیا تھا یہاں پہنچ کر کالرا کا شکار ہوا۔

۱۸۷ء میں ڈائرکٹر گل کرسٹ نے غازی پور میں نیل اور افیون کے کارخانے قائم کئے تھے۔ گنگا کی بندرگاہ جو عہد مغلیہ میں دو آبے کی بہار و بنگال سے دریائی تجارت کی گذرگاہ تھی تباہ ہوئی۔ اسی گھاٹ سے غازی پور اوپیم فیکٹری کی افیون یونین جیک کے پھریرے اڑاتے جہازوں پر لد کر براہ کلکتہ چینیوں کو گراں خواب کرنے کے لئے شنگھائی اور کینٹن روانہ کی جانے لگی۔

"جادو گھر" کے ڈائننگ روم سے ملحق گول کمرے میں وہ سیاہ بانات کی اسکرین استادہ تھی جس پر دو قد آدم کار چوبی چینی آستینوں میں ہاتھ دیئے مونچھیں جھکائے فلسفہ کنفیوشس میں مستغرق تھے۔ جس اسکرین کو فاتح برٹش انڈین آرمی کے ایک سپلائی ایجنٹ میر نذر الباقر ۱۹۰۱ء کی باکسر بغاوت کے بعد کینٹن سے لائے تھے اور باکسر بغاوت یوں ہوئی تھی کہ گراں خواب چینی سنبھلنے لگے تھے۔

عبدل کے اب و جد ڈیڑھ سو برس سے غازی پور کے فرنگی حکام اور لالے اور نیل کے پلانٹرز کے ہاں بیرہ گیری کرتے آئے تھے۔ عبدل اپنے ہم وطن مہاتما بدھ کی مانند پر اسرار سے مسکراتے تھے۔ پورب دیس کے بیشتر باشندوں کی طرح مرنجاں مرنج اور مسکین صورت گول مٹول چہرے سے انمٹ شانتی ہویدا تھی۔ عہد عتیق کا گر جاپتی پور جو پچھلے ایک ہزار سال سے سید سالار مسعود و غازی" ہمشیرزادہ محمود غزنوی کے نام پر غازی پور کہلاتا تھا۔ شاہان مغلیہ کی دریائی بندرگاہ' جان کمپنی کی فیکٹری کا مستقر۔ برطانوی ہند کا افلاس زدہ پسماندہ ضلع۔ عبدل اور ان کے آباء سب اپنے اوپر گذار چکے تھے۔ اور اسی وجہ سے اتنے صابرو شاکر' قسمت پر قانع نظر آتے تھے۔ عہد جان کمپنی کی روایات کے مطابق عبدل "سردار" کہلاتے تھے۔ کیونکہ ملازموں کے عملے کے ہیڈ تھے۔

بھائی کوئین وکٹوریہ ہائی اسکول کی چھٹی کلاس میں داخل تھے (جو اسکول سید احمد خاں صدر امین نے مع "سائنٹفک سوسائٹی" بعد غدر بجنور اور مراد آباد سے تبدیل ہو کر یہاں آنے کے بعد قائم کیا تھا۔) جمنا پانڈے مہاراج چپراسی کے ساتھ اسکول جاتے اور واپس آکر آواز دیتے۔ "سردار!" عبدل خوشدلی سے جواب دیتے "کمرچ ہو گئے۔"

جمنا پانڈے بلحاظ شکل و صورت عادات و خصائل سردار کا برہمن اڈیشن تھے۔ وہی نرم نرم گول مٹول گوتم بدھ والی صورت۔ نوکیلی سفید مونچھیں۔ وہی لب ولہجہ۔ باوقار اور فربہ برہمن تھے۔ مہاراج کہلائے جاتے تھے۔ ابا جان اور اماں بھی "مہاراج" اور "آپ" کہہ کر انہیں مخاطب کرتے اور کسی غلط یا چھچھوری حرکت کی ان سے توقع نہیں کی جاتی تھی۔ یہ کاسٹ سسٹم کے حفظ مراتب کا غیر شعوری اثر تھا۔

عبدل کی طرح خوش مزاج تھے اور طبیعت میں ایک نوع کی بے نیازی پائی جاتی تھی۔ دورے کے زمانہ میں ایک مرتبہ ناؤ میں جلوہ افروز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اچانک اطمینان سے بولے "صاحب۔ دیکھئے سامنے ایک ٹھونا کا چلا آوت ہے۔"

ایک مہیب مگرمچھ۔ گنگا کا نام ور آدم خور۔ سیاہ لکیر کی صورت کچھ دور پانی میں چلا جاتا تھا۔ صاحب بیگم صاحب بھی اطمینان سے بیٹھے رہے۔ ابا جان جو اخبار پڑھنے میں مصروف تھے اس کی ایک تصویر اماں کو دکھلا کر بولے "ولایت میں اب لمبے بالوں کا فیشن دوبارہ آگیا۔" اس اثنا میں ناکا غائب ہوا۔

سردیوں میں ابا جان دورے پر نکلتے۔ بشیر کی بیوی گھونگھٹ نکال کر پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں۔ مہاراج بشیر کے برابر فروکش ہوتے۔ نوعمر پنکھا قلی دلیپ باہر فٹ بورڈ پر کھڑا ہو جاتا اور طویل مسافتیں اسی طرح کھڑکی کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑے کھڑے طے کرتا۔ چھولداریاں، دفتری فرنیچر اور دوسرے ملازمین بیل گاڑیوں پر جاتے۔

آم کے باغات میں کیمپ لگتا خیموں کے اندر پرال پھیلا کر ان پر نیلی سرخ دھاریوں والی دریاں بچھائی جاتیں۔ خیموں کی اندرونی زرد اور عنابی چھینٹ کی دیواروں میں چار دروازے اور کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ دوہرے پردے اور چقیں۔ غسل خانے کی چھولداری میں زمین کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہری گھاس پر ٹب، بالٹیاں، حمام، کموڈ۔ میز پر سفید تام چینی کی سلفچی۔ جگ۔ لوٹے۔ مگے۔ بیڈ روم سے غسل خانے تک قنات کی گیلری۔ باہر کھلے آسمان کے نیچے زمین میں گڑھے کھود کر عارضی چولہے تیار کئے جاتے۔ دور آم کے درختوں کے نیچے لالٹین کی روشنی میں گاڑی بان بھوریاں ڈالتے۔ کچھ فاصلے پر عدالتی عملے کی چھولداریاں لگتیں۔ اس منظر اور سو برس قبل کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی کیمپ لائف میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔

پورب اور بہار میں جو صوفیائے کرام اپنے سلسلے قرون وسطیٰ میں پھیلا گئے تھے خانقاہی غازی پور میں ان کے خانوادے ان پر سکون، سرسبز غربت زدہ گاؤوں کے اندر اسی طرح آباد تھے۔ پرانے خاندانوں کے بزرگ جن میں سے اکثر وارثی فقیر تھے بودھ بھکشوؤں کی مانند نارنجی کفنیاں پہنے غنائیہ بحر طویل میں صوفیانہ شاعری کرتے تھے۔ پورب گورکھ ناتھ کے سدھوں کو دیس تھا۔ گھنے باغوں میں پر اسرار مٹھ پوشیدہ تھے جن کے اندھیرے تہ خانوں میں فاقے کر کے اپنے آپ کو ختم کر دینے والے مہنتوں کی سادھیاں پنہاں تھیں۔ ضلع کو کرم ناس ندی بہار کے ضلع شاہ آباد سے جدا کرتی تھی اور کشتی پر بیٹھے بیٹھے آپ سیدھے بکسر پہنچ سکتے تھے۔

موسم سرما دورے اور شکار کا زمانہ تھا۔ غضنفر علی نقوی عرف لڈن للت پور سے تبدیل ہو کر پرتاب گڈھ آچکے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی تنور علی نقوی عرف الن کہ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر بہاء الدین کالج ریاست جونا گڈھ کاٹھیاواڑ میں تاریخ پڑھاتے تھے کرسمس کی چھٹیوں میں غازی پور آئے۔ اماں کار چلانا سیکھ رہی تھیں۔ بشیر خاں نے کہا "بھیا۔ بیگم صاحب کا آپ سکھلا دیجئے۔ ہمری سنت ناہیں ہیں اپنی مرضی سے چلاوت ہیں۔"

الن ماموں نے حسب عادت مستعدی سے جواب دیا "ہاں۔ ہاں۔ اس میں کیا مشکل ہے باجی میں آپ کو دو دن میں دلوا دوں گا ڈرائیونگ لائسنس۔" اس کے بعد ایک صبح اماں کار لے کر تنہا مقبرہ کارنوالس روانہ ہوئیں اور بااطمینان سیمنٹ کی نالیوں پر سے گذرتی مقبرے تک اس طور سے پہنچیں کہ لارڈ کارنوالس نے اپنی قبر میں کروٹ بدلی۔ بعد ازاں اسی طور سے پرتاپ گڈھ کا رخ کیا جہاں سے لڈن ماموں برائے شکار جنگلوں کی طرف جانے والے تھے۔

پرتاپ گڈھ کلب کی مکسڈ سوئمنگ پول میں زہرا ممانی مشاقی سے پیرتی تھیں اور ان کے تینوں بچے نام جن کے صہیب، سلویا اور مظفر تھے ماہر پیراک تھے۔

لڈن ماموں کی شکار گاہ میں کلکٹر ضلع وشنو سہائے مع کنبے کے مہمان تھے۔ ایک رات سارے بچوں کو تھوڑی دیر کے لیے مچان پر بٹھایا گیا۔ بعد ازاں زہرا ممانی نے ایک عدد شیر مارا۔ اور صبح کو اماں نے اپنے کوڈیک کمرے سے جو ابا جان جرمنی سے ان کے لئے لائے تھے ان کی تصویر کھینچی کہ برجس پہنے ایک پاؤں مردہ شیر پر رکھے بندوق سنبھالے کھڑی ہیں وہ تصویر اماں نے طمطراق سے سالگرہ نمبر "تہذیب نسواں" میں شائع کروائی۔ اور اس بے پردگی پر اہل مراد آباد نے پیٹ بھر کے اعتراض کئے۔

شروع جنوری میں پرتاپ گڈھ سے الموڑہ جا کر نندہ دیوی پر برف کا نظارہ کیا گیا۔ منظور زہرا (بنت ظہور حسنین رضوی مرحوم) نندہ دیوی کے سامنے جس بنگلے میں مقیم تھیں اس کا نام "سورج ہاؤس" تھا۔ ان کے شوہر سید مختار حسین نقوی امروہوی گورنمنٹ کالج الموڑہ میں پڑھاتے تھے۔

غازی پور میں فروری کی ایک صبح مہاراج ڈاک لے کر آئے اور سیاہ حاشیے والا لفافہ اماں کو تھما کر پوری شکل دوسری طرف دیکھنے لگے۔ الموڑے میں منظور زہرا اپنی کزن ثروت آرا کی طرح جوان جہاں اچانک دنیا سے کوچ کر گئی تھیں۔

جمنا پانڈے ان پڑھ تھے لیکن طرز تحریر پہچاننے لگے تھے۔ لیجئے بیگم صاحب۔ ای آپ کے بہنوئی مسٹر افضل علی انغم نیس آفیسر پشاور۔ ای آپ کے بھائی مسٹر آل حسنین۔ وکیل مراد آباد۔ ای مس حجاب اسمٰعیل۔ مدراس۔

ابا جان ایک بار علی گڑھ سے مسلم یونیورسٹی کے پرچے چھپوانے مدراس گئے تھے وہاں سید محمد اسمٰعیل صاحب سے ملاقات ہوئی جو نظام اسٹیٹ سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد مدراس میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی عباسی بیگم مرحومہ اپنے زمانے کی مشہور ناول نگار تھیں۔ بیٹی حجاب افسانہ نویسی کے میدان میں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ پردہ نہیں کرتی تھیں اور مغربی لباس پہنتی تھیں۔ جن دنوں ابا جان مدراس میں تھے حجاب اسمٰعیل کا افسانہ "میری ناتمام محبت" "نیرنگ خیال میں چھپ رہا تھا۔ ابا جان نے علی گڑھ واپس آکر اماں سے کہا۔ میں امتیاز کے لئے ایک بہت اچھا رشتہ تلاش کر آیا ہوں۔ اماں نے شمس العلماء مولوی ممتاز علی کو لاہور خط لکھا۔ کچھ عرصہ بعد تاج و حجاب میں بھی خط و کتابت شروع ہو گئی۔ پھر وہ خط و کتابت کسی وجہ سے بند ہو گئی۔ تاج کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح سلسلہ دوبارہ جاری کریں۔ انہی دنوں وہ "انار کلی"

شائع کرنے والے تھے۔ پطرس بخاری نے مشورہ دیا کہ اسے حجاب کے نام معنون کردیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حجاب من گئیں اور خط وکتابت پھر شروع ہو گئی۔ تاج کے بہنوئی سر محمد یعقوب کسی کام سے مدراس گئے۔ وہاں سے تاج کو بلانے کا تار لاہور بھیجا۔ ان کے مدراس پہنچنے کے بعد رشتہ طے ہو گیا۔ اس دوران میں حجاب کی اماں سے بھی خط وکتابت جاری تھی۔ عباسی بیگم مرحومہ سے بھی اماں کی خط وکتابت رہ چکی تھی اور حجاب اس وجہ سے اماں کو "خالہ جان" لکھتی تھیں۔

آرکیڈیا

واشرمین پیٹ۔ مدراس

۳۰ جولائی ۱۹۳۲ء

سبھوں نے پھیر لیں آنکھیں وفا کہیں نہ رہی
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی

پیاری اور بہت پیاری مگر کسی قدر ظالم خالہ جان الٰہی عمر خضر عطا ہو اور غصہ اب تک کافور ہو گیا ہو۔ آمین۔ دیکھئے آخر آپ نے بھی مجھی کو مورد الزام ٹھہرایا"

ہم کو امید نہ تھی ایسی جفا سے ان کی

میری پیاری نہایت پیاری خالہ جان میں جس اشتیاق سے آپ کو خط لکھتی ہوں اسے آپ نہیں جان سکتیں۔ میں بخدا آپ کو حقیقی خالہ سمجھتی ہوں۔ آپ اس زمانے کی بات پوچھ رہی ہیں جب سر یعقوب یہاں آئے تھے۔ میں نے سنا ہمارے دوست [8] نے جن کا خط آپ کو بھیجا تھا آپ کو مفصل کیفیت لکھ بھیجی ہے۔

اس وقت آسمان کا رنگ نہ گہرا نیلا ہے نہ ہلکا۔ بلکہ کچھ عجیب بے لطفی کا رنگ ہے۔ ہوا گیت گا رہی ہے۔ میں برآمدے میں بیٹھی ہوں۔ پپا ڈرائنگ روم میں مدراس میل پڑھ رہے ہیں نو دس بلیاں برآمدے میں پڑی ہیں۔ چار پانچ اندر میرے پلنگ پر سو رہی ہیں۔ خرگوش بیٹھا گھاس کھا رہا ہے۔ طوطا ناچ رہا ہے۔ ہرن اور بکریاں بیٹھی آسمان کے بے لطف رنگ پر غور کی نگاہ ڈال رہی ہیں۔ دو گائیں سو رہی ہیں۔ بچھڑا چیخیں مار رہا ہے۔ (ابھی ابھی ایک بلی سوتے میں کرسی سے گر پڑی) میں نے ایک زرد رنگ کا فراک پہن رکھا ہے۔ آپ نے نہیں لکھا' موسم کیسا تھا۔ کیا ہو رہا تھا۔ کوئی رومانٹک دریچہ بھی کسی کمرے میں ہے یا نہیں۔ کسی کھڑکی کے آگے کوئی پودا ہے جس پر بلبل چہچہا سکتی ہے۔

دلی محبت

حجاب

"روک ووڈ"

۲۳۔ ریذیڈنسی روڈ

بنگلور

۵ مئی ۱۹۳۳ء

میری نہایت پیاری خالہ جان

اشتیاق دید۔ ہم لوگ بنگلور آئے ہوئے ہیں۔ نہایت خوبصورت جگہ ہے۔ شاعروں کی سرزمین۔ خوش رنگ پیارے پھول۔ راگ گانے والے پرند۔ آج کل شہزادی در شہوار اور نیلوفر بھی آئی ہوئی ہیں۔ میں پچھلے سال ان سے ملی تھی۔ مسز صغرا ہمایوں مرزا مدراس میں رہنے سہنے لگی ہیں۔ مجھے مدراس بہت یاد آرہا ہے۔ اس دفعہ آپ گرمیاں کہاں بسر کریں گی۔ سر محمد یعقوب کا خط آیا ہے۔ ۲۰ مئی کو انگلستان جا رہے ہیں۔

مسز اعجاز علی کلکتے گئے تھے وہاں سے لکھا تھا اگر موقعہ ملا آپ کے ہاں جائیں گے۔ پنجاب سے جنوب اتنی دور ہے خدا کی پناہ پانچ دن میں خط ملتا ہے۔ خدا کرے جلد ایئر میل کا انتظام ہو جائے۔ نیرنگ خیال میں چچا جان کا ایک دلچسپ ایرانی ناول چھپ رہا ہے۔ بہت سے پیار قبول کیجئے۔ چچا جان کو آداب۔

آپ کی دور افتادہ

حجاب

(تلخیص)

منظور خالہ کی برسی کے بعد اگلی گرمیوں میں ان کے اکلوتے بڑے بھائی سید آل حسنین کی تقریب شادی مراد آباد میں منعقد ہوئی۔ نواب سید عاشق حسین خان کا مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اس مجمع میں پنجاب سے آئے ہوئے دراز قد خالو افضل طرے دار پگڑی باندھے سب سے مختلف نظر آتے تھے۔ شام کو صحن میں چھڑکاؤ کے بعد گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں اڑتی۔ گمنوں سے کوندنی کی طرح لدی دلہن چندا بیگم جھلی جھلی لا کر ایک پلنگ پر بٹھال دی جاتیں اور گھنٹوں اسی طرح سر جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہتیں۔ بیلے اور چنبیلی کی کیاریوں کے نزدیک گھڑونچیوں پر گجروں اور جھل جھل کرتے نقشیں مراد آبادی کٹوروں سے ڈھکی صراحیاں اور گھڑے دھیمے دھیمے مہکا کرتے۔ دالان کی نیلے شیشوں والی محرابوں پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور ایک در کے نیچے اماں کے ایک ننہیالی بزرگ شجاع نانا مونڈھے پر بیٹھے سارے ہنگامے کو سپروائز کرتے تھے۔ ان کی قطع نو لکشور پریس لکھنؤ کے پیلے خستہ ورق پر چھپی نواب مرزا داغ کی قلمی تصویر کی ایسی تھی۔ دو حصوں میں منقسم داڑھی۔ انگرکھا۔ مخملیں مندیل چڑھواں جوتا۔

ایک رات چندا ممانی کے والد نواب سید ابراہیم حسین خاں کی طویل زرد موٹر میں ٹھنس کر بہت سے لوگ بارہ میل دور محمود پور گئے۔ کھیتوں پر ٹھنڈی چاندنی پھیلی تھی۔ موٹر کا ٹاپ گرا ہوا تھا۔ حسنین ماموں

ڈرائیو کر رہے تھے۔ الن ولڈن ماموں ان کے ساتھ بیٹھے تھے اور تینوں الاپ رہے تھے۔

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے
جھک کے کچھ بات کہی ----------------

دھت تیرے کی۔ بدمعاش اندھا ہو گیا ہے۔ ایک جھانپڑ دوں سیدھا ہو جائے گا۔ کچی سڑک پر جو بیل گاڑی چرخ چوں کرتی سامنے سے آ رہی تھی۔ ہیڈ لائینس کی چکاچوند سے بیل بگڑ گئے۔ حسنین ماموں نے بریک لگایا۔ گاڑی بان نے گھبرا کر بیلوں کو دھکیلا۔ موٹر نشین نوجوانوں نے خالص جاگیردارانہ انداز میں اس کو اچھی طرح ڈانٹا۔ مسکین صورت دیہاتی بیلوں کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ کار ایک دھچکے سے سنگ سرخ کے قلعہ محمود نور کی سمت بڑھی۔

وہ جاگیرداروں کے لئے چین دامان کا زمانہ تھا۔ اماں کے سیکنڈ کزن اور چندا ممانی کے بڑے ابا نواب سید عاشق حسین خاں یو پی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر اور مراد آباد میونسپلٹی کے چیرمین تھے۔ ان کی بڑی شاندار نوکیلی سفید مونچھیں تھیں۔ اور وہ محلّہ سادات لانگڑی مراد آباد میں اپنے مکان کی دوسری منزل پر چھپر کھٹ پر لیٹے رہتے تھے اور تکئے کے نیچے اشرفیوں کا بٹوہ رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے سید حامد علی خاں موسیقاروں کی سرپرستی کرتے تھے۔

ان موسیقاروں میں جو رؤسا کے ہاں زیست کرتے تھے ایک رامپور کے استاد یوسف خاں تھے جو بہار کے کسی راجہ صاحب کے ہاں ملازم تھے۔ باعث پیرانہ سالی ان کے دربار سے الگ ہو چکے تھے۔ اماں کو جب ستار سیکھنے کا شوق چرایا نوابزادہ حامد علی خاں کے ذریعے استاد کو رام پور سے غازی پور بلوایا گیا۔ مشاہرہ پچاس روپے ماہوار اور کھانا۔ "جادو گھر" کا ایک کمرہ جو پہلو کے لان پر کھلتا تھا اس میں وہ فروکش تھے۔ صبح شام چاء اور دونوں وقت کا کھانا عبدل کشتی میں سجا کر ان کو دینے جاتے تھے۔ سہ پہر کو استاد اماں کے کمرہ نشست میں ستار سکھاتے تھے جو بنارس سے منگوایا گیا تھا۔ استاد اسے ہمیشہ ستاری کہتے تھے۔ "ستار اس سے بڑا ہوتا ہے۔" وہ ہمیشہ تصحیح کرتے۔ شاعر بھی تھے اور اکثر اپنی غزلیں بغرض اصلاح سردار کے ہاتھ ابا جان کو بھیجا کرتے تھے جن سے ان کا سابقہ بہت کم پڑتا تھا۔ ابا جان کو موسیقی سے قطعی شغف نہ تھا۔ کیونکہ ہر انسان کی اپنی ذاتی موسیقی جداگانہ ہے۔

دعوتوں کے مواقع پر استاد کھانے کے بعد مہمانوں کو کلاسیکل سنگیت سے محظوظ کرتے تھے۔

استاد یوسف خاں ایک غیور اور خود دار بزرگ تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک مسلمان افسر کی لڑکی کی سالگرہ کی پارٹی تھی۔ استاد بچی سے بہت مانوس تھے۔ ایک تہنیتی نظم لکھ کر اس کے ہاں پہنچے۔ ملازموں نے اندر نہ جانے دیا۔ وہ چپ چاپ برساتی میں کھڑے رہے۔ بہت دیر بعد صاحب خانہ نے باہر آ کر ان سے کہا "استاد آپ کی چھٹی۔ پھر کبھی آیئے گا۔"

استاد اس واقعے کے بعد کئی دن تک ملول اور نادم سے رہے اور اماں سے کہا "میں ایک غریب گویا ہوں اور تکبر میں مبتلا لوگوں کو خدا سے ڈر نہیں لگتا۔"

دن بھر استاد اپنے کمرے میں بیٹھے آرائش محفل پڑھا کرتے تھے اور بید گپی تھے۔ ان کے کمرے کے مقابل میں لان کی دوسری سمت بشیر خاں کا کاٹج سا تھا جس میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ کاٹج سے متصل مرغیوں کے دو زمین دوز بڑے بڑے ڈربے تھے جن کی چھت پر جالی لگی تھی اور مرغیاں غالباً سیڑھیاں چڑھتی اترتی تھیں۔

ایک روز استاد بھائی کو لے کر گاما پہلوان کا دنگل دیکھنے گئے۔ پھر غازی پور میں ہوائی جہاز آیا۔ مقبرہ کارنوالس کے میدان میں شامیانے کے نیچے بہت سارے انگریز میمیں اور بابا لوگ اکٹھے ہوئے اور وہ لیمونیڈ پیتے جاتے تھے اور گوروں کا بینڈ سنتے جاتے تھے۔ اور مختصر ساز رد رنگ کا طیارہ سامنے مودب سا کھڑا تھا اور اس پر سوار ہو کر ابا جان نے بنارس تک پرواز کی اور دس منٹ بعد بنارس سے واپس آ گئے۔

"یہ انگریز کے کمالات ہیں۔" استاد نے اظہار خیال کیا۔ کلب اور گالف کورس اسی سرسبز میدان میں تھا اور اکثر اتوار کو ابا جان گالف کھیلنے جاتے تھے۔ جس طرح علی گڑھ میں پابندی سے گالف کھیلا کرتے تھے۔

پھر ایک ٹرین غازی پور سے گذری جس میں مہاتما گاندھی سوار تھے اور اسٹیشن پر ان کے درشن کے لئے عوام کا جم غفیر اور گوروں کا بندوبست تھا۔ اور اماں جو کچھ عرصہ قبل کھادی پہننا ترک کر چکی تھیں گاندھی جی کو دور سے دیکھنے گئیں۔

ریل گاڑی کا اپنا رومانس تھا۔ خصوصاً چھوٹی لائن کی روہیل کھنڈ کمایوں ریلوے اور اودھ ترہٹ ریلوے کی ٹرینیں جو ننھے منے اسٹیشنوں سے گذرتی شمالی یو۔ پی کے گھنے جنگلوں، ترائی اور بھابھر کے علاقوں سے کوکو چھک چھک کرتی پورب کے پر اسرار بنوں میں غائب ہو جاتی تھیں۔ جس زمانہ میں چچا وحید الدین حیدر کسی دور افتادہ پوربی ضلع میں تعینات تھے انہوں نے ابا جان کو ایک مرتبہ پوسٹ کارڈ پر صرف دو سطریں لکھ بھیجی تھیں۔

گو وطن سے دور ہوں اور چھوٹی لین ہے
پر خدا کا شکر ہے کہ ہر طرح سے چین ہے

ایک روز روہیل کھنڈ کمایوں ریلوے یا شاید اودھ ترہٹ ریلوے پر سفر کرتے پھوپی زاد بھائی سلطان حیدر غازی پور پہنچے۔ سلطان بھائی، ماموں ممانیوں کے لاڈلے بذلہ سنج اور پہلے زمانہ کے قابل میٹریکولیٹ تھے۔ انہوں نے بھائی کو پڑھانا شروع کیا۔ پڑھاتے میں وہ بھائی کے کان امیٹھتے، طمانچے لگاتے، ڈانٹتے اور بھائی کان سرخ کئے سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ بڑوں کا ادب کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ مجال تھی جو چوں بھی کر جاویں۔

گلابی جاڑوں کی ایک پر سکون صبح بشیر خاں زمین دوز خانے کے کنارے بیٹھے مرغیوں کو دانہ ڈالتے جاتے تھے اور لہک لہک کر الاپ رہے تھے۔ بنا کے قالوبلیٰ کا پھندا النوں کی لٹ میں پھنسا کے مارا۔

بھائی گیند کھیلتے کھیلتے ان کے قریب پہنچے اور غور سے سننے لگے اور پوچھا "قالوبلیٰ کا پھندا کیا ہوتا

ہے؟"

"بابا۔" بشیر نے متانت سے کہا' "یہ خدا رسول ؐ کی باتیں ہیں۔" اور دانہ پھینکتے رہے۔ پہلو کے برآمدے میں کاؤچ پر زبیدہ آپا منہ میں تھرمامیٹر لئے لیٹی تھیں۔ برآمدے میں دھوپ آرہی تھی۔ اندر سے آپا حمید جہاں اور زینب خالہ آکر ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ حمید جہاں جادو گھر میں مہمان ٹھہری ہوئی تھیں۔ زینب خالہ زبیدہ آپا کی عیادت کے لئے آئی تھیں۔ گوری گوری سی آپا حمید جہاں علی گڑھ کی عبداللہ بیگم کی بھانجی تھیں۔ لندن سے پڑھ کر آئی تھیں۔ انسپکٹرس آف اسکول تھیں اور غازی پور دورے پر آئی ہوئی تھیں۔ اور بعد میں ان کی شادی ڈاکٹر عندلیب شادانی سے ہوئی۔ زینب امجد علی ابا جان کے دوست لکھنؤ یونیورسٹی کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر ولی محمد کی لڑکی تھیں۔ انہوں نے ازابلا تھوبرن کالج سے بی اے کیا تھا۔ اور ان کے شوہر امجد علی اوپیم فیکٹری کے مینجر تھے۔

زبیدہ آپا کے والد میر ولایت حسین نے ابا جان کو ایم۔اے۔او اسکول میں بڑی شفقت سے پڑھایا تھا۔ زبیدہ آپا نے آگرے سے ڈاکٹری پاس کی تھی اور کچھ عرصہ قبل میر ولایت حسین کا خط آیا تھا کہ وہ ٹرانسفر ہو کر غازی پور آرہی ہیں ان کا خیال رکھیں۔ خط ملتے ہی ابا جان اور اماں زنانہ ہسپتال پہنچے تھے جو بڑی ڈیپریسنگ جگہ تھی۔ اور زبیدہ آپا کے صحن میں حبس طاری تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی ہنس مکھ اور محنتی لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کی شادی ہو چکی تھی اور شوہر کسی دوسرے شہر میں مقیم تھے۔ پھر زبیدہ آپا کو بخار آنے لگا تھا۔ اور اماں انہیں اپنے ہاں لے آئی تھیں۔ یہاں وہ مہمان کمرے میں چپ چاپ لیٹی رہتی تھیں اور میجر گیرڈ نے ایک روز ابا جان کو بتایا تھا کہ ڈاکٹر صالح کو گیلپنگ ٹی بی ہو گئی ہے۔

مہمان کمرے کی ایک دیوار پر ایک برطانوی پینٹنگ کا بڑا سا پرنٹ آویزاں تھا جس میں اٹھارویں صدی کے ایک جہاز میں کپتان کے کمرے کے اندر میز کے گرد سرخ چہروں والے موٹے موٹے انگریز ہاتھ میں مگ لئے شراب پی رہے تھے اور پورٹ ہول میں سے سیاہ سمندر نظر آرہا تھا۔ زبیدہ آپا اپنے پلنگ پر لیٹی لیٹی شاید اس تصویر کے گول روشندان میں سے باہر دیکھتی رہتی تھیں۔ جہاں مہیب تاریک انجانا سمندر موجزن تھا۔

چند روز بعد ان کے شوہر ڈاکٹر محمد صالح آگئے اور زبیدہ آپا بادامی ریشمی ساڑی میں ملبوس جس میں پارسی بیل لگی تھی جھکی جھکی سی آہستہ چلتی کار میں بیٹھیں اور بھوالی روانہ ہو گئیں۔ اور ایک مہینہ بعد ان کی سناونی آگئی۔

سردیاں آئیں۔ اسی برآمدے کے سامنے جہاں زبیدہ آپا دھوپ کھاتی تھیں سوئیٹ پیز کھل گئے۔ برگد کے تلے گلہریاں دوڑتی پھرتیں اور نیل کنٹھ اڑتے۔ اپنے کمرے کے سامنے استاد حقہ گڑگڑایا کرتے۔ باغ کے گول چبوترے کے گرداگرد گل آفتاب کھل گئے۔

جاڑے نکلے۔ چبوترے پر دوبارہ بڑا پنکھا دوبارہ نصب کیا گیا۔ ڈنر کے بعد مہمانوں کو استاد نے چبوترے بیٹھ کر رات کے راگ سنائے اور ہوا "رات کی رانی" سے معطر ہوئی۔ برسات میں جادو گھر کے

غسل خانوں اور برآمدوں کی نچلی سیڑھیاں گھاس میں اس طرح ڈوبتیں جیسے گھاٹ کا زینہ پانی میں گم ہو جاتا ہے۔

آوازیں۔ دوپہر کے سناٹے میں ستار سکھاتے ہوئے استاد کی آواز۔ دردا رادا دارا۔ اماں کی ہارمونیم پر نغمہ سرائی — او نمک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم۔ کلب میں میجر گیرڈ کی پکار — کوئی ہائے۔

جاڑے۔ تیز سرد چاندنی میں امرویوں کے پرے سے آتی گیدڑ کی چیخ۔ کیمپ۔ گودھولے کے وقت چراگاہ سے لوٹتے گلوں کی گھنٹیوں کی سریلی ٹنٹناہٹ۔ رہٹ کی سیال موسیقی۔ لکڑ بگے کی خوفناک ہنسی۔ ارہر کے شبنم آلود کھیت میں سے گذرتی بشیر کی بیوی کی آواز "افراط چنا۔ افراط۔" کوچ کے وقت ڈاک بنگلوں کے خالی کمروں کی گونج۔

گرمیوں میں باغ کی آوازیں۔ کوئل کی کوک۔ مور کی جھنکار۔ دور سڑک پر آتی اوک لینڈ کا ہارن۔ برسات۔ مینہ کی رم جھم۔ بوچھاڑ۔ مینڈک۔ جھینگر۔ پرنالوں کا شور۔ پروّیا کی سنسناہٹ۔ نذیر خاں کی آواز: لگا کے کالو بلا کا پھندا لٹوں کی لٹ میں پھنسا کے مارا۔

کوئی ہائے۔

۷۔ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے

دسمبر کی ۲۳ اور ماہ رمضان کی غالباً دسویں یا گیارہویں تاریخ تھی۔ سحری کے بعد سے باہر لوگوں کا مجمع لگنا شروع ہو گیا۔ وہ یکوں' تانگوں اور موٹروں سے اتر اتر کر نیم تاریک کہر آلود باغ کی روشوں پر ٹہلنے لگے۔ کچھ برآمدے میں آکھڑے ہوئے۔ سامان دو روز قبل مال گاڑی سے دہرہ دون بھجوایا جا چکا تھا۔ رخصت کرنے والوں نے اوک لینڈ کو گجروں اور گلاب گیندے کے ہاروں سے اتنا سجایا کہ وہ پشپ رتھ معلوم ہونے لگی۔

چلتے وقت بشیر کی بیوی نے گھونگٹ کاڑھے روتے روتے سامنے آکر کہا' "بیگم صاحب ہم کا جلدی بلا لیجئے گا۔" وہ اپنے دیور کے ہمراہ شام کو گورکھپور واپس جا رہی تھیں۔ سردار' خانساماں جی' جمنا پانڈے مہاراج' رام نرائن چپڑاسی' ترلوچن مالی اور دوسرے ملازم ایک قطار میں کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔ استاد یوسف خاں اسی صبح رامپور واپس جا رہے تھے۔ اپنا مختصر سا زاد راہ 'کتابوں کا بستہ' ٹین کا ٹرنک' دری میں لپٹا بستر' لوٹا' غلاف پوش طنبورہ اور طبلہ بایاں ایک انبار کی صورت میں چنے' خاموش ایک طرف کو کھڑے تھے۔ چوڑی دار پائجامہ' دصلی کی جوتیاں' عنابی مخملی واسکٹ' نوکیلی مونچھیں' سرے سے مزین آنکھوں میں آنسو۔ ایک الوداعی نظم کہی تھی اس کا ملگجا سا پرچہ چپ چاپ آگے بڑھ کر ابا جان کو تھما دیا۔ اور واپس اپنی جگہ پر جا کھڑے ہوئے۔

نذیر نے "یا غوث الاعظم" کہہ کر ہینڈل سے موٹر اسٹارٹ کی۔

پھاٹک سے نکل کر بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے دور تک پیچھے پیچھے آئے۔ پھر کمرے میں نظروں

سے او جھل ہو گئے۔

بنارس کے راستے میں ایک دیہاتی نے دوسرے سے کہا' "بڑے دن کا موٹر سجا ہے۔"

اماں نے بنارس میں مکرجی ماموں کے ہاں روزہ افطار کیا۔ پادری مکرجی علی گڑھ ٹریننگ کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے اور اردو میں مسیحی ڈرامے لکھتے تھے۔

دوسرے روز صبح کو سارناتھ میں ابا جان سولا ہیٹ پہنے ستوپوں کے نیچے نیچے جگہ جگہ ٹھٹھک کر پادری و مسز مکرجی اور اماں کو بدھ مت کے بارے میں بتلاتے گئے۔ بشیر نے جو ایک درخت کے نیچے بیٹھے منظر کا مطالعہ کر رہے تھے' فوراً مہاتما بدھ کا کریڈٹ خود لے لیا۔ "ارے ہمرے جلعے کے تو تھے۔"

جونپور سے آگے زنانوں کی ٹولی نے بیچ سڑک پر آ کر موٹر روک لی اور دف بجا بجا کر الاپنا شروع کیا' "منصور کے پردے میں خدا بول ریا ہے۔ منصور کے پردے میں خدا بول ریا ہے۔" "اماں نے کہا" "اے ہے۔ یہ روہیلکھنڈی یہاں کیسے پہنچ گئے۔ دکھیا مارے۔"

ابا جان راستے بھر نیرنگ خیال کا جہازی سالنامہ پڑھنے میں مشغول رہے۔

لکھنؤ چھاؤنی میں دور سے لال کرتی کی پر سکون بستی دکھلائی دی۔ جو لال کرتی نوشہرہ والے کوتوال منور خاں مرحوم کی ذاتی ملکیت تھی۔ بشیر پڑاؤ کی منزل پر پہنچتے ہی محمد ابراہیم خان ابن منور خاں مرحوم کے مسخرے مدراسی ملازم ال ٹپا کی مدد سے گرد آلود موٹر دھونے میں جٹ گئے۔ (ال ٹپا کو ان کے ایام طفولیت میں چیل اٹھا لے گئی تھی اور وہ اتنے ناکارہ ثابت ہوئے تھے کہ واپس لا کر چھوڑ گئی تھی!)

ماموں ابراہیم خاں اور اختر ممانی کے وسیع مکان کے صحن میں فوارہ چل رہا تھا اور بڑا افسانوی سا ماحول تھا۔

شاہجہان پور سول لائینز میں ایک پھاٹک پر تختی۔ کے بی۔ ایس۔ ڈبلیو۔ حیدر سول سرجن۔ ابا جان نے پہنچتے ہی چھوٹے بھائی سے سوال کیا' "آپا جان کیسی ہیں؟"

پھوپی جان جو علاج کے لئے نہٹور سے آئی ہوئی تھیں ایک روز قبل ۲۵ دسمبر کی صبح کو رحلت فرما چکی تھیں۔

سیدہ صغریٰ فاطمہ بنت سید جلال الدین حیدر مرحوم۔ جن کی عربی اور فارسی کی تعلیم چاروں بھائیوں کے ساتھ ہوئی تھی ابا جان سے تین سال بڑی اور بچپن میں ان کی جوڑی دار رہ چکی تھیں۔ لو ایک قصہ اور سنو۔ ایک دفعہ بنارس میں نوکر نے ان دونوں سے کہا۔ گملے میں پیسے بو دیجئے۔ روپوں کا درخت اگ آئے گا۔

باپ کی جان لیوا ایمانداری کی وجہ سے کوتوالی میں پیسے کی سخت قلت تھی۔ دونوں بہن بھائیوں نے جیب خرچ کے چند آنے جوڑ جوڑ کر کھتی میں جمع کر رکھے تھے۔ وہ جمع پونجی گملے میں دبا دی اور روز بڑے اشتیاق سے اسے پانی دینے لگے۔ اس دوران نوکر پیسے کب کے نکال چکا تھا۔ دولت کا درخت نہ اگا۔ دونوں نے جا کر والد سے فریاد کی اور لالچ کے گناہ پر ایک عدد لیکچر سے مستفید ہوئے۔

سیدہ صغریٰ فاطمہ بڑی ہو کر باپ' ماں اور نانی مریم خاتون کی مانند اللہ والی اور متشرع بی بی ثابت ہوئیں۔ سانپ کے کاٹے کی عامل تھیں اور نہٹور میں حاجتمندوں کو موثر تعویز اور نقش لکھ کر دیا کرتی تھیں۔

شام کی ٹرین سے ان کے چھوٹے بیٹے عثمان حیدر آفندی مع بہو محمودہ خاتون شاہجہانپور پہنچے۔ وہ دونوں چند روز قبل ترکی سے لوٹے تھے اور محمودہ خانم مغربی فراک میں ملبوس تھیں۔

پھوپی جان پٹھانوں کے قبرستانوں میں سپرد خاک کی گئی تھیں۔ قبرستان کے پٹھان مہتمم نے کہا' "ڈاکٹر صاحب میری بچی پرسوں سے سخت بیمار تھی۔ کل شام اہلیہ نے مجھ سے کہا جو سیدانی بی بی آج یہاں دفن کی گئی ہیں ان کے مزار کی تھوڑی سی خاک لا دو۔ میں نے خاک چٹائی۔ لڑکی بحکم خدا بھلی چنگی ہے۔"

"لیجے صاحب!" ڈاکٹر وحید نے آہستہ سے کہا۔ "بدعت یہاں بھی شروع ہو گئی۔" مزار جلد از جلد پختہ کرایا گیا لیکن قبر کی سطح پر جمی گرد کالی کھانسی کے مریض بچوں کو چٹائی جاتی رہی۔

ابا جان کہ حسب معمول طویل رخصت لے کر فروری ۱۹۳۴ء میں یوروپ اور ترکی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے غازی پور سے چلتے وقت دفعتاً انہوں نے ارادہ حج کا کیا۔

شاہجہاں پور سے مراد آباد پہنچ کر سر محمد یعقوب کے ہاں رات گذاری۔ صبح اماں اور مولوی صاحب نے سحری کھائی۔ میرٹھ داخل ہو کر بھانجی فاطمہ خاتون کے "سر پہ ہاتھ رکھنے" سول لائنز گئے۔ وہ شال اوڑھے شلوار قمیض میں ملبوس پھولے پھولے پپوٹے کہ خاندانی خصوصیت تھی چارپائی پر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ انہیں بتلایا کہ حج کے لئے جاتے ہیں۔ کہنے لگیں "ماموں جان۔ ابھی اکتوبر میں جب آپ اماں جان مرحومہ سے ملنے نہٹور آئے تھے آپ کے جاتے ہی میں نے ان سے کہا تھا ماموں جان پھر ولایت جانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ اس مرتبہ اسپین اور ترکی کا ارادہ ہے۔ وہ شدید نقاہت کے باوجود پلنگ پر اٹھ بیٹھیں اور جوش سے بولیں۔ نہیں انشاء اللہ اس مرتبہ وہ حج کرنے جائیں گے۔"

میرٹھ چھاؤنی۔ پریڈ گراؤنڈ پر لفٹنٹ آل حسنین نمبر ۹ جاٹ رجمنٹ کا خیمہ۔ رات کو میس سے کھانا آیا۔ بیٹ مین چھنوا نے اماں اور رسول کے لئے انگیٹھی پر سحری تیار کی۔ صبح کے دھندلکے میں فوجی بگل کی آواز بلند ہوئی۔ گوروں کا دستہ خیمے کے سامنے سے مارچ کرتا گذرا۔

گڑھ مکتیسر کے پل پر میلہ چل رہا تھا۔ بشیر نے خطرناک پون ٹون برج پر سے احتیاط کے ساتھ جوں کی رفتار موٹر نکالی۔

فیروز آباد میں چند روز قبل خونریز ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ شہر سنسان پڑا تھا۔ چوڑیوں کے خاکستر بازار میں سے گذرتے ہوئے ابا جان نے تاسف سے سر ہلایا۔

حوالہ جات

1 رشید احمد صدیقی "گنج ہائے گرانمایہ"

2 مشتاق احمد زاہدی

3

ماتھے پہ بندی آنکھ میں جادو ہونٹوں کی بجلی گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی بات مہکتی جیسے کسی نے پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی جن میں ہو رقصاں لمحے میں رادھا لمحے میں راہو
ایسی پھڑک تھی خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا
کہاں سے آہو

یلدرم

یہ نظم سب سے پہلے ستمبر ۱۹۲۶ء میں رسالہ سہیل میں شائع ہوئی تھی

4 ماخوذ از "ایام گذشتہ" عصمت۔

5 سرفراز حسین عزمی کی نظم جو رسالہ سرگذشت علی گڑھ میں چھپی۔

6 ماخوذ از "ایام گذشتہ" مطبوعہ عصمت۔

7 از "ایام گذشتہ" عصمت۔ فروری ۱۹۵۲ء

8 تاج

فصل ہشتم

ا۔ کہسار پری

غازی پور سے دہرہ دون کا سات سو (۷۰۰) میل سفر طے کر ٹھیک آٹھویں دن دھول سے اٹی اوک لینڈ ڈالن والا میں داخل ہوئی۔ دوپہر ہو چکی تھی اور درختوں پر سے بارش کے آبشار گر رہے تھے۔ پوپلے منہ والے بوڑھے ہاؤس ایجنٹ خان بہادر اختر محمد خاں خورجوی برجس میں ملبوس اپنے شاداب باغ کی بھیگی بجری پر تیز تیز چلتے باہر تشریف لائے۔ دور سے جھک کر اماں کو آداب عرض کیا۔ آشیانے میں کسی پنجابی ریاست کے راجکمار مع اسٹاف مقیم تھے اور ڈون پبلک اسکول میں پڑھتے تھے۔ خان صاحب نے سروے آف انڈیا کے خان بہادر سید ظل حسنین کی خالی کوٹھی حسنین منزل کی کنجی اماں کو پیش کی ظل حسنین صاحب خود محلہ کرن پور میں رہتے تھے۔

سفید اور اودی دھاریوں والے بھورے پہاڑی پتھروں سے بنی حسنین منزل کے احاطے میں پہنچ کر نذیر نے ایک بار پھر پیر دستگیر" کو یاد کیا اور اتر کر موٹر کے انجن کو وفادار گھوڑے کی گردن کی طرح تھپتھپایا۔

پانی تھم چکا تھا۔ اچانک برفپوش ہمالیہ دھوپ میں چمک اٹھا۔ احاطے کی روشوں پر بچھے اودے اور لاجوردی [illegible] سبزے' بارش میں دھلے دھلائے' سورج کی شفاف روشنی میں دمکنے لگے۔ بگو گوشے اور آلوچے ہوا میں جھوم رہے تھے اور پھولوں پر بڑی بڑی زرد اور عنابی تتلیاں اڑتی پھرتی تھیں۔

نواب [illegible] اللہ خان کی جوانمرگ بیٹی زاہدہ خاتون شیروانیہ [1] نے دہرہ دون میں ایک نظم کہی تھی۔ ابا جان کو جو [illegible] مرحوم کو "عورتوں کا اقبال" کہا کرتے تھے' بہت پسند تھی ~ کہسار پری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے۔ ذوق نظری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے۔ منظور زمیں کو ہے میری تازگی چشم سبزے سے ہری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے۔ ہے برف سے ملبوس سرکوہ صنوبر' چاندی یہ کھری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے۔ ہے کس کا تجسس پئے تبریک بہاراں؟ کوئل سفری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے۔

وہ ۳۱ دسمبر کا روشن برفانی دن تھا اور ڈالن والا کے انگریز سال نو منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ آس پاس کی کوٹھیوں سے مغربی راگوں کے تہ بہ تہ سربلند ہو رہے تھے۔ بشیر خاں کھانا پکانے والا ڈھونڈنے نکلے اور تھوڑی دیر میں ایک خوش طبع باورچی پکڑ لائے جو "سفر مینا" یعنی SAPPERS AND MINERS کے میس میں کام کر چکے تھے۔ دوسرا ملازم سہ پہر کو سلطانہ رضاء اللہ لے کر آئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سڑک پر سے وائسرائے کے باڈی گارڈ کے شاندار شہسوار پھریروں والی سنگینیں بلند کئے گذرے۔ پچھواڑے کی کوٹھی میں صاحب لوگ نے ۱۹۴۳ء کو خیرباد کہنا شروع کیا۔ وہ رات گئے تک شرابیں لنڈھاتے' شور مچاتے' گراموفون ریکارڈوں پر فوکس ٹروٹ اور والٹس ناچتے رہے۔ کہسار پری دراصل

ان لوگوں کے لئے تھی۔

یخ بستہ چاندنی رات میں حسنین منزل کی نیلگوں بجری پر بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ دریچے میں دو طویل القامت سائے نظر آئے اور پھر سنہری کلاہ والی پگڑیاں پھر ایک فرنچ کٹ داڑھی' دروازے پر دستک۔ ایک اجنبی آواز۔ "سید صاحب۔ سید صاحب۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ کون صاحب؟"

"میں حاضر ہوں۔ غلام محمد حاضر۔"

سیالکوٹ میں اماں کے دادا میر مظہر علی کے کشمیری دوست مالک سرائے و چاء خانہ کے پوتے۔ جی۔ ایم حاضر کے نام کا بورڈ "حاضر اینڈ کو" اب ہندوستان کے اہم ریلوے اسٹیشنوں کے بڑھیا ریفرشمنٹ رومز پر لگا نظر آتا تھا۔ دہرہ دون میں وہ پریڈ گراؤنڈز کے نزدیک رہتے تھے جہاں ان کے سیالکوٹی اسپورٹس گڈز اور جنرل مرچنٹس کی عالیشان دوکان واقع تھی۔ میر افضل علی نے "تخیلات" حاضر صاحب کے بڑے بھائی اور اپنے بچپن کے دوست خواجہ محمد ابراہیم مرحوم کے نام معنون کی تھی۔ لائلپوری لکھنؤ والے محمد ابراہیم خاں' لاہور کے مولوی ممتاز علی اور انعام اللہ شاہ وغیرہ وغیرہ کی مانند حاضر ماموں کا کنبہ بھی اماں نے اپنے والدین سے ترکے میں حاصل کیا تھا۔ جونہی ان کو خبر ملی کہ اماں دہرہ دون پہنچ گئی ہیں کڑکڑاتے جاڑے کی رات کھانے کے ناشتہ دان بھر بڑے بیٹے خواجہ مظہر القیوم (جو علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے) کے ساتھ حسنین منزل پہنچ گئے۔ ایسی بے لوث پر خلوص دوستیاں اس نسل کے لوگوں کی تھیں۔ دوستی کے ذریعے ذاتی مفاد کا حصول آج کے سوشل تعلقات کی خصوصیت ہے۔

حاضر ماموں' مظہر بھائی' ابا جان اور اماں آتشدان کے سامنے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے جب ٹھیک بارہ بجے پڑوس میں میموں کے قہقہوں اور مسرور چیخوں کا شور بلند ہوا۔ ۱۹۳۴ء آگیا۔

حسنین منزل کی سرد اور نم بجری پر کرسی بچھائے دھوپ میں بیٹھے ابا جان اخبار پڑھتے تھے۔ ناگاہ ایک تانگہ عین ان کی کرسی کے سامنے آن کر رکا۔ انعام اللہ شاہ خوش و خرم' ترکی ٹوپی' سیاہ شیروانی' کھڑکھڑاتی شلوار "سال نو مبارک بھائی جان" کا نعرہ لگاتے سواری سے اترے۔ ایک بازو ایک حادثہ میں کھو چکے تھے۔ شیروانی کی ایک آستین خالی جھولتی رہتی تھی۔ اس وقت سر ظفر اللہ کے ہمراہ لندن کا سپاٹا لگا کر آرہے تھے۔

انعام اللہ ماموں نے لاہور سے اخبار "دور جدید" جاری کیا تھا جسے خود ایڈیٹ کرتے تھے۔ اپنا پریس قائم کر رکھا تھا جہاں سے اماں کا ناول "مذہب اور عشق" شائع کیا تھا اور اماں حسب عادت رائلٹی نہیں لیتی تھیں۔ اس ناول کا قصہ ایک تہلکہ خیز اور ناکام ہندو مسلم رومان پر مبنی تھا۔ اماں اس نامور خاندان سے واقف تھیں۔ اس وجہ سے اپنی پھوپی "والدہ افضل علی" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔

انعام اللہ ماموں نے ابا جان کے پاس بید کی کرسی گھسیٹ کر ایک پیالی گرم پانی کی منگوائی اسے چاء کی طرح پیتے گئے اور جلدی جلدی اس اردو ٹائپ یا شاید اردو ٹائپ رائٹر کی متعلق بتلانے لگے جو ہندوستان

میں رائج کرنا چاہتے تھے اور چودھری ظفر اللہ جسے نظام گورنمنٹ میں لگوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اردو ٹائپ ابا جان کا محبوب موضوع تھا۔ گھنٹے بھر بعد انعام اللہ ماموں اسی تانگہ پر بیٹھ کر اسٹیشن چلے گئے اور پھر کبھی نظر نہ آئے۔ کچھ عرصہ بعد حیدر آباد دکن میں دفعتاً پیوست رحمت حق ہوئے۔

شاید تیسواں روزہ تھا۔ اماں پچھلے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی "سفرینا" والے خانساماں جی سے سودے کا حساب لے رہی تھیں۔ بھائی برآمدے کے در میں کھڑے بڑے انہماک سے "چکی" چلانے میں مشغول تھے۔ پچھواڑے والی کوٹھی کی چھت پر صاحب اور میم لوگ دھوپ میں گراموفون ریکارڈوں کی دھنوں پر رقصاں تھے۔ سرخ فراک پہنے ایک نوجوان میم ایک گورے کی کمر میں ہاتھ ڈالے منڈیر پر کھڑی ہنستی تھی۔ دفعتاً اماں کی چارپائی زور سے ہلی۔ انہوں نے چونک کر کہا "ارے زلزلہ۔"

اس وقت بہار اور مشرقی یو۔ پی میں خوفناک بھونچال آیا۔

حسنین منزل ایک ٹھنڈی اور نم کوٹھی تھی۔ ہفتہ بھر بعد اماں خود تلاش مکان میں نکلیں۔ ایک صبح کرزن روڈ پر پیدل چلی جاتی تھیں کہ ایک خوش پوش نوجوان سردار جی مع سردارنی چہل قدمی کرتے دکھلائی پڑے۔ اماں نے بزبان پنجابی ان سے گفتگو شروع کی اور کہا کسی ایسی خالی کوٹھی کا پتہ بتائیں جس میں دھوپ خوب آتی ہو۔

وہ سردار جی بیشتر سکھ صاحبان کی مانند ایک خوش خلق اور فوراً دوستی کر لینے والے آدمی تھے۔ بے تکلفی سے فرمایا "بہن جی۔ غریب خانے پر آجاؤ۔ اپنا گھر سمجھو۔ ہماری کوٹھی کا آدھا حصہ خالی پڑا ہے۔ کرایہ بیشک جو چاہے دیدینا۔" فوراً "غریب خانہ" دکھانے لے گئے جو دراصل ایک عالیشان دولت خانہ تھا۔

تیسرے دن اماں نے حسنین منزل سے کرزن روڈ کوچ بول دیا۔ سردار چنچل سنگھ پنجاب کے ایک ایبنسٹی لینڈ لارڈ تھے اور بالکل فراغت سے زندہ تھے۔ دن بھر وہ پیانو پر مغربی موسیقی کی ابتدائی سرگمیں اور آسان دھنیں غلط سلط بجایا کرتے اور بید خوش رہتے تھے۔ ان کی جھل جھل کرتی کوٹھی کے فرش سیاہ و سفید ٹائل کے تھے۔ دیواریں شاہ بلوط سے منڈھی اور ولایتی مناظر سے مزین تھیں۔

ابا جان نے حج کی تیاری شروع کی۔ حسنین ماموں اور چندا ممانی مراد آباد سے آئے۔

چندا ممانی جن کی شادی سال بھر قبل ہوئی تھی اور ان کی چھوٹی کنواری بہن شاہجہاں۔ قلع محمود پور کے شدید پردے کی پروردہ لڑکیوں کو اماں نے آناً فاناً دہرہ دون کی بے پردہ "فیشن ایبل ینگ لیڈیز" میں تبدیل کر دیا۔ شام کو سڑک پر ٹہلتے ہوئے چندا ممانی گھبرا کر کہتیں "اے ہے۔ باجی۔ وہ مردوا جو سامنے سے آرہا ہے۔ کہیں سری محمود پور کا نہ ہو۔ جاکے ابا سے جڑ دے گا۔"

"جی ضرور سری محمود پور سے سیدھا کرزن روڈ ہی تو آرہا ہے۔ تمہاری جاسوسی کرنے۔" اماں غصے سے جواب دیتیں۔

حسنین ماموں ہمارے بہت دوست تھے اور طرح طرح کی شرارتیں کرواتے تھے۔ ایک روز

برآمدے کے تخت پر میں اپنا نیا "اولڈ روز" ریشمی فراک ڈانٹے بیٹھی ٹیڈی بیر سے کھیل رہی تھی۔ پاس بڑی سی قینچی پڑی تھی۔ چندا ممانی کچھ سیتے سیتے اٹھ کر اندر گئیں۔ ماموں نے چپکے سے کہا، "اگر تم اپنا فراک یہاں سے اتنا کاٹ دو تو ابھی انگلش سٹورز لے جا کر کیڈ بری چاکلیٹ کھلائیں گے۔"

میں نے اطمینان سے دامن پر قینچی چلا دی۔

پھر فرمایا، "اتنا اور کاٹ دو تو دو چاکلیٹ۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے فوراً آواز دی، "لو باجی تمہاری لونڈیا نے نیا فراک کاٹ پیٹ کے برابر کر دیا۔"

اماں نے فوراً باہر آکر مجھ پر گرجنا شروع کیا۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا، "ماموں ہی نے تو کہا تھا۔" اماں اب ان پر برسیں "باولے کو ہش بھی تم ہی کرتے ہو۔" فرمایا، "باجی میں تو کسی چیز کی لالچ میں آکر بیوقوفی نہ کرنے کا سبق دے رہا تھا۔"

جس روز صبح ابا جان حج پر جانے کے لئے براہ علی گڑھ بمبئی روانہ ہو رہے تھے انہوں نے اماں سے کہا، "رات ہم نے خواب میں آپا جان مرحومہ کو دیکھا۔ سفید براق کپڑے پہنے بہت مسرور نظر آ رہی تھیں۔"

۲۔ عزم حجاز

اعرابی ترکستان جا رہا تھا۔ خدا اسے کعبہ پہنچا رہا ہے۔ میں انگورہ اور قسطنطنیہ کا ارادہ دل میں لے کر اٹھا تھا۔ اب کعبہ کی طرف منہ پھیر دیا۔[2]

اعزہ اور اقربا، میرے شوق سفر کے ہمیشہ مخالف رہے۔ کسی کے نزدیک یہ اسراف میں داخل۔ کسی کے خیال میں میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے عزم حجاز پر بھی مخالفت کی آوازیں میری کان میں پڑیں۔ دہرہ دون نے، اہل وطن نے سرد مہری کے ساتھ مگر تعلقات دیرینہ کو نبھا کر، افغان سرداروں نے گرمجوشی سے رخصت کیا۔ عادت قدیم کے مطابق پہلے آستانہ علی گڑھ پر حاضر ہوا۔ سر راس مسعود نے مسافر نوازی کی۔ ۲ فروری کو علی گڑھ سے روانہ ہوا۔ بمبئی کے وکٹوریہ ٹرمنس پر عازمان حجاز کے مطوفین موجود تھے مگر ایک انگریزی ہیٹ پہنے مسافر کو وہ عازم حجاز کب تصور کر سکتے تھے۔ میری طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔ میں اپنے دوست محی الدین خان آزاد بیرسٹر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ انہوں نے کہا، "آپ کو دیکھئے آپ حج کو جا رہے ہیں۔"

تیسرے یا چوتھے دن پیر میں سخت موچ آگئی۔ چلنا دشوار ہو گیا۔ آزاد کا فلیٹ تیسری منزل پر ہے۔ فیصلہ کیا کہ عزیز بزرگ[3] جہاں ٹھہرے ہیں وہیں جا ٹھہروں۔ جعفر سلیمان کے مسافر خانے پہنچا۔

یہاں فضا ایک دم بدل گئی۔ ہر طرف عمامہ پوش۔ نورانی چہرے۔ مسافر کے بجائے حاجی کے لقب سے یاد کیا جا رہا تھا۔ میرے دوست عبدالرحیم صاحب دستکار، انجمن اسلام کے سکریٹری، حج کمیٹی کے ممبر اور حاجی حسین علی صاحب وائس پریذیڈنٹ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور پریذیڈنٹ حج کمیٹی کی طرف

سے مجھے اطلاع ملتی ہے کہ جہاز رحمانی کے تم امیرالحج مقرر کئے گئے۔

۲ مارچ ۱۹۳۴ء آج طبی معائنہ ہے۔ فرسٹ، سیکنڈ، تھرڈ کلاس کے حاجی جمع ہیں۔ سب ایک ٹین پوش ہال میں جمع کئے گئے۔ سو دو سو کے بیٹھنے کے لئے بنچیں، باقی چھ سات سو زمین پر اکڑوں بٹھائے جا رہے ہیں۔ ۴ مارچ۔ رحمانی کل دس بجے رات بمبئی سے روانہ ہو گیا۔ صبح کو میں نے جہاز کا جائزہ لیا۔ سر نظامت جنگ بہادر اور بمبئی کے قونصل جنرل افغانستان اور مسعود علی صاحب ریٹائرڈ سشن جج ہم سفر ہیں۔ اس جہاز میں اور دوسرے جہازوں میں جن پر اس سے قبل سفر کرنے کا مجھے اتفاق ہوا کس قدر فرق ہے۔ جو جہاز سوئیز کو جاتے ہیں ان کی آراستگی، صفائی اور انتظام اور رحمانی کی بے ترتیبی، چپقلش اور گندگی دیکھ کر یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی انگریز کمپنی کا جہاز ہے۔

اس جہاز پر شام کو ڈنر سوٹ پہنے مرد اور دلربا زرّین کے ساتھ لیڈیز نظر نہیں آتیں۔ پیانو اور وائلن کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ادھر ادھر لحن عربی میں قرأت ہو رہی ہے۔ لیکن سات آٹھ سو آدمی کس ابتری میں فریضہ نماز ادا کر رہے ہیں۔ کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں۔ ان عبادت گذار مسلمانوں کو نصرانی ادارہ، نصرانی کپتان، نصرانی خدام ارض موعود کی طرف لئے جا رہے ہیں...[4]

۳۔ رسپنا ندی

ایک باریش بزرگ سفید احرام باندھے، تانگے پر سوار بغیر اطلاع سردار چنچل سنگھ کی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ چھڑی کے سہارے اتر کر ذرا دقت سے سیڑھیاں چڑھے۔ پاؤں کے ایک انگوٹھے پر پٹی بندھی تھی۔

شام کو افغان سردار قدم بوسی کے لئے تشریف لائے۔ سردار محمد عمر خاں نے حال دریافت کیا۔ بزرگ نے فرمایا "جہاز پر سوار ہوتے ہی نقرس (گاؤٹ) عود کر آیا۔ اسی حالت میں ہم لاٹھی کے سہارے حاجیوں کی خبر گیری کرتے پھرے۔ دن میں کئی بار مختلف درجوں کی سیڑھیاں چڑھے اترے۔ اس وجہ سے تکلیف بڑھ گئی۔"

سردار عمر خان نے کہا، "آپ کو خبر گیری کی کیا ضرورت تھی؟"

"امیرالحج مقرر کئے گئے تھے۔"

حج کے تبرکات افغانوں کو پیش کئے۔ افغان ان کو آنکھوں سے لگاتے اور چومتے اور روتے جاتے۔ چند روز بعد داڑھی منڈوا، سوٹ بوٹ ڈانٹ چھوٹے بھائیوں سے ملنے اور برائے علاج نقرس شاہجہان پور روانہ ہوئے۔

ابا جان کو جتنی خوشی سیاحت سے ہوتی تھی اسی قدر اماں نقل مکانی سے مسرور ہوتی تھیں۔ دہرہ دون میں تبدیلی مکان کوئی مسئلہ نہ تھا کوٹھیاں فرنشڈ کرائے پر اٹھائی جاتی تھیں۔ اب اختر محمد خاں صاحب نے فرمایا ان کے داماد نقی محمد خاں کی کاٹج رسپنا کے قریب خالی ہو گئی ہے۔ فوراً وہاں منتقل ہو گئیں۔

خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی حکایات کا خزانہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ غالباً محکمۂ پولس میں ملازم رہ چکے تھے اور عرصے سے پنشن لے رہے تھے۔ لکھتے بھی تھے اور اپنی کتابیں "مذاق سلیم" "ذوق سلیم" وغیرہ اماں کو دی تھیں جنہیں وہ "اردو ادب کی اماں حوا" کہتے تھے۔ "جس طرح بچوں کو ہوا سے ڈرایا جاتا ہے نو آموز لکھنے والے آپ کی کہنہ مشقی اور پختہ نویسی سے ڈرتے ہیں۔"

وہ قریب سرکلر روڈ پر رہتے تھے۔ ان کے پڑوس میں بلونت سنگھ جسپال کی کوٹھی تھی جن سے ابا جان نے پورٹ بلیر میں چارج لیا تھا۔ اور وہ انڈمان سے ابا جان کی جگہ ہردوئی بھیجے گئے تھے۔ ان کی لڑکیاں شکنتلا' کملا اور وملا جیزس اینڈ میری کانونٹ میں پڑھتی تھیں۔ شکنتلا ہم سب سے بڑی اور سمجھ دار تھیں کملا' وملا اور میں مستقل کھیلتے کودتے رہتے تھے۔

کالج سے کچھ دور رسپنا ندی بہہ رہی تھی۔ پڑوس میں عبداللہ بیگم کے بہنوئی خان بہادر محمد حسین رہتے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی محمد جہاں کی شادی لاہور کے خان بہادر میاں عبدالعزیز فلک پیما سے ہوئی تھی جو ہمایوں میں "طیور آوارہ" کے عنوان سے فلسفیانہ اور شگفتہ نثر پارے لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں محمد حسین صاحب کی چھوٹی بیٹی حمید جہاں بھی دہرہ دون آئی ہوئی تھیں جو کچھ عرصہ قبل ہمارے ہاں غازی پور آئی تھیں۔ آپا حمید جہاں کی سب سے بڑی خالہ سکندر جہاں بیگم بھی موجود تھیں۔

شروع گرمیوں میں میں بیمار پڑ گئی۔ خالہ سکندر جہاں گوری چیٹی' مغل چہرہ مہرہ' سفید دوپٹہ کرتا' سفید دلی والا غرارہ پہنے' ہاتھ میں پنکھا' دن بھر بڑی لگن سے تیمار داری کرتیں۔ تیسرے پہر کو خالہ سلطانہ رضاء اللہ آجاتیں جو رسپنا کے کنارے رہتی تھیں۔ شام پڑے تک اماں کے کمرے میں ان نفیس دہلوی بیگمات کی محفل جمتی۔

ڈاکٹر پورن چند ہون نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ اماں فوراً ڈولا ڈنڈا اٹھا راجپور پہنچیں۔ ایک انگریز بڑھیا مسز چیپ مین کے ہوٹل میں قیام کیا۔ مسز چیپ مین کے ہوٹل کے پاس ایک اندھوں کا اسکول تھا جسے مزید انگریز بڑھیاں یسوع کی خاطر چلاتی تھیں۔ اس اسکول کے باغ میں غریب اندھی بچیاں چپ چاپ بیٹھی ننگ کرتی رہتی تھیں اور مسوری جانے والے بشاش دولتمند مسافروں کی موٹریں ان کے پاس سے زن زن کرتی گزرا کرتی تھیں۔

راجپور سے مزید تبدیل آب و ہوا کے لئے اماں نے چچا نصیر الدین حیدر کے ہاں الموڑہ جانے کا پروگرام بنایا۔ ابا جان ابھی شاہجہان پور میں تھے۔ بشیر خان چھٹی لے کر گورکھپور روانہ ہوئے۔ ہم لوگوں نے بذریعہ ریل کاٹھ گودام کا رخ کیا۔

۴۔ جگنوؤں کی دنیا

بیکٹ ہاؤس' الموڑہ کے برآمدے پر چڑھ کر کھانے کے لئے مثالی کھٹے انگوروں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے کے نیچے ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔ لان کی سرسبز ڈھلوان کے نیچے مال روڈ تھی۔ اس سے

نیچے بل کھاتی سڑک پر موٹریں اور لاریاں کھلونوں کی طرح رینگتی نظر آتی تھیں۔

جس روز ہم لوگ بیکٹ ہاؤس پہنچے ٹانگ پر پٹی باندھے اچھو بچوں کے کمرے میں سفید پلنگڑی پر ٹھاٹھ سے بیٹھی تھی۔ اس نے بڑے رعب سے مجھے مخاطب کیا' "جناب ہم اتنی اونچی پہاڑی سے گرے تھے۔ گرتے گرتے ہم ایک خوفناک چٹان پر پہنچے۔" اچھو نے جو قصہ سنایا اس سے گمان ہو سکتا تھا کہ وہ نندہ دیوی سے گری تھی اب وہ ایک مہینے سے پلنگ پر چڑھی سب پر حکم چلا رہی تھی اور اپنے حادثے کی وجہ سے بے حد اہم ہو چکی تھی۔ اور اپنے گھنگریالے بال جھٹک کر خوب ہنستی تھی۔

چچی [illegible] یدہ کچھ عرصہ کے لئے نہنور گئی ہوئی تھیں۔ بیکٹ ہاؤس پر لڑکیوں کی عملداری تھی۔ سب سے بڑی عذ[illegible] یٹرک کی تیاری کر رہی تھیں۔ حمیرا آپا اور زہرا آپا کو بھی ماسٹر صاحب پڑھانے آتے تھے۔ اچھے بھائی اسکول میں داخل تھے۔ اچھو اور پارے گھر پر ماسٹر صاحب سے پڑھتے تھے۔ ہمارے تایا زاد بھائی امتیاز حیدر کلکتہ سے آئے ہوئے تھے اور ابا جان وغیرہ کی چچا زاد بہن پھوپی اپی گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

بیکٹ ہاؤس' کمایوں کے ایک مشہور انگریز کی بنوائی ہوئی کوٹھی تھی۔ شام کو عذرا آپا نے مجھ سے کہا۔ اگر آپ دوپہر کو اچھو' پارے کے ساتھ بیٹھ کر قاعدہ پڑھیں گی تو روز رات کو پری آکر ایک چاکلیٹ آپ کے تکیے کے نیچے رکھ جایا کرے گی۔ اچھو' پارے جب اچھے اچھے کام کرتے ہیں تو وہ انہیں بھی انعام دیتی ہے۔

صبح کو چاکلیٹ میری تکیے کے نیچے موجود تھی۔ سہ پہر کو ماسٹر صاحبان کے جانے کے بعد ان کے شاگردان [illegible] شہد درخت پر چڑھ کر مطالعہ کرتے۔

اکثر دوپہر کو امتیاز بھائی دوسرے برآمدے میں گراموفون بجاتے اور بڑے انہماک سے ایک ریکارڈ سنا کرتے۔

بلبل ناشاد نے کچھ اس طرح فریاد کی　　روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں صیاد کی

مہمان نیچے واپس جاتے تو امتیاز بھائی' اچھے بھائی اور پھوپی اپی کے بیٹے بھائی بہاء الدین ایک سرخ پلنگ پوش بانس سے باندھ کر مال کی رخ والے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے۔ مہمانوں کی موٹر یا لاری دور نشیبی راستے پر سے گذرتی دکھائی دیتی۔ اس وقت یہ الوداعی پرچم لہرایا جاتا۔

ایک روز پارے میاں گھاس میں بڑے غور سے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ "کیا چیز ہے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پری کنڈل ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"رات کو جو پری آتی ہے اس کے قدموں کے نشان جس جگہ پڑیں وہاں شبنم نہیں گرتی۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"عذرا آپا نے بتلایا ہے۔"

میں بھی فوراً پری کنڈل کی تلاش میں جت گئی۔

فہمیدہ کی چھوٹی بہن زلیخا اتنی چھوٹی تھی کہ اسے محض چھوٹی ہی کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں پھوپی ابی کی لڑکیاں تھیں۔ اس وقت ممن آپا اور بھائی بہاء الدین چھوٹی کو ایک ٹوکری میں ڈالے برآمدے میں ٹوکری گھسیٹتے پھر رہے تھے۔ دفعتاً بھائی بہاء الدین غائب ہو گئے۔ وہ سہ پہر بھائی بہاء الدین نے اپنے کمرے کے دروازے اندر سے بند کر کے کسی پراسرار مصروفیت میں گزاری۔

شام کے وقت برآمدے میں انگور کی بیل کے نیچے کارڈ بورڈ کی ننھی سی گاڑی نظر آئی جو سنڈریلا کی بلوریں کوچ کے نمونے پر بڑی کاریگری سے بنائی گئی تھی۔ گاڑی میں دو مینڈک جتے تھے جو بدمزاجی سے اسے گھسیٹتے ہوئے ادھر ادھر پھدک رہے تھے۔

"جلدی سے اندر آجایئے۔" عذرا آپا نے آواز دی۔

"کیوں؟ یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"پری آئی تھی۔" جواب ملا۔ "مگر قاعدہ یہ ہے کہ کسی آدم زاد کو پری کی گاڑی نظر آجائے تو اس میں جتے ہوئے لال فوراً مینڈک بن جاتے ہیں۔"

"کیا اس وقت بھی وہ گاڑی میں بیٹھی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بالکل! قریب ہرگز مت جایئے۔" اچھے بھائی نے جواب دیا۔

"پری۔" پارے میاں ڈپٹ کر للکارے۔

"کیا ہو رہا ہے۔" اچھو نے اندر سے پکارا۔

"آپا اچھو۔" میں اسے بڑے ادب سے باضابطہ آپا اچھو کہتی تھی۔ "پری برآمدے میں بیٹھی ہے۔ اس کی کوچ کے گھوڑے مینڈک بن گئے۔"

"کہاں؟" اچھو پلنگڑی سے اتر کر دریچے میں آئی۔ فہمیدہ اپنا لمبا فراک پہنے چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ ہم تینوں نے باہر جھانکا گاڑی غائب ہو چکی تھی۔ بڑے بہن بھائی بھی غائب تھے۔

"گپ!" اچھو نے غصے سے کہا اور جا کر اپنی پلنگڑی پر بیٹھ گئی۔ دو روز بعد اسے چلنے پھرنے کی اجازت ملنے والی تھی۔

"ٹنکر ٹیلر سولجر سیلر۔" اچھو تاش کے پتے بانٹنا شروع کرتی۔ ہر پتے پر مسخری تصویریں بنی تھیں۔ یہ شاید "ہیپی فیملی کارڈ" کہلاتے تھے۔ پھر کھیل ادھورا چھوڑ کر اچانک "اول بھلا بھئی اول بھلا۔ سب میں کدو گول بھلا۔" کا نعرہ لگاتی۔

دنیا کی ہر چیز بہت فرحت بخش تھی۔ بات کا ہر جملہ عموماً اس طرح شروع ہوتا "اوفوہ۔ اتنا مزا آیا۔"

"کیا ہو رہا ہے۔" کوئی بڑا پوچھتا۔

"مزے۔"

جب بادل کمروں میں گھس آتے تب بھی "بڑا مزا" آتا۔ "بڑا مزا" ایک ساتھ اور مشدد ادا کیا جاتا تھا تاکہ اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہو سکے۔

کبھی کبھی رات کو ممن آپا مجھے گیلری کی دیوار میں نصب ٹیلی فون کے اونچے تختے پر چڑھا کر خود جگنو جمع کرنے باغ میں چلی جاتیں۔ کچھ دیر بعد کھلکھلا کر ہنستی ہوئی واپس آتیں۔ ان کے چنے ہوئے دوپٹے میں جگنو ٹمٹما رہے ہوتے۔

وہ جگنوؤں کی دنیا تھی۔

ایک شام ماسٹر صاحب کا دیا ہوا سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے اطلاع ملی کہ پری خفا ہو گئی ہے۔

اچھو، پارے اپنے اپنے سبق فرفر یاد کرنے کے بعد مجھے جلانے کے لئے نوابوں کی طرح آنکھیں بند کئے اپنے بستروں پر لیٹے پاؤں ہلا رہے تھے۔

اچانک اچھو نے کروٹ بدل کر ایک آنکھ کھولی اور زور سے کہا "سلام علیکم پری۔"

پارے نے اس کی تقلید کی "سلام علیکم پری۔"

پھر اچھو اچھل کر پلنگ پر اکڑوں بیٹھ گئی اور تکیہ اٹھایا جس کے نیچے ٹافی کا پورا ڈبہ موجود تھا۔

میں نے فوراً اپنے تکیے کے نیچے دیکھا وہاں کچھ نہ تھا۔ میں نے بڑے دکھ سے رونا شروع کر دیا۔ پھر جلدی سے آنسو پونچھ کر اچھو سے دریافت کیا "کیسی تھی پری؟"

"بہت خوبصورت۔"

"کیا پہنے تھی؟"

"ساری۔"

"ساری میں اڑتی کیسے ہو گی؟"

"پر جو ہیں۔"

"ٹافی ہمیں بھی دیجئے آپا اچھو۔"

"آپا نے منع کیا ہے۔ آپ نے پہاڑا یاد نہیں کیا۔ پارے میاں تو پورا شکوہ حفظ کر رہے ہیں۔"

پارے میاں فوراً اپنے پلنگ پر کود کر گرجے "اور جناب۔ وہ شمع اجالا جس نے کیا۔"

دروازے میں سے پھوپی ابی نے جھانکا "شو۔ شو۔ رات ہو گئی۔ سو جاؤ۔"

ہم تینوں پھر اپنے لحافوں میں گھس گئے۔ آتشدان کے شعلوں میں طرح طرح کی شکلیں بنا کیں۔

چند منٹ بعد اچھو نے چپکے سے آواز دی "ہم بہترین خرگوش بنا رہے ہیں۔" اس نے ہاتھوں کی پرچھائیں سے دیوار پر خرگوش بنایا۔

"اب بطخ۔ اب کتا۔" پارے میاں نے اطلاع دی۔ میں بھی بڑی سرگرمی سے اٹھ بیٹھی اور اس اہم کام میں مصروف ہو گئی۔

صبح کو پارے میاں نے مطلع کیا' "آج سینما دکھایا جائے گا۔"

"وہ کیسا ہوتا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔ "آپ نے دیکھا ہے آپا اچھو؟"

"جناب۔" اچھو نے رعب ڈالا۔

رات کو کھانے کی میز پر سے یک بیک اٹھ کر پارے میاں ڈرائینگ روم کی سمت بھاگے جہاں چچا جان کے ایک دوست پروجیکٹر لگانے میں مشغول تھے۔ پھر پردے گرا کر روشنیاں بجھائی گئیں اور انگریزوں کی تصویریں دیوار پر اچھلنے کودنے لگیں۔ سب نے پورک پائی ہیٹ لگا رکھے تھے اور ادھر ادھر پھدکتے پھر رہے تھے۔ ایک کھلے دریچے میں سے چاند جھانکنے لگا۔ باہر پہاڑوں پر بڑا سناٹا طاری تھا۔

رات کو چاند بہت بڑا اور بہت پیلا اور بہت سرد معلوم ہوتا تھا۔ رات' ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھی بوڑھی جوگن' برف کے ٹکڑوں جیسے تاروں کی مالا جپتی تھی۔ اور دور جاگیشور کے قدیم تاریک مندروں میں دیے ٹمٹماتے تھے۔ پہاڑیاں جادو کی جڑی بوٹیوں سے مکالمہ کرتی تھیں۔ اس خنک' خوشگوار' شانت دنیا میں صرف پھولوں' تروتازہ پھلوں' پریوں اور انسانوں کی طرح باتیں کرنے والے جانوروں کی عملداری تھی۔ رات کو "چور چور" کھیلتے ہوئے اچھو گھاس کے لمبے ڈنٹھل کی تلوار بجھے لے کر کسی دریچے میں کھڑا کردیتی۔ باہر اندھیرے میں چور سرخ زبانیں نکالے کھڑے تھے اور سرخ پنکھڑیوں والے پھول چوروں کی زبانیں تھیں۔ بچوں کا تخیل اچھوتا' خوبصورت اور انوکھا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے لئے یہ ہمارا تخیل تھوڑا ہی تھا۔ حقیقت تھی۔

ایک روز ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج چچا جان نے کچہری سے واپس آکر اماں سے کہا' "شاہجہان پور سے بھائی جان نے اطلاع بھجوائی ہے ان کا تبادلہ اٹاوہ کا ہوگیا آج کل میں خط بھی آتا ہوگا۔"

جب ہم لوگ دہرہ دون روانہ ہوئے اور ہماری لاری بل کھاتے راستوں سے اترتی نشیب کی طرف جارہی تھی اس وقت دور چیڑھ کے درختوں سے ڈھکی ایک پہاڑی پر سرخ پلنگ پوش کا "پرچم" لہرایا جارہا تھا۔ پھر وہ پرچم رفتہ رفتہ ایک نقطے میں تبدیل ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

بیکٹ ہاؤس میں اب اترپردیش کی نیشنل کیڈٹ کور کے ہیڈ کوارٹرز ہیں۔ اس کے برآمدے جالی سے ڈھک دیئے گئے ہیں۔ سامنے جیپ گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ برساتی اور پچھلا حصہ شکستہ ہوگیا ہے۔ پچھلی پہاڑی پر فوجی جوان نہانے دھونے میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن آپ یقین فرمایئے کہ اس بے رنگ و بو دنیا میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب جگنوؤں کی روشنی میں اس کوٹھی کے اندر پری آیا کرتی تھی جس کی گاڑی میں مینڈک جتتے تھے اور رات کو چور زبانیں نکال کر پھولوں کی جھاڑیوں کی صورت میں کھڑے رہتے تھے۔

اور جاننا چاہئے کہ بچپن کی معصومیت جگنو کی روشنی کی مانند ٹمٹما کر اس طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے وہ زمانہ کبھی تھا ہی نہیں۔

لیکن وہ بچے انگوروں کی بیل میں چھپی اس کوٹھی میں شاید اسی طرح موجود قہقہے لگا رہے ہیں۔

کیونکہ وقت ایک ایسی لوح محفوظ ہے جس پر وقت کا کوئی اثر نہیں۔

۵۔ خزاں کی چاندنی

شاید جمنا پار سے دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں تاج محل کا سپید چمکیلا گول ڈلا سا نظر آیا۔ شہر کی گلیوں میں پہنچ کر کوئی نواب فیاض بہادر تھے۔ ان کا پتہ پوچھتے پوچھتے بشیر نے ایک ڈیوڑھی کے سامنے اوک لینڈ روکی۔ ایک حبشن نے اندر سے سر نکال کر جھانکا اور اس کے دانت جگمگائے۔

صحن میں بہت سی حبشنیں گھوم رہی تھیں۔ نام ان کے مروارید' مرجان' الماس اور زمرد تھے۔ گویا دارالخلافہ اکبر آباد سے ایک خفیف سا تعلق ابھی باقی تھا۔

نواب صاحب کے ہاں سے دوسرے روز اٹاوہ روانہ ہوئے اور جمنا کے کنارے آباد ایک بوسیدہ سے شہر میں پہنچے جہاں فیروز شاہ تغلق کی بنوائی ہوئی جامع مسجد استادہ تھی اور سرسید کے آخری ساتھی حاجی الطاف حسین کے اسلامیہ ہائی اسکول میں سے پڑھائی کے بعد لڑکوں کے غول باہر آرہے تھے۔

بشیر شہر خبرو تھے۔ اٹاوہ پہنچنے کے دوسری دن اطلاع دی' "بیگم صاب۔ ہم نے سنا ہے یہاں مرہٹوں مگلوں میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ایک مگل سپاہی نے مگلن کی چٹکی مراٹھن سے جڑ دی۔ بس اسی روج سے مگل ہارنے لگے۔ مگل ایپارٔ بیٹھ گئی۔ اس بدماس کی ہیاں کبر ہے۔ سنا ہے اس پر بورڈ لگا ہے۔ جون صاحب ادھر سے گذریں مہربانی سے چگل کھور کی کبر پر دس جوتے مارتے جائیں۔ ہم بھی کل جا کر ماریں گے۔ پچاس جوتے۔"

اماں نے درشتی سے کہا' "بشیر باؤلی باتیں مت کیا کرو۔ کسی کی قبر پر جوتے نہیں مارتے۔"

بشیر کی بی بی گورکھپور سے آگئیں۔

پچھوا ہوا چلی۔ کوری صراحیوں میں رکھا پانی ٹھنڈا ہوا اور بشیر کی بی بی نے بزعل کا شربت تیار کیا۔

دلی میں ہیضہ پھیل گیا۔ اس سے بچنے کے لئے چچا مشتاق احمد زاہدی مع چچی جو ایک غیر معمولی طور حسین مغل خاتون تھیں اٹاوے تشریف لائے۔ برسات شروع ہو گئی۔ جب جھڑی لگی ہوتی چچی گراموفون پر اپنا پسندیدہ ریکارڈ بجاتیں' "حق کے پیارے غوث الاعظم دیکھ جھولنا جھولیں" چچا آرام کرسی پر بیٹھ کر دلی کا ہفتہ وار "نوائے سروش" اور کلکتہ کا الہلال پڑھتے اور باہر سبزے پر نمکولیاں ٹپ ٹپ گرتیں۔

ان دونوں کے دلی واپس جانے کے بعد چچا ظفر عمر تشریف لائے۔ ان کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی۔ اٹاوے میں گھی کے تاجروں کے علاوہ طوائفوں کی فراوانی تھی جو یکوں پر بیٹھی بغیر آستین کے بلاوز پہنے چوڑیاں چھچھاتی درگاہوں کی سمت جاتی سڑک پر سے گذرتی تھیں۔۔ ان کو دیکھ کر بشیر کی بی بی ہونٹ چپکا کر ترشی سے کہتیں' "افراط طوائف۔ افراط طوائف۔"

دیوالی کی رات غازی پور کی طرح اٹاوے میں بھی بشیر نے اپنی نگرانی میں کوٹھی پر چراغاں کروایا۔ اور کھانڈ کے کھلونے اور مٹی کی گڑیاں ٹوکرے بھر کر میرے لئے آئیں۔

دوپہر کے سناٹے میں کبوتر مستقل غٹرغوں کرتے اور بکائن پر بیٹھی دھوبن چڑیاں چپ چپ کیا کرتیں۔ شہر کی دیواروں پر انڈین ٹی کے اشتہار لگے تھے جن میں دو بچوں کی تصویروں کے نیچے لکھا تھا "یہ اور اس کا بھائی۔ پیتا ہے روز چائی۔"

انڈین ٹی کا ایک اشتہار

حسن جبش مشہور زمانہ جبو شیدی جبوشانہ

بشیر خاں کو بہت مرغوب تھا کہ خود بھی طبعاً شاعر تھے اور اکثر و بیشتر فکر سخن میں محو رہتے تھے۔ ایک مرتبہ بھائی نے ان کو "جلال الدین خوارزم شاہ" کا

کوہ و صحرا برفانی جنگل وحشت ویرانی
سردی سردی بے حد سردی ہے عریانی کی بے دردی
کیسے جائے گی پیسے سے

پڑھ کر سنایا۔ بہت خوش ہوئے۔ تیز گرمی پڑ رہی تھی۔ فرمایا

گرمی گرمی بے حد گرمی سنو اٹاوے کی بے سری
ننگے لوگ ٹہلتے ہیں پنکھا لے کر جھلتے ہیں

ضلع اٹاوہ میں ایک قصبہ پھپھوند تھا۔ وہاں کے مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی ایک مخلص بے لوث ایثار پرست کانگریسی تھے۔ آدھی عمر جیل میں گزاری تھی۔ ایک بار وہ اپنے چند مزاحیہ کتابچے ابا جان کو دے گئے۔ ان کے نام نے بشیر کو بہت انسپائیر کیا۔

بھائی امتیاز حیدر الموڑے سے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اور بھائی نے مصرع طرح تجویز کیا

بشیر احمق کو لگ گئی پھپھوندی آج

دوپہر بھر بشیر خاں فکر سخن میں مصروف رہے۔ شام کو سامعین سے کہا "سنئے۔ بابا ارج کرتے ہیں

بشیر احمق کو لگ گئی پھپھوندی آج
اب کیا جائے ای کا کون علاج
نہ توپ ہے نہ سپاہی ہے اور نہ ہے بندوک
گدھے پہ بیٹھ کے لینے چلے ہیں ای سوراج

بشیر خاں کو فوٹوگرافی کا شوق چرّایا۔ کیمرہ اور پردے خریدے۔ شاگرد پیشے کے سامنے پردے لگا کر ہم سب کی تصوریں کھینچا کرتے۔ بی بی کو بھی فوٹوگرافی سکھلا دی تھی۔ لڑائی کی خبریں سننے کا بڑا شوق تھا۔ دنیا کے کسی حصے میں جنگ نہ ہوتی تو اکتا کر کہتے۔ اچھا بابا ہندو مسلم لڑائی کی کھبریں ہی سنا دیجئے۔ اچھا کتابوں کی قیمت ہی سنا دیجئے۔ (پھول کے اخری صفحے پر چھپتی تھیں) ننھی کتاب دو آنے' منی کتاب دو آنے پیاری کتاب دو آنے' راکھ بیگم ۴ آنے خزانہ کا راز ۴ آنے۔

بشیر خاں موٹر ڈرائیور ہندوستان کے ان کروڑوں بد قسمت عوام میں سے تھے جو تعلیم سے محروم

رکھے گئے تھے۔ پڑوس کے ضلع ایٹہ میں چچا نثار حیدر زیدی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہ آل انڈیا مشاعرے کرواتے تھے اور لڈن ماموں ایس پی تھے جو "انسداد جرائم ڈکیتی" میں مصروف تھے۔ چچا نصیر نے الموڑے میں برج کے رسیا خان بہادر اسد اللہ کاظمی اور پروفیسر مختار حسین نقوی کے لئے ایک طویل نظم کہی:

لگے فرمانے مجھ سے چند احباب کہ ہم ہرگز نہ آئیں گے کبھی پاس
اگر تم چاہتے ہو ہم سے ملنا تو ہو جاؤ برج کے تم بھی اک داس
گنو بس بیٹھے بیٹھے ساری گنتی اٹھارہ 'بیس' پینتالیس 'انچاس
برج بھاشا بھی کیا الٹی ہے بھاشا ہوئے جو فیل کہتے ہیں کیا پاس
اترتے ہیں جو ٹھٹھوں پر تو ایسے کہ گویا پی کے بیٹھے ہوں الماس
برج کھیلے وہی جس کو ہو کرنا سبھوں کا ناس اپنا ستیا ناس

نزدیک کے سرسبز میدان میں سرکس آیا۔ پل بھر میں ایک پرفسوں دنیا وہاں آباد ہو گئی۔ بشیر اکثر شام کو ہمیں تماشہ دکھانے لے جاتے۔ سرکس نے مجھے سخت مسحور کیا۔ ایک رات میں نے اماں سے کہا' "اماں ہم سرکس میں نوکر ہو جائیں؟"

"ضرور۔ بڑی ہو کر تھیٹر دیکھو گی تو کہنا تھیٹر میں نوکر ہو جاؤں۔ ناچا کروں گی۔ سنیما دیکھ کر کہنا۔ ایکٹرس بنوں گی۔"

یہ ہمت شکن جواب سننے کے بعد خود گڑیوں کا سرکس قائم کر اپنے آپ کو رنگ ماسٹر کا عہدہ تفویض کیا۔

چچی وحیدہ مع اچھو پارے الموڑے سے تشریف لے آئیں۔ رات کو پچھلے چبوترے پر پلنگ بچھتے۔ اوپر تاروں بھرا آسمان بہت نیچا جھکا ہوتا۔ ابا جان ہم لوگوں سے کہتے ایک تارا گھگو تارا۔ دو تارے گھگو تارے۔ یہ غالباً نشور کی کوئی پرانی نرسری رائیم تھی۔ اٹاوہ کی سرخ سنگلاخ دھرتی پر رات کو موسم خزاں کی زعفرانی چاندنی پھیلتی تھی۔ جب چاند طلوع ہوتا چچی جان مسکرا کر ہم تینوں سے کہتیں -- آ اتر آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی

اچھو بہت پریکٹیکل مزاج رکھتی تھیں۔ ذرا سوچ کر فرماتیں' "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

ایک روز اماں اور چچی جان دن بھر کے لئے کانپور گئیں۔ اچھو کہ میری دوست' فلسفی اور رہبر تھیں جاپانی تصویریں پانی میں بھگو کر دوسرے کاغذ پر اتارنے میں مصروف تھیں چپکے سے بولیں' آج بڑے ابا کچہری جائیں ہم لوگ چپکے سے پیچھے لگیج کیریر پر بیٹھ جائیں گے۔ بڑا مزا آئے گا۔"

"بہت اچھا آپا اچھو۔" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

جب ابا جان موٹر میں سوار ہوئے ہم دونوں اچک کر لگیج کیریر پر بیٹھ گئے۔ اس کی سلاخیں تھام لیں۔ موٹر پھاٹک سے نکلی سڑک پر پہنچ کر اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہم دونوں نے مزید مضبوطی سے سلاخیں پکڑ لیں۔

ایک راہ گیر نے گھبرا کر بشیر خاں کو روکنے کا اشارہ کیا۔ بشیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ موٹر روکی۔ ہم لوگوں کو اتار کر ابا جان کے سامنے پیش کیا" "غضب ہوتا۔ گر جاتیں۔ سر پھوٹ جاتے۔ مر جاتیں۔"

بشیر دہشت زدہ اور ابا جان بے حد متفکر نظر آئے۔ ملائمیت سے کہا" "آپ لوگوں کو اس قسم کی خطرناک شرارتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

اتوار کی سہ پہر امریوں میں گلدم نغمہ سرا ہوئی۔ بشیر خاں کنویں کے پاس کھاٹ بچھا کر بیٹھتے اور طاہر چپڑاسی سے داستان لندھور سنتے۔ سامعین میں شفیق چپڑاسی' فقیرا' جو دہرہ دون سے ساتھ آیا تھا اور بشیر خاں کی بیوی اور ہم بچہ ہا شامل ہوتے۔ بشیر خاں مجھ سے اور اچھو سے اتنے خفا تھے کہ اس اتوار کو انہوں نے بطور احتجاج داستان لندھور بھی نہیں سنی۔

۶۔ گلاب پاش

جرمنی سے لوٹ کر خواجہ عبد المجید کے بھتیجے ڈاکٹر اے۔ حمید نے علی گڑھ میں ایک کوٹھی مسعود منزل بنوائی تھی جو کرائے پر اٹھتی تھی۔ خود بمبئی میں رہتے تھے۔ (یہ کوٹھی اب مسعود محل کہلاتی ہے اور علی گڑھ آنے والے وی۔ آئی۔ پی لوگوں کے لئے ہوٹل میں تبدیل کر دی گئی ہے)۔ ۱۹۳۵ء میں ابا جان کے متعدد عزیزوں کی اولادیں مسعود منزل میں فروکش یونیورسٹی اور گرلز کالج میں علم حاصل کر رہی تھیں۔ والدائیں مسعود منزل میں مقیم اور والد لوگ اضلاع میں بر سرکار تھے۔ ابا جان وغیرہ کے ماموں سید اکرام حیدر ترمذی ابن میر بندے علی ترمذی بھی مسعود منزل میں مقیم تھے۔ اس وقت اسی برس کے لگ بھگ عمر تھی۔ ان کی والدہ سیدہ مریم خاتون ۱۸۴۲ء میں سوات بنیر سے بندیلکھنڈ آئی تھیں اور پرنانا سید نور محمد کو بخارا چھوڑے تقریباً سوا سو سال ہو چکے تھے مگر دادے اکرام حیدر اب تک وضع قطع اور چہرے مہرے سے بخاری مولوی اور سرحدی پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ بڑا سا پگڑ' گھیر دار شلوار' روئی کا دگلہ' بجد گوری رنگت' بگلا ایسی سفید داڑھی نورانی چہرہ۔ اپنی مرحومہ بہن سعید بانو کی اولاد سے فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے اور خالص نہٹوری لہجے میں اردو بولتے تھے۔ بندوق ہمیشہ ساتھ رہتی تھی۔ ان کے کمرے میں رات بھر روشنی جلتی رہتی۔ انگیٹھی پر خود چاء بنا کر پیتے جاتے اور بغیر عینک لگائے اپنے بستے پر جھکے "تذکرہ اولیائے بندیلکھنڈ و روہیلکھنڈ" اور "تاریخ سادات نہٹور" بزبان فارسی لکھنے میں مشغول رہتے۔

صبح کے وقت دادا جان بندوق سنبھالے پہلو کے برآمدے میں گڈے کی طرح آن بیٹھتے۔ سامنے آم کے درخت میں ٹین بندھوا رکھے تھے۔ بچوں سے چاند ماری کی مشق کروایا کرتے۔

اندر بڑے کمرے کے آتشدان پر دو نقرئی گلاب پاش دھرے تھے۔ ایک سہ پہر اس کمرے میں چاندنی کا فرش کر کے زنانہ میلاد شریف منعقد کیا گیا۔ دادے اکرام حیدر ترمذی نے کراری آواز میں وعظ کہا۔ اور لڑکیوں بالیوں نے سر ڈھانپ ایک قطار میں کھڑے ہو۔

بڑی دور سے آئے ہوئے ہیں تم پر اترائے ہوئے ہیں۔ یا نبی سلام علیک۔ پڑھا اور آپا عذرا اور

آپا طفیل نے گلاب پاش اٹھا کر خنک عرق گلاب حاضرین محفل پر چھڑکا۔

فروری کے مہینے میں سالانہ نمائش کے لئے مزید رشتے دار دوسرے شہروں سے مسعود منزل میں وارد ہوئے۔ بچوں سے گھر بھر گیا۔ برساتی میں کینوس کی چادر سے ڈھکی چچا نصیر الدین حیدر کی کار کھڑی تھی۔ باہر خیمہ لگا تھا۔ دونوں جگہیں آنکھ مچولی کے لئے بہترین تھیں۔ اکثر آپا ممن "دی پرنس آف پیرس لوسٹ ہز ہیٹ" کھلاتیں۔ شام کو نمائش کی سیر کی جاتی۔

ایک شام نمائش کے ایک پنڈال میں الہ آباد کی مس آشا کماری اوجھا نے کتھک رقص دکھلایا۔ شمالی ہند میں ہندو شرفاء کی لڑکیاں اکا دکا پبلک میں رقص کرنے لگی تھیں۔ جس وقت مس اوجھا تھالی کے کنارے پر بھاؤ بتا رہی تھیں سامنے کی قطار میں بیٹھی اماں نے خاصی بلند آواز میں ارشاد کیا" "بڑے افسوس کی بات ہے ایک شریف زادی اسٹیج پر کھڑی ناچ رہی ہے۔ ایسی آزادی بھی کیا۔ اور بھابی مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ گھر چلئے۔"

دیورانی مسز وحید الدین حیدر نے جواب دیا" "بھابی' ان کے اعمال ان کے ساتھ۔ اب آئے ہیں تو سارا پروگرام دیکھ لیں۔ سردی کا انتظام میں ابھی کرتی ہوں۔"

انہوں نے نزدیک بیٹھی بیگمات سے پروگرام کے کاغذات لئے' ایک صاحب سے ماچس حاصل کی۔ کرسی کے سامنے ننھا سا الاؤ جلایا اور خود بھی اطمینان سے پیر تاپنے لگیں۔

اسی ہفتے خالدہ ادیب خانم ہندوستان کا دورہ کرتی علی گڑھ پہنچیں۔ اماں کو سخت افسوس ہوا کہ اس وقت ابا جان بہت دور اٹاوہ کے ضلع میں دورے پر تھے۔ کہنے لگیں' "کاش اس وقت میرے بجائے وہ یہاں ہوتے۔ کسی طرح ایسا ہو کہ میں چلی جاؤں اور وہ علی گڑھ آ جائیں تو مجھے زیادہ خوشی ہو۔ بچہ اٹاوے میں اکیلا ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک کا وہاں ہونا ضروری ہے۔" اتفاق کی بات دوسری صبح اٹاوے سے بھائی کی علالت کا تار آ گیا۔ اماں فوراً علی گڑھ سے روانہ ہوئیں۔ اسی روز شام اچانک ابا جان مسعود منزل پہنچ گئے۔ معلوم ہوا یونیورسٹی نے یونین ہال میں خالدہ ادیب خانم کا تعارف کرانے کے لئے خاص طور سے بلایا ہے۔

"ہال [5] لڑکوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ سب ہمہ تن انتظار تھے۔ اسٹیج کے بائیں پہلو کا دروازہ کھلا۔ پہلے وائس چانسلر اور ان کے بعد خالدہ ادیب خانم اور ان کے ساتھ ماموں جان داخل ہوئے۔ روشندان میں سے خالدہ خانم پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ چونکہ ماموں جان ساتھ کھڑے تھے ان پر بھی پنکھڑیاں گر رہی تھیں۔ ان کی اس وقت کی تصویر نظروں کے سامنے ہے۔ سر کے بالوں پر پنکھڑیاں چمکتے ہوئے سنہرے فریم کی عینک اور وفور مسرت سے چمکتا ہوا گلابی چہرہ۔ میری ایک نظر اپنے ماموں پر تھی اور ایک خالدہ ادیب پر۔ یہ ادھیڑ عمر کی ترکن ایسی تر و تازہ گلاب تھی جس کے سامنے ہال میں موجود دیورو چین عورتیں (پروفیسروں کی جرمن بیویاں وغیرہ) پھیکے شلجم معلوم ہو رہی تھیں۔

"لڑکوں نے ہم آہنگ ہو کر تالیاں بجائیں اور وائس چانسلر کے شکریے اور ماموں جان کی تعارفی

تقریر کے بعد خالدہ ادیب خانم نے تقریر شروع کی۔

"سجاد صاحب [6]، خالدہ ادیب اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑی دلدادہ تھے۔ یونین میں سجاد صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاپردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوب سے تائب ہو گئی ہیں اور اسے صرف ایام جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد میں ایک صحبت میں اس واقعے کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ ادیب خانم کو کیا معلوم ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر غلط بحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔"

خالدہ ادیب خانم والے جلسے میں ایک نوجوان طالب علم اسرار الحق مجاز نے "نذر خالدہ" سنائی تھی۔ ابا جان نے مسعود منزل واپس آکر اپنے بھتیجے جرار حیدر سے جو مجاز کے کلاس فیلو تھے کہا، "یہ لڑکا بہت اچھا شاعر ثابت ہوگا۔"

حوالہ جات

1 وفات ۱۹۲۳ء وہ عندلیب جو قفس میں پیدا ہوئی۔ قفس میں رہی اور قفس میں ہی دم توڑ دیا"
یلدرم تہذیب نسواں ۱۸ فروری ۲۳ء

2

شکرایزد ملا یہ شرف مجھے کو — جس سے محروم تھے میرے اب وجد
کر لیا میں نے حج بیت اللہ — یہ جبیں اور بارگاہ صمد
دیکھ آیا مزار پاک رسولؐ — بن کے رشک اویسؓ تابہ ابد
لیکن آں حالت ایست حالت من — کہ ؟ اور اضمیر من نجد
پر تو نور او چوں نیست بہ قلب — چہ شود گر کے جبیں ساید

یلدرم

3 ابا جان کے ننھیالی عزیز مولوی محمد علی قادری نقشبندی (ابن حافظ محمد موسیٰ) ہیڈ مدرس مدرسہ عالیہ اسلامیہ حمیرپور، بند ھیلکھنڈ، جو پھوپی جان کے حج بدل کے لئے بھیجے جارہے تھے۔

4 تلخیص از "نیرنگ خیال" لاہور۔ اپریل ۱۹۳۴ء

5 "ایک بہترین یاد" از فاطمہ الطاف حسین عصمت کراچی۔ مئی ۱۹۶۴ء

6 رشید احمد صدیقی "گنج ہائے گرانمایہ۔"

فصل نہم

ا۔ اولڈ بوائیز لاج

رخشِ عمر سرعت سے اپنی منزلیں طے کرتا اڑا چلا جاتا ہے۔ دفعتاً پتہ چلتا ہے کہ زندگی بیت گئی۔

۱۹۳۸ء میں سرکاری طور پر چھپن سال کے ہو کر ابا جان ریٹائر ہوئے۔ اگر ذیابیطس نے صحت نہ گرائی ہوتی۔ اپریل ۳۵ء میں بھائی نے گورنمنٹ ہائی اسکول اٹاوہ سے میٹرک کا امتحان دیا اور ابا جان نے قبل از وقت پنشن لے لی۔ اماں نے حسب معمول مال گاڑی پر اسباب لدوایا۔ ٹاؤن ہال میں گروپ فوٹو کھنچے۔ سنہرے چوکھٹوں سے مزین الوداعی نظموں اور گوٹے کے ہاروں کا انبار ایک خالی برآمدے کی میز پر جمع ہوا۔ موسم گرما شروع ہو چکا تھا۔ موٹر کے پہیوں کے چوبی SPOKES پر معمول کے مطابق خس لپیٹی گئی۔ بشیر خاں نے ایک بار پھر پیرِ دستگیرؒ کو پکار کر دہرہ دون جانے والی سڑک پکڑی۔

سال اور شیشم کے جنگلوں سے نکل کر دور سے ڈون ویلی کے آبشار نظر آئے۔ دہرہ دون میں داخل ہوئے۔ ڈالن والا پہنچ کر آشیانہ کھلوایا گیا جس میں پنجابی نواب صاحب کے بھانجوں بھتیجوں کے جانے کے بعد سنٹرل انڈیا کے کسی رجواڑے کے لڑکے جو ڈون اسکول میں زیر تعلیم تھے مقیم رہے تھے۔ ان لائق راجکماروں نے باغ کے ایک گوشے میں مختصر ریلوے اسٹیشن' ریل کی پٹڑیاں' سگنل' کیبن اور سرنگیں بنائی تھیں اور ولایتی کھلونے انجن اور ٹرینیں دوڑانے کا شغل کرتے تھے۔ پڑھتے وڑھتے کیا ہوں گے۔

الہ آباد بورڈ کا نتیجہ نکلنے کے بعد ہم لوگ دہرہ دون سے علی گڑھ روانہ ہوئے۔ اولڈ بوائز لاج میں تلاش مکان شروع ہوئی۔ بھائی کو فرسٹ ائیر کلاس میں داخل کیا گیا۔

اولڈ بوائز لاج کے سامنے کھیل کا میدان' پختہ گرینڈ اسٹینڈ اور مسجد تھی۔ پانچوں وقت اذان کی صدا بلند ہوتی۔ رات کو یونیورسٹی کا سائرن بجتا۔ سامنے سبزے پر سرخ بیر بہوٹیاں رینگتیں۔ اتوار کے روز خاندان نہٹور کی درجن بھر لڑکیاں جو ایف۔ اے اور بی۔ اے میں پڑھ رہی تھیں سفید شلواریں اور کالج یونیفارم کے سیاہ برقعے اوڑھے تر و تازہ گھاس پر خراماں خراماں چلتی اولڈ بوائز لاج آتیں۔ ابا جان کے ماموں زاد بھائی چچا غنی حیدر تشریف لا کر انتہائی دلچسپ فلسفیانہ باتیں کرتے۔

موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ دن کو مکھیاں بھنبھناتیں۔ رات کو مچھر۔ اور "اللہ میاں کی بھینسیں۔" ہر طرف کیچڑ تھی۔ "علی گڑھ اتنی ڈیپرسنگ جگہ ہے۔ نہ جانے ابا جان کو کیوں اس قدر پسند ہے۔" بھائی تعجب سے کہتے۔

بھائی کو یونیورسٹی جاتے چند روز ہوئے تھے کہ ملیریا میں صاحب فراش ہوئے۔ مجھے نزلہ ہو گیا۔ اماں نے اعلان کیا۔ علی گڑھ میں پڑھائی منسوخ۔ ہم تو دہرہ دون واپس جاتے ہیں۔

مسعود منزل میں مقیم نہٹوری رشتے داروں کے علاوہ ابا جان کے احباب مرزا سرگذشت (جو بقول

بشیر خاں بہت مزاحیہ آدمی تھے)' انگریز نما سلطان حیدر جوش' خواجہ عبدالمجید' ظفر عمر' شیخ عبداللہ سب نے اماں کو سمجھانے کی سعی ناکام کی۔ ملیریا معمولی وقتی بیماری ہے۔ آپ پھر کیوں اکھاڑ پچھاڑ کرتی ہیں۔ لڑکے کا وقت برباد جائے گا۔ ساز و سامان پھر واپس لے جائیں گی۔ مفت کی زیر باری۔ علاوہ ازیں مجبو میاں بچپن میں آٹھ سال یہاں رہ چکے ہیں۔ اس آب و ہوا کے پھر عادی ہو جائیں گے۔ سجاد بھائی کو اتنا ارمان ہے کہ ان کی اولاد علی گڑھ میں پڑھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

کہنے لگیں' "بچہ یہاں روز بیمار پڑے گا۔ علی گڑھ ہمیشہ سے وباؤں کا گڑھ ہے۔ آتے ہی آتے دونوں بچے پڑ بائے۔"

ابا جان نے حسب معمول ایک بار پھر حجت نہیں کی۔ انہیں معلوم تھا کہ اماں کو سمجھانا لاحاصل ہے۔

"اچھا بھائی۔ اولڈ بوائز لاج سے بھی چلے" بشیر نے موٹر کا ہینڈل گھماتے ہوئے کہا۔ اور ملیٹوں کو براہ بجنور دہرہ دون جانے والی سڑک پکڑی۔

نہٹور میں چند روز قبل ابا جان کے پھوپا ڈپٹی صغیر حسین کا انتقال ہوا تھا اور ان کی کوٹھیاں پرسہ کے لئے آئے ہوئے عزیزوں سے پر تھیں۔ بڑے اپنی باتوں میں مصروف رہتے۔ بچوں کی بن آئی تھی۔ دن بھر باغ کے درختوں پر چڑھ کر آم اور کچے پکے پھل کھاتے کھاتے حالت تباہ تھی۔ ایک صبح اچھو بیگم کھوں کھوں کرتی ایک روش پر دوڑی جا رہی تھیں اچانک چچا وحید نے پیچھے سے آ کر ان کی گردن دبوچی اور فرمایا "کہئے آ۔۔۔"

اچھو نے منہ پھاڑ کر کہا "آ۔۔۔"

اب چھوٹے چچا جان نے مجھے پکارا اور میری گردن پکڑی "کہئے آ۔۔۔"

"آ۔"

چچا جان مکان کی طرف واپس چلے گئے۔ شام کو اچھو نے بڑی اہمیت سے کہا' "جناب آپ کو معلوم ہونا چاہئے برسات کے بعد ہمارے ٹونسلز کا آپریشن کیا جائے گا۔"

"ہمارا بھی۔" میں نے فوراً نقل میں دہرایا۔ حالانکہ مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا۔

"پہلے ہمارا حلق ایک مشین لگا کر کھولا جائے گا۔" اچھو نے حسب عادت افسانہ طرازی شروع کی۔ میں مرعوب ہو کر آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھتی رہی۔ "پھر جناب ہم جو ہیں۔ ہم شیشے کی ایک میز پر لیٹ جائیں گے۔ اور ایک بہوت بڑا۔ اتنا بڑا جتنا سورج ہے۔ اتنا بڑا بجلی کا لیمپ ہمارے سر پر لٹکایا جائے گا۔ ہمیں پھوٹ چاپان نے ہتلایا ہے۔" اچھو نے گپ ہانکی۔

"ہمیں بھی ہتلایا ہے۔" میں نے دہرایا۔

نہٹور میں شاہ جارج پنجم کا جشن سلور جوبلی منایا جا رہا تھا۔ روز شام کو جھیل کے کنارے آتشبازی چھٹتی تھی۔ ہمارے کمرے کی دیوار پر ایک کیلنڈر آویزاں تھا جس میں ایک انگریز عورت سرخ رنگ کی

بیدنگ کو سٹیوم پہنے سمندر کے کنارے چٹان پر بیٹھی بیڑی پی رہی تھی۔ نیچے لکھا تھا' "ہمیشہ رام جی داس اینڈ کو دہلی کی بیڑی پیو۔"

چچا نصیر ضلع گڑھوال کے ڈپٹی کمشنر ہو کر الموڑے سے کوٹ دوار چلے گئے تھے۔ جاڑوں میں جب ہم لوگ برائے آپریشن ٹونسلز دہرہ دون سے چھوٹے چچا جان کے ہاں شاہجہان پور آئے چچا جان کا تبادلہ گڑھوال سے بحیثیت کلکٹر ضلع شاہجہان پور کا ہو چکا تھا۔ ابا جان نے کہا سرکار دو سگے بھائیوں کو ایک ضلع میں نہیں رکھتی۔ ممکن ہے ان دونوں میں سے ایک کو وہاں سے جلد ٹرانسفر کر دیا جائے۔ کلکٹر اور سول سرجن کوٹھیاں آمنے سامنے واقع تھیں۔ جانے والے مسٹر بوتا ری نے ابھی کوٹھی خالی نہیں کی تھی۔ چچا جان اور چچی وحیدہ چھوٹے چچا جان کے ہاں مقیم تھے۔ آپا عذرا' اچھے بھائی آپا' چمن آپا' زہرا علی گڑھ سے اور اچھو پارے نینی تال کانونٹ سے شاہجہان پور آن پہنچے۔ آپریشن والی صبح اچھو اور میں' رشید بھائی' چھوٹے چچا جان اور ان کے اسسٹنٹ سرجن اور ای این ٹی اسپیشلسٹ ڈاکٹر ککڑ کے ساتھ ہسپتال کے کوریڈور میں سے گذر رہے تھے جس کے دونوں طرف باغ تھا۔ ڈاکٹر ککڑ نے دلاسہ دیا' "شاباش بی بی ڈرنا بالکل مت۔"

اچھو نے کہا' "ہم بالکل نہیں ڈرتے۔"

میں نے حسب معمول طوطے کی طرح اچھو کی بات دہرائی' "ہم بھی بالکل نہیں ڈرتے۔"

چھوٹے چچا جان نے اپنی گمبھیر آواز میں کہا' "یہ ہماری بہادر بیٹیاں ہیں۔"

کلورو فارم کی نیم غنودگی میں میں نے دیکھا آپریشن تھیٹر کے دریچوں کے باہر روشن باغ میں تیتریاں اڑ رہی تھیں اور اچھو اور رشید بھائی روش پر ٹہلتے پھر رہے تھے۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔

میرے فوراً بعد اچھو کا آپریشن ہوا۔ جب ہم لوگ گھر واپس پہنچے ہماری فوری دلبستگی کے لئے برآمدے کے نیچے ایک نٹ اور ایک نقال مستعد کھڑے تھے جنھوں نے سگنل ملتے ہی ہم لوگوں کو اپنے فنون سے محظوظ کرنا شروع کر دیا۔ ہماری ہر فرمائش دوڑ دوڑ کر پوری کی جا رہی تھی۔ نئے کھلونوں کے انبار لگا دیئے گئے۔ شام کو ڈاکٹر ککڑ مع بیوی دیکھنے کے لئے آئے۔ اماں اور چچی وحیدہ نے مسز ککڑ کو دو بنارسی ساڑیاں تحفتاً دیں۔

ہم لوگ چند روز میں ٹھیک ٹھاک ہو کر پھر اپنے اہم مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ چھوٹے چچا جان کا گھر گوناگوں دلچسپیوں کا حامل تھا۔ باغ کے درختوں پر چند ذہین بندر مقیم تھے جن میں سے ایک روز صبح کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر اخبار پڑھنے کی نقل کرتا۔ ایک بندریا شیشے کے ٹکڑے میں اپنی صورت ملاحظہ کرتی۔ احاطے کے عقب میں ریلوے لائن تھی۔ ٹرین یا مال گاڑی گذرتے وقت ہم لوگ بھاگم بھاگ وہاں پہنچ کر جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔ اینگلو انڈین گارڈ آخری ڈبے کے کھلے حصے میں بیٹھا اکثر شراب پیتا نظر آتا۔ پارے میاں تاک کر اس پر کنکر کا نشانہ لگاتے۔ وہ دانت پیس کر گھونسہ دکھاتا۔

چچا وحید کم آمیز اور کم سخن' چچا نصیر اتنے ہی شگفتہ مزاج اور بچوں کے دوست تھے۔ اکثر ہمارے ساتھ اسکیٹنگ کرتے۔ کھانے کے وقت بوڑھے امیر بخش جو اورئی سے چچا وحید کے ساتھ آ رہے تھے مناسا

پیتل کا گھنٹہ بجاتے جو سائڈ بورڈ پر رکھا رہتا تھا۔ کھانے کے بعد پیچھے پیچھے دوڑتے' "پھبو میاں او ٹل ٹین پی لیجئے۔ پیارے میاں او ٹل ٹین۔ اچھے میاں۔"

"آپذرا۔ آتیل۔" دوسری طرف سے آپا زہرا کی آواز آتی' "چھوٹ چی یان بلا رہی ہیں۔"

دراصل ہمہ وقت ایسی بھگدڑ مچی رہتی تھی اور سب اس قدر جلدی میں تھے کہ بہت سے ناموں کو مخفف کر لیا گیا تھا۔ ابا جان "ابین" چچا جان "چایان" (وقت ضرورت زیادہ جلدی ہو تو "چان") چھوٹے چچا جان "چھوٹ چایان" چچی جان "چی یان" "آپا عذرا" "آپذرا" "آپا طفیل" "آتیل" "بھائی بہاء الدین" "بھائی بھودین" وغیرہ وغیرہ۔

ک حیرت انگیز چیز یہ تھی کہ بڑے سب بذریعہ کار یا ریل مستقل سفر کیا کرتے تھے۔ اٹاوے سے دہرہ دون۔ دہرہ دون سے علی گڑھ۔ علی گڑھ سے نہٹور۔ نہٹور سے پھر دہرہ دون۔ دہرہ دون سے شاہجہان پور۔ پھر واپس دہرہ دون۔ اور محرم آ گیا تو اماں نے دہرہ دون سے مراد آباد کے لئے سامان لیس کیا۔

۲۔ سوہنی

محلّہ مغلپورہ اول مراد آباد میں گھر گھر رنگ برنگے بٹوے سل رہے تھے۔ ان کے اندر "گوٹا" بھر کے تیرہ دن پھانکا جائے گا۔ حسنین ماموں کے بھی ماموں سید آل مصطفےٰ جعفری کے مکان کی دوسری منزل پر جہاں اماں مقیم تھیں رات کے سناٹے میں دور نزدیک سے سریلے نوحوں کی آوازیں آتیں۔ صبح کو دھوپ نکلتی۔ آل مصطفےٰ ماموں اور منور ممانی کے بچوں عالم [1] اور مہر کے ساتھ صحن میں اکڑوں بیٹھ کر میں کھیلتی۔ جو تانگہ سے الن ماموں عشرہ محرم کے لئے آ چکے تھے۔ ڈیوڑھی کے بڑے پھاٹک میں لگی کھڑکی پھلانگ کر اندر آتے۔ دالان میں مونڈھے پر بیٹھ کر اکثر مسحور کن دلدوز دھن میں ایک فارسی نوحہ پڑھتے جو دور سے کچھ ایسا سنائی دیتا۔

فریاد اصغر ہے بو بے یاری حسین
وزنالہ ہائے دمبدم دزاری حسین

کبھی مردانی مجلس کے بعد اپنی سریلی آواز میں "آج شبیرؔ پر کیا عالم تنہائی ہے" گنگناتے ہوئے زینہ چڑھتے۔

زیادہ تر لوگ انیسیے تھے۔ لڈن ماموں کی دلہن زہرا ممانی بتاتی تھیں کہ ان کے والد کے ماموں سید حسین تعلقہ دار رائے پور نے میرانیس کو مجالس پڑھتے سنا تھا۔ اور زہرا ممانی کے بہنوئی لکھنؤ والے بیرسٹر اخلاق حسین جو تھے ان کے نانا سے ایک دفعہ میرزا دبیر نے فرمایا تھا میں اپنے مراثی بھیجوں گا پڑھئے گا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ صاحب میں میرانیس کے علاوہ کسی کے مرثیے نہیں پڑھتا۔ لوگ بے چارے میرزا دبیر کو نہ جانے کیوں مستقل اگنور کرتے تھے۔

پانچویں یا چھٹی کی سردرات تھی۔ زینے کے دروازے کی کنڈی کھڑکی۔ منور ممانی نے دلائی میں

لپٹ باہر جا کر کواڑ کھولا۔ ایک ادھیڑ عمر کی سانولی سی عورت سوزنی اوڑھے کھڑی سردی میں سکڑ رہی تھی۔ بولی، "بیگم صاحب اجازت ہو تو اندر آجاؤں۔"

منور ممانی نے کوئی محلے ٹولے والی سمجھ کر اندر بلا لیا۔ وہ چاندنی کے کنارے دری پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چپکی بیٹھی رہی۔ منور ممانی نے پوچھا، "کیا بات ہے کہاں سے آئی ہو؟"

چاروں طرف دیکھ کر بولی، "بی بی۔ اجازت ہو تو ایک نوحہ سنادوں۔"

اماں اور منور ممانی اسے ڈومنی یا میراثن سمجھیں۔ اماں نے کہا "کسی راگ میں سناؤ۔ سوہنی میں سناؤ۔"

"حکم۔" اس نے ریاستی انداز میں جواب دیا۔ ذرا اطمینان سے ہو بیٹھی اور الاپ کے بعد سوہنی میں نوحہ خوانی شروع کی۔ سماں باندھ دیا۔ ماہر فن لے دار عورت تھی۔ نوحہ ختم کر کے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں اور منور ممانی نے انعام دیا۔ جھک کر سلام کیا۔ اماں نے پوچھا کہاں کی رہنے والی ہو۔ خاموش رہی۔ اماں نے (جن کی کراس کوئچنگ کی عادت مشہور تھی) دریافت کیا۔ "مراثن ہو؟ میاں بھی گاتا ہے؟"

چپ۔

اماں نے کہا۔ "بیوہ ہو؟" چپ۔

"کنواری ہو؟"

چپ۔ آخر ذرا مسکرا کر کہا۔ "بیگم صاحب ہمارے ہاں شادی کا رواج نہیں۔"

عین اس وقت دروازہ بھڑ سے کھلا اور اماں کے ایک دلچسپ رشتے دار میتا چچا داخل ہوئے۔ عورت نے جلدی سے سوزنی میں سر منہ لپیٹا اور جھپاک سے باہر۔

اماں نے کہا، "عجیب سی جروا تھی۔"

"باجی۔" میتا چچا گوٹا پھانکتے ہوئے بولے "آپ نے جو روپیہ اسے دیا ہے ابھی بازار جا کر اس کی کوکین کھالے گی۔"

"باجی یہ اپنے زمانہ میں بریلی کی نامی طوائف تھی۔ آج گلی گلی بھیک مانگتی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ جو ملتا ہے اس کی کوکین کھا جاتی ہے [2]۔"

حسین ؑ کے تیجے کے بعد منور ممانی کے شوہر آل مصطفےٰ ماموں جو بڑی بڑی آنکھیں، شاہانہ مونچھیں، سرخ و سفید ایک وجیہ بزرگ تھے منا سا ترازو لے کر اماں کے سامنے اپنے چند خاندانی جواہرات تولنے بیٹھے۔ برائے ادائیگی قرضہ مہاجن۔

اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اماں کے مقدمے کے کاغذات ایک بستے سے نکالے۔ میر قائم علی کی گورداس پور والی کوٹھی کی مانند ان کی مراد آباد والی کوٹھی کی بھی اماں مالک تھیں وہ اب "نذر باجی" کی کوٹھی کہلاتی تھی۔ اس کے کرائے دار نے عمارت کے اندر شکر کا کارخانہ قائم

کر لیا تھا اور کرایہ نہ دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے بے دخل کیا گیا تھا۔ مقدمہ چل رہا تھا۔ شکر کی وجہ سے چیونٹوں نے بلا بول دیا تھا۔ "باجی آپ کی کوٹھی کی نیو کو چیونٹے کھائے جا رہے ہیں۔" حسنین ماموں نے کہا جو اماں کی طرف سے مقدمہ لڑ رہے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ اماں کے فینانشل معاملات بالکل MESS میں تھے۔

دوپہر کے وقت سب لوگ کوٹھی کے معائنے کے لئے تشریف لے گئے۔ غدر سے پہلے کی بنی ہوئی عمارت۔ اونچی کرسی۔ اینٹوں کا فرش۔ ڈھنڈار کمرے۔

"یہاں تو بھیروں ناچ رہا ہے۔" منور ممانی نے افسردگی سے کہا۔

احاطے کے ایک کونے میں کچھ زنگ آلود مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک خالی کمرے میں مجھے گڑیا کا زرد رنگ کا چارخانہ سوتی فراک پڑا نظر آیا۔ میں نے فوراً اسے اٹھا لیا اور اماں سے پوچھا "ہم اسے لے لیں؟"

"لے لو۔" اماں نے تلخی سے کہا، "میر قائم علی کی جائداد میں سے شاید یہی چندی تمہاری قسمت میں لکھی ہے۔"

کوٹھی کے سامنے چوراہے کے اس طرف حسنین ماموں کا مکان تھا جسے اماں "چچی کی اٹاری" کہتی تھیں۔ سب لوگ مصروفیت سے باتیں کرتے چوراہا پار کر کے اٹاری پہنچے۔ میں نے اندر جاتے ہی ایک چھوٹی سی رنگین چوبی پٹاری پر چھتی پر سے اتروائی اور بڑی احتیاط سے گڑیا کا فراک اس میں رکھ دیا۔ یہ پٹاری محرم سے قبل محمود پور میں حیدری ممانی نے کپڑے کی گڑیوں سے بھر کے دی تھی۔ اس وضع کی گنبد نما ڈھکن والی پٹاریوں کے اندر قلعہ محمود پور میں اب بھی کپڑے رکھے جاتے تھے۔

ملکیت کا یہ قاعدہ ہے کہ ایک کے بعد دوسری چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس فراک اور پٹاری کی حفاظت کے لئے مکان ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے گڑیا کے گھر کی فرمائش کی۔ فوراً چھٹوا لپکے ہوئے باہر گئے اور مٹی کا ایک غریب سا گھروندا مع گڑیا کے لئے رانگے کے زیور (جو ایک دفتی پر ٹکے تھے) اپنی جیب سے خرید لائے۔ اماں نے چھٹوا کو قیمت دینی چاہی جو انہوں نے نامنظور کی۔ اماں نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے بے تکان رونا شروع کر دیا۔

حسنین ماموں کی انگنائی پر نیم کا درخت سایہ فگن تھا۔ آل زہرا نانی نے ہونٹ پچکا کر چھٹوا سے کہا، "بس نیم پر کے بھتنے کو معلوم ہو گیا کہ آگئی ہیں۔"

میں نے فوراً رونا ملتوی کر کے دلچسپی سے پوچھا، "کون سا بھتنا؟"

نانی نے تجاہل عارفانہ سے میری سنی ان سنی کر کے چھٹوا سے گفتگو جاری رکھی، "جب ذرا سی تھیں اور یہاں آتی تھیں نگوڑے کو فوراً معلوم ہو جاتا تھا ادھر اس نے ڈال پر بیٹھے بیٹھے انگلی دکھلائی ادھر انہوں نے رونا شروع کیا۔ اب پھر بیٹھا انگلی دکھا رہا ہے۔"

میں فی الفور باہر گئی اور درخت کو غور سے دیکھا۔ بھتنا نظر نہ آیا مگر اس کے وجود پر یقین کامل تھا۔ ضرور رہتا ہو گا اور آج بھی آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ بھتنا نیم پر موجود نہیں؟

۳۔ آشیانہ

آشیانہ، نمبر ۱۳ اندر روڈ، ڈالن والا، سڑک کے سرے پر ایسٹرن کنال روڈ سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کے پہلو میں پہاڑی نہر شور مچاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ احاطے میں سامنے آم اور لیچیوں کا گھنا اور چرڈ تھا۔ باغ کی ایک مختصر مصنوعی پہاڑی پر نیلے پھول کھلتے تھے۔ درختوں میں سریلے پرندے آباد تھے۔

بھائی ڈی۔ اے۔ وی کالج کے فرسٹ ایر اور میں ایک کانونٹ اسکول کی ابتدائی کلاس میں بھرتی کر دی گئی تھی۔ اماں کو مستقل یہ وہم لاحق رہتا تھا کہ ابا جان، بھائی اور میں عنقریب بیمار پڑنے والے ہیں۔ ڈاکٹر پورن چند ہون جو ۱۹۲۸ء میں آرکیڈیا میں پاپا نذر الباقر کے معالج رہ چکے تھے آئے دن "چیک اپ" کے لئے بلائے جاتے۔

ڈالن والا میں ابا جان اور اماں کے پرانے دوستوں کی افراط تھی۔ ایسٹرن میں صاحبزادہ سعید الظفر خاں رہتے تھے جو سر جھکائے صبح کو ٹہلنے نکلتے۔ آگے آگے سائیکل پر ان کی بیٹی حمیدہ فراٹے بھرتیں۔ عامر مصطفےٰ خاں کے باغ میں ہرن پلے تھے۔ اور نیمی روڈ پر مولوی عنایت اللہ نے اپنے ہاں باقاعدہ زو بنا رکھا تھا۔ چچا عنایت اللہ حیدر آباد سے ریٹائر ہو کر آگئے تھے۔ مجرد تھے اور جانوروں اور بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اکثر شام کو وہ اپنی ہل مین پر مجھے ہوا خوری کے لئے لے جاتے اور میں راستے بھر ان سے نہایت بیوقوفی کے سوال کرتی۔

ان کے چھوٹے بھائی بھاوج یعنی چچا رضاء اللہ اور سلطانہ خالہ رسپنا ندی کے کنارے رہتے تھے۔ کچھ فاصلے پر انیس فاطمہ قدوائی (بنت بمبوق) کی کوٹھی تھی اور اکبر الہ آبادی کی پوتی مصحفی خالہ امپریل فارسٹ کالج کے علاقہ میں فروکش تھیں۔ ان کے شوہر کا قاعدہ تھا کہ کسی کے گھر پہلی بار جاتے تھے تو اندر اپنی بیگم صاحبہ کا تفصیلی تعارف کہلوا بھیجتے تھے۔ جب آشیانہ "کال" کرنے آئے فقیرا برساتی میں کھڑا کان کھجا رہا تھا۔ فرمایا، "جا کر بیگم صاحبہ سے عرض کرو اکبر الہ آبادی کی پوتی، سید عشرت حسین صاحب کی بیٹی، نواب صاحب پریاواں کی نواسی تشریف لائی ہیں۔"

فقیرا نے اندر آکر اماں سے مختصراً کہا، "نواب صاحب کی پریاں آئی ہیں۔" فقیرا کی عقل کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے مسز میرچندانی کو ہمیشہ مسز مچھردانی ہی کہا۔

نہٹور سے ہمارے پھوپھی زاد بھائی سلطان حیدر تشریف لائے۔ ان کے دم سے گھر بھر میں چہل پہل ہو گئی۔

میر نذر الباقر مرحوم کے ایک سرحدی دوست کی بیٹی مسلمان سے عیسائی ہو گئی تھیں۔ مشنریوں کے خرچ سے امریکہ پڑھ کر لوٹی تھیں۔ پڑوس کی ایک کاٹج میں رہتی تھیں۔ نہایت فربہ تھیں۔ سلطان بھائی کو ان کے ارتداد کا بہت قلق تھا۔ ان کا بہت طویل نام نصف اسلامی نصف مسیحی تھا۔ سلطان بھائی ایک سانس میں ان کو مس اظہر اختر رشیدہ سعیدہ جارجینا فرانسیسکا ڈگلس اسکاٹ ڈمپلاٹ فلفٹ کہتے تھے۔ اور میں

ہنس ہنس کر بے حال ہوتی تھی۔ ایک صبح اخبار پڑھتے ہوئے آپ نے اماں کو سنایا، "ممانی جان ذرا یہ ملاحظہ فرمایئے۔ ڈائریکشن بائی بائی جدن بائی۔ اسٹوری بائی بائی جدن بائی۔ میوزک بائی بائی جدن بائی۔"

"سبحان اللہ رئیس گورکھپور۔" دروازے میں کھڑے بشیر خاں نے داد دی "سبحان اللہ رئیس گورکھپور جن کا ذکر اودھ پنچ میں بھی آتا تھا، اکثر غازی پور میں ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے۔ اٹاوے والے احمق پھپھوندوی کی طرح ان کے نام نے بشیر خاں کو ہمیشہ بہت محظوظ کیا۔

سلطان بھائی کے نہٹور واپس جانے کے بعد آشیانہ پر پھر خاموشی چھاگئی جسے سہ پہر کے وقت ان کے ستار کی ٹن ٹن منتشر کرتی تھی۔

ایک صبح جب اورچرڈ میں ایک سینڈ پائپر مسلسل ٹی ٹی کئے جا رہا تھا ایک لیچی کے نیچے کھیل میں مصروف تھی، بجری پر تانگہ آکر رکا۔ ایک صاحب نے آواز دی۔ میں بھاگی ہوئی گئی اور آداب کیا۔ اجنبی نے پوچھا، "آپ کے ابا جان اماں جان گھر پر ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ چاعنائے تلا کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔"

"اور بھائی؟"

"وہ کالج گئے۔"

"آپ اسکول نہیں گئیں؟"

"ہم بیمار ہیں۔ اس لئے نہیں گئے۔"

"آپ کی اماں جان کے وہم جوں کے توں باقی ہیں۔" نووارد نے مسکرا کر کہا۔ تانگہ بڑھوا کر برساتی میں لے گئے۔ خود بکس بستر اتارا اور لے جا کر گیسٹ روم میں رکھ دیا۔ باہر آکر پوچھا، "اچھا جناب آپ کو معلوم ہے۔ ہم کون ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی آپ کو بتائیں گے۔"

خوش طبعی ان کے بشرے سے آشکار تھی۔ ایسے لوگوں سے بچے فوراً مانوس ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان کی انگلی پکڑ کر باغ کی سیر کرانی شروع کی۔ سیاہ رنگ کا ڈاشنڈ ینکس کہیں سے دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے اطلاع دی۔

"یہ ہمارے چھوٹ چاپان نے شاہجہانپور سے بھجوایا ہے۔ بہت سوئیٹ کتا ہے۔"

"اچھا آپ کے چھوٹے چچا جان بھی ہیں!"

باغ کے ایک گوشے میں پختہ گڑیا کا گھر استادہ تھا۔ میں نے دوسری اطلاع دی، "جب ہمارے چاپان چانصیریاں رہتے تھے انھوں نے آپذرا کے لئے بنوایا تھا۔"

"آپذرا کون؟"

"آپا۔ عذرا۔" میں نے سمجھایا۔

"اچھا۔ آپ کی کوئی آپا عذرا بھی ہیں؟"

"پھر انہوں نے پوچھا" آپ کے ابا جان اماں جان کب آئیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ فقیرا کو معلوم ہوگا۔"

"اچھا آپ یہیں کھیلئے ہم ابھی آتے ہیں۔" لمبے لمبے ڈگ بھرتے باورچی خانے کی طرف غائب ہو گئے۔ وہاں دولت مسیح اور فقیرا سے کچھ مسکوٹ کی۔ فقیرا کا نیا دھلا ہوا صافہ باندھے نمودار ہوئے۔ ایک صاف جھاڑن کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ مہمان کمرے میں جا کر کوٹ ٹائی جوتے موزے اتار سوٹ کیس میں سے ایک ولایتی گڑیا نکال کر مجھے عنایت کی اور بولے' "اب آپ بالکل چپ رہئے گا' ہنسئے گا بالکل نہیں۔ ورنہ گڑیا واپس لے لیں گے۔" پھر ننگے پیر جا کر برآمدے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

اوک لینڈ برساتی میں داخل ہوئی۔ ابا جان اترے اجنبی نے جھک کر لمبا سلام کیا اور کہا "حضور سنا ہے آپ کے ہاں سرونٹ کی جگہ خالی ہے؟"

ابا جان نے نرمی سے دہرایا' "سرونٹ کی جگہ؟ معلوم نہیں بیگم صاحب سے پوچھئے۔" اور حسب عادت سر جھکائے اندر چلے گئے۔ نووارد نے پھر فرشی سلام جھاڑا۔ "بیگم صاحب۔"

"کیا ہے۔؟" اماں نے حسب عادت درشتی سے پوچھا۔

"سرکار مجھے عبدالکفنگپ خاں والئی کاغان نے آپ کے ہاں بھیجا ہے۔"

"ضرورت نہیں ہے بھئی۔"

"ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں۔ انگلش۔ فرنچ۔ چائنیز۔"

لفظ فرنچ سے اماں ذرا متاثر ہوئیں "تنخواہ کیا لیتے ہو۔"

"پچاس روپے اور کھانا۔"

"نہیں بھئی۔ صاحب کی پنشن ہو چکی ہے۔ ہم اتنی تنخواہ نہیں دے سکتے۔ انگریزوں کے ہاں جاؤ۔ کیا نام بتایا تھا؟ کس نے بھیجا ہے؟" اب اماں نے ان کو ذرا غور سے دیکھا اور چلائیں۔ ارے سعید کے بچے۔ شیطان۔" اس وقت مسز ہون آگئیں۔ اماں نے اسی حلئے میں سعید بھائی کو ان سے ملوایا' "یہ دیکھئے میرے چھوٹے دیور ڈاکٹر وحید کا لڑکا ہے۔ شریر اچانک آپہنچا اور بھیس بدل کر جل دے رہا تھا۔ آٹھ سال بعد دیکھا۔ پہچان ہی نہ سکی۔ جب ہم لوگ علی گڑھ میں تھے سن اٹھائیس تک یہ اور الن' لڈن' حسنین' عثمان حیدر سب مل کر اسی قسم کے تماشے اور شرارتیں کیا کرتے تھے۔ اب یہ انجینئرنگ پاس کر کے بمبئی سے لوٹا ہے۔ میرے منجھلے دیور نصیر کی لڑکی سے منگنی ہو گئی ہے۔ ہاں۔ وہی آپ نے تو اسے یہاں آشیانے میں چھوٹی سی کو دیکھا تھا۔ جب بھائی نصیر یہاں انکم ٹیکس آفیسر تھے ۲۶ء میں۔ اب وہ آئی ٹی کالج میں ایف اے کر رہی ہے۔ لکھنؤ میں کالج ہوسٹل میں رہتی ہے۔ بی۔ اے کر لے تو شادی ہوگی۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے جی کہ محمڈن لڑکیاں کالج میں پڑھ رہی ہیں۔" مسز ہون نے کہا۔

محمڈن لڑکیاں کافی کمالات دکھانے لگی تھیں۔ ایک سہ پہر سعید بھائی سامنے کے برآمدے میں

بید کے صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہل ہل کر خشوع خضوع سے تازہ تہذیب نسواں میں سے اماں کو حجاب امتیاز علی کا مضمون سنا رہے تھے' "آخر وہ دن آیا جب میں پلیٹ بن گئی۔ سوری بڑی اماں۔ کتابت کی غلطی ہے۔ جب میں پائیلٹ بن گئی۔"

حجاب امتیاز علی نے حال ہی میں لاہور فلائنگ کلب سے ہوابازی کا لائسنس حاصل کیا تھا۔

ہندوستان اور سارے مشرق میں ایر میل سروس بھی شروع ہو چکی تھی۔ بنگ کاک سیام سے ڈاکٹر اے حمید کا پکچر پوسٹ کارڈ آیا' "یہاں سپلا کے ایجنٹ کا انتظام کر لیا ہے۔" کارڈ پر سنگاپور کی مہر کے ساتھ "بائی ایر میل" کی وہی نیلی چٹ لگی ہوئی تھی جو آج تک مستعمل ہے۔ ڈاکٹر حمید نے برلن سے لوٹ کر بمبئی میں دواؤں کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا اور ابا جان اس کے اولین بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے۔

سعید بھائی کے شاہجہانپور جانے کے بعد آشیانے پر پھر خاموشی چھا گئی۔

دہرہ دون میں ایک صاحب ڈاکٹر محمد حسین آکر رہے۔ بید پستہ قد۔ عباپوش۔ فرنچ کٹ داڑھی۔ ہنس مکھ۔ پر خلوص۔ بالکل گڈا ایسے معلوم ہوتے۔ برسوں سعودی عرب میں پریکٹس کی تھی۔ بی بی عرب تھیں۔ لاولد تھے۔ ایک وسیع دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے کر اس کا نام دارالسلام رکھا۔ اور اس میں برائے خدمت اسلام مسلمان لڑکوں کے لئے ایک عدد انگلش پبلک اسکول قائم کیا۔ جتنے مختصر خود تھے اس سے مختصر بے بی آسٹن چلاتے ہوئے آشیانہ تشریف لائے اور ابا جان سے کہا آپ اتنے عرصے مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے ہیں۔ شعبہ تعلیم کا خوب تجربہ ہے۔ دہرہ کیمبرج اسکول کی آنریری سکرٹری شپ قبول فرمائیے۔ ابا جان نے فوراً قبول فرمائی۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد اماں نے آگ بگولہ ہو کر کہا بس ایک مفت کی ذمے داری اور سر پر لے لیجئے۔ لیکن ابا جان دہرہ کیمبرج اسکول میں ذوق و شوق سے منہمک ہو چکے تھے۔ ایک اوکسفرڈ گریجویٹ انگریز مسٹر [illegible] کو پرنسپل مقرر کیا۔ ہوسٹل کی وارڈن شپ کے لئے چچا ستار خیری کو علی گڑھ خط لکھا کہ فاطمہ خیری کو فوراً دہرہ دون روانہ کریں۔

ستار خیری برلن [3] سے واپس آچکے تھے اور قلیل مشاہرے پر علی گڑھ میں جرمن پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے بیوی بچوں کو فوراً دہرہ دون بھیج دیا۔

چچی فاطمہ خیری ایک ٹپکل سیدھی سادی شوہر پرست محنتی جرمن ہاؤس وائف تھیں۔ جرمنی اور جرمن عورتوں کی ترقی کے متعلق چچا ان کے نام سے مضمون لکھ لکھ کر برلن سے بھیجا کرتے تھے جو چچا کے کزن علامہ راشد الخیری کے رسالے عصمت میں چھپتے تھے۔ چچی مع تینوں بچوں عبدالرحمن' زینب اور نعمت دہرہ دون آکر خوش اسلوبی سے دہرہ کیمبرج اسکول کے ہوسٹل کا انتظام سنبھالنے میں مصروف ہو گئیں۔ موسم بہت ہی خوشگوار ہوتا۔ وہ ٹہلتی ہوئی آشیانہ آجاتیں۔ وہ خود اور تینوں بچے جو جرمنی میں پیدا ہوئے تھے فر فر اردو بولتے تھے۔

نعمت عرف نی نی اپنی جرمن گڑیا احتیاط سے بانہوں میں سنبھال کر چچی کے ساتھ آتیں۔ میرے

پاس برطانوی گڑیوں' کھلونوں اور فادر ٹک۔ ای۔ سی۔ فور لندن کی مطبوعہ کتابوں کا زبردست انبار موجود تھا لیکن نی نی کی جرمن گڑیوں اور جرمن باتصویر کتابوں کی بات ہی جدا تھی۔ جرمنی صنعتی لحاظ سے انگلستان سے آگے نکل چکا تھا اور اسی وجہ سے عنقریب ایک عالمگیر جنگ اور چھڑنے والی تھی۔

نی نی کی بڑی بہن زینب خیری جرمن نژاد لڑکی فراک پہنے خود اعتمادی سے سائیکل پر گھوما کرتیں۔

ابا جان نے فکر مند ہو کر اماں سے کہا' "اس اسکول میں طرح طرح کے بگڑے ہوئے نوابزادے آرہے ہیں بے چاری زینب کا وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ چچا کو خط لکھا کہ وہ زینب کو علی گڑھ گرلز کالج کے ہوسٹل میں بھیج دیں۔ چچا دہرہ دون پہنچے۔ آشیانہ کے برآمدے میں بیٹھے' سوئیٹ اور بھولے سے' خشخشی داڑھی ابا جان سے کہہ رہے تھے' "میں بہت خوش ہوں کہ فاطمہ کو ملازمت مل گئی۔"

لیکن چچی فاطمہ خیری کی ملازمت زیادہ نہ چلی۔ کیونکہ دہرہ کیمبرج اسکول ہی بوجہ مالی مشکلات بند ہو گیا۔

اس برسات میں ٹوٹ کر بارش ہوئی۔ رسپنا شور کرتی غیض و غضب کے عالم میں اپنے جگمگاتے سنگریزوں پر منہ زوری سے رواں تھی۔ پہاڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ ابا جان کو ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ مرتے مرتے بچے۔ انگریز سول سرجن نے برانڈی تجویز کی۔ ابا جان نے ڈاکٹر ہون سے کہا' "میں نے ساری عمر آج تک شراب نہیں چھوئی۔ اب حج کرنے کے بعد برانڈی اڑاؤں گا؟" اس پر ڈاکٹر ہون نے کوئی باموقعہ اردو شعر پڑھا۔ ابا جان نے تو برانڈی نہیں چکھی لیکن چند روز بعد غٹاغٹ برانڈی پینے والا بے چارہ نوجوان سول سرجن نمونیہ میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔

ابا جان کی عیادت کے لئے قریبی عزیزوں نے آنا شروع کیا۔ آشیانہ مہمانوں سے بھر گیا۔ دونوں بھائی نصیر و وحید اور متعدد ماموں لوگ' حسنین' الن' نوازش ماموں اور جانے کون کون۔ الن ماموں میرے لئے بمبئی سے رنگ برنگے ربن لے کر آئے تھے۔

بہت ہی سہانا موسم تھا۔ باغ کی گھاس پر کچے پھل گرے ملتے۔ ہوا میں خوشبوئیں تیرتیں۔ ابا جان اچھے ہو گئے۔ مہمان چلے گئے۔ آشیانہ پر پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی میں میں دن بھر باغ میں کھیلتی پھرتی۔

فلک اختر' جواد' شہزاد اور گل رعنا چار بہن بھائی صغر سنی میں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ سنا ہے گل رعنا بے انتہا حسین تھیں۔ جواد حد سے زیادہ ذہین۔ ایک برس کی عمر میں سو تک گنتی سناتے تھے۔ نانی اشرف جہاں مرحومہ کہتی تھیں میاں جینے کی باتیں کرو۔ مطلب یہ کہ جو بچہ غیر معمولی طور پر ذہین ہو وہ جلد مرجاتا ہے۔ سلطان پور میں جواد میاں کو نیند کی ماتی آیا نے رات کے وقت غلطی سے دودھ کے بجائے دودھ کی بوتل صاف کرنے والی اسپرٹ پلا دی تھی وہ چٹ پٹ ہو گئے۔ مرنے سے پہلے گھر والوں کو بلا کر پلنگ کے پاس کھڑا کیا۔ سب کو باری باری سلام کر کے آنکھیں موند لیں۔ گل رعنا کو پولیو اور فلک اختر اور شہزاد کو تھتکارا (ہیضہ) سمیٹ لے گیا۔ یہ چاروں مر کے ہمارے اوپر بڑا ستم ڈھا گئے تھے۔ ان کی اموات کے بعد

اماں کے دل میں لاعلاج وہم بیٹھ چکے تھے۔ احتیاط اور پرہیز کروا کروا کے عاجز کر رکھا تھا۔ آئس کریم' شربت' برف' دہی بڑے' چاٹ' اچار' مربے' کھٹاس غرضیکہ ہر مزیدار چیز اور بیشتر فواکہات سختی سے ممنوع تھے۔ آشیانہ کے باغ میں ناشپاتی' آڑو' آلوچے وغیرہ ہر قسم کے پھل موجود تھے۔ صرف آم کی "بہار" اور لیچی کی "فصل" فروخت کی جاتی تھی۔ چند درخت گھر کے لئے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ ان پر سے بھی کھانچیوں پھل اترتا۔ میں دن بھر درختوں کے نیچے اکیلی اکیلی کھیلا کرتی۔ ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ چونکہ اماں نے منع کر دیا تھا خبردار جو لیچی کو ہاتھ بھی لگایا چنانچہ سر پر دہرہ دون کی مشہور و معروف لیچیوں کے گچھے جھولا کرتے۔ کبھی انہیں چکھنے کا خیال تک نہ آیا۔

سب بچے اپنی تصوراتی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ میری مرغوب فینٹسی یہ تھی کہ ایک غریب دیہاتن راستہ بھول کر ادھر آگئی ہوں۔ پھر ایک پوٹلیا میں چنے اور کنکر پتھر یعنی زاد راہ لے کر برساتی میں پہنچتی اور تصور کرتی کہ اب یہاں نوکری کروں گی۔ ماہرین نفسیات اسی فینٹسی میں شاید یہ نکتہ تلاش کر سکتے ہیں لاشعوری طور پر خود کو نعمتوں سے محروم ایک غریب دیہاتی لڑکی سمجھتی تھی۔ اس سلسلے میں پوربی مالی رام بھروسے کی لڑکی دلریا میری ہیروئن تھی۔ وہ باغ میں جھاڑو دیتی۔ میں بھی جھاڑو دیتی۔ وہ گھاس کھودتی۔ کھرپی لے کر میں بھی اس کے ساتھ ساتھ گھاس کھودا کرتی۔ کھانے کے بعد اکثر ایک چپاتی اور ایک آدھ آلو چپکے سے اٹھا کر باہر لے جاتی اور باغ کے ایک گوشے میں اکڑوں بیٹھ کر ایک ہاتھ پر چپاتی اور اس پر آلو رکھ کر دوسرے ہاتھ سے توڑ توڑ کر اس طرح کھاتی جیسے دلریا کھاتی تھی۔

دوسری فینٹیسی سفر کی تھی۔ پیدائش کے تقریباً فوراً بعد سے مستقل سفر کر رہی تھی۔ مزید کا شوق تھا۔ چھوٹی چچی جان نے شاہجہانپور میں دومنے سے چمڑے کے اٹیچی کیس دے تھے۔ ان میں اپنا سامان پیک کر کے سفر پر نکلتی تھی اور باغ کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک جاتی تھی۔ اماں کو محض بیماریوں کا وہم تھا۔ ویسے انہوں نے انتہائی بے خوفی اور خود اعتمادی برتنے کی تربیت دی تھی۔ چونکہ توہمات کے ہمیشہ سے خلاف تھیں لو لو' ہوا سے ڈرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ میں رات برات اندھیرے کمروں میں اطمینان سے چلی جاتی۔ بھائی جو تالے کے سانپ مارنے دوڑتے۔ ہم لوگ "ڈر" کے تصور ہی سے ناآشنا تھے۔

آشیانے کے سنسان کونوں کھدروں' جو گویا GOBLINS اور پریوں سے آباد تھے میں طرح طرح کے خیالی ایڈونچر زمیں منہمک رہتی۔ خود آشیانہ ولایتی پریوں کے گھر جیسا "فیری ٹیل" اور پکچر یسک مکان تھا۔ سرخ چھت' چاکلیٹ رنگ کی بیرونی دیواریں جس پر سفید دھاریوں سے اینٹوں کا چناؤ واضح کیا گیا تھا۔ ہر کمرہ اپنے اندر ایک دنیا رکھتا تھا۔ خوبصورت ڈرائنگ و ڈائننگ روم۔ چار وسیع و عریض بیڈ روم۔ چار ایک سے ایک پر اسرار ڈریسنگ روم۔ پانچ عدد برآمدے' وسیع برساتی جس کے اندر دو موٹریں برابر برابر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ سامنے کا چوڑا برآمدہ جو جنگلے کی وجہ سے بہت کوزی معلوم ہوتا' موزیک کے فرش' پام کے گملوں اور آرام دہ فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔

برآمدے کے سائیڈ رومز میں ایک مہمان کمرہ اور ایک ابا جان کی اسٹڈی تھی۔ پچھلے برآمدے کے

دونوں سروں پر دو ونگ تھے جن میں برآمدوں کے ساتھ ساتھ باورچی خانے، کولری، گوداموں اور مزید کمروں کی قطاریں تھیں۔ صحن کے آگے شاگرد پیشہ تھا۔ اکثر مغرب کے وقت وہاں سے ڈاشنڈ کے بچوں کے بھونکنے کی باریک باریک آواز آتی رہتی تھی اور بہت اچھی لگتی تھی۔ ساری کوٹھی مع پردوں اور قالینوں کے فرنشڈ تھی اور اسی طرح کرایہ پر اٹھائی جاتی تھی۔

جاڑوں میں ابا جان کے بیڈ روم میں آتشدان کے سامنے مسند بچھا دی جاتی۔ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا وہیں کھایا جاتا تھا۔ وہ بھی بہت ہی کوزی جگہ تھی۔ اکثر میں اپنی پینٹنگ بکس وہیں پھیلا کر مزے سے پینٹ کرتی رہتی تھی۔ ایک پینٹنگ بک میں سمندر اور جہازوں کی تصاویر تھیں۔ نیلا سمندر سردی میں بہت سرد معلوم ہوتا۔ انگلش کنٹری سائیڈ کے مناظر میں سیب بے حد سرخ اور پتے بے حد سبز معلوم ہوتے تھے۔ اور برفیلی صبحوں کو جب فقیرا چاء کی کشتی لے کر ابا جان کے کمرے میں داخل ہوتے، کسی دور کے کمرے سے اماں کی آواز آتی۔ "Pretty Polly! Pretty polly"

ایک یخ بستہ صبح آتشدان کے سامنے چاء پیتے ہوئے ابا جان اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسی میں غالباً کسی بوڑھے مہاراشٹرین پروفیسر کی تصویر چھپی تھی جو اپنی لڑکی کے ساتھ نہال نہال کھڑے کیمرے کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکی انگلستان سے کوئی بہت زبردست ڈگری حاصل کر کے بمبئی لوٹی تھی۔ ابا جان نے وہ تصویر اماں کے سامنے سرکا کر کہا، "ایک دن ہم بھی ان بڑے میاں کی طرح کھیسیں نکالے مسرور کھڑے ہوں گے جب بی بی انگلستان سے اعلیٰ تعلیم ختم کر کے لوٹیں گی۔"

اماں پیدائشی قنوطی تھیں اور انہیں کسی بھی پر مسرت موضوع پر برف ڈالنے کا فن آتا تھا۔ بولیں، "اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ بیٹی کی بھی جان کے لالے پڑے ہیں۔ نجانے ایسا موقع کیسے آئے گا۔"

ابا جان خاموش ہو گئے۔ پھر اخبار اٹھا لیا۔

۴۔ میں چمن میں چاہے جہاں رہوں

ابا جان کو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ذاتی مکان میں، جو انہوں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدا تھا، رہنے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ آشیانہ میں بہت خوش تھے۔ لیکن صرف ڈیڑھ سال گذرا تھا جب اماں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آشیانہ گھنے باغ کی وجہ سے بہت سرد اور خندوس ہے۔ پھر نمونیہ ہو جائے گا۔ کمرے اتنے بڑے ہیں کہ آتشدانوں میں کتنی ہی لکڑیاں جھونکو پوری طرح گرم نہیں ہوتے۔ پلورسی ہو جائے گی۔ دہرہ دون کی میونسپلٹی نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ایسٹرن کنال کے ذریعہ ڈالن والا کی ہر کوٹھی میں نالیوں سے آبپاشی کی جاتی تھی۔ آشیانہ کے باغ میں بھی پانی کی چھوٹی چھوٹی نہریں بہا کرتی تھیں جن کی وجہ سے باغ اور چہ ڈ ہمیشہ نم اور سرسبز رہتے تھے۔ اماں کا آشیانہ پر تیسرا اعتراض یہ تھا کہ ڈی۔ اے۔ وی کالج سے بہت دور ہے۔

ابا جان کو نزلہ ہو گیا۔ "ابھی نمونیہ ہو چکا ہے۔" اماں نے اعلان کیا "اب یہاں سے جلد از جلد

شفٹ کرنا چاہئے۔" تلاش مکان میں نکلیں۔ کرزن روڈ پر ایک انگریز بڑھیا کی آدھی کوٹھی بیلی لاج خالی تھی اس سے معاملہ طے کر کے آگئیں۔ بشیر نے دبی زبان سے کہا، "بیگم صاحب اپنا ذاتی مکان چھوڑ کرائے کے آدمی کوٹھی میں رہنا ذرا بے فضول سی بات ہے۔" اماں نے ڈانٹ بتائی، "تم چپ رہو جی۔" اور اسباب باندھنا شروع کر دیا۔

ابا جان نقل مکان کے سلسلے میں اماں کے اٹل فیصلوں کے سامنے کب کے ہار مان چکے تھے۔ بشیر خان نے اوک لینڈ اسٹارٹ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا، "کہیں نہیں ہے ٹھکانہ میرا جمانے میں۔ نہ آشیانے کے باہر نہ آشیانے میں۔"

بیلی لاج شفٹ ہونے کے ایک مہینے کے اندر اندر اماں نے کرزن روڈ پر پوری کوٹھی ڈھونڈ نکالی۔ نمبر ۲۰ کرزن روڈ باغ میں درخت نہ ہونے کے کارن بالکل ٹھنڈی نہیں تھی۔ وہاں منتقل ہونے کے تین چار روز بعد ۳۶ء ختم ہو گیا۔ سال نو کی صبح فقیرا چاء کی کشتی لے کر بیڈ روم میں آئے۔ بھائی نے پوچھا "فقیرا آج کون سا سال ہے؟" فرمایا "سن چھتیں۔"

بھائی نے کہا "ارے بیوقوف آج سے ۱۹۳۷ء آگیا ہے۔"

بے نیازی سے جواب دیا "اچھا۔ آگیا ہو گا۔"

آتشدان میں آگ سنہرے شیر کی طرح گرجتی رہتی۔ اخبار رسالے پڑھتے پڑھتے ابا جان، اماں اور بھائی خبروں کے متعلق باتیں کرتے ان میں بعض نام بہت پر اسرار اور سحر انگیز معلوم ہوتے۔ "حبشہ کا راس طفاری۔" "سمرقند۔" "یارقند" "کاشغر" "مہدی سوڈانی" "مراقش" اور اقبال کے بعض اشعار جو ابا جان گنگناتے۔ انھیں سن کر پھریری سی آتی۔ "وہ ترے شہداء پالنے والی دنیا۔ عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا۔" اور "ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا۔" اور اماں کبھی کبھی گنگناتیں "طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں"

اور "بٹاویا" "بارسیلونا" "برلن" جہاں کی آوازیں رات کو وائرلیس سیٹ پر آتیں۔ اور اماں کے ڈریسنگ روم میں ایک پاؤڈر کا ڈبہ رکھا تھا جس پر گلاب کا پھول بنا تھا اور "واٹر آف روزیز" کی شیشی پر گلاب کا ڈنٹھل۔ ایک سائیڈ روم کو اماں نے اپنی اسٹڈی بنایا تھا۔ اس میں خوب دھوپ آتی تھی۔ پہلو کے برآمدے میں دوپہر کے وقت افغان سردار محمد عمر خاں آکر ابا جان کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ اور ڈاک سے پھول (لاہور) پیام تعلیم (دہلی) اور پشپا (بمبئی) آیا کرتے تھے۔

اور بھائی نیلا بیرے اڑھ کر آصفہ ممانی کے چھوٹے بھائی سید محمد نواب کے ساتھ ٹینس کھیلنے کی جلدی میں سرعت سے کھانا ختم کرتے تو اماں کہتیں "اپ پھر ہر ہوئے۔ حواصلوں کی طرح مت کھاؤ۔ چبا چبا کر کھاؤ۔ مسز سمپسن چبا چبا کر کھاتی ہے۔ بادشاہ سے تخت چھڑوایا۔"

ایک روز اماں اپنی اسٹڈی میں دیوان پر دن بھر لیٹی ساری کے پلو سے منہ چھپائے رویا کیں۔

گجرانولہ سے سیاہ حاشیہ والا لفافہ آیا تھا۔ ان کے تایا اور خالو میر فیض العسکری دنیا سے رخصت ہوئے جو میر نذر الباقر' ظہور حسنین اور اکبری بیگم کے بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۳۷ء تک اماں کو جب پنجاب سے خط بھیجتے تھے تو لفافے پر بھتیجی کے نام کے بجائے "اندرون محل سرائے سید محمد سجاد حیدر زیدی سلمہ طولعمرہ" لکھتے تھے۔

مارچ ۱۹۳۷ء میں بھائی نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا۔ شروع اپریل میں حسنین ماموں' الن ماموں 'لڈن ماموں مراد آباد سے نمبر ۲۰ کرزن روڈ وارد ہوئے۔ ایک صبح تینوں ماموں صاحبان مع ہونہار بھانجا بھانجی پہلو کے برآمدے میں پلنگوں پر آڑے ترچھے نیم دراز مشغول ہو حق تھے۔ الن ماموں تازہ فلمی گیت "او دلربا کہاں تک ظلم و ستم سہیں گے" الاپ رہے تھے۔ سامنے ایک کار آن کرکی اور حجاب امتیاز علی اتریں۔ برآمدے کا منظر دیکھ کر متحیر نظر آئیں۔ ماموں صاحبان ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھک جھک کر آداب عرض کیا۔ الن ماموں نے کہا' "او مائی گاڈ" اور زقند بھر کے اندر بھاگے۔ جا کے اماں سے کہا' "باجی باجی وہ آئی ہیں اف میرے معبود! او بلند آسمان!! ہم لوگوں کو کتنا جنگلی خیال کرتی ہوں گی' وہ آئی ہیں ساحل کیباس سے خاتون روحی"

حجاب امتیاز مسوری جاتے ہوئے تشریف لائی تھیں۔ اسی روز شام کو مسوری سے کسی آفت زاہدی کا تار آیا۔ رات کو چچا مشتاق احمد زاہدی کے بیٹے آصف مع اپنے آرٹسٹ دوست سید محمد اودیاما کے آن پہنچے۔ آصف کو تار والوں نے غلطی سے آفت کر دیا تھا۔ لیکن اودیاما نام ہی جاپانی تھا۔ الن ماموں نے پھر جا کر اماں سے کہا' "باجی وہ آئے ہیں کوئی دلائی لامہ ہیں اور دوسرے وہی آفت زاہدی۔"

پھر ہم لوگ اوک لینڈ میں لد پھند کر مسوری گئے۔ امیر احمد خاں راجہ محمود آباد بھی مسوری آئے ہوئے تھے۔ دہرہ دون واپس آکر تینوں ماموں صاحبان اپنے اپنے مستقر کی سمت روانہ ہوئے۔ ابا جان نے اماں سے کہا "جناح صاحب اور راجہ صاحب مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ راجہ صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ ان کے لئے کام کروں پولٹیکل۔"

اماں نے غصے سے کہا' "یوں فرمائیے کہ پھر چلے راجہ کی چاکری [4] کرنے۔ پہلے باپ کی۔ اب بڑھاپے میں بیٹے کی کیجئے۔"

ابا جان نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں خالی بیٹھے بیٹھے اکتا گیا ہوں۔ ایک مشغلہ رہے گا۔"

"صحت کا یہ حال۔ پیسے کی آپ کو ضرورت نہیں۔ یہ وقت آپ کا آرام کا ہے یا نوکری کا؟ پھر پنشن ہی کیوں لی تھی؟ راجہ صاحب تو آپ کو بہت چچا چچا کہتے ہیں۔ آپ کی حالت ان کو نظر نہیں آئی۔ روز کے بیمار۔ نوکری کروانے کی سوجھی۔"

"پھر وہی نوکری ارے صاحب۔ مسلم لیگ کا کام ہے۔ لکھنؤ میں رہیں گے۔ وہیں بھبو جی یونیورسٹی میں داخل ہو جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔ میری تو جوتی جاتی ہے لکھنؤ۔"

"اچھا تو جو پہلے کا پروگرام ہے وہی سہی۔ ترکی چلو۔"

"پھر ترکی؟ اب اتنا لمبا سفر کرنے کی حالت ہے آپ کی؟"

ابا جان نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا' "میں ترکی بھی نہ جاؤں تو آخر کیا کروں؟"

اماں نے اپنے بہنوئی میر افضل علی کو حالات سے آگاہ کیا' "تمہارے بھائی جان پھر چار مہینے کے لئے ترکی جانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ بتاؤ کیا کروں؟"

افضل خالو کا جواب آیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ریسٹ ہاؤس۔ سیالکوٹ چھاؤنی

۱۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء

پیاری باجی جان۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا خط ملا۔ میری صلاح یہ ہے کہ آپ استخارہ کیجئے۔ شیعوں کی طرح تسبیح کے دانوں پر نہیں بلکہ دل میں۔ سات روز تک ہر وقت دل میں دعا کرتی رہیں۔ چاء پیتے میں بھی سیر میں بھی۔ جب پلنگ پر سر منہ لپیٹ کر پڑی ہوں تب بھی۔ کہ اے خدا تو سجاد صاحب کا اور بچوں کا اور میرا محافظ ہو۔ کیونکہ ہمارا سوائے تیرے اور کوئی نہیں۔ بس یہ دعا یا اس قسم کی جو دل کے اندر سے نکلے اور عرش پھاڑ دے آپ سات روز تک ہر وقت کرتی رہیے۔ بس یہ بات تو یوں فیصلہ ہوئی۔ اب اسباب کی طرف دیکھئے۔ موٹر چار ماہ بند رہ کر ٹھیکرا ہو جائے گی۔ اسے فوراً فروخت کر دیجئے۔ ساٹھ ستر روپیہ ماہوار خرچ بچایئے۔ پھر تھکی ماندی بڑھیا کو اتنے سامان کی کیا ضرورت ہے جو سفر کرنے لگو تو رکھنے کی جگہ نہیں۔ بس تمام سامان راہ خدا میں دیدو کہ دن رات کی فکر سے بچو۔ آپ کہیں گی بچوں کے لئے اکٹھا کیا ہے۔ وہ پھر کب اتنا سامان بنا سکیں گے۔

یہ سب غلط ہے۔ اگر بچے پروان چڑھے تو اپنی ضرورت کا سامان خود مہیا کر لیں گے۔ آپ اس مصیبت کی جڑ کو کاٹتی جائیے۔ سوائے قیمتی ہونے والے قالینوں اور دریوں کے سب بیچ جائیں۔ جب ہندوستان واپس آئیں معمولی سادہ سامان پشتینوں والا خرید کر چھوٹی سی کوٹھی میں گزر کر لیجئے۔ اس طرح زندگی بڑی آسانی سے گزرے گی۔ اپنے تئیں ہلکا کیجئے۔ بھاری نہ کرتی جائیے۔ جو جائداد کرائے پر ہے اسے کرائے پر ہی رہنے دیں اور اس کا باقاعدہ حساب رکھیں اور انٹر بھنفر میں سفر کریں بچوں کو سخت جانوں والی زندگی گزارنے کی عادت ڈالئے۔ جبھی تو دنیا کا مقابلہ کر سکیں گے۔

شاید یہ سفر بھائی جان کی صحت کے لئے اچھا ہو۔ اس لئے بھائی جان کی مرضی کے مطابق چل پڑیے۔ جب اس طرح اپنے آپ کو خدا پر پھینک دیں گی وہ خود آپ کی حفاظت کرے گا۔

غلام ازل

افضل

لیکن مئی کے پہلے ہفتے میں ابا جان نے اماں سے کہا۔۔۔ راجہ صاحب مصر ہیں کہ فوراً لکھنؤ پہنچوں۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہونے والا ہے۔ تر کی اگلے سال چلیں گے۔

اماں نے برا فروختہ ہو کر جواب دیا' "مسلم لیگ کا دن رات کا کام جلسے' دورے آپ کو ہلکان کر دیں گے۔ آپ جائیے شوق سے لکھنؤ۔ لڑکے کو ہوسٹل میں ڈال دیجئے۔ لڑکی کو بھائی نصیر کے ہاں علی گڑھ بھیجئے۔ یا جو چاہے کیجئے۔ میں لاہور جاتی ہوں۔" اور اسباب باندھ چند روز بعد افضل خالو کے ہاں لاہور روانہ ہو گئیں۔

۵۔ جرس غنچہ کی صدا

لاہور جاتے وقت اماں سامان پیک کر کے آشیانے کے گودام بھجواتی گئی تھیں۔ میری گڑیوں کھلونوں اور پریوں کی کہانیوں کی کتابوں کو بھی دو بڑے صندوقوں میں بھر کر آشیانہ روانہ کیا جا چکا تھا۔ اپنے اس عزیز ترین اثاثے کے اچانک غائب ہو جانے کا مجھے حد سے زیادہ صدمہ تھا اور میں حیران پریشان نمبر ۲ کرزن روڈ کے ڈھنڈار کمروں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اماں علی گڑھ کے لئے میرا سوٹ کیس بھی پیک کرتی گئی تھیں۔ ان کے لاہور جانے کے چند روز بعد بھائی دوبارہ مسوری چلے گئے۔ اپنی بی بی کو اس دوران میں بشیر خاں گورکھپور پہنچا آئے تھے۔ جون کی ایک اجاڑ سی صبح ابا جان نے بستر بند سوٹ کیس اوک لینڈ کے لگیج کیریر پر بندھوائے۔ فقیرا نے دھاروں رونا شروع کیا۔ خانساماں جی چشم پرنم جا کر پلیا پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ موٹر نمبر ۲۰ کرزن روڈ کے پھاٹک سے نکلی۔

آشیانہ خالی پڑا تھا۔ اس کے سامنے سے گزرے۔ ڈالن والا سے باہر آئے۔ ڈون ویلی کو پیچھے چھوڑا۔ شام پڑے رڑکی پہنچ کر نہر کے کنارے ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ ڈاک بنگلے کے خانساماں نے چاء بنائی۔ رات ہو گئی۔ خانساماں نے کھانا تیار کر کے میز پر رکھا۔ صبح کو ناشتے کے بعد ابا جان شیو کرنے میں مصروف ہوئے۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر بڑی کوشش سے ان کے جوتوں پر پالش کیا۔ بشیر خاں موٹر کا کوئی کل پرزہ ٹھیک کرانے شہر لے گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لئے موٹر کے کارخانے کے مالک خانصاحب نے ابا جان کو اپنے ہاں مدعو کیا۔

خانصاحب کا بہت وسیع مکان تھا۔ ان کی بھونگ پائجامہ پہنے گھونگٹ کاڑھے صحن میں کھڑی دیغ میں کچھڑا گھونٹ رہی تھی۔ ایک کمرے میں تخت ہی تخت بچھے تھے اور دیواروں پر سینما ایکٹرسوں کی رنگین تصاویر آویزاں تھیں جن کی ساریوں پر ابرق لگی تھی۔ سیتا دیوی۔ مس گوہر۔ دیویکا رانی۔

کھانا کھا کر میں بشیر خاں کے پاس باہر بھاگ گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک دو منزلہ مکان تھا۔ ایک عورت سفید بلاؤز سفید چٹی کوٹ پہنے گھنے بال کندھوں پر چھٹکائے دروازے سے نکلی۔ گلی میں بچھی کھاٹ پر لیٹ گئی۔ ایک آدمی بجھی بجھی سی آنکھوں والا کھاٹ کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھا مٹھی سی بنائی اور سگریٹ پینے لگا۔ پھر وہ عورت ٹہلنے لگی۔ میں نے بشیر خاں سے کہا' "ارے ارے دیکھو۔ یہ عورت ساری پہننا بھول

گئی۔ ایسے ہی باہر آگئی۔" بشیر خاں نے کھلے انجن پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور چیں بجبیں ہو کر مجھ سے کہا' "بی بی آپ اندر جائیے۔"

بازار کی دیواروں پر "شوخ دلربا" فلم کے اشتہار لگے تھے اور بڑا ویران بے رنگ سا شہر تھا یا شاید ساری دنیا ہی بے رنگ اور اجاڑ سی تھی۔

قرولباغ۔ دہلی چچا مشتاق احمد زاہدی اپنی زرد رنگ کی کوٹھی کوشک کے برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے تھے۔ گرد آلود اوک لینڈ پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھ کر لپکے ہوئے باہر آئے۔

چچی کے کمرے میں چاندنی کے فرش پر کوچہ پنڈت سے آئی ہوئی چند برقعے والی عورتیں بیٹھی پان بنا رہی تھیں۔ ڈائننگ روم میں ریڈیو سیٹ کے اوپر بھائی نور الدین احمد اور ان کی انگریز بیوی برتھا عرف بلی (اسلامی نام بلقیس) کی بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ وہ دونوں نہر سعادت خاں پر رہتے تھے۔ شام کو چچا کی نواسیاں کوئن میری اسکول سے پڑھ کر لوٹیں۔ جمیلہ' نسیمہ' حسینہ عرف چنی۔ ہم لوگوں نے باغ میں خوب "اونچا نیچا ٹیلہ" کھیلا اور دوسرے روز چچی کے ساتھ شمسی کے تالاب گئے۔

میرس روڈ علی گڑھ چچا نصیر نور منزل کے برآمدے میں بیٹھے اچھے بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔ گرد آلود اوک لینڈ پھاٹک میں داخل ہوئی' "ارے بھائی جان آگئے۔" کہتے ہوئے باہر لپکے۔ چچا جان اسی سال شاہجہانپور سے ریٹائر ہو کر ریاست ٹونک میں وزیر مال مقرر ہوئے تھے اور چند روز کے لئے راجپوتانہ سے علی گڑھ آئے ہوئے تھے جہاں میرس روڈ پر نور منزل کے آدھے حصے میں چچی وحیدہ برائے تعلیم اولاد مقیم تھیں۔

رات کے کھانے کے بعد وائرلیس سیٹ پر خبریں سن کر ابا جان اور چچا جان' چچی جان پچھلے برآمدے میں آ بیٹھے۔ دہرہ دون کا گھر اس طرح یک بیک بریک اپ ہو جانے کی وجہ سے وہ تینوں بہت ملول نظر آتے تھے۔ لیکن ہم بچوں کو ان معاملات کا کچھ ہوش نہ تھا۔ میں 'اچھو' پارے حسب معمول کھیلنے میں مشغول تھے۔ وہ اماوس کی رات تھی اور باغ میں ایک ہرے رنگ کی ہری کین لالٹین روشن تھی۔

"بھابی جان کی ضد کے سامنے" چچا جان کہہ رہے تھے کسی کی نہیں چل سکتی۔ ان کو سمجھانا لاحاصل ہے۔"

"آپ اب ان کو اسکول میں داخل کر دیجئے۔" ابا جان نے بھاوج سے کہا۔

کچھ دیر بعد چچا جان کی آواز آئی' "بھائی جان' ٹونک میں والد مرحوم کا مقبرہ اب تک تو اچھی حالت میں ہے' چار دروازوں میں سے ایک مرمت طلب تھا۔ ہم کتبے کی عبارت بھی نقل کروا لائے ہیں تاکہ یہ لوگ پڑھیں۔"

چچی جان نے ہم لوگوں کو پکارا۔ ہم دوڑتے ہوئے پہنچے۔ ابا جان نے جیب سے پڑھنے کی عینک نکال کر ایک کاغذ پر نظر ڈالی۔ پھر اسے چچی جان کی طرف سرکا دیا۔ چچا جان نے مجھ سے کہا' "پڑھیے۔ یہ بھائی

اعجاز حیدر مرحوم کے اشعار ہیں۔"

میں نے اسے بغور دیکھا" یہ جنے کیا لکھا ہے۔"

"یہ فارسی ہے جناب۔ ہم پڑھ سکتے ہیں۔" اچھو نے حسب معمول رعب ڈالا۔ اور آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔ "آں سرذی کرم مس تج مع عزوجل۔۔ اور جنے کیا۔۔ معدن خلق و مروت معدن صدق و صفا بوداز۔ آل رسولؐ و اولاد علیؑ ذی قوت باشجاعت صاحب جود و سخا۔ ٹھہر جایئے۔ ہاں۔ چار شنبہ بود صبح بست و یک از ماہ صوم۔"

"کرداز دار فنا رحلت سوئے دار بقا۔" آپا زہرا نے آکر آگے پڑھا وہ فارسی میں برق تھیں۔

"سال وصلش دردل اعجاز ایں الہام شد۔ برجلال الدین حیدر رحمت آل عباؑ۔"

اچھو نے ایک لمبا سانس لیا۔ ابا جان نے کہا' "اب آپ آگے چلیے۔" اچھو نے پھر کرسی۔

"آں فخر بجنور آمداز مشرق بمغرب چوں صبا۔ ازنو بہارا و گلزار نوتنک از سر شگفت۔ یک روز بیش از بستم رمضان شب یوم الخمیس وقتیکہ ماندے دائما بیدار و عابد خوش نخفت۔ افوہ بڑے ابا ہم نہیں پڑھتے۔ یہ بہت مشکل ہے۔"

یہاں پر یہ سب فارسی عربی پڑھنی پڑے گی۔ یہ سوچ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ نور منزل میں جسے دیکھو پڑھائی میں منہمک تھا۔ آپا ممن ایف اے کر رہی تھیں۔ ان کی شادی سندیلے کے جری احمد سید سے طے کی جارہی تھی جو اسی سال انڈین آڈٹ اینڈ اکاونٹس کے مقابلے میں آ گئے تھے اور عنقریب رزمک جانے والے تھے۔ دوسرے دن ابا جان سے ملوانے کے لئے ان کو یونیورسٹی سے بلوایا گیا۔ ابا جان نے ان کو بہت پسند کیا' "بہت قابل پڑھا لکھا نوجوان ہے۔" انہوں نے بعد میں خوشی سے اظہار خیال کیا۔

میری جری بھائی سے بہت سخت دوستی ہو گئی۔ آپا ممن کا ان سے سخت پردہ تھا۔

تیسرے روز ابا جان لکھنؤ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ مجھ سے کہا' "اب آپ خوب جی لگا کر پڑھئے۔ دیکھئے عذرا بی بی کتنی قابل ہیں۔"

بشیر خاں نے اپنی گول ٹوپی سر پر رکھی اور موٹر کا ہینڈل گھمایا۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ ابا جان کے سوار ہونے کے بعد یا غوث کہہ کر موٹر اسٹارٹ کی جو دھول اڑاتی نور منزل کی پھاٹک سے نکل گئی۔

آپا عذرا ازبلا تھوبرن کالج سے آ چکی تھیں اور اب بی اے فائنل میں تھیں۔ دوپہر کو انہیں فلسفہ پڑھانے ایک صاحب جن کا نام مدثر تھا یکے پر سوار ہو کر نور منزل آتے۔ جتنی دیر وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پڑھاتے آپا بحیثیت شیپرون فرش پر بیٹھی پان چبایا کرتی۔

مدثر صاحب کہتے' "کائنات کس نے بنائی۔ خدا نے۔ خدا کو کس نے بنایا۔ ذہن انسانی نے۔ اور ذہن انسانی کو کس نے بنایا۔ ارتقاء ہوا۔ اور ارتقاء۔"

مدثر صاحب اب مدت مدید سے اقوام متحدہ نیویارک میں ماہر نفسیات کے عہدے پر فائز ہیں۔

جولائی میں گرلز کالج کھلا۔ اچھو ڈبل پرموشن لے کر ساتویں کلاس میں آ گئی۔ آپا زہرا دسویں جماعت میں تھیں۔ وہ داخلہ کروانے مجھے پرنسپل کے پاس لے گئیں۔

پرنسپل کون۔ عبداللہ بیگم یعنی اعلیٰ بی جو سفید براق کرتا دوپٹہ غرارہ پہنے اپنے دفتر میں بیٹھی تھیں۔ پھر ایک استانی نے ایک خالی کلاس روم میں لے جا کر امتحان لیا۔ حساب میں قطعی کوری نکلی۔ تیسری کلاس میں داخلہ ہوا۔ چند روز بعد کلاس ٹیچر نے آپا زہرا سے کہا انگریزی اردو کے لئے پانچویں جماعت میں بھیجا جا سکتا ہے۔ لہٰذا پانچویں اور تیسری جماعتوں میں بیک وقت تعلیم کا آغاز ہوا۔

اگست کی ایک شام جھٹ پٹے کے وقت میں 'اچھو' پارے' ری میاں اور پھوپی ابی کی بچیاں فہمیدہ اور زلیخا نور منزل کی چھت پر کھیل کود میں مصروف تھے۔ منڈیر کے نیچے نظر پڑی۔ دیکھا حسنین ماموں کھڑے ہیں۔ ہم سب سرپٹ نیچے بھاگے۔

حسنین ماموں برآمدے میں چچا جان سے کہہ رہے تھے' "بھائی جان۔ یہ۔ افضل بھائی کا تار آیا ہے۔ لاہور سے۔"

"خیریت تو ہے؟" چچا جان نے گھبرا کر پوچھا۔

تار میں لکھا تھا' "فوراً علی گڑھ جاؤ اور بی بی کو لے کر لاہور پہنچو۔"

چچا جان نے کہا' "خدانخواستہ بھابی یا افضل بھائی بیمار ہیں؟ کیا بات ہے؟ فوراً لے جایئے۔"

میرا ایک مہینے میں تیسری جماعت کے حساب اور پہاڑوں سے ناک میں دم آ چکا تھا۔ بہت خوش ہوئی۔ مگر نور منزل کی شدید تفریحات چھوڑ دینے کو بھی ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چچی جان نے افسردگی کے ساتھ میرا اسباب باندھا۔

لاہور کے پلیٹ فارم پر میر افضل علی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ حسنین ماموں نے ہڑبڑا کر دریافت کیا' "بھائی جان۔ سب خیریت ہے؟"

"اللہ کا کرم ہے۔" اطمینان سے جواب دیا۔

راستے میں حسنین ماموں نے پھر پوچھا' "بھائی جان۔ اس طرح اچانک کیوں بلا لیا؟ لونڈیا اچھی خاصی اسکول میں داخل ہو گئی تھی۔ پڑھ رہی تھی۔"

"بات یہ ہے۔" افضل خالو نے منہ لٹکا کر جواب دیا' "کہ میں نے پچھلے اتوار کو ایک فلم دیکھی تھی۔"

"فلم؟"

گیر بدلتے ہوئے جواب دیا "ہاں۔ اردو فلم۔ واہیات سی کہانی تھی۔ مگر اس میں ایک بچی تھی۔ بالکل بی بی۔ اور آخری سین میں وہ بچی موٹر کے نیچے آ کر مر گئی۔"

گھر پہنچنے کے بعد اماں نے حسنین ماموں سے آہستہ سے کہا' "تمہیں معلوم ہے افضل ہمیشہ کے رقیق القلب ہیں۔ جب سے دل کا عارضہ لگا ہے قوت برداشت بالکل نہیں رہی۔ یہ فلم دیکھے جائیں اور زار

و قطار روئیں۔ مجھ سے کہا بی بی کو فوراً بلا لیجئے۔ کہیں وہ بھی نہ مرجائے۔ میں نے کہا آل حسنین کو تار دیدو۔"

نمبر ۱۸ وارث روڈ کے دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگ چکی تھیں۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ افضل علی اڈیشنل کمشنر انکم ٹیکس صبح کو دفتر چلے جاتے۔ چھبو خالہ کے کمرے میں پنکھے کے نیچے فرش پر دراز ہو کر یہ سارے چچا زاد بہن بھائی دن بھر گپیں ہانکتے۔ ۱۹۳۰ء میں ثروت خالہ کا سولن میں انتقال ہوا تھا۔ افضل خالو نے اپنے بڑے ماموں میر فیض العسکری کی بیٹی شبیہ زہرا عرف چھبو جی سے عقد کر لیا تھا۔ میر فیض العسکری نے مرتضائی بیگم مرحومہ کے علاوہ مزید دو شادیاں صوبہ سرحد میں کی تھیں۔ زوجہ دوم کی بیٹی خورشید زہرا ضلع جھنگ کے کسی رئیس اعظم سے بیاہی تھیں۔ خورشید خالہ شلوار کے بجائے لاچہ پہنتی تھیں اور ماں سے ملنے ان دنوں لاہور آئی ہوئی تھیں۔ زوجہ سوم جنہیں بے بے جی کہا جاتا تھا بے انتہا حسین خاتون تھیں۔ ان کی لڑکیاں شبیہ زہراء اور تشبیہ زہرا اور فیض زہراء ماں پر گئی تھیں۔ یہ تینوں اور ان کے بھائی فیض العسکری، ظہور العسکری اور حسن عسکری پنجابی لباس پہنتے تھے۔ لیکن آپس میں اردو بولتے تھے اور اپنے آپ کو اپنی مراد آبادی ددھیال سے آئی ڈینٹی فائی کرتے تھے۔ افضل خالو کی بیوی خالہ شبیہ زہرا جو چھبو جی کہلاتی تھیں اپنے بھانجے مصطفٰے حیدر کو بہت چاہتی تھیں اور اپنے عرف پر بھائی کا پکارنے کا نام چھبو جی انہوں ہی نے رکھا تھا۔ بغیر فریم کی چوکور عینک لگاتی تھیں اور ذرا فربہ تھیں۔ گلاب کے پھول ایسی رنگت تھی۔

ماموں حسن عسکری ہائی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ شام کو ایک ماسٹر صاحب گھر پہ ٹیوشن کرنے آتے تھے۔ مجھے بھی ان کے سامنے بٹھالا گیا کہ پہاڑے یاد کرواتے رہیں۔ ماسٹر صاحب ایک اداس صورت غریب نوجوان تھے۔ حسن ماموں کو پڑھانے کے بجائے زیادہ تر ان کو اردو اشعار سنایا کرتے تھے۔ کبھی پڑھاتے پڑھاتے چونک کر کہتے ؎ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد۔ غالب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے۔ جنے بیچارے پر کیا گذری تھی۔

ایک کمرے میں گراموفون رکھا تھا اور گوسائیں، دیوکی نندن، مس چنچل کماری، مس طمنچہ جان، عنایت بائی ڈھیرو والی اور مختار بیگم کے ریکارڈ۔ ایک دوپہر حسن ماموں نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی۔ قوال بچے کی دلدوز آواز بلند ہوئی "محمدؐ۔ محمدؐ پکارے چلا جا۔" چھبو خالہ جو پاس قالین پر لیٹی تھیں کروٹ بدل کر دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگیں۔ میں نے گھبرا کر حسنین ماموں سے پوچھا "خالہ رو کیوں رہی ہیں؟"

"نذر باجی کے اور میرے بڑے ابا میر فیض العسکری تھے نا۔ وہ چھبو جی کے ابا تھے۔ کچھ دن ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ انہیں یہ قوالی بہت پسند تھی۔" حسنین ماموں نے آہستہ سے بتایا۔

لاہور بڑی چہل پہل کا شہر تھا۔ انار کلی، مال روڈ، لارنس گارڈن، شالامار باغ، جہانگیر کا مقبرہ۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے رنگا رنگ ہجوم۔ تمام عورتیں ریشمیں کپڑے پہنتی تھیں۔ چھبو خالہ کی

عیسائی "چوڑی" یعنی مہترانی بھی ہمیشہ ریشمیں "سوٹ" میں ملبوس رہتی تھی۔ شہر کی دیواروں پر "کرنال شاپ" "بھرا تاں جی دی ہٹی" اور "کویراج ہرنام داس بی اے" کے اشتہار چسپاں تھے۔

انار کلی میں نوازش علی شاہ کے بڑے بھائی ڈاکٹر بہادر کا مکان تھا۔ نیچے سڑک پر سے ایک روز سیاہ لہنگے اور سفید کرتے دوپٹے پہنے پنکھیاں سنبھالے گوری گوری معمر ہندو خواتین کا جلوس جا رہا تھا۔

تاج اور حجاب بہاولپور روڈ پر رہتے تھے۔ سنسان سی جگہ۔ سڑک پار بھینسوں کا طویلہ۔ امتیاز بھائی جن کو لڑکپن سے اسٹیج اور سینما کا شوق تھا۔ اب باقاعدہ فلمساز بن چکے تھے۔ اپنی تمثیل "سہاگ کا دان" کی فلم لاہور میں بنائی تھی۔ جو فیل ہو گئی تھی۔ اس کے سیٹ کا راج سنگھاسن ڈرائینگ روم میں رکھا تھا۔ ایک آراستہ پیراستہ طاق میں ان کی شادی کی (جو ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی) تصویر اور وہ نظم فریم میں لگی رکھی تھی جو ابا جان نے اس موقع پر کہی تھی ؎

قیس دلیلے کو سکھائیں گے یہ درس الفت — ان کو تفسیر رہ و رسم وفا آتی ہے

افضل خالو ستمبر کے مہینے میں اٹھارہ نمبر سے وارث روڈ کی لین کے اندر ایک چوکور دروں والی نئی کوٹھی میں منتقل ہوئے۔ سب سے پہلے قرآن شریف اور پانی کی صراحی نئے گھر میں لے جائی گئی۔ خالہ فیض زہرا سری نگر سے واپس آنے والی تھیں۔ ان کے لئے ایک بیڈ روم عنابی پردوں اور عنابی قالین سے آراستہ ہوا۔ آتش دان پر ان کی شادی کا بڑا سا پورٹریٹ رکھا گیا۔

خالہ فیض، چھبو خالہ کی سب سے چھوٹی بہن تھیں۔ لاہور تبدیل ہو کر آنے سے قبل افضل خالو انبالہ میں تھے جہاں سے سال گذشتہ انہوں نے خالہ فیض کے نکاح کی مندرجہ ذیل اطلاع اماں کو آشیانے بھیجی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انبالہ۔ ۱۹ مارچ ۳۶ء

پیاری باجی جان۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

فیض اب بیس سال کی ہے۔ پشاور میں نویں جماعت میں تھی۔ برات میں مرد عورتیں کل بیس آئے تھے۔ میری طرف سے باہر مردوں کے استقبال کے لئے لاہور سے پندرہ بیس افسر آگئے تھے۔ ان کے علاوہ نوازش، بہادر، بھائی مراتب، اندر اماں جان محمد شاہ کی، مسز شمشاد حسین[5] اور ان کی دو بیاہی لڑکیاں۔ اندر کھچا کھچ مہمان بھرے تھے۔ اماں جان محمد شاہ کی سب رسومات ادا کر رہی تھیں۔ ہماری طرف سے ململ کے تھان اور لٹھے کا جوڑا انہوں نے دولہا کے والد مرحوم کے نام اصرار سے دلوایا۔ میں بہت ہنسا کہ شادی پر مردے بھی شیعوں میں کپڑے لیتے ہیں۔

نکاح کے بعد شمشاد مرحوم کی لڑکی طاہرہ جو کیپٹن احمد سے بیاہی ہیں اور اقبال جو کیپٹن نذیر[6] کی بیوی ہیں دونوں نے اصرار کیا کہ دولہا کو اندر لاؤ کہ دلہن کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنائے۔ غرض دولہا فرنگی چال عورتوں میں پھنس گیا۔ آدھ گھنٹے تک طاہرہ اور اقبال انگریزی میں باتیں کر کے دولہا کو مرعوب کرتی

رہیں۔

اصغر اپریل میں ایم اے فلاسفی کا امتحان دے گا۔

کچھ عرصہ قبل فیض خالہ لاہور سے رخصت ہو کر ماہ عسل منانے "بائی کار" کشمیر چلی گئی تھیں۔ عنقریب واپس آنے والی تھیں۔

ستمبر کی ایک خوشگوار صبح خالو اصغر حسین اور فیض خالہ وارث روڈ پہنچے۔ کاسنی "سوٹ" میں ملبوس فیض خالہ نے جھک کر اپنی والدہ بے۔بے جی کے پیر چھوئے جو پنجاب کا دستور تھا۔ خالہ فیض بالکل پری تھیں۔ گجرانولہ کے باشندے سید اصغر حسین ایک بیحد اسمارٹ اور خوش شکل نوجوان تھے۔ نفسیات ان کا خاص مضمون تھا۔ اکثر وہ اماں سے باتیں کرتے ہوئے کہتے۔ "باجی جان۔۔۔ ہماری سائیکولوجی یہی کہتی ہے۔ باجی جان ہماری سائیکولوجی کی رو سے۔"

افضل خالو لاولد تھے۔ ایک پشاوری نوجوان سردار محمد اسلم خان کو بیٹا بنایا تھا۔ وہ مع اپنی والدہ اور بہن بی بی گل کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کا پورٹریٹ ڈرائنگ روم میں رکھا تھا۔ وہ خود انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کے مقابلے میں کامیاب ہو کر پوسٹنگ پر جا چکے تھے۔ میر افضل علی ایک دلآویز' احباب پرست' کنبہ پرور' اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ نو برس کی عمر سے بلاناغہ تہجد پڑھ رہے تھے۔ اخبار الفضل کا روزانہ مطالعہ کرتے تھے۔ اپنے آبائی عقائد اثناء عشریہ پر قائم تھے۔ لیکن مغرب میں تبلیغ اسلام کے لئے ہر ماہ قادیان[7] چندہ بھیجتے تھے۔ معترضین کو جواب دیتے تھے اگر کسی شیعہ یا سنی جماعت نے اس طرح ساری دنیا میں اشاعت اسلام کا بیڑہ اٹھایا ہوتا تو میں اسے چندہ دیتا۔ لیکن آپ حضرات نے سوائے آپس میں لڑنے کے اور کیا کیا ہے؟

اماں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک رات کھانے کی میز پر دفعتاً اناؤنس کیا۔ "برسات کا زمانہ ہے۔ بچہ لکھنؤ میں جنے کیا الابلا کھا رہا ہو گا۔ وہ بٹلر پیلس میں کڑھی اور دہی بڑے اڑاتے ہوں گے۔ کالرا کا موسم ہے۔ میں جاتی ہوں لکھنؤ۔ افضل میاں تم صبح دفتر جاتے ہی اپنے بھائی جان کو تار دیدو۔"

چوتھے روز ابا جان خوش خوش لاہور آپہنچے۔

لکھنؤ روانگی سے ایک دن قبل ہم لوگ مال روڈ سے گذر رہے تھے۔ چوراہے پر بتیاں سبز سے سرخ ہوئیں۔ افضل خالو نے بریک لگا کر ابا جان سے کہا' "دیکھیے بھائی جان ہمارے لاہور میں ٹریفک لائٹس لگ گئی ہیں۔" عین اسی لمحے مجھے ایک سفید بلی سڑک پر نظر آئی۔ میں نے فوراً اس کی فرمائش کی۔ خالو فوراً کار ایک طرف ٹھہرا کر بلی کی طرف لپکے۔ وہ غائب ہو گئی چند منٹ میں نہ جانے کس طرح اسے پکڑ لائے۔

"اگر یہ چند دن لاہور میں اور رہ گئیں افضل اپنے لاڈ پیار میں بالکل برباد کر دیں گے۔" اماں نے بگڑ کر کہا۔

مغرب کے وقت مومن پورہ قبرستان میں اماں اور چھبو خالہ ایک طرف کھڑی ہو کر پھسر پھسر رویا

کیں۔ ابا جان اور افضل خالو نے نانا فیض العسکری مرحوم کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ افضل خالو غروب آفتاب کی روشنی میں دونوں ہاتھ الگ الگ اٹھائے آسمان کی طرف نگاہ کئے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

شروع نومبر میں چھبو خالہ کا سراسیمہ خط اماں کے نام لکھنؤ پہنچا۔ "باجی جان۔ افضل بہت سخت بیمار ہیں۔"

۶۔ چراغ پھولوں کے جل رہے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۷۔بی۔ وارث روڈ
لاہور۔ ۷انومبر ۱۹۳۷ء

پیاری باجی جان۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ۔ آپ کا ۱۵ نومبر کا خط ملا۔ آپ تو یونہی گھبرا گئیں۔ میں اب اچھا ہوں۔ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کھانا اپنے ہاتھ سے کھاتا ہوں۔ ۱۶ جنوری تک نوکری پر چلاؤں گا۔ فکر نہ کریں اور بچوں کو چھوڑ کر فوراً آنے کا قصد نہ کریں۔ دسمبر میں مصطفےٰ حیدر اور عینی جانی کو ساتھ لے کر آنا۔ اور جب تشریف لائیں تو بس ایک مختصر سا بستر ا اور ایک سوٹ کیس ہر ایک کا ہو۔ ستار اور باجہ تو بالکل نہ لائیں اور لوٹے سب گھر میں بند کرتی آئیں اور سیدانی بی بی بس اپنا "نمازی لوٹا" ساتھ لائیں۔

غلام ازل
افضل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لاہور ۲۰ نومبر ۳۷ء

باجی جان۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ کرسی پر بیٹھا خط لکھ رہا ہوں۔ احتیاطاً چلتا پھرتا نہیں کہ کہیں ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ رخصت ایک ماہ کی اور لے لی ہے۔ چھبو جی کی کالج کی تعطیلات دسمبر میں شروع ہوں تو مختصر سا سامان از قسم بقچی بغل میں دبا کر چل پڑیں۔ جیسے ماموں فیض العسکری پنشن کے بعد چلا کرتے تھے۔ ورنہ ملازمت کے ایام میں آپ کے ستار کی طرح ان کا حقہ اور تمباکو اور کوئلوں کے بکس ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ سادہ زندگی اور کم سامان میں انسان کو آرام رہتا ہے۔ زیادہ سامان ہو تو سب سے زیادہ قیمتی چیز گم ہو جاتی ہے۔ جیسے آپ بہت سامان لے کر چلیں تو ماموں ظہور حسنین کی بڑی سی تصویر آغا میر بھائی سے دہرہ دون کے اسٹیشن پر گم ہو گئی۔

کل ظفر اللہ آرہے ہیں۔ اعجاز احمد بھی ہمراہ ہوں گے۔ ڈاکٹر لطیف کو دہلی سے میرے معائنے کے لئے لا رہے ہیں۔ اصغر دہلی میں ہیں۔ ان کا کمرہ اور بڑا غسل خانہ ظفر اللہ کے لئے اور ان کے بعد آپ کے لئے لیس ہو رہا ہے۔ بس اس کے بعد دسمبر میں مع تھوڑے سے سامان اور مع دونوں بچوں کے تشریف لے

افضل

۲۴ نومبر کو چھبو خالہ کا تار لکھنؤ پہنچا' "افضل کی حالت نازک ہے۔"

نمبرے بی وارث روڈ پر عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ سردیوں کی گہری دھند میں لوگ چھوٹے چھوٹے گروہ بنائے سبزے پر موجود تھے۔ اندر اپنے کمرے میں افضل خالو پلنگ پر آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ چھبو خالہ شال میں لپٹی گم سم پائنتی بیٹھی تھیں۔ حسب معمول ان کے بالوں کی ایک لٹ چہرے پر جھول رہی تھی۔ مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے باورچی خانہ میں دیگیں اس طرح کھڑکتی تھیں گویا شادی کا گھر ہو۔

محل سرا مراد آباد میں ۱۹۰۳ء میں جب پانچ سالہ افضل علی کی سنتوں کی تقریب منعقد کی گئی تھی تب بھی اسی طرح دیگیں کھڑکی تھیں[8]۔

ایک رات میں نے بے بے جی کے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ "اللہ میاں۔ میرے خالو جان کو اچھا کر دیجئے۔ اللہ میاں"۔ بے بے جی آتشدان کے سامنے قالین پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں۔ خدا کو پانچ منٹ کی مہلت دینے کے بعد میں نے ان سے پوچھا' "بے بے جی کیا اللہ میاں نے دعا سن لی ہو گی؟"

وہ بولیں' "ہاں بٹی' وہ رب کریم معصوم بچوں کی آواز سن لیتا ہے۔"

گھر میں مستقل لمبی لمبی نمازیں پڑھی جا رہی تھیں۔ میر افضل علی ایک ہر دلعزیز انسان تھے۔ لاہور کی سنی مساجد میں نماز جمعہ کے بعد ان کے لیے دعا کی گئی تھی۔ قادیان میں دعائیں کی جا رہی تھیں۔ مراد آباد میں آل زہرا نانی نے منتیں مانیں۔ اور فریادی ماتم کیا۔

افضل خالو کو خون کی الٹیاں آنی شروع ہو گئیں۔ اس روز تیسرے پہر کو چند مہمان بیبیاں پہلو کے برآمدے میں بیٹھی تبادلہ خیالات کر رہی تھیں' "ہمارے میر صاحب پر کسی دشمن نے جادو کر دیا ہے۔"

"سنا میں نے بھی یہی ہے۔ فلاں صاحب کی بیوی نے کرایا ہے۔ ان کے خاوند اس عہدے کی تاک میں تھے ترقی میر صاحب کو مل گئی۔"

"ایسے نمازی' پرہیز گار' نیک بندے کا کلیجہ کٹ کٹ کر نکل رہا ہے۔"

"آپا جی۔ جادو کا اثر تو حضور ﷺ پر نور پر بھی ہو گیا تھا۔ ہم تم کس گنتی میں ہیں۔"

میں نے اپنے ہاں جادو ٹونے کا ذکر کبھی نہیں سنا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اندر جا کر اماں کو اطلاع دی۔ "اماں باہر وہ بیگم قریشی جو بیٹھی ہیں وہ کہہ رہی ہیں خالو پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ وہ کیسے ہوتا ہے؟"

اماں نے گرج کر ڈانٹا' "ایسی بے عقلی کی خرافات نہ سنو نہ آ کر مجھ سے سوال کرو۔"

اگلی صبح شاید سات بجے کڑاکے کی سردی میں افضل خالو کے کمرے کا ایک دروازہ کھلا دیکھ کر میں چپکے سے اندر چلی گئی۔ خالو کے سرہانے حسنین ماموں الن ماموں (دونوں ایک روز قبل لاہور پہنچے تھے) چھبو

خالہ' اماں' فیض خالہ اور اصغر خالو سب جمع تھے۔ میں دبے پاؤں جا کر بالکل تکیے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ خالو پر غنودگی طاری تھی۔

اچانک انہوں نے آنکھ کھولی اور زور سے آواز دی' "انعام اللہ۔"

انعام اللہ خالو کے ڈرائیور کا نام تھا۔ میں اسے بلانے تیر کی طرح باہر بھاگی۔ آس پاس نظر نہ آیا تو شاگرد پیشے تک دوڑی گئی۔ وہاں بھی نہ ملا۔ تو واپس آئی۔ اس وقت تک کمرے میں کہرام بپا ہو چکا تھا۔

خالو کی منہ بولی بیٹی بی بی گل سردار اسلم خاں کی بہن نے بال کھول سرہانے کھڑے ہو پشتو میں نالہ و فریاد شروع کی۔ ایک مہمان بی بی چیل کی طرح چھبو خالہ کی طرف جھپٹیں۔ آتشدان پر سے ایک بھاری چیز اٹھا کر ان کی چوڑیاں چھنا چھن توڑ ڈالیں۔

افواہ پھیلی کہ سر ظفر اللہ خاں دہلی سے آ گئے ہیں اور جنازے کو جنت البقیع' قادیان لے جانا چاہتے ہیں۔ حسنین ماموں نے فوراً اعلان کیا۔ ہم سب کی گواہی میں۔ اللہ جنت نصیب کرے بھائی جان مرحوم نے وصیت کی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین ان کے باپ دادا کے طریقے پر کروائی جائے۔ زوال سے پہلے پہلے لاہور شہر کے ایک شیعہ مجتہد نے آ کر لان پر نماز جنازہ پڑھائی۔ جلوس جس میں مسلمان ہندو سکھ عیسائی شامل تھے مومن پورہ روانہ ہوا۔ میر افضل علی اپنے بڑے ماموں میر فیض العسکری کے پہلو میں سپرد خاک کر دئے گئے۔

اس رات مرنے والے کے کمرے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سوگواروں کا مجمع فرش پر خاموش سرنگوں بیٹھا تھا۔ دفعتاً کسی نے اونچی آواز سے دریافت کیا۔ "بھائی جان مرحوم نے مرتے وقت انعام اللہ کو آواز دی تھی؟"

"میں تو وہیں کھڑی تھی" خالہ فیض نے شال کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "بھائی جان آنکھیں کھول کر اچانک اس طرح بولے جیسے کوئی سامنے آ کھڑا ہو اور اسے دیکھ کر حیرت سے اس کا نام لیں۔"

"انعام اللہ شاہ بھائی افضل کے بڑے چہیتے دوست تھے۔ کیا پتہ ان کی روح بھائی جان کو لینے آئی ہو۔" کسی اور نے اظہار خیال کیا۔

سوئم کے روز ابا جان لکھنؤ سے پہنچے۔ فوراً مومن پورہ گئے۔ عین اسی جگہ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی جہاں تین ماہ قبل افضل خالو نے ان کے ساتھ کھڑے ہو کر نانا فیض العسکری کی قبر پر فاتحہ خوانی کی تھی۔

جب فلسفی اور درویش مزاج میر افضل علی کے منجھلے ماموں میر نذر الباقر اور والدہ اکبری بیگم کا ۱۹۳۹ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں انتقال ہوا۔ وہ اماں کو علی گڑھ لکھا کرتے' "میں نے ماموں اور اماں کا سارا سامان خیرات کر دیا۔ دنیا فانی ہے۔ کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں۔ مال و متاع کا کبھی غم نہ کیجئے۔"

چند ماہ قبل دہرہ دون اماں کو لکھا تھا' "سامان اور موٹر فروخت کر دیجئے۔ تھکی ماندی بڑھیا کو اتنے سامان کی کیا ضرورت ہے۔ بس تمام چیزیں راہ خدا میں دیدو کہ دن رات کی فکر سے بچو۔"

میرافضل علی اڈیشنل انکم ٹیکس کمشنر لاہور نے مرتے وقت مکان جائداد بینک بیلنس کچھ نہیں چھوڑا۔

بی وارث روڈ سے رشتے دار اور احباب ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ کوٹھی کا سامان بندھنا شروع ہوا۔ چند روز بعد نئے کرائے دار مکان دیکھنے کے لئے آئے۔۔۔۔۔ ایک صبح ان کے فرنیچر کے ٹھیلے آ کر پھاٹک پر کھڑے ہو گئے۔ جس رات ہم لوگ لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔ بے بے جی ایک خالی کمرے میں آتشدان کے سامنے بیٹھی نیلی پھولدار قمیض پہنے سرمئی شال میں لپٹی' حقہ گڑگڑاتی بار بار دہرا رہی تھیں' "اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔"

پینتالیس (۴۵) سالہ میرافضل علی غیر معروف دانشور و مصنف "تخیلات" کی داستان حیات ختم ہوئی۔

ایک مرتبہ ریڈیو پاکستان لاہور سے سید امتیاز علی تاج مرحوم نے "اردو کے گمنام ادیب" کے سلسلے میں میرافضل علی کے متعلق ایک تقریر نشر کی تھی

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی (جو ضلع گورداس پور کے باشندے ہیں) کے بزرگ میر قائم علی میر مہدی علی' میر مظہر علی میر فیض العسکری اور میر نذر الباقر سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ میرے استفسار پر جون ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے لندن سے تحریر فرمایا کہ انہوں نے میرافضل علی مرحوم کے متعلق ایک مضمون ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا جو رسالہ ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا تھا۔ وہ انہوں نے اپنے مضامین کے مجموعے میں شامل کیا ہے جو لاہور سے شائع ہونے والا ہے۔ وہ کتاب بھی مجھے آج تک نہیں ملی۔

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک بھی میرافضل علی کی کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ایف اے اردو نصاب میں شامل رہی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں مکتبہ جدید لاہور نے ایک انتخاب بعنوان "اردو کا بہترین انشائی ادب" شائع کیا جس میں میرافضل علی کا ایک مضمون شامل ہے۔ کتاب کے مرتب کو مصنف کے متعلق کچھ معلوم نہیں کون تھے' کب پیدا ہوئے' کہاں رہے' کب مرے۔

بعض ادیب ایسے بد قسمت بھی ہوتے ہیں۔[9]

حوالہ جات

1. کرنل فروغ بنی جعفری۔ پاکستان آرمی۔
2. "آگ کا دریا" میں لکھنؤ کی طوائف چمپابائی کی زندگی کا آخری دور اسی دھندلی سی یاد پر مبنی کیا تھا۔
3. دیکھئے فصل ششم باب نمبر۵ "اورینٹ ایکسپریس۔"
4. دیکھئے فصل پنجم باب ۳ "ہلٹن لین۔"
5. چودھری ظفر اللہ خاں کی ساس۔ دیکھئے فصل پنجم باب ۱۱۔
6. اب پاکستانی جنرل نذیر احمد۔
7. دیکھئے فصل پنجم باب ۱۱ "حکایہ لیلے مجنوں۔"
8. دیکھئے فصل چہارم باب ۲ "محل سرا۔"
9. میرافضل علی کے متعلق ملاحظہ کیجئے فصل پنجم باب ۱۱ "حکایہ لیلے مجنوں۔"

فصل دہم

۱— امیر جمع ہیں احباب

معزز حاضرین'

ہندوستانی اکیڈیمی نے مجھے اس جلسہ کا صدر قرار دے کر اپنی توہین کی اور مجھے عزت بخشی۔ اس توہین کے آپ سزاوار ہیں' اس عزت کا میں مستحق نہیں!

ہندوستانی اکیڈیمی اس صوبے کی دو زبانوں کی رقابتوں اور کشمکشوں کو دور کرنے کے لئے عالم وجود میں آئی تھی۔ کیا اس رقابت اور کشمکش میں کوئی کمی آئی؟ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں! دو سال قبل ہی کی بات ہے کہ دو زبردست ہستیوں نے اس اکیڈیمی میں دو متضاد خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

مولانا عبدالحق نے فرمایا تھا: "میں اس وقت اس کے (یعنی ہندوستانی اکیڈیمی کے) کاموں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا لیکن اکیڈیمی کے کار فرماؤں کی خدمت میں اس قدر عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ جب اکیڈیمی نے ہندوستانی کا لقب اختیار کیا ہے اور ہندوستانی کے رواج کا بیڑہ اٹھایا ہے تو کیوں اب تک کچھ کتابیں ایسی تالیف نہیں کرائی گئیں اور کوئی رسالہ ایسا شائع نہیں کیا گیا جو ہندوستانی زبان میں ہو اور بجنسہ بغیر کسی تغیرو تبدل کے دونوں رسم الخط میں لکھا جا سکے .... اس سے بھی زیادہ مفید کام جو اکیڈیمی کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسی زبان میں ریڈریں تیار کرائے جو دونوں رسم الخط میں لکھی جائیں اور مدارس میں رائج کی جائیں۔ اس سے وہ دورنگی جو اس وقت اس صوبے کے مدارس میں پائی جاتی ہے خود بخود اٹھ جائے گی...... ہندوستانی کے رواج کا سب سے بڑا ذریعہ مدارس ہو سکتے ہیں۔ جب زبان ایک ہو جائے گی تو رسم خط کی نزاع آپ سے آپ اٹھ جائے گی۔ ابھی زبان ہی ایک نہیں' رسم خط کی بحث کیسی!"

اسی دن اور اسی مقام پر ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا نے بہ حیثیت صدر شعبہ ہندی کے فرمایا:

"جب تک ہم علمی حالت میں ہیں' اختلاف ماننا ہی پڑے گا۔ اور اسی کے مطابق کام بھی کرنا ہو گا.......... سرکاری احکام کو جن کے مطابق ان صوبوں میں ہندی اور اردو کو متحد کرنا ٹکسٹ بک کمیٹی کا سب سے بڑا فرض تھا اس وقت سے متحد کرنے کی کوشش کو خود اور روایتی طور سے دیکھتا اور بھگتتا رہا۔ اس تجربے سے یہ اصول میرے دل میں جاگزیں ہو گیا کہ معمولی بول چال میں "میں کھاتا ہوں' میں جاتا ہوں" وغیرہ کے استعمال تو ایک قسم کے ہیں اور ایک قسم کے ہوتے رہیں گے لیکن مضمون نگاری اور تصنیف کے عمل میں یکسانیت قطعاً ناممکن ہے۔ غیر ممکن ہی نہیں بلکہ برباد کن ہے اور ان زبانوں کا اتحاد اسی وقت ممکن ہو گا' جب پانی کے کل دھارے وجود مطلق کے بحرِ بے پایاں میں محو ہو جائیں گے جس آدمی کے دل میں یہ اصول جاگزیں ہو گیا تھا اسے دونوں زبانوں کے متحد کرنے والے ادارے کو دیکھ کر تعجب ہونے لگا' اپنے اصول پر شبہ ہونے لگا...... لیکن کچھ ہی دنوں' مہینے سے بھی کچھ کم' میں یہ دکھائی دیا کہ ہندی اور اردو کے

دونوں دھاروں کا پریاگ پر سنگم نہیں ہو رہا ہے اور دونوں دھارے ساتھ ساتھ مگر الگ الگ چل رہے ہیں اور چلائے جا رہے ہیں۔ دونوں زبانوں میں علیحدہ علیحدہ کتابیں تیار ہو رہی ہیں اور آخر میں اس ادارے کے آرگن تماہی رسالے بھی الگ الگ نکل رہے ہیں۔"

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں: "آج ہندوستانی اکیڈیمی کے اندر اردو اور ہندی کے الگ الگ اجلاسوں کو دیکھ کر اور اس سے اپنے اصولوں کی تائید پا کر میں کتنا مسرور ہوں میں نہیں کہہ سکتا۔ "جیسا ہوا ہے ویسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا! یہی مناسب تھا اور یہی مناسب ہے!"

آپ نے دیکھا اور آپ نے غور فرمایا! ان دونوں بزرگ ہستیوں کے ارشادات میں کیا فرق ہے؟ میرے نزدیک فرق ظاہر ہے۔

ایک آرزو بیان کر رہا ہے۔ دوسرا حقیقت جسے وہ اپنی آرزو کے ہم عنان پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی کی شاہراہیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا فرماتے ہیں' یہی مناسب تھا اور یہی مناسب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کو شاہراہوں کے علیحدہ ہونے سے انکار ہے نہیں' مگر وہ کہتے ہیں کہ دونوں زبانوں کو ایک ہی راستے پر ڈال دینا چاہیئے۔

ان دو[2] شاہراہوں کو دیکھ کر ہمارے قابل تعظیم اور اتحاد پسند صدر ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو نے یاس انگیز خیال ظاہر کیا کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو وہ دن دور نہیں کہ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے لئے ہندو مسلمانوں کو ایک ایک ترجمان ساتھ رکھنا پڑے گا۔ جب اتحاد کے امکان کو ان الفاظ میں بیان کیا جائے کہ ان زبانوں کا اتحاد اسی وقت ممکن ہو گا جب پانی کے کل دھارے وجود مطلق کے بحرِ بے پایاں میں محو ہو جائیں گے۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ اردو کے انتہا پسند بھی یہ کہیں کہ اردو کو آسان کرنے کی کوشش کی بے سود ہے بے سود ہی نہیں مضر ہے۔ اسے اگر بازار کی زبان سے اوپر کرنا ہے تو اسے فارسی و عربی کے ان الفاظ سے جو بلند خیالات کو ظاہر کر سکیں مالا مال کرنا ہو گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ کہ آپ اردو کو ہندی سے یا ہندی کو اردو سے بالکل بے نیاز کر دیں۔ جب تک آپ ایک ملک میں رہتے ہیں ایک دوسرے کے ہمسائے اور پڑوسی ہیں' یہ ممکن نہیں کہ ایک دوسرے کی معاشرت ایک دوسرے کی زبان یا بالفاظ دیگر ایک دوسرے کی رفتار و گفتار سے متاثر نہ ہوں۔ جب یہاں پہنچ کر مسلمانوں کا لباس و خوراک' طرز بود و ماند یہاں تک مذہبی مراسم میں مقامی رنگ آگیا' مقامی اثرات کی جھلک دکھائی دینے لگی' تو زبان تو بہت جلد اثر پذیر ہوتی ہے۔ اور ہندوؤں نے بھی اسی حد تک بلکہ اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کا اثر قبول کیا' اور یہ اثر ایک دوسرے پر پڑتا رہے گا جب تک کہ آپ دونوں قوموں کے درمیان ایک دیوار آہن کھڑی نہ کریں۔

اب تو دونوں ایک جگہ رہتے سہتے ہیں۔ جب مسلمان ہندوستان میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے اس زمانے میں بھی ایک دوسرے کی زبان اور لٹریچر سے ایسے بیگانہ نہ تھے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

ایک پراز معلومات و پراز تحقیقات مقالے میں جو پنڈت برج موہن دتاتریہ نے علی گڑھ میں پڑھا تھا یہ ثابت کیا تھا کہ فارسی کا پڑھنا ہندوؤں میں مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے جاری تھا گو عام نہ ہو اور ہندوستان کے ہندو راجہ قبل اس کے کہ مسلمان یہاں حملہ آور ہوتے' کابل اور وسط ایشیا کی اسلامی سلطنتوں سے فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے اور ہندو دربار کے ہندو منشی ان مراسلات کو فارسی میں لکھتے تھے۔ ہندو عرب کے تعلقات میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے بتایا ہے کہ جنوبی ہند میں عرب تاجروں اور عرب جہاز رانوں کی بدولت مسلمانوں اور وہاں کے ہندوؤں میں معاشرتی اور تجارتی تعلقات مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہونے سے قبل قائم ہو چکے تھے۔ اسی طرح فارسی زبان کا "بت" اصل میں "بدھ" ہے یعنی حضرت گوتم بدھ کا مجسمہ' اور یہ تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ نیپال جو کبھی مسلمانوں کے زیر نگیں نہیں رہا' وہاں بھی شمشیر جنگ رانا' بیر جنگ رانا' تیغ بہادر رانا جیسے نام بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی زبان کا اثر' ان کے سیاسی اثر کے حدود سے باہر پہنچ گیا تھا۔

ایسی حالت میں میں نہیں جان سکتا کہ اردو جو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں اگرچہ اس میں فارسی اثر زیادہ ہے وہ محض مسلمانوں میں محدود ہو کر رہ جائے گی۔ یا ہندی کو مسلمان نہ سمجھ سکیں گے۔ آخر اب بھی تو ہندی ٹھمریوں اور گانوں کو مسلمان سنتے ہیں اور ان سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اردو کا اثر مسلمانوں اور ہندوؤں پر کم و بیش ہو گا۔ ہندوؤں پر کم مسلمانوں پر زیادہ۔ اسی طرح ہندی کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر ہوتا رہے گا۔ مسلمانوں پر کم' ہندوؤں پر زیادہ۔

مگر جب عمداً یہ کوشش کی جائے کہ دونوں زبانیں اس قدر علیحدہ اور ایک دوسرے سے دور ہو جائیں کہ ان میں مشارکت کا امکان ہی باقی نہ رہے' رسم الخط تو علیحدہ ہے ہی' الفاظ بھی ۹۹ فیصد علیحدہ ہوں تو پھر اگر آئندہ کی طرف سے ناامیدی ظاہر کی جائے تو کوئی جائے تعجب نہیں۔

اردو سے ان فارسی الفاظ کے نکالنے کی کوشش جو اس کے جسم اور جان میں پیوست ہو گئے ہیں' ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں جو لکھنؤ کی ہندوستانی کانفرنس میں گزشتہ سال ارشاد فرمایا تھا' کہا تھا کہ اردو نے جن فارسی الفاظ کو اپنا لیا ہے ان کو انہیں معنوں میں اور ویسے تلفظ اور املا کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے جن معنوں اور جیسے تلفظ اور املا کے ساتھ اردو میں وہ رائج ہو گئے ہیں۔ مولانا نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً مراد' اصل' مشکور' مصالحہ' مثال' اسی طرح سنسکرت کے الفاظ جس طرح اردو میں یا ہندوستانی میں رائج ہیں' ان کو چھوڑ کر اصلی سنسکرت کے تلفظ کے ساتھ ان کو بولنے کی کوشش کو بھی بالکل بجا طور پر ادبی پاپ قرار دیا ہے۔

ان فارسی الفاظ سے جنہیں ہم فارسی سمجھ کر فارسی میں استعمال کرتے ہیں اہل ایران ان پر چونکتے ہیں اور ہماری ہنسی اڑاتے ہیں۔ یعنی وہ الفاظ فارسی نہیں رہے۔ ہم نے اردو میں ان کو دوسرے معنی دے دیئے ہیں اور اب وہ لفظ بالکل ہمارے ہو گئے ہیں۔ آپ ان کو اپنی زبان سے نکال دیجئے۔ آپ کے ہاں سے

نکل کر وہ لفظ بالکل نکھرے ہو جائیں گے۔ کیونکہ فارسی یا عربی ان معنوں میں انہیں قبول نہ کرے گی۔

مثلاً ان دو لفظوں کو لیجئے جن کو فارسی میں استعمال کرنے میں جب کہ وہ ایران میں سفر کرتے ہیں' اہل ہند ٹھوکر کھاتے ہیں۔

	اصل معنی	اردو میں
تکلیف	فرض' ذمہ داری	زحمت
خفا	گلا گھونٹنا	ناراض ہونا

یہ نہ خیال کیجئے کہ ہم نے الفاظ کے معنی بدل دیئے۔ ایرانیوں نے بھی ایسا کیا ہے۔ مثلاً ناخوشی' ہم اصل معنی "ناراضی" میں استعمال کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے ناخوشی کو بیماری کے معنی دے دیئے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ عرض کروں۔ بغداد میں ایک نوجوان ایرانی جو ہندوستان میں رہ چکے تھے مجھ سے تعریفاً کہنے لگے کہ ہندوستانیوں کے کیریکٹر کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ تکلیف یعنی فرض اور ذمہ داری کو زحمت سمجھتے ہیں اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ "ڈیوٹی" کم ایسا ہوتا ہے کہ آرام کی چیز ہو لیکن اگر کوئی ڈیوٹی کو آرام کی چیز نہ کہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ وہ اس سے گریز کرتا ہے۔ برخلاف اس کے ایرانیوں کے خصائص ملی اور ان کی ہمت و بہادری کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ "تیغ" تلوار کے مفہوم سے گھٹ کے اور اتر کے "استرے" کے معنی میں رہ گیا ہے! ایرانی "استرے" کو شمشیر کے برابر خطرناک ہتھیار سمجھتے ہیں۔

ایک ہی لفظ اردو میں ایک معنی دیتا ہے اور دوسرے زبان میں بالکل دوسرے معنی! اس کی پر لطف مثال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ "ظریف و متین" دو لفظ ہیں۔ "ظریف" ہم اس شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق و خوش طبعی ہو۔ "متین" ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ لیکن ایک ترکی اخبار میں ایک جوتا بیچنے والے کے اشتہارات میں نے دیکھے جو کہتا ہے کہ اس کے جوتے نہایت "ظریف و متین" ہیں! کیا سمجھے آپ؟ بیک وقت یہ جوتے آپ سے مذاق بھی کریں گے اور نہایت متانت سے بھی پیش آئیں گے۔ لیکن اشتہار دینے والے کا یہ مطلب نہیں۔ وہ تو یہ اعلان کر رہا ہے کہ اس کے جوتے "ظریف" یعنی خوبصورت بھی ہیں اور "متین" یعنی مضبوط بھی۔ ایک اور لفظ کا قصہ عرض کروں گا جس میں کوئی مذاق کا پہلو نہیں مگر جس نے ایک موقع پر ایک بیخودی کی کیفیت مجھ پر طاری کر دی۔ "عرصہ" کا لفظ ہماری زبان میں "مدت وقت" کے لئے مستعمل ہے "آپ سے بہت عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔" استنبول میں ایک قطعہ زمین پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا۔ "یہ عرصہ برائے فروخت ہے۔" یہ پڑھتے ہی مجھے داغ کا شعر یاد آگیا اور میں نے مزے لے لے کر اسی مقام پر اسے پڑھا"

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھرو ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

یہ جو عام شکایت کی جاتی ہے کہ آج کل اردو لکھنے والے جان جان کر غیر مانوس اور سخت عربی

فارسی کے الفاظ اپنی تحریروں میں ٹھونستے ہیں اور روزمرہ کے سادہ الفاظ کے استعمال کو اپنے خلاف شان سمجھتے ہیں یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایک زندہ اور ترقی کرنے والی زبان ہمیشہ نئے نئے الفاظ اپنے میں جذب کرتی رہتی ہے۔ اس کو قطعاً روکنے کی کوشش کرنا مضر ہو گا۔ اب یہ مذاق سلیم اور ہندوستانی اکیڈیمی کے احکامات پر موقوف ہے کہ لکھنے والا کون سے لفظ اختیار کرے اور ان کو رواج دینے کی کوشش کرے۔ نان کو آپریشن کے زمانے میں اخبارات اور تقریروں میں "عدم تعاون" اور "مقاومت مجہول" پڑھنے اور سننے میں آتے تھے۔ مقاومت مجہول' لاحول ولا قوۃ! سوائے اس کے Resistance Passive کا ایک بھونڈا سا ترجمہ کر دیا۔ مکھی کی جگہ مکھی مار دی' مگر سننے والا خاک نہیں سمجھا کہ یہ مقاومت مجہول کیا بلا ہے! میں اب بھی کہتا ہوں کہ اگر ذہن میں Passive Resistance کے الفاظ پیشتر سے نہ ہوں تو کوئی عربی داں بھی اس کے وہ معنی نہیں بتا سکتا جس کے لئے مقاومت مجہول گھڑا گیا۔ بہر حال مقاومت مجہول اپنی موت مرگیا۔ مگر عدم تعاون زندہ و قائم ہے۔ اسی طرح مندوب' مبعوث' نمائندہ تین لفظ نکلے۔ یہ اردو میں (Delegate یا Representative) کے معنوں میں نئے لفظ تھے۔ مندوب و مبعوث کا استعمال اس قدر کم ہے کہ بمنزلہ نہ ہونے کے ہے مگر نمائندہ چل پڑا ہے۔ ایکٹنگ کی جگہ "اداکاری" نے لی ہے اور یہ اچھا لفظ ہے۔

یعنی اچھے خاصے لفظ چھوڑ کر' نئے لفظ محض اس لئے کہ وہ شاندار ہیں' اختیار کئے جا رہے ہیں۔ "ناظرین" قریب قریب مرحوم ہے اس کی جگہ "قارئین کرام" نے لی ہے۔ ہیرو کو چھوڑ کر "بطل" کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر شکر ہے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

میں نے ایک اصول قائم کیا ہے' یا یوں کہئے کہ یہ میرا ایک نظریہ ہے۔ عربی کے جو الفاظ فارسی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچتے ہیں اردو انہیں ہضم کر لیتی ہے مگر جو الفاظ براہ راست عربی سے لئے جاتے ہیں' اردو کا معدہ انہیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ فارسی بھی سعدی و حافظ کی نرم و شیریں فارسی' نہ کہ آج کل کی کرخت ایرانی۔ اب تو فارسی کے لئے عربی کے لفظ کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ "بطل" "فکاہات" "شذرات" ہضم نہ ہو سکے۔ اس بات پر غور کرنا بھی دلچسپ ہے کہ نیپال میں شمشیر جنگ' تیغ بہادر' ببر جنگ تو چلا' سیف الملک و ضیغم الدولہ نہ چلا۔

یہ الزام بھی غلط ہے کہ ہندی کے لفظ جان جان کر نکالے جا رہے ہیں۔ سماج (بمعنی سوسائٹی) پرچار' چناؤ' شانتی' جو پہلے استعمال نہ ہوتے تھے' اب مسلمانوں کی تحریروں میں ملتے ہیں' بلکہ میں تو کہہ سکتا ہوں کہ ہندو لکھنے والے فارسی کے مروجہ اور زبان زد خاص و عام الفاظ کے ساتھ زیادہ عدم تعاون برتتے ہیں۔

اور یہ بات کہ مسلمانوں کی اردو میں فارسی الفاظ نسبتاً زیادہ ملتے ہیں اور ہندوؤں کی زبان میں سنسکرت کے قدرتی بات ہے۔ جس لٹریچر اور زبان سے جو شخص زیادہ متاثر ہوا ہے اس کی تحریر و تقریر میں اس کی جھلک پائی جائے گی۔

پارسیوں کی گجراتی' ہندوؤں کی گجراتی سے ایک حد تک مختلف ہوتی ہے۔ پارسیوں کی گجراتی میں فارسی اور اردو کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ "جام جمشید" جو پارسیوں کا مشہور اخبار ہے اور گجراتی میں شائع ہوتا ہے اگر آپ کے سامنے پڑھا جائے تو آپ اس میں بہت سے الفاظ ایسے پائیں گے جنہیں ہم بولتے اور لکھتے ہیں۔ اخبار کا نام ہی فارسی ہے۔ "سانجھ ورتمان" جو ہندوؤں کا کثیر الاشاعت گجراتی زبان کا اخبار ہے اس میں فارسی اور اردو کے الفاظ کم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ باوجودیکہ پارسیوں نے گجراتی زبان اختیار کر لی ہے لیکن ان میں ایک کافی تعداد اب بھی فارسی پڑھتی ہے اور اس کی تحریر و تقریر میں اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح قاضی نذر السلام جو بنگال کے نوجوان شاعروں میں بے حد شہرت و مقبولیت حاصل کر رہا ہے' کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری میں گل و بلبل' زلف و کاکل' ساغر و شراب اور اسی قسم کے اور فارسی الفاظ کثرت سے آتے ہیں۔ صرف دیکھنا یہ چاہئے کہ جان جان کر اور تعصب سے تو الفاظ کا استعمال نہیں کیا جا رہا ہے؟ اگر بے ساختہ زبان پر آتا ہے تو ٹھیک ہے۔

یہ کوشش کہ ہندی سے فارسی کے الفاظ یعنی بدیسی الفاظ خارج کر دیئے جائیں تو نیشنلسٹ شراب کے نشے کا نتیجہ ہے۔ ایران اور ترکی کے قوم پرور بھی اسی نشے سے بدمست ہیں۔ فارسی سے عربی الفاظ کو دیس نکالا مل رہا ہے۔ ترکی میں اس کا زور ہے کہ فارسی اور عربی دونوں کو نکال دو۔ میرا خیال ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں کی یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ شروع شروع میں تو میں نے دیکھا کہ ایسی ترکی لکھی جاتی تھی جس کا سمجھنا ازبس دشوار تھا۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ پھر وہی معمولی ترکی ہے جس میں فارسی کے لفظ بھی ہیں اور عربی کے بھی۔ ہندی کی اس نیشنلسٹ تحریک جدید کا کیا حشر کیا ہو گا۔ اس کے متعلق اس وقت کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ شدت' یہ تعصب قائم نہیں رہے گا۔

اس موقع پر خالدہ خانم ادیب کی رائے کا نقل کر دینا نامناسب نہ ہو گا۔ خالدہ خانم اپنے ملک میں بھی سخت قسم کی نیشنلسٹ ہیں۔ اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد جو کتاب (Inside India) انہوں نے لکھی ہے اور جو ابھی شائع ہوئی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمدردی تمام تر ہندوستان کی نیشنلسٹ تحریک کے ساتھ ہے اور اکثر انہوں نے مسلمانوں کو مورد الزام قرار دیا ہے۔ ان کے خیالات یہ ہیں۔

انہوں نے اپنے کسی مسلمان دوست کے خط کا اقتباس دیا ہے جس میں اس نے لکھا تھا:۔

"آپ کے جانے کے بعد نیشنلزم نے زبان کے معاملے میں مسلمانوں کو سخت ضرب لگائی ہے۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ شمالی ہندوستان کی تمام وہ زبانیں جو بولی جاتی ہیں اپنی ترقی و ارتقاء کے لئے مسلمانوں کی حمایت کی مرہون احسان ہیں لیکن نیشنلزم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمام بدیسی الفاظ قومی زبان سے خارج کر دیئے جائیں اور اسی قومی زبان کا نام "ہندوستانی" قرار دیا جائے۔ اور نیشنلزم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ نہ صرف ٹیکنیکل اصطلاحات کے لئے بلکہ روزمرہ کے الفاظ کے لئے سنسکرت کو منبع و مرجع قرار دیا جائے' وہ سنسکرت جو کبھی ملک میں بولی نہیں گئی۔"

اس اقتباس کے بعد خالدہ خانم اپنی رائے دیتی ہیں۔

"میں اس ملک کی تبع ہوں جو خالص زبان کا حامی ہے اور اس بنا پر مجھے ہندوؤں کا طرفدار ہونا چاہئے تھا۔ مگر میں ان کی طرفدار نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالص زبان میں اسے سمجھتی ہوں جس میں تحریر کی زبان جہاں تک ہوسکے اس زبان سے جو بولی جاتی ہے' قریب لائی جائے۔ ٹیکنیکل اصطلاحات کے بارے میں میں انٹرنیشنل یعنی بین الممالک اتحاد کی قائل ہوں۔"

آگے چل کر وہ فرماتی ہیں:۔

"ہندو جن الفاظ کو (عربی و فارسی کے الفاظ کو) غیر ملکی قرار دیتے ہیں' وہ غیر ملکی نہیں رہے۔ جن لفظوں کا استعمال ایک ہزار برس سے ہو رہا ہے ان کی جڑ کہیں کی ہو' اہل ہند ان سے بمقابلہ غیر مانوس سنسکرت الفاظ کے زیادہ آشنا ہیں۔"

میں ان کے اصل الفاظ آپ کی اجازت سے پڑھ کر سنا دینا چاہتا ہوں۔

(اس موقعہ پر آپ نے کتاب سے انگریزی عبارت پڑھی' جس کا ترجمہ ابھی گزر چکا ہے)

مشترک زبان کا حل میرے نزدیک یہ نہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے جو نہ آج کی سخت اردو ہو اور نہ آج کل کی سخت ہندی۔ کیونکہ جب ایسی ریڈریں تیار کی جاتی ہیں تو دونوں طرف سے ان پر اعتراض شروع ہوتے ہیں۔ اردو والے کہتے ہیں کہ مشترکہ زبان کے پردے میں ہندی کو رواج دیا جارہا ہے۔ ہندی والے کہتے ہیں کہ یہ تو وہی اردو رہی۔ میرے نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہے کہ ہر طالب علم کو اردو اور ہندی دونوں زبانیں سیکھنے پر مجبور کیا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ خود بخود ایک گھلی ملی زبان پیدا ہو جائے گی۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے اردو کے ایم اے کے نصاب میں اسی اصول کو مد نظر رکھ کر ہندی کا ایک لازمی پرچہ بھی رکھا ہے۔ مجھ سے ایک صاحب نے کہا (میں نہیں جانتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے' کیونکہ وہاں کا نصاب میری نظر سے نہیں گزرا) اور اسی کو نظیر قرار دے کر لکھنؤ کے ہندی ایم اے کے نصاب میں اردو کا پرچہ شامل کئے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا' مگر وہ مسترد کر دیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس غلطی کی تلافی ہونی چاہیئے۔

شاید یہ کہا جائے کہ طالب علم پر کتنی زبانیں سیکھنے کا بار ڈالا جائے گا۔ اس کا میرے پاس یہ جواب ہے کہ اردو اور ہندی دو مختلف الاصل زبانیں نہیں ہیں۔ جب جنوبی افریقہ میں ڈچ اور انگریزی اور کنیڈا میں فرنچ اور انگریزی دو یا بالکل جدا جدا زبانیں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو ہندی جو حقیقت میں ایک ہی زبان ہیں کیوں ساتھ ساتھ نہ چل سکیں گی۔

ہندو مصنفین سے میری درخواست ہے کہ وہ ایسی اردو لکھیں جیسی میرے دیرینہ محب مکرم منشی دیا نرائن نگم صاحب' پنڈت کول' پنڈت زتشی لکھتے ہیں۔ مسلمان ایسی لکھیں جیسے سید سلیمان ندوی' مولوی عبدالحق' حسن نظامی' ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں۔ کاش منشی پریم چند جیسے مصنفین ہم میں پیدا ہوں جن کی قادر الکلامی اردو اور ہندی زبانوں پر یکساں تھی اور جنہیں اردو اور ہندی اپنا سب سے بڑا ادیب شمار

کرنے میں مسابقت کر رہی ہیں۔

ایک حد تک یہ مسئلہ فرسودہ ہوگیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے ہندوستانی اکیڈیمی قائم ہوئی ہے اس کے ہر سالانہ جلسے میں' ہر خطبہ صدارت میں اس کے متعلق اظہار کیا گیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو' مسٹر سچیدانند' مولوی عبدالحق' مولانا سید سلیمان ندوی' ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا اکیڈیمی میں اور اکیڈیمی کے باہر بطور قول فیصل کے پنڈت جواہرلال نہرو نہایت قابلیت مگر نہایت ٹھنڈے دل سے اس مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈال چکے ہیں لیکن مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ہمارے مفکرین کی توجہ تمام تر اس کی طرف ہے۔ پھر بھی کوئی معقول حل' ایسا حل جسے عام رائے خوشی سے قبول کرلے نظر نہیں آتا۔ تو پھر اس گتھی کو سلجھانے کا میں کیا دعوی کر سکتا ہوں۔ لیکن اپنی بساط بھر کوشش میں نے بھی کی۔

حضرات! ہندوستانی اکیڈیمی کی علمی اور ادبی خدمات قابل تحسین ہیں۔ اس قلیل عرصے میں اس نے بہت کچھ کیا ہے لیکن کام کی ابتدا ہی ہے اور اس وقت ہی اگر اپنا پروگرام پورے غور و خوض سے متعین کرلیا جائے تو بہتر ہے۔

ہماری زبان کے لئے یہ دور دور ترجمہ ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی ہو کہ انجمن ترقی اردو' ہندوستانی اکیڈیمی ہو کہ کوئی اور جماعت' دوسری زبانوں کے بلندپایہ مصنفین کی کتابوں کے ترجمے سے وہ بے نیاز نہیں۔ یہی نہیں کہ بے نیاز نہیں بلکہ ان کی کوششوں کے بیشتر حصے کا انحصار عمدہ کتابوں کے ترجمے کرانے یا ایسی تالیفات پر ہو جن کا ماخذ کوئی مستند کتاب یا مستند مصنف ہے اور یہ طریقہ عمل صحیح بھی ہے۔ تخلیقی دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے۔ پہلے اپنی زبان کے خزانے ان جواہرات سے بھر لیجئے جو آپ کو آسانی سے مل سکتے ہیں۔ پھر نئی کانوں کی تلاش میں نکلئے گا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ سائنس اور فلسفے کی کتابوں کا ہی ترجمہ کیا جائے۔ بیشک ان کا ترجمہ لابدی اور ضروری ہے مگر دوسری زبانوں کے لٹریچر سے ہمیں بے خبر نہیں رہنا چاہیئے۔ انسانی روح کی تڑپ اور اس تڑپ سے جو سوز و گداز قوموں میں پیدا ہوا ہے وہ ہمیں لٹریچر میں ہی ملتا ہے۔

سید حسین بلگرامی مرحوم نے علی گڑھ میں ایک لکچر کے دوران میں کس قدر صحیح فرمایا تھا کہ عربوں نے یونانیوں کے علوم و فنون' حکمت و فلسفہ' منطق و طب کو اپنی زبان میں منتقل کر کے ان کے دماغ' ان کے گوشت پوست کو لے لیا مگر ان کے لٹریچر سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے یونان کی روح' یونان کے دل تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ یونان کی خشکی اور بلوست تو ان میں آگئی' مگر یونان کی لطافت' حسن و جمالیات کی فرینگی کی اقلیم سے وہ دامن کشاں نکلے چلے گئے۔ اس لئے وہ ایک بڑی نعمت سے محروم رہے۔

یوروپ جب قرون وسطی کے خواب سے بیدار ہوا تو انسانیت پرستی کی لہر اس لٹریچر کے مطالعے سے اس میں دوڑ گئی۔ اس لٹریچر کو اس نے Humanities کے نہایت موزوں نام سے یاد کیا۔ اس لئے میری عرض ہے کہ آپ لٹریچر کے ترجمے کی اہمیت کو معمولی نظر سے نہ دیکھیں اور یونان اور قدیم روما کا لٹریچر ہماری زبان میں منتقل ہونا چاہیئے۔

جس لٹریچر نے بائرن کو یونان کا ایسا عاشق بنا دیا کہ اس نے اس کے لئے اپنی جان دے دی وہ کچھ جادو اپنے اندر رکھتا ہو گا۔ بائرن ہی کیا' انگلستان نے اور یوروپ کے کل شاعروں کل ادیبوں کو اسی لٹریچر سے الہام ہوا ہے۔ ملٹن' کیٹس' شیلی کی شاعری میں یونان و روما کے لٹریچر سے متاثر حصے کو نکال ڈالئے تو پھر کیا رہ جاتا ہے؟ غرض کہ ہومر' ورجل' ہیروڈوٹس' سافوکلس اور دیگر خدایان سخن کی تصانیف ہماری زبان میں براہ راست آنی چاہئیں۔

میں نے براہ راست عمداً کہا۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب میں پڑھتا ہوں کہ روسی و فرانسیسی ادبیات کے شاہکاروں کے ترجمے اردو میں ہو رہے ہیں۔ جب دیکھئے تو مراد یہ ہے کہ میکسم گورکی' ٹالسٹائی' چیخوف' اناطول فرانس کے جو ترجمے انگریزی میں ہوئے ہیں' ان میں سے کچھ کتابیں یا کچھ فسانے اردو میں کئے گئے ہیں۔ یعنی ترجمہ در ترجمہ۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہترین ترجمہ اصل کی خوبیوں کا دھندلا سا نقشہ ہوتا ہے' یہ نقشہ اور بھی دھندلا ہو جاتا ہے جب وہ کسی ترجمہ کا ترجمہ ہو۔ اکیڈیمی کو اس قاعدے کی سختی سے پابندی کرنی چاہئے کہ وہ کسی ترجمے کو قبول نہ کرے جب تک کہ وہ اصل زبان سے اردو میں نہ کیا گیا ہو۔ افسوس ہے کہ اردو میں خود ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لٹریچر کے ترجمے انگریزی سے کئے جاتے ہیں۔
ٹیگور نے اپنی تصانیف کے انگریزی ترجمے خود کئے ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ترجمے نہیں ہیں' اس کی تصنیفیں ہیں' اس لئے ٹیگور کی انگریزی تصانیف سے ترجمہ کرنا جائز ہے لیکن بنکم چندر اور دیگر بنگالی مصنفین کی جو کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں' میرا خیال ہے کہ وہ ان کے انگریزی ترجموں سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ غضب خدا کا! میں نے الف لیلہ کا ایک ترجمہ دیکھا جو انگریزی سے کیا گیا تھا۔ میری التجا ہے سنسکرت لٹریچر کے ترجمے بھی اردو اور سنسکرت کے عالم اردو میں کر کے ہم کو عنایت کریں۔
اردو کے قدیم استادوں کے کلام کو اور بعض جو استاد تھے بھی نہیں' ان کو استاد بنا کر پیش کرنا اور ان کے متعلق تنقیدی مضامین لکھنا اور ان کی یکساں اور گوشہ عزلت کی زندگی' ایسی زندگی جو ہنگامہ اور تلاطم سے دور رہی ہو' جن کے کلام نے تو معاصرین کی زندگی یا آئندہ نسلوں پر کوئی اثر ڈالا ہو تو گویہ بھی بہت مشتبہ ہے مگر جن کی زندگی نے مطلق کوئی اثر نہیں ڈالا' ایسی زندگیوں کے حالات کدوکاوش سے ڈھونڈنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور آپ کے اصرار سے میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ اردو ادب کی خدمت ہے' مگر ہندوستانی اکیڈیمی کا کیا یہی مطمح نظر ہونا چاہئے؟ اس کے رسالے "ہندوستانی" کو مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کے "اردوئے معلی" کا نقش ثانی نہیں ہونا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین زیادہ چھپیں' جیسے مولوی نعیم الرحمن صاحب یا ڈاکٹر صدیقی نے لکھے ہیں۔
حضرات! ہندوستانی اکیڈیمی نے ایک کمیٹی اس غرض سے قائم کی تھی کہ وہ اس مسئلے پر غور کرے کہ ایک مشترک زبان کس طرح عالم وجود میں لائی جا سکتی ہے؟ اس کمیٹی نے ۱۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو اپنا اجلاس منعقد کیا اور اپنی رپوٹ تیار کی۔ اکیڈیمی کی کونسل میں ۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو یہ رپورٹ پیش ہوئی اور کونسل

نے رپورٹ سے اتفاق کرتے ہوئے یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ اکیڈیمی ایک ایسی ڈکشنری شائع کرے جس میں اردو ہندی کے تمام وہ الفاظ ہوں جو روزمرہ کی بول چال میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسے آسان ہندی لفظوں کا ایک لغت فارسی خط میں لکھا جائے اور ان کے ہم معنی ہندوستانی لفظ لکھے جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی میں شامل ہو سکیں۔ میری درخواست اس سے زیادہ ہے۔ ایک مکمل ہندی ڈکشنری فارسی خط میں چھاپی جانی چاہئے۔ ہندی الفاظ کو خطوط وحدانی میں ناگری حروف میں بھی لکھ دیا جائے۔ مگر معنی اور تشریح سب فارسی خط اور ہندوستانی میں ہو۔

حضرات! جب تک آپ لیتھو کے شکنجے سے اپنے اخبارات' اپنی کتابوں کو آزاد نہ کریں گے' میری رائے میں اردو پوری ترقی نہیں کر سکتی۔ آپ لیتھو کے ذریعہ سے کسی کتاب یا کسی اخبار کو لاکھوں کی تعداد میں چھاپ ہی نہیں سکتے۔ چند ہزار کاپیوں کے بعد حرف اڑنے لگتے ہیں۔ علاوہ ازیں کتابت اس سرعت سے نہیں ہو سکتی جس سرعت سے کہ ٹائپ کمپوز کیا جاتا ہے۔ پھر ہر وقت آپ کو یہ آسانی ہے کہ چھپتے چھپتے آپ کسی عبارت کو نکال سکتے ہیں' بڑھا سکتے ہیں' گھٹا سکتے ہیں۔ اخبار کی تیاری اور اشاعت میں اس آسانی کو بڑا دخل ہے۔ اخبار چھپ رہا ہے' آپ کے پاس خبر آئی۔ آپ پریس روک کر' اخبار کے کسی پیراگراف کو نکال کر ورنہ جیسے کہ عام قاعدہ ہے (Stop Press) کی جگہ میں جو پہلے ہی سے اسی غرض سے خالی رکھی جاتی ہے اس خبر کو چھاپ سکتے ہیں۔ کاپیوں کی کتابت کی غلطیوں کے درست کرنے میں جو دیر لگتی ہے یہی اسے مردود و مطرود قرار دینے کے لئے کافی ہے۔
ان تمام آسانیوں اور خوبیوں کی وجہ سے سوائے ہندوستان کے' اور ہندوستان میں بھی سوائے اردو کے کہیں اخبار اور کتابیں لیتھو میں نہیں چھاپی جاتیں۔ ایران' مصر' ترکی' عربستان اور تو اور افغانستان' حجاز ان تمام ممالک نے لیتھو کی چھپائی یک قلم موقوف کر دی۔ ان ملکوں کی تمام کتابیں ٹائپ میں چھپتی ہیں۔
لیکن ہمارا ہندوستان — نے غلط کہا' ہماری اردو ابھی تک پتھر ہی کے زمانے میں ہے' اس سے آگے نہیں بڑھی۔ ہندوستان کی تمام زبانیں بنگالی' مرہٹی' گجراتی' تلگو' ملیالم' کناری اپنے اخبارات اور اپنی کتابیں ٹائپ میں چھاپتی ہیں۔ الا ماشاء اللہ ہماری اردو! سندھی تک جو اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جس میں اردو' اس کے تمام اخبارات اور کتابیں ٹائپ میں چھپتی ہیں۔
سب سے بڑی رکاوٹ جو ٹائپ کے چھاپے کی راہ میں سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو کے پڑھنے والے ٹائپ کے چھاپے کے پڑھنے کے عادی نہیں۔ نہ معلوم یہ دلیل کن صاحب نے ایجاد کی ہے۔ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا کہ ٹائپ کے پڑھنے میں اسے کوئی غیر معمولی دقت محسوس ہو۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال ٹائپ میں شائع کرنا شروع کیا' تو کیا ٹائپ کی وجہ سے اس کی اشاعت' اس کی مقبولیت' اس کی مانگ میں کسی قسم کی کمی آئی وہ ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ بکا اور اب بھی آنکھیں اسے ڈھونڈتی ہیں؟ اور مثل گفتہ سعدی "مشک کاغذ زری برند۔"

انجمن ترقی اردو کا رسالہ "اردو" یا رسالہ "سائنس" یا ہمارا "ہندوستانی"۔ اس وجہ سے کم فروخت نہیں ہوتا کہ وہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ ان رسالوں کی اشاعت محض اس وجہ سے محدود ہے کہ پبلک ابھی علمی رسالوں کی قدر ہی نہیں کرتی۔

مولانا محمد علی مرحوم نے "ہمدرد" ٹائپ میں نکالا' وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لوگ ایڈیٹر کی شخصیت اور مضامین کی دلکشی و دلچسپی کو دیکھتے ہیں۔ ٹائپ و لیتھو کو نہیں دیکھتے۔ جب اس وجہ سے مجبور ہو کر کہ کافی ٹائپ ان کے پاس موجود نہ تھا مرحوم مولانا نے "ہمدرد" لیتھو میں چھاپنا شروع کیا تو خریداروں کی تعداد میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوا۔

گورنمنٹ گزٹ' سرکاری رپورٹیں اور اعلانات ٹائپ میں شائع ہوتے ہیں' یہاں تک کہ سمن اور سفینے' گاؤں والوں اور کم پڑھے لکھے آدمیوں تک کے پاس ٹائپ کے چھپے ہی جاتے ہیں۔ لوگ انہیں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے عادی کر دیئے گئے ہیں۔

لیتھو کے طرفدار اور اس کے شیدائی اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ اردو نستعلیق میں لکھی جاتی ہے اور نستعلیق لیتھو ہی میں چھپ سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اچھا نستعلیق ٹائپ ابھی نہیں بن سکا ہے اور میرا خیال ہے کہ بن سکتا نہیں۔ اس کے دائرے' اس کی نوک پلک اتنے جوڑ توڑ مانگتے ہیں کہ ان کو ٹائپ میں ڈھالنا اور ان ٹکڑوں کو محدود تعداد میں رکھنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ حامیان لیتھو کہتے ہیں کہ جب نستعلیق کا اچھا ٹائپ نہیں بن سکتا تو لامحالا اردو نسخ میں چھاپی جائے گی اور خوبصورت اور دیدہ زیب نستعلیق جس میں ہندوستانی نے اتنی ترقی کی ہے یک قلم معدوم ہو جائے گا۔

یہ اعتراض صحیح ہے مگر فن خطاطی و خوشنویسی جو بجائے خود ایک فن لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت ہندوستان و ایران میں حاصل کر چکا تھا وہ کب کا رخصت ہو چکا! لیتھو نے اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ یہ خیال غلط ہے کہ لیتھو سے خطاطی اور خوشنویسی قائم ہے۔ نستعلیق کی ایک بگڑی ہوئی شکل اب بھی موجود ہے۔ بس اتنا ہے کہ خوشنویس یہ چاہتا ہے کہ اس کا خط صاف پڑھا جا سکے۔ روزانہ اخباروں کی اشاعت' کاتب سے جلد جلد لکھنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایسی حالت میں مطبع کا خوشنویس ان مشہور خوشنویسوں کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے جو ایک ایک وصلی' ایک ایک قطعہ لکھنے میں مہینوں لگا دیتے تھے اور جو اپنی انگلیاں نرم کرنے کے لئے ہفتوں ہاتھوں پر حلوہ باندھتے تھے۔ اب تو "کاتا اور لے دوڑی" پر عمل ہے۔ علاوہ ازیں نستعلیق اپنی جگہ خوشنما ہے مگر نسخ' اچھا نسخ کچھ کم دلربا نہیں۔ نسخ قدرتاً ٹائپ میں اچھا ڈھل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک نے بھی جو نستعلیق استعمال کرتے تھے نسخ کو اختیار کر لیا۔ ایران میں تو نستعلیق پیدا ہی ہوا' وہاں کے خطاط نستعلیق کے لکھنے میں جو کمال دکھا چکے ہیں وہ ہندوستان کے بہت کم خوشنویسوں کو نصیب ہوا۔ اور اب بھی اس فن کے ماہر وہاں ملتے ہیں۔ بااین ہمہ ایران نے نستعلیق کو چھوڑ کر اپنی کتابیں' اپنے اخبارات تمام تر ٹائپ میں چھاپنے شروع کر دیئے ہیں۔ ایران کے بعد افغانستان کو دیکھئے۔ یہ قدامت پسند ملک بھی طباعت میں جدت طراز و جدت آشنا ہے۔ وہاں بھی کتابیں اور رسالے نسخ ٹائپ ہی میں شائع ہوتے

ہیں۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہاں کا مشہور رسالہ مجلّہ "کابل" عمدہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔

ترکی نے ٹائپ سب سے پہلے قبول کیا تھا اور وہاں کا نسخ ٹائپ میری رائے میں تمام دوسرے ممالک کے ٹائپوں سے خوبصورت و خوشنما اور فن کے لحاظ سے مکمل تھا۔ ترکوں کا مذاق لطیف تر ہے۔ حسن و زیبائی کا احساس (Aesthetic Sense) ہم سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اسی لئے ان کا ٹائپ بھی خوبصورت تھا۔ ہائے "استنبول" کے حسین ٹائپ کے وہ حسین حروف نہ معلوم اب کیا ہو گئے ہوں گے؟ غالباً ان کا سیسہ گلا کے رومن حروف ڈھال لئے ہوں گے! کاش وہ خرید کر یہاں منگا لیا جاتا۔ مجھے حیرت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سے صحیح المذاق آدمی نے "الہلال" اسی ٹائپ میں چھاپا جو عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے۔ وہ استنبول یا مصر کا ٹائپ منگا سکتے تھے۔

ہمارا ٹائپ سب سے بدتر اور گرا ہوا ہے۔ اگر یہاں کے لوگ اس ٹائپ کو دیکھ کر ٹائپ کے چھاپے کو ناپسند کریں اور لیتھو کو ترجیح دیں تو کوئی تعجب نہیں۔ رسالوں میں اب تصویروں کا رواج ہو چلا ہے مگر ہوتا کیا ہے کہ علیحدہ اوراق پر تصاویر بلاک سے چھاپی جاتی ہیں اور ان کے نیچے عبارت ٹائپ میں ہوتی ہے اور وہ رسالے کے اندر مختلف اوراق کے درمیان لگا دی جاتی ہیں۔ کسی صفحے پر جس پر لیتھو کی چھپی عبارت ہو' عمدہ بلاک کی تصویر نہیں ہو سکتی۔

یہ کوشش بے سود ہے کہ عمدہ نستعلیق ٹائپ ایجاد ہو۔ سالہا سال سے "حیدر آباد" وغیرہ میں اس پر روپیہ اور وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔ وہ محنت اگر نسخ کے ٹائپ کے رواج پر کی جاتی تو بار آور ہوتی۔

مولانا سلیمان ندوی سے مجھے شکایت ہے کہ "معارف" اور دارالمصنفین کی کتابیں وہ ٹائپ میں کیوں نہیں چھاپتے۔ اس تحریک کا سردار ان کو ہونا چاہئے۔ "جامعہ ملیہ" دہلی کے مطبع میں جو ٹائپ ہے میری رائے میں وہ اس ٹائپ سے جس میں کہ "اکیڈیمی" کی مطبوعات اس وقت چھپ رہی ہیں' بہت بہتر ہے۔ میرے خیال میں اکیڈیمی کا رسالہ اور تمام کتابیں اس ٹائپ میں چھپنی چاہئیں۔

حضرات! ایک چیز جو بظاہر حقیقت ہے آپ کی توجہ کی مستحق ہے۔ ہماری مطبوعہ کتابوں میں اعراب زبر زیر پیش کا استعمال زیادہ ہونا چاہئے۔ ہمارے رسم الخط پر یہ الزام ہے کہ اس پر جو عبارت لکھی جاتی ہے اس کے صحیح پڑھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والا عبارت کے الفاظ کے صحیح تلفظ سے پہلے سے واقف ہو ورنہ مُلکٌ کو وہ مُلکٌ' مِلکٌ اور مَلکٌ پڑھ سکتا ہے۔ اعتراض بالکل صحیح ہے اور اسی کے رفع کرنے کے لئے اعراب ایجاد کیا گیا۔ مگر ہم نے اس ضروری چیز کا استعمال بالکل چھوڑ رکھا ہے اور اس کی وجہ سے اچھے پڑھے لکھے آدمی عبارت کے پڑھنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ لفظ کے ہر حرف پر قرآن کریم کی آیتوں کی طرح اعراب لگائے جائیں۔ نہ اس کی ضرورت' نہ اس کی مہلت ہے۔ مگر ان حرفوں پر لگا دینے سے جنہیں تلفظ کی کنجی کہنا چاہئے عبارت کے صحیح پڑھنے میں بہت مدد ملے گی۔ مثلاً یہ فقرہ لیجئے "مولانا عبدالحق نے فرمایا۔" اس میں "مولانا" پر کسی اعراب کی ضرورت نہیں۔ "عبدالحق" "ع" پر زبر اور "د" پر پیش اور "ح" پر زبر کافی ہے یعنی تیرہ حروف کے فقرے میں صرف تین پر اعراب لگانے کی

ضرورت ہے۔ مثلاً "ہندوستانی" کی کتابوں کے اشتہارات میں چھپتا ہے۔ "سول ایجنٹ کتابستان یہ "Sole اور Civil بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اب اگر "و" پر ساکن کی علامت لگا دی جائے تو سول سول نہیں پڑھا جائے گا۔

حضرات! ایک اور خیال میں نے بارہا آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ جب اکیڈیمی قائم ہوئی اس کی ابتدا ہی میں یعنی ۹ دسمبر ۱۹۳۸ء کو میں نے ایک ریزولیوشن رومن حروف کے رواج دینے کے متعلق پیش کیا تھا۔ پھر گذشتہ سال لکھنؤ میں ہندوستانی اکیڈیمی کے اردو سیکشن میں اس کے متعلق ایک مقالہ پڑھا۔ اب پھر آپ کو بہکانے اور آپ کے درد سر کا باعث ہونے کے لئے میں اسی راگ کو الاپتا ہوں۔

لیکن اس مرتبہ میری ہمت بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کی اس عظیم الشان جماعت کے صدر نے (جس کے ہاتھ میں اس ملک کے سات صوبوں کی حکومت کی باگ ہے) "ہری پورہ کانگریس" کے پلیٹ فارم سے اس مسئلے پر اظہار خیال فرما کر اس کی اہمیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ "مسٹر سبھاس بوس رومن حروف کے رواج کے حامی ہیں۔" یہ آواز تمام ملک میں گونج رہی ہے۔ اس مسئلے پر جو اور آوازیں کمزور آوازیں کمزور آدمیوں کی طرف سے اٹھتی تھیں ان کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن جب ایک بڑے گرجا کے بڑے آرگن کی پر عظمت آواز سے وہی لے نکل رہی ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ عقیدت اور احترام سے سنی جائے گی۔

میں نے جو پار سال کہا تھا وہی اب بھی کہہ سکتا ہوں۔ صرف الفاظ بدل سکتا ہوں۔ اس لئے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جو مقالہ میں نے پار سال پڑھا تھا اس کو بطور ضمیمے یا تتمے کے اس خطبے کے ساتھ شامل کر دوں۔

لیکن نہایت مختصر طور سے یہ عرض کردوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ "ترکی" کی طرح قانوناً "ہندوستانی" کا فارسی حروف یا ناگری حروف میں لکھنا بند کر دیا جائے اور ہر شخص مجبور کیا جائے کہ وہ "رومن" میں لکھے۔ نہیں! میری عرض یہ ہے کہ موجودہ فارسی خط اور ناگری خط جاری رہے مگر ساتھ ہی اس کے "رومن" کو بھی رواج دینے کی کوشش کی جائے اور اردو ہندی کی کتابیں اور اخبارات ان حروف میں بھی چھاپے جائیں تاکہ ملک کے اس طبقے تک جو ہندوستانی زبان بولتا اور سمجھتا ہے مگر بہ سبب اس کے کہ فارسی رسم الخط یا ناگری رسم الخط سے نابلد ہے اسے پڑھ نہیں سکتا ہمارے لٹریچر کی رسائی ہو سکے۔

خاتمہ کلام پر میں اردو اور ہندی کے ہمہ گیر اثر کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ وہ زبان جسے اردو کہئے یا ہندی یا صلح جویانہ طریقے سے ہندوستانی اس ملک کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی ہے اور چھاپی جاتی ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں زبان کا بھی فیڈریشن (Federation) ہو گا اور یہ دو فیڈریشن ہوں گے۔ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد اردو کے فیڈریشن میں شامل ہوں گے۔ یہاں اردو حاکم اعلیٰ ہو گی۔ مقامی حکومت خود اختیاری پنجاب میں پنجابی کو، سندھ میں سندھی کو، صوبہ سرحد میں پشتو کو دی جائے گی۔ بلوچستان کے متعلق میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ آیا وہ

اس فیڈریشن میں شامل ہو گا یا نہیں۔

دوسرا ہندی کا فیڈریشن ہو گا۔ اس میں ممالک متوسط، مہاراشٹر، بمبئی شامل ہوں گے۔ ہمارا صوبہ اور بہار ہندی کے فیڈریشن میں ہو گا۔ مگر اردو کا فیڈریشن یہاں حملہ آور رہے گا۔ اور ممکن ہے لسانی طوائف الملوکی Linguistic Anarchy رہے۔ جس طرح بلوچستان کے متعلق میں کوئی رائے نہیں دے سکتا بنگال کے متعلق بھی میں نے کوئی رائے قائم نہیں کی۔ بلوچستان کا اردو کے فیڈریشن میں شامل ہونا اس لئے مشتبہ ہے کہ وہاں زبان ولسان کے بارے میں کوئی احساس، کوئی بیداری نہیں۔

بنگال کی حالت اس کے بالکل خلاف ہے۔ وہاں خود داری کا احساس اس قدر تیز ہے کہ بنگال ہندی کے فیڈریشن میں شامل ہونا اپنی کسر شان سمجھے گا۔

جنوبی ہند ان دونوں فیڈریشنوں سے کلیتاً آزاد رہے گا۔ مسٹر گوپال آچاریہ جنوبی ہند میں ہندی کی ترویج کی کوشش کر رہے ہیں مگر "اینٹی ہندی کانفرنس" کے قیام نے انھیں ثابت کر دیا ہو گا کہ وہ جنوبی ہند میں ہندی کو رواج نہیں دے سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو ہندو مذہب کی وجہ سے ہندو معاشرت کا اثر وہاں حاوی ہے اور سنسکرت لٹریچر وہاں عقیدت اور شوق سے پڑھا جاتا ہے لیکن چونکہ وہاں کی زبانیں دراوڑی ہیں وہ اپنے کو ہندی سے بالکل علیحدہ اور دور پاتی ہیں۔ رسم الخط الفاظ، گرامر ہر چیز علیحدہ ہے۔

صوبہ سرحد کے اس بدنام "اینٹی ہندی سرکلر" ہی کو لیجئے جس کی وجہ سے اخبارات کے سینکڑوں کالم سیاہ ہوئے اور سینکڑوں پروٹسٹ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ نتیجہ کیا ہوا؟ سرحد میں نہ ہندی رہی نہ اردو وہاں کی اسمبلی کے ایک نیشنلسٹ ممبر نے یہ ریزولیوشن اسمبلی میں پیش کر دیا ہے کہ وہاں کی مادری زبان پشتو ہے لہٰذا وہاں ذریعہ تعلیم پشتو ہی ہو۔

میں نے جو یہ کہا کہ صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ میں غالباً اردو کامیاب ہو گی یہ اس بناء پر کہا کہ وہاں کے باشندے (میں اکثریت کا ذکر کر رہا ہوں) جس رسم الخط میں اپنی اپنی زبان پڑھتے لکھتے ہیں وہ وہی رسم الخط ہے جس میں اردو لکھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زبانوں میں فارسی عربی الفاظ اسی نسبت سے شامل ہیں جس نسبت سے اردو میں۔ اس لئے وہ اردو کو بمقابلہ ہندی کے اپنی زبان کے قریب تر پائیں گے۔ اسی بنا پر صوبہ متوسط برار، بمبئی، مہاراشٹر کے لوگ ہندی کو اپنی زبان کے قریب تر پائیں گے۔

غرض کہ ہر جگہ جہاں ہندی کامیاب ہو گی وہاں سمجھنا چاہئے کہ اردو بھی کامیاب ہو گی۔ اسی طرح جہاں اردو نے گھر کر لیا وہاں ہندی بھی داخل ہو گی۔ مدراس کا رہنے والا جو تیلگو یا کناری یا ملیالم بولتا ہے جب ہندی بولنے اور پڑھنے لگے گا تو کیا وہ اردو نہیں سمجھے گا۔

میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن میں نے سوچا کہ جب آپ نے موقع دیا ہے تو کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔ پھر ایسا موقع ہاتھ آئے نہ آئے، دل کی بھڑاس تو نکال لوں۔

امیر جمع ہیں احباب، درد دل کہہ دے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

اردو ہندی کے لئے رومن حروف کا استعمال

یہ مسئلہ ہندوستانی اکیڈیمی کے سامنے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا جارہا ہے۔ اس سے قبل بھی ۱۹۲۵ء میں میں نے اکیڈیمی کی کونسل میں ایک ریزولیشن پیش کیا تھا کہ اکیڈیمی کی مطبوعات اردو ہندی کے علاوہ رومن حروف میں بھی چھاپی جایا کریں۔ اکیڈیمی نے اس وقت اس تجویز کو مسترد کردیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ مسئلہ دوسرے مقامات پر باا ثر شخصیتوں کی طرف سے اٹھایا گیا اور پریس میں اور لیکچروں اور مقالات کے ذریعے پبلک کے سامنے کافی نمایاں شکل میں آیا۔

ایک عرصہ تک الہ آباد کے مقتدر اخبار "لیڈر" میں یہ بحث چھڑی رہی اور پروفیسر شیشادری نے قابلیت کے ساتھ اور عالمانہ طریقہ سے اس کی حمایت میں مضامین لکھے۔ غالباً شانتی نکیتن میں بھی اس کی تائید میں ایک مضمون پڑھا گیا۔ گو وہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ اور سب سے آخر میں جواہرلال نہرو کی سی محترم اور ہردل عزیز ہستی نے بھی اپنی سوانح عمری میں اسی پر اظہار خیال فرما کر اس کی اہمیت کو دوبالا کردیا۔

اس وقت کہ یہ مسئلہ اکیڈیمی کی کونسل کے حضور ایک کم سواد شخص کی طرف سے پیش ہوا تھا اس کی ہنسی اڑائی گئی تھی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ شاید اب کے یہ کانفرنس اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائے۔

میں ابتدائی ہی میں یہ عرض کردوں کہ میں انتہا پسند مسلک کا پیرو نہیں اور شاید اسی وجہ سے میں ازیں سو رانده و زاں سو درمانده ہوں۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ عربی اور دیوناگری حروف کا استعمال بالکل ترک کردیا جائے اور بہ جبر رومن حروف کو رواج دیا جائے تو غالباً لوگ بھڑکتے اور شدت سے میری مخالفت کی جاتی اور جیسا کہ مخالفت کا اکثر نتیجہ ہوا کرتا ہے' چند شدید حمایت کرنے والے بھی مجھے مل جاتے۔ پہلی مرتبہ بھی میں نے صاف طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ عربی اور دیوناگری حروف میں کتابیں چھاپنا یک قلم موقوف کردیا جائے اور اب بھی یہی کہتا ہوں۔

اور صاف تو یوں ہے کہ ہمارے ملک میں خوش قسمتی سے یہ ممکن بھی نہیں۔ یہ باتیں تو وہیں ہو سکتی ہیں جہاں "ڈکٹیٹر شپ" ہے جہاں کسی امیر مطلق کا حکم چلتا ہے۔ ٹرکی اور سوویٹ روس میں اس قسم کا احکام نافذ کئے جاسکتے ہیں اور کئے گئے ہیں۔ کم سے کم میں تو اس قسم کی "ڈکٹیٹر شپ" کا ہندوستان کے لئے آرزومند نہیں۔ رسم الخط کی جنگ ان صوبہ جات میں کم و بیش تیس پینتیس سال سے جاری ہے۔ رسم الخط کے ساتھ زبان کی جنگ بھی ہے۔ مگر یہ عربی حروف اور دیوناگری حروف اور اردو زبان اور ہندی زبان کی جنگ تھی۔ میدان میں ایک چھوٹا سا بچیت اور کود پڑا ہے اور وہ رومن رسم الخط ہے۔ یہ توقع کرنا کہ عربی اور دیوناگری حروف ہندوستان سے اٹھ جائیں گے یا اس کی کوشش کرنا قطعاً بے سود ہے۔ دو بڑی قوموں کی معاشرت' تہذیب و تمدن' تاریخ و روایت کے یہ حروف حامل ہیں۔ جن قوموں کے پاس ایسی عظیم الشان ایسی روشن تاریخ و روایت نہ ہوں' ایسا مالا مال لٹریچر نہ ہو' وہ آسانی سے زبان چھوڑ سکتی ہیں' رسم الخط

چھوڑ سکتی ہیں' اپنی معاشرت چھوڑ سکتی ہیں۔ صحرائے افریقہ کے زولو اور بانٹو کو جو حروف چاہئے سکھا دیجئے۔ جو زبان چاہئے' اس کی زبان قرار دے دیجئے۔ گو وہ بھی بخوشی اپنی زبان چھوڑنے پر تیار نہ ہوگا۔ لیکن ہم کیسے چھوڑ دیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک قرآن کریم عربی حروف میں اور وید مقدس دیوناگری حروف میں محفوظ ہیں' کسی گوشہ دماغ میں بھی اس خیال کا گذر نہیں ہو سکتا۔ دیوناگری اور عربی حروف قدیم تہذیب و تمدن کی یادگار ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر انسانی ارتقا کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وہ انسانی آواز کو مقید اور ظاہر کرنے کے ایسے ہی عجیب اور مکمل طریقے ہیں جیسا کہ رومن حروف! مکمل اور بے عیب رسم الخط نہ عربی حروف ہیں نہ دیوناگری اور نہ رومن۔ ان تینوں میں ان کی مخصوص خوبیاں اور مخصوص عیب ہیں۔

ناگری رسم الخط' بشرطیکہ تمام ماتروں کے ساتھ لکھا جائے آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پڑھنے والا تحریر شدہ لفظ کو پہلے سے جانتا ہو تو صحیح پڑھ سکے۔ مگر وہ بہت دیر میں لکھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے عربی رسم الخط مختصر نویسی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مختصر نویسی اس وقت سے صدیوں پہلے ایجاد ہوئی جب کہ پٹ مین Pitman کے دماغ میں "شارٹ ہینڈ" کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اس کے الفاظ کو صحیح پڑھنے کے لئے ان الفاظ کا تلفظ پہلے سے جاننا ضروری ہے۔ اعراب اس عیب کو دور کردیتے ہیں' مگر اعراب سے اس خط کی زود نویسی میں فرق آجاتا ہے۔ ان دونوں رسم الخطوں کی قصیدہ خوانی کے بعد بھی اگر میں رومن رسم الخط کی حمایت کرتا ہوں تو کیوں؟ اس لئے کہ موجودہ حالات میں ہندوستانی زبان کی ترویج کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

اسلام جہاں گیا' اپنے حروف ساتھ لیتا گیا۔ جس ملک کو اس نے فتح کیا یا جہاں وہ پھیلا وہاں کی زبان پر اس نے گہرا اثر ڈالا۔ بعض ملکوں نے تو اسلام کے ساتھ عربی زبان کو بھی اختیار کرلیا جیسے کہ مصر اور شمالی افریقہ۔ اکثر نے حروف ضرور لے لئے ایران' افغانستان' سندھ' بلوچستان' کردستان' ترکستان اور غالباً جاوا' ساترا وہ ممالک ہیں جنہوں نے اپنی زبان تو نہ چھوڑی لیکن مذہب کے ساتھ عربی رسم الخط کو اختیار کرلیا۔ شائد چین ہی وہ ملک ہے جہاں عربی رسم الخط نے وہاں کے مسلمانوں میں رواج نہ پایا۔

ہندوستان کی آرین قوم نے اپنے مفتوحہ ممالک نیز ان میں جو ان کے زیر اثر آئے اپنے رسم الخط کو منوالیا۔ اس براعظم کے مختلف صوبوں میں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک اقلیم ہے' رسم الخط دیوناگری' اس کی ترمیم شدہ شکل کا ایک رسم الخط ہو گیا۔ جنوبی ہند کی زبانوں' لٹریچر اور مختلف رسم الخطوں نے بھی اس قوی اثر کو محسوس اور قبول کیا۔ تیلگو اور کناری خطوں نے اپنی اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھی۔ لیکن دیوناگری رسم الخط کا اثر ان میں بھی نمایاں ہے۔

اب اس وقت ایک اور رسم الخط کا ہمہ گیر اثر تمام براعظم ہند پر طاری ہے۔ یہ رسم الخط' رومن رسم الخط ہے۔ بنگالی' سندھی' پشتو' تلنگی' کناری' گجراتی' مرہٹی بولنے والا اپنی زبان اپنے حروف میں پڑھتا ہے لیکن اس کا تعلیم یافتہ طبقہ روز افزوں تعداد میں رومن حروف سے لامحالہ واقفیت پیدا کرتا ہے۔ ہندوستانی زبان کی رسائی اس طبقے تک' رومن حروف کے واسطے سے نہایت آسان ہوگی۔ بمبئی کے پارسی

اور اس پریذیڈنسی کے اور شہروں کے رہنے والے' کلکتے اور بنگال کے بڑے شہروں کے باشندے ہندوستانی زبان سے' جس طرح کہ وہ عام طور پر بولی جاتی ہے عموماً واقف ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندی بھجن اور ٹھمریاں اور غزلیں ہندوستانی زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچاتی ہیں مگر بمبئی اور بنگال اور دوسرے صوبوں کے ہندوستانی سمجھنے والے لوگ دیوناگری یا عربی رسم الخط نہیں جانتے اور اس لئے عموماً اردو ہندی کے اخبار اور کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ انگریزی دانی کے "عالم شمول" اثر کی وجہ سے انھیں رومن حروف سے عموماً واقفیت ہوتی ہے۔ ان سے یہ توقع کرنا تو زیادتی ہوگی کہ وہ عربی یا دیوناگری حروف سیکھیں لیکن اگر رومن حروف میں کتابیں چھپی ہوں تو بلا کسی محنت و مشقت کے انہیں پڑھ سکیں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریز ہندوستانی زبان اور اس کے لڑیچر سے اچھی طرح شناسا تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض ذہین اور طباع حضرات تو شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے' چنانچہ اردو کے تذکروں میں ایسے یورپین حضرات کے نام بھی ملتے ہیں جو اردو میں اچھی نظم و نثر لکھنے پر قادر تھے۔ لیکن غدر کے بعد سے جو ہندوستانیوں سے خلا ملا کی پالیسی یک قلم موقوف کردی گئی اور رعایا پر رعب اور سفید نسل کی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کے لئے ان سے کامل علیحدگی اختیار کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبان اور لٹریچر کا پڑھنا انگریزوں میں کم ہو گیا۔ گو اس ملک میں رہنے کی وجہ سے زندگی کی ضروریات نہیں۔ مجبور کرتی ہیں کہ وہ اہل ملک کی زبان نوکروں کے ذریعہ سے ہی سیکھیں۔ اس طبقے کے لئے بھی ہندوستانی کتابوں کا رومن میں چھپنا مفید ہوگا۔

رومن حروف کا رواج بغیر کسی باقاعدہ ریزولیشن کے پاس کرنے کے' پہلے ہی سے ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں عیسائی مشنریوں کی مساعی بہت مشکور ہیں۔ وہ انجیل مقدس اور کلیسا کے بھجنوں کی کتابیں رومن حروف میں بھی چھاپتے ہیں۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی رومن حروف سیکھتے ہیں اور فوجی احکام اور پریڈ کے قواعد ان حروف میں پڑھتے ہیں۔

ہندوستانی اکیڈیمی کی ابتدائے تاسیس سے اس وقت تک اچھی اچھی تصانیف اکیڈیمی کی طرف سے اردو اور ہندی میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب تو ایسی ہے جو تنہا اپنی ذات سے 'اکیڈیمی کے وجود کا بہترین ثمرہ ہے۔ میرا اشارہ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" کی طرف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی کے مطالعہ سے گذرے اور میری آرزو تو یہ ہے کہ وہ مصنف کے الفاظ میں ہی زیادہ تعداد میں پڑھی جائے' اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس کا ایک رومن ایڈیشن بھی چھاپا جائے۔

عربی رسم الخط کی ترمیم کے لئے بہت سی کوششیں کی جا رہی ہیں اور بہت سی کی جا چکی ہیں۔ وہ کوششیں مستحسن ہیں جو اس کی اصلی ہیئت کو مسخ کئے بغیر اسے آسان کردیں۔ ان سب کوششوں میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش پنجاب میں ڈاکٹر ہالرائیڈ اور ان کے رفقاء کی ہے جنھوں نے ایسی اچھی ترمیمیں کیں کہ وہ پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے ذریعہ پنجاب میں اور وہاں سے بغیر کسی خاص جدوجہد کے تمام ہندوستان میں رائج ہو گئیں۔

مثلاً نون غنہ کو بغیر نقطے کے لکھنا' ہائے مخلوط چھا' جھا دو چشمی (ھ) سے لکھنا' تھے تھی کے فرق کو ے' ی سے ظاہر کرنا وغیرہ۔

مگر بعض تجویزوں میں ایسی اپچ کی جاتی ہے کہ بالکل ایک نئی ابجد ایجاد کرنے کے مساوی ہوتی ہے۔ مثلاً حال میں مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب کی ایک تجویز پڑھی' جس میں وہ رومن حروف کو اختیار کرتے ہیں اور ان پر عربی اعراب لگاتے ہیں! میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کونسی خاص آسانی پیدا ہوئی؟ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ رومن حروف معہ اپنے Consonants اور Vowels کے لے لئے جائیں اور ان میں نہایت جزئی ترمیمیں کردی جائیں۔

چنانچہ ترکوں نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے ہم آواز حروف میں سے صرف ایک حرف رکھ لیا ہی۔ باقی کو خارج کر دیا۔ مثلاً V اور W میں ایسا باریک فرق ہے کہ ہم لوگ اسے ادا نہیں کر سکتے۔ ترکوں نے "و" کے لئے "v" لے لیا اور "w" کو ترک کر دیا۔ اسی طرح "ch" مل کر جو کہیں "چ" کہیں "ش" کی آواز دیتے ہیں۔ انھوں نے "c" کے نیچے ایک کاما لگا کر اسے "چ" قرار دے دیا وغیرہ۔

میرے خیال میں اردو ہندی کے لئے Hunterian SYSTEM بہت کافی ہے اور زیادہ ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہیں ورنہ

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کا معاملہ ہو جائے گا۔

۲— زرد گلاب کی بیل

"بارودخانہ۔ مولہ گنج۔ عجیب و غریب پتہ ہے۔ السلام علیکم ممانی جان۔ دونوں بڑی اور چھوٹی۔" بھائی سلطان حیدر باہر سے کڑکے۔ خادم حسین نے باورچی خانے میں سر نکال کر کہا آہا سلطان میاں۔! تیری آواز مکے اور مدینے!" سلطان بھائی نے پہلے اپنی چندنیا لب سڑک برآمدے کے کنارے پر رکھی۔ بستر ابکسا اندر کو سرکایا پھر اچک کر خود چڑھے۔ سیڑھی کیوں استعمال کرتے۔ چھوٹی چچی جان فوراً خوش خوش کمرے سے نکلیں۔ بھائی اور رشید بھائی یونیورسٹی جا چکے تھے۔ خادم حسین کھانا پکا رہے تھے۔ اماں تلاش مکان میں بادشاہ باغ گئی ہوئی تھیں۔

جب اماں جون ۴۷ء میں اسٹرائیک کرکے دہرہ دون سے لاہور چلی گئی تھیں ابا جان نے مجھے علی گڑھ پہنچایا تھا۔ جولائی میں بھائی مسوری سے اتر کر سیدھے لکھنؤ آگئے تھے جہاں ان کے اور چچا وحید کے فرزند اصغر رشید حیدر کے لئے بارودخانے میں ایک مکان کرائے پر لیا گیا تھا۔ دونوں بھائی یونیورسٹی میں داخل ہو چکے تھے۔ مکان پر چچا وحید کے پرانے ملازم خادم حسین گویا میجرڈومو تھے۔ مزید دیکھ بھال کے لئے چھوٹی چچی جان ہر ہفتے "بائی کار" اناؤ سے آتی رہتی تھیں جہاں چھوٹے چچا جان کا شاہجہان پور سے تبادلہ ہو چکا تھا۔

ابا جان قیصر باغ میں راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں مقیم تھے۔ شروع اکتوبر میں لاہور سے آن کر اماں ماموں ابراہیم خاں کے ہاں لالکرتی میں ٹھہریں۔ پھر بشیر خاں کے ہمراہ ٹرین سے دہرہ دون گئیں۔ آشیانے کے گوداموں سے فرنیچر نکلوا کر لکھنؤ کے لئے بک کرایا۔ واپس آ کر افضل خالو کی علالت کی اطلاع پر دوبارہ لاہور گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد لکھنؤ لوٹ کر بارود خانہ میں اتریں۔ اب بشیر خاں ان کو کوٹھی کی تلاش میں روزانہ بادشاہ باغ کے علاقے میں گھمارہے تھے۔

تیسرے پہر کو گھر آئیں اور کہا' "مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہابو ہو گئی۔ آج جا کے ایک کاٹج ملی ہے۔"

سلطان بھائی بولے "" ممانی جان۔ آپ کو تو راجہ صاحب نے کوٹھی دی ہو گی۔ سن چودہ میں ان کے باپ نے دی تھی ہلٹن لین میں۔"

"دی ہے۔ جھال پال۔ پندرہ کمرے۔ بنارسی باغ سے آگے۔ یونیورسٹی سے بارہ پتھر پاہر۔ بچہ روز سائیکل پر اتنی دور آیا جایا کرے گا؟ ہل ہو جائے گا۔ میں تو نہیں رہتی جنگل بیاباں میں جا کے۔ میاں میں تو دہرہ دون میں بھی آشیانہ چھوڑ کر کرائے کی کوٹھیوں میں رہتی پھری' اسی مارے کہ بچے کے کالج کے قریب رہوں۔"

نمبرا راۓ بہاری لال روڈ۔ تقریباً لب سڑک۔ مختصر سا برآمدہ۔ چھ سات کمرے۔ چھوٹا سا احاطہ۔ موٹر خانہ کے سامنے جنگل جلیبی کا درخت۔ بشیر نے اوک لینڈ گیریج میں کھڑی کی اور بددل اور اداس سے مکان دیکھتے پھرے۔ ایک ڈرینگ روم کی کھڑکی پر زرد گلاب کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ بشیر خاں نے جو وسیع معلومات عامہ رکھتے تھے فرمایا' "چینی گلاب ہے۔" لیکن غازی پور۔ اٹاوہ اور آشیانہ دہرہ دون کے بعد یہ معمولی کاٹج۔ زندگی کا یہ نیا دوران کو نہ بھایا۔ کچھ عرصہ بعد اماں سے کہا چھٹی لے کر گورکھپور جانا چاہتے ہیں اور بچشم پرنم "خطا قصور معاف" کروا کر چلے گئے۔ پھر واپس نہ آئے۔

اماں افضل خالو کی المناک بیوقت موت کی وجہ سے حددرجہ غمزدہ تھیں۔ سلطان بھائی ان کا دل بہلانے کے لئے مزے مزے کی باتیں کیا کرتے۔ روز صبح کو کرسی پر آلتی پالتی مار کر پانیر اخبار سناتے۔ وہ کمزوری بصارت کی وجہ خود کچھ نہیں پڑھتی تھیں۔ ہمیشہ دوسروں سے پڑھوا کر سنتی تھیں۔ مضامین بھی ڈکٹیٹ کرواتی تھیں۔

ایک روز بھائی نے کہا' "سلطان بھائی۔ چلئے آپ کو انگریزی سینما دکھلائیں۔" شام کو اوک لینڈ میں جسے بشیر خاں کے جانے کے بعد بھائی خود چلاتے تھے' سلطان بھائی کو حضرت گنج لے گئے۔

شروع فروری کا زمانہ تھا۔ سلطان بھائی کمبل اوڑھے اطمینان سے انگریزوں اور میموں کی بھیڑ چیرتے ٹکٹ گھر کے سامنے پہنچے۔ ڈبیا سے پان نکال کر نوش کیا۔ ڈپٹ کر انگریزی میں اینگلو انڈین لڑکی سے کنسیشن ٹکٹ کی فرمائش کی۔ لڑکی نے حیرت سے باریش بزرگ کو دیکھا۔ بھائی نے آگے بڑھ کر کہا' "آپ یونیورسٹی میں عربی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔" فلم کا پہلا سین ہی نہایت درجہ واہیات نکلا۔ باآواز بلند فرمایا'

"لاحول ولاقوہ! بڑا افسوس ہے ببو میاں لیکن میں آپ کو ایسی مخرب الاخلاق فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" بانہہ پکڑ کر اٹھایا اور بیک بنی و دو گوش گھر واپس لے آئے۔

سلطان بھائی نے جس سخت گیری سے غازی پور میں بھائی کو پڑھایا تھا اب مجھے پڑھانا شروع کیا۔ لیکن چند روز بعد انہیں نہٹور واپس جانا پڑا۔ ابا جان کو میری تعلیم کی فکر کھائے جارہی تھی۔ نیا ڈرائیور ملازم رکھ لیا تھا۔ ایک روز اماں کو بتائے بغیر چپکے سے کرامت حسین گرلز کالج لے گئے۔ (اسی مدرسے کے دور اولیں ۱۹۱۶ء وغیرہ میں اماں اور لیڈی وزیر حسن اس کے انتظامات میں جی جان سے لگی رہی تھیں۔)

اینگلو انڈین پرنسپل مس مائیلز چڑے کا فراک پہنے اپنے دفتر میں بیٹھی تھیں۔ پنسل سے بنی باریک بھویں' سنہرے بال' سرخ لپ اسٹک۔

"یہ میری لڑکی ہے۔ علی گڑھ گرلز کالج میں پانچویں کلاس میں لے لی گئی تھی۔" ابا جان نے اس فخر سے بتایا گویا علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ "لیکن حساب میں کمزور ہے۔"

مس مائیلز مجھے اپنے ساتھ کالج کے اندر لے گئیں۔ میں ان کے ساتھ اس طرح چلی جیسے بکرا قصائی کے ساتھ چلتا ہے۔ یہاں بھی ایک خالی کلاس روم میں ایک استانی نے حساب کا ٹسٹ لیا۔ آدھ گھنٹے بعد مجھے لے کر مس مائیلو کے دفتر پہنچیں۔ ابا جان صبر سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ استانی نے مس مائیلز سے کہا' "تیسری کلاس میں لیا جا سکتا ہے۔"

ابا جان کا چہرہ اتر گیا۔ چونکہ ڈانٹتے کبھی نہیں تھے۔ بہت نرمی سے کہا' "واہ جناب آپ نے تو ہمیں بھی مات کر دیا۔ ہم تو ایف اے تک ریاضی گھسیٹ لے گئے تھے۔"

مس مائیلز نے کہا' "میں اسپیشل کلاس میں لے سکتی ہوں۔ باقی مضمون پانچویں لے۔ حساب کے لیے تیسری میں جانا ہو گا۔"

پیر کے روز "مسلم اسکول" کی کھڑکھڑیا پردہ پوش لاری نے پھاٹک پر ہارن بجایا۔ ایک سفید ریش پیرمرد ڈرائیو کر رہے تھے۔ مسلمان قوم اپنی لڑکیوں کے پردے کا کس قدر اہتمام کرتی تھی اور کتنی محتاط تھی۔ مسلم اسکول کی دونوں لاریوں کے ڈرائیور ستر ستر برس کے رہے ہوں گے۔ جانے اس ضعیف العمری میں ڈرائیو کس طرح کرتے تھے۔

اندر بیٹھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ دوسرے روز سے باہر بڑے میاں کے پاس بیٹھی۔ لیکن اسکول لاری سے زیادہ پُر کن ثابت ہوا۔ کلاس میں حساب کے سوال۔ لکھنوا غرارے اور تنگ پائجامے پہنے لڑکیاں۔ سب اردو بولیں اور فراک اور انگریزی کا مذاق اڑائیں۔ ڈرل کرنی بھی کسی طرح نہ آئی۔ صرف دو ہفتے بعد میں نے ابا جان سے کہا' "ہم مسلم اسکول نہیں جائیں گے۔" ابا جان بہت ملول نظر آئے۔ اماں باغ باغ ہوئیں۔

ابا جان مسلم اسکول میں پڑھانا چاہتے تھے تاکہ اردو کی بنیاد پختہ ہو۔ اماں کانونٹ پر مصر تھیں۔ کانونٹ اسکولوں میں حساب بھی واجبی ہوتا تھا۔ قصہ کوتاہ مسلم اسکول سے نام کٹوایا گیا۔ سینٹ اگنیز کا رخ

کیا گیا۔ گھر پہ قرآن شریف پڑھانے کے لئے ایک مولوی صاحب مقرر کئے گئے۔ اٹاوہ میں بھائی کو جو مولوی صاحب دینیات اور قرآن شریف پڑھانے آتے تھے وہ اسلامیہ ہائی اسکول کے پرانی وضع کے مدرس تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے بھائی سے کہا تھا' "ہم نیک سیرت آدمی۔ تمہاری والدہ سامنے کھڑی تھیں ہم خود ہی ہٹ گئے۔" لکھنو والے مولوی صاحب ندوہ کے ایک ہنس مکھ غریب طالب علم تھے۔ یہ بہت ماڈرن نکلے۔ انہماک سے ریڈیو سنتے اور برآمدے میں پڑی انگریزی کتابیں اٹھا کر پڑھنے لگتے۔ بغدادی قاعدہ شروع کرانے سے قبل انھوں نے مجھ سے دریافت کیا' "بیٹا۔ آپ لوگ ولد والین پڑھتے ہیں یا والضالین"؟

میں نے کہا' "معلوم نہیں۔ جو آپ کا جی چاہے پڑھا دیجئے۔"

دراصل یہ ض اور دواد کا معاملہ ہمارے ہاں بہت دلچسپ تھا۔ اور ذرا تفصیل چاہتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں' مغرب میں نظریہ ارتقاء' جدید سائنس اور عقلیت پرستی اور مذہب میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئی تھیں سرسید" اور ان کے رفقاء ان سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ مغرب میں "ایوولیوشنری نیچرل تھیولوجی" کا زور ہوا۔ یہاں سرسید" اور ان کے ساتھ بھی "نیچری" کہلائے۔ وہاں بائبل یہاں قرآن شریف کو "عین قانون فطرت کے مطابق" ثابت کیا گیا۔ فوق العادات اور کرامات کو مغرب نے زور شور سے مسترد کیا۔ یہی رویہ ہندوستانی مصلحین کا رہا۔ ارتقاء کی تھیوری مسلسل ترقی کے نظریے پر مبنی تھی۔ مغرب میں سائنس تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی تک مغرب کے اہل دانش انتہائی امید پرست رہے۔ ان کی دنیا متواتر ترقی پذیر تھی[2] رجائیت اور ترقی کا یہی جوش اور ولولہ ہندوستان کے مصلحین نے اپنایا۔ ابا جان اور اماں ہندوستان کی اس عقلیت پرست اصلاح پسند نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ (ابا جان نوجوانی کے زمانے میں پہلے غالباً Agnostic تھے۔ پھر خود کو "پکا نیچری" کہتے تھے۔ اور قرون وسطی کے علمائے معتزلہ کی عقلیت پرستی کے مداح تھے۔) ابا جان تاریخ داں اور دانشور تھے' اماں بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن تحریک سرسید" کی تربیت یافتہ اور لڑکپن سے اصلاح مذہب کی نقیب رہی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان شیعہ سنی تکرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں ددھیال ننھیال دونوں جگہ متعدد رشتے دار دونوں فرقوں کے ملے جلے پائے جاتے تھے۔ (یہ جھگڑا صرف شہر لکھنؤ کی خاصیت تھا۔) شاہ ولی اللہ" کی تحریک' مغرب کی ایوولیوشنری نیچرل تھیولوجی اور سرسید" کی تجدید و اصلاح دین سب نے مل جل کر ابا جان اماں کی نسل کو متاثر کیا تھا۔ ان کے اکثر دوستوں کے خیالات اسی قسم کے تھے۔ اماں بھی کرامات و خوارق کی منکر تھیں۔ کبھی ہمارے گھر پر نذر و نیاز کونڈے وغیرہ نہیں ہوئے۔ نماز روزے کی سختی سے پابند تھیں اور مجالس محرم میں دوسروں کے ہاں جا کر شرکت کرتی تھیں لیکن ماتم کو "دھڑا دھڑ پیٹنے" کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ ابا جان کو صوفیائے کرام کی دانشوری اور ہیومنزم سے شروع سے دلچسپی تھی۔ آخر عمر میں' خصوصاً حج کرنے کے بعد غالباً وہ پرانا نیچرل تھیولوجی والا رویہ بھی ترک کر چکے تھے۔ بہرحال اس ماحول میں ہماری چند روزہ دینی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابا جان اور اماں کی رواداری کا عجب عالم تھا۔ اماں کہتی تھیں بچوں کو سنی دینیات

پڑھوایئے۔ ابا جان کہتے اگر وہ شیعہ دینیات بھی پڑھ لیں گے تو کیا غضب ہو جائے گا۔ لیکن اماں نے چھوٹی چچی جان سے جو اناؤ سے آئی ہوئی تھیں کہا "بھابی۔ لڑکی کو اپنی نماز سکھلا دیجئے۔" انھوں نے بخوشی سکھلا دی۔ گو دعائے قنوت پر پہنچ کر میں نے اسٹرائیک کر دیا کہ بہت طویل تھی۔

اب ندوہ کے ہنس مکھ نوجوان مولوی صاحب نے کلام مجید شروع کروایا۔ چند روز بعد میں نے الجھ کر ابا جان سے کہا' "مولی صاحب جنے کیا پڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔"

ابا جان اپنے زمانہ طالب علمی میں مضمون لکھا کرتے تھے کہ نماز تک اردو میں پڑھی جائے۔ میں نے کہا' "ہم بڑے ہو جائیں تو قرآن شریف خود پڑھ لیں گے۔"

"کام چور کو سو بہانے۔" اماں نے فوراً ڈانٹ بتائی۔ "بیٹھ کر پڑھو۔" چنانچہ میں نے اپنی چوڑے نیلے ربن والی چھجے دار تنکوں کی ہیٹ دوبارہ سر پہ جمائی (بجائے دوپٹہ) اور الف لام میم شروع کیا۔

لیکن اب مولوی صاحب ہی غائب ہو گئے۔ کئی ہفتے بعد اماں کو امین آباد میں ملے۔ داڑھی مونچھ صاف' سائیکل سے اتر کر کہا' "بیگم صاحبہ۔ مولوی گیری سے بیوی بچوں کا پیٹ نہیں پلتا۔ ٹائپنگ سیکھ رہا ہوں۔ سکریٹریٹ میں کلرکی مل جائے گی۔ بٹیا کیا پڑھ رہی ہیں؟

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ ملا بے دین نکل گئے۔ شاگرد ڈنڈے بجا رہی ہیں۔" اماں نے جواب دیا۔ مولوی صاحب نے قہقہہ لگایا۔ سلام کر کے پیڈل پر پاؤں مارتے ہوا ہو گئے۔

دہرہ دون سے میری گڑیوں اور فرنگی پریوں کی کہانیوں کی کتب کے صندوق آچکے تھے اور میں ان میں بے طرح مشغول ہو چکی تھی۔

یو۔ پی لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس کے لئے بےحد پیاری کلثوم بھابی مراد آباد سے مہمان آئیں جو مراد آباد والے تایا بھائی شاہد حسین کی گریجویٹ بی بی تھیں۔ ابا جان بے حد فخریہ سب سے ان کا تعارف کراتے "کلثوم شاہد حسین ایم ایل اے۔"

اماں حسبِ عادت ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں کی اولاد کی شادیاں کروانے میں مشغول ہو گئیں۔ ایک منہ بولے بھائی سید رضا حسین ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اجمیر' سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی لڑکی رضیہ دلشاد کے نام سے تہذیب نسواں میں مضمون لکھتی تھیں اور فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اماں سے خط و کتابت تھی۔ اماں نے کہا کہ یہ لڑکی بنے کے لئے عین مناسب ہے۔ لیڈی وزیر حسن اور اماں کا نظریہ تھا کہ لڑکا کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ جیل جانے پر تلا رہتا ہے۔ شادی ہو گی۔ راہ راست پر آجائے گا۔

"ہم نذر خالہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہمیں ان کی یاد اپنے بچپن سے ہے۔ اس وقت وہ پردہ کرتی تھیں اور ہم اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ ہم ان کے سامنے جا سکتے تھے۔ (ہمارے تین بڑے بھائی تھے اور وہ ان سے نہیں مل سکتے تھے۔ لمبی' چھریری' گوری چٹی' غرارہ پہنے اور دوپٹہ اوڑھے' وہ گھنٹوں ہماری اماں سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ کتنی ترقی پسند تھیں یہ بیبیاں' تعلیم نسواں اور مسلمان عورتوں کے

حقوق کے لئے کتنا کچھ انھوں نے کیا۔ پھر جب ہم ذرا بڑے ہوئے اور اردو پڑھنے لگے تو سب سے پہلے جو ناول پڑھے ان میں نذر خالہ کے "آہ مظلوماں" اور "اختر النساء بیگم" تھے۔ پھر خاتون کے پرانے نمبر اور لاہور والے تہذیب کو بھی پڑھتے تھے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ نذر خالہ جان بنت نذر الباقر کے نام سے پہلے لکھا کرتی تھیں۔

رضیہ کے والد خان بہادر رضا حسین صاحب نے نذر خالہ جان کو اپنی بہن بنایا تھا۔ ان کے ذریعہ ہماری نسبت ہوئی۔ پھر جب اجمیر سے منگنی کے لئے امام ضامن وغیرہ تمہارے گھر آیا اور نذر خالہ خوان میں سب سامان (مٹھائی، پھول، انگوٹھی) لے کر آئیں اور انھوں ہی نے مجھے انگوٹھی پہنائی، امام ضامن باندھا اور پہلی مبارکباد دی۔ ہماری دعوت ولیمہ میں سجاد حیدر صاحب نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی۔ افسوس کہ اس کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ اس نظم میں میرے کیوٹزم کا بھی بڑا پیارا ذکر تھا۔ سب لوگ خوب ہنسے۔ وہ بھی ہم سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اور ہماری ان کی بڑی لمبی چوڑی سیاسی اور فلسفیانہ بحثیں ہوتی تھیں۔ کیسے اچھے لوگ تھے۔"[3]

کولابہ بمبئی۔ موسم گرما ۱۹۳۸ء

"بھائی سجاد۔" مٹیا برج کلکتہ کے نوابزادہ مرتضیٰ علی خاں جو ابا جان کے زمانہ بغداد کے دوست ہیں۔ سمندر کے رخ اپنے برآمدے میں بیٹھے عینک ماتھے پر سرکا، اخبار میز پر رکھ، بات شروع کرتے ہیں۔ "لیگ نے اپنا پروگرام بھی کانگریس سے ملتا جلتا رکھا۔ سارے پرانے کانگریسی بھی اس میں شامل ہوگئے۔ خلیق الزماں نے اندر خانہ رفیع قدوائی سے بات چیت بھی کرلی۔ مگر صاحب -- کچھ وہ کھنچے کھنچے رہے -- کچھ ہم کھنچے کھنچے --"

بھائی سجاد سگریٹ پیتے ہوئے سمندر کو دیکھ رہے ہیں۔

"اور اتنے نوابین کو بھرتے جارہے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو محض اس لئے آگے رکھا جارہا ہے کہ ان کی دولت لیگ کے کام آسکے؟ راجہ صاحب محمود آباد کا کیا محض یہی رول ہے؟"

"امیر احمد خاں ایک بیحد ذہین اور جوشیلے نوجوان ہیں۔ دوسرے نوابوں سے بہت مختلف، اپنے باپ سے بھی مختلف۔ کمبل بچھا کر زمین پر سوتے ہیں۔ جو کی روٹی کھاتے ہیں۔"

"اوہو۔ ہو۔ ہو۔ آئیڈیلزم کا سیاست سے کیا تعلق؟"

سامنے سے ایک یاٹ گذرتی ہے جس پر چند انگریز اور میمیں سوار ہیں۔

"دیکھا تم نے۔" مرتضیٰ علی خاں پائپ سے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ "ان کو ذرا جو پرواہ ہو۔ اور بھائی میرے۔ جب تک برطانیہ کا سایہ سر پہ سلامت ہے۔"

"میم صاحب۔" گوانی بیرہ آکر مودبانہ عرض کرتا ہے۔ "ریزرو بینک سے مسٹر لقمان حیدر کا فون آیا ہے۔" اماں اٹھ کر اندر جاتی ہیں۔

"چچی جان" دوسرے سرے پر نوجوان سید لقمان حیدر کہہ رہے ہیں۔ "آپ لوگ مرتضیٰ علی

خاں صاحب کے ہاں اتنے دن تو رہ لئے۔ کل صبح میں اور حسنہ آپ لوگوں کو لینے آرہے ہیں۔"

شیریں کاٹیج۔ کالج روڈ۔ ماٹنگا۔ مختصر سے سٹنگ روم میں نوجوانوں کا مجمع۔ پڑوس کی نامور مغنیہ فلم اسٹار اپنے شوہر سے پٹ کر آئی تھی اور غم غلط کرنے کے لئے اپنا تازہ "ہٹ" گانا سنانے میں مصروف تھی۔ بیگم جلال الدین حیدر کمرے میں جھانک کر تسبیح پھیرتی، جھکی جھکی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

مغنیہ کے جانے کے بعد دادی جان نے اماں سے کہا، "دلہن۔ ایسی عورتوں سے پردے کا حکم آیا ہے۔"

آپا حسنہ کی ایک سہیلی نے ہنس کر جواب دیا، "خالہ۔ یہ بے چاری تو اب گرہستن کی طرح رہتی ہے اور اعلیٰ درجے کی فنکار ہے۔"

"فنکار کیا بٹی؟ بٹنیا۔ پاتر۔ رام جنی تو معلوم ہے یہ فنکار آج ہی سنا۔ غضب خدا کا۔ شریف زادیاں بیٹھی فنکاروں سے گانا سن رہی ہیں۔ وہ لقمان میاں کے دوست۔ اللہ رکھے موٹے تازے۔ سید زادے۔ ٹھٹھے لگا رہے تھے۔ اور وہ چڑبانک خدائی خوار بیٹھی طبلہ بجارہی تھی۔"

"اب تو شریف زادیاں سینما میں کام کررہی ہیں۔" اماں نے تاسف سے کہا۔

"دلہن تم ہی آزادی آزادی چلاتی پھرو تھی۔ ایک دفعہ گھر میں بیٹھنے والیوں کا پردہ اٹھ گیا تو اٹھ گیا۔" دادی جان بولیں۔

"میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ شرفاء کی بیٹیاں ایکٹرس بن جائیں۔"

"بھنو۔ ایک بار جو پیاؤ کھلا تو کھلا۔ دیدوں کا پانی ڈھلتے دیر نا لگتی۔"

ابا جان لیگ کی میٹنگ سے لوٹ کر آئے۔ سوتیلی والدہ کے سامنے مودبانہ بیٹھ گئے۔ ان کی ماں سعید بانو کی جوانمرگی کے بعد ان کے والد نے جب فتح گڑھ میں تعینات تھے ان سے عقد کرلیا تھا شیعہ پٹھان زادی تھیں۔ بے انتہا گوری، بھولی بھالی، سفید براق کپڑے، تنگ پائجامہ، لاولد تھیں۔ میکہ کب کا ختم ہوچکا تھا۔ سارا رنڈاپا مرحوم شوہر کے بیٹوں، بھتیجوں کے ہاں تیر دیا۔ سوتیلے بیٹے ان کو "مائیدر" یا اماں کہتے تھے اور بے حد ادب و تکریم سے پیش آتے تھے۔ پچھلے اکتوبر نہٹور میں آپا حسنہ اور لقمان بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ دادی جان ان کا "گھر جمانے" بمبئی آئی ہوئی تھیں۔

ابا جان ہر سال سپلا کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ کے لئے بمبئی آتے تھے۔ اس سال راجہ صاحب کے ہمراہ لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے لئے آئے تھے۔ لکھنؤ واپس جانے کے چند روز بعد راجہ صاحب کے ساتھ پھر دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔

زرین میں
۱۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء

السلام علیکم۔ یکم اکتوبر کو مراد آباد پہنچا۔ راجہ صاحب، رضا علی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ کل میں نے آل حسنین کے ہاں کھانا کھایا۔ آج شام کو ۷ بجے لاہور پہنچیں گے۔ کل صبح کراچی روانہ ہوں گے۔

سجاد

لاہور
۱۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء

پیاری باجی جان۔ السلام علیکم۔ رات نو بجے بھائی جان تشریف لائے۔ ان کے آنے سے کس قدر خوشی افضل مرحوم کو ہوتی تھی، کیا بتاؤں۔ سمجھتے تھے عید کا چاند ہمارے گھر میں آگیا ہے۔ مجھ بدنصیب سے ملنے کی خاطر بھائی جان نے چند گھنٹوں کے لئے اتنی تکلیف انہوں نے اٹھائی۔ اللہ انہیں قائم رکھے ہمارے سر پر۔ صبح نو بجے کراچی تشریف لے گئے۔ بواجی کی کار پر اسٹیشن بھیجا۔

آپ کی
چھبو

شادماں۔ کراچی
۱۱۰ کتوبر ۱۹۳۸ء

السلام علیکم۔ ہم لوگ عبداللہ ہارون کے ہاں آکر اترے۔ انھوں نے نیا مکان بنوالیا ہے۔ لیڈی ہارون تم کو پوچھتی تھیں۔ ۱۴ تک یہاں جلسے ہیں۔ کل مسلمان طلبہ کا جلسہ ہے جس کے پریسیڈنٹ راجہ صاحب ہوں گے۔
تیس روپے اماں کے نام میاں نثار حیدر کو بریلی روانہ کردو۔

سجاد

لکھنؤ ریڈیو کے پہلے اسٹیشن ڈائرکٹر نے ابا جان اور اماں کو تقاریر کے لئے مدعو کیا۔ اماں نے کہا "میں تو پندرہ منٹ کی قید کی پابند نہیں ہو سکتی۔ پندرہ منٹ تک تو میں بات کا آغاز ہی کروں گی۔ اور جب تک دل چاہے گا بولوں گی۔"
اسٹیشن ڈائرکٹر نے کہا" ریڈیو پر وقت کی پابندی ضروری ہے۔"
"مجھے نہیں چاہئے آپ کا آل انڈیا ریڈیو۔"

براڈ کاسٹ کے فوراً بعد کھڑے کھڑے نقد معاوضہ مل جاتا تھا۔ ابا جان اپنی پہلی ٹاک کا معاوضہ لے کر گھر آئے۔ اماں بہت خفا ہوئیں، "روپے لینے کی کیا ضرورت تھی؟" خود ساری عمر اپنی کثیرالاشاعت کتابوں کی رائلٹی نہیں لی تھی اور پبلشروں کو مالا مال کیا تھا۔
ابا جان نے جواب دیا، "سرکاری محکمہ ہے۔ انھوں نے کوئی میرے اوپر ذاتی احسان تھوڑا ہی کیا ہے۔"
آپ کو چاہئے تھا ان سے کہتے کہ یہ روپیہ خیرات کردو۔ یا تمہارا ریڈیو اسٹیشن نیا نیا کھلا ہے اسی میں لگادو۔"

اس سال علامہ اقبالؒ اور کمال اتاترک نے رحلت کی۔ ابا جان کئی دن تک گم سم رہے۔ ایک صبح ریڈیو پر مولانا شوکت علی کی وفات کی خبر آئی۔ ابا جان اسی وقت کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ سکتے میں آکر دروازے میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔
الفریڈ خانساماں جو دہرہ دون سے علی گڑھ بھی ساتھ گئے تھے اب لکھنؤ بلوا لئے گئے تھے۔ سفید ریش نور علی بیرے غازی پور کے عبدل کا لکھنوی اڈیشن تھے۔ ان کو خالق باری ازبر تھی اور کافی گپی تھے۔ شکل سے علی بابا معلوم ہوتے تھے۔ استانبول سے ترک مہمان آئے ہوئے تھے جو اسکندریہ کے گورنر رہ چکے تھے۔ سیاہ اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس ان کی بیوی بہت اداس صورت تھیں۔ میاں موجودہ دور حکومت میں زیر عتاب تھے یا کیا قصہ تھا۔ بہرحال ابا جان ان ترکوں کی آمد کی وجہ سے نہال نہال تھے۔ رات کو کھانے کی میز پر ابا جان اور یہ لوگ مستقل ترکی بولتے اور برچوق، برچوق کرتے رہتے۔ عثمانی دور کے ترک سب عربی داں ہوا کرتے تھے۔ نور علی جو پچھلی جنگ عظیم میں کسی انگریز فوجی کے ساتھ عراق ہو آئے تھے ایک روز بوڑھے ترک کے ہاتھ دھلاتے ہوئے عربی کی ٹانگ بھی توڑتے رہے۔ اور مستقل "بوکرا"۔ "بوکرا" کہے جائیں۔ بعد میں میں نے سخت مرعوب ہو کر پوچھا، "نور علی آپ عربی میں کیا کہہ رہے تھے؟"
متانت سے جواب دیا، "کل۔"
ابا جان کے کمرے میں لاطینی رسم الخط میں چھپے تازہ ترکی اخباروں اور رسالوں کا انبار رہتا تھا۔ ادیانش اور جمہوریت، حریت وغیرہ وغیرہ جن کا معیار ہندوستانی جریدوں سے کہیں بہتر تھا۔ بالکل ولایتی اخبار معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ایک سنڈے اڈیشن میں ایک کارٹون اسٹرپ دیکھا جو ترکی جانے بغیر سمجھ میں آ گیا۔ اسے ٹریس کر کے انگل سے خود ہی مکالمے لکھ کر نیچے بڑے اسٹائل سے اضافہ کیا، "ترکی سے۔ روزنامہ جمہوریت۔ انقرہ۔" چپکے سے پھول میں روانہ کردیا۔ پھول کے سالنامہ میں وہ کارٹون چھپ گیا۔ اس کے بعد ابا جان یا اماں کو دکھائے بغیر پھول میں مضمون بھیجنے شروع کردیے۔ وہ فٹافٹ چھپنے لگے۔ ایک واپس نہ آیا۔

امین آباد پارک میں نمائش لگی۔ "لالکرتی والوں" کے ساتھ گھومتے ہوئے ایک پان والے کی

دکان کے سامنے رکے۔ سب نے پان خریدے' ایک پان میں نے بھی کھایا۔ لکھنؤ میں لونگ کے بجائے کو کے یعنی چھوٹی کیلیں لگاتے تھے۔ جو گلوری میں نے نوش جان کی اس میں ایک کے بجائے دو کیلیں جڑی تھیں۔

جب پیٹ میں جا کر چبھنی شروع ہوئیں تب یاد آیا۔ سب لوگ ہڑبڑا کر ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑے۔ قریب ڈاکٹر عبدالرحمن کا مطب تھا جسے وہ بند کر کے گھر جانے والے تھے۔ انھوں نے کہا' "روئی کے سینڈوچ کھلایئے۔ صبح تک دیکھیے ورنہ آپریشن کرنا پڑے گا جو کافی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

صبح کو میڈیکل کالج میں ایکسرے لیا گیا۔ دو عدد کیلیں آنتوں میں موجود تھیں۔ جن میں سے ایک ٹیڑھی ہو گئی تھی اور خوب چبھ رہی تھی۔

رات کو ابا جان کو ارجنٹ تار دیا گیا تھا جو دہلی گئے ہوئے تھے۔ ان کا جواب آیا۔ بھاٹیہ کو دکھاؤ۔ میں فوراً آتا ہوں۔ سرجن بھاٹیہ لکھنؤ میں موجود نہیں تھے۔ دوسرا تار دیا گیا کہ ڈاکٹر جوشی کو لے کر آئیں۔

یوروپین وارڈ میں کمرہ لیا گیا۔ ڈاکٹر کے ساتھ طالب علم لوگ آئے۔ بڑی دلچسپی سے اس خطرناک کیس کا حال سننے لگے۔ ایک نرس نے ہندوستانی فلموں کی نرسوں والی ادا سے سر ہلا کر رنجیدہ آواز میں کہا' "بیچاری بچی۔"

آپریشن کی تیاری کی جا رہی تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے بتائے ہوئے روئی کے سینڈوچ کارگر ثابت ہو گئے۔ ابا جان کو تیسرا تار دیا گیا۔

دلی سے لوٹ کر ابا جان نے اماں سے کہا' "راجہ صاحب بتا رہے تھے' کیلیں تو ہم لوگ اکثر پان میں کھا جاتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

"جی ضرور۔ راجہ صاحب کی تو ساری عمر کیلیں' سیفٹی پنیں' ریزر بلیڈ کھاتے ہی گزری ہے۔ اچھا دوسری بات یہ کہ میں نے فیض آباد روڈ پر بہت عمدہ کوٹھی ڈھونڈلی ہے۔ پہلی تاریخ کو وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ اپنی کتابیں کاغذات پیک کروا لیجیے۔"

۳۔ پھول بَن

ترکی "گل خانے" کے مانند ہندی زبان کا "پھول بن" یعنی باغ بھی ایک خوبصورت لفظ ہے۔ نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ' آئی۔ ٹی کالج اور پولس لائنز سے آگے' کرامت حسین گرلز کالج کے راستے میں ایک نئی نکور جدید وضع کی کوٹھی تھی جس کی تعمیر میں اس کے مالک بابو رام شروپ سنگھ نے خوش ذوقی کا ثبوت دیا تھا۔

اماں نے گورکھپور پوسٹ کارڈ ڈالا۔ اب بشیر خاں کے مرتبے کے مطابق کوٹھی مل گئی ہے۔ واپس تشریف لے آویں۔ ان کا کلکتہ سے روتا پیٹتا معذرت نامہ آیا کہ ایک فوٹوگرافر کی دوکان پر بہت اچھی تنخواہ پر نوکر ہو چکے ہیں۔ بشیر خان کے جانے سے ہمارے بچپن کا ایک بہترین باب ختم ہو گیا۔

نمبر ۲۱ میں سامنے اور پیچھے تین عدد لان تھے۔ اماں نے فوراً مالی رکھا۔ اور بہت جلد باغ لہلہا اٹھا۔

ابرِ نوبہار گھر کر آیا تو پھول کھل اٹھے اور تیتریاں نمودار ہوئیں اور امرود اور شہتوت اور انجیر کے درختوں میں پرندوں نے چکارنا شروع کر دیا۔ ہو گئیں کیاریاں ہری۔ جیسے کہ رت پلٹ چلی۔

اسی فیض آباد روڈ پر بارہ بنکی میں ابا جان کے فرسٹ کزن سید نثار حیدر زیدی کی کوٹھی نمبر ۲۱ سے ٹھیک پندرہ میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اتوار کے روز چچا نثار جو بارہ بنکی میں ڈپٹی کلکٹر تھے مع چچی حمیدہ اپنی سرمئی شیو پر لکھنؤ آتے جہاں ان کے بیٹے سید جرار حیدر نے لال باغ میں مکان لے کر چودھری نعمت اللہ کی ٹرینگ میں وکالت کی پریکٹس شروع کر رکھی تھی۔ ٹونک سے چچا نصیر اور چچی وحیدہ تشریف لاتے۔ چچا وحید اور چھوٹی چچی جان اناؤ سے آتی رہتی تھیں۔

اپریل ۱۹۳۹ء میں بھائی بی۔ اے کا امتحان دے کر مسوری روانہ ہوئے۔ آشیانے میں کرایہ دار تھے۔ دہرہ دون پہنچ کر اماں نے "سیزن" بھر کے لئے کرزن روڈ پر ایک پر فضا کوٹھی کرائے پر لی۔ جس کا نام ڈون ہیون تھا۔ دو سال قبل اماں کرن پور والے خان بہادر سید ظل حسین کی میٹرک پاس نواسی آصفہ بیگم سے الن ماموں کا بیاہ کروا چکی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں الن ماموں مع آصفہ ممانی اور نوزائیدہ نادرہ جوناگڈھ سے دہرہ دون آئے ہوئے تھے اور اپنی سسرال کرن پور میں مقیم تھے۔

جب ڈون ہیون کے سبزے پر بارش کی پریاں رقصاں ہوتیں اور میں پروفیسر مرزا محمد سعید کی بھانجی احمدی کے ساتھ برآمدوں میں "گھر گھر" کھیلنے میں مشغول ہوتی معطر پانی سے لدے ہوا کے جھونکے لطیف بادلوں کی طرح کمروں سے گذرتے۔ الن ماموں کسی کمرے میں پلنگ پر لیٹے لیٹے ملہار الاپنا شروع کر دیتے۔ برآمدے کے ہرے جنگلے پانی کی پھوار سے بھیگ جاتے۔ کمرے خنک' باہر درختوں کی سرسراہٹ' کتابوں کے ورق نم' روشن رنگین تصویریں' سر فلپ سڈنی بلنم کی لڑائی' آئرش پریوں کی کتاب "A Password To Fairyland" ----- اور بوڑھی یک چشم جمعدارنی چھینٹ کی شلوار پہنے' پشت پر ایک ہاتھ رکھے' جگل جگل کمروں میں اسی طرح جھاڑو دیتی جیسے آشیانے میں دیا کرتی تھی۔

شام کو ہم سب آصفہ ممانی کے چھوٹے بھائیوں اور ماموں زاد بہنوں کے ساتھ جا کر پریڈ گراونڈ پر نمائش میں سرکس ملاحظہ کرتے۔

اماں ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہو گئیں اور ڈاکٹر ہون کو ہر تیسرے دن آنا پڑا۔ مختلف شہروں سے ابا جان کے خط ڈون ہیون آتے رہے۔

کوشک۔ قرولباغ

نئی دہلی۔ ۱۸ اپریل ۳۹ء

السلام علیکم

میں کل علی گڑھ جا رہا ہوں۔ وہاں کورٹ کی میٹنگ ہے۔ شام کو لکھنؤ روانہ ہو جاؤں گا۔ لکھنؤ

۲۲جون ۳۹ء

میں ایک ضروری کام سے ایک دن کے لئے لاہور جا رہا ہوں۔ دو بجے میل سے روانہ ہوں گا۔ نواب قزلباش کے ہاں ٹھہروں گا۔ پھبو جی کا موجودہ پتہ معلوم نہیں۔ یہاں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کل بارش ہوئی۔

لکھنؤ

۲۶جون ۳۹ء

میں کل لاہور سے واپس آیا۔ آج پھبو میاں کو مسوری آم بھجواؤں گا۔ دو دفعہ لکھ چکے ہیں۔ کل خوب بارش ہوئی۔ ہوا خنک ہے۔ ۳۰ جون کو بمبئی جانا ہے۔ ۳۰ کو میری تقریر ریڈیو پر ہے۔ اسے کوئی دوسرا شخص پڑھ دے گا۔ آندھی سے ہماری کوٹھی پر ریڈیو کے جو بانس لگے تھے وہ گر پڑے، تار بھی گر گیا۔

عینی بی بی کی پڑھائی کا کیا ہو رہا ہے۔

بمبئی

۵جولائی ۳۹ء

کل حسنہ بی بی کے ہاں کھانا تھا۔ محمد عباس، آصف فیضی، بیگم آصف فیضی بھی آئے تھے۔ عطیہ فیضی امریکہ گئی ہوئی ہیں۔ آج آصف کے ساتھ زہرا فیضی سے ملنے جاؤں گا۔ مرتضیٰ علی خاں کا مکان اب یک منزلہ بنگلہ ہے اس لئے چڑھنا اترنا نہیں پڑتا۔

لکھنؤ

۲۴جولائی ۳۹ء

پیاری عینی بی بی۔ اپنی اماں جان کی خیریت کا ہر روز ایک کارڈ لکھ دیا کرو میں نے کالرا کا ٹیکہ لگوالیا ہے۔ میری پیشانی پر کاربنکل نکل آیا ہے۔ میاں وحید نے کہا ہے پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ خود آپریشن کریں گے۔

راقم الدعا

اباجان

لکھنؤ

۲۷جولائی ۳۹ء

پیاری عینی بی بی۔ دعائیں۔ تمہاری اماں جان کا خط پھبو جی کے نام پہنچا۔ وہ مسوری سے بخیریت واپس آگئے اور یونیورسٹی جانا شروع کر دیا ہے۔ میں کاربنکل کے آپریشن کے لئے کل رائے بریلی جا رہا ہوں۔ تم لوگ ڈیڑھ دو دن سے وہیں پہنچ جاؤ۔

ڈاکٹر وحید الدین حیدر نے جو اناؤ سے تبدیل ہو کر رائے بریلی آچکے تھے گھر کے برآمدے میں میز بچھا کر کاربنکل کا آپریشن کیا جس کے بعد بڑے بھائی سر پر پٹی باندھ کر مزے سے چلنے پھرنے لگے۔

چھوٹے چچا جان کے ہاں ہر شہر میں سال کے بارہ مہینے کوئی نہ کوئی دور نزدیک کے رشتے دار بغرض علاج ٹھہرے رہتے تھے۔ ان دنوں بھائی سلطان حیدر نہٹور سے آئے ہوئے تھے۔ دونوں وقت حسبِ معمول کھانے کے میز پر محفل جمتی۔ باہر باغ میں مور جھنکارتے۔ دوپہر کے وقت جب سب سو جاتے اور گھر پر خاموشی طاری ہوتی میں بے تحاشا وسیع و عریض خنک ڈرائنگ روم کے دروازے اندر سے بند کر کے گراموفون بجاتی۔ کملا جھریا۔ اے دل تو اس گلی میں پامال ناز ہو جا۔ اختری فیض آبادی۔ دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ بنا دے۔ امراؤ ضیا بیگم۔ یثرب کو جانے والے میرا سلام لے جا۔ کلن قوال سوا خلد سے بھی ہے شان مدینہ۔ ان کے علاوہ نیو تھیٹرز، پربھات اور بمبئی ٹاکیز کے ریکارڈ جو بمبئی سے سعید بھائی لا کر رکھ گئے تھے۔ ایک ریکارڈ میں دیویکا رانی نازک نازک منحنی سپاٹ آواز میں گاتیں۔ مائیں نے ایک مالا گوندھی ہے۔ انسون کی مائیلا گوندھی ہے۔ اور نسیم بانو بھرائی ہوئی موٹی سی صدا لگاتیں۔ زندگی ای ای کا ساز بھی کیا ساز ہے اے اے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ بی کی بیٹی خورشید آپا تک گاتی تھیں۔ چھلوا دل بجن تم میرو من بھنورا۔ اور ایک ریکارڈ مس اقبال تِلّی کا تھا ''جشنِ جوبلی شاہا مبارک ہو۔''

پینٹری کی ایک الماری میں امریکن ٹرو اسٹوری میگزین کا انبار رکھا تھا۔ چوہے کی طرح میں اس میں بھی لگی رہتی۔ جو مشکل الفاظ سمجھ میں نہ آتے کسی سے دریافت کر کے پھر پڑھنا شروع کر دیتی۔

ایک اتوار کو دونوں بھائی اپنی ایک چچا زاد بہن عزیزہ خاتون سے ملنے شہر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک پل پر سے گزرتے ہوئے چھوٹے چچا جان نے مجھ سے کہا ''دیکھئے اس جگہ ہمارے چچا جان مرحوم ڈاکٹر کرار حیدر گھوڑے سے گرے تھے۔ دماغ میں چوٹ آئی۔ فوراً ختم ہو گئے۔ آپ کے جو چچا نثار حیدر زیدی بارہ بنکی میں ہیں۔ ان کے والد۔''

اباجان نے کہا ''ماموں اکرام حیدر نے چچا مرحوم کی وفات کا قطعہ تاریخ کہا تھا۔''

مسیح زماں ڈاکٹر بود نامی — مخاطب بہ خان بہادر زقیصر
بہ ہندوستان از فن چشم سازی — بشد نام روشن چو ماہ منور
صد افسوس در عنفوان جوانی — قضا کرد مجموعہ عمر ابتر
پئے یاد از یاد تاریخ رحلت — صفی ارم میر کرار حیدر''

چھوٹے چچا جان نے کار اسٹارٹ کی اور ڈسٹرکٹ ہسپتال کی سمت بڑھتے ہوئے اماں اور چھوٹی چچی جان سے کہا ''آئیے آپ کو وہ مکان دکھلائیں جہاں ہم لوگ اسکول کی چھٹیاں گزارنے علی گڑھ سے آکر چچا جان مرحوم کے ہاں رہا کرتے تھے۔''

باہر گاڑی روک کر اسسٹنٹ سرجن کے پی ڈبلیو ڈی ریگولیشن زرد مکان پر نظر ڈالی۔ چھوٹی چچی جان نے کہا ''What a Quiet Sad Place'' اور چھنگلی کی نوک سے آنکھ کا گوشہ خشک کیا۔

چھوٹی چچی جان بڑی غیر معمولی خاتون تھیں۔ شادی کے برسوں بعد اپنے شوق اور محنت سے

انگریزی سیکھی تھی۔ جس زمانے میں چچا وحید لارڈ ولنگڈن کے اعزازی معالج تھے چچی فاطمہ صغریٰ بنت سید اکرام حیدر ترمذی سال میں ایک بار وائسریگل لاج نئی دلی ڈنر کھانے جاتی تھیں اور وہاں بزبان انگلشیہ گفتگو کرتی تھیں۔ کسی غیر مسلم دوست کے گھر پر نماز کا وقت آجائے فوراً اطمینان سے صوفے کی پشت یا دیوار تھپتھپا تیمم کر نماز شروع کر دیتی تھیں۔ بعد ازاں اونچی ایڑی کے پمپ شو پر کھٹ کھٹ کرتی باہر آکر اکثر خود ڈرائیو کرتی ہوئی روانہ ہو جاتی تھیں۔

آج "ومنز لب" کے دور میں نتیجہ یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو گو صدیوں تک مفلوج اور مقید رکھا گیا لیکن موقع ملتے ہی وہ اپنی فطری صلاحیتیں بروئے کار لے آئیں۔

۳ ستمبر کی شام ابا جان' اماں' چھوٹی چچی جان اور سلطان بھائی باہر لان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ احاطے میں کہیں دور مور جھنکار رہے تھے۔ پھاٹک کے کھمبوں پر کار کی روشنی پڑی۔ چھوٹے چچا جان کلب سے واپس آرہے تھے۔

کار ڈرائیو پر روک کر ایک کیاری پھلانگتے ہوئے وہ سیدھے سبزے پر آگئے اور ابا جان کو آواز دی۔ "بھائی جان جنگ شروع ہو گئی۔"

عبدالستار خیری مع فاطمہ خیری نینی تال میں نظر بند کئے گئے۔ الزام تھا کہ جرمنی میں ہٹلر سے ملا کرتے تھے اور فسطائی تھے۔

سن چودہ کی لڑائی کے ویٹرن میر نذر الباقر مرحوم کے دونوں بھتیجے کیپٹن آل حسنین' پائلٹ آفسر ظہور العسکری اور بھتیج داماد کیپٹن اصغر حسین محاذ جنگ پر روانہ ہوئے۔ پٹرول راشننگ شروع ہو گئی۔

دسمبر میں بچوں کا ایک اسپیشل پروگرام نشر کیا گیا جس کی تصویر آل انڈیا ریڈیو نے اپنے سال نو کے تہنیتی کارڈ پر چھاپی۔ میں کہ بچوں کے پروگرام کی ایک ویٹرن براڈ کاسٹر تھی سفید فراک پہنے' دوسرے بچوں کے ساتھ "چاچا" (شوکت تھانوی) "آپا جان" (عرش منیر) اور "بدھو" (غلام قادر فرید) کے قدموں میں بڑی عقیدت سے بیٹھی۔

فروری میں ابا جان بہت مصروف نظر آئے۔ اپنے کمرے میں دریچے کے سامنے میز پر بیٹھے مسلم لیگ کے لاہور سیشن کے لئے انگریزی کتابچے اور راجہ صاحب کی تقریر لکھنے میں منہمک رہے۔ سیشن میں ہمراہ جانے کے لئے آپا عذرا علی گڑھ سے آئیں۔ گرمیاں شروع ہونے والی تھیں۔ اور فیض آباد روڈ پر املی کے درختوں کے نیچے گرد اڑتی تھی۔

مئی کے مہینے میں ہم لوگ پھر بمبئی گئے اور آپا حسنہ لقمان کے ہاں مسّلا میں ٹھہرے۔

جب ہم لوگ لکھنؤ واپس جا رہے تھے اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی میں کمپارٹمنٹ کی کھڑکی میں سے ہجوم کا نظارہ کرتی رہی اور سامنے کچھ فاصلے پر گرے سوٹ میں دبلے پتلے طویل القامت جناح صاحب اور ابا جان پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر ابا جان گاؤٹ کے علاج کے لئے سہارنپور روانہ ہوئے جہاں چچا وحید کا رائے بریلی سے تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور ان کے بڑے صاحبزادے' وہ سعید بھائی جو ایک دفعہ آشیانہ آئے تھے اور بھیس بدلا تھا اور جن کی شادی آپا عذرا سے ہونے والی تھی' بہادر آباد ضلع سہارنپور میں نہروں کے ہیڈ ورکس پر انجینئر تھے۔

پی۔ او۔ بہادر آباد

۶ جون ۱۹۴۰ء

السلام علیکم

کل صبح وحید' مسز وحید' رشید' رِی اور میں موٹر سے دہرہ دون روانہ ہوئے۔ راستہ میں موٹر فیل ہو گیا۔ واپس آکر ہردوار سے ریل میں سوار ہوئے۔ ایک بجے دن دہرہ دون پہنچے سیدھے آشیانہ گئے۔ وہاں معلوم ہوا آشیانہ ۳ جون سے کرایہ پر اٹھ گیا۔ مگر کرائے دار نے جو ڈیرہ غازی خاں کے ہندو ہیں سامنے کا برآمدہ اور پہلو کا ایک کمرہ ہمیں دیدیا۔ وہاں بیٹھ کر کھانا کھایا جو مسز وحید ساتھ لائی تھیں۔ پھر حاضر صاحب کے ہاں گئے۔ مظہر نے موڑ دیا۔ میں سردار عمر خاں کو دیکھنے گیا جو بہت بیمار ہیں۔ علاج کے لئے بھی پیسہ نہیں ہے۔ شام کی گاڑی سے بہادر آباد لوٹے۔ کل لڈن دورے پر آرہے ہیں۔ ہردوار کے انسپکشن ہاؤس میں ٹھیرے ہیں۔

تم بے چارے رضا امام کے انتقال پر مہارانی کے پاس نہ پرسہ کے لئے گئیں نہ خط پرسہ کا لکھا[4]۔

چھتا بازار گیٹ کے اندر ایک قدیم کوٹھی میں ایک نہٹوری عزیز خان بہادر احمد حسین ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر رہا کرتے تھے۔ ابا جان کی سہارنپور سے واپسی پر ایک روز وہ فیض آباد روڈ آئے۔ اور باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ ان کی چھوٹی بچی زہرہ اگلے سال بنارس یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دیں گی۔ وہاں لڑکیوں کو اجازت ہے کہ ریاضی کے بجائے کوئی دوسرا مضمون لے لیں۔ ابا جان نے بڑی دلچسپی سے مزید تفصیلات دریافت کیں۔ چچا احمد حسین نے فرمایا کہ ایک کائستھ ماسٹر صاحب پر تھی سنگھ سریواستوا نے دو سال سے ایک پرائیوٹ اسکول کھول رکھا ہے جس میں وہ لڑکیوں کو اس امتحان کے لئے پڑھاتے ہیں۔ ابا جان نے ان کو بلوا بھیجا۔ دوسرے روز ہی ماسٹر صاحب تشریف لے آئے۔ دبلے پتلے' پر خلوص' ثقہ اور نستعلیق استاد تھے۔ ابا جان نے میرے داخلے کے متعلق ان سے طے کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

اماں نے کہا' "بغیر حساب کا جھو جھرا میٹرک' بالکل واہیات ہو گا۔ اور یہ لڑکا تو ہیں نہیں جو اوور ایج ہو جائیں گی۔ چار پانچ سال بعد سینئر کیمبرج کر لیں گی تو کیا غضب ہو جائے گا۔ آخر ایسی بھگدڑ کیا پڑی ہے۔"

ماسٹر صاحب بتا کر گئے کہ بنارس میٹرک میں لڑکیوں کے لئے ہندوستانی کلاسیکل میوزک بھی ایک اختیاری مضمون ہے۔ میرا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ اماں نے بات جاری رکھی' "بفرض محال انہوں نے اگلے سال میٹرک پاس بھی کر لیا تو کون سے کالج میں داخلہ ہو گا۔ ہر جگہ کم از کم عمر چودہ سال ہے۔"

ابا جان نے کہا' "امتحان کے فارم میں تاریخ پیدائش آگے بڑھا دیں گے۔"

اماں نے کہا' "آپ کی جو بات ہے نرالی۔ دنیا لڑکیوں کی عمر گھٹا کر لکھواتی ہے آپ بڑھا کر لکھوائیں گے۔"

"ہم تو ضرور بالضرور ماسٹر صاحب کے اسکول میں پڑھیں گے۔" میں نے اعلان کیا' "اور میوزک بھی لیں گے۔"

مجبوراً دوسرے دن اماں نے لاٹوش روڈ جا کر بڑا سا ستار اور طنبورہ خریدا۔ ۱۶ جولائی کی صبح چھ بجے جب بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی اور بادل گھرا گھرا تھا ماسٹر صاحب کے اسکول وارد ہوئی۔

موسیقی کے نابینا استاد سورج بخش سریو استوا شام کو میرس کالج میں پڑھاتے تھے دن میں ہماری کلاس لینے آتے تھے میوزک کی کلاس میں متعدد لڑکیاں مسلمان تھیں جن میں مشہور فارسی شاعر عزیز لکھنوی کی پڑپوتی عزیز بانو داراب (جو مشق سخن بھی فرماتی تھیں) بہت سریلی آواز پائی تھی ناچیز کی آواز بے حد واجبی تھی لیکن ماسٹر سورج بخش فرماتے تھے بس تم ستار اور تھیوری میں بہت زیادہ نمبر لے جاؤ گی کلاس میں روزانہ طنبورہ ناچیز چھیڑتی تھی اور تان پلٹے لگاتی تھی

ماسٹر صاحب نے ایک کھٹارا فورڈ خرید لی تھی اس کی سیٹیں نکلوا کر لکڑی کی بنچیں لگوائی تھیں عجیب و غریب موٹر تھی لیکن معجزہ یہ تھا کہ خوب چلتی تھی سبزی منڈی سے عزیز بانو داراب کو لے کر فیض آباد روڈ پہنچتی۔ دور پھاٹک پر ہارن بجتا۔ باورچی خانے کے کھلے کو ریڈور سے غلام حسین آواز دیتے' "بوٹیا۔ آپ کا چھکڑا آگیا۔" اور عقبی برآمدے کے تخت پر رکھا غلاف پوش ستار اور کتابوں کا بستہ اٹھا کر سر جھکائے پھاٹک کی سمت چل پڑتے۔

میں جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے سرپٹ ان کے پیچھے دوڑتی۔

فورڈ دھواں چھوڑتی آگے بڑھتی اور بنارسی اور نرہی سے لڑکیوں کو لیتی چرخ چوں کرتی لال باغ پہنچ کر دم لیتی۔ یہ موٹر ہم لوگوں کے لئے رولز رائس کا درجہ رکھتی تھی اور جب لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہم لوگ ماسٹر صاحب سے وفاداری کے مارے اس کی طرف داری میں اپنی جانیں لڑانے کو تیار رہتے تھے "ماساب" کا اسکول ایک منفرد لاجواب تعلیم گاہ تھی۔

دوپہر کو غلام حسین سائیکل کے ہینڈل پر ناشتہ دان آویزاں کئے گھر سے اسکول آتے۔

غلام حسین جو نانا نذر الباقر مرحوم کے خانہ زاد ملازم تھے۔ کچھ قبل سیالکوٹ سے لکھنو آئے تھے۔ وہ ایک خضاب شدہ سرخ مونچھوں والے شفیق بزرگ تھے۔ کلاہ دار پگڑی شلوار اور لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ وہ اماں کو بی بی مجھے بوٹیا اور ابا جان کو صاحب کے بجائے آفتاب میاں کہتے تھے جو خطاب جون ۱۲ء میں نانی اشرف جہاں بیگم مرحومہ نے ابا جان کو دیا تھا۔ وہ پائیں باغ کے سرے پر بنی نوکروں کی کاٹیج میں بڑے وقار سے مقیم تھے۔ ان کو ملازم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صبح و شام چاء اور دونوں وقت کا کھانا اماں اپنے ہاتھ سے نکال کر کشتی میں ان کے لئے سجاتی تھیں جسے وہ پچھلے برآمدے کے تخت پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اور ایک قسم

کے میجر ڈومو تھے۔ جب ابا جان کی گاؤٹ کی تکلیف عود کر آتی وہ تسلہ نیچے رکھ کر ابا جان کے پاؤں کے انگوٹھے کی مرہم پٹی کرتے۔

غلام حسین نانا پاپا کے بیٹ مین کی حیثیت سے چار برس فرانس میں بسر کر چکے تھے۔ اور انگلستان یوروپ اور مشرق وسطیٰ کے شہروں کے سیریں کی تھیں۔ بہت ذہین آدمی تھے۔ اردو خوب لکھتے پڑھتے تھے اور انگریزی لکھنا جانتے تھے۔

غلام حسین اماں کے ماں باپ کے گھر کی آخری یادگار تھے۔ وہ ان کی بہت خاطریں کرتی تھیں۔ انہیں "پکار" فلم دیکھنے کا شوق چرایا۔ اماں انہیں خود سینما دکھانے لے گئیں۔ دسمبر کی ایک ٹھنڈی سہ پہر اسکول کے سامنے اوک لینڈ کا سریلا ہارن بجا۔ میں باہر گئی۔ غلام حسین میرا شربتی رنگ کا اوور کوٹ جس کے کالر پر فرکی تھی سنبھالے پھاٹک پر کھڑے مونچھوں میں مسکرا رہے تھے۔ کہا' "بی بی پکار کا میٹنی شو دیکھنے جا رہی ہیں۔ آپ بھی چلئے۔" اور فلم دیکھ بہت مسرور ہوئے۔

بھائی بی۔ اے آنرز کے بعد ریاضی میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ اور شاہ محمد سلیمان کے بیٹے محمود سلیمان کے ساتھ جو ان کے ہم جماعت تھے سائیکل پر گھوما کرتے تھے۔ اکثر سہ پہر کو لیڈی وزیر حسن ان کی بیٹیاں ٹمن باجی' حسو باجی' بہوئیں اور دیورانی بیگم اصغر حسین جج اور ان کی لڑکیاں یا لال کرتی والے آجاتے یا اماں ان کے ہاں چلی جاتیں۔ زندگی پر سکون اور پر آسائش گذر رہی تھی مگر اس میں ہر دوسرے مہینے تلاطم اس وقت پیدا ہوتا جب ابا جان راجہ صاحب کے ساتھ بسلسلہ مسلم لیگ دورے پر نکلنے کی تیاری کرتے۔ اماں چلانا شروع کرتیں' "صحت گرتی جا رہی ہے اور روز سفر۔ روز سفر۔ کسی دن ٹرین ہی میں نہ جانے کیا ہو جائے۔ ذرا فکر نہیں۔" ابا جان چپ چاپ امیر خاں یا غلام حسین سے اسباب بندھوانے میں مصروف رہتے۔ خدا حافظ کر کے روانہ ہو جاتے۔ اماں اپنے کمرے میں بیٹھی چیخ چلاتی رہتیں۔ غلام حسین اندر آکر کہتے "بی بی آفتاب میاں ہمیشہ کے سیلانی بندے ہیں۔ سفر میں بے حد خوش رہتے ہیں۔ آپ کیوں بیکار غصہ کرتی ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ خیریت سے واپس آئیں گے۔" ابا جان دوسرے شہروں سے پابندی کے ساتھ اپنی خیریت کی اطلاع بھیجتے رہتے۔

کوشک۔ قرولباغ۔ دہلی۔

۲۸ ستمبر ۱۹۴۰ء

السلام علیکم۔ میں آج یہاں پہنچا۔ مشتاق احمد زاہدی کے ہاں ٹھہرا ہوں راجہ صاحب مارینا ہوٹل میں ہیں۔ جمال[5] میاں سنی حبیب[6] اللہ وغیرہ ان کے ساتھ ہیں۔ سب پرسوں میرٹھ جائیں گے۔ وہاں سے سہارنپور۔ مظفر نگر اور دہرہ دون۔

بمبئی

۲۵ نومبر ۱۹۴۰ء

آج میں حسنہ بی بی کے ساتھ عطیہ فیضی کے ہاں گیا۔ زہرا بیگم بہت بیمار ہیں۔ میں خط لکھ کر لیگ کی

میٹنگ میں جارہا ہوں۔ رات کو علی خاں کے ہاں کھانا ہے۔ رات ہی کو لکھنوء روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔

بمبئی

۲۶ نومبر ۴۰ء

--- کل رات روانہ ہونا چاہتا تھا مگر ورکنگ کمیٹی کا کام ختم نہیں ہوا۔ آج ایک اور میٹنگ ہے۔ رات کو چلوں گا۔ کل سے میرے پاؤں کے انگوٹھے کی تکلیف (نقرص) عود کر آئی ہے۔ میں نے چلنا پھرنا بند کردیا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحمید اپنی موٹر بھیج دیں گے۔ اس میں کمپنی[7] تک جاؤں گا اور واپس آجاؤں گا۔ اس کے بعد شام تک کہیں نہیں جاؤں گا۔ سیدھا اسٹیشن جاؤں گا۔

میری رائے میں تم ۳۰ کو ڈنر کے دعوت نامے جاری کردو۔ میرا انتظار مت کرو۔ میں میاں وحید کے پاس تین دن سہارنپور ٹھروں گا۔

لکھنو میں بھائی تازہ ترین ماڈل کی "ڈی۔ کے ڈبلیو" اپرول پر گھر لائے۔ اب وہ برساتی میں کھڑی دمکتی رہتی۔ اوک لینڈ جواب بھی بہت مضبوط تھی موٹر خانے میں سستا رہی تھی۔

مارچ کے مہینے میں میں ماساب کے اسکول کی لڑکیوں کے ہمراہ امتحان دینے بنارس گئی۔ غلام حسین ساتھ تھے۔ بنارس میں ویناتیک راؤ پٹوردھن نے گائیکی کا امتحان لیا۔

اماں کی لڈو پھوپھی (الن ماموں کی چھوٹی بہن) جو ایک بیحد خوبصورت اور فیشن ایبل خاتون تھیں ان کے شوہر جونپور کے خان بہادر سید علی ضامن ان دنوں ریاست رام نگر کے دیوان تھے۔ اور ان کے گھر کے راستے میں کشتیوں کا پل پڑتا تھا۔ اور شہر میں ایک جگہ سرخ رنگ کی وہ کوتوالی تھی جہاں ایک زمانے میں دادا جلال الدین حیدر رہا کرتے تھے۔ اور بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔

مدراس

۱۱۳ اپریل ۴۱ء

السلام علیکم۔ میں خیریت سے ہوں۔ پہلے ٹیلچری کے لئے روانہ ہونے والے تھے جہاں راجہ صاحب موپلا کانفرنس کی صدارت کرنے والے ہیں۔ مگر اب مسلم لیگ کا اجلاس ۱۵ دن تک ہوگا۔ اس کے بعد ٹیلچری جائیں گے۔

مریم منزل۔ پٹنہ

۱۲۳ اپریل ۴۱ء

۔ ہم لوگ کل صبح ایک قصبہ ہے بہار شریف' جہاں ہندو مسلم فساد ہوا ہے۔ وہاں جانے والے ہیں۔ وہاں سے کلکتہ جائیں گے۔ عینی بی بی کا نتیجہ بذریعہ تار اگر ۲۶ مئی تک معلوم ہو اس پتے پر اطلاع دو۔ Care Deputy Mayor Calcutta

بنارس سے لوٹنے کے بعد اپریل میں ہم لوگ آپا عذرا سعید بھائی کی شادی کے لئے علی گڑھ گئے۔

علی گڑھ سے بھائی مسوری چلے گئے۔ ہم لوگ لکھنؤ واپس آئے اور ابا جان پھر دورے پر نکلے۔

مریم منزل۔ پٹنہ

۲۲ مئی ۴۱ء

کل شام ہم لوگ پٹنہ پہنچ گئے۔ امیر خان[8] یہاں پہنچ گئے۔ معلوم نہیں عینی بی بی کا نتیجہ آیا یا نہیں۔ ہم لوگ لیڈی علی امام کے ہاں پرسوں تک ہیں۔ اس کے بعد کلکتہ جائیں گے۔

کلکتہ

۲۹ مئی ۴۱ء

السلام علیکم۔ تم فوراً ذیل کے پتے پر خط لکھو۔ میں ہر روز متوقع ہوں کہ عینی بی بی کا تار آتا ہوگا۔

C/o M.A.H. ISPHAHANI

5, CARMAC STREET CALCUTTA.

یہاں کے اخبارات میں بنارس یونیورسٹی کے نتیجے شائع نہیں ہوتے۔

اصفہانی صاحب کے ہاں مرچوں کا کھانا پکتا ہے۔ میرے لئے بغیر مرچوں کا پکایا جارہا ہے۔ فکر مت کرو۔ اور بھبو جی کی خیریت لکھو۔

دہرہ دون والے حاضر ماموں کے دوسرے بیٹے خواجہ ناظر القیوم لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور چار باغ ریلوے اسٹیشن پر اپنے ریفریشمنٹ روم میں مقیم تھے۔ ایک روز صبح میں غسل خانے میں منہ دھو رہی تھی۔ پچھلے برآمدے سے ناظر بھائی کی آواز آئی "پھوپھی جی۔ رزلٹ آگیا۔"

میں منہ پر صابن لگائے لگائے باہر بھاگی۔ ناظر بھائی نے اخبار ہوا میں لہرایا۔ اسٹیشن پر جونہی بنارس الہ آباد کی ٹرین آکر رکی ناظر بھائی اخبار جھپٹ کر بھاگتے آئے تھے۔ "اردو میں ڈسٹنکشن اور بنارس یونیورسٹی کی تاریخ میں دوسری سب سے کم عمر کنڈیڈیٹ"۔ ناظر بھائی نے اخبار ہمیں پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ ابا جان کو کلکتہ تار دیئے فوراً واپس بھاگے۔

ابا جان کے لکھنؤ آنے پر سامنے کے لان پر زبردست گارڈن پارٹی منعقد کی گئی جس کے لئے حسنین ماموں اور چندا ممانی فیض آباد چھاؤنی سے آئے۔

چند روز بعد ابا جان نینی تال چلے گئے۔

چیتا پارک۔ نینی تال

۲۰ جون ۴۱ء

السلام علیکم۔ کل کاٹھ گودام سے نینی تال تک میاں وحید کا ساتھ ہوگیا۔ وہ انسپکٹر جنرل شفاخانہ جات سے ملنے جارہے تھے۔ میں نینی تال سے واپسی میں دو دن کے لئے نہٹور جاؤں گا۔

سجاد

۴۔ پلکھن کی چھاؤں

ساون بھادوں کے جھالے پڑے اور جھیل ہاتھی ڈباؤ ہوئی۔ مگر لڑکے بالے پیراکی کے مقابلوں سے باز نہ آتے۔ پرلے کنارے بانس کے جھنڈ میں چھپی میراں ابرار علی کی کوٹھی اور ٹینس کورٹ' اس سرے پر مسجد میر بندے علی ترمذی اور محلہ سادات سہ دری۔ ایک طرف کشتیوں کا بیڑہ۔ سردیوں میں نقشہ بدل جاتا ہے۔ کنول کھلے۔ سنگھاڑے کی بیلیں بوئی گئیں۔ بندر کی ذات پانی سے ڈرنے والی پر ادھر فصل تیار ہوئی ادھر اس چالاک قوم نے کنارے سے ہاتھ بڑھا بڑھا سنگھاڑے نوچے۔ اپنے سروں پر کیچڑ تھوپ اس میں سنگھاڑے اڑسے اور پلکھوں پر چڑھ کر غائب۔

جھیل کنبے کی مشترکہ جائیداد ہے۔ فصل اترنے پر سید جلال الدین حیدر مرحوم کے چھوٹے بھائی سید حسین حیدر میر محلہ بڑی پلکھن تلے چارپائی پر بیٹھ کر برادری میں سنگھاڑے تقسیم کرواتے ہیں۔ سال میں ایک بار محلہ ماہی گیراں کے مچھیرے جو دھینور کہلاتے ہیں بلوا کر سول مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ اسے بھی دادے حسین حیدر تقسیم کرتے ہیں۔ گھر گھر لذیذ سولی کی ہانڈی چڑھتی ہے جسے بجڑے کی روٹی سے کھایا جاتا ہے۔ بجڑی کی روٹی چنے کا ساگ۔ دیگ کے اڑد۔ مٹی کی ہانڈی میں پکے رتالو۔ اپنے کولہو کا تازہ تازہ رس۔

یادش بخیر سید سعد اللہ عالمگیری عرش آشیانی کی پڑپوتی شریف النساء سید جلال الدین حیدر کی اماں تھیں۔ شریف النساء بیگم کی بھاوج زینب خاتون کو اللہ نے اولاد سے نانوازا۔ وہ بھی سکندر پور کی زمیندار تھیں۔ وہیں پر انہوں نے چھپے گنبد والی مسجد بنوائی تھی۔ دادی زینب کی جائیداد کی آمدنی ان کی پانچ نندوں کی اولاد در اولاد میں بٹا کرتی ہے۔ غلہ بکنے پر اس کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھی سید حسین حیدر تقسیم کرتے ہیں۔

اناج کی بھوسی اور گنے کے چھلکوں سے کھانا پکتا ہے۔ غریب گھر والیاں اور خوشحال کنبوں میں اصیلیں باندیاں صبح چار بجے سے اٹھ کر چکی پیستی اور دودھ بلوتی ہیں۔ نماز فجر کے بعد گرمیوں کے موسم میں مرد اور لڑکے بالے خربوزے اور تربوز اڑانے گاگن کی طرف نکل جاتے ہیں۔

گلیوں میں ڈولیاں چل رہی ہیں۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر رات کے کھانے کے بعد عورتیں چادر لے یا برقعے اوڑھ کر ایک دوسرے کے گھر ملنے ملانے جاتی ہیں۔ ایک لڑکا لالٹین اور ڈنڈا لئے آگے آگے چلتا ہے۔ قصبے میں بجلی آنے سے قبل مسجد بندے علی میں ہر گھر سے ہفتہ وار سرسوں اور مٹی کا تیل اور چراغوں کی بتیاں جاتی تھیں۔ جھاڑو' پنکھے' چٹائیاں' بدھنے' موذن کی روٹی ہر گھر سے مقرر ہے۔ دھوبی' بہشتی' نائی' حلال خور سب کو تنخواہ کے بجائے ربیع و خریف کی فصلوں پر اناج دیا جاتا ہے۔ بہشتی جمعہ کی دوپہر کو روٹی لے ہے۔ حلال خورنی روزانہ۔

جمعرات کی شام خاندانی قبرستان کا مجاور اور اس کی بیوی گھر گھر پہنچ کر آواز دیتے ہیں۔ جھٹ پٹے کے وقت ڈیوڑھی پر مجاور کی صدا اچانک یاد دلا دیتی ہے کہ قزاق اجل کا لوٹنے ہے دن رات بجا کے نقارہ

اس شام سب گھروں میں حسب توفیق روزمرہ سے بہتر کھانا پکتا ہے جو مجاور کی نذر کیا جاتا ہے۔

نہٹور کی آدھی برادری سادات زیدی' ترمذی سنت جماعت ہے آدھی شیعہ۔ قصبے کے متمول ترین زمیندار سید اقبال مہدی' نونہال مہدی اور غدر والے میراں امتیاز علی کے پوتے میراں ابرار علی سب شیعہ مذہب ہیں۔ لیکن محرموں میں سب سے زیادہ شاندار روشن چوکی دادے غلام حیدر کے ایک داماد کے گھر سے ہی اٹھتی ہے۔

بالی۔ یہ عقیدوں کا معاملہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ ڈپٹی صغیر حسین مرحوم کے گھر کے پچھواڑے محلہ میاں صاحبان میں حافظ میاں محمد امین" خلیفہ شاہ بلاق" کی دو سو برس پرانی کائی آلود درگاہ ہے۔ اس کے ہرے بھرے احاطے میں برگد تلے ان روہیلہ امرائے نجیب آباد کی قبریں موجود ہیں جو بعد مرنے کے نجیب آباد سے لا کر ان بزرگ کے پائنتی دفنائیں جاں تھے۔ حافظ صاحب" کے سجادہ نشین میاں صاحبان سے ہماری کچھ قرابت داری بھی ہے۔ ان کے عرس میں ہم لوگ نہیں جاتے۔ کیوں۔ کہ میاں صاحبان ٹھہرے بریلوی (گو شادی سے پہلے ہمارے دولہا مقلد ہو یا غیر مقلد' میاں صاحب کے مزار پر سلام کرنے ضرور جاتا ہے) اور ادھر کافی عرصے سے ہمارے ہاں علمائے دیوبند کا اثر زائل سا ہو گیا ہے۔ دیوبند سے ایک نہ ایک مولانا نہٹور آکر ہر سال قصبے کی جامع مسجد اور اس کے بعد ہماری بڑی پلکھن کے نیچے وعظ فرماتے ہیں۔ عورتیں کھڑکیوں اور چھتوں پر سے سنتی ہیں۔

ایک دفعے ایک دیوبندی مولانا نے پلکھن تلے فنا و بقا پر بڑا ہی موثر وعظ کہا تھا۔ کہنے لگے "'لال قلعے کے اندر تلاوت کلام پاک میں سورہ یٰسین پڑھنا جرم کی حد تک منع تھا کیونکہ یہ سورہ وقت نزع پڑھی جاتی ہے۔ مگر لال قلعے کے مکین فنا ہو چکے۔ یٰسین شریف باقی ہے۔"

یہ سن کر نین ماموں بہت روئے۔ ان کا اصلی نام تو تھا سید محمد حسنین۔ نین نین کہلائیں تھے۔ ہمارے کنبہ کی شیعہ شاخ کے ایک بزرگ تھے۔ ایک زمانے میں بہت امیر تھے۔ زمینداری فضولیات خرافات میں اڑا دی۔ اب نہٹور سے دھام پور تک ایک نہایت پھٹیچر تانگہ چلاتے تھے۔ بہت سادہ لوح اور خوش دل اور باوضع آدمی تھے۔ دھام پور اسٹیشن پر اترنے والے دور نزدیک کے عزیزداروں کی مجال نہ تھی کہ نین ماموں کی موجودگی میں کسی اور تانگہ میں سوار ہوں یا گھر پہنچ کر انہیں کرایہ ادا کریں۔ پھوپھا برہان حیدر اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بہت خوش مزاج نوجوان تھے۔ نین ماموں کے ساتھ طرح طرح کے مذاق کریں۔ وہ ہنستے رہتے۔ برا نہ مانتے۔ ایک دفعے فاطمہ خاتون نے ان سے پوچھا' "نین ماموں' ابا جان مرحوم آپ کو اتنا چھیڑتے تھے آپ کبھی ناراض نہ ہوئے۔"

آبدیدہ ہو کر فرمایا "'بالی میں اس سے ناراض ہوتا؟ وہ تو یاروں کا یار تھا۔ وہ دل لگی کرے تھا میں بھی دل لگی کروں تھا۔ پر وہ جوان ہی چلا گیا۔" اتنا کہہ' 'دے صورتیں الٰہی' پڑھتے ہوئے تانگہ ہنکا دیا۔ کھچا کھچ سواریاں لاد سکندر پور کی طرف کو بڑھ گئے جہاں بوڑھا پیر اور سالار مسعود غازی کی چھڑیوں کا میلہ

بھر رہا تھا۔

لو اب پوربیوں کی زبان میں ایک نظم سنو جو بھائی نثار حیدر زیدی نے تفریحاً لکھی تھی۔

چل اے ری سکھی دیکھن کو چلیں ہووت ہے میلہ چھڑین کا ۔۔۔ تو کھات پہ اپنی اینڈت ہے گھر گھر ہے رکا چھڑین کا
سنتے ہیں کمسنر آئیں گے اور کیک پھروٹ اڑائیں گے ۔۔۔ سب ڈاک بنگلیہ جائیں گے رونک پہ جلسہ چھڑین کا
کہیں پہ باسن مائی کے ہیں کہیں پہ کپڑے چھاپے کے ۔۔۔ کہیں پہ منکا سیرے کا کہیں پہ چھینا چھڑین کا
چلی کبولی میلے کو اور گلی بھنانے دھیلے کو ۔۔۔ پھرہانک کے بولی ٹھیلے کو چل جھولیں جھولا چھڑین کا
سسرال سے پتر آیا ہے مالک نے مجھے بلایا ہے ۔۔۔ یہ ڈھیرونن میں اب کے برس بھیجا ہے سندیسہ چھڑین کا
اکبال میاں کا دورہ ہے' تحصیل میں جن کا سہرہ ہے ۔۔۔ یہ ڈانڈا ان کا باجت ہے کیا چھیڑیں باجہ چھڑین کا

قبولی جو ایک دھیلہ لے کر چھڑین کے میلے جاتی ہے' اپنے بھائی بندوں کی طرح محلہ سادات کی ایک جھونپڑی کی مکین ہے۔ محلہ جات سادات' قاضیان' افغانان' شیخان' خواجہ زادگان' مولویاں' تیرگران' نوربافاں۔ کلالاں' کائستھاں' چودھریاں میں غرباء کی کمی نہیں۔ خوشحالی چند گھرانوں میں محدود ہے۔ جولاہے' چھیپی' تیرگر یعنی آتشبازی بنانے والے' دھوبی' چمار' مراثی وغیرہ وغیرہ نے ہمارے جدی قطعات زمین پر جھونپڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ ان سے کرائے کے بجائے وقت ضرورت بیگار لی جاتی ہے۔ ہر سال گرمیوں میں ان جھونپڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جھیل سے گھڑے بھر بھر کے اہل محلہ آگ بجھانے کی سعی ناکام کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بے چارے پھونس اور سرکنڈے جمع کر کے اپنے گھروندے پھر کھڑے کرلیتے ہیں۔

"کمینوں" میں کسی کی عورت مرجائے یا بھاگ جائے یا ناپسند ہو تو بازار میں اس کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ جمعہ کے دن گاگن کے نزدیک امروں میں جو پینٹھ لگتی ہے اس میں عورتیں بیچی جاتی ہیں۔ "کمین" اپنی پسند کی جروا خرید لاتے ہیں۔ اچھی ثابت نہ ہوا اگلی پینٹھ میں لے جاکر بیچی دوسرے لے آئے۔ عمر اور شکل کے لحاظ سے کمین عورتیں بیس سے پچاس روپے تک میں مل جاتی ہیں۔

سلطان سنگھ عرف سلطانہ ڈاکو بجنور کا باشندہ اور اپنے وقت کا روبن ہڈ تھا۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل اس نے آفت جوت رکھی تھی۔ امیروں کے دھوئیں اڑا دئے۔ سنتے ہیں قصبے کے سفید پوش مفلسوں یا "کمین" غریبوں میں سے کوئی بٹیی کی شادی یا قرضے کی نالش کے مصائب میں مبتلا ہوتا رات کے اندھیرے میں جھونپڑے کے موکھے میں سے روپے کی تھیلی چھن سے اندر آگرتی۔ دینے والا نظر نہ آتا۔ اسے پھانسی لگنے کے بعد نوٹنکی کی ٹولیاں گاؤں گاؤں "سلطانہ ڈاکو" نامی ناٹک دکھلاتی پھرتی تھیں۔

جب سے برٹش کا راج قائم ہوا ضلع بجنور کی مشہور صنعتیں سسک رہی ہیں یا دم توڑ چکی ہیں۔ گاندھی جی' علی برادران اور جواہر لعل نہرو نے کہا آزادی ملتے ہی مساوات اور خوشحالی کا راج ہوگا۔ تو یہ نہ سمجھنا کہ یہ مفلس اور نادار اتنے بھولے ہیں جتنا ان کو سمجھتے ہو۔ ۱۸۵۷ء میں یہ لڑے بھڑے۔ کانگریس اور خلافت میں یہ جی جان سے کود پڑے۔ کوبہ کو آوازیں بلند ہوتیں "الٰہی آبرو رکھنا میرے ترکی جوانوں کی

دیار مصطفےٰ خیرالوریٰ کے پاسبانوں کی۔ گاندھی جی کی اہنسا سے الگ ایک راستہ انقلابیوں نے دکھلایا۔ یہ اس پر چل پڑے۔ اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔ کہ یہ راستہ بڑی بھاری قربانیاں مانگتا تھا۔

تو آج سے بارہ پندرہ برس ادھر جب اشفاق اللہ اور بھگت سنگھ کا غلغلہ تھا بجنور کے چند سرپھرے انقلابی پارٹی میں شامل ہوگئے۔

پیارے پڑھنے والو۔ شاید تم کو یاد ہو۔ غدر ۵۷ء میں ہمارے نہٹور میں "بارہ ٹوپی[10]" والوں کی خفیہ جماعت بنی تھی جنھوں نے گیارہ مہینے دربار عظام میں آزاد حکومت چلائی۔ "بارہ ٹوپی والے" دراصل لال قلعہ دلی کے بارہ عاقلوں کی کونسل کا نام تھا جو مرزا الٰہی بخش' نواب فاضل بیگ' حکیم احسن اللہ' نواب نبی بخش' محبوب علی خاں' خواجہ سرا' مرزا جام بیگم' راجہ دینا ناتھ وغیرہ پر مشتمل تھی لہٰذا نہٹوریوں نے بھی اپنی ایمرجنسی کونسل کا نام "بارہ ٹوپی والے" رکھا تھا۔

۱۹۳۶ء کے نہٹور کی اس انقلابی پارٹی میں بھی بارہ آدمی شامل تھے۔ لال قلعہ دلی والے مدبر بڑے بڑے امراء تھے۔ دربار عظام نہٹور والے چھوٹے موٹے جاگیردار۔ مگر یہ نئے انقلابی سارے کے سارے محلہ مولویان نہٹور کے غریب کاریگر ہیں۔ کہ مولویوں کی قطار سید احمد بریلوی سے لے کر علمائے دیوبند تک جنگ آزادی میں صف بستہ پیش پیش رہی ہے۔ کانپور کے "بابا خضر" ان انقلابیوں کے لیڈر تھے۔ کافی عرصہ نہٹور میں روپوش رہے۔ ان میں سے ایک مستری مبارک حسین' پہلے بہت آسودہ حال تھے۔ اپنی لاری چلاتے تھے۔ پھر لاری احرار پارٹی کو بخش کر خان عبدالغفار خان کے بلانے پر پشاور چلے گئے۔ لاہور میں بھگت سنگھ سے ملاقات کی۔ ۲۹ء میں بریلی اور پیلی بھیت اور اکوڑہ میں ریلوے لائن اکھاڑی۔ پولس نے فیر کیا۔ بھاگ نکلے۔ نورپور میں پولس اسٹیشن جلایا۔ ہیڈ کانسٹبل شاکر حسین کی مدد سے جیل سے فرار ہوئے۔ غرضیکہ مستری مبارک حسین اور ان کے ساتھیوں[11] نے زندگیاں اسی جدوجہد کے لئے وقف کردیں۔ گھر بار تباہ کردیے۔ پھر معلوم ہوا کہ انقلاب فیل ہوگیا۔ یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

اور آج ۱۹۴۱ء میں محلے کے لڑکے بالے پلکھن تلے جمع ہو کر گا رہے ہیں "کشکول گدائی لے کے پھرا۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔ نقشہ ہی بدل گیا' میاں۔

۵۔ بعوض پان صد اشرفی محمد شاہی مع گھریلو شاعری

ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل۔ میں کا منڈھا چھوواؤرے۔ سید جلال الدین حیدر صاحب مرحوم و مغفور کے مکان کی ڈیوڑھی میں ان کا میانہ رکھا ہے۔ اندر سروری میراثن کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔ آس پاس جھیل کنارے کے ہرے بانسوں کا منڈھا تیار کیا جا رہا ہے۔ جو ہندو ودواہ منڈپ کا گویا "اسلامی" روپ ہے اس منڈپ کا فرش دولہا کی بہنیں اپنے ہاتھ سے لیپیں گی اور یہیں لڑکے کو دولہا بنایا جائے گا۔

بہنوئی' پھوپھا یا پھوپھی زاد بھائی سہرا باندھیں گے۔ میراثی نساب زبانی شجرہ سنائے گا۔ دلہن کے گھر

جانے سے پہلے درگاہ حافظ محمد امین" پر دولہا حاضری دے گا۔ متشرع گھرانوں میں مہتروں کے بینڈ کے بجائے دف بجتی ہے۔

اب دلہن کا فوٹو گراف دیکھو۔ ابھی بیس پچیس سال ادھر تک کنواری بالیاں نہ مانگ کاڑھیں تھیں۔ چنے ہوئے دوپٹے اور مہندی کی مناہی تھی۔ سیدھے تنگ پائجامے پہنتی تھیں۔ اریب یعنی آڑے پائجامے معیوب تھے۔ کہ یہ طوائفوں کا پہناوا تھا۔ لو بوا دیکھتے دیکھتے نہٹور میں آڑے پائجامے' پنجابی شلواریں' ہندوستانی ساریاں سبھی چل پڑیں۔ جب بدیشی کپڑوں کی ہولیاں جلیں میاں عثمان حیدر نے اپنے قیمتی سوٹ نذر آتش کئے۔ بی فاطمہ خاتون کو ان کی ممانی نذر سجاد نے ۱۹۲۶ء میں ان کی شادی کا تحفہ کھادی کا جوڑا دیا۔ بھابی وحیدہ بھی کھادی پہن رہی تھیں۔ میاں سب کے سرکاری ملازم۔ بیویاں سودیشی۔

دلہن کا جوڑا ہمارے ہاں کا مخصوص ہے۔ تلے اوپر چار دوپٹے۔ رانگے کی ایک خاص نمونے کی چھپائی کے سرخ ٹول کا دوپٹہ سب سے اوپر۔ اس کے نیچے دوسرا دوپٹہ کسم رنگ کا۔ جو رہنی کھیلنے والے دن رنگا جاتا ہے۔ اس کے نیچے باریک لال رنگ کے۔ چاروں کو ملا کر کنارے پر سراسری ٹانکی جاتی ہے۔ کالی نواڑ کی پٹی پر باریک سفید موتیوں کا جال۔ بیچ میں ایک بالشت پر سونے کی سات یا گیارہ ٹکلیاں تورانی وضع کی۔ سامنے چار انگل چوڑی موتیوں کی جھالر۔ دولہن کی اکیس چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں۔ یہ بھی تورانی فیشن ہے۔ قدیم سے چلا آتا ہے۔ نکاح کے سرخ ٹول کے جوڑے پر قینچی نہیں لگائی جاتی۔ تھان سے پھاڑ کر سات سہاگنیں اسے سیتی ہیں۔ بارات آنے پر دلہن کے گھر کا سقہ گھوڑے کے قدموں پر پانی کی لگن انڈیلتا ہے۔ نیگ لے کر چھوڑتا ہے۔

صبح چار بجے دلہن کی بہنیں بھاوجیں بری کا جوڑا بیونتی ہیں۔ نماز فجر کے بعد باجے والے "منڈھا جلاتے ہیں۔" شام کو مٹی کی پلیٹوں میں ساری برادری کا کھانا ہوتا ہے۔

جہیز میں چھری' چاقو' سروتہ (کاٹنے والی چیزیں) اور دست پناہ' چکنی (کھٹ پٹ کرنے والی چیزیں) نہیں دی جاتیں۔ رخصتی کے وقت لڑکی کے بزرگ مرد باحفظ مراتب باری باری سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتے ہیں۔ اور وہ بے تکان روتی ہے۔ میراثنیں گاتی ہیں۔ نیم تلے سے پھلکیا جو نکلی بیرن نے کھائی پچھاڑ رے۔

دولہا کے ہاں پہنچ کر دلہن کا ہاتھ صندل کے پانی میں ڈال کر دیوار سے لگایا جاتا ہے۔ پھر وہ گھر کے چاروں کونوں میں وہی پانی چھڑکتی ہے۔ خالص ہندو رسم۔

مکان کے باہر تیر گر آتشبازی چھوڑتے ہیں۔ بھانڈ نقلیں دکھاتے ہیں۔ اور انعام میں "سیدھا" یعنی آٹا' چاول اور کچا گڑ پاتے ہیں۔ میراثنوں اور "کمینوں" کو دولہا اور دلہن کے گھروں سے ہر رسم کے بعد ثابت کالے اڑد کی دال اور روٹی دی جاتی ہے۔ پلکھن کے نیچے دیغیں گاڑ کر نائی کھانا تیار کرتے ہیں اور ہر ریت رسم کے بعد مجو نائن برادری میں حصے بانٹنے نکلتی ہے۔ چھمی مالن جو جمعے کے جمعے گھروں میں مہندی اور ریٹھے آنولے لاتی ہے شادی کے مواقع پر بحد حسین سہرے اور ہار گوندھتی ہے۔ اس کا مالی کسی جرم کی

سزا میں کالے پانی بھیج دیا گیا۔ اس ستونتی نے پاکدامنی سے ساری عمر جمانوں کی خدمت میں گذار دی۔

حلال خورنیں دولہا کے ہاں "بدھائی ڈالتی" ہیں اور ڈھولک کی تھاپ پر کڑے سے کڑا بجا کر ناچتی ہیں۔ چوتھی کے روز دلہن کے سگے اور رشتے کے بھائی اس کے میکے لے جانے کے لئے آتے ہیں۔ دلہن سیدھے کے نام سے مٹھائی لے کر سسرال واپس جاتی ہے۔ ہر میوے کی فصل پر دھڑیوں اور منوں کے حساب سے آم' خربوزے دلہن والے اس کی سسرال بھیجتے ہیں۔ جو ذرا ذرا سا حصہ ہو کر ساری برادری میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔

پہلے رمضان میں لڑکی کا باپ بے چارہ کئی من روٹی اور دو طرح کا سالن بیٹی کی سسرال بھیجتا ہے وہ برادری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لڑکی دونوں "جلتے چاند" محرم اور شب برات' میکے میں دیکھتی ہے۔

سادات نہٹور کا اپنا خبرنامہ "مرقع نہٹور" حاجی خلیل احمد لکھنؤ سے ہر مہینے شائع کرتے ہیں۔ اس میں خبروں کے علاوہ "ہاؤس پوئیٹری" چھپتی ہے۔ بھائی سجاد حیدر' بھائی نصیرالدین حیدر' بھائی نثار حیدر زیدی' آپا نثار فاطمہ' وحیدہ بیگم پختہ گو شاعر ہیں۔ نئی پود میں فاطمہ خاتون' عذرا' نفیسہ خاتون اچھے خاصے شعر کہہ لیتی ہیں۔ ولادت' شادی اور موت کی قطعات تاریخ کے ذریعے نشاندہی کا دستور ہے۔ اردو تہذیب بنیادی طور پر شاعری کی تہذیب ہے۔

مئی ۱۹۲۶ء۔ میاں عثمان حیدر کی شادی۔ ہلکی پھلکی غنائیہ شاعری کا دور۔ بھائی سجاد نے لکھا"

گلریز ہے دشت و دمن گل پاش ہے صحن چمن
ہر سو طرب جلوہ فگن صوفی بھی کیا ہے شوخ دشن

دیر و حرم سے نعرہ زن آئے ہیں شیخ و برہمن
یا جو بھی ہے گل پیرہن رنگیں بیاں رنگیں سخن

ہاں مطربہ بربط بزن ساقی مرا از پا فگن
زاہد سے کہہ دو یہ سخن ہے فصل گل توبہ شکن

گزرا ہے عیش جاں وتن میخواروں کا سیکھے چلن
ایک دشمن ایماں و دیں ثانی نہیں جس کا کہیں

مذہب ہے جس کا غیظ و کیں ایسا کوئی ایک نازنیں
وحشت فزا قہر آفریں چنگیز جس کا خوشہ چیں

خوں ریز جس کی آستیں قاتل کی سی جس کی جبیں
خنداں و خوش آیا یہاں مسرور تھا اور شادماں

رخ پہ مسرت تھی عیاں لب پہ خوشی کی داستاں
تیر و تبر تیغ و سناں رکھ کر ہوا سجدہ کناں

کرنے لگا ورد زباں شکر خدائے ذوالمنن
جب شادیاں ہو ہر طرف جب رنج و غم ہوں برطرف

خوشیاں کھڑی ہوں صف بہ صف ہر شخص ہو جب زر بکف
ہے باعث عز و شرف گر چھوڑ دوں اپنا شغف

لوں ہاتھ میں میں چنگ و دف کیا خوب ہے مطرب کا فن
اس شہر کے برنا و پیر مفلس ہوں وہ یا ہوں امیر

ہیں خوش لقا روشن ضمیر دلدار دلبر دل پذیر
ہیں قلب ان کے مستنیر مہر و وفا ان کا خمیر

پر لطف ان کی دار و گیر دلچسپ ان کا وہ بزن
یہ سب تو اک افسانہ تھا تخیل کا کاشانہ تھا

رندانہ تھی طرز ادا دل میں ہے حرف مدعا
گو سب سے سن لی واہ وا ہے اب مگر وقت دعا

مقبول ہو نزد خدا مقصد نہیں شعر و سخن
کہتے ہیں سب گردوں نشیں جن و ملک حور و عیں

ہو آج تم الفت گزیں عثمان حیدر آفریں
اے قیس کے طینت گزیں ایک لیلیٰ محمل نشیں

گھر میں تمہارے ہو گئیں باعفت و باعلم فن

جولائی ۲۹ء بھائی اعجاز حیدر مرحوم کی پری تمثال بچی عائشہ صدیقہ خاتون شادی ہو کر پردیس جا رہی تھی۔ غیروں میں بیاہی گئی۔ دولہا سید احمد رشید کی دادی سرسید احمد خاں کی قریبی عزیز تھیں۔ والد سید محمد میر مرحوم سید محمود مرحوم کے رضاعی بھائی۔ میرٹھ میں باثرؔ۔

عصمت کا در، حیا کا صدف، علم و فن کا پھول گوہرمین کا ایسا نہ باغ عدن کا پھول
صدقے میں اس شرف کے کہ ہے بنت فاطمہ۔ پاکیزہ سیرتی میں ہے وہ یاسمن کا پھول۔ اے سروباغ حضرت میرجناں مقام ہم آج تم کو دیتے ہیں اپنے چمن کا پھول۔ دلہن کے چچا سجاد حیدر نے کہا۔

دولہا کے بہنوئی الٰہ آباد کے باثرؔ محمد حسین نے جھٹ کھڑے ہو کر فی البدیہہ جواب دیا؎

اعجاز حیدری کا نرالہ ہے یہ اثر گلچیں کو ساتھ لے گیا اس کے چمن کا پھول

پہلا مصرعہ یاد نہیں آرہا۔ پر دوسرا تھا؎

بلبل کو میرے لے گیا تیرے چمن کا پھول

شادی کے مشاعرے کے لئے ساغر نظامی نے لکھا "عروس کا الوداعی گیت"

میری آزادیوں کے زمانے گئے۔۔ زمزے۔۔ ولولے۔۔ چہچہے۔۔ ہو چکے۔۔ السلام اے وطن اے زمین وطن آسمان وطن -- تیری گودی میں پل کر ہوئی میں جواں -- شادماں، کامراں، ضوفشاں -- تیرے پھولوں سے مہکا مرا گلستاں -- نغمہ خواں -- نغمہ زن -- میں تو ہوتی ہوں رخصت تری بزم سے تاقیامت الٰہی تو یوں ہی رہے۔ پُراماں۔ خندہ زن

صدیقہ خاتون بجنور سے ذرا دور دلی ہی جارہی تھیں مگر پردیس بیاہے جانے کا کیا ہنگامہ تھا۔

چچا سجاد نے فرمایا؎

بدر خانہ اغیار غزل خواں رفتم نکہت افشاں چودم باد بہاراں رفتم

قصبے کے کاستھوں، تیاگی برہمنوں اور چودھریوں کی شادیوں میں بھی اردو فارسی سہرے کہے جاتے ہیں۔ بات یوں ہے کہ سہرے، تہنیتی نظمیں، قصیدے، قطعات تاریخ اور زبان کے کھیل کھلونے ہیں۔ سیماب اکبر آبادی نے بھائی صغیر حسین مرحوم کی بچی نفیسہ کی میاں اطاعت حسین سے شادی کی تاریخ کھڑے کھڑے نکال دی۔

کیا عقد کا سال سیماب نے بنائے نفاست برائے اطاعت

ڈپٹی صغیر حسین مرحوم کے پائیں باغ میں یوکلپٹس کے درختوں اور گلاب کی جھاڑیوں کی افراط ہے۔ شادیوں کے مشاعروں کے لئے شعرائے کرام باہر سے بلائے جاتے۔ مردانی کوٹھی میں ٹھہرتے۔ ایک روز صبح سویرے ڈپٹی صاحب کی نواسی بھائی نصیرالدین حیدر کی کمسن بچی زہرا کھیلتی کودتی باغ میں پہنچی، پھونس کے سمرہاؤس میں ساغر نظامی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔۔۔ زہرا بی بی نے بہت سے پھول توڑ کر گلدستہ پیش کیا۔

زہرا کے گلدستہ پیش کرنے پر

جس طرح دیتی ہے شب کو شام قرص ماہتاب جس طرح نور سحر دیتا ہے نذر آفتاب
جس طرح بلبل رنگیں کو دے طشت شمیم جس طرح دے صبح کو افسردہ نکہت نسیم
شمع بخشے گوشۂ تاریک کو جس طرح نور حور جیسے دے فرشتے کو صبوحی طہور
پیش کش ماہ منور کو بہ انداز حجاب دے ثریا جس طرح اپنے ستاروں کا رباب
جس طرح مرشد کو طالب دے امانت روح کی جس طرح اللہ بخشے آدمی کو زندگی
بالکل ایسے ہی مجھے زہرا نے گلدستہ دیا رنگ وبو کا سر خاموش و پربستہ دیا
دل میں رکھ لوں روح کی خلوت میں پھیلا دوں اسے یا نسیم آہ سے کچھ اور مہکا دوں اسے

بھائی نثار حیدر زیدی کی بیٹی حسنہ کنبے کی پہلی گریجویٹ لڑکی۔۔۔۔۔۔ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ اسی سال اکتوبر میں سید اکرام حیدر ترمذی کے پوتے، سید غنی حیدر کے سپوت جائے سید لقمان حیدر سے نہٹور میں بیاہی گئیں۔ دلہن کے نانا ڈپٹی صغیر حسین کی زنانی کوٹھی میں جگر مراد آبادی کی بیگم شیرازن نے بیاہ کے گیت الاپے۔ باہر مردانی کوٹھی میں حسب معمول مشاعرہ ہوا۔ سیماب اکبر آبادی نے رسالہ شاعر، کا باقاعدہ حسن زہرا نمبر شائع کیا۔ اس میں خاندان کے بچے بچے نے فلاں حیدر فلاں نہٹوری کے نام سے طبع آزمائی کی۔ محلہ کائستھان کے شعراء نے طویل سہرے کہے۔

نہٹوری کائستھوں کی شادیوں کا ایک دلچسپ گیت

ارے مورے انگنوا بیلا کی بہار ڈپٹی بھی بیٹھے، کلکٹر بھی بیٹھے
بیٹھے سب سے سندر میاں ہمار

لیکن ایک بات پر غور کر لو۔ ہندو مسلمان مرد شرفاء آپس میں ملتے جلتے ہیں ان کی عورتیں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی اور ایک دوسرے کی مخلوط طرز معاشرت تک سے ناواقف ہیں۔ صرف نوکر پیشہ عورتیں کہارنیں، ماتیں، منہاریاں ہندو مسلم زنان خانوں میں جاتی آتی ہیں۔

سید جلال الدین حیدر مرحوم اپنے مکان کی دوسری منزل ہی کے چاروں کونوں پر اپنی چار بہوؤں کے لئے برجی نما کمرے بنوا گئے تھے۔ ان میں سے ایک برجی کی الماری میں دستاویزیں اور وصیت نامے مقفل ہیں۔ سترھویں اٹھارویں صدی میں قسمت نامے قاضی سرکار سنبھل اور مغل صوبیداروں کی مہروں کے ساتھ بزبان فارسی رقم کئے جاتے تھے۔ ملکہ ثوریہ کے اشٹام پیپر پر لکھا ایک وصیت نامہ بزبان اردو

"منکہ سید بندہ علی ولد سید امام بخش مرحوم و مغفور، متوطن قصبہ نہٹور تعلقہ ضلع بجنور کا ہوں... جو ..... جائیداد..... کثیرالاولاد و مختلف الازدواج ..... بباعث ضعیف العمری و پیری نقاہت اور ناتوانی زیادہ طاری ہونے والی ہے لہٰذا احتمال غالب ہے کہ شاید ہوش و حواس کامل بجانہ رہیں۔ پس بہ نظر دوراندیشی حال مرداں زمانہ مختلف دیکھ کر تحریر قرطاس ہٰذا واجبا...... کہ ہر ایک شخص خاصیت جداگانہ و مزاج علیحدہ

علیحدہ رکھتا ہے۔...... پس حق رسائی حقداران علی قدر مراتب نام بنام جداگانہ موافق عقل اپنی کے کرتا ہوں۔ چنانچہ مکانات اندرونی حویلی کلاں و دیگر حویلیات بہ تعمیر پختہ بمہ جہت مرتب و مسقف و چاہ و باغات انبہ واراضی شوروبنجر و حنجر و چراگاہ و تالاب و سرائے وزیور طلائی کنج' چمپا کلی' کنٹھ مالا' حلقہ ہائے بنی' بولاق' بازو بند' پہنچی' چوہے دتی' جگنو' آرسی' نو نگے' نگر' ہیکل' مالاہائے اشرفی' سکہ کلمہ' سنگار پٹی' ظروف نقری و مسی و دوشالہ جات......

سید بندے علی
ساکن قصبہ نہٹور۔ سرکار سنبھل
مضاف بصوبہ مستقر الخلافہ اکبر آباد
اسٹام سکہ کلدار

۲۰جنوری ۱۸۷۴ء

نکتہ غور طلب اس میں یہ ہے کہ انگریزی عملداری میں یہ خیال پرست بزرگ اب تک سرکاری کاغذات پر عہد مغلیہ کا "سرکار سنبھل' مضاف بصوبہ دارالخلافہ اکبر آباد" لکھ رہے تھے۔

اور بیسویں صدی میں پہنچ کر صرف چند سال ادھر تک ہمارے خاندان میں نکاح نامہ پر مہر "بعوض پانصد اشرفی محمد شاہی" لکھا جاتا تھا۔

ایک سادہ لوح جنتی قوم کے یہ افراد خیالی "سرکار سنبھل دارالخلافہ اکبر آباد" میں رہتے تھے۔ اور لڑکیوں کا مہر محمد شاہ رنگیلے بادشاہ غازی کی خیالی اشرفیوں کا باندھتے تھے' جبکہ ان میں سے بہت سے پانچ ہزار روپیہ چہرہ جارج ششم ادا کرنے کا مقدور نہ رکھتے تھے اور شاعری کرتے تھے۔ جس میں رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے تھے۔

اب نہٹور سے کول چل کر نئی روشنی کا سینما دیکھتے ہیں۔

اپریل ۱۹۴۱ء

چہ روز مسرت چہ روز سعید — بفضل خداوند مارا رسید
سعید جگر گوشہ ام نورعین — عروسی اوہست یا جشن عید
چناں بر زمیں زہرہ آمدز چرخ — خمیدو چمید و زمیدو رمید
چو پرسیدم ازدے چہ حالت گفت — چرا من نرقصم بطرز جدید
بخوانم برقصم بنازم ہما — کہ یزداں مرا خود براین آفرید
سرشتم طرب نغمہ روح من است — زمن عشق و مستی بباید فرید
من و چنگ و بربط من ورنگ ونے — من و ساز عشرت کہ وقتش رسید [12]

چرا من نہ رقصم بطرز جدید۔ دلہن بی مایوں کے کمرے میں بیٹھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آسمان میں تھگلی لگا رہی ہیں۔ یہ تو بھنو علی گڑھ آن کر دیکھا۔ لنکا میں جو نکلا باون گزا۔ دلہن کہہ رہی ہیں امیری غریبی منجانب اللہ نہیں۔ دولت برابر برابر تقسیم ہونی چاہئے۔ دوسری افلاطون کی خالہ بولیں۔ انگریز مسلح انقلاب

کے ذریعہ ہی نکلے گا۔ ایک صاحبزادے نے فرمایا جب تک مولویوں' پنڈتوں کا تسلط ہے عوام ترقی نہیں کر سکتے۔

قصہ یہ ہے کہ سید کے کالج میں آج کل باغیانہ باتوں کی بڑی شورش ہے۔ مولانا محمد علی کے دنوں میں کم ہنگامے ہوئے تھے۔ لیکن اب چرچا ہی جداگانہ ہے "سماجی انصاف"۔ "معاشی برابری"۔ توبہ توبہ۔ اللہ وہ وقت نہ لائے جب ہمارے ہاں کی چھپنی' دھنے' بھڑ بھونجے ہم سے برابری کا دعویٰ کرنے لگیں۔ سنتے ہیں میر خانی گردی اور غدر میں یہ بھی ہوا تھا۔ ہماری رعیت نے گواروں کے ساتھ مل کر جب موقع ملا خوب ہاتھ رنگے۔

امیر نشاں علی گڑھ میں بھائی نصیرالدین حیدر کی بڑی بیٹی عذرا جو مایوں بیٹھی ہیں۔ بی۔ اے میں ماشاء اللہ ساری یونیورسٹی میں فسٹ آئیں۔ بی ٹی بھی پاس کر لیا۔ عذرا بی کے چھوٹے بھائی اچھے میاں' چھوٹی بہن زہرا' خالہ زاد بھائی جرار حیدر بیٹھ کر چین جاپان کی اڑاتے ہیں۔ اول فول۔ زمینداروں کے وہ خلاف۔ مسلم لیگ سے انہیں للہی۔ برٹش کی سرکار سے انہیں خدا واسطے کا بیر۔ میں نے کہا بھیتے اللہ کا شکر ادا کرو۔ چین کی بنسی بجاتے ہو۔ جرمن والا یا روس والا آن پڑا آفت آجائے گی۔

آج صبح کی بات ہے۔ ڈاک میں لاہور سے ایک نئے فیشن کا ادبی رسالہ آیا۔ اللہ رکھے میاں بہاء الدین عذرا بی کو دے گئے۔ ان کی بڑی اماں مایوں کے کمرے میں موجود تھیں۔ بولیں "عذرا میں تو اب آنکھوں سے کچھ پڑھ نہیں پاتی تم کوئی اچھا افسانہ ہو تو پڑھ کر سنا دو۔"

عذرا نے پڑھنا شروع کیا' "رامو قلی نے دو دن کے فاقے کے بعد جب اپنی جھونپڑی میں ------"

"آگے چلو۔" بڑی اماں نے اکتا کر کہا۔

عذرا بی نے ورق پلٹے "اچھا سنئے۔ یہ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ہے۔ یہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے غریب کسانوں کے متعلق سنئے۔"

ان کی بڑی اماں کچھ دیر چپکی بیٹھی سنتی رہیں۔ پھر بولیں "کسان لڑکی کے مکھن جیسے پاؤں۔ بچاری کسان لڑکیوں کے پاؤں دھول میں اٹے ہوتے ہیں۔ بی بی۔"

"بڑی اماں۔" عذرا بی نے پلکیں جھپکا کر کہا' "آپ فیوڈل دور کی ادیبہ ہیں۔ یہ عوامی ادب ہے۔"

"عذرا تم مجھ سے باؤلی باتیں مت کیا کرو۔" انہوں نے جواب دیا اور اٹھ کر دیورانی کا ہاتھ بٹانے باہر چلی گئیں۔

امیر نشاں میں لڑکی والے رہتے ہیں۔ بارات مسعود منزل سے آوے گی۔ بھائی بھائی آپس میں سمدھی۔ سارے رشتے دار دونوں طرف بٹ گئے ہیں۔ لڑکے والی سمدھنوں کی پٹائی کے لئے پھولوں کی چھڑیاں تیار کی جا رہی ہیں۔

گواب محمد شاہی خیالی اشرفیوں کے بجائے مہر عرصے سے سکہ رائج الوقت کا بند ھنا ہے۔

سعید میاں کو کئی برس انتظار کرنا پڑا عذرا بی اے پڑھ لیں تو بیاہ ہو۔ دولہا دلہن کے بڑے ابا نے جو نظم کہی اس میں اس طرف بڑا خوبصورت اشارہ تھا۔ پچھلے برس ٹونک میں نکاح کے وقت پڑھا۔ مقطع پر پہنچے

ان کا نصیب کامگار، ان کا زمانہ ساز گار　　غنچہ وگل کھلیں ہزار، ان کے چمن میں ہو بہار

تو حاضرین محفل کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بھائی جان تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ یہاں مسعود منزل میں دعوت ولیمہ پر یہی نظم خوش گلوری میاں سے پڑھوائی جنہوں نے جگر صاحب کے ترنم میں سنا کر سماں باندھ دیا۔ لوتبرکاتم بھی سن لو کہ اب عذرا بی سعید میاں کے بڑے ابا کی داستان حیات عنقریب ختم ہوا چاہتی ہے۔

آج چمن میں ہے بہار، گل بھی ہیں اور گل عذار　　مجھ سے خطیب شاخسار کہہ یہ رہی ہے بار بار
نکلیں گی کیسی حسرتیں، دل میں ہیں اس کی کاہشیں　　اس پہ کروں گا نافلیں، شیخ حرم ہو ہوشیار
کس کو خیال عزو جاہ، کس کو خیال رسم و راہ　　میں تو ہوں رند بے پناہ چھیڑو نہ مجھ کو زینہار
توبہ شکن ہے مے فروش چار طرف ہے ناؤ نوش　　شرع مبیں کا کس کو ہوش، کیوں نہ ہوں میں بھی میگسار
آج ہے مجھ کو انتظار، حسرت دید روئے یار　　اے کہ ستم تراشعار گاہ زہے یاد آر
راحت جان بیقرار، آکہ مجھے بھی ہو قرار　　اب نہیں تاب انتظار، کچھ تو ہو عہد استوار
گرچہ رہا میں غم بدوش، آہ نہ کی رہا خموش　　کعبہ دل سیاہ پوش، کیا کہوں کیا تھا حال زار
شکر کہ آج آگیا، خانہ دل بسا گیا　　روح پہ میری چھاگیا، آج تو میں ہوں بختیار
آج سعید ہے سعید، آج ہے اس کا روز عید　　غنچہ آرزو دمید نخل مراد بار دار
بنت نصیر نکتہ داں، صاحب علم بیکراں　　مایہ ناز دختراں، علم و حیا کی تاجدار
آج ہے ان کا ازدواج عرش پہ گفتگو ہے آج　　مل کر وفا کا تخت وتاج ان کو ملا بہ ایں قرار
گلشن دہر میں بسیں تابہ ابد وہ خوش رہیں　　دیکھ کے ان کو سب کہیں ہوتے ہیں ایسے بختیار

ان کا نصیب کامگار، ان کا زمانہ سازگار
غنچہ گل کھلیں ہزار، ان کے چمن میں ہو بہار

۶۔ بلبل کے کاروبار

نمبر۱۲ فیض آباد روڈ۔ لکھنؤ

۱۰ جولائی ۱۹۴۱ء

ڈیئر ظفر عمر۔ تمہارا خط ملا۔ تم کبھی کبھی اس قسم کی چیز از قسم یاد ایام مانگتے ہو۔ آج کا پانیر پڑھ کر بے ساختہ یہ اشعار قلم سے نکلے

پڑھنے سے کچھ غرض نہ پڑھانے سے واسطہ　　استاد جامعہ کو ہوس عزو شاں کی ہے

بھائی کو ٹھونس دوں کہ بھتیجے کو ٹھونس دوں　　اب اپنے بعد فکر انہیں خانداں کی ہے
کہتا ہے سرگذشت لطیفہ نیا سناؤ　　محفل میں آج دھوم تمہاری زباں کی ہے
ہو جامعہ میں روز نیا معرکہ تو کیا　　ہم کو تو یاد فصل گل اس گلستاں کی ہے
جولانۂ چمن تھا ہوا آج داغ دل　　دراصل یہ اساس میری داستاں کی ہے

علی گڑھ میں ان دنوں شعبہ سائنس کے ایک معمر پروفیسر کے ایک کمسن لڑکی سے عقد ثانی کا بھی بہت چرچا تھا۔ پروفیسر صاحب کی پہلی بیوی از حد دل گرفتہ تھیں۔ وہ ایک صاحب دیوان شاعرہ اور بھولی بھالی اللہ والی خاتون تھیں اور سب کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ ابا جان اور اماں ذاتی طور پر ان سے واقف نہیں تھے لیکن یہ دونوں ساری عمر کثرت الازدواج کے خلاف شدومد سے لکھتے رہے تھے۔ ابا جان نے سرگذشت میں ایک مختصر سا ڈرامہ "سرسری انصاف" اس واقعہ کے متعلق شائع کیا۔

سرگذشت۔ علی گڑھ

مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۴۱ء

برادرم سجاد۔ سلام۔ ۲۴ جولائی کا سرگزشت پڑھ کر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک خط بھیجا ہے جو آئندہ اشاعت میں درج ہو گا اور ایک شعر میری اور آپ کی نذر کیا گیا ہے۔ مگر نہ ایک غریب بیوی کا دل ٹوٹتا نہ یہ غوغا ہوتا۔ مولانا کا خط ملفوف ہے۔ تمہارا جواب شوخی سے بھرا ہونا چاہئے۔ میں ۳۰ جولائی کی شام کو ڈاک گاڑی سے لکھنؤ پہنچوں گا۔ مسز سجاد کو سلام۔ بچوں کو دعا۔

تمہارا　　ظفر عمر

لکھنؤ۔ ۷ اگست ۱۹۴۱ء

ایک اولڈ بوائے کی دعا ایک اولڈ بوائے کے لئے

وہ فاتح قلوب دلوں کا وہ حکمراں　　پرچم ظفر کا کھول کے ہوتا ہے پھر رواں
ہندوستاں کے بعد ہے فتح دکن کا عزم　　نصرت تمہیں نصیب ہو احمد سعید خاں
اللہ نے کیا ہے تمہیں صاحب نفوذ!　　اور شاہ نے کیا ہے رعایا کا پاسباں
کوشش یہ ہو کہ خلق خدا کا رہے خیال　　اور یہ نہ ہو تمہاری جبیں شہ کا آستاں!
سونپی گئی ہیں تم کو دکن کی مقدرات　　اب اس کو خار زار بناؤ کہ گلستاں
ہو معدلت اساس سیاست مدار کا　　نصفت مآب بن کے کرو سحر کاریاں
لازم ہے قلع قمع کرو اہل جور کا　　اوروں کے واسطے ہو خطا بخش و مہرباں
دلدار و دلنواز و کرم گستر و جواز　　زر پاش وسیم پاش و گہربار گل فشاں

ہو غلغلہ دکن میں کہ یاں آگیا وزیر
حق کوش، حق شناس، بہی خواہ قدراں

آپا عذرا کی شادی کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ علی گڑھ سے فیض آباد چھاؤنی ۔ ۔ ۔ جہاں کیپٹن ایس ۔ اے حسنین کے تیز سبز باغ پر بھاری سرمئی گھٹائیں جھکی رہتی تھیں ۔ چندا ممانی کی بڑی بہن منور ممانی مراد آباد سے آئی ہوئی تھیں ۔ رات کا کھانا برآمدے میں دسترخوان بچھا کر کھایا جاتا اور آم کی بالٹی پاس بھری رکھی رہتی ۔

ماموں کے ایک دوست انڈین میڈیکل سروس کے میجر وہاج الدین احمد مرزا چندا ممانی کے منہ بولے بھائی بیچلر تھے ۔ اماں نے فوراً ان کے لئے رشتے تجویز کرنے شروع کر دیئے ۔

۱۶ جولائی کو ازابلا تھوبرن کالج کھلنے والا تھا ۔ حسنین ماموں کے خانہ زاد ملازم بوا سوسن مرحومہ کے بیٹے چھٹوا کے ہمراہ لکھنؤ ۔

جون کے مہینے میں ابا جان داخلے کے لئے مسز داس کے پاس لے گئے تھے ۔ وہ ایک گوری چٹی نقرئی بالوں والی شاندار خاتون اور آئی ٹی کالج کی پہلی ہندوستانی پرنسپل تھیں ۔ ابا جان نے چار سال قبل جس فخر کے ساتھ مسلم اسکول کی مس مائیلز سے کہا تھا' "علی گڑھ میں پانچویں کلاس میں تھی" اس سے کہیں زیادہ فخر وانبساط کے ساتھ بنارس یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ مسز داس کے سامنے پیش کیا ۔

مسز داس نے منڈیا ہلا کر عینک کے پیچھے سے سرٹیفکٹ پر نظر ڈالی اور ڈرامائی انداز سے سر پکڑ لیا ۔ ابا جان نے گھبرا کر انہیں دیکھا ۔ "ہمارے کالج میں داخلے کی کم از کم عمر سولہ سال ہے ۔"

میں نے ابا جان کو اتنا مایوس اور پژمردہ کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ وہ بھوچکے سے مسز داس کو تکتے رہے ۔ اس نیک خاتون نے ابا جان کا متغیر چہرہ دیکھ کر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا' "آپ کی بچی نے ہائی اسکول میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے ۔"

ابا جان ہیٹ سنبھال کر کرسی سے اٹھے اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا ۔ مسز داس نے فارم ان کے آگے سرکا دیا ۔

"اس کا میں کیا کروں ؟" ابا جان ے افسردگی سے پوچھا ۔

"بیک ڈیٹ ۔"

ابا جان نے تذبذب سے کہا' "یہ خلاف قاعدہ نہیں ہو گا ؟"

"This is an Exceptional case" مسز داس نے مسکرا کر کہا ۔

اس وقت ان کے سر کے گرد نور کا ہالہ تھا اور پس منظر میں یسوع مسیحؑ کے فرشتے اپنے نقرئی پر پھڑ پھڑا رہے تھے ۔ ابا جان نے جلدی سے حساب لگا کر ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء لکھ دیا ۔ حساب میں ہمیشہ سے کمزور تھے ۔ سولہ سال اب بھی نہیں بنے ۔ مسز داس نے دیکھے بغیر فارم بید کی ٹرے میں ڈل دیا اور مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا ۔

فیض آباد سے لوٹ کر ۱۶ جولائی کی صبح غلام حسین کے ہمراہ تیز تیز قدم اٹھاتی خوش خوش کالج پہنچی ۔

فرسٹ ائیر کلاس میں پورٹ بلیر اور دہرہ دون والے سردار بلونت سنگھ جسپال کی سب سے چھوٹی لڑکی وملا کے علاوہ فیض آباد والے میجر وہاج مرزا کی بھانجی مہر جبیں' نہٹور کی حمیدہ زیدی' انیس احمد عباسی مدیر روزنامہ حقیقت کی لڑکی سعید بانو اور قاضی عزیز الدین بلگرامی کی بھتیجیاں قمر اور اختر داخل ہوئی تھیں ۔ حاجی خلیل احمد بانی ایک آنہ فنڈ برائے مرمت مساجد لکھنؤ و اڈیٹر مرقع نہٹور کی لڑکیاں جمیلہ اور شکیلہ تھرڈ ائیر میں' مراد آباد والے بھائی شاہد حسین کی کزن کشور احمد چودھری محمد علی ردولوی کی ایک نواسی طلعت احمد کی ہم جماعت تھیں ۔ خان عبدالغفار خاں کی لڑکی مہر تاج اور مسز وجے لکشمی پنڈت کی لڑکی چندر لیکھا کسی سینئر کلاس میں پڑھتی تھیں ۔ یہ سب ہوسٹل میں مقیم تھیں ۔ چند لڑکیاں بھوپال اور حیدر آباد دکن سے آئی تھیں ۔

اردو مرزا علی حسن اور فارسی سید مرتضیٰ حسین پڑھاتے تھے ۔

اردو کلاس میں مہر جبیں اور سعید بانو اور میں ساتھ بیٹھتے اور کاپی پر لکھ لکھ کر مستقل ایک دوسرے سے گپیں ہانکتے تھے ۔ نظریہ یہ تھا کہ اردو اتنی آتی ہے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ ٹسٹ میں ہم تینوں کو سب سے زیادہ نمبر ملتے ۔

باقی سارے مضامین سوئیٹ امریکن بڑھیاں پڑھاتی تھیں ۔

بھائی نے یونیورسٹی یونین کی صدارت کا الیکشن لڑا ۔ اوک لینڈ پر لاؤڈ اسپیکر لگائے ان کے ورکر لڑکے سارے میں گھوما کرتے ۔ ایک روز پنڈت نہرو ہمارے کالج آئے اور ہندوستان کے قدیم جغرافیہ پر روشنی ڈالی ۔ کہنے لگے اگر تم لوگ لکھنؤ سے نینی تال جاتیں تو جہاز پر بیٹھ کر سمندر میں سے گزرنا پڑتا ۔

لاکرتی چھاؤنی میں ماموں ابراہیم خاں کے فرزند اکبر محمد ایوب خاں علی گڑھ سے بی ۔ اے کر گھر آ چکے تھے ۔ ان کے عزیز دوست راز مراد آبادی علی گڑھ سے ساتھ آئے تھے ۔ راز بھائی جگر صاحب کے شاگرد رشید تھے ۔ "سراج الدین خان آرزو پر ریسرچ کر رہا ہوں ۔" انہوں نے ابا جان سے کہا ۔ حالانکہ ریسرچ ویسرچ کچھ نہیں کر رہے تھے ۔ مستقل غزلیں کہا کرتے تھے جنہیں ترنم میں سناتے تھے ؎

میرے پیکر میں سراپا تو ہی تو ہے تو پھر   میری فطرت میں مزاق بندگی کا ہے کو ہے

ٹپکل مراد آبادی اور علی گڑھی تھے ۔ دن بھر گپیں ہانکا کرتے اور بے حد سوئیٹ تھے ۔

چھاؤنی میں دلکشا باغ کے اندر صرف ایک کوٹھی تھی ۔ اس میں رضیہ سجاد ظہیر کے بڑے بھائی یعنی اماں کے ایک اور منہ بولے بھتیجے معین حسن کنٹونمنٹ افسر مقیم تھے ۔ ان کی شادی اماں جج مسعود الحسن کی لڑکی عطیہ سے طے کروانے میں مصروف تھیں ۔ ایک شام معین بھائی نے میرے میٹرک پاس کرنے کی خوشی میں دعوت کی ۔ اماں' مجاز' راز بھائی اور سوز شاہجہانپوری کو اوک لینڈ میں بٹھال کر دلکشا لے گئیں ۔ مجاز کو پہلے وارننگ دیدی تھی کہ شراب پی کر نہ آئیں ۔ کھانے کے بعد باہر چاندنی رات میں مجاز نے "اندھیری رات کا مسافر" پڑھی ۔ اس مصرع پر پہنچے خدا سویا ہوا ہے اہرمن محشر بداماں ہے ۔۔ اماں نے کہا' "میاں اب بھی وقت ہے توبہ کر لو ۔" ایک مور گھنے باغ سے نکلا ۔ چاند کے نیچے سبزے پر کرسیوں سے

ذرا دور کھڑا ہو گیا۔ غور سے سنتا رہا۔ پھر برگد کے تاریک جھنڈ میں واپس چلا گیا۔

بمبئی

۲۶ اگست ۴۱ء

السلام علیکم۔ کل مسلم لیگ کی میٹنگ میں سر سکندر حیات نے معافی مانگ لی اور جنگ کی کونسل سے استعفےٰ دیدیا۔ آج پھر میٹنگ ہے۔ ایران کے متعلق ریزولیوشن پاس کیا جائے گا۔

سجاد

۱۵ جنوری ۴۲ء کے روز ایس۔ ایچ۔ چپ اسٹیشن ڈائرکٹر نے ابا جان کو یاد دہانی کی کہ "سات مصنف ایک افسانہ" کے لئے اپنی کہانی لکھیں۔ یہ ایک دلچسپ سلسلہ ریڈیو پر جاری تھا جس میں ایک ادیب اپنی کہانی نامکمل چھوڑتا تھا اور دوسرا اسے آگے بڑھاتا تھا۔

بھائی ریاضی میں ایم اے کرنے کے بعد انڈین ریلویز کی امپریل سروس کے مقابلے میں بیٹھے۔ منتخب کر لئے گئے اور کلکتہ روانہ ہوئے۔

بھائی ایک بے انتہا ذہین اور جوشیلے قوم پرست تھے جو مخدوش اور پر خطر خصوصیات ہیں۔ جمال پور میں ایک شام انگریز افسر سے کسی بات پر جھڑپ ہو گئی۔ بھائی نے آگ بگولا ہو کر اسے ایک عدد طمانچہ رسید کیا۔ فرمایا "میں اسی وقت استعفیٰ دیتا ہوں۔" انگریز کے دفتر سے نکلے اور سیدھے بھاگتے چلے گئے۔ سامنے سے ایک مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اس کے ایک ڈبے کا ہینڈل پکڑ کر اس سے لٹک گئے۔ رات بھر اسی طرح ہینڈل پکڑے پکڑے سفر کیا۔ گھر واپس پہنچے۔ چند روز بعد کھدر پوش ہوئے۔ ابا جان کا کلکتہ سے خط آیا۔

۲۴ مئی ۴۲ء

---میں کلکتہ سے سیدھا حیدر آباد جا رہا ہوں۔ سالار جنگ کے پتے پر اپنی خیریت کا تار دو۔

اماں نے اپنے بلڈ پریشر کی خیریت کے بجائے پریشان کن تار بھیجا۔ "پھبو جی جمال پور سے استعفےٰ دے کر آ گئے۔" اماں اتنی بڑھیا ملازمت چھوڑ دینے پر سخت خفا تھیں۔ لیکن ابا جان لکھنؤ واپس آ کر حسب عادت خاموش رہے۔ سردار بلونت سنگھ جسپال کی بڑی لڑکی شکنتلا نے جو یونیورسٹی میں ایل ایل بی کر رہی تھیں ایک انگریزی رسالہ "نیو لائف" کا اجراء کیا تھا۔ بھائی اس میں مضمون نویسی کرتے تھے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے۔ ابا جان نے اماں سے کہا۔

"پھبو جی سرکاری ملازمت کے سیدھے محفوظ راستے پر چلنے کے بجائے صحافت وغیرہ کی طرف متوجہ۔ ہیں انہیں منع کرنا بیکار ہے۔"

"امپریل سروس چھوڑ دی۔ سفر کے لئے اپنی سیلون ملتی۔ فلاں فلاں ابھی سے اپنی لڑکیوں کے لئے کہلوا رہے ہیں۔ اخبار کی نوکری کریں گے؟ اس میں دو سو روپلی بھی نہیں ملتے۔ آپ کے لاڈ پیار نے اسے

بگاڑا۔ کبھی کسی بات پر نہیں ٹوکا۔ بچہ خود سر ہو گیا۔ کھدر پہنے سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے۔ اب تو سمجھائیے۔"

ابا جان ہنسنے لگے "میرا سمجھانا لاحاصل ہو گا۔ اس عمر میں اپنے دور کے مطابق میں نے بھی یہی سب کیا تھا۔ انہیں اس زندگی کا تجربہ کر لینے دو۔ اور کھادی تحریک کے زمانے میں تم نے بھی تو برسوں کھدر پہنی تھی۔"

اماں بڑبڑاتی رہیں۔ ابا جان اٹھ کر افغانستان کی سیاحت کے لئے پیکنگ میں مصروف ہوئے۔

شہر نو۔ کابل

۳۰ ستمبر ۴۲ء

السلام علیکم۔ کل بخیریت یہاں پہنچ گیا۔ راستہ بڑا خراب تھا۔ عبدالحکیم صاحب کا مہمان ہوں۔ موسم اچھا ہے۔ اس وقت تک سردی زیادہ نہیں ہوئی۔ دو دن ابر رہا۔ ایک ہفتہ یہاں رہوں گا اس کے بعد غزنی و ہرات۔ پشاور سے سیدھا سہارنپور جاؤں گا۔ پھر لکھنؤ۔

یہاں اسمٰعیل حکمت بک سے ملا جو لکھنؤ آئے تھے۔ بیوی اور لڑکا بھی یہاں ہیں۔ کل انہوں نے دعوت کی تھی۔ ایک اور ترک صلاح الدین بک اور ان کی خانم۔ صلاح الدین یہاں میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں۔ ہندوستان ہو آئے ہیں۔ بارہ بجے رات تک کل ان کے ہاں ہندوستان کی خبریں ریڈیو پر سنیں۔

یہاں ایک صاحب خان بہادر سکندر خاں انگریزی سفارت خانے میں سکریٹری ہیں۔ انہوں نے کل لنچ پر بلایا ہے۔

دو تصویری پوسٹ کارڈ۔ "از مناظر مشرقی قسمتی از باغ شاہی۔ جلال آباد۔" "قصر سلطنتی دلکشا۔ کابل۔" ایڈرس۔ مس قرۃ العین حیدر

نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ۔ لکھنؤ یوپی۔ انڈیا۔

الن ماموں کے سب سے چھوٹے بھائی کشور علی نقوی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ بید حسین، سفید رنگت، گھنگھریالے بال۔ چار خانہ کوٹ سفید پتلون پہنے سائیکل پر آ کر پچھلے برآمدے سے اماں کو آواز دیا کرتے تھے "ارے بھئی باجی۔" ایک سہ پہر کشور ماموں گھبرائے ہوئے آئے۔ تیر کی طرح اماں کے کمرے میں پہنچے اور کہا "باجی۔ ابھی ابھی میں نے پھبو جی کو منکی برج پر دیکھا۔ جلوس میں شامل نعرے لگاتے چلے جا رہے تھے۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ کسی طرح ان کو منع کیجئے۔

"جا کر اپنے بھائی جان کو تار دو۔ فوراً واپس آئیں۔" اماں نے بوکھلا کر کہا اور اٹیچی کیس کھول کر کابل کا پتہ تلاش کرنے لگیں۔ (چند روز بعد نوجوان کشور ماموں ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوئے اور راہی بلرام پور اسپتال میں جہاں ۱۹۱۸ء میں نوجوان مصطفےٰ باقر کو اجل آئی تھی۔ راہی ملک عدم ہوئے۔)

جب تک ابا جان کابل سے لکھنؤ پہنچیں پہنچیں بھائی اگست اندولن کو چھٹی دے کر مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔

اب انہوں نے مسلم لیگ کا ایک انگریزی پرچہ شائع کرنا شروع کیا۔ "دی فور وکٹری" کی مانند "دی فور پاکستان" کے بیج بنوائے۔ دو تین شماروں کے بعد وہ رسالہ بند ہو گیا اور پریس کے بل آنے شروع ہوئے۔ اس کے بعد پانیر کے اڈیٹر ایس۔ این۔ گھوش نے بھائی کو سب اڈیٹر مقرر کر لیا اور انہوں نے بڑے ذوق شوق سے پانیر کے دفتر جانا شروع کر دیا۔

سر محمد یعقوب فیض آباد روڈ آئے۔ ترکی ٹوپی' شیروانی' گورے چٹے چہرے پر بشاشت۔ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے ابا جان اور اماں سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ ۲۴ نومبر کو اطلاع ملی کہ وہ بھی عالم بالا کو سدھارے۔ ابا جان نے "ہمدم دیرینہ" کے عنوان سے نظم لکھی۔ اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے۔ یہ شرط رفاقت تھی ہمیں چھوڑ گئے تم --یعقوب سا اب کوئی نہ آئے گا دوبارہ-- شیریں سخن دوست نواز انجمن آرار-- احباب پرستی کا نمونہ تھے تو تم تھے-- احباب فراموشی کو شرماؤ تو آ کر-- بیکار ہے بیکار ہے اخلاص و محبت--کوئی نہ ہو گام زن جادۂ الفت--وہ بھی رہبری راہ محبت-- کہتا تھا زمانہ کہ وفا اس کی ہے خصلت--یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ--اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ۔

نمبر ۳ بھاولپور روڈ لاہور
یکم دسمبر ۴۲ء

پیاری خالہ جان۔ بھائی یعقوب[13] کا اتنا Shock پہنچا ہے کہ کیا بتاؤں! میرا یہ حال ہے کہ ایسی خبریں سن ہی نہیں سکتی۔ امتیاز باہر جاتے اور وقت مقررہ سے دیر میں آتے ہیں تو حادثے کے خیال سے کانپ جاتی ہوں۔ میرے کپور تھلہ کے سفر کا حال پڑھ لیا ہو گا۔ وہاں مجھے آپ کی علالت اور تار کا خیال بے چین رکھتا تھا۔ آیئے کچھ دل بہلانے کی باتیں کریں۔

اس وقت رات کے سوا سات بجے ہیں۔ سردی' آپ کی محبوب سردی خوب پڑ رہی ہے۔ چمن کے کمرے میں کشن چیئر پر نیم دراز ہوں اور لکھ رہی ہوں۔ سامنے آگ کے نارنجی شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یاسمین ڈائننگ روم میں کھانا کھا رہی ہے اور تاج نماز پڑھ رہے ہیں۔

میری ایک بلی ابھی کمرے میں آ گئی ہے۔ ہائے! بلیاں تو میری جان ہیں۔ جب امتیاز مدراس آئے تھے اور میرے ہاں لنچ پر ٹھہرے تو انہیں بڑا تعجب ہوا تھا کہ جب میری اکیس بلیوں کو کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ اب میرے پاس اٹھارہ بلیاں ہیں۔ بڑی چور اور لالچی بلیاں ہیں۔ لیکن مجھے وہی بلی بے حد پیاری لگتی ہے جو سب سے زیادہ چور اور بدصورت ہو۔ آپ کی تین بلیوں کے رنگ کیا ہیں؟

بتایئے تندرستی کے لئے کب لاہور آئیں گی اور کچھ دن شوخ بنی رہیں گی؟ بیماری کو بھول جایئے۔

دلی محبت۔ خدا کرے چچا افغانستان سے بخیریت گھر پہنچ گئے ہوں۔ وہ بھی عجیب سیاح واقع ہوئے ہیں۔

(تلخیص) آپ کی حجاب

۷۔ کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

جاڑوں میں اکیس نمبر کا باغ خوش رنگ انگریزی پھولوں سے لہلہا اٹھتا تھا۔ سامنے کے لان کے تین طرف اور پچھلے باغ میں سرخ' عنابی' گلابی اور زرد اور سفید گلاب کے عظیم الجثہ پھولوں پر صبح صبح شبنم کے قطرے جگمگاتے۔ بیرونی برآمدے کی سرخ سیڑھیوں پر پام' کروٹن اور مختلف اقسام کی فرن کے گملے رکھے تھے اور دروں میں کونڈے آویزاں تھے۔ جب مالی ان میں پانی دیتا برآمدے کا سرخ فرش اوپر سے گرتی بوندوں سے جھلملانے لگتا۔ صبح کو ہر کمرے کے گلدانوں میں پابندی سے تازہ پھول سجائے جاتے۔ ڈرائنگ روم کے چاروں کونوں میں اسٹینڈز پر پام کے مزید گملے پیتل کی بالٹیوں میں رکھے ہوئے تھے۔ دوپہر کے گہرے سناٹے میں باغ کی سیمنٹ کی اونچی نالی میں سے پانی بہنے کی آواز آتی جو حوض میں گرتا رہتا۔ جس کے برابر لگی پانی کی مشین یکسانیت سے گھڑ گھڑاتی۔ اتوار کی صبحوں کو آئی ٹی کالج کے ہوسٹلوں میں رہنے والی لڑکیاں ملنے آتیں اور ڈھیروں گلاب توڑ کر لے جاتیں۔ ان کے جانے کے بعد میں سائیکل چلانے کی مشق کرتی۔

ابا جان وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ ایک روز میں پھاٹک سے لے کر موٹر خانے تک کی طویل سڑک پر سائیکل چلا رہی تھی۔ برساتی میں نکل آئے۔ دو منٹ بعد اپنے کمرے میں گئے پھر ہاتھ میں ایک کھمن زین کی سفید پتلون لئے باہر آئے۔ جب میں سائیکل پر سوار برساتی میں سے گذری کہنے لگے' "سائیکل آپ کو ہمیشہ پتلون پہن کر چلانی چاہئے۔ یہ لیجئے۔ اسے درزی سے اپنے لئے ٹھیک کروا لیجئے۔" اس وقت لفظ "سلیکس" بھی غالباً رائج نہیں ہوا تھا۔

اکثر صبح صبح ابا جان کے کمرے یا غسل خانے سے ان کے گنگنانے کی آواز آتی وہ عموماً اقبال کے اشعار ہوتے۔ ایک مرتبہ بتایا' "اپنے اولیں دور میں اقبال" اپنا کلام اشاعت سے قبل ہمیں پڑھنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔"

میں مستقل طرح طرح کے سوالات کرتی' "صوفی لوگ کون ہوتے ہیں؟ آج کل بھی ہوتے ہیں؟ آج کل کون ہے۔"

"مہاراجہ کشن پرشاد۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور پوجا پاٹ بھی کرتے ہیں۔"

"عیسائی تین خدا کیوں مانتے ہیں؟"

"تین خدا تو قسطنطنیہ کے ایک بادشاہ کے ووٹ کے ذریعہ طے کئے گئے تھے۔ یونیٹیرین عیسائی موحد ہیں۔"

"ابا جان۔ لوگ دنیا میں کیوں رہتے ہیں؟ یہ سب پڑھنا لکھنا' ڈگریاں لینا' یہ سارا اگڑم بگڑم۔ پھر مر جاتے ہیں۔ جنگل میں چلے جانا چاہئے۔"

"واہ جناب دنیا میں رہنا بہت ضروری ہے۔"

"اباجان۔ اللہ میاں دنیا بنانے سے پہلے کیا کرتے تھے؟" وغیرہ وغیرہ۔

اباجان پیدائشی مستقبل پرست تھے اور مجھے اس وقت اتنی عقل نہیں تھی کہ پیدائشی ماضی پرست ہوں۔ ایک روز ناشتہ کرتے ہوئے اباجان بھائی سے کہنے لگے "بہت جلد انسان چاند پر بھی پہنچ جائے گا۔ ہم تو زندہ نہیں ہوں گے مگر آپ لوگوں کے سامنے ہی سائنس بیحد ترقی کر لے گا۔ پھر جناب آپ اور بی بی دلی میں بریکفاسٹ کیجئے گا لندن میں لنچ اور چاند پر ڈنر۔"

"سب ایک ہی دن میں؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

اباجان کبھی کبھار نماز پڑھ لیتے اور بہت خوش ہو کر کہتے "آج ہم نے نماز پڑھی۔" آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے کبھی کبھی خود بخود کہہ اٹھتے "اچھا صاحب۔" شاید اللہ میاں کو مخاطب کرتے تھے۔

اماں نے پرہیز کروا کروا انہیں عاجز کر رکھا تھا۔ پھر وہ سفر پر نکلتے اور دوسرے شہروں میں اپنے چھوٹے بھائیوں کے گھر جا کر بھاوجوں سے ان تمام پسندیدہ کھانوں کی فرمائش کرتے جو اماں نے برسوں سے ممنوع کر رکھے تھے۔

انواع و اقسام کے لوگ گھر پر آتے۔ اہل قلم میں سید آل رضا' علی عباس حسینی' لڈن ماموں کے خسر چودھری محمد علی ردولوی (فن گفتگو اور شائستگی جن پر ختم تھی) اور جنے کون کون۔ مسلم گرلز کالج کی پرنسپل مس روشن جہاں سائیکل پر آیا کرتیں۔ مہینے میں ایک دو بار اختر ممانی مع خاندان لالکرتی چھاؤنی سے اپنی طویل زرد رنگ کی موٹر پر آتیں۔ اماں ان کے ساتھ ہندوستانی سینما دیکھنے جایا کرتیں۔ اباجان کو سینما کا قطعی شوق نہیں تھا۔ ایک بار اماں نے چڑ کر ان سے کہا' "آپ کا بس چلے تو جنگل میں آرام کرسی بچھا کر بیٹھے رہیں اور اوپر درخت پر الو بول رہا ہو۔"

۳۱ دسمبر ۴۲ء کی شام ہم لوگوں نے چینا بازار گیٹ میں عائشہ غلام حسن کے ہاں گذاری۔ "لیجئے صاحب .... زندگی کا ایک سال اور ختم ہوا۔" اباجان نے جج غلام حسن بٹ سے کہا۔ "انسان کی عمر طبعی ۶۲' ۶۳ سال ہوتی ہے ہم اس عمر کو پہنچنے والے ہیں۔"

زندگی کے مختلف ادوار ایک کے بعد ایک فراٹے سے گذر جاتے ہیں ۱۹۳۰ء میں اماں اباجان عائشہ غلام حسین کے ہاں سامان رکھ کر انڈامان گئے تھے۔ صرف بارہ سال قبل اور دسمبر ۴۲ء کی اس رات وہ ماضی بعید معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اس دور کی یادگار وفادار اوک لینڈ باہر برساتی میں کھڑی تھی۔ اندر مہاگنی کے آتش دان کے سامنے جج و بیگم غلام حسین اور اباجان اماں بے فکری سے باتیں کر رہے تھے۔ بڑا محفوظ و مامون وقت تھا۔

سال نو کے روز اباجان اور اماں سید علی ظہیر کی لڑکی سکینہ کی شادی میں گئے۔ چند روز بعد گاؤٹ کی تکلیف پھر بڑھ گئی۔ غلام حسین بیوی کی علالت کی اطلاع پر سیالکوٹ واپس جا چکے تھے۔ امیر خاں روز رات کو پاؤں کے انگوٹھے کی مرہم پٹی کرتے۔ علی گڑھ میں کوئی کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس کے متعلق

نوابزادہ مرتضیٰ علی خاں کا خط آیا۔

چھتری والا بنگلہ' ماہم

بمبئی ۱۶' ۲۳ جنوری ۱۹۴۳ء

بھائی سجاد۔ کانفرنس کب ہے۔ اخبار سے معلوم ہوتا ہے ۱۲ فروری کو علی گڑھ میں ہوگی۔ تم بھی چلو تو لطف رہے گا۔ یکم جنوری سے ۴ تک شکار پر رہا۔ اچھے شکار ہاتھ آئے بامراد پھرا۔ کیا کہی ہے۔ بے زبانوں کی جان لی اور اسے تحصیل مراد سمجھا۔

لیگ کا جلسہ دلی میں قرار پایا ہے' ایسٹر کی تعطیلوں میں ہوگا۔ معلوم ہوا ہے کرش مشن لکھنؤ نہیں جائے گا۔ تمہیں تو سخت ناامیدی ہوئی ہوگی۔ علی گڑھ بھی شاید نہ جائے۔ یہ تو بہت برا ہوگا مسلمانوں کی واحد درسگاہ اگر نہ دیکھی تو کیا صرف قلعہ بندیاں دیکھنے آئے ہیں۔ بہرحال تم یقیناً ان سے ملاقات کرو گے۔ میں بمبئی میں ملنے کی کوشش کروں گا۔ اور یہ کراما کاتبین کے ہاتھ میں ہے۔

تمہارا

مرتضیٰ

چھ مہینے قبل حسنین ماموں فیض آباد چھاؤنی سے تبدیلی ہو کر لکھنؤ آ چکے تھے اور دلکشا کی اسی کوٹھی میں مقیم تھے جس میں پہلے بھائی معین حسن رہا کرتے تھے۔ علی گڑھ سے واپسی پر اباجان نے اتوار کے دن صبح صبح حسنین ماموں کو بلانے کے لئے امیر خاں کو سائیکل پر دلکشا بھیج دیا۔ دوپہر کے وقت ماموں ممانی آ پہنچے۔ اباجان اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ اباجان نے اطمینان سے کہا۔ آیئے آیئے جناب۔ ہم نے آپ کو اس لئے بلایا ہے۔ ٹھہریے ذرا سامنے سے جعفری صاحب کو بلوا لیں۔ آپ دونوں کی گواہی میں وصیت نامہ لکھ دیں۔" چندا ممانی نے فوراً رونا شروع کر دیا۔ اماں اندر آئیں اور پوچھا "کیا ہو رہا ہے؟"

"بھائی جان --- کے دشمن۔ شیطان کے کان بہرے۔ وصیت نامہ لکھوا رہے ہیں۔" چندا ممانی نے کہا۔ یہ سنتے ہی اماں نے بھی رونا شروع کر دیا۔

اباجان ہنس پڑے اور کہا' "اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

حسنین ماموں بھی بہت ملول نظر آئے۔ یہ منظر دیکھ کر اباجان نے کہا' "اچھا پھر سہی۔" بات آئی گئی ہوئی۔

چھوٹے چچا جان دو روز کے لئے سہارنپور سے آئے۔ نئی دوائیں تجویز کیں۔ دونوں بھائی رات گئے تک برساتی میں پلنگ بچھائے ہنسا بولا کئے۔

شروع اپریل کی ایک شام ٹریننگ کالج میں مشاعرہ تھا۔ اباجان مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ حفیظ

جالندھری اسٹیج پر چہک رہے تھے۔ شعر پڑھتے جاتے اباجان کو مخاطب کر کے "سید صاحب۔ یہ ملاحظہ کیجئے۔ سید صاحب۔ عرض ہے۔" کہتے جاتے۔

بھائی کے لئے نہٹوری کنبے میں ایک جگہ سلسلہ جنبانی جاری تھا۔ آخر مارچ کی ایک شام اماں نے ابا جان سے کہا "آپ کے ہاں نہٹور میں اب تک اتنی ریت رسمیں ہوتی ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں بری کے ساتھ اکیاون مٹکیاں مٹھائی کی آئیں۔"

اباجان نے مسرور لہجے میں جواب دیا "ہم مٹھائی چاندی کی اکیاون مٹکیوں میں لے جائیں گے۔"

نہٹور کے ایک عزیز چچا غفران احمد پنشن یافتہ فاریسٹ رینجر ایک Eccentric سے بزرگ تھے جو اپنی سائیکل پر انگریزی رسالوں کا انبار' فوٹو گرافی کا سامان لادے فوجی وردی پہنے اور ہیٹ پر ڈاٹا مولگائے کبھی کبھی ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ ۷ اپریل کی صبح چچا غفران آپہنچے اور اباجان کی تصویریں کھینچنے پر مصر ہوئے۔ اباجان اسی وقت گرے رنگ کا سوٹ پہن کر باہر جا رہے تھے۔ لان پر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ چچا غفران نے تصویریں اتاریں۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ۱۰ اپریل کی شام مغرب کے وقت اباجان پچھلے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دور ڈائینمو کی روشنی نظر آئی۔ چچا غفران پھاٹک پر آتے تھے۔ ان کے ہیٹ کی روشنی باورچی خانے کے راستے تک پہنچتی تھی۔ چچا غفران اندر آئے۔ تصویریں بنا کر لے آئے تھے۔ لفافہ اباجان کو دیا۔ انہوں نے کہا۔ کونٹیکٹ' پرنٹس ہیں۔ اس وقت ہمیں صاف کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ صبح دیکھیں گے۔"

چچا غفران سے باتیں کرتے رہے اور کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسے۔ پھر معذرت چاہ کر تبدیل لباس کے لئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

اباجان شیخ محمد حبیب اللہ کے ہاں کے ڈنر سے دس بجے کے قریب گھر واپس آئے۔ روزانہ رات کو انہماک سے ریڈیو کے بہت قریب بیٹھ کر خبریں سنا کرتے تھے۔ جاڑوں میں کمبل سر سے اوڑھ کر صوفے پر بیٹھ جاتے تھے۔ اور نو بجے کی نیوز دھیان سے سنتے تھے۔ اتنی دیر تک امیر خاں یا غلام حسین دروازے میں بیٹھے رہتے تھے۔ اباجان ریڈیو بند کر کے گیلری میں سے ہو کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ امیر خاں ڈرائنگ روم کے دروازے اور دریچے بند کر کے چٹخنیاں لگاتے پھرتے۔ یہ معمول برسوں سے جاری تھا۔

۱۰ اپریل کی رات جب اباجان گھر واپس آئے خبریں ختم ہو چکی تھیں۔ ڈرائیور نے برساتی میں کار روکی۔ اباجان سیڑھیاں چڑھے۔ ڈرائنگ روم میں جھانکا پھر کہا "او ہو بی بی سی کی خبروں کا وقت بھی نکل گیا۔" اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ اسی وقت ڈرائیور کار بڑھا کر اباجان کے دریچے کے نیچے سے گذرتا موٹر خانے کی سمت چلا گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی پچھلے باغ میں استادہ ہولی ہوکس کے پھولوں پر پڑی۔ انجن بند ہونے اور گراج کا پھاٹک بند کرنے کی مانوس آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

ہولی ہوکس کی قطار کے بعد چبوترہ تھا جس کے ایک سرے پر اباجان کے غسل خانے کا دروازہ کھلتا تھا۔ اباجان کے کمرے کے برابر اماں کا بیڈ روم تھا اور اس سے ملحق میرا کمرہ ان دونوں کمروں کے

دروازے پچھلے برآمدے میں کھلتے تھے جس کا فرش سرخ رنگ کا تھا۔

رات کے دو بجے کوئی بھاری چیز گرنے کی آواز آئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اماں اس وقت تک اپنے کمرے سے نکل کر اباجان کے کمرے تک پہنچ چکی تھیں جو ان کے غسل خانے کے برابر میں تھا۔ انہوں نے اباجان کے کمرے کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اماں نے مجھے پکار کر کہا "امیر خاں کو بلاؤ جلدی۔" میں اپنے کمرے سے نکل کر فوراً باہر بھاگی۔ چاندنی رات تھی۔ میں وسطی روش پر سے سرپٹ دوڑتے ہوئے جس کے دونوں طرف تیز سرخ گلاب چاندنی میں نہا رہے تھے' شاگرد پیشے کی کاٹج پہنچی اور امیر خاں کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے دوڑتے ہوئے ساتھ آئے۔ غسل خانے کے دروازے کو دھکا دے کر زور سے کھولا۔ اندر اباجان فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ امیر خاں نے بیساختہ رونا شروع کر دیا۔ اٹھا کر کمرے میں لائے اور مسہری پر لٹایا۔ بھائی کا مدور کمرہ بیرونی برآمدے کے سرے پر تھا۔ میں نے تیر کی طرح جا کر انہیں جگایا۔ وہ ننگے پاؤں ڈاکٹر کو بلانے بھاگے۔ اماں اور امیر خاں اباجان کے حلق میں سنترے کا عرق ٹپکاتے رہے۔ جو باہر بہہ گیا۔ کچھ دیر میں ایک اجنبی بنگالی ڈاکٹر آپہنچا جو فیض آباد روڈ پر رہتا تھا۔ اماں لباس شب خوابی میں تھیں۔ انہوں نے جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر سبز جارجٹ کی ساری جو ایک کرسی پر پڑی تھی لپیٹی (اس ساری پر سیاہ پتوں والے بڑے بڑے سرخ گلاب انہوں نے خود چھپوائے تھے) الٹے پاؤں اباجان کے بیڈ روم میں آئیں۔ اباجان کو اب ہچکیاں لگ چکی تھیں اور غنودگی طاری تھی۔ ڈاکٹر نے علیحدہ جا کر بھائی سے کہا "Diabetic Coma" اتنے میں اباجان نے دو تین ہچکیاں لیں اور ختم ہو گئے۔

بھائی اور میں حواس باختہ جج سعید الدین جعفری کو جگانے کے لئے ننگے پاؤں باہر بھاگے۔ الہ آباد کے ریٹائرڈ جج جعفری سڑک پار مقابل کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ ایک نہایت خوش مزاج انسان تھے اور ان کی پنجابی بیوی اگلے وقتوں کی آئی ٹی کالج کی گریجویٹ تھیں۔ دونوں اکثر ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ اس وقت صبح کے تین بجے تھے۔ چاندنی پھیکی پڑنے لگی تھی۔ جج جعفری مع اہل و عیال مکان کے باہر مچھر دانیاں لگائے محو خواب تھے۔ جج صاحب کے پھاٹک کے قریب جا کر ہم لوگوں نے روتے روتے کہنا شروع کیا' "جج صاحب۔۔ جج صاحب۔۔۔ اٹھیئے جلدی۔۔۔ اباجان کا انتقال ہو گیا۔"

اب پو پھٹ رہی تھی۔ اور لوگ آتے گئے۔ چندا ممانی دھاڑیں مار کر روتی فیض آباد روڈ پہنچیں۔ حسنین ماموں' ماموں ابراہیم خاں اور جج سعید الدین جعفری نے تجہیز و تکفین کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

موٹر خانے میں اباجان نہلائے گئے۔ برساتی جو ہمیشہ مجھے اجاڑ سی لگتی تھی اس میں جنازہ رکھا گیا۔ مجمع بڑھتا گیا۔ جنازہ پھاٹک سے نکلا۔ عیش باغ روانہ ہوا۔ فرنگی محل کے ایک مولانا نے نماز جنازہ پڑھائی۔ چمن خاص میں سپرد خاک کیا گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سارے مرد قبرستان گئے ہوئے تھے۔ خواتین مختلف کمروں میں جمع تھیں۔

سامنے کا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ وہاں سے ایک مانوس گرجدار آواز آئی' "سید صاحب۔ السلام علیکم۔ میں غلام محمد حاضر۔ حاضر ہوا ہوں۔"

میں چق اٹھا کر باہر گئی' "ابا جان کا تو انتقال ہو گیا۔" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ حاضر ماموں نے بھونچکے ہو کر مجھے دیکھا۔ وہ کچھ دیر قبل دہرہ دون سے آئے تھے۔

قریبی عزیزوں نے دوسرے شہروں سے پہنچنا شروع کیا۔ تیسری صبح سویرے بیرونی برآمدے میں سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔

سعید بھائی بہادر آباد سے آکر اترے تھے اور ابا جان کے دریچے کے باہر ٹھٹھک کر آنسو بہا رہے تھے۔ میں نے پیچھے سے جا کر دیکھا۔ دریچے میں سے مقابل کی دیوار پر ابا جان کے کپڑے اور ٹائیاں کھونٹیوں پر ٹنگی نظر آ رہی تھیں اور ایک گہرے سبز رنگ کی گول پورک پائی' ایک سولا ہیٹ' ایک ترکی ٹوپی' سعید بھائی دریچے میں کہنیاں رکھ کر ان چیزوں پر نظریں جمائے روتے جا رہے تھے۔ چند برس قبل جب آشیانے میں آئے تھے تو ڈرائیور کا بھیس بدل کر اتنا ہنسایا تھا۔ اس کے بعد اب دوسری دفعہ آئے تھے۔

ٹونک راج اور سہارنپور سے چچا جان اور چھوٹے چچا جان تشریف لائے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق صدمے کا اثر قبول کیا تھا۔ جب چھوٹے چچا جان ڈاکٹر وحید پہنچے میں کھانے کے کمرے کی بے وِنڈو میں رکھی چلمچی میں ہاتھ دھو رہی تھی۔ چچا وحید نے خاموشی سے آکر سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی گمبھیر آواز میں مختصراً کہا "بہادر باپ کی بہادر بیٹی ہو۔" چچا نصیر زار و قطار روتے گھر میں داخل ہوئے۔

اماں کا بلڈ پریشر بہت اونچا ہو گیا تھا اور وہ صاحب فراش تھیں۔ چندا ممانی گھر کا انتظام کر رہی تھیں۔ چالیس دن تک وہ پھرکی کی طرح غرارہ سرسراتی' گودام کی کنجیاں سنبھالے مہمانوں کی دیکھ بھال اور خاطر مدارات میں مصروف رہیں۔ گھر اب اچھا خاصا کلب بن گیا تھا۔ روز شام کو مقامی غمگسار آکر ادھر ادھر گروہ بنا کر بیٹھ جاتے۔ گپیں ہانکتے۔ اور چندا ممانی چاء کی کشتیاں سجوا سجوا کر ان کو بھیجتیں۔ صرف لیڈی سلیمان سفید سوتی ساری میں ملبوس اداس صورت ایک طرف کو خاموش بیٹھی رہتیں۔ آل زہرا نانی نے مراد آباد سے سفید رنڈسالہ بھجوایا۔ حسنین ماموں اسے لے کر آئے اور اماں کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر خوب روئے۔

ابا جان کے صندوقوں میں سے ان کے بڑھیا گرم سوٹ 'کالر' ڈنر سوٹ' اوور کوٹ اور دوسرے کپڑے نکالے گئے۔ بیشتر کپڑے یتیم خانے بھجوا دیئے گئے۔ اماں کے پھوپا وجیہہ اور شاندار خان بہادر سید علی ضامن بنارس سے آکر اماں کے پاس بیٹھے اور کہا "جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سے گا۔ جب احمد مرسل ؐ نہ رہے کون رہے گا۔

"کیا جانے والے کو پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے؟" اماں نے کہا' "ابھی مرنے سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ میرے ساتھ موٹر پر قیصر باغ کے چوراہے سے گذر رہے تھے اچانک بولے۔ بہت سا آٹا اور جنس منگوا کر گھر میں رکھ لو۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ کچھ جواب نہیں دیا۔"

پھاٹک پر ابا جان کے نام کا بورڈ "سید سجاد حیدر یلدرم پی۔ سی۔ ایس (ریٹائرڈ)" چار کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔ حال ہی میں نہ جانے کب اس کی دو کیلیں نکل گئی تھیں اور ٹیڑھا ہو گیا تھا جیسے اب گرا کہ اب گرا۔ کسی کو اسے ٹھیک کرنے کا خیال نہ آیا تھا۔ نہٹور کی ایک عزیزہ خورشید زیدی جو نشاط گنج میں رہتی تھیں اور یونیورسٹی میں قانون پڑھتی تھیں سویم کے روز کہنے لگیں' "پچھلے ہفتے یونیورسٹی جاتے ہوئے میری نظر اس ترچھے بورڈ پر پڑی۔ ہول آیا۔ میں نے نزدیک جا کر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر کیلیں گر چکی تھیں۔"

دریچے کے نیچے ابا جان کی رائٹنگ ٹیبل تھی۔ اس کی ایک دراز میں منی آرڈر فارم رکھے تھے۔ ابا جان ساری عمر ہر ماہ کی پہلی تاریخ مختلف حاجتمندوں کو مختلف رقوم بھیجا کرتے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا بھیجتے ہیں۔ سعید بھائی اپنے بڑے ابا کی اس میز کے سامنے بیٹھ کر متفرق کاغذات پر پنسل سے لکھے ہوئے اشعار اکٹھے کرنے میں مصروف رہے۔ ایک کتاب کے اندر سے آخری سیاحت کا مڑا تڑا بے بضاعت سا بس ٹکٹ نکلا۔

افغان موتر سروس

تاریخ رفت ... ۱۳۲۱ نمبر موتر .... سیت پیش

از کابل الی پشاور حامل تکت یک چوکی

نشیمن دارد .... حدود دو ... بجائے .. موتر

گذاشتہ بتوانند......

لیٹر پیڈ کے نیلے کاغذ پر "غمزدہ دوست" (مشتاق احمد زاہدی) کے نام

نہ مرنے کی کرتا کبھی آرزو — شکستہ نہ کر اپنا جام و سبو

بچاتا ہے جاں کو ہر ایک جاندار — وہ بدبخت ہو یا ہو کامگار

وہ بلبل کہ جو ہے اسیر قفس — اسے بھی ہے جینے کی ازبس ہوس

ادھر دیکھو ہے ایک شیر ژیاں — وہ سلطان و صحرائے وحشت نشاں

ادھر ہے اک آہوئے چالاک و تیز — وہ آنکھیں رسیلی ہوا میں ہو

جھپٹتا ہے آہو پہ شیر ژیاں — وہ آہو چلا جیسے تیر از کماں

..... غرض زاہدی یہ نصیحت سنو — جیو گرچہ جینے میں غم ہی سہو

مگر کر رہا ہے جو یہ وعظ و پند — نہیں خود نصیحت پہ وہ کاربند

وہ دنیا سے نومید و بیزار ہے — غم و رنج کا اس پہ انبار ہے

شب و روز صبح و مسائے کام — خوش وہ ام زندگی کا انعام

دوسرے کاغذ پر چند روز قبل کے مشاعرے کی صدارتی نظم۔

کیوں مجھ کو کیا ہے صدر مجلس — کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جاگیر

جب دیکھئے تخت پہ ہوں بیٹھا — منبر پہ ہو جیسے واعظ پیر
مانا کہ ہے میرا نالہ دلکش — ہے دل میں تڑپ زباں میں تاثیر
ہے تو سن طبع شوخ و طرار — چال اس کی کڑی کمان کا تیر
لیکن نہیں شاعری کا دعوے — ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر
یہ شوخی محض ہے وگرنہ — کیا ہیچ مداں کی ہیچ تحریر
ہوں شاہد شعر کا میں شیدا — بس اس لئے ہے میری یہ توقیر
صد شکرز سعی نوجواناں — یک قصرادب شدست تعمیر
اس بزم میں ایک ادیب کہنہ — کیوں لائے ہیں آپ بہر تشہیر
رسم است کہ شائقین تحریر — آزاد کنند بندۂ پیر

مختلف پر زوں پر۔ غم کا خیال چھوڑ کر پایان غم نہیں — دنیا میں کون ہے جسے رنج والم نہیں
رکھ یاد تیرا وقت بھی نا پائیدار ہے

آسماں پہ شفق سرخ زمیں پہ لالہ — رائیگاں یونہی تو خون شہیداں ہوتا ہے
کاش معلوم ہو مجھ کو کہ ملی کیوں یہ حیات — سارے عالم کا الم اور یہ چھوٹی سی بساط
اپنی ہستی میں تو شاید نہ ملے ان سے نجات — لاکھ کوئی کہے مجھ سے کہ ہے عالم میں نشاط
کون کرتا ہے یقیں

دست و پا اپنے ہی جب ہو گئے اپنے غماز — تو ہی اے خاک چھپالے ہمیں ہو کر فیاض
اب تو اس عالم عصیاں کی ہوا ہے ناساز — ہم سے خالی ہوکیں جلد یہ دنیا کی بیاض
لے اجل جان حزیں

۸۔ جہاں پھول کھلتے ہیں

سجاد حیدر[14] کی قبر پر عقیدت اور محبت کے دو پھول رضا علی کی طرف سے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون — دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

سجاد حیدر کی موت اس دردناک حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ علی گڑھ میں علمی مذاق کی کبھی قدر نہ ہوئی .... سجاد حیدر رسوم و قیود کے پابند نہ تھے.... شادی کے معاملے میں بھی انہوں نے ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون سے شادی کی جو شیعہ خاندان میں پیدا ہوئیں اور خود بھی شیعہ ہیں۔ رواداری عجیب نعمت ہے۔ سجاد حیدر سنی تھے اور بی بی شیعہ۔ مگر دونوں نہایت خوش و خرم اور فرقہ وارانہ پراگندگیوں سے محفوظ و مامون رہے۔ اپنی اولاد کو بھی جو نہایت سعید ہے بہت اچھی تعلیم دلائی .... سجاد مرحوم سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۴۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ میرے دوست سید محمد سبطین صاحب وکیل پرتاب گڑھ کے لڑکے کی بارات آئی تھی اور شب گذشتہ کو عزیزی سید علی ظہیر بیرسٹر کی لڑکی سے جو ماشاء اللہ خود

بھی بی اے ہے نکاح ہوا تھا۔ یکم جنوری کی دوپہر کی دعوت میں بہت سے دوستوں کا مجمع تھا۔ سجاد حیدر بھی شریک تھے۔ صحت اچھی نہ تھی۔ عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ دو ڈھائی گھنٹے تک بہت پر لطف صحبت رہی۔

سر وزیر حسن اور خان بہادر سید اصغر حسن بھی موجود تھے۔ دیر تک علی گڑھ کی پرانی صحبتوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ زمانہ بڑی عجلت کے ساتھ بدل رہا ہے تاہم ہماری سوسائٹی کا اب تک یہ حال ہے کہ جہاں دس ذوق سلیم والے جمع ہو جاتے ہیں وہاں شعر و سخن کا تذکرہ ہونا لازمی ہے۔ چند ہفتے پہلے سر محمد یعقوب کی وفات پر میں ایک مضمون سرگذشت میں لکھ چکا تھا۔ اس مضمون کی جو داد دوران گفتگو سجاد حیدر نے دی اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ کہنے لگے "تمہارا مضمون میں نے پڑھا۔ اور میں اس سے حد درجہ متاثر ہوا ہوں۔ میں یعقوب مرحوم کے مرثیے میں ان حالات کا تذکرہ کروں گا جو تم نے اپنے مضمون میں لکھے ہیں۔" دنیا عجیب جگہ ہے۔ افسوس کہ اس قدر جلد وہ وقت آگیا کہ مرثیہ لکھنے والے کا ہی مرثیہ کوئی اور لکھے۔ سجاد کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ علی گڑھ کے دور ثانی میں بڑی مشکل سے کوئی اور شخص ایسا ملے گا جس کی ذات میں اتنی جامعیت ہو جو سجاد حیدر کی ذات میں موجود تھی۔ مرحوم نے دوستوں کا وسیع حلقہ چھوڑا ہے جن میں سے بہتوں کی سجاد کے بعد یہ حالت ہو گئی ہے

تمہارے بعد یہ حال ہے ہم صفیروں کا — اس آشیاں میں صدا دی ادھر پکار آئے

"جہاں پھول کھلتے ہیں اور گلاب کی خوشبو شام کے سایہ میں پھیلتی ہے ایسی وادی کے خاموش گوشے میں جہاں نہ دبدبہ ہو نہ دغدغہ زندگی بسر کرنے کا لطف ہے۔ جہاں پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترد سرد دنیا ہنسنے لگتی ہے۔ جب فرشتہ گل شبو کے منہ کو کھولتا ہے اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے۔ اس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مرجانے کا لطف ہے۔

"جس وقت ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے اور وادی کی سطح کے زمردیں نیلوں اور زمردیں دامن کوہ پر بادلوں کا سایہ اس طرح آتا ہے جس طرح فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور میری روح کو تلاش کرتے ہیں اس وقت میری روح چاہتی ہے کہ پھولوں میں سے نکل کر بادلوں میں جا ملے۔ اور میرا دل یہ چاہتا ہے کہ اسی دامن کوہ میں ان ہی سرو کے درختوں کے سایہ میں میرے جسم کو دفن کر دیں۔ اور اگر میں اس قابل ہوں تو میرے لئے رونے والوں کے آنسو (کہ یہی میرے حسنات عمر کا نتیجہ ہوں گے) اس ہنستے کھیلتے دریا میں جو اس وادی میں بہتا ہے مل جائیں' نابود ہو جائیں۔

("جہاں پھول کھلتے ہیں" ۔ حکایات و اقتباسات[15])

"دنیا کی خوشی میں' سعادت و رفاہیت میں اضافہ نہیں ہو گا۔ مگر اندوہ و غم میں کمی ہو جائے گی۔ ایک محبت آلود وجود دنیا سے اٹھ جائے گا۔ سفالت و رذالت' تنعم و تعیش کی جنگ جاری رہے گی۔ مگر دنیا کے لئے کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائے گا۔" ("میرے بعد")

محبت کا ایک قرضہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ادا نہیں ہو سکتا۔ بیتے ہوئے زمانے کی یاد کو جگا رہا ہوں۔ یہ جان کر کہ وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا۔ محفل دیشب کے ٹوٹے ہوئی جام و مینا کے

ٹکڑے سمیٹ رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب وہ میری دست رس سے باہر ہیں۔

آخری دفعہ ۴۲ء کے آخر اور ۴۳ء کے شروع میں سجاد سے سترہ سال بعد لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ان کو بہت کمزور اور ضعیف پایا۔ میرا پہلا سوال ان سے یہی تھا' "سجاد کیا تم بیمار ہو؟" اور اپنی اس زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ (جس کی لذت سے ان کے سب ہی احباب آشنا تھے) ان کا جواب تھا۔ "ارے کچھ بھی نہیں بھائی۔ تھوڑی سی ذیابیطس ہے سو میں اس کا علاج یوں کرتا ہوں کہ جی بھر کے مٹھائی کھاتا ہوں۔ پرہیز اور احتیاط سے مرض کی خاطرداری نہیں کرتا۔"

لکھنؤ میں یہ چند ہفتے اس طرح گذرے کہ ہم دونوں گھنٹوں ان کی کوٹھی کے خاموش برآمدے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ علی گڑھ کی۔ ادبیات اور شعرو شاعری کی۔ گذرے ہوئے اور گئے ہوئے دوستوں کی۔ اس ملاقات سے چند روز پہلے نومبر ۴۲ء میں ان کے عزیز ترین دوست سر محمد یعقوب کے لئے اپنے خالق کا بلاوا آچکا تھا۔ ۲۱ دسمبر ۴۲ء کو وہ مجھے لکھ رہے تھے' "تمہیں میں تعزیت[16] نامہ کیا لکھوں۔ ہمدم دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے جانے والے دوست کے نام ایک پیام بھی۔ سر محمد یعقوب کی قوم پرستی کی نہیں احباب پرستی کی یاد مجھے تڑپا رہی ہے۔ تمہارا سجاد۔"

جو شکوہ مرحوم نے اپنے ہمدم دیرینہ[17] سے کیا تھا اب ان کے احباب خود ان سے کر رہے ہیں۔

یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ   اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ

میں اگر شاعر ہوتا تو شاید یہی سب آج سجاد مرحوم کے لئے لکھتا۔ لیکن میں کتنا ہی لکھتا رہوں کتنا ہی لکھتا رہوں وہ قرضہ کبھی ادا نہیں کر سکتا جو ایک عزیز دوست' ایک بے مثل ادیب اور ایک نازک خیال مفکر کا میرے ذمے عائد ہوتا ہے۔ اس قرضے کو میں قرضہ صرف اس لئے نہیں سمجھتا کہ سجاد مرحوم اردو زبان میں ایک نئے اور ترقی پسند اور بہت ہی دلنواز اسلوب بیان کے موجد تھے اس لے وہ خراج تحسین کے حق دار ہیں بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ ان کے ادبی ذوق سے میرے ادبی رجحانات نے اپنے آغاز کار میں بہت کچھ حاصل کیا تھا...... جس زمانہ میں سجاد مرحوم کے مضامین مخزن میں شائع ہو رہے تھے میں ان کو بار بار پڑھتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے ذہنی نقوش چرا چرا کر ان سے اپنے مضامین کو سجاتا تھا......

آخر ۴۲ء اور شروع ۴۳ء کی وہ ملاقاتیں میری نظروں میں پھر رہی ہیں۔ لکھنؤ سے چند ہفتوں کے لئے یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ واپس آکر تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ لیکن جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد میرا انتظار نہ کر سکے۔ وہ تین چار دن پہلے ہی ایک دن صبح کو اس فانی دنیا سے منہ موڑ کر آسودۂ خواب ہو گئے۔

.... ترجموں میں بھی اور ان کے طبع زاد افسانوں میں بھی غالب کی طرح انہوں نے الفاظ کی نئی ترکیبیں ایجاد کیں۔ ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کیا۔ اور دو دو چار لفظوں کے طبع زاد مرکبات میں قوت بیان کی تمام شدت کو مرکوز کر دینے کا نیا انداز اختیار کیا........

سجاد ایک ترقی پسند ادیب تھے۔ کیا یہ کوئی عجیب دعویٰ ہے؟ بلاشبہ ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کے

اندر سجاد کا انداز نگارش ترقی پسند تھا۔ انھوں نے اردو ادب کو ترکی ادب کے ترقی پسند رجحانات سے متاثر کر کے قدامت کی زنجیریں توڑ دیں۔ نہ صرف انشا پردازی کے اعتبار سے بلکہ مطالب کے اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو ترقی پسندی کا پیام دیا۔ ان کے افسانوں کے تمام موضوعات بھی ایسے ہی ہیں اور زبان کی ترقی و تہذیب کے متعلق وہ قدیم راستوں سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ یہ رجحان اس خطبہ صدارت سے بھی پوری طرح ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد کی چھٹی کانفرنس میں پڑھا تھا.......

مولانا محمد علی جوہر سجاد کو بہت چاہتے تھے۔ ہمدرد جاری کرنے سے پہلے سجاد سے بہت اصرار کیا کہ اس اخبار کی زمام ادارت سنبھال لیں۔ لیکن سجاد کی طبیعت کے رجحانات اخبار نویسی اور اس کی متعلقات کی کشاکش سے بہت دور تھے۔ ان کی فطرت زندگی کا کوئی خاموش گوشہ چاہتی تھی جہاں وہ اپنے افکار کی دنیا بسا کر بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے۔

لیکن دنیا ستم گار اور ستم ظریف ہے۔ جن ہنگاموں سے دور بھاگا کرتے تھے ان سے بدتر پابندیوں میں مبتلا ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ ادب کی قلمرو میں جو ان کی حقیقی قلمرو تھی' ان کا سکہ چلتا وہ چاکری کے چند کھوٹے سکوں کے لئے "مجموعہ تعزیرات ہند" کی دنیا میں بند کر دئے گئے۔ غلام ملکوں کا یہی سب سے بڑا حزنیہ ہوتا ہے۔ کہ ہرن اصطبل میں باندھے جاتے ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ سجاد اخبار نویسی کی دنیا میں قدم رکھنے پر آمادہ نہ ہوئے لکھا تھا' وہ ادب کے لئے وضع کئے گئے ہمارے ادبی کے لئے۔

ماو مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و من در کوچہ ہا رسوا شدیم"

کوچہ و بازار میں محمد علی کا وہ "رسوا" ہونا اور چاکری کے لق و دق صحرا میں سجاد کے کاروان ادب کا لٹ جانا ہماری زبان کی تاریخ کے دو بڑے حادثات ہیں جن سے انقلابی ہندوستان کا مورخ عبرت حاصل کرے گا۔

وہ آخری ملاقات مجھے یاد آتی ہے۔ ایک دن کہنے لگے۔ کیوں بھائی! یہ کیا بات ہے کہ "اردو زبان کے لئے اب کوئی دوسرا پریم چند پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے کہا' "کوئی پریم چند ہو یا اقبال ہو یا ٹیگور ہو یہ نوع تو صرف ایک ہی بار پیدا ہوا کرتی ہے۔ قدرت شاہکاروں کو پیدا کرنے میں کبھی فیاض نہ تھی۔"

ایک غمگین اور تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے' "اے کاش۔ ----" اور "اے کاش" کہہ کر رک گئے۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کیا کہتے۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ بدل دیا۔

بہرحال میرے پاس سجاد کی آخری یادگار ان کی وہی غمگین اور تھکی ہوئی مسکراہٹ ہے جو اس دن شام کو میں نے ان کے ہونٹوں پر دیکھی تھی۔ "سیل زمانہ" کو مخاطب کر کے انہوں نے ایک دفعہ لکھا تھا۔ ----

"بہے جا۔۔۔ بہائے جا۔۔۔ نہ تجھ میں سلامتی۔ نہ تیرے کنارے میں سلامتی۔ مٹے ہوؤں کو مٹائے جا۔ تیراکوں کو ڈبا۔ غواصوں کو غرق کر! بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے' بہے جاؤں۔۔۔! بس اے سیل زمانہ بہے جا۔ بہائے جا۔ اس بحرناپیداکنار میں اس عمان عظیم الشان میں' اس اوقیانوس ابد میں' اب یا جب تیرا دل چاہے مجھے گرادے۔"

سجاد[18] کے مضامین یا افسانوں میں آپ کو مصنف کی ذاتی زندگی کا ذرا سا حال بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ ان کی قوت تخیل ایسی قوی تھی اور جدت طبع کا یہ زور تھا کہ ان کو اپنے ذاتی ماحول کو کام میں لانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اور اگر وہ کام میں لاتے بھی ہوں گے تو اس خوبی سے کہ جو تصویریں وہ ہمارے سامنے پیش کرتے تھے وہ ان کے تصور کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی زندگی کو اپنی پبلک یا سرکاری زندگی سے بالکل علیحدہ رکھا۔ وہ کچہری اور دفتر میں عہدے دار اور مضامین اور افسانوں میں ہمیشہ سجاد حیدر رہے۔ وہ طبعاً سنجیدہ تھے مگر رعونت ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ ان کی زندگی چند نامور حضرات کی زندگی سے وابستہ رہی۔ ان کی تحریریں بارہا کرسی صدارت سے نشر کی گئیں اور اخبارات میں تعریف کے ساتھ شائع ہوئیں۔ مگر بڑے بڑے قومی جلسوں میں جب جناب صدر اپنی تقریر پڑھتے تھے تو کسی کو کانوں کان یہ نہ معلوم ہوا کہ اس تقریر کا مصنف یہ ایک نحیف الجثہ شخص ہے جو ایک گمنام انسان کی طرح اس مجلس کے ایک کونے میں بیٹھا ادھرادھر دیکھ رہا ہے۔ گویا اس تقریر سے اس کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو گمنامی میں رکھنا' "بڑا آدمی" کہلانے سے بھاگنا اور "بڑے آدمیوں" کی صحبت چھوڑ کر بے تکلف گمنام دوستوں کے ساتھ وقت گذارنا اور ان کے ساتھ خوش طبعی میں خاموشی سے حصہ لینا' سجاد حیدر کی ایسی خصوصیت تھی جو بہت کم انسانوں میں دیکھنے میں آئی ہے۔"

"سید[19] سجاد حیدر یلدرم۔ کیسی خوشگوار' کیسی مہرو محبت کی یادیں وابستہ ہیں اس نام سے۔ میرے علی گڑھ کالج کے قیام کے دوسرے ہی سال مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے پہلے رجسٹرار سجاد حیدر صاحب مقرر ہوئے۔ نام اور شہرت سے واقف تھا اور خاندانی تعلقات جو ان کے ساتھ رہے تھے جانتا تھا۔ میرے والد مرحوم خواجہ غلام الثقلین سے ان کو بہت عقیدت تھی اور وہ انہیں اپنا "گرو" مانتے تھے۔ عم محترم خواجہ غلام السبطین ان کے کلاس فیلو اور دوست رہے تھے اور بھائیوں کی طرح عزیز تھے۔ خود ملا تو پہلی ہی ملاقات میں ان کے "فتراک کا نخچیر" تھا۔ ان کی شفقت اور محبت اور گرمجوشی نے اپنی آغوش میں لے لیا..... ان کی محبوب یاد کو ایک سرمایہ عزیز سمجھتا ہوں جب روز حساب اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا (خدا کرے ایسا ہو) تو مجھے یقین ہے کہ نیکیوں کے فرد میں ایک اندراج یہ ہو گا کہ اس شخص نے سجاد حیدر کی قدر اور ان سے محبت کی تھی.....

سجاد حیدر کی ذات میں ایک اچھے انسان اور اچھے ادیب کا ایک حسین سنگم تھا۔ ان میں چاہنے اور چاہے جانے کی صلاحیت تھی جو قدرت کم لوگوں کو بخشتی ہے۔ ان میں ایک خاص خلوص اور گرمجوشی تھی جس کی تپش اجنبیت کو پگھلاتی اور تکلف کے پردے اٹھا دیتی تھی۔ وہ ہونہار نوجوانوں' ادیبوں' شاعروں کی

بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ جو ہر قابل کو ڈھونڈ نکالتے تھے اور اس کو بنانے' سنوارنے میں دلچسپی لیتے تھے اور اس رشتے میں عمر یا افسری کا خیال کبھی پر نہ مار سکتا تھا۔ ان کی گفتگو ایک طرف علم و ادب کے شوق کو اکساتی' ان کی نئی جہتوں میں دلچسپی پیدا کرتی اور دوسری طرف ایسی مخصوص ظرافت اور شوخی سے سننے والوں کے دلوں میں یہ کیفیت پیدا کرتی کہ "اے وقت تو خوش کہ وقت ماخوش کردی"۔ بعض دفعہ اپنی دلچسپ یادداشتیں اور تجربے مزے لے لے کر سناتے۔ ایک دفعہ سرکاری ملازمت کے دوران میں ان کا تقرر جزائر انڈامان کے ایک افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ اس جزیرہ میں زیادہ تر وہ لوگ آباد تھے جن کو سنگین جرموں کی وجہ سے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ وہاں یہ لوگ یا ان کی اولاد ہی نوکروں کا کام کرتی تھی۔ کہتے تھے "ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو یہ معلوم ہوا کہ میرا باورچی زہر خورانی کے جرم میں سزا یافتہ ہے اور میرا حجام گلا کاٹنے کا مجرم!" مگر اس دلچسپ دریافت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ سجاد حیدر کی شرافت' انسانیت اور سیرت دلنوازی سے متاثر ہو کر یہ جرم پیشہ "مصاحب" بھی رام ہوتے ہوں گے۔

..... میرا مقصد تو محض یہ ہے کہ ایک ایسی نسل کو جس نے سجاد حیدر کو نہیں دیکھا' ان کی شخصیت کے آتشدان پر اپنے ہاتھ گرم' ان کی سیرت کی سچائی سے براہ راست کسب فیض نہیں کیا' ایک خفیف سی جھلک دکھادوں۔ اس مرد شریف کی جس کی ذات میں محبت' خلوص اور گداز قلب کی شمع روشن تھی۔ ایک ایسی شمع جس کی اس زمانے میں قیمت بڑھتی جاتی ہے اور مانگ کم ہوتی جاتی ہے۔"

"..... سجاد حیدر میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور مستحکم بالشان پہلو ہے۔ انہوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں۔ ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیروزبر کر سکتی تھیں۔ لیکن ان میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے اور انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک شریف' شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے۔ انہوں نے مہاراجہ محمود آباد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں' نواب مزمل اللہ خاں' ڈاکٹر سر ضیاء الدین سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جداگانہ سجاد حیدر کا تھا۔ انہوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی۔ میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی سب سے محکم دلیل ہے۔

..... بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ تعلیم نسواں' اردو ٹائپ' اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔

ایک فارسی مجلہ "ایران شہر" نامی برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے۔ سر بمہر بہت سارے لفافے کاغذات ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبا کر ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے

آرہا تھا۔ اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا انداز خاص تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی۔ ہموار کسی قدر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے۔ نگاہ نیچی' تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر ایک ذرا کی ذرا رک جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا' "سجاد تم تو چلنے میں سانپ کو بھی شرماتے ہو۔ وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔" اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے کہنے لگے' "سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کرو گے؟"

اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آرہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اٹھا لیا' کچھ دور ہی آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافے نے مفارقت کی' وہ بھی میں نے قبضے میں کیا۔

سجاد صاحب برابر رسالے کے مطالعے میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچ کر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلق لوگوں کے حوالے کیے۔ معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں۔ چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک سخت متفکر رہے۔ میں نے تینوں لفافے بکھ وقفے سے واپس کیے۔ سید صاحب فرمانے لگے' "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ فوراً کیوں نہ دے دیئے۔ اس وقت مجھ پر کیا گذر گئی۔"

میں نے کہا' "آپ مطالعے میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا' "خوب یاد دلایا۔ یہ ملاحظہ فرمایئے۔ ایران شہر ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے۔ کیسے اچھے اور جاندار مضامین اور نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ بت سنگی سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود رہے گی۔"

میں نے کہا' "سید صاحب۔ بت سنگی کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا"

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا' "یہی تو ستم ہے۔ آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے خواہ مخواہ ٹائپ کی مٹی پلید کر دی۔"

میں نے عرض کیا' "سید صاحب اکبر نے کہیں بھس نہیں ملایا صرف بھس میں چنگاری دکھائی ہے۔"

ہنسے۔ پھر فرمایا' "اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔" سید صاحب اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سید صاحب کو میں نے شاید ہی کبھی تم سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انہوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی

مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا۔

ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے ایسے الفاظ نہ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔

یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اس حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے۔

سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو۔

وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے کبھی ان سے جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں۔"

"...... [20] مجھے طبعاً متین نظر آتے تھے۔ لیکن جب گفتگو کرتے تو ایک خوشگوار تبسم ان کے نازک خد و خال کو دل آویزی سے روشن کر دیتا تھا۔ گفتگو میں وقفے بھی ہوتے تھے لیکن لہجے میں بے تکلفی کی گونج اور تعلقات کی گرمجوشی جھلکتی رہتی تھی۔ ایک مضمحل انداز سے سر پیچھے کرسی سے ٹکا کر لطیف تبسم کے ساتھ اوپر دیکھتے ہوئے چپ چاپ کچھ سوچنا اور پھر یکایک سنبھل کر شفقت سے کوئی بات شروع کر دینا ان کی ایک ایسی تصویر ہے جو چشم تصور سے کسی طرح اوجھل نہیں ہوتی۔ مجھے آج اس یگانہ روزگار ادیب کے اٹھ جانے کا ہی صدمہ نہیں بلکہ میرا دل ایک ایسے عزیز بزرگ کے داغ مفارقت کا الم بھی محسوس کر رہا ہے جس کی شفقت میرے لئے ہمیشہ دلی مسرت و ناز کا باعث بنی رہی۔ ---- "زہرا" "ثالث بالخیر" "خیالستان" "حکایات و احتساسات" "جلال الدین خوارزم شاہ" "جنگ و جدال" "پرانا خواب" "آسیب الفت" اور دوسرے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ نظمیں شائع نہیں ہوئیں۔ آخری ملاقات میں فرماتے تھے کہ مجھ سے نظمیں بعض خاص عزیزوں اور قریبی دوستوں کے تعلقات ہی نے کہلوائی ہیں۔ اسی ملاقات میں ایک ڈرامہ "طارق" لکھنے کا خیال ظاہر فرما رہے تھے۔"

"بچپن [21] سے سید سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر صاحبہ کا نام سنتے آئے تھے۔ مضامین اور افسانے پڑھے تھے۔ مگر ملاقات ہوئی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر۔ یوں دیکھ چکے تھے علی گڑھ میں بھی۔ دبلے پتلے' دھان پان' ترکی ٹوپی پہنے ہوئے۔ گویا مہاتما گاندھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر اب تک شرمیلی طبیعت ہے۔ اپنی ادبی خدمات کا احساس ہی نہیں غرور تو دوسری چیز ہے۔ اپنے سامنے کے ادبی بچوں کا بھی اس انداز سے احترام کرتے ہیں گویا آپ تو خود کچھ ہیں ہی نہیں۔ جو کچھ ہیں یہ نئی پود کے برخورداران ادب ہیں۔

..... میں یہ سطریں لکھ ہی چکا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم کے سفر آخرت کی خبر بھی سن لی۔ افسانہ نگار خود افسانہ بن گیا۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون**"

"ہمارے [22] موجودہ شور رستاخیز میں سجاد حیدر کی وفات کا سانحہ کچھ دب کر رہ گیا۔ اسے محسوس کیا تو صرف انہی لوگوں نے جن کے لئے ان کی موت ایک ذاتی صدمہ تھی۔ یہ تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا اس پر کوئی نعرہ چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ واقعہ کہ ان کی رحلت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے۔ اردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا۔ بڑی شوخی اور لطف کے ساتھ انہوں نے اردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تر و تازگی بخشی۔ گو ان کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے لیکن رنگ و روپ کی بہت سی لطافتیں جو انہوں نے اردو میں پیدا کیں ابھی باقی ہیں........"

۹۔ اولڈ کیوروسٹی شاپ اور پلگرمز پروگریس

چہلم تک گھر میں مہمانوں کا ہجوم رہا پھر رفتہ رفتہ سناٹا چھا گیا۔ صرف قریبی عزیز و احباب موجود رہے۔ منشی فیاض علی ایڈوکیٹ' ڈرائنگ روم میں ابا جان کے قانونی کاغذات سامنے پھیلائے لکھا پڑھی میں مصروف رہتے۔ ابا جان ریاضی میں کمزور تھے لیکن شیر مارکیٹ اور اسٹاک ایکس چینج کی بہت سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ایک لاکھ ۳۶ ہزار کی مالیت کے شیرز' جن میں سے چارٹرڈ بنک آف انڈیا' آسٹریلیا اینڈ چائنا' بشپس گیٹ لندن کے کاغذات سے معلوم ہوا کہ متعدد جنوبی افریقہ اور برما کی کانوں کے تھے۔ مزید اطلاع ملی کہ وفات سے چھ سات دن قبل کلکتہ کے شیر بروکرز منشی جی اینڈ کمپنی نے ابا جان کے پاس چورنگھی کی ایک عمارت رہن رکھی تھی لیکن جس تاریخ کو مسودات پر دستخط کرنے والے تھے اس سے دو روز پہلے اللہ میاں کا بلاوا آ گیا۔ منشی فیاض علی نے کہا۔ منشی جی اینڈ کمپنی پر دعویٰ دائر کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بیحد خرچہ اور دردسری مضمر ہے۔ خود شیرز اور آشیانہ کے وراثتی سرٹیفکیٹ کی کورٹ فیس کافی بھاری تھی جو کیش میں موجود نہ تھا۔ جج سعید جعفری بچارے نے جو ابا جان کی انتقال کے روز سے بھائی کو مستقل انواع و اقسام کی کفایت شعاریوں کے مشورے دے رہے تھے تجویز کیا کہ یہ کوٹھی چھوڑ کر کم کرائے کے مکان میں منتقل ہو جاؤ اور ملازمت تلاش کرو۔

پیکنگ شروع کرانے سے قبل چندا ممانی خاموشی سے کمرے کمرے گھومتی پھریں۔ اس ماڑس اثاث البیت سے بیشمار یادیں وابستہ تھیں۔ کھانے کے کمرے کے خلیجی دریچے میں اسٹینڈ پر وہی چاپچی رکھی تھی جو اسی اسٹینڈ پر مختلف شہروں کے کمروں میں رکھی رہی تھی۔ طویل میز جو غازی پور کے وسیع ڈرائنگ روم میں سالم بچھتی تھی اس کے دونوں مدور سرے علیحدہ کر کے دیواروں سے لگا دیئے گئے تھے۔ وکٹورین سائیڈ بورڈز کی سفید لیس مسوری کی بل دیو سے چلی آ رہی تھی۔ ایرانی اور انگورہ قالین مختلف بیرونی سیاحتوں کی یادگار تھے۔ ان کے علاوہ ترکی فنجان' یوروچین تک نیک' وسطی منقش میز پر چاندی کا درخت جس

میں نقرئی بالئیاں سی آویزاں تھیں' کشمیری کیک اسٹینڈ' برنجی اسٹول پر لرزاں برنجی نٹ' بڑے بڑے کنڈوں والے برنجی گملوں میں پوشیدہ پام کے گملے' نقرئی فریموں میں مزین رشتے داروں کی تصاویر کا جنگل' آتشدان کے کارچوبی مخملیں غلاف' جزائر انڈامان کے سمندری نمک کے عظیم الجثہ بحری پھول' سیپ اور گھونگے۔

جاڑوں میں دبیز ریشمی اور گرمیوں میں جالی کے پردے دریچوں اور دروازوں پر لگائے جاتے تھے مئی کا مہینہ آ گیا۔ اس سال موسم سرما کے پردے تبدیل کرنے کے بجائے اتار کر تہہ کر دیئے گئے۔

ابھی یہی طے نہیں ہوا تھا کہ ہم لوگ کہاں رہیں گے۔ اماں منٹ منٹ پر متضاد فیصلے کرتی تھیں۔ بھائی جن کی زندگی کے بائیس سال مکمل بے فکری اور آسائش میں گذرے تھے بالکل بھونچکے تھے۔

ابا جان جتنے کفایت شعار تھے اماں اتنی ہی شاہ خرچ واقع ہوئی تھیں۔ دعوتیں' پارٹیاں کرنا' پہاڑوں پر "سیزن" گذارنا' عزیزوں' دوستوں اور ان کی اولادوں کی شادیوں پر بھاری جوڑے مع ایک عدد جڑاؤ زیور تحفے میں دینا وغیرہ ان کے محبوب مشاغل تھے۔ لڑکپن سے فیشن لیڈر رہی تھیں۔ وضع جدید کا غرارہ اختراع کر کے رائج کیا۔ کھدر پوشی کے دور میں کھادی کی ساریوں پر نت نئے ڈیزائن چھپوایا کرتی تھیں۔ ان کے ایک سفید ولایتی ٹی سیٹ پر جیسی سبز بندکیاں پڑی ہوئی تھیں آشیانہ میں ایک ٹی پارٹی پر پہننے کے لئے سفید جارجٹ کی ساری پر اسی نمونے کی سبز بندکیاں چھپوائیں۔ ساری زندگی ایک وقت کا کھانا خود نہیں پکایا تھا۔ مجھے بھی باورچی خانے میں جانے کی ممانعت کہ دھوئیں سے آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ میری ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ بیرے کی نگرانی میں ڈنرز کے مواقع پر کلف دار نیپکنز کے مختلف نمونے بنا کر گلاسوں میں اڑسوں اور کاغذ کے پوتگے سے پڈنگ پر آئسنگ کروں۔

اماں البتہ بہترین ہاؤس وائف اور مکمل ہوسٹس تھیں۔ گھر کا سارا سامان خود بڑے شوق سے بنوایا اور خریدا تھا جسے وہ علی گڑھ' لکھنؤ' ہردوئی' غازی پور' دہرہ دون' اٹاوہ احتیاط سے لئے لئے پھری تھیں۔ ایک ایک چیز سینت کر رکھتی تھیں۔ کارچوب اور کلابتوں کی ڈوائلز' کشمیری اور چینی ہاؤس ہولڈ لینن' کرم خوردہ چینی لبادے اور ترکی فرغل اور دوسرا الم غلم الماریوں میں اٹا ٹوٹ ٹھنسا ہوا تھا۔ ابا جان کی بیش قیمت ترکی' فارسی انگریزی اردو کتابوں کے انبار جستے کے ٹبوں میں انڈیلے گئے اور انہیں بیل گاڑیوں پر لاد کر ماموں ابراہیم خاں کے ہاں لاکرتی روانہ کیا گیا۔ بیل گاڑیوں کے جانے کے بعد پچھلے برآمدے کے ایک کونے میں مجھے چند کتابیں پڑی نظر آئیں جو ٹبوں میں ڈالے جانے سے رہ گئی تھیں۔ سلامبو۔ تائیس' چوگان ہستی۔ خواب ہستی۔ ظالم محبت۔ مخزن اور تہذیب نسواں کے چند فائل۔ ٹونو بنگے۔ گرے وولف۔ ٹائم براؤنز اسکول ڈیز۔ پریسٹر جان۔ کیسٹریونا۔ فاؤسٹ۔ اولڈ کیوروسٹی شاپ۔ پلگرمز پروگریس۔

قالینوں۔ دریوں اور ہاؤس ہولڈ لینن کے گٹھر باندھے گئے۔ چینی کے برتن پیک ہوئے۔ اسٹیر ٹرنکوں میں تصاویر اور سجاوٹ کی چیزیں بند کی گئیں۔ فرنیچر فروخت کرنے کے لئے پچھلے برآمدے سے ملحق

وسیع چبوترے پر نکال کر رکھا گیا۔

اولڈ کیوروسٹی شاپ۔

اسی افراتفری میں متعدد اہم کاغذات اور تعزیتی خطوں کے پلندے کہیں ضائع ہوئے۔ ان سولہ کتابوں کے ساتھ زرد رنگ کے کاغذ پر لکھا ہوا ایک تعزیتی خط باقی رہ گیا۔

دہرہ دون

۱۲ جون ۱۹۴۳ء

محترم ذی شان جواں بخت و شجاع خصلت سب اڈیٹر پانیر زاد عنایتہ' کل اتفاقاً مولوی عنایت اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت عالی صفات و پاک طینت جناب رجسٹرار صاحب یعنی بزرگوار جمیع مسلمانان ہند بالقاب پر زور یلدرم معروف اس دنیائے فانی سے توشہ بزرگ اعمال و سند بیت اللہ شریف جیسا آپ کو یاد ہو ان کے عزم حج پر اسٹیشن دہرہ دون میں آغائے محمد عمر خاں وغیرہ نے رخصت کیا تھا دارالآخرت کو واصل ہوئے۔

اے دل چہ شد کہ از جگر فغاں نمی کشی

آہے بیاد شاہ شہیداں نمی کشی

واللہ اے جوان باقبال محترم و عزیز سب اڈیٹر صاحب' یہ کاغذ زرد محض ثبوت رنگ زرد اپنے غم کی وجہ کا ہے۔ خداوند عالم مرحوم و مغفور کو عاقبت میں جیسا کہ دنیا میں سرخرو رکھا محفوظ رکھے۔

رنگ زرد عاشقاں و چہرہ گلگون یار

ہر دو رایکجا کنی رعنا وزیبای شود

دنیا پر آشوب میں یہ ہمیں وجہ کہ انسان روتے پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے نقش و نگار سے مانوس ہو کر قہقہے لگاتا ہے۔ اور اس آہ و بکا کو جو قدرت نے ابتداً ودیعت کیا ہے بھول جاتا ہے۔ اسی لئے مسلمان اپنے حافظہ میں دوسرے قوموں سے فوق العادہ مانا گیا ہے۔ پہاڑی لوگوں کی زبان میں شیر کو جو مخزن عقل ہے کپال کہتے ہیں اور ہمارا لفظ کابل اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امان اللہ خاں غازی نے اپنے بل سے یوروپ کے نقشے کو ایشیا والوں کو معقول سمجھایا اور خداداد مملکت افغانستان کے نام کو مستقل و جاوید حریت بخشی۔ یہ روحانیت اور نام زندگی مسلم ہے۔

خداوند کریم سجاد صاحب کو سایہ جوار رحمت میں آرا سے رکھے اور آپ کو اور والدہ محترمہ' ہمشیرہ عزیزہ کو ہمت دے۔

نیازمند

حاجی عبد القدوس افغان

اس کے علاوہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء کا عربی رسم الخط میں لکھا کسی ترک کا خط ہیٹ ریک کی دراز میں

سے نکلا۔ حضور عالیدینہ۔ سعادتو فردہ تم سجاد حیدر بک یلدریم حضرتینہ ---------- جنے کیا لکھا تھا۔

یکم جولائی کو نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ سے "کاشانہ" میں ہم لوگ منتقل ہوئے۔ جو نزدیک رائے بہاری لال روڈ پر ایک بجد مختصر سی کاٹج تھی۔ صبح منہ اندھیرے زیر دیوار ڈاکٹر وحید مرزا کے باغ میں پرندے چہچہاتے۔ ڈاکٹر وحید مرزا کی بیوی بیا باجی اور بہن قرۃ العین جو عرصہ دراز سے تہذیب نسواں میں مضمون لکھا کرتی تھیں دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیا باجی سلطانہ خالہ اور چچا رضاء اللہ کی لڑکی تھیں۔ کچھ دور پر ڈاکٹر عبد الرحمٰن کا مکان تھا جنھوں نے میرے پان میں کیلیں کھا جانے کا علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر رحمٰن کی حسین بھانجی نسیمہ سے جن کے والد آغا محمد جان راولپنڈی کے نامی بیرسٹر تھے اماں نے فیض آباد چھاؤنی والے میجر وہاج الدین احمد مرزا کی شادی طے کروائی تھی۔ ۱۰ اپریل کی شام میں نے مرزا ماموں کی شادی میں پہننے کے لئے ابا جان سے فیروزے کے سیٹ کی فرمائش کی تھی۔ شادی مئی کے مہینے میں ہوئی۔ اب مرزا ماموں اور نسیمہ ممانی روزانہ شام کو اماں کے پاس چھاؤنی سے آیا کرتے۔ چھاؤنی سے حسنین ماموں چندا ممانی' ابراہیم ماموں' اختر ممانی بلاناغہ رائے بہاری روڈ آتے رہتے۔

بھائی جو ہر سال مسوری جا کر بال روم ڈانس' رولر اسکیٹنگ اور شہ سواری میں موسم گرما گزارتے تھے اور انگریز کو تھپڑ لگا کر امپریل سروس چھوڑ آئے تھے' ابا جان کی رحلت کی صبح سے دفعتاً ان کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ اب وہ نزدیک پولس لائنز کی مسجد میں جا کر باجماعت پنجگانہ پڑھتے تھے اور تلاش ملازمت میں مصروف تھے۔ چونکہ ابا جان کی طرح حد درجہ غیور واقع ہوئے تھے ابا جان کے کسی صاحب اقتدار دوست سے سفارش حاصل نہیں کی۔ راجہ صاحب محمود آباد سے ملنے نہیں گئے۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے سنٹرل نیوز آرگنائزیشن میں انگریزی نیوز کاسٹر کی جگہ کا اشتہار اخبار میں دیکھ کر درخواست بھیجی اور انٹرویو کے لئے بلائے گئے۔

دہرہ دون سے اطلاع آئی کہ ۱۲ اکتوبر کے روز چچا عنایت اللہ دہلویؒ بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔

اس صبح امریکن ضعیفہ مس ویلسن کی کلاس میں شاکے کینڈا کی "پلے ریڈنگ" کی جا رہی تھی۔ اپنا پارٹ پڑھتے پڑھتے میں دروازے کی طرف چلی گئی۔ باہر نظر پڑی تو دیکھا امیر خاں پھاٹک میں داخل ہو رہے ہیں۔

کلاس کے بعد باہر گئی۔ وہ ایک پام کے نیچے گھاس پر گم سم بیٹھے تھے۔ کھڑے ہو کر کہا' "بیگم صاحب کے پاس بابا کا تار آیا ہے۔ دلی سے۔"

میں نے ان سے لے کر تار پڑھا' "نوکری مل گئی۔ بی بی کا داخلہ اندر پرستھ کالج میں کر دیا ہے۔ فوراً بھیج دیجئے۔"

پلگر مزپروگریس۔

حوالہ جات

1. خطبہ صدارت' اجلاس ششم' شعبہ اردو۔ ہندوستانی اکیڈیمی۔ الہ آباد۔ مارچ ۱۹۳۸ء
2. پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاری کے بعد یہ رجائیت یاسیت میں بدل گئی جس نے ایلیٹ سے ویسٹ لینڈ لکھوایا۔ بعد کی اقتصادی کساد بازاری اور دوسری جنگ عظیم نے پرانی عقلیت پرستی اور رجائیت کو تہہ و بالا کر دیا اور بہت سے اہل مغرب ایک بار پھر قدامت پرست مذہب' روحانیت اور معرفت میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔
3. اکتوبر ۶۷ء میں نذر سجاد حیدر کی وفات پر سجاد ظہیر کے تعزیتی خط سے اقتباس۔
4. اماں چونکہ راجہ صاحب محمود آباد سے خفا تھیں کہ وہ اباجان سے کام کیوں کروا رہے ہیں ان کے ہاں بالکل آتی جاتی نہیں تھیں۔
5. جمال میاں فرنگی محلی۔
6. شیخ محمد حبیب اللہ کے بیٹے۔ عطیہ شاہد حسین کے شوہر۔ شیخ حبیب اللہ مدتوں سے تعلقہ محمود آباد کے مینجر تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔
7. سپل۔ا
8. ملازم۔
9. دودھ میں چاول۔
10. دیکھیے فصل اول باب ۸ "غدر ۱۸۵۷ء" اور فصل پنجم' باب ۱۲ "مثنوی ماڑے نامہ"۔
11. مستری احمد حسین اور عبدالرزاق (چاندپور) مستری میت اللہ (بجنور) مستری ننھے (نجیب آباد) صوفی عبدالرحیم' شیخ اسمٰعیل' مولوی رحمت اللہ' حافظ عبداللطیف (نہٹور) مستری اللہ دیا (مراد آباد) وغیرہ۔ مستری مبارک حسین نہٹور میں انتہائی مفلوک الحال اور گمنامی کے عالم میں زندہ ہیں۔
12. از یلدرم۔
13. سر محمد یعقوب مرحوم قاضی عبدالغفار کے سالے اور امتیاز علی تاج کے بہنوئی تھے۔ اور ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اور اماں نے تاج اور حجاب کی شادی کروائی تھی۔
14. "سید سجاد حیدر یلدرم" از سر سید رضا علی۔ مطبوعہ جامعہ دہلی۔ جولائی ۱۹۴۳ء (تلخیص)
15. قاضی عبدالغفار کے ایک طویل مضمون کی تلخیص جس کے آغاز میں انہوں نے یلدرم کے مندرجہ بالا اقتباسات پیش کئے تھے۔
16. قاضی عبدالغفار مرحوم سر یعقوب مرحوم کے بہنوئی تھے۔
17. دیکھیے باب گذشتہ۔

18. مشتاق احمد زاہدی کے ایک مضمون سے اقتباس۔ مطبوعہ ادیب۔ دہلی ستمبر ۴۳ء
19. ایک دلکش شخصیت" از خواجہ غلام السیدین مرحوم۔
20. امتیاز علی تاج۔ "تہذیب نسواں" لاہور۔ ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء
21. شوکت تھانوی۔ "شیش محل"
22. اللہ شاہ بخاری پطرس۔ باقی مضمون کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے صہ ۱۳۲ فصل سوم باب ۶ "پریم چند سے پہلے"
23. مصنف انور و شمیم۔ بعد میں ایڈوکیٹ جنرل' پاکستان۔

فصل یازدہم

۱ــ بائیس خواجہ کی چوکھٹ

اکتوبر کی تیز دھوپ میں تانگہ نمبر ۴ پارک سائیڈ نارتھ' قرولباغ کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ حسنین ماموں کے خانہ زاد ملازم چھٹوا نے جو لکھنؤ سے پہنچانے آئے تھے' اسباب اتار کر برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھا۔ چچا مشتاق احمد زاہدی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ فوراً اٹھ کر در میں آئے۔ چچی آنسو بہاتی اندر سے نکلیں۔ شیشہ ایسی جھلکتی رنگت۔ ناک میں ہیرے کی بڑی سے لونگ۔ سفید ململ کی ساری۔ چچی جو بلند شہر کے ایک قدیم علم دوست مغل خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس عمر میں بھی بیحد حسین تھیں۔ بھائی آصف زاہدی سیاہ کوٹ پہن کر اسی وقت کورٹ جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں بھائی دوپہر کی خبریں پڑھ کر سائیکل پر براڈکاسٹنگ ہاؤس سے لوٹے۔ آصف بھائی کی کشمیری دلہن نے کھانا نکلوایا۔

چچا زاہدی کوشک فروخت کر کے کچھ عرصہ قبل ہی اس وسیع و عریض ماڈرن فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں ان کا بیش قیمت کتب خانہ تھا۔

چچا غالباً ۳۵ء تک صادق ایجرٹن کالج بھاولپور کے پرنسپل رہے تھے۔ انگریزی ادب اور تاریخ کے استاد تھے اور سیاسی طور پر قوم پرستی کے حامی تھے۔ دن بھر ان کے پاس احباب کا مجمع رہتا۔ خان بہادر بنیاد حسین' چچا سلجوقی' فصیح الدین احمد' خواجہ محمد شفیع' ظہیر شمسی اور دوسرے دلی والے۔ پارک کی دوسری طرف بھائی نورالدین احمد کی نئی کوٹھی میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کرائے دار تھے۔ چچا کے پڑوس سے کرنل فیض احمد فیض حال میں کہیں اور جا چکے تھے۔

چچی کے کمرے میں تخت پر داغ کے داماد نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی آکر گڈے ایسے بیٹھ جاتے۔ گورا رنگ۔ سفید چوگوشیہ ٹوپی۔ ہاتھ میں ڈنڈا۔ خاندان لوہارو کے دوسرے افراد آتے رہتے۔

چچا نے تاریخ اور اقتصادیات لینے کا مشورہ دیا۔ کالج کی لاری صبح صبح آکر پھاٹک پر ہارن بجاتی۔ اندرپرستھ کالج بہت دور علی پور روڈ پر واقع تھا۔ اماں کی ایک سہیلی لاڈو رانی زتشی کی بیٹی جنک کماری زتشی شعبہ انگریزی میں لیکچرر تھیں۔ انگلش لٹریچر کے ساتھ ایک پرچہ اردو یا ہندی کا لازمی تھا۔ اردو پنڈت تری بھون ناتھ زار پڑھاتے تھے جو وضع قدیم کے ایک شفیق بزرگ تھے اور مولوی صاحب کہلاتے تھے۔ دو تین سکھ لڑکیوں نے بھی اردو لے رکھی تھی۔

کالج میں کمیونلزم بالکل نہیں تھی اور مسلمان لڑکیوں کی تعداد خاصی تھی۔ نہایت معیاری اور عمدہ کالج تھا مگر ازابلا تھوبرن کالج کے بعد بہت کھل رہا تھا۔ اندرپرستھ کی لڑکیوں پر ازابلا تھوبرن کالج کا بہت رعب تھا۔ مجھے دیکھ کر آپس میں سرگوشی کرتیں۔ "آئی۔ٹی سے آئی ہے۔ "گویا آکسفرڈ سے آئی ہے۔

کلاس میں برابر کے ڈیسک پر ایک سبز آنکھوں والی دبلی پتلی لڑکی منہ لٹکائے چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ داخلے کے تیسرے روز اس نے اچانک مجھ سے اپنا تعارف کروایا' "میں کنیرڈ سے آئی ہوں۔ تم آئی ٹی چھوڑ کر اس پتری پاٹھ شالہ میں کیوں آگئیں؟"

"فادر کی ڈیتھ ہو گئی۔" میں نے اس کالج کی مروجہ زبان میں جواب دیا۔ "ہم لوگوں کو دلی آنا پڑا۔ برادر کو یہاں سروس مل گئی ہے۔"

"مجھے بھی مجبوراً آنا پڑا۔ والد صاحب قبلہ کا لاہور سے تبادلہ ہو گیا۔"

میں نے اسے چونک کر دیکھا۔

اس اہل زبان خاتون کا اسم گرامی شانت لتا بہادر تھا۔ دلی کے ایک قدیم ماتھر کائستھ گھرانے کی دختر نیک اختر۔ جد اعلیٰ راجہ رگھوناتھ رائے اورنگ زیب کے دیوان اور پردادا منشی جیون لال غدر کے وقت ریذیڈنسی کے میر منشی تھے۔ سارا بہادر خاندان علی پور روڈ سے ملحق سول لائنز میں رہتا تھا۔

آخر نومبر میں اماں لکھنؤ سے آگئیں۔ چچا زاہدی کے ہاں تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ دلی میں امی جی تھی۔ کوچہ چیلاں میں سلطانہ خالہ' چچا رضاء اللہ اور پروفیسر مرزا محمد سعید۔ گلی قاسم جان میں ابا جان کے دوست کرنل زیڈ احمد مرحوم کا کنبہ۔ دریا گنج میں چچا انعام الحق مرحوم کی بیوی چچی توقیر' ان کے علاوہ مولانا رازق الخیری" شاہد احمد دہلوی' آغا شاعر قزلباش مرحوم کی اولاد سب پرانی دلی کے اندر اپنے اپنے گھروں میں ہونگی ڈوری بیٹھے تھے۔ چچا زاہدی کی بیٹی حسنہ باجی دہلی ریڈیو کی مقبول "باجی" اور سحاب قزلباش ہر دلعزیز اناؤنسر تھیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ صرف ساڑھے تین برس بعد سورج سوا نیزے پر آیا چاہتا ہے۔

شائستہ اکرام اللہ اور چودھری ظفر اللہ خاں نئی دہلی میں رہتے تھے۔ چودھری صاحب وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر تھے۔ ان کی کوٹھی کے آفس روم میں میز کے پیچھے دنیا کا نقشہ آویزاں تھا اس کے نیچے بیٹھے چودھری صاحب کام میں معروف رہتے تھے۔ اس وقت ان کو علم نہ تھا کہ بہت جلد وہ خود ایک نئی مملکت کے وزیر امور خارجہ کی حیثیت سے عالمی سیاست میں اہم رول ادا کریں گے۔

بدر ممانی' یعنی لیڈی ظفر اللہ افضل خالو مرحوم کے جوانمرگ دوست شمشاد حسین کی خوبصورت بیٹی اپنے نامور شوہر سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں۔ چوڑی دار پاجامہ پہنے تیز سرخ لپ اسٹک لگائے انگریزی بولتی ہوئی سخت پردے میں رہتی تھیں۔ وہ اماں سے بار بار کہتیں "باجی جان۔ اللہ آپ سب کا نیک انتظام کرے۔ اللہ نیک انتظام کرے۔"

اماں نے چودھری صاحب سے کہا کہ گورداسپور والی کوٹھی میر قائم علی کے لامتناہی مقدمے کے سلسلے میں کچھ کریں۔ ایک روز ان کا پرچہ قرولباغ آیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر۸ پارک روڈ نئی دہلی
۲۸ نومبر ۱۹۴۳ء

محترمہ باجی جان۔ اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

میں نے میرزا عبدالحق صاحب ایڈوکیٹ گورداسپور کے نام خط لکھا۔ ان کا جواب آپ کی اطلاع کے لئے ارسال خدمت ہے۔ وہ لکھتے ہیں آپ خوشی سے اس عاجز کے نام مختار نامہ بھجوا دیجئے۔ میں انشاء اللہ سارا کام کردوں گا۔ لیکن زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ آپ خود بھی چند روز کے لئے گورداسپور تشریف لے جائیں۔

بچوں کو دعا

خاکسار
ظفر اللہ خاں

اماں نے فی الفور گورداسپور کا پاتراب کیا۔ چچی زاہدی بولیں "بھابی چلئے حضرت نظام الدین چل کر منت مان آئیں۔ اللہ آپ کو مقدمے میں کامیاب کرے۔ دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے۔ یہاں آپ کی سب پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ"

اماں نے کہا "بھابی میں تو قبر پرستی کرتی نہیں۔ آپ جا کر کلاوے باندھئے۔ میں خواجہ بانو سے مل لوں گی۔" اماں اور چچی کے درمیان زیارت قبور کے سلسلے میں ہمیشہ ایک دوسرے سے نوک جھونک رہتی تھی۔

خواجہ حسن نظامی اور ان کی بیوی خواجہ بانو ابا جان اور اماں کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ دوسری صبح ہم سب نظام الدین اولیاء پہنچے۔ فرغل میں ملبوس خواجہ حسن نظامی چاندنی کے فرش پر گاؤ تکئے کے سہارے جلوہ افروز تھے۔ کندھوں پر کاکلیں چھٹکی ہوئی تھیں۔ قریب فرش پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ ہماری موجودگی میں دو تین بار وائسریگل لاج سے فون آیا۔

خواجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا "یہاں اسکول میں داخل ہو گئی ہو؟" میں نے کہا "کالج میں بی۔اے میں داخلہ لیا ہے۔"

تعجب سے فرمایا "ارے اتنے جلدی بی۔اے میں پہنچ گئیں۔"

جنگ کی وجہ سے دلی میں مکانوں کا قحط تھا۔ چچا زاہدی کے گھر کے نزدیک بھجور روڈ پر چار کمروں اور دو برآمدوں کا ایک گراؤنڈ فلور فلیٹ بمشکل دستیاب ہوا۔ گورداسپور سے لوٹ کر اماں نے بقول خود "کام چلاؤ" سستا فرنیچر خریدا اور چچا کے ہاں سے قریشی منزل منتقل ہوئے۔

عاشورہ محرم کا اجاڑ دن گذارنے ہم لوگ چچا رضا علی کے ہاں چلے گئے۔ جو اپنے بیٹے حمزہ علی کے ساتھ نئی دہلی میں رہتے تھے۔ ان کی پنجابی بہو دھوپ میں بیٹھی انگیٹھی پر بھجڑا گھونٹ رہی تھیں۔ چچا ڈریسنگ گاؤن پہنے آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ قریب فرش پر اعمالنامہ کی سرخ جلدوں کا انبار رکھا تھا جو شاید اسی روز

پریس سے آیا تھا۔

بھجور روڈ عجب ویران سی سڑک تھی۔ جس پر ہر وقت دھول اڑتی رہتی۔ قریشی منزل کے پیچھے محلہ تھا۔ ماہ رمضان کی سرد راتوں میں پچھلے پہر پچھواڑے کی گلی میں دو فقیر بڑی خوش الحانی سے سحری کے لئے پکارتے گذرتے۔ وقت برکت ہے اے روزہ دارو۔ اٹھو۔ ہوشیار ہو سحری کھالو۔ وفادار امیر خاں جو اماں کے ساتھ لکھنؤ سے آگئے تھے فوراً باورچی خانے میں جا کر ہندوستانی وضع کا چولہا سلگاتے۔

لاہور سے ہر دوسرے تیسرے مہینے بھائی حمید علی آتے رہتے۔ ایک روز حکیم یوسف حسن لاہور سے تشریف لائے اماں سے کہا "نیرنگ خیال کی حالت دگرگوں ہو چکی ہے۔ کوشاں ہوں کہ پھر اسی آب و تاب سے نکلے۔" معاً مجھے مخاطب کیا "اب قلم آپ کے ہاتھ میں آیا ہے۔ آپ نیرنگ خیال میں لکھنا شروع کیجئے۔"

میں نے نہایت اطمینان اور خود اعتمادی سے جواب دیا "بہت اچھا ضرور لکھیں گے۔" آخر پھول اور بنات اور تہذیب نسواں میں لکھ رہے تھے کہ نہیں۔ بڑوں کے رسالوں میں بھی لکھ لیں گے۔ کون سے کمال کی بات ہے۔ اور لکھنؤ ریڈیو کے بچوں اور عورتوں کے پروگرام کے لئے اتنے سارے اسکٹ جو لکھے تھے وہ الگ۔

چند روز بعد ایک طنزیہ اسکٹ "ایک شام" لکھ کر چچا زاہدی کو دکھایا۔ انہوں نے بےحد پسند کیا۔ مگر کہنے لگے اپنے نام سے چھپواؤ گی تو کسی کو یقین نہ آئے گا کہ ایں قدر نے لکھا ہے۔ پہلے فرضی نام سے لکھو۔ چچا نے لالہ رخ کے فرضی نام سے وہ مضمون ادیب کے اڈیٹر فصیح الدین احمد کو دے دیا۔ وہ بغیر کسی رد و بدل کے شائع ہو گیا۔ اس کے بعد ایک افسانہ بعنوان "ارادے" اپنے نام سے ادیب کو بھیجا۔ اس پر مبلغ بیس روپے کا انعام ملا۔ چچا نے کہا بس اب تم باقاعدہ افسانہ نگار بن گئیں۔

اب میں نے کہانیاں لکھ لکھ کر چچا کو دکھائے بغیر ساقی' ہمایوں اور ادب لطیف میں بھیجیں۔ جوں کی توں چھپ گئیں۔ شاہد احمد دہلوی نے جو نئے لکھنے والوں کی بے انتہا ہمت افزائی کرتے تھے اداریے میں تعریف کی۔ فٹافٹ افسانے چھپنے لگے۔ ایک بھی کہیں سے واپس نہ آیا جو ذرا حوصلہ شکنی ہوتی۔

ترقی پسندی اور شدید بائیں بازو کی سیاست کا دور تھا۔ ایک مرتبہ پرکاش پنڈت اڈیٹر شاہراہ کا خط آیا' "محترمہ رفیقہ (یہ کامریڈ کا ترجمہ تھا) آپ کا فلاں افسانہ جو ادب لطیف میں چھپا گو بورژوائیت لئے ہوئے ہے مگر اچھا ہے۔ شاہراہ کے لئے کچھ بھیجئے۔"

میں نے چچا زاہدی سے پوچھا "بورژوائیت کیا چیز ہوتی ہے؟"

چچا نے کہا' "وہ بھی ہوتی ہے ایک چیز۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ جس طرح تمہارا دل چاہے اس طرح لکھتی جاؤ۔"

اچھو بیگم جنہوں نے علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن اور تیسری پوزیشن میں ہائی اسکول کیا تھا لیڈی اروِن کالج دہلی میں دو سال گذار کر بی۔ اے کے لئے علی گڑھ واپس جا چکی تھیں۔ ان سے بڑی بہن آپا

زہرا لیڈی ارون میں پڑھ رہی تھیں۔ اچھو' پارے' رمی علی گڑھ سے آئے دن دلی آتے رہتے تھے۔ ابا جان کی ایک چچا زاد بہن کی بیٹی آپا نفیسہ اور ان کے نہٹوری شوہر محکمہ امور خارجہ کے سید اطاعت حسین نئی دلی میں رہتے تھے۔ چچا نصیر اور چچی وحیدہ ٹونک میں تھے۔ چچا وحید اپنی آخری پوسٹنگ سہارنپور سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آگئے تھے (جہاں سعید بھائی کا بہادر آباد سے تبادلہ ہو چکا تھا) اور قیصر ولا میں سعید بھائی آپا عذرا کے ساتھ رہتے تھے۔ دسمبر ۴۴ء میں جب ہم لوگ علی گڑھ گئے۔ چچا وحید ہمارے قیصر ولا پہنچنے پر برآمدے میں آکر خاموش کھڑے رہے۔ پھر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے میں واپس جا کر پلنگ کے کنارے بیٹھ گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد "اللہ اکبر' اللہ اکبر" کہہ اٹھتے۔

چھوٹی چچی جان نے اماں سے کہا' "بھابی۔ آپ کے دیور ہمیشہ کے کم سخن ہیں۔ لیکن بھائی جان کے جانے کے بعد سے یہ حال ہو گیا ہے کہ بہت ہی کم بولتے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر دل ہولتا ہے۔"

ہر طرف اداسی تھی۔ مراد آباد میں منور ممانی سفید دوپٹہ اوڑھے صحن میں بیٹھی تھیں۔ آل مصطفےٰ ماموں کا چہلم ہو چکا تھا۔ اتاری میں آل زہرا نانی اکلوتے چھوٹے بھائی کی موت کے غم سے جھکی جھکی' فرشی پائینچے اڑسے آنگن میں ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔

محمود پور۔ جہاں سے چلتے وقت جب منہ اندھیرے بہلی قلعہ کے پھاٹک سے باہر نکلی ماموں ابراہیم حسین کے ہندو منیجر لالہ جی جو اماں اور منور ممانی کو بو بو کہتے تھے ڈنڈا سنبھال کر آگے بیٹھے۔ تاروں کی چھاؤں میں بہلی چھن چھن کرتی نزدیک کے غالباً سرسی ریلوے اسٹیشن روانہ ہوئی۔ اندر منور ممانی اور اماں دلائیوں میں لپٹی بیٹھی تھیں اور کچی سڑک کی ریت ستاروں کی روشنی میں جھلملا رہی تھی۔ اور دونوں طرف گنے کے کھیتوں پر دھند لکا تیر رہا تھا۔

دہلی واپس آکر میں نے ایک افسانہ بعنوان "ستاروں سے آگے" رقم فرمایا (جو ادب لطیف میں چھپا۔)

مراد آباد سے لکھنؤ جہاں اماں وراثتی سرٹیفکیٹ کے سلسلے میں گئی تھیں۔ لکھنؤ وہی تھا مگر مختلف سا تھا۔

خاموشی سے بھائی کی شادی ہوئی۔ سفید رنگت' بھورے بالوں والی سولہ سالہ بیحد ذہین اور سویٹ عاصمہ بیگم ضلع بارہ بنکی کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد اورنگ آباد دکن میں وکیل تھے۔ کچھ عرصہ قبل ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اپنے خالو چودھری نعمت اللہ کے ہاں لکھنؤ میں مقیم تھیں۔ جب وہ لکھنؤ سے رخصت ہو کر قریشی منزل کھجور روڈ قرول باغ دہلی آئیں امیر خاں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر چچی زاہدی سے کہا' "صاحب اتنے دن ہی اور جی لئے ہوتے۔ مرنے سے آٹھ روج پہلے بڑے ارمان سے کہہ رہے تھے۔ بابا کی برات میں چاندی کی اکیاون مٹکیاں لے کر جاویں گے۔"

۲—ڈیمی پیراڈائز

اپریل کی خواب آگیں عطر بیز دوپہر۔ آشیانے میں لیچی اور آم کی فصل حسب معمول پک چکی۔ بڑے بڑے پگڑ باندھے تہمد پوش دراز قد کھٹیک نم زمین پر کھاٹ بچھائے حقہ گڑگڑاتے ہیں۔ گلپوش مصنوعی ٹیلے کے ادھر ایک ایزل اوندھا پڑا ہے۔ اس پر بیٹھی ایک زمردیں چڑیا مسلسل گائے جا رہی ہے۔ اتنی ننھی سی جان میں ایسی طاقتور فلک شگاف آواز جانے کہاں سے آجاتی ہے۔

وہ ایزل ایک نوجوان اطالوی افسر کا ہے جسے اپنے تین رفیقوں کے ساتھ سرکار نے آشیانے میں چند روز نظر بند رکھا تھا۔ عجیب دل چلے لوگ تھے۔ تصویریں بناتے اور اوپیرا گاتے تھے۔ جبھی تو ہار گئے۔

آشیانہ سے کچھ فاصلے پر نابھ ہاؤس کے احاطے میں ٹرک کھڑے ہیں اور آرمی کنٹریکٹر خواجہ غلام محمد حاضر کے فرزند اکبر خواجہ مظہر القیوم اپنی نگرانی میں کلیمن ٹاؤن کے اطالوی جنگی قیدیوں کے میس کے واسطے اجناس لدوا رہے ہیں۔ ممانی زنانہ مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت کے لئے برقعہ اوڑھ کر کار میں سوار ہو رہی ہیں۔ پریڈ گراؤنڈ پر پلیڈیم سینما میں وار ٹائم انگلینڈ کے متعلق "ڈیمی پیراڈائز" نامی فلم کا میٹنی شو ہو رہا ہے۔ اور دہرہ دون ہمیشہ کی طرح نصف فردوس ہے۔

حاضر[1] ماموں نے اپنے ریلوے ریفرشمنٹ رومز اور دوسرے کاروبار کے علاوہ ۳۹ء سے فوجی ٹھیکے لے رکھے تھے۔ ممانی بتاتی تھیں کہ جب مدتوں قبل ان کے نوعمر شوہر نے سیالکوٹ سے دہرہ دون آکر کنفکشنری کی مختصر سی دوکان شروع کی اور پہلی مرتبہ سوا تیرہ آنہ کا منافع ہوا تو خوشی کے مارے دونوں میاں بیوی کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ ان دونوں کی سادگی اور دینداری میں آج تک مطلق فرق نہ آیا تھا۔ ممانی اور تینوں بہوئیں سخت پردے میں رہتی تھیں۔ حاضر ماموں فرنچ کٹ داڑھی رکھتے تھے۔ کلاہ پگڑی' لمبا کوٹ اور شلوار میں ملبوس وضع قدیم کے فرشتہ صفت پنجابی بزرگ تھے اور لڑکپن میں اقبال کی ٹکڑی میں رہ چکے تھے۔

بہار کی اس روشن دوپہر جمعہ پڑھ کر لوٹنے کے بعد کھانے کی طویل میز پر انہوں نے اماں سے کہا "بہین جنگ ختم ہونے والی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہندوستان جلد آزاد ہو جائے گا۔ انگریزوں نے مسوری دہرہ دون کی جائیدادیں فروخت کرنا شروع کر دی ہیں۔ انگزنڈرا پیلس ہوٹل بھی بک رہا ہے۔ سوچتا ہوں۔ رہائش کے لئے خرید لوں۔ تم شام کو جا کر اپنی بھابی کو دکھلا لاؤ۔"

اندھیرے پڑے اماں کی قیادت میں برقع پوش ممانی اور بہوئیں ٹہلتی ہوئی ڈالن والا میونسپل روڈ پہنچیں اور ایک وسیع باغ کے اندر استادہ انگلش کنٹری ہاؤس وضع کے "یورو پینیز اونلی" ہوٹل کو ملاحظہ کیا جو اب خالی پڑا تھا۔

اگلے جمعہ کو ہم لوگ انگزنڈرا پیلس منتقل ہوئے۔ اماں قرآن شریف اور مظہر بھائی کی دلہن پانی کی صراحی لے کر صدر دروازے سے بال روم میں داخل ہوئیں۔

"اس جگہ" حاضر ماموں کے سیالکوٹی منشی جی نے کہا' "ستراسی برس تک لہو ولعب' فسق و فجور ہوتا رہا ہے۔ اسے اچھی طرح پاک و صاف کروانا چاہئے۔" دوسرے روز بال روم کو خوب دھو دھا کر اس میں زنانہ میلاد شریف منعقد کیا گیا۔

"یہ ایک بڑا علامتی واقعہ ہے میرے خیال میں" حاضر ماموں کے چھوٹے لڑکے توفیق [2] رفعت نے سنجیدہ آواز میں مجھ سے کہا اور ایک بے ونڈو میں جا کر فی الفور ایک عدد نظم بزبان انگریزی رقم کرنے میں منہمک ہو گیا۔

چند روز بعد اماں نے مراد آباد کے لئے رخت سفر باندھا۔ جہاں حسنین ماموں (جن کا مشرقی محاذ سے دو مرتبہ خط ڈسپیچ میں آچکا تھا) رخصت پر آنے والے تھے۔

حسنین ماموں کا مکان جسے اماں "چچی کی اٹاری" کہتی تھیں۔ ان دونوں عم زاد بہن بھائیوں کے پردادا میر قائم علی کی کوٹھی کے عین مقابل ایک نیچی سی ٹیکری پر واقعہ تھا۔ یہ قدیم بوسیدہ مکان حسنین ماموں کے خسر اور ان کی والدہ آل زہرا نانی کے چچا زاد بھائی نواب سید ابراہیم حسین خاں کی ملکیت تھا۔ اور آل زہرا نانی نے ۱۹۱۳ء میں بیوہ ہونے کے بعد سے ساری عمر اس میں کاٹ دی تھی۔ اماں کے چھوٹے چچا ظہور حسنین مرحوم نے اماں کو اپنی بیٹی بنایا تھا۔ آل زہرا بیگم اماں کی سیکنڈ کزن بھی تھیں۔ آج بھی اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی میں 'جب کہ ان کی مانگ اجڑی' کس قدر حسین رہی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ گھرسواں فرشی پائجامہ پہنتی تھیں۔ فارسی 'کشیدہ کاری' طباخی کی ماہر' سانپ کے کاٹے کی عامل اور طب اور انگریزی زبان سے واقف ایک باوقار روشن خیال بی بی تھیں۔ جو مراد آباد سے باہر اماں کے پاس دہرہ دون یا لکھنؤ یا کسی پہاڑ پر جاتیں تو پردہ نہیں کرتی تھیں۔

اٹاری میں اماں ہمیشہ دوسری منزل کے اس ہوادار کمرے میں ٹھہرتی تھیں جس کے دریچے اور شہ نشین کوٹھی میر قائم علی اور مسجد رستم خاں کے رخ کھلتے تھے۔ سامنے گورنمنٹ انٹر کالج کے پھاٹک پر بھونپو لگا تھا جس میں آل انڈیا ریڈیو سے خبریں نشر کی جاتی تھیں۔ دوپہر کے وقت جب کبھی بھائی کی آواز آتی محلے میں غل مچ جاتا "چھبو میاں بول رہے ہیں۔"

شاید برلن کی آخری لڑائی لڑی جارہی تھی۔ جس روز نو بجے رات کی خبریں تشویشناک اور سنسنی خیز ہوتیں' چوراہے پر اسٹریٹ لیمپ کے نیچے عوام کی بھیڑ لگ جاتی۔ معمولی خبروں پر مجمع کم ہوتا۔ اس کے بعد لوگ لیمپ کی زرد روشنی میں ایک ایک کرکے اپنے اپنے گھروں کی طرف جاتے نظر آتے۔

دوپہر کو بھونپو پر دہلی ریڈیو سے فلمی ریکارڈ بجتے -- "نجانے کدھر آج میری ناؤ چلی رے" اور "میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔ کوٹھی میر قائم علی (یا "نذر باجی کی کوٹھی") کے متصل دوکانوں کی قطار تھی جو میر قائم علی بنوا گئے تھے۔ یہ دوکانیں اور ان کے اوپر کے کمرے حسنین ماموں کے حصے میں آئے تھے۔ ان کمروں میں رئیس امروہوی کرائے پر رہتے تھے۔

اٹاری کے نزدیک ایک اور نیچی ٹیکری پر اماں کے نانا میر مہدی علی (نانی اشرف جہاں مرحومہ کے شوہر) کی بنوائی ہوئی مسجد اور مکان تھا جس میں چند رشتہ دار مع اجنہ قدیم مقیم تھے۔ اس سے متصل نواب سید ابراہیم حسین خاں کا دوسرا بڑا مکان تھا جس میں ان کی بڑی بیٹی منور جہاں بیگم رہتی تھیں جن کے شوہر سید آل مصطفےٰ کا جو نانی آل زہرا کے چھوٹے بھائی تھے سال گذشتہ انتقال ہوا تھا۔ منور ممانی بھی اپنی نند آل زہرا بیگم کی مانند غیر معمولی طور پر ذہین اور علم جو خاتون تھیں۔ اگر ان کو پڑھایا لکھایا جاتا تو جانے کیا کیا کر سکتی تھیں۔ ٹیکری کی معیت چوک سادات لانکڑی میں میر قائم علی کے بہنوئی اور کزن میر منور علی کے پوتوں یعنی لڈن اور الن ماموں کا وسیع کنبہ آباد تھا۔ قصہ مختصر ۱۸۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک محلہ مغلپورہ اول میں انیس بیس ہی کا فرق تھا۔

بوٹی دار آب رواں کا سفید دوپٹہ اوڑھے آل زہرا نانی رنگیں پیڑھی پر بیٹھ کر نقشین سینیوں میں ڈونگے چنواتیں۔ چینی کے گول پیالوں میں سے پھولدار لبوترے چچوں کے ذریعہ "سالنا" نکالا جاتا (جو گول پیالے اور لبوترے چمچے آذربائیجان سے لے کر چین تک مستعمل ہیں اور جنہیں مغلوں نے یہاں رائج کیا تھا اور جو اب صرف چینی ریسٹورانوں میں نظر آتے ہیں۔) پھولدار چینی کی رکابیوں میں کھانا کھانے کے بعد مراد آبادی کٹوروں میں پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا۔ بچوں کو حکم تھا جنت میں جھاڑو دے کر اٹھو۔ ورنہ رزق کی بے ادبی ہو گی۔ اس کے بعد اصیل فارسی اشعار سے مزین زرد رنگ کا فرخ آبادی دسترخوان "بڑھاتی۔"

"مسلمان لٹ گئے تھے مگر نیں نہ گئی" اٹاری کے سائبان میں میتا ماموں نے مجھے لڈن' الن ممان کے والد خان بہادر ڈپٹی اصغر علی مرحوم کا مشہور قصہ سناتے ہوئے کہا۔ "فرنگی کی نوکری نہ کرنے کے چچا اصغر علی گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ بھنورے میں پلے اکلوتے بیٹے۔ مدرسہ جائیں اور گھر آجائیں۔ بازار تک جانے کی اجازت نہ تھی۔

"غدر کے بعد کلکٹر لانکڑی والوں سے دوستی بڑھانا چاہتا تھا۔ ایک روز اس کا پیش کار چچا اصغر علی کو بہلا پھسلا کر کسی بہانے اسکول سے اپنے ساتھ بنگلے پر لے گیا۔ ادھر ان کو گھر پہنچنے میں دیر ہوئی۔ سب سمجھے کسی دشمن نے اغوا کر لیا۔ لانکڑی کے غازی تلواریں سونت مکانوں سے نکلے۔ قاضی کی املی تک پہنچے تھے کہ سامنے سے کلکٹر کی چوکڑی آتی دکھلائی دی۔ میاں اصغر علی ساتھ۔ کلکٹر نے لانکڑی والوں کو بہت سمجھایا بجھایا۔ میر قائم علی کی مثال پیش کی۔ چچا کو سولہ روپیہ مہینہ پر نائب تحصیلدار مقرر کیا۔ چچا نے جب پنشن لی ضلع بستی کے کلکٹر تھے۔"

"نیں تو سات فاقوں کے بعد بھی نہیں گئی۔" اماں نے دالان میں بیٹھے بیٹھے اونچی آواز میں کہا۔

"بہرے نعیم کی بیوی نے کل لونڈیا کا پیغام لوٹا دیا۔ لڑکا دلی میں کھاتا پیتا بزنس مین ہے مگر وہ ڈپٹن دادی کو بتلا گئیں کہ لڑکے کی ذات میں کھیل ہے اور بساطی ہے۔ منور بیگم ذرا سنبل کو بھیج کر معلوم کرواؤ۔ خیر سے جان جہاں چچی آگرے سے آگئیں کہ نہیں۔ شام کو ڈپٹن دادی کے ہاں جاؤں گی۔"

جان جہاں بڑا خوبصورت نام تھا۔ اور لڈن' الن ماموں کی والدہ ڈپٹن دادی کہلاتی تھیں۔

"اے پھوپھی۔ ------- سنبل نظر آئیں تو بھیجوں۔" منور ممانی نے نئی اصیل کے متعلق باورچی خانے کی دہلیز پر سے جواب دیا۔ "بندو کی جروا کہاں سے یہ بوال سیٹر لائی۔ صبح سے مریم روزہ کھے کوٹھی میں بیٹھی ہیں۔"

"ڈائن کی جھس۔" اماں نے اظہار خیال کیا۔

"کتا سمجھایا کل چلی جیؤ سری۔" منور ممانی بولیں۔

"بندیا رگ۔" اماں نے فیصلہ صادر کیا۔

حمید حسن ماموں ہاتھ میں مسلم لیگ کا اردو اخبار لئے داخل ہوئے۔ وہ اور ریتا ماموں دالان میں جا بیٹھے۔ آل زہرا نانی کترنوں کی بقچی کھٹولے پر پھیلائے لفافے کا بٹوہ سی کر اب اس پر لچکا ٹانک رہی تھیں۔

"نذر کی لونڈیا کہاں ہے؟" ابراہیم ماموں نے جو محمود پور سے آئے ہوئے تھے زینہ اترتے ہوئے آواز دی اور دالان میں آکر تخت پر بیٹھ گئے۔ "آؤ بی نجوئی۔ کہاں پھرتی رہی ہو۔ لور۔ لور۔" انھوں نے مجھے پکارا۔ "بھائی نعیم مقدے بازی میں کھکھ ہو گئے۔ دھرتی اڑ گئی لیکن۔" اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"لونڈا کھرا رضوی ہے۔ میں جانتا ہوں۔" ریتا ماموں بولے۔ "نذر بیگم۔ بہر خدا بھرے نعیم کو تم ہی سمجھاؤ انھوں نے تو اللہ بخشے بھائی آغا میر کو مات کر دیا۔"

"اجی کہاں وہ۔ کہاں یہ۔ لبڑ دھوں دھوں۔" حمید حسن ماموں عینک اتار کر اخبار تہہ کرتے ہوئے بولے۔

"اللہ بخشے بھائی آغا میر" ایک ایسی افسانوی ہستی تھے جن کا ذکر اکثر ہوتا تھا اور جن کی نازک مزاجی اور بلند خیالی کے قصے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے تھے۔

لیکن ابراہیم ماموں نے موازنہ آغا میر و بھرے نعیم نظر انداز کر کے مجھ سے پوچھا' "انگریزی تو پڑھ گئیں پکانا رِیندھنا بھی سیکھا؟ بی سنبل پہ شیخ سدو سوار ہیں۔ ہمارے لئے ذرا لوکی کا حلوہ تو پکا لاؤ"

"جی۔" میں نے سہم کر کہا۔

"بھرے نعیم کے باغ کے متعلق کلکٹر بند رسول سے خود میاں آل حسنین نے بات کی تھی۔ مگر اس وقت ان پر میونسپل بورڈ کی چیرمینی کا جن سوار تھا۔" حمید حسن ماموں بولے۔

"اللہ آل حسنین کو خیریت سے واپس لے آئے۔" اماں نے کہا۔

"آمین۔" آل زہرا نانی بولیں۔

"جب پاپا چین اور برما گئے تھے بھائی آغا میر کہا کرتے تھے" اماں نے کہنا شروع کیا۔

"بی نجوئی۔ تنجن پکانا آتا ہے؟ اگر نہیں آتا تو اب سیکھو۔" ابراہیم ماموں نے دوبارہ فرمایا۔

"جی۔ بہت اچھا۔" ان کا دھیان حصول فن طباخی کی طرف سے ہٹانے کے لئے میں نے فوراً پوچھا۔ "یہ بھائی آغا میر بچ کے کوئی صاحب تھے؟"

ابراہیم ماموں پیچوان کا کش لگاتے لگاتے چونکے "بالکل تھے۔ تمہاری اماں کے سگے ماموں زاد بھائی تھے۔ میر مہدی علی کے بھتیجے۔"

"آپ نے دیکھا تھا انہیں؟"

"قطعی دیکھا تھا۔ مجھ سے بہت چھوٹے تھے غریب۔ آخری بار جب ملے تاڑ والے محل میں رہیں تھے۔ دریا کنارے۔"

"تاڑ والا محل؟ نہیں۔ شروع سے بتایئے۔" میں قصہ سننے کے لئے مستعد ہو بیٹھی۔

"اجی یہ پل کے پاس جہازی مکان نہیں ہے۔" ریتا ماموں بولے۔ "میر نجف علی والوں کا۔"

"میر نجف علی کمپنی بہادر کی لوکل فورس میں رسالدار تھے۔" نواب ابراہیم حسین خاں نے اس انداز سے کہا گویا کمپنی بہادر آج کی بات تھی۔ "ان کے بیٹے تھے سید حسین علی۔ وہ کمپنی کی بنگال کیولری تھرڈ رجمنٹ میں رسالدار میجر تھے۔ سنی خاندان تھا۔ ارے میاں چھنو خاں۔"

چھنوا لپکے ہوئے آئے اور پیچوان تازہ کرنے لے گئے۔ "ہوں۔ تو سید حسین علی کے دو لڑکے تھے علی حسین اور اولاد حسین۔ جب غدر پڑا۔"

"ماموں غدر میں آپ کتنے بڑے تھے؟"

"ہم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بھائی جان مرحوم دس برس کے تھے۔ تو جب غدر پڑا ایک بے چارے شہزادے مرزا علی بیگ لال قلعہ سے بھاگ کریاں آئے سر چھپانے۔ چھوٹی بہن ساتھ تھیں۔ ان سے سید علی حسین کی شادی ہو گئی۔ کانپور میں امراؤ بیگم کے انتقال کے بعد میر قائم علی پنجاب چلے گئے تھے۔ دوسری شادی انھوں نے علی حسین اولاد حسین کی بہن سے کی۔ سن ستاون کے بعد میر قائم علی نے کئی تباہ حال عزیزوں کو پنجاب بلا کر روزگار سے لگوا دیا۔ اولاد حسین کو بھی بلوا بھیجا۔ ای۔ اے۔ سی کرا دیا۔ اولاد حسین خان بہادر بھی ہوئے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں انتقال کیا۔ ۱۸۸۱ء میں۔"

"لیکن آغا میر۔" میں نے پھر یاد دلایا۔

"اب یوں سمجھ لو۔" ابراہیم ماموں نے پہلو بدل کر اطمینان سے بات جاری رکھی۔ "میر مہدی علی کے تین بیٹے تھے۔ تفضل علی۔ فضل علی۔ اور نبی علی۔ دو لڑکیاں۔ مرتضائی اور تمہاری نانی مصطفائی۔ اکبری پھوپھی میر فضل علی سے بیاہی گئیں۔ وہ تمہارے خالو میر افضل علی کے باوا تھے۔ نبی علی کی شادی تاڑ والے محل میں ہوئی۔ میر قائم علی کی نواسی سے۔ ان کے لڑکے تھے آغا میر۔"

"آغا میر کی شادی انہیں مغل شہزادی کی پوتی سے ہوئی تھی۔" آل زہرا نانی نے دانت سے دھاگہ توڑتے ہوئے بتلایا۔

"آپ نے دیکھی تھیں وہ مغل شہزادی؟" میں نے بجد اشتیاق سے دریافت کیا۔ "کیسی لگتی تھیں۔؟"

"بہت دھندلی سی یاد ہیں۔ گوری بھک۔ بھولی سی بیوی تھیں۔"

بیتا ماموں بولے، "اللہ بخشے بھائی آغا میر تانا شاہ ثانی تھے۔ ایک دفعہ ہمارے ساتھ شکار کے لئے چلے لکھیم پور کھیری۔ راستے میں۔"

"میں نے کہا آل زہرا آپا۔ آجاؤں۔" زینے کی ڈیوڑھی میں سے آواز آئی۔ بھنیاوالے بھائی حسین جان فوجی کپتان کی وردی میں ملبوس لنگڑاتے ہوئے داخل ہوئے۔ برما کے محاذ پر ٹانگ میں گولی لگ گئی تھی۔ ایک عدد برمی بیوی ساتھ لائے تھے۔

ان سرشارین کیریکٹر آغا میر کا قصہ ادھورا رہ گیا۔ لیکن بغور دیکھا جاتا تو مراد آبادی، محمود پوری ننھیال کے کافی لوگ سرشارین تھے۔ نہٹوری ددھیال کے برعکس جس کے مردوزن سب بے حد متوازن، سنجیدہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ محنتی، عمل پسند اور Puritan تھے۔ اور یہ سب بالعموم ایک سے ایک زندہ دل، جذباتی، کلر فل، تنک مزاج، آرام پسند، اور اندرونی طور پر سید بڑے کی ست الوجود رومینٹک دنیا کے باسی۔

گھوسی پورہ ضلع اعظم گڑھ میں معجزہ ہوگیا۔ ایک علم میں جناب عباسؑ کی شبیہ مبارک کسی کو نظر آئی اور خون کی بوندیں ٹپکیں۔ مغلپورہ سے بیبیاں جوق درجوق زیارت کے لئے اعظم گڑھ چلی جا رہی تھیں۔ ایک خوشگوار صبح اماں کے ایک نوعمر ننھیالی عزیز اور سائنسداں علی مہدی [3] نقوی (جو دلی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے) اٹاری کی انگنائی میں جھلنگا کھاٹ پر نیم دراز ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے۔ انہوں نے اماں کو اطلاع دی "باجی سنا ہے کل چھمن بھائی کے ہاں بھی معجزہ ہوگیا۔"

زینے پر آہٹ ہوئی اور اماں کے ایک اور عزیز مرتضیٰ بھائی اندر داخل ہوئے۔ سید مرتضیٰ حسین میکش مراد آبادی لمبے لمبے پٹے رکھتے تھے اور جاسوسی ناول لکھ کر ایک فرضی نام سے چھپواتے تھے۔ انہوں نے آتے کے ساتھ ہی خبر سنائی، "آل زہرا آپا۔ بنّن بھائی کے ہاں بھی معجزہ ہوگیا۔"

اماں نے دالان میں سے حسب عادت ڈپٹ کر جواب دیا، "دھرا تھا معجزہ۔ میں جب جانوں جو میرے ہاں کے علموں میں بھی ہو جائیں معجزے۔ چندا بیگم۔ نکالو اپنے ددیا سسر کا صندوق۔"

چندا ممانی نے دوپٹے سے سر ڈھانپ باادب پر چھتی پر سے وہ قدیم بکسا اتروایا جس میں میر معصوم علی لکھنوی کے تبرکات محفوظ تھے۔

نیم سے چھنتی دھوپ میں صحن کے تخت پر علم پنکے سجادیئے گے۔ "ذرا چاندنا چھوڑ کر بیٹھنا" چندا ممانی نے مجھ سے کہا۔ پھر وہ اور ان کی دونوں بہنیں منور ممانی اور شاہجہاں علموں کو بغور دیکھنے لگیں۔ اتنے میں شاہجہاں کی نند رئیسہ آنگن میں داخل ہوئی۔ تخت کے کنارے بیٹھ کر اس نے بھی علموں پر نظریں جمادیں۔ صحن میں بڑا متوقع سناٹا طاری تھا۔ چند لمحوں بعد رئیسہ نے دبی زبان سے کہا، "منور باجی۔ مجھے تو کچھ نوکیلی سی شے دکھ رہی ہے۔ ذوالجناح کے کان تو نہیں ہیں؟"

پل کی پل میں محلے میں اڑ گئی۔ آل زہرا آپا کے ہاں معجزہ ہوگیا۔

"لائیے ہم بھی دیکھیں۔" میں نے رئیسہ سے کہا اور آنکھیں پھاڑ کر پنجے کو ملاحظہ کیا۔ کچھ نظر نہ

آیا۔ سید رضا علی کے ہم زلف پیشکار صاحب کے گھر کی کھڑکی اٹاری کے تاریک باورچی خانہ میں کھلتی تھی۔ چشم زدن میں پیشکار صاحب کی بیوی موکھا پھلانگ "حسینؑ! حسینؑ!" کرتی وارد ہوئیں۔ میں نے دوبارہ کہا، "ہمیں تو کچھ بھی نہیں۔" بی ہمسائی نے بات کاٹی، "اے ہٹو۔ تم سن کی لونڈیا۔ تمہیں کیا دکھے گا۔ لاؤ سب سے پہلے میں زیارت کرلوں۔"

اماں اور آل زہرا نانی دالان میں چپکی بیٹھی یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ فوراً سے پیشتر انہوں نے علم پنکے صندوق میں رکھوا پر چھتی پر واپس پہنچوادیئے۔

لیکن اصلی معجزہ اس محلے میں یہ ہوا تھا کہ بقول الن ماموں جس لڑکے نے چوک سادات لانگڑی کے کنویں کا پانی پیا اس نے میٹرک سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔ وہاں کی آدھی درجن لڑکیاں بی اے کر رہی تھیں یا کر چکی تھیں۔ الن ماموں کی بھانجیاں لڈو پھوپی کی لڑکیاں زہرا، عذرا، مطہرہ آئی۔ ٹی کالج اور لوریٹو کانونٹ لکھنؤ سے گٹ پٹ کرتی آتی تھیں اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ لڈن ماموں نے (جو ۱۹۴۰ء میں ایران پر برطانوی تسلط کے بعد سے طہران کے برٹش انڈین قونصل خانے میں شاردی افیر تھے) اپنی لڑکی سلویا کو جو طہران میں نیم یوروپین زندگی گذار رہی تھی چند ماہ کے لئے خاص طور سے مراد آباد بھیجا تھا کہ اپنی تہذیب سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ ان دنوں وہ اپنے بید قدامت پرست تایا ابا سید انور علی نقوی کی زیر نگرانی پردے میں بیٹھی دینی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف تھی۔

نواب سید ابراہیم حسین خاں کے ایک داماد سید شاہ علی نے فقیری لے لی تھی۔ کاکلیں چھنکائے رام گنگا کنارے باقاعدہ جھونپڑی ڈال کر رہتے تھے۔ جب ان کو اطلاع پہنچی کہ میں اور سلویا مراد آباد آئے ہوئے ہیں وہ اپنے تپوون سے پاپیادہ خاص طور پر ہم دونوں سے ملنے تشریف لائے۔ اور اس خیال سے کہ شاید ہم لوگ اردو بولنا بھول چکے ہیں۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو مس عینی" "ہاؤ ڈو یو ڈو مس سلویا!" کہہ کر مصافحہ کیا اور مستقل انگریزی میں گفتگو کرتے رہے یہ سب بڑے سادہ لوح جنتی لوگ تھے۔

شہر سے باہر سنبھل روڈ پر ایک وسیع قدیم کوٹھی میں شاہد بھائی اور کلثوم بھابھی (ایم۔ ایل۔ اے) مع کنبے کے رہتے تھے۔ شاہد بھائی کی (جو شمس العلماء مولوی ممتاز علی مرحوم اور میرٹھ کے قاضی خاندان کے قریبی عزیز تھے) علی گڑھ میں زمانہ طالب علمی میں بصارت زائل ہوگئی تھی۔ اسی حالت میں انہوں نے بی۔ اے اور قانون پاس کیا تھا اور مراد آباد میں وکالت کرتے تھے۔ شاہد بھائی اور کلثوم بھابی دونوں بے حد سوئیٹ تھے۔

ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر آئس فیکٹری تھی جس میں ہریجن مزدور کام کرتے تھے جو سردی سے ٹھٹھرے ہوئے شام کو کارخانے سے نکلتے تھے۔ چندا ممانی اگر کہنا چاہتیں کہ فلاں بد دماغ یا مغرور ہوگیا ہے تو اس کے بجائے کہا کرتیں، "اے ہے وہ تو برف خانے کے چمار کی طرح اکڑ گئے ہیں۔"

"اڑے" کے عاشق بنگالی کی مانند یو۔ پی کا مسلمان لسانی لفاظی اور گپ کا استاد تھا۔ دلی، لکھنؤ، بریلی، رام پور، آگرہ، مراد آباد وغیرہ وغیرہ اس کاٹج انڈسٹری کے اہم مراکز تھے۔ ہمارے ہاں شاہ بڑے کی

یہ محفل عموماً الن ماموں کے والد ڈپٹی اصغر علی مرحوم کے مکان کے تہہ خانے میں منعقد ہوتی تھی۔ الن ماموں حسب معمول گرما کی تعطیلات میں جو ناگڑھ سے آچکے تھے۔ دوپہر کو تہہ خانے کے اندر قطار میں بچھی بان کی چارپائیوں پر چھڑکاؤ کیا جاتا۔ برقی پنکھا چلتا رہتا۔ ایک طرف لانگڑی کے آم بالٹی میں بھر کے رکھ دیئے جاتے اور اراکین محفل دور کی کوڑی لاتے۔

ایک سہ پہر بیتا ماموں نے اطلاع دی۔۔۔ "بھائی آل حسنین برما اسٹار ہو گئے۔"

"کیسے اسٹار؟" پچھن ماموں نے نیم غنودگی سے چونک کر پوچھا

"برما اسٹار۔ ایک تمغہ ہوتا ہے۔ سنا ہے جنرل ماؤنٹ بیٹن نے کہہ دیا ہے مراد آباد آکر خود تمغہ لگاؤں گا۔"

"اور میرے بھائی" الن ماموں نے کروٹ بدل کر متانت سے دریافت کیا۔ "اس نے ہٹلر کو دیکھ لیا تو۔۔۔؟"

اس وقت شہر میں مستحکم افواہ گرم تھی اماں ہٹلر نے خودکشی کاں کی۔ بھیس بدل کر مراد آباد آگیا ہے۔ دیوان کے بازار میں رہ رہا ہے۔

غدر ۵۷ء کے دنوں میں مراد آباد میں اڑ گئی تھی کہ ایک پہنچا ہوا فقیر ایران سے ایک لاکھ غازی لے کر دلی داخل ہوا ہے۔ ان کی کرامت سے انگریزوں کی توپیں پانی ہو جاتی ہیں اور باغی فوج ملکہ وکٹوریہ کو گرفتار کرنے براہ قسطنطنیہ لندھن روانہ ہو چکی ہے۔

اور قلعہ محمود پور کی آخری جھلک۔ سنگ سرخ کے محل کے اندر صدر دالان مین ایک کھرا پلنگ حسب معمول آدھا در کے اندر آدھا باہر۔ اس پر حیدری ممانی حسب معمول ننگے سر بیٹھی ہیں۔ دوپٹہ ایک طرف رکھا ہے۔ ان کو لیٹنے کی عادت نہیں۔ سارا سارا دن گاؤ تکیے کے سہارے کے بغیر اسی طرح سیدھی بیٹھی رہتی ہیں۔ سامنے صندوقچہ رکھا ہے۔ جاگیر اور محلات کے انتظام میں مصروف۔ بار بار لالہ ڈیوڑھی پر بلوائے جاتے ہیں۔ دالانوں اور صحنوں میں بہوؤں' بیٹیوں' ان کی اولادوں خواصوں' میراثنوں اور کہارنوں کی چہل پہل۔ باہر دیوانخانے کے پھاٹک پر دوپہر کی نوبت بجی۔ عقب کے ویران احاطے میں پھانسی گھر (جو مدتوں سے بند پڑا ہے) اس سے ملحق چونے سے بھرا کنواں' ترکی حمام' بارود خانہ' فیل خانہ' دمدمہ تیز دھوپ میں سنسناتے رہتے ہیں۔

ماموں ابراہیم حسین اماں کو محمود پور سے مراد آباد پہنچانے آئے جس روز ہم دلی واپس جا رہے تھے۔ حسب دستور اتاری کے دروازے سے موٹر تک قنات لگائی گئی۔ انگرکھا' چوڑی دار پائجامہ اور دوپلی ٹوپی پہنے سفید نوکیلی مونچھوں اور تمکنت شان والے ابراہیم ماموں نے اپنی نگرانی میں اسباب لدوانا شروع کیا۔ چھٹوا ایک غلاف پوش ستار سنبھالے زینے سے اترے ابراہیم ماموں نے انہیں چونک کر دیکھا اور پوچھا' "یہ کس کا ہے؟"

چھٹوا نے سہم کر دبی زبان سے کہا' "عینی بی کا۔"

"ہوں" انہوں نے یکلخت طیش میں آکر زور کا ہنکارا بھرا۔ چہرہ غم و غصے سے سرخ ہو گیا' "نذر کی لونڈیا اب سارنگی بھی بجاتی ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا اور چپکے ہو رہے۔

نواب سید ابراہیم خان اسی برس ہماری مراد آباد سے روانگی کے دو ماہ بعد بعمر پچاسی سال اپنے بزرگوں سے جا ملے۔

۳۔ شاہ بلوط کے سائے

پرنسپل مشتاق احمد زاہدی کی بڑی بہو بلقیس نورالدین۔۔۔ اصل نام برتھا (عرف بلی) انگریز خاتون تھیں۔ لندن سے گرٹن کالج کیمبرج ہسٹری پڑھنے گئی تھیں۔ وہاں سینٹ کیتھرین کالج میں ایک جمیل شکل ہندوستانی طالب علم نورالدین احمد سے ملاقات ہوئی۔ شادی کر کے دلی آگئیں۔ شوہر کے ساتھ نہر سعادت خاں پر رہتی تھیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا کہنا تھا ان تمام یوروپین خواتین میں جنھوں نے ہندوستانیوں سے شادیاں کی تھیں بلقیس واحد بی بی تھیں جنھوں نے ایک ہندوستانی زبان پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی۔

بلی بھابی قلعہ معلی کی زبان بولتی تھیں اور مختلف طبقوں کے لوگوں سے ان کے محاورے میں گفتگو کرتی تھیں۔ نہایت ظریف الطبع' نیک دل اور محبت شعار بی بی تھیں۔ حاضر جوابی میں جواب نہ رکھتی تھیں۔ لڑکی امینہ کوئن میری میں پڑھتی تھی اور تصویریں بناتی تھی۔ اور آثار و اطوار کہتے تھے کہ بڑی ہو کر بہت بڑھیا مصور بنے گی۔

میں اور امینہ مل کر چچا زاہدی سے مستقل انواع و اقسام کی بحثیں کیا کرتے تھے اور مستقبل کے متعلق اول جلول پلان بناتے تھے۔

"بس ہم لوگ سوئٹزرلینڈ میں ایک شاٹو خرید لیں گے۔" ایک روز امینہ نے چچا کو آگاہ کیا' "اس میں رہا کریں گے۔"

"ہم کتابیں لکھیں گے اور امینہ تصویریں بنائیں گی۔" میں نے ارشاد کیا۔

"اور کھاؤ گی کہاں سے؟" چچا نے پوچھا۔

"ہماری کتابیں اور تصویریں بکیں گی جو دھڑا دھڑ۔"

"پتہ مارنا سیکھو۔ اس دنیا میں سے خیریت سے گذر جانا بڑی چیز ہے۔ ابھی سے پتہ مارو۔"

"تو آخر ہم کریں کیا؟" میں نے الجھ کر دریافت کیا۔

"تمہارے باوا کو۔۔۔۔" چچا زاہدی نے کہا "علی گڑھ سے عشق تھا۔ پہلے تو وہاں جا کر پڑھو۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

چچا نصیر ٹونک میں تھے۔ چچا وحید' سعید بھائی کے ساتھ بلند شہر جا چکے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ علی گڑھ میں حسب معمول بہت سے ننھوری رشتے دار بسلسلہ تعلیم اولاد مقیم تھے۔ ان میں سے ایک (حسب

معمول خان بہادر اور ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) چچا ضمیر حیدر (جو ابا جان کے ماموں زاد بھائی اور مزاج اور شکل میں مشابہ تھے) کے ہاں اتر کر دوسرے روز پہنچی یونیورسٹی۔ شعبہ انگریزی کا صدر ایک طویل القامت انگریز تھا جس کا نام شاید پروفیسر فیلڈ نگ تھا۔ اس نے کہا کہ کلاس روم میں پارٹیشن لگایا جائے گا۔ اس کے پیچھے بیٹھ کر پڑھنا ہو گا۔

میں نے کہا' "یہ تو سخت مسخرے پن کی بات ہو گی۔"

فرنگی نے نرمی سے کہا' "یہ یہاں کا قانون ہے۔"

"میرے لئے یہ ایک ازحد مضحکہ خیز تصور ہے۔"

فرنگی نے کہا' "میں اس سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا' "کوئی اور ترکیب سوچئے۔"

اس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ اچھا تم برقعہ پہنے پہنے دروازے کے باہر جہاں چپراسی بیٹھتا ہے وہاں بیٹھ کر لیکچر سننا۔"

میں نے کہا' "جناب شاید آپ سنجیدہ نہیں ہیں۔"

فرنگی نے کہا' "مائی ڈیئر۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ یہ مسلم یونیورسٹی کا قانون ہے۔"

میں نے گھر آ کر بے حد جوش کے ساتھ چچا ضمیر سے کہا' "کمال ہے۔ آج سے مدتوں قبل اماں نے علی گڑھ آ کر برقعہ ترک کیا تھا اور ہم برقعہ پہنیں گے؟ یہ ترقی معکوس نہایت افسوس ناک ہے۔"

چچا ضمیر حیدر مرحوم' ابا جان کی طرح ملائمیت سے بات کرتے تھے کہنے لگے "مگر یہ تو سوچئے اس وقت مخلوط تعلیم کا سوال پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اب کم از کم لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھ تو رہی ہیں۔ بی بی مسلمان قوم اسی طرح لشتم پشتم جوں کی چال ترقی کرے گی۔"

چچا نصیر کی تینوں بڑی بیٹیوں عذرا' حمیرا' زہرا کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ سب سے چھوٹی اچھو گرلز کالج ہوسٹل میں رہتی تھی۔ مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی دونوں کا علی گڑھ میں ان دنوں بہت زور تھا۔ اچھو نے کارل مارکس پر نظر کرم کی تھی۔ اس شام وحیدیہ ہوسٹل کے برآمدے میں جہاں لڑکیوں کے پلنگ ایک قطار میں بچھے تھے میں نے اچھو سے کہا' "آپا اچھو۔ اس قدر گھٹے ہوئے ماحول میں آپ نے اتنے برس کیسے پڑھا؟"

کہنے لگیں' "انقلاب آنے والا ہے۔ عنقریب اس بورژوا رجعت پسند معاشرے کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

حسین مہ جبین سلمیٰ رشید احمد صدیقی ریشمی غرارہ سرسراتی آ کر دوسرے پلنگ پر بیٹھیں اور انہوں نے آنے والے انقلاب پر مزید روشنی ڈالی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر اپنے گھر چلی گئیں اور اچھو نے تقریر جاری رکھی۔ وحیدیہ ہوسٹل کے اس برآمدے میں اچھو نے رات بھر مجھے کمیونزم کے نظریات سے مستفید کیا۔ آپ کی انتہائی رجائی گفتگو سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ تاشقند یونیورسٹی

میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی کی مسجد سے فجر کی اذان ہوئی۔ میں نے پوچھا "اور مسلم لیگ کا کیا ہو گا؟"

کہنے لگیں' "پاکستان عوامی مطالبہ ہے۔"

میں نے کہا' "دیکھئے کمیونسٹ ملا اذان دے رہا ہے۔"

کہنے لگیں' "چلو نماز کا وقت ہو گیا۔ یہ یہاں کا قانون ہے۔"

دہلی واپس جاتے ہوئے ٹرین میں خواجہ عبدالمجید مل گئے جو آل انڈیا مسلم مجلس قائم کر چکے تھے یا شاید کرنے والے تھے۔ راستے بھر ان سے بحث رہی۔ قرولباغ پہنچ کر میں نے چچا زاہدی کو رپورٹ دی۔ انہوں نے اداسی سے کہ ا "بس تم سے پتہ نہ مارا گیا۔"

دہلی یونیورسٹی میں داخلے کی تاریخ نکل چکی تھی۔ اماں کے کزن علی مہدی نقوی نے جو وہاں ڈاکٹریٹ کر رہے تھے وائس چانسلر سر مارس گوائر سے ملاقات کا وقت مقرر کروایا۔

بڑے میاں نے مارکس نکلوائے۔ فرسٹ کلاس میں صرف تین نمبر کم تھے۔ داخلہ کر لیا۔ انگریز ہندوستان چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ خود اس بڈھے مارس گوائر کی کچھ عرصہ قبل بسلسلہ قومی جدوجہد لکھنؤ یونیورسٹی کے لڑکوں نے بڑی گت بنائی تھی۔ لیکن انگریز کے اخلاق کا کیا عالم تھا۔ بڈھا تیز دھوپ میں نکل کر اپنی کوٹھی کے پھاٹک تک پہنچانے آیا۔ (آزادی کے بعد ہندوستان و پاکستان کے اکثر دیسی لوگ "بڑے آدمی" بنتے ہی بقول چندا ممانی برف خانے کے چمار کی طرح اکڑنے لگے)

قرولباغ سے روزانہ یونیورسٹی پہنچنا مشکل ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی خود کافی بوریت کی جگہ نکلی۔ چچا زاہدی کو مطلع کیا۔ آصف بھائی خشکی سے بولے' "علی گڑھ اور دہلی دو یونیورسٹیاں آپ کے معیار سے کم نکلیں۔ اب لکھنؤ کو موقع دے کر دیکھ لیجئے۔"

یہ نومبر کا مہینہ چل رہا تھا۔ لالکرتی لکھنؤ پہنچ کر ماموں ابراہیم خاں کے چھوٹے لڑکے اور بچپن کے ہمجولی الیاس خاں کے ساتھ رجسٹرار آفس کا رخ کیا۔ معلوم ہوا داخلے کب کے بند ہو چکے ہیں۔

اچانک یاد آیا۔ بیبا باجی مرحومہ کے میاں یعنی خالہ سلطانہ رضاء اللہ کے داماد یہاں پڑھاتے ہیں۔

میں نے الیاس سے کہا' "چلو عربک ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈیں۔"

ڈاکٹر وحید مرزا سوئیٹ نے کوشش کر کے داخلہ کروا دیا۔ لیکن کیلاش ہوسٹل میں جگہیں پر ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر وہاج الدین احمد مرزا کی بھانجیاں مہر قمر پرانی سہیلیاں۔۔۔۔ کیلاش کے پچھواڑے ایک کاٹیج میں اپنے والدین کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ قمر جبیں یونیورسٹی سے ایم اے کر چکی تھیں۔ ان کے ہاں ٹھہر کر یونیورسٹی جانا شروع کیا۔

پندرہ برس قبل لیڈی کیلاش سریواستوا کے نام نامی پر آئی ٹی کالج کے چوراہے کے نزدیک یونیورسٹی روڈ پر انجینئر حامد علی کی کوٹھی میں ایک ہوسٹل قائم کیا گیا تھا جس میں ہر سال سات آٹھ لڑکیاں ایک حسین کشمیری بیوہ مسز وانچو کی زیر نگرانی قیام کر کے یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کی تعداد بڑھی۔ کوٹھی کے سرسبز احاطے میں دو منزلہ عمارت تعمیر کی گئی جس میں چالیس عدد طالبات رہ سکتی تھیں۔

کوٹھی کے عقبی دو کمرے اب بھی لڑکیوں کے لئے مخصوص تھے۔ جنوری کے مہینے میں مسز وانچو نے بتلایا کہ کوٹھی میں ایک جگہ خالی ہو گئی ہے۔

کوٹھی کے ان کمروں میں انیس باجی کی لڑکی رفیعہ قدوائی عرف آزادی اور ای نذرے براجمان تھیں۔ ای نذرے جس نے آئی ٹی سے انٹر کیا تھا نینی تال کی نیک سرشت باغ و بہار لڑکی تھی۔ بہت اچھا گاتی تھی۔ ٹی پلانٹر والدین کی نور نظر تھی۔ بے فکری سے ہمہ وقت چہکتی اور گاتی پھرتی تھی۔ ہمارے برآمدے کے سامنے احاطے میں شاہ بلوط کا جنگل کھڑا تھا۔ نئی عمارت میں ماسٹر صاحب کے بنارس اسکول والی عزیز بانو داراب' ابا جان کی ایک سیکنڈ کزن کی بیٹی شکیلہ' علی گڑھ کی آصف جلیل اور فیروز جبیں کے علاوہ دس بارہ اہل اسلام لڑکیاں اور تھیں' جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت قابل تعریف بات تھی۔

شکیلہ اور آصف ایم۔ ایس۔ سی کر رہی تھیں۔ اتوار کی ایک صبح بریکفاسٹ کی میز پر ان کی ایک تامل ہم جماعت نے بہت سنجیدگی سے ہم لوگوں سے پوچھا' "تم محمڈن لوگ تو گھر میں پرشین بولتے ہو نا۔"

میں نے اسی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دور پر انڈوں کی پلیٹ رکھی تھی۔ ذہن میں انڈے کا فارسی نام ہرگز نہ آیا لاشعور میں کہیں یہ بیضا چھپا ہوا تھا اس کا ہم وزن "سگ لیلےٰ" یاد آگیا۔ ہڑبڑا کر میں نے شکیلہ سے کہا' "خواہرم۔ سگ بدہ۔ سگ بدہ۔" شکیلہ نے گھبرا کر جواب دیا' "نمی دانم۔ نمی دانم۔ شما چہ خواہی۔"

کچھ دیر تک اس نوع کے فارسی مکالموں کے بعد آصف نے کھڑے ہو کر قصہ مختصر کیا' "سوے اطاق من می گویم۔" یعنی جاتی ہوں۔

تامل لڑکی ہم لوگوں کی "پرشین" پر عش عش کرتی رات کی بریانی اڑا گئی۔

بریانی کی شان نزول یہ تھی' ہوسٹل میں ہر پندرواڑے ایک ایک لڑکی باورچی خانے کا انتظام کرتی تھی ان دنوں میری باری تھی اور گوشت خور اور سبزی خور دونوں اقسام کی لڑکیوں کو ایک سے ایک بڑھیا کھانے کھلوا رہی تھی۔ جب مہینے کے آخر میں سب کے معمول سے دوگنے بل بنے صبح صبح رام لال بیرہ نے آکر آواز دی' "بابا آپ کو میم صاحب بلاوت ہیں۔"

مسز وانچو اپنے دفتر میں پریشان بیٹھی تھیں۔ کہنے لگیں' "میں نے یہ بل ابھی روک لئے ہیں۔ لڑکیاں معمول سے دوگنی رقم ہرگز نہیں دیں گی۔ تم نے اتنی فضول خرچی کیوں کی؟"

عرض کیا' "سال بھر میں دو ہفتے لڑکیوں نے پیٹ بھر کے اچھے کھانے کھا لئے تو کیا غضب ہو گیا۔"

بحیثیت ایک کشمیری برہمن مسز وانچو خود خوش خوراک تھیں۔ یہ نقطہ نظر سمجھتی تھیں۔ لیکن کہنے لگیں' "وہ تو ٹھیک ہے مگر۔-------"

میں نے شان استغنے سے جواب دیا۔ "لڑکیوں کا معمول کا بل بھیج دیجئے۔ سب کا سرپلس روپیہ میں بھر دوں گی۔"

شکیلہ' آصف' ای نذ' رفیعہ' فیروز' عزیز بانو داراب اور پریم لتا گرودور نے چندو خانے کی بقیہ اراکین کو ایک شاہ بلوط کے نیچے جمع کیا۔ انہوں نے کہا فکر مت کرو۔ اپنے بل ہم خود ادا کر دیں گے۔ لیکن

باقیوں کے لئے کیا کیا جائے۔

میں نے مراقبے سے آنکھ کھول کر جواب دیا' "اللہ میاں فتوح کا انتظام کر چکے ہیں۔ سائیکلیں نکالو اپنی اپنی۔" ہم سب سائیکلوں پر بھاگم بھاگ امپریل بنک پہنچے۔ مبلغ چار سو روپے کا وہ چیک جو "ستاروں سے آگے" نامی مجموعے کے جملہ حقوق کا دہلی سے صادق الخیری نے چند روز قبل بھیجا تھا' بھنوایا۔ واپس آکر مطلوبہ رقم مسز وانچو کو پیش کی۔ انھوں نے سر ہلا کر افسردگی سے کہا' "اب مجھے معلوم ہوا کہ مسلمان قوم کیوں تباہ ہوئی' محض زبان کے چٹخارے کی خاطر۔"

"یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ جب سے تامل لڑکی نے اطلاع دی تھی کہ ہم لوگ گھر پر پرشین بولتے ہیں ہم لوگ نہایت مفرس و معرب زبان استعمال کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ ازراہ تعاون ای نذ نے پاگل کو "پاغل" اور زندگی کو "زندغی" کہنا شروع کر دیا تھا۔

بے پردہ مخلوط تعلیم کے باوجود یونیورسٹی کا ماحول علی گڑھ سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ معاشرے میں آج جیسی بے راہ روی نہ آئی تھی۔ ساری ہندو مسلمان عیسائی لڑکیاں کلاس سے سیدھی لیڈیز روم میں آکر بیٹھ جاتی تھیں جس کے دروازوں پر دوہری چقیں پڑی تھیں۔ انگریزی ایم اے میں پریم لتا گرودور اور میں صرف دو لڑکیاں پڑھتی تھیں جنھوں نے پورے دو سال میں صرف دو ایک ہم جماعت لڑکوں سے چند جملوں سے زیادہ گفتگو نہ کی۔ نہ لڑکے اس کے متوقع تھے۔ لڑکیوں کی سب سے بڑی تفریح یہ تھی کہ غول بیابانی کی صورت میں حضرت گنج جا کر انگریزی پکچر دیکھ لیں۔ یا کافی ہاؤس میں علیحدہ میزوں پر کافی سے شغل کریں اور واپس آجائیں۔ یا ہم تین چار لڑکیاں ریڈیو اسٹیشن جا کر پروگرام نشر کر آتے تھے۔

ہماری کلاس پروفیسر سدھانت صدر شعبہ انگریزی' ڈاکٹر راؤ' مسٹری۔ جی رائے اور ایف ٹی۔ رائے' ڈاکٹر جوہری' مسٹر نریش چندر اور مسٹر ریش موہن لیتے تھے۔ مشہور اردو نقاد اور ادیب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بی۔ اے کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک لیکچرر کی غیر حاضری میں فقط ایک دن ایک پیریڈ لینے تشریف لائے تھے۔

پریم لتا گرودور اور میں اکثر شام کو گومتی کے کنارے آرٹ اسکول جاتے اور پرنسپل ایل۔ ایم۔ سین سے جاپانی بنگالی واش تکنیک سیکھتے۔ اسکول میں اس وقت صرف ہم دو خاتون طالبات تھیں۔ سالانہ نمائش میں ہماری بنائی ہوئی تصاویر بڑی طمطراق سے سجائی گئیں۔ دوسرے روز مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے ایل۔ ایم۔ سین سے کہا شاید میں انگلستان جا کر مزید تصویر کشی سیکھوں۔ ایک عدد سرٹیفکیٹ لکھ دیجئے۔

ایل۔ ایم۔ سین نے کہ ایک سادھو قسم کے ٹپکل بوڑھے بنگالی آرٹسٹ تھے فوراً ہم دونوں کے لئے ایک ایک سرٹیفکیٹ لکھا۔ ہم دونوں شاداں و فرحاں کیلاش واپس آئے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر جنرل ڈسٹمس کے موک ٹرائل کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔ اتنے میں پریم لتا اندر آئیں بولیں' "میں نے دیکھا نہیں۔ سین دا نے تمہارے لئے کیا لکھا ہے۔" میں نے بے خیالی سے کہا' "بہت اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ وہ میز پر رکھا ہے۔ پڑھ لو۔"

پریم نے سرٹیفیکیٹ ملاحظہ کیا۔ لکھا تھا۔۔۔۔۔۔ میری اسپیشل فائن آرٹ کلاس میں سیکھا۔ اچھی تصویریں بناتی ہے۔ قوت تخیل وافر ہے۔ ہاتھ میں صفائی اور ڈرائنگ میں مہارت۔۔۔۔۔ اگر دل لگا کر کام کرے تو ایک دن اچھی مصور بن سکتی ہے۔ مگر طبیعت میں جلد بازی۔

پریم نے کہا "بس یہی بات ہے وہ جو تم بتاتی ہو تمہارے دلی والے چاچا کہتے ہیں کہ پتہ مارو۔ ہر کام دل لگا کے کرنا چاہئے۔"

"وقت بہت کم ہے۔" میں نے فلسفیانہ گمبھیرتا سے ارشاد کیا۔ اور بالوں پر سفید پاؤڈر چھڑکنے میں مصروف رہی۔ اور مسز وجے لکشمی پنڈت کا بھیس بدلا۔ شام کو گنگا پرشاد میموریل ہال میں یونیورسٹی یونین کی طرف سے جنرل اسمبلی کا موک ٹرائل پیش کیا جانے والا تھا جس میں یونیورسٹی کے نامور مقرر ظفر الاسلام جنرل اسمٹس اور خاکسار وجے لکشمی پنڈت کا رول ادا کرنے والے تھے۔

موک ٹرائل کے لئے ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ سب سے اگلی قطار میں ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر خوش خوش بیٹھے تھے۔ "وجے لکشمی پنڈت" کی زوردار تقریر کے فوراً بعد امر ناباذار پتریکا کی طرف سے ایک عدد گولڈ میڈل اناؤنس کیا گیا۔ رشیدہ آپا ٹرائل ختم ہوتے ہی اسٹیج پر آکر خوشی سے لپٹ گئیں۔ بھیڑ کے دھکے کھاتے باہر نکلے راز بھائی کی بارات میں جانے کے لئے جہاں الیاس کار لئے کھڑے تھے۔

"آج حاجیہ تاج یاد آگئیں۔" الیاس نے کہا۔ حاجیہ تاج اماں کی ایک پنجابی سہیلی تھیں۔ برقعہ پوش گرجدار لیگی لیڈر۔ لمبی چوڑی 'فربہ' بے انتہا خوش مزاج۔ ایک بار لاہور سے ہمارے ہمارے ہاں فیض آباد روڈ تشریف لائی تھیں۔ کانگریس کے جلسہ میں گئیں۔ واپس آکر اماں سے کہا۔ بس اسٹیج پر "ایک طرف بھائی کرشمے دکھا رہا تھا۔ دوسری طرف بہن۔" اماں بولیں' "آپ برقعے میں رہ کر اس کرشمہ سازی کا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ پردہ چھوڑ کر میدان میں آیئے۔" حاجیہ تاج نے کہا' "اے ہے بہن۔ خدا نہ کرے۔"

جناب ساجد [3] علی خاں راز مراد آبادی لکھنؤ ریڈیو میں ملازم تھے اور ماموں ابراہیم خاں کے ہاں لال کرتی میں رہتے تھے۔ علامہ نیاز فتحپوری کی گریجویٹ سالی حسنہ بیگم کو رخصت کرا کے ہم لوگ رات گئے چھاؤنی لائے۔ ماموں ابراہیم خاں اور اختر ممانی کے خلف اکبر ایوب خاں کی شادی دو سال قبل دلی کے ایک پرانے خاندان میں ہو چکی تھی۔ پلنگ پر لیٹی الیاس کے سہرے الاپا کرتیں۔ سلسلہ جنبانی ایک خاکی نیکر' توند' سولا ہیٹ اور کھچی مونچھ والے بزرگ چلا رہے تھے جو کسی دوسرے صوبے سے آیا کرتے تھے جہاں لڑکی کا امیر کبیر کنبہ رہتا تھا۔ لڑکی والے جہیز میں بیوک موٹر دینے کو کہہ رہے تھے۔

"ہمیں بیوک چاہئے نہ ڈیوک۔ لڑکی نیک مزاج ہو۔" اختر ممانی کہتیں۔ سننے میں آیا کہ لڑکی "آدمی کا بچہ" ہے اور بیوک اس لئے دے رہے ہیں کہ اس کی "عمر ذرا نکل گئی ہے۔"

ایک روز کھانے کے بعد الیاس کی دادی جان نے کہا' "اے کچھ تو فنی ہو گی لڑکی میں جو عمر نکل گئی۔ اور اب موٹر ساتھ کر رہے ہیں۔"

"وہ کہتے ہیں آپ لوگ جب چاہیں جا کر لڑکی دیکھ لیں۔" اختر ممانی بولیں۔

"چلئے ہو آئیں۔" میں نے تجویزا۔

"ہو آئیں فوراً۔" ایوب بھائی نے سر ہلا کر دہرایا۔ "ایک ہزار میل کا نسخہ۔ کیا موہن لال گنج جانا ہے؟"

روانگی کے وقت الیاس نے مجھے اور پروین بھابی کو ایک طرف لے جا کر باضابطہ قسم کھلائی' "سچ سچ بتایئے گا اس کی صورت کیسی ہے۔"

چھوٹی لائن کی افسانوی ٹرین میں سکنڈ کلاس ریزرو کر کے ابراہیم ماموں' اختر ممانی' ایوب بھائی پروین بھابی اور سب سے چھوٹا بھائی آغا ادریس اللہ میاں کے پچھواڑے روانہ ہوئے۔ حد نظر تک سرسبز شاداب گھنے جنگل اور شکار گاہیں۔ فطرت تر و تازہ اور بشاش آزاد ہے۔ انسان مغموم اور مجبور اور معذور۔

ایک پڑوسی صوبے کے ایک سنسان ریلوے اسٹیشن پر کھچی مونچھ استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ تحصیلدارانہ مونچھوں والے ایک اور صاحب بید ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ دونوں ملول۔ ہم لوگوں کو دو دقیانوسی کھٹارا موٹروں میں بھر کر سول لائنز روانہ ہوئے۔ ایک کائی آلود دو منزلہ کوٹھی پر پہنچے۔ سامنے کے کمرے میں ایک صاحب فرش پر ستار رہے تھے۔ دری پر رکھا برقی پنکھا گھوں گھوں کر رہا تھا۔ ان کی تتلی نما مونچھیں ہوا میں لرزاں تھیں۔ گویا ناک میں مرغی کا پر آدھا ادھر آدھا ادھر۔ اندر سارا مکان سنسان۔ ایک برآمدے میں والدہ دختر نفیس ململ کی سفید ساری پہنے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ سامنے جنگلی صحن میں دو کھٹیوں پر سرخ مرچیں سوکھ رہی تھیں۔

نہایت پر تکلف خاصہ تناول کرنے کے بعد ہوا کھانے میں اور پروین بھابی پچھلے برآمدے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ جس کے آگے بہت گھنا آم کا باغ تھا۔ اس وقت وہ بے چاری اچانک دکھلائی دے گئی۔ وہ دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ کھڑکی کا آدھا حصہ ایک درخت کی اوٹ میں تھا۔ ایسے جالی دار سفید دریچوں میں موجود اداس مختصر لڑکیوں کی یک رخی تصاویر مغل راجپوت مصوروں نے بنائی تھیں۔ بجد باریک ناک نقشے بڑی بڑی ڈگر ڈگر کرتی آنکھوں والی اس سینک سلائی لڑکی نے حیرت اور صبر سے ہمیں دیکھا۔۔۔۔۔۔ ہم اسے دیکھنے گئے تھے۔

وہ فیوڈل لوگ یو۔پی والوں سے دس قدم آگے نکلے۔ "پاندان کا خرچ چھ سو روپے ماہوار" کی کڑی شرط پر پہنچ کر بات ٹوٹ گئی۔

راز بھائی کے بیاہ کے لئے ان کی دونوں چھوٹی بہنیں گھیر سید خاں مراد آباد سے لکھنؤ آئی تھیں۔ دونوں خوبصورت پٹھانیاں۔ سارے گھر سے ان کا سخت پردہ تھا۔ مستقل ایک کمرے میں مقید رہتیں۔ چھوٹی بہن ستارہ جبین بہت ہی زیادہ حسین تھی۔ وہ لوگ مراد آباد واپس جا چکی تھیں۔ اختر ممانی نے ایک روز مجھ سے کہا' "راز سے تم کہو۔ سنا ہے ان کے ہاں رامپور سے باہر شادی نہیں کرتے۔"

سہ پہر کو موصوف کھانے کے بعد گول کمرے میں صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے فکر شعر میں محو تھے۔ خاصدان رکھا تھا۔

میں نے معتبر شکل بنا کر مخاطب کیا" راز بھائی۔"

"ہوں۔"

"راز بھائی۔۔وہ۔۔۔۔دراصل۔۔"

"ہوں۔۔۔ہوں۔۔اوں۔۔اوں۔۔ہوں۔۔"

"راز بھائی۔۔وہ ہمارا مطلب ہے۔۔"

راز بھائی نے دوسری گلوری نوش جان کی۔

"ہمارے کہنے کا مطلب ہے۔۔"

"اماں خاموش رہو ذرا۔ ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ ہاں بھئی۔ اب بتاؤ کیا بات ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مراد آباد والوں کا کوئی جواب نہیں۔

الیاس اور ستارہ کی شادی طے ہوگئی۔ اس سال کرسمس کی چھٹیوں میں اختر ممانی کے ہاں دن بھر ڈھولک بجتی۔ رات کے کہر آلود سناٹے میں دور سے انگریزی گیت سنائی دیتے۔ "دس از دی آرمی مسز جونز۔" "گیوی فائیو منٹس مور۔" ابراہیم ماموں نے پرانے مکان سے ملحق نئی وضع کی کوٹھی تعمیر کرلی تھی۔ پرانے گھر کا ماحول بدستور پرانے اردو ناولوں کے مکانوں والا تھا۔ یہ ایک سیدھا سادا خوش دل نیک طبع کنبہ تھا اور ہم لوگوں سے سگے عزیزوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ فراغت اور آسائش کی مرنجان مرنج مہذب زندگی گذارتے تھے۔ جانے ایسے لوگ اب کیوں نہیں ہوتے۔

پرانے مکان کے لعل کمرے میں گراموفون پر نور جہاں، خورشید، سہگل کے ریکارڈ بجائے جاتے۔ ترپ چال کی محفل جمتی۔ سہ پہر کو ایک مخنث سبزی فروش جھوا لے کر ڈیوڑھی پر بڑی ادا سے صدا لگاتا۔ "اے بیگم صاحب۔ ہم جنت کی چڑیا آئی گئیں۔" اور پروین بھابی، حسنہ بھابی اور ممانی قالین پر کپڑے پھیلا کر غراروں کی گوٹیں تراشتیں۔

رسالہ عالمگیر لاہور کا شاید افسانہ نمبر نکلنے والا تھا۔ اس کے اڈیٹر کا خط لال کرتی پہنچا۔ حالات زندگی اور سن پیدائش مع تازہ افسانے کے ارسال فرمایئے۔ سخت فکر لاحق ہوئی۔ حالات زندگی کیا ہوتے ہیں۔ کچھ تھے ہی نہیں۔ یہ سوال گول کیا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ قارئین کرام پر پختگی سن و سال کا رعب پڑے کالج کے داخلے کے Back-dated سن پیدائش میں مزید ایک سال بیک ڈیٹ کر کے لکھ بھیجا جو آج تک چھپ رہا ہے۔ بعد ازاں ہوسٹل واپس جانے کی تیاری کی۔

اپریل میں آخری پرچہ کر کے لال کرتی جانے کے لئے ہوسٹل سے سامان باندھا۔ سہ پہر کے وقت اختر ممانی کار لے کر کیلاش آئیں۔ ای نذ خدا حافظ کہنے باہر نکلی۔ شاہ بلوط کے درختوں میں ویران ہوائیں

سنسنا رہی تھیں۔

"یہ لوگ پھر چلنے لگیں"، ای نذ نے چاروں طرف دیکھ کر اداسی سے کہا۔

تیسرے روز اختر ممانی کے بھائی کے ہمراہ بلند شہر۔۔۔ جہاں ۵ مارچ کو چھوٹے چچا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔

۴۔ بوئے گل اور رنگ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

چھوٹی چچی جان برآمدے میں نکل آئیں۔ ان کے سفید بال دیکھ کر دھکا سا لگا۔ چچا وحید کی رحلت کے بعد سے انھوں نے خضاب لگانا چھوڑ دیا تھا۔ ہمیشہ کی فیشن ایبل خوش پوش ہنس مکھ چھوٹی چچی جان یک لخت بجھ کے رہ گئیں۔

دونوں بہوئیں آپا عذرا اور آپا طفیل (آتیل) خانہ داری میں مصروف تھیں۔ ان کی بچیاں رعنا، تزین، نسرین، باغ میں کھیل رہی تھیں۔ اماں جو چھوٹے چچا جان کی وفات کے تیسرے روز دہلی سے آگئی تھیں ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا اپنے کمرے میں صاحب فراش تھیں۔

"تمہارے چچا جان مرحوم کا پروگرام تھا تم امتحان سے فارغ ہو لو تو تمہیں بلائیں گے کہ یہاں رہ کر کھانا پکانا سیکھو۔" چھوٹی چچی جان نے افسردگی سے کہا۔

دن بھر لو چلتی۔ شام کو کرسیاں نکال کر سبزے پر رکھی جاتیں۔ شاہجہان پور، اناؤ، رائے بریلی، سارن پور میں چھوٹے چچا جان باہر آکر سبزے پر بیٹھا کرتے تھے اور رائے بریلی میں اندھیرا پڑے باغ کے مور جھنکارتے تھے۔

گھریلو شاعری کا سلسلہ جاری تھا۔ فروری میں آپا عذرا نے اماں کو دلی منظوم خط بھیجا تھا۔

"پیاری بڑی اماں۔۔۔۔

یوں تو کہنے کے لئے آپ سے میں دور سہی — مجھ میں اور آپ میں جو بعد ہے منظور سہی
یہ بھی سچ ہے کہ شب و روز رہی ہوں مصروف — روز و شب آپ کی خدمت سے بھی معذور سہی
میری باتوں سے بھلا آپ کو کیا دل چسپی — اس پہ بھی باتوں میں طول شب دیجور سہی

بہ صفائی دل مومن بہ خلوص شاعر
دل سے تم دور نہیں آنکھوں سے گو دور سہی

"خاکسار عذرا"

یادش بخیر نانی اشرف جہاں مرحومہ اپنے آپ کو "بوڑھی پوسہ" کہا کرتی تھیں۔ جو ان کا ارشاد تھا کہ "بل بل کی لپسی کا پوسہ" سے نکلا ہے۔ اماں نے بھی اپنے آپ کو یہی لقب عطا کیا تھا۔ عذرا آپا کو جواباً جو منظوم خط دلی سے لکھا اس کا ایک شعر تھا

گو سن و سال میں ہے فرق بہت دونوں کے
اس لپوسائی میں جذبات سے معذور سہی
بڑی اماں لپوسا

اب بلند شہر میں وہ پلنگ پر لیٹی لیٹی دونوں دیوروں نصیرو وحید کے مرثیے لکھنے میں مشغول تھیں۔
سال گذشتہ چچا نصیر ٹونک سے ابا جان کی طرح خرابی صحت کی بنا پر قبل از وقت ریٹائر ہو کر علی گڑھ جا رہے تھے جہاں انہوں نے ایک بڑی کوٹھی تعمیر کروائی تھی اور اس کا نام خیابان رکھا تھا۔ علی گڑھ جاتے ہوئے چھوٹے بھائی سے ملنے کے لئے بلند شہر آئے۔ اچانک بیمار پڑے اور ۳ مئی ۱۹۴۶ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔

---------- ان تینوں بھائیوں کی پے در پے اموات کے بعد وہ نظام کہن اب ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ قدیم اقدار' پر آسائش زندگیاں' فیوڈل بنیادوں پر استوار افسر شاہی معاشرہ' عنقریب معدوم ہونے والا تھا۔ بلند شہر کلب میں برطانوی ہند کے آخری سویلین بلیرڈ کھیلنے میں مصروف تھے۔ غدر سے پہلے بنے ہوئے کلب میں منٹی اور فلورا اینی اسٹیل کے ناول الماریوں میں مقفل تھے۔ وکٹورین صوفوں پر بیٹھ کر ایم۔ پی احمد آئی۔ سی۔ ایس ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج' سعید بھائی اور ضلع کے دوسرے ہندو مسلمان افسر روز شام کو تردد اور دھیان سے شملہ گفت و شنید کے متعلق تازہ ریڈیو بلیٹن سنتے۔
چھوٹی چچی جان نے کلب جانا ترک کر دیا تھا۔ وہ عموماً اماں کے پاس بیٹھی رہتیں۔ چچی وحیدہ اور ان دونوں بیویوں نے بڑے اچھے وقت دیکھے تھے۔ اور ان کا زمانہ گذر چکا تھا۔
چھوٹے چچا جان مرحوم کے کمرے میں دو مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں پر بستر اور مچھر دانیاں اسی طرح لگی تھیں۔ اسی کمرے میں ایک مسہری پر چچا نصیر اور دوسری پر چچا وحید کا انتقال ہوا تھا۔ سرہانے کی میز پر چچا وحید کے میڈیکل رسالے اور کیس میں بند عینک رکھی تھی۔ الماریوں میں میڈیکل کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ دیوار پر لارڈ ولنگڈن کے ساتھ ان کی تصویر آویزاں تھی۔ چچا وحید لارڈ ولنگڈن کے اعزازی معالج رہ چکے تھے۔
چچا وحید کم آمیز' بردبار' میٹر آف فیکٹ انسان تھے۔ اماں ان کو ہمیشہ زاہد خشک کہہ کر چھیڑتی تھیں۔ آخری علالت میں سول سرجن سے اپنے مرض کے متعلق بڑے اطمینان سے تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اور وفات سے ایک دن قبل چھوٹی چچی جان سے کہا'' بیگم صاحب تختے اور گھڑے منگوا رکھئے۔ ہمارا خیال ہے ہم کل پرسوں تک چلے جائیں گے۔''
بلند شہر کے شہر خموشاں میں چنبیلی کے جھاڑ کے نیچے پہلو بہ پہلو دو قبریں۔
سید نصیرالدین حیدر مرحوم ۱۸۸۲ء - ۱۹۴۶ء
سید وحید الدین حیدر مرحوم ۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء
قبروں کے گرد خودرو پھول اگ آئے تھے۔ دن بھر شائیں شائیں کرتا جھکڑ چلتا۔ رات کی خنک

ہوا میں چنبیلی کے پھول ستاروں کی مانند گرتے۔
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے
"خدا کی شان ہے۔ تینوں صاحب میں دو دو برس کا فرق اور تینوں تریسٹھویں سال گئے۔"
گلدانوں میں تازہ پھول سجاتے ہوئے پچھلے برآمدے کے فرش پر اکڑوں بیٹھے خادم حسین نے تاسف سے اظہار خیال کیا۔ مالی پھولوں کی ٹوکری لئے سیڑھی پر کھڑا تھا۔ سعید بھائی اپنے مرحوم والد کی آرام کرسی پر نیم دراز ہندوستان ٹائمز پڑھ رہے تھے۔ رشید بھائی پان بنا رہے تھے۔ اور چھوٹی چچی جان پانیر کے مطالعہ میں مصروف تھیں۔ اماں چچی وحیدہ سے جو علی گڑھ سے آ گئی تھیں تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ آپا عذرا اور آتیل پھول منتخب کر کرکے خادم حسین کو دیتی جاتی تھیں۔ خادم حسین نے جو ۱۹۳۷ء میں ببو بھائی اور رشید بھائی کے بارود خانہ لکھنؤ والے عارضی مکان کے منتظم تھے اس دس برس میں داستان کا ایک اور باب ختم ہوتا دیکھ لیا تھا۔ غلام حسین' چھٹوا' مشتاق' جان محمد' مقصود' بشیر خاں' فقیرا' امیر خاں' عبدالرحمن' امیر بخش' خادم حسین یہ غریب بے بضاعت لوگ جنھوں نے مدتیں ان گھرانوں کی خدمت کرتے گذار دیں جو "خدا پنج انگشت یکساں نکرد" اور "جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہ" پر تکیہ کرتے تھے یہ کہانی اپنی زاویے سے جانے کیسی سناتے۔
اور وقت اور FAMILIAL CHARISMA ۔۔۔ رنجیت خاں ہیڈ کانسٹبل ہمیں دادا جلال الدین حیدر کے قصے سناتے تھے۔ سعید و رشید بھائی کی اولاد امیر بخش اور خادم حسین سے اپنے دادا ڈاکٹر وحید الدین حیدر کے واقعات سن رہی تھی۔
امیر بخش بیرے جو شاہجہانپور میں "بابا اوئل ٹین" پکارتے پھرتی سے دوڑتے تھے اب کمر خمیدہ ہو چکے تھے اور پنشن پا رہے تھے۔ چپ چاپ گیلری سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ گویا بغداد باستان کی گلیوں سے ایک پرچھائیں نمودار ہوئی شہر حیرت کا کبڑا۔ گم سم بوڑھا۔ عین مین "فادر ٹائم"۔
"ابی پھانسی کیا ہوتی ہے؟" تزئین نے کودتے ہوئے آتیل سے پوچھا۔ "امیر بخش کہہ رہے تھے جب کسی کو پھانسی دی جاتی تھی دادا جان وہاں موجود رہتے تھے اور گھر آ کر دو دن کھانا نہیں کھاتے تھے۔"
"ایک قسم کی سزا ہوتی ہے۔"
"اور امیر بخش کہہ رہے تھے۔ ایک بہت امیر آدمی تھا۔ اس کے لڑکے نے کسی کو مار ڈالا۔ تو اس امیر آدمی نے دادا جان کو ایک لاکھ روپیہ رشوت پیش کی کہ غلط ڈیتھ سرٹیفکیٹ لکھ دیں۔"
"صاحب بولے۔ گیٹ آؤٹ۔ لال پیلے ہو گئے۔ کوٹھی سے نکال دیا۔" امیر بخش نے در کے پاس کھڑے کھڑے بات پوری کی۔
"ڈیتھ سرٹیفکیٹ کیا ہوتا ہے؟" تزئین نے سوال کیا۔
"ایک قسم کا سرٹیفکیٹ ہوتا ہے۔"
"اور رشوت۔۔۔۔؟"

"رنجیت خاں ایک لاکھ روپیہ کتنا ہوتا ہے؟" میں نے سوال کیا تھا۔

رشید بھائی پاندان بند کر کے اندر گئے اور چند لمحوں بعد ایک پیلا کتابچہ لئے برآمد ہوئے۔

"یہ ایک بجید سوئیٹ چیز ہے۔" آپا عذرا نے مجھے بتایا۔ "پند نامہ سید جلال الدین حیدر۔ برادری میں تقسیم کرنے کے لئے اسے باقاعدہ چھپوایا گیا تھا۔ دادا جان کے انتقال کے بعد۔"

میں نے رشید بھائی سے لے کر کتابچے کے ورق پلٹے اور باآواز بلند ادھر ادھر سے پڑھنا شروع کیا۔ "دیباچہ از سید اعجاز حیدر..... اکبر اولاد راقم جو محکمہ پرمٹ میں انسپکٹر ہے' پسر دوم سید سجاد حیدر بی۔ اے۔ جو اسسٹنٹ پولیٹکل افسر محمد یعقوب خاں سابق امیر افغانستان ہیں۔ پسر سوم سید نصیر الدین حیدر سلمہ' بی۔ اے۔ جو بارہ بنکی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ پسر چہارم سید وحید الدین حیدر جو اس وقت میڈیکل کالج لاہور میں تعلیم پا رہے ہیں۔ خدا انہیں کامیاب اور اعلیٰ مراتب پر فائز کرے۔۔۔" اچانک میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید جارجٹ کی ساریوں میں ملبوس تین بیگمات چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ میں نے آگے نظر دوڑائی۔ "مجاہد علی النفس وہ نہیں ہے جو دنیا کی آزمائشوں کی تاب نہ لا کر منزوی ہو جائے۔ بلکہ...... جس دیانت اور جفاکشی اور بے لوثی سے پولس میں اپنی نافع خلق زندگی...... جس تہی دستی سے آئے تھے اسی تہی دستی سے بنارس کو خیرباد کہا...... لیکن لاکھوں دعاؤں کی دولت ساتھ لے گئے ...... جس وقت یہ معلوم ہوا کہ پنشن لینے والے ہیں سارے شہر میں کھلبلی...... روانگی کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ہجوم...... مرحوم شیخ سعدی کے اس شعر کو

کجا خود شکر ایں نعمت گذارم — کہ زور مردم آزادی ندارم

اس تصرف سے پڑھا کرتے تھے۔۔۔ میل مردم آزاری ندارم۔ کہ زور مردم آزاری تھا۔ اسے کبھی کام میں نہ لائے۔۔۔ یہ نصیحت نامہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے لئے لکھا تھا....

دستور العمل۔ زاتفاق مگس شہد میشود پیدا..... ہزار ہزار شکر کا مقام ہے بفضل خداوند تعالیٰ جل شانہ' اب تم میری منشا کے موافق اپنی اپنی تعلیم میں کامیاب ہوئے جاتے ہو۔ یہ بقیہ مراد بھی اللہ پوری کرے۔ چونکہ اب تم سمجھ دار ہو اور نیک و بد کو جاننے لگے ہو اپنا بیگانہ پہچاننے کی لیاقت ہو گئی ہے پس جاننا چاہئے کہ جو کام اور انتظام اپنے حقیقی بھائیوں کے اتفاق سے ہو گا وہ نہایت مستحسن اور مستحکم ہو گا۔ جو کام اپنی ذات سے براہ خود پسندی کیا جاوے گا یا زن مرید ہو کر عورتوں کے کہنے پر کیا جاتا ہے چونکہ وہ کم عقل اور خود غرض ہوتی ہیں اس کا آغاز و انجام ہمیشہ بے اصل ہوتا ہے..... اس لئے تمہارے عمل درآمد کے لئے دستور العمل حسب دفعات ذیل مرتب کرتا ہوں۔ تمہاری سعادت مندی اور خوش چلنی سے مجھے بفضل خدا امید کامل ہے...... ایک ایک نقل اس کی اپنے پاس رکھو۔ وقت مناسب میں ہمیشہ اس کو ضرور پڑھ لیا کرو۔

جب کسی بھائی سے گھر کے معاملات میں باہم تکرار اور رنج ہو جائے اس کو بڑھنے نہ دو۔ کیونکہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں آپس میں رنج بڑھ جاتا ہے اور دلوں کو ایسا توڑتا ہے جیسے کانچ کو پتھر۔ اس حالت میں اس

میرے پرچے کو نکال کر ضرور دیکھ لیا کرو........

قواعد تعمیل طلب: (۱) اولاً اپنے عقائد مذہب اہلسنت و جماعت میں مضبوط رہ کر نماز و روزہ زکوٰۃ ..... انجام بخیر ہوتا ہے ..... (۲) درجہ بدرجہ مرد ہوں یا عورت سب میں بڑے چھوٹے کا ادب و لحاظ ...... (۳) ہر ایک' ایک دوسرے بھائی کی اولاد کو اسی نظر محبت سے دیکھے جیسے اپنی اولاد کو..... (۴) عورتوں کے طعن و تشنیع کو سنے یا بری بھلی باتوں پر مطلق دھیان نہ دیا جائے ..... (۵) کبھی عورتوں کو ایسا دخل نہ دیا جائے جس میں وہ خلل انداز انتظام و اتفاق ہوں۔ اور اپنی اپنی عورتوں پر رعب و داب رکھا جائے۔ اور کچھ ایسی خوش اسلوبی سے ان کے اوقات کی تقسیم کی جاوے کہ سوائے امور ضروریہ اور بیرونی باتوں میں مداخلت کا ان کو موقع ہی نہ ملے۔ ان کا خاصہ ہے کہ ہڈی سے گوشت جدا کر لیتی ہیں اور پھر بھی ان کی طبیعت کو اطمینان نہیں ہوتا۔ (۶) کوئی بھائی صاحب اقبال ہو اور معزز روزگار پر نوکر ہو جائے کبھی دوسرے بھائی کی جانب حقارت سے نہ دیکھے۔ برابر شفقت برادرانہ سے دیکھتا رہے...... (۷) جو بھائی منتظم اور گھر کا بزرگ ہو اس کے حکم کی تعمیل واجب سمجھی جائے۔ حتی الامکان باہم نزاع نہ ہو..... عدالت میں کبھی رجوع نہ کرنا۔ (۸) ایک بھائی کا ہمیشہ گھر پر رہنا ضروری ہے جو معاملات کا بندوبست بخوبی کرتا رہے .... (۹) ظلم' حسد' عداوت' فساد' خیانت' کج خلقی' سخت کلامی' غصہ سے مجتنب و محترز رہنا۔ زیادہ زیادہ اللہ و بس باقی ہوس۔"

"جولی گڈ۔۔۔ لیکن دادا جان اتنے ری ایکشنری تھے سوئیٹ۔۔۔ عورتوں کے متعلق ایسے افسوسناک خیالات۔۔۔" میں نے کتابچہ میز پر رکھ کر کہا۔۔۔

"ماموں جان مرحوم اپنے وقت کے نمائندے تھے۔" چچی وحیدہ نے جواب دیا" "اور ان بھائیوں کو یہ نصیحت نامہ بار بار پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

"اس زمانے میں سارے ریفارمر بھی اسی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ عورتیں لڑ جھگڑ کر خاندان تباہ نہ کریں۔ علامہ راشد الخیری۔ اکبری پھوپی اور سب۔" اماں نے کہا۔

"گویا عورت سدھار تحریک۔" سعید بھائی بولے۔

"آدھا بنگالی اردو فکشن انہی اگنائیوں اور رشتوں کی داستان ہے۔ ساس نندیں لوک گیتوں کی پرانی ولین ہیں۔" عذرا آپا نے کہا۔

"بی بی اصل وجہ جہالت تھی۔" اماں بولیں۔

"گویا ایم۔ اے پاس عورتیں نہیں لڑتیں۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

"اس وقت علامہ راشد الخیری تھے۔ اب ماہر نفسیات آگئے ہیں۔" سعید بھائی بولے۔

"وجہ جہالت تھی اور عورتوں کی اقتصادی مجبوری اور مشترکہ خاندان۔" آتیل نے کہا۔

"لیکن آپ لوگوں کے پاس کیا نسخہ کیمیا تھا؟" میں نے تینوں بیگمات سے پوچھا۔

"محبت۔" چچی وحیدہ نے جواب دیا۔

"سنا ہے عالم بالا میں --" میں نے کہا۔ پھر میں نے سوچ کر اضافہ کیا۔-----

"سوائے اماں کے آپ سب ایک دوسرے کی اور ان بھائیوں کی فرسٹ کزن بھی تو تھیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ سگی بہنیں آپس میں لڑتی ہیں۔" چچی جان نے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ لوگوں کی وکٹورین تہذیب۔ انگریز کبھی اظہار جذبات نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"تم نے سب وجہیں سوچ لیں۔ ایک ہی کا خیال نہیں آیا۔ خود غرضی اور شرپسندی نہیں تھی۔" چچی وحیدہ نے کہا' "اور ان سب کی طبیعتیں نیک تھیں۔"

چھوٹی چچی جان نے مجھے مخاطب کیا' "تم پھوپا جان کو ری ایکشنری کہہ رہی ہو۔ انگریزوں کے ہاں شادی کے وقت بیوی کن الفاظ میں عہد کرتی ہے؟" "Honour and obey"

یہ لوگ سب کامیاب رہے۔ ہر طرح سے۔ میں نے ان حیرت انگیز غیر معمولی خواتین پر نظر ڈال کر سوچا۔ "شاید زندگیاں اتنی پیچیدہ نہیں تھیں۔" میں نے باآواز بلند کہا۔

"بڑے ابا وغیرہ کی زندگیاں تو کافی پیچیدہ تھیں۔" آپا عذرا نے کہا' "آخوند امام بخش کی زندگی البتہ سیدھی سادی رہی ہوگی۔"

"آخوند امام بخش کی زندگی--- ؟" سعید بھائی نے چونک کر دہرایا۔ "چاروں طرف بدامنی --لوٹ مار-- فوج کشی--"

"اچھا ان سے پہلے۔ اور ان سے پہلے---؟" میں نے سوال کیا۔

"زندگی کسی زمانے میں آسان نہیں رہی۔ ورنہ اتنے پیغمبر اور اولیا نہ آتے۔" چچی وحیدہ نے جواب دیا۔

آپا عذرا کہنے لگیں' "نہ معلوم اصلیت کیا تھی۔ کسی گذشتہ زمانے کو ہم بعد کے عہد میں بیٹھ کر جج نہیں کر سکتے---"

"مگر نہٹوری خاندان اس قدر PURITAN کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ ولی اللہ" کا اثر---" چچی وحیدہ نے جواب دیا۔

"لیکن امی جان اس سے پہلے ہم مغل ملٹری سوسائٹی کی پیداوار ہیں۔" آپا عذرا بولیں۔

"مجھے مغل ملٹری سوسائٹی بہت رومینٹک معلوم ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ" کی تحریک بور تھی۔" میں نے فیصلہ کیا۔

"جس طرح مارٹن لوتھر کی اصلاح نے نئی مڈل کلاس کے لئے ایک پروٹسٹنٹ WORK ETHIC پیدا کی---"

"پرانی فیوڈل اقدار کی جگہ نئی مڈل کلاس مورلیٹی--- دادے جان جلال الدین حیدر شاہ اسی کے نمائندے تھے۔" میں نے آپا عذرا کی بات کاٹی' "یعنی سردار امیر خاں ایک طرف اور شاہ ولی اللہ" اور سرسید" دوسری طرف۔"

"اور بیچ میں میر بندے علی اور احمد علی جو دونوں دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے!" چچی وحیدہ نے کہا۔

"لیکن چی یان ہمارے ہاں عجب کنفیوژن ہے۔ جتنا فخر باغی احمد علی پر کیا جاتا ہے اتنا ہی ان کے بھائی رسالدار نبی بخش پر کہ وہ لارڈ ڈلہوزی کے نیٹو اے۔ ڈی۔ سی۔ تھے۔" میں نے کہا۔

"ہماری سوسائٹی کے یہ تضاد آج تک موجود ہیں۔ ساری قوم نہرو خاندان کی انگریز دشمنی پر نازاں ہے اور اس بات پر بھی کہ وہ ہیرو میں برٹش لارڈز کے ساتھ کھیلے کودے۔" سعید بھائی نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں PATRIARCHAL سوسائٹی کی ویلیوز موجود رہیں۔" چھوٹی چچی جان نے کہا۔

"جب ہر طرف سول وار زہو رہی تھیں اور سردار امیر خاں نے تباہی بلائی اس کے بعد سارے کنبے کی کفالت دادے بندے علی ہی نے تو کی۔ غدر کی ضبطی کے بعد پھوپا جلال الدین حیدر بے چارے انیس (۱۹) برس کی عمر ہی میں نوکری کرنے لگے کہ چھوٹے بھائیوں اور چچاؤں کی اولاد کو پال پوس سکیں۔"

"اب پھر گردی بج رہی ہے۔ بیگم صاحب اب کی بار کوئی چھتر چھایا سروں پر موجود نہیں۔" امیر بخش نے جو گرینڈ فادر کلاک کی طرح کھڑے بغور یہ گفتگو سن رہے تھے سادگی سے کہا۔

باغ میں تیز ہوا چل رہی تھی۔ موسم گرما کے پتے سبزے پر اڑنے لگے۔

"سید حامد اور احد حسین قدوائی تشریف لائے ہیں۔" رشید بھائی نے دروازے میں آکر کہا۔

اماں' دونوں چچیاں اور سعید بھائی اندر چلے گئے۔ میں نے عذرا آپا سے کہا' "یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا ابا جان وغیرہ کا زمانہ ہولناک نہیں تھا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ آرام چین ہی دیکھا۔ اگر آپ فاقے کر رہے ہوں---"

"محرومیاں اور مصائب ہمیشہ اضافی ہوتے ہیں۔" "ہمیں کیا معلوم کون کیسی مطمئن یا طول زندگی گذار کر گیا ہے۔ یہ صرف وہی جان سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔"

فلسفہ عذرا آپا کا مضمون رہ چکا تھا۔ زندگی کیوں؟ موت کیوں؟ اور بے پایاں کائنات اور لامتناہی ازل اور ابد کے درمیان حیات انسانی کا حباب آسا موہوم وقفہ-- باٹھ تریسٹھ برس-- یا اس سے بھی کم۔ یا اس سے چند سال زیادہ۔ اور یہ سب تعلیم و تربیت۔ جدوجہد۔ تجربے۔ تفکرات۔ غم و اندوہ۔ ناکامیاں مسرتیں۔ اور اچانک فنا۔ یعنی دنیا کے بنارس میں تہی دست آئے اور تہی دست گئے۔ اور مجاہد علی النفس وہ ہے---

خادم حسین فرش پر بکھرے پھول اور پتیاں سمیٹنے لگے۔ امیر بخش کمر دوہری کئے اپنے کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوپہر ہوئی۔ کھانے کے کمرے میں لنچ کا گھنٹہ بجا۔ کھانے کے بعد لوگ نیم تاریک خس خانوں میں آرام کرنے چلے گئے۔ لُرگ باہر چلچلاتی دھوپ اور لو میں محنت مزدوری کرتے رہے۔ دور شاگرد پیشے کی ایک کوٹھری سے امیر بخش کی بھونچکی آواز بلند ہوئی۔ تری شان جل جلالہ'۔

۵۔ فردوس گمشدہ

جون کے پہلے ہفتے میں اماں کا بلڈ پریشر بہت زیادہ اونچا ہو گیا۔ ڈاکٹر نے چلنا پھرنا منع کر دیا۔ وہ لیٹی جمیل الدین عالی سے ان کا کلام بلاغت نظام سنا کرتیں جو ان دنوں بلند شہر آئے ہوئے تھے۔ قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ دہرہ دون پہنچانے کے لئے بھابی کے بڑے بھائی ایوب احمد کرمانی (جو عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دلی کے اخبار غالباً انجام میں کام کر رہے تھے) بلند شہر آئے۔ سعید بھائی جنہوں نے اپنا گھر انتہائی خوش ذوقی سے سجا رکھا تھا' اسٹیشن لے جانے کے لئے ایک ٹرک منگوایا اور اس کا بھی انٹیریر ڈیکوریشن کر ڈالا' قالین بچھا کر اس پر اماں کے لیٹنے کے لئے صوفہ رکھا گیا۔ ساتھ میں مزید کرسیاں' وسطی میز اور ایک عدد پام کا گملہ۔ اس سج دھج سے ٹرک ریلوے اسٹیشن روانہ ہوا۔

اگزنڈرا پیلس دہرہ دون کے گھرے سبز باغ میں شام کو بڑی فرحت انگیز لطیف خنکی چھا جاتی۔ اکثر غروب آفتاب کے وقت بھائی مظہر القیوم کے دوست کرنل ایوب[4] خاں اپنے ایلیشن کتے کے ساتھ ٹہلتے ہوئے آتے۔ بلند و بالا درختوں کے نیچے بچھی بید کی سفید کرسیوں پر سورج کی ترچھی ارغوانی کرنیں بکھری ہوتیں۔ اندر ممانی اپنی کسی بہو کو آواز دیتیں' "دلہن۔ کرنل ایوب کے لئے باہر چاء بھجوا دو۔"

اگزنڈرا پیلس میں جو پہلے انگریزوں کا ریذیڈنشل کلب تھا دس بارہ نہایت پکچریسک سویٹ آف رومز تھے جن میں ماموں ممانی' ان کے تینوں بڑے لڑکے اور بہوئیں رہتی تھیں۔ ایک سویٹ اماں کے لئے مخصوص خالی پڑا رہتا تھا۔

بھائی دہلی سے چند روز کے لئے اگزنڈر پیلس آئے۔ ان صوبوں کے جہاں پاکستان بننے والا تھا متعدد متمول ہندو اور سکھ کاروباری دہرہ دون اور مسوری میں جائیدایں خرید رہے تھے۔ ایک روز حاضر ماموں نے بھائی سے کہا' "سرشوبھا سنگھ نے آشیانے کی قیمت ایک لاکھ بیس ہزار لگائی ہے۔ فوراً بیچ دو۔" بھائی نے کہا' "ماموں کتنی ہی اچھی قیمت ملے آشیانہ فروخت کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

آشیانے کا کچھ حصہ مرمت طلب تھا۔ اس کے لئے بھائی نے مبلغ چار ہزار روپے کا چیک ہاؤس ایجنٹ کے حوالے کیا اور اطمینان سے دلی واپس چلے گئے۔

لیکن ۱۵ اگست کے بعد شہر بگڑنا شروع ہو گیا۔ تباہ حال شرنارتھیوں کے قافلے جوق در جوق دہرہ دون پہنچ رہے تھے۔ ڈالن والا میں مسلمانوں کی کوٹھیاں سرعت سے خالی ہونے لگیں۔ اکثر شام کو جب پرانے معالج ڈاکٹر ہون اماں کا بلڈ پریشر دیکھنے اگزنڈرا پیلس آتے۔ افسوس سے خبر دیتے۔ "ثناء اللہ صاحب بھی چلے گئے۔ مظفر محمد خاں جانے والے ہیں۔ صرف ابھی محمد حسنین صاحب کے ہاں دانہ نہیں آیا۔"

محمد حسنین صاحب نے جن کے ہاں بات بات پر استخارہ دیکھا جاتا تھا ترک وطن کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ ان کے والد ظل حسنین صاحب مرحوم کے ہاں اماں جون ۱۹۱۲ء میں کوہاٹ سے آن کر اتری تھیں۔ ان کی بڑی بھانجی صالحہ بیگم کی شادی کرنل بشیر حسین زیدی کے بھتیجے سید تنویر حسین سے ہوئی تھی۔ چھوٹی آصفہ بیگم کی شادی ۱۹۳۷ء میں اماں نے الن ماموں سے کروائی تھی۔ ان کا آدھا خاندان پاکستان چلا گیا۔ سارا دہرہ دون مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ محمد حسنین صاحب دل جمعی سے بیٹھے اپنی ذاتی مسجد میں لمبی لمبی نمازیں پڑھتے رہے۔ محرم میں تنہا بیٹھ کر مجلسیں پڑھ لیتے۔

ستمبر کے مہینے میں مہر جبیں اور منہاج الدین احمد لکھنؤ سے پاکستان جاتے ہوئے دہرہ دون آئے۔ ان کے ساتھ میں مسوری چلی گئی۔ وہاں دفعتاً صورت فسادی قائم ہوئی۔ ہنگامہ جدال و قتال گرم ہو گیا۔ ہم لوگ بھاگم بھاگ نیچے اترے۔ اگزنڈرا پیلس میں بھائی مظہر القیوم کی نگرانی میں سرعت کے ساتھ پیکنگ کی جا رہی تھی۔ حاضر ماموں کا خاندان دہرہ دون کو خیرباد کہہ کر آبائی وطن سیالکوٹ واپس جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔

"بہن۔" حاضر ماموں نے متفکر آواز میں اماں سے کہا۔ "حالات بعید نازک ہیں۔ نہ معلوم تم لوگوں کو کس وقت پاکستان جانا پڑ جائے۔ آشیانے میں جو چیزیں مقفل ہیں میرے سامان کے ساتھ سیالکوٹ بھیج دو۔"

اماں کا بلڈ پریشر بہتر ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اماں چھتری لگا کر پیدل اندر روڈ روانہ ہوئیں۔ آشیانہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے چند پریشاں حال شرنارتھی کنبے ٹھہرا دیئے تھے۔ اماں نے پچھلے ونگ کے کمرے میں مقفل گودام کھلوائے جن میں ۱۹۳۷ء میں لاہور جاتے وقت سامان بند کر گئی تھیں اور ابا جان کی کتابوں کے صندوق اور قالین وغیرہ لال کرتی لکھنؤ سے ۱۹۴۰ء میں لا کر رکھ دیئے تھے۔ کتابوں کے صندوق اور دوسرا قیمتی سامان ٹھیلوں پر لدوا کر اگزنڈرا پیلس بھجوایا جو دوسرے روز حاضر ماموں کے الغاروں اسباب کے ساتھ مال گاڑی کی ویگنوں پر لدنے کے لئے اسٹیشن روانہ کر دیا گیا۔

اسی رات خبر گرم ہوئی کہ نابھ کے سکھ دہرہ دون پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اگزنڈرا پیلس میں اس کا بہت اکسائٹمنٹ رہا۔ برستی بارش میں رات بھر حاضر ماموں کے لڑکوں نے بندوقیں سنبھال کر کوٹھی کے چاروں طرف پہرہ دیا۔ رات بھر چاء اور کافی بنتی رہی۔

ریڈیو پر قرولباغ دہلی کے فساد کی خوفناک خبریں آ رہی تھیں۔

ایک روز بھائی کی ٹرنک کال آئی کہ بھابی اور امیر خاں کو لکھنؤ پہنچانے جا رہے ہیں۔ فوراً لکھنؤ پہنچے۔

حاضر ماموں نے منشی جی کو ٹرین میں ساتھ لکھنؤ بھیجا۔ آخری بار ڈالن والا سے نکلے۔ دہرہ دون کا دلفریب منظر بارش میں سنہری دھند میں آہستگی سے اس طرح جذب ہو گیا جیسے جاپانی واش تکنیک کی واٹر کلر تصویر کو پانی میں بھگوتے ہیں۔

ٹرین گلپوش ڈون ویلی سے گذری۔ اس وقت رات کا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں تین امریکن مشنری عورتیں ہمسفر تھیں جو مسوری کے کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور لکھنؤ جا رہی تھیں۔

ڈوئی والا اسٹیشن پر تین منٹ کے لئے گاڑی رکی۔ اچانک ایک ہجوم مفسدین "شکار۔ شکار" کے نعرے بلند کر کے کھڑکیاں توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک امریکن عورت نے فوراً میرے اوپر اپنا لحاف پھیلایا اور خود اس پر چڑھ بیٹھی (وہ ایک بیحد فربہ مبلغ خاتون تھی) اور اماں سے کہا کہ دوسرے لحاف میں چھپ جائیں۔ انہوں نے 'کہ اشرف جہاں بیگم کی نواسی تھیں' اطمینان سے جواب دیا' "میں نہیں ڈرتی کسی سے۔ آئیں تو اندر۔" اور فوراً قصہ سنانا شروع کیا۔ کس طرح جب ایک بار تنہا مراد آباد جا رہی تھیں لیڈیز کمپارٹمنٹ کے غسلخانے میں تین عدد چور چھپے ملے۔ مطلق ڈرے بغیر زنجیر کھینچ کر ان کو حوالہ پولیس کیا۔

وہ یہ قصہ سنا رہی تھیں اور بلوائی کھڑکیوں کے شیشوں سے منہ چپکا کر اندر جھانک رہے تھے۔ ان کو تین امریکن بڑھیاں نظر آئیں۔ اماں کو شاید کوئی پارسن سمجھے۔ امریکن عورتوں نے چلا کر زور سے ڈانٹا۔ دوسرے لمحے ٹرین آگے بڑھ گئی۔

٦۔ کارواں سرائے

مردہ اور زندہ انسان ایک ساتھ رقصاں ہیں۔ ایک ہی وقت ہے۔ ایک ہی جگہ ہے اور ایک وسم 5گرد آلود فیض آباد روڈ پر ایک بوڑھا خستہ حال شرنارتھی سرحدی صافہ باندھے' سر جھکائے سڑک کے نل پر جھکا اوک سے پانی پی رہا تھا۔

سامنے از ابلا تھوبرن کالج کے ایک پلیٹ گلاس دریچے کے ادھر طویل القامت امریکن مشنری حیفہ مس ویلیمز بلیک بورڈ کے پاس کھڑی حسب معمول بائبل کلاس لے رہی تھیں۔ اسی صحیفے میں ایک جگہ رقوم تھا۔ "لومڑیوں کے بھٹ ہیں اور پرندوں کے گھونسلے اور ابن آدم کے لئے سر چھپانے کی جگہ ہیں۔"

فیض آباد روڈ سے مڑ کر سروری عرفان اللہ کی کار بادشاہ باغ میں داخل ہوئی۔ یونیورسٹی کا ماحول نت بدل چکا تھا۔ تازہ وارد سندھی پنجابی نہایت اسمارٹ لڑکیاں لیڈیز روم کی چھتوں کے باہر کھڑی ہنس بول ی تھیں۔

چودھری محمد سلطان کی کوٹھی کے سرسبز لان کو پانی دیا جا رہا تھا۔ اور بڑے بڑے السیشن ٹہل رہے ،۔ اس لان پر بچپنے میں میں اور فاطمہ غفار آم کے سائے میں بیٹھ کر پھول اخبار پڑھا کرتے تھے۔

سروری عرفان اللہ نے کار روکی۔ برآمدے میں قاضی عبد الغفار آرام کرسی پر خاموش بیٹھے ،۔ "کیا کرتی پھر رہی ہو؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "شرنارتھیوں کے لئے چندہ۔ بیگم عرفان اللہ نے ٹی بنائی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ چچا عبد الغفار چپ چاپ اٹھے۔ "جو کچھ اس وقت میرے پاس ہے

لے جاؤ۔" انھوں نے کہا۔ اندر گئے۔ رقم لا کر بیگم عرفان اللہ کو دی اور پھر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ چچا عبد الغفار کو میں نے اس روز آخری بار دیکھا[6]۔

وزیر منزل میں بنے بھائی نے مجھ سے کہا۔ "بی بی چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ جو پاس ہے لائے دیتا ہوں۔" اندر گئے۔ رقم لا کر بیگم عرفان اللہ کے حوالے کی۔

کمشنرز ہاؤس میں انیس باجی کے ہاں سوگواروں کا جم غفیر جمع تھا۔ جب سے ان کے شوہر شفیع احمد قدوائی کی ۷ اکتوبر کو مسوری میں شہادت کی اطلاع پہنچی تھیاں کی چھوٹی لڑکی کشور کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ سب آنے جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چھوٹے ماموں انور جمال قدوائی چند روز قبل انڈین ہائی کمیشن کے پبلک ریلشنز افسر کی حیثیت سے لندن جا چکے تھے۔ ممانی شگفتا جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ دہرہ دون والی شگفتا نے یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد ۴۵ء میں جمال سے شادی کر لی تھی جو ان دنوں لکھنؤ میں ہندوستان ٹائمز کے نمائندے تھے۔

شگفتا دلی سے لندن پرواز کرنے والی تھیں۔ جب ہم لوگ انہیں اموسی ایئر فیلڈ پہنچانے گئے آپا رشید جہاں بھی ساتھ تھیں۔ کہنے لگیں میں نے آج تک ہوائی جہاز قریب سے نہیں دیکھا۔ ٹھہرو ذرا دیکھ آؤں۔ سفید غرارہ پہنے گھنگریالے بال' تیز تیز چلتی ڈیکوٹا کے نزدیک پہنچیں۔ اسے دیکھا بھالا اور واپس آگئیں۔ اس روز رشیدہ آپا کو بھی آخری بار دیکھا[7]۔

لال کرتی میں کوچ کی تیاری کی جا رہی تھی۔ راز بھائی ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن جا چکے تھے۔ ہم لوگ حسو باجی کے ہاں جاپلنگ روڈ منتقل ہوئے۔ جو ساز و سامان اپریل ۴۳ء میں نمبر۲۱ فیض آباد روڈ سے لالکرتی بھجوایا گیا تھا چھاؤنی سے حسو باجی کے گھر روانہ کیا گیا۔

حسو باجی کے ہاں ان کی والدہ لیڈی وزیر حسن نے وزیر منزل سے فون کیا' "چھبوجی کی خیریت کی اطلاع ملی؟"

"کراچی پہنچ گئے۔ اماں نے جواب دیا۔"

نمبر۲۱ فیض آباد روڈ پر اکثر صبح سویرے' جان کے کمرے سے ان کے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی' دونوں کے صنم فانی

میں نے تقسیم کے المیے پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ناول بعنوان "میرے بھی صنم خانے" رقم کرنا شروع کیا۔ اور ازابلا تھوبرن کالج کی پرنسپل مس سیرہ چاکو کے نام انگریزی لیکچررشپ کی درخواست بھیجی۔ یک روز یونیورسٹی میں سدھانت صاحب سے ملنے گئی۔ انہوں نے کہا تم نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا۔ میرا یال تھا تم فرسٹ کلاس لاؤ گی۔ میں نے کہا میں نے پڑھا ہی کب تھا۔ بعد میں خیال آتا ہے کہ کود پھاند کر لدی سے ہائی اسکول کر لینے میں ایک نقصان یہ ہوا کہ ایم۔ اے میں پہنچ کر ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کی قل ہی نہیں آئی تھی۔ بہرحال اس وقت سدھانت صاحب نے کہا' "بی۔ ایس۔ سی فرسٹ ایئر کو انگریزی

پڑھاؤ گی؟" میں نے کہا۔ جی ہاں ضرور۔ شعبے سے باہر آئی تو نوٹس بورڈ پر آویزاں نئے طلبہ کی فہرست میں لڈن ماموں کے بڑے لڑکے صہیب کا نام دیکھا۔ بڑا کنفیوژن کا زمانہ تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کون کہاں جانے والا ہے۔ لڈن ماموں ہنوز طہران میں تھے۔

حسو باجی کے پڑوس میں اندر پرستھ کالج دہلی والی شانت لتا بہادر رہتی تھی جس کے والد چند ماہ قبل انکم ٹیکس کمشنر ہو کر لکھنؤ آئے تھے۔ اتوار کی ایک پر سکون صبح بھابی شانت' اس کی بہن آوم اور میں حضرت گنج میں مٹرگشت کر رہے تھے۔ جوں ہی کافی ہاؤس سے نکلے سامنے پریشان صورت امیر خاں کھڑے تھے۔

محکمہ قضا و قدر نے عجیب اور اہم خبریں سنانے کا فریضہ ان بے چارے کو سونپا تھا۔ ۱۱ اپریل ۴۳ء کی رات کے دو بجے ابا جان کے ڈریسنگ روم سے نکل کر روتے ہوئے اطلاع دی تھی۔ "صاحب گجر گئے۔" چند ماہ بعد کالج کے پھاٹک پر کھڑے نظر آئے تھے۔ "بابا کا تار آیا ہے۔ دلی بلایا ہے۔"

اب قریب آکر کہا۔ "بابا کا تار آیا ہے۔ آپ لوگوں کو کراچی بلایا ہے۔" پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

دوسرے روز کراچی سے ایک اور ٹیلی گرام آیا۔ خود لکھنؤ آ رہے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے کے بعد بھائی کچھ عرصہ سے دہلی کے ڈان اخبار میں کام کر رہے تھے۔ پانیر کے سابق اڈیٹر بریگیڈیر ڈیز منڈ ینگ نے جو ان کی انگریزی صحافت کا بہت قائل تھا' کراچی جا چکا تھا' وہاں سے تار دے کر بھائی کو کراچی بلوایا۔ اس وقت تک پاسپورٹ ویزا کا چکر شروع نہیں ہوا تھا۔ ہم لوگ ابھی دہرہ دون میں تھے جب بھابی کو لکھنؤ پہنچا کر بھائی ہوائی جہاز سے کراچی روانہ ہوئے۔ وہاں بریگیڈیر ینگ نے ڈان میں ملازمت کا مشورہ دیا اور کہا۔ ان حالات میں خواتین کا ہندوستان میں تنہا رہنا مخدوش ہے۔ جا کر فوراً لے آؤ۔

دسمبر کے پہلے ہفتہ میں بھائی کراچی سے بذریعہ ہوا دلی اور وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔

کارلٹن ہوٹل میں بھارت ایرویز کا دفتر تھا۔ وہاں سے دہلی کے ٹکٹ خریدے گئے۔

امیر خاں نے روتے روتے کہا' "بابا ہم کو جلدی بلوا لیجئے گا۔" اماں نے ان کو رضیہ آپا کے ہاں وزیر منزل پہنچوایا۔ بنے بھائی بھی پاکستان جا چکے تھے۔ (بعد میں رضیہ آپا نے امیر خاں کے متعلق ایک موثر افسانہ بعنوان "چھتنار" لکھا۔)

فضائی سفر کا پہلا اتفاق تھا لہٰذا باضابطہ حسو باجی کے ہاں ترازو پر پینتیس پینتیس سیر وزن کے کپڑے تولے گئے۔ اموسی ایرفیلڈ پہنچ کر معلوم ہوا کہ طیارہ تقریباً خالی جا رہا تھا۔

اماں اور بھابی ہوائی جہاز کے سفر سے مطلق خوفزدہ نہیں تھیں۔ اطمینان سے بیٹھی رہیں۔ ایر ہوسٹس لڑکیاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ دلی کے راستے میں اسٹیورڈ نے چاء کی کشتی پیش کی۔ اماں نے بھائی سے کہا "ہوائی جہاز میں اسپنسرز زیادہ مہنگی چا کھانا دیتے ہوں گے۔ مت لو۔"

پالم سے کناٹ پلیس تک کا راستہ سنسان اور اندھیرا تھا۔ کناٹ پلیس بھی ویران اور نیم تاریک پڑا تھا۔

نمبر۶ کنگ ایڈورڈ روڈ رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی پناہ گزین مہمانوں سے بھری بڑی کربناک روشن کاروان سرائے معلوم ہو رہی تھی۔ ہم لوگ باغ کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ انیس باجی نے موٹے موٹے لحاف گدے پلنگ پر لگوائے۔ انگیٹھی جلوائی۔ مگر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور دلی کا اندھیرا اور تباہی انتہائی دہشت ناک تھی۔ دوسرے روز رات کو بھائی اپنے ایک صحافی دوست مسٹر شرما کے ساتھ نئی دہلی گھوم کر آئے اور کہنے لگے نئی دہلی وار ٹائم یوروپ کے کسی شہر کی طرح ویران اور برباد معلوم ہوتا ہے۔

شگفتہ قدوائی کی چھوٹی بہن وملا سمال کے ہاں پنڈارا روڈ پر ان کی سب سے بڑی دیدی لاہور سے لٹ لٹا جان بچا کر پہنچی تھیں۔ مردولا سارا بھائی' انیس باجی اور ان کی لڑکی کشور ریفیوجی کیمپوں میں دن رات کام میں مصروف تھیں۔ قرولباغ سے چچا زاہدی مع خاندان پرانا قلعہ اور وہاں سے کراچی جا چکے تھے۔ بھائی نور الدین احمد بلی بھابی' امینہ اور دونوں لڑکوں فرید احمد اور فیروز احمد خاں کو لندن پہنچانے گئے ہوئے تھے۔

تیسرے روز رفیع احمد قدوائی نے ایک سرکاری ڈیکوٹا میں ہم لوگوں کے لاہور جانے کا انتظام کیا۔ اس طیارے میں مردولا سارا بھائی ہندو سکھ مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے پاکستان جا رہی تھیں۔ یہ ڈیکوٹا بھی تقریباً خالی تھا۔ اس میں سوائے مردولا سارا بھائی' تین سرکاری افسروں اور ہم لوگوں کے اور کوئی نہ تھا۔

سہ پہر کا نارنجی وقت تھا جب جالندھر ایئر فیلڈ پر اترے۔ ایئر فیلڈ کیا تھی۔ شرنارتھی اور مہاجر بردار طیاروں کی خاطر چند خیمے لگے تھے۔ ایک بڑا تمبو لیڈیز ویٹنگ روم کا کام دے رہا تھا۔ اس کے برابر میں غسل خانے کی چھولداری تھی۔

ڈیوٹی افسر نے ہم سب کے لئے چائے منگوائی۔ پھر سارے مسافر باری باری غسل خانے ہو آئے۔ میں کہ حسب معمول باتوں میں ازحد مصروف تھی سب سے آخر میں گئی۔ لکھنؤ سے چلتے وقت اماں نے سارا زیور ایک اسکارف میں باندھ کر پوٹلی میرے بیگ میں ٹھونس دی تھی۔

غسل خانے کا فرنیچر دیکھ کر مجھے معاذوروں کا عہد رفتہ یاد آگیا۔ نم گھاس پر رکھی چلمچی والی میز اور پھولدار جگ۔ پی ڈبلیو ڈی ریگولیشن کا سنگھار میز۔ مگر اس وقت اور اس وقت میں کیا عجیب و غریب فرق تھا۔ میں نے کنگھی تلاش کرنے کی جلدی میں سارا بیگ سنگھار میز پر الٹ دیا۔

باہر سے اماں نے پکارا' "چلو جلدی۔" ہوائی جہاز کے انجن نے گڑگڑانا شروع کیا۔ پھر کسی نے آواز دی۔ "ہری اپ۔ ہری اپ۔ پلیز۔"

ہڑبڑا کر ادھ کھلا بیگ اٹھا کر فرانے سے باہر نکلی۔ سب لوگ طیارے میں بیٹھ چکے تھے۔ اسٹیوارڈ

سیڑھی پر کھڑا مجھے بلانے کے لئے زور زور سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے سرپٹ بھاگنا شروع کیا۔

اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے کچھ دیر بعد میں نے بیگ اٹھایا تو دفعتاً بہت ہلکا سا معلوم ہوا۔ گہنوں کی پوٹلی جالندھر ایرفیلڈ کے خیمے کی سنگھار میز پہ رہ گئی۔ میں نے ڈر کے مارے کسی کو نہیں بتایا۔ چپکی بیٹھی رہی۔

طیارہ مشرقی پنجاب کے کھیتوں پر پھیلی سنہری مدھم دھوپ میں لاہور کی سمت پرواز کرتا رہا۔

جلد دوم

فصل دوازدہم

1۔ تار حریر دو رنگ

دسمبر کا مدھم آفتاب بہت جلد اور اچانک غروب ہو جاتا ہے شفق کی روشنی رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو چکی تھی اور لاہور کے نیم تاریک والٹن ایئر فیلڈ کی لہریں مارتی اونچی گھاس' تیز سرد ہوا میں ہرے دریا کی طرح بہہ رہی تھی۔ ہوائی اڈے کا سرمئی سپاٹ میدان سنسان پڑا تھا۔

طیارے سے اتر کر سامان اٹھائے باد مخالف کے تھپیڑے کھاتے ہم چاروں' دور ایک زرد دھبے کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک روشن عمارت قریب آئی۔ اوورکوٹوں اور مفلروں میں ملفوف چند دراز قد آدمی عمارت کی سیڑھیوں پر خاموش کھڑے تھے وہ حکومت مغربی پنجاب کے افسر تھے اور بھارتی سرکاری وفد کو لینے آئے تھے۔

ہم لوگ اندر پہنچے۔ ہال میں مزید اجنبی چہرے نظر آئے۔ اس وقت کسٹمز' پاسپورٹ' ویزا ہر پابندی مفقود تھی' بلکہ ابھی متعارف ہی نہیں ہوئی تھی۔ ہم لوگ پریشان کھڑے تھے کہ والٹن سے شہر کس طرح پہنچیں۔ بھائی سے کسی نے کہا باہر ایک کوچ موجود ہے وہ طیارے کے عملے کو لاہور لے جائے گی۔ اس میں چلے جایئے۔ ایک پٹھان قلی نے ڈیکوٹا سے اسباب لا کر سامنے رکھا۔ ہم چاروں ہال سے نکل چپ چاپ کوچ میں جا بیٹھے۔ یہ سب عجیب غیر حقیقی خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا خواب جو انتہائی سرد رات میں اچانک نظر آئے۔ اس اثناء میں پرچھائیوں کی طرح چلتا انڈین ڈیلی گیشن اپنے پاکستانی میزبانوں کے ساتھ دو طویل موٹروں میں سوار ہوا۔ موٹریں فراٹے سے دھندلکے میں غائب ہو گئیں۔ کافی دیر بعد کوچ کا طویل القامت پٹھان ڈرائیور کمرے میں سے نمودار ہوا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا کلینرز سے باتیں کی انجن اسٹارٹ کیا۔ ہم لوگ صبر سے اپنی سیٹوں پر بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھا کئے جہاں پالا گر رہا تھا۔ ایک دھچکے کے ساتھ کوچ آگے بڑھی اور لاہور جانے والی خاموش سڑک پر آگئی۔

ارے کوئی ویرانی سی ویرانی تھی' آسمان پر گہری دھند چھا چکی تھی۔ کہر آلود شاہراہ پر دونوں جانب گھنے درختوں کے نیچے گدڑی پوش مہاجروں کے کنبے سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے الاؤ سلگتے تھے۔ عارضی چولہوں پر کھانا پک رہا تھا۔ مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے قافلے۔ ہزارہا مہاجر۔ لومڑیوں کے بھٹ ہیں۔ پرندوں کے گھونسلے۔ ابن آدم کے سر چھپانے کو کہیں ٹھکانہ نہیں۔ الوہی۔ الوہی۔ لما سبقتنی۔

ویران' اندھیری مال روڈ پہنچ کر کوچ ایک بلڈنگ کے سامنے رکی۔ ہم لوگ اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ بھائی کچھ دور پیدل جا کر دو تانگے لائے اور سوزنیوں میں سر منہ چھپائے کوچوانوں سے کہا۔

"بھئی سنت نگر کہاں ہے' وہیں چلے چلو۔"

سنت نگر کی گلیوں میں مدھم مدھم مضمحل لیمپ روشن تھے۔ چند مکانوں میں مہاجر آباد ہو چکے تھے۔ باورچی خانوں کا دھواں کہرے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ بھائی نے اوورکوٹ کی جیب سے سید احمد نواب انکم ٹیکس افسر کا پتہ نکالا۔ دونوں تانگے آگے پیچھے ٹخ ٹخ چلتے الن ماموں کے برادر نسبتی آصفہ ممانی کے چھوٹے بھائی کا مکان تلاش کرتے پھرے جنہوں نے بمبئی سے ہجرت کر کے یہاں آنے کے بعد سنت نگر میں مکان الاٹ کروا لیا تھا۔ گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اچانک ایک اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں الن ماموں کی بچیاں نظر آ گئیں جو ملازم کے ساتھ بنیئے کی دوکان سے واپس آ رہی تھیں۔

بھائی احمد نواب کے مکان کا مالک غالباً کوئی آریہ سماجی خاندان تھا۔ ایک کمرے کی الماری میں تین چار انگریزی کتابیں اور کچھ اردو آریہ سماجی لٹریچر رکھا ہوا تھا۔ کلیات آریہ مسافر اور ستیہ رتھ پرکاش وغیرہ۔ ایک انگریزی ناول کے اندر (جو شائد مالک مکان کے فرزند کو انعام میں ملا ہو گا) چسپاں تھا:

دیال سنگھ کالج

نام:۔ ودیا ناتھ سیٹھ

کلاس:۔ فورتھ ائیر

فرسٹ ان میوزک

دستخط:۔ ہنس راج۔ پرنسپل

27۔2۔37

اس کے علاوہ رسالہ "مست قلندر"' "انیسویں صدی" اور "چترا" ویکلی کے متعدد پرچے اور سالنامہ نیرنگ خیال سنہ 26ء تا مغربی آرٹ اور چغتائی کی تصاویر "انگلستان کا جدید ترین تھیٹر" از پطرس۔ "بہشتی" از پریم چند۔ "آسیب الفت (مکمل ناولٹ) از یلدرم۔ "دختر بابل" از محمد دین" تاثیر (سلوی کا ترجمہ) موت کا درخت" از غلام عباس "چارلی چپلن" از دیوان آتم آنند شرد "چچا چھکن" از امتیاز علی تاج۔ مجلس علوم مشرقیہ ہند کے پانچویں اجلاس کی رپورٹ جس میں صدر شعبہ عربی فارسی' ڈاکٹر مسٹر محمد اقبال اور لاہور کے مشہور کتاب فروش گلاب سنگھ عطرچند کپور نے مہمانوں کو مقبرہ جہانگیر میں عصرانہ دیا۔

بھائی احمد نواب اپنے کرن پور دہرہ دون والے خاندان کے مانند ازحد مذہبی اور متقی انسان تھے۔ "اس مکان میں بہت قیمتی سامان موجود تھا۔ سب میں نے بیت المال بھجوا دیا" انہوں نے بتایا۔ مکان واقعی ڈھنڈار پڑا تھا۔

نہ جانے وہ لوگ کون تھے مارے گئے یا زندہ دلی پہنچ گئے اور ودیا ناتھ سیٹھ آج سنہ 1978ء میں جانے کہاں ہوں گے۔

الن ماموں ابھی جوناگڑھ میں تھے۔ آصفہ ممانی معہ بچیوں کے بھائی احمد نواب کے پاس لاہور آگئی تھیں۔ حسنین ماموں فوج کی تقسیم کے بعد نمبر 9 جاٹ رجمنٹ کے ہیڈکوارٹرز میرٹھ چھاؤنی سے نوشہرہ

چھاؤنی پہنچ چکے تھے جہاں کسی زمانے میں ان کے چچا خان بہادر نذر الباقر مرحوم رہا کرتے تھے۔ چندا ممانی مراد آباد سے آگئی تھیں اور لاہور چھاؤنی میں حسنین ماموں کے فیض آباد چھاؤنی والے دوست کرنل الطاف حسین کے ہاں مقیم تھیں۔ وہ کچھ عرصہ قبل ایران سے واپس آئیں تھیں' دوسرے روز وہ بھائی احمد نواب کے ہاں پہنچیں۔ ایرانی چالوس کا نیلا غرارہ پہنے ہمیشہ کی طرح پر سکون سج سج چلتی زینہ طے کر کے دوسری منزل کے صحن میں داخل ہوئیں اور اس اجنبی ماحول میں بہت انوکھی اور تقویت بخش لگیں۔

اماں کی لاہور آمد کی اطلاع پر لوگوں نے آنا شروع کیا۔ امتیاز علی تاج' حجاب بھابی' بھائی حمید علی اور ان کے لڑکے سلیم ممتاز و نسیم ممتاز عرف کرنل و میجر۔ ریڈیو پاکستان کے غلام قادر فرید اور شوکت تھانوی جو امتیاز بھائی کے ساتھ مل کر روزانہ ایک قومی پروگرام پیش کرنے میں مصروف تھے۔ (لکھنؤ میں بچوں کے پروگرام میں شوکت صاحب "چاچا" اور غلام قادر فرید "بدھو" بنا کرتے تھے اور میں ان کی نہایت عقیدت مند چیلی)

ایک شام اماں کی تایا زاد بہن خالہ خورشید زہرا (بنت میر فیض العسکری مرحوم) کے صاحبزادے ضلع جھنگ کے رئیس اعظم تشریف لائے۔ ساڑھے چھ فٹ قد یم تحیم۔ بے حد گھیر کی شلوار اونچے طرے والا صافہ انتہائی زبردست مونچھیں۔ بالکل پنجاب کے دیہات کے متعلق کسی افسانے کا کردار معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ یہ دیو زاد ہمارا کزن تھا۔ اور ایسا قوی ہیکل عظیم الجثہ شخص' اتنا رقیق القلب نکلا۔ آنسو پونچھ پونچھ کر وہ ہم سب سے ملے۔ شاید انہیں یہ تعجب ہو رہا ہو گا کہ یہ نازک اندام لوگ میرے رشتہ دار!

شام کے وقت سارے مہمان اوپر آ کر بالائی منزل کے برآمدے میں بیٹھتے اور فسادات کے دنوں کا تذکرہ اور اپنے اپنے تجربات بیان کرتے۔ سامنے حد نظر تک دھندلکے میں پوشیدہ شہر کی مدھم روشنیاں ٹمٹمایا کرتیں ع۔۔۔۔ یہاں سے شہر کو دیکھو۔

ایک صبح سرد دھوپ میں تیرتے ہم لوگ نمبر7 ریلوے روڈ گئے۔ دار الاشاعت پنجاب کی عمارت کے پھاٹک کے اندر' غلام عباس سامنے ہی نظر آئے۔ گلے میں مفلر لپیٹے وہ تہذیب نسواں کے دفتر سے نکل رہے تھے۔ متانت سے گویا رائٹر نو رائٹر دریافت کیا۔ "آجکل آپ کیا لکھ رہی ہیں"۔

اسی متانت سے جواب دیا۔ "ایک ناول لکھ رہے ہیں میرے بھی صنم خانے"

کہنے لگے۔ "فسادات کی وجہ سے پبلشنگ کا کاروبار معطل پڑا تھا۔ اب حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ ناول مکمل کیجئے میں کسی ناشر سے بات کروں گا"۔

پھاٹک کے اندر وہ عمیق ڈرائنگ روم تھا جہاں بچپن میں میں پیانو پر انگلیاں مارتی تھی اور امتیاز بھائی منع کرتے تھے اور اس سے قبل سنہ 1928ء میں اسی کمرے کے اندر نانا نذر الباقر مرحوم کا پلنگ بچھایا گیا تھا جب وہ آرکیڈیا دہرہ دون سے ڈیرہ اسماعیل خاں اپنے آخری سفر پر جاتے ہوئے یہاں ٹھہرے تھے اور انعام اللہ ماموں مرحوم آدھی رات کو گنڈیریاں خرید کر لائے تھے اور یہیں اسی مکان میں ایک مرتبہ

مجھے وہ عجیب و غریب مرض لاحق ہوا تھا کہ بقول خود حلق نہیں کھلتا تھا اور اسی لاہور کے مومن پورہ قبرستان میں خالو میر افضل علی مرحوم محو خواب تھے۔

ہفتہ بھر بعد بھائی نے ٹرین میں ایک پورا سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ ریزرو کروایا اور ہم کراچی روانہ ہوئے ابھی "برطانوی زمانے" کو گذرے فقط تین مہینے گذرے تھے اور پرانی ریلیں چل رہی تھیں۔ جنوبی پنجاب اور سندھ کے ریگزاروں سے گذرتے ہوئے وسیع و عریض ڈبہ گرد و غبار سے اٹ گیا۔ اماں' بھائی' بھابی اور میں کھڑکیاں بند کر کے پھر باہر دیکھنے لگے۔ دور دور تک جلے ہوئے ٹھنٹھ' تھوہڑ' ناگ پھنی اور کیکر اور ببول۔

ریلوے اسٹیشنوں پر جہازی سائز کی ڈبل روٹیاں اور بڑے بڑے نان ارزاں فروخت کئے جا رہے تھے۔ "یہاں غلے کی افراط ہے" بھائی نے کہا۔۔۔ سندھ کے سنسان پلیٹ فارم' اکا دکا سندھی ہندو سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس کھڑا نظر آ جاتا۔ حیدر آباد سندھ کے قریب ٹرین پہنچی' مکانوں پر لگے بادگیروں کا جنگل سا اگا نظر آیا۔ کراچی کے نزدیک ڈرگ روڈ پر کھپریل کی چھتوں' ہری جافریوں اور سرمئی اینٹوں والی دو منزلہ کوٹھیوں کی قطاریں' میب ہینگر جو جرمن طیارے زپلن کے لئے بنایا گیا تھا۔

طویل گرد آلود ٹرین ریلوے اسٹیشن میکلوڈ روڈ پر پہنچی۔ باہر آ کر بھائی نے دو وکٹوریہ گاڑیاں کیں۔ دفعتاً اماں نے کہا۔ "سنہ 29ء میں دو تین مرتبہ اسی ریلوے اسٹیشن پر اترے تھے۔ ہم لوگ بغداد جاتے ہوئے۔۔۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا' نجانے کس زمانے کی بات کر رہی تھیں۔

طویل میکلوڈ روڈ پر جنرل پوسٹ آفس کے آگے گلابی رنگ کی ایک چھ منزلہ عمارت کے پہلو کی دیوار پر جلی حروف میں "گرینڈ ہوٹل" لکھا نظر آیا۔ سڑک کے رخ رہائشی فلیٹوں کی کھڑکیاں۔ عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر بھائی نے گاڑیاں رکوائیں۔ تیسری منزل پر جا کر فلیٹ نمبر9 میوچل بلڈنگ کے دروازے کا تالہ کھولا۔ وکٹوریہ گاڑیوں کے حبشی نژاد مکرانی کوچوانوں نے اسباب اوپر پہنچایا۔ ہم لوگ فلیٹ میں داخل ہوئے۔ زرد ٹائیلوں والی پتلی سی گیلری' تین مختصر کمرے' گیلری کے سرے پر دو غسل خانے' بیرونی کمرے میں ایک ٹرنک پر بیٹھ کر بھابی نے اپنے بالوں کی گرد جھاڑی۔ اماں نے روز مرہ کے استعمال کے لئے جو برتن بھانڈے لاہور سے خریدے تھے ان کا بکس کھولا۔

ہم لوگ یو۔ پی کے مہاجر تھے۔

لکھنؤ جانے سے قبل بھائی نے ٹیلی فون لگوا لیا تھا۔ دوسرے روز صبح سے مانوس چہرے نظر آنے شروع ہو گئے۔

"چھبو میاں!" ایک رشتے دار نے تعجب سے کہا۔ "آجکل کراچی کے ہندو اپنی ایک سے ایک نفیس کوٹھیاں اور بڑھیا فلیٹ چھوڑ کر بمبئی جا رہے ہیں۔ آپ کو یہی فلیٹ دستیاب ہوا؟"

"بس ہم جب لکھنؤ سے یہاں آئے تو جو جگہ آسانی سے فوراً مل گئی وہی لے لی۔ اب کون

دوسرے مکان کے لئے دوڑ بھاگ کرتا پھرے"۔ بھائی نے ہمیشہ کی طرح استغنے کے ساتھ جواب دیا۔ کہ درویشی اباجان سے ورثے میں ملی تھی۔ جلدی جلدی چاء پینے کے بعد وہ ڈان کے دفتر روانہ ہو گئے۔

"اماں!" بھابی نے کہا۔ "لحاف بستر بھی تو نہیں ہیں۔"

"آ جائیں گے" اماں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مظہر کو فون کرو۔ اب تک ہمارا اسباب سیالکوٹ سے آگیا ہو گا۔ حاضر بھائی بے چارے نے دہرہ دون میں صحیح رائے دی تھی کہ نجانے کب فورا پاکستان جانا پڑ جائے کچھ سامان سیالکوٹ بھجوا دو۔۔" پھر رشتے دار سے مخاطب ہو کر دہرایا۔ (بے سروسامانی کی وضاحت کے لئے وہ یہ تفصیل ہر آنے جانے والے کو بتاتی تھیں) "میاں ہم تو ہوائی جہاز سے آئے۔ صرف پہننے کے چند کپڑے ہی لا سکے۔ اگست کے مہینے میں ہم نے آشیانے کے گودام سے کچھ چیزیں نکال کر حاضر بھائی کے سامان کے ساتھ دہرہ دون سے سیالکوٹ روانہ کر دی تھیں۔ دلہن مظہر کو فون کیا؟"

"اماں۔ آج کرسمس اور قائداعظم کی سالگرہ کی چھٹی ہے۔ حاضر صاحب کا دفتر بند ہو گا۔ ان کے گھر کا فون نمبر مجھے معلوم نہیں۔"

موصوف ایک مارکسٹ جرنلسٹ تھے اور دلی سے آکر کھماڑی کی ایک عمارت میں اپنے ایک صحافی دوست احمد کے ساتھ مقیم تھے جو بھوپال سے آئے تھے۔

انہوں نے چند سکے اور نوٹ جیب سے نکال کر کہا "پاکستانی کرنسی آگئی ہے میں نے بس میں دیکھا مہاجر سکوں کو چوم کر آنکھوں سے لگا رہے تھے"۔

بھائی احمد نواب نے وظیفہ ختم کرنے کے بعد فورا بڑی عقیدت سے دو سکے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے۔

6 جنوری کے فساد کے دوسرے روز اماں کی ایک پرانی شناسا خاتون تشریف لائیں۔ "بہن۔" انہوں نے بیٹھتے ہی کہا۔ "چلیے کلفٹن یا جمشید روڈ پر آپ کو جس ہندو کی کوٹھی پسند آئے دلوا دوں۔ آپ اس معمولی فلیٹ میں کیوں پڑی ہیں۔ غضب خدا کا آپ بھی تو انڈیا میں اپنی تین کوٹھیاں چھوڑ کر آئی ہیں۔ دہرہ دون' مراد آباد' گورداسپور۔ تین تین کوٹھیاں"۔

اماں نے جواب دیا "آپ کیا چاہتی ہیں میں کسی ہندو کو نکلوا کر اس کے گھر پہ قابض ہو جاؤں؟"

"بہن۔" خاتون نے فورا کھڑے ہوتے ہوئے کہا"۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا' اور اگر آپ کی عقلوں کا یہ عالم رہا تو پھر پنپ چکے آپ لوگ"۔

زینے پر ان کی مڈبھیڑ ایوب بھائی سے ہو گئی۔ وہ اندر آکر کہنے لگے "یہ یہاں بھی پہنچ گئیں؟ ہر نومولود بورژوا معاشرہ اسی قسم کے کرپٹ موقع پرست لیڈر پیدا کرتا ہے۔" ایوب احمد کرمانی پاکستانی لیفٹ ونگ کی اولین آوازوں میں سے تھے۔

"ایوب بھائی۔ آپ ہر چیز کا منفی پہلو ہی دیکھتے ہیں۔ شروع شروع کی بات ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بھائی احمد نواب نے مصلے پر بیٹھے ہوئے کہا۔ "جب امریکہ آزاد ہوا ہے وہاں بھی یہی

سب ہوتا تھا۔"

30 جنوری کے روز بھائی احمد نواب بے حد گھبرائے ہوئے گھر آئے اور کہا "گاندھی جی قتل کر دیئے گئے۔ عجیب ٹرینڈ ہیں۔ عجیب ٹرینڈ ہیں۔

بھائی نے فورا ریڈیو پر دہلی لگایا جہاں سے رام دھن نشر کی جا رہی تھی۔ اسی روز بھائی اور ایوب بھائی اپنے اپنے اخباروں کے دفتروں میں بے حد مصروف رہے۔ رات گئے وہ دونوں گھر پہنچے۔ ایوب بھائی نے کہا۔ "ہائی کورٹ کے سامنے چوک میں گاندھی جی کا مجسمہ کھڑا ہے۔ اخباروں میں روز مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ ابھی میں وہاں سے گذرا۔ چوک میں بالکل سناٹا تھا۔ مجسمے کو کسی نے گیندے کا ہار پہنا دیا تھا"۔

ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے اکثر اعزہ فلیٹ نمبر 9 میں آکر ٹکتے۔ رات گئے تک چاء کا دور چلتا۔ بالکل پکنک کا سا ماحول تھا۔ ایک روز ملاقاتی نے اماں سے کہا "چھبو میاں آجکل کیا کر رہے ہیں؟ اور اس فلیٹ میں۔۔۔؟ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے' اور سجاد حیدر صاحب مرحوم تو برسہا برس کے قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خاں اور ساری لیگ لیڈر شپ کے اتنے قریبی دوست تھے اور خود انہوں نے مدتوں اپنی لگن اور خلوص سے لیگ کے لئے ذہنی کام کیا۔ چھبو میاں کو چاہیئے کہ جلد از جلد قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خاں سے ملیں اور ان کو بتائیں کہ وہ کس کے بیٹے ہیں اور اپنے لئے بڑھیا ملازمت اور عمدہ مکان حاصل کریں"۔

اماں نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ "نہ ان کے باپ کی یہ عادت تھی کہ سفارشیں حاصل کریں۔ لوگ ان کی سفارش حاصل کرنے آتے تھے۔ اور نہ بیٹے کی یہ عادت ہے۔ جیسا کچھ ہے ٹھیک ہے"۔

ایک صبح میں اور بھابی حسب معمول ذرا ہوا خوری کے لئے بالکنی میں کھڑے تھے جب نیچے فٹ پاتھوں پر بڑی خلقت جمع ہوئی نظر آئی۔ موٹر سائیکل سوار دستہ ٹریفک کے بندوبست میں مشغول تھا۔ ایک انگریز نے پیدل سڑک کراس کرنا چاہی' سب انسپکٹر پولیس نے ڈپٹ کر اس سے کہا۔ "واپس جاؤ وہاں کھڑے ہو جاؤ۔ جہاں سب کھڑے ہیں"۔

"کیا بات ہے؟" انگریز نے پوچھا۔

"قائداعظم گذرنے والے ہیں"۔

"او کائیڈ آزم۔ ویری ویل"۔

چند منٹ بعد ایک طویل کھلی کار سڑک پر سے گذری اس میں شاہ جارج ششم کے چھوٹے بھائی ڈیوک آف گلوسسٹر کے ساتھ قائداعظم تشریف فرما تھے۔ انہوں نے گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

سات سال قبل جب وکٹوریہ ٹرمینس بمبئی کے پلیٹ فارم پر قائداعظم اباجان کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ تب بھی گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس وقت اور اس وقت کے درمیان بہت بڑا فاصلہ تھا۔

2۔ سلسلۂ روز و شب

رات کے سنسناتے سناٹے میں فلیٹ کے پچھواڑے کچھ دور سے ریلوے انجنوں کی چھک چھک اور سائیں سائیں کی آوازیں آتیں اور غسل خانے کی کھڑکی میں سے ریلوے یارڈ کی نیلی سرد روشنیاں بہت پراسرار معلوم ہوتی تھیں۔ نیچے شفاف سرمئی میکلوڈ روڈ پر سے خوش باش سیاہ فام حبشی نژاد مکرانی عورتیں اور مرد گدھا گاڑیوں پر سوار دف بجاتے اور ثریا اور شمشاد بیگم کے تازہ فلمی گیت اور غزلیں الاپتے گذرا کرتے۔ صبح منہ اندھیرے سے گدھے' اونٹ اور وکٹوریہ گاڑیوں اور موٹروں کا ٹریفک جاری ہو جاتا۔ دن بھر فون کی گھنٹی بار بار بجتی اور مختلف رشتے دار اپنی آمد کی اطلاع دیتے اور جائے قیام کے پتے بتاتے۔ جیکب لائنز' لارنس روڈ۔ انٹیلی جنس اسکول' مارٹن روڈ' پیرالٰہی بخش کالونی۔ یہ سرکاری کوارٹرز دوران جنگ میں تعمیر کیے گئے تھے اور ان میں مہاجرین کی ایک رنگا رنگ دنیا آباد ہو رہی تھی۔ لیکن سرکاری گیسٹ ہاؤس بلوچ میس میں جہاں بھائی لقمان حیدر (جو ریزرو بنک آف انڈیا کلکتہ سے اسٹیٹ بنک آف پاکستان آ گئے تھے) مقیم تھے' پکا برٹش ماحول باقی تھا۔ لقمان بھائی کی اماں سے بہت گہری چھنتی تھی۔ دونوں دو سروں سے ذرا مختلف ذہنوں اور مزاجوں کے مالک اور GRACIOUS LIVING کو بہت اہمیت دینے والے لوگوں میں سے تھے۔ جس شام لقمان بھائی اماں کو بلوچ میس ڈنر پر لے گئے وہ کافی برسوں بعد خود کو اپنی سابقہ طرز رہائش والے ماحول میں پا کر یک لخت بہت مطمئن نظر آئیں۔ انسان بڑی مشکل سے خود کو ڈی کلاس کر پاتا ہے۔

تقسیم طبقاتی خطوط پر ہوئی تھی۔ انڈیا و پاکستان کے فوجی میس' کلب' پوش تعلیمی ادارے' فوج' ایڈمنسٹریشن سب انگریز کے بنائے ہوئے تھے اور قطعاً یکساں تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی سے آ کر بھائی اطاعت حسین' جوائنٹ سیکرٹری' وزارت امور خارجہ' فریر روڈ کراچی کی ایک دو منزلہ کوٹھی میں مقیم تھے۔ ان کے بچے سینٹ کولمبائی دہلی سے آ کر سینٹ پیٹرک کراچی میں داخل ہو چکے تھے۔ جو کانونٹ اور انگلش پبلک اسکول انڈیا میں تھے۔ انہی کی شاخیں پاکستان میں موجود تھیں۔ دونوں ملکوں میں ان اداروں کی عمارتوں میں شاہ جارج ششم کا پورٹریٹ اتار کر اس کی جگہ گاندھی جی' پنڈت نہرو' قائد اعظم جناح اور لیاقت علیخاں کی تصویریں لگا دی گئی تھیں اور آزادی کس طرح حاصل کی گئی اس کے دو مختلف ورژن دونوں ملکوں کے اسکولوں میں بطور اسباق پڑھائے جا رہے تھے۔

نہٹوری اور مراد آبادی رشتے داروں کو جو سرکاری ملازم تھے سرکاری کوارٹرز اور کوٹھیاں مل گئی تھیں۔ چار ورقی خاندانی خبرنامہ "مرقع نہٹور" جو حاجی خلیل احمد بانی ایک آنہ فنڈ لکھنؤ برسوں سے لکھنؤ سے شائع کرتے تھے اب کراچی سے چھپنا شروع ہو گیا تھا۔ اس میں ان سیکڑوں اراکین برادری سادات نہٹور کے متعلق اطلاعات درج ہوتیں جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مغربی اور مشرقی پاکستان میں آباد ہو رہے تھے (اور کسی کو اس وقت سان و گمان نہ تھا کہ 23 سال بعد مشرقی پاکستان سے ایک اور اندوہناک ہجرت کریں

گے) ان رشتے داروں میں سابق زمیندار اور جاگیردار صاحب بہادر' مولوی' عالم دین' اعلیٰ افسر' معمولی کلرک' امیر' غریب سبھی شامل تھے اور سب ایک دوسرے کی خیر خبر کے جویا اور ایک دوسرے کے متلاشی تھے۔ اور کراچی میں مہینے میں ایک آدھ بار سب ایک دوسرے کے گھروں میں مل بیٹھتے تھے۔

نہٹور کے تیاگی برہمنوں کی روایت کے مطابق ان کے پرکھوں نے مسلمانوں کی آمد سے قبل راجپوت خانہ جنگیوں کے دوران راجستھان میں اپنا گاؤں تیاگ کر دہلی کے قریب گاگن کے کنارے نیا نہٹور بسایا تھا جو رفتہ رفتہ نہٹور کہلانے لگا۔ سنہ 1947ء کی ہندوستانی خانہ جنگی میں نہٹور تیاگ کر پاکستان جو لوگ پہنچے وہ گویا ے فلادر کے پلگرم فادرز میں شامل تھے۔ اور اب یہاں بھی ایک "فرنٹیر اسپرٹ" اور "پائنیر اسپرٹ" پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں باہر نکل رہی تھیں۔ سابق زمیندار تجارت شروع کر رہے تھے۔ نوجوان نئے نئے علوم و فنون کی تربیت حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔

پاکستان آئے ہوئے نہٹوری عزیز نہایت متنوع قسم کے لوگ تھے۔ بھائی مطلوب حسین جو سادات نہٹور کے اولین شوقیہ پائلٹ تھے۔ عرصے سے قائد اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے تھے اور اب مسٹر مطلوب۔ ایچ سید کہلاتے تھے۔ بھائی محمد جمیل اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کے والد ماجد حاجی محمد خلیل' حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی" کے مرید' مولانا حسین احمد مدنی کے عقیدت مند اور اپنے عہد کے بیشتر عظیم ترین علماء و مشائخ سے وابستہ رہے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب نہایت قابل قدر ہستی تھے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی برٹش انڈیا میں ان کے بیٹے سید محمد جمیل آڈٹ آف اکاؤنٹس کے انٹرویو کے لیے جانے لگے' ان کے معاشی حالات اس وقت ایسے تھے کہ ملازمت کی ان کو اشد ضرورت تھی۔ لوگوں نے کہا میاں جمیل کی داڑھی انتخاب میں حارج ہو گی۔ حاجی محمد خلیل نے فرمایا "رزاق خدا ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ میں ایک عہدے کے حصول کے لئے اجازت نہیں دے سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی جائے"[1]

بھائی جمیل مع داڑھی نمایاں طریقے سے کامیاب ہو گئے۔ چچا محمد خلیل نے نہٹور اور لکھنؤ میں کئی دینی مدرسے قائم کئے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اب وہ ڈھاکہ اور کراچی میں پیدل گھوم کر اسلامی مدارس کھولتے پھر رہے تھے اور گھوڑا گلی سے مری تک پیدل جاتے تھے۔

یہ غالباً ایک THROW BACK تھا۔ قرون وسطیٰ کے اللہ والے اور کمال الدین ترمذی" اسی قطع کے بزرگ رہے ہوں گے۔ جو "فقیر کو تائید ایزدی کافی ہے" کہہ کر پاپیادہ ملکوں ملکوں گھومتے تبلیغ دین مبین کرتے پھرتے تھے۔

مذہبی راسخ العقیدگی' لباس' وضع قطع' اور طرز زندگی میں کسی نوع کی تبدیلی سے اجتناب کر کے قائم رکھی جاتی ہے۔ رومن کیتھولک' گریک اور تھوڈوکس اور سیرین کلیساؤں کے پادریوں اور راہبوں اور عالم اسلام کے علماء کی عبا قبا میں صدیوں سے ذرہ برابر فرق پیدا نہیں ہوا۔ حاجی محمد خلیل کے فرزند بھائی جمیل اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان بھی باریش اور زبردست مبلغ اسلام تھے۔ جب اماں سے ملنے فلیٹ نمبر 9 آتے

وہ ان کی مولویت اور داڑھی پر خوب چوٹیں کرتیں۔ نہایت مفرح دل و دماغ مناظرہ ہوتا جس میں بھائی دونوں طرف سے شامل ہو جاتے۔ بھائی اور اماں دونوں شدید قسم کے سینس آف ہیومر کے مالک۔ اوپر سے اگر ایوب بھائی آجائیں تو سونے پر سہاگہ۔

ایک اتوار کو بھائی جمیل آکر ایک صندوق پر بیٹھے۔ ایوب بھائی بالکنی کے دروازے میں براجمان تھے۔ بھائی اماں کے پلنگ کے کنارے پر بیٹھے نیگرو پریس آف امریکہ کے لئے ڈسپیچ ٹائپ کر رہے تھے۔ ٹائپ رائٹر اماں کی دواؤں کی میز پر رکھا تھا۔ کیمپنگ کا سا سماں تھا میں کچھ نہ کرنے میں مصروف تھی۔

اماں نے کہا۔ "پنڈی سے یہ ہولناک اطلاع آئی ہے کہ جری میاں نے بھی داڑھی رکھ لی"۔

"سنا ہے بھائی جری اٹلی سے ارسطو کا ایک نادر مجسمہ لائے ہیں۔ وہ ڈرائنگ روم کے آتشدان پر رکھا ہے دانتے اور ابن تیمیہ دونوں کو اور بیجنل میں پڑھتے ہیں۔ کیا عالم ہوگا"۔ میں نے کہا۔

"مغربی دانشور کنز کیتھولک ہو سکتا ہے۔ ہندو انٹلکچوئیل ویدانتی ہو سکتا ہے۔ مسلمان انٹلکچوئیل کنز مسلمان ہو جائے تو آپ کو اعتراض ہے۔" بھائی نے فوراً آپا حمن کے شوہر جری احمد سید کی حمایت میں کہا۔

"جماعت اسلامی کی انٹلکچوئیلزم ہمیں تو بہت بعض دفعہ بہت اپیل کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ میں ان دنوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بہت پڑھ رہی تھی۔

"انتہا پسندی ہمیشہ پرکشش ہوتی ہے۔ مزید براں اقبال" کا ایک پہلو ہمیشہ آپ کو جماعت اسلامی کی طرف لے جائے گا۔۔ مجھے ہے حکم اذاں۔۔۔ لا الہ الا اللہ۔" ایوب بھائی بولے۔

"ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام۔ ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز۔" میں نے کہا۔ "لایئے 'ز' کا"۔

"زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی"۔ بھائی نے نیگرو پریس آف امریکہ ملتوی کرکے ارشاد کیا۔ بیت بازی شروع ہو گئی۔ بہت جلد ' ائی نون سیریس ہو کر فاؤل پر اتر آئے۔ چپکے چپکے وہ پلنگ کے نیچے جھک کر کچھ دیکھتے جا رہے تھے۔

"میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے۔ یہ جہاں میرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی"۔

ایوب بھائی نہایت سنجیدگی سے بولے۔ "لایئے 'ی' کا۔"

"یگر نہ دوڑ دو گر نہ دوڑو۔ انھو گر نہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔" بھائی نے کہا۔ بھائی نے فوراً جھک کر پلنگ کے نیچے سے ہمایوں کا پرچہ نکالا۔

"میں اندر آسکتی ہوں۔" دروازے کے باہر سے ایک لنک دار آواز آئی۔ معمولی شکل و صورت کی ایک نوجوان لڑکی گیلری میں داخل ہوئی۔ "میں ذرا ایک فون کر لوں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں ضرور۔" بھائی نے کہا۔ اماں چیں بجبیں ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ وہ لڑکی

دوسرے کمرے میں جا کر فون پر بہت دیر تک زور زور سے باتیں کیا کی۔ اماں اور بھابی دونوں ناخوش و بیزار نظر آئیں۔

یہ عمارت ایک ایسی کارواں سرائے تھی جس میں بھارت سے بھانت بھانت کے لوگ آکر اتر رہے تھے۔ یہ خاتون ایک نامور ترقی پسند ادیب کی بنائی ہوئی فلم کی ہیروئن تھیں۔ فلم فلاپ گئی۔ یہ خود بمبئی سے یہاں آگئی تھیں۔ دو تین بار فون کرنے آچکی تھیں۔ اماں ایکٹرسوں سے میل جول کے معاملے میں انتہائی قدامت پرست واقع ہوئی تھیں اور اس کی آمد و رفت ناپسند کرتی تھیں۔

چند منٹ بعد وہ لڑکی کمرے سے نکل کر بسرعت' سرائے کے باہر چلی گئی۔

کنٹربری کے دو اور پلگرم فلیٹ میں داخل ہوئے۔ احمد حسن اور فیروز جبیں۔ فیروز جبیں میوچل بلڈنگ سے ملحق گرینڈ ہوٹل میں مقیم تھیں۔ ان دونوں نے سنہ 47ء میں لکھنؤ سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ احمد حسن کراچی کے ایک انگریزی اخبار میں کام کر رہے تھے۔ فیروز جبیں علی گڑھ سے آئی تھیں۔ ارادہ تھا کہ کراچی میں جرنلزم کریں گی۔ دونوں بے حد لفٹ ونگ تھے۔ بھائی جمیل سے ایک اور بحث شروع ہو گئی۔

فیروز نے چپکے سے مجھ سے کہا "میں تو علی گڑھ واپس جا رہی ہوں۔ وہاں سے لندن چلی جاؤں گی اور شاید کبھی اس سب کونٹینٹ واپس نہ آؤں۔" (فیروز نے ایسا ہی کیا اور آج تک لندن میں موجود ہیں)۔

احمد حسن اور فیروز جانے کے لئے اٹھے۔ دروازے میں شائستہ اختر سہروردی نمودار ہوئیں۔ شائستہ اختر سہروردی کے شوہر اکرام اللہ فارن سیکرٹری تھے۔ وہ کلفٹن پر رہتی تھیں۔ وہ ایک عجیب باوضع خاتون تھیں۔ دیکھنے میں موڈرن۔ اندر سے قدامت پرست۔ آدھی عمر مغرب میں گذاری تھی۔ لندن یونیورسٹی سے سنہ 40ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا اور ایک بار کیکسٹن ہال لندن میں اردو ادب پر تقریر کرتے ہوئے بہت دیر تک اماں کے ناولوں پر روشنی ڈالی تھی۔ ان کی پھوپھی خجستہ اختر سہروردی کے بیٹے حسین شہید سہروردی اب ملک کے مشہور سیاست داں اور تقسیم سے قبل بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے تھے۔ ان کی قانون پڑھنے کے لئے ولایت روانگی کی اطلاع ان کی والدہ خجستہ اختر سہروردی[1] نے سنہ 1914ء میں اماں کو دی تھی۔ وقت پلک جھپکتے میں کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ شائستہ آپا اپنے سہروردی خاندان کی پرانی بیبیوں کی تمدنی اور اخلاقی روایات کی بے حد قدردان تھیں۔ اقوام متحدہ نیویارک میں پاکستان کی نمائندگی کرتی تھیں۔ (بعد میں وہ کئی ممالک میں اپنے ملک کی سفیر رہیں اور ان کی ایک لڑکی کی شادی جورڈن کے کراؤن پرنس سے ہوئی۔) سنہ 48ء کے ان اولین دنوں ہی سے "بیگمات" کا ایک مدمغ طبقہ وجود میں آچکا تھا۔ شائستہ آپا اس گروہ سے نالاں اور اس میں شامل نہیں تھیں۔

شائستہ اکرام اللہ بھی ایک صندوق پر بیٹھ گئیں۔ بھابی نے مزید چائے بنائی۔ محفل جاری رہی۔

یہ محافل فلیٹ نمبر9 کے معمولات میں شامل تھیں۔ مولانا رازق الخیری' شاہد احمد دہلوی' صہبا شاہین' ممتاز شیریں' سحاب قزلباش' قدرت اللہ شہاب' غلام عباس' سب آکر اسی طرح بکسوں اور اسٹولوں

پر بیٹھ جاتے اور اماں اسی بے سروسامانی کے عالم میں مجلس آرائی کرتیں۔

قدرت اللہ شہاب جموں کے باشندے تھے اور انڈین سول سروس کے بہار کاڈر سے پاکستان آئے تھے۔ چند برس سے افسانے لکھ رہے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنا ناول "یا خدا" اماں کو پیش کیا اور بتایا کہ پہلے اس کا نام "تین خدا" رکھا تھا۔ مولویوں کے ڈر سے بدل دیا۔

ابا جان کے زمانے کے علی گڑھ یونیورسٹی والے جلیل احمد قدوائی (جو اب محکمہ اطلاعات و نشریات میں انفارمیشن افسر تھے) دہلی سے آکر فی الحال گرینڈ ہوٹل میں مقیم تھے۔

"سید حمید علی لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ کہنے لگیں۔ پھوپھی نذر نچلی منزل میں ہیں۔ آپ لوگ بھی چلئے۔ جلیل صاحب کی تو وہ ماں کی جگہ تھیں میرے لئے البتہ ایک مصنفہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہم کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ کیا نام ہے آپکا؟ جب تک میں نام بتاؤں دوسرا سوال۔ کس کی بیٹی ہو؟ ابھی پہلا جواب نہ دے سکی تھی دوسرے کا کیسے دیتی۔ اتنے میں تیسرا سوال کرنا لا' میں دماغ کو حاضر کر کے سلسلے وار جواب دینے پر آمادہ ہو گئی۔ مگر میں ست رفتار اور وہ برق رفتار۔ میرا ان کا کیا مقابلہ..... اس ملاقات کے بعد سے پھر میں ان سے مل کر نہ گھبرائی بلکہ ان کی تیز تیز مگر میٹھی میٹھی لچھے دار باتوں کی کچھ چاٹ سی پڑ گئی..... وہ حسب عادت تیزی سے موضوع بدل دیتی تھیں [3]۔"

ریڈیو پاکستان کے رسالے آہنگ کے ایڈیٹر ہو کر غلام عباس لاہور سے آچکے تھے۔ ایک دن وہ "میرے بھی صنم خانے" کا مسودہ لے گئے اور حسب وعدہ اسے لاہور ناشر کے پاس بھجوا دیا۔ بعد کچھ عرصے کے مبلغ ایک ہزار روپے کا چیک بطور معاوضہ دائمی حقوق مکتبہ جدید لاہور موصول ہوا جسے میں نے بوجہ حمق بخوشی قبول کیا۔

ایک دن بھائی ایوب احمد کرمانی نے آکر اماں سے کہا۔ "یہاں ایک نفیس پر فضا جگہ ہے گجراتی کولونی۔ عامل کولونی جمشید روڈ کی طرف۔ وہاں ایک کوٹھی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس میں کراچی مسلم لیگ کا دفتر تھا وہ کہیں اور منتقل ہو رہا ہے۔ فی الحال وہ کوٹھی دفتر کے نام پر الاٹ رہے گی۔ پھر اپنے نام کروا لیجئے گا"۔

بھائی اس اثناء میں ڈان کی ملازمت ترک کر چکے تھے اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اور نیگرو پریس آف کی نمائندگی اور کراچی یونین آف جرنلسٹس کے مشاغل میں منہمک تھے۔ کہنے لگے۔ "جی ہاں۔ اور معلوم اس میں کیا شاخسانے نکلیں اور یہ فلیٹ بھی ہاتھ سے جائے"۔

"یہ فلیٹ مقفل رکھیے"۔ ایوب بھائی نے کہا۔

بھائی اس قسم کے معاملات سے بہت گھبراتے تھے۔ رشتہ داروں کے سمجھانے بجھانے پر نقل مکان کے لئے بہت بے دلی سے آمادہ ہوئے۔ اب ہم لوگ ڈانڈا ڈولا اٹھا کر جمشید روڈ پہنچے۔

گجراتی کولونی کی وہ کوٹھی دولت مند سندھی ہندوؤں کے مخصوص طرز آرائش سے مزین تھی۔ دروازوں میں رنگ برنگے شیشے۔ نقشیں الماریوں میں قد آدم آئینے۔ فرش پر پھولدار ٹائیل۔ سنگلاخ

دیواروں پر بیل بوٹے۔ کھڑکیوں میں مضبوط سلاخیں۔ باہر مرصع چبوترہ۔ وسیع و عریض ہال۔ اگست سنہ 47ء تک اس مکان میں گجراتیوں کا کلب گھر تھا۔ احاطے میں پھلوں کے درخت سرسرا رہے تھے اور روہتک کا مہاجر مالی ہزارے سے کیاریاں سینچ رہا تھا۔ پھاٹک کے سامنے لکشمی نارائن کا مندر تھا جو 6 جنوری کے فساد اور ہندوؤں کے انخلاء کے بعد سے مقفل پڑا تھا اور اس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ مندر کی دوسری جانب ایک دو منزلہ سرکاری کوٹھی کی نچلی منزل میں بڑی اماں و بیگم اعجاز حیدر' ان کی بیٹی اور داماد' آپا صدیقہ بھائی احمد رشید دہلوی اور ان کے بچے کلکتے سے آکر آباد ہو چکے تھے۔

نئے مکان میں پہنچ کر میں نے خوشی کے مارے فوراً مالی سے جھاڑو لی اور پھلواری کی صفائی شروع کر دی۔ دو تین دن تک خوب گرد پھانکی۔ چوتھے روز بخار آیا۔ بعارضہ ٹائیفائیڈ صاحب فراش ہوئی۔

الن ماموں بہاء الدین کالج جوناگڑھ سے مستعفی ہو کر کراچی آچکے تھے۔ ایک روز وہ خبر لائے۔

"میں میکلوڈ روڈ کے فلیٹ گیا تھا۔ وہاں دروازے کے باہر تمہارے نام کا ایک سرکاری لفافہ منسٹری آف فارن افیرز کا جانے کب کا آیا پڑا تھا۔ میں نے فوراً کھول کر دیکھا۔ تمہیں ایک انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔ تاریخ نکل گئی"۔

"فارن سروس میں تو لڑکیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ کاہے کے لئے بلایا تھا؟" میں نے بے پرواہی سے پوچھا۔

ملازم سیاہ بکرا لئے کمرے میں داخل ہوا جو اماں نے صدقے کے لئے منگوایا تھا۔ بکرا زور سے چلایا۔ الن ماموں نے فوراً کوئی دعا پڑھی اور بولے۔ "اچھا پہلے بکرے کے سر پر ہاتھ پھیر دو"۔

میں نے بکرے کے سر پر باضابطہ ہاتھ پھیرا۔

"ممکن ہے چودھری ظفر اللہ نے بلایا ہو"۔ الن ماموں نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے بکرے نے منقطع کیا تھا۔

"بھائی ظفر اللہ پردے کے حامی اور لڑکیوں کی ملازمت کے خلاف ہیں وہ کیوں بلانے لگے"۔ اماں نے کہا۔

"باجی۔ بکرے کو سات دفعہ مریض کے پلنگ کے گرد پھرانا بھی ضروری ہے"۔ الن ماموں بولے اور بکرے کو چکر دلوانے میں مصروف ہو گئے۔ اس نے پھر فریاد کی۔

"یہ خط کیا مسٹری ہے فون کر کے معلوم کرنا چاہیئے۔ بیگم لیاقت علیخاں امریکہ جا رہی ہیں۔ سنا ہے ساتھ لے جانے کے لئے ایک پی۔ آر۔ او لڑکی چاہیئے تھی"۔ الن ماموں نے بکرے کو طواف کرواتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"گول کیجئے"۔ میں نے کروٹ بدل کر کہا۔ فوراً اسی وقت غور کیا تو پتہ چلا کہ طبیعت میں ایک نوع کی بے نیازی اور قناعت پسندی آتی جا رہی ہے۔ الن ماموں تشویش سے بولے۔ "لیکن معلوم تو کر لیں کیا حرج ہے"۔

اتنے میں ایوب بھائی وارد ہوئے۔ الن ماموں نے انٹرویو کے بلاوے کے متعلق انہیں بتلایا۔ کہنے لگے۔ "ارے پی۔ آر۔ اووہ تو مقرر کرلی گئی۔ خوجہ لڑکی۔ مس حاجی"۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا گول کیجئے"۔ میں اطمینان سے بولی۔

ایوب بھائی ایک پریشان کن اطلاع لے کر آئے تھے۔ "یہ مکان"۔ انہوں نے اماں سے کہا۔ "متروکہ جائیداد نہیں ہے۔ اس کا مالک کسٹوڈین پر مقدمہ دائر کر رہا ہے"۔

"سامان باندھیئے اور چلیئے میکلوڈ روڈ واپس"۔ بھائی فوراً بولے۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا اس مکان میں شاخسانے نکلیں گے۔ بس جیسے ہی بی بی اچھی ہوں یہاں سے کوچ"۔

اماں نے فی الفور روانگی کی تیاری شروع کردی۔ شام کو آپا صدیقہ نے پڑوس سے آکر کہا۔ "چچی جان۔ مالک مکان کو کرایہ دیتی رہیئے اور یہاں سے نہ جائیے۔ اتنی معقول کوٹھی مل گئی ہے"۔

"بیٹی"۔ اماں نے عادت قدیم کے مطابق جواب دیا۔ "میں تو خود اس جگہ سے ناخوش تھی آتے کے ساتھ ہی بچی بیمار پڑی۔ جی۔ پی۔ او سے بچہ روز خبریں بھیجتا ہے۔ اسے روز یہاں سے اتنی دور میکلوڈ روڈ جانا پڑتا ہے۔ وہ فلیٹ خندوس سہی' ہے تو ڈاکخانے کے قریب۔ بی بی تم کو تو معلوم ہے میں دہرہ دون میں آشیانہ چھوڑ کر کالج کے قریب رہی۔ لکھنؤ میں بنارسی باغ کی مفت بڑی کوٹھی چھوڑ کر' یونیورسٹی کے قریب کوٹھی لی اور اتنے برسوں اس کا کرایہ ادا کیا"۔

چنانچہ کچھ عرصے بعد وکٹوریہ گاڑیوں پر لد پھند کر دوبارہ فلیٹ نمبر9 میوچل بلڈنگ میکلوڈ روڈ۔ اماں اس قدر بشاش تھیں گویا جھونپڑا چھوڑ کر محل میں واپس آگئی ہوں۔

الن ماموں اپنے ایک بھانجے بدر حسنین کے پاس مارٹن روڈ کے ایک کوارٹر میں مقیم تھے۔ بہاء الدین کالج جوناگڑھ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ یہاں آن کر سندھ کے محکمہ تعلیم میں ملازمت تلاش کر رہے تھے۔ کراچی میں نفسانفسی تھی۔ مہاجروں کی ریل پیل۔ سب اپنے اپنے پاؤں جمانے کی فکر میں سرگرداں تھے۔ الن ماموں بیچارے سادہ دل' نیک خصلت بھولے آدمی بے طرح دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ روز ڈاکٹر داؤد پوتا سے ملنے جاتے جو صوبہ سندھ کے محکمہ تعلیم کے افسر اعلیٰ تھے۔

"یہ تمہارا داؤد پوتا بھی تمہیں جل دے رہا ہے"۔ اماں جل کر کہتیں۔

"نہیں۔ نہیں باجی۔ داؤد پوتا میرا بمبئی کے زمانے کا دوست ہے"۔ الن ماموں جواب دیتے۔ "کل ہزہائی نس بھی مجھ سے کہہ رہے تھے۔ بس نقوی صاحب تم فکر نہ کرو اللہ کارساز ہے"۔

"نواب صاحب جوناگڑھ تم کو تم کہتے ہیں"۔ میں نے دوسرے کمرے میں جاکر بھابی کو یہ ضروری اطلاع دی۔ وہ فوراً اماں کے کمرے میں آئیں۔

"اچھا الن ماموں۔ نواب صاحب جوناگڑھ کے کتوں کا قصہ سنائیے"۔ بھابی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے فرمائش کی۔

"بس ہر کتے پر ایک ایک انگریز گورنس مقرر تھی اور ان کے دانت سونے کے برش سے صاف

کئے جاتے تھے"۔

"او۔ فوہ۔۔۔۔" بھابی بولیں۔

"شروع ہوگئی بکواہ۔" اماں نے اظہار خیال کیا۔ لیکن الن ماموں فوراً اپنی پریشانیاں بھول جاتے اور گپ شروع ہو جاتی۔ الن مماں اپنے پروویڈنٹ فنڈ کا روپیہ جو ہندوستان سے منتقل ہو چکا تھا۔ خرچ کر رہے تھے اللہ پر توکل کئے گپاشک میں منہمک تھے۔ فن گفتگو لانگڑی والوں کا پرانا ہنر ہے۔ جو فن گفتگو اور علم مجلس تین سو سال سے (کہ تھے ہند کے میخانے بند) ان کے SURVIVAL کا موجب رہا تھا۔

جب ہم لوگ گجراتی کولونی گئے تھے بھائی احمد نواب اس وقت فلیٹ نمبر9 سے بدر کے ہاں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے چھوٹے علی نواب جو علی گڑھ میں پارے کے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ وہاں سے انجینئرنگ پاس کرکے آن پہنچے اور اب ملٹری اکیڈیمی کاکل میں شامل ہونے کے لئے جانے والے تھے۔ کچھ عرصے کے لئے میں مارٹن روڈ گئی اور بدر کے کوارٹر میں چوک سادات لانگڑی 'مراد آباد' مکان ڈپٹی اصغر علی مرحوم و مغفور کے تہہ خانے والا' بقول اماں "احدی کلب" قائم ہو گیا۔ وہاں ایک روز اطلاع موصول ہوئی کہ بھائی فلاں محلہ سادات لانگڑی مغلپورہ اول شہر مراد آباد سے راولپنڈی پہنچ گئے ہیں۔ وہاں پیری مریدی شروع کردی ہے اور بفضلہ خوب کما رہے ہیں۔ بھائی مرتضیٰ حسین میکش مراد آبادی کا ناقہ صحرائے سندھ میں پہنچ کر جیکب آباد میں بیٹھ گیا جو دنیا کا گرم ترین علاقہ تھا۔ مرتضیٰ بھائی نے وہیں ڈیرہ ڈال کر حسب سابق اپنے جاسوسی ناول لکھنا شروع کردیئے۔ ان کی تازہ تصنیف "شیطان کا پنجہ" منظر عام پر آچکی تھی۔ جہد البقاء کے لئے پیری مریدی اور جاسوسی ناولوں کی تصنیف و تالیف سب سے زیادہ سمجھداری کے کام تھے۔

الن ماموں کی بڑی بہن یعنی اماں کی پیاری پھوپھی کی حسین مہ جبیں لڑکی عالیہ اور اس کے شوہر لفٹیننٹ کرنل ناصر (جو الن ماموں کی سب سے بڑی بہن کے لڑکے تھے) ملیر چھاؤنی میں آگئے تھے۔ اکثر اتوار کے روز احدی کلب کا اجلاس ان کے ہاں منعقد ہوتا۔

11 ستمبر کی سہ پہر ہم لوگ مارٹن روڈ کوارٹر میں دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولے میں مصروف تھے کہ معاً پڑوس کے کوارٹر سے (اس میں بھی مہاجر آباد تھے) صدائے گریہ و بکا بلند ہوئی۔ علی نواب زقند بھر کر باہر گئے۔ چند ثانیوں بعد واپس آکر اطلاع دی۔

"قائد اعظم کا انتقال ہو گیا"۔ ہم سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ آصفہ ممانی دوپٹے میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگیں۔

دوسرے روز ہم لوگ احدی کلب کی کھاٹوں پر صبح کے اخبار پھیلائے جنازے کے جلوس کی تصاویر دیکھنے میں مشغول تھے۔ ایک فل پیج فوٹوگراف میں قائد اعظم کا تابوت ائیرفورس کے طیارے سے اتارا جا رہا تھا۔ کندھا دینے والوں میں سیاہ ماتمی پٹی بازو پر باندھے ایک ائیرفورس افسر کے کلوز اپ کو دیکھ کر الن ماموں نے دفعتاً کہا۔۔ "ارے۔ یہ تو میاں ظہور معلوم ہوتے ہیں"۔

دوسری تصویر میں وہی افسر گن کیرج کے ساتھ ساتھ سر جھکائے چلتا نظر آیا۔

اتوار کی صبح سویرے کوارٹر کے سامنے ایک کار آن کر رکی۔ پھر ایک کڑک دار آواز آئی۔
"پروفیسر تصور علی نقوی صاحب یہیں رہتے ہیں؟" دوسرے لمحے دروازے کی چلمن اٹھا کر ایک لمبا تڑنگا ایئر فورس افسر بازو پر سیاہ ماتمی پٹی باندھے اندر داخل ہوا۔

"ارے بھئی الن چچا۔۔۔ السلام علیکم!"

"اماں ظہور۔۔ میں نے تو کل تصویر میں ہی تمہیں پہچان لیا تھا۔" الن ماموں نے کھل کر کہا۔
"فورا سمجھ گیا تھا کہ قائد اعظم کے جنازے کے ساتھ تم زیارت سے آئے ہو گے"۔

"جی نہیں الن چچا۔ میں یہاں ایئر فورس کوارٹرز ماری پور میں پوسٹیڈ ہوں۔ بھائی آل حسنین کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نوشہرہ ہیں۔ ان کو خط لکھا تو آپ سب کا پتہ چلا۔ پھپھو میاں کو ٹیلی فون کیا۔ کل نذر باجی سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے آپ کا پتہ بتایا۔ آپ سب خیریت سے یہاں پہنچ؟ پارٹیشن کے وقت میں سکندر آباد چھاؤنی میں تھا"۔

ظہور ماموں اپنی پیک کیپ کھاٹ پر رکھ کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ الن ماموں نے ان کا تعارف آصفہ ممانی سے کرایا۔ "آصفی' یہ میرے بھتیجے ہیں۔ نذر باجی کے سگے تایا زاد بھائی یعنی بھائی فیض العسکری مرحوم کے لڑکے۔ پھپھو باجی سے ملی ہو نا۔۔؟ بھائی افضل مرحوم کی بیوی سے۔۔؟ ان کے چھوٹے بھائی۔"

"آپ لوگوں کے پیچیدہ رشتے آج تک میری سمجھ میں نہ آئے"۔ آصفہ ممانی گڑبڑا کر بولیں۔
"نذر باجی اور بھائی حسنین آپ کو چچا کہتے ہیں اور ان کی اولاد آپ کو ماموں پکارتی ہے"۔

"یہ لوگ سب اماں سے اتنے چھوٹے ہیں اسیں نانا کیسے کہیں۔ بچپن میں بہت دنوں تک لڈن مما کی دلہن کو جوان نانی پکارا کرتی تھی"۔ میں نے کہا۔

"اماں آصفی' کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ نذر باجی' آل حسنین اور میاں ظہور العسکری کے دادا میر مظہر علی ہمارے والد مرحوم کے فرسٹ کزن تھے"۔ الن ماموں نے فرمایا۔

"تو شروع کے دادا کون تھے؟" آصفہ ممانی نے الجھ کر پوچھا۔

"نذر باجی کی پردادی میر قائم علی کی بیوی امراؤ بیگم اور ہمارے دادا میر منور علی سگے بہن بھائی تھے۔ اتنی آسان بات ہے"۔ الن ماموں نے جواب دیا۔

"بے حد آسان۔" ظہور ماموں نے سر ہلایا۔ پھر بولے۔ "چلیے سب ماری پور چل کر رہیے۔ میرے ہاں' میں نے نذر باجی سے بہت اصرار کیا ہے۔ مجھے ماری ایئر فورس اسٹیشن پر بہت بڑا مکان ملا ہے۔ جب تک پھپھو جی بہتر فلیٹ تلاش کریں کم از کم تم میرے ہاں آ جاؤ"۔ انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

"اماں یہاں احدی کلب قائم ہے۔ مزے سے پڑے دن بھر گپ ٹھونکتے ہیں۔ کہاں جاتی پھرو گی ماری پور۔ بسیار ہوائی جہازوں کی ریل پیل۔ ہنگامہ۔ خطرناک مقام ہو گا"۔ الن ماموں نے مجھ سے کہا۔

"الن چچا۔ آپ سب تشریف لائیے۔ کم از کم ویک اینڈ کے لئے ہی آ جایا کیجئے نہایت خاموش پر فضا جگہ ہے۔ احدی کلب کے لئے آئیڈیل"۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤں۔ بمبار ہوائی جہاز تم خود اڑاتے ہو۔؟" الن ماموں نے بے حد فکر مند ہو کر دریافت کیا۔ الن ماموں دنیا کی ان کمیاب ہستیوں میں سے تھے جن کا خمیر صرف محبت اور اخلاص سے تیار ہوتا ہے۔

3۔ خیمہ گاہ عمر ماروی

ماروی ملیر گاؤں کی لڑکی تھی۔ اس گاؤں کی حنا مشہور تھی۔ اٹھارہویں صدی میں شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی نے عمر ماروی کا قصہ نظم کیا۔ جو سسی پنوں' ہیر رانجھا' سوہنی مہیوال' مرزا صاحباں کی طرح پنجاب اور سندھ کے صوفی شعراء کا ایک اور نغمہ معرفت تھا۔ ملیر اور بھنبھور اور عمر کوٹ' سندھی جام اور شہزادے اور مچھیرنیں اور کمہارنیں سب تصوف کی علامتیں تھیں۔ اب بھنبھور ایک خرابہ تھا آرکیولوجسٹ جس کی کھدائی میں مصروف تھے۔ ملیر ایک کنٹونمنٹ۔ مچھیرنیں دراصل اس افلاس اور غلاظت میں زندہ تھیں کہ ان سے کسی قسم کا روحانی یا رومانی تصور وابستہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ تصوف آج بھی سندھی کلچر کی بنیاد تھا اور شاہ عبداللطیف کے نغمے گھڑے اور ایکتارے بجا کر گائے جاتے تھے۔ مگر یہ کلچر کراچی کے HINTERLAND میں چھپا ہوا تھا۔

رات گئے ماری پور گاؤں سے صحرا کی سمت جاتے ہوئے یقیناً کوئی ساربان چاندنی رات میں عمر ماروی کا کوئی گیت الاپتا ہو گا۔۔۔ پیرے پاؤں دی ساں۔۔۔ چواں دی ساں۔۔۔۔ رہی ونجھ رات بھنبھور میں۔۔۔ اللہ جواں دی ساں۔۔۔۔ یہ تصور عبدالرحمٰن چغتائی کی کسی پینٹنگ کی طرح مسحور کن اور رومینٹک تھا مگر اصلیت میں ماری پور گاؤں مچھیروں کی ایک گندی عسرت زدہ بستی تھی جو کراچی شہر سے سات آٹھ میل دور ساحل سمندر پر واقع تھی اور برطانوی نژاد "ماری پور ایئر فورس اسٹیشن" اس سے ایک بے انتہا مختلف عالم آب و گل سے تعلق رکھتا تھا۔ عمر اور ماروی کی نسل والوں کے ماری پور گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر پاکستان ایئر فورس ہیڈ کوارٹرز کی یہ وسیع اور خوشنما صاف ستھری بستی برطانوی ہند میں رائل ایئر فورس کا اہم مستقر رہ چکی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہاں امریکن فضائیہ کے افسروں کے عارضی قیام کے لئے دو منزلہ اپارٹمنٹ بلاک تعمیر کئے گئے تھے۔ ہر بلاک میں چار چار کشادہ خوبصورت فلیٹ' درمیان میں چوڑی طویل گیلریاں۔ دونوں جانب وسیع طویل برآمدے۔ ساری عمارتیں ایک دوسرے کے ساتھ فرلانگوں' لمبے کوریڈورز سے ملحق تھیں۔ ایک طرف سمندر کے کنارے خوش منظر میس۔ امریکنوں کے اس عارضی رین بسیرے کو ایئر فورس افسروں کے جائے رہائش میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

اسکواڈرن لیڈر سید ظہور العسکری کا گراؤنڈ فلور فلیٹ سمندر کے رخ والی ایک عمارت میں تھا۔ جب سورج بحیرہ عرب میں غروب ہوتا۔ اس کی نارنجی کرنوں سے کمرے جھلملا اٹھتے اور کھانے کے کمرے کی میز پر رکھے چاء کے برتن مدھم انگاروں کے مانند جگمگانے لگتے اور دور ساحلی ریت پر بکھری نمک کی سفید

ڈھیریاں ارغوانی ہو جاتیں۔ ایک روز الن ماموں نے بتلایا کہ شاید اسی جگہ پر گاندھی جی نے اپنا سالٹ مارچ کیا تھا۔

سینچر کی رات کو افسروں کی بیگمات میس کے بال روم میں ڈانس کرتیں۔ جو ابھی اس فن سے نابلد تھیں وہ دن میں شہر جا کر بال روم ڈانسنگ کے مدرسوں میں تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ سینچر کی شام منکی جیکٹ میں ملبوس پاکستانی ایئر فورس افسر اور سرسراتے غرارے اور ساریاں پہنے ان کی بیگمات اور چند ایک انگریز افسر اور ایوننگ گاؤن میں ملبوس ان کی میموں کے پرے چپکیلے خاموش کوریڈورز میں سے گذرتے میس کی طرف رواں ہوتے جہاں رات گئے تک رقص ہوتا۔ ظہور ماموں اور ریحانہ ممانی (جو پشاور کے ایک بخاری سادات کی لڑکی تھیں) بہت کم جاتی تھیں۔ ظہور ماموں مے نوشی اور بال روم رقص سے بے نیاز ایک قدامت پسند انسان تھے جو GENES کے پراسرار اثر کی وجہ سے خاندان سادات لانگڑی کی طرح "احدی کلب" کی گپاشنگ کو ترجیح دیتے تھے۔ سینچر اور اتوار کے دن شہر سے دوست اور عزیز آجاتے۔ شام کو ہم سب ٹہلتے ہوئے جا کر ایئر فورس کے سینما ہاؤس میں انگریزی فلم ملاحظہ کرتے۔

GENES کا سفر بہت پراسرار ہے۔ کسی سادہ دل پرکھے کی وجہ سے بسلسلہ مالی معاملات مستقل زبردست حماقتیں مجھ سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک صبح دو باریش حضرات ماری پور تشریف لائے اور کہا ہم نفیس اکیڈیمی کے پبلشر ہیں اور ریلدرم کی ہماخانم شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی اجازت درکار ہے۔ ایک سادہ کاغذ پیش کیا۔ حسب معمول مخلا بالطبع انداز میں اس کورے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ وہ کاغذ لیکر چلتے بنے۔

بہت دنوں بعد جب میں نے اس کا ذکر کیا' مرزا ماموں جان افسردگی سے بولے۔ "یہ جو تم SPONTANEOUS بیوقوفی کرتی ہو اس کا کوئی علاج نہیں ہے"۔

نجانے وہ سادہ دل بزرگ کون تھے۔ شاید میر احمد علی رہے ہوں جو پھانسی کے تختے پر چڑھنے کو بخوشی تیار ہو گئے تھے۔

ظہور ماموں کے اوپر کے فلیٹ میں اسکواڈرن لیڈر آغا حبیب احمد اور ان کی بیوی ڈاکٹر اعجاز فاطمہ رہتی تھیں۔ امریکن فلم اسٹار لنڈا ڈارنل کی ہم شکل' اعجاز کے والد حکیم نیر واسطی عرصہ دراز سے لاہور میں سکونت پذیر اور ہمارے نہٹوری قرابت دار تھے۔ اعجاز کے جیٹھ آغا عبد الحمید انڈین سول سروس سے آئے تھے اور وزیر اعظم لیاقت علیخاں کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ نند زبیدہ آغا نامور آرٹسٹ بننے والی تھیں۔ ان دنوں لاہور سے آئی ہوئی تھیں۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنی ایک تجریدی تصویر دکھلا کر کہا اس کا نام "ففتھ سمفنی" ہے۔ میں نے بغور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد پوچھا کیا اس کا نام "نائنتھ سمفنی" نہیں ہو سکتا؟"

زبیدہ نے کہ ایک متین اور حلیم خاتون تھیں مختصراً جواب دیا۔ "نہیں یہ ففتھ سمفنی ہے"۔
"اچھا۔ تم کہتی ہو تو ہو گی"۔ میں نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

"ابا کا اورنگ آباد سے خط آیا ہے۔ انڈیا میں زمینداری ختم ہونے والی ہے۔ مجھے بڑی فکر ہے۔ وہ لوگ اپنا فیوڈل رہن سہن کس طرح چھوڑیں گے۔ کیا ہو گا"۔ اعجاز فاطمہ حبیب کے ڈرائنگ روم میں اس کی اور میری نہٹوری کزن زاہدہ نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بھائی انور رضا حیدر اور بھائی اطہر رضا حیدر دریچے سے باہر سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ زاہدہ شاید اس وقت اورنگ آباد ضلع بلند شہر پہنچی ہوئی تھی۔ زاہدہ ابا جان کی فرسٹ کزن پھوپھی سعیدہ (بنت سید غلام حیدر مرحوم) کی لڑکی تھی۔ اس کے والد ضلع بلند شہر کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ پچاس گاؤں کی جاگیر۔ اورنگ آباد میں صبح و شام چالیس پچاس آدمی ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ کراچی آکر زاہدہ ایک بالکل مختلف ماحول میں اپنے شوہر کے ساتھ پیر الٰہی بخش کولونی کے ایک کوارٹر میں رہتی تھی اور بہت مطمئن تھی مگر اورنگ آباد والے وہیں رہ کر اس تبدیلی کو کس طرح قبول کریں گے؟

"سوسائٹی بہت MOBILE ہوتی جا رہی ہے۔ سب بدلتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر رہے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "بھائی بہاء الدین کا خیال کرو"۔

بھائی بہاء الدین کے والد پھوپھا ضمیر الحسن فسادوں کے زمانے میں چلتی ٹرین میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ بھائی بہاء الدین میر سعد اللہ عالمگیری کے ترکے کے باغات انبہ سنبھالے نہٹور میں تنہا بیٹھے تھے۔ میر سعد اللہ۔ میں نے اچنبھے سے سوچا۔ میر سعد اللہ نے اٹھارہویں صدی کی طوائف الملوکی دیکھی تھی۔

مسز مارگریٹ شمسی ننگ کرتی اعجاز کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ یہ جرمن بی بی اور ان کے شوہر ظہیر شمسی' قرولباغ دہلی سے آئے تھے اور اعجاز کے پڑوس میں اپنی لڑکی فاطمہ اور داماد ونگ کمانڈر چیمہ کے ہاں مقیم تھے (دوسری لڑکی آمنہ کے بے حد کم سخن شوہر گروپ کیپٹن اصغر خاں بہت عرصے بعد بحیثیت ریٹائرڈ ایئر وائس مارشل اصغر خاں حزب مخالف کے لیڈر بننے والے تھے) فاطمہ اور آمنہ بہت حسین اور سیدھی سادی لڑکیاں تھیں۔

زاہدہ کراچی واپس جانے کے لئے اٹھی۔ جب ہم لوگ زینے سے اتر رہے تھے۔ اس وقت ایک کار اور سامان سے لدے ٹرک سامنے آ رکے۔

"ارے نسیمہ ممانی' ماموں جان"۔ میرے منہ سے نکلا۔

"دیکھو سب کراچی میں جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ کاش سب لوگ انڈیا سے یہاں آ سکتے۔ یہ خلش ہی نہ رہتی۔ کیا MASS MIGRATION ممکن نہیں؟" زاہدہ نے کراچی روانہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

نسیمہ ممانی' مرزا ماموں ہمارے بلاک کی دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں آکر اترے۔ حسنین ماموں کے دوست اور اماں اور چندا ممانی کے منہ بولے بھائی کرنل وہاج الدین احمد مرزا آئی۔ ایم۔ ایس۔ جن کا آبائی وطن بنارس تھا اور جن کی شادی اماں نے سنہ 43ء میں لکھنؤ میں راولپنڈی کے جسٹس محمد جان کی لڑکی نسیمہ سے کروائی تھی۔ تقسیم کے وقت سیتاپور میں سول سرجن تھے۔ اب وہ آر پی اے ایف کے میڈیکل چیف اور ونگ کمانڈر ہو کر راولپنڈی سے تشریف لائے تھے۔ مرزا ماموں اور نسیمہ ممانی کے آنے

سے دفعتاً بہت چہل پہل ہو گئی۔ اتوار کے روز کراچی سے اکثر الن ماموں اور دوسرے عزیز ظہور ماموں کے ہاں آ جاتے۔ آزادی کے بعد تہران میں برٹش انڈین قونصل خانہ بند ہو چکا تھا۔ الن ماموں کے بڑے بھائی لڈن مما (غضنفر علی نقوی) جو سنہ 42ء سے وہاں شارد ی افیرز تھے کراچی آ گئے تھے اور کلفٹن پر اپنے ہم زلف سید کاظم رضا کے ہاں مقیم تھے جو ان دنوں کراچی کے انسپکٹر جنرل آف پولیس تھے۔ سید کاظم رضا بھی اپنے دونوں بھائیوں سید آل رضا لکھنوی اور سید ہاشم رضا (آئی۔ سی۔ ایس) کے مانند خوش گو شاعر تھے (اور شام کبن کے نام سے ٹھمریاں اور دادرے بھی تصنیف کرتے تھے)

لڈن ماموں نے انڈین پولیس سے مستعفی ہو کر کراچی میں ٹیکسٹائل کا کاروبار شروع کیا تھا اور مانچسٹر میں دفتر قائم کرنے کے لیے بڑے لڑکے صیب کو انگلستان روانہ کر چکے تھے۔

رائل پاکستان ایئر فورس میں ابھی متعدد انگریز افسر موجود تھے۔ ایئر مارشل بھی انگریز تھا لیکن دوسرے فرنگی افسر عنقریب انگلستان کوچ کرنے والے تھے۔ اتوار کی صبح ایک انگریز سامنے چٹانوں پر چپ چاپ کھڑا اپنا موڈل طیارہ اڑایا کرتا۔ سال نو کی شام انگریزوں نے رات بھر غل غپاڑہ مچایا اور ایک میب فٹ بال سارے میں لڑھکاتے پھرے۔ ماری پور ایئر فورس میس میں اور کراچی کے کلبوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دھوم دھام کی "نیو ائیرز ایو" منائی گئی غراروں اور ساریوں میں ملبوس سیکڑوں بیگمات معروف رقص تھیں۔ کیسی نماز بال میں ناچو جناب شیخ۔

اکبر لسان العصر نہیں لسان الغیب تھے۔

پاکستان میں مغربیت اور اسلامی تجدید کے مابین نظریاتی رسہ کشی شروع ہو چکی تھی۔ جماعت اسلامی کے رسالے شائع ہو رہے تھے۔ اور ایک چھوٹا سا بچیت میدان میں اور کود پڑا تھا۔ "لفٹ ونگ" جس کی نمائندگی ہمارے ہاں بھائی ایوب احمد کرمانی کرتے تھے۔

یکم جنوری سنہ 49ء کی صبح الن 'لڈن مما' زہرا اور سلویا اور ایوب بھائی ماری پور آئے۔ وہ سب برآمدے میں سمندر کے رخ بیٹھے دھوپ اور خشک میوے کھا رہے تھے اور کافی پی رہے تھے۔ بہت پر سکون وقت تھا۔ جیسے جنرل طارق کے سارے جہاز کنارے پر پہنچ چکے ہوں۔ چند شاندار پنجابی اور پٹھان افسر رپ رپ کرتے سامنے بجری پر سے گذرے۔ اچانک ایوب بھائی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور سگریٹ کا کش لگا کر بولے "انگریز اس سب کو ٹیٹنٹ کی فوجیں بنا گیا۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ کشمیر میں انگریز کی تربیت یافتہ فوجیں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں؟"

"آپ کا کیا مطلب ہے۔ انگریز نہ رہا ہوتا تو سب تیر کمان تلواریں لگائے ہاتھی پر سوار گھومتے ہوتے"؟ سلویا نے دریافت کیا۔

"تلواریں تو نہیں البتہ مڈل ایسٹ کے ملکوں کے شکستہ حال ڈھیلے ڈھالے لشکر دیکھ لیجئے۔ عربوں کو ملاحظہ کیجئے کہ فلسطین میں یوروپین یہودیوں سے برابر پٹ رہے ہیں"۔

"تو کیا کولونیل عہد ضروری تھا؟" سلویا نے پوچھا۔

"جنگل بل جنگل بل جنگل آل دی وے"۔ ظہور ماموں کی غیر معمولی طور پر حسین بچی لالہ رخ اپنی چھوٹی بہن شگفتہ رخ کے ساتھ بجری پر گاتی پھر رہی تھی۔ پھر ان دونوں نے "ہیر دی گو راؤنڈ دی ملبری بش"۔ شروع کر دیا۔

"کان کھول کر سن لیجئے"۔ ایوب بھائی نے کہا۔ "مغربی کلچر یہاں باقی رہے گا۔ مغل تہذیب کی طرح۔ امپریل تہذیبوں کے اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ رومن لاء آج تک موجود ہے"۔

"کیا مغرب ہم سے واقعی برتر ہے"۔ میں نے سوال کیا۔

"ہم سے زیادہ ایفی شنٹ اور سائنٹیفک ہے۔ صرف اس جگہ کا ڈسپلن اور صفائی دیکھ لیجئے جو دو سو ۲۰۰ سالہ برطانوی فوجی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے برعکس سویلین جگہوں کی گندگی اور لوگوں کی نااہلی پر غور فرمائیے"۔

"یہ تو فوجی حکومت قائم کرنے کا جواز ہو گیا"۔ میں نے کہا۔

دوسری طرف لڈن مما ظہور ماموں کو ملک الشعرا بہار کے اشعار سنا رہے تھے۔ آقائے بہار ان کے گہرے دوست تھے۔

ایوب بھائی نے فوراً کان کھڑے کیے۔ "ایران میں تودہ پارٹی کا کیا حال ہے؟" انہوں نے لڈن مما کی طرف مڑ کر ان سے دریافت کیا۔

الن ماموں ریحانہ ممانی سے مخاطب تھے۔ "کل مجھے بندر روڈ پر جوناگڑھ کے ایک شناسا میمن سیٹھ ملے۔ میلے کپڑے۔ منہ میں بیڑی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ خیریت دریافت کی۔ روانکھے ہو کر بولے۔ "کھیریت کہاں نقوی صاحب۔ اکھا مال بمبئی میں رہ گیا۔ تھوڑا سا روکڑا لا پایا ہوں" میں سمجھا شاید دس پندرہ ہزار روپے لا سکے ہوں گے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا۔ "نقوی صاحب بہت تھوڑا سا روکڑا کھالی ایک کروڑ"۔

"سیٹھ جی کا روکڑا ملک الشعرا بہار سے ہمیشہ زیادہ اہم رہے گا۔ اس نکتہ کو پہچان لیجئے"۔ ایوب بھائی بولے۔

"اور انگریز کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہترین شاعری بھی کرتا تھا اور بہترین بنیا بھی تھا۔ ہم محض شاعری کرتے رہے ہیں"۔ ظہور ماموں نے کہا۔

"کل میں قدرت اللہ شہاب کا ناول پڑھ رہا تھا"۔ الن ماموں بولے۔ "اس میں مہاجر 'غیر مہاجر' بنگالی' پنجابی کی تفریق پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ سال بھر کے اندر اندر یہ جھگڑے"۔

"لینن نے قومیتوں کا مسئلہ اس طرح حل کیا"۔ ایوب بھائی نے کہنا شروع کیا۔

الن ماموں نے ایوب بھائی کا قطع کلام کیا۔ "بس پہنچ گئے آپ ماسکو"۔

"گو اس سلسلے میں تھوڑے سے کنفیوزڈ تھے مگر اس طرف علامہ مرحوم نے بھی ایک نظر ڈالی تھی"۔ ایوب بھائی نے جواب دیا۔

"حسنین بھائی کا کوئٹہ سے خط آیا ہے"۔ مرزا ماموں ایک لفافہ لئے زینے سے اترے۔ "ان کا تبادلہ نوشہرے سے کوئٹہ ہو گیا۔ ہم سب کو سردی منانے وہاں بلایا ہے"۔

ایوب بھائی نے سر اٹھا کر ونگ کمانڈر مرزا کو دیکھا اور متانت سے بولے۔ "آپ لوگوں کے لئے ابھی یہاں SKIING وغیرہ کا انتظام نہیں کیا گیا؟"

"وہ بھی ہو جائے گا"۔ الن ماموں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ جس انقلاب کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ یہاں آنے والا نہیں۔ کائے کو خالی پیلی بوم مارتا؟"۔ انہوں نے روکڑا والے میمن سیٹھ کی زبان میں کہا۔

"بابر بہ عیش کوش"۔ ریحانہ ممانی نے نقرئی قہوہ دان اٹھا کر سب کے لئے اسپوڈز چائنا کی پیالیوں میں کافی بنانی شروع کی۔ ان پیالیوں پر اٹھارہویں صدی انگلستان کے پر امن PASTORAL مناظر منقش تھے۔ باغ میں جارجین پولیلین WIGS' اور پکچر ہیٹ پہنے لارڈز اور لیڈیز' بارَیک شکاری کتے۔

"اچھا ہوا یہ لوگ خوشگوار وقت گذار گئے۔ اب یہ دوبارہ دنیا میں نہ آئیں گے۔ ان کا زمانہ ان کے ساتھ ختم ہوا"۔ ظہور ماموں نے ایک کوارٹز پلیٹ اٹھا کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ظہور ماموں گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے ذہین طالب علم رہ چکے تھے۔

"اور اچھا زمانہ بھی چند روزہ ہے"۔ میں نے کہا۔ مجھے ابا جان کی ایک نامکمل نظم یاد آئی جو ان کے انتقال کے بعد ان کی میز کی دراز سے نکلی تھی۔ جس کا ایک مصرع تھا ع رکھ یاد ترا وقت بھی ناپائیدار ہے۔

نجانے کیوں' گو اس وقت تک اقبال کو سمجھنے کی عقل بھی نہیں آئی تھی' جون سنہ 43ء میں نمبر21 فیض آباد روڈ سے منتقل ہونے سے چند روز قبل میں سامنے کے برآمدے میں متواتر گاتی پھر رہی تھی۔ تیرے بھی صنم خانے۔ میرے بھی صنم خانے۔۔۔ دونوں کے صنم خاکی۔۔۔ دونوں کے صنم فانی۔۔۔۔ جو ابا جان اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

بھائی نے اپنے کمرے سے نکل کر مجھے آہستہ سے منع کیا تھا۔۔ "اماں کے پاس تعزیت کے لئے لوگ آئے بیٹھے ہیں اور آپ ہیں کہ گاتی پھر رہی ہیں"۔

اپریل سنہ 49ء میں "میرے بھی صنم خانے" مکتبہ جدید لاہور سے پہلی بار شائع ہوئی۔ سب سے پہلے چچا مشتاق احمد زاہدی نے بیحد نازاں ہو کر اس پر مضمون لکھا۔ چند سال قبل قرولباغ دلی میں چچا زاہدی ہی کی ہمت افزائی پر میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ مضمون اتفاقیہ مجھے ایک رسالے میں نظر آ گیا۔ چچا بہت دور رہتے تھے اور کافی دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

اگست کے مہینے میں کراچی میں بارشوں کی جھڑی لگی۔ سمندر بادلوں میں ڈوب گیا۔ لوگوں نے کہا۔ "مہاجر اپنے ساتھ بارشیں بھی لے آئے"۔

شاہ ایران کی آمد نے فیشن ایبل طبقے کو بہت مصروف رکھا۔ شاہ نے پاکستان ویمنز نیشنل گارڈ کے

مارچ پاسٹ کی سلامی لی۔ دستے کی قیادت لکھنؤ کے سابق ڈائرکٹر آف اگریکلچر مسٹر امام کی پری جمال بیٹی رضیہ کر رہی تھیں۔ اماں کسی عزیز کو بی۔ او۔ اے سی کی فلائنگ بوٹ پر پہنچانے کورنگی کریک گئیں۔ "میں ہوائی جہاز کو پانی میں چھپ چھپ کرتے اترتا دیکھنا چاہتی ہوں"۔ انہوں نے کہا۔ جب سے انہوں نے تہذیب نسواں میں بیسویں صدی کی نئی دنیا کی ایک نئی لڑکی کی حیثیت سے مضمون نگاری شروع کی تھی۔ ان کو ہر نئی چیز کو دیکھنے اور برتنے کا اشتیاق رہا تھا۔

نوعمری میں انسان نئی دنیائیں کھوجنا چاہتا ہے اور شاعری بھی کرتا ہے۔ مڈ سنچری کی ایک نئی لڑکی کی حیثیت سے بزبان انگلش جدید شاعری کرنے میں' میں بھی ان دنوں مصروف ہوں۔ حاضر ماموں کے چھوٹے بیٹے خواجہ توفیق رفعت[4] کی طرح جن لوگوں کا VOCATION ہی یہ ہوتا ہے وہ باقاعدہ سنجیدہ شاعر بن جاتے ہیں۔ ہم سے وال کچھ دنوں تک ٹوں ٹاں کر کے اپنے چھوڑ چھاڑ دیتے ہیں۔ توفیق جو گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہو کر کراچی آ چکا ہے۔ ایک روز ماری پور آ کر سامنے چٹان پر بیٹھ کر سمندر کو دیکھتا رہتا ہے۔

نظم[5] لکھتا ہے۔ BEAUTY SLIDES ON ROCK FACE

توفیق نے عمر رواں کا سارا ٹریجک ڈرامہ اس ایک سطر میں بند کر دیا۔ گو ابھی ہم سب کے ROCK FACES ظاہر ہونے میں بہت مدت پڑی ہے۔ اور ہم لوگ مگن ہیں۔ اور جو زندگی کی مسافتیں طے کر کے آخری پھاٹکوں تک پہنچ رہے ہیں ان کو ہم سمجھ نہیں سکتے اور یہ لاعلمی ہی بہتر ہے۔

ان دنوں ظہور ماموں کے ہاں سمندر کے رخ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر میں نے بے حد نقل کی اور بے حد نظمیں لکھیں۔ طویل' مختصر' امیجسٹ' تجریدی' علامتی' آپ صنف کا نام لیجئے کھٹ سے نظم تیار۔ آمد ہی آمد ہے۔ ان میں سے چند جو ضائع ہو جانے سے بچ رہیں۔ پاکستان ٹائمز اور پاکستان کوارٹرلی میں شائع ہوئیں۔ ان کے مصرعے کچھ یوں تھے۔

THESE ARE THE GHOST FLOWERS WE'D GATHERED

CITY OF NOT LIFE SO BUSY DEFINING CULTURE GOOD BYE

GOOD BYE TO VAPOURY AUTUMN NIGHTS

اور ایک میں نے عرض کیا تھا۔

I LIVE WITH UNATTAINED HOURS SPENT UNSPENT

وغیرہ اور ایک مقطع تھا۔

"CONSIDER THIS MY TIME IS UP. MEASUREABLE ON LONELY ROADS ON LONELY ROADS."

"تم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہو' جو چاندی کا چمچہ منہ میں لیکر پیدا ہوئے۔ ہمیشہ خوش بشاش پر آسائش زندگی گذاری۔ خود ہر وقت ہنستی قہقہے لگاتی رہتی ہو۔ تم ایک غیر معمولی طور پر CHEERFUL انسان ہو۔ مگر جو کچھ لکھتی ہو اردو میں اور انگریزی میں اس میں ایک ROMANTIC SADNESS موجود رہتی ہے اور یہ عمر کا تقاضہ ہے"۔ ایک روز ظہور ماموں نے ایک نظم پڑھ کر فیصلہ صادر کیا۔

"یا دماغ کا فتور"۔ میں نے کہا۔

"یو آر اے رومینٹک"۔ زبیدہ آغا نے سرہلا کر کہا۔

"کیا ایک رومینٹک اشتراکی نہیں ہو سکتا؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے" میں دریافت کرتی ہوں۔

"آپ اشتراکی کسی طرف سے نہیں ہیں"۔ ظہور ماموں نے جواب دیا۔

یہ سن کر مجھے بہت شدید فکر لاحق ہوئی۔ لیکن بہت جلد انگریزی میں شاعری کرنے سے طبیعت ہٹ جاتی ہے۔ حالانکہ جو طویل جدید نظم پاکستان کوارٹرلی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی بہت تعریفیں ہوئی تھیں۔ پھر میں نے ڈچ ماسٹرز اور ڈچ انٹریرز کی دنیا کو ڈسکور کیا۔ اور ایک ڈچ ماسٹر کی ایک تصویر کی واٹر کلر میں COPY بنائی۔ جسے ریحانہ ممانی نے ڈرائنگ روم کے آتشدان پر سجا کر کہا۔ "اچھا اب تو سنجیدگی سے بیٹھ کر تصویریں بناؤ۔ باقاعدہ بہت وقت ضائع کر لیا"۔

لکھنؤ آرٹ اسکول میں بنائی ہوئی تصاویر لکھنؤ میں رہ گئیں۔ دفعتاً جوش آتا ہے۔ دوسرے دن ظہور ماموں' ریحانہ ممانی کے ساتھ شہر جا کر آئل پینٹنگ کا سامان خریدتی ہوں۔

ایک صبح ظہور ماموں چند کینوس دیکھ کر کہتے ہیں۔

"HOODED FIGURES BROODING" سب کے سب۔ اور اتنے ڈارک براؤن"۔

تب اچانک خود دیکھتی ہوں۔ ڈارک براؤن' سیاہی مائل نیلے' سیاہی۔ گل سرخ' سیاہی مائل.....

"میں ایک میڈیول گوتھک روح ہوں"۔ میں ارشاد کرتی ہوں۔

"آپ دنیا میں ابھی محض ایک نووارد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ دوسرے رنگ بھی استعمال کرنے لگیں گی"۔ ظہور ماموں اطمینان سے کہتے ہیں۔ یہ بڑے کس بلندی سے بات کرتے ہیں۔

سلویا کو بھی بڑوں سے یہی شکایت ہے۔ جب زہرا ممانی کے ساتھ سلو اور میں حسنین ماموں کے پاس کوئٹہ روانہ ہوتے ہیں۔ ہم دونوں طے کرتے ہیں کہ اب کچھ عرصہ کوئٹہ میں رہ کر صرف مارکسٹ تنقید کا مطالعہ کیا جائے گا تاکہ ذہن میں پختگی اور راسخ العقیدگی آوے۔ لیکن کوئٹہ اپنے اندر ایک اور فسوں خیز دنیا رکھتا ہے' جو ڈسکور کیے جانے کی منتظر ہے۔

4۔ پھر چراغ لالہ۔ (مالکونس)

سے روشن ہوئے۔ کوئٹہ چھاؤنی میں۔ میجر آل حسنین کا وسیع باغ نیلے نیلے اودے اودے۔ پیلے پیلے پھولوں سے معمور تھا۔ اور بادام کے اشجار اور انگور کی بیلیں۔ چندا ممانی انگور کا سرکہ بنانے میں

مصروف۔ کوہ و دمن روشن ہوئے۔ سرخ پہاڑوں پر دھوپ۔ ایرانی بلوچستان سے سرد ہواؤں کے ریلے۔

مجھ کو پھر نغموں پہ۔

ہنگام شب اکثر ایرانی قونصل و خانم آن کر "شجر حیات" والے ایرانی قالین سے مزین روشن ڈرائنگ روم میں قہوہ پیتے اور حسنین ماموں پیچوان گڑگڑا کر ٹھیٹھ مراد آبادی لہجے میں بزبان فارسی ان سے گفتگو کرتے۔

ایرانی قالین کی کائنات۔ گل بوٹے' اشعار' چنار کے پتے' گل لالہ' سرو و صنوبر' بولین' آبجو' پرند' شجر حیات۔ کمرے کی چاروں دیواروں تک پھیلی نرم و گرم' رنگ برنگی نشاط آگیں پر تکلف محدود دنیا۔ ماموں کو ایرانی قالین جمع کرنے کا شوق ہے۔ ایران سے لا لا کر ڈھیروں قالین مراد آباد میں جمع کر ڈالے۔ اب یہاں ان کے تایا میرزا الباقر نے بھی بہت ایرانی قالین جمع کیے تھے۔ حیات انسانی کے مقابلے میں اون اور رنگوں کا یہ کمزور تانا بانا کس قدر زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ ماموں اور اماں کے بزرگ سنا ہے مشہد و نیشاپور سے آئے تھے۔ جہاں وہ روضہ امام رضاؑ کے کلید بردار تھے۔ کلید کس کے پاس ہے کسی کے پاس نہیں۔ لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب۔

شجر حیات پر بیٹھے پرند پھر پھر کر کے اڑتے جاتے ہیں۔ ایرانی قالین میں بنے پرند موجود۔

آدمی کا ہنر اس کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔

علی الصبح صحن چمن میں کوہستانی چڑیوں کی چہکار۔ چندا ممانی برآمدے میں ناشتے کا انتظام کرواتے ہوئے سر اٹھا کر پہاڑوں کی سمت دیکھتی ہیں "یہاں سے زاہدان' زاہدان سے مشہد۔ انشاء اللہ محرم کرنے اگلی بار مشہد جاؤں گی۔"

"یہاں سے زاہدان' زاہدان سے تاشقند۔" میں اور سلویا انگور کی بیل کے پیچھے چھپ کر خفیہ سازش کر رہے ہیں۔ "بس ان پہاڑوں کے پیچھے چھپ کر ہٹ اینڈ رن۔ ہٹ اینڈ رن۔"

لیکن سلو جو اچھوں کی طرح بہت پریکٹیکل مزاج رکھتی تھیں دفعتاً چونک کر کہتیں۔ "لیکن وہاں سردی میں ہو گیا نمونیہ تو؟"

ناشتے کے بعد ہم دونوں ایک سرو کے نیچے غالیچہ بچھاتے اور اس پر بیٹھ کر نہایت خشوع و خضوع سے "الوژن اینڈ ریلٹی" اور "ذان ہنتا رہا" کی تلاوت شروع کر دیتے۔ جو کراچی سے چلتے وقت سلو کی بے حد پروگریسیو خالہ ہما اخلاق حسین نے عنایت کی تھیں۔

اکسانے لگا مرغ چمن۔

پھر مجھے نغموں پہ۔ ماموں وردی پہن کر دفتر روانہ ہو جاتے۔ کار روانہ ہونے کی آواز آتی۔ دوسرے موٹر خانے میں لڈن ماموں کی رشو کھڑی تھی جو انہوں نے تہران سے براہ زاہدان واپس آکر حسنین ماموں کے ہاں رکھ دی تھی۔

"بلوچستان کے عوام۔" میں دریچے سے باہر جھانک کر کہتی۔ "برف پر ننگے پاؤں گھوم رہے

ہیں۔"

"ہٹ اینڈ رن۔ ہٹ اینڈ رن۔" سلو اسی سازشی انداز میں دہراتیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد چندا ممانی' زہرا ممانی' منور ممانی' شاہجہاں اور حسن احمد ماموں جو ہندوستان سے آگئے تھے اپنے اپنے کمروں میں آرام کرتے۔ اس وقت میں اور سلو ڈرائنگ روم میں جاتے۔ جس کے طویل دریچے پر گلاب کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ سلو بڑی عقیدت سے پال رابن کا کوئی ریکارڈ گراموفون پر لگاتیں۔ اس کے بعد مزید نیگرو روحانی نغمے۔ اس کے بعد "والگا بوٹ مین کا گیت" جو بار بار بجایا جاتا۔ یہ سارے ریکارڈ اوری کے تھے جو سلو اپنے ساتھ کوئٹہ لے آئیں تھیں تاکہ عالمی انقلاب سے روحانی رابطہ قائم رہے۔ ہم دونوں آنکھیں بند کرکے صوفے پر بیٹھ جاتے اور "والگا بوٹ مین کا گیت" سنتے۔ پال رابن کی پرشکوہ آواز سے ایک ولولہ خیز سنسنی جسم میں پیدا ہوتی۔ ایک عجیب پرفسوں دنیا تصور میں آجاتی۔ مادر دالگا' ڈون قزاق' انقلاب۔

سلو آنکھیں کھول کر دوبارہ وہی ریکارڈ لگاتیں۔ ہم دونوں نہایت بیوقوف اور نوعمر انقلابی تھے جو اس عمر اور اس زمانے میں ساری دنیا میں اس وقت موجود تھے۔

"اور تم جا رہی ہو مانچسٹر۔" مجھے دفعتاً غصہ آجاتا۔ "برٹش امپریل سرمایہ داری کا گڑھ۔ خیر تقیہ کرلینا۔"

سلو یا منہ لٹکا کر بیٹھ جاتیں۔ پھر ہم لوگ پہلو کے برآمدے میں جاکر انگوروں کی بیل کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے اور شام کی چاء کے وقت تک منور ممانی کی بے حد حسین بچی ثریا کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ کر انگور نوش جان کرتے۔

ایک صبح ایک شریف آدمی سائیکل پر تشریف لائے۔ "میرا نام ش صنیٰ ہے۔ اور میں یہاں کوئٹہ کالج میں پڑھاتا ہوں۔" ایک نظم پیش کی جو غالباً رسالہ ماہ نو میں چھپی تھی۔ "یہ میں نے میرے صنم خانے پر نظم لکھی ہے۔ آپ کو کالج مدعو کرنے حاضر ہوا ہوں۔"

تب دفعتاً یاد آیا کہ میں ایک قسم کی ادیبہ بھی بن چکی ہوں۔ "جی۔ بہت اچھا۔ ضرور حاضر ہوں گی۔" میں نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

سلو دروازے کے باہر کھڑی ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ شریف آدمی کے جانے کے بعد میں نے برآمدے میں آکر سلو سے کہا۔ "خاموش رہو اور برائے مہربانی ہمیشہ یاد رکھو کہ ہم رائٹر ہیں۔"

"او جیز س کرائسٹ۔ دیٹس ایکسٹرا علی فی۔" سلو پر ہنسی کا مزید دورہ پڑا۔

"دیکھو۔" میں نے انگلی اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔ "تم انقلاب کے راستے پر ملک کے دانشور طبقے کو ساتھ لیکر چلنا چاہتی ہو یا نہیں۔؟"

"اولارڈ جیز س کرائسٹ۔" سلو نے فرش پر لوٹ لگائی۔

اور کوئٹہ کالج میں بے پردہ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی تھیں۔ پراعتماد' بردبار' سفید شلواریں پہنے سیدھی سادی' سنجیدہ' میں نے گھر آکر بتایا۔

"دو سال کے اندر اندر اتنی ترقی۔" حسن احمد ماموں نے خوشی سے اظہار خیال کیا۔ یہ سب بڑے قوم پرست لوگ تھے۔

سامنے مسلم لیگ لیڈر قاضی محمد عیسیٰ کی کوٹھی سے ان کی انگریز بھاوج مسز محمد موسیٰ برآمد ہوتیں اور ٹہلتی ہوئی ہماری سمت آتی دکھلائی دیتیں۔ وہ اپنے چنٹ دار "نیولک" فراک کا گھیر گھاس پر پھیلا کر ہمارے پاس بیٹھ جاتیں۔ "ہلو بچیو۔ آج کی صبح تم کیسی ہو۔؟" پھر وہ از سر نو سوال کرتیں۔ "تم دونوں کے انگریزی نام کیوں ہیں؟" سلویا از سر نو بتاتیں۔ "اصلی نام توفیق سیدہ ہے۔ جب ہم پیدا ہوئے۔ یو۔ پی کے انگریز آئی۔ جی کی بیوی ہماری گوڈمدر بنی تھیں۔ انہوں نے اپنے نام پر ہمارا نام رکھا تھا۔"

"ہاؤ انٹرسٹنگ۔ شیکسپیر نے TWO GENTLEMEN OF VERONA میں ایک جگہ سوال کیا ہے۔ ہو از سلویا۔؟ اور اس پر شوبرٹ ایک نغمہ بھی کمپوز کرچکا ہے۔" مسز موسیٰ بتاتیں۔

"نہایت فلسفیانہ سوال ہے"۔ سلویا منہ لٹکا کر کہتیں۔

"اور تمہارا نام۔؟" مسز موسیٰ پوچھتیں۔

"ہمارا نام انگریزی نہیں عربی ہے"۔ میں دوبارہ سمجھاتی۔

مسز موسیٰ کے جانے کے بعد منور ممانی کہتیں۔ "معلوم ہے ان کے میاں کے متعلق ایک اردو شاعر کیا کہہ گیا ہے۔؟"

"کیا کہہ گیا ہے؟"۔

"جب وہ ولایت جا رہے تھے اور جب ان کو لے کر آئے تو شاعر نے کہا۔"

موسیٰ سے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے
جاتے میں قدم اور تھے آتے میں قدم اور

"کوئٹہ ہے یا کوہ طور' قاضی موسیٰ' بریگیڈیر موسیٰ اور جانے کون کون موسیٰ۔" میں کہتی۔ بریگیڈیر موسیٰ جو اکثر حسنین ماموں کے ہاں آیا کرتے تھے' ہزارے کے شیعہ اور شکلاً بالکل چینی معلوم ہوتے تھے۔ اور فوج میں بہت سے انگریز افسر موجود تھے جو عنقریب انگلستان کوچ کرنے والے تھے اور حسنین ماموں کے ہاں ڈنرز پر آتے تھے اور پھولدار غلاف والی ونڈو سیٹ پر ٹک کر یا آتشدان پر کہنی ٹکا کر برطانوی دولت مشترکہ کے خوش آئند مستقبل پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ تن تیرا نہ من۔ اور اخبار مسئلہ کشمیر اور سقوط حیدر آباد سے پر تھے۔ میں نے شیخ و برہمن۔

اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی آمد پر حاکم اعلیٰ بلوچستان کے ڈنر کے لئے برطانوی ہائی کمشنر اور ان کی میم کراچی سے آئے اور شامیانے کے اندر دبیز صوفوں پر بیٹھے۔ نیچے جن کے نہریں بہہ رہی تھیں۔ سروں پر انگور کے خوشے تھے۔ اور سامنے سبزے پر بلوچ رجمنٹ کے غلمان رقصاں۔ الغوزے کے

سروں اور دف اور ڈھول کی تھاپ پر رومال لہراتے چکر کاٹتے بلند و بالا نوجوان۔ وہ خٹک ناچ ایک ولولہ خیز مغربی ایشیائی رقص تھا اور قناتوں کے باہر سرد اور تاریک آسمان کے نیچے گدڑی پوش مزدور بالٹیوں میں دعوت کے برتن دھوتے تھے اور گدڑی پوش بچے موٹروں کی قطاروں کے پرے کھڑے اچک اچک کر اندر کا نظارہ دیکھنے میں مصروف تھے۔

جب ظہور ماموں' ریحانہ ممانی' الن ماموں' آصفہ ممانی' مرزا ماموں' نسیمہ ممانی سب اکٹھے کراچی سے حسنین ماموں کے ہاں کوئٹہ وارد ہوئے۔ وہ لوگ سب پائیں باغ میں لگے بھٹے تڑوا کر انگیٹھی پر بھونتے تھے اور دھوپ میں بچھے پلنگوں پر بیٹھ کر وہ بھٹے اور انڈیا میں چھوڑی ہوئی اپنی جائدادوں کا غم کھاتے تھے۔ آتا ہے دھن جاتا ہے دھن۔

اور چھاؤنی کی پارٹیوں میں حسب فرمائش نسیمہ ممانی اور میں نہایت دلجمعی اور اطمینان سے گیتا رائے کا "میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا" سناتے تھے جو خاصا فقیروں کی صدا معلوم ہوتا تھا۔ اور میں حلق میں سے نہایت باریک "انگریزی آواز" نکال کر "آئی ڈریمٹ آئی ڈویلٹ ان ماربل ہالز" پیش کرتی۔ کبھی دوپہر کو انگوروں کی بیل سے چھپے پہلو کے برآمدے میں حسنین ماموں کے ذخیرے کے انگریزی ریکارڈ گراموفون پر بجائے جاتے۔ ان کے ساتھ نسیمہ ممانی اور مرزا ماموں رقص کرتے۔ دونوں ماہر بال روم ڈانسر تھے۔

اور چند روز بعد وہ دونوں اور ظہور ماموں اور ریحانہ ممانی ائیر فورس کے ڈیکوٹا سے کراچی واپس چلے گئے۔ الن ماموں نے زیارت چلنے کا پروگرام بنایا۔

اور حسنین ماموں کے ہاں ایک ایسا ریفریجریٹر تھا جو مٹی کے تیل سے کھڑ کھڑ چلتا تھا تو میں نے کہا "کمال ہے۔ ہے تو فرج اور چلتا ہے مٹی کے تیل سے"۔ تو منور ممانی بولیں۔ "بہت سی زندگیاں بھی ایسی ہوتی ہیں۔ بناوٹ میں بڑھیا۔ چلانے کو جڑتا ہے مٹی کا تیل۔ اور کبھی اس کے برعکس۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"قسمت"۔

"تو پھر نماز روزہ' عبادت' دعا' درود سب بے کار ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو گا"۔ میں نے کہا۔

"توبہ کرو توبہ۔ نماز فرض ہے"۔ چندا ممانی سکون سے کہتیں اور انگوروں کا سرکہ بنانے میں مصروف رہتیں۔

"جنت میں چندا آپا (انگوروں کی انچارج تو بنائی ہی جائیں گی مگر یہ وہاں بھی سارے انگوروں کا سرکہ بنا دیں گی"۔ سلو کہتیں۔ "ذرا سوچو سارے اہل بہشت ابد تک بیٹھے سرکہ پی رہے ہیں"۔

پھر میں اور سلو گھاس پر بیٹھ کر جنت و جہنم جزا و سزا وغیرہ پر غور و خوض کرتے اور کچھ پلے نہ پڑتا۔ عقائد اور ان سے منسلک تصورات آئیڈیا اور امیج۔

ہل اسٹیشن زیارت کے سرکٹ ہاؤس کے گرداگرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ زہرا ممانی موسم بہار

میں کوئٹہ آچکی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "کوئٹہ اور ایران کا موسم بہار دیکھ کر ہی ایرانی شاعری کی امیجری سمجھ میں آئی یہاں بہار کی کیفیت ہی مختلف ہے"۔

"تو کیا آم کھا کے فارسی شاعری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"شاعری کو کتنا ہی یونیورسلائز کر لو اس کی قومی بنیاد باقی رہے گی۔ میاں جان نے اپنے تازہ خط میں ایک بڑی پیاری بات لکھی ہے۔ ٹھہرو میں بتاتی ہوں۔" زہرا ممانی نے پرس کھولا۔ ان کے والد چودھری محمد علی ردولی میں تنہا رہ گئے تھے اور اپنی بیٹیوں کو بڑے دلآویز خط لکھا کرتے تھے جن کا مجموعہ ہما باجی "گویا دبستان کھل گیا" کے عنوان سے شائع کرنے والی تھیں۔

صبح کو پھولوں کی شبنم پر سورج کی کرنیں پڑیں۔ کتب خانہ گل کے ایک ایک حرف کی وضاحت۔ اور الن ماموں ایک دریچے میں کھڑے شیو کرتے جاتے اور گنگناتے۔ وزد بمرغزار ہا ہوائے نو بہارانہ سرد ہا چنارانہ صوفیاں قطارہا۔

"پچھلے سال قائد اعظم کا اسی جگہ انتقال ہوا تھا۔ کتنی جلدی ایک برس گذر گیا۔ سمجھو پاکستان بنے بھی ڈھائی سال ہونے کو آئے۔" منور ممانی نے کہا۔ ہم لوگ سامان کاروں میں بھر کر واپس اتر رہے تھے۔

ان کو صرف ڈھائی سال کا افسوس ہے! ابھی تو ساری زندگی باقی پڑی ہے۔ میں نے سوچا۔ مگر بڑوں اور نوجوانوں کا پیمانہ وقت بھی مختلف ہوتا ہے۔ کوئٹے واپس پہنچ کر سلو کراچی سے انگلستان روانہ ہونے والی تھیں جہاں لڈن ماموں ان کو ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی تعلیم کے لئے بھیج رہے تھے۔

کوئٹے میں شدید سردی پڑ رہی تھی۔ ایک صبح زہرا ممانی کے ساتھ ہم لوگ مال روڈ پر گئے۔ سلو نے پاسپورٹ کے لئے تصویر کھنچوائی۔ اور پھر سلو اور زہرا ممانی کراچی چلی گئیں۔ ایک مرتبہ حسنین ماموں کے ہاں جعفر طاہر مجھ سے ملنے آئے تھے جو بہت ہی غنائی خوبصورت الف لیلوی کینٹو لکھتے تھے۔ اور شاید فوج میں نان کمیشنڈ افسر تھے۔ تو لوگوں کی زندگی کی یہ بتدریج پروگریس۔ لمحہ بہ لمحہ' ہفتہ' مہینہ سال کی رفتار سے گویا کینٹوز کا تسلسل۔

اور ایک شام جب سخت جاڑا پڑ رہا تھا باہر ایک کار آ کر رکی اور بھائی رشید حیدر' اور آپا صدیقہ کی لڑکیاں انور اور قیصر اور انور کے شوہر کیپٹن انصاری اندر آئے۔ رشید بھائی دورے پر کوئٹے آئے تھے اور کیپٹن اظہر انصاری کا وہاں تبادلہ ہو گیا تھا۔ انور نے کہا۔ "نور افشاں آپا نے بھی ائیر فورس جوائن کر لی ہے۔ ماری پور پوسٹنگ ہوئی ہے۔ پنڈی سے اب تک ماری پور پہنچ گئی ہوں گی"۔

"ذرا نہٹور اور لانکڑی کی لڑکیوں کو تو دیکھو۔ کوئی فوج میں ہے۔ کوئی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کے لئے ولایت گئی ہے"۔ حسن احمد ماموں نے اظہار خیال کیا۔

"ہمارے ہاں عورتوں کی تعلیم اور ترقی کا یہ پودا اکبری پھوپھی اور نذر باجی نے لگایا تھا۔ اب اس بات پر غور کرو تو حیرت ہوتی ہے"۔ حسنین ماموں نے پیچوان گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

اس وقت قالین میں بنے "شجر حیات" کے پھول پتے تیز برقی روشنی میں بہت روشن نظر آ رہے

تھے۔ اور زندگی کا تانا بانا حیرت انگیز تھا۔

اب گلاب کے پھولوں پر شبنم کے قطرے منجمد ہو جاتے تھے۔ (اس موتی پہ سورج کی کرن) اور میں نے آتشدان کے آگے بیٹھ کر افسانہ بعنوان "کیکٹس لینڈ"[6] لکھا۔ اور باغ میں خزاں زدہ پھولوں کی روحیں آوارہ ہوئیں۔ اور انگور کی بیلوں پر سرد زمردیں روشنی پھیلی اور شہر کے بازاروں میں چیتھڑے لپیٹے سرخ گالوں والے پر امید بچے چاء خانوں کے سامنے جمع ہوئے اور جنوری سنہ 50ء میں ایرانی بلوچستان سے سرد ہواؤں کے ریلے بہتے ہوئے آکر چلتان کے پہاڑوں سے ٹکرائے اور برف پڑی تو۔

5۔ دراحوال احفاد میر بندے علی بے تالپور

بھورے درہ بولان سے گذرتی، گرم دھواں اگلتی بولان میل آن کر کراچی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے لگ گئی۔ میں اور بھائی رشید حیدر جو کوئٹے سے ہمراہ آئے تھے ڈبے سے برآمد ہوئے۔ سامنے سعید بھائی موجود تھے۔

"سلاں علیکم"۔ کہنے لگے۔ "اچھو، پارے، رتی، نورافشاں کو آپ نے پچھلی بار کب دیکھا تھا؟"

"سلاں علیکم۔ چار پانچ سال ہوئے۔ علیگڑھ میں۔ پارے، جمال پور کے مقابلے میں بیٹھنے والے تھے اور نورافشاں آگرہ میڈیکل کالج جا رہی تھیں۔"

"اچھا، اب ایک کرامت کے زور سے وہ سب اس وقت ایک جگہ جمع ہیں اور وہاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

سفری اسباب سے لدی پھندی سعید بھائی کی بیوک شہر سے نکل کر کچے راستے پر گرد اڑاتی ساحل سمندر کی طرف چلی۔ ہاکس بے کی ایک چوبی کاٹج کے سامنے وہ سب موجود تھے۔ کچھ ہائیڈ پارک کورنر کا سا مجمع معلوم ہوتا تھا — بھائی ایوب احمد کرمانی باقاعدہ ایک کریٹ پر چڑھے سیاسی تقریر کر رہے تھے۔ ریت کی ڈھلوان سے اتر کر دوڑتا ہوا ہجوم کار کی سمت آیا۔ گرم پتلون، اوور کوٹ، دستانوں اور مفلر میں ملبوس نووارد خاتون کو دیکھ کر وہ سب ذرا ٹھٹکے پھر اچھو اور نورافشاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئیں۔

پارے اور عاصم ساحل پر سرپٹ بھاگتے ٹیلے پر پہنچے۔ "سلاں علیکم۔" پارے نے چھوٹتے ہی کہا۔

"وہ سامنے جو میم جا رہی ہے، نورافشاں نے شرط لگائی تھی کہ جا کر اس سے بات کر آئیں تو۔"

"سلاں علیکم۔" "تو ہم لوگ اس میم کے پاس۔" عاصم نے کہنا شروع کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کون سی میم؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو اونٹ پر سوار ہو رہی ہے۔ سامنے۔ ادھر دیکھیے۔ تو ہم بھاگم بھاگ اس کے پاس پہنچے اور پارے ماموں نے اس سے کہا۔ معاف کیجیے کیا آپ پچھلے سال 19 اپریل کے روز سڈنی میں تھیں؟ اس نے بڑی حیرت سے ہمیں دیکھا اور کہنے لگی جی نہیں۔ پارے ماموں بولے، کیا عجیب اتفاق ہے میں بھی اس روز وہاں موجود نہیں تھا۔"

"نورافشاں بیگم۔ لایئے پانچ روپے۔" پارے نے مطالبہ کیا۔

"پارے ادھر دیکھنا۔ جلدی۔ وہ دیکھو کون آ رہا ہے۔" نورافشاں نے گھبرا کر کہا۔

"بور صدیقی۔" پارے نے اطمینان سے دہرایا۔ "لایئے پانچ روپے۔"

"کمال ہو گیا۔" عاصم بولے۔ "علیگڑھ کے کیفے ڈی پھونس میں بور صدیقی آخری بار جب ملے تھے تو ہم نے ان سے ازراہ اخلاق کہا تھا کہ کسی روز پاکستان میں ہم سے ملنے آیئے گا۔"

وہ صاحب جن کا لقب بور صدیقی تھا۔ پارے کے کلاس فیلو رہ چکے تھے اور ہانپتے کانپتے ریت کا ٹیلہ چڑھنے میں مصروف تھے۔ نزدیک آ کر انہوں نے باآواز بلند اعلان کیا۔ "سلاں علیکم۔ میں جو ہوں صاحب، میں سیدھا فلائنگ آفیسر زیدی کے پتے پر ماری پور پہنچا۔ بلاک نمبر6۔ معلوم ہوا۔ تمام صاحبان جو ہیں وہ ہاکس بے تشریف لے گئے ہیں۔ اسی ٹیکسی پر براہ راست یہاں حاضر ہو رہا ہوں۔" اچانک ان کی نگاہ مجھ پر پڑی اور انہوں نے میری اسکیمو نما پوشاک کو بنظر غائر دیکھا۔ نورافشاں نے فوراً ان کا شبہ دور کیا۔ "آپ جو ہیں آپ کوئٹے سے براہ راست یہاں تشریف لا رہی ہیں۔"

"سلاں علیکم"۔ اب وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تو میاں آپ جو ہیں آپ فلائنگ آفیسر ہو گئے مبارک ہو۔" عاصم سے گرمجوشی سے مصافحہ۔ پھر بولے۔ "تو شاہیں ہے پرواز ہے۔۔"

"معاف کیجیے گا قطع کلام ہوتا ہے۔" عاصم نے کہا۔ "فلائنگ آفیسر زیدی وہ سامنے کھڑی ٹھنگ کر رہی ہیں۔"

بور صدیقی نے نورافشاں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

اس رات جب ماری پور کی سرخ چٹانوں کے نیچے سمندر خراٹے لے رہا تھا اور زمستاں کا طلائی چاند بحیرۂ عرب پر نورافشاں تھا، رہائش گاہ فلائنگ آفیسر نورافشاں زیدی کے ایک حجرے میں ان پانچ منتخب بندوں کی ٹولی مشرقی پاکستانی پٹ سن کے رنگین بوریے پر جمع ہوئی۔

"اجوا تین پھڑا اتار کر آرام سے بیٹھو۔ اور اچھوالین کٹر نوش کرو۔" ان میں سے ایک نے بھائی ببھو کے الفاظ دہرائے اور چھالیا کا ٹین وسط میں بطور شمع دھرا۔ اور ماجرا اپنی اپنی سیر کا سنانے پر کمر بستہ ہوئے۔ اس وقت نورافشاں کا برادر خورد عاصم زیدی کہ شہر لاہور میں چندے قیام کر کے آ رہا تھا، دریچے میں کھڑا تھا "باری تے کھلوتیاں، باری تے کھلوتیاں" گاتا تھا۔ بعد ازاں پہلی بندی چھالیا پھانک دوزانو بیٹھی اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح بیان کیا: "ہم میڈیکل کالج آگرہ میں فورتھ ایئر میں تھے۔ جب صورت فساد قائم ہوئی اور زخمیوں کے ٹرک بھر بھر کر کالج ہاسپٹل لائے گئے۔ ہم اسٹوڈنٹ ڈاکٹرز کی ڈیوٹی لگی۔ خون خرابہ بڑھا تو ہم اکٹھے لاہور روانہ ہوئے، لاہور سے ہم نے سنہ 48ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ آپا، ممن بھائی جان انڈیا سے پنڈی آ چکے تھے۔ بھائی جان[7] نے ہم سے کہا۔ آرمڈ فورسز میں ڈاکٹر لڑکیاں لی جا رہی ہیں۔ تم بھی فوج میں آ جاؤ چنانچہ ہم ایئر فورس میں بھرتی ہو گئے۔ پچھلے مہینے یہاں آئے۔ امی، ابا اور سب بہن بھائی انڈیا سے لاہور آ گئے تھے — ابا کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں زمینیں الاٹ ہو گئی تھیں۔ وہ وہاں پہنچے تو

معلوم ہوا وہ زمینیں بنجر ہیں۔ پھر وہ سب ہمارے پاس یہاں آ گئے ماری پور"۔ نور افشاں نے بات ختم کی اور مزید چھالیا پھانکی۔

اب مخدوم زادی اچھو (جس نے سال گذشتہ علم جغرافیہ میں فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے مدرسۃ العلوم علیگڑھ سے کیا تھا) نے چھالیا کا ڈبہ اپنی جانب سرکایا اور ایک آہ سرد کھینچی۔ جب اس کے کہنے کی نوبت پہنچی۔ چار زانو ہو کر کہا۔ "ہم گرلز کالج میں پڑھا رہے تھے۔"

"جب ایک روز آپ پر منکشف ہوا کہ انقلاب [8] فیل ہو گیا۔ بورژوا سیاست جیت گئی۔ دونوں ملکوں میں بورژوا سرمایہ دار حکومتیں قائم ہیں دختر من۔ چاہے جہاں رہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔" احقر العباد تذکرہ نویس نے اچھو شاہ کی بات پوری کی۔

تس پر خوش گلو عاصم زیادی نے دریچے میں نکلے نکلے جگر صاحب کے ترنم میں شروع کیا۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں
میرا حق ہے فصل بہار پر

بقیہ دلق پوشوں نے اس کا ساتھ دیا۔

"ہندوستان میں کنبے کا آخری اجتماع شملہ میں ہوا تھا۔" اچھو نے اداسی کے ساتھ پھر بات شروع کی۔ "سنہ 47ء کی گرمیوں میں ہم سب کالکا کے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوئے۔ امی جان' آپا عذرا' آپا ممن' آپا زہرا۔ خالہ نفیسہ' خالو اطاعت' امتیاز بھائی' آپا جمیلہ اور ان سب کے بچے اور بہت سارے ملازم۔ پینتیس لوگوں کا قافلہ۔ ٹرین کے کئی ڈبے ریزرو کروا لئے گئے تھے۔ شملے میں دو کوٹھیاں لی گئی تھیں۔ شملے پہنچنے کے چند روز بعد جرار بھائی کا علیگڑھ سے خط آیا۔ حالات مخدوش ہیں۔ تم لوگ فوراً واپس آ جاؤ۔

"جب فساد شروع ہو گئے۔ آپا ممن اور آپا زہرا سلیکس پہن کر وائسرائے کے دفتر گئیں جہاں سے وائسریگل کو نوائے دلی جانے والا تھا۔ لیکن وہ لوگ پہچان گئے اور کہا ہم آپ کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ اگر راستے میں حملہ ہوا ہم آپ کو وہیں اتار دیں گے۔ کونوائے کے ساتھ روانہ ہونے سے قبل آپا ممن کے بچوں منی' مشن کو سکھایا کہ امی خالہ ابو وغیرہ کہنے کے بجائے ممی ڈیڈی' آنٹی کہیں تاکہ ہم سب کو عیسائی سمجھا جائے۔ راستے بھر یہی فکر رہی کہ بچے غلطی سے امی یا خالہ کہہ کر کسی کو نہ پکاریں' جان ہتھیلی پر رکھ کر دہلی پہنچے۔ بھائی جان اٹلی سے واپس آ چکے تھے۔ جنگ کے بعد پونا ملٹری اکاؤنٹس میں تعینات تھے۔ وہاں سے ان کا تبادلہ لکھنؤ کا ہوا۔ لکھنؤ چھاؤنی پہنچ کر چارج لیا۔ لیکن دفتر کے عملے نے پن ڈاؤن اسٹرائیک کر دی کہ ہم ان کے ماتحت کام نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہ دہلی سے آپا ممن اور بچوں کو لیکر راولپنڈی پہنچے۔ شملے سے بھاگتے وقت آپا ممن بھی تمہاری طرح اپنے زیورات اور سامان وہیں چھوڑ آئیں۔ ایسا عجیب و غریب زمانہ تھا۔

"میں آپا زہرا' جرار بھائی کے پاس علیگڑھ آ گئی۔ امی جان اور اچھے بھائی بھی وہیں تھے۔ جرار

بھائی اتنے بڑے قوم پرست ہیں کہ ہندوستان چھوڑنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوئے۔"

"تم کو ذکی کے متعلق معلوم ہے؟ بھائی جان (جری احمد سید) کا منجھلا بھائی جامعہ ملیہ کا گریجویٹ۔ اور اس کو اس طرح دلی سے بھاگنا پڑا کہ ٹرین کا ڈبہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا اور مردوں کے انبار میں چھپ کر اس نے سارا سفر طے کیا۔ کرشن چندر کا پشاور ایکسپریس' اور ہم وحشی ہیں' بالکل جذباتیت نہیں ہے۔"

اب اچھو کا برادر خورد شاہ پیارے یعنی صلاح الدین حیدر میکینکل انجینئر کوٹ باندھ کر بیٹھا اور اپنی سیر کا بیان اس طرح کرنے لگا۔ "صاحبو تم کو یاد ہو گا۔ عرصہ تین سال کا ہوا اس بندے کو رزق کھینچ کر جمال پور لے گیا تھا۔ "کپی ٹیشن والا" کہلاتا تھا اور عیش کرتا تھا۔ جب پوری ہونے پیش گوئی شاہ نعمت اللہ دلی کا وقت آیا خود کو ریلوے ورکشاپ لاہور میں پایا۔ اب شہریار وقت' انجن برائے پاکستان ریلوے خریدنے ملک جاپان بھیجتا ہے۔ عنقریب روانگی ہے۔ دعاگو ہوں کہ تم سب سے ساتھ خیریت واپس آن کر ملاقی ہوں۔ سنا ہے اقلیم جاپان عجیب طلسم ہے۔ پارٹنر اب تم بتاؤ۔"

میر سلطان حیدر خنگ سوار یعنی رتی شاہ متحیر کامل زمزمے والے نے مراقبے سے سر اٹھایا کہا۔ "راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔" سب دلق پوش خاموش تھے۔ رتی نے کہا۔۔۔ بڑی ممانی جان (بیگم نثار حیدر زیدی) نے نہٹور سے لکھا ہے۔ ایک سال ہو گیا مگر وہ رات کو سو نہیں سکتیں تھی۔ کچھ دیر میں چلی گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

پچھلے سال اگست میں۔" رتی کی آواز بلند ہوئی۔ "وہ اور ماموں جان نہٹور میں تھے اور خوفناک خبریں پہنچ رہی تھیں ایک اطلاع ملی کہ شملے سے اترتے ہوئے سارا خاندان مارا گیا۔ پھر معلوم ہوا خبر غلط تھی۔ دوسری افواہ نہٹور پہنچی کہ دہرہ دون میں آشیانہ جلا دیا گیا اور ممانی نذر سجاد اور عینی بی بی لاپتہ ہیں اور قرولباغ دلی میں بھائی جعبو اور بھابی بلوائیوں کے نرغے سے نہیں نکل سکے۔ کلکتہ سے اطلاع آئی کہ لقمان بھائی کے گھر پر حملہ ہو گیا۔

"لقمان بھائی کے گھر پر حملے کی خبر صحیح تھی۔ روز دستی بم اور پتھر آن کر گرتے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ لقمان بھائی دفتر میں ہوتے تھے۔ آپا حسنہ بنو' پرد کو لیکر ایک کمرے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ آخر لقمان بھائی نے اپنا تبادلہ ڈھاکہ کروا لیا۔

نہٹور میں ممانی حمیدہ دہشتناک خبریں سن سن کر رات رات بھر صحن میں ٹہلا کرتی تھیں۔ حالات بہتر ہو گئے مگر اب وہ رات کو بالکل نہیں سو پاتیں۔

"غدر سنہ 57ء میں بھی نہٹور میں خوف و ہراس کا یہی نقشہ رہا ہو گا۔ قصہ خود اس کمترین کا بہت مختصر ہے۔ کیا عرض کریں۔ الا اسکے کہ شہر کوفی سے منزل منزل یہاں پہنچے۔ اورینٹ ایئرویز کے دفتر میں آب و دانہ لکھا ملا۔ کل کی خبر وہ نیلی چھتری والا جانتا ہے یا۔۔۔۔۔"

"میر بندے علی تالپور۔۔۔" عاصم نے دریچے میں سے کہا۔ "مرزا صاحب کے ہاں آئے ہیں"۔

"انہی کے اجداد سے سو ۱۰۰ سال قبل انگریز نے سندھ چھینا تھا۔" رتی نے ایک آہ سرد کھینچی۔

اور بولے --- "I HAVE SINNED" سر چارلس نیپیر نے تسخیر کے بعد شاید ملکۂ وکٹوریہ کو اطلاع دی تھی۔"

"دیکھیں کیسے لگتے ہیں۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔ ہم سب اٹھ کر دریچے میں گئے۔ باہر ایک معمر باوقار سوٹ بوٹ میں ملبوس بزرگ ایک لمبی تڑنگی امریکن خاتون کے ساتھ ایک طویل کار میں سے اتر رہے تھے۔ خاتون نے آئینوں سے مرصع قدیم سندھی شاہی پوشاک پہن رکھی تھی۔

"یہ میم صاحبہ۔" نور افشاں نے کہا۔ "پاکستان کی سوسیولوجیکل ریسرچ کے لئے آئی ہیں۔ نسیمہ ممانی بتا رہی تھیں۔ ان کو جم خانہ میں ملیں۔ ان سے کہا کہ کسی سندھی ارسٹوکریٹ سے ملنا چاہتی ہیں۔ مرزا صاحب نے ان کو میربندے علی تالپور سے ملوا دیا۔ میر صاحب نے معلوم ہوتا ہے کہ مارے شرافت و سخاوت کے ان کو اپنے توشہ خانے سے نکال کر ایک پرانی تاریخی پوشاک بھی پریذنٹ کر دی۔"

"جو انہوں نے فوراً پہن لی۔"

"برڈز آف پیسج نے پاکستان آنا شروع کر دیا ہے۔" رتی نے ایک اور آہ کھینچی۔

"سوسیولوجیکل ریسرچ کا قاعدہ ہے کہ جو پروجیکٹ شروع کرو اسی کے مطابق لباس پہنو۔" عاصم بولے

"تو یہ بی بی چٹاگانگ ہل ٹریکس اور ناگا لینڈ جائیں تو کیا کریں گی---؟" اچھو نے تردد سے دریافت کیا۔ وہ ہمیشہ اسی قسم کے سوالات کرتی تھی۔

"باجی--- باجی--- ریڈیو پر بڑی خوفناک خبر آئی ہے۔" نور افشاں کے تیسرے بھائی مصطفےٰ[9] عالم عرف مٹن نے اندر آ کر کہا۔ "فلاں صاحب کو کل صبح دس بجے گولی مار کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔"

ہم سب بھونچکے رہ گئے۔

"گولیمار---" دفعتاً عاصم نے نعرہ بلند کیا۔ "کراچی کے ایک علاقے کا نام ہے۔"

"آر یو شیور---؟" اچھو نے تشویش سے دریافت کیا۔

عین اس وقت ایک پٹھان افسر کی بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ نور افشاں سے نسخہ لینے آئی تھیں۔ نور افشاں کی والدہ اور ہماری تایا زاد بہن راضیہ خاتون (بنت سید اعجاز حیدر مرحوم) نے گیلری میں سے آواز دی--- "چلو--- کھانا لگ گیا۔"

ہم سب معہ مہمان خاتون ڈائننگ روم کی طرف چلے۔

"آپ لوگ--" کھانے کی میز پر سرحدی خاتون نے کہا۔ "فرش پر حلقہ بنائے اکڑوں کیوں بیٹھے تھے؟ اس طرح تو ہماری طرف قلندر درگاہوں پر جمع ہوتے ہیں۔"

"ہم لوگ انڈیا سے یہاں پہنچنے کا اپنا اپنا احوال بیان کر رہے تھے۔" رتی نے مختصراً جواب دیا۔

"بڑی ایڈونچرس جرنی ہوگی۔" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"غدر کے دنوں میں۔" آپا راضیہ نے کہنا شروع کیا۔ "جب میربندے علی جھانسی سے چلے۔"

"میربندے علی اتنے ضعیف تو نہیں معلوم ہوتے۔" خاتون نے تعجب سے آپا کی بات کاٹی۔ "میں نے ابھی ابھی ان کو ونگ کمانڈر مرزا کے ہاں دیکھا۔"

"یہ ایک اور بزرگ کا ذکر ہے۔" رتی بولے۔

"اچھا۔ وہ کون تھے جی۔؟"

"وہ--؟" نور افشاں نے سوچ کر جواب دیا۔ "وہ؟--- میربندے علی بے تالپور۔"

"ہائیں۔ اپنے بزرگوں کی شان میں گستاخی نہیں کرتے۔" آپا راضیہ نے ڈپٹا۔

بیگم شہباز خاں بہت کنفیوزڈ نظر آئیں۔ دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ نور افشاں کے دوسرے برادر خورد حاتم[10] نے آواز دی۔

"باجی۔ آپ کی کال آگئی۔" نور افشاں کھانا ادھورا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ "آج رات سے ہماری چوبیس ۲۴ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔" اس نے اپنا سیاہ بیگ اٹھا کر پچھلے برآمدے کی طرف بھاگتے ہوئے مطلع کیا۔ باہر ہسپتال کی جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

"اب ہم پھر اس نان جویں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس پر مدار قوت حیدری ہے۔" رتی میاں نے ارشاد کیا۔

بیگم شہباز خاں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

آپا راضیہ نے پھر کہا۔ "تم لوگ نوجوان ہو۔ اور یہاں نئی زندگیاں شروع کرنے والے ہو۔ خدا جس حال میں رکھے اس کے شکرگزار رہو۔ اور حالات بہتر ہوں تب بھی غرور نہ کرنا۔ یہی ہمارے دادا جان کی نصیحت تھی۔"

مجھے دادا جلال الدین حیدر کا نصیحت نامہ[11] یاد آیا جو انہوں نے اپنے چاروں بیٹوں، باجی راضیہ کے والد، ابا جان اور چچا نصیر، چچا وحید کے لئے لکھا تھا جب وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی نئی زندگیاں شروع کرنے والے تھے۔ آپا راضیہ کہتی رہیں۔ "مجھے یاد ہے۔ جب سنہ 44ء میں زہرا بی بی کی شادی ہوئی تھی ان کو جہیز میں چاندی کا بہت سارا سامان ملا تھا۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار اپنے والدین کے ہاں علیگڑھ سے ٹونک گئیں۔ ایک چاندی کا گلاس ساتھ لیتی گئی تھیں۔ کھانے کی میز پر عبدالرحمٰن وہ گلاس ان کی پلیٹ کے سامنے رکھ دیا کرتا۔ چچا نصیر نے چند روز تک یہ دیکھا پھر بولے۔ زہرا بی بی آپ چاندی کے گلاس میں پانی کیوں پیتی ہیں۔ وہ ہڑبڑا گئیں۔ ان کو اس بات کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ چچا جان مرحوم بیٹی سے کہنے لگے۔ کبھی چاندی سونے کے برتنوں میں کھانا پینا نہیں چاہئے اس سے غرور بڑھتا ہے۔"

دوسرے روز صبح سویرے اعجاز فاطمہ حبیب نے بالائی منزل سے جھانک کر مجھے آواز دی---

"تمہاری دوست ای نذ لکھنؤ سے آگئی ہے۔"

ای نڈ۔؟ لکھنؤ سے۔۔۔ ماری پور۔۔۔؟ ہم لوگ سمندر کے رخ والے برآمدے میں بیٹھے صبح کی چاء پی رہے تھے۔ سامنے سطح آب پر سفید پرند چکر کاٹ رہے تھے۔ عاصم ایرونوٹیکل انجینئرنگ کی ضخیم کتاب کے مطالعہ میں مصروف آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ مرزا ماموں اور نسیمہ ممانی کے بچے نادرہ' ہنی اور علی اور آپا راضیہ کے چھوٹے بچے رانی 'گڈو' بھیا سامنے چٹانوں پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ای نڈ جن کو آخری بار اپریل سنہ 47ء میں کیلاش ہوسٹل میں شاہ بلوط کے نیچے خدا حافظ کہا تھا' ایک طویل القامت خوش شکل پٹھان افسر کے ساتھ بجری کے راستے پر نمودار ہوئیں۔

فلائنگ آفیسر خوشحال خاں جدون نے مطلع کیا۔ سنہ 46ء میں پشاور سے لکھنؤ گئے تھے۔ ایم اے ایل ایل بی کرنے۔ تقسیم کے بعد لکھنؤ سے چلتے وقت اس بی بی سے ملاقات ہوئی۔

"ہم لوگ پاغل کی مثال لو میں گر گئے۔" ای نڈ نے ارشاد کیا۔ موصوفہ کی نانی امریکن مشنری اور والدین کوہستان کمایوں کے باشندے تھے۔ لیکن جب سے کیلاش ہوسٹل میں "پٹھین" بولنے کا رواج ہوا تھا آپ اسی قسم کی زبان استعمال فرماتی تھیں۔

ای نڈ اور جدون چار بلاک آگے رہتے تھے۔ نور افشاں کا فلیٹ اسی "جزیرہ نما" والی عمارت میں تھا جس میں پہلے ماموں ظہور العسکری رہتے تھے جو چند ماہ قبل ٹرانسفر ہو کر پشاور جا چکے تھے۔ ہمارے عین اوپر مرزا ماموں اور نسیمہ ممانی کا فلیٹ تھا۔ نیچے کونے والے بیڈ روم میں نور افشاں' اچھو اور میں فروکش تھے۔ ایک شام اچھو بیڈ روم کے دریچے میں کھڑی سمندر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ دفعتاً فرمایا۔ (آپ اس قسم کی تحقیقات اکثر کیا کرتی تھیں) "تم نے غور کیا۔ یہ زمین کا بالکل آخری سرا ہے جہاں اس وقت ہم لوگ موجود ہیں۔ اس کے آگے بقول مجاز 'بس آب و ہوا ہی آب و ہوا ہے۔" سامنے سرخ چٹانیں بکھری تھیں۔ سمندر کی ایک چھوٹی سی خلیج دریچے تک پھیلی ہوئی تھی۔ دور افق پر بندرگاہ کیماڑی کے مستول اور کرین نظر آرہے تھے اور منوڑہ لائٹ ہاؤس جو رات کو منور ہو جاتا تھا۔ اسی طرف کسٹم ہاؤس کا گنبد نظر آتا تھا۔ ایک جانب لاس بیلہ کی ارغوانی پہاڑیاں تھیں۔ اسی کے آگے قلات تھا اور اس کے آگے بلوچستان اور اس کے آگے ایران۔ اور اس کے آگے۔۔۔۔

"تم نے غور کیا۔" اچھو نے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے بات جاری رکھی۔ "کہ اگر ہم اس کھڑکی سے نکل کر کوے کی طرح اڑیں تو دو گھنٹے میں سیدھے تہران پہنچ جائیں۔ یہ کرہ زمین کا آخری سرا ہے۔ لینڈز اینڈ۔"

باہر چٹانوں پر سے نور افشاں کے چوتھے چھوٹے بھائی خورشید[12] نے آواز دی۔ "آیئے کشتی تیار ہے۔" خورشید کہیں سے ربر کی دو کشتیاں لے آئے تھے اور سہ پہر سے ان کے انتظام میں لگے تھے۔ اکثر ہم لوگ ان کشتیوں میں بیٹھ کر خلیج کی سیر کرتے۔ کشتی الٹ جاتی تو اتھلے پانی میں اطمینان سے چلتے کنارے پر آجاتے۔

اس روز ہم لوگ کشتی کے بعد چٹانوں پر سے کودتے پھاندتے گھر آرہے تھے کہ سامنے سے سید

مظہر امام کی ہڈسن آتی دکھلائی دی۔ وہ آکر بجری پر رکی اور مظہر صاحب' پارے اور ایوب بھائی برآمد ہوئے۔ (پارے' میاں' سعید بھائی کے ہاں شہر میں مقیم تھے) ہڈسن سے اترتے ہوئے مظہر صاحب نے آواز دی۔ "ہم لوگ آپا صدیقہ کے ہاں سے آرہے ہیں۔ مبارک ہو۔ رتی کشور کی شادی طے ہو گئی۔"

رتی میاں یعنی سید سلطان حیدر دادا اکرم حیدر ترمذی کے پوتے' چچا غنی حیدر اور پھوپھی انوار فاطمہ کے سپوت جائے۔ سید لقمان حیدر کے ہونہار برادر خورد سب سے آخر میں ہڈسن میں سے طلوع ہوئے۔ آپ کا اوریجنل نام رمضان حیدر تھا۔ علیگڑھ اسکول میں "رمضان شریف آرہے ہیں" کا شور مچا۔ آپ نے نام تبدیل کر کے سلطان حیدر رکھ لیا۔ (سلطان حیدر صغیر عرف رتی میاں یار باش' خوبرو' خوش گلو نوجوان فی الوقت اپنی والدہ اور بھائی احسان حیدر کے ساتھ پیر الٰہی بخش کولونی میں اقامت پذیر تھے۔ رتی میاں کے ہم جماعت سید مظہر امام گیا کے رہنے والے تھے' ثقہ' نیک طبیعت' نرم مزاج' ہوشمند اور بہار کی فیوڈل تہذیب کا ایک پاکیزہ اور ارفع نمونہ۔ والد ان کے سید حسین امام ممبر راجیہ سبھا نئی دہلی ہنوز ہندوستان میں مقیم تھے۔ صاحبزادگان نے کراچی آکر وسیع کاروبار شروع کر دیا تھا۔ جوان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ مگر بڑی بہادری سے بزنس میں لگے ہوئے تھے۔

نسیمہ ممانی اوپر اپنے برآمدے میں کھڑی تھیں– رتی میاں کے متعلق مژدہ جانفزا سن کر فوراً نیچے آئیں۔ کشور جہاں بیگم نور افشاں کی خالہ زاد بہن اور رتی میاں رشتے میں نور افشاں کے ماموں تھے۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے مظہر صاحب نے کہا "ہمارے ہاں بہار میں ماموں سے مذاق کیا جاتا ہے۔"

"جیسے جیسے پورب کی طرف جایئے مذاق کے رشتوں کا درجہ شائد بڑھتا جاتا ہے۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

"تو جاپان میں دادا سے مذاق کیا جاتا ہو گا۔" نسیمہ ممانی بولیں۔

عاصم نے کھنکار کر کہنا شروع کیا۔ "جزائر ہوائی میں۔" ایوب بھائی بولے۔ "معاف کیجئے آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔"

"ایوب بھائی معاف کیجئے آپ کے قطع کلام کا قطع کلام ہوتا ہے۔" حاتم نے کمرے میں آکر کہا۔ "کراچی سے نور اللہ بھائی کا فون آیا ہے۔ جلدی چلیئے۔ زوال حیدر آباد شروع ہونے والا ہے۔"

"زوال حیدر آباد اب شروع ہونے والا ہے؟" ایوب بھائی نے تعجب سے پوچھا۔

اس رات جب ہم لوگ کراچی کی صنعتی نمائش میں "زوال حیدر آباد" نامی مقبول ڈرامہ ملاحظہ کر کے نکلے دیکھا کہ ایک طرف ظہیر کاشمیری ٹہل رہے ہیں۔ ایوب بھائی نے تعارف کرایا– واپسی میں پارے نے کہا۔ "آپ نے غور کیا۔ ظہیر کاشمیری۔ سرخ داڑھی۔ نیلا سوٹ۔ سلیم شاہی جوتے۔ بالکل شیکسپیئر معلوم ہو رہے تھے۔"

"شیکسپیئر سلیم شاہی جوتے کہاں پہنتا تھا۔" نور افشاں نے سوچ کر کہا۔

ماری پور کے راستے میں کھارادر کے موڑ پر نور اللہ نے کار روک لی۔

"ایک صاحب نے بیچ سڑک کے شامیانہ لگا رکھا ہے۔ آگے نہیں جا سکتے۔" میں نے اطلاع دی۔

نور اللہ کاظمی نے معائنے کی غرض سے کار ایک طرف پارک کی۔ یہ بندہ خدا الہ آباد والے خان بہادر اسد اللہ کاظمی کا لڑکا اور ہم لوگوں کا بچپن کا ساتھی اور رتی 'پارے کا یار غار تھا۔ ہم لوگ اسے کبھی یاد دلانا نہیں بھولتے تھے کہ بیکٹ ہاؤس' الموڑے میں وہ اپنے چپراسی کے کندھے پر سوار ہو کر آتا تھا اور وہ اور پارے اور اقبال رشید صدیقی جب بے حد شرارتیں کرتے تھے تو ان کو سب سے زیادہ ڈانٹ پڑتی تھی۔ اب وہ کراچی آ کر بزنس کر رہا تھا ایک بہت کیم شحیم کار خریدی تھی اور خوفناک مونچھیں رکھ لی تھیں۔

"ایک صاحب کی شادی ہو رہی ہے چلو بارات میں شامل ہو جائیں۔ پہلے ذرا موقع محل دیکھ کر آتے ہیں۔" پارے نے کہا۔ وہ اور نور اللہ کود کر باہر گئے۔ کچھ دیر بعد رتی نے باہر جھانک کر کہا۔ "پارے اور نور اللہ تو ہنسی کے مارے لوٹن کبوتر بنے جا رہے ہیں۔ ہم دیکھ کر آئیں کیا ماجرا ہے۔"

واپس آ کر نور اللہ نے کار ذرا آگے بڑھائی۔ شامیانے میں گیس کے ہنڈے کے نیچے سڑک کے عین وسط میں ایک بے حد و حساب موٹا آدمی دھاری دار سلیپنگ سوٹ پہنے مصروف رقص تھا۔ وہ چک پھیریاں کھاتا جاتا تھا اور بے تکان گا رہا تھا۔ "دولہا پانچ من کے۔ دلہن سات من کی۔ پہلے آنا ہمارے انگنا"۔

ایوب بھائی نے تردد سے کہا۔ "اب مجھے یہ فکر لاحق ہے کہ ایک اور لغو گانا آپ لوگ گایا کریں گے"۔

6۔ یمن کلیان اور مون لائٹ سوناٹا

"شمانہ میں پیش کرتے ہیں"۔ نور افشاں سنجیدگی سے شروع کرتیں۔ "نہ کر ہم نشیں۔ بے اے دقوادنی ای کی باآتیں ایں۔"

"میں بھولا نہیں ہوں اوں دقو۔ نی ای کی باتیں۔" میں آواز لگاتی۔

"تم لوگ بڑے آغا کے ہاں یہ سیکھ رہی ہو۔؟" مرزا ماموں جان تعجب سے پوچھتے۔

"جی نہیں ہم نے خود کمپوز کیا ہے۔"

"اچھا اب ہم مالکوس میں کلام اقبال سنائیں گے۔" نور افشاں دوسرے نغمے کا آغاز کرتیں۔ "پھر چراغ لالہ سے اے رواوشن ہوئے اے۔"

"کوہو اودمن۔ ا آ آ۔۔۔" میں تان لگاتی۔

"پھول ہیں۔۔۔۔ صحرا میں یوں۔ پریاں قطار اندر قطار۔"

ہمارے اسٹار سنگرز رتی پارے اور عاصم تھے کہ بہت ہی سریلی آوازیں پائی تھیں اور خوب گاتے تھے۔ پکے گانے کے سلسلے میں رتی میاں تلمیذ الرحمن تھے۔ ان کو یہ کمال قدرت نے عطا کیا تھا کہ جس راگ

یا راگنی میں گانا شروع کرتے وہ لا محالہ شنکرا میں ختم ہوتا تھا۔ نسیمہ ممانی اچھا گاتی تھیں۔ ای نذ جو لکھنؤ ریڈیو سے مستقل گایا کرتی تھیں اب ای نذ جہاں آراء جدون کے نام سے ریڈیو پاکستان سے "ہلکے پھلکے نغمے" نشر کر رہی تھیں۔ میوزک پارٹیاں بے ساختہ اور فی البدیہہ ہوتی تھیں۔ اتوار کے روز صبح ناشتے کے بعد ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ کر گھنٹوں گایا جاتا تھا۔ ایک کزن آپا نسیمہ کے شوہر عباسی بھائی استاد گلوکار تھے۔ کبھی ہم لوگ رتی میاں کے دوست فرحت سعید چھتاری (جن کی بالکل اپنے نامور اور محترم والد کی سی مونچھیں تھیں) کے ہاں کراچی جا کر ان کی میوزک پارٹیوں میں شاہد احمد دہلوی سے بے حد پکے راگ سنتے۔ شاہد صاحب پر دلی کی تباہی کے بعد وہ بے خبری وقت پڑا تھا کہ وہ گذر اوقات کے لئے ریڈیو پاکستان سے ایس۔ احمد کے نام سے کلاسیکل موسیقی نشر کرتے تھے اور کسی نہ کسی طرح بہادری کے ساتھ رسالہ ساقی نکال رہے تھے۔

ماری پور میں ہماری محافل موسیقی کا ایک گیسٹ آرٹسٹ ضیاء محی الدین تھا کہ افسانے بھی لکھتا تھا اور نہایت پروگریسیو انٹلکچوئیل باتیں کرتا تھا۔ بھائی جان جری احمد سید کے چھوٹے بھائی تقی احمد سید کے ساتھ ریڈیو پاکستان مری میں ملازم تھا۔ وہاں سے کراچی آیا تھا۔ مزید میوزک پارٹیاں سعید بھائی' آپا عذرا کے ہاں میکلوڈ روڈ پر منعقد ہوتی تھیں۔ سعید بھائی بلند شہر سے آ کر کراچی الیکٹرک سپلائی کے ڈسٹری بیوشن انجینئر ہو گئے تھے۔ اور حسین اور پر فضا بے حد وسیع فلیٹ ان کو کمپنی کی طرف سے ملا تھا جو پہلے انگریز انجینئر کی جائے رہائش تھا۔ اس فلیٹ کی ایک خوبصورت لاؤنج میں آپا عذرا کی محافل دانشوراں آراستہ ہوتیں جن میں جب فیض احمد فیض کراچی آتے تو اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔

اس زمانے میں نماز پڑھنے کا موڈ طاری تھا۔ پہلی مرتبہ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی وہ آپا عذرا کے ہاں لاؤنج میں آئے بیٹھے تھے کسی نے ان سے جا کر کہا۔ "ابھی آتی ہیں ذرا نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"نماز پڑھ رہی ہیں؟" فیض صاحب نے سکون سے کہا۔

آپا زہرا علیگڑھ سے آئی ہوئی تھیں۔ مظہر صاحب کے ایک کزن جو اوکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور فلسفی تھے اور ساتھ ہی بہار کی کسی درگاہ کے سجادہ نشین وہ بھی انڈیا سے آئے ہوئے تھے۔ اسی وقت مظہر صاحب کے ساتھ وہ تشریف لے آئے۔ اس شام مابعد الطبیعات' مذہب اور مادیت پر بڑی زبردست روشنیاں ڈالی گئیں۔ مظہر صاحب نے کہا۔ "آپا۔ یہ جو آپ نے اپنے ہاں اٹھارہویں صدی فرانس کا سیلوں آراستہ کر رکھا ہے۔ ایک غیر طبقاتی سماج میں آپ کو اس ذہنی عیش و عشرت کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"خیر سیلوں نہ سہی۔ ہیلیس آف کلچر ہی سہی۔"

"اور اگر جواب اس میں بھی نہ ملا تو۔؟" اوکسفورڈ کے سجادہ نشین نے پوچھا۔

"بہرحال ایک بنیادی ہارمنی SUBSIST کرتی ہے۔ شاید۔" میں نے کہا۔

"ہوں۔" فیض صاحب نے اظہار خیال کیا۔

"بل بل جاؤں مدھر سر گاؤں۔ اب کی بیر مورے کرشن کنہیا۔۔" نور افشاں الیا بلاول کا سبق

گنگناتی ہوئی برابر کے کمرے سے گذر گئیں۔

"یہ دیکھ لیجئے۔ اب تک کرشن کنہیا کا ورد جاری ہے!" ایوب بھائی نے کہا۔

"یہ بھی ایک بنیادی سوال ہے۔" اوکسفرڈ کے تعلیم یافتہ سجادہ نشین نے کہا۔

فلائٹ لفٹیننٹ نور افشاں زیدی اس وقت بڑے آغا کے ہاں سے سیدھی آپا عذرا کے ہاں آئی تھیں۔ جس روز ان کی چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی وہ شہر آکر بڑے آغا سے علم موسیقی کی تحصیل کرتی تھیں۔ بڑے آغا کو نور افشاں نے ڈسکور کیا تھا۔ ایک روز انہوں نے شہر سے گھر واپس آکر مجھ سے کہا۔ "ہم پیراڈائز سینما کے نزدیک ایک سڑک پر سے گذر رہے تھے۔ ایک مکان پر "میوزک اسکول" کا بورڈ نظر آیا۔ ہم اندر گئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ ایک سنسان کمرے میں دری پر چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کراچی آنے سے قبل لکھنؤ میرس کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ بے چارے کہنے لگے یہاں آن کر یہ اسکول کھولا مگر شاگرد میسر نہیں۔ بٹیا تم کیا کرتی ہو۔ ہم نے بتایا کہ ڈاکٹر ہیں۔ کہنے لگے بٹیا ہماری لڑکی کو نرسنگ کی ٹریننگ دلوا دو کہ گھر کا خرچ چل سکے۔ ہمارے اوپر پیغمبری وقت پڑا ہے۔"

شام کو نور افشاں گانا سیکھ کر بس پر واپس آتی اور فلیٹ سے ملحق سنسان کوریڈور میں داخل ہو کر گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے یمن کلیان کا "مندر من لائے۔" گنگناتی پچھلے برآمدے میں داخل ہوتی۔ ایک شام ایوب بھائی اسی وقت آکر اترے۔ کہنے لگے۔ "آج آپ کون سا سبق گاتی ہوئی آرہی تھیں۔؟"

"ہم؟ ۔۔ وہ والا۔ منہروا موہے ہری ہری چوریاں دیہو منگائے۔ الہیا بلاول۔ تین تال۔"

"ماشاء اللہ۔ اگر آپ یونیفارم اور اپنی پیک کیپ لگا کر اس کے بعد یہ گانا بھی گائیں تو بور صدیقی کا کیا حال ہو۔ پہلے انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا تھا اب کانوں پر یقین نہ آئے گا۔"

دن کے وقت میں نے بڑے آغا کے ہاں جانا شروع کیا۔ ایک اجاڑ سے احاطے کے وسط میں صرف ایک کمرہ کھڑا تھا جو غالباً کسی ادھورے مکان کا حصہ تھا۔ اندر ایک دری بچھی تھی۔ آلات موسیقی دیواروں سے لگے رکھے تھے۔ بڑے آغا ایک گدیلے پر دیوار کے سہارے دن بھر چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ میرے اور نور افشاں کے علاوہ اکا دکا شاگرد اور آنکلتا تھا۔ ایک بار ایک صاحب سیاہ شیروانی' سفید کھڑکھڑاتی شلوار میں ملبوس بڑے آغا سے ملنے تشریف لائے۔ میں نہایت دلجمعی سے بھائیں بھائیں تانیں اڑایا کی۔ وہ غریب اخلاق سے خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بڑے آغا سے پوچھا۔ "یہ کون صاحب تھے؟"

"استاد بڑے غلام علی خاں صاحب کے صاحبزادے استاد منور علی خاں"۔

"اور مائی گوش.... "جہالت بڑی رحمت ہے۔

میں بنارس یونیورسٹی کے ہائی اسکول کے امتحان کے لئے استاد سورج بخش سریواستوا کی شاگردی میں میرس کالج لکھنؤ کا سیکنڈ ایئر تک کا کورس کر چکی تھی (اس زمانے میں نمبر21 فیض آباد روڈ پر بھائی بھی استاد ادریس خاں سے پکے گانے کا درس لیا کرتے تھے۔) اس لئے کچھ شد بد تھی۔ چند ماہ بڑے آغا صاحب

سے سیکھا۔ مگر چچا مشتاق احمد زاہدی اور ایل۔ ایم۔ سین والی بات ایک بار پھر کہ پتہ نہ مارا گیا۔

ایک روز بڑے آغا کے ہاں سے لوٹتے میں کچھ فاصلے پر ایک اونچی بلڈنگ کی ایک بالکنی پہ "ایف۔ ایکس۔ فرنینڈیز پیانو ٹیچر" کا بورڈ آویزاں نظر آیا۔ ماری پور واپس آکر میں نے نسیمہ ممانی سے کہا۔ "کیوں نہ پیانو سیکھا جائے۔"

گروپ کیپٹن نور خاں کی حیدر آبادی بیگم اپنا تقریباً نیا جرمن پیانو فروخت کر رہی تھیں۔ دوسرے روز ان سے وہ پیانو خریدا اور نسیمہ ممانی کے ساتھ صدر میں گوانی عیسائی پاڑے کی ایک میوزک شاپ پر پہنچی۔ ایک نیم تاریک بوسیدہ حال میں انواع و اقسام کے نئے اور پرانے پیانو اور میوزک کی کتابوں کے انبار رکھے ہوئے تھے۔ ایک عدد پیانو نسیمہ ممانی نے خرید فرمایا۔

اب ہم دونوں نے روزانہ صبح دس بجے مسٹر فرنینڈیز سے پیانو سیکھنے جانا شروع کیا۔ دہرہ دون اور لکھنؤ کے کانونٹ اسکولوں میں اس فرنگی باجے کی ابتدائی واقفیت میں نے اور پریزنٹیشن کانونٹ راولپنڈی میں اتنی ہی جانکاری نسیمہ ممانی نے اس کی حاصل کی تھی۔ چند ہفتوں میں ہم لوگ "چل نکلے"۔ ماری پور واپس آکر روزانہ گھنٹوں دقیق جان لیوا سرگموں کی مشق اور دو درجن میجر اور مائنر KEYS کی باریکیوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد کونسرٹو' سوناٹا' فرسٹ مومنٹ فارم وغیرہ وغیرہ کا مطالعہ کرتے اور "لیٹل اینی رونی"۔ "جس آدمی نے مونٹی کارلو کا بنک لوٹا۔" "بوڑھے سیب کے درخت کے نیچے۔" "سوانی"۔ امریکن ڈکسی لینڈ کے گیت' آئرش اور اسکاٹش دھنیں۔ اطالوی اوپیرا کے نغمے' والگا بوٹ مین کا گیت' ایک پولش مزدور کا وغیرہ وغیرہ بجاتے اور بااخلاق سامعین سر دھنتے۔ جب ہم لوگ واگنز' شوپاں' ویبر وغیرہ کے سہل کئے ہوئے اسباق پر پہنچے مسٹر فرنینڈیز نے ایک روز مجھ سے کہا۔ "مسز مرزا بہت محنت سے سبق یاد کرتی ہیں۔ اگر تم بھی دل لگا کر محنت کرو چند سال بعد لندن کے ٹرنٹی کالج آف میوزک کا امتحان دلوا دونگا۔"

میں نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ ہندوستانی شاستریہ سنگیت کے مانند پیانو علم دریاؤ تھا اور وقت بہت کم تھا۔ مسٹر فرنینڈیز بیحد سویٹ انسان تھے بڑے صبر سے سکھلاتے تھے۔ اکثر ہمارے ساتھ وائلن پر ڈوئیٹ بجاتے۔ ان کی بیوی اور سات بچے بطور سامعین ان کے سٹنگ روم میں جمع ہو کر ہمارے کمالات سنتے اور گلاس کیس میں رکھی یسوعؑ و مریمؑ کے اونچے مجسمے کے سامنے شمع فروزاں رہتی۔

ریڈیو اسٹیشن ابھی اٹلیجنس اسکول کی ایک پارک میں عارضی طور پر قائم تھا باہر قطعہ زمین پر کرسیاں بچھائے ملک حبیب احمد اور ذوالفقار احمد بخاری بیٹھے تھے۔ اندر ای نغمہ اپنا پروگرام نشر کر رہی تھی۔ بخاری صاحب نے حال ہی میں ٹھمری' دادرے ممنوع کر دیئے تھے۔ کہنے لگے کہ ہمیں دونوں ملکوں کے درمیان ایک تہذیبی دیوار کھڑی کرنی ہے۔

میں نے کہا "تو پھر آپ کو درگا' شنکرا' بھیروں' بھیرویں' شام کلیان' چندرکونس' وغیرہ بھی تبدیل کرنے ہوں گے۔ مثلاً شنکرا کے بجائے عبدالشکور۔ درگا کے بجائے دردانہ۔ اب آپ دردانہ میں ایک

خیال سنئے۔"

"ہمیں اپنی علیحدہ کلچر کی تشکیل کرنی ہے۔" بخاری صاحب نے دہرایا۔

میں نے کہا۔ "روس سمیت سارا یوروپ ساری مغربی موسیقی کو اپنا مشترکہ سرمایہ جانتا ہے۔ ایسا ہی اس برصغیر میں کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ہمارے کلچر کا مسئلہ یوروپ کے تہذیبی ارتقاء سے بالکل مختلف ہے۔ ہمیں اپنا تہذیبی رابطہ مشرق وسطیٰ سے قائم کرنا ہے"۔ انہوں نے کہا۔

میں نے کہا۔ "مشرق وسطیٰ سے ہمارا رشتہ تو امیر خسرو کے وقت سے قائم ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ڈھول، طبلہ، طنبورہ، سرود، شہنائی سب وہیں کی دین ہے۔ مگر ہندوستانی راگوں کو کس طرح ترک کریں گے؟ اور پھر یہ بخاری صاحب کہ مشرقی پاکستان میں روبند شو سنگیت کے بغیر لوگوں کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

"لیکن وہاں کی مسلم لوک سنگیت، نذرل گیتی وغیرہ اب پاکستان کی روایات میں شامل ہیں۔"

"بخاری صاحب۔ ان سب کی بنیاد بنگالی علاقائی موسیقی پہ ہے۔ جیسے سندھ اور پنجاب کی علاقائی موسیقی اور دیسی پنجابی موسیقی، مشرقی پنجاب میں بھی۔"

"آپ نے ہمارے تہذیبی مسائل کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔" بخاری صاحب بولے۔ اتنے میں ای نذ کلچر کے دقیق مسائل سے لاعلم اور بے نیاز اپنا پروگرام ختم کرکے حسب عادت شاداں و فرحاں اسٹوڈیو سے باہر نکلی۔ بخاری صاحب اور ملک حبیب احمد کو خدا حافظ کہہ کر ہم لوگوں نے آپا عذرا کے گھر میکلوڈ روڈ کا رخ کیا۔ وہاں لاؤنج میں اس وقت "محفل موسیقی" جاری تھی اور پارے اور رتی زور و شور سے ثریا کا تازہ ترین گیت الاپنے میں مصروف تھے۔ رتی نے تان لگائی۔ "دور پپیہا بولے --- رات آدھی رہ گئی --- میراجی ہے اداس جیا مند مند ہے --- بادلوں کے گھیر میں چاند۔ نظر بند ہے۔"

"سیفٹی ایکٹ میں ---" ایوب بھائی نے گرہ لگائی۔

سیفٹی ایکٹ نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔ ایوب بھائی نے ہم لوگوں کو ماری پور میں اسٹالن پرائز یافتہ سوویٹ ناولوں اور رسالہ سوویٹ لٹریچر کے انبار لا کر دیدیے تھے۔ جب ایوب بھائی پاکستان ٹائمز گروپ کے اردو روزنامے امروز کے غالباً اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو کر لاہور چلے گئے ہم لوگوں نے ان کو جو خط لکھا اس کا ایک صفحہ روسی نما حروف میں اڑنگ بڑنگ الفاظ لکھ کر پر کیا اور حاشیے پر تیر کا نشان بنا کر رقم کیا۔ "یہ روسی زبان میں تحریر کیا ہے۔ آپ کی خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔"

چند ہفتے بعد ایوب بھائی کراچی آئے۔ "لاہور میں" انہوں نے کہا "چھاپے پڑ رہے ہیں۔ ایک صاحب کے ہاں زیرو بم پکڑی گئی۔ انسپکٹر صاحب نے پوچھا یہ کس قسم کا بم ہے۔ پھر وہ میرے مکان کی تلاشی لینے آیا۔ آپ صاحبان کا خط شامت اعمال سے میری میز پر اوپر ہی پڑا رہ گیا تھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر وہ مہمل، روسی اور حاشیے کا نوٹ دیکھ کر اس مرد خدا نے کہا۔ "اچھا آپ کی روسیوں سے باقاعدہ خط و کتابت بھی ہے۔ خوش قسمتی سے میں قید ہونے سے بال بال بچ گیا۔"

پھر ایوب بھائی نے مرزا ترسون زادے والا قصہ سنایا۔ مرزا ترسون زادے اور دوسرے سوویٹ ادیب لاہور تشریف لائے تھے۔ یار لوگوں نے ان کے کپڑوں کو چھو چھو کر دریافت کیا۔ "یہ کوٹ پتلون آپ کی ذاتی ملکیت ہے یا اسٹیٹ پراپرٹی۔ مرزا ترسون زادے نے پوچھا۔ آجکل کامریڈ سجاد ظہیر کہاں ہیں؟ ایک صاحب نے بزبان فارسی جواب دیا۔ "زیر زمین"۔ ان کا مطلب تھا انڈر گراؤنڈ۔ مرزا ترسون زادے کا چہرہ رنج و غم سے سفید پڑ گیا۔ وہ سمجھے بنے بھائی کا خدانخواستہ انتقال ہو گیا۔"

مولانا چراغ حسن حسرت کے تازہ ترین لطیفے ان ہی کے مخصوص لہجے میں سنانے کے بعد ایوب بھائی بولے "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ نقوش، سویرا اور ادب لطیف آپ کو BAN کر چکے ہیں۔ آپ محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں اور عزیز احمد سب نہایت رجعت پسند ادیب ہیں۔"

"معلوم ہے" میں نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

ایوب بھائی اور رتی میاں کراچی واپس جانے کے لئے اٹھے۔ اچانک عاصم نے گھڑی دیکھی اور کہا "ذرا ٹھہریئے" اور آتش دان میں منہ ڈال کر زور سے چلائے۔ "جاگتے رہو"۔

"یہ کیا بچپنا ہے؟" ایوب بھائی نے کہا۔

"دیکھئے ایوب بھائی۔" عاصم نے شرلک ہومز کی طرح جواب دیا۔ "آپ یہ آتش دان دیکھتے ہیں۔ اس کے اور پڑوسی کے آتش دان کا خلا مشترکہ ہے۔"

"خلاسب کا مشترک ہے"۔ رتی میاں نے چونک کر فلسفیانہ انداز میں ارشاد کیا۔

"اور اونچی آوازیں سب دوسری طرف جاتی ہیں۔"

"آوازیں سب دوسری طرف جاتی ہیں۔" رتی میاں نے مابعد الطبیعاتی گمبھیرتا سے فرمایا۔

"تو ظہور ماموں کے پشاور جانے کے بعد جو افسران کے فلیٹ میں آئے ان کی بیوی آپا راضیہ سے کئی بار شکایت کر چکی ہیں کہ آپ کے ہاں رات گئے تک شور مچتا ہے۔ آپا کئی بار ہمیں ڈانٹ چکی ہیں۔ ہم نے آپا سے وعدہ کیا ہے کہ صرف سنیچر کی رات کو شور مچے گا۔ مگر عاصم نے چند روز بعد سے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ٹھیک گیارہ بجے آتشدان میں منہ ڈال کر "جاگتے رہو" کا نعرہ لگاتے ہیں"۔ میں نے آتشدان کے قریب بیٹھے بیٹھے سمجھایا۔ پھر باآواز بلند بہت سنجیدگی سے دریافت کیا--- "اچھا یہ بتایئے آپ کب انڈر گراؤنڈ ہو رہے ہیں۔"؟"

ایوب بھائی اٹھ کر سرپٹ باہر بھاگے۔

اسی زمانے کا ذکر ہے اتوار کی ایک صبح مرزا ماموں جان، نسیمہ ممانی، آپا عذرا، سعید بھائی اور میں کراچی بوٹ کلب کے برآمدے میں بیٹھے کافی پیتے تھے کہ ایک خاموش گوشے میں ایک صاحب سیاہ گھنی داڑھی، سیاہ چشمہ، ایک اور صاحب کے ساتھ بیٹھے بیئر سے شغل کرتے نظر آئے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

انڈر گراؤنڈ ہونے کا مطلب بہت دنوں بعد سمجھ میں آیا۔ غالباً سنہ 65ء حوض خاص، نئی دہلی کے

مکان میں بنے بھائی نے ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ مجھ سے کہا جب ہم پاکستان میں انڈر گراؤنڈ تھے۔ ایک روز اچھی بیئر پینے کو جی چاہا فلاں صاحب کے ساتھ کراچی بوٹ کلب گئے۔ وہاں تم کو دیکھا تھا۔ تم ظاہر ہے ہمیں بالکل نہیں پہچان سکیں۔ کراچی میں بھی بہت دنوں بعد ایوب بھائی نے ایک مرتبہ بتلایا تھا کہ جب ہم لوگ گجراتی کالونی' جمشید روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ ایک رات ایوب بھائی نے چپکے سے بنے بھائی کو لا کر کوٹھی کے ایک بیرونی کمرے میں چھپایا تھا اور صبح منہ اندھیرے وہاں سے نکال لے گئے تھے۔

اچھو کا خبریں پڑھنے کا وقت اور انداز دونوں بہت پر اسرار تھے۔ وہ ریڈیو پاکستان کی ایکسٹرنل سروسز میں انگریزی نیوز کاسٹر ہو گئی تھی اور ٹھیک آدھی رات کو ایک ایک لفظ علیحدہ کر کے آہستہ آہستہ خبرنامہ پڑھتی تھی۔

"جناب یہ باہر کے لوگوں کے لئے ہے۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کے لئے۔ تاکہ ان کی سمجھ میں آ جائے۔" اس انداز سے کہتی جیسے بچپن میں وہ مجھ پر رعب ڈالتی تھی جناب ہم اتنی اونچی پہاڑی سے گرے۔ اور جناب ہمارے حلق کا آپریشن کیا جائے گا۔ اور میں فوراً تصور کرتی ساری دنیا کے صحافی دور دور ملکوں میں اپنے اپنے ریڈیو سیٹ سے کان لگائے بیٹھے اچھو کے ایک ایک لفظ کو نوٹ کرتے جا رہے ہیں۔ میں جو ریڈیو سے نئی ولایتی انگریزی کتابوں پر تبصرے یا "جدید انگریزی شاعری کیا ہے" یا تجریدیت کیوں؟" وغیرہ انگریزی میں نشر کرتی تھی وہ اچھو کی اس بین الاقوامی نشریات کے مقابلے میں بالکل آتشدان میں منہ ڈال کر "جاگتے رہو" کہنے کے مترادف تھا اور میں ہمیشہ کی طرح اچھو کو نہایت معتقدانہ نظروں سے دیکھتی۔

25 دسمبر سنہ 1950ء کی صبح سویرے میں نے اچھو اور نور افشاں سے کہا۔ "ای نڈ کی اپنے ماں باپ سے دور یہ پہلی کرسمس ہے۔ اسے ہوم سک نہیں ہونے دینا چاہیئے۔" اوپر نسیمہ ممانی کو فون کیا۔ انہوں نے گرمجوشی سے کہا۔ "ای نڈ کو کرسمس سروس کے لئے شہر کے کیتھڈرل لے چلیں۔ ہم لوگوں نے ملازم اس کے گھر بھیجا کہ بڑا دن ہمارے ہاں آ کر منائے اس کے بعد ہم لوگ کرسمس کی تیاریوں میں جی جان سے جٹ گئے۔ عاصم حاتم کینٹین سے کاغذی ربن' شیشے کے رنگ برنگے قمقمے' کرسمس ڈیکوریشن کے دیگر لوازمات' مع ایک عدد ننھی سی کرسمس ٹری خرید کر لائے۔ ڈرائنگ روم سجایا گیا۔ آپا راضیہ نے کرسمس کیک تیار کرنا شروع کر دیا۔ نسیمہ ممانی' ماموں جان اخلاقی امداد کے لئے اوپر سے آ گئے۔ میں نے عیسیٰؑ و مریمؑ کا واٹر کلر جو لکھنؤ آرٹ سکول میں بنایا تھا' آتشدان پر سجایا۔ اس کے دونوں طرف شمعدان روشن کئے گئے۔ نسیمہ ممانی نے میوزک کی کتابیں نکال کر کیرل منتخب کئے اور ہم دونوں نے پیانو پر نغمات ولادت مسیحؑ گانے شروع کر دیئے۔

پروفیسر مرزا محمد سعید کے صاحبزادے کمانڈر حسن عسکری جو "ابن سعید" کے قلمی نام سے افسانے لکھتے تھے' ہمارے چنڈو خانے کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کو اور ان کی حسین مہ جبیں بی بی نفیس کو کراچی فون کیا گیا۔ گھنٹے بھر میں وہ بھی پہنچ گئے۔ آدھا بڑا دن گذر گیا۔ اچھو نے تنگ آ کر کہا۔ "ہم لوگوں نے اس

قدر کرسمس ای نڈ کی خاطر منالی۔ اب اس سے زیادہ صرف یہی اور کر سکتے ہیں کہ خود عیسائی ہو جائیں۔ اور وہ ہے کہ آہی نہیں چکتی۔"

شام پڑے بیگم جہاں آراء جدون تشریف لائیں۔ ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔ "ارے یہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"؟

نور افشاں نے غصے سے جواب دیا۔ "تمہارا سر ہو رہا ہے۔ صبح سے نیٹو کرسچین بنے بنے حالت تباہ ہو گئی"۔

"کیوں۔؟ ارے۔۔۔ ہولی میکرل۔۔ مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ آج کرسمس ہے۔"

چچا نصیر مرحوم 'فیلی فینسی ڈریس کے مقابلوں میں جج بنا کرتے تھے اور خود بھیس بدلتے تھے۔ کراچی میں ایک زبردست فیلی فینسی ڈریس پارٹی سال نو کے روز آپا نفیسہ' بھائی اطاعت کے ہاں منعقد کی گئی۔ اب لوگوں نے آئے دن "باہر" جانا شروع کر دیا تھا۔ بھائی اطاعت اقوام متحدہ کے اجلاس کے لئے اکثر نیویارک جاتے رہتے تھے۔ اس روز ایک کزن محمود زیدی نے اناؤنس کیا کہ بغرض اعلیٰ تعلیم لندن جانے والے ہیں۔ پنڈی سے اطلاع ملی کہ بھائی جان جری احمد سید کے برادر خورد تقی سید جو جامعہ ملیہ دہلی سے پڑھ کر آئے تھے عازم انگلستان ہیں۔

پیچیدہ مسائل کے لئے جاتے ہیں انگلینڈ
زلفوں میں الجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے
(اکبرؔ)

تقی میاں اور محمود میاں بذریعہ پولش جہاز بٹوری انگلینڈ روانہ ہونے والے تھے ایک اور قبل ماری پور کے ڈرائنگ روم میں قالین پر بیٹھ کر رات گئے تک ماؤلفٹ وِنگ تقی میاں نے حالات حاضرہ پر عالمانہ سنجیدگی سے تبادلہ خیال کیا۔ "ہم لندن یونیورسٹی میں سرسید احمد خاں اور سنہ 1857ء سے سنہ 1906ء تک کی مسلم سیاست پر ریسرچ کرنے جا رہے ہیں۔" تقی میاں نے واضح کیا۔ "نئی مسلم بورژوازی کا رول۔"

"تقی بھائی معاف کیجئے گا..... ایک منٹ۔" عاصم نے گھڑی دیکھ کر آتشدان میں سر ڈالا اور چلائے "جاگتے رہو"۔ پھر محمود میاں بولے۔ "لندن اسکول آف اکنامکس کے بعد یہ سیدھے امریکہ۔"

"اور آپ کا کیا ارادہ ہے؟" تقی میاں نے پائپ سلگا کر عینک کے شیشوں کے پیچھے سے پوچھا۔

"ساری دنیا۔" میں نے جواب دیا۔ "لندن اور امریکہ جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے میں بھیمن کو گھو جاؤں گی۔"

"برا خیال نہیں۔ اچھا۔ اب آئندہ ملاقات آپ سب سے۔"

"ٹوئن ہم کورٹ روڈ کے نکڑ پر ٹھیک سوا پانچ بجے شام۔" عاصم نے گڈ سولجر شویک کی طرح کہا۔ بعد ازاں ہم لوگوں نے اپنا پسندیدہ "الوداعی گیت" شروع کیا ؎ کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے۔ زندگی خطر ہے منہ پھاڑے۔

بھائی مستقل مزاجی سے فلیٹ نمبر9 میوچل ہاؤس میکلوڈ روڈ میں مقیم تھے۔ ایک چھوٹی سی کار خرید لی تھی۔ مکان میں جگہ کی کمی اور مہمانوں کی افراط کی وجہ سے اپنا ایک موبائل دفتر کار میں بنا لیا تھا۔ اکثر فلیٹ کے نیچے وہ کار کھڑی رہتی۔ اماں جو ساری عمر نت نئی کوٹھیاں تلاش کر کے ان میں منتقل ہوتے رہنے کی شوقین تھیں اب ہمت ہار چکی تھیں۔ وہ زیادہ تر بھائی کے ہاں رہتیں یا ماری پور آ جاتیں یا نشوری اور مراد آبادی رشتے داروں کے ہاں سرکولیٹ کرتی رہتیں۔ جس عزیز کے ہاں قیام کرتیں ان کی بے انتہا آؤ بھگت اور خدمت کی جاتی۔ ہر رشتے دار مصر رہتا کہ وہ اسی کے ہاں قیام کریں۔ کبھی لال کرتی لکھنؤ والے ماموں ابراہیم خاں یا بھائی حمید علی کے ہاں لاہور ہو آتیں۔

ویزا کی پابندیاں لگ چکی تھیں۔ یو۔ پی کے مسلمانوں کے تقسیم شدہ خاندانوں کا المیہ رفتہ رفتہ واضح ہونا شروع ہوا۔ بیشتر بوڑھے والدین ہندوستان میں تھے' اولاد پاکستان آ گئی تھی۔ اب بزرگوں کی علالت اور اموات کی خبریں آنے لگیں۔ سنہ 1950ء کی ایک بارونق شام آپا عذرا کے جگر جگر کرتے وسیع و عریض فلیٹ کی لاؤنج میں چچی وحیدہ نے (جو خود حال میں خیاباں کسٹوڈین کے حوالے کر کے علیگڑھ سے پاکستان آ گئی تھیں) تاسف سے کہا۔ "بھائی آل حسنین کی والدہ کا مراد آباد میں انتقال ہو گیا۔" مراد آباد کی نیم تاریک اتاری' آل زہرا نانی کا گورا' بارعب چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ فرشی پائجامے کے پائینچے اڑسے صحن میں سے گذرتی آل زہرا عرفانی۔ حسنین ماموں کے پاکستان آنے کے بعد سے وہ اتاری میں وفادار خانہ زاد ملازم چھنوا کی معیت میں تنہا رہ رہی تھیں۔ حسنین ماموں فوجی افسر ہونے کے کارن انڈیا نہیں جا سکتے تھے۔ تنہائی میں اجل آئی۔ اتاری کے عقب میں اپنے چچا زاد بھائی اور سمدھی نواب سید ابراہیم حسین خان مرحوم کی قبر کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئیں۔ ایک عزیز نے قطعہ تاریخ کہا ؎

حکم پہ اللہ کے عامل ہوئیں
اس لئے جنت کے وہ قابل ہوئیں
خدمت آل نبی ﷺ کے واسطے
آل زہرا خلد میں داخل ہوئیں

آل نبی ان کے والد کا نام بھی تھا۔

7۔ یہ داغ داغ اجالا

فیض صاحب کے مصرعے افسانوں کے عنوان کی حیثیت سے اب کلیشے بن چکے ہیں۔ میرا افسانہ "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" امروز کے کسی سنڈے اڈیشن میں سنہ 49ء میں چھپا تھا۔

"پانی[13] کنارے کنارے بہتا جا رہا ہے اور پتے پراسرار بادبانی جہازوں کی طرح سطح پر وقار سے بہہ رہے ہیں۔ اور سبزے پر جو شکستہ بنچ رکھی ہے اس کے چاروں اور پرانے کاغذ' سگریٹ کے ٹکڑے اور دوسرے راہگیروں کی چھوڑی ہوئی چیزوں کے نشان پڑے ہیں جو ایسی ہی خنک راتوں میں یہاں بیٹھ کر ستائے۔

وہ لوگ جو یہاں سے گذرے تھے ان میں سے کچھ مر چکے ہیں اور کچھ دنیا کے کونوں میں گھوم رہے ہیں۔ کچھ اپنے بستروں پر خاموش لیٹے ہیں۔ وقت مصنوعی ہے اور سرد۔ ستارے تیزی سے جلتے ہیں اور لمحات اس طرح ختم ہوتے جاتے ہیں.... صرف ہم زندہ ہیں اور صرف ہمارا دماغ۔ اور بارش۔ اور لیمپ کی خنک روشنی۔ اور کہر آلود گھاس..... زندگی کی اس بکھری ہوئی تصویر میں کیا تمہیں خوف نظر آیا ہے۔ جہاں چاروں طرف گھومتے ہوئے سیارے ہیں... طویل سرنگیں جن کے روشندانوں میں سے اجالے کی تیز لکیریں تیرتی ہوئی نیچے اترتی ہیں۔ فولاد کے شیڈ' ہجوم' چیختی چلاتی موٹریں' پریم گاڑیاں دھکیلتی سرخ بالوں والی سفید فام عورتیں' باہر اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے ہوا کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے' جو سمندروں پر چل رہی ہے۔ جھاڑیوں کا بھیگا پن' پتھروں کی مہک' ان جگہوں پر خدا کی روح رہتی ہے۔ اور میں ان زمانوں کو یاد کرتی ہوں جب صبح کی برف سمیٹ کر وہ اندر آتے۔ درختوں پر دھند جمی ہوتی اور لکڑی کے مکانوں میں سے دھواں اٹھتا۔

دنیا کی آبادیوں پر صبح ہوتی ہے۔ فٹ پاتھوں پر خیموں کے ٹکڑوں سے بنے جھونپڑوں فلیٹس کی تاریک قطار اندر قطار کھڑکیوں پر جو پراسرار طریقے سے کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ مہربانو شہربانو خدا حافظ۔ اپنی عارضی پناہ گاہوں' مکانوں' فلیٹوں کو سمیٹ لو۔ آسمان گر رہا ہے۔ آسمان گر رہا ہے۔

مملکت تابلستان کے سفارتخانے کا شارد افیر صبح نو بجے سو کر اٹھا۔ اپنے ملک کے اخباروں پر سرسری نظر ڈالی اور مادام استووسکی کو فون پر صبح بخیر کہنے کے بعد دریچے سے باہر نظر ڈال کر اس نے دیکھا کہ کیرل گانے والے واپس جا چکے۔ اس وقت دماغ پر زور ڈال کر اس نے اس پرانے کیرل کو یاد کیا۔ ایک لنگڑی بھیڑ مقدس شہر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے تاکہ وہاں پہنچ کر دوبارہ پیدا ہو سکے۔

اور میں ان وقتوں کو یاد کرتی ہوں جب پلنگ پوش کے نیلے سمندر پر ہم بید کی ٹوکری کے جنگی جہاز تیراتے تھے اور صوفوں کے پیچھے چھپ کر بحری قزاقوں کی جنگ ہوتی تھی۔ اور تب ہم نے رات کو باہر گھاس پر بیٹھے بیٹھے ستاروں کی روشنی میں پھولوں کو بڑھتے دیکھا۔ لیڈی برڈ اور ہولی ہوکس کی گفتگو سنی اور عینک لگائے الو کے فلسفیانہ تبادلۂ خیالات پر غور کیا۔

بہار کے سرخ پھولوں اور خزاں کی سرخ آگ کے درمیان ہم وقت گذارتے رہے۔ پانی اسی طرح رواں ہے اور ان کنجوں کی طرف سے آرہا ہے جہاں بچپن میں وہ کھیلتے تھے۔ دوسرے بچے باغوں میں اسٹرابری چننے میں مصروف ہیں۔ اور بحری قزاقوں کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور کھڑکی کے باہر ہواؤں کے ریلے میں زمانے کا پراسرار موسیقار آرگن بجاتا جا رہا ہے۔ ہم پرانے مکانوں میں داخل ہوتے ہیں اور اندھیرے کمرے میں گرد آلود شاہ بلوط کی میزوں کے گرد بیٹھ کر شمع کی روشنی میں باتیں کرتے ہیں اور روغنی تصویریں اداسی سے ہمیں دیکھتی ہیں۔

پانی کے کنارے سبزے پر جو انسان بیٹھا ہے اسے دیکھو یہ ایک زوال شدہ تمدن سے نکل کر یہاں آیا ہے۔ تاریک کمروں میں گھس کر ہم نے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ پرانے قالین جو طہران اور مشہد میں خریدے گئے۔ چینی برتنوں کا انبار جو پیرس میں جمع کیا گیا۔ ریشمی پردے جو شنگھائی..... اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ کنارے کی نمی میں براؤن پتے جم گئے ہیں۔ میرے عزیزو تو میرا مرثیہ لکھو گے؟ میرے باپ کا مرثیہ' میرے دادا کا مرثیہ' سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن ڈیش دی وے ٹو لندن ٹاؤن۔ اے مادہ پرستو۔ میں روح کی ارسٹوکریٹ ہوں۔ سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن۔

اب آپ صاحبان غم غلط کرنے کے لئے ایک کہانی سنیئے۔

اُلو اور پسی کی کہانی

الو اور پسی سبز رنگ کی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کے لئے گئے۔ اور اپنے ساتھ شہد اور ٹافی لیتے گئے الو ستاروں کو دیکھتا رہا اور گٹار پر اس نے گایا۔ اے میری پیاری پوسی تم کتنی خوبصورت ہو۔ اور شادی کی انگشتری خریدنے وہ تیرتے تیرتے ایک جنگل میں پہنچے جہاں ایک عالم فاضل فنکار پگ رہتا تھا جسے اردو میں سور کہتے ہیں جس کی ناک میں ایک انگوٹھی تھی۔

ہوا یہ کہ انقلاب کے بعد جو لڑکیاں آئیں بہت سی تو کالجوں میں پڑھا رہی ہیں' چند ایک رسالوں میں غراروں کے فیشن اور پڈنگ بنانے کی تراکیب لکھنے میں مصروف ہیں۔ باقی سب زنانہ امدادی فوج میں شامل ہو گئیں۔ دس فیصدی ان میں سے مخلوط کلبوں میں بھی جاتی ہیں۔ انٹلکچوئیل لڑکیاں ایک فی ہزار بلکہ اس سے بھی کم مقدار میں تھیں۔ ان کو اپنے متعلق بڑے زبردست مغالطے تھے۔ کامریڈز تقریباً ناپید تھیں۔ یہاں پر ملت' اقبال" اور ذوق جہاد زیادہ طاری تھا..... بہت سے نوجوان سمندر پار گئے ہوئے تھے ان کے لئے قوی خدشہ تھا کہ وہاں سے بیویاں لے آئیں گے۔ جو لڑکیاں باہر گئی ہوئی تھیں ان کے متعلق کسی کو اب تک خیال نہ آیا تھا کہ وہ شوہر ہمراہ لے آئیں گی۔ گو یہ بھی ممکنات میں داخل ہو سکتا ہے۔

پانی کے کنارے پر اندھیرا بہت نیچے اتر آیا ہے۔ اور باغ کا یہ دیوانہ سبزہ ڈھلوان پر پہنچ کر رات کے انتظار میں یکلخت ٹھٹھک گیا ہے۔ جہاں دیوار ہے۔ اور گھر پر مجھے سکھایا گیا تھا کہ عصرانے پر اس طرح چائے بنا کر مہمانوں کو پیش کروں اور نماز کا عرق اس طرح تیار کروں اور مہمانوں سے محض ان کی دلچسپی کی

باتیں کروں اور لیڈی بوکس والا سے پوچھوں ان کا زکام اب کیسا ہے۔

اور اب شفق کے اجالے میں وہ سب چٹان پر ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور وطن مرحوم میں کھیتوں کی نرائی کی جا رہی ہو گی۔

بابل یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا ہم موم بتیوں کی روشنی میں وہاں تک پہنچ جائیں گے؟ یہ ایک نرسری گیت ہے۔ یہ چاند کی پہلی تاریخیں ہیں اور چھت کے کنگوروں پر گذرے وقتوں کے بھوت ٹہلتے ہیں اور نیم روشن سرد ہال میں وہ وبسٹر کے ڈراموں کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ میں نے ایک سفید سیڑھی چھپا رکھی ہے جسے لے کر ہم اسٹرابری کی تلاش میں چلیں گے...... دیکھو وقت خامشی سے اپنے آپ کو ابدیت میں دھکیلتا جا رہا ہے اور مستقبل کے گن مین تاریک نکڑوں پر کھڑے ہیں۔

فضا میں توپیں گرج رہی ہیں اور ہوا میں طیاروں کی فلیٹ جگمگا رہی ہے۔ صوفوں پر بیٹھی معزز خوبصورت خواتین گوگلز لگائے سرخ اور نیلی ساریاں پہنے پروگرام کے کاغذوں سے آنکھوں پر سایہ کئے سامنے کے منظر کو کاہلی سے دیکھتی ہیں۔ ان کے پیچھے بہت فاصلے پر بہت بڑا ہجوم ریلنگ پر امڈا کھڑا ہے۔ ان سے کہو پیچھے ہٹ جائیں یہ بے حد مخصوص مجمع ہے۔ ان لوگوں کو یہاں کس نے گھسنے دیا؟ عام پبلک تمیز کے ساتھ اپنی اوقات پہچانتے ہوئے سڑک پر دو رویہ کھڑے رہنے پر کیوں اکتفا نہیں کرتی؟ ان کو ہٹاؤ۔ میں نے بابل' قرطاجنہ اور ایتھنز اور اسکندریہ میں بھی یہی مناظر دیکھے ہیں۔ ان کو ہٹاؤ۔ اور توپیں سامنے سے آ رہی ہیں۔ ٹینک' شرمین ٹینک' تھری چیرز' تھری چیرز' اب وہ آ رہے ہیں' آگے آگے پائلٹ آتا ہے۔ کھلی کیڈی لیک پر سرکار عالی بیٹھے ہیں اور ان کا ملٹری سیکرٹری اور تین جنرل۔ پانی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ ہوا سرسرا رہی ہے۔ اور ہم ریت پر کھڑے ہیں۔ تھری چیرز۔ تھری چیرز'

چھوٹی پتیوں والی سوئس گھاس پر سے ہوا تیزی سے روتی ہوئی گذر رہی ہے۔ چیپل کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اور سیڑھیوں پر پیپل کے پودے اگ آئے ہیں۔ اس قربان گاہ کے سامنے پیاری ڈورس کی شادی والٹر سے ہوئی تھی جو آئی۔ پی میں تھا اور ہوم واپس گیا۔ عرشے پر سفید ڈیک چیرز رکھی ہیں۔ نورما ڈارلنگ اور جنجر پیو اور دھوپ میں آجاؤ۔

میں دھوپ میں بیٹھ کر کینوس تیار کرتی تھی اور TAUBES کے نئے نظریوں کا مطالعہ کرتی تھی۔ میرے چچا میاں نے مجھ سے کہا میرے ہمراہ نیویارک چلا کرو اور وہاں اقوام متحدہ میں کوئی ہلکا پھلکا کام کرو۔ میں روتی رہی کیوں کہ میں نے صرف قہوہ بنانے کا فن سیکھا تھا اور اب کینوس دھو رہی ہوں اور چچا میاں نے یو۔ این میں ولایتی چوہوں کی غذا میں اصلاح اور ریسرچ کے لئے پندرہ سب کمیٹیاں بنائی ہیں اور ہر سب کمیٹی ہر سیشن میں پندرہ ہزار الفاظ کی رپورٹ تیار کرتی ہے۔

کھانے کے دوران لیپ لینڈ کے سفیر نے مجھے بتایا کہ ان کے ملک کے باشندوں کو ہم سے کس قدر گہری محبت ہے۔ ہماری قومی تحریکوں کو وہاں کے رین ڈیر تک بیحد ہمدردی اور دلچسپی کی نگاہ کے ساتھ ہمیشہ سے دیکھتے آئے ہیں۔ یو۔ این او کی چوہوں کی غذا کی اصلاح کی سب کمیٹی کا آئندہ اجلاس لیپ لینڈ میں ہو گا۔

ایک لنگڑی بھیڑ آہستہ آہستہ مقدس شہر کی طرف بڑھ رہی ہے۔

میں تابلستان کے سفارت خانے کا ناظم امور ہوں۔ کرنل فلفوز۔ یہ شتر مرغ پلاؤ نوش کیجئے جو ہمارے قدیم ملک کی پانچ ہزار سالہ تہذیب کا شکار ہے.....

کرنل فلفوز اس کیرل کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تین بادشاہوں کا گیت

جب ہم وطن سے چلے تو مشرقی ستارہ آگے آگے ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ فضائی میزبان لڑکی نے جو قہوہ پلایا وہ ٹھنڈا تھا۔ گھنٹیاں بجاتے اور OUR TIMES پڑھتے ہم منزل کی طرف بڑھے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ اوڈن مجھے کبھی پسند نہیں آیا اور گرٹرڈ اشین کے متعلق میں اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ وفور عقیدت اور جلال خداوندی کے نور سے معمور ہم مقدس شہر پر اترے۔ اس روز وہاں نئے جنم کی خوشی کا عظیم الشان جشن تھا۔ ہم مقدس ہیکل تک نہیں پہنچ سکے۔ اور ہمیں بلوچ میس میں ٹھہرا دیا گیا۔ ہم نے چاروں طرف دیکھا وہاں جشن ہو رہا تھا۔ ہم سردی میں باہر لان پر بیٹھے خوشی کے مارے گھنٹیاں بجاتے رہے جس کی وجہ سے ہم تینوں کو انفلوئنزا ہو گیا۔

فیر دی ویل مائی فیری نفے' میں سوزی اینا سے ملنے لوئی زیانا جا رہا ہوں۔ راہ میں مجھے ایک حبشی ملا۔ میں اسے گھوڑا سمجھ کر اس پر سوار ہو گیا۔ امریکن لوک گیت سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن۔ ڈیس دی وے ٹولنڈن ٹاؤن۔ تم لوگ نہج البلاغہ کیوں نہیں پڑھتے۔

مجھے تھوڑا سا زکام ہو گیا ہے خانم فہمی میں آپکے پیارے ہینڈسم شہنشاہ کی سالگرہ کے عصرانے میں نہ آسکوں گی۔

پل پر زرد کہرہ منڈلا رہا ہے۔ اور انسانوں کی تاریک قطاریں اس پر سے گذر رہی ہیں۔ہائے چوہے۔ کتنے بہت سے چوہے۔ اور ہم مر چکے ہیں اور دروازہ پھر سے بند ہو جاتا ہے۔

آدمی بچ ابکلے۔ آدمی بچ ابکلے۔

سب دروازے بند رہے اور نکل گیا سوار رے۔

دھیرے گاڑی ہانک رے بھیا گاڑی بانا۔ دھیرے۔

کنارے پر پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ مجھے یہاں گھاس پر بیٹھ کر رونے دو۔ بوٹ ہاؤس کے پیچھے تاریکی ہے۔ تاریکی' تاریکی' کسی چیز کا کسی چیز سے تعلق نہیں۔ اس قرمزی روشنی میں تمہارے ساتھ کون ہے؟ میں اسے نہیں پہچان سکتی۔ سب نے سفید لبادے اوڑھ رکھے ہیں اور آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ ہوا سمندروں پر پھیل رہی ہے۔ تابلستان کا شاردی افیرز ڈز سے واپس آنے کے بعد مادام استودکی کو فون پر شب بخیر کہہ کر سو گیا۔ تم بھی سو جاؤ میرے عزیزو۔

" سو جاؤ' اور مشرق کے ان تین بوڑھے بادشاہوں کو بھول جاؤ جو ٹھنڈی گھاس پر اداس بیٹھے

پیدائش کی خوشی کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ اپنا بہت لمبا سفر طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ اور ورجن اپنے باغ میں بیٹھی ہے جہاں پر محبت کا خاتمہ ہے۔ ہم یہیں رہیں گے اور خدائے قدوس کی تکریم میں مصروف رہیں گے۔

کیا ہم واپس چلے جائیں؟

8۔ درویشان غوغائی

عثمانیہ ترکی کے درجنوں صوفی سلسلوں میں سے ایک 'کہ فرقہ درویشان غوغائی کہلاتا تھا' مراکز اس کے علی قاضی تکیہ سی' شربت دار تکیہ سی' حبیب آفندی تکیہ سی' خواجہ زادہ تکیہ سی قسطنطنیہ کے قاسم پاشا' فیروز آغا' لالہ زار' چشمہ چراغ' قبہ وغیرہ مقامات پر واقع تھے۔ جہاں یہ فقرائے باب اللہ روزانہ جمع ہو کر ہو حق کرتے تھے۔

درویشان غوغائی کے تکیہ سی واقع طیارہ خانے اوغلو متصل قراالبیلہ میں شیخ کی ایک تابندہ صبح آغا سلطان حیدر کوچک معہ آغا ایوب کرمانی دارالخلافہ سے وارد ہو کر یوں گویا ہوا۔ "وزارت اطلاعات و نشریات کے محکمہ اشتہارات و فلمیات و مطبوعات کی خانم مسرت جہاں تیموری دو سال کی رخصت پر عازم امریکہ ہیں ان کی جگہ کام کرنے کے واسطے مسٹر جی احمد نے آپکو بلایا ہے۔ فلاں تاریخ۔ نیپیر بارک۔ دس ۱۰ بجے صبح۔

سوویت لٹریچر کے پرچے گھول کر پی جانے کے بعد کچھ عرصے سے احقر العباد خود کو نہایت انقلابی محسوس کر رہی تھی۔ سوال کیا "ہم اس بورژوا رجعت پسند حکومت کی ملازمت کریں گے؟"

اچھولی بھی تو کر رہی ہیں۔ سب کر رہے ہیں۔" رتی میاں نے کہا۔

"فی الوقت۔" شیخ حلقہ آغا ایوب کرمانی نے کھنکار کر فتویٰ دیا۔ "قطعاً جائز بلکہ مباح ہے کہ مواقع سے مصالحت کر کے درپردہ انقلاب کو آگے بڑھایا جاوے۔"

احقر العباد نے قدرت اللہ شہاب آغا کو فون کیا کہ گو حلقے سے تعلق رکھتا تھا مگر اس بورژوا حکومت کا ایک ستون تھا۔ اس فقیر نے حسب عادت انڈر اسٹیمنٹ دیا۔ "کرنا تو آپ کو یہی چاہیئے۔"

اس وقت مس مسرت جہاں تیموری دودمان مغلیہ کے آخری چراغوں میں سے ایک محکمہ ایڈورٹائزنگ فلمز اینڈ پبلی کیشنز کے دفتر میں روشن تھیں۔ بحیثیت حکومت پاکستان کی واحد سویلین خاتون افسر۔ ان کی جگہ پرایڈ ہوک تقرر کے بعد شیخ محمد اکرام آئی سی ایس نے جو اس وقت غالباً اس وزارت کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ اپنے دفتر میں میٹنگ بلائی۔ ڈپٹی سیکرٹری قدرت اللہ شہاب ان کے برابر متمکن تھے اور نہایت معتبر اور سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ اکرام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اور پاکستانی کلچر کی تشکیل میں ازحد خلوص سے کوشاں تھے کہنے لگے۔ "کلچرل پبلسٹی کے سلسلے میں آپ لوگ خیال رکھیئے گا کہ ہمیں ایک خالص پاکستانی تہذیب کی تخلیق کرنی ہے۔ مثال کے طور پر میرانیس' نظیر اکبر آبادی' مومن'

غالب وغیرہ کے بجائے ان شعراء کی طرف توجہ دیجئے جن کا تعلق خاص سرزمین پاکستان سے ہے۔ مثلاً خوشحال خاں خٹک۔ رحمان بابا اور ناطق مکرانی۔

انور قریشی میرے ساتھ ہی اس محکمے میں شامل ہوا تھا۔ میٹنگ کے بعد باہر آکر میں نے اس سے کہا۔ "بھئی ابو۔ یہ پاکستانی کلچر کا مسئلہ تو بہت الجھتا جا رہا ہے۔ اس دن بخاری صاحب کہہ رہے تھے۔"

انور قریشی عرف ابو نے پائپ سلگا کر میری بات کاٹی۔ ابو کے والد کرنل قریشی ابا جان کے زمانے میں علی گڑھ میں رہ چکے تھے۔ اس کا بڑا بھائی زبک (ظہیر بابر قریشی) بمبئی میں مشہور جرنلسٹ تھا اور جاپان چلا گیا تھا۔ چھوٹا بھائی عمر قریشی کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ ابو انگلستان میں پچیس سال گذار کر آ رہا تھا اور روحانی اور ذہنی طور پر ایک خالص لبرل 'انگریز' تشکیک پرست 'دانشور' تھا۔ اور انتہائی پرمذاق اور دلچسپ باتیں کرتا تھا۔ ہم لوگ محکمے کے دوسرے رفقاء جلال الدین احمد اور امجد علی وغیرہ کے ساتھ عہد سر چارلس نیپیر کی دو منزلہ لق و دق سرکاری عمارت سے باہر نکلے۔ سامنے سے کمال احمد فاروقی آتا نظر آیا جو پائپ پیتا پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کار روک کر کہا۔ "میں نے اسلامک کونسٹی ٹیوشن پر اپنی کتاب کا پلان مکمل کر لیا ہے۔ لنچ ٹائم میں آکر تم لوگوں کو بتاؤں گا۔"

مزید سرچ فور آئیڈنٹیٹی۔ ہم لوگ سڑک عبور کر کے اپنے دفتر کی طرف گئے۔ 14 اگست 1947ء سے ذرا قبل یہ عارضی بارکیں' آرک لائینس میں راتوں رات جلد از جلد سکھ معماروں نے تیار کی تھیں کہ آزادی کے فوراً بعد وہاں سرکاری دفتر قائم ہو سکیں — عمارتیں بنانے کے بعد اپنی اجرت لیکر سکھ راج مزدور اور بڑھئی انڈیا ہجرت کر گئے تھے۔

"فرنٹیر اسپرٹ ہونی چاہیئے۔ اب نئے افق ہمارے سامنے ہیں۔" جلال الدین احمد نے کہا۔ ہم لوگ اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ لنچ کے وقت کمال فاروقی عرف بوبی اپنا کتاب کا پلان لیکر آگیا۔ ابو کے علاوہ اس محکمہ کا وہ دوسرا مغربی انٹلکچوئیل تھا۔ لیکن ابو ایک آزاد روح تھا۔ بوبی بیحد کٹر مسلمان۔ وہ پاکستان کی دفاعی افواج کے میڈیکل چیف جنرل فاروقی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ (جنرل فاروقی ایک اور سویٹ بزرگ تھے۔) اس کا مسئلہ ایک اور تھا' روحانی اور ذہنی طور پر انگریز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ عرصہ سے بڑا زبردست مرد مومن بن چکا تھا۔ نسلاً وہ نصف پنجابی مسلمان' نصف ساؤتھ انڈین ملیالی ہندو تھا۔ اس کی والدہ مسز فاروقی ہندوستان کے نامور ڈپلومیٹ وی پی مینن کی سالی تھیں۔ وہ بیرسٹر تھیں اور لکھنؤ میں رہتی تھیں۔ ابو کی طرح بوبی کی تعلیم و تربیت بچپن سے انگلستان میں ہوئی تھی۔ چند ماہ قبل وہ کیلی فورنیا سے سوسیولوجی میں ایم اے کر کے لوٹا تھا۔ اور اسلامی آئین پر ایک نہایت دقیق اور عالمانہ کتاب لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ اردو اور پنجابی زبانوں سے ناواقف تھا اور انگریزی برطانوی لہجے میں بولتا تھا۔

سرچ فور آئیڈنٹیٹی۔

لنچ کھاتے ہوئے میں اور ابو حسب معمول اس سے بحثتے رہے۔ بوبی فاروقی میں نے کہا۔ "تم نے اپنی روٹس کی تلاش کے سلسلے میں بہت زیادہ کنفیوژن پھیلا رکھا ہے۔ جڑیں' زمین کے اندر سیدھی

سیدھی نہیں ہوتیں آپس میں الجھی ہوتی ہیں۔"

"لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انڈین کلچر سے ہمارا POINT OF DEPARTURE کس نقطے سے ہوا۔" جلال الدین احمد نے جو پاکستانی تہذیب کے ایک اور نظریہ ساز تھے' کہنا شروع کیا۔ موصوف رشید احمد صدیقی کے بھانجے اور بیگم رشید احمد صدیقی کے بھانجے داماد تھے۔ جلال الدین احمد اور ڈی اے ایف پی کے دوسرے رفقائے کار شان الحق حقی' اللہ بخش راجپوت اور مسٹر ہوم (بمبئی کے خوجے اور سابق شیکسپیرین ایکٹر) چاروں نہایت خوش اخلاق اور دلچسپ حضرات تھے۔

عبدالقیوم صاحب چیف کاپی رائٹر بھی نہایت مہذب انسان تھے۔ بحیثیت کاپی رائٹر میرا اور انور قریشی کا کام یہ تھا کہ فارن پبلسٹی کے لئے تہذیبی موضوعات پر بزبان انگریزی مضامین لکھیں۔ مثلاً لاہور اور ملتان کی تاریخی عمارتیں۔ مغل مصوری۔ فلسفہ اقبال' قاضی نذرالاسلام کی شاعری۔ مشرقی پاکستان کے لوک گیت' خوشحال خاں خٹک' پاکستان کا عظیم شاعر' ملکہ نور جہاں پاکستان کی عظیم المرتبت حکمراں۔ ان میں سے چند موضوعات پر میں عبدالقیوم صاحب سے مستقل جھگڑتی رہتی۔ تو ملکہ کیتھرین دوئم کو سوویت یونین کی ملکہ کہنا چاہیئے۔ ممتاز محل چونکہ آگرہ میں دفن ہے اس لئے انڈیا کی ملکہ ہے؟ عبدالقیوم صاحب یہ مضامین بیرونی ممالک کے پاکستانی سفارتخانوں کے پریس اتاشی حضرات کو بھیج دیتے تھے تاکہ ان ممالک کے اخبارات میں چھپیں۔ انہی تہذیبی موضوعات پر باتصویر کتابچے تیار کرنا دوسرا کام تھا۔ ان مضامین میں اینٹی انڈین پروپیگنڈہ بالکل نہ ہوتا تھا۔ انڈو پاک جھگڑوں اور مسئلہ کشمیر کے متعلق لکھنا لکھانا محکمہ انفارمیشن کے سپرد تھا۔

ایک روز ابو نے کہا "پی۔ آئی۔ بی نے پریس کو ڈائریکٹو بھیجا ہے۔ کہ جہاں جہاں لفظ انڈیا ہو اسے "بھارت" کر دیا جائے۔ ڈان کے ایک سب ایڈیٹر نے امریکہ کے کسی ریڈ انڈین قبیلے کی کوئی خبر چھاپی ہے اسے "ریڈ بھارتی" لکھ دیا ہے۔ لہٰذا ان کو انڈین کیمونسٹ سمجھا جا سکتا ہے۔"

"گپ"۔ میں نے کہا۔

دراصل کام وام کوئی خاص تھا نہیں۔ اوقات فرصت میں میں انور قریشی' جلال الدین احمد گپیں ہانکا کرتے۔ عموماً لنچ ٹائم میں بحریے کے دفتر تعلقات عامہ کے لیفٹیننٹ کمانڈر عسکری (ابن سعید) اور یونس ایم سعید آ جاتے۔ یونس کو ہزارہا اشعار یاد تھے اور وہ ایک انگریزی رسالہ VISION شائع کر رہا تھا جس کا نام میں نے BLURRED VISION تجویز کیا تھا۔

وزیراعظم محمد علی بوگرا کا چھوٹا سوتیلا بھائی عمر علی چودھری جو سر عبدالقادر کے بیٹے ریاض قادر کی طرح ایک نہایت عمدہ انگریزی شاعر تھا اور وژن میں لکھتا تھا۔ عمر علی چودھری کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل تھے۔

مذہب — کٹر رومن کیتھولک۔ نسل — نصف بنگالی' نصف اطالوی۔ قومیت — پاکستانی۔ نظریات — مغربی۔ جب ابو' بوبی' اور عمر علی چودھری ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے تو چنگاریاں اڑتی تھیں۔

کیمبرج کے تعلیم یافتہ اصلی انگریز دانشور سڈنی بولٹ (جو ایک برطانوی فرم کے سربراہ تھے۔ ان کی جرنلسٹ بیوی جیا کیرالا کی سیرین کرسچین تھی۔ ابو کیمبرج کی تعلیم یافتہ پارسی دانشور لڑکی ماکی دھن جی بھائی سے شادی کرنے کے چکر میں تھا۔ ماکی ایک انتہائی سوئیٹ لڑکی تھی اور ابو کی تمام انٹلکچوئیل اڑانوں کی حد درجہ مداح۔ اکثر یہ سارا کراوڈ ماری پور میرے ہاں یا کراچی میں ایک دوسرے کے ہاں طعام شب پر جمع ہوتا اور اس کو سموپولیٹن ذہن پرست وسیع المشرب حلقے میں بیٹھ کر سب کو ہری ہی ہری سوجھتی۔ سب بہت اونچے اڑتے۔ لیکن عام زندگی کے حقائق اور ملک یا برصغیر یا ساری دنیا کی اکثریت کی اصلی ذہنی سطح اور اس کے پیدا کردہ حالات پر ان اڑانوں کا کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا۔

"اور تم قلم سے کھانا پکاتی ہو' جھاڑو سے لکھتی ہو۔ تم کیا کرو گی۔" ابو گرج کر کہتا۔

میں' نسیمہ ممانی' مرزا ماموں جان' حسنین ماموں کے ہاں چند روز کی چھٹی منانے کوئٹہ روانہ ہوئے۔ ائیر فورس کا ڈکوٹا بلوچستان کی سرخ پہاڑیوں پر سے اڑتا جا رہا تھا۔ اس کا سایہ نیچے ساتھ ساتھ رواں تھا۔ اچانک میں نے نسیمہ ممانی سے کہا۔ "ہوائی جہاز الار ہو رہا ہے۔" کہنے لگیں۔ "فواد استاد آدمی ہے۔ ٹھیک کر لے گا۔" اسی وقت لکھنؤ کے شاہد حسین قدوائی کے صاحبزادے عطیہ حبیب اللہ کے چھوٹے بھائی اور ملک کے بہترین ہوا باز اسکواڈرن لیڈر فواد شاہد حسین 12 اطمینان سے مسکراتے ہوئے کاک پٹ سے برآمد ہوئے۔ فرمایا ایک انجن ذرا سا فیل ہو گیا ہے۔ دوسرے انجن پر لئے جا رہے ہیں۔ شاید فورسڈ لینڈنگ کرنا پڑے۔"

میں نے نیچے نظر ڈالی تو پہاڑیوں کے مون اسکیپ میں فورسڈ لینڈنگ کی کوئی جگہ دکھلائی نہ پڑی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور چٹانوں میں بہتے چشمے گلنار ہو چکے تھے۔ دور ایک قبائلی خیمہ گاہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے خوشی سے کہا۔ "ہم لوگ کسی بگٹی سردار کے قلعے میں رات گذاریں گے اور وہاں الاؤ کے گرد بیٹھ کر کسی بوڑھے افسانہ خواں سے گل بلوچ کا قصہ سنیں گے۔"

"بی بی اللہ اللہ کرو۔" پچھلی سیٹ پر بیٹھی ونگ کمانڈر مشتاق احمد کی بیگم نے کہا۔

ماموں جان بولے۔ "فواد بڑا استاد آدمی ہے فورسڈ لینڈنگ کے بغیر نکال لے جائے گا۔"

منٹوں میں کوئٹے کی وادی نظر آنے لگی۔ سرو کے درخت' تاکستان' اونچی چہار دیواریوں والے ایرانی وضع کے مکانات' سرمئی رنگ کی ائیر فیلڈ۔ جہاز ایک زخمی لیکن ارادے کے مضبوط عقاب کی طرح زمین پر اترا ایک کیپ لگائے وردی پوش حسنین ماموں اور اودے غرارے اور کپاسی دوپٹے میں ملبوس چندا ممانی تیزی سے چلتے طیارے تک آئے۔ پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن۔

کڑاکے کی سردی۔ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ ائیر فیلڈ سے چھاؤنی جاتے ہوئے حسنین ماموں نے کہا۔ "میاں اودری مانچسٹر جا رہے ہیں۔ یہاں بھی انکوائری ہوئی تھی۔"

لڈن ماموں کے دوسرے بیٹے مظفر علی نقوی عرف اودری ایک جوشیلے اور بیحد ذہین لیفٹنٹ تھے۔ لڈن ماموں اب فریر ہال کے نزدیک ایک ہرے بھرے باغ والی کوٹھی کی نچلی منزل میں فروکش تھے۔ اوپر کی

منزل میں لکھنؤ کے ڈاکٹر حمید صدیقی مشہور برین اسپیشلسٹ مقیم تھے۔ لڈن ماموں کے بڑے بچے صہیب اور سلویا مانچسٹر میں تھے۔ اودری کا داخلہ بھی مانچسٹر یونیورسٹی میں ہو گیا تھا۔ کوئٹے سے واپسی کے دوسرے تیسرے روز سی فیلڈ روڈ سے اودری کا فون آیا۔ ہم آج رات کے دو بجے لندن چلے جینبا۔ لڈن ماموں کی اولاد اپنے ننھیال ردولی کی اودھی زبان بولتی تھی۔

سی فیلڈ روڈ لڈن ماموں کی کوٹھی درویشان غوغائی کا ایک اور اہم تکیہ سی تھی۔ اس شام جب میں سی فیلڈ روڈ پہنچی تو عجیب منظر دکھلائی دیا۔ اودری ڈرائنگ روم میں اطمینان سے بیٹھے سوشل انتھروپولوجی کے کسی نکتے پر اپنی دانشور والدہ سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں اور ان کے جرنلسٹ دوست زوار اور مشیر لاؤنج میں ٹیلی فون کے پاس سخت متفکر بیٹھے ہیں۔ فون کی گھنٹی بجی مشیر نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ چند منٹ بعد اودری کے تیسرے صحافی دوست اختر نے کمرے میں آ کر کہا۔ "گڑبڑ ہو گئی۔ عین وقت پر اودری کو باہر جانے کی اجازت نہیں مل رہی۔"

زیرو بم کو بم بنانے کا نسخہ سمجھنے والے پولیس انسپکٹر کی طرح غالباً کراچی کے کسی مستعد پولیس افسر نے اودری کے خلاف رپورٹ کر رکھی تھی۔

"نہیں جانے دیتے ہیں تو نہیں جینیا۔" اودری نے اطمینان سے کہا۔

بی او اے سی کے طیارے کی روانگی سے ایک گھنٹہ قبل رمی میاں نے فون کیا کہ اجازت مل گئی۔

اسی رات باہر اندھیرے باغ میں رات کی رانی معطر تھی۔ اوپر ڈاکٹر حمید صدیقی کے گھر سے طلعت محمود کے کسی گانے کی دھیمی آواز آ رہی تھی اور عنابی مخملیں پردوں کے نیچے دبیز صوفوں پر بیٹھے اودری اور اختر قہقہے لگا رہے تھے اور ملازم اودری کا اسباب لیجا کر نیچے کار میں رکھنے میں مشغول تھے۔ اس وقت کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ صرف چند برسوں بعد یہ جوان صورتیں اودری اور اختر اس پیہم مٹتے ہوئے تصویر خانے سے زائل ہو جائیں گی۔ نقش بر آب۔ مگر یہ غیبت صغریٰ ہے یا فنا' کیا ہے؟

9۔ پوم پوم ڈارلنگ

رتی کشور کی شادی کی تقریب کی فلم پارے میاں اپنے مووی کیمرے سے کھینچ رہے ہیں جو وہ جاپان سے لائے ہیں۔ اچھو کمخواب کا غرارہ پہنے سیڑھیوں پر بیٹھی ایک ڈچ لڑکی سے باتیں کر رہی ہیں۔ مولانا شامیانے کے نیچے نکاح پڑھانے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ دلہن کے والد بھائی احمد رشید دہلوی (ان کی شادی آپا صدیقہ سے نہٹور میں۔ جولائی سنہ 29ء۔ ابا جان آپا صدیقہ کے لئے نظم پڑھ رہے ہیں۔ عصمت کا در حیا کا صدف علم و فن کا پھول۔ گو ہر یمن کا ایسا نہ باغ عدن کا پھول۔ صدقے میں اس شرف کے کہ ہے بنت فاطمہ۔ پاکیزہ سیرتی میں ہے وہ یاسمین کا پھول۔ اے سرو باغ حضرت میر جناں مقام۔۔۔ ہم آج تم کو دیتے ہیں اپنے چمن کا پھول۔)

آپا صدیقہ کی نوبیاہتا لڑکیاں انور' قیصر بھاری غرارے اور زیور پہنے مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی

ہیں ان کی چھوٹی بہنیں قمر اور افسر ہنستی کھلکھلاتی پھر رہی ہیں۔ چھوٹے بھائی عثمان حیدر دولہا کے پاس مسند پر بیٹھے ہیں۔ بڑے بھائی عثمان حیدر آفندی نے دولہا کے سہرا باندھا ہے۔ آپا خدیجہ مرحومہ کی لڑکی ثریا نعمانی آپا فاطمہ خاتون کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ دلہن کا چھوٹا بھائی ہارون الرشید پارے میاں کے ساتھ ساتھ شادی کی مووی فلم کھینچنے میں مشغول ہے۔ مہر بعوض پانصد اشرفی محمد شاہی کے بجائے سکہ رائج الوقت پاکستانی کا بندھتا ہے۔ اور اس نئی اقتصادیات کی تشکیل میں دولہا کے بڑے بھائی اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے سید لقمان حیدر دن رات کام میں مصروف ہیں۔

نہتور کی سروری میراثن موجود نہیں — دلہن کی سہیلیاں نئی انڈین فلم کا گیت "راجہ کی آئے گی بارات" گا رہی ہیں۔ پاکستانی شادی میں بھارتی فلمی گیت۔ ہر طرف عجیب گھپلا ہے۔ آپا فاطمہ خاتون مشرقی پاکستان سے آئی ہوئی ہیں جہاں ان کے داماد راج شاہی ڈویژن میں کہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں۔ آپا فاطمہ خاتون بڑی شدید پاکستانی نیشنلسٹ ہیں اور پرانی اردو تہذیب کی نقیب اور نئے ملک میں مغربیت کی یلغار اور اردو کی تباہی پر نالاں۔ جن مسائل پر کینیڈا اور فرانس میں مقیم شائستہ اختر سہروردی ان کی ہمنوا ہیں اور یہ دونوں حیرت انگیز بیبیاں عصمت میں مضامین لکھنے میں مصروف ہیں۔ رتی میاں اور احسان بھائی اور چھوٹے عثمان بھائی اور لقمان بھائی اور آتیل کے والد چچا غنی حیدر (ابن سید اکرام حیدر ترمذی مرحوم) شادی میں شرکت کے بعد نہتور واپس جانے لگتے ہیں تو آپا فاطمہ خاتون لکھتی ہیں "بھارت کو جانے والے۔۔ حافظ خدا تمہارا۔۔۔ مالک کے تم حوالے۔۔ ہندوستان تمہارا۔۔۔ گھر تھا کبھی ہمارا۔۔۔ ہم اس کو چھوڑ آئے۔۔۔ لے کر نیا سہارا۔۔۔۔ تم کو وطن تمہارا۔۔۔۔ ہے اس چمن سے پیارا۔ روکے نہ رک سکے تم۔۔۔ جب دیس نے پکارا۔۔۔ اس دیس کی کشش سے۔۔۔ میرا سلام کہنا۔۔۔ ہم اس وطن سے چھوٹے۔۔۔ گنگ و جمن سے چھوٹے۔۔۔ بے بال و پر ہوئے ہیں۔۔۔ اپنے چمن سے چھوٹے۔۔۔ بیتے ہوئے زمانے۔۔۔ خوشیوں کے سب فسانے۔۔۔ پیپل کے سائے میں ہم۔۔۔ چھوڑ آئے وہ خزانے۔۔۔ گذرا جہاں تھا بچپن۔۔۔ آئی جہاں جوانی۔۔۔ اس گھر کے بام و در سے۔۔۔ میرا سلام کہنا۔۔۔ وہ دولت جہاں ہے۔۔۔ وہ ہم سر جناں ہے۔۔۔ خاک وطن کا ہم کو۔۔۔ ہر ذرہ حرز جاں ہے۔۔۔ جھگڑوں کو بھول جائیں۔۔۔ پھر پریم رس لنڈھائیں۔۔۔ گنگا کے جل میں پانی۔۔۔ زمزم کا ہم ملائیں۔ اس ماں کے لال تم بھی۔۔۔ اس ماں کے لال ہم بھی۔۔۔ میرا سلام کہنا۔۔۔ ان پیاری بستیوں سے۔۔۔ ان بہتی ندیوں سے۔۔۔ ان اونچے پربتوں سے۔۔۔ اور ان کی گھاٹیوں سے۔۔۔ غنچوں سے اور گلوں سے۔۔۔ پیڑوں سے جھاڑیوں سے۔۔۔ اس بچھڑی انجمن سے۔۔۔ ان پیارے ساتھیوں سے۔۔۔ بھارت کے باسیوں سے۔۔۔ میرا سلام کہنا۔۔۔ ہم آن بان والے۔۔۔ ہم اونچی شان والے۔۔۔ ملک خدا کے والی۔۔۔ قومی نشان والے۔۔۔ دیتے ہیں ایک سندیسہ۔۔۔ راہی ذرا ٹھہر جا۔۔۔ مہر و وفا کی مالا۔۔۔ اور یہ پیام لے جا۔۔۔ مسجد ہو یا شوالہ۔۔۔ مقصد ہے ایک سب کا۔۔۔ "آپس میں بیر رکھنا۔۔۔ مذہب نہیں سکھاتا[15]"۔۔۔)

سارا خاندان ایئرپورٹ چچا غنی حیدر کو رخصت کرنے گیا۔ وہ طیارے پر سوار ہوئے۔ طیارہ دلی

کی سمت اڑا۔ چچا غنی حیدر پالم ایئرپورٹ پہنچ کر دلی شہر جائیں گے۔ وہاں سے نوے میل دور واپس نہتور۔ جو اب پاکستانی رشتے داروں کے لئے ایک دوسری موہوم دنیا ہے۔ چچا غنی کی الوداعی دعوت کے وقت آپا فاطمہ خاتون نے یہ نظم پڑھی تھی۔۔۔ "ایک بھارتی عزیز کی روانگی پر"۔

چچا غنی حیدر کو "ایک بھارتی عزیز" کہنا عجیب سا لگتا ہے۔ اور اس نظم میں جذباتیت کی فراوانی ہے۔ کیونکہ نہتور نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے مگر اس کا نوسٹیلجیا باقی ہے۔ آپا فاطمہ خاتون انتہائی محب الوطن "آن بان اونچی شان والی" قوم پرست پاکستانی خاتون ہیں۔ مگر یہ نوسٹیلجیا ایک خالص جذباتی چیز ہے۔ پچھلی صدی میں روس اور یوروپ اور آرمینیہ اور لبنان سے امریکہ گئے ہوئے فرسٹ جنریشن مہاجرین بھی اپنی "اولڈ کنٹری" کو کبھی کبھی اسی طرح یاد کر لیتے تھے۔ نئی پود کے لئے اس نوسٹیلجیا کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ وقت اور تاریخ کا قانون۔۔۔

بھائی احسان حیدر کی شادی۔ سارا کنبہ لاریوں میں بھر کر حیدر آباد سندھ جا رہا ہے۔ آپا صدیقہ کے ہاں' بھائی اعزاز حیدر (منے بھائی) کی شادی۔ اماں بندکیوں والا ڈریسنگ گاؤن پہنے پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ بریلی کی مہاجر دلہن ان کے پاس لا کر بٹھائی جاتی ہے۔ ہماری بڑی اماں (آپا صدیقہ' امتیاز بھائی اور منے بھائی کی والدہ) سفید چوڑی دار پائجامہ' سفید کرتا دوپٹہ' گوری ذہین بزرگ خاتون' جو سنہ 1906ء میں ایک حسین نوعمر لڑکی تھیں اور تہذیب نسواں میں نظمیں لکھتی تھیں۔ وقت کا کیمرہ سب ریکارڈ کرتا جا رہا ہے۔

"اتل بلاش" ۔۔۔ بھائی کی انتہائی ذہین سنہرے بالوں والی بچی نور العین نے تتلا کر غصے سے کہا۔

"خبط الحواس"۔ میں نے پھر ڈانٹا۔

"اتل بلاش" انہوں نے بسور کر دہرایا۔ اور بل ٹیریر کے سب سے موٹے بچے گپلو کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ گڈو کمرے سے نکل کر سرپٹ بھاگی جا رہی تھیں۔ گپلو ان کے پیروں میں الجھ گیا۔

"آپ کہاں بھاگی جا رہی ہیں گڈو باجی۔" نور افشاں نے باہر سے آواز دی۔ گڈو چھ برس کی تھیں اور خود کو باجی کہلواتی تھیں۔

"ہمارے اسکول میں مسز ڈونلڈ ڈک آ رہی ہیں۔ ہمیں فوراً پہنچنا ہے۔ آئی مین۔ مسز مک ڈونلڈ۔"

"وہ کون ہیں؟" بور صدیقی نے کان کھڑے کئے۔

"مسز ائیر مارشل۔" گڈو نے جواب دیا اور غائب ہوگئیں۔

ہم لوگ لٹل لولو' اوز فن ابنی اور ٹام اینڈ جیری کے تازہ ترین کومک سنبھال کر باہر آن بیٹھے' جہاں فیض صاحب' ایوب بھائی' ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' سید مظہر امام اور بور صدیقی پہلے سے تشریف فرما تھے۔ میں نور افشاں اور عاصم حاتم نہایت استغراق سے کومک پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ کچھ دیر بعد فیض صاحب نے کافی کی پیالی میز پر رکھ کر سگریٹ سلگایا۔ لٹل لولو بند کر کے میں نے انکو اطلاع دی۔ "ہم نے نیا ناول لکھنا شروع کر دیا ہے آپ جلدی سے کوئی نظم کہیئے تاکہ ہم اس میں سے عنوان نکالیں۔ داغ داغ اجالا تو ہم نے کر لیا۔"

"یہ بھی کلیشے بن جائے گا۔" نور افشاں نے ٹام اینڈ جیری پڑھتے ہوئے باآواز بلند اظہار خیال کیا۔

"کون۔؟" ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے دریافت کیا۔

"انکل اسکروج۔ آئی مین۔ یہ داغ داغ اجالا۔" میں نے کہا۔

"ہمیں لاہور میں کالج کی چند لڑکیاں ملیں جنھوں نے بڑی مایوسی اور حیرت سے ہمیں بتایا کہ کراچی سے لاہور جاتے ہوئے ٹرین میں آپ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ برابر کے کوپے میں تھیں۔ انتہائی عقیدت کے ساتھ کنڈکٹر کے ذریعہ انہوں نے آپ کو کہلوایا کہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ پھر حاضر خدمت ہوئیں۔ اور آپ۔" ایوب بھائی نے سپنس پیدا کرنے کے لئے توقف فرمایا۔ پھر بولے۔ "اور آپ نہایت انہماک سے شمع اور چنگاری اور ڈونلڈ ڈک کو مک پڑھتے پائی گئیں۔"

"آگیا۔ آگیا۔" میں نے یکلخت اچھل کر کہا۔ "سفینہ غم دل۔ ہوگیا عنوان۔"

نور العین نے اپنی گڑیا سیڑھی پر رکھی اور گپلو کے پیچھے دوڑیں۔

"بی بی آپ کا نام کیا ہے۔" بور صدیقی نے ان سے پوچھا۔

"نول العین حیدل۔ آپ تے مزاج شلیف؟"

"نہایت تمیزدار بچی ہے۔ اور آپ کی پھوپھی کا نام کیا ہے؟"

"اقل بلاش۔"

"نہایت ذہین بچی ہے۔"

"آپا سلطانہ کی جن کزن سے شادی ہونے والی ہے وہ بھی فوجی ڈاکٹر ہیں؟" مظہر صاحب نور افشاں سے دریافت کر رہے تھے۔

"نہیں — سادے آدمی ہیں۔" نور افشاں نے جواب دیا۔

"وہ کرنل انکی؟" مظہر صاحب نے پوچھا۔ "یہ خوب رہے گا۔ وہ کرنل اور آپا سلطانہ فوج میں کیپٹن ڈاکٹر۔"

"کرنل انکی؟" بور صدیقی نے چونک کر پوچھا۔ "انگریز ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لکھنؤ چینیا بازار گیٹ والے چچا احمد حسین کے بیٹے۔ وہ فوج میں کرنل انکی اس لئے کہلاتے ہیں کہ بالکل انگریزوں والی چال ڈھال ہے۔ وہ اصلی انگریز دوسرے ہیں جن کو ہمارے ایک اللہ والے عزیز نے پالا پوسا تھا۔"

"اصلی انگریز بھی آپ کے ہاں موجود ہیں؟" بور صدیقی نے تعجب سے دریافت کیا۔

"وہ کسی انگریز کرنل کا یتیم و لیسیر بچہ تھا جس کی ہمارے ان بزرگ نے پرورش کی۔ وہ بڑے ہو کر ایسے قدامت پرست مسلمان نکلے کہ سادات نہٹور کی ایک ان پڑھ پردہ نشین لڑکی سے شادی کی۔ اسے پردے میں رکھتے ہیں۔ وہ بھی فوج میں شاید میجر ہیں۔" نور افشاں نے کہا۔

"ہم نے سنا تھا۔" مظہر صاحب کہنے لگے۔ "کہ رتی کشور کی شادی پر آپ لوگوں کے ایک جادوگر

کزن محیر العقول شعبدے دکھائیں گے۔ وہ آئے ہی نہیں۔ وہ آجکل کہاں ہیں؟"

"غالباً کامروپ میں۔" عاصم نے مختصراً جواب دیا۔

"رتی کشور کی شادی کے زمانے ہی میں حفیظ جالندھری کا قومی ترانہ شائع ہوا تھا۔ کشور حسین شادباد۔ اس پر آپ نے یا طفیل احمد جمالی نے امروز میں ایک بڑا پر لطف تنقیدی نوٹ لکھا تھا۔ "مس کشور حسین کا سہرا۔ اس پر میں سمجھا کہ یہ شاید کشور بی بی کا سہرا ہے۔" بور صدیقی نے ایوب بھائی سے کہا۔

"آپ کی سمجھ کے متعلق مجھے ہمیشہ سے شبہ تھا۔" ایوب بھائی نے جواب دیا۔

"جادوگر کزن؟" بور صدیقی نے دوبارہ چونک کر دہرایا۔

"پارٹیشن سے پہلے انہوں نے اپنا سرکس قائم کر رکھا تھا رنگون میں۔" میں نے بتایا۔ "پردے کے بے انتہا قائل آدمی تھے۔ جب رنگون کی سڑکوں پر ان کے شیروں اور لنگوروں کے پنجروں کا جلوس نکلتا۔ بیوی کی پردے سے منڈھی ڈولی بھی ساتھ ساتھ چلتی۔"

باجی راضیہ باہر آکر محفل میں شامل ہوئیں۔

"اس قدر پردہ بھی آج کل لوگ کروا سکتے ہیں۔" مظہر صاحب نے کہا۔

"وہ نہٹور کی قدیم ترین روایات کو اب تک نبھا رہے ہیں۔" باجی راضیہ نے کہا۔ "آپ لوگوں کو اب یقین نہ آئے گا مگر سچا واقعہ ہے۔ سنا ہے ہمارے پرداداغدر والے باغی میر احمد علی ایک مرتبہ اپنی بیوی ہماری پردادی شریف النساء بیگم کو ساتھ لیکر نہٹور سے ذرا دور سکندر پور جا رہے تھے۔ پردادی پردے سے منڈھے رتھ میں بیٹھی تھیں۔ میر احمد علی گھوڑے پر سوار ذرا آگے آگے جا رہے تھے۔ راستے میں گاڑی کو دھچکہ لگا اور پردادی کا پہلوٹھی کا شیر خوار بچہ۔ ہمارے دادا جلال الدین حیدر۔ ان کی گود سے پھسل کر باہر سڑک پر گر گیا۔ پردادی نے دہل کر چیخ ماری مگر ہمت نہ پڑی کہ گاڑی بان سے رتھ روکنے کے لئے کہیں۔ بچہ سڑک پر پڑا رہ گیا۔ بیوی کی چیخ سن کر میر احمد علی گھوڑا دوڑاتے رتھ کے قریب آئے۔ بچہ سڑک پر سے اٹھایا۔ مگر شریف النساء بیگم کو ڈانٹا کہ تم نے چیخ کیوں ماری۔ آواز کی بے پردگی ہوئی۔"

"اللہ اکبر۔" بور صدیقی نے کہا۔

"جادوگر ماموں واقعی باکمال انسان ہیں۔" عاصم بولے۔ "ہم چھوٹے سے تھے جب خالہ عذرا کی شادی ہوئی تھی۔ امیر نشاں علیگڑھ میں ایک رات پچھلے چبوترے پر سب لوگ بیٹھے تھے۔ جادوگر ماموں نے اپنے شعبدے دکھائے۔ انہوں نے جناب ہم سے کہا صحن میں سے ایک مرغی پکڑ لاؤ۔ ہم فوراً گھیر کر پکڑ لائے۔ پھر بڑے نانا جان [16] کے ہاتھ میں چھری دی کہ اس کو ذبح کر دیجئے۔ "بڑے نانا جان نے انکار کیا۔ پھر انہوں نے کسی اور تماشائی سے اسے ذبح کروایا۔ ہم رونے لگے ہم اسے روز دانہ ڈالتے تھے۔ پھر انہوں نے سب کے سامنے اس کا سر پھر سے جوڑ دیا اور وہ مرغی زندہ ہو کر بھاگ گئی۔"

"ہم سب چشم دید گواہ ہیں۔ مجھے یاد ہے۔ پہلے جادوگر بھائی نے وہ مرغی ابا جان کو دی جب انہوں نے اس کے گلے پر چھری پھیرنے سے انکار کیا تو کسی اور نے شاید عبد الرحمٰن نے اسے ذبح کیا تھا۔ مگر ایک

قطرہ خون نہ نکلا۔ نظربندی کا کمال۔ یہ نظربندی کس طرح کی جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جس طرح ہمارے سیاست داں کرتے ہیں۔" ایوب بھائی بولے۔

"مگر یہ جادوگر صاحب ہیں کون؟" بور صدیقی پھر کا مروپ واپس گئے۔

"ہماری چھوٹی چچی جان کے ننھیالی رشتے دار۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ ایک کچھوے کو خرگوش میں اور ایک سندھی مزدورنی یا بنگالی مچھیرن کو جم خانہ کلب میں رقصاں بیگم میں تبدیل کر سکتے ہیں؟" ایوب بھائی نے سوال کیا۔ "جس طرح آپ بذریعہ پبلسٹی ایک غریب پسماندہ معاشرے کو ایک الٹرا ماڈرن ہائی سوسائٹی میں تبدیل کر کے پیش کر رہی ہیں۔ یہ بھی نظربندی کا کمال ہے۔ انڈیا بھی یہی کر رہا ہے۔"

"ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف پسماندہ مشرقی ملکوں میں ہو رہا ہے۔ اور آپ کی فارن پبلسٹی سے ویسٹ کے لوگ مرعوب ہو جائیں گے؟۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔"

"کیا آپ کچھوے کو خرگوش میں تبدیل کر سکتی ہیں؟" بور صدیقی نے ششدر ہو کر سوال کیا۔

"ارے صاحب میں آج کل فارن پبلسٹی کے لئے ایک مصور چکیلی کتاب پروڈیوس کرنے میں مصروف ہوں۔ ویمن آف پاکستان۔"

"جی ہاں۔ اور اس کے لئے آپ روزانہ جسٹس طیب جی کے ہاں شہر کی الٹرا فیشن ایبل بیگمات کو جمع کر کے ان کی تصویریں کھنچوا رہی ہیں۔ اس کتاب کے لئے آپ نے مہاجروں کی جھگیوں میں جا کر ان کی تصویریں کیوں نہیں لیں۔" ایوب بھائی نے کہا۔

فیض صاحب ڈاکٹر رضی الدین کے ساتھ کیاری کی دوسری طرف مصروف گفتگو تھے۔ وہ سب کراچی واپس جانے کے لئے اٹھے۔ ایوب بھائی نے بی بی نور العین کو گود میں اٹھایا۔ وہ سب بجری پر چلتے مظہر صاحب کی بڈسن کی طرف بڑھے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے مجھ سے کہا۔ "آپ کے بڑے بھائی عثمان حیدر آفندی کل شام عذرا بی بی کے ہاں شے بتا رہے تھے آپ' رتی' اچھو' نور افشاں سب مل کر ایک کار خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"وہ ارادہ ختم ہوا۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک نئی مشترکہ اسٹیشن ویگن خریدنے کی وہ اسکیم قطعی ناقابل عمل تھی۔ کیوں کہ ہم سب نہ صرف رہتے دور دور ہیں' ہمارے دفتر بھی مختلف سمتوں میں ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ سوشلزم کے بجائے پرائیویٹ انٹرپرائز کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ سب الگ الگ کاریں خریدیں گے۔ آج کل زوروں میں ان کے ٹرائل لئے جا رہے ہیں۔ کل عاصم میرے لئے ایک سلور گرے زمین دوز شے لیکر آئے تھے۔ کہنے لگے یہ JAGUAR ہے۔ بہترین برٹش ارسٹوکریٹک کار۔ بس ذرا پرانی ہے۔ سوار ہو کر ہم لوگ ماری پور گارڈ روم کی حد سے نکلے۔ کراچی جانے والی سڑک پر کچھ دور جا کر محسوس ہوا جیسے موٹر الار ہو رہی ہے۔ پھر وہ پطرس کی سائیکل کی طرح ترچھی ترچھی چلنے لگی۔ عاصم فوراً

نیچے اترے۔ معائنہ کر کے اطمینان سے فرمایا۔ "میرا خیال ہے کہ اس میں سے اتر جانا مناسب رہے گا۔ اس کا ایک پہیہ نکلنے والا ہے۔

"بس آپ بیگمات کی تصویریں کھنچوائیے اور تین پہیوں کی کار چلائیے"۔ ایوب بھائی نے کہا۔

"جی جہاں۔ کٹی ہوئی مرغی کا سر جوڑا جا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اتّل بلاش۔ خدا حافظ۔" نور العین منا سا ہاتھ ہلا کر بولیں۔ فیض صاحب۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ایوب کرمانی' بور صدیقی' عاصم' مظہر صاحب سب شہر روانہ ہو گئے۔ نور افشاں جو فلائٹ لیفٹیننٹ ہو چکی تھیں اور جاڑوں میں ریشمی "ایئرفورس بلیو" اور گرمیوں میں سوتی خاکی ساری پر نیلا یا خاکی یونیفارم کوٹ پہن کر' سر پر بیرے لگا کر کام پر جاتی تھیں اپنی جیپ پر سوار ہوئیں۔ میں نے سبز جالیوں والے برآمدے میں واپس آ کر لٹل لولو پڑھنا شروع کی۔ کچھ دیر بعد رتی میاں شہر سے ٹرائل کے لئے ایک کار لیکر آنے والے تھے۔

اہالیان ایئرفورس اسٹیشن کے لئے مخصوص بسیں ہمارے بلاک سے چند قدم کے فاصلے پر ہر آدھ گھنٹے بعد چھٹتی تھیں۔ جو ایک میل دور گارڈ روم کے پھاٹک سے نکل کر ساحلی شاہراہ پر سے گذرتی شہر جاتی آتی تھیں۔ ہفتے میں تین چار بار نور افشاں' نسیمہ ممانی اور میں استاد بڑے آغا صاحب اور مسٹر فرنانڈیز کے ہاں تحصیل فنون موسیقی شرقیہ و غربیہ کے لئے انہی بسوں پر راہ علم طے کرتے تھے۔ یہ بسیں سنٹرل سیکرٹریٹ کے عین سامنے جا کر رکتی تھیں۔ جہاں محکمہ اطلاعات و نشریات واقع تھا۔ دفتر کے لئے پابندی اوقات چنداں ضروری نہ تھی۔ نور افشاں اپنی وردی ڈانٹ کر صبح ساڑھے سات بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتی تھی۔ میں سویلین آدمی اطمینان سے نو ساڑھے نو بجے جاگ کر گیارہ بجے تک ماری پور بس کے ذریعے دفتر جاتی۔ لیکن روزانہ بس میں اتنی دور آنا جانا ایک نا تاشاہی طبع نازک پر بار تھا۔ لہٰذا کار خریدنے کی اسکیم' جس کی تکمیل کے لئے رتی اور عاصم کونا گوں و قلموں سیکنڈ ہینڈ موٹریں ماری پور لا رہے تھے۔

تیسرے پہر کو رتی میاں ایک اسکوڈا پر تشریف لائے۔ مالک مسٹر جھن جھن والا ساتھ تھے۔ دونوں صاحبان آ کر برآمدے میں بیٹھے۔ مسکین صورت منحنی مسٹر جھن جھن والا نے فرمایا۔ "ایکدم نیا گاڑی ہے۔ ہم چھ ہجار سے کم نہیں لے گا۔ بجار میں پتا کر لو۔ اس سے کم دام میں اسکوڈا نہیں ملے گا۔"

رتی نے کہا۔ "ذرا اسٹوڈنٹس کنسیشن کر دیجئے۔"

انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔ "آپ اسٹوڈنٹ لوگ ہے؟"

رتی میاں نے کہا۔ "انسان ساری عمر جویائے علم رہتا ہے۔"

جھن جھن والا نے اس فلسفیانہ نکتے کو نظرانداز کر کے دہرایا۔ "چھ ہجار۔"

بہت رد و قدح کے بعد رتی میاں نے مسٹر جھن جھن والا سے کہا۔ "پیر کے روز ایک خطیر رقم آپ کی خدمت اقدس میں پیش کر دی جائے گی۔"

"کیسی رقم؟"

"خطیر۔"

"رتی میاں ان سے انگریزی میں کیوں نہیں بات کرتے؟" باجی راضیہ نے کہا۔

رتی میاں نے جواب دیا۔ "اردو ہماری قومی زبان ہے۔"

"پانچ ہجار۔" مسکین تاجر نے کہا۔

میں جو خریداری کے معاملے میں بالکل کوری ہوں اور اب تک صبر سے خاموش بیٹھی تھی فوراً بول اٹھی۔ رتی میاں پانچ ہزار تو بالکل ٹھیک ہے بالکل نئی کار ہے۔ چیکو سلوو یکین۔"

رتی میاں نے سر پیچھے ڈال کر ایک لحظے کے لئے آنکھیں بند کیں۔ گہرا سانس لیا اور مسٹر جھن جھن والا سے بولے۔ "جھن جھن والا صاحب یہ ہماری بہن جو ہیں۔ ان کی آنکھیں بہت کمزور ہیں۔ اس وجہ سے سیکنڈ ہینڈ کار ان کو نئی نظر آرہی ہے۔ پیر کے دن آپ کو اس کا ایک معقول و مناسب معاوضہ۔"

مسٹر جھن جھن والا جھنجلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ برآمدے سے اتر کر اسکوڈا کی سمت بڑھے۔ رتی میاں نے آواز دی۔ "جھن جھن والا صاحب بفضل خدا سودا بخیر و خوبی طے ہوگیا۔ کار یہیں چھوڑتے جایئے تو مہربانی ہوگی۔"

پرند نما جھن جھن والا تیز تیز قدم رکھتے بجری کا میدان پار کرکے بس اسٹاپ پر جا کھڑے ہوئے بہت قابل رحم نظر آئے۔

آپا راضیہ نے کہا۔ "رتی میاں یہ کیا حرکت ہے۔ ان کو کار میں شہر چھوڑ کر آؤ۔"

"بے چارے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"بے چارے؟ یہ لکھ پتی آدمی ہیں۔ اور نہایت چلتے پرزے۔ ہمیں بے وقوف بنانے آئے تھے۔ میں پیر کے روز تک ان سے ہزار پانچ سو اور کم کروا لونگا۔"

آخر رتی میاں کے دل میں نیکی آگئی۔ کار لیکر بس اسٹاپ پر گئے اور جھن جھن والا کو اس میں بٹھا کر شہر روانہ ہوئے۔ انہیں کراچی پہنچا کر اسکوڈا ماری پور واپس لائے۔ اس وقت تک عاصم آچکے تھے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ باہر ہارن بجا' چند منٹ بعد رتی میاں مسکراتے ہوئے کمرے میں تشریف لائے اور فرمایا۔ "پوم پوم ڈارلنگ باہر کھڑی ہیں۔" کار کا نام بالاتفاق رائے پوم پوم ڈارلنگ" طے ہوا جو عاجزہ کے متعلق عصمت چغتائی کے اس مضمون کا عنوان تھا جو حال میں غالباً سویرا میں چھپا تھا۔

فائنینشل معاملات بدستور MESS میں تھے۔ شیرز کے اسکرپس کسٹوڈین کی طرف سے الٰہ آباد بنک لکھنؤ کی تحویل میں تھے۔ لیکن ابھی فارن ایکسچینج پر پابندی نہیں لگی تھی۔ چنانچہ نئے ہندوستانی قانون کے مطابق تارک وطن شیر ہولڈرز کے ڈیویڈنڈ وارنٹس کراچی بھیجے جاتے تھے۔ ان پر دستخط کرکے واپس کیا جاتا اس کے بعد ان کا پچاس فیصدی منافع ہندوستان میں وضع کرلیا جاتا تھا۔ بقیہ ریزرو بنک آف انڈیا کے فارن ایکسچینج ڈپارٹمنٹ کی طرف سے شاید سیدھا چارٹرڈ بنک کراچی آجاتا تھا جو کلکتے میں بھی ابا جان کا بنک تھا۔ یہ بہت پیچیدہ معاملات تھے نجانے کیا سلسلہ تھا۔ پچاس فیصدی منافع ہندوستان میں کٹنے کی وجہ سے بہت نقصان

ہو رہا تھا۔ علاوہ ازیں کلکتہ' بمبئی' دہلی اور کانپور سے انواع و اقسام کے کاغذات' فارم' رپورٹیں اور منافع کے وارنٹ آتے رہتے تھے۔ جن کو میں کھول کر دیکھتی بھی نہیں تھی۔ بہت سے منافع میری لاپرواہی کی وجہ سے LAPSE ہو چکے تھے وغیرہ وغیرہ۔

حاضر ماموں حسب سابق اماں کے مالی مشیر تھے۔ انہوں نے حاضر اینڈ کو کے علاوہ دو انگریزوں کی شرکت میں "ارون پیل اینڈ حاضر" کے نام سے ایک اور بڑی فرم کراچی میں قائم کی تھی (ان کے ایک پارٹنر مسٹر ارون وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن کے انڈین سیکشن کے نامور کیوریٹر مسٹر جان ارون کے چھوٹے بھائی تھے۔) اماں نے اپنے والد میر نذر الباقر مرحوم کے دیئے ہوئے چند پرامیسری نوٹس کی رقم حاضر ماموں کے کسی کاروبار میں لگا رکھی تھی جس کا منافع ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو خواجہ مظہر القیوم یا ان کے مینجر سید شہنشاہ حسین رضوی پابندی سے لاکر اماں کو دے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اماں کے شیرز کے معاملات مظہر بھائی سنبھالتے وہ اکثر مجھے فون کرتے۔ "آپ کل صبح میرے دفتر آیئے میں آپ کے کاغذات SORT OUT کروں اس طرح آپ کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔"

"جی ہاں! مظہر بھائی ضرور آؤنگی۔" پھر ان کے دفتر جانا ٹال جاتی۔ چند ہفتے قبل بالآخر میں ان کے دفتر چارٹرڈ بنک بلڈنگ میکلوڈ روڈ گئی تھی۔ مظہر بھائی میز پر سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ کہنے لگے۔ "تشریف رکھیئے۔ کاغذات لائی ہیں؟" وہ بہت برافروختہ تھے۔

"جی ہاں۔ جو مل گئے وہ لے آئے ہیں۔"

"مل گئے کیا؟۔۔۔ آپ ان کو ردی میں پھینک دیتی ہیں؟"

"جی نہیں مظہر بھائی۔ وہ دراصل۔ ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ پھوپھا مرحوم آپ کے لئے اتنا چھوڑ گئے۔ لوگ اپنے حالات بہتر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ جو کچھ آپ کے پاس ہے اسے بھی برباد کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی بھی کیا بے پرواہی۔ پھوپی شکر ہے کہ ذمے دار آدمی بن چکے ہیں اور آپ۔"

مظہر بھائی دہرہ دون میں میری انگلی پکڑ کر مجھے سرکس دکھلانے لے جایا کرتے تھے۔ میں چپکی بیٹھی ان کی پرخلوص مشفقانہ جھاڑ سنا کی۔ کاغذات مجھ سے لیکر انہوں نے اپنی فرنگن سیکرٹری کو بلایا۔ اس سے کہا کہ ان کاغذات کو ترتیب دے کر ان کی فائل تیار کرے۔ کمپنیوں کی فہرست سامنے رکھ کر مجھ سے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے ان میں سے چند کمپنیاں بالکل گولڈ مائن ہیں۔ افریقہ اور برما کی ٹھنڈی پڑ چکی ہیں لیکن کورین وار کی وجہ سے قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ آپکے چالیس ہزار کے شیرز کی موجودہ مارکیٹ ویلیو نوے ہزار کے قریب ہے۔ مگر آپ کو اللہ نے عقل سلیم عطا نہیں کی۔"

"جی۔ مظہر بھائی۔"

پچاس فیصد منافع وضع ہونے کے باوجود ریزرو بنک آف انڈیا نئی دہلی چارٹرڈ بنک کراچی کو جو منافع بھیج رہا تھا اس کی اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی۔

"ذرا اپنی چیک بک دکھلایئے۔" مظہر بھائی نے معاً کہا۔
میں نے پیش کی۔ اس کے کاؤنٹر فائیلز پر لکھا تھا طامس اینڈ طامس بک سیلرز۔ طامس اینڈ طامس۔ طامس اینڈ طامس.....

"آپ ہر مہینے اتنی کتابیں خریدتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ مظہر بھائی۔ وہ دراصل انگلش اور امریکن کتابیں آجکل بہت مہنگی ملتی ہیں۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن آپ اتنی کتابیں پڑھ کر کیا کریں گی۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"بہت خوب۔"

سیکرٹری نے فائل مرتب کر کے پیش کیا۔

"میں ان سب سے آپ کی طرف سے ضروری خط و کتابت کروں گا۔ اب تک کتنا روپیہ ڈوب چکی ہیں۔ کمال ہے۔ اللہ رحم کرے اور آپ کو عقل سلیم عطا کرے۔"

"اللہ آپ کو تھوڑا سا کومن سنس عطا کرے۔" رتی میاں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کا بس چلتا تو آج صبح آپ جھن جھن والا کو مارے ہمدردی کے اس کی بتائی ہوئی قیمت سے زیادہ پیش کر دیتیں کیونکہ اس کی شکل پر بہت بیچارگی برس رہی تھی۔"

"بگ نور پورٹ سر آئی ایم این ایڈیٹ۔" میں نے ہم سب کے محبوب کردار گڈ سولجر شویک کی طرح بے عجز و انکسار سے جواب دیا۔

اس اتوار کو ماری پور کی شاہراہ پر "پوم پوم ڈارلنگ" فراٹے سے رواں تھی۔ عاصم بطور انسٹرکٹر تشریف فرما تھے۔ پارے میاں اور اچھو پیچھے بیٹھی تھیں۔ میں نے کہا۔ "دیکھئے جناب سامنے سے جو موٹر آ رہی ہے۔ میں اسے کس صفائی سے اوور ٹیک کرتی ہوں۔"

پارے نے کہا۔ "یہی تو کمال ہے کہ آپ اپوزٹ ڈائریکشن سے آنے والے موٹر کو اوور ٹیک کرتی ہیں۔"

اماں کار کی خریداری اور ڈرائیونگ سیکھنے کے اس سارے ہنگامے کی وجہ سے حد درجہ سراسیمہ تھیں۔ "ایکسیڈنٹ کریں گی۔ مر جائیں گی۔" ایک روز انہوں نے حسب عادت اپنے قنوطی انداز میں اظہار خیال کیا۔

"میں ایک مرتبہ منگی برج سے فیض آباد روڈ تک اوک لینڈ۔ نفس نفیس خود چلا کر نہیں لائی تھی۔؟ اور آپا عذرا اور اچھو اور سلویا جو اس فراٹے سے کار چلاتی ہیں آج تک کچھ نہیں ہوا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ سمجھدار لڑکیاں ہیں۔ پہلے ان جیسی عقل تو لاؤ۔"

بھائی بولے۔ "بس کراچی کے ٹریفک میں کار چلاتے وقت آپ ہنسنے گا ہرگز نہیں۔ کیونکہ آپ

چینیوں کی طرح ہنستی ہیں۔ سامنے سڑک نظر نہیں آئے گی۔"

پوم پوم ڈارلنگ کو آئے چند روز گزرے تھے جب ڈی اے ایف پی میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے صبح ساڑھے گیارہ بجے القا ہوا کہ انگلستان جانا چاہئے۔ فوراً رتی میاں کو ان کے اورینٹ ایرویز دفتر فون کیا۔

"رتی میاں۔ سلاں علیکم۔ گول کیجئے۔ کار واپس۔"

"سلاں علیکم۔ پوم پوم ڈارلنگ واپس؟"

جھن جھن والا کو ابھی چیک تو نہیں دیا؟ ہم انگلستان جا رہے ہیں۔ آپ اب ہوائی جہاز کا ٹکٹ کٹوا دیجئے۔ فی الفور۔"

اسی وقت یاد آیا کہ انور قریشی کی چھوٹی بہن بلقیس نصراللہ نے چند روز قبل برسبیل تذکرہ ذکر کیا تھا کہ وہ مسٹر فلاں پاسپورٹ آفیسر سے ملنے جا رہی ہے۔ رتی میاں سے بات ختم کر کے بلی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسرے روز ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میں اور بلی معہ تصویر پاسپورٹ آفیسر کے دفتر میں موجود تھے۔ اس زمانے میں اس قسم کے کام بلا کسی دقت کے فوراً ہو جایا کرتے تھے۔ پاسپورٹ آفیسر نے ایک گھنٹے کے اندر اندر پروانہ راہداری تیار کروا کے حوالے کیا۔ بقیہ متعلقہ مراحل اسی طرح جلد از جلد طے ہوئے۔ تیسرے روز چارٹرڈ بینک آف انڈیا' آسٹریلیا اینڈ چائنا کے شعبہ زرمبادلہ کے فرنگی نے آدھ گھنٹے میں سال بھر کا کوٹا ڈھائی سو پاؤنڈ کے ٹریولرز چیک پیش کئے۔ رتی میاں کا دفتر بنک کے عین مقابل واقع تھا۔ باہر میکلوڈ روڈ پر شور شدید تھا۔ سڑک کراس کرنے کے انتظار میں فٹ پاتھ پر توقف کیا تو کچھ فاصلے پر بے چارے بور صدیقی کھڑے دکھلائی دیئے۔ نہایت خوش خلقی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں "ہلو" کیا۔ وہ فوراً بھیڑ چیرتے لپکے ہوئے آئے۔ قریب پہنچے غور سے دیکھا تو وہ بور صدیقی نہیں تھے۔ انہوں باچھیں کھلا کر کہا۔ "آپ نے مجھے بلایا تھا؟ میں فلاں ہوں۔ آپ۔؟"

میری روح پرواز کر گئی۔ یہ صاحب عالم اسلام کے ایک نامور اور محبوب بزرگ کے فرزند اکبر تھے۔ بسلسلہ خواتین جن کے مشاغل کی وجہ سے ان کے مرحوم و مغفور والد ان سے بے انتہا ناخوش و نالاں رہے تھے۔ میں فوراً سرپٹ بھاگتی رتی میاں کے آفس پہنچی۔ رتی میاں اطمینان سے اپنی میز پر بیٹھے چاء نوش کر رہے تھے۔ ان کو واقعہ بتایا۔ انہوں نے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ اب فوراً عینک خرید لیجئے۔"

"عینک تو خیر ہرگز نہیں لگائیں گے۔ ٹکٹ بن گیا؟"

"بی بی بات یہ ہے کہ تمام غیر ملکی ایئر لائنز کی پرواز ایک نامعلوم مدت تک کے لئے کسی وجہ سے ملتوی کر دی گئی ہے۔ کیا آپ کو کسی خاص تاریخ پر ضروری کام سے لندن پہنچنا ہے؟"

"بالکل۔ جلد از جلد۔"

"لیکن کیوں؟ اتنی جلدی کیا ہے؟"

"ایسے ہی۔"

"اچھا۔ میں تین چار کمپنیوں میں معلوم کر کے شام کو گھر پر فون کرتا ہوں۔"

اگلی صبح دفتر میں انوز قریشی نے دریافت کیا۔ "یہ تم تین چار دن سے کس چکر میں مصروف ہو؟"

"بہت اہم معاملہ ہے۔ چلو ذرا قیوم صاحب کے پاس چلیں۔"

مسٹر عبدالقیوم ایک انتہائی نیک دل اور شریف انسان تھے۔ میں نے کہا۔ "قیوم صاحب۔ کم از کم سال بھر کی چھٹی مل سکتی ہے؟"

"سال بھر۔۔۔؟" قیوم صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ کو یہاں کام کرتے کتنے دن ہوئے ہیں؟"

تو استعفےٰ لے لیجئے۔"

"کیا آپ کو لندن میں کوئی ملازمت مل گئی ہے؟"

"بالکل نہیں۔ یونہی جا رہے ہیں۔ اپنے ذہنی افق وسیع کرنے۔"

قیوم صاحب نے اپنے گھومنے والی چرمی کرسی پر پہلو بدلا اور سوچ کر بولے۔ "میں یہ رائے دوں گا کہ آپ استعفےٰ داخل نہ کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ جتنی رخصت بغیر تنخواہ مل سکتی ہو ایڈمنسٹریشن کے ہیڈ کلرک سے معلوم کر کے لے لیجئے۔ اور رخصت کی مدت ختم ہوتے ہی واپس آ جایئے۔"

ہیڈ کلرک نے کاغذات کی جانچ پڑتال اور قوانین کی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔ "آپ کو تین ماہ کی رخصت بغیر تنخواہ مل سکتی ہے۔"

میں نے قیوم صاحب سے کہا۔ "لایئے وہی دید یجئے۔"

تین ماہ کی رخصت بغیر تنخواہ منظور ہو گئی۔

دوسرے دن لنچ کے وقت شان الحق حقی صاحب نے پوچھا۔ "لندن میں آپ کے کوئی رشتے دار ہیں؟ کہاں ٹھہریں گی؟"

"دو کزن حال ہی میں وہاں گئے ہیں مگر ان کا اتہ پتہ معلوم نہیں۔ وہ دونوں ایلچی ہیں پینک میں اب تک انہوں نے خط ہی نہیں لکھا۔"

"آپ کے کزن ایلچی ہیں۔۔؟" ایک صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ وہ روحانی طور پر پینک میں رہتے ہیں۔ بہرحال ہم DIGS میں قیام کریں گے۔ جیسے سب رہتے ہیں۔ کیا خاص بات ہے۔"

"میرے بڑے بھائی۔" شان صاحب نے کہا۔ "عرصے سے وہاں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی انگریز ہیں۔ وہ کمرے کرائے پر اٹھاتے ہیں۔ میں ان کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔"

لوگ باگ جوق در جوق انواع و اقسام کے سرکاری اور بیرونی وظائف پر باہر جا رہے تھے۔ اب گھر پہ اعزہ اور احباب کے پے در پے تہنیتی فون آنے شروع ہوئے۔ "مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ کون سا۔ کہاں کا اسکالرشپ ملا ہے؟"

"کہیں کا بھی نہیں۔ ہم خود جا رہے ہیں۔"

"ایں۔۔؟" اپنے پیسے سے؟ یہ کیا حماقت ہے؟ کوئی اسکالرشپ حاصل کیجئے۔ آپ کو تو بے حد آسانی سے مل جائے گا۔"

"ایک دفعہ طے کر لیا کہ فوراً جانا ہے تو بس جا رہے ہیں۔ اسکالرشپ کے لئے کون درخواستیں دیتا پھرے۔"

رتی کا فون آیا۔ "دو انجن والا ایک جہاز لیبیا' تیونس' الجیریا ہوتا ہوا لندن جا رہا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس کا ٹکٹ بنوا دوں۔"

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا۔ "رتی میاں کیا وہ جہاز قرطاجنہ' طرابلس' الجزائر' ٹینجیرز' کاسابلانکا ٹھہرتا ہوا جائے گا؟ ایسا انتظام کیجئے کہ میں ان سب جگہوں پر رکتی ہوئی جاؤں۔"

راس طغاری' مہدی سوڈانی' سلامبو' مراقش' طرابلس' کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں۔

سلویا اور ادری کے بڑے بھائی صیب ان دنوں مانچسٹر سے آئے ہوئے تھے۔ وہ رتی میاں کے بہت یار غار تھے۔ دوسرے روز رات گئے سی فیلڈ روڈ سے ان کا فون آیا۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "رتی ابھی ابھی پتہ چلایا ہے۔ وہ ایک کھٹارا جہاز ہے۔ دو انجن والا۔ مرمت کے لئے لندن جا رہا ہے۔ اس میں ہرگز ہرگز مت جاؤ۔ رتی نے ابھی معلوم کیا ہے۔ فارن ایرلائنز کا اسٹرائیک ختم ہونے والا ہے۔ تین چار دن تک سوئیس ائیر میں بکنگ کروا دی جائے گی۔"

سامنے بجری کے میدان کے ادھر آخری بس آ کر رکی جس میں سے عاصم زیدی ہوائی سفر کے دو زرد سوٹ کیس لئے اترے جو میں نے صبح جب وہ شہر جا رہے تھے ان سے کہا تھا کہ خریدتے لائیں۔

اماں بہت سی خود ساختہ یا قدیم اصطلاحات استعمال کیا کرتی تھیں۔ پستہ قد ناپسندیدہ شخص گپنا یا خنگا۔ بیحد دبلا بوڑھا قاق۔ (جواب جا کر معلوم ہوا کہ منگولین اور ترکی زبانوں میں دھوئیں سے سکھائے ہوئے گوشت کو کہتے تھے اور یہ لفظ بھی نواح دہلی میں مغلوں نے رائج کیا ہو گا۔) بے تکا بوڑھا بوبک۔ اردو کے وہ متروک الفاظ اور محاورے جو نانی اشرف جہاں بیگم اور مصطفائی بیگم' مرتضائی بیگم کی زبان پر رہتے ہوں گے اماں انہیں مستقل استعمال کرتی تھیں۔ قلماقنی' قابوچی' کوتک' لانگائیر' کبن' روغن قاز' ہوائی دیدہ' الغتے۔ کپڑوں کے لئے فتوئی' مرزئی' دگلہ' خفتا' الخاق یعنی روئی دار قبا۔ کہنے لگیں۔ "دو الخاق ساتھ لے جاؤ۔ باقی وہاں خرید لینا۔" الخاق پرانی اردو میں گرم فرغل کو کہتے تھے۔ اماں مذاقاً اوورکوٹ کو اسی نام سے یاد کرتی تھیں۔

لکھنؤ میں نمبر21 فیض آباد روڈ سے کچھ فاصلے پر شہاب الدین صدیقی ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل رہتے تھے۔ سعیدہ' شمیم اور ظفر اقبال ان کی لڑکیاں اور لڑکے لا مارٹیز میں صیب' سلو' ادری اور مشیر کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ سب اب کراچی آ چکے تھے۔ جس روز میں انگلینڈ جا رہی تھی اس کے دوسرے روز مشیر مغربی جرمنی روانہ ہونے والے تھے۔ لہٰذا سعیدہ' شمیم اور اقبال نے اپنے ہاں ہم لوگوں کی فیرویل پارٹی

عقد کی کیک پر باقاعدہ ہم لوگوں کے نام لکھوائے گئے۔ روانگی کی صبح ڈان کے IMPORTANT ARRIVALS AND DEPARTURES کے کالم میں پڑھا MR. QUARRATULAIN HYDER LEAVES FOR U.K. میں نے زوار کو فون کیا۔ آپ نے فرمایا خبر میں نے دی تھی۔ "مسٹر" پرنٹر کی غلطی ہے۔

اسی روز نور افشاں کو سرکاری کام سے راولپنڈی جانا پڑا۔ دوپہر کو رتی میاں سوئس ایئر کا رٹرن ٹکٹ لئے شاداں و فرحاں ماری پور تشریف لائے۔ فرمایا۔ "یہ اوپن ڈیٹ ٹکٹ ہے۔ سال بھر کے اندر کبھی بھی واپس آجائیے۔ لیکن بارہ مہینے کی مدت نکل گئی تو ایئرلائنز آپ کو واپسی کا کرایہ لوٹائے گی نہیں۔" پھر ایک کاغذ سامنے رکھا۔ یہ آپ کی ITINERARY ہے۔ سوئس ایئر کا طیارہ اس روٹ سے لندن جاتا ہے۔ ہم نے ایسا انتظام کیا ہے کہ آپ ان مقامات پر ٹھہرتی ہوئی مندرجہ ذیل تاریخوں پر سوئس ایئر کا طیارہ پکڑ کر آگے چلتی لندن پہنچیں۔"

میں نے پروگرام پڑھا۔ بغداد۔ بیروت۔ استنبول۔ فرینک فرٹ۔ برسلز۔

"جزاک اللہ۔" میں نے کہا۔

"مگر آپ سے بعید نہیں کہ آپ راستے میں پینک میں آکر کہیں اور نکل جائیں۔ پھر بڑی طوالت ہوگی۔"

طیارہ رات کے ایک بجے اڑنے والا تھا۔ وقت گذارنے کے لئے نسیمہ ممانی' ماموں جان اور میں رات کے گیارہ بجے تک جم خانہ میں بیٹھے رہے۔ کلب سنسان ہو چلا۔ اتنے میں ماموں جان کے دوست میر بندے علی تالپور اور حسین شہید سہروردی' جی۔ معین الدین آکر بیٹھ گئے۔ مزید قہوہ منگوایا گیا۔ سہروردی صاحب کسی سیاسی مسئلے کی وجہ سے بہت متفکر اور ملول نظر آرہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھ کر ماموں جان سے کہا۔ "اب چلئے ڈرگ روڈ سے ماری پور بعید لمبا فاصلہ ہے۔ واپسی میں آپ لوگوں کو بہت دیر ہو جائے گی۔"

سہروردی صاحب نے چونک کر پوچھا۔ "آپ کہاں جارہی ہیں؟"

"لندن۔" میں نے اس بے نیازی سے جواب دیا گویا آئے دن لندن جاتی رہتی ہوں۔

جی۔ معین صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ مجھے آجکل کے نوجوانوں کی یہ اسپرٹ بہت پسند ہے۔"

میں انکسار سے مسکرائی۔

ڈرگ روڈ پر ایئرپورٹ کے سنسان راستے میں چند رشتے داروں کی موٹریں ملیں۔ جو خدا حافظ کہنے فرودگاہ گئے تھے اور واپس آرہے تھے۔ سلویا کی کار نظر آئی۔ انہوں نے رک کر بتایا۔ "ہوائی جہاز تین چار گھنٹے لیٹ ہے۔ ایئرپورٹ پر عاصم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

پھر بھائی نے اپنی موٹر روک کر طیارہ لیٹ ہونے کی خبر سنائی۔ اب سب کو خدا حافظ کہہ کر آگے چلے۔

عاصم ڈرگ روڈ پر ایرونوٹیکل انجینئرنگ کی ٹریننگ حاصل کر رہے تھے۔ منے بھائی سول ایوی ایشن میں ملازم تھے۔ دونوں ایئرپورٹ کے گول ہال میں منتظر ملے۔ اس زمانے میں ہوائی جہازوں کی اتنی ریل پیل نہیں تھی۔ ایئرپورٹ سنسان پڑا تھا۔ منے بھائی اور نسیمہ ممانی' ماموں جان کے جانے کے بعد عاصم نے جن کا فرودگاہ میں بہت عمل دخل تھا رن وے کے برابر دو کرسیاں رکھوائیں اور ہم لوگ طیارے کے انتظار میں مصروف ہو گئے۔

صبح چار بجے کے قریب تاریک افق پر سرخ بتیاں نظر آئیں۔

عاصم چند ماہ بعد اعلیٰ ٹریننگ کے لئے ہالینڈ جانے والے تھے۔ "آپا اب آپ سے ایمسٹرڈیم میں ملاقات ہوگی۔ فلاں تاریخ کو۔ شام کے چار بجے۔" انہوں نے گڈ سولجر شویک کی طرح کہا۔

"پونے چار بجے زیادہ بہتر رہے گا۔" میں نے کرسی سے اٹھ کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے گڈ سولجر شویک کی طرح جواب دیا۔

جب ہوائی جہاز رن وے پر کچھ دور جانے کے بعد رک کر ستاتا تھا تو نور افشاں ہمیشہ کہتی تھی۔ اب پائلٹ پرچہ ترکیب استعمال پڑھ رہا ہے۔ پرواز سے قبل طیارہ حسب عادت کچھ دیر ستایا اور مغرب کی سمت اٹھا۔

وقت آنست کہ پری جزاز

حوالہ جات

1. حاجی محمد خلیل نہٹوری کے متعلق مفصل مضمون مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "پرانے چراغ" میں ملاحظہ فرمایئے۔
2. ملاحظہ کیجئے جلد اول فصل پنجم باب 3 "ہلٹن لین"
3. "محترمہ نذر سجاد حیدر" از رمزی جلیل قدوائی۔ عصمت۔ جنوری سنہ 1968ء
4. دیکھیے جلد اول، فصل یازدہم۔ باب 2 "ڈیپی پراڈائز" صفحہ نمبر 490
5. یہ نظم اب تک کئی مغربی مجموعوں میں شامل کی جاچکی ہے۔
6. یہ افسانہ "شیشے کے گھر" مکتبہ جدید لاہور میں شامل ہے۔
7. جری احمد سید۔ اس وقت کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس پاکستان۔
8. دیکھیے جلد اول فصل یازدہم باب 3 "شاہ بلوط کے سائے" صفحہ نمبر 459
9. اب کیپٹن مصطفٰے عالم زیدی۔ کپتان مرچنٹ نیوی۔
10. اب بریگیڈیر حاتم زیدی۔
11. دیکھیے جلد اول فصل یازدہم باب 4 "بوئے گل اور رنگ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں۔"
12. اب کمانڈر خورشید زیدی۔ ڈیفنس، اٹامک پاکستان اٹامک کولمبو۔
13. تلخیص از "شیشے کے گھر"۔ مکتبہ جدید۔ لاہور
14. اب مرحوم
15. مطبوعہ عصمت کراچی۔
16. یلدرم

فصل سیزدہم

1۔ رفش اینڈ چپس

برسلز سے اڑ کر طیارہ بحر شمالی کے بادلوں سے گذرتا لندن پہنچا۔ ہیتھرو ایئرپورٹ صبح کاذب کے دھندلکے میں پوشیدہ تھا۔ اس وقت اس طیران گاہ میں جھاڑو دیتی پنجابی عورتیں نظر نہ آتی تھیں۔ نہ در داخلہ پر پاکستانیوں، ہندوستانیوں کی وہ گت بنتی تھی جو آج بنتی ہے۔ کسٹم والے گورے نے بڑے اخلاق سے دریافت کیا۔ "آپ کے پاس کوئی غیر قانونی منشیات تو نہیں ہیں؟" میں نے کہا قانونی و غیر قانونی دونوں نہیں ہیں۔ اس نے سوٹ کیس کھولے بغیر چاک کے سفید نشان بنائے اور مسکرا کر آگے جانے کا اشارہ کیا۔

باہر اونچی چھت والی ٹیکسیاں، ڈیل ڈول اور جسامت میں اوک لینڈ مرحومہ سے مشابہ نظر آئیں۔ ایک ٹیکسی والے گورے کو شان الحق حقی کے برادر معظم کا پتہ بتایا۔ وہ اسباب لاد کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ لندن ابھی خوابیدہ تھا۔ سڑکوں پر روشنیاں جل رہی تھیں اور بڑی خوشگوار خنکی تھی۔ میلوں دور جا کر ریجنٹ پارک کے نزدیک بھورے سہ منزلہ وکٹورین مکانوں کی ایک قطار کے سامنے ٹیکسی رکی۔ میں نے اتر کر نمبر 12 ریجنٹ پارک ٹیرس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ دہلیز پر دودھ کی بوتلیں رکھی تھیں اور مکان کے دریچوں میں جیرینیم کے گملے رکھے نظر آرہے تھے۔ خالص پر امن روایتی مڈل کلاس انگلستان۔

چند منٹ بعد گرم ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ایک انگریز خاتون نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔ "صبح بخیر آپ مسز حقی تو نہیں؟"

انھوں نے کہا ہاں ہیں۔ میں نے ان کے نادیدہ پاکستانی دیور کا خط انہیں دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسباب لاکر سیڑھی پر رکھا جو مسز حقی اٹھا کر خاموشی سے زینے کی سمت لے چلیں۔ تیسری منزل پر پہنچ کر ایک کمرے میں داخل ہوئیں۔ سبز قالین، سبز پردے، سفید فرنیچر۔ انگریز خاندان میں کتا ایک اہم اور معزز فیملی ممبر کا مقام رکھتا ہے۔ سامنے ایک دیوار پر حقی خاندان کے ایک باوقار کوکر اسپنیل کی تصویر آویزاں تھی۔ مسز حقی نے اسباب فرش پر رکھ کر نپے تلے برطانوی اخلاق و آداب کے انوسار کہا۔ "آپ یہاں ویلکم ہیں۔ میں امید کرتی ہوں یہاں آرام سے رہیں گی۔ بریکفاسٹ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے BASE MENT میں۔" اور واپس چلی گئیں۔

کمرے میں لطیف خنکی تھی۔ میں نے دریچے میں جا کر دیکھا۔ باہر صبح کا اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور کہر آلود ریجنٹ پارک کے درخت نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سوچا اب شہزادی الزبتھ وہاں شہسواری کرتی دکھلائی پڑیں گی۔ بچپن سے پھول اخبار میں پڑھتے آئے تھے کہ شہزادی الزبتھ علی الصبح ریجنٹ پارک میں شہسواری کرتی ہیں۔

لیکن شہزادی الزبتھ نظر آنے کے بجائے چچا انعام الحق دہلوی مرحوم کے داماد شریف الحسن سے

ملاقات ہوئی۔ جب میں ٹھیک آٹھ بج کر پچیس منٹ پر تہہ خانے میں جانے کے لئے زینے پر پہنچی تو شریف الحسن صاحب جو صاحب خانہ کے رشتے دار تھے۔ چوتھی منزل سے اتر کر ناشتے کے لئے نیچے جاتے ملے۔ میں نے بعد علیک سلیک چچی توقیر اور زیرک کی خیریت ان سے دریافت کی جو لاہور میں تھیں۔ شریف الحسن صاحب قاہرہ سے تبدیل ہو کر آئے تھے اور پاکستان ہاؤس میں پریس اتاشی تھے۔

تہہ خانے کے اطاق صبحانہ میں صاحب خانہ ڈریسنگ گاؤن اور اونی سلیپر پہنے آتشدان کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے مانچسٹر گارجین پڑھ رہے تھے۔ ایک بلی اور ایک کتا قدموں میں فروکش تھے۔ صاحب خانہ نے اٹھ کر برطانوی انداز میں خیر مقدم کیا۔ مگر چند منٹ بعد ہی بے ساختہ سوال کیا آجکل پاکستان میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کے مانند وہ بھی بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔

ناشتہ کرتے ہوئے خیال آیا تقی میاں اور محمود میاں کا پتہ شاید پاکستان ہاؤس کے شعبہ تعلیم سے معلوم ہو جائے گا۔ شریف الحسن صاحب نے کہا دونوں حضرات فی الوقت پاکستان ہاؤس میں پارٹ ٹائم ملازم ہیں۔

بریکفاسٹ کے بعد شریف الحسن صاحب کے ہمراہ بس پر سوار ہو کر ہائی کمیشن کا رخ کیا۔ اب لندن جاگ چکا تھا۔ اور منظم' خوش لباس لوگوں کے ہجوم سڑکوں پر رواں تھے۔ بس ماربل آرچ کے سامنے سے گذر رہی تھی جب شریف الحسن صاحب نے معاً کہا۔ "میرے شعبے میں ایک انفارمیشن آفیسر کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں ہائی کمشنر صاحب سے بات کروں آپ کی خدمات کراچی سے منتقل کر دی جائیں۔"

لاؤنڈز اسکوائر میں پاکستان ہاؤس کے ریڈنگ روم میں داخل ہوتے ہی سامنے لائبریرین کی میز پر محمود میاں بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور اٹھے۔ "تو آپ بلجین کونگو نہیں گئیں۔" انہوں نے کہا اور دوسرے کمرے سے تقی میاں کو بلا کر لائے۔ انہوں نے پائپ سلگانے کے لئے ماچس جلاتے ہوئے اس اطمینان سے "سلاں علیکم" کہا گویا میرا صبح صبح اچانک لندن پہنچ جانا روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا۔

"تقی میاں آپ بھی جز وقتی کام کر رہے ہیں؟ اور سرسید پر ریسرچ؟"

"وہ بھی ہوتی رہتی ہے۔"

"بھائی احمد رشید کے بھانجے بھی یہاں پر ہیں بحیثیت کونسلر۔ بریگیڈیر حامد حسین"۔ محمود میاں نے اطلاع دی۔ تقی میاں نے کہا وہ بی بی سی میں کام کرتے ہیں اور عنقریب وہاں مستقل طور پر ملازم ہونے والے ہیں۔

ریڈنگ روم کی طویل میز پر برٹش کونسل کے کتابچے پڑے دیکھ کر معاً مجھے یاد آیا۔ کچھ عرصہ قبل کراچی میں برٹش کونسل کے سربراہ مسٹر اوین جونز نے ذکر کیا تھا کہ وہ چند ماہ کے لئے لندن جانے والے ہیں۔ محمود میاں نے کہا۔ "انہیں فون کریں؟"

مسٹر اوین جونز ایک اولڈ اسکول شفیق بزرگ تھے۔ جو مدتوں اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل رہے تھے۔ انہوں نے فون پر کہا۔ "مائی ڈیئر۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم برطانیہ آئیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم یہاں کے علوم و فنون سے فیض یاب ہو گی۔ روزانہ برٹش میوزیم کے ریڈنگ روم جایا کرو اور کل شام کو میرے ساتھ تھیٹر چلو تو مجھے ازحد مسرت ہو گی۔ یہاں تم کو صرف بہترین پلے دیکھنے چاہئیں۔ اور کلاسیکل موسیقی کے کونسرٹ ضرور جانا۔ اور مجھے یقین ہے کہ لندن کے دوران قیام میں تم اپنی پیانو کی مشق بھی ضرور جاری رکھو گی۔"

دوسرے روز شام کو وقت مقررہ پر۔ ایک منٹ ادھر نہ ادھر۔ مسٹر اوین جونز جو کراچی میں معمولی کوٹ پتلون پہنتے تھے' سیاہ سوٹ' سیاہ بولر ہیٹ' ہاتھ میں رولڈ چھتری' عین مین سو فیصدی انگلستان میں رہنے والا انگریز حقی صاحب کے دروازے پر موجود تھے۔ یعنی وطن عزیز کی سرزمین پر واپس پہنچ کر خالص انگریز بن چکے تھے۔

ویسٹ اینڈ کے ایک تھیٹر میں ڈورو تھی ٹیوٹن کا "واٹرز آف دی مون" دیکھنے کے بعد واپس آتے ہوئے مسٹر اوین جونز نے کہا۔ "میں عنقریب ریٹائر ہونے والا ہوں۔ ساری عمر برصغیر میں گذار دی۔ واپس آکر اپنے خوابیدہ پہاڑی گاؤں میں ویلز میں رہوں گا۔ اور شیکسپیئر پڑھتے ہوئے موت کا انتظار کروں گا۔ انگلستان بدلتا جا رہا ہے ہم ایک انتہائی قدامت پرست قوم ہیں۔ پھر بھی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کا ساتھ دینا غالباً ناگزیر ہے۔ نئی نسل پر امریکہ کی پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ لیکن جب تک پرانا انگلستان سلامت ہے انگلستان ہمیشہ باقی رہے گا۔"

انگریز جذباتی کبھی نہیں ہوتا۔ مسٹر اوین جونز نے یہ سب بڑے ٹائیٹ اپرلپ کے ساتھ کہا اور حقی صاحب کے دروازے پر پہنچ کر اولڈ ورلڈ انگلش کرٹسی کے ساتھ رخصت ہوئے۔ وہ ایک اصل نسل وضعدار بوڑھے انگریز تھے۔ (اس شام کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہوئی۔ دو تین برس بعد سنا کہ اپنے ویلش گاؤں میں ان کا انتقال ہو گیا۔)

حقی صاحب کے باورچی خانے میں بی بی سی کے صدیق احمد صدیقی آئے بیٹھے تھے جنہیں تقی میاں نے میری آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ کہنے لگے۔ "مسٹر اوین جونز کی طرح کے بوڑھوں کی اس ملک میں فراوانی ہے۔ جو برصغیر میں امپریل برطانیہ کے نمائندے رہ چکے ہیں۔ دیہات کی اکثر خوبصورت کاٹیجوں پر لکھا نظر آتا ہے۔ "لکھنؤ"۔ "شالیمار"۔ "کوئٹہ"۔ "نینی تال"۔ اندر پنشن یافتہ بوڑھے ٹائمز پڑھتے اور برٹش انڈیا میں گذارے ہوئے زمانے کی یاد میں آہیں بھرتے ملیں گے۔"

"اچھا ایک بات اور ہے۔" حقی صاحب بولے۔ "ان بوڑھوں میں جو اسکالر ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ جنہوں نے سنسکرت زبان و ادب یا ہندو فلسفے کا مطالعہ کیا ہے یا جن کا ہندوؤں سے زیادہ سابقہ پڑا وہ پرو انڈیا ہیں۔ فارسی' عربی یا اسلامی علوم کے ماہرین یا جن کا مسلمانوں سے واسطہ رہا تھا وہ ووکنگ مسجد کی تقاریب اور ریجنٹ پارک اسلامک کلچر سنٹر کے جلسوں میں جاتے ہیں اور پرو پاکستان ہیں۔"

رات بہت آگئی تھی۔ صدیق احمد صدیقی چلتے وقت کہنے لگے۔ "بٹیا کل صبح دس بجے بی بی سی آ جایئے۔ اوکسفرڈ سرکس میں جہاں ایک عمارت کی دیوار پر "لندن کو آپریٹو سوسائٹی" لکھا نظر آ جائے۔ سمجھ لیجئے وہیں بیرونی نشریات کے دفتر ہیں۔"

"بی بی سی کا۔" میں نے کہا۔ "نہایت غیر شاعرانہ پتہ ہے۔"

"مزید برآں۔ ہمارے دفتر میں دروازے کے قریب پہلی میز پر ایک صاحب جناح کیپ پہنے بیٹھے ملیں گے۔ نام ان کا نور محمد چوہان ہے۔ لیکن عیسائی ہو چکے ہیں۔ ان کی ہمیشہ سے یہ تمنا تھی کہ انگلستان آ کر شہزادی الیزبتھ کو انگریزی پڑھائیں۔ وہ ممکن نہ ہوا۔ ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ بہت معقول انسان ہیں۔ مگر ان کے لئے یاران طریقت نے کہا ہے"

کیا لندن چلا جاؤں؟ کیا لندن چلے جاؤ
کیا چوہان کا ڈر ہے۔ کیا چوہان تو ہو گا!"

"مجھے ہمیشہ سے یہ جستجو رہی کہ اسی قبیل کے دوسرے بلند پایہ شعر کی شان نزول معلوم کروں۔"

"کیا برما چلا جاؤں۔؟" صدیق احمد صدیقی نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ کیا برما چلے جاؤ۔ کیا جاپان کا ڈر ہے۔"

"کیا جاپان تو ہو گا۔" صدیق احمد صدیقی نے شعر پورا کیا۔

حقی صاحب نے جو ایک سنجیدہ اور متین انسان تھے حیرت سے مجھے اور صدیق احمد صدیقی کو دیکھا پھر آہستہ سے مجھ سے پوچھا۔ "آپ انگلستان کس مقصد کے لئے آئی ہیں؟"

"جنرل ایجوکیشن۔" میں نے جواب دیا۔

ایک بالائی منزل کے روشن کمرے میں جس کے دریچے اوکسفرڈ سرکس کے اوپر کھلتے تھے۔ چار پانچ میزوں پر نور محمد چوہان' صدیق احمد صدیقی' امجد علی' یاور عباس اور اردو کاتب محمد عاقل تشریف فرما تھے۔ تقی میاں اور اعجاز حسین بٹالوی' عاقل صاحب کی میز کے پاس کھڑے مصروف گفتگو تھے۔ اعجاز بٹالوی گرے سوٹ مع واسکٹ بہت معتبر معلوم ہو رہے تھے۔ تقی میاں نے جملہ صاحبان سے تعارف کرایا۔ اعجاز بٹالوی ذرا جھینپے سے کھڑے تھے۔ فرمایا۔

"اندیشہ تھا کہ اس ریویو کی وجہ سے آپ بیحد خفا ہونگی۔"

جب "ستاروں سے آگے" شائع ہوئی تھی اعجاز نے ساقی میں تبصرہ رقم کیا تھا۔ لکھا تھا کہ "اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے جاتے وقت اپنی انگریزی زبان مصنفہ کے افسانوں کے لئے چھوڑ گئی ہیں۔"

اعجاز کے یاد دلانے پر مجھے اس ریویو کا خیال آیا۔ "اعجاز حسین بٹالوی۔" میں نے کہا۔ "ہم صوفی لوگ ایسی معمولی باتوں پر کسی سے خفا نہیں ہوتے۔ ویسے وہ مضمون بہت غیر منصفانہ تھا اور تمہیں ضرور

چاہئے کہ اس کے لئے نادم ہو۔"

فرمایا۔ "لیکن میں بھی امید کرتا ہوں کہ آئندہ آپ اردو زبان میں لکھا کریں گی۔"

دوپہر کو ہم سب گراؤنڈ فلور پر کینٹین میں کاؤنٹر کے برابر قطار میں کھڑے تھے۔ صدیق احمد صدیقی نے جو جگت چچا تھے مجھ سے کہا۔ "قطار بندی یہاں کی ایسی قومی خصوصیت ہے کہ ایک روز ہم نے دیکھا بگ بین کے نیچے چالیس پچاس انگریز اپنی اپنی گھڑیاں صحیح کرنے کے لئے کیو بنائے کھڑے تھے۔"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ کل جب ساڑھے چار منٹ کے لئے سورج نکلا تو ریجنٹ پارک میں لوگ قطار بنا کر اسے دیکھ رہے تھے۔"

"سبحان اللہ۔" کشمشی رنگ کے اونی فراک میں ملبوس ایک بلونڈ فرنگی لڑکی نے پلٹ کر کہا۔

کھانے کے دوران امینہ نور الدین احمد نے جو سنہ 47ء کے فسادات کے زمانے میں نہر سعادت خان دہلی سے بلی بھابی کے ہمراہ لندن آگئی تھی' ارشاد کیا۔ "سنو بھائی۔ ہم لوگ قرولباغ میں ابا[1] سے کہا کرتے تھے کہ جنوبی فرانس میں شاطو لیکر رہیں گے۔ کیویار نوش جان کریں گے۔ سارتر وغیرہ سے ملاقات رہے گی۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ فش اینڈ چپس کھا رہے ہیں اور سارتر کے بجائے شاہ بڑے کی محفل جاری ہے۔"

اعجاز بولے۔ "لندن آنے سے قبل میرا بی بی سی کے متعلق یہ تصور تھا کہ ایک طرف اسٹیون اسپنڈر بیٹھے ہیں۔ ادھر سے کرسٹفر فرائی آ گئے۔ ابہام کی سات قسموں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس پر یاد آیا پرسوں شام کو فلاں جگہ حلقہ ارباب ذوق کی ماہانہ میٹنگ ہے۔ ضرور آنا۔"

تقی میاں نے کہا۔ "میڈا ویل میں ایک بوڑھا آسٹرین یہودی رہتا ہے اس کے ہاں ایک نہایت تاریخی کمرہ ہے کیوں کہ ہم سب لندن آ کر باری باری اسی کمرے میں قیام کر چکے ہیں۔ یہ روایت آپ کو پوری کرنی ضروری ہے۔ میں ابھی مسٹر مورگنسٹن کو فون کرتا ہوں اور معلوم کرتا ہوں کہ اس کمرے کی صورتحال کیا ہے۔"

تقی میاں اٹھ کر گئے۔ چند منٹ بعد واپس آ کر کہا۔ "کمرہ خالی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس اتوار کو کیکسٹن ہال میں افریشیائی طلباء کا اہم جلسہ ہے اس میں شرکت کے لئے کیمڈن ٹاؤن سے فلاں نمبر کی بس۔۔۔۔

مرزا ماموں جان نے جو سنہ 32ء وغیرہ میں یہاں طب پڑھتے تھے۔ کراچی سے چلتے وقت نصیحت کی تھی عموماً انگریز جب تک اس کی جان پر نہ بن جائے کسی اجنبی سے بات نہیں کرے گا۔ مگر لندن میں بہت سے مشتبہ قسم کے غیر ملکی بھی بستے ہیں۔ خصوصاً سوہو کے علاقے میں بہرحال اگر کبھی کوئی اجنبی خواہ مخواہ راستہ چلتے تم سے بات کرنا شروع کر دے اسے اگنور کرنا۔

اتوار کے روز کیکسٹن ہال کے راستے میں ایک ہونق سا غیر ملکی بس میں آ کر برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تمام انگریز مسافر حسب معمول خاموشی سے اخبار پڑھنے میں منہمک تھے۔ چند منٹ بعد اس شخص

نامعلوم نے دانت نکوس کر دریافت کیا۔ "انڈیا۔ پاکستان؟"

میں خاموش۔ اس نے تین چار بار یہی سوال دہرایا اور پھر اضافہ کیا۔ "میں پاکستانی طالب علم ہوں۔"

میں کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ بولا۔ "میں فلاں کالج میں ہوں۔ ہم لوگ شام کو بہت تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ آپ سینما وغیرہ جاتی ہیں؟"

اس شخص کی صورت پر غیر معمولی حمق برس رہا تھا۔ میں تعجب سے سوچتی رہی کہ اس قسم کے LOW I.Q. کے لوگ یہاں کس طرح آ جاتے ہیں۔ پھر بولا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں۔"

اتنے میں بس کی رفتار مدھم ہوئی۔ میں اسی بس اسٹاپ پر سرپٹ اتر گئی اور کیکسٹن ہال کی سمت بھاگی جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ سنسان سڑک پر شخص نامعلوم پیچھے پیچھے لپکا چلا آ رہا تھا۔ کیکسٹن ہال کی سیڑھیوں پر پہنچ کر دیکھا کہ وہ بھی سرعت سے زینہ طے کر رہا ہے۔ میں بھاگم بھاگ اندر پہنچی۔

ہال رنگ برنگی قومی پوشاکوں میں ملبوس افریشیائی لڑکوں لڑکیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مائیکرو فون پر اعجاز حسین بٹالوی دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔ جلو میں تقی احمد سید استادہ تھے۔ میں سیدھی ڈائس پر پہنچی اور تقی میاں کے کان میں چپکے سے کہا۔ "ایک بیہودہ شخص تعاقب کر رہا ہے۔ وہ دیکھئے۔ وہ رہا۔ ہال کے اندر آ گیا۔ وہ۔ اس کی ٹھکائی کیجئے۔"

وہ شخص نامعلوم اس اثناء میں ڈائس کے نزدیک پہنچ گیا۔ تقی میاں نے فی الفور اوپر سے کود کر اسے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ پھر دوسرا۔ پھر باقاعدہ پٹائی شروع کر دی۔ وہ چلا چلا کر فریاد کناں ہوا۔ "" کامریڈ مجھے کیوں پیٹتے ہو؟ میں ڈیلی گیٹ ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ۔ میں تقریر کرنے آیا ہوں۔"

اس دوران میں حاضرین جلسہ غالباً سمجھے کہ پاکستانی نمائندے اعجاز حسین بٹالوی کے بھاشن سے اختلاف رائے کے سلسلے میں مار پیٹ شروع ہو گئی۔ چشم زدن میں افواہ پھیلی کہ بائیں بازو اور دائیں بازو والے طلباء جنگ و جدال پر اتر آئے ہیں۔ ایک بنگالی نے ہال کے گوشے سے نعرہ بلند کیا۔ "انقلاب زندہ باد۔ عالمی امن زندہ باد۔ سامراج کے ایجنٹوں کا ناش ہو۔" ایک عراقی نوجوان ہوا میں مکہ دکھا کر کرسی پر چڑھا اور گرج کر بولا "اسرائیلی امریکن گٹھ جوڑ مردہ باد" اور فوراً عربی میں طویل جوشیلی تقریر شروع کر دی۔ پل کے پل میں دائیں اور بائیں بازو کے فریقین ایک دوسرے کی ٹھکائی میں مشغول ہو چکے تھے۔ گھمسان کا رن پڑا۔

"بہت کامیاب کانفرنس رہی۔" جلسے کے خاتمے پر تقی میاں نے پائپ سلگاتے ہوئے اطمینان سے اظہار خیال کیا۔

ہم لوگ کیکسٹن ہال سے باہر آ رہے تھے کہ طلباء کے جم غفیر میں ایک بنگالی لڑکے کے ساتھ چلتی اودی ساری سفید کارڈیگن میں ملبوس ایک اسمارٹ خوش شکل خاتون نظر آئیں جو بڑے جوش و خروش سے کوئی سیاسی بحث کرتی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔

"مس عظمت فاروقی۔ اوکسفرڈ میں پڑھتی ہیں اور سدھارتھ بنرجی۔ بہت بڑھیا مقرر ہے۔ مگر ہے ٹروٹسکی آیٹ۔" تقی میاں نے کہا۔

"ارے۔! اجو باجی۔" میرے منہ سے نکلا لیکن وہ خاتون بھیڑ میں غائب ہو چکی تھیں۔

اجو باجی کو میں نے آخری بار تقسیم ہند سے قبل لکھنؤ میں دیکھا تھا جب وہ سیاہ برقعہ اوڑھے زنانہ مسلم لیگ کے جلسہ میں تقریر کرنے جا رہی تھیں۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس ڈبل ایم اے کر چکی تھیں۔ ان کے والدین سیدھے سادے اللہ والے لوگ رکاب گنج میں رہتے تھے۔ سنہ 48ء کی گرمیوں میں جب الن ماموں کے احدی کلب مارٹن روڈ پر براجمان تھی اجو باجی کا کنبہ لکھنؤ سے آن کر پڑوس کے کوارٹر میں اترا تھا۔ اجو باجی ایک اسکالر شپ پر آکسفرڈ جا چکی تھیں۔ "اجو برقعے میں ایئرپورٹ گئی اور انشاء اللہ جب ولایت سے لوٹے گی اسے برقعہ اڑھا کر ہی ایئرپورٹ سے لاؤنگی۔" ان کی والدہ نے سادگی کے ساتھ مجھ سے کہا۔

"ان کو ولایت میں تو پردہ چھوڑنا پڑا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"بٹی حضور پرنورؐ کی حدیث ہے کہ وقت ضرورت شرعی پردے کے ساتھ عورتیں باہر نکل سکتی ہیں۔ اور تحصیل علم کے لئے تو چین تک جانے کا حکم ہے۔"

میں ان کی اس معصومیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

کوارٹرز میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ ایک شام ہم لوگ صحن میں چارپائیاں ڈالے الن ماموں کی زیر صدارت احدی کلب کی میٹنگ میں مصروف تھے۔ اجو باجی کی کمسن چھوٹی بہن ہاتھ میں لالٹین لئے اندر آئی اور مجھ سے بولی۔ "امی آپ کو بلا رہی ہیں۔ شام کو ڈاک میں اجو بجیا کا خط آکسفورڈ سے آیا ہے۔ تصویر بھیجی ہے۔ آپ کو بھی سلام لکھا ہے۔ چل کر پڑھ لیجئے۔"

اجو باجی کی والدہ اپنے نیم تاریک کوارٹر کی انگنائی میں باورچی خانے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں اکڑوں بیٹھ کر میں نے اجو باجی کا نیلا ولائتی ایئر لیٹر پڑھا اور تصویر ملاحظہ کی۔ تراشیدہ بال۔ انتہائی باریک مصنوعی بھنویں' ہونٹوں پر گہرا لپ اسٹک۔ اجو باجی زنانہ پارک لکھنؤ کے جلسوں میں مسلم لڑکیوں کی فیشن پرستی کے خلاف بڑی زوردار تقاریر کیا کرتی تھیں۔ ان کی والدہ بے چاری نے میرے استعجاب کو محسوس کر کے فوراً کہا۔ "اجو نے پچھلے خط میں لکھا تھا۔ ولایت میں سردی کی وجہ سے ہونٹ پھٹتے ہیں اس لئے لپ اسٹک لگانا ضروری ہے۔"

سال بھر بعد اجو باجی کی والدہ سے پیر الٰہی بخش کولونی کے ایک زنانہ میلاد شریف میں ملاقات ہوئی۔ میں نے اجو باجی کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے خشکی سے جواب دیا۔ "عظمت فاطمہ آجکل پیرس میں ہیں۔ اپنی پڑھائی میں مصروف ہیں۔ خیریت سے ہیں۔"

کیکسٹن ہال والے جلسے کے چند روز بعد حقی صاحب کے ہاں فون آیا۔ ایک خاتون خالص برطانوی لہجے میں بول رہی تھیں۔ "دس از ازمیٹ فاروقی۔ مے آئی اسپیک ٹو۔"

"ارے۔ اجو باجی۔!" میں نے خوشی سے کہا۔

بزبان انگریزی جواب ملا۔ "میں نے اس دن کیکسٹن ہال میں تم کو دور سے دیکھا تھا۔ مگر اس مار پیٹ کی افراتفری کی وجہ سے مل نہ سکی۔ پھر میں نے سڈ سے کہا فیروز جبیں ضرور جانتی ہوں گی تم کہاں رہتی ہو۔ سڈ نے فیروز سے معلوم کرکے آج مجھے بتایا۔ سڈ تمہارے کزن سے بھی واقف ہے۔"

"سڈ کون۔ اجو باجی۔؟"

"اوہ۔ سڈ ھارٹ بنرجی۔"

"پھر سے کہیے۔"

"سڈ ھارٹ۔"

"یعنی سدھارتھ۔ اجو باجی۔ اب آپ اردو بالکل نہیں بولتیں؟"

"اوہ مجھے خوف ہے کہ نہیں۔ مگر میں مسرور ہوں کہ اب تم سے ملاقات ہوا کرے گی تو میں اپنی ارڈو کی پریکٹس کرلوں گی۔"

جب میں اجو باجی سے ملنے گئی ان کے کمرے میں رادھا کرشنا کی تصویریں نظر آئیں۔ ذرا جھینپ کر بتایا کہ سڈھارٹ نے دی ہیں۔ (اجو باجی پہلے بجد نماز روزے کی پابند ہوا کرتی تھیں) اجو باجی کی اس مکمل قلب ماہیت نے مجھے بہت متحیر کیا۔ کچھ عرصے بعد میں ان کی رائٹنگ ٹیبل پر رادھا کرشنا کے بجائے جیزس اینڈ میری براجمان دیکھے۔ سمجھ میں آگیا۔ اس زمانے میں وہ سدھارتھ بنرجی سے خفا تھیں۔ اور یہ تصاویر ایک اطالوی طالب علم نے ان کو دی تھیں۔ ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا۔ "ایک پردے دار' قدامت پرست مذہبی ماحول سے نکل کر اچانک ایک مختلف دنیا میں شامل ہونے کی وجہ سے جو ردعمل ہو سکتا ہے وہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر آپ میں ایسی مکمل کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟" وہ اداس ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔ "میں خود نہیں بتا سکتی لیکن میرے لئے اب اپنے پرانے کلچر پیٹرن میں واپس جانا بہت مشکل ہے۔"

چند برس بعد میں نے "آگ کا دریا" لکھنا شروع کیا۔ آخری عہد کی چمپا باجی کی تخلیق کرتے ہوئے اجو باجی [2] کی اس شخصیت کو سامنے رکھا۔ اور پیرس میں ایک ہندوستانی لڑکی ملی جس کے پیچیدہ کردار نے "ستیاہرن" کی ہیروئن کی تخلیق میں اعانت کی۔

جنرل ایجوکیشن۔

2۔ کہرے کا شہر

میڈا ویل میں ٹیوب اسٹیشن کے نزدیک طویل خاموش ایونیو پر جس کے دونوں طرف وکٹورین مکانات تھے ایک عمارت میں بوڑھا یہودی مورگنسٹن اپنا اقامت خانہ چلاتا تھا۔ مورگنسٹن آسٹریا کا ریفیوجی تھا جس نے 1934ء میں دوسرے ہزارہا یہودیوں کے مانند ہٹلر گردی سے جان بچا کر لندن میں پناہ لی تھی۔ میڈا ویل کے بازار میں بہت سے جرمن اور پولش یہودی پناہ گزیں کپڑے سیتے تھے یا اپنی دوکانوں پر چکیلے

کرے آویزاں کئے۔ گول ٹوپیاں اوڑھے عقابی ناکوں والے بوڑھے' مصیبت کے ماروں کی قیمتی چیزیں گروی رکھتے ہوئے سترہویں صدی کی ڈچ تصویریں معلوم ہوتے تھے۔ اور مسز مورگنسٹن کی جوان اور خوبصورت جرمن یہودی بیوی بالکل وکی بام کے ناولوں کا ایک کردار نظر آتی تھی۔ مسٹر مورگنسٹن صبح کو بریکفاسٹ کی کشتی میرے کمرے میں لانے کے بعد آتشدان کے سہارے ٹک کر اپنی گزشتہ امارت کے قصے سناتا۔ اس کا خاندان ہیروں کا تاجر تھا۔ وی آنا میں ان کے اپنے اصطبل تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اپنے ماضی کے قصے سنانا اپنی جگہ سے اکھڑے ہوئے لوگوں کی خاص عادت ہے۔ ممکن ہے جیکب مورگنسٹن بھی سچ کہتا ہو۔ مشرق و مغرب کی دنیائیں پناہ گزینوں سے پر تھیں۔

ناشتے کے بعد میں ٹیوب ٹرین سے نائیٹس برج روانہ ہوتی اور لاؤنڈز اسکوائر پہنچ کر پاکستان ہاؤس کے شعبۂ انفارمیشن میں لنچ تک اپنی میز پر برطانوی اخباروں کا مطالعہ کرتی۔ کام زیادہ تر کچھ نہ کرنے پر مشتمل تھا۔ دوپہر کو میں' تقی میاں اور محمود میاں نزدیک کے کسی ریستوران میں جاکر کھانا کھاتے۔ بعد چند ماہ کے شریف الحسن صاحب کا تبادلہ کسی اور ملک کا ہو گیا۔ ان کی جگہ جو صاحب آئے وہ آتے کے ساتھ ہی دو مہینے کی رخصت پر کراچی چلے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں ناچیز نے ایکٹنگ پریس اتاشی کے فرائض انجام دیئے جو کم از کم اس زمانے میں خاصے واہی تھے۔ روزانہ صبح ہائی کمیشن کے تمام شعبہ جات کے سربراہوں کی میٹنگ اصفہانی صاحب ہائی کمشنر کے دفتر میں منعقد ہوتی تھی۔ کلکتہ والے ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی (اصفہانی چچاہ) ابا جان کے پرانے دوست اور ایرانی شائستگی والے خلیق انسان تھے۔ (مجھے یاد آیا میرے میٹریکولیشن کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے ابا جان نے ان کے ہاں کلکتے سے اماں کو خط پہ خط لکھے تھے اور تار بھیجے تھے) بھائی احمد رشید کے بھانجے بریگیڈیر حامد حسین کونسلر تھے۔ ماری پور کے ونگ کمانڈر اللہ داد ائیر اتاشی میٹنگ میں بحیثیت ایکٹنگ پریس اتاشی یہ میٹنگیں اٹنڈ کیں تو پتہ چلا کہ ان میں بالکل ہلکی پھلکی معمولی باتیں کی جاتی تھیں کوئی رازدارانہ سیاسی یا عالمگیر اہمیت کی کارروائیاں نہیں ہوتی تھیں۔ تب فقیر پر روشن ہوا کہ جن چیزوں کا دور سے یا باہر سے بہت رعب پڑتا ہے اندر سے دیکھو تو اصلیت میں کوئی ایسی لمبی چوڑی بات نہیں۔ دوسری مثال کے طور پر وی۔ آئی۔ پی لوگوں کے اخباری بیانات۔

وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین لندن تشریف لائے۔ ایک رات خواجہ صاحب نے ہائی کمیشن کے شاندار ایوان نشست میں جمع پاکستانی طلباء اور طالبات کو خطاب کیا۔ میں ڈیوٹی پر مستعد ایک انگریز رپورٹر کے ساتھ ایک کونے میں کھڑی تھی۔ خواجہ ناظم الدین مرحوم ایک شریف بھولے سے انسان تھے اور بہت زیادہ قابل ذکر مقرر نہیں تھے۔ پہلے انہوں نے بنگالی میں بولنا شروع کیا' پھر اردو میں اتنی مدھم آواز میں بولے کہ بالکل سنائی نہ دیا۔

انگریز رپورٹر نے مجھ سے دریافت کیا۔ "آنریبل پرائم منسٹر کیا کہہ رہے ہیں؟" ان کی تقریر کا ایک لفظ میرے پلے نہ پڑا تھا۔ میں نے کہا۔ "تفصیل ابھی چیک کرکے بتادوں گی فی الحال لکھ لو۔ دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک اور دنیا کی پانچویں سب سے بڑی مملکت کی ہونہار نوجوان نسل کی حیثیت سے آپ

لوگوں پر نہایت اہم ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ملک کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ لوگ جب تک یہاں ہیں یاد رکھیے کہ اس سرزمین پر آپ سب پاکستان کے غیر سرکاری سفیروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ یہاں سے واپس جا کر وطن عزیز کی پر خلوص اور ان تھک خدمت کریں گے۔"

گورے نے شارٹ ہینڈ میں نوٹ کر لیا۔ اتنے میں دہرہ دون والی بیگم اسد محمد علی کے صاحبزادے محسن علی تشریف لائے جو رائٹر خبر رساں ایجنسی کے نمائندے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "خواجہ صاحب نے کیا فرمایا؟ میں دیر میں پہنچا۔" میں دونوں صحافی حضرات کو پریس اتاشی کے کمرے میں لے گئی۔ محسن علی ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھ گئے — میں نے ان کو بھی وہی خود ساختہ تقریر لکھوا دی۔

اتنے میں محمود میاں نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ "پرائم منسٹر کی بنگلہ تقریر کا ترجمہ مل گیا؟"

میں نے کہا۔ "میں نے عارضی طور پر تقریر پریس کو دیدی ہے۔"

"لیکن آپ کو تو بنگلہ آتی نہیں۔" محمود میاں نے چپکے سے کہا۔

"بالکل نہیں آتی۔ مگر آجکل ایشیا' افریقہ' پاکستان اور انڈیا کا ہر لیڈر یہاں آ کر اپنے طلباء سے تقریباً یہی الفاظ کہتا ہے۔" میں نے چپکے سے جواب دیا۔

محمود میاں گھبرا کر دوبارہ ہال میں گئے اور کسی بنگالی لڑکے سے دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ خواجہ صاحب نے بنگلہ اور اردو میں بالکل یہی الفاظ کہے تھے۔

میڈ اویل سے دو تین اسٹیشن آگے ایک بے رنگ سے محلے کی انجمن خواتین میں فرنگنیں شام کے وقت جمع ہو کر فنون طباخی' خیاطی وغیرہ سیکھتی تھیں۔ سینچر کی شام وہاں جا کر ولایتی علم طباخی کے حصول میں کوشاں رہتی۔ نومبر کی ایک سرد رات' جب باہر گہرا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ گلی میں بچے GUY FAWKS کے پتلے جلا رہے تھے۔ میں نے طے کیا کہ یہ علم حاصل کر لیا بہت کافی ہے۔ فرنچ ود آؤٹ ٹیرز آ سکتی ہے۔ فرنچ ککنگ ود آؤٹ ٹیرز ناممکن۔ اس کہر آلود رات باہر آ کر آخری یارک شائر پڈنگ کا پیالہ ایک فرنگی بھکاری کے حوالے کیا۔

دوسری صبح بروز سینچر زبیدہ اللہ داد کا فون آیا۔ کہنے لگی۔ "اس فون کو ایس۔ او۔ ایس سمجھو اور فوراً پہنچو۔ آج شام اللہ داد نے خواجہ ناظم الدین کو معہ ان کی پارٹی ڈنر پر بلا لیا ہے۔ تم تو نہ صرف آجکل ولایتی ککنگ سیکھ رہی ہو۔ بلکہ یوپی والی ہو' پلاؤ زردہ پکانا بھی خوب آتا ہو گا۔ میں اس فن سے بالکل ناواقف ہوں۔ فوراً پہنچو۔"

اس وقت زبیدہ پر اصلیت واضح کرنا اسے اور زیادہ ڈی مورائیلز کر دیتا خصوصاً جبکہ خواجہ ناظم الدین اپنی خوش خوراکی کے لئے مشہور تھے۔ میں نے متانت سے جواب دیا۔ "فکر نہ کرو۔ ابھی آتے ہیں۔"

ہیمرا سمتھ میں زبیدہ کے فلیٹ پر پہنچتے ہی میں نے نہایت رعب داب سے کہا۔ "زبیدہ اپنی آیا کو

بلاؤ۔ ہم اسے مصالحوں کی فہرست بتا دیں۔ جا کر سلطان احمد کی دکان سے لے آئے۔ ہم اتنے ذرا ایک ضروری فون کر لیں۔"

زبیدہ فوراً باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ میں نے "یا اللہ مدد" کا وظیفہ پڑھتے ہوئے گیلری میں جا کر شگفتا قدوائی کو فون کیا۔ شگفتا اپنی بڑی نند بیگم انیس قدوائی سے متعدد دعوتی مغلیہ کھانے پکانا سیکھ چکی تھیں۔ میں نے چپکے سے کہا۔ "شکن' بریانی' قورمے اور مرغ مسلم کے نسخے فوراً بتاؤ میں لکھتی جاتی ہوں۔" شگفتا نے بتائے۔ پھر میں نے فیروز جبیں اور ایک بنگالی لڑکی (جو ڈھاکے کی نامور مغنیہ لیلیٰ ارجمند بانو کی چھوٹی بہن تھی) کو فون کیا کہ جلد از جلد زبیدہ کے گھر پہنچیں۔ ہم سب نے مل جل کر شام تک ایک سے ایک بڑھیا دعوتی کھانے تیار کر ڈالے۔ معہ شاہی ٹکڑے۔ خواجہ ناظم الدین معہ اراکین کابینہ تشریف لائے۔ وہ مرحوم نفیس کھانوں کے بے انتہا شوقین تھے۔ زبیدہ سے کھانوں کی بہت تعریف کی۔ خصوصاً بریانی کی جو فیروز نے تیار کی تھی۔ فیروز نے چپکے سے مجھ سے کہا۔ "اگر ان کو بتایا جائے کہ نسخہ انڈین پریس اتاشی کی بیوی نے بتایا اور ایک بھارتی کنیا نے اسے پکایا۔"

میں نے کہا۔ "اور اگر یہ خبر پریس میں پہنچ جائے تو عوامی اخبار ڈیلی مرر اس کی یوں سرخی لگائے گا — ہندوستان و پاکستان کے درمیان گریٹ مغل کی فیورٹ ڈش پلاف کے ذریعہ خیر سگالی۔ اور ڈیلی ورکر یوں لکھے گا — ہندوستان و پاکستان کی بورژوا حکومتوں کے سربراہ اور افسران بالا نہ صرف امپریل لندن میں آ کر پر تکلف ڈنر اڑاتے ہیں جبکہ ان کے ملکوں کے کروڑوں عوام فاقے کر رہے ہیں بلکہ فیوڈل مرغن کھانے تیار کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اور ٹائمز لکھے گا۔

دفتر میں ٹائمز اور دوسرے برطانوی اخبار' رسالے پڑھتے پڑھتے دن گذر جاتا۔ سنہری منقش دیواروں اور سبز قالین والے خاموش گرم کمرے میں وسیع و عریض میز کے پیچھے چمڑے کی دبیز گھومنے والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے روشنیاں جل جاتیں۔ ساڑھے چار بجے سورج غروب ہوتا۔ دریچے کے باہر گہری دھند اور تاریکی چھا جاتی۔ اس وقت یہ گرم اور روشن کمرے برفانی سمندر میں ٹھہرے ہوئے روشن جہاز کے مانند معلوم ہوتے اور باہر پھیلا ہوا لندن ایلیٹ کی UNREAL CITY ٹھیک پانچ بجے گیلری میں سے اپنے اپنے اوورکوٹ' برساتیاں' دستانے اور چھتریاں سنبھال کر میں' تقی اور محمود سب کو گڈ نائٹ گڈ نائٹ کہتے نیچے آ کر ٹیوب اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتے۔

دو ماہ بعد پریس اتاشی صاحب واپس آئے۔ میں نے ان سے کہا۔ "میں اتنے دنوں سے یہاں کام کر رہی ہوں مگر اب تک یہ فیصلہ نہیں کیا گیا کہ مجھے KARACHI–BASED افسر کی حیثیت سے تنخواہ دی جائے یا نہیں۔ یہ بڑی غلط بات ہے" کہنے لگے۔ "فیڈرل پبلک سروس کمیشن یہاں آنے والا ہے۔ اس کے سامنے آپ کا معاملہ پیش کر دیا جائے گا۔

اگلے ہفتے نیویارک جاتے ہوئے چودھری ظفر اللہ خاں اور بھائی اطاعت حسین جوائنٹ سیکرٹری وزارت امور خارجہ تشریف لائے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ "وزیر خارجہ آپ کے گوناگوں بو قلموں

اموؤں میں سے ہیں اور جوائنٹ سیکرٹری وزارت خارجہ آپ کے کزن۔ اپنی ملازمت کے متعلق ان سے بات کیجئے۔" میں نے جواب دیا نہ میں چودھری صاحب سے اقرباپروری کے لئے کہوں گی' نہ وہ اقرباپروری کریں گے۔ میرا معاملہ سراسر حق بجانب ہے۔ اگر اس جگہ پر کوئی لڑکا ہوتا اس کا باضابطہ فوراً تقرر کر لیا گیا ہوتا۔ چونکہ میں خاتون ہوں علاوہ ازیں لوگوں کے آگے پیچھے نہیں دوڑتی نہ "اہم" لوگوں کو "کلٹی ویٹ" کرتی ہوں اس وجہ سے میرے ساتھ یہ بے انصافی وغیرہ وغیرہ۔۔ دنیا مردوں کے لئے بنی ہے اور لڑکیوں کی اس میں کوئی جگہ نہیں۔ (مغرب کی ویمنز لب نے اس صورت حال کے خلاف احتجاج اب شروع کیا ہے۔ اس وقت یہ تحریک موجود نہ تھی۔)

چودھری سر ظفراللہ دوسرے روز ہائی کمیشن تشریف لائے۔ دریافت کیا۔ "ارے۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے بتایا۔

فرمایا۔ "باورچی خانہ سنبھالنا اور باغبانی لڑکیوں کے اصل فرائض ہیں۔ میں باجی جان کو لکھوں گا کہ وہ تم کو صحیح مشورہ دیں۔ طباخی اور باغبانی مفید مشغلے ہیں۔"

میں چودھری صاحب کا بہت ادب کرتی تھی اس لئے خاموش رہی۔ بھائی اطاعت حسین' محمود میاں کے ساتھ شام کو مجھ سے ملنے میڈ اویل آئے۔ میں نے بھائی اطاعت سے اس قصے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ دو دن بعد پبلک سروس کمیشن لندن پہنچا۔ یہ کمیشن لندن آکر غالباً برطانیہ میں پڑھنے والے طلباء کا انٹرویو کرتا تھا یا جانے کیا کرتا تھا۔ بہرحال اس کے چیئرمین گل محمد خان صاحب اکثر و بیشتر لندن آیا کرتے تھے۔ ایک سہ پہر اصفہانی صاحب کے دفتر میں بورڈ بیٹھا۔ اس میں گل محمد صاحب' اصفہانی صاحب اور پریس اتاشی صاحب شامل تھے۔ گل محمد خانصاحب نے پوچھا۔ "آپ اس ملازمت پر لندن میں کیوں رہنا چاہتی ہیں؟ انگلستان میں رہنے کا کیا گلیمر ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپ کیوں بار بار یہاں تشریف لاتے ہیں۔ آپ کو بھی انگلستان کا کیا گلیمر ہے؟"

گل محمد صاحب نے ششدر ہو کر عینک کے شیشوں کے اوپر سے گھور کر مجھے دیکھا اور چپ ہو گئے۔ اصفہانی صاحب نے بے آرامی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ پریس اتاشی صاحب ایک فائل میں منہمک ہو گئے۔

اس تاریخی انٹرویو کے بعد جب میں باہر آئی' گیلری میں تقی میاں اور محمود میاں متفکر و منتظر کھڑے تھے۔ میں نے اطمینان سے ماجرا سنایا۔ انہوں نے کہا۔ "چیئرمین فیڈرل پبلک سروس کمیشن کو آپ نے ایسا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور آپ کا خیال ہے اب وہ آپ کی ملازمت یہاں پکی کر دیں گے؟"

"نہ کریں۔ انہوں نے ایسا نامناسب سوال کیوں کیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

پانچ بج چکے تھے۔ ہم لوگ اوور کوٹ پہن کر نیچے اترے۔ باہر دھند بید گہری ہو گئی تھی۔ یہ لندن کے SMOG کا زمانہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ تقی اور محمود سر جھکائے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک

لیمپ پوسٹ کے نیچے رک کر پائپ سلگاتے ہوئے تقی میاں نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو تھوڑا سا TACT سیکھنا چاہیئے۔"

میں نے کہرے میں ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔ ع۔ "میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔"

"اصل مسئلہ یہ ہے' محمود میاں بولے۔ "کہ ہم سب کی خودی بہت زیادہ بیدار ہو چکی ہے"

"یہ تو آپ کو علم ہو گا کہ آپ نئے پریس اتاشی کی اچھی کتابوں میں نہیں ہیں۔" تقی میاں نے کہا۔

"بخوبی علم ہے۔ ان کا غالباً کوئی ایگو پرابلم ہے جسے مولانا آزاد "ایغو" کہتے ہیں۔ مگر تقی میاں ذرا غور فرمایئے کیا صوتی شکوہ ہے ان اشعار میں۔ خاشاک کے تودے کو کہتے ہیں کوہ دماوند۔ لگتا ہے دہل بج رہا ہے۔ اور طبل جنگ۔" میں نے جواب دیا۔

انڈر گراؤنڈ کے برقی زینے تک پہنچتے پہنچتے تقی میاں پبلک سروس کمیشن کو بھول کے جوش میں آ کر "مسجد قرطبہ" شروع کر چکے تھے۔ دفعتاً انہوں نے ٹھٹھک کر کہا۔ "مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ری ایکشنری نظم ہے۔"

"یہ اردو زبان کی حسین ترین نظم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پلیٹ فارم پر پہنچ کر پائپ دوبارہ سلگاتے ہوئے تقی میاں نے فرمایا۔ "اب یہ غور کرنا لازم آیا کہ اقبال کس حد تک پروگریسیو تھے اور کس حد تک ری ایکشنری۔"

تیسرے روز صبح پریس اتاشی نے کہنا شروع کیا۔ کمیشن کا فیصلہ ہے۔"

"جناب عالی وہ مجھے پہلے سے معلوم ہے۔" میں نے اخلاق سے جواب دیا اور ان کے دفتر سے باہر آ گئی۔ لائبریری میں ایک صاحب نے کہا۔ "یہ آپ کی زیادتی ہے۔ منسٹری آف انفارمیشن کے افسر جب باہر بھیجے جاتے ہیں وہ فارن سروس کے تحت آ جاتے ہیں اور فارن سروس میں فی الحال لڑکیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور وہ جو تھیں مس حاجی۔ وہ 1948ء میں بحیثیت انفرمیشن آفیسر امریکہ کیوں بھیجی گئی تھیں؟"

کہنے لگے۔ "وہ تو پرانی بات ہو گئی۔ وہ غالباً عارضی طور پر بھیجی گئی تھیں اور وہ بہرحال استعفیٰ دے کر انڈیا واپس جا چکی ہیں۔"

"ہم بھی استعفیٰ دے کر میڈ اویل واپس جاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ ریڈنگ روم میں محمود میاں کی میز پر جا کر ایک عدد استعفے کا خط لکھا اور اسے عبدالقیوم کے نام کراچی روانہ کیا۔ دوسرا خط اسی مضمون کا مس بشپ سیکرٹری کے ہاتھ اصفہانی صاحب کو بھجوایا۔ اس اثناء میں مسز ایڈ روڈز پریس اتاشی کا سرکاری خط لیکر آئیں۔ "آپ کی عارضی ملازمت یہاں فلاں تاریخ سے ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی کراچی اپنی سابقہ ملازمت پر واپس جا سکتی ہیں۔ میں نے عبدالقیوم صاحب والے خط

کی ایک نقل مسز ایڈ روڈز کو دی کہ میری بہترین خواہشوں کے ساتھ پریس اتاشی صاحب کی خدمت میں پیش کردیں۔ اور پاکستان ہاؤس سے باہر آکر سلمان بھائی کے گھر جانے کے لئے بس پکڑی۔

لڈن ماموں اور زہرا ممانی کراچی سے آکر سال بھر کے لئے مانچسٹر میں مقیم تھے۔ زہرا ممانی ان دنوں اپنے چھوٹے بھائی سلمان احمد علی سے ملنے مانچسٹر سے آئی ہوئی تھیں۔ سلمان بھائی جو فارن سروس کے ایک سینیئر ڈپلومیٹ تھے شاید مغربی جرمنی سے کینیڈا جاتے ہوئے چند ہفتوں کے لئے لندن ٹھہرے تھے۔ ان کی بیوی فن بھابی حیدر آباد کے کسی "یار جنگ" گھرانے کی بہت سیدھی سادی پرسکون خاتون تھیں۔ سلمان بھائی کی دوسری بہن ہما اخلاق حسین وی آنا کی عالمی امن کانفرنس میں شرکت کے بعد لندن آئی ہوئی تھیں۔ کانفرنس میں بزبان اردو انہوں نے بہت موثر تقریر کی تھی۔ سلمان بھائی نے اپنے والد چودھری محمد علی رودلوی کی تازہ تصنیف "کشکول محمد علی شاہ فقیر" مجھے دی جو حال ہی میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ سلمان بھائی کہنے لگے۔ "میاں جان ردولی میں اب بالکل اکیلے ہیں۔ ساری اولاد پاکستان چلی آئی۔ بے حد تنہا ہیں مگر شگفتہ مزاجی اور امید پرستی برقرار ہے۔ پہلے میاں جان کا چپوان 'مالی موسم کے تازہ پھولوں کے گجروں سے سجاتا تھا۔ تعلق داری کے خاتمہ کے بعد سے میاں جان نے اس قسم کی نفاستیں بھی ترک کردیں۔" چودھری محمد علی ایک صاحب طرز ادیب ہونے کے علاوہ ماہر فن گفتگو تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ ایک مرتبہ سنایا ہوا لطیفہ یا واقعہ انہوں نے کبھی نہیں دہرایا۔ ترقی پسند تحریک کے شروع سے حامی تھے۔ ساری عمر کٹر مولویوں کی جان کو آئے رہے۔

کچھ عرصہ قبل زہرا ممانی ان سے ملنے کراچی سے ردولی گئی تھیں۔ اپنے پرانے شگفتہ انداز میں ان کو ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے۔ "چند روز ہوئے ہم حضرت گنج سے گذر رہے تھے۔ راستے میں چند شناسا نوجوان لڑکے مل گئے۔ ان کے ساتھ کچھ دیر ایک قہوہ خانے میں جاکر بیٹھے۔ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ ان میں جوانی کی جھلک دیکھی۔ اپنا بڑھاپا بھولے۔ پھر لڑکے اپنی راہ چلے گئے۔ سامنے سے ایک بوڑھا آتا نظر آیا۔ سوچ کہ اب پھر بڑھاپا دکھلائی دیا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ اب دو گھڑی رک کر ان سے ملنا پڑے گا۔ صورت آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ٹھہر کر ان سے باتیں کریں۔ بادل ناخواستہ ان کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو سامنے قد آدم آئینہ تھا۔"

لندن کے ڈپلومیٹک علاقے کے ایک عالیشان فلیٹ کے اندر سنہرے فریم والے آئینوں سے جگمگاتے ڈرائنگ روم میں اس شام ہم لوگ چودھری محمد علی اور دور افتادہ قصبے ردولی میں ان کی تنہائی کو یاد کرکے ملول ہو رہے تھے۔[3]

"میاں جان ترک وطن کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔" ہما باجی نے کہا۔

"حالات ایسے ہیں کہ ان کا کوئی مداوا نہیں۔" زہرا ممانی بولیں۔

"کوئی مداوا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس پر یاد آیا' آپ کہہ رہی تھیں کہ دفتر سے چھٹی لیکر مانچسٹر اور اس کے بعد یوروپ چلو۔ ہم بخیر و عافیت آج ملازمت سے مستعفی ہوئے۔ ضرور چلیں گے۔"

مانچسٹر ریلوے اسٹیشن پر لڈن ماموں کار لئے منتظر تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ڈڈزبری کے راستے میں ہما باجی ایک اودھی گیت گنگنانے لگیں۔ سلویا اور صیب کراچی گئے ہوئے تھے۔ مظفر یعنی ادری مانچسٹر یونیورسٹی اور نو سالہ اصغر ایک گرامر اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

لڈن ماموں اور صیب کا پلیٹ گلاس دریچوں والا جہازی دفتر ٹیکسٹائل کے مرکزی تجارتی علاقے کے وسط میں واقع تھا۔ مانچسٹر مغربی سرمایہ داری کا ایک گڑھ تھا۔ شام کو یونیورسٹی کلب میں آتش دان کے سامنے ایک چرمی صوفے پر بیٹھ کر پائپ پیتے ہوئے ادری میاں طبقاتی جدوجہد اور جدلیاتی مادیت کے نظریات سے مجھے مستفید کرتے۔ کیونزم میں ابھی شیعہ سنی والا تفرقہ نہیں پڑا تھا اور کامریڈ اسٹالین بقید حیات اور ممدوح تھے۔

رات کو ہم لوگ مانچسٹر کی مسقف اسکیٹنگ رنگ میں جاتے جہاں ہزاروں کی تعداد میں فرنگی لڑکے اور لڑکیاں رولر اسکیٹنگ میں مصروف ہوتے۔ میں اور ادری اور اصغر رولر اسکیٹنگ کرتے اور آئس کریم کھاتے اور باہر برف گرتی رہتی۔ جنگلوں میں سلور برچ اور ایش اور ہولی بیری سب برف سے لد گئے۔ سارا لینڈ اسکیپ ایک کرسمس کارڈ میں تبدیل ہوگیا اور رودبار کے دوسری طرف یوروپ برف پوش تھا اور پیرس میں "زیست پرستوں" کے قہوہ خانے گرم اور روشن۔ کیا ہم سب زیست پرست نہیں ہیں؟ مغربی جرمنی میں گرم برادران کی فیری ٹیلز جیسے مناظر۔ کیا اسی جرمنی میں 'صرف چھ سات سال قبل تک کنسنٹریشن کیمپ موجود تھے؟ ناقابل یقین۔ اور ان حسین جنگلوں اور وادیوں اور دلفریب شہروں میں وہ بھیانک جنگ لڑی گئی تھی؟ ناقابل یقین — لیکن ہینس کرسچین اینڈرسن کا ڈنمارک اور گرم برادران کا جرمنی اور نغمہ پرست اطالیہ اور وہ کنسنٹریشن کیمپ اور وہ فسطائیت اور وہ بمباری دونوں حقیقت تھے۔ چنانچہ کیا یہ ثابت ہوا کہ فیری ٹیلز پر یقین نہ کرنا چاہئے؟ ضرور کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی حقیقت ہیں۔ مجھے فیری ٹیلز پر یقین ہے۔

اور "میری انگلینڈ" میں ابھی جیک فروسٹ کی عملداری تھی اور لندن ٹاؤن کے پرانے گرجاؤں کی گھنٹیاں نرسری کے گیتوں کی دھنوں سے منسوب آوازوں میں بج رہی تھیں۔ سینٹ مارگریٹ' سینٹ پیٹرز۔ وائٹ چیپل۔ اسٹیپنی۔

AND SO TO LONDON AND DOWN THE EVER-MOVING STAIRS-[3]

3۔ لاروند

ایسٹ اینڈ![4] پکیڈلی سے ٹیوب ٹرین میں بیٹھ کر وائٹ چیپل یا اسٹیپنی گرین اترئیے۔ بیس پچیس منٹ کے اندر آپ ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے۔ بمباری سے تباہ شدہ محلے۔ جلے ہوئے مکانات' تاریک گلیاں' نازیوں نے اپنی بمباری کا نشانہ خاص طور پر ان گنجان مزدور بستیوں کو بنایا تھا۔ یہاں کوئی

کنونشن نہیں۔ ہر شخص دوستی کے موڈ میں رہتا ہے۔ ایک نیم تاریک ہندوستانی طعام خانے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بھات کھا رہا ہے۔ ڈورچسٹر؟ مے فیر؟ کلریجز؟ لندن محض دریائے ٹیمز کا مغربی کنارا ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور پٹی کوٹ لین میں ہاٹ لگتا ہے۔ ٹھیلے والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں۔ سیکنڈ ہینڈ مال' نجومی' رمال' گلیوں میں شکستہ مکانوں کی سیڑھیوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں۔ بالوں کا جوڑا بنائے ایک یہودی ربائی خاموشی سے گذر جاتا ہے۔ سڑکوں پر بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر۔ ملبے کے انبار۔ یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شیفلڈ۔ گلاسگو۔ ویلز کی آبادیوں میں۔ نیچے جنوبی اٹلی اور اسپین اور یونان میں اور نیچے نیلا میڈیٹرینین جگمگا رہا ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم کی یاٹ تیرتی ہے جو مارکوئس آف ٹوڈل ڈو کے ساتھ اطالوی رویرا تشریف لے گئی ہیں۔

"ہم یوروپ کے سلمز سے اپنے یہودیوں کو اسرائیل نکال لے گئے۔" میری پیاری دوست حایا نے مجھ سے کہا۔ "ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں سے مصالحت کر لیں لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا۔ وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔"

ڈاکٹر حایا کاف مین روسی نژاد ہے۔ یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ صیہونی تحریک میں کام شروع کیا۔ اس نے ڈبلن سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔ حایا' یا حیاء' یعنی حیات۔

میں بنی اسرائیل کی حیات نو کے اس سمبل سے ہمیشہ الجھتی رہتی ہوں۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے دستی بموں سے کتنے عربوں کی جان لی ہو گی۔ وہ اطمینان سے پیانو پر چیکوسکی بجاتی رہتی ہے۔ جب زیادہ جذباتی ہوتی ہے تو روسی گانے الاپنے لگتی ہے۔ جنگ فلسطین کے زمانے میں برطانوی پولیس نے اسے جیل میں بند رکھا۔ سیاسی طور پر وہ اشتراکی ہے۔ اس وقت حایا ہمبرگ کے ڈاکٹر الث طر سے الجھ رہی ہے۔ الث طر مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں روسی سیکھی اور "جرم و سزا" پڑھا۔ اب ہمبرگ میں جرمن ادب پڑھاتا ہے۔ وہ بھی کیمبرج میں موڈرن انگلش لٹریچر کا یہی سمر کورس کرنے آیا ہوا ہے۔

رونلڈ برطانوی ہے۔ نسلاً خالص اینگلو سیکسن۔ "تم برصغیر کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے۔" وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر الث طر کرشنفرل سے ٹیگور کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

"حضرت علیؓ اور امام غزالی اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی مطالعہ کیجئے۔ مگر آپ عیسائیوں کا قدیم تعصب کب مٹے گا۔" میں کہتی ہوں۔

"اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں۔" رونلڈ سگریٹ رول کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔ چاروں طرف خطرناک پانی ہیں اور ہم سب ایک ناؤ میں سفر کر رہے ہیں۔ کیم آہستہ آہستہ بہہ

رہا ہے۔ تیرہویں' چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے وہ یونہی بہتا آ رہا ہے۔ اس کے دونوں طرف پرم روز کھلے ہیں اور موسم بہار کے سارے پھول اور وِیپنگ ولوز کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی ہیں اور چیری کے درخت اور ان میں چھپے کاٹج اور ٹی گارڈن۔

گرانچسٹر۔ جہاں روپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹر۔ گرانچسٹر۔ گرجا کے قبرستان میں روپرٹ بروک کے میموریل پر ایک اکیلی ریتھ مرجھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لانچ یونین جیک لہراتی زناٹے سے پانی کی سطح پر سے نکل جاتی ہے۔ گڈ اولڈ یونین جیک کوئی آہستہ سے کہتا ہے۔ حایا ایک عبرانی گیت گنگنانے لگتی ہے۔ ڈاکٹر الث طر ایک جرمن نغمہ گا رہا ہے۔ ڈاکٹر نینسی کارلسن ایک نیگرو روحانی گیت شروع کر دیتی ہے۔ نینسی کی دادی ایک حبشی کنیز تھی جسے نیو اورلینز میں فروخت کیا گیا تھا۔ اس کا باپ ورجینیا میں پادری ہے۔ نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس نے "امریکن ناول میں نیگرو پادری کا کردار" پر مقالہ لکھ کر کولمبیا سے ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔ وہ کسی امریکن نیگرو یونیورسٹی میں ادب پڑھاتی ہے۔ بہت بشاش لڑکی ہے' بات بات پر قہقہے لگاتی ہے۔ رسل فریزر گورا امریکن ہے۔ نیویارک سے آیا ہے۔ وہاں کسی ادبی رسالے کا معاون مدیر ہے۔ اس نے کسی میٹا فزیکل شاعر پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ یہ بھی جدید انگریزی ادب کورس کرنے آیا ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریکفاسٹ کی میز پر بشاشت کے ساتھ نینسی سے کہا۔ "ہلو ٹوپسی!"

نینسی نے اس سے کہا۔ "دیکھو ڈارلنگ' مجھے معلوم ہے تم نے کسی بری نیت سے نہیں محض خوشدلی سے مجھے ٹوپسی پکارا۔ مگر آئندہ کسی نیگرو کو اس لقب سے مخاطب نہ کرنا۔"

"اوہ۔ آئی ایم سو سوری ڈیئر۔" انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خاموشی سے پورج میں مصروف ہو گئی۔

"تم نے دیکھا۔" بعد میں نینسی نے مجھ سے کہا۔ "اسی طرح لوگ نیگرو عورتوں کو ٹوپسی یا نیگرس کہتے ہیں۔"

"الفاظ میں کیا رکھا ہے؟" رونلڈ نے ایک اور سگریٹ رول کرتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کسی چینی کو چائنا مین کیوں کہتے ہیں اور ایشیائی کو ایشیاٹک؟" میں نے کہا

اب ہم اپنے گرینڈ کونسرٹ کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے۔ فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بہہ رہی ہے۔ تیز سبز گھاس نم ہے اور پتوں پر سے بارش کے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔ ای۔ ایم فاسٹر' سی۔ ڈے۔ لوئیس' ٹیرنس ٹلز اپنے اپنے لیکچر دے چکے۔ موسم گرما ختم ہوا۔ ایک کمرے میں ہم اس اسکٹ کی مشق کر رہے ہیں۔ جو ہم نے ایلیٹ کے "سوینی ایگنٹس" کی پیروڈی میں لکھا ہے۔ سارے ایسٹ انگلینڈ پر موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔

لندن کے ویسٹ اینڈ میں پیٹر اسٹنوف' ایڈتھ ایونز اور میری مارٹن کے کھیل بے پناہ ہجوم کھینچ

رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے فیشن ایجاد کئے ہیں۔ اوور سیز لیگ کی بھوری مہیب عمارت میں بوڑھے پنشن یافتہ آئی سی ایس اور نو آبادیات کے سابق گورنر چپ چاپ بیٹھے وہسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں۔ سیاح ٹرےفلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانہ کھلا رہے ہیں۔ ٹیٹ میں پکاسو اور رائل اکیڈیمی میں داونچی کی نمائش ہو رہی ہے۔ پکیڈلی سرکس کی طوائفیں سیاحوں کو ہلو ہینڈ سم کہہ کر اپنی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکیڈلی۔ ہارٹ آف دی ورلڈ۔! شام کا مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ سینما گھروں کی کھڑکیوں کے سامنے کیو لگے ہیں۔ ایک خوبصورت جوان آدمی جس کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ بھیک مانگتا مانگتا کیو کے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے۔ ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پیسے اس کے بکس میں کوئی نہیں ڈالتا۔

"سلام میم صاحب!" وہ ہمارے سامنے آکر اردو میں کہتا ہے۔

"کیا تم کبھی انڈیا گئے ہو۔؟" فیروز پوچھتی ہے۔

"نہیں میں ڈنکرک گیا تھا۔" وہ جواب دیتا ہے۔

فیروز اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔ وہ مسکرا کر تھینک یو کہتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

"ڈنکرک گیا تھا۔" فیروز دہراتی ہے۔ اور اب ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں کے آگے بھیک مانگتا ہے۔ اور ابھی ایک جنگ اور ہوگی؟"

میں اور فیروز سینما ہاؤس کے اندر جا کر مشہور فرنچ فلم لارونڈ دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

لارونڈ۔ زندگی کا میرگو راؤنڈ۔

شگفتہ کی چھوٹی بہن اور بچپن کی دوست کملا جسپال کا فلیٹ چیلسی میں ہے۔ وہ انڈین فارن سروس کی ایک رکن ہے۔ اس کے یہاں کینیڈا کا اکونومسٹ اور بجید ہینڈ سم (وہ بھی یہودی ہے) برنی اوسٹری کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر بحث کر رہا ہے۔ بہت پروگریسو ہے۔ (مغرب کے زیادہ تر پروگریسو انٹلیکچویل یہودی ہیں)۔ برنی جب اپنی امریکن کار پر قصبات کی پتلی پتلی سڑکوں پر سے گذرتا ہے' راہگیر رک کر اس کی کار غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکن کاریں انگلستان میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ گاؤں کے اکثر دیہاتی حیرت سے برنی کی کار چھو کر بھی دیکھتے ہیں۔

اور کینیڈا اور برطانیہ عظمیٰ کے انقلابات!۔ میرا اس سے جھگڑا جاری رہتا ہے۔ میاں انقلاب تو ایشیا میں آتے ہیں۔ ایک دو سال میں کایا پلٹ۔ یہ تھوڑا ہی ہے' پہلے انڈسٹریل ریولیوشن گھسیٹا۔ اسٹیم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کانوں کا سلسلہ رہا۔ دنیا کی تاریخ تو ایشیا میں بن رہی ہے۔

برنی سکون سے مسکراتا ہے۔

کرشنا مینن ریٹائر ہو چکے ہیں اور حسب معمول انڈیا لیگ کے دفتر کے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ جہاں اکثر اتوار کے روز اس کے دفتر کے ہال میں ریکھا اپنے رقص کی پریکٹس کرتی ہے۔ اور کنول کرشن

تصویریں بناتے ہیں اور کرشنا مینن کی قدیم وفادار آئرش سیکرٹری برجیٹ چائے بنا بنا کر ہم سب کو دیتی ہیں۔ کرشنا مینن برنی کو کینیڈین بش مین کہتے ہیں۔ اس وقت وہ برنی کو اپنے ہاتھ سے پراٹھے بنا کر کھلا رہے ہیں اور وہ سالن میں مرچوں کی زیادتی کی وجہ سے سوں سوں کر رہا ہے۔

اب رات ہوتی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے ٹہلنے والی حسین طوائفیں اور وہ بوڑھے بھکاری جو فٹ پاتھ پر رنگین چاک سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دیوار کے سہارے دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور راہ گیروں کو دھندلی پر امید آنکھوں سے دیکھا کرتے ہیں۔

زمین دوز ریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں۔ متوسط طبقے کے بولر ہیٹ' سیاہ سوٹ اور چھتریوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیے گئے ہیں۔ باہر خنک ہوا چل رہی ہے۔ کل سردی ہوگی۔ نیچے سڑک پر شام کے اخبار بیچنے والے آخری بچے کھچے پرچے سمیٹ رہے ہیں۔ جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ ایوا پیرون مرگئی۔ شاہ فاروق کو نکال باہر کیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ روسیوں نے ہلسنکی میں ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔ اب سب سو رہیں گے۔ فیروز اور کملا اور حایا اور ینفسی اور رونلڈ اور الث ملر اور برنی۔ کیونکہ یہ آج کا دن بھی ختم ہوا۔

کل کیا ہوگا۔؟ یہی سوال سنہ 38ء میں بھی سب کے سامنے تھے۔
لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے۔ دیکھو۔
اب تمہاری خاطر کوئی ڈینیل فیصلے کے لئے نہیں آئے گا۔

4۔ میوزیکل باکس اور بیرل آرگن

ہم کنٹربری جانے والے پلگرم رات کو سرائے میں جمع ہو کر اپنے اپنے قصے سناتے ہیں اور گلاس میں ریت تیزی سے گر رہی ہے۔ انگلستان کے میڈیول اور ٹیوڈر قصبوں کے مکان اب بھی موجود ہیں اور ندیوں کے کنارے ویپنگ ولوز اسی طرح جھکی ہوئی ہیں۔ لوگ بدل گئے۔

بہار۔ سارے برطانیہ اور یورپ میں سیلانی موٹریں روک کر خیمے نصب کرنے میں مصروف ہیں۔ آؤ زندگی میں اپنے اپنے خیمے نصب کرتے ہوئے تھوڑی سی باتیں کرلیں۔ پھر کوچ کا وقت آجائے گا۔

بہار۔ اسنو ڈراپ اور پرم روز اور وائلٹ اور بلوبلز اور درختوں پر بلیک برڈز اور اسٹارلنگ اور روبن۔ اور رات کو چاندنی سے روشن ایلپنگ فورسٹ میں پری زاد نکلتے ہیں۔ جو مشروم کی میز پر واٹر للی کا میز پوش بچھا کر شہد اور اخروٹ کی ضیافت کرتے ہیں۔ کھیتوں میں بٹر کپ اور کاؤزلپ اور للی اور پنسزی اور گلاب کھل گئے۔ آشیانہ' دہرہ دون' بلیکی اینڈ سنز اور فادر ٹک ای سی فور لندن کی پرفسوں باتصویر کتابیں۔ سنہرے خوابوں کے شہر "شٹ آئی ٹاؤن" جانے کے لئے شب خوابی کی پوشاک میں ملبوس

ننھے بچوں کا غول کمرے میں چھپی ایک روشن ٹرین میں سوار ہو رہا ہے اور ایک گورنس ہاتھ میں شمعدان لئے کھڑی ہے۔ ساری دنیا کی ضخیم کتابیں فلسفے اور ادب پڑھنے کے بعد انسان 'پریوں کی ملکہ میب' ایلس کے ونڈرلینڈ' اور سبز جیکٹوں والے پری زادوں کے دیس واپس جانا چاہتا ہے جن کی سرخ ٹوپیوں میں الو کے پر لگے ہیں۔ اور گرم برادران کی دنیا میں اور یوجین فیلڈ کی نظموں میں ننھے چاند۔ تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ ابھی اپنے شفق کے بستر میں سو رہو۔ جب بڑے ہو جاؤ گے رات بھر چمکنا۔ جب ہم بڑے ہو جائیں گے تو اتنی عقل اتنی تکان ہو گی کہ آنکھ بند کر کے "شٹ آئی ٹاؤن" جانا نعمت معلوم ہو گا۔ اور چوبی گھوڑے پر سوار ہو کر بین بری کراس جاؤ تو وہاں ایک سفید لباس پہنے حسین خاتون سفید گھوڑے پر سوار مل جائے گی۔ اس کی جوتیوں پر گھنٹیاں لگی ہیں۔

اب میں نے بین بری کراس دیکھا ہے۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔

جب ساز خاموش ہوتا ہے تو موسیقی کہاں چلی جاتی ہے؟

اور جمال اور شگفتا قدوائی کے ہاں شام کو لوئی تک نیٹس آکر بیٹھتے ہیں اور ڈبلیو جی آرچر کی بنگالی بھاوج شیلا آڈن (آرٹسٹ) ملک راج آنند اور شیریں وظیفہ دار (ڈانسر) اور اقبال سنگھ (مارکسسٹ نقاد) ریکھا دیوی (ڈانسر) اپنے باورچی خانے میں پنجابی چنے بھورے بنا کر نسیمہ ممانی کو کھلانے میں مصروف ہے۔ یہ لوگ پچیس تیس سال بعد ایک "پیریڈ" کہلائیں گے۔ گلاس میں ریت۔

ریکھا ایک سیدھی سادی پنجابی لڑکی ہے اور شمالی ہند کی پہلی بھرت ناٹیم ڈانسر۔ جب ناچتے ناچتے وہ ہوا میں زقند بھرتی ہے تو لندن کے مشہور بیلے کرٹک اور بیلے ڈانسر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ وہ اداسی کے ساتھ اکثر مجھ سے کہتی ہے لاہور میں راوی روڈ پر ہماری کوٹھی تھی۔ کبھی دیکھ کر آنا اور مجھے لکھنا کس حال میں ہے۔ تقسیم کو ابھی صرف پانچ سال ہوئے ہیں۔ اب ساری دنیا کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ عشق غم نو خرید۔ عشق غم نو خرید۔ ریکھا اور دیمو سکھوی جو احمد آباد کے ایک مل اونر کی مارکسسٹ لڑکی ہے۔ اور فیروز اور یہ سارا گروہ سب اشتراکی آدرش وادی نوجوان ہیں۔ طلوع فردا کے منتظر۔ ایک پائپر ہماری گلی میں آیا تھا۔ اس کی موسیقی سن کر سب لوگ 'مرد' عورتیں' بچے اپنے اپنے کام چھوڑ گلی میں ناچنے لگے اور ایک سنہرے زمانے کی طرف رقص کرتے چلے گئے۔ ایک آئرش شاعر نے بچوں کی ایک نظم میں لکھا تھا۔ ہم سب مختلف پائپرز کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ جن میں سب سے بڑا پائپر خود ہمارا ضمیر ہے۔ آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر۔ فیض صاحب نے اقبال کے لئے لکھا تھا۔ اقبال کو ایک لیجنڈ بنے زمانہ ہو گیا۔ اب خود فیض صاحب ایک لیجنڈ بنتے جا رہے ہیں۔ ملی بھابی کے ہاں دریچے میں کھڑے ہو کر صبح صبح ڈان اخبار کی سرخی دیکھی۔ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے لئے سزائے موت۔

یہ بھی ایک زمانہ ہے۔ مزید ہولناک وقت ابھی اور آئیں گے۔ باغوں میں میڈونا للی اور کنٹربری بلز اور مائیکل ماس ڈیزی کھلتی رہیں گی۔ انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چاء خانے میں بیٹھ کر تقی میاں اور اعجاز پنڈی سازش کیس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈیزی سے لبریز گھاس کے ہرے سمندروں پر تیرتے اس فاصلے سے برصغیر کی غربت' بدحالی' گندگی' ابتری پر کڑھتے' ہائی

گیٹ کے قبرستان میں کارل مارکس کی قبر کے پاس بیٹھ کر ہم انقلاب پر مزید بحثیں کرتے جو عنقریب ہندو پاکستان میں آنے والا تھا!

"اپنے ہاں SOCIAL UGLINESS کا خیال آتا ہے۔" اعجاز اداسی سے کہتا۔

ہیر دی گو راؤنڈ دی ملبری بش۔ دی ملبری بش۔ دی ملبری بش۔ اون اے کولڈ اینڈ فروسٹی مورننگ۔ نرسری کا گیت۔

ہم مسلسل ایک ملبری بش کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ایک سال کے بعد دوسرا تیسرا۔ چوتھا۔ وہی لیڈروں کی تقریریں۔ وہی وعدے۔ وہی کلیشے۔ ہم بہت ہی تیسرے درجے کے لوگ ہیں۔ خود ترسی کا دورہ۔ اپنے ملکوں سے باہر نکل کر آؤ ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ۔ واپس جاؤ۔ پھر وہی ریں ریں۔

وہ انقلاب کبھی نہ آیا۔

ہیسٹنگز میں بہت زور کی ہوا چل رہی ہے۔ طوفانی بارش۔ طوفانی سمندر۔ انور قریشی کے والد کرنل قریشی کا فلیٹ ساحل پر ایک جدید جہازی عمارت میں ہے۔ ابو کی بہن رانی ایک کمرشیل آرٹسٹ ہے۔ چھوٹا بھائی عمر قریشی کاؤنٹی کرکٹ کا کھلاڑی۔ اتوار کی صبح مطلع صاف ہوتا ہے۔ ہم لوگ کرکٹ میچ دیکھنے جاتے ہیں۔ عمر قریشی اپنی کاؤنٹی کے لئے کھیل رہا ہے۔ کرکٹ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ یہ کہ لوگ یہ کھیل کیوں کھیلتے ہیں۔ میں نٹنگ کرتی رہتی ہوں۔ دور سمندر لہریں مار رہا ہے۔ جب سے دنیا کا ارتقاء ہوا ہے' ہوا برابر چل رہی ہے۔ پانی مسلسل بہہ رہا ہے۔ ہیسٹنگز سنہ 1866ء۔

ساحلی ہوٹلوں کے برآمدوں میں لوگ خاموش بیٹھے لہروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اجاڑ۔ ویران۔ نمکین' تندرو' موسم۔

اور مغرب میں آکر ہم نے کتنے بے شمار تھیٹر دیکھے۔ اور کتنے بے شمار یوروپین اور انگریزی فلم۔ اور سب کی کہانیاں مختلف تھیں۔ اور زندگی میں اتنا تنوع ہے اور اتنی یکسانیت۔ میں نے موسموں کو پکارا ٹھہر جاؤ مگر بجرے وینس کی نہروں پر سے گذرتے گئے۔

خزاں کے کروکس کھل چکے ہیں۔ تو آؤ کیوں نہ ہم اولڈ لانگ زائین گائیں کہ یہ سال بھی جانے والا ہے۔ اور کرسمس کے تحائف میں اسکاٹ لینڈ سے ایک دوست نے ایک میوزیکل باکس بھیجا ہے جس کے ڈھکن پر میرے پسندیدہ اٹھارہویں صدی انگلستان کا ایک دیہاتی منظر بنا ہوا ہے اور لیڈی جان اسکاٹ کا نغمہ انی لاری بجتا ہے۔ اور انگلش کنٹری سائیڈ' اور دیہاتی چاء خانے اور جارجین امرا کے باغات اور اولڈ ماسٹرز کی تصاویر اور مقبول پرانی دھنیں اور اولڈ لانگ زائین اور گلاب کے پھول "اولڈ روز" ساٹن اور نقرئی شمعدان اور کوئن این فرنیچر اور پرانے سلور کا اولڈ فیشن رومان اور طامس بیلی اور ہنری کیری اور ٹام مور کے گیت اور بیرل آرگن بجانے والے کوچہ گرد موسیقار میرے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

میوزیکل باکس میں نے آتشدان پر رکھ دیا ہے اور اس میں انی لاری کی اسکاٹش دھن بج رہی ہے اور اس دھن کے متعلق کسی نے لکھا تھا کہ یہ نغمہ ایک اداس زرد شام دور سے آتی ہوئی بیرل آرگن کی مدھم آواز کی طرح سحر انگیز ہے۔

اور میڈا ویل کی سڑک کے نکڑ پر اس سرد برفانی رات میں کوئی بھکاری بیرل آرگن بجا رہا ہے۔

5۔ ”رسلی سیزن“

مارچ سنہ 53ء میں کامریڈ جوزف اسٹالین کی وفات حسرت آیات کے تیسرے روز کا ماجرا ہے میں صبح دس بجے بی بی سی کے دفتر جا رہی تھی کیا دیکھا کہ اوکسفرڈ اسٹریٹ میں کامریڈ اسٹالین خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ بیگم اسد محمد علی ہمراہ تھیں۔ سوچی یا میری نظر کو کچھ ہو گیا ہے یا ہیلوسی نیشن دکھلائی دیتا ہے۔ بی بی سی کا دفتر سامنے ہی تھا۔ یاران طریقت سب کینٹین میں جمع تھے۔ میں نے اطلاع دی۔ ”ذرا باہر چل کر دیکھئے اسٹالین سامنے بوٹس کی دوکان میں کھڑے موزے خرید رہے ہیں۔ اور بیگم اسد محمد علی ساتھ ہیں۔ ارے وہی۔ اپنے عسکری ابن سعید کی پھوپھی۔ احمدی کی والدہ۔۔۔“

سب نے متفکر ہو کر مجھے دیکھا۔ ”اسٹالین کی موت کا۔“ چچا صدیق نے آہ سرد بھر کر کہا۔ ”اس قدر صدمہ کہ دماغ پر اثر ہو گیا۔“

”ارے آپ باہر چل کر دیکھئے تو سہی“ میں نے ہڑبڑا کر اصرار کیا۔

سب لوگ فوراً باہر نکلے۔ عطیہ حبیب اللہ آگے آگے۔ سڑک پر آکر سب اچانک دم بخود اور ہکا بکا۔ جوزف اسٹالین سامنے موجود تھے۔ وہی قد و قامت۔ چال ڈھال' چہرہ مہرہ' مونچھیں' سر مو فرق نہیں۔

فیروز جبیں چپکے سے بولی۔ ”یہ کوئی گہرا انٹرنیشنل راز ہے۔ یا روسیوں نے ایک ڈبل یہاں بھیج دیا ہے۔ یا اسٹالین زندہ ہیں۔ خود ہی اڑا دی کہ مر گئے۔ اور چپکے سے یہاں بھاگ آئے۔“

جوزف اسٹالین اب ہم لوگوں کی طرف بڑھے۔ ہم سب فٹ پاتھ پر حیران پریشان کھڑے تھے۔ میں نے بیگم اسد محمد علی کو ہکلا کر آداب عرض کیا۔ وہ ہماری ہونق شکلیں دیکھ کر ہنس پڑیں۔ بولیں ”ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ یہ میرے دیور ہیں۔ کراچی سے آئے ہیں۔“

اسٹالین نے السلام علیکم کہہ کر چچا صدیق وغیرہم سے مصافحہ کیا۔ (موصوف سر سید احمد خاں کے پرنواسے تھے۔)

کینٹین واپس آکر چچا صدیق نے مجھ سے کہا۔ ”اب کہ آپ بخیر و خوبی سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ چکی ہیں۔ وقتاً فوقتاً براڈ کاسٹ کے بجائے ایک باضابطہ پروگرام ہفتے میں دو بار نشر کیجئے۔ میں نے فرنگی مسٹر فلاں سے آپ کے فضائل بیان کئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے ہفتہ دس دن میں اس پروگرام کا مستقل کنٹریکٹ آپ کو دیدیں گے۔“

بعد ایک ہفتے کے چچا صدیق نے افسردگی سے کہا۔ ”فلاں وی آئی پی جو تین سال کے لئے یہاں آئے ہیں اپنی بیگم صاحبہ کو یہی پروگرام دلوانا چاہتے ہیں۔ جب ان کو آپ کے متعلق معلوم ہوا۔ انہوں نے فوراً فرنگی مسٹر فلاں کو اپنے ہاں ڈنر پر مدعو کیا۔ میرا خیال ہے اب یہ کنٹریکٹ آپ کو نہیں ملے گا۔“

”یہاں پر بھی یہ سب چلتا ہے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”یہ سب دنیا میں ہر جگہ چلتا ہے۔“ چچا نے جواب دیا۔ چنانچہ وہ مستقل کنٹریکٹ مجھے نہیں ملا۔

اس فقیر پر دنیائے دوں کے بہت سے اسرار منکشف ہوتے جا رہے تھے۔

میں نے وکٹوریہ میں واقع قدیم ہیدرلیز اسکول آف آرٹ میں داخلہ لے لیا جہاں میں واحد ایشیائی خاتون طالب علم تھی۔ (بہت دنوں بعد یاد آیا کہ سوئس ایئر کا سال بھر کے اندر واپسی کا کرایہ نجانے کب کا غت ربود ہو ہو چکا۔) پھر مسٹر اوین جونز کی نصیحت کے مطابق کہ پیانو کی پریکٹس ہرگز نہ چھوڑنا شام کے وقت بیکر اسٹریٹ کے ایک میوزک سکول جانا شروع کیا۔

لندن مجلس کی تہذیبی سرگرمیاں ہم لوگوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ سالانہ آرٹ کی نمائش کے لئے میں نے پنچ تنتر کی ایک حکایت بارہ تصاویر میں مصور کی۔ ایک شیڈو پلے پروڈیوس کیا۔ ریکھا بیلے ڈائریکٹ کرتی تھی وغیرہ وغیرہ میں آرٹ کی نمائش کی منتظم تھی۔ ایک غیر معروف ساؤتھ انڈین نوجوان اپنی تصاویر کا بستہ لیکر روز آتا تھا کہ یہ تصاویر بھی نمائش بھی لگا لیجئے۔ وہ ابو ابراہام آج نامور کارٹونسٹ ہے۔ سوزا بھی اس وقت اتنے مشہور نہیں ہوئے تھے۔ پاکستانی ڈپلومیٹ سعید حسن کے ہاں جن کی بیوی فریدہ بہت عمدہ گاتی تھیں انڈین بنگالی لڑکے لڑکیوں کا مجمع رہتا سب گایا بجایا کرتے۔ دونوں میاں بیوی مشرقی پاکستانی تھے۔ ایک اور مشرقی پاکستانی نوجوان ہمایوں رشید لندن مجلس کی گانے بجانے کی محفلوں میں شامل رہتا تھا۔ (وہ سنہ 1971ء میں نئی دہلی میں پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر تھا۔ اس نے دہلی سے بنگلہ دیش کے لئے ڈیفیکٹ کیا۔)

ایک روشن صبح ہیدرلیز اسکول آف آرٹ میں ایک روغنی تصویر بناتے بناتے القا ہوا کہ آرٹ وارٹ کافی ہو لیا جرنلزم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

کرشنا آل حسن' اعجاز حسین بٹالوی اور رمیش سنگھوی مستقل مزاجی سے قانون کے طالب علم تھے۔ امینہ سلیڈ اسکول آف آرٹ سے فارغ التحصیل ہو کر لندن یونیورسٹی میں روسی اور فارسی پڑھ رہی تھیں۔ فیروز جبیں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں رالف رسل کی زیر نگرانی اردو ALLEGORY پر ریسرچ میں مصروف تھیں۔ تقی میاں پاکستان ہاؤس کی ملازمت چھوڑ کر برٹش میوزیم کے اردو سیکشن کے انچارج ہو گئے تھے۔ ایک روز میں برٹش میوزیم گئی تو آپ اردو سیکشن میں خاموش کھڑے پائپ پیتے نظر آئے۔ ایک الماری میں ”ستاروں سے آگے“ بھی دیکھی۔ طبیعت کو بہت فرحت حاصل ہوئی۔

کزن محمود احمد زیدی پاکستان ہاؤس کی لائبریرین شپ سے دست بردار ہو کر لندن اسکول آف اکنومکس میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک کہر آلود شام ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک کے سامنے سے گذرتے ہوئے مل گئے۔ میں اندر جا رہی تھی۔ پوچھا۔ ”آپ کا میوزک اسکول تو بیکر اسٹریٹ میں ہے۔ جہاں آپ شام کو جاتی ہیں۔ اس وقت یہاں کہاں؟“ بے نیازی سے عرض کیا۔ ”میں یہاں جرنلزم پڑھ رہی ہوں۔ جرنلزم اور فرنچ۔“

”جزاک اللہ۔“ محمود میاں نے جواب دیا اور دھندلکے میں غائب ہو گئے۔

ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک میں فرانسیسی زبان ایک کوئی COCKNEY استاد پڑھاتا تھا۔ اس سے فرنچ پڑھنا ایسا ہی تھا جیسے دلی کے کسی کرخندار سے تہرانی فارسی سیکھی جائے۔ صحافت کا سال بھر کا ڈپلومہ

کورس تھا۔ جب تک برطانوی جرنلزم کی تاریخ پڑھائی گئی اسباق نہایت مفید اور دلچسپ ثابت ہوئے۔ مگر جب ماسٹروں نے یہ سکھلانا شروع کیا کہ مضمون کس طرح لکھے جائیں تو خیال آیا کہ اس سے کہیں بہتر مضامین تو ہم پاکستان ٹائمز میں لکھ چکے ہیں اور یہاں لندن کے ماہنامے "ایسٹرن ورلڈ" میں لکھتے رہتے ہیں۔ اب مناسب یہ ہے کہ پولی ٹیکنیک میں تضیع اوقات کے بجائے کسی اخبار میں کام کرنے کا تجربہ حاصل کیا جاوے۔

انور جمال قدوائی اور شکنتلا سنہ 47ء میں دلی سے لندن آئے تھے۔ جمال یہاں سے تبدیل ہو کر انقرہ اور روم میں تعینات رہے۔ اب انڈیا ہاؤس کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہو کر لندن واپس آ چکے تھے۔ ایک شام میں اور شکنتلا حسب معمول آتشدان کے سامنے قالین پر کہنیوں کے بل لیٹے شطرنج میں منہمک تھے کہ جمال دفتر سے واپس آئے۔ پوچھا۔ "آج تم اپنی مختلف النوع کلاسوں سے جلدی لوٹ آئیں۔"

"ہم اب اخبار میں کام کرنے جا رہے ہیں۔"

"کون سے اخبار میں؟"

"یہ ابھی طے نہیں کیا۔"

جمال پائپ سلگا کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ "دیکھو۔ تم انگریزی میں ایک جاسوسی ناول لکھو۔ فرضی نام سے۔ بہت بکے گا۔ اس کے منافع سے یہاں ایک ادبی اور انقلابی رسالہ نکالو۔" حسب عادت انہوں نے نہایت ناقابل عمل مشورے دینے شروع کئے۔

"جمال آپ فی الوقت بالکل مخلا بالطبع ہیں۔"

"تمہارا بشپ گیا۔" شکنتلا نے کہا۔

"رسالہ نکالو۔ ہمارے [5] ابا کامریڈ میں کالم لکھتے تھے اور کسی کو نہیں بخشتے تھے۔"

"شکن اپنا اونٹ بچاؤ۔"

"اور سنا ہے علیگڑھ میں ایک مزاحیہ دو ورقی پرچہ شائع کرتے تھے فرضی نام سے۔"

"پتہ ہے۔ ابا جان کا مرزا پھویا شاید پہلے اسی میں چھپا تھا۔"

"ہاں۔ اب حسرت کو دیکھو۔ کیا عجیب و غریب انسان تھا۔"

"جمال آپ موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔"

"ڈیلی ورکر میں جاؤ۔"

آپ کو معلوم ہے کہ اس قدر زبردست انقلابی ہو گئی ہوں کہ ابھی ریڈ ڈین نے جو بڑی بھاری میٹنگ بلائی تھی اس میں سب لوگ CAUSE کے لئے چندہ دے رہے تھے تو منیب الرحمٰن وغیرہ نے مجھے اسٹیج پر بھیجا۔ میں ان کو چندہ دیکر آئی سب کی طرف سے۔ ڈین آف کنٹربری جیتے سے بالکل انگریز مہاتما گاندھی لگتے ہیں۔"

"کتنا چندہ دیا آپ لوگوں نے۔"

"پانچ پاؤنڈ کا I.O.U سادے کاغذ پر۔"

"یہ لونڈہارپن آپ لوگوں کو اب چھوڑنا چاہیئے"۔

"ہم لوگ بیحد سنجیدہ ہیں۔"

"ڈیلی ورکر میں جاؤ۔ ٹوری پریس کالوں کو نوکری نہیں دیتا۔"

"شکن تمہاری کوئن گئی۔ جی۔۔ کیا؟ ٹوری پریس؟"

"ہم کرشنا مینن سے کہیں گے وہ سرہیری ٹرنر سے بات کریں۔ اچھا سنو۔ تم مولانا محمد علی اور حسرت کے متعلق ایک مضمون لکھو۔"

"اور ساتھ ساتھ جاسوسی ناول۔ یہ ہیری ٹرنر کون صاحب ہیں؟ شکن تم نے میرا دوسرا اونٹ بھی پیٹ لیا۔"

برٹش یونین آف جرنلسٹس کے صدر سرہیری ٹرنر مسٹر اوین جونز کی قبیل کے بزرگ نکلے۔ مشفقانہ انداز میں فرمایا۔ "قباحت یہ ہے کہ لندن میں ہمارے اخبار نویسوں نے بڑے سخت قوانین بنا رکھے ہیں کہ دولت مشترکہ کے صحافی یہاں کام نہ کریں۔ ورنہ دیکھتے دیکھتے فلیٹ اسٹریٹ ان سے بھر جائے گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اس مجبوری کو مدنظر رکھو گی۔ اور کسی پروونشل اخبار میں کام کرنے کو تیار ہو گی۔ وہاں یہ دقت پیش نہ آئے گی۔"

"جی نہیں۔ صرف فلیٹ اسٹریٹ۔"

"اچھا یہاں کسی زنانہ رسالے میں کام کرو گی؟"

"جی نہیں۔ صرف کسی بڑے قومی روزنامے میں رپورٹنگ کا تجربہ۔"

سرہیری نے دو منٹ خاموش رہ کر کچھ سوچا۔ پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ڈائل گھما کر ڈیلی ٹیلی گراف کے منیجنگ ایڈیٹر سے مصروف گفتگو ہوئے۔ پھر مجھ سے کہا۔ "میں نے ابھی بات کی۔ تم کو یونین کے قوانین کی وجہ سے تنخواہ نہیں ملے گی۔ زیر تربیت رپورٹر سمجھا جائے گا۔ بطور ٹوکن پانچ پاؤنڈ ہفتہ ملے گا اور رپورٹنگ کی دوڑ بھاگ کے لئے ٹیکسی کا کرایہ۔ ٹھیک ہے؟ ابھی سیدھی وہاں جاؤ۔ فوراً۔"

میں نے ان فرشتہ صفت بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور ان کے بوسیدہ دفتر کے نیم تاریک چوبی زینے سے بسرعت اتر کر سرپٹ ڈیلی ٹیلی گراف بھاگی۔ جو چند قدم پر تھا۔ ڈیلی ٹیلی گراف کی عمارت پر لگے گھڑیال میں اس وقت صبح کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔

منیجنگ اڈیٹر نے مجھ سے کہا۔ "فی الحال تم کو عورتوں کے صفحے پر کام کرنا ہو گا۔ میں نے اس کی اڈیٹر مس بارنٹ سے بات کر لی ہے۔" یہ برطانوی ایفی شنسی حیرت انگیز تھی۔ تیسرے فلور پر شعبہ خواتین میں متعدد فرنگنیں کام میں مصروف تھیں۔ مس بارنٹ ایک معمر خاتون تھیں۔ جنھوں نے بوجہ برطانوی کم سخنی اور میٹر آف فیکٹ رویے دو منٹ موسم پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد کہا۔ "یہ اپریل کا مہینہ ہے اور برطانوی خواتین اپنے موسم سرما کے ملبوسات الماریوں میں مقفل کرنے والی ہیں۔ گرم کپڑوں کی حفاظت کے متعلق

فوراً ایک نوٹ لکھدو۔ دوسرے کمرے میں مس گرفتھ تم کو تازہ ترین قسم کی موتھ بالز وغیرہ پر میٹریل دیدینگی۔"

گرم کپڑوں کی حفاظت اور موتھ بالز۔!

میں نے ٹائپ رائٹر پر جا کر لکھنا شروع کیا۔ OH ! TO BE IN ENGLAND NOW THAT APRIL'S THERE لیکن گرم کپڑوں کو کھانے والے کیڑے بھی موسم بہار میں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لاحول ولا قوۃ۔ بہرحال۔ نوٹ ٹائپ کرکے لنچ کے بعد مس بارنٹ کو دیا۔ انہوں نے بغور پڑھا۔ سنا تھا اڈیٹر لوگ "بلیو پنسل" بہت کرتے ہیں۔ بڑی بی نے عینک پیشانی پر سرکائی اور وہ مضمون جوں کا توں نیچے پریس میں بھیج دیا۔ اور بولیں "تم کو "بائی لائن" بھی دی جائے گی۔"

میں صبح پونے گیارہ بجے سرہیری ٹرز سے ملنے گئی تھی۔ اس وقت دن کے پونے تین بجے تھے اور مضمون مع "بائی لائن" پریس جا چکا تھا۔

اجی وہ موتھ بالز کے متعلق عورتوں کے صفحے پر ہی سہی۔ مگر ڈیلی ٹیلی گراف میں روز اول مجھے کون ادبی کالم لکھنے کو دیدیتا۔

موسم بہار "سلی سیزن" کہلاتا ہے۔ جب عورتیں طرح طرح کے نمونوں کے ہیٹ پہنتی تھیں۔ ایک روز مس بارنٹ نے پوچھا۔ "تمہارے ہاں موسم بہار میں زنانہ فیشن کس نوع سے تبدیل ہوتے ہیں؟ اور۔ تمہارے ہاں عورتیں کس قسم کے ہیٹ۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے ہاں عورتیں ہیٹ نہیں پہنتیں۔ موسم بہار میں پھولوں سے بال آراستہ کرتی ہیں۔"

"گڈ۔ تم فوٹوگرافر لیکر ابھی بونڈ اسٹریٹ کی کسی بڑی دکان میں جاؤ۔ جلین کے ساتھ۔ اور اپنی تصویر آئینے کے سامنے بالوں میں پھول لگاتے ہوئے اور جلین کی ایک نئی ہیٹ ٹرائی کرتے ہوئے کھنچواؤ۔ اور فیچر لکھو۔ موسم بہار کے فیشن مغرب و مشرق میں۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ مضمون کے ساتھ جس روز وہ لغو تصاویر ڈیلی ٹیلی گراف میں چھپیں، میں نے سوچا یاران طریقت کا سامنا کس منہ سے کیا جائے۔ لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ فقیر فلیٹ اسٹریٹ کی زنانہ اور فیشن جرنلزم کے بحرِ ذخار میں غوطہ زن اور ساحل پر کھڑے جیمز جوائس اور ایلیٹ نوحہ کناں تھے۔

نامور بیلرینا موائیرا شیرر ہسپتال میں داخل تھی۔ اس سے جا کر معلوم کیا کہ آج کل کس قسم کے پرہیزی کھانے کھاتی ہے۔ اور اسی قسم کے عظیم صحافتی کارنامے انجام دیئے۔ بلکہ ایلزبتھ نے تاجپوشی کے موقع پر ہیروں کے بندے پہننے کے لئے کان چھدوائے۔ یہ اطلاع پریس میں آتے ہی برطانوی عورت نے جوق در جوق اپنے کان چھدوانے شروع کر دیئے۔ اس بوڑھے سنار کا جس نے "ینگ اینڈ بیوٹی فل کوئن"

کا کن چھیدن کیا تھا جا کر انٹرویو کیا۔ ایک سلور اسمتھ نے شہزادی این کے لئے گڑیوں کا نقرئی ٹی سیٹ اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ ایک دور افتادہ گاؤں جا کر اس سلور اسمتھ سے شرف نیاز حاصل کیا اور مضمون رقم کیا بعنوان "شہزادی این کے نقرئی کھلونے۔"

اپنے والد آسکر وائلڈ کی ذلت و خواری و رسوائی کے بعد ان کے بیٹے نے اپنا ننھیالی خاندانی نام ہالینڈ اختیار کر لیا تھا۔ مسز ہالینڈ کی زوجہ بونڈ اسٹریٹ میں ایک بے حد شاندار بیوٹی پارلر چلاتی تھیں اور ملکہ معظمہ کی ذاتی بیوٹیشن تھیں۔ کورونیشن کی صبح وہ ہر میجسٹی کا میک اپ کرنے والی تھیں۔ جس روز صبح میں مسز ہالینڈ کا اس سلسلے میں انٹرویو کرنے گئی۔ زبیدہ اور اس کے شوہر گروپ کیپٹن اللہ داد (جو پاکستان ہاؤس میں ایر اتاشی تھے) ہمراہ تھے۔ ہم لوگ بیوٹی پارلر کے اندر گئے۔ زبیدہ چاروں طرف دیکھ کر چپکے سے بولی۔ "یہ مسز ہالینڈ انگلستان کی سب سے مہنگی بیوٹیشن ہے۔ اس کے ہاں آکر عورتوں کی کھال ادھڑ جاتی ہو گی۔ کروڑپتی عورتیں، فلمسٹارز اور کاؤنٹیس وغیرہ ہی یہاں آتی ہیں۔ کاش ہمارے پاس اتنے پیسے ہوتے کہ ہم بھی کبھار اس سے سنگھار کروا لیا کرتے۔"

اللہ داد نے کہا۔ "زبیدہ قناعت سیکھو۔" پھر مجھ سے بولے۔ "ہم اپنی شاپنگ کر کے آتے ہیں۔ اتنے تم اپنا انٹرویو کر لو۔"

مسز ہالینڈ باہر لاؤنج میں آئیں۔ میری شکل بغور دیکھ کر اللہ داد سے کہا ٹھیک دو گھنٹے بعد آیئے گا۔" اندر ڈرائنگ روم میں جا کر ملکہ ایلزبتھ کے سنگھار پٹار کے بارے میں مصروف گفتگو ہوئیں۔ انٹرویو آدھ گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ مجھے یہ فکر کہ اب مجھے ڈیڑھ گھنٹہ زبیدہ اللہ داد کا انتظار کرنے پڑے گا۔ مگر مسز ہالینڈ اس اثناء میں بیوٹی پارلر میں جا چکی تھیں۔ پھر باہر آئیں بولیں۔ "میں تمہارا میک اپ کرنا چاہتی ہوں۔ بطور تحفہ، فری۔" بعد ازاں آسکر وائلڈ کی بہو نے پورا ڈیڑھ گھنٹہ اس عاجزہ کے چہرے پر اپنا فن مشاطگی صرف کیا۔ اور اپنی کارگذاری دیکھ کر فرمایا۔ "یہ خالص اورینٹل لک ہے۔"

میں نے آئینہ دیکھا کہ ایک عجیب و غریب اجنبی شکل نظر آئی۔ سرخی مائل کتھئی رنگت۔ کوئلے کے رنگ کی جاپانی بھویں اور سیاہی آنکھیں۔ حبشی ہونٹ۔ میں نے مسز ہالینڈ کا شکریہ ادا کیا۔ موصوفہ نے ایک لحیم شحیم خوبصورت ڈبہ گلابی چوڑے فیتے سے بندھا پیش کیا۔ بولیں۔ "ہر میجسٹی جس برانڈ کا میک اپ استعمال کرتی ہیں وہی سارا میں نے اس میں تمہارا لئے رکھ دیا ہے تمہاری کلرنگ کے لحاظ سے۔"

میں نے مزید شکریہ ادا کیا اور ان کو خدا حافظ کہہ کر باہر آئی۔ ٹھیک اسی وقت زبیدہ اور اللہ داد صدر دروازے میں نمودار ہوئے۔ زبیدہ بھونچکی ہو کر میری شکل دیکھتی دیکھتی رہ گئی۔ "یہ۔۔ یہ تمہارا کیا حلیہ بنایا ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ میں نے سڑک پر آتے ہوئے کہا۔ "تم کو کیا معلوم۔ یہ اورینٹل لک ہے۔"

"اور اس ڈبے میں کیا ہے۔"

"تبرک۔ ہاتھ نہ لگانا۔ اسی برانڈ کا میک اپ ہر میجسٹی استعمال کرتی ہیں۔"

زبیدہ نے کار میں بیٹھتے ہی بے صبری سے ڈبہ کھولا۔ اندر میک اپ کے سارے لوازمات موجود تھے اور سب گہرے کتھئی رنگ کے۔ زبیدہ نے پھر میری صورت دیکھی سوچ کر بولی۔ "تم بالکل افریقی اور چینی ملی جلی کٹھ پتلی معلوم ہو رہی ہو۔"

"وہ کس قسم کی کٹھ پتلی ہوتی ہے؟" اللہ داد نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ اور بولے۔ "زبیدہ۔ میں نے تم سے کہا تھا نا' قناعت سیکھو۔ زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔"

بسلسلہ کورونیشن دولت مشترکہ کے ایک خصوصی ٹیلی ویژن پروگرام میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا تھا برائے ڈھائی منٹ کی تقریر۔ اس پروگرام کی شوٹنگ بھی ایک نہایت "اورینٹل سیٹ" پر کی گئی۔ دیوار پر بخارا کے قالین۔ کشمیری پردے۔ عمر خیام والی صراحیاں۔ مورش محراب۔ زبیدہ کی ایک جھکا جھور ساری اور اس کے جملہ زیورات برائے اورینٹل لک بے معنی' ڈائرکٹر کی ہدایت کے مطابق مورش محراب کے نیچے سے گذر کر کیمرے کے مقابل آتے ہوئے اچانک ایک سوال ذہن میں کوندا۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں اور یہ کیا مسخرہ پن ہے؟ زندگی میں بعض اوقات عجیب عجیب مواقع پر معاً یہ سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟

دوسری شام میں نے یہ سوال تقی میاں سے کیا۔ ہم لوگ پال مال پر سے گذر رہے تھے۔ جہاں شاہی جلوس کے تماشائیوں کے لئے دو رویہ اسٹینڈ تیار کئے جا رہے تھے۔ اردو سروس کے لئے جشن تاجپوشی کی تیاریوں کا "آنکھوں دیکھا حال" نشر کرنے کے سلسلے میں میں اور تقی میاں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ بکنگھم پیلس کہرے میں چھپ گیا تھا۔ درختوں میں سے ہائی لینڈرز کے بیگ پائپ کی جان لیوا دھن سنائی دے رہی تھی۔ دولت مشترکہ کے ممالک نے اپنے اپنے فوجی دستے جلوس میں شرکت کے لئے بھیجے تھے۔ سامنے سے شاندار خوش شکل پنجابی "جوانوں" کا پاکستانی دستہ مارچ کرتا گذرا۔

"تقی میاں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ لوگ۔ ہم سب۔ یہاں کیوں موجود ہیں؟"

"سرسید احمد خاں۔۔۔" تقی میاں نے کہنا شروع کیا۔

"بجا۔۔۔ سرسید احمد خاں بگھی پر بیٹھ کر اسی پھاٹک سے داخل ہو کر اندر ملکہ وکٹوریہ سے ملنے گئے ہونگے پھر ایم۔ اے۔ او کالج بنا۔ پھر ہم لوگوں نے انگریزی پڑھی۔ پھر پاکستان بنا' جو دولت مشترکہ میں شامل ہے مع انڈیا کے اور اس کے فوجی ملکہ کے جشن تاجپوشی میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ تو فرض کیجئے کہ سرسید کی روح کہیں سے گھومتی گھامتی اس وقت یہاں آ نکلی ہو تو یہ منظر دیکھ کر کیا سوچتی ہو گی؟" میں نے سوال کیا۔

"غالباً۔ خوش ہو گی۔" تقی میاں نے جواب دیا۔

"سرسید تقسیم پسند کرتے۔؟"

"غالباً۔ یا شاید قطعی۔ میں اپنی ریسرچ مکمل کر لوں تو کسی نتیجے پر پہنچوں۔ اس پر یاد آیا پنڈت نہرو بھی تو جشن میں شرکت کے لئے آنے والے ہیں۔"

"اس پر یاد آیا۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "مجھے شگفتہ کے ہاں جانا ہے' کل ان کا فون آیا تھا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔"

تقی میاں کو شب بخیر کہہ کر میں نے پال مال سے نائیٹس برج کا رخ کیا۔ اسی رات جمال جینوا جانے والے تھے۔ شگفتہ صاحب فراش تھیں۔ معلوم ہوا ان کے خانساماں رمضان بھی بیمار پڑے ہیں۔ میں نے کہا۔ "ٹھہر جاؤ جی۔ میں منٹوں میں نہایت بڑھیا کھانا تیار کرتی ہوں۔ آخر روز گھر میں پکاتی ہوں یا نہیں اور خواجہ ناظم الدین کے لئے بریانی تو گویا ایک تاریخی واقعہ ہے۔" فوراً باورچی خانے میں جا کر قورمہ تصنیف کیا اور کھانے کی میز پر لے جا کر طمطراق سے اسے رکھا۔ جمال نے حسب عادت مخلا بالطبع انداز میں کھانا نوش جان کر لیا۔ بعد میں خیال آیا۔ شگفتہ کے کمرے میں آ کر ٹہلتے ہوئے فرمایا۔ "بھئی وہ سالن جو ہم نے کھایا اس کا کچھ عجیب سا مزا تھا۔"

میں نے بات ٹالنے کے لئے پوچھا۔ "آپ نے میرا وہ مضمون پڑھا کوئن آف ایلزبتھ کے کن چھیدن کے متعلق مع ہائی لائین۔"

جمالؔ نے یکلخت بہت متفکر ہو کر کہا۔۔ "اس قسم کی خرافات لکھ لکھ کر تمہارا ذہن بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

"ایک عام برطانوی ہاؤس وائف کی ذہنی سطح کے لحاظ سے لکھتے ہیں ہم لوگ۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"تم لوگ کون ہو؟"

"ہم برطانوی جرنلسٹ لوگ۔"

"وہ قورمہ۔۔ اس میں کیا شے ڈالی تھی؟"

"آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں فلیٹ اسٹریٹ میں برصغیر کی واحد خاتون صحافی ہوں۔"

"لیکن اس سے پہلے کہ مسز پارنٹ تم سے ڈیوک آف ایڈنبرا کے سائیس کا انٹرویو کروائیں تم۔۔۔ ارے ہمیں تو اس وقت جینوا جانا ہے۔" جمال نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا اور غائب ہو گئے۔ میں اور شگفتہ شطرنج کی طرف متوجہ ہوئے۔

2/ جون۔۔ سویرے سے ٹیلی ویژن پر جشن تاجپوشی دکھلایا جا رہا تھا۔ شاہی جلوس سڑکوں پر سے گذر کر ویسٹ منسٹر ایبے پہنچا۔ رسوم تاجگزاری شروع ہوئیں۔ آرچ بشپ آف کنٹربری نے چمچے میں تیل بھر کر اسے ملکہ کے سر پر انڈیلا کہ یہ "مسح" کی قدیم عبرانی روایت تھی۔ ("مسیح" یعنی THE ANOINTED ONE) عہد نامہ قدیم میں جگہ جگہ لکھا ہے تو اپنے سینگ میں تیل بھر کے جا اور فلاں کے سر پر تیل انڈیل کر اسے بادشاہ بنا۔۔ مسز ہالینڈ نے اتنی محنت سے بے چاری کوئن ایلزبتھ کے بال سنوارے ہوں گے اور لاٹ پادری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لیکر چمچہ بھر تیل انڈیل دیا۔۔۔ وہ بے چاری بہت سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایبے کے ہال میں پنڈت نہرو' اندرا گاندھی' اصفہانی صاحب روح افزا سجاد حیدر

اور سجاد حیدر، بیگم لیاقت علی خاں، وزیر اعظم محمد علی بوگرا معہ بیگم اور بریگیڈیر حامد حسین معہ بیگم بھی موجود تھے۔

دوسرے روز پنڈت جواہر لعل نہرو کیکسٹن ہال میں تقریر کرنے گئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بوڑھے پھوسا لارڈ پیتھک لارنس جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ اور مارے ضعیفی اور نقاہت کے سرنیہوڑائے بیٹھے تھے۔ پنڈت نہرو نے اپنی عادت کے مطابق جیو پولیٹکس پر روشنی ڈالی اور جوش سے بولے۔ "ہندوستان جاگ اٹھا ہے۔"

لارڈ پیتھک لارنس کا سر اور جھک گیا۔

پنڈت نہرو نے فرمایا۔ "ایشیا جاگ اٹھا ہے۔" لارڈ موصوف کا سر اور خم ہوا۔

"افریقہ جاگ اٹھا ہے۔"

لارڈ پیتھک لارنس تقریباً رکوع میں چلے گئے۔

"میں سمجھتا ہوں یہ ایک بہت ہی سمبولک منظر ہے" تقی میاں نے چپکے سے کہا۔

شاید تیسرے روز پنڈت جی اوسٹرلی کے انڈین کرکٹ کلب میں ہندوستانی طلباء کو مخاطب کر رہے تھے پنڈت جی بھائی نور الدین احمد کے بہت پرانے دوست تھے۔ امینہ نے ان سے کہا۔ "تم سلامت رہو ہزار برس"۔۔۔ کہنے لگے۔ "ارے بھئی ایسی بدعا مت دو۔ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔" تقریر میں کہنے لگے۔ "اس دفعے جب ہم نے یہاں ملکہ کی تاجپوشی کا ہنگامہ دیکھا۔ گلی کوچوں کو دیکھ کر اپنا عہد جوانی یاد آیا۔ جب ہم یہاں تم لوگوں کی طرح مٹرگشت کرتے تھے۔ وہ شعر کیا ہے بھئی۔ غزل اس نے چھیڑی۔۔"

"مجھے ساز دینا۔ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا۔" مجمع میں سے علیگڑھ کے ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"ہاں۔ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا۔ مگر اس وقت ہمارے سامنے ایک مقصد تھا۔ ایک ولولہ تھا۔" پنڈت جی سوچتے انگریزی میں اور بولتے اردو میں تھے۔ فرمایا۔ "مگر آپ لوگ۔۔؟ آپ لوگ بس طرح طرح نعرے اٹھاتے ہیں۔" (یہ "SLOGAN RAISING کا ترجمہ تھا) ایک لڑکے نے آواز دی۔ "پنڈت جی نعرے لگائے جاتے ہیں، اٹھائے نہیں جاتے"۔ کچھ کمیونسٹ لڑکوں نے ان سے سیاسی مباحثہ شروع کر دیا۔ پنڈت نہرو کی مخالفت ان دنوں "پارٹی لائن" تھی۔ مگر جلسے کے بعد سب نے بچوں کی طرح انہیں گھیر لیا۔ ان کے مخالفین بھی ان کے کرشمہ CHARISMA سے مسحور نظر آتے تھے۔ مجھے ایک بار پھر حاجیہ تاج کی مدتوں پرانی بات یاد آگئی کہ۔ "اسٹیج پر ایک طرف بھائی کرشمے دکھا رہا تھا۔ دوسری طرف بہن کرشمے دکھا رہی تھی۔" (چند برس بعد بہن لندن میں انڈین ہائی کمشنر بن کر آنے والی تھیں۔ بیٹی ابھی پبلک لائف میں بالکل نہیں آئی تھیں۔)

اسی ہفتے میں پنڈت نہرو جینیوا اور وہاں سے واپس دلی جانے والے تھے۔ امریکن سائنسدان میاں بیوی جولیس اور ایتھل روزن برگ کو روس کی جاسوسی کے الزام میں سزائے موت کا حکم دیا جا چکا تھا۔ پنڈت نہرو سمیت دنیا بھر کے لیڈر صدر آئزن ہاور سے اس حکم کو منسوخ کرنے کی اپیل کر چکے تھے۔ لیکن

پنڈت جواہر لعل نہرو کی اپیل بھی مسترد کی جا چکی تھی۔ یہ امریکہ میں مک آرتھی ازم کے عروج کا دور تھا۔ جس روز پنڈت جی لندن سے روانہ ہونے والے تھے۔ اطلاع آئی کہ صبح چار بجے سنگ سنگ جیل میں روزن برگ میاں بیوی کو برقی کرسیوں پر بٹھال دیا جائے گا۔

اس شام برطانوی ادیبوں، صحافیوں، طلباء، یہودیوں اور کیتھولک پادریوں اور ہندوستانی پاکستانی و افریقی طلباء کا ایک زبردست جلوس احتجاجی مارچ کرتا نمبر10 ڈاؤننگ اسٹریٹ پہنچا۔ وہاں پہرے کے سنتریوں نے بتایا کہ وزیر اعظم مسٹر چرچل اپنے کنٹری ہاؤس جا چکے ہیں۔ جلوس نے شہر واپس آکر عین اوکسفرڈ سرکس میں دھرنا دے دیا۔ ٹریفک رک گیا۔ گھڑ سوار پولیس نے مجمع کو اٹھانا چاہا۔ جواباً ہزاروں کے مجمع نے انگریزی، عبرانی، فرانسیسی اور بنگالی میں انقلابی گیت شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد یہ جم غفیر شب بیداری کی غرض سے ہائیڈ پارک روانہ ہوا۔ پکیڈلی سرکس کے ایک برآمدے میں سے کسی انگریز نے چلا کر پوچھا۔ "واٹ اباؤٹ برلن؟" راستے میں مزید انگریز مرد عورتیں جلوس میں شامل ہو گئیں۔ برطانوی لڑکے لڑکیاں جوش و خروش سے گاتے جا رہے تھے۔ "جب سرخ سویرا آئے گا ہم لیڈی ایسٹر سے برتن دھلوائیں گے اور چرچل کو ووڈبائن سگریٹ پلائیں گے۔"

چند کیتھولک پادری چلتے چلتے بار بار سڑک پر دو زانو ہو کر تسبیح پھیرتے اور دعائیں پڑھتے۔ برطانوی یہودی مرد اور عورتیں روتے جا رہے تھے۔ الوہی۔ الوہی۔ لما شبقتنی۔

لندن پولیس کے سیکڑوں سپاہی چشم زدن میں جانے کہاں سے نمودار ہو گئے تھے اور نہایت سکون اور خاموشی سے جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ہائیڈ پارک پہنچ کر جگہ جگہ تقریریں شروع ہوئیں سب سے زیادہ جوشیلی تقاریر انڈیا کے بنگالی اور مشرقی پاکستان کے بنگالی طلباء کر رہے تھے) سب کی آخری امید پنڈت نہرو سے وابستہ تھی۔ رات گئے اطلاع ملی امریکن پریزیڈنٹ نے انڈین پرائم منسٹر کی دوسری اپیل بھی مسترد کر دی۔ اب عورتوں کی آہستہ آہستہ رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہمارے دوستوں کا گروہ شبنم آلود گھاس پر حلقہ بنائے بیٹھا تھا۔ میں نے رمیش سنگھوی سے کہا۔ "چلو مولانا آزاد کو ٹرنک کال کریں۔ (مولانا اس وقت نئی دلی میں پنڈت جی کی غیر موجودگی میں قائم مقام وزیر اعظم تھے) اور جینوا پنڈت جی کو CONTACT کرنے کی کوشش کریں۔ کہ وہ ایک بار پھر آئزن ہاور سے کہیں۔" ہم لوگوں نے ہائیڈ پارک سے باہر آکر ٹیلی فون کیئے۔ معلوم ہوا پنڈت جی جینوا سے روانہ ہو چکے۔

"ممکن ہے ہمارا پیغام ہوائی جہاز میں پنڈت جی کو پہنچا دیا جائے۔" رمیش سنگھوی نے کہا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ ہم لوگ ہائیڈ پارک واپس آئے۔ جہاں اب ان گنت شمعیں جلا دی گئی تھیں اور کیتھولک پادری اور یہودی ربائی دعاؤں میں مصروف تھے۔ روزمارک نے جو ایک برطانوی یہودی لڑکی تھی مجھ سے کہا۔ "بنی اسرائیل کا گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس طرح اس مفروضہ خیالی طاقت سے رحم کی التجا کرتے کرتے ساٹھ لاکھ یہودی مرد، عورت اور بچہ ہٹلر کے گیس چیمبرز کی نذر ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل کے خدا کو ان پر رحم نہ آیا۔ اب وہ محض ان دو عدد میاں بیوی

کو کیا بچائے گا۔ اور یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ نا تسی قیامت کے بعد یوروپ اور امریکہ کا بیشتر یہودی ملحد ہو چکا ہے۔ لیکن ذرا ان سادہ لوح ربائیوں کو دیکھو۔ دعا مانگ رہے ہیں۔!"

اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم بی بی سی اور اپنے ٹوری اخبار کے لئے اس وجل کو کور کر رہی ہو نا؟ بس کافی کور کر لیا اب گھر جاؤ۔" پھر اس نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

سرپنٹائن جھیل پر کہرہ تیرتا رہا۔ اور جب وہ پانی کے کنارے بیٹھے اپنے صیہون کو یاد کر کے روتے تھے مجھے دفعتاً چھینکیں آنے لگیں۔ خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ روز نے مجھ سے کہا۔ "یہ لو کنجی اور میرے گھر جاؤ۔" میں 'فیروز اور ایک اور انگریز لڑکی ہیلی' روز کے گھر کی طرف پیدل روانہ ہوئے جو زیادہ دور نہیں تھا۔

روز کے فلیٹ پر پہنچ کر ہم نے آتشدان جلایا اور ادھر ادھر پڑ کر سو رہے۔ صبح چھ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ روز ہائیڈ پارک کے ناکام وجل سے واپس آ چکی تھی اور آتشدان کے سامنے سر جھکائے بیٹھی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔۔۔

دوسری رات میں ایک تھیٹر دیکھنے کے بعد کافی دیر میں میڈ اویل اپنے گھر لوٹی۔ اوپر لینڈنگ پر پہنچتے ہی گیس کی ہولناک بو ناک میں داخل ہوئی۔ اس لینڈنگ پر صرف میرا کمرہ تھا۔ دروازہ کھولا۔ اندر کمرے میں گھٹا ٹوپ گیس بھری ہوئی تھی۔ صبح گیس کھلا رہ گیا ہوا تھا۔ مارے گھبراہٹ اور حماقت کے مسٹر مور گشن کو بتانے کے بجائے نیچے اتر کر گیلری کا فون بھی استعمال نہ کیا مبادا مور گشن یا اس کی میم سن لے۔ سڑک پر جا کر پبلک بوتھ سے بلی بھابی کو فون کیا جو لندن سے بہت دور ایک ہرے بھرے قصبے میں رہتی تھیں۔ خیال یہ تھا کہ اتنی دور بھاگ جانا چاہیئے کہ مور گشن پکڑ نہ سکے۔ اب خیال آتا ہے کہ عقل ہمیشہ سے کم ہے مگر نوعمری میں اس شے کا بالکل فقدان تھا۔ بلی بھابی سے کہا۔ "میں فوراً آ رہی ہوں۔ انتظار کیجئے۔"

انہوں نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "اپی۔ کیا بات ہائے؟ خیریت ہائے؟"

میں نے کہا۔ "بس میں فوراً آ رہی ہوں"۔ فون بند کر کے بوتھ سے نکلی اور سنسان سڑک پر ٹیوب اسٹیشن کی طرف بھاگی جو آدھ فرلانگ پر تھا۔

ابھی بارہ نہیں بجے تھے اور ریلیں چل رہی تھیں۔ گھنٹے بھر بعد سرنگ سے نکل کر ٹرین سطح زمین پر برآمد ہوئی۔ اور اس کے پینتالیس منٹ بعد ضلع مڈل سکس میں بلی بھابی کا قصبہ آیا۔ آدھی رات ادھر' آدھی رات ادھر۔ اسٹیشن سنسان باہر سڑک ویران۔ ہو کا عالم۔ اسٹیشن سے بلی بھابی کا گھر پون میل کے فاصلے پر تھا۔ اب دلچسپ بات یہ ہے کہ کمرے میں گیس بھری دیکھ کر دہشت زدہ ہوئی مگر اکیلے دوکیلے رات برات کہیں آنے جانے کا خوف بچپن سے مطلق نہیں تھا۔ لہٰذا اس سنسان سڑک کا طویل راستہ نہایت اطمینان سے طے کر کے تھورن بری روڈ پر بلی بھابی کے گھر پہنچی۔ اس زمانے میں انگلستان کی سڑکیں بھی محفوظ تھیں۔ COSH BOYS اور ٹیڈی بوائز ابھی وجود میں نہ آئے تھے۔

بلی بھابی کے باغ میں روشن دریچہ نظر آیا۔ وہ دریچے ہی میں منتظر بیٹھی تھیں۔ دروازہ کھولا۔

پوچھا۔ "کیا ہوا؟ خیریت؟" وہ عموماً اردو بولتی تھیں۔

میں نے کہا۔ "صبح کو بتلاؤں گی۔"

بلی بھابی دلی والی بن چکی تھیں لیکن بہرحال تھیں تو اصل نسل انگریز۔ اور انگریز کبھی ذاتی سوالات نہیں کرتا۔ بولیں۔ "اچھا اگر کوئی گھبراہٹ ہے تو میری ہول دلی پہن لو۔"

ہم لوگ اوپر ان کے بیڈ روم میں گئے۔ بلی بھابی نے سنگھار میز پر سے ہول دلی اٹھا کر مجھے دی۔ کہربا کی تعویذ پر کندہ آیت کریمہ جو دلی کی بیگمات کا خاص زیور تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے ہول دلی تو بالکل نہیں ہے۔ فکر ضرور ہے۔"

بولیں۔ "اچھا اصل خیر سے سویرے بتانا۔ لمبو بے ڈول سے اس کی نئی نظم سنو۔ دل بہل جائے گا۔ اللہ کی قسم کیا اونٹ کی اونٹ لونڈیا ہے۔ کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔"

"وہ ابھی تک جاگ رہی ہے؟ کیسی شاعری کرتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسی شاعری ایک اونٹنی کر سکتی ہے۔"

اتنے میں مہمان کمرے سے نکل کر وہ بے حد و حساب بے تحاشا لمبی امریکن لڑکی بلی بھابی کے بیڈ روم میں آئی۔ میں نے اپنی ساری عمر میں اتنی طویل لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ امینہ کی دوست تھی اور عظمت فاروقی کے دوست سڈھارٹ بنرجی یعنی سدھارتھ بنرجی (جو اتنے ہی پستہ قد تھے) کے عشق میں گرفتار۔ موڈرن پوئٹری لکھ رہی تھی اور ویک اینڈ کے لئے اوکسفرڈ سے آئی ہوئی تھی۔ نور الدین بھائی چند روز قبل دلی واپس گئے تھے۔ امینہ یوروپ گئی ہوئی تھی اور دونوں چھوٹے لڑکے فرید اور فیروز اپنے کمرے میں محو خواب تھے۔

بلی بھابی نے اسی ڈھنگ سے میرا تعارف کرایا۔ "ہائے" اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ "میری نظم سنو۔"

"ہائے" میں نے جواب دیا۔ "سناؤ"

اچانک اس نے بلی بھابی سے کہا۔ "مجھے اپنی ایک ساری پہننے کو دیجئے میں ہندوستان کو FEEL کرنا چاہتی ہوں۔"

بلی بھابی نے اٹھ کر وارڈروب کھولا۔ ایک ریشمی ساری نکال کر دی۔ لڑکی ساری زیب تن کر کے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا ملاحظہ کرنے لگی۔ بھابی پلنگ کے کنارے بیٹھی تھیں۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر چپکے سے اردو میں بولیں۔۔ "عین مین ہیجڑا لگے ہے۔"

ساری پوش بنت عوج بن عنق نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ اچانک خاموش ہو گئی۔ آنسو بہانے لگی۔

"اب تم اپنے کمرے میں جا کر سوؤ۔" بلی بھابی نے نرمی سے کہا۔

صبح ہوئی۔ روشن اور خوشگوار۔ بلی بھابی کے باورچی خانے کے دریچے پر سیب کی ٹہنیاں جھکی ہوئی

تھیں۔ ایک شاخ پر بیٹھا پرند مسلسل گائے جا رہا تھا۔ بنت عوج بن عنق پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی۔ دریچے سے چھنتی دھوپ میں بلی بھابی کے عنابی بال جگمگا رہے تھے۔ ان کے سامنے باورچی خانے کی میز پر سنڈے پیپرز پھیلے ہوئے تھے۔ چاء کی پیالی ہاتھ میں لئے بلی بھابی ملکہ ایلزبتھ اور ایتھل روزن برگ کی تصاویر دیکھ رہی تھیں۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے اردو میں کہا۔ "ایک لڑکی۔ دو بچوں کی ماں۔ تخت شاہی پر بیٹھتی ہے۔ دوسری لڑکی۔ دو بچوں کی ماں کو اس کے خاوند کے ساتھ الکٹرک چیئر پر بٹھاویں ہیں۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بیوی یا تخت' یا تختہ۔"

شام کے وقت جب میں میڈ اویل واپس پہنچی۔ مسٹر و مسز مور گشن حیران و پریشان گیلری میں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر یوروپین انداز میں آسمان کی طرف سر اٹھایا اور دونوں ایک ساتھ بولے۔ "تمہارے کمرے میں گیس بھری ہوئی۔ اور تم غائب۔ دن بھر انتظار کرکے اب ہم پولیس کو فون کرنے والے تھے۔"

دفعتاً مسز مور گشن نے کرسی پر ٹک کر ہسٹریائی انداز میں رونا شروع کر دیا۔ مسٹر مور گشن ان کو باورچی خانے میں لے گئے۔ چاء بنا کر دی۔ مجھ سے کہا۔ "تم نے ہمیں کیوں نہ بتایا۔ غائب ہو گئیں۔"

"بس مارے بے وقوفی کے مجھے یہی سوجھا کہ رات گذارنے کہیں اور چلی جاؤں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ مسز مور گشن کیوں رو رہی ہیں؟"

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ "میری بیوی کا سارا خاندان جرمنی میں گیس چیمبر کی نذر ہو چکا ہے۔ تمہارے کمرے میں گیس بھری دیکھ کر انہیں صبح سے کئی بار دورے پڑ چکے ہیں۔ اور اس سے ایک دن پہلے روزن برگز کا واقعہ۔"

وکی بام کی نازک اندام بلونڈ ہیروئن جیسی مسز مور گشن نے چاء کی پیالی میز پر رکھی اور سنک پر جا کر منہ پر پانی کے چھپکے مارے۔ وہ موسم گرما کی ایک حسین شام تھی اور باہر پائیں باغ میں فرحت انگیز پھول کھلے تھے اور پرندے بسیرا لینے کے لئے درختوں کی طرف واپس آ رہے تھے۔ فطرت بے نیاز ہے۔

6۔ واٹرز آف دی مون

جیسا کہ میں نے انور جمال قدوائی کو مطلع کیا تھا۔ فلیٹ اسٹریٹ میں برصغیر کی واحد خاتون صحافی تھی۔ دوسری ایک معمر بنگالی خاتون ایلا سین (مسز ربڈ) برطانوی شہری تھیں۔ ان کے میاں انگریز تھے۔ تیسری کراچی کی دوست اور کیرالا کی رہنے والی جیہ بولٹ بھی برطانوی شہری تھی اور چند ماہ کے لئے ڈیلی ایکسپریس میں کام کر رہی تھی۔ اس کا دیور رابرٹ بولٹ ڈرامے لکھتا تھا (اور چند برس بعد برطانیہ کا نامی گرامی ڈرامہ نگار بننے والا تھا اور مشہور فلم اسٹار سیرہ مائلز کا شوہر۔) جیہ اور میں دوپہر کو ڈاکٹر جانسن کے تاریخی مکان کے زیر دیوار و معنز پریس کلب میں لنچ کھاتے تھے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کے ایک سینئر صحافی مار سلینڈ گینڈر جو مدتوں سے السٹرینڈ ویکلی آف انڈیا میں "لندن لیٹر" لکھا کرتے تھے۔ ہنی میں دریائے ٹیمز کے

کنارے رہتے تھے۔ اوکسفرڈ کیمبرج بوٹ ریس ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "تم اور مسز بولٹ اتوار کی صبح بوٹ ریس دیکھنے کے لئے سینچر کی شام کو میرے گھر آ جانا۔"

اسی زمانے میں ایک خوفناک شخص نے جو عورتوں کو قتل کرتا پھرتا تھا اور جس کا نام غالباً کرسٹی تھا انگلستان میں خوف اور دہشت پھیلا رکھی تھی۔ سارا اسکاٹ لینڈ یارڈ اس کے تعاقب میں تھا مگر وہ ہاتھ نہ آتا تھا۔

مسٹر مار سلینڈ گینڈر نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اسٹیشن پر کار لیکر آ جائیں گے۔ میں نے کہا ہم لوگ نجانے کون سی ٹرین سے کس وقت پہنچیں۔ آپ فکر نہ کیجئے ہم خود آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔
سینچر کی شام میں اور جیہ بولٹ ریل سے اتر کر مسٹر گینڈر کے بتائے ہوئے پتے پر ان کے مکان کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ سامنے ایک خوبصورت گھنا جنگل نظر آیا جس میں سے ایک پگڈنڈی گزر رہی تھی۔

"سڑک کا لمبا فاصلہ طے کرنے کی بجائے کیوں نہ جنگل جنگل نکل چلیں۔" میں نے جیہ سے تجویزا۔
شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ ہم دونوں نے اطمینان سے ٹہلتے ہوئے جنگل عبور کیا اور دوسری طرف نکلے۔ مسٹر و مسز مار سلینڈ گینڈر حواس باختہ اپنے مکان کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ مسٹر گینڈر کہنے لگے تم لوگوں کو آنے میں دیر ہو گئی۔ ابھی ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ کرسٹی بارنز کے علاقے میں روپوش ہے۔ ہمارا پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ "ابھی تمہاری تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ شکر ہے۔ شکر ہے۔"
اتوار کی صبح ہم لوگ بوٹ ریس دیکھنے میں مصروف تھے جب اطلاع ملی کہ کرسٹی پکڑا گیا۔ سینچر کی شام وہ ٹونٹی کے اسی تاریک جنگل میں چھپا ہوا تھا جس میں سے ہم دونوں احمق الذی مزے سے اٹکھ باشھ کرتے گزرے تھے۔

"خدا بیوقوفوں کی حفاظت کرتا ہے۔" جیہ نے گہرا سانس لیکر کہا۔
"فارن برا ائیر فیسٹیول میں۔" چچا صدیق نے کہا۔ "تازہ ترین موڈل کے عجیب و غریب برطانوی طیارے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سائنس نے کتنی ترقی کر لی اور دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ آپ یہ فیسٹیول ضرور دیکھ کر آئیے۔"

دوسرے روز علی نواب 'امینہ' پر میلا پرشاد (جو کوئن میری اسکول دہلی میں امینہ کے ساتھ پڑھ چکی تھی) اور میں نے فارن برا نامی قصبے کا رخ کیا۔ وہاں پر ایک میدان میں ہزارہا انگریز جمع تھا اور انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے طیارے۔ رائل باکس میں ڈیوک آف اڈنبرا مع شاہی خاندان کے چند افراد کے موجود تھے۔ میلے کے میدان میں جگہ جگہ ریفریشمنٹ کے شامیانے ایستادہ تھے۔ چہل پہل' مرد' عورتیں' بچے' صاف شفاف روشن دن۔ فوٹو گرافر تصویریں کھینچتے پھر رہے تھے۔ ہم چاروں ایک نیچی سی ٹیکری پر جا کر کھڑے ہوئے۔ ایک فوٹو گرافر نے ہماری تصویر کھینچی (جو اس کتاب میں شامل ہے) ہمارے چاروں طرف بہت بھیڑ تھی۔ سب کی میدان کی اور آسمان کی طرف نظریں۔ ہر چند منٹ بعد ایک طیارہ اڑ کر اوپر جاتا تھا۔

بعض طیارے لگتا تھا کہ بالکل کسی سائنس فکشن میں سے نمودار ہوئے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکرز پر ہر فوجی اور سویلین ایئر کرافٹ کی خصوصیت' رفتار اور پائلٹ کا نام اناؤنس کیا جا رہا تھا۔

پھر آسمانوں کا برطانوی ہیرو جان ڈیری اپنا طیارہ لے کر اڑا۔ چند لمحوں بعد دور بلندیوں سے دو مرتبہ گرجدار دھماکے کی آواز آئی۔ جان ڈیری نے ساؤنڈ بیریر توڑ دیا تھا۔ میدان میں تالیاں بجیں' پائلٹ زمین پر واپس آیا۔

جس جگہ ہم چاروں کھڑے تھے اس سے کچھ فاصلے پر ریفریشمنٹ کا شامیانہ تھا۔ علی نواب نے کہا۔

"چلو آئس کریم کھائی جائے۔"

ہم لوگ ٹیکری پر سے اتر کر ٹہلتے ہوئے شامیانے کی طرف چلے گئے۔ اس اثناء میں اناؤنسر کی آواز سنائی دی کہ جان ڈیری دوبارہ ساؤنڈ بیریر توڑنے جا رہے ہیں۔ ہم آئس کریم کھانے میں مشغول ہوئے۔ آسمان پر زوردار دھماکہ۔

پھر توڑا ساؤنڈ بیریر۔" پرمیلا نے کہا۔

ہم چاروں باتیں کرتے شامیانے سے باہر آئے۔ ایک اور دھماکہ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک سورج کے برابر گولہ' سرخ اور دہکتا ہوا' زنانے سے ہماری سمت آ رہا تھا۔ ایک لحظے کے لئے مجھے خیال آیا کہ اب شاید بمباری کی پریکٹس کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ یہ سردار جی کا لطیفہ ہو سکتا تھا۔ دوسرے لحظے دیکھا کہ جرمن بمباری کے سدھے ہوئے انگریز چاروں طرف اوندھے منہ زمین پر پڑے تھے۔ میں نے خود اوندھے منہ گرنے کے بجائے ادھر ادھر بھاگ کر امینہ اور پرمیلا کو پکارا کہ کہیں وہ نہ مر گئے ہوں۔ ابھی ابھی وہ تینوں ساتھ موجود تھے کہاں غائب ہو گئے۔ تیسری بار ساؤنڈ بیریر توڑتے ہوئے جان ڈیری کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو چکا تھا اور اس ایئر کرافٹ کے جلتے ہوئے ٹکڑے دور دور جا کر گر رہے تھے۔ وہ آتشیں کرہ جو میری سمت آتا نظر آیا تھا طیارے کا ایک انجن تھا جو آ کر عین اس ٹیکری پر گر کر زمین میں دھنستا چلا گیا جہاں صرف چند منٹ قبل ہم چاروں موجود تھے۔ اس ٹیلے کی جگہ چشم زدن میں ایک غار بن چکا تھا۔ اور تماشائیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

اگر صرف چند منٹ قبل علی نواب نے یہ تجویز نہ کیا ہوتا کہ چل کر آئس کریم کھائی جائے تو ہم لوگ بھی اس جگہ پر موجود ہوتے اور اب اس غار میں موت کی نیند سو رہے ہوتے۔

میں ہجوم میں تینوں کو تلاش کرتی پھرتی۔ اچانک پرمیلا پر شاد نظر آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ صحیح سلامت تھی۔ علی نواب اور امینہ بھی صحیح سلامت تھے۔ میرے بالکل نزدیک ایک زخمی انگریز عورت سکون سے گھاس پر بیٹھی کراہ رہی تھی۔ ریڈ کراس والے اسٹریچر لے کر سفید پوش جنات کی طرح نمودار ہوئے۔ منٹوں میں لاشوں اور زخمیوں کو خاموشی سے اٹھا کر غائب۔ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا مگر کوئی افراتفری' سراسیمگی یا شور و شغب نہیں۔ باقی تماشائیوں کا مجمع اسی طرح موجود۔ نہ بھگدڑ مچی نہ غل۔ اس روز میں انگریز قوم کے بلند کردار اور عالی ہمتی کی قائل ہو گئی۔

چند منٹ بعد لاؤڈ اسپیکرز پر نہایت میٹر آف فیکٹ الفاظ میں اناؤنس کیا گیا۔ "ہمارا بہادر ہوا باز جان ڈیری' ساؤنڈ بیریر توڑتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ لیکن سائنس نے ایسی ہی قربانیاں لیکر ترقی کی ہے۔ شو جاری رہے گا۔"

اس کے فوراً بعد دوسرے طیارے نے ٹیک آف کیا۔ دوسرے ٹسٹ پائلٹ نے آسمان پر جا کر آواز کی سرحد پار کی اور نیچے اتر آیا۔ لندن واپس پہنچ کر میں نے چچا صدیق کو فون کیا۔ انہوں نے کہا فوراً اسٹوڈیوز جا کر آنکھوں دیکھا حال ریکارڈ کروا دیجئے۔ ایسٹرن سروسز میں آپ کی ٹاک اس سانحے کی پہلی چشم دید رپورٹ ہو گی۔

دوسرے ہفتے جان ڈیری کی زندگی پر مبنی برطانوی فلم "ساؤنڈ بیریر" دیکھی جس میں ہیرو آواز کی سرحد توڑتے ہوئے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور یہ فلم جان ڈیری کے حادثے سے قبل بنی تھی۔

فارن برا ایئر فیسٹیول کے حادثے کے چند روز بعد عطیہ حبیب اللہ کے ہاں ڈنر تھا۔ سب لوگ کمرہ طعام میں جا چکے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں گیس کی انگیٹھی کے آگے کھڑی مینٹل پیس پر لگے بڑے آئینے میں لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی۔

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔ اتفاقاً اسی وقت عطیہ کمرے میں آئیں اور گھبرا کر بولیں۔

"آگ۔ تمہاری ساری میں آگ لگ گئی۔"

"تیسری بار بال بال بچی۔ کرشی۔ فارن برا۔ اور کل آگ۔" میں نے چچا صدیق سے کہا۔ "بعض لوگ ہوتے ہی ACCIDENT PRONE ہیں۔"

"وہ تو کہو ساری کا نچلا حصہ ہی جلا۔ خود بالکل محفوظ رہیں۔" فیروز بولی۔ "ورنہ حمیدہ علی ظہیر کا واقعہ یاد ہے۔ تہران میں ان کے کپڑوں میں اسی طرح آگ لگی' آدھا جسم جل گیا تھا۔"

"اسی وجہ سے ہم مرشد حلقہ آپ سب فقراء کی خیر و عافیت کے لئے وظائف پڑھتے رہتے ہیں۔" چچا صدیق نے کہا۔ موصوف ایک راسخ العقیدہ مارکسسٹ تھے گو فرنگی محل کے سند یافتہ بھی رہ چکے تھے۔ پھر اچانک بولے۔ "بڑے بڑے عالموں کی جھاڑ پھونک غباروں میں بند کر کے انڈیا پاکستان سے یہاں امپورٹ کی جائے۔"

"بہت نیک خیال ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "روز بروز زیادہ سے زیادہ سوامی اور یوگی یہاں چلے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مارکیٹ کورنر کر لیں۔"

"ہم نے ایک سائنٹیفک طریقہ سوچا ہے۔" چچا نے فرمایا۔ "بڑے مولاناؤں کی چار شلنگ کی پھونک۔۔۔ دو شلنگ کی پھونک سب غباروں میں بند کر کے فروخت کریں گے۔ آپ' فیروزہ اور امینہ مرشد بن سکتی ہیں۔"

"قطعی۔" میں نے جواب دیا۔ "دیکھئے پیرس میں مرشد عنایت خاں والا صوفی سنٹر کتنا اچھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اشرف آپ ہمارے سنٹر کی مینیجری قبول کریں گے؟" میں نے سامنے بیٹھے کنور محمد اشرف سے

دریافت کیا۔ انہوں نے اسی متانت سے اقرار میں سرہلایا۔

محمود نظامی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر حمید احمد خاں، قدرت اللہ شہاب اور جو کوئی شخص معقول کبھی اس طرف آنکلتا اس محفل میں شامل ہو کر مزید بصیرت حاصل کرتا تھا۔ ڈاکٹر اشرف ان دنوں میکبتھ ڈرامہ ترجمہ کر رہے تھے جسے ہم لوگ ہر ہفتے نشر کرتے تھے۔

"کل صبح ٹھیک دس بجے آجایئے گا۔ سر جارج ڈنڈاز کی تقریر ریکارڈ کرنی ہے۔ موصوف تقسیم کے وقت صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔" چچا صدیق نے یاد دلایا۔

"زندگی اس قدر پر خطر ہے۔ آجائیں گے، اگر کل صبح تک زندہ رہ لئے۔" میں نے جواب دیا۔

صبح پونے دس بجے لفٹ کے پاس تقی میاں کھڑے ملے۔ دو میمیں اور ایک ضعیف العمر انگریز جو برساتی اوڑھے کونے میں کھڑا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے تقی سے اردو میں کہا۔ "یہ اچھی مصیبت ہے۔ یہ گورنر صاحب اتنے سویرے کیوں آرہے ہیں۔ بے چارے کے پاس کوئی کام کرنے کو نہیں ہوگا۔ وہاں گورنری کرتے تھے۔ یہاں سور چراتے ہوں گے۔ کیمبرج میں ایک بوڑھا چاء فروش علاوہ بمبئی کا پریذیڈنسی مجسٹریٹ رہ چکا تھا۔ ارے اور تو اور تقی میاں! لیڈی ونگڈن بالکل باؤلی ہوگئی ہیں۔"

"لیڈی ونگڈن۔۔۔؟"

"لیڈی ونگڈن۔ میں نے خود دیکھا وکٹوریہ میں سڑکوں پر سے کاغذ کے ٹکڑے چنتی پھرتی ہیں۔ عبرت۔ اور یہ صاحب جو آنے والے ہیں، یقیناً کسی گاؤں میں سور چراتے ہوں گے۔"

لفٹ نیچے آیا۔ ہم لوگ، دونوں میمیں اور انگریز پیر مرد اس میں داخل ہوئے۔ چوتھی منزل پر میں اور تقی دفتر کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ سوا دس بجے نیچے اسٹوڈیو میں گئے۔ وہ انگریز پیر مرد اپنی تقریر لئے میز کے سامنے صبر سے بیٹھا تھا۔ میری نظر اسکرپٹ پر پڑی تو سٹی گم ہوگئی۔ تقریر اردو میں تھی۔ اردو سیکشن کے انچارج نے اندر آکر تعارف کروایا۔ سر جارج ڈنڈاز۔ سابق گورنر صوبہ سرحد۔

زندگی اس قدر پر خطر ہے کہ اس کا کوئی حد و حساب ہی نہیں۔

اردو سیکشن کے فرنگی انچارج مسٹر ڈین پنجاب پولیس میں رہ چکے تھے اور ان کے پردادا دلی میں مرزا غالب کے دوست تھے۔ ڈین صاحب کے پاس ایک صندوقچہ تھا جس میں مرزا غالب کے چند تبرکات موجود تھے جو مرزا نوشہ نے ڈین صاحب کے پردادا کو دیئے تھے۔ راز بھائی ڈین صاحب کو اپنے شعر سنایا کرتے تھے۔ راز بھائی معہ حسنہ بھابی و اولاد تین سال کے لئے ریڈیو پاکستان سے بی بی سی آچکے تھے اور حرام حلال کی فکر میں مبتلا مستقل آئس کریم کھایا کرتے تھے۔

ایک گدبدی سی سانولی سلونی اردو شاعرہ ایک ایسی پر اسرار خاتون تھیں جو ایک فیشن ایبل مہنگے علاقے میں رہتی تھیں۔ بہت بری طرح کار چلاتی تھیں۔ اس سے بری طرح غزلیں کہتی تھیں۔ بیرسٹری پڑھ رہی تھیں اور ہماری خفیہ خبر رساں ایجنسی کے مطابق اگلے وقتوں کی ایک مشہور فلم اسٹار کی ہمشیر خورد تھیں۔

ایک سہانی نیلگوں شام عطیہ فیروز اور میں بی بی سی پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جناب ساجد علی خاں راز مراد آبادی برساتی اوڑھے احباب کو راستے کے لئے پان کی گلوریاں تقسیم کر رہے ہیں اور سارا قافلہ برساتیاں اوڑھے چھتریاں سنبھالے کہیں چلنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ صدیق احمد صدیقی نے کہا۔ "تم لوگ بھی راز مراد آبادی کے طفیلیوں میں شامل ہو جاؤ۔ بہت بڑھیا دعوت کھانے کو ملے گی۔"

"ضرور بالضرور۔" میں نے کہا۔

راز بھائی مراد آبادی قدامت پسندی کے ساتھ جھنجلا کر بولے۔ "یہ کیا لغویت ہے۔ وہاں تم لوگوں کا کیا کام۔ مردانہ مشاعرہ ہے۔"

"اب تو ہم ضرور جائیں گے۔" فیروز نے جواب دیا۔ "مگر جا کہاں رہے ہیں؟"

قافلہ ایک مہنگے محلے کے شاندار بلاک کے شاندار فلیٹ پر پہنچا۔ ایک انگریز بٹلر نے دروازہ کھولا۔ سب لوگوں کا وہاں پہلی بار جانے کا اتفاق تھا اس لئے سب متحیر تھے۔

میزبان خاتون (کارچوبی ساری، بالوں میں پھول، کسی پرانے ناول کی ہیروئن جن کا تعلق 1930ء کی دنیا سے تھا) نے استقبال کیا۔ لیکن تین بن بلائی خواتین کو دیکھ کر وہ زیادہ مسرور نظر نہ آئیں۔ بڑے پر تصنع انداز سے خوش آمدید کہا۔ شاندار سروس فلیٹ۔ ایرانی قالینوں سے مزین۔ انگریز بٹلر نے ڈنر سرو کیا جانے کیا چکر تھا۔

کھانے کے بعد ہم لوگ "مشاعرے" کے لئے قالینوں پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میزبان خاتون پاندان سامنے رکھے گلوریاں بنانے میں مصروف۔ ناک میں ہیرے کی لونگ جگمگا رہی تھی۔ "میں سمجھتی ہوں کلکتہ والی گوہر اسی قسم کی فیسی نیٹنگ ہستی رہی ہوگی۔" عطیہ نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

"مہاکوی کالی داس فرما گئے ہیں۔" میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "کہ گرہستنوں اور شریف زادیوں کو ارباب نشاط ہمیشہ فیسی نیٹ کرتی ہیں۔"

"کل شمشاد بائی کا گانا سننے چلئے گا؟" یاور عباس نے جو نوابی اسٹائل سے قریب متمکن تھے چپکے سے دریافت کیا۔ "وہ اپنی نواسی سے ملنے آئی ہوئی ہیں جو یہاں اسکول میں پڑھتی ہے۔"

"ضرور۔" میں نے مستعدی کے ساتھ جواب دیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" راز بھائی نیچی آواز میں خفگی سے بولے۔ "اب تم مجرا سننے بھی جاؤ۔ میں ہرگز اس کی اجازت نہ دونگا۔"

"نہایت معقول محفل ہوگی۔ ڈاکٹر لف و نشر غیر مرتب صدارت کریں گے۔ فلاں صاحب کے ہاں۔" یاور عباس نے کہا۔

"اگر ڈاکٹر صاحب وہاں آرہے ہیں تو ضرور بجد نفیس محفل ہوگی۔ ہم تو ضرور جائیں گے۔ ہم نے آج تک مجرا نہیں سنا۔ خدا کی قدرت ہے کہ لندن آکر شمشاد بائی اور ہمشیر فلاں بائی کی صحبتیں میسر آرہی ہیں"۔ میں نے کہا۔

ڈاکٹر لف و نشر غیر مرتب اورینٹل اسکول میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ میرے بچپن میں دہرہ دون میں رہ چکے تھے۔ وہ اور ان کی بیوی ابا جان اور اماں کے دوستوں میں سے تھے۔ بہت ہی سوئیٹ اور وضعدار انسان تھے۔ بی بی سی کے اردو شاعروں کی صدارت ہمیشہ آپ سے کروائی جاتی تھی۔ اور ہمیشہ اپنی تعارفی تقریر کا آغاز اس جملے سے کرتے تھے۔ "لندن کی سنگلاخ زمین میں آج شام گلشن غزل کی آبیاری کے لئے۔" اور اشعار کی دادیوں دیتے تھے۔ "سبحان اللہ کیا لف و نشر غیر مرتب استعمال کی ہے۔ کیا صنعت فلاں کو انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑا ہے" وغیرہ۔

"اس وقت ڈاکٹر صاحب کی کمی بہت کھل رہی ہے۔" فیروز نے کہا۔

محمد علی خان ملیح آبادی نے (جو جنگ آزادی لڑنے انگلستان آئے تھے اور گزشتہ چالیس ۴۰ سال سے یہیں رہتے تھے اور بی بی سی اردو سیکشن کی ایک خاص بیحد دلچسپ شخصیت تھے) رکھائی سے کہا۔ "بی بی صاحبہ۔ آپ نے کھانا کھلا دیا۔ اب اپنا کلام بھی سنا دیجئے۔"

میزبان خاتون نے اپنی نہایت صبر آزما غزلیں سنائیں۔ پھر راز بھائی نے ان کا کلام سنا گیا۔

رات کا ایک بج گیا۔ راز بھائی چونک کر بولے۔ "اماں۔ میں نے کہا اب بسیں وسیں تو بند ہو گئی ہوں گی۔" میزبان خاتون نے راز بھائی سے کہا۔ "میں آپ کو کار سے گھر پہنچا دوں گی۔"

محمد علی خان ملیح آبادی ترشی سے بولے۔ "بی بی صاحبہ۔ ہم لوگ کیا پیدل جائیں گے؟ ہم نے آپ کا کلام سنا۔ اب آپ ہمیں گھر پہنچائیے۔"

ہم لوگ نیچے اترے۔ تقی اور اعجاز نے چپکے سے کہا۔ "ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں۔ ہم پیدل جاتے ہیں۔" اور کہرے میں غائب ہو گئے۔ میزبان خاتون نے بقیہ مہمانوں کو اپنی طویل بڑھیا کار میں بھرا اور بے تحاشا ڈرائیو کرتی ہوئی چلیں۔ راز بھائی نے زیر لب آیت الکرسی پڑھنا شروع کی۔

زندگی بے حد پر خطر تھی۔

عطیہ حبیب اللہ' صدیق احمد صدیقی' راز بھائی' یاور عباس' امجد علی' نور محمد چوہان اور محمد عاقل کے علاوہ اب تقی احمد سید بھی بی بی سی کے "ہول ٹائمز" ہو چکے تھے' یاور عباس دودمان میر انیس سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے فوج میں میجر تھے۔ بیوی انگریز تھیں۔ جن سے جنگ کے بعد جاپان میں شادی کی تھی۔ بہت خوب گاتے تھے۔ محمد عاقل نقل نویس تیس سال سے لندن میں مقیم تھے۔ بہت سے پاپڑ بیل چکے تھے۔ ایک ولایتی سرکس میں بھی کام کیا تھا ان کی بیوی سفید روسی تھیں۔

"پارٹ ٹائمز" میں امینہ احمد' فیروز جبیں' اعجاز بٹالوی' انور اور غزالہ انصاری' ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی' محمد علیخان ملیح آبادی' ڈاکٹر اجمل' ڈاکٹر محمد اشرف وغیرہ شامل تھے۔ باقی لوگ کمپتمایئز رتھے کہ کبھی کبھار آنکلتے تھے۔ میں آرٹ کی نمائشوں وغیرہ کا ہفتہ وار راؤنڈ اپ' نئی انگریز کتابوں پر تبصرہ' مختلف واقعات اور موضوعات پر "ٹاک" وغیرہ فرماتی تھی۔ اور انٹرویو۔ بحث مباحثے۔ ڈرامے۔ جو بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ سارے پروگرام LIVE ہوتے تھے۔ ڈراموں کی ریہرسل کے دوران چچا صدیق اسٹوڈیو کی

دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ جاتے اور کبھی کبھی کہتے۔ "بٹیا مکالمے میں ڈرامہ ذرا زیادہ ڈالو۔"

تمثیلوں کی LIVE براڈکاسٹ کے دوران تقی میاں اسٹوڈیو کے ایک کونے میں جا کر سنجیدگی سے کہتے۔ "اچھا جا رہا ہے۔"

کینڈڈا وغیرہ قسم کے طویل ڈرامے بالاقساط نشر کیئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اشرف نے میکبتھ ترجمہ کیا جو پانچ قسطوں میں نشر ہوا۔ عطیہ حبیب اللہ لیڈی میکبتھ تھیں۔ پریم بخشی میکبتھ۔ فیروز' امینہ اور میں چڑیلیں۔ اعجاز بٹالوی راوی جو ہر قسط کے آغاز میں ایک عبارت دہراتے تھے۔ "یہ داستان پانچ سو سال پرانی ہے۔" سنتے سنتے ہم لوگوں کو پوری عبارت رٹ گئی تھی اور ہر مرتبہ سن کر ہنسی کا دورہ پڑتا تھا۔

ڈاکٹر اشرف مرحوم جو پاکستان سے جلاوطن کر دیئے گئے تھے بہت عسرت میں گزر بسر کر رہے تھے۔ چچا صدیق ان کو پروگرام دیتے رہتے جو ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ شکستہ جوتے' بوسیدہ کپڑے۔ وہ جید عالم اپنا زیادہ وقت برٹش میوزم میں صرف کرتا۔

ڈاکٹر اشرف دنیا کا تجربہ کر چکے تھے۔ ہماری لونڈہار پارٹی کا بے فکری کا زمانہ تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ سوائے اصولی فکروں کے' یعنی یہ کہ دنیا میں امن قائم ہو جانا چاہیئے۔ سماجی اور معاشی برابری ضروری ہے' وغیرہ۔ اور کوئی پریشانی نہ تھی۔ میں اور امینہ اکثر سڑک پر یا ٹیوب ٹرین میں گاتے چلتے۔ ہندوستانیوں' پاکستانیوں کی تعداد اس زمانے میں بہت کم تھی۔ چاروں طرف انگریز' کوئی مضائقہ نہ تھا۔ سامنے سے کسی ہم وطن کو آتے دیکھ کر فوراً خاموش ہو جاتے۔ "منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے۔" پسندیدہ قوالی تھی جو ہم دونوں اکثر گایا کرتے تھے۔ جو ہم وطن امینہ سے واقف نہ تھے اسے انگریز لڑکی سمجھتے تھے۔ اس کی موجودگی میں آپس میں اردو میں گفتگو کرتے ہوئے کوئی ناشائستہ بات کہہ جاتے اور دفعتاً دلی کی زبان میں اس کی ڈانٹ پھنکار سنکر ششدر رہ جاتے۔

چچا صدیق ہمارے حلقے کے نظریہ ساز اور فلسفی تھے۔ ان کا ایک مقولہ یہ تھا کہ لندن میں ہر کالنیئن دوسرے کالیئن کو کالیئن سمجھتا ہے۔ ہم لوگوں کا ایک بہت بلیغ ریمارک تھا۔ فلاں اچھے جا رہے ہیں' اعجاز آجکل اچھے جا رہے ہیں۔ تقی اچھے جا رہے ہیں۔ فلاں بھی برے نہیں جا رہے۔ کبھی کبھی چچا بیٹھے بیٹھے اچانک کہتے۔ "کوئی ایسی بات کرو' دل میں جا کر ٹن سے لگے۔"

عیدین کے مواقع پر سارا مسلمان کالیئن ووکنگ کی مسجد میں جمع ہوتا تھا۔ ایک عید الفطر پر میں اور امینہ ٹرین سے ووکنگ جا رہے تھے۔ ڈبے میں چند کالیئن فوجی افسر سوار تھے وہ بھی ووکنگ جا رہے تھے۔ دور سے مسجد کے گنبد نظر آئے۔ امینہ نے پہلے اس مسجد کے بارے میں ای ایم فاسٹر کا مضمون جو وہ ساتھ لائی تھی پڑھا پھر اچانک نہایت جذبے سے کہنا شروع کر دیا۔ "دی اذانیں کبھی یوروپ کے کلیساؤں میں۔" کالیئن افسروں نے انگشت بدنداں ہو کر اسے دیکھا۔ اسٹیشن آ چکا تھا۔ ہم لوگ جلدی سے پلیٹ فارم پر کود گئے۔

اباجان 1924ء کو بقرعید کے روز ووکنگ کی مسجد میں آئے تھے۔ اور اماں کو خط میں لکھا تھا۔

"مسجد میں ہندوستانی' انگریز مسلمان' ترک' عرب' مصری سب تھے۔ خواجہ کمال الدین کے لڑکے نے نماز پڑھائی اور انگریزی میں وعظ کہا۔"

آج تقریباً تیس سال بعد اس سے کہیں زیادہ بڑے مجمع میں ایک اور مسلمان قوم کا اضافہ ہو چکا تھا۔

غراروں اور شلواروں میں ملبوس پاکستانی خواتین اور سفید شلوار سیاہ شیروانی اور جناح کیپ پہنے پاکستانی حضرات سبزے پر بکھرے ہوئے تھے۔ مسجد کا باغ افراط گل اور چہل پہل کی وجہ سے روضہ رضواں معلوم ہو رہا تھا۔

سیاہ شیروانی' علی گڑھ کٹ پائجامے میں ملبوس ایک نوجوان ہجوم میں سے نکل کر آیا اور زور سے سلاں علیکم کا نعرہ لگایا۔

"ارے۔ علی نواب!۔" میں نے تعجب اور خوشی سے کہا۔

الن ماموں کے برادر نسبتی' آصفہ ممانی کے برادر خورد اور چنڈو خانے کے استاد سید علی نواب 1948ء کے موسم گرما میں ایک دن الن ماموں کے احدی کلب' مارٹن روڈ' کراچی' کے ایک کھوٹے سے چھلانگ لگا کر کاکل ملٹری اکیڈیمی اڑنچھو ہوئے تھے۔ اس لمحے بحیثیت کیپٹن علی نواب ووکنگ کے باغ میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے خاندان کی تازہ ترین خبریں گوش گزار کیں۔ "کل شام ہی کراچی سے خط آیا ہے۔ نذر خالہ نے ہماری نسبت ایک سرحدی لیڈی ڈاکٹر سے طے کر دی ہے۔ وہ نورافشاں کے بیچ کی لڑکی ہے۔ رضیہ نام ہے۔ فوج میں کیپٹن ہے۔ دوسری اطلاع یہ ہے کہ پارے کینیڈا جا رہے ہیں۔ تیسری خبر یہ کہ اچھو کی شادی ہو گئی۔ چوتھی اطلاع یہ کہ آپا عذرا کو لندن یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور وہ عنقریب یہاں آنے والی ہیں۔"

"آپا عذرا ایک ابوالحسن تا ناشاہ خاتون ہیں۔" میں نے فکر سے کہا۔ "یہاں بہت بے دماغ ہوں گی"۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے لندن انہیں خوش آئے گا۔" علی نواب نے جواب دیا۔

۷۔ "پانچ سو پاؤنڈ سالانہ اور اپنا کمرہ"

اسٹریٹ فرڈاؤن ایون کی ایک خاموش سڑک پر سید علی نواب نے' جو تین سالہ فوجی کورس کرنے برطانیہ آئے ہوئے تھے۔ اپنی ے فلاور روک کر کہا۔ "بس وہ جو اس فٹ پاتھ پر پریم کھڑی ہے اس کے پاس چلی جاؤ"

ہم لوگوں نے کار سے اتر کر سڑک پار کی۔ اس دوران میں میم اپنے بچے کی پریم گاڑی دھکیلتی آگے چل پڑی۔ میں فوراً اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ امینہ اور اس کی کلاس فیلو چودھری خلیق الزماں کی بھانجی

اختر وسیم ہمراہ۔ چلتے چلتے ہم لوگ سڑک کے نکڑ پر جا پہنچے۔ بہت فاصلے پر کیمرہ سنبھالے علی نواب متحیر کھڑے رہ گئے۔ پھر کار لیکر پیچھے پیچھے آئے۔ میم نے ایک دوکان کے سامنے پریم کھڑی کر دی۔ ہم تینوں بھی وہیں ٹھٹھک گئے۔ میم نے گاڑی آگے بڑھائی۔ ہم دوبارہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ علی نواب نے کار قریب لا کر ہارن بجایا۔ ہم لوگوں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ انہوں نے جھنجلا کر دریافت کیا۔ "یہ آخر آپ لوگ جا کہاں رہی ہیں؟"

"تم نے کہا تھا کہ پریم کے پاس جاؤ۔" میں نے یاد دلایا۔

علی نواب نے سر پکڑ لیا۔ "اب تک تمہاری عقل کا وہی عالم ہے۔ انگلینڈ کچھ نہ بگاڑ سکا"۔

"دنیا کا کوئی ملک"۔ میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔ "ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپا عذرا کو دیکھو"۔

عذرا آپا یونیورسٹی میں داخل ہو چکی تھیں۔ رسل اسکوائر میں رہتی تھیں۔ دو تین Digs تبدیل کیں جو ان کی طبیعت کے موافق نہ نکلیں۔ ایک شام رسل اسکوائر کے ایک ریسٹوران میں ان سے ملاقات ہوئی۔ جب وہ اپنی چوتھی Digs چھوڑنے والی تھیں اور بہت پریشان تھیں۔ اتنے میں ایک الجھے ہوئے سرخ بالوں والی خاتون جو بقول اماں بالکل بھابھڑا بھوت لگ رہی تھی' طعام خانے میں داخل ہوئی۔ یہ خاتون ایک خاصی معروف ادبی نقاد اور ڈی لن طامس کی ذاتی دوست تھی۔ گرین پارک میں جو فرنگیوں کا حلقۂ ارباب ذوق تھا جسے وہ "کونسل آف کنٹمپریری آرٹس" کہتے ہیں وہاں اعجاز بٹالوی اور ڈاکٹر حایا کاف مین (اب مرحومہ) کے ساتھ کبھی کبھار ڈیوڈ ڈاشیز یا آئی۔ اے رچرڈز یا دوسرے نقادوں کی تقریریں سننے جایا کرتی تھی اور وہاں اس خاتون سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی والدہ بھی اپنے زمانے کی "بلومزبری[6] ٹائپ تھیں۔

میں نے آپا عذرا سے کہا۔ "یہ خاتون اسی محلے میں رہتی ہے یہاں کسی اچھے بورڈنگ ہاؤس کا پتہ ضرور جانتی ہو گی۔ ابھی معلوم کرتی ہوں"۔

میں اس کی میز پر گئی اور اسے مدعا بتایا۔ وہ نقاد خاتون اکل و شرب کر کے آ رہی تھی۔ ڈبڈبائی ہوئی قدرے سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ایک پتہ لکھ کر دیا۔ "بہت اچھی جگہ ہے۔ میری والدہ بھی وہیں رہتی ہیں۔" اس نے کہا اور دوبارہ جام ے کی طرف متوجہ فرمائی۔

میں نے اپنی میز پر واپس آ کر کہا۔ "لیجئے آپا۔ کام بن گیا۔ اس نامی گرامی نقاد کی والدہ بھی اسی مکان پر رہتی ہیں۔ یقیناً بہت آرام دہ اور معقول جگہ ہو گی۔ بس اگلے ہفتے ہی وہاں شفٹ ہو جایئے"۔

دوسرے ہفتے صبح صبح آپا ڈی لن طامس کی گرل فرینڈ کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچیں۔ ریسپشن کلرک نے ذرا تعجب سے ان کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیا آپ کو یقین ہے آپ اسی جگہ رہنا چاہتی ہیں؟"

آپا نے سمجھا شاید یہ سوچتا ہے جگہ بہت مہنگی ہے اور ایک پاکستانی طالب علم اس کا کرایہ ادا نہ کر سکے۔ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ بالکل۔ مس فلاں نے ری کمنڈ کیا ہے"۔

"ویری ویل۔" کلرک نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ پیشگی کرایہ لیا اور کمرے کی کنجی تھما دی۔ کرایہ واقعی بہت زیادہ تھا۔ کلرک نے کہا۔ "اس میں کھانا اور ناشتہ بھی شامل ہے۔ آپا نے اطمینان کا سانس لیا کہ کھانا پکانے کے جھنجھٹ سے فرصت ملی۔ رات کو مع رعنا و اسباب وہاں منتقل ہو گئیں۔

صبح کو نیچے ڈائننگ ہال میں بریکفاسٹ کا گھنٹہ بجا۔ رعنا کے ساتھ گئیں۔ طویل میز کے دونوں طرف جو لوگ آ آ کر بیٹھ رہے تھے ان کی اوسط عمر اسی برس تھی۔ آپا نے انگریز قوم کی ہمت پر عش عش کیا کہ اس پیرانہ سالی کے باوجود یونیورسٹی میں پڑھنے آئے ہیں۔ ایک کرسی پر بیٹھیں۔ رعنا کو برابر بٹھالا۔ دائیں طرف کی کرسی پر سے ایک نوے سالہ ضعیف نے کہا۔ "گڈ مارننگ۔ مجھے اپنا تعارف کروا کے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ میں ملکہ تبت ہوں۔ شی [7]"۔

آپا عذرا نے مسکرا کر جواباً گڈ مارننگ کہا اور دوسری طرف دیکھا۔ سامنے بیٹھا ایک پچانوے سالہ بوڑھا بڑی شولری سے جھک کر بولا۔ "ویلکم یور ہائی نس۔ آپ مہارانی آف ہو دھپور ہیں نا؟ جب میں ایر ناٹنٹین اوون میں مہاراجا آف اودے پور کا سکر ٹیری تھا"۔

آپا عذرا نے بسرعت ناشتہ ختم کیا اور رعنا کی انگلی تھام کر باہر بھاگیں۔ گیلری میں سے ایک پہیوں والی کرسی ایوان طعام میں لائی جا رہی تھی۔ اس کرسی پر ایک اور ضعیف بیٹھی تھی جس کے سرخ بھرے بال تھے۔ ہاتھ میں یلو [8] بک کی ایک جلد۔ وہ یقیناً ڈی لن طامس کی گرل فرینڈ کی "اولڈ بلومزبری ٹائپ" والدہ تھی۔

آپا ریسپشن پر پہنچیں۔ کلرک نے مسکرا کر گڈ مارننگ کہا۔ آپا بولیں۔ "میں فوراً یہاں سے جانا چاہتی ہوں"۔ کلرک نے کہا۔ "مجھے پہلے ہی تعجب ہوا تھا کہ آپ اس اولڈ پیپلز ہوم میں کیوں رہنا چاہتی ہیں"۔

"مس فلاں نے اس کا پتہ دیا تھا"۔ آپا نے جواب دیا۔

"اوہ...... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مس فلاں چوبیس گھنٹے نشے میں غرق رہتی ہیں؟"

آپا عذرا کو بالآخر ایک حسب الخواہ فلیٹ مل گیا۔ سعید بھائی ہر تیسرے چوتھے مہینے کراچی سے آجایا کرتے تھے۔ پھر بھائی اطاعت حسین جو ہر سال یو۔ این۔ سیشن کے لئے نیویارک جاتے تھے۔ پاکستان کے کونسل جنرل ہو کر کراچی سے سان فرانسسکو چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد آپا نفیسہ' نوشابہ (نشو) رعنا (رانی) اور دوسرے بچے لندن ٹھہرتے ہوئے بذریعہ بحری جہاز امریکہ روانہ ہوئے۔ پارے میاں ان کے ہمراہ تھے۔ وہ پاکستان ریلویز کے شعبہ انجینئرنگ سے مستعفی ہو کر مک گل یونیورسٹی میں پڑھنے کی غرض سے مونٹریال جا رہے تھے۔

مرزا ماموں جان اور نسیمہ ممانی اپنی بچی نادرہ عرف منو کو ایک کانونٹ اسکول میں داخل کرانے انگلستان لائے نادرہ ماری پور میں نور افشاں کی چھوٹی بہن صبیحہ عرف رانی کی بہت سخت دوست اور ہم جماعت تھیں۔ وہ دونوں وہاں سینٹ پیٹرکس کانونٹ میں پڑھا کرتی تھیں۔ آپا راضیہ کی تربیت کی وجہ سے

رانی بے انتہا مذہبی اور نمازی بی بی تھیں۔ انہوں نے چلتے وقت نادرہ کو چند پند و نصائح کئے تھے جو وہ گرہ میں باندھ کر لندن لائی تھیں۔ رانی کہتی تھی۔ رانی کہتی تھی۔ ولایت کے کانونٹ میں جب فادر اور ننز کہیں' جیزس خدا کا بیٹا ہے۔ تم دل میں فوراً کہنا۔ نعوذباللہ۔ اور فوراً کلمہ پڑھنے لگنا۔ اور جب Nuns کہیں خدا تین ہیں تو تم دل میں فوراً کہنا لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔"

آٹھ سالہ صبیحہ زیدی نے آٹھ سالہ نادرہ [9] مرزا کو بالکل مولون بنا کر انگلستان بھیجا تھا۔

میں مسٹر مور گشن کے مکان سے میڈا ویل کے نزدیک سینٹ جانز ووڈ کے ایک بہت خوبصورت مکان میں منتقل ہو چکی تھی۔ نمبر24 گریول پیلس کا FlatLet ملحق کچنٹ اور باتھ روم اور کرایہ محض پانچ گنی ہفتہ کہ سستا سماں تھا۔ نسیمہ ممانی' ماموں جان نے چند روز میرے ہاں ٹھہر کر تلاش مکان شروع کی۔ ایک روز نزدیک پر فضا ہیمپسٹڈ میں لوگ پاپیادہ چلے جاتے تھے کہ ایک پھاٹک پر ایک خوجہ بوہرہ قسم کے نام کا بورڈ نظر آیا۔ ایک انگریز خاتون پورچ میں کھڑی اپنے ہندستانی شوہر کو ڈانٹ رہی تھیں' جو کھرپی لیئے باغیچے میں گھاس کھود رہے تھے۔ میں نے کہا ان کے بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ لینڈلیڈی ہیں۔ میاں بیرسٹری پڑھنے آئے ہوں گے۔ لینڈلیڈی کی لڑکی سے شادی کر کے یہیں رہ پڑے۔

ہم لوگ فوراً اندر گئے۔ میم صاحب سے دریافت کیا۔ قیاس صحیح نکلا۔ فوراً بیڈ اینڈ بریکفاسٹ کا نرخ بتایا اور یہ کہ رات کو آپ کے ہاں کوئی مہمان نہیں ٹھہرے گا۔ میاں بدستور سر جھکائے گھاس کھودا کیے۔ لینڈلیڈی اندر لے گئیں۔ نسیمہ ممانی سے کہا۔ "آپ میرے باورچی خانے میں کپڑے بھی نہیں دھوئیں گی۔ وہاں صرف میں کپڑے دھوتی ہوں"۔

نسیمہ ممانی نے چھت کو دیکھا۔

معاملہ بخیر و خوبی طے ہونے پر ہم لوگ باہر نکلے۔ سڑک پر آ کر ماموں جان نے کہا۔ "بے چارے کے ماں باپ نے کن ارمانوں سے بیٹے کو پڑھنے بھیجا ہو گا' اس نے لیکے دھوبن سے شادی کر لی"۔

جب ماموں جان' نسیمہ ممانی اس مکان میں منتقل ہوئے اس عورت نے پر پرزے نکالے۔ رات کو دس بجے کے بعد بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی کہ کوئی مہمان تو نہیں ہے جو رات کو وہاں ٹھہر جائے۔

ایک مرتبہ نسیمہ ممانی کے ہاں رات زیادہ آگئی۔ نسیمہ ممانی نے کہا۔ "یہیں ٹھہر جاؤ"۔ میں نے کہا۔ "دھوبن مار ڈالے گی"۔

اسے جل دینے کی ترکیب سوچی گئی۔ ٹھیک دس بجے شب میں گیلری سے نکل کر پورچ میں گئی۔ وہاں سے باآواز بلند ماموں جان کو گڈ نائٹ کہا۔ انہوں نے اتنی ہی اونچی آواز میں جواب دے کر دروازہ بھڑ سے بند کر لیا۔ میں باغ میں اتر کر دریچے پر پہنچی۔ جہاں نسیمہ ممانی اندر مستعد کھڑی تھیں۔ ایک گملے پر پاؤں ٹکا کر اندر کود گئی۔ صبح اس سے قبل کہ دھوبن کا بے چارہ شوہر (جس کے والد بمبئی کے ایک بقید حیات نامور مسلمان لیڈر تھے)۔ بریکفاسٹ کی کشتی لیکر حاضر ہو میں دریچے سے باہر کود کر سرپٹ گریول پیلس کی طرف بھاگی جو پڑوس میں تھا۔

چند روز بعد ماموں جان نے بتایا۔ "ہم نے آج ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھ کر اسی بوڑھے ڈاکٹر کو فون کیا جو کالج میں ہمارا استاد تھا اور ہم اس کے ہاں پی۔ جی رہتے تھے۔ وہ زندہ ہے۔ اب مزویل ہل پر رہتا ہے۔ اب اس کا لڑکا ڈاکٹر ہے۔ بڑے میاں نے بہت خوشی سے کہا کہ ہم لوگ کرائے دار نہیں رکھتے مگر تم میرے پرانے طالب علم ہو ضرور آجاؤ"۔

خوش منظر مزویل ہل پر سفید لیس کے پردوں اور کٹ گلاس سے مزین' متمول گھر میں چرمی صوفہ چیر پر بیٹھا مفلوج بوڑھا ڈاکٹر اپنے سابق شاگرد سے مل کر بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ اس کی بیوی نے مجھ سے کہا۔ "میں نے تم کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ ہاں' یاد آگیا۔ ٹی۔ وی پر دیکھا تھا۔ تاجپوشی کے پروگرام میں"۔ بوڑھے ڈاکٹر نے سرہلا کر تاسف سے کہا۔ "ایمپائر ختم ہوگئی۔ تاجپوشی کا تماشا کرکے خوش ہولیئے۔ تم لوگ آزادی حاصل کرکے چین سے ہو؟۔ میرا لڑکا تقسیم کی خونریزی کے زمانے میں ہندوستان میں تھا۔ فوجی ڈاکٹر تھا"۔

اور اتوار کی ایک نقرئی صبح جب بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک پکچریسک پہاڑی پر ایستادہ سینما ہاؤس میں "ہنیس کرسچین اینڈرسن" دیکھا جس میں ڈینی کے گاتا تھا۔ "ونڈر فل۔ ونڈر فل کوپن ہاگن"۔ اور دنیا بہت ہی خوبصورت اور خوشگوار اور فرحت بخش تھی۔ اور "ونڈر فل۔ ونڈر فل۔ کوپن ہاگن"۔ گنگناتے ہیں۔ اور نسیمہ ممانی دوسرے روز گرین لائن کی کوچ پکڑ کر سرے کے ایک نظر فریب گاؤں کو بھاگ گئے۔ جہاں وسیع سبزہ زار کے وسط میں ایک بھورا سرد کانونٹ اسکول بارش میں بھیگ رہا تھا۔ ہال کے چکیلے چوبی فرش پر عیسیٰ و مریم کی مورتیوں کے سامنے جلتی شمعوں کی روشنی منعکس تھی۔ اور طویل دریچوں کے باہر شاہ بلوط کے درختوں پر پانی برس رہا تھا اور سیاہ لبادے والی ایک بوڑھی راہبہ آستینوں میں ہاتھ دیئے سائے کی طرح چلتی ایوان نشست میں آئی اور نادرہ کے داخلے کے فارم پیش کئے۔ واپسی پر ہم لوگ سبزہ زار کی طویل سرمئی سڑک پر چلتے گاؤں کی سمت جا رہے تھے۔ پیچھے سے ایک کار آکر رکی اور ایک بیحد خوش شکل نوجوان راہب نے لفٹ دینے کی پیش کش کی۔ وہ راہب ڈینی کے سے زیادہ خوبصورت تھا اور ماموں جان کی نصیحت یاد آئی اور کسی اجنبی سے بات نہ کرتا مگر نسیمہ ممانی نے آہستہ سے اردو میں کہا۔ "یہ غریب تو فادر ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں"۔

اور نسیمہ ممانی کے والد مسٹر جسٹس محمد جان اپنی پوتے کا داخلہ ہیرو میں کرانے راولپنڈی سے آئے ہوئے تھے۔ ہیرو میں "ٹام براؤنز اسکول ڈیز" والی فضائیں ابھی باقی تھیں۔ وہاں سے واپسی پر لندن کے قریب پہنچ کر ہم لوگ ایک انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن میں گئے۔ اور وہ رات کی آخری ٹرین تھی اور طویل کمپارٹمنٹ میں ہم لوگوں کے علاوہ پانچواں آدمی اور کوئی نہ تھا۔ اور عین دریائے ٹیمز کے نیچے پہنچ کر کسی خرابی کے باعث گاڑی اچانک رک گئی۔ اور بہت دیر رکی رہی۔ یکلخت سردی اور نمی کا احساس ہوا۔ میں نے نسیمہ ممانی کے والد سے کہا۔ "ہمارے سروں کے اوپر سے دریا گذر رہا ہے"۔

"الامان والحفیظ۔" انہوں نے جواب دیا۔ "اوپر دریا۔۔ اور سرنگ میں سامنے سے کوئی اور ٹرین

آرہی ہو' بے قابو ہوئی ہوئی۔ اللہ رحم کرے"۔

"مگر ذرا غور کیجئے آغاجی' دریا ہمارے اوپر سے گذرے چلا جارہا ہے"۔ میں نے دہرایا۔

"اور سرنگ کی چھت میں ہوگیا سوراخ۔ تو۔؟ خداوند کریم رحم کرے۔"

نسیمہ ممانی بولیں۔ "آغاجی۔ ہم لوگ تو ڈیکوٹا میں ایک انجن پر کوئٹہ گئے تھے۔"

"اللہ اللہ کرو بیٹی۔"

ٹرین ایک جھٹکے سے چل پڑی۔

پڑوس میں بیحد حسین چھوٹا سا گرجا مقفل اور سنسان پڑا تھا۔ اس کی دیواریں عشق پیچاں کی بیلوں سے پوشیدہ تھیں اور سامنے ایک گھنا ایلم سایہ فگن تھا۔ غروب آفتاب کی روشنی میں گرجا کے بند دریچے قوس و قزح میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اکثر اتوار کی صبح میں گرجا کے پھاٹک کے برابر ایزل رکھ کر تصویریں بناتی۔ اکادکا انگریز راہگیر ٹھٹھک کر مہذب دلچسپی سے کینوس پر نظر ڈالتے اور خاموشی سے اپنی راہ لیتے۔

ومنزلب کی تحریک سے مدتوں قبل اکتوبر ۱۹۲۸ء میں ورجینا وولف نے کیمبرج میں نیو ہم اور گرٹن کی طالبات کو ایک طویل لیکچر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "اسی موسم خزاں کی ایک خوشگوار صبح میں ایک مردانہ کالج کے سبزے پر سے گذر رہی تھی' ایک بیڈل (کالج کا اہلکار) نے ٹوک دیا اور بولا۔ "سبزے پر سے فقط کالج کے فیلوز اور اسکالرز گذر سکتے ہیں۔ عورتوں کو صرف بجری پر چلنے کی اجازت ہے"۔

وہاں سے ورجینا وولف لائبریری پہنچیں۔ دروازے پر ایک سلور گرے بالوں والے بزرگ نے ملامت سے کہا۔ کتب خانے میں وہ محض کسی فیلو کی معیت میں یا ڈین کے تعارفی خط کے ساتھ داخل ہو سکتی ہیں۔

تب وہ ندی کے کنارے جا بیٹھیں اور سوچا کہ صدیوں قبل او کس برج کے یہ کالج بادشاہوں اور امراء اور کروڑپتی تجار کے گراں بہا عطیات کے ذریعہ تعمیر کئے گئے تھے۔ اور جب ۱۸۶۰ء میں آج کی طالبات کی دادیوں' نانیوں نے ایک زنانہ کالج قائم کرنے کے لئے کمیٹی بنائی اور ملک کی معزز خواتین کے پاس چندے کی درخواستیں بھیجیں تو وہ بہزار دقت صرف تیس ہزار پاؤنڈ جمع کر پائیں۔ کیونکہ ساری معزز خواتین بے مایہ تھیں۔ ان کے شوہر اور باپ لاکھوں کروڑوں پاؤنڈ کے مالک تھے لیکن خود ان کے پاس ذاتی روپیہ قانوناً موجود نہ تھا۔ صرف اڑتالیس ۴۸ سال قبل وہ ایک نئے ایکٹ کے ذریعہ اپنے پیسے کی مالک و مختار بن سکیں۔

"برٹش میوزیم لائبریری میں لاکھوں کتابیں موجود ہیں۔ اور تقریباً سب مردوں کی لکھی ہوئی..... دنیا بھر میں عورتوں کی لکھی کتابوں کی تعداد اتنی قلیل کیوں ہے؟ سارے عالمی ادب میں شروع سے آخر تک عورتیں' مرد مصنفین کے اعصاب پر سوار ملتی ہیں لیکن شاعری اور فکشن میں عورتوں کو محض مرد شعراء اور ادباء کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ بے چاری جین آسٹن' اپنے مسودات بلاٹنگ پیپرز کے نیچے چھپا کر رکھتی تھی۔

"تم نے مجھ سے فرمائش کی ہے 'عورت اور فکشن' پر تقریر کروں۔ اس کا مطلب محض یہ ہو سکتا ہے کہ میں فینی برنی' جین آسٹن' برونٹے سسٹرز' مس مٹ فرڈ اور جارج ایلیٹ کے بارے میں چند الفاظ کہدوں۔ یا تمہارا مطلب عورتیں اور ان کا تخلیق کردہ ادب' یا عورتیں اور ان کے متعلق لکھا ہوا ادب یا عورتوں اور ان کے لکھے ہوئے ادب کی ماہیت و خصوصیت بھی ہو سکتا ہے۔

"ندی کنارے بیٹھے بیٹھے میں نے سوچا کہ ساری بات دراصل یہ ہے کہ عورت کو فکشن لکھنے کے لئے پانچ سو پاؤنڈ سالانہ کی ذاتی آمدنی اور اپنا ذاتی کمرہ ضروری ہے۔ پھر بھی عورت کی اصل فطرت اور فکشن کی ماہیت کے سوالات حل طلب رہ جاتے ہیں"۔

صدیق احمد صدیقی نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا۔ بروایت ماجد علی پاکستان سے سی ایس پی کے زیر تربیت نوجوانوں کا ایک گروہ حسب معمول یہاں مزید تربیت کے لئے آیا ہوا تھا۔ اور ارباب برٹش کونسل انہیں برطانوی تہذیب سے روشناس کرنے کے لئے تھیٹر' اوپیرا وغیرہ دکھلاتے پھر رہے تھے۔ تو ایک شام یہ نوجوان بیلے دیکھنے میں مصروف تھے۔ "سوان لیک" کا پہلا ایکٹ ختم ہوتے ہی ایک صاحبزادے نے اٹھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یار بیلے کا بھی آئیڈیا ہو گیا۔ چلو اب چلیں"۔

ایک روشن صبح میں گرجا گھر کے سامنے بیٹھ کر تصویر کشی میں مصروف تھی۔ سامنے باغ کی اونچی دیوار پر سے پھولوں کی ڈالیاں باہر جھک آئی تھیں۔ ایک سفید بلی سڑک کے کنارے جا رہی تھی۔ اور گریول پیلس کے خاموش ایونیو میں مالی جھاڑو دیکر ارغوانی اور زرد پتے سمیٹنے میں مصروف تھا۔ پتے بار بار ہوا کے جھونکوں سے پھر منتشر ہو جاتے تھے۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ "پانچ سو پاؤنڈ سالانہ اور اپنے کمرے" کا کافی آئیڈیا ہو گیا۔ اب واپس چلنا چاہیئے۔

اس سہ پہر بی بی سی کی کینٹین فش اینڈ چپس کی گرم گرم مہک سے معمور تھی۔ اچانک بارش کی پھواریں باہر کھڑکیوں سے ٹکرانے لگیں۔ کونے کے میز پر سارا حلقہ فکریہ موجود تھا۔ باہر دھند گہری ہوتی گئی۔ اعجاز بٹالوی نے دریچے کے باہر نظر کر کے فی البدیہہ ارشاد کیا"

قرۃ العین ہے کہ حیدر ہے
آج کیسا خراب ویدر ہے

میں نے اناؤنس کیا۔ "خواتین و حضرات۔ اب میں اپنی اردو کی پریکٹس کرنے کانٹینوں کے دیس واپس جاتی ہوں۔"

چچا صدیق چند لمحوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کو آئیڈیا ہو گیا۔؟"

"تقریباً ساری دنیا کا آئیڈیا ہوتا جا رہا ہے۔"

"ہمیں کافی پہلے سے ہو چکا ہے۔" چچا نے کہا اور خاموش ہو گئے۔ شاید انکو وطن یاد آ رہا تھا۔ چچا صدیق پر (جو علی گڑھ میں اچھے بھائی اور جرار بھائی کے ہم جماعت رہ چکے تھے) ۴۸ء میں علی گڑھ سے پاکستان آکر وہاں سے لندن آ گئے تھے۔ مکان خرید لیا تھا۔ بی بی بچوں کو بلا لیا تھا مگر غالباً اندر سے خوش نہ

تھے۔ یہ تقسیم کے بعد اندر سے اکھڑی ہوئی نسل کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ "نقوش" میں "جلاوطن" کی اشاعت کے بعد انہوں نے کسی کو بتایا تھا کہ وہ اسے پڑھ کر روئے۔ حافظ قرآن بھی تھے اور مارکسٹ بھی (تقی میاں چچا کو انیسویں صدی کا لبرل انگریز کہتے تھے۔) چچا اس کلچر کی پیداوار تھے جس میں فن گفتگو اور آداب مجلس کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ گو اس بھیگی ہوئی خنک سہ پہر کسی کو معلوم نہ تھا کہ رونق محفل چچا صدیق اس دنیا میں زیادہ عرصہ ٹکنے والے نہیں۔

"تمہارا Last Supper ویسٹ اینڈ کے فلاں ریستوران کی دوسری منزل پر منعقد کیا جائے گا۔ ہم سب کی طرف سے۔ باضابطہ۔" اعجاز نے کہا۔

"اور جب پلیٹ میں رکھا مرغ تین مرتبہ اذان دے گا۔" میں نے کہا۔ میں متوقع تھی چچا کہیں گے کہ ہم سب ایک دوسرے کے لئے Judas ہیں یا اسی قسم کی کوئی اور بات مگر بولے۔ "بھئی تم بہت جلد چل دیں۔ دیکھو ہم کب تک یہاں رہتے ہیں۔ بٹیا۔ ہم انگریز کے ساتھ بہت رہ لئے۔ اب قبر میں اس کا ساتھ نہیں چاہتے۔"

یوسٹن اسٹیشن پر جملہ اعزہ و احباب کا ہجوم جمع تھا۔ کافی ہلڑ ہو رہا تھا۔ سب پر (میرے سمیت) کافی رقت طاری تھی۔ جس وقت بوٹ ٹرین چھوٹنے والی تھی۔ چچا برساتی پہنے بھاگم بھاگ پلیٹ فارم پر پہنچے۔ ان کو پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی تھی۔ چلتے چلتے ایک بار پھر انہوں نے وہی بات دہرائی۔ "تم تو واپس چلدیں۔ بٹیا۔ ہم قبر میں انگریز کا ساتھ نہیں چاہتے۔"

پولش جہاز بٹوری ایک ایسا لگژری لائنر تھا جس کے خدام اور خادمائیں وقت فرصت میں مارکس' اینگلز اور پولش کلاسیکس کا مطالعہ کرتے نظر آتے تھے اور جبل الطارق کی گلیوں میں سے گذرتے ہوئے خیال آتا تھا کہ اپنی کشتیاں جلانے کے فوراً بعد وہ اس پتھریلی زمین پر اترے تھے۔ چٹان کے اوپر یونین جیک لہراتا تھا۔ اور پورٹ سعید کی دوکانوں میں سے شاہ فاروق اور ملکہ نریمان کی تصاویر کب کی اتاری جا چکی تھیں۔ جنرل نجیب بھی پرانی بات ہو چکے تھے۔ اور الرئیس گمال عبدالناصر کے پورٹریٹ ہر جگہ مسکرا رہے تھے۔ اور بندرگاہ میں "ایسٹ آف سوئز" کا کولونیل ہینگ اوور ابھی باقی تھا اور گلیوں میں طویل القامت عباپوش مصری' مغربی سیاحوں کا راستہ روک کر چیخے ہے۔ "ٹائی پکچرز.... ٹائی پکچرز۔" دہراتے تھے اور طویل القامت عباپوش مصری "گلی گلی مین" جہاز پر آکر برطانوی بچوں کو "جادو" کے کرتب دکھاتا تھا۔

آج سے تراسی ۸۳ سال پہلے' جب نہر سوئز کھدی تھی اور مشرق و مغرب کے درمیان بحری ٹریفک پہلے سے کئی سو گنا زیادہ بڑھ گیا تھا۔ انگلستان سے آنے والی میم صاحب لوگ سوئز سے گذرتے ہوئے جہاز کے ڈیک پر بیٹھ کر "لائٹ آف دی حرم" قسم کی کتابیں پڑھتی تھیں۔ جب پورٹ سعید' وائٹ ٹاؤن اور بلیک ٹاؤن میں منقسم تھا۔ جب بے چارے خدیو سعید پاشا کو سارے یوروپ کے بے ایمان انڈسٹریلسٹ لوٹ رہے تھے۔ جب مصر قانونی طور پر سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ مگر سیاسی طور پر برطانیہ اور فرانس کا نیم غلام بن چکا تھا۔ جب یوروپین پائلٹ نہر میں جہازوں کی قیادت کرتے تھے۔ دونوں طرف لائٹ ہاؤس اور

گورنر ابراہیم رشدی بے کا دو منزلہ بنگلہ۔ کار میلایٹ راہبات کی خانقاہ۔ عثمانی ترکی۔ اور یوروپ اور امریکہ کے جہازوں کا ہجوم۔ شہر کے اندر یونان اور مالٹا کے ٹھگ۔ کیسنو میں جوا کھیلنے والے سیاح۔ یونانی اور فرنچ گرجا گھر۔ اور پرانا عرب شہر' خچر' سقے' مفلس مصری' یوروپین سیاحوں سے بخشش مانگنے والے بھکاری۔

سوئیز کے ایک طرف ایشیا ہے۔ دوسری طرف افریقہ۔ دونوں طرف زرد' سیاہ' اجاڑ پہاڑیاں عرب اور سنائی۔ اور مصر۔ صبح سویرے طلوع آفتاب کے ساتھ ریت کے پہاڑوں کے بدلتے ہوئے رنگ۔ اودے۔ گلابی۔ نیلے۔ اور نہر کی سطح پر سے گذرتے عثمانی جہاز اور مصری گن بوٹ۔ اور برطانوی اور فرنچ اسٹیم لانچیں اور "بم بوٹ"۔ اور اسمعیلیہ جہاں سے ٹرین سوئز اور قاہرہ اور اسکندریہ جاتی تھی۔ اور گوشن کا خطہ جس کا ذکر موسیٰ کے باب میں انجیل کے اندر موجود ہے۔

وہی نہر سوئیز ہے۔ وہی دشت وجبل۔ ایک طرف بادیۃ العرب ہے۔ دوسری طرف مصر۔ اور اس کے نخلستان۔ اور پڑوس میں نیا ملک اسرائیل۔ اور پاکستان جانے والی ایک میم ڈیک چیئر پر بیٹھی آج بھی مشرق کے متعلق لکھا ہوا ایک بوگس ناول پڑھ رہی ہے۔

غروب آفتاب کے وقت مشرق کی سمت عربستان کے پہاڑوں کی دیوار گلابی ہو گئی۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ لبنان سے یہاں تک چلا آرہا ہے اور جنوب میں عدن تک جائے گا۔ سوئیز کے پچھمی کنارے۔ افریقہ کی سرزمین اور وادی موسیٰ۔ اس جگہ سے کلیم اللہ اپنی امت کو نکال لے گئے تھے۔ اب امت ان پہاڑوں کے کچھ فاصلے پر اسرائیل میں اپنی مشین گنوں کا رخ مصر کی طرف کئے بیٹھی ہے۔

رات کو سوئیز پر چاند نکلا۔ ساڑھے تین ہزار سال قبل عہد موسیٰ میں یہی چاند بالکل اسی طرح نکلتا ہو گا۔ اور اس ریت اور ان پہاڑوں پر اس طرح چمکتا ہو گا۔ کوہ سینا' طور موسیٰ' جبل موسیٰ' ماؤنٹ کیتھرین' حمام موسیٰ' اور راس ابو محمد جس کے بعد سمندر ہی سمندر ہے۔

اور جہاز پر لوگ باگ اس خطے کی لرزہ خیز عظمت اور اہمیت سے بے نیاز اور لاعلم اور بے پرواہ بال روم رقص اور فینسی ڈریس اور عارضی معاشقوں میں مشغول ہیں۔

عدن۔ ہنوز ایک برطانوی کولونی' واٹر پولیس۔ "کرنل گورڈن پاشا گورنر جنرل خط استوا" کے عہد کی بنی ہوئی سرکاری عمارتیں۔ شہر کے اندر پارسیوں' خوجوں اور سندھیوں کی دوکانیں۔ چیخ پکار' بدنظمی' غربت' شدید گرمی۔

ہم برصغیر ہندوپاکستان کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

حوالہ جات

1- مشتاق احمد زاہدی۔ ملاحظہ کیجئے جلد اول۔ فصل بازدہم۔ باب ا "بائیس خواجہ کی چوکھٹ۔"
2- چودھری محمد علی ردولی کے متعلق میرا مضمون بعنوان "داستان طراز" سویرا لاہور میں غالباً ۵۴ء یا ۵۵ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا ہے۔
3- لوئی مک نیس : زنداں نامہ
4- تلخیص از "لندن لیٹر" مطبوعہ نقوش لاہور ۵۲ء یہ طویل مضمون افسانوں کے مجموعے "شیشے کے گھر" میں شامل ہے (مکتبہ جدید لاہور اشاعت اول ۱۹۵۴ء)
5- یلدرم کے علی گڈھ کے ساتھی ولایت علی بمبوق مرحوم۔
6- چند دہائی قبل رسل اسکوئر کے نزدیک بلومزبری نام کا محلہ اپنے ادباء اور دانشوروں کے لیے مشہور تھا اور انٹلکچوئیل عورتیں "بلومزبری ٹائپ" کہلاتی تھیں۔
7- رائیڈر ہیگرڈ کا ناول "SHE"۔
8- YELLOW BOOK تاریخ ساز ادبی رسالہ جو ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۷ء تک نکلتا رہا اس کے آرٹ ڈائیریکٹر اوبری بیرڈزلے تھے۔ یلو بک کا ایک انتخاب ۱۹۴۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔
9- نادرہ (اب مسز اکبر علی) نے پیرس میں مستقل سکونت اور فرانسیسی قومیت اختیار کر لی ہے۔

فصل چہاردہم

۱۔ رائل بنگال ٹائیگر

ماری پور میں ایک صبح جلال الدین احمد کا فون آیا۔ "جلاوطن کا ترجمہ جلد از جلد انگریزی میں کر دیجئے ہم اسے پی۔ ای۔ این کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔"

گڈ اولڈ جلال صاحب۔ "آپ حسب معمول پاکستانی کلچر کی آبیاری میں مصروف ہیں۔"

"بالکل۔ اور اب مشرقی پاکستان کی کلچرل آبیاری کے لئے ڈھاکہ جاتے ہیں۔ وہاں پاکستان پی۔ ای۔ این کی طرف سے ایک انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔"

جلال صاحب سے یہی امید تھی۔

تیج گاؤں ائیرپورٹ پر اورینٹ ائیرویز کا طیارہ اترا تو اچانک بہت عجیب سا معلوم ہوا۔ چارسو شدید ہریالی' جھیلیں' آم اور کیلے کے جھنڈ۔ ہوا کی تاثیر تک مختلف تھی۔ گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ لگتا تھا ایک دم غازی پور پہنچ گئے یا برسات کے زمانے میں علی گڑھ۔ بہرحال وہ مغربی پاکستان سے یکسر مختلف علاقہ تھا۔

آپا حسنہ اور لقمان بھائی ہوائی جہاز کے بالکل نزدیک آ گئے۔ ائیرپورٹ گھریلو معلوم ہو رہا تھا۔

ائرپورٹ سے باہر آ کر پہلے قریب ہم لوگ بھائی منے کے گھر گئے۔ تایا زاد بھائی اعزاز حیدر عرف منے بھائی' کی دو منزلہ کوٹھی بھی درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ سبزے پر گائیں چر رہی تھیں۔ کراچی کے بعد میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس منظر کو دیکھا۔

شہر میں رتی میاں کے بڑے بھائی سید لقمان حیدر مینجر اسٹیٹ بینک آف پاکستان ایک ایسی عمارت میں رہتے تھے جسے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھارہویں صدی میں تعمیر کیا تھا۔ اور ولندیزی گورنر اس میں رہا کرتا تھا۔ نچلی منزل میں اسٹیٹ بنک اور اوپر کی منزل پر آپا حسنہ' لقمان بھائی رہتے تھے۔ کمرے اور برآمدے اس قدر وسیع تھے کہ ان میں تقریباً ' ٹف کھیلا جا سکتا تھا۔ برآمدوں کے جارجین ستونوں کا قطر حیرت انگیز تھا۔ اور چوبی کشادہ زینے پراسرار۔ رات گئے' ڈرائنگ روم کے طویل دریچے کے نیچے عمیق باغ میں جھانکتے ہوئے (جہاں روجنی گوندھو مہک رہی تھی) میں نے پرامید لہجے میں آپا حسنہ سے پوچھا۔

"یہاں ڈچ بھوت تو کافی ہونگے۔"

ایک صبح سیدھے سادے کوی جسیم الدین ملنے آئے اور اپنی کتاب کا انگریزی ترجمہ FIELD OF PATCH WORK QUILT دے گئے۔ نچلی منزل میں شیخ مجیب الرحمٰن جو شاید حبیب بنک میں کام کرتے تھے' اکثر لقمان بھائی کے پاس آ کر بیٹھتے۔

ڈھاکہ اس وقت تک خاصہ خستہ حال تھا۔ ایک بوسیدہ کائی آلودہ عمارت میں زین العابدین جو ایک بیحد بھلے آدمی تھے ڈھاکہ آرٹ اسکول چلا رہے تھے۔ ایک قدیم دو منزلہ کوٹھی میں ریڈیو اسٹیشن تھا۔

ڈھاکہ کی اکثر عمارتیں عہد جان کمپنی کی اور اس وجہ سے لکھنؤ کی پرانی کوٹھیوں سے مشابہہ تھیں۔ ڈھاکہ کلب لکھنؤ کے محمد باغ کلب سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ انگریزی عہد کی تہذیبی چھاپ ہندو پاکستان دونوں جگہ بہت گہری اور بہت مضبوط تھی۔

پی۔ ای۔ این کانفرنس کے غیر ملکی مندوبین نئے نویلے ہوٹل شاہ باغ میں ٹھہرے تھے۔ یہ ہوٹل بعد از جنگ نئی امریکن اسٹائل ٹورسٹ دنیا سے تعلق رکھتا تھا۔

ایک روز کانفرنس کے سارے مہمانوں کو پدما پر اسٹیمر میں لے جایا گیا۔ میں نے ایک بنگالی ادیب سے کہا ان گورے رائیٹرز کو کوئی بنگلہ گیت سنائیے۔

"بہت اچھا۔" انہوں نے مستعدی سے جواب دیا۔

اچانک جہاز کے عرشے پر نامور بنگالی ادباء و شعراء جن میں سے چند ایک باریش مولانا تھے' اور بیشتر بنگالی ادیب مولوی کہلاتے تھے۔ مولوی جسیم الدین' مولوی منظور الدین احمد' مولوی شہید اللہ ایک قطار میں کھڑے ہو کر ٹیگور اور نذر الاسلام کے گیت گانے لگے۔

میں نے جلال الدین احمد سے کہا۔ "دیکھئے بنگالی اور اردو تہذیبوں میں یہ فرق ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ محمد حسن عسکری' پروفیسر وقار عظیم' ممتاز شیریں' علامہ نیاز فتح پوری' ایم۔ اسلم اور مولانا اعجاز الحق قدوسی ایک قطار میں کھڑے ہو کر اچانک گانا شروع کر دینگے؟"

فرمایا۔ "عنقریب بنگلہ اور اردو تہذیبوں کا فرق مٹ جائے گا۔ بہت جلد۔ انشاء اللہ۔"

میلکم مگرج جو اسی وقت پنچ کے اڈیٹر تھے' کانفرنس کے لئے لندن سے آئے تھے۔ بیحد سوئیٹ انسان تھے۔ ایک شام میں نے ان کو لقمان بھائی کے ہاں لیجا کر ان جغادری پیل پایوں کی زیارت کروائی جو فن تعمیر کے لحاظ سے برصغیر ہندوپاک کے موٹے ترین جارجین پیل پائے تھے۔

"اس برصغیر میں آرکیٹیکچر کے نوادرات کی حیرت انگیز بہتات ہے لیکن کسی کو دلچسپی نہیں۔" میلکم مگرج نے پیل پائے دیکھ کر انگشت بدنداں ہوتے ہوئے کہا۔

کراچی واپس آ کر ایک صبح میں کسی کام سے رتی میاں کے نئے دفتر گئی جو کراچی جم خانہ کے نزدیک تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ پاکستان انٹرنیشنل ائیرلائنز کا دفتر تھا جو حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور رتی میاں اب اورینٹ ایرویز سے پی۔ آئی۔ اے۔ میں آ چکے تھے۔ اس وقت رتی کے کمرے میں ایک نہٹوری قرابت دار بھائی اسحاق حیدر کمرشل آرٹسٹ موجود تھے۔ رتی میاں نے فرمایا۔ "ہم بھائی اسحاق حیدر کو ذرا زو لیے جاتے ہیں۔ رائل بنگال ٹائیگر دکھانے وہ اس کی تصویر بنائیں گے۔ پھر اس تصویر کو پی۔ آئی۔ اے کا ٹریڈ مارک بنایا جائے گا۔ مزید برآں ہمیں ایک عدد انفرمیشن آفیسر کی ضرورت ہے۔ آپ آ جائیے۔ اس ملازمت میں ایک عدد فوکس ویگن بھی مضمر ہے جو آپ کی خدمت میں حاضر رہے گی اور یوم یوم ڈارلنگ درکار نہ ہو گی۔"

باہر ریسپشن ڈیسک پر ایک براؤن بالوں والی بیحد گوری پٹھان لڑکی بیٹھی تھی۔ رتی میاں نے ملوایا۔

"حسینہ فاروق۔ مسٹر غلام فاروق منسٹر آف انڈسٹریز کی صاحبزادی۔ ریسپشنسٹ کا کام کر رہی ہیں۔ پاکستان ترقی کر رہا ہے۔ اب آپ دونوں سارے ملک کا دورہ کیجئے۔ اور آپ حسینہ فاروق کی روشن مثال پیش کر کے اچھے خاندانوں کی لڑکیوں کو ایئر ہوسٹس بھرتی کیجئے۔ اور ایک پریس کمپین اس کے لئے چلایئے۔"

دوبارہ ڈھاکہ۔ آپا حسنہ کہنے لگیں۔ "بنگالی بڑے قدامت پرست ہیں۔ یہاں تمہاری کامیابی مشکل ہے۔"

آپا حسنہ ایڈن گرلز کالج کے بورڈ آف گورنرز پر تھیں۔ انہوں نے دوسرے روز پرنسپل کو فون کیا۔ تیسرے پہر کو میں اور آپا حسنہ کالج گئے۔ پرنسپل نے اسمبلی ہال میں سارے کالج کی لڑکیوں کو جمع کیا۔ سیاہ و سرخ کناروں کی سوتی ساریاں پہنے' بال بکھرائے مسلم بنگالی کنیاؤں کا جم غفیر سامنے موجود تھا۔ آپا حسنہ نے چپکے سے مجھ سے کہا۔ "اردو میں مت بولنا۔"

میں نے بزبان انگریزی پی۔ آئی۔ اے میں ایئر ہوسٹس بننے کے فوائد پر مدلل تقریر کی۔ وہ بنگہ کنیائیں کندھوں پر بال چھنکائے اس طرح گم سم بیٹھی رہیں۔ دوسرے اسکولوں اور کالجوں میں بھی یہی ہوا۔

وہ پریشد بہت دلدوز جگہ نکلی۔ ایک شامیانے کے نیچے بے شمار بنگالی خواتین جمع تھیں۔ نامور بنگالی شاعرہ بیگم صوفیہ کمال نے ناچیز کے متعلق ایک بنگلہ نظم لکھی تھی وہ پڑھی۔ ایک لڑکی روزی خان نے اس کا انگریزی ترجمہ سنایا۔ اور یہ سب مجھے بہت TOUCHING لگا لیکن ان سیدھی سادی ادب پرست بنگالنوں اور ایک انٹرنیشنل ایرلائنز کے لئے درکار گلیمرس' تیز و طرار ایئر ہوسٹس لڑکیوں میں زمین آسمان کا فاصلہ مجھے نظر آیا۔

"اب چٹاگانگ جا کر دیکھ لیں۔" میں نے گھر آ کر لقمان بھائی سے کہا۔ لقمان بھائی کے پرانے سندیلوی دوست سید محمد عباس' مولف سفینہ غزل جنگی شادی اماں نے 39ء میں لکھنؤ کے جج اصغر حسن کی بیٹی بنن باجی سے کروائی تھی۔ ان دنوں چٹاگانگ میں کلکٹر آف کسٹمز تھے۔ وہ اور بنن باجی' لقمان بھائی کے ہاں ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ ٹرین سے چٹاگانگ' جو ایک حسین دلفریب شہر تھا۔ عباس صاحب کی کوٹھی ایک سرسبز خوش منظر پہاڑی پر واقع تھی۔ چٹاگانگ ایسٹ پاکستان ریلوے کا ایک بڑا مستقر بھی تھا۔ عباس صاحب کہنے لگے۔ "یہاں پہاڑیاں ہی ہیں۔ آدمی ریلوے کے۔ ہوائی لڑکیاں تمہیں کہاں ملیں گی۔" نہیں ملیں۔

ابھی پی۔ آئی۔ اے کے نئے طیارے اڑنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ چٹاگانگ سے واپس ڈھاکہ۔ وہاں سے لاہور جاتے ہوئے اورینٹ ائرویز کا طیارہ آدھ گھنٹے کے لئے دہلی رکا۔ میں نے پالم ایئر پورٹ سے جمال اور شگفتا کو فون کیا جو لندن سے آچکے تھے۔ پاکستانی گوانی عیسائی ایئر ہوسٹس لڑکی نے آ کر کہا "چلئے لاہور جانے کے لئے ایئر کرافٹ آپکا منتظر ہے۔"

آٹھ سال قبل بھارت ایئرویز کے خالی ڈیکوٹا میں اماں' بھائی' بھابی' اور میں اسی پالم ایئر پورٹ سے اڑ کر بحیثیت مہاجر لاہور گئے تھے۔ پالم اب کتنا بدل چکا تھا۔

لاہور بھی بدل چکا تھا۔ بارونق اور ترقی پذیر۔ دسمبر 1947ء کے اس انتہائی ڈپریسنگ ویران شہر سے مختلف۔ چلے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اورینٹ ایئرویز کے دفتر سے آپا ممن' بھائی جان کے گھر نمبر ۴۹ لارنس روڈ پہنچے پہنچتے چھینکوں سے حالت تباہ۔ آپا ممن پچھلے برآمدے میں گاجر کا حلوہ بنا رہی تھیں۔ بچے کالج اور اسکول گئے ہوئے تھے۔ بھائی جان۔ دفتر میری اچانک آمد سے بشاش ہو کر آپا ممن نے پوچھا۔ "کہاں سے آ گئیں؟"

"یہی ذرا چٹاگانگ اور ڈھاکہ سے۔ اور بہت سخت تکان ہے اور شاید زکام۔ اب میں تین دن آرام کروں گی۔ NOW I'LL RELAX AND TALK, TALK, TALK.

آپا ممن کے چہرے پر مزید روشنی آئی کہ وہ مجھ سے زیادہ باتونی اور ماہر گپاسٹک خاتون تھیں۔ اچانک مجھے پھر وہ رکروٹنگ کی ناکام مہم یاد آ گئی۔ آپا ممن نے کہا۔ "پنجاب بہت موڈرن علاقہ ہے۔ یہاں تم کو بہت لڑکیاں ایئر ہوسٹس بننے پر تیار مل جائیں گی۔"

سلیم شاہد (سابق شمشیر سنگھ بترہ) لاہور ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ میں نے ان سے کہہ کر ایئر ہوسٹس رکروٹنگ کے جدوجہد کے سلسلے میں ایک پروگرام نشر کروایا۔ شوکت تھانوی نے چند لطیفے سنائے۔

راولپنڈی میں حسینہ فاروق اور رتی میاں ایئر فیلڈ پر دھوپ میں کھڑے چلغوزے کھاتے منتظر ملے۔ چھاؤنی میں میجر سید اصغر حسین کے ہاں مجھو خالہ اور خالہ فیض پلنگ پر پھلکاری بچھائے سورج کے رخ بیٹھی قہوہ پی رہی تھیں۔ اصغر خالو لندن گئے ہوئے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن جا کر کھڑے کھڑے ایک ڈرامہ ایئر ہوسٹس لڑکیوں کے متعلق لکھا جسے اس وقت فوراً مختار صدیقی نے پروڈیوس کر کے نشر کر دیا۔

بھائی جان جری احمد سید اور تقی میاں (تقی احمد سید بی بی سی والے) کے منجھلے بھائی ذکی احمد سید جن کی شادی پھوپھی اپی کی لڑکی زلیخا سے ہوئی تھی۔ (جو حال ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ایس سی کر کے آئی تھی) بھی پنڈی میں رہتے تھے۔ رتی میاں نے ذکی میاں کے ہاں سے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو ٹرنک کال کی۔ ڈاکٹر صاحب پشاور کی نئی نویلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے۔ پنڈی سے اڑ کر پشاور۔ یونیورسٹی کیمپس پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی نئی نویلی کوٹھی۔ کے باغ میں تیز سرخ گلاب کھلے ہوئے تھے اور بڑی شدید سردی پڑ رہی تھی۔

پشاور ومنز کالج میں کیلاش ہوسٹل لکھنؤ والی آصف جلیل وائس پرنسپلی کر رہی تھی۔ وہ بھی دھوپ میں شال اوڑھے بیٹھی چلغوزے کھا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "توبہ کرو۔ چند سال ادھر تک پٹھان مولوی یہاں بے پردہ عورتوں کی چوٹیاں کاٹنے کے لئے قینچیاں لئے گھومتے تھے۔ یہاں سے کون لڑکی جائے گی ہوا میں اڑنے۔"

کراچی واپس پہنچ کر میں' رتی میاں اور حسینہ فاروق سوچنے لگے کہ یہ مہم تو ناکام ثابت ہوئی اب کیا کیا جائے۔

"لامحالہ آسٹریلیا سے لڑکیاں منگوانی پڑینگی۔" رتی میاں نے کف افسوس مل کر کہا۔

چند روز بعد رتی میاں اور حسینہ بہت خوش خوش میرے دفتر کے کمرے میں آئے کہا۔ "ہماری مہم ناکام نہیں تھی۔ پاکستانی لڑکیوں کی درخواستیں آنی شروع ہو گئی ہیں۔ انٹرویو ہونے والے ہیں اور اب یہ طے کیا جائے گا کہ پی۔ آئی۔ آے کی ایئرہوسٹس کا یونیفارم کیا ہو۔"

لندن جانے والی افتتاحی فلائٹ کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ میں نے دن رات ایک کرکے اس کے لئے کام کیا۔ صبح پانچ بجے ایئرپورٹ پر جا کر نئے سوپر کونسٹلیشن کی تصاویر کھنچوائیں۔ ایک روز نسیمہ ممانی اور نادرہ کو (جو کوب ہیم انگلستان کے کانونٹ اسکول سے چھٹیوں میں آئی ہوئی تھی) موؤل مسافر بنا کر جہاز کے اندر بٹھایا کہ نئی ایئرہوسٹس لڑکی ان کو لنچ سرو کر رہی ہے۔ ایک صبح منہ اندھیرے آزدری کو ہوائی جہاز پر سوار ہوتے دکھایا۔ آدھی رات اور صبح چار بجے گھپ اندھیرے میں فوکس واگن پر جس کا ڈرائیور جٹ کی رفتار سے کار چلاتا تھا' ماری پور سے پچیس میل دور ڈرگ روڈ۔ رات اور صبح کی اولین فلائٹس کے انتظامی مناظر کی تصویریں کھنچوائیں اور صبح کو دفتر پہنچ کر پبلسٹی کے پمفلٹ لکھے۔ کے۔ ایل۔ ایم والے کیٹرنگ اور ایئرہوسٹسوں کے اسکول چلا رہے تھے۔ ان غیر دلچسپ ولندیزی لوگوں سے نپٹی۔ غرضیکہ صاحب بیحد کام کیا۔ چیف انفرمیشن آفیسر دہلی کے باشندے اور ایک معقول شریف کم گو انسان تھے۔ لیکن افتتاحی فلائٹ سے چند روز قبل ایک صاحب کو بھی میرے علاوہ انفرمیشن آفیسر مقرر کیا گیا۔ یہ صاحب حکومت کے ایک بہت اعلیٰ افسر کے قریبی رشتہ دار تھے۔ ایک روز رتی میاں نے مجھے بتایا کہ۔ "آپ کے بجائے ان صاحب کو افتتاحی فلائٹ کے لئے لندن بھیجا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "رتی میاں مجھے تین چار روز کے لئے لندن جانے کی قطعی خواہش نہیں ہے۔ مگر اس بے انصافی اور زیادتی کے خلاف کہ ساری محنت اور دوڑ بھاگ بسلسلہ ایئرہوسٹس لڑکیاں اور اس فلائٹ کی پبلسٹی میں نے کی' اور جا یہ صاحب رہے ہیں محض بربنائے نیپوٹزم بطور اصولی احتجاج فوراً استعفےٰ مرا باحسرت ویاس۔ بات دراصل یہ ہے رتی میاں کہ IT'S STILL A MAN'S WORLD اس کا تجربہ مجھے لندن ہائی کمیشن کی ملازمت کے سلسلے میں بھی ہو چکا ہے"۔

رتی میاں بولے۔ "آپ کے احتجاجی استعفےٰ سے دنیا کی ذہنیت تو راتوں رات بدل نہیں جائے گی۔"

میں نے فوراً قدرت اللہ شہاب کو فون کیا۔ "آپ ایک عدد STINKER تصنیف کر سکتے ہیں۔ یعنی سخت قسم کا استعفےٰ کا خط۔ ٹھیک ایک بجے جم خانہ کلب تشریف لے آیئے اور مجھے اس قسم کا ایک خط ڈکٹیٹ کر دیجئے۔"

شہاب صاحب نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے پہر کو وہ خط میں نے پی۔ آئی۔ اے کے کینیڈین جنرل مینجر کو بھجوا دیا اور گھر آ گئی۔

نورافشاں نے متفکر ہو کر کہا۔ "تمہاری شہرت ہو جائے گی کہ کسی جگہ ٹک کر کام نہیں کرتیں۔

ڈی۔اے۔ ایف۔ پی کی اچھی ملازمت سے استعفےٰ دینے کے بعد اب پی۔ آئی۔ اے سے استعفےٰ دیکر آ گئیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں حق بجانب نہیں ہوں؟"

سلو یا مانچسٹر سے آ چکی تھیں۔ ایک روز ان کا فون سی فیلڈ روڈ سے آیا۔ "ایک ذرا ضروری بات بتانے ہم فوراً ماری پور آ رہے ہیں۔"

سلو بیگم کا یہ تھا کہ اگر سورج ڈیڑھ بلم پر آ جاتا اور ان سے کہا جاتا سلو قیامت آ گئی۔" تو آپ نہایت دلجمعی سے جواب دیتیں۔ "اچھا۔ آ گئی؟۔ ٹھہرو۔ چلتے ہیں۔ ذرا ایک پان بنالیں۔"

آپ ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی میں ڈگری لے کر مانچسٹر سے واپس لوٹیں۔ میں نے سخت اکسائیٹ منٹ سے کہا۔ "کمال ہے سلو۔ یہ تو بہت مشکل علم ہو گا۔" بولیں۔ ہاں خاصا مشکل تھا۔ بس سیکھ گئے۔"

اسپین تشریف لے گئی تھیں۔ کسی نے پوچھا۔ "وہاں بل فائٹ دیکھی؟" کہنے لگیں۔ "ہاں دیکھی اس قدر کی دھول' دھوپ' گرمی' چیتھڑے لگائے بل فائٹر ایک بھینسے سے لڑتے لڑتے ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ خواہ مخواہ۔"

اب شام کو ماری پور پہنچ کر سکون سے فرمایا۔ ممی ہمرا بیاہ طے کر دیمن ہیں۔ سلو اور ان کے تینوں بھائی ہمیشہ اپنی ننہیالی اودھی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

نورافشاں نے کہا۔ "سنا ہے سلو تمہارے منگیتر بہت خوبصورت ہیں۔ سبز آنکھیں۔"

"ہاں ہم نے دیکھا تھا جب ممی اور ابی سے ملنے آئے تھے۔ کچھ ہری سی آنکھیں ہیں۔"

سلو کا جواب نہیں تھا۔ دراصل وہ بھی اپنے شدید سنس آف ہیومر کی وجہ سے دنیا کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی عادی تھیں۔

ڈاکٹر شبر حسن' خواجہ غلام السیدین کے کزن تھے۔ (ان کے بھائی مبشر حسن آئندہ برسوں میں سیاسی لیڈر اور بھٹو کی کابینہ کے وزیر بننے والے تھے)۔ لاہور سے بارات آئی۔ سی فیلڈ روڈ پر بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ لڈن ماموں بیمار رہنے لگے تھے۔ جب سلو رخصت ہو رہی تھیں' کار کے پاس جا کر ان کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اور آنسو ضبط کئے۔

چند روز بعد لڈن ممّا کا مرض شدت پکڑ گیا۔ اللہ کو پیارے ہوئے۔ چھوٹے بھائی الن ماموں سندھ سے اور سلو لاہور سے روتی دھوتی کراچی پہنچیں۔ لڈن ماموں نے کچھ عرصہ قبل ناظم آباد میں کوٹھی بنوانا شروع کی تھی۔ خود سی فیلڈ روڈ پر رہتے تھے۔ ناظم آباد میں نامکمل مکان کے برآمدے میں لا کر ان کا سیاہ تابوت رکھا گیا۔ زہرا ممانی دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ مراد آبادی رشتے داروں کا ہجوم جمع تھا۔ اماں سفید ساری پہنے ایک طرف بیٹھی تھیں۔ 1924ء میں لڈن ماموں اماں کو اپنے بیاہ میں لے جانے کے لئے سولن پہنچ گئے اور سولن سے مراد آباد کے راستے میں اماں نے لپاجھپ سہرا تصنیف کیا تھا۔

دولھا بنا غضنفر چمکے فلک پہ اختر
جھک جھک کے چومتا ہے کیا ماہتاب سہرا

محلہ سادات لانگڑی کے ہونہار نوجوان رجسٹرار ہاؤس علی گڑھ کے کھلنڈرے طالب علم انڈین پولیس کے اعلیٰ افسر' تہران کے ڈپلومیٹ' مانچسٹر کے کاروباری' اور آخر میں صرف ایک سیاہ تابوت۔

لڈن ماموں کی زندگی میں میاں صبیب کی نسبت پی۔ آئی۔ اے کی حسینہ فاروق سے طے ہو چکی تھی۔ کچھ عرصے بعد شادی ہوئی جو کراچی کی ایک "میجر سوسائٹی ویڈنگ" تھی۔

حسینہ بیگم رخصت ہو کر سی فیلڈ روڈ آگئیں' کہ تسلسل حیات یونہی قائم رہتا ہے۔ ناظم آباد والی کوٹھی کرائے پر اٹھ گئی اس میں سرسید گرلز کالج قائم ہو گیا۔

افضل خالو مرحوم' لڈن ماموں مرحوم' حسنین ماموں' الن مما' ثروت اور منظور اور چھبو خالائیں' اور ان سب کی رنگ لیڈر اماں۔ یہ کزن لوگ اپنے زمانے کے BRIGHT YOUNG PEOPLE تھے۔ الن ماموں کہتے۔ "ارے تم نے نذر باجی کو ان کے انحطاط کے وقت دیکھا ہے۔ جوانی میں ایسی زبردست شخصیت تھیں کہ خاندان میں سارہ برن ہارٹ کہلاتی تھیں۔ سب ان سے تھر تھر کانپتے تھے۔" ہم برائیٹ ینگ پیپل کو سارہ برن ہارٹ کی اہمیت بھی معلوم نہ تھی۔ ہر دور کے سنہ ذہنی کردار دوسرے دور کے لئے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اور الن مما کہتے۔ "باجی کے ناول آہ مظلوماں کی ان کی بغیر اجازت نام بدل کر بمبئی میں ایک خاموش فلم بھی بن گئی تھی۔ پھر اچانک ان کو کچھ یاد آتا اور کہتے۔ تم نے رڈولف ویلنٹینو کا شیخ نہیں دیکھی۔ کیا پکچر تھی۔" (رڈولف ویلنٹینو بھی ہمارے لئے بے معنی تھا۔) اور یہ اماں لوگ (ثروت' منظور' چھبو خالائیں' اکبری نانی) ROARING TWENTIES کے فیشن برت چکی تھیں اور اماں ۳۲ء میں ستار بجاتی تھیں اور کار چلاتی تھیں اور زہرا ممانی شیر کا شکار کرتی تھیں۔ اور لڈن ماموں بے خوفی سے جا کر نامور ڈاکوؤں کو پکڑتے تھے اور گھر واپس آکر الن ماموں کے ساتھ غزلیں گاتے تھے۔ اور سوز پڑھتے تھے۔ اور پھر کلب جا کر جھلملی دالی بند گاڑیوں' برطانوی سیلون کاروں' شکار گاہوں اور ڈائینا آف دی اپ لینڈ اور "ماسٹر لیمنٹن" کی روغنی نقلوں سے سجے دیوان خانوں کی ELEGANT دنیا سے نکل آئے تھے اور عصری دنیا میں شامل تھے۔ ان میں چند ثروت' منظور' افضل علی جوان مرے تھے۔ اب لڈن ماموں چھپن سال کی عمر میں روانہ ہو گئے۔ دفعتاً احساس ہوا کہ ان لوگوں کے لئے کوچ کا نقارہ بجنا شروع ہو چکا ہے اور یہ بڑی دہشت ناک بات تھی۔

۲— کنول بن

سید ہاشم رضا اب وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ "ہم شعبہ فلم کی توسیع کر رہے ہیں۔ آپ ڈی اے ایف پی میں واپس آجایئے۔"

مصنف "گریز" و "ایسی بلندی ایسی پستی" نے (جو اب ڈی۔ اے۔ ایف پی کے ڈائریکٹر تھے) کہا

کہ کچھ عرصہ آپ امریکن ایڈوائزر سے فلمسازی اور اسکرپٹ رائیٹنگ ٹریننگ لے لیجئے۔

اس ایڈوائزر کا بہت لمبا چوڑا کارخانہ' بے شمار سٹاف' موٹریں' اسٹیشن ویگن وغیرہ قمر ہاؤس میں پھیلا ہوا تھا۔ اور کام وہاں کچھ خاص ہو تا نہیں تھا۔ میں نے بہت مرعوب ہو کر وہاں جانا شروع کیا کہ نجانے یہ امریکن ایکسپرٹ فلمسازی کے کیا کیا گر سکھلائے گا۔ لیکن حسب معمول چند روز بعد منکشف ہوا کہ محض پریکٹیکل تجربہ اصل چیز ہے۔

میں نے عزیز احمد صاحب سے کہا۔ "وہ سب ٹھیک ہے۔ آپ پہلے کون سی ڈوکومنٹری بنوا رہے ہیں۔"

"پاکستان لوک ناچوں پر ایک رنگین فلم بنانی چاہیئے۔ پہلے آپ ڈھاکہ جا کر کچھ بیک گراؤنڈ میٹرل جمع کرلائیے۔"

ڈھاکہ پہنچ کر میں نے آپا حسنہ سے کہا پچھلی بار پی۔ آئی اے کے لئے ائیر ہوسٹس لڑکیاں تلاش کیں اب فوک ڈانسر ڈھونڈیئے۔"

آپا حسنہ نے فوراً مختلف لوگوں کو فون کیئے۔ ان کے ہاں رقم رقم کے کلاکار آنے لگے۔ زلفیں چھنکائے داڑھیاں بڑھائے۔ دھوتی پوش' تہمد پوش۔

مشہور لوک گیت ایکسپرٹ مولوی منصور الدین احمد نے تشریف لا کر فرمایا۔ "ادھر لوک گیت بہت ہے۔ آپ کو لوک ناچ نہیں ملے گا۔"

ایک صاحب کوئی آکر بولے۔ "ادھر لوک ناچ کی کیا کمی۔ گاؤں گاؤں کسان لوگ ناچتا گاتا مل جائے گا۔"

تیسرے گنی جن نے ارشاد کیا۔ "اسلامی ملک ہے۔ رقص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" چوتھے بزرگوار نے اطلاع دی۔ "ڈانسر سب ہندو لوگ تھا۔ سب انڈیا چلا گیا۔"

ایک بار میں پھر اس نتیجے پر پہنچی کہ ہمارے برصغیر کے "ایکسپرٹ لوگ" عموماً مبہم بات کرتے ہیں۔ اور ہمارے بجید تعلیم یافتہ گنی لوگوں کی ان مبہم متضاد باتوں ہی پر اہل مغرب جھنجلا جاتے ہیں۔ اور متعجب ہوتے ہیں۔

میں نے خود ریسرچ شروع کی یونیورسٹی لائبریری سے کتابیں نکلوائیں۔ پریس کلب جا کر بنگالی صحافیوں سے ملی۔

جوشیلے بنگالی انٹلکچوئیل نذیر احمد نے جن کو میں بی بی سی کے زمانے سے جانتی تھی' موصوف وہاں پاکستان سروس میں بنگلہ خبریں پڑھا کرتے تھے بڑی جانکاری اور جذبے سے کہا۔ "آپ کو اب تک یہاں سب نے گمراہ کیا ہے۔ یہاں پہاڑی علاقوں میں لوک ناچ کی وہ بہتات ہے کہ آپ طے نہیں کر پائیں گی کہ شوٹنگ کہاں سے شروع کریں۔"

لقمان بھائی نے عباس صاحب کو چٹا گانگ ٹرنک کال کیا۔ میں طیارہ پکڑ کر چٹا گانگ پہنچی۔ وہاں سے

عباس صاحب کی جیپ میں رنگامائی جو چٹاگانگ ہل ٹریکٹس کا صدر مقام تھا۔ یہ خطہ بقول نذیر احمد رقص و نغمہ کی جنت تھا۔ لیکن مجھے قبائلی عورتیں رومینٹک پہاڑی ناچ ناچنے کے بجائے کرگھوں پر بیٹھی ملیں یا کھیتوں میں محنت کرتی۔ اور ان کے کاہل مرد ہمسایہ ملک برما کے مردوں کی طرح اطمینان سے گھروں میں بیٹھے چرٹ پی رہے تھے۔ اور چاروں طرف سوروں کے غول۔

ہل ٹریکٹس کے بوڑھے ہردلعزیز ڈپٹی کمشنر مسٹر نبلٹ ان مسٹر آر ایچ نبلٹ کے چھوٹے بھائی تھے جو ۱۹۰۸ء کے دہرہ دون اور اس کے بعد غازی پور میں اباجان کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ پرانے اردو فارسی داں انگریز اور مشرقی یوپی کے انگریز پلانٹرز کی اولاد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے بڑے بھائی آر۔ ایچ نبلٹ الہ آباد میں رہتے ہیں اور نابینا ہو چکے ہیں۔

چھوٹے مسٹر نبلٹ نے برطانوی حسن انتظام کے ساتھ چند گھنٹوں میں ایک قبائلی گروہ کو بلوا بھیجا جو سرکٹ ہاؤس کے لان پر ایک قطار میں کھڑے ہو کر سارے برصغیر کے آدی واسیوں کے مانند آہستہ آہستہ کودنے میں مشغول ہو گئے۔

میں اور مسٹر نبلٹ برآمدے میں بیٹھے تھے میں نے موصوف سے کہا۔ "اب ان سے کہئے ناچیں۔"

ناچ تو رہے ہیں۔ مسٹر نبلٹ نے جواب دیا۔

میں ڈھاکہ واپس گئی اور آپا حسنہ سے کہا نذیر احمد کے بچے کو بلایئے۔ تاکہ اس سے پوچھوں مجھے اس جنگلی بطخ کے تعاقب پر کیوں بھیجا۔ یہ لوگ اس قدر ہوائی باتیں کیوں کرتے ہیں۔؟

مشرقی پاکستان کے محکمہ اطلاعات کے ایک نہایت نفیس انسان اور عمدہ شاعر احسن احمد اشک کلکتہ کے اردو اسپیکنگ بنگالی تھے وہ کہنے لگے۔ "آپ کو اس سلسلے میں اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں آپ ہر کام لگن اور محنت سے کرنا چاہتی ہیں اور یہاں بنگال میں عام رویہ بے فکری اور بے پروائی کا ہے۔ آپ کیمرہ مین لیکر آ جایئے۔ ادھر ادھر گھومئے۔ فلم آپ سے آپ بن جائے گی۔ اس قدر شدید ریسرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں خاصی کنفیوزڈ کراچی واپس پہنچی۔

"میرا خیال ہے اللہ میاں ایسی خلاف شرع فلم بنوانے کے حق میں نہیں۔ میں نے عزیز احمد صاحب سے کہا۔ "لیکن چٹاگانگ ہل ٹریکٹس ایک خطہ جنت نظیر ہے۔ پہلے کیوں نہ صرف اس کے بارے میں ایک رنگین ڈوکومنٹری فلم بنائی جائے؟

بنالایئے۔ عزیز احمد صاحب نے جواب دیا۔

اپنے دفتر کے کمرے میں واپس آکر میں نے رتی، کشور اور عاصم کو فون کئے۔ چلتے ہو تو ڈھاکہ چلئے۔"

پھول کھلے ہیں 'پات ہرے ہیں اور بادوباراں بالکل نہیں۔ جھیلوں میں سرخ کمد' موسم سرما کی دھوپ میں روشن سارا مشرقی بنگال ایک وسیع کنول بن۔ جو "پھول بن" کی طرح ہندی زبان کا ایک اور

خوبصورت لفظ ہے۔

لقمان بھائی سعید بھائی کے مانند ایک انتہائی خوش سلیقہ اور منتظم انسان تھے۔ بنگال میں میرے انواع و اقسام کے سفروں کے لئے سامان جیپ گاڑیوں پر لاد کر بہت پہلے ایئرپورٹ بھیج دیا جاتا تھا۔ مختلف شہروں کو ٹرنک کال ہو جاتے۔ ڈاک بنگلوں اور اسٹیمروں اور ریلوے کی بکنگ ہفتوں پہلے سے کر دی جاتی تھی۔ یہ سارے فرائض مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے محکمہ اطلاعات کے تھے۔ مگر لقمان بھائی مارے محبت کے سارے کام خود اپنے عملے کے ذریعے منٹوں میں کروا دیتے تھے۔

جب رتی، کشور، عاصم اور میں کیمرے سنبھالے ولایتی سیاحوں کی طرح تیج گاؤں ایئرپورٹ پر اترے چٹاگانگ ہل ٹریکٹس کے دشوار گزار سفر پر جانے کے لئے لقمان بھائی سارے انتظامات پہلے سے مکمل کروا چکے تھے۔

جس وقت ہم لوگ ائرپورٹ سے اسٹیٹ بنک پہنچے اوپر برآمدے میں ایک مدقوق، مغموم بنگالن چند کاغذات ہاتھ میں لئے لقمان بھائی کی منتظر بیٹھی تھی۔ وہ مشرقی پاکستان کے جواں مرگ رقاص، بلبل چودھری' کی بیوہ افروزہ تھی۔ آپا حسنہ ڈھاکے میں انواع و اقسام کی لنگڑی بطخوں کی سرپرستی کیا کرتی تھیں۔ میں افروزہ اور بلبل کے پروگرام یورپ میں دیکھ چکی تھی۔ اس وقت وہ لوگ پاکستان میں رقص کی تحریک کے پانیرز تھے اور ان کی ہمت قابل تعریف تھی۔ بلبل نے چند ناچوں کو "اسلامی" بنانے کے لئے لڑکیوں کو ساریوں کے بجائے غرارے پہنا دیئے تھے۔ افروزہ سمیت ٹروپ کے بیشتر لڑکے لڑکیاں ہندو تھے۔

اب افروزہ مجھ سے کہنے لگی۔ ہم لقمان حیدر صاحب سے کلکتہ کے لئے فارن ایکسچینج کی اجازت لینے آیا ہے۔ ادھر سے نیا کوسٹیومز بنوانے کے لئے اس ہفتے ہالینڈ سے ایک امپریساریو پروگرام دیکھنے آ رہا ہے۔ وہ پسند کر لیا تو ہمارے دوسرے یوروپین ٹور کا بندوبست ہونے لگے گا۔ پچھلی بار تو ہم لوگ گورنمنٹ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔"

شوہر کی بے وقت وفات کے بعد وہ بڑی ہمت سے اپنا ٹروپ چلانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی اس نے جھنگیا کی نوک سے اپنے آنسو پونچھے۔ "ہم نے ڈائیلاگ کے ساتھ ٹیگور کا ڈانس ڈرامہ چترانگد ابھی تیار کیا تھا۔

"مگر یوروپ میں تمہارا بنگالی ڈانس ڈرامہ کون سمجھے گا؟" موضوع کا انتخاب اس کے لئے بہرحال بہت مشکل مسئلہ تھا۔ کلاسیکل رقص سوائے کتھک کے سب "ہندوانی" محض بنگالی فوک ڈانس پاکستانی قرار دیئے جا سکتے تھے۔ اور وہ اکثر مصنوعی تھے جنہیں شانتی نکیتن میں تخلیق کیا گیا تھا۔ یا اودے شنکر نے رائج کیا تھا۔ ایک نئی تہذیبی انفرادیت کا تعین نئے ملک کا زبردست مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ مجھے مشرقی پاکستان میں اور زیادہ الجھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ لوگ بنگالی کلچر نیشنلزم کی بیساختہ کشش اور پاکستانی قومی سالمیت اور اسلام کی اتنی ہی زبردست کشش کے درمیان معلق تھے۔ لیکن اس وقت زیادہ تر لوگوں کو اس حقیقت کا واضح احساس نہیں تھا۔

ایک شام افروزہ نے ہم لوگوں کو انجینئرز انسٹی ٹیوٹ مدعو کیا جہاں وہ ڈچ امپریساریو کو اپنا "بیلے" دکھارہی تھی۔ اس بوسیدہ عمارت کے ہال میں تھوڑے سے لوگ موجود تھے۔ سامنے ایک کرسی پر ولندیزی مہمان بیٹھا تھا ذرا تعجب سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ باہر گھپ اندھیری رات میں دور سے شہر کی روشنیاں مدھم مدھم نظر آرہی تھیں۔ پروگرام خاصا کمزور تھا۔ اسٹیج پر "مچھیروں" کے لباس میں منحنی سے لڑکے اور لڑکیاں اسٹیج پر دھپ دھپ کودنے پھاندنے میں مصروف تھے۔

کشور نے چپکے سے کہا۔ "خالہ آپ کا کام تو بن گیا۔ ان سب کو لیکے فلم بنالیجئے۔"

"یہ مصنوعی کمپوزڈ ناچ ہیں۔ میں اصلی مچھیرے اور کسان رقاص تلاش کر نکالوں گی۔ فکر نہ کرو۔ میں نے جواب دیا۔

ڈچ امپریساریو ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے سارا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید کنٹریکٹ نہیں کیا وہاں سے اٹھ کر اپنے متمول 'خوش باش' جگمگاتے یورپ واپس چلاگیا۔

چند روز بعد ہم لوگ ہل ٹریکٹس کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی بار جیپ کشتیوں پر رکھ کر دریا پار کئے۔ چٹاگانگ کے ایک سرسبز ٹیلے پر بنن باجی' عباس صاحب کی دو منزلہ کوٹھی ہمیشہ کی طرح پھولوں سے گھری ہوئی تھی۔ عباس صاحب کلکٹر آف کسٹمز کے غیر شاعرانہ فرائض نبٹانے کے بعد اپنی کتاب سفینۂ غزل کی تصنیف و تالیف میں مشغول ہو جاتے یا لطیفے سناتے۔

مسٹر نبلٹ دور دراز کے گھنے پر خطر جنگلوں میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ ان کو ہرکارے کے ذریعے اطلاع بھجوادی گئی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کی طرح عصا کے سرے پر گھنٹی باندھے دشوار گزار بنوں اور گھاٹیوں میں سے پیدل دوڑتا ہوا جاتا تھا۔ جس وقت ہم لوگ رنگامانی پہنچے۔ برطانوی ایلفی شنسی کے انوسار بوڑھے مسٹر نبلٹ منزلیں مارتے اپنے مستقر پر واپس آکر ہمارے استقبال کے لئے سرکٹ ہاؤس کی سیڑھی پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"مسٹر یونگ اسٹون آئی پری زیوم۔" میں نے ان سے کہا۔

دوسری صبح کیمرہ مین مسٹر مرچنٹ (جو گجراتی میمن تھے اور پاکستان آنے سے قبل بمبئی میں مدھوبالا وغیرہ کی فلموں کی عکاسی کر چکے تھے) مع اپنے ساز و سامان اور اسسٹنٹ کراچی سے آن پہنچے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرنافلی بہتا تھا۔ اور بیحد نظر فریب منظر تھا۔ ہم لوگوں کو پچھلے برآمدے میں جاکر بیٹھے چند منٹ گزرے تھے کہ ایک غریب بنگالی بچہ نظر آیا جو کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا نارنجی پھولوں کے گجرے بغیر ڈورے کے گوندھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے وہ گجرے لاکر مجھے اور کشور کو پیش کئے۔

"یہ بنگالی بڑے آرٹسٹک لوگ ہیں۔ واقعی اس بچے نے دھاگہ استعمال کئے بغیر کیا سبک اور حسین گجرے تیار کئے ہیں۔ کمال ہے۔ عاصم نے حیرت سے کہا۔

میں نے "بخشش" دینے کے لئے پرس کھولا۔ وہ بچہ غائب ہو چکا تھا۔

دوسرے روز میں' جیپ پر بیٹھ کر مقامی بنگالی ڈپٹی کلکٹر کے ساتھ لوکیشن تلاش کرنے پہاڑیوں کی طرف جارہی تھی۔ ایک گھنے پہاڑی جنگل میں سے گزرتے ہوئے میں نے اس بچے کا تذکرہ کیا۔ وہ صاحب بولے۔ "آپ لوگ ویسٹ پاکستان سے ہمیں یہاں بخشیں دینے آتے ہیں۔ یہی سرپرستانہ رویہ غلط ہے۔

سارے راستے انہوں نے نہایت اینٹی ویسٹ پاکستان باتیں کیں۔ "آپ مغربی پاکستان سے آنے والے افسرلوگ ہمیں اپنی کولونی سمجھتے ہیں۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔ بغاوت کا منظر نامہ رفتہ رفتہ تیار ہو رہا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پچھلے برآمدے سے برما کی نیلی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ برما میں کشور کے ایک ددھیالی عزیز رہتے تھے۔ جن کا نام اور رشید تھا وہ کشور کے پھوپھا الہ آباد والے ڈاکٹر رؤف کے جوان دنوں کینیڈا میں انڈین ہائی کمشنر تھے' شاید چھوٹے بھائی تھے۔ وہ مدتوں سے بری شہری تھے۔ اور برما کی کابینہ میں وزیر۔ اور رشید کہلاتے تھے او۔ تھانٹ' او۔ ون' او۔ رشید' کمال ہے۔

ایک صبح ناشتے کی میز پر رتی نے دفعتاً مجھ سے کہا۔ لائیے اپنا پاسپورٹ اور ویزا سب اکٹھے رکھ لیں۔

"پاسپورٹ ویزا۔؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔

"ارے آپ لائی نہیں ساتھ؟ کراچی میں آپ سے کہا تھا کہ برما کا ویزا بنوا کر لیتی چلیے۔ یہاں سے او۔ رشید کے ہاں جائیں گے۔"

"ایکولی ہوگئی۔ یاد ہی نہیں رہا۔"

"ہاتھی لوگ آگیا ہے۔" میرے چپڑاسی نے جو کراچی سے آیا تھا دروازے میں آکر اطلاع دی۔

میں ایک آہ سرد بھر کر کرسی سے اٹھی۔

"تم لوگ ہو آؤ۔ میں اتنے ہاتھی لوگ کی شوٹنگ کراؤں۔"

"کہا برما چلا جاؤں؟" عاصم نے پوچھا۔

"کہا برما چلے جاؤ۔ میں نے افسردگی سے جواب دیا

"خالہ کاش آپ پاسپورٹ ساتھ لے آتیں۔ کشور نے ایک اور گہری آہ کھینچی

"BEG TO REPORT, SIR, I AM AN IDIOT"

میں نے گڈ سولجر شویک کی طرح دہرایا۔

شام کو عاصم نے پی۔ آئی۔ اے کا فلائٹ پروگرام دیکھتے ہوئے گڈ سولجر شویک کے مانند مستعدی سے کہا۔ "۲۶ تاریخ کو تین بجے دوپہر چٹاگانگ کے ہوائی اڈے پر آپ سے ملیں گے۔"

دوسرے روز صبح وہ لوگ رنگون جانے کے لئے چٹاگانگ روانہ ہوئے۔ جب ان کی جیپ سرکٹ ہاؤس کے پھاٹک سے نکلی میں نے مرچنٹ سے کہا۔ "کیمرہ چلا دو۔ یہ بھی فلم میں ڈال دیں گے۔ گویا ٹورسٹ لوگ رنگامانی سے واپس جا رہے ہیں۔"

۲۶ء تاریخ' وقت مقررہ پر پی- آئی- اے کا طیارہ رنگون سے آکر چٹاگانگ ایئرپورٹ پر اترا- اس میں سے صرف دو عدد برمی خواتین برآمد ہوئیں اور چند بنگالی- رتی 'کشور' عاصم ندارد-

کاکس بازار کے چار پانچ اداس صورت بھکشو چندھے چندھے ادھر ادھر آ کتے ہوائی جہاز کی طرف جانے کو تیار ہوئے- میں نے پھر رتی 'کشور' عاصم کی تلاش میں نظریں دوڑائیں- نگاہ اخبار کی سرخی پر پڑی جو قریب کھڑا ایک بنگالی مسافر پڑھ رہا تھا- "برما میں کرین بغاوت-"

مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے جوش سے مطلع کیا- "میڈم- برما میں ریوولوشن چل رہا ہے-"

برما ان ملکوں میں سے تھا جہاں ریوولوشن مستقل چلتا رہتا تھا- میں رتی 'کشور' عاصم کے متعلق از حد متفکر دوسرے طیارے سے ڈھاکہ واپس پہنچی-

آپا حسنہ اور لقمان بھائی نے مجھے تنہا واپس آتا دیکھ کر پریشانی سے پوچھا- "وہ تینوں کہاں رہ گئے؟-"

رتی کشور کا چھوٹا بچہ بھی ساتھ گیا تھا- ایئرپورٹ اسٹیٹ بنک پہنچتے ہی لقمان بھائی نے پاکستانی سفیر متعینہ رنگون کو ٹرنک کال کی- معلوم ہوا وہ لوگ لاپتہ ہیں- ہم لوگوں کا پریشانی کے مارے برا حال- برما کے منسٹر- او- رشید کے پاکستانی رشتے دار باغیوں کے لئے آئیڈیل Hostage ثابت ہو سکتے تھے- ان کا لیڈر برمی پرائم منسٹر کو پیغام بھیجے گا کہ اتنے لاکھ روپے دو یا ہماری فلاں فلاں شرائط پوری کرو ورنہ-

لقمان بھائی رنگون کے پاکستانی سفارت خانے اور او- رشید کو مستقل ٹرنک کال کرنے میں معروف رہے- ایک روز تیسرے پہر چند اردو شعرا آگئے- پریشانی بھلانے کے لئے برآمدے میں بنھ کر ان کا تازہ کلام سنا جا رہا تھا کہ باچھیں لٹکائے وہ تینوں زینے پر نمودار ہوئے- کشور کی گود میں اس کا بچہ اور اس کے ساز و سامان کی ٹوکری- رتی' عاصم کی ہاتھوں میں کیمرے اور فلاسک-

رتی نے اطمینان سے کہا- "وہ دراصل ہوا یہ کہ ہم لوگ ایک پگوڈا دیکھنے جا رہے تھے- ڈرائیور جنگل میں راستہ بھول کر باغی علاقے میں جا پہنچا- خیریت ہوئی- بال بال بچے- ایک جھاڑی میں سے کرین باغی لیڈر نکلا بندوق تانے' ہماری لینڈ روور رکوا کر باز پرس شروع' ڈرائیور برمی تھا' اس سے بات چیت کی- پھر ہماری طرف متوجہ ہوا' لڑکا سا تھا' انگریزی جانتا تھا"

"بس تم نے اپنی لچھے دار باتیں اس سے شروع کر دی ہو گی-" میں نے رتی سے کہا-

"بے حد دوستی ہو گئی- اپنے گاؤں لے گیا- دو دن مہمان رکھا-"

"غرضیکہ خوب ایڈونچر رہے-" عاصم بولے

"اصلی تے وڈے ایڈونچر-" میں نے رشک سے کہا- "کاش میں اپنا پاسپورٹ لانا نہ بھولی ہوتی-"

"انسان کو اپنا پاسپورٹ ہمیشہ ساتھ رکھنا چاہیئے- کیا پتہ کس وقت کس ملک کے ریوولوشن یا کاؤنٹر

ریوولوشن میں پہنچنے کا اتفاق ہو جائے-" آپا حسنہ بولیں-

"پاسپورٹ کی طرح میں نے ریوولوشن پر چند نظمیں لکھ رکھی ہیں- نجانے کس وقت کام آ جائیں-" ایک نوعمر شاعر نے مزاحاً کہا-

"ہماری تازہ نظم ملاحظہ کیجئے-" ایک بھولے سے بہاری شاعر نے مجھ سے کہا- "کل یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں-آپ کے لیئے جو عصرانہ دیا جانے والا ہے اس میں یہ نظم پیش کروں گا-" انہوں نہایت جوش و خروش سے پڑھنا شروع کیا- نظم کا ہر چوتھا مصرعہ--- "ای پاکستان ہمارا" پر ختم ہوتا تھا-

"اردو میں بھوجپوری کا کیا حسین استعمال آپ نے فرمایا ہے-" عاصم نے سنجیدگی سے داد دی-

شاعر نے وضاحت کی- "ای پاکستان یعنی ایسٹ پاکستان-"

نجانے وہ بچارے بہاری شاعر ابھی زندہ ہیں یا ۱۹۷۱ء میں مارے گئے-

اس رات عاصم' رتی 'کشور ہاتھی بیچ کر سوئے- سارے میں گہرا سناٹا طاری تھا- مگر کوئی ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی- لقمان بھائی کے خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں سے جو نیچے پام کے جھرمٹ میں پوشیدہ تھا- "واہ واہ- سبحان اللہ- کیا ندرت خیال ہے-" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں- پھر غزل خوانی شروع ہوئی- نہایت مترنم-

ڈچ گورنر کا بھوت نہ صرف غزلیں کہنے لگا ہے بلکہ ان کو ترنم سے پڑھتا ہے- میں نے سوچا-

آپا حسنہ بھی جاگ اٹھیں-

میں نے کہا- "یہ رتی' عاصم تو ہو نہیں سکتے- دونوں استاد ترنم باز تھے- یہ انکا سٹائل نہیں ہے- علاوہ ازیں آج ہی برما سے تھکے ماندے آئے ہیں' آدھی رات کو نیچے گیسٹ ہاؤس میں جا کر غزل خوانی کیوں کرنے لگے؟"

اب وہاں باقاعدہ مشاعرہ ہو رہا تھا-

آپا حسنہ نے کان لگا کر سنا پھر بولیں- "ارے چند صاحبان اردو کانفرنس کے لیے آج رات لاہور سے آنے والے تھے- وہی آگئے- ہزہائی نس نے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا دیا ہو گا-" آپا حسنہ لقمان بھائی کو ہمیشہ تفریحاً ہزہائی نس کہتی تھیں-

آپا حسنہ کا گھر ڈھاکے میں اردو والوں کا مستقر تھا' مشاعرے' ادبی محفلیں' انجمن ترقی اردو کے معاملات جنکی دیکھ بھال آپا حسنہ کی زیر نگرانی سرور بارہ بنکوی کرتے تھے-

اس خطے کے سیاسی اور لسانی مسائل کے لحاظ سے یہ سب بڑا غیر حقیقی اور افسانوی سا ماحول تھا- جو الامکھی کا لاوا ابھی بہت نیچے اندر ہی اندر پک رہا تھا- اوپر پھول کھلے تھے' پات ہرے تھے' فی الوقت فضا نہایت پر سکون تھی- ڈھاکہ بسرعت ترقی کر رہا تھا- بلند و بالائی عمارتیں' "نیو مارکیٹ" تعمیر ہو گئی تھی- جس میں لقمان بھائی کی "پاکستان کو آپریٹیو بک سوسائٹی" کی دوکان بھی تھی جسے وہ بڑی ذوق و شوق سے دیکھنے جاتے تھے- اس میں کلکتہ سے بھی کتابیں آتی تھیں- لقمان بھائی شدید پاکستانی نیشنلسٹ اور ان تھک

خادم قوم تھے۔ کسی سرکاری کام سے سمندر پار جاتے تقریباً سارا فارن ایکسچینج جو انکو بیرونی سفر کے اخراجات کے لئے ملتا واپس لا کر بینک میں داخل کر دیتے۔ "کیوں صاحب میں فضولیات کی خریداری میں پاکستان کا قیمتی فارن ایکسچینج کیوں برباد کروں۔" بہت کم لوگ لقمان بھائی کی آئیڈیلزم اور اصول پرستی کو سمجھ پاتے تھے۔ لقمان بھائی رات گئے تک نچلی منزل کے دفتر میں کام کرتے رہتے۔ سوتا سب سنسار جاگتا پاک پروردگار اور فائلوں میں مستغرق سید لقمان حیدر۔ ان کے دفتر کی روشنی سے باغ کا ایک حصہ منور رہتا۔ سارے احاطے پر سناٹا چھا جاتا۔ رات گہری ہوتی اور سارا بنگال ایک بیکراں خواب میں ڈوب جاتا۔ جس خواب کی تعبیریں مختلف تھیں اور اس خواب کا کوئی ساحل نہ تھا۔

کراچی واپس پہنچنے کے چند روز بعد اطلاع ملی کہ چٹاگانگ ہل ٹریکٹس کے مقبول ڈپٹی کمشنر بوڑھے مسٹر ہلٹ کو بندربن کے گھنے جنگل میں ایک پاگل ہاتھی نے کچل کر ہلاک کر دیا۔

۳۔ بنجارہ چاند

لوگ باگ اپنے اپنے خواب دیکھتے چاند کے بجرے پر سوار ایک مہینے کے بعد دوسرا مہینہ' تیسرا مہینہ' بارہ مہینے' بارہ سال' ساری عمر بتا دیتے ہیں اور چاند کا ملاح اپنے مسافروں کو فنا کے سمندر میں پھینکتا جاتا ہے۔ اور اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ دریاؤں اور سمندروں پر بہتا ہے۔ جنگلوں' صحراؤں' پہاڑوں اور شہروں پر بھٹکتا ہے۔ دیس دیس کو جھانکتا پھرتا ہے۔ ہر ملک اور ہر موسم کے چاند کی خصوصیت مختلف ہے۔ مشرق کا چاند گرم اور نارنجی ہے۔ مغرب کا سرد اور پیلا۔ پنجاب کا نیا چاند اس کے شاعروں کو درانتی معلوم ہوتا ہے۔ بنگال کے شاعروں کو پدما پر بہنے والی نوکا۔ لیکن چاند دلی اور کراچی کے لوگوں کو بیک وقت نظر آتا ہے۔ اور چیزیں اس طرح نظر نہیں آتیں۔

جولائی کے مہینے میں بحیرہ عرب سے اٹھنے والے بادلوں میں چاند کبھی کبھی چھپ جاتا تھا۔ ایک روشن رات لندن سے کرشنا آل حسن کراچی وارد ہوئی اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے ہاں ٹھہری۔ کرشنا کے پاس برطانوی پاسپورٹ تھا اور وہ اپنے والدین سے ملنے انڈیا جا رہی تھی۔ مسز سلیم الزمان صدیقی (جو ایک جرمن خاتون تھیں) نے مجھ سے کہا چلو ہم لوگ بھی کرشنا کے ساتھ بذریعہ ٹرین ہندوستان ہو آئیں۔

کراچی سے لاہور پہنچ کر آپا ممن کے ہاں لارنس روڈ پر کرشنا نے بھائی جان سے بحثیں کیں۔ اور اعجاز حسین بٹالوی سے ملنے ماڈل ٹاؤن گئی۔ اس نے اعجاز کے ساتھ لندن میں بیرسٹری پڑھی تھی۔ ایک روز ریڈیو اسٹیشن پر پہلی مرتبہ میری ملاقات ن۔ م۔ راشد سے ہوئی جو نیو یارک سے چند روز کے لئے آئے ہوئے تھے۔ شوکت تھانوی نے میرا تعارف کرایا۔ "یہ ریڈیو کی بیٹی ہیں اور کرشنا ریڈیو کی بہو۔" آل حسن آل انڈیا ریڈیو سے ۴۷ء میں بی بی سی انڈین سیکشن گئے تھے۔

جس رات ہم لوگ نمبر ۴۹ لارنس روڈ سے نور جہاں کے مقبرے گئے۔ چاند راوی کے کنارے شمع مزار کی طرح جل رہا تھا۔

تیسری رات وہی چاند جمنا میں اشنان کرتا ملا۔ جمنا روڈ پر شانت لتا بہادر کا گھر تھا۔ کچھ فاصلے پر علی روڈ پر بلی بھابی مقیم تھیں۔ وہ لندن سے واپس آ چکی تھیں۔ اور نور الدین بھائی نے میڈنز ہوٹل کے سامنے ایک دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔ امینہ روسی زبانی کی ایکسپرٹ ہو کر لندن سے لوٹی تھی۔ کچھ عرصہ قبل خرد شیف اور بلگانن کی آمد پر پنڈت جواہر لعل نہرو نے امینہ کو ان کے ہندوستان کے دورے کے زمانے میں دونوں کا ترجمان مقرر کیا تھا۔ اب وہ انڈین فارن سروس کے ایک روسی اور فرانسیسی داں افسر سے شادی کر کے ماسکو جا چکی تھی۔

جمنا روڈ پر ایک روز شانت کے ہاں صبح کے اخبار میں وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد کے متعلق کوئی خبر پڑھتے ہوئے خیال آیا نجانے پھر کبھی مولانا سے ملنے کا موقع ملے نہ ملے ان سے ملاقات کرآنا چاہیئے۔ ان کے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خان کو فون کیا۔ چند منٹ بعد انہوں نے جواب دیا۔ "مولانا بہت خوش ہوئے۔ کل شام چار بجے تشریف لائیے۔"

دوسرے روز جب میں مولانا کے بالکل سادے سے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھی وہ فوراً کمرے میں داخل ہوئے۔ آتشدان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور مجھے غور سے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "تم سجاد کی لڑکی ہو۔" پھر ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ چند لمحے خاموش رہے۔ چائے آئی۔ چائے پیتے ہوئے دریافت کیا۔ "پاکستان میں کیا کر رہی ہو۔"

پوچھا۔ "ذہنی طور پر خوش ہو؟ یہاں واپس آؤ گی۔؟"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تم واپس جا کر مجھے خط لکھو۔ میں جواہر لعل سے کہوں گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "بہت مشکل بات معلوم ہوتی ہے۔ ناممکن۔"

"بہرحال۔" مولانا آزاد نے فرمایا۔ "اگر تم چاہو تو مجھے لکھنا۔ میں پوری کوشش تمہاری لیئے کروں گا۔"

دوسری شام خواجہ غلام السیدین کے ہاں جو ان دنوں وزارت تعلیم کے سکریٹری تھے جتنے لوگ ملے سب نے جوش صاحب کے متعلق پوچھا۔ میں جوش صاحب سے کبھی ملی نہیں تھی۔ انکے اچانک پاکستان چلے جانے پر دلی میں کافی تہلکہ مچا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا جوش صاحب کو صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ ابا جان سے ملنے نمبر ۱۲ فیض آباد روڈ آئے تھے۔ میں نے باہر لان پر گھوم رہی تھی۔ ایک صاحب' سرخ و سفید' گاڑی سے اترے' سفید براق کرتا پائجامہ اور معطر' ابا جان کے لئے پوچھا۔ میں نے کہا وہ گھر پر نہیں ہیں۔ واپس چلے گئے۔ کراچی میں ملاقات کا ان سے کبھی اتفاق نہ ہوا۔ دلی میں انکے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔

ٹرین علیگڑھ کے مانوس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ آپا حسنہ اور آپا زہرا دونوں نند بھاوج پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔ آپا حسنہ لاہور سے آئی ہوئی تھیں جہاں دو ماہ قبل لقمان بھائی کا ڈھاکے سے تبادلہ ہو گیا

تھا۔ آپا حسنہ کے والدین چچا نثار حیدر زیدی اور پھوپھی حمیدہ نہٹور میں اور اکلوتے بڑے بھائی سید جرار حیدر علی گڑھ میں رہتے تھے۔ تقریباً سارا خاندان پاکستان جا چکا تھا مگر جرار بھائی اور آپا زہرا نے بوجہ شدید آئیڈیلزم اور وطن پرستی 'ترک وطن' نہیں کیا تھا۔ لقمان بھائی والی اصول پرستی کی طرح اس آئیڈیلزم کو بھی بہت کم لوگ سمجھ سکتے تھے۔

چچا نثار حیدر نہٹور میں اب تک پرانی زمیندارانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یوکلپٹس اور گلاب کے وسیع پائیں باغ کے سمر ہاؤس میں بریکفاسٹ سرو کیا جاتا تھا۔ سات آٹھ ملازمین خدمت میں حاضر تھے۔ لقمان بھائی اور رقی میاں کے والد چچا غنی حیدر اور ہمارے پھوپھی زاد بھائی سلطان حیدر کبیر بھی پاکستان نہیں گئے تھے۔ یہ تینوں بزرگ نہٹور میں مقیم پاکستان سے اپنی اولاد اور عزیزوں کے خطوط کے انتظار میں مصروف رہتے تھے۔

سانتا کروز کے پرانے ائیرپورٹ پر شگفتا قدوائی کی چھوٹی بہن وٹا سمال منتظر ملی۔ چرچ گیٹ پر ایروز بلڈنگ کے پانچویں فلور پر اس کا فلیٹ تھا۔ سامنے گھاس کا وسیع بیضوی میدان مون سون کے پانی سے بھیگ رہا تھا۔ ایک رات طیارہ بمبئی سے اڑ کر کراچی پہنچا۔ چاند بحیرہ عرب پر ساتھ ساتھ تیرتا بمبئی سے کراچی آ گیا۔ اس کو ویزا پاسپورٹ سیاست کسی بات کا مطلق پرواہ نہیں۔

لو اب اسی چاند کا ایک اور قصہ سنو۔ کہ حقیقت فسانے سے عجیب تر ہے۔

آپا راضیہ اور بھائی عالم نے ناظم آباد میں مکان بنوانا شروع کیا۔ کچھ عرصے سے کام کی نگرانی کی خاطر باجی راضیہ خیمہ لگا کر وہیں قطعہ زمین پر رہتی تھیں۔ سینٹ پیٹرک اسکول ماری پور کی تعطیلات میں ان کے تینوں چھوٹے بچگان۔ رانی 'گڈو اور بھیا ناظم آباد گئے ہوئے تھے۔ ایک رات بعد نماز عشا آپا راضیہ نے کہا۔ "چلو ڈھونڈتے ہیں کہیں پڑوس کے مکانوں میں تمہارے ساتھ کھیلنے کے لئے ہم عمر بچے مل جائیں۔ چنانچہ وہ مع اطفال تیز چاندنی رات میں سڑک پر چہل قدمی کرتی چلی جاتی تھیں کہ ایک نئے مکان کے سامنے چاندنی میں چمکتی خنک ریت لڑکیاں، ننگے پاؤں شملتی نظر آئیں۔ چاندنی میں ان کے چہرے روشن تھے۔ ان میں سب سے چھوٹی رانی کی ہم عمر تھی۔ باجی راضیہ نے ان کے قریب جا کر السلام علیکم کہا اور اپنا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ کچھ فاصلے پر وہ اپنی کوٹھی بنوا رہی ہیں۔ سب سے بڑی لڑکی اختر جہاں جو بہت حسین تھی۔ اخلاق سے سب کو گھر کے اندر لے گئی اور اپنی والدہ سے ملوایا۔ کمرۂ نشست میں بک شیلف پر "میرے بھی صنم خانے" رکھی ہوئی تھی۔ رانی نے چونک کر کہا۔ "ارے۔ یہ تو ہماری خالہ کی کتاب ہے۔"

بڑی لڑکی اختر جہاں جس نے کراچی یونیورسٹی سے اسی سال بی۔ اے کیا تھا۔ ادبی ذوق رکھتی تھی اور "میرے بھی صنم خانے کے نسوانی کردار" کے عنوان سے ایک ٹاک بھی کراچی ریڈیو سے نشر کر چکی تھی۔ یہ سی۔ پی (جسے اب مدھیہ پردیش کہتے ہیں) سے آیا ہوا کنبہ تھا۔ اور بہت نفیس اور مہذب لوگ تھے۔

کچھ عرصے بعد آپا راضیہ نے عاصم کی شادی اختر سے طے کر دی جو نومبر ۵۶ء میں منعقد ہوئی۔

رقی میاں پی۔ آئی۔ اے کے ڈسٹرکٹ مینیجر ہو کر مع کشور جینیوا چلے گئے۔ اسی زمانے میں سوئٹزرلینڈ کے پاکستانی سفارت خانے سے ہمارے تایا زاد بھائی یعنی کشور کے ماموں سید امتیاز حیدر کراچی واپس آ چکے تھے۔ خورشید زیدی نیوی میں شامل ہو کر ٹریننگ کے لئے انگلستان چلے گئے۔ مشرق اور مغرب میں ذہنی طور پر بیک وقت اور جغرافیائی طور پر باری باری زندگیاں گزارنا برصغیر ہندوپاک کے PRIVELEGED طبقے کا نارمل پیٹرن بنتا جا رہا تھا۔

"چٹاگانگ ہل ٹریکٹس" بیس منٹ کی دستاویزی فلم ٹیکنی کلر میں بن کر تیار ہو گئی۔ دستاویزی فلموں کے ایک بین الاقوامی فیسٹول میں یوروپ میں کہیں اسے ایک عمدہ انعام بھی مل گیا۔ اب میں نے لوک ناچ والی فلم کا آغاز کیا۔ مسٹر مرچنٹ بولے۔ لوک ناچ کے لئے ہم ایسٹ مین کلر پاکستان میں پہلی بار ایکسپوز کریں گے۔ پہلے اس کی ایک ٹرائل ریل بنا لینی چاہیئے۔

اتوار کے روز ہمارا مکان فلم اسٹوڈیو میں تبدیل ہو گیا۔ ہنگامے سے خوش اور مضطرب ہو کر ہمارے سارے بل ٹیریر ایک ساتھ بھونک رہے تھے۔ ماری پور کی چند بیگمات جو ہماری خاص دوست لوگ تھیں مطلوبہ رنگوں کی ساریاں پہنے مطلوبہ میک اپ کیئے "ان ڈور سیٹ" یعنی ہمارے ڈرائنگ روم میں جمع ہوئی۔ ای نذ جہاں آرا جدون' نے جو گویا چیف اسٹار تھیں بڑے فلمی اسٹائل سے پیانو بجایا۔ اس کے بعد ڈیڑھ میل دور ائرفورس ہسپتال پہنچے' جو نورافشاں کی عملداری تھی کے پر فضا باغ میں ایک طرف ونگ کمانڈر ڈاکٹر مشرف علی نے جو لکھنؤ کے باشندے' مشہور کا مرثیہ اشرف علی کے چھوٹے بھائی اور ہمارے چنڈو خانے کے ایک رکن تھے کیکٹس کے پودوں کا نادر اور بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اس باغ میں روشوں پر ٹہل ٹہل کر اور فوارے کے کنارے بیٹھ کر اردو ہندی فلموں والی اداکاری کی پیروڈی ہماری "اسٹار لوگ" نے کی۔ نسیم ہمانی دوسری چیف اسٹار تھیں۔ لیکن ای نذ میرے ڈائرکشن کو قطعی مسترد کر کے خود درختوں کے گرد گھوم گھوم کر گاتی رہیں اور بہت تفریح رہی۔

"اوفوہ۔ آج بہت کام کیا۔" شام کو سب "اسٹار لوگ" نے گھر واپس آ کر مضمحل پروفیشنل انداز میں میک اپ اتارتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

۴ شاہ جو رسالو

"سنا ہے آپ ایک ناچ گانے کی سرکاری فلم بنانے لاہور جا رہی ہیں۔ ٹرین سے جایئے اور راستے میں اتر کر موئن جوڈارو دیکھتی جایئے۔ اس سے قبل کہ ہم سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیں آپ کو سندھ کی سیر کرا دیں۔ نادر موقع ہے۔ آپ کو ہم ایسے میڈیول وڈیروں کے زنانخانوں میں ٹھہرائیں گے کہ میڈیول زمانوں کے لئے آپ کا سارا فیسی نیشن ہوا ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھٹے حال ہاریوں سے ملوائیں

گے۔" ایوب بھائی نے مجھ سے کہا۔

سوال یہ ہے۔" اچھے بھائی نے جو ایوب بھائی کی طرح بیحد پروگریسیو آدمی تھے، ہنس کر دریافت کیا۔ "کہ تم کو حکومت نے اب تک ملازم کس طرح رکھا ہوا ہے!" ایوب بھائی اور اچھے بھائی شام کے وقت شہر سے ماری پور آئے ہوئے تھے۔

اچھے بھائی------ سید ظہیر حیدر ابن سید نصیرالدین حیدر مرحوم۔ کچھ عرصہ قبل علی گڑھ سے ہجرت کرکے کراچی آ گئے تھے۔ بھابی کے بڑے بھائی ایوب احمد کرمانی پاکستان ٹائمز گروپ کے روزنامہ امروز لاہور سے مستعفی ہو کر حکومت سندھ کے ڈائرکٹر آف انفرمیشن بن چکے تھے۔ اور گاندھی گارڈن کے قریب ایک بڑی دو منزلہ سرکاری کوٹھی میں اپنے زیر تعلیم چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان سب کا آبائی وطن ضلع بارہ بنکی تھا اور ان کے والد اورنگ آباد (دکن) میں وکالت کرتے تھے۔ تقسیم سے قبل ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ (کنیز فاطمہ حیا بنت جسٹس چودھری نعمت اللہ، ان کی خالہ زاد بہن تھیں۔) ایوب بھائی ایک ہر دلعزیز رنگا رنگ شخصیت کے مالک شگفتہ مزاج انسان تھے۔ عقیدتاً پکے مارکسٹ۔ مگر خاندان نہور میں کہیں میلاد شریف منعقد کیا جاتا تو ایوب بھائی کو سیرت نبویؐ پر تقریر کرنے کے لئے بلایا جاتا اور آپ نہایت عالمانہ اور ترقی پسند میلاد شریف پڑھ کر آتے۔ اب شعلہ نگار صحافی کے بعد ایک بیوروکریٹ بن گئے تھے مگر اپنے اس نئے رول سے زیادہ خوش نہ تھے۔ اچھے بھائی کی بات کے جواب میں کہنے لگے۔

"جبھی تو عرض کر رہے ہیں اس سے پہلے کہ ہمیں نوکری سے برطرف کر دیا جائے آپ لوگ سب چل کر سندھ کی سیر کر لیجئے۔ نادر موقع ہے۔" ایوب بھائی ٹیلی فون کے پاس بیٹھے تھے معاً اچھے بھائی نے گھڑی پر نظر ڈال کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "ایوب ذرا بیگم انیس مرزا سے وقت تو معلوم کرو۔ پھر واپس چلیں۔"

"بور صدیقی وقت معلوم کرنے کے بعد ہمیشہ تھینک یو کہتے ہیں"۔ سید مظہر امام نے کہا۔ اچھو کی دوست انیس مرزا کی سریلی ریکارڈیڈ آواز ۔ وقت وقت بتاتی رہتی تھی۔ ٹن

WHEN YOU HEAR THE TONE. THE TIME WILL BE SEVEN HOURS FORTY MINUTES AND FIVE SECONDS – ٹن – WHEN YOU HEAR THE TONE –

ایوب بھائی نے وقت کا نمبر ڈائل کیا۔

اچھے بھائی نے اپنی رسٹ واچ درست کی۔

شمالی سندھ میں خیرپور ریلوے اسٹیشن پر ایوب بھائی اور ان کے انفرمیشن آفیسر مسٹر بروہی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اسٹیشن سے ہم لوگ سیدھے سابق ریاست خیرپور کے شاہی مہمان خانے گئے جو اب سرکاری گیسٹ ہاؤس تھا۔ اولڈ ورلڈ ڈرائنگ روم میں سرچارلس نیپیر کی تسخیر حیدر آباد سندھ کے لیتھو گراف اور برطانوی تسلط سے قبل کے امیروں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

حضرت بندگان عالی میر صاحب میر محمد خان سلمہ الرحمن والئی حیدر آباد سندھ، میر شاہ محمد خاں میرپور سندھ۔ میر حسن علی خان، امرائے قندوبخارا اور سندھ کے ان امیروں کی طویل گھنی داڑھیوں، شکلوں، وضع قطع اور بھاری بھرکم پن میں ایک عجیب و غریب پر اسرار اور زبجک مماثلت مجھے نظر آئی۔ ایک الماری میں سررچرڈ برٹن مترجم الف لیلے کے سفرنامے کی جلدیں رکھی تھیں۔ سررچرڈ ۱۸۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک سندھ میں سرچارلس نیپیر ـــ اہل ہند "شیطان کا بھائی کہتے تھے") کے اسٹاف پر رہ چکے تھے۔ (انہی حضرت نے عربستان میں جاسوسی کرنے کے لئے مسلمان کا بھیس بدل کر حج کیا تھا۔) ایک طرف جیمز میڈن کا "دی امیرز آف سندھ" رکھا تھا۔ ۱۸۵۴ء کا ایڈیشن اور "تذکرہ اولیائے سندھ" اور شاہ عبداللطیف بھٹائی ۱۶۹۰ء۔ ۱۷۵۲ء کا مجموعہ کلام جو عرف عام میں "شاہ جو رسالو" کہلاتا ہے۔ اور سربارٹل فریئر گورنر بمبئی و سندھ کی لڑکی کی لکھی ہوئی ایک کتاب۔ ایک پورا السناک عہد اس الماری میں مقفل تھا۔ باہر باغ میں سارس مراقبے میں مصروف تھے جو شاہ لطیفؒ کی شاعری کے خاص سمبل تھے۔

دوپہر کو لنچ کی میز پر ایوب بھائی نے پوچھا۔ "سرچارلس نیپیر کی روح سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں۔ لیکن صبح صبح دریچے کے نیچے سے کسی کے گانے کی آواز آئی تھی۔ میں نے باہر جا کر مالی سے پوچھا وہ کہنے لگا شاہؒ کا کلام گا رہا تھا۔

"ہم لوگ کوٹری بھی جائیں گے جس کے قریب شاہؒ کا بھٹ ہے۔ وہ سندھ کا حافظ و رومی تھا۔" ایوب بھائی کے انفرمیشن آفیسر مسٹر بروہی نے کہا۔ وہ نامور قانون داں اور پاکستانی ہائی کمشنر اے۔ کے بروہی مقیم دہلی کے چھوٹے بھائی تھے۔ نہایت ذی ہوش، پڑھے لکھے اور سوئیٹ انسان تھے۔ تقسیم سے قبل انڈین نیوی میں تھے۔ اور بمبئی کی جہازیوں کی بغاوت میں حصہ لے چکے تھے۔

"سندھ پر تصوف کا اتنا گہرا اثر تھا اسی وجہ سے وہ اتنی آسانی سے انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ اقبالؒ اسی لئے رسم و رہ خانقہی کے اتنے خلاف تھے۔" میں نے کہا۔

"یہیں ریاست خیرپور میں ایک گاؤں دراز ہے جسے فقراء "درراز" کہتے ہیں کیونکہ یہاں سچل سرمست پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک ماہر موسیقار اور زبردست وحدت الوجدی تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ "کیا میں کٹھ پتلی ہوں یا گیند یا لٹو یا گھوڑا جس پر سوار موجود ہے یا محل جس کے اندر بیٹھا شہنشاہ اتنی زبانیں بولتا ہے۔ یا سمندر کی موج جو ساحل کو نم کر جاتی ہے۔ یا مہندی یا گلاب، یا بادلوں کے پانی سے بھرا ہوا فوارہ جس میں سورج اور چاند منعکس ہوتے ہیں۔ یا خدا کا سایہ۔ جو نہیں ہے۔ میں بھی وہ نہیں ہوں۔

بروہی صاحب نے آہستہ آہستہ کہا۔ "کیستم، من کیستم، من کیستم، در تحیر ماندہ ام من کیستم، کر سچل میرے خیال میں ایک نشن شاعر بھی تھا۔ اس نے کہا۔ متحد ہو جاؤ اس سے پہلے کہ سورج مغرب میں غروب ہو جائے۔ اہل مغرب تم کو اندھیرے میں لوٹ لیں گے اور پہاڑوں اور میدانوں میں لاشیں پڑی رہ جائیں گی۔ اہل اللہ معموں میں بات کرتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ایک ہو جاؤ تاکہ آنے والی تباہی سے بچ سکو۔ سچل کا انتقال ۱۸۲۹ء میں ہوا۔ انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا۔"

"بچل میں کلاس کونشس نس بھی تھی۔" ایوب بھائی بولے۔

بروہی صاحب نے بچل کے مزید اشعار سنائے۔ میں نے امیروں کے دربار دیکھے۔ غریبوں پر ایک سو مصیبتیں ٹوٹتی دیکھیں۔ گداؤں کو شاہ اور شاہوں کو گدا بنتے دیکھا' بے علم قاضی دیکھے۔ مہذب لائق انسان درماندہ و محزوں ہیں۔ ناکارہ اور نااہل کامیاب اور مسرور' گدھوں کو طوق زرین پہنے دیکھا۔ حاکموں کے دروازوں پر نیک اور پاکباز اور عالم فاضل لوگوں کو نکبت اور فلاکت اور بے قدری کے عالم میں کھڑا پایا۔ اہل علم کو پریشان دیکھا۔ دانشوروں کو پیسے پیسے کے لئے محتاج پایا۔ اور کتے خالص سونے کے زیور پہنے نظر آئے حکام کے خوف سے لوگوں کے چہرے زرد دیکھے۔ سلطنت مغلیہ کو اہل مغرب نے فتح کر لیا اور عنقریب وہ لوگ سندھ بھی پہنچ جائیں گے۔ بچل کی وفات کے ٹھیک چودہ سال بعد چارلس نیپیر نے سندھ امیروں سے چھین لیا۔"

میں نے سامنے لگی چارلس نیپیر کی تصویر کو دیکھا اور مجھے انگریزوں کے بنوائے ہوئے نیوڈر طرز تعمیر کے کراچی جم خانہ کلب میں بیٹھے میر بندے علی تالپور اور میر احمد علی تالپور یاد آئے۔ اور میں نے دوسری پرانی تصویر پر نظر ڈالی۔ حضرت بندگان عالی میر صاحب میر شاہ محمد خان' میرپور سندھ میر حسن علی خان میر۔

ہم لوگ بذریعہ لینڈر رووَر حیدر آباد سندھ کوٹڑی' سکھر اور لاڑکانہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں کس قدر پرانے مقابر تھے۔ زمین میں اتنوں کی خاک موجود ہے۔ کیسے کیسے لوگ چلے گئے۔ زندگی اتنی مختصر ہے۔ لطیف جاگو اور ڈھونڈو۔

راستے میں ایک جگہ صحرا پر اچانک بادل گھر آئے۔ جاڑوں کا بوند ساون۔ شاہ نے سر سارنگ میں کہا ہے۔ سارنگ (بارش) نے کرار جھیل کو بھر دیا۔ اور زمین سر سبز ہو گئی۔ اور ایک جگہ کہا۔ ہر سمت بجلیاں چمک رہی ہیں۔ بادل ہر سو پھیل گئے۔ استنبول' چین' سمرقند' روم' قندھار' دلی' دکن' گرنار' جیسلمیر بیکانیر' امرکوٹ' اللہ سندھ پر بھی بارش برسا کر اسے شاداب کر دے۔

جھیلوں اور جنگلوں میں تیتر بول رہے تھے۔ سارس' بگلے' باز' طوطے' مور قصبوں میں مغلوں اور کلہوڑوں کے عہد کے مکانات اور پھر زرد دھوپ میں تنہا صحرا۔ شاہ نے کہا تھا۔ صحرا' جہاں پرندوں کا گزر نہیں۔ وہاں جوگی اپنی آگ جلاتے ہیں۔ اور جب وہ جوگی چلے گئے تو ان کی جگہ پر نہ تنکے ملے نہ پتھر اور راکھ اڑ گئی۔ اور جوگی اپنے سنکھ پھونکتے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔

بروہی صاحب کہنے لگے۔ "معرفت کی اصطلاح میں بھمبھور وہ سنہرا شہر ہے جہاں شہزادہ پنوں یعنی خدا رہتا ہے۔ اور بھنبھور کے دولتمند دھوبی کی لڑکی سسی انسان کی روح ہے۔ سندھ کے پہاڑ اور دریا اور ریگستان سالک کی راہ کی تکالیف ہیں۔ شاہ کہتا ہے کہ اس سفر میں سالک کو لا کا خنجر اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔ اور سسی نے غزالان خطا اور ہما کی طرح لا انتہا جستجو کا گر سیکھ لیا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے شاہؒ کا انتقال کس طرح ہوا۔؟ آپ بہت سے زیارات کے لئے کربلائے معلی

تشریف لے جا رہے تھے۔ بھٹ سے کچھ دور ہی گئے تھے کہ راہ میں ان کو ایک درویش ملا۔ اس نے کہا۔ شاہ! کہاں جاتے ہو۔ تمہارا اپنا سفر ہی قریب الختم ہے۔ یہ سنکر واپس لوٹے۔ سیاہ پوش ہوئے اور سرکیدارو میں شہادت حسینؓ پر اپنا مرثیہ پڑھنے لگے۔ بیس دن اعتکاف میں رہے اس کے بعد محفل سماع منعقد کروائی۔ جب فقراء اور قوالوں نے سماع ختم کیا اس وقت تک شاہؒ کی روح پرواز کر چکی تھی۔"

"روح کوئی شے نہیں۔ انسان مرجاتا ہے۔ اس کے ساتھ احساس وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔" ایوب بھائی نے جو مادیت پرست مارکسسٹ تھے اظہار خیال کیا۔

سکھر کے ضلع میں نہر کے کنارے کنارے لینڈ رووَر کچے راستے پر ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔ بروہی صاحب اپنے بروہی قبیلے کے متعلق بتلانے لگے جس کی زبان انڈو آریائی سندھی کے بجائے دروآڑی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ بروہی صاحب بولے۔ "ہمارے ہاں اگر کوئی لڑکی بھاگ جائے تو سر پر باقاعدہ کفن باندھ کر بھاگتی ہے۔"

"یعنی اصلی کفن باندھ کر؟" میں نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ بالکل اصلی۔ کورے لٹھے کا کفن ساتھ لیکر گھر سے نکلتی ہے۔ قبیلے کے لوگ اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ اگر پکڑی گئی تو اسے اس کے گھر واپس لا کر باقاعدہ دلہن بنایا جاتا ہے۔"

"میں نے کہا۔ "تب تو آپ کا قبیلہ نہایت روشن خیال ہے۔"

"اسے دلہن بنایا جاتا ہے۔ پھر سارا خاندان اس کے ساتھ ساتھ چلتا اسے دریا کے کنارے لے جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اسے دوزانو بٹھلاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ پھر ایک کلہاڑی سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ بروہی صاحب بولے۔

"گڈ گوڈ۔" میں نے بھونچکی ہو کر کہا۔

"کیوں؟ اگر ایک شریف زادی ایسی قبیح حرکت کرے تو اسے سزا نہ دی جائے؟"

میں متحیر ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ ایک انٹلکچوئیل آدمی تھے اور خیرپور ریلوے اسٹیشن پر انہوں نے مجھے ادبی تنقید کی ایک امریکن کتاب "THE CREATIVE PROCESS" تحفتاً دی تھی۔ اور اس وقت وہ ایسی بات کر رہے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ایوب بھائی چپکے چپکے ہنسی کے مارے دہرے ہوئے جا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "بروہی صاحب جس خطے کے شاعروں نے سسی اور سوہنی اور ماروی جیسی باہمت اور باشعور ہیروئینوں کی تخلیق کی وہاں کی لڑکیوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک؟"

ڈرائیور نے ایک پٹرول پمپ کے سامنے لینڈ رووَر روکی۔ بروہی صاحب اتر کر ایک چائے خانے کی طرف لپکے ہوئے چلے گئے۔ میں نے کہا۔ ایوب بھائی یہ بروہی صاحب بھی لر نکلے۔ ایوب بھائی نے اپنا پسندیدہ "حقہ پیجئے" والا لطیفہ دہرایا۔ ایک صاحب ایک پاگل خانے میں گئے وہاں ان کو ایک بزرگوار ملے جنھوں نے ان کو سارا پاگل خانہ دکھایا۔ نہایت عاقلانہ اور معقول باتیں کیں۔ ملاقاتی ان کو پاگل خانے کا

سپرنٹنڈنٹ سمجھے۔ چلتے وقت ان صاحب نے اپنا انگوٹھا مہمان کے سامنے پیش کر کے کہا۔ حقہ پیجئے۔

"مگر ایوب بھائی یہ حضرت تو ایک انقلابی تحریک میں حصہ لے چکے ہیں۔ اتنی پروگریسو باتیں کرتے ہیں اور اچانک کہنے لگے کہ لڑکی کی سزائے موت حق بجانب ہے۔"

ایوب بھائی بولے۔ "بہت سے جید علماء کے نزدیک قتل مرتد جائز تھا۔ ایک بات۔ دوسری بات یہ کہ وہ قدیم قبایلی ذہنیت ابھی ان کے لاشعور میں کہیں تھوڑی سے پوشیدہ ہوگی۔ وہ بڈھا جس کا نام کارل مارکس ہے کہتا ہے۔"

"گنڈیریاں کھائیے۔ بروہی صاحب کی بشاش آواز آئی۔ سیاہ شلوار۔ ضخیم گپڑ' سیاہ ریش غلافی آنکھوں والا سندھی چائے کی کیتلی اور گنڈیریوں کی پلیٹ اٹھائے الہ دین کے جن کی طرح دھندلکے میں سے نمودار ہوا۔

بروہی صاحب ہنس کر بولے۔ "میں نے محض آپ کو SHOCK کرنے کے لئے کہا تھا۔ یہ قبائلی رسوم ہمارے ہاں پچھلی صدی تک رائج تھیں۔ اب ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے میں اس وحشیانہ قانون کو کس طرح حق بجانب کہہ سکتا ہوں۔ میں تو محض آپ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔"

ضلع لاڑکانہ میں غروب آفتاب کی گلرنگ روشنی میں ہم لوگوں نے موئن جوڈارو کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔ ہم ایک قدیم انسان کے ہمراہ جس کے ابتدائی دراوڑی آباء غالباً سواحل کنعان اور سمیر اور عروق سے نکلے تھے۔ وقت میں پیچھے کی سمت سفر کر رہے تھے۔ اور پیچھے۔ اور پیچھے۔

YOU HEAR THE TONE THE TIME WILL BE WHEN YOU HEAR THE TONE -- WHEN

موئن جوڈارو کے میوزیم کی ایک الماری میں دوسرے سفالی کھلونوں کے ساتھ ایک ننھی سی مٹی کی بیل گاڑی رکھی تھی اور میوزیم کے باہر بالکل عین مین اسی وضع کی بیل گاڑی کچی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ پانچ ہزار سال میں اس بیل گاڑی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

موئن جوڈارو کی صاف ستھری گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ڈائرکٹر آف آرکیالوجی نے ایک دیوار کی اینٹوں میں اٹکی چند سفالی چوڑیاں اور کڑے اور برتنوں کے دو تین ٹکڑے نکال کر مجھے دیئے۔ (جو بعد میں بدقسمتی سے میں نے کہیں گنوا دیئے) ایک مکان میں چولہے کے قریب جھک کر انہوں نے ایک چھوٹی سی ہڈی اٹھائی۔ اسے بغور دیکھا اور بولے۔ کسی نوجوان کے کندھے کی ہڈی ہے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ نایاب تحفہ ہے۔"

میں نے دلی شکریے کے ساتھ پانچ ہزار سال قبل مرے ہوئے اس انسان کی ہڈی بھی پرس میں رکھ لی۔

سکھر ریلوے اسٹیشن پر رات کے بارہ بجے ایوب بھائی اور بروہی اور میں لاہور جانے والی ٹرین کے منتظر تھے۔ ایوب بھائی نے گریٹ کوٹ پہن رکھا تھا جو طفیل احمد جمالی نے چین کے دورے سے لاکر

انہیں دیا تھا۔ اور جسے ہم لوگ ماؤزے تنگ کا کوٹ کہتے تھے۔

"سائیں۔ ریل جو چھٹو کھے ڈیو۔" میں نے بروہی صاحب سے کہا۔

ایوب بھائی جو اگلے جمعے کو لاہور آنے والے تھے قہقہہ لگا کر بولے۔ اب مجھے یہ فکر لاحق ہے کہ اگلے ہفتے میں لاہور پہنچوں گا تو آپ اور آپا ثمن اور آپا حسنہ بے نقط کی سندھی بولتی پائی جائیں گی۔"

میں نے پرس کھول کر اطمینان کیا کہ وہ ہڈی چوڑیوں کی طرح گم تو نہیں ہو گئی۔

"وہ قصہ آپ لوگوں نے سنا ہے۔؟" میں نے کہا۔ "ایک فرانسیسی آرکیالوجسٹ اہرام مصر کی کھدائی کر رہا تھا۔ ایک ممی کی ٹانگ دستیاب ہوئی۔ اسے جھاڑ پونچھ کر خوش خوش قاہرہ اپنے ہوٹل لے آیا۔ ٹانگ الماری میں مقفل کر کے سو رہا۔ آدھی رات کو کھٹ کھٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے ایک حسین لڑکی لنگڑاتی ہوئی کمرے میں کچھ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ فرانسیسی کی گھگھی بندھ گئی۔ بمشکل پوچھا۔ مادام آپ کو کیا چاہیئے؟ بولی۔ موسیو میں آمن ہوپت کی ملکہ ہوں۔ میری ٹانگ فوراً واپس کرو۔"

ایوب بھائی بولے۔ "اپنا کوپے اندر سے اچھی طرح مقفل کر لیجئے گا۔ آدھی رات کو بیچ ریگستان میں ٹرین رک جائے گی۔ کھڑکی میں ایک سر نظر آئے گا۔ ماتھے پر پٹی باندھے موئن جوڈارو کا وہ پروہت یا کمر پر ہاتھ رکھے رقاصہ نمودار ہوگی اور اپنے کندھے کی ہڈی کی واپسی کا مطالبہ کرے گی۔"

اس وقت ریل آ پہنچی میرا کوپے کراچی سے ریزرو کیا جا چکا تھا۔ جلدی سے ڈبے میں سوار ہوئی۔ ایوب بھائی اور بروہی صاحب کو خدا حافظ کہا۔ ٹرین اندھیرے گھپ صحرا کی طرف بڑھی۔ سکھر کے چمکیلے سنسان پلیٹ فارم پر ایوب بھائی اور بروہی صاحب خوش گپیاں کرتے کھڑے رہ گئے۔

لاہور پہنچنے کے تیسرے روز آپا حسنہ لقمان بھائی کے ہاں شام کی چائے پی جا رہی تھی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ لارنس روڈ سے آپا ثمن بول رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی ابھی آپا عذرا نے کراچی سے ٹرنک کال کیا ہے۔ ایوب بھائی کا انتقال ہو گیا۔"

ہم سب بھونچکے رہ گئے۔

چند منٹ بعد فیض صاحب کا فون آیا۔ رات کو وہ گم صم آپا حسنہ کے ہاں پہنچے۔ رات کے وقت انہوں نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ شاید روتے رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر بولے۔ "ہمیں چاہیئے تھا ایوب کو پاکستان ٹائمز سے نہ جانے دیتے۔"

کراچی میں بندر روڈ پر ایک عمارت کی بالائی منزل پر کافی ہاؤس تھا۔ پریس کلب قائم ہونے سے قبل تک ہم لوگ ڈی۔ اے ایف پی کے اخوان الصفا مع کمانڈر عسکری (ابن سعید) ایم۔ سعید' ٹونی منکرانس۔ مشیر اور دوسرے صحافی وہاں جمع ہو کر روزانہ لنچ کھاتے تھے۔ اسی عمارت میں برٹش انفارمیشن سروسیز کا دفتر تھا اور ہم لوگوں کا دوست برٹش انفرمیشن سروسیز کا ڈائرکٹر مک سامپلز بھی نیچے آکر لنچ میں شامل ہو جاتا تھا۔ روزانہ ہنگامہ خیز سیاسی بحثیں رہتی تھیں۔ کافی ہاؤس کے دریچے کے عین سامنے ایک اونچا گھنا درخت کھڑا تھا۔ جس کی شاخیں بالائی منزلوں تک پہنچتی تھیں۔ جہاں رہائشی فلیٹ تھے۔

"پرسوں صبح میں جو تھا میں آپ کے کراؤڈ کے ساتھ کافی ہاؤس لنچ کھانے گیا۔" بور صدیقی نے اداسی سے کہنا شروع کیا۔ وہ اسی روز اپنے کسی کام سے لاہور آئے تھے اور چند منٹ قبل آپا حسنہ کے ہاں وارد ہوئے تھے۔ ہم لوگ رات کے کھانے کے بعد ایوان نشست میں جمع قہوہ پی رہے تھے آمنہ مجید ملک' ضیا سرحدی اور ان کی بیگم بھی موجود تھیں۔ بور صدیقی نے سلسلۂ کلام بازی رکھا۔ ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے جب کافی ہاؤس کی کھڑکی کے باہر درخت کی شاخ ٹوٹنے کی چرچراہٹ اور مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم لوگ سب فوراً ہڑبڑا کر نیچے بھاگے۔ دیکھا ایوب احمد کرمانی خون میں لت پت فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئے۔

"معلوم ہوا کافی ہاؤس سے اوپر والی منزل میں کسی شخص سے ملنے گئے تھے۔ بالکنی میں کھڑے نیچے جھانک رہے تھے۔ توازن قائم نہ رہ سکا۔ اور گر پڑے گرتے میں درخت کی شاخ پکڑی مگر شاخ ٹوٹ گئی اور نیچے آن رہے۔

"بعضوں کا کہنا ہے سندھ کی سیاست میں غلطاں و پیچاں تھے۔ کسی دشمن نے پیچھے سے دھکا دیدیا۔ لیکن وہ شخص جس کے گھر پہ یہ حادثہ پیش آیا روتا پیٹتا یہ کہتا ہے کہ کرمانی صاحب نے اپنے ڈرائیور سے کہا تھا کہ نیچے بازار میں کھانا کھا کر ٹھیک ڈیڑھ بجے واپس آ جائے۔ میری بیوی انہیں لنچ پہ روک رہی تھیں مگر انہوں نے کہا کہ ضروری کام سے کہیں پہنچنا ہے۔ ڈیڑھ بجے وہ بالکنی میں گئے اور ڈرائیور کو آواز دی۔ جب وہ نیچے فٹ پاتھ پر نظر نہ آیا تو اسے دیکھنے کے لئے پنجوں کے بل اچک کر بالکنی کے باہر جھکے اور اچانک گر پڑے۔

"جس شخص کا یہ بیان ہے ظاہر ہے کہ اس نے دھکا نہ دیا ہو گا۔ اس کا سندھ کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔"

آمنہ مجید ملک نے کہا۔ چند روز قبل اس غیر ملکی لڑکی کا فیض صاحب کے پاس روم سے خط آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ پیارے فیض۔

"پیارے فیض۔ بور صدیقی نے چونک کر دہرایا۔

"ہاں۔ پیارے فیض اپنے دوست سے کہہ دیجئے کہ میں ان سے شادی نہیں کر سکتی۔

"اب اس حادثے پر ایک اور اینگل سے روشنی پڑتی ہے۔" بور صدیقی نے اظہار خیال کیا۔

"نونسنس" میں نے کہا۔ "ایوب بھائی بے چارے مدتوں سے اس سے شادی کے خواہاں تھے۔ ایک دوبار اسے ہم لوگوں سے ملانے ماری پور بھی لائے تھے۔ اس حادثے سے چند ہفتے قبل وہ اٹلی چلی گئی تھی مگر ایوب بھائی جیسے ہوشمند' زندہ دل آدمی اس لڑکی کے چکر میں جان تو دینے سے رہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے اگر ایسا ارادہ ہوتا تو ڈیڑھ بجے ڈرائیور کو کیوں بلاتے۔" بور صدیقی نے صاد کیا۔ ڈرائیور کا بیان ہے کہ صاحب کو دو بجے سرکاری کام سے فلاں جگہ جانا تھا۔ وہ زار و قطار روتا تھا کہ مجھے کھانا کھا کر لوٹنے میں دس پندرہ منٹ کی دیری ہو گئی اور میری وجہ سے صاحب کی جان گئی۔"

"مگر قسمیہ یقین نہیں آتا کہ ایوب بھائی اس دنیا میں نہیں رہے۔" ضیا سرحدی نے کہا۔ "ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی' کمانڈر عسکری وغیرہ کے ساتھ۔"

"آپ ہی وہ فلم ڈائریکٹ کریں گے۔؟ ناچ گانے والا؟۔ ضیا صدیقی نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ ڈی۔ اے۔ الیف۔ پی نے اسکو ڈائریکٹ کرنے کا مجھ سے کنٹریکٹ کیا ہے۔"

بور صدیقی نے جوش سے کہا۔ "GOOD THE SHOW MUST GO ON."

اتنے رنج کے موقع پر بھی ہم لوگوں کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ بور صدیقی اب میری طرف متوجہ ہوئے "آپ نے یہاں رقص و سرود کا انتظام کر لیا؟"

"جی ہاں۔ اب ہم لوگ پرسوں صبح یہاں سے ڈھاکہ فلائی کر رہے ہیں۔"

"خوب۔ تو میں بقراط کو تار دیدوں۔ وہاں آپ سے مل لیں۔"

"کہیں آپ جوش میں آ کر واقعی انہی ناموں سے تار نہ دیدیجئے گا۔ بور صدیقی تو بقراط۔ ایسٹ پاکستان۔"

۵— سرکٹ ہاؤس

"سنتھال عورتوں کو" بقراط پائپ سلگاتے ہوئے بولے۔ "میک اپ کی ضرورت نہیں۔ ہم سب کے اندر جو آدی واسی انسان چھپا ہوا ہے گاہے بگاہے نمودار ہونا چاہتا ہے۔ ہم اسے واپس اندر دھکیل کر چہرے پر میک اپ پوت لیتے ہیں یا ماسک پہن لیتے ہیں۔"

میں نے حسب معمول صبر سے ان کی بات سنی پھر عرض کیا۔ "مجھے آدی واسی عورتوں کے لئے میک اپ نہیں خریدنا۔ صرف رنگین سوتی ساریاں درکار ہیں۔"

بقراط نرائن گنج کی ساحلی ریت پر سر جھکائے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر دریافت کیا۔ کراچی میں تو پچھلی مرتبہ آپ نے بتلایا تھا کہ مشرقی پاکستان میں لوک ناچوں کی جستجو ناکام رہی۔"

میں نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں ڈھونڈے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔"

"غلط مفروضہ ہے۔" بقراط نے مختصراً کہا۔

"بہرحال۔ مجھے سراغ ملا ہے کہ ضلع راج شاہی میں سنتھال بستے ہیں اور ضلع سلہٹ میں آسام کی سرحد پر منی پوری باشندوں کا ایک پورا گاؤں آباد ہے۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھا ہوتا تو میں آپ کو بہت پہلے ہی بتا دیتا۔" بقراط نے کہا۔ جو ان دنوں مشرقی پاکستان کے ایک دور افتادہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ موصوف ہم لوگوں کے بچپن کے دوست اور بور صدیقی کی طرح علیگڑھ میں رتی' پارے کے ساتھی رہ چکے تھے۔ اور اس وقت ڈھاکہ سرکٹ ہاؤس سے میرے ہمراہ نرائن گنج تشریف لائے تھے۔

زائن گنج کے ساحلی بازار میں افلاس زدہ بنگالی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے سامنے خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ میں ساریوں کی ایک دکان کے سامنے رک گئی۔ بیس بیس روپے کی موٹے کپڑے کی پچاس عدد رنگین ساریاں خریدیں۔ ان کے بنڈل اٹھا کر چپڑاسی صدر گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں یونٹ کے دوسرے افراد جہاز کے منتظر تھے۔

صدر گھاٹ کے راستے میں ایک جھیل پڑی جس میں کنول کھلے ہوئے تھے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ بقراط اب THOUSAND----PETALLED LOTUS. کی بات کریں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

"گل ہزار برگ۔" انہوں نے فرمانا شروع کیا۔

"فضول بات ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کنول میں ایک ہزار پنکھڑیاں نہیں ہوتیں۔"

"یہ ہندو مابعد الطبیعات کی ایک علامت ہے۔"

"معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ بقراط کو یہ جواب دینے سے انسان ہمیشہ فائدے میں رہتا تھا کیونکہ پھر مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

جہاز نے بھونپو بجایا۔ بقراط عرشے پر آئے۔ اچھا۔ آپ راج شاہی ہو آئیے۔ سری منگل میں ملاقات ہوگی۔" انہوں نے کہا اور سیڑھیاں اتر گئے۔

سری منگل ضلع سلہٹ کے ڈاک بنگلے میں لالٹین روشن کر دی گئی تھی۔ چوکیدار نے تیل کا وکٹورین لیمپ لا کر برآمدے کی وسطی گول میز پر رکھا۔ بقراط نے کرسی برآمدے کے سبز جنگلے کے قریب گھسیٹ لی۔ یونٹ کے افراد دیوار کے قریب آرام کرسیوں پر اکتائے ہوئے بیٹھے مچھر مار رہے تھے۔

"نجانے آپ سب لوگ اس قدر بور کیوں ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ اتنی فیسی نیٹنگ جگہ ہے۔"

"اس ڈاک بنگلے میں کیا خاص بات ہے۔ اللہ میاں کے پچھواڑے۔ نہ بجلی کی روشنی۔ مچھروں کی بھرمار۔ آپ کو فیسی نیٹنگ لگ رہا ہے۔" ایک رفیق کار نے جل کر کہا۔

"مجھے سرکٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلے ہمیشہ سے فیسی نیٹ کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یو۔ پی کے اضلاع کے گھنے جنگلوں میں چھپے سرکٹ ہاؤس اور پہاڑی ڈاک بنگلے جہاں پہنچتے ہی ایک پر اسرار خانساماں جن کی طرح نمودار ہو کر منٹوں میں کھانا تیار کرلاتا تھا۔ مع کسٹرڈ پڈنگ۔ برٹش انڈین ایمپائر کی بنیاد ڈاک بنگلے اور کسٹرڈ پڈنگ اور عبدل خانساماں پر رکھی گئی تھی۔"

اندر سے ایک پر اسرار خانساماں چائے کی کشتی لیے نمودار ہوا۔

بقراط نے کہنا شروع کیا۔ "آپ کو معلوم ہے۔؟"

"جی ہاں۔" میں نے ترنت جواب دیا۔

"جی نہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ ابن بطوطہ۔"

کوئی چیز فرش پر کھٹ سے گری۔ کیمرہ مین مسٹر مرچنٹ لیمپ کی روشنی میں اپنے تام جھام کا کوئی کل پرزہ ٹھیک کر رہے تھے۔ انہوں نے جھک کر وہ چیز اٹھائی۔ بقراط نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑا۔

"ڈاکٹر کون۔"

"ڈاکٹر کون 'کون؟۔ آپ نے ابن بطوطہ سے بات شروع کی تھی۔" میں نے ان کو یاد دلایا۔

"آپ کو معلوم ہے ڈاکٹر کارلٹن کون امریکہ کے عظیم ترین انتھروپولوجسٹ ہیں۔"

"قطع کلام معاف کیجئے گا۔"

"ہرگز نہیں۔" بقراط نے ارشاد کیا۔ "تو پروفیسر کون نے میڈیول عربوں کے تخلیق کردہ بین الاقوامی تمدن کا ذکر کرتے ہوئے کہیں لکھا ہے کہ چودھویں صدی میں جب ابن بطوطہ ٹینجیرز سے مشرق بعید اور جنوبی روس سے زنجبار اور ٹمبکٹو تک غیر مسلح بلا خوف و خطر سفر کرتا پھرتا تھا۔ ہر رات کو اسے راستے میں اسلامی سرکاری مسافر خانے اور کارواں سرائیں اور صوفی خانقاہیں مفت قیام و طعام کے لئے مل جاتی تھیں۔

"یہ ایک یونیورسل اسٹیٹ کے تمدن کی ایک علامت ہے۔" بقراط نے چائے میں شکر گھولتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "قدیم رومن ایمپائر اور اشوک اور چندر گپت موریہ اور علاء الدین خلجی اور شیر شاہ سوری اور شاہان مغلیہ کے ہندوستان اور شاہ عباس کبیر کے ایران اور سلطان سلیمان اعظم کے ترکی اور برطانوی راج کے انڈیا کا بھی یہی نقشہ تھا۔"

"باپ رے۔" مسٹر مرچنٹ نے زیر لب کہا۔

"برٹش انڈیا نے مغلوں کی وارث اسٹیٹ کی حیثیت سے ایڈمنسٹریشن کا بنیادی سانچہ شیر شاہ سوری اور اکبر اعظم سے حاصل کیا تھا۔ ہندستان و پاکستان کی حکومتوں نے یہ برطانوی انتظامیہ اور عدلیہ اپنے ترکے میں پایا۔ انڈین سول سروس کی جانشین ملازمتیں آئی۔ اے۔ ایس اور سی۔ ایس۔ پی جس خوش اسلوبی سے اپنا اپنا نظام حکومت چلا رہی ہیں ان کی برطانوی اساس اس کی بڑی وجہ ہے۔ چنانچہ یہ ڈاک بنگلہ اور سرکٹ ہاؤس اور پر اسرار خانساماں۔" بقراط نے بات ختم کی۔ ان کے چپڑاسی نے نزدیک آ کر مودبانہ ان سے کچھ گذارش کی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں ان کی جیپ تک چھوڑنے گئی۔ انہوں نے کہا۔ "دوسری بات یہ کہ میں عنقریب اس ملازمت سے مستعفی ہو رہا ہوں۔"

"کیوں؟ آپ کو مغلوں اور انگریزوں کا وارث ایڈمنسٹریٹر بنے رہنا پسند نہیں۔؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں میں کینیڈا چلا جاؤں گا۔ اور وہاں رہ کر کتابیں لکھوں گا۔ کل آپ منی پوری ناچ کی شوٹنگ کرانے روانہ ہو رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔ آج کے پاکستان کے سیاق و سباق میں منی پوری ناچ کی کیا معنویت ہے؟"

"اس معاملے پر ذرا غور کرلوں۔ اتوار کی شام سلہٹ کے سرکٹ ہاؤس میں آپ کو بتاؤں گا۔"

بقراط جیپ میں بیٹھے اور گھپ اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

میں برآمدے میں واپس آئی۔

"کس قدر کریک آدمی ہے۔" ایک رفیق کار نے اظہار خیال کیا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ وہ قطب لوگ ہیں جنکی وجہ سے دنیا قائم ہے۔ یہ لوگ سوچتے ہیں۔"

آسام کی سرحد پر منی پوری لوگوں کا وہ بڑا خوبصورت گاؤں تھا۔ اس کی آرٹسٹک چوپال کے سامنے سرکنڈے کے احاطے میں منی پور رقاصاؤں نے ایک ویشنو بھجن کی دھن پر اپنے دلفریب ناچ کا آغاز کیا۔ ایک کمسن لڑکا کرشن کنہیا کے پوشاک میں بانسری ہاتھ میں لئے ان کے گھیرے میں کھڑا تھا۔ مسٹر مرچنٹ نے شوٹنگ شروع کی۔

ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی کے افسر اعلیٰ مسٹر غلام غوث فرید (جو آل انڈیا ریڈیو کے غلام قادر فرید کے بڑے بھائی تھے) گاؤں کے چودھری کیساتھ ایک گلبار درخت کے نیچے بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ منی پوری پیدائشی رقاص ہیں۔ اور ان کے ویشنو بھجنوں کی دھنوں پر نیو تھیٹرز کے میوزک ڈائرکٹروں نے وہ دلآویز گیت کمپوز کئے تھے۔ منی پوری لوگ جو نسلاً نصف برمی اور نصف منگول ہیں خود کو چترانگدا کی نسل سے بتاتے ہیں۔ چترانگدا جو ارجن کی ایک آسامی رانی تھی اور جس پر ٹیگور نے اپنا چترانگدا لکھا۔ جس کا بے چاری افروزہ بلبل ڈھاکے میں بھی ایک بیلے تخلیق کر رہی تھی۔ تو چترانگدا اور منی پوری راس لیلا پاکستان کے منظرنامے میں کس طرح شامل تھی؟ اس کنفیوژن کو کلچر کے نظریہ سازکیوں کر سلجھائیں گے یا نظرانداز کردیں گے۔

اتوار کی رات شہر سلہٹ کی سول لائنز میں دریائے سرما کے کنارے واقع سرکٹ ہاؤس کے ڈائننگ روم کے اندر کافی بڑا مجمع تھا۔ حسب وعدہ بقراط اپنے مستقر سے آچکے تھے۔ ایک بہت سینئر پنجابی سویلین جو مغربی پاکستان سے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم اور ہم سب طویل میز کے دونوں طرف بیٹھے پر تکلف انگریزی ڈنر اڑانے میں مصروف تھے۔ لوک ناچ کی اسی فلم کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔ سینئر سویلین نے ذرا خفگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ یہ فلم پروڈیوس کر رہی ہیں؟ لکھی کس نے ہے؟"

"اسکرپٹ اور کنٹری ناچیز ہی نے لکھی ہے۔"

"سن چالیس میں پاکستان کا جو اسکرپٹ لکھا گیا تھا۔ اس میں رقص و سرود کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس اسکرپٹ کی تصنیف میں آپ کے مرحوم والد ماجد کا بھی کافی ہاتھ تھا۔" انہوں نے چکن روسٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "سن چالیس کے پاکستان ریزولیوشن میں ناچ گانا شامل تھا۔؟"

بقراط میرے دائیں جانب بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "آپ فرمائیے۔ آپ نے اس سلسلے میں کچھ غور و خوض کیا۔ آج کے سیاق و سباق میں منی پور ناچ کاہے کی کی علامت ہے۔؟"

"آپ کی فرمائش پر میں نے کل اور پرسوں رات بھر اسی مسئلے پر غور و فکر کیا۔ لیکن اب میں اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہوں گا۔"

انگریز کے وقتوں کا بوڑھا بنگالی مسلمان دراز ریش بیرہ 'ہندو کلچر' مسلم کلچر' بنگالی کلچر' پاکستانی کلچر' کے ان دقیق مسائل سے لاعلم اور بے نیاز کالا صاحب لوگ اور کالا میم لوگ کو ڈنر سرو کرنے میں مصروف رہا۔

"سنا ہے نور افشاں بیگم کا مظہر میاں سے بیاہ ہونے والا ہے۔ جنوری میں۔" ڈنر کے بعد بقراط نے برآمدے سے نکلتے ہوئے کہا۔ "بہت ممکن ہے میں اس جگہ کو خیرباد کہہ کر جلد ہی کراچی پہنچ جاؤں۔ یہاں اندر ہی اندر سیاسی اور نفسیاتی تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے بہت کھل رہا ہے۔"

"آپ دنیا کے کسی بھی حصے میں جا کر رہیں وہاں کوئی نہ کوئی سیاسی الجھن موجود ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔ "فی الحال تو آپ نور افشاں کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی تشریف لائیے۔"

"پل کا بھروسہ نہیں۔ شاید آجاؤں۔ سنا ہے ایوب بھائی مرحوم نے نور افشاں اور مظہر امام کو شادی میں دینے کے لئے سندھ کاٹیج انڈسٹریز سے بہترین تحائف بنوائے تھے وہ ان کے مرنے کے بعد یہ اپنی کبھی نہ پہنچے راستے ہی میں چوری ہوگئے۔ حیات انسانی بالکل ابسرڈ ہے۔"

"آپ اس قدر قنوطی ہوئے تو آپ کا کونڈا شریف۔" میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "میری رائے ہے آپ کچھ عرصے کے لئے کامیو کو چھٹی دیجئے۔"

"وہ مجھے چھٹی نہیں دیتا۔" بقراط نے رنجیدگی سے سر ہلا کر کہا اور باہر جا کر کمرے میں غائب ہو گئے۔

پیشنس نور افشاں بیگم کا پسندیدہ کھیل تھا۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ اکثر کھیلتے خود CHEATING کرتی تھیں اور جیت جاتی تھیں۔ واہ خوب ایکٹونی کردی۔ واہ کیا چوٹ دی ہے۔ جنوری ۱۹۵۷ء میں اپنی شادی سے پندرہ روز قبل پیشنس کے لئے پتے سجاتے ہوئے سوچ کر فرمایا۔ "ہم ابھی ایئرفورس سے ریٹائر بھی ہوسکتے ہیں۔ ہماری ملازمت کو سات سال ہوگئے۔"

"اس میں ایک قباحت ہے۔" میں نے سر کھجا کر جواب دیا۔ "دعوتی کارڈوں پر چھپے گا فلائٹ لیفٹننٹ نور افشاں زیدی (ریٹائرڈ) اس سے کافی کنفیوژن پھیل سکتا ہے۔"

"معلوم ہوا دلہن پنشن یافتہ ہے۔ نفیس دلہن۔ مہتاب دلہن۔ ریٹائرڈ دلہن۔ عاصم نے ارشاد کیا۔

نکاح کے وقت سعید بھائی اور دوسرے بزرگ عزیز مع مولوی صاحب کمرے میں آئے۔ دلہن گھونگھٹ کاڑھے سر جھکائے نہایت انہماک سے پیشنس کھیلنے میں مصروف تھیں۔ نکاح کے وکیل اور گواہوں کی آہٹ پر ہڑبڑا کر تاش کے پتے سمیٹے اور ان کو فرشی پاجامے کے پائینچے میں چھپا کر سر اور زیادہ جھکا لیا۔

نور افشاں کہا کرتی تھیں فلاں بات یا واقعہ اتنا دلچسپ تھا کہ سن کر HILARIUM ہوگیا۔ (بروزن DELIRIUM)

ہلیریم میں مبتلا ہم لوگ باہر شامیانے کے نیچے کھڑے تھے کہ بقراط ٹہلتے ہوئے آئے۔ قصہ سنا اور

یہ بھی کہ مولوی صاحب کی نگاہ تاش کے چند پتوں پر پڑ گئی تھی اور وہ بے انتہا متعجب نظر آ رہے تھے۔

بقراط نے پائپ کا کش لگایا پھر گویا ہوئے۔ "یہی سارا معاملہ ہے۔"

"کیا۔؟" ہم لوگ حسب معمول ان کا مقولہ سننے کے لئے تیار ہوئے۔

"ہم سب کے ہاتھوں میں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "تاش کی ایک ایک گڈی ہے۔ مشہور مثال ہے۔ باون پتے تقدیر نے ہمیں تھما دیئے۔ اب ہم انہیں جس طرح کھیلیں یہی معاملہ جبر و اختیار کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو کر کون ہے؟"

۶— حرف محرمانہ

سفید ریت کے متحرک' نیلے' زرد صحرا' سرمئی شاہراہ' اونٹوں کے کارواں' اور [illegible] کا مشرق گو تھک جس کے رازوں کو کھوجنا چاہئے۔ نیکرو پولیس کی قدیم اونچی قبروں کی منفرد خشتی حسن کاری جس طرح ترکی کے نوکیلے گنبدوں والے مقبرے' پر اسرار ملتان' سر رچرڈ برٹن کے لیتھو گرافس میں سے اچانک نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ اولیا کے مزاروں کا بھورا ہجوم ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ جو ایک پوشیدہ جنت ہے اسے وہ لوگ دیکھتے ہونگے۔ ہمیں محض نیلے اصفہانی ٹائیل اور گنبدوں کے نیچے آواز بازگشت۔ یا بنت الجبل! تو کہاں کہاں سے ہو کر آتی ہے۔؟ قلعہ ملتان میں دمدمے کے پاس کھڑے ہو کر کار کے عجیب و غریب سمجھدار ڈرائیور نے کہا۔ "ہوا اور ہوا۔"

اسی ضلع ملتان کی تحصیل لودھراں کے کسی قدیم قبرستان میں اماں کے دادا میر مظہر علی شاہ کہیں دفن تھے۔ جو بعد محمد علی شاہ بادشاہ اودھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ انسان کہاں کہاں جا کر دفن ہوتا ہے۔[1]

پیغمبروں اور فقیروں نے صحراؤں میں بگولوں کے ساتھ گشت کرتے ہوئے اپنے رویا دیکھے۔ وارث شاہ کے "کن پھٹے جوگی" کیکر کے نیچے چکارے بجاتے تھے۔ کھنڈروں میں سائبیریا سے آئے ہوئے پرند ستا رہے ہیں۔ مقید انسان کا کرب شدید ہے۔ مرو اور بلخ اور ملتان کے مسافر' سندھ دریا کا سفر بہت طویل ہے۔ طامس مور کی لالہ رخ کا کارواں۔ وقت ایک ایسا کتا ہے جو بھونک بھونک کر ہمیں جہنم کے پھاٹکوں تک پہنچا دیتا ہے۔ کسی نے کہا تھا۔ جہنم یہاں بھی ہے۔ اور وہاں بھی۔ نوحہ پلے کے سیاہ پوش کورس کی طرح سب روتی ہوئی آوازوں میں چلا رہے ہیں۔

ملتان کے گورستان' وہ لوگ جنکی تصویریں بھی موجود نہیں' آئے اور گئے۔ اسٹیج نوہ ڈرامہ جاری۔ ایکٹر ضیاء محی الدین' سرور واجد خان سے شادی کرنے والا تھا۔ جو بھوپال کی لڑکی تھی۔ سرور کی چھوٹی بہن شہربانو' نصرت بھٹو کی چھوٹی بہن' بہجت اصفہانی' کی طرح بہت اچھی اسٹیج ایکٹرس تھی اور کراچی

کی انگریزی شوقیہ اسٹیج پر ضیاء کے مقابل جولیٹ کا رول ادا کر چکی تھی۔ بڑی بہن کی ایک فوجی کرنل سے شادی ہوئی تھی۔ اور لاہور میں رہتی تھی۔ اس کی کار امریکہ سے آئی تھی اسے لیکر ہم لوگ لاہور جا رہے تھے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ افق پر بادلوں کے سنہرے زینے۔ سڑک کے سرے پر گھنے درختوں کی محرابیں جو اور دور ہوتی جاتی ہیں۔ اچانک آسمان پر دھنک کی ندی نیچے ایک اور چوڑا دریا۔ کنارے پر ایک قدیم سرکٹ ہاؤس۔ چاندنی رات کے باغ میں بڑے پگڑ اور تہمد والا بوڑھا مالی۔ گویا سوہنی مہینوال کا ایک کردار۔ اپنی دریا جیسی سرد آنکھوں سے ہمیں دیکھ کر بولا۔ "سامنے برگد کے نیچے سو ۱۰۰ برس پرانا ناگ رہتا ہے۔"

"اس علاقے میں مشہور ہے۔" ریسٹ ہاؤس کے بیرے نے برآمدے میں ڈنر سرو کرتے ہوئے کہا۔ "چاندنی راتوں میں دو دو سو برس پرانے ناگ سونی نیاروں کے روپ میں نکلتے ہیں۔"

ناگوں کا خوبصورت عورتوں کے روپ میں نمودار ہونا قدیم چینی تصور بھی تھا۔ مجھے خیال آیا۔ اور اماں بتاتی تھیں کہ ان کے دادا میر مظہر علی کے متعلق ایک واقعہ مشہور تھا (جو میر مظہر علی شاہ بعد رحلت پیر کہلائے۔) جب وہ ملتان میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر "لگے" ہوئے تھے۔ ایک بار پرگنے کا دورہ کرتے ڈاک بنگلے پر واپس آئے۔ منظر۔ موسم گرما' چاندنی رات' ڈاک بنگلے کے سبزے پر پلنگ' سفید براق مچھردانی برابر میں آرام کرسی' دو عدد مونڈھے۔ اسٹول پر صراحی اور گلاس' میر صاحب کا گھوڑا اصطبل میں آرام کر رہا ہے۔ پلنگ پر نیم دراز میر صاحب پیچوان کا کش لگاتے ہیں۔ بندوق سرہانے رکھی ہے۔

چھن چھن چھن۔ ایک حسینہ نمودار ہوتی ہے۔ اٹھلاتی ہوئی آ کر مونڈھے پر بیٹھ جاتی ہے۔ ادائے دلبری سے حقہ کی نے میر صاحب سے لیکر کش لگاتی ہے۔

میر صاحب دل میں ہو نہ ہو یہ کنجری کسی وڈیرے نے بھیجی ہے۔ لاحول ولا قوۃ (بآواز بلند) چپڑاسی' چپڑاسی' بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بندوق دیکھ کر پر اسرار حسینہ کا رنگ فق' فوراً اٹھ کر اٹھلاتی ہوئی ڈاک بنگلے کی سمت چلی اور غسل خانے کی موری میں داخل ہونا شروع ہوئی۔ آخر میں فقط ناگ کی دم باقی رہ گئی اور وہ بھی غائب۔

اندرونی دنیاؤں کی ایک مہیب ناک جھلک کیا میر مظہر علی نے دیکھی۔؟

نوہ کے ماسک۔ قدیم اساطیر تنزک علامتیں۔

کچھ لوگوں نے سر اتنے بلند کئے کہ شیشہ ٹوٹ گیا۔

اور آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میر علی کے ساتھ یہ واقعہ نہیں گزرا؟

سامنے عظیم دریا بہہ رہا تھا۔ سچل سرمست نے کہا تھا۔ "جھیں مہرملایو تھیں گھڑے تاں گھوری آیاں۔ تہیہ کنھر تاں قرباں تیاں جنھیں کچو پکایو۔

سچل سرمست پہنچے ہوئے بزرگ۔ کمہار سے خوش۔ ہم آپ معمولی انسانوں کے لئے سارا پرابلم یہی کہ سوہنی کی طرح گھڑے کو پکا سمجھ کر اس پر سوار ہوئے اور وہ کچا نکلا۔ اور کمہار پر کوئی بس نہیں۔ اور جو کر کون ہے۔؟

مقبرہ انار کلی جو مورخین کے مطابق جہانگیر کی چہیتی بیوی کی آخری آرام گاہ اور یہ ملکہ اس فرضی اور خفی انار کلی سے مختلف ہستی تھی اس کے مقبرے میں انگریزوں نے گرجا گھر بنایا۔ چرچ آف سینٹ جیمز۔ بعد میں پبلک ریکارڈ آفس۔ حسنین ماموں بتاتے تھے کہ میر مہدی علی کوتوال شہر لاہور کی قبر اس مقبرے کے احاطے میں تھی۔ کیوں؟ اور کس طرح؟۔ اماں کے نانا میر مہدی علی' نانی اشرف جہاں کے شوہر جن کو غدر کے بعد اماں اور حسنین ماموں کے پردادا خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای (جن کو انگریزوں نے کانپور ضلع پار بلوالیا تھا)۔ نے بعد غدر سوختہ ساماں عزیزوں کو پنجاب بلوا کر ملازمتیں دلوائی تھیں۔ ان میں ان کے فرزند میر مظہر علی کے ہم زلف میر مہدی علی شامل تھے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ میر مہدی علی مقبرہ انار کلی کے احاطے میں کیوں دفن کئے گئے۔

"اور اب ان کی قبر موجود ہے یا نہیں۔" میں نے آپا ممن سے کہا۔ رنگین دستاویزی فلم۔ لوک کے پنجابی ناچوں کے لئے بارونق افسانوی روشن منور انار کلی بازار میں رات کے وقت میں اور آپا ممن کپڑے خرید رہے تھے۔ گلیوں میں قدیم وضع کے افسانوی مکانوں کے بخار چے اور پھاٹک۔ یہیں کہیں شہر میں موچی دروازے میں نواب قزلباش کا مکان تھا جہاں میر قائم علی آکر ٹھہرا کرتے تھے اور اس سے پہلے مغلوں کا لاہور کاش ہم لوگ پچھلے کسی دور میں پیدا ہوئے ہوتے۔ میں نے اظہار خیال کیا۔

"برا حشر ہوتا۔" آپا ممن نے کہا۔ "پردے میں قید گھٹی پڑی ہوتیں۔ شکر کرو۔ مزے سے شام کے وقت آزادانہ شاپنگ کرتے گھوم رہے ہیں۔ ساری دنیا میں تنہا سفر کرتے ہیں۔ راستے میں ٹھگ گلا گھونٹ کر مار ڈالتے۔ بادبانی جہاز ڈوب جاتے۔ بحری قزاق پکڑ لیتے۔ لے جا کر بغداد میں کنیز بنا کر بیچ دیتے ورنہ یہیں کہیں بادشاہ ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دیتا یا قلعے کی فصیل پر سے زندہ نیچے پھینک دی جاتیں۔"

آپا ممن نے جو فی الفور منظر نامہ پیش کیا وہ نہایت خوفناک تھا۔

میں نے سر کھجایا۔ "جی۔ مگر یہ کلچر کے مسائل تو نہ ہوتے۔ کیونکہ اب سوال یہ ہے کہ مجھے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ پنجاب کی مسلمان کسان عورتیں شلوار کے بجائے لنگا پہنتی ہیں؟ لنگا پہنے جھومر ناچتی لڑکیاں مشرقی پنجاب اور راجستھان کی لڑکیوں سے کس طرح مختلف معلوم ہونگی۔ چترانگدا کی طرح ہیرس یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔"

"اس جگہ"۔ ممن نے راستے میں ایک سمت اشارہ کیا۔ علامہ اقبال رہا کرتے تھے ۱۹۲۲ء تک۔"

آپا ممن بولیں۔ "بڑی اماں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جب علامہ اقبال اپنے انار کلی والے مکان میں رہتے تھے۔ وہ علی گڑھ سے لاہور آئی ہوئی تھیں' اقبال نے انکو اس مکان میں کھانے پر بلایا تھا۔ بڑی اماں نے اسی زمانے میں پردہ ترک کیا تھا۔ مگر علامہ مرحوم کے سامنے نہیں آئی تھیں کہ ان کو افسوس ہو گا۔"

"اب علامہ اقبال کو لیجئے۔ اور اسلامی کلچر کے متعلق ان کے نظریات۔"

"بڑی اماں میں کتنی ہمت تھی۔ اپنے زمانے کے GIANTS کو مستقل DEFY کرتی رہتی تھیں۔

"اکبر الہ آبادی اور اقبال دونوں اماں کی آزاد خیالی سے نالاں تھے۔" میں نے جواب دیا۔ حسنین ماموں 'الن ماموں بتاتے ہیں کہ اقبال اماں کو آقازادی کہتے تھے۔ یعنی رسول اللہ ؐ کی اولاد۔ شاید اس وجہ سے اور ناراض تھے کہ آل رسول ؐ ہو کر بے پردہ ہو گئیں۔ جو تھا نہیں ہے۔ جو ہے نہ ہو گا۔ وقت اتنا بدل چکا ہے کہ اگر اس زمانے کے متعلق سوچیے تو عجیب لگتا ہے۔ جب میر فیض العسکری 'نذر الباقر اور ظہور الحسنین اور اقبال اکٹھے مدرسے جاتے تھے۔ اور انعام اللہ ماموں کے چچا علامہ میر حسن سے پڑھتے تھے۔ اور تین سالہ اماں اقبال کے والد شیخ نور محمد کا سیا ہوا سرخ ریشمی برقعہ اوڑھ کر اپنے دادا میر مظہر علی کی گود میں گھوڑے پر بیٹھتی تھیں۔[2] ابھی راستے میں ملتان سے گزرتے ہوئے ہمیں یاد آیا کہ میر مظہر علی وہیں کہیں دفن ہیں۔ میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔"

صبح کے وقت آپا ممن کے ہاں نمبر ۴۹ لارنس روڈ پر پچھلے برآمدے میں درزی آن کر بیٹھا۔ ملبوسات کی سلائی شروع کی۔ تیسرے پہر کومار کسٹ انٹلکچوئیل صفدر میر تشریف لائے۔ میں نے لنگوں کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔

صفدر میر نے پورے دو گھنٹے لیکچر دیا۔ "ہماری کلچر۔" انہوں نے فرمایا۔ "دراصل سکھ کلچر ہے۔ ہماری اور مشرقی پنجاب کی تہذیب ایک ہے۔"

"پھر قائد اعظم والے پاکستان کا کیا ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ بھی ہے۔" انہوں نے مطلع کیا۔

جو باریک نکتہ میری سمجھ میں نہ آیا اور میں اٹھ کر گلبرگ کالج آف ہوم سائنس کی پرنسپل ڈاکٹر محبوب شاہ زماں کو فون کرنے گیلری میں گئی جنکے ہاں کی لڑکیاں اس شرط پر رقص کرنے کے لئے راضی ہوئی تھیں کہ فلم پاکستان میں نہ دکھائی جائے۔

ڈاکٹر محبوب شاہ زماں سردار ایوب خاں مرحوم[3] کی پوتی تھیں۔

ایک رات وہ اپنے کالج سے مجھے اپنے گھر لے گئیں جس کی دیواروں پر بخارا کے قالین آویزاں تھے اور تپائیوں پر خشک میوں کے طشت رکھے تھے اور محبوب کی والدہ ایک شاندار افغان شہزادی تھیں۔ ابا جان کا ذکر کرتے ہوئے ان آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ "ہم لوگ شدید پردے میں رہتے تھے۔ مگر اپنے مردوں سے مرحوم کی بے حد تعریفیں سنا کرتے تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔"

مجھے اس وقت یاد آیا۔ ایک افغان شہزادے سردار عمر خاں جب نمبر ۲۰ کرزن روڈ دہرہ دون کے پہلو کے روشن برآمدے میں آکر بیٹھا کرتے تھے اور ابا جان کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ ایک بار میں نے ضرب کلیم میں سے "رومی بدلے شامی بدلے' بدلا ہندوستان۔ تو بھی اے فرزند کوہستان اپنی خودی پہچان۔" ان کو دی تھی اور وہ اٹک اٹک کر اس نظم کو پڑھ رہے تھے۔ اور اس وقت علامہ عبداللہ یوسف علی کے مترجمہ قرآن شریف کا ایک پارہ ڈاک سے آیا اور ابا جان نہایت ذوق و شوق سے اس کے متعلق سردار عمر خاں سے گفتگو کرنے لگے اور سردار عمر خاں پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ اس

افغان شہزادے نے چند سال بعد بعالم عسرت دہرہ دون میں انتقال کیا تھا۔

کالج میں روزانہ ریہرسلوں کے بعد دو تین دن ہم لوگ گاؤوں میں لوکیشن تلاش کرنے گئے۔ اس کے بعد ایک صبح جب دبیز کہرہ سارے شہر پر چھایا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے گلبرگ کالج کی ان پندرہ بیس لڑکیوں کے ساتھ ایک خوبصورت گاؤں کا رخ کیا۔ سورج نکلنے پر گاؤں کے چودھری کے آنگن میں رقص شروع کیا گیا۔ مسٹر مرچنٹ نے کیمرہ چلایا۔ ضیا سرحدی نے منظر ڈائریکٹ کرنا شروع کیا۔

محبوب اور میں نیم تلے کھٹولے پر بیٹھے لسی پی رہے تھے۔ دوسرے کھاٹ پر عزیز احمد صاحب جو کراچی سے آگئے تھے فلیٹیز میں مقیم تھے' چودھری کے ساتھ بیٹھے لسی پی رہے تھے سامنے لڑکیاں جھومر ناچ رہی تھیں۔ ہم لوگ زرعی پنجاب کے رومان سے مسحور و مسرور ہوا کی ڈوری بیٹھے تھے کہ معاً پانچ چھ دیہاتی مولوی ڈنڈے سنبھالے کہیں سے آن موجود ہوئے۔ اور کلمات نامعقول بزبان پنجابی ادا کرنے لگے۔ بے چاری محبوب بے انتہا سراسیمہ ہوئیں۔ ہم لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے۔ جلد از جلد پیک اپ کیا اور وہاں سے سرپٹ بھاگے۔ بقیہ شوٹنگ اگلے ہفتے چند روز تک گلبرگ کالج کے سبزے پر کی۔

اچھو کراچی سے آئی۔ ایک شام بھائی جان' آپا ممن' اچھو اور میں جم خانہ کلب گئے ہوئے تھے بال روم میں فیشن ایبل دولتمند کی نفیس بیگمات مصروف رقص نظر آئیں۔ لیکن کوئی غریب دیہاتی مولوی وہاں تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

لاہور کا جاڑا اپنے شباب پر تھا۔ ایک برفانی صبح چھاؤنی کے انتہائی پر فضا اسٹیڈیم میں بارڈر فورس کے وجیہہ پٹھانوں نے سرحدی خٹک ڈانس ڈوکومنٹری کے لئے پیش کیا جسے مسٹر مرچنٹ نے پکچرائز کیا۔ اس کے بعد میں نے فلم کے گانے ریکارڈ کروانے شروع کئے۔ صدا بندی نہر کے قریب ایک اسٹوڈیو میں کی جا رہی تھی۔ تقسیم سے قبل شاید وہ کملا مووی ٹون کہلاتا تھا۔

پہلے روز رات کے دس بارہ بجے تک ریکارڈنگ تھی۔ میں آپا ممن کو ساتھ لے گئی۔ سرخ کنارے والی سفید ہندوستانی شالیں ان دنوں لاہور میں بہت مقبول تھی۔ اسی ہفتے آپا زہرا ایسی ہی ایک شال علی گڑھ سے آپا ممن کے لئے لے کر آئی تھیں۔ آپا ممن خوش خوش شال سر سے اوڑھ کر ہال میں دیوار کے کنارے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ کر نٹنگ میں مصروف ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر دیکھا۔ مقابل کی دیوار کے ساتھ پلے بیک سنگر کوثر پروین اور دوسری گانے والی لڑکیوں کی نانیاں' امائیں' خالائیں اور شاہی محلے کی دوسری خواتین وہی سرخ کنارے والی سفید شالیں سر سے اوڑھے ایک قطار میں بیٹھی اسی طرح نٹنگ میں مصروف تھیں۔

آپا ممن نے ہنسی ضبط کر کے وقار سے اپنی اون اور سلائیوں پر دھیان دیا۔ میں دوسرے اسٹوڈیو میں پروین کوثر اور اس کی ساتھیوں سے ایک پنجابی لوک گیت کی ریہرسل کروانے میں منہمک تھی۔ کچھ دیر بعد میں گیلری میں گئی۔ وہاں آپا ممن مل گئیں۔ مجھے صورت حال بتائی۔ ابھی ابھی یہ نانیاں' خالائیں میرے پاس آکر بیٹھی تھیں۔ ایک بولیں۔ بڑی سردی ہے جی۔ میں نے کہا جی ہاں ہمدردی سے بولیں۔ اچھا کیا آپ

بھی نٹنگ ساتھ لیتی آئیں فلم اسٹوڈیو میں رات رات بھر بیٹھ کر بندہ تھک جاتا ہے۔ پھر پوچھا یہ آپ کی چھوٹی بہن ہے جی؟ میں نے کہا جی ہاں ایک نانی نے دریافت کیا۔ کیا گاتی ہیں پکا یا غزلیں؟۔ دوسری خالہ نے پوچھا آپ کیا گاتی ہیں۔ تیسری نے سوال کیا۔ کہاں سے آئی ہیں۔ پہلے تو آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔

"جب ایک نانی نے سگریٹ پیش کیا میں نے کہا معاف کیجئے ابھی آتی ہوں اور اٹھ کر باہر بھاگی۔"

"بیگم جری احمد سید اس وقت میر احمد علی اور شریف النساء بیگم اور سید جلال الدین حیدر اور سعید بانو بیگم نے قبروں میں کروٹیں لی ہونگی۔ اسی وجہ سے پردے کا حکم آیا ہے۔ اور اکبر الٰہ آبادی اور اقبال نے شاید اس منظر کو پہلے سے دیکھ لیا ہو۔ یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟"

میری صراحی سے قطرہ قطرہ۔

دوسری شام ہم لوگ گھر پر آتشدان کے سامنے بیٹھے پچھلی رات کے واقعے کا تذکرہ کر رہے تھے۔ آپا ممن نے کہا۔ ساری دنیا کے افسانوں اور ناولوں میں طوائف کو انتہائی مظلوم اور ستم زدہ غمگین دکھلایا گیا ہے۔ یہ لوگ تو نہایت بشاش تھیں۔ ذرا جو غمگین ہوں۔"

"غمگین اور نیک دل ہارٹ آف گولڈ کی مالک۔" میں نے اضافہ کیا۔ "اور یوروپ کی گلیمرس اسٹریٹ واکرز انگلیوں میں سگریٹ اور لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑی ہیں۔ بارش شروع ہوئی تو کونوں' کھدروں میں دبک گئیں۔"

"سوشلسٹ ملکوں میں۔" نوابزادہ امتیاز علی خاں نے کہا۔ "جو بھی پابندیاں وہاں عورتوں کی یہ ذلت و خواری ختم کر دی گئی ہے۔ نواب زادہ امتیاز علی خان آپا ممن' بھائی جان کے پڑوسی پرانے ترقی پسند تھے۔

"عورت مختلف طریقوں سے ہمیشہ بکتی رہی ہے۔ چاہے وہ کنیز بنا کر بیچی گئی ہو یا اس نے بالاخانہ آراستہ کیا ہو اور محلے کی ڈیرے دار طوائف یا گائیکہ اس کو اپنی قدر و قیمت بھی خوب معلوم ہے۔ زبردستی اپنے عیش و عشرت کی خاطر' شوقیہ' یا بحالت مجبوری بہر صورت وہ بک سکتی ہے۔ یہی تو ٹریجڈی ہے۔" بھائی جان کے ایک دوست نے کہا۔

"سوشلزم نے اس ٹریجڈی کو ختم کر دیا ہے۔" نوابزادہ امتیاز نے دہرایا۔

گیلری میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر بات کی۔ اندر واپس آکر کہا۔ زر خرید کے مصنف ابھی آرہے ہیں۔"

کچھ دیر بعد برساتی میں ایک کھڑ کھڑیا اسٹیشن ویگن آکر رکی۔ گاڑی ایک ٹوٹا پھوٹا انگریز چلا رہا تھا۔ وہ اس کی چوہیا سی میم' اور عزیز احمد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

عزیز احمد نے نوواردوں کا تعارف کرایا۔ "مسٹر و مسز فلاں۔ برطانوی جرنلسٹ۔"

نوابزادہ امتیاز اور رانا صاحب جا چکے تھے۔ بھائی جان غیر ملکیوں سے باتیں کرنے لگے۔ عزیز احمد نے مجھ سے کہا۔ "یہ ایک عجیب اداس سا جوڑا ہے۔ کل شام مجھے فلیٹیز میں ملا۔ یہ صاحب مجھ سے مصر ہوئے

کہ لاہور کے خاص خاص لوگوں سے ان کو ملوادوں۔ انگلینڈ سے بذریعہ کار آئے ہیں۔ حسبِ معمول پاکستان پر کتاب لکھنے۔"

ان دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ وہ دنیا کے ان لوگوں میں سے تھے جو ہر طرح کی کوشش کرنے اور ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود ناکام رہتے ہیں یا چوٹی پر نہیں پہنچ پاتے۔ وہ بجھے بجھے چہروں والے میاں بیوی تھے۔ جو ایک شکستہ اسٹیشن ویگن پر سوار ہو کر دنیا میں قسمت آزمائی کرنے نکلے تھے۔

عزیز احمد نے آپا ممن سے کہا۔ "ممن بی بی میں یہ سن کر دنگ رہ گیا جب اس بے چاری عورت نے کہا کہ تنگدستی کی وجہ سے اس سیاحت کے دوران اسے اکثر خود خرچ چلانا پڑتا ہے۔ اور محض جرنلزم کے ذریعہ نہیں۔"

"عجیب۔ ابھی کچھ دیر قبل ہم لوگ یہی بات کر رہے تھے۔" آپا ممن نے جواب دیا۔ بے چاری۔"

بیچاریاں 'موسم گرما ۳۹ء دہرہ دون پریڈ گراؤنڈ کی سالانہ نمائش "موت کے کنویں" کی زہرہ ڈربی نے شہر میں دھوم مچا رکھی ہے۔ کرن پور سے ہم سب بچگان صالحہ آپا اور آصف بھائی کے چھوٹے بھائی اور ان کے ماموں زاد بھائی اور بہنیں نہایت ذوق و شوق سے سرکس دیکھنے جاتے ہیں۔ "موت کے کنویں" میں زہرا ڈربی موٹر سائیکل پر ایک خوفناک مونچھوں والے آدمی کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ صالحہ آپا' آصف بھائی 'الن ماموں' محمد نواب' احمد نواب بھائی زینے کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ اطفال 'کنیز فاطمہ' عزیز فاطمہ' شفیق فاطمہ' علی نواب' محمد میاں' امی' میں گنتی سے ایک قطار میں زینے پر چڑھائے جاتے تاکہ بھیڑ بھڑ کے میں کھو نہ جائیں۔ کنویں کی تہہ میں مچھندر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتا۔ سائیکل شور مچاتی اوپر آتی۔ "کنواں" زور زور سے ہلتا۔ تماشائیوں میں سے کوئی منچلا رومال نیچے گرا دیتا جسے زہرا ڈربی لپک کر پکڑ لیتی۔ خطرناک جان جوکھوں کا تماشا جس کے ذریعے وہ بے چاری اپنا پیٹ پالتی تھی۔[4]

ایک شام بھائی مظہر القیوم مجھے نمائش گھما رہے تھے۔ ایک طرف تمبو لگے ہیں۔ "آدمی عورت آدمی مچھلی۔ عورت کا کٹا ہوا سر۔" "مس بجلی کا زندہ ناچ گانا۔" "اس خیمے کے سامنے ایک گلابی رنگت والا خوبرو پٹھان نوجوان گلابی شلوار قمیض' طرے والی پگڑی میز پر کھڑا ر کابیاں اچھالنے کا تماشا دکھلا رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق خیمے کے اندر جا رہے ہیں جہاں سے گھنگروؤں کی آواز آ رہی ہے۔ پٹھان نوجوان ہنس ہنس کر کسی سے کہتا ہے۔ سب فری ہیں سب فری ہیں۔"

ایک خیمے کے باہر لکھا ہے۔ "سرکٹی لڑکی۔ پھول دیوی۔"
مظہر بھائی کہتے ہیں۔ "بی بی اسے دیکھو گی؟ ڈرو گی تو نہیں۔؟"
"ہرگز نہیں۔ ہم بہت بہادر ہیں۔"

خیمے کے اندر سبز گھاس پر ایک میز رکھی ہے۔ اس کے چاروں پائے نظر آ رہے ہیں۔ میز پر صراحی صراحی کے منہ پر پوڈر سرخی سے لپی پتی لڑکی کا سر۔ ایک آدمی اندر آتا ہے خیمے میں صرف مظہر بھائی اور میں اور وہ سرکٹی لڑکی اور وہ پر اسرار آدمی وہ پوچھتا ہے تمہارا کیا نام ہے۔"

لڑکی بڑی تکلیف سے اور مدھم آواز میں جواب دیتی ہے۔ "پھول دیوی"۔
"کیا کھاتی ہو۔؟"
"پھول سونگھتی ہوں۔"

میں بہت متحیر اور افسردہ ہوتی ہوں۔ بے چاری سرکٹی لڑکی بغیر کھانا کھائے صرف پھول سونگھ کر کس طرح جیتی ہو گی۔ اب مجھے یکلخت ڈر لگتا ہے اور میں مظہر بھائی سے کہتی ہوں۔ "باہر چلئے۔"

اور وہ چار سالہ بچی کے قد کی بونی جو ایک بوڑھے کے کندھے پر سوار اونچی پاٹ دار آواز میں لکھنؤ کی سڑکوں پر گاتی پھرتی تھی۔ اور بھیک مانگتی تھی اور ایک مرتبہ جاڑوں کی ایک سہ پہر ہمارے ہاں فیض آباد روڈ آئی تھی اور اماں اور چندا ممانی نے اس سے گانے گوا کر سنے تھے۔[5]

اور سرکس اور نوٹنکی اور تھیٹر والیاں اور جادوگروں کی اسسٹنٹ جن پر چاقو پھینکے جاتے ہیں۔ اور وہ اسٹیج کی دیوار سے لگی کھڑی رہتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر عورتوں پر چاقو پھینکے جاتے ہیں اور دیوار سے لگی دم سادھے کھڑی رہتی ہیں۔

اور "لوک ناچ" کے پنجابی گیتوں کی صدا بندی کے بعد ایک سرد دھندلی صبح پروین کوثر اپنی کورس گرلز کے ساتھ اسٹوڈیو کے باہر ریکارڈنگ وین کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے اس وقت کے لاہور کے مروجہ فیشن کے مطابق شلوار قمیض کے ساتھ سر پر اونی بیرے اوڑھ رکھی تھی۔ ریکارڈنگ سنگر بہت لجاجت سے اس سے کہا۔ "اگر آپ کو گانے پسند نہ آئے ہوں تو میں سارے پھر گا دوں گی۔ ہم لوگ سب دوبارہ گا دیں گے۔ ہم حاضر ہیں۔"

نیک دل اور ہارٹ آف گولڈ کی مالک والا ابہیج غالباً صحیح تھا۔

سبط حسن کی ادارت میں پاکستان ٹائمز گروپ کا ہفتہ وار مصور رسالہ "لیل و نہار" ان بہترین پرچوں میں سے تھا جو اردو میں کبھی شائع ہوئے۔ ان دونوں اس میں ہر ہفتے ایک تصویری فیچر "سوہے وہ بھی آدمی" شائع ہوتا تھا جس میں غریب ترین اونیٰ ترین محنت کش افراد کے انٹرویو چھپتے تھے۔ جو مختلف طریقوں سے اپنی روزی کماتے تھے۔ نجانے کسی نے "سوہیں وہ بھی عورتیں" قسم کا فیچر کیوں نہ شائع کیا۔

فلم کے باقی گانوں کی صدا بندی میں نے لندن میں کروائی چچا صدیقی نے بی بی سی کے اردو سیکشن کے اسٹوڈیوز میں چند پاکستانی پنجابی لڑکیوں کو جمع کیا۔ انہوں نے ڈھولک کے گیت گائے اور "لڈی ڈالی"۔

نہ سر جان لارنس کو معلوم تھا نہ مقبرہ انار کلی کو 'چرچ آف سینٹ جیمز' میں تبدیل کرنے والوں کو کہ ایک وقت وہ آئے گا جب راوی اور چناب اور ستلج اور بیاس اور جہلم اور گنگ و جمن کے کنارے بسنے والے دریائے ٹیمز کے ساحل پر اپنی بستیاں آباد کریں گے۔ گرجا گھروں میں گوردوارے اور مسجدیں بنائیں گے۔ محرم کی مجلسیں کریں گے اور انگریز کی ناک میں مرغی کا پر ڈالیں گے۔

کنکاں دیا فصلاں پکیاں نے۔ انگلینڈ وچوں میماں نسیاں نے۔
میری صراحی سے۔

۷ — یا بنت الجبل

موسم گرما ۱۹۷۵ء سہ پہر کا وقت سمندر کی جھلکتی جھلملاتی آنکھ برآمدے کی آہنی ہری جافری میں سے جھانک جھانک کر ہمیں گھور رہی ہے۔ دور لاس بیلا کی سرخ پہاڑیاں گرد کے جھکڑ میں چھپ گئیں۔ دوپہر کی آوازیں پہاڑیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یا بنت الجبل۔ تم کہاں سے ہو کر آئی ہو اور کہاں نکل جاؤ گی۔؟

کسی فوجی طیارے کے اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ اندر خنک ڈرائنگ روم میں قالین پر رکھی سلہٹی بید کی کشتی میں سبز بلجین پیالیاں جھلملاتی ہیں۔ ان کے عقب میں رکھا ہالا کا زرد گلدان۔

اسٹل لائف۔

مظہر میاں' اچھے بھائی' نور افشاں' عاصم' حاتم اور میں فرش پر بیٹھے چائے پینے میں مصروف بے چارے ایوب بھائی مرحوم خود اسی ٹکڑی میں شامل اسی جگہ بیٹھ کر یہی بحثیں کرتے تھے۔ مگر اس وقت تک ان کی موت کا قصہ بھی باسی ہو چکا تھا۔ باہر بہت دور کنکریٹ کے گرد آلود میدان میں فوجی طیارے نے ٹیک آف کی تیاری کی۔ اٹھنے کے لئے پر تولے۔ انجن کی گڑگڑاہٹ تیز ہو گئی۔ کمرے کے اندر مظہر میاں نے اپنا گولڈ فلیک کا ڈبہ جو ہر وقت ان کے ہاتھ رہتا تھا فرش پر رکھ چائے بنانی شروع کی۔ اچھے بھائی نے بہت آہستہ گویا سلو موشن میں دوسرا سگریٹ سلگایا اور چائے کی پیالی اٹھائی۔

ڈاکٹر نور افشاں امام نے انکو ذرا غور سے دیکھا۔

مظہر میاں نے دوسرا سگریٹ جلایا— اچھے بھائی اور مظہر میاں دونوں لگاتار سگریٹ پیتے تھے— اچھے بھائی نے اپنے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھٹکی— باتیں کرتے کرتے بے دھیانی میں وہ راکھ میں ایش ٹرے سے نکال نکال کر اچھے بھائی کی چائے میں ڈالتی رہی— چند لمحوں تک وہ خاموشی سے میرا یہ عمل دیکھا کیے پھر بہت ملائمت سے کہا— "میری چاء میں راکھ مت ملایئے—"

اچھے بھائی— سید ظہیر حیدر ابن سید نصیر الدین حیدر کی پوری شخصیت میں یہی نرمی اور ملائمت رچی ہوئی تھی— ہر بات بہت ہی نرم لہجے میں کرتے تھے اور ایک پر سکون متوازن انسان تھے— علیگڑھ سے آ کر یہاں ایک برطانوی فرم میں ملازم ہو گئے تھے اور اپنی بڑی بہن آپا عذرا کے ہاں پی ای سی ایچ۔ ایس۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں مقیم تھے— اب ہم لوگ ان کی شادی کے لئے لڑکی تلاش کرنے میں مصروف تھے— چند روز قبل نئی ہل مین کار خریدی تھی اور اسے ہم لوگوں کو دکھانے ماری پور لائے تھے— کچھ دیر بعد مظہر صاحب اچھے بھائی عاصم اور حاتم کے درمیان موٹروں کے متعلق ٹیکنیکل گفتگو شروع ہو گئی— پھر اچھے بھائی نے گھڑی دیکھی اور شہر واپس جانے کے لئے اٹھے— سلو موشن میں اپنا ہاتھ سر تک لے گئے— اور نور افشاں سے کہا— "ہمارے سر میں تین چار دن سے ہلکا ہلکا درد مستقل ہو رہا ہے—"

"اچھے بھائی اپنا چیک اپ فوراً کروا لیجیے—" نور افشاں نے کہا

"کروا لیں گے—" اچھے بھائی نے بے پروائی سے جواب دیا— ہم سب باتیں کرتے برآمدے میں آ گئے— باہر فوجی طیارہ ڈھلتی دھوپ میں کبوتر کی طرح چمکتا شفاف نیلے آسمان پر کسی طرف کو اڑا جا رہا تھا—

اچھے بھائی کے درد سر نے تشویشناک صورت اختیار کر لی— چند روز بعد جب ہم ان کی عیادت کے لئے آپا عذرا کے ہاں گئے— شام ہو چکی تھی— اچھے بھائی' آپا عذرا' سعید بھائی اور دوسرے عزیز باہر سبزے پر بیٹھے تھے— پڑوس میں کسی انڈین ڈپلومیٹ کی کوٹھی میں ریڈیو بج رہا تھا— جھٹ پٹے کے آسمان پر پرندوں کی ڈاریں بسیرا لینے ایک سمت کو پرواز کر رہی تھیں— چچی وحیدہ برآمدے میں نماز مغرب ادا کرنے میں مصروف تھیں— اچھے بھائی شگفتگی سے باتیں کرتے رہے— میں نے ان سے کہا— "میں اگلے مہینے ورلڈ پن کانگریس کے لئے ٹوکیو جا رہی ہوں—"

"کہا جاپان کا ڈر ہے؟" اچھے بھائی نے پوچھا—

"کہا جاپان تو ہو گا—" میں نے جواب دیا—

پھر وہ ہم لوگوں کو کار تک پہنچانے بہت آہستہ آہستہ چلتے پھاٹک تک آئے—

تیسرے روز انکو بحریے کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا—

۴۔ جولائی کی صبح ملک کا بہترین برین سرجن اچھے بھائی کے دماغ کا آپریشن کرنے والا تھا سارا کنبہ صبح سے نیوی کے ہسپتال میں جمع تھا— صرف اچھے بھائی کی والدہ چچی وحیدہ ہسپتال نہیں گئی تھیں— ان کی دوسرا ہٹ کے لیے میں اور نوشابہ آپا عذرا کے گھر پہ رہ گئے تھے— چچی جان ڈرائنگ روم میں تخت پر جائے نماز بچھائے دعائیں پڑھ رہی تھیں میں اور نشو ٹیلی فون کے پاس بیٹھے تھے' سارے مکان پر سناٹا طاری تھا— وہ۔ ۴ جولائی کی صبح گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا—

فون کی گھنٹی بجی— نشو نے ریسیور اٹھایا— ہسپتال سے ساؤنی آئی تھی— اچھے بھائی آپریشن ٹیبل پر ختم ہو گئے—

چچی جان نے ہم دونوں کو زار و قطار روتے دیکھا— چند لمحے ساکت و صامت بیٹھی رہیں— پھر آہستہ سے اٹھیں اور ہمارے قریب آ کر کہا— "اللہ کی امانت تھی— اس نے واپس لے لی— صبر—"

جوان بیٹے کی موت پر چچی جان کا صبر و ضبط اور ایمان کی مضبوطی لرزہ خیز— وہ دو تین منٹ تک چپ چاپ کھڑی ٹیلی فون کو دیکھتی رہیں— پھر "اللہ" کہہ کر آہستہ آہستہ قدم رکھتی جھکی جھکی اپنے کمرے میں گئیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا— دریچے کے باہر پھولوں پر سفید تیتریاں اڑتی پھر رہی تھیں— اور آسمان پر بادل گھرے کھڑے تھے— اچانک سامنے کی دیوار پر لگے ککو کلاک پر میری نظر پڑی— جو نہ معلوم کس وقت بند ہو گیا تھا میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور وقت کا نمبر ڈائل کیا— انیس مرزا کی آواز یکسانیت سے دہرا رہی تھی— When you hear the tone, The time will be

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے کہا تھا— "وہاں جوگی اپنی آگ جلاتے ہیں اور جب وہ جوگی چلے گئے—

تو ان کی جگہ پر نہ تنکے ملے نہ پتھر اور راکھ اڑ گئی اور جوگی اپنے سنکھ پھونکتے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔"

اور ایوب احمد کرمانی مرحوم نے کہا تھا۔ "روح کوئی شئے نہیں۔ انسان مرجاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا احساس وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

اچھے بھائی کے سگے بہن بھائیوں میں پارے مونٹریال میں تھے۔ آپا زہرا علیگڑھ۔ آپا ممن لاہور۔ صرف آپا عذرا اور اچھو کراچی میں تھیں۔ آپا ممن سرخ آنکھیں لیے ایئرپورٹ سے پہنچیں۔ آپا عذرا' سعید بھائی کی نئی کوٹھی کے لان پر اچھے بھائی کا جنازہ لا کر رکھا گیا۔ ان کی تایا زاد بہن یعنی نور افشاں کی والدہ آپا راضیہ نے سرہانے بیٹھ کر تلاوت قرآن شروع کی۔ گھر اور باغ سوگواروں سے بھر گیا۔ چچی جان سفید چکن کی ساری پہنے خاموش بیٹھی رہیں یا صبر۔ صبر۔ دہرانے لگتیں۔

شاہ عبداللطیف" نے کہا تھا۔ "اس زمین میں انتوں کی خاک موجود ہے۔ کیسے کیسے لوگ چلے گئے۔ زندگی اتنی مختصر ہے۔ لطیف۔ جاگو۔ اور ڈھونڈو۔"

"میں جگمگاہٹ سے نکل کر آیا تھا۔ اسی میں واپس جاتا ہوں۔ بیچ میں یہ کیا تھا؟"[6]

بانسری کا صرف ایک سُر۔

اچھے بھائی مرحوم کے چالیسویں کے دو تین روز بعد اگست کے مہینے میں آپا صدیقہ رتی کشور سے ملنے جینوا روانہ ہوئیں۔ اچھو نے شکاگو یونیورسٹی اور میں نے یونیسکو کی دعوت پر جاپان کی تیاری شروع کی۔ کار جہاں جاری رہا۔

۸۔ زین ماسٹرز اور ٹائی فون

"مسٹر سلمان احمد علی کا فون آیا تھا۔" بور صدیقی نے کہا۔ "انکے ہاں شام کو میکش کھانے پر آرہے ہیں۔ آپکو بلایا ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔" اور اپنی بوریت میں غلطاں و پیچاں غائب ہو گئے۔

میکش سلمان احمد علی کے ہاں آرہے ہیں۔ تعجب میں نے نور افشاں کو آواز دی۔ "لو اور سنو۔ میکش کراچی آئے ہوئے ہیں اور سلمان بھائی کے ہاں ڈنر پر آرہے ہیں۔ عجیب بات ہے۔"

"ہلے بیک سنگر میکش۔ انڈیا سے؟"

"ہاں۔ ہاں وہی۔"

شام کو ہنگیرین نژاد برطانوی مزاح نگار (George mikes) سلمان بھائی کے گھر پر انور قریشی اور ماکی سے باتیں کرتے ملے۔ واقعہ یہ تھا کہ ٹوکیو' کیوٹو' نارا اور کیناوا' ہانگ کانگ' بنگ کاک' منیلا اور رنگون ادھر۔ اور سارا برطانیہ اور مغربی یورپ ادھر۔ بور صدیقی کا ثانی نہ میں نے دیکھا نہ سنا۔ بقراط عموماً ان کے ساتھ میک ٹوینگ جاتے تھے۔ گمران کے مقابلے میں DANNY KAYE تھے۔ ان ہی کی قسم کے ایک صاحب اس وقت سلمان بھائی کے ہاں آن پہنچے۔ مہمان خصوصی سے ملوایا گیا۔ کھانے کے دوران

جارج میکش نے ان سے کوئی لطیف قسم کا مذاق کیا۔ ان پر کوئی رد عمل نہ ہوا۔ جارج میکش نے مجھے دیکھا۔ مجھے بنگ کاک یاد آگیا۔ جاپان سے واپسی پر دس بارہ دن بعد جہاں انگس ولسن اسٹیون اسپنڈر اور ان سب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ ایک محفل میں جارج میکش نے اسی طرح کوئی پر لطف بات کہی تھی۔ ایک صاحب نے پلک جھپکا کر پوچھا۔ "اس کا مطلب؟" جارج میکش نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔ "IT WAS A JOKE"

جب کسی ادیب یا مزاح نگار کو خود یہ سمجھانا پڑے کہ اس نے کیا لکھا یا کہا ہے وہ وقت بہت صبر آزما ہوتا ہے۔ اسی لئے زین ماسٹر کہہ گئے ہیں کہ خاموش بیٹھے لوبان کی آواز سنتے رہو۔

"بنگ کاک کے آگے تو آپ نے مزید خطرناک ہوائی سفر نہیں کئے۔" جارج میکش نے دریافت کیا۔

جب ہم ٹوکیو[7] سے چلنے والے تھے۔ شمالی سمندروں میں بڑے زبردست ٹائی فون آرہے تھے۔ ٹوکیو ایئرپورٹ پر معلوم ہوا کہ ٹائی فون ہلڈا کی آمد آمد ہے۔ اس وجہ سے اگلے دو دن کی ساری فلائٹس معطل کر دی گئی ہیں۔ صرف ایک ٹی ڈبلیو۔ اے کا باربردار طیارہ اوکیناوا جا رہا ہے۔ میں نے کہا اگر میں آج کل میں نہ روانہ ہوئی تو میرا آگے کا سارا پروگرام تلپٹ ہو جائے گا آپ اسی جہاز میں مجھے سیٹ دیدیجئے۔

ایک باریش مشہور[8] بنگالی شاعر جو کراچی یونیورسٹی میں بنگالی پڑھاتے تھے میرے نزدیک کاؤنٹر پر موجود تھے۔ میرے علاوہ پاکستان سے صرف وہ اس کانفرنس کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ میں نے کہا آپ بھی چل رہے ہیں؟ وہ بہت گھبرائے۔ میں نے کہا۔ صاحب آپ مرد مومن کلمہ گو آدمی' ایک ذرا سے ٹائفون سے ڈرتے ہیں۔ اگر طیارے کے حادثے میں مرنا قسمت میں لکھا ہے مرجائیں گے ورنہ بخیریت پہنچ جائیں گے۔ وہ بہت پریشان اور جزبز ہوئے۔ اوکیناوا پہنچ کر "ٹی ہاؤس آف دی آگسٹ مون" بہت یاد آیا۔

بنکاک میں ہماری ایک پرانی کلاس فیلو رشیدہ موجود تھی۔ وہ پنجابی لڑکی ہے۔ شوہر بنگالی اور تھائی لینڈ میں پاکستانی سفیر اس لڑکی کے انڈین پنجابیوں سے بہت اچھے مراسم تھے۔ جس روز صبح تین بجے میں بنگ کاک سے چل رہی تھی اس نے سر پر نیلی پگڑی باندھنے والے خوفناک سرداروں سے رات کے ۲ بجے ان کی امریکن نائیلون ساریوں کی دوکان کھلوا دی۔ سرداروں نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "بھین جی اپنی دوکان سمجھو۔" جانے وہ نہنگ تھے یا اکالی تھے یا کون تھے۔ منیلا اور ہانگ کانگ میں قطعی' اجنبی لوگوں نے ایسی مہمان نوازی کی گویا مدتوں کے پرانے دوست ہیں۔ اور رنگون ایئرپورٹ پر ایک پرانے ملاقاتی ملے جو ایک وی۔ آئی۔ پی ہیں۔ فوراً ایک لفافہ تھمایا کہ کراچی پہنچ کر ان کو دیدوں۔ اپنی بیوی کے لئے تحفہ لے جا رہے ہیں۔ بوجہ حمق اغلب تھا کہ اسے پرس میں رکھ لوں' دفعتاً جانے کس طرح خیال آیا کہ اس میں کوئی گھپلا نہ ہو۔ لفافہ کھول کر دیکھا۔ گلابی موتی اور یاقوت! ان کا خیال تھا کہ کراچی کسٹم والے میرا سامان نہیں دیکھیں گے۔ ورنہ میں پکڑی جاتی۔ دنیا عجیب و غریب واقعات سے پر ہے۔

جارج میکش آنکھیں گول کیئے سنتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے ایڈونچر سنائے۔ کھانے کے بعد ہم

لوگ انگو ان کے ہوٹل پہنچانے نکلے۔ پھاٹک پر آدھ گھنٹہ موصوف نے انور قریشی کی فیٹ الیوین ہنڈرڈ کے فضائل پر ایک مدلل تقریر کی۔ معلوم ہوتا تھا ساری عمر کسی موٹر گیراج میں کام کیا ہے۔ وہ کتابیں تو یونہی غلطی سے لکھ ڈالیں۔

"کیا نفیس شخص ہے۔" ماکی نے بعد میں کہا۔ "اور اتنا موڈیسٹ۔"

"میں نے ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو بہت موڈیسٹ پایا۔ ایلمر رائس بوڑھے ہیں اس لیئے ذرا جھکی تھے۔ جان اسٹین بک کم گو ہیں۔ مغرور نہیں۔ جان ڈوس پیسوس' البرٹو مورادیا' انگیس ولسن' پال بٹوری سب سوئیٹ لوگ ہیں۔ صرف اسٹیون اسپنڈر ذرا لڑاکا تھا۔ مگر ان کے لئے ان کا ایک ہم عصر مشہور انگریز ادیب کہہ رہا تھا کہ BAD CONSCIENCE ان کو ستاتا ہے۔ اس وجہ سے بد مزاج ہیں۔ یہ محض ہمارے ہاں ہندو پاکستان کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی خصوصیت ہے۔ خصوصاً اردو کے بعض اہل قلم کی۔ جن کو عالمی شہرت بھی حاصل نہیں۔ لیکن ذرا سی اہمیت انکو ملی اور دماغ ساتویں آسمان پر۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ بقراط کو اگر عالمی شہرت بھی مل گئی۔ جو عین ممکن ہے۔ وہ ایسے ہی خاکسار رہیں گے۔" ماکی نے کہا۔

دسمبر کے مہینے میں بقراط ڈھاکے کے سے آ گئے۔ ان کی اگلی منزل کینیڈا تھی جہاں رہ کر وہ جمالیات اور فلسفے پر نہایت خوفناک قسم کی کتابیں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ بیگم بقراط ڈاکٹر تھیں اور نورافشاں کی رفیق کار رہ چکی تھیں۔ اتوار کی ایک صبح ماری پور تشریف لائے میں نے کہا۔ "ہم ایک ناول لکھ رہے ہیں۔ سوچتے ہیں اس میں بطور گریک کورس آپ کو ڈال دیں۔"

"یہ بھی کیا ذو کو منزی بتا رہی ہیں کہ کاسٹ میں اس کو ڈال دوں۔ اس کو ڈال دوں۔ واہ دا"۔

"یہ تو طے ہے کہ کسی نہ کسی کتاب میں 'دریا سویر' آپ کو ضرور شامل کریں گے۔"

"صرف ایک شرط پر۔ میرا اصل نام ہرگز ظاہر نہ کیجئے گا۔"

"بہت خوب۔ لیکن کیا لکھا جائے۔ ایک گمنام فلسفی کا مقولہ ہے۔؟"

"کیا ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جسے آپ جانتی ہیں اس کا ذکر کریں؟"

"ہمارے نزدیک ہر انسان ایک اہم کردار ہے۔ جو کہ وہ ہے۔؟"

"لگتا ہے آپ کا انڈین پیریڈ ختم ہو گیا۔ اب زین کا دور ہے۔"

"میرے ہاں۔" میں نے نہایت بدحواسی کے عالم میں جواب دیا۔ "سارے پیریڈ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کوئی دور' کسی دوسرے دور سے سے علیحدہ نہیں۔ گل صد ہزار برگ۔" میں نے انگلی اٹھا کر انہیں یاد دلایا۔

"آپ پر انکشاف ذات ہو چکا ہے۔"

"ارے صاحب بہت عرصے سے"۔

"کیا۔؟"

"ع۔ اے عندلیب کیوں نہ چمن بیچ مر گئی۔"

"اور۔؟"

"اور یہ کہ اگر ہم سب دن میں ایک دوبار خود کو یاد دلاتے رہیں۔

I AM A DAMN FOOL.

I AM A DAMN FOOL.

I AM A DAMN FOOL.

تو سارے مسئلے حل ہو جائیں۔ یہی مہامنتر ہے۔"

ہم لوگ حسب معمول سمندر کی طرف والے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ سامنے چٹانیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ نیلے آسمان پر سفید پرندے چکر کاٹ رہے تھے۔

"سناٹا۔ جھینگر کی آواز۔ چٹانیں۔" بقراط نے کہا۔ "یہ ہاشو[9] ہے۔"

ایک کوا اڑتا ہوا آ کر جنگلے پر بیٹھ گیا۔ عاصم نے اس پر اس پیترے سے نظر ڈالی گویا عنقریب اس پر ایک ہائیکو تخلیق کرنے والے ہیں۔

"اس عاقل پرند کو دیکھ کر آپ کو کیا یاد آتا ہے۔؟ بقراط نے پوچھا۔

"کوا اندھیری رات میں دن بھر اڑا کیا۔" میں نے جواب دیا۔

"لاحول ولا قوہ۔ سنیئے ہاشو کہتا ہے۔

خزاں کی شام
سوکھی ٹہنی
پر ایک کوا"

کوا فوراً اڑ گیا۔ اندر سے صبیحہ عرف رانی نکل کر آئیں اور مجھ سے کہا۔ "ان کا فون آیا ہے۔"

"کون۔؟"

"وہی۔ جو ہیں۔ وہ۔"

"اچھا۔ وہ۔ کہدو۔ اچھا'۔ یہ زین کی آخری اسٹیج ہے۔" میں نے رانی کی طرف سے مڑ کر بقراط کو مخاطب کیا۔

"ارے نہ معلوم کون ہے۔ رانی بی بی فون بند نہ کرنا۔ میں نے بیگم صاحب سے کہا تھا اس وقت مجھ سے بات کر لیں۔ بقراط لپک کر اندر گئے۔ واپس آئے اور کہا۔ میری بیوی نہیں تھیں۔ کوئی صاحب کہہ رہے تھے آپ سے کہدوں وہ لوگ آج صبح لاہور روانہ ہو گئے۔ آپ کے پلین کی فلائٹ کل صبح دس بجے کی ہے۔"

"اچھا۔ وہ لوگ۔ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لوگ۔ ہر طرف پر اسرار لوگ بسے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ۔ یہ لوگ۔ کون کون کیسے کیسے لوگ

کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اچانک نمودار ہوتے ہیں۔ پھر غائب ہو جاتے ہیں۔" بقراط نے سمندر کی لہروں کی طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

اندر پھر فون کی گھنٹی بجی۔ رانی نے آکر کہا۔ "کمانڈر مظہر احمد لنچ پر انتظار کر رہے ہیں۔ بقراط ماموں کو بھی بلایا ہے۔" "آصف لنگور ماموں" کی طرح بچے باضابطہ۔ "بورصدیقی ماموں" اور بقراط ماموں" کہتے تھے۔

دو گھنٹے بعد۔ بحریے کے میس کے سبزے پر دھوپ میں بیٹھے اب ہم لوگ لنچ کا انتظار کر رہے تھے۔ اور ذرا اکتا رہے تھے۔ "پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا۔ عاصم نے کہا۔

"نہایت گہری بات ہے۔" بقراط بولے۔ "نجانے یہ آج کل کے لڑکے جو انگریزی میں جدید شاعری کرتے ہیں۔ انہوں نے اکبر کو پڑھا ہے یا نہیں۔"

اعجاز حسین بٹالوی جو لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ انور قریشی 'مائی' کمانڈر عسکری ابن سعید نشو عاصم باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گئے۔

"کوئی پری گزر رہی ہے۔" نشو نے کہا۔

"جی نہیں۔ پری زاد آ رہا ہے۔ بقراط بولے۔

لیفٹننٹ کمانڈر مظہر احمد سبزے پر گزرتا ہوا واپس آیا۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل رشید احمد کا چھوٹا بھائی' بے انتہا حسین و جمیل 'نازک سا' بھولا سا' نوجوان جو انگریزی میں جدید نظمیں لکھتا تھا جنہیں میں توفیق رفعت کی نظموں کے ساتھ پاکستان کوارٹرلی میں شائع کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مظہر احمد پھر اٹھ کر میس کی عمارت کی طرف گیا۔ ایک چیل دور سے پرواز کرتی ہوئی آئی' آکر املتاس کی ایک شاخ پر بیٹھی اور مراقبے میں مصروف ہو گئی۔

"چیل بھی ایک زین ماسٹر ہے۔" عاصم بولے۔

"جب چیل کو حضور قلب حاصل ہوتا ہے تو وہ کیا کرتی ہے۔" اعجاز نے پوچھا۔

"انڈا چھوڑتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اب ہم پھر خاموش تھے۔ دو برآمدے میں مظہر احمد کسی ساتھی افسر سے باتیں کرنے میں مصروف نظر آیا۔

"ایسا پیارا مظہر احمد۔" بقراط نے اچانک کہا۔ "ان لوگوں میں سے ہے جن کو انگریزی میں FEY کہا جاتا ہے۔" (کیا بقراط کو علم غیب تھا۔ پری زاد مظہر احمد چند سال بعد ایک ہیلی کوپٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔)

بقراط پھر چونک کر بولے۔ "وہ لوگ کون تھے؟ جن کے متعلق فون آیا تھا کہ لاہور گئے؟"

"ڈاکٹر برنارڈ لوئیس وغیرہ۔ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے لئے آئے ہیں۔ ڈاکٹر برنارڈ لوئیس یہاں تین چار دن ٹھہرے۔ ہم لوگوں کے ساتھ روز کافی ہاؤس لنچ کھانے جاتے تھے۔ ذرا جو AIRS لیتے ہوں۔"

میں نے کہا۔ "وہی بات کہ یہ لوگ اصل دانشور ہیں۔"

"زین اور اسلامیات۔ دونوں میں سے آپ کو کون زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔؟" بقراط نے پوچھا۔

"دونوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ بھی زین ہے۔" بقراط نے جواب دیا۔

چیل اڑ گئی۔

۹۔ بگل کی آواز

۳۱ دسمبر کی صبح پنجاب یونیورسٹی کے سبزے پر بڑی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ رنگین قناتیں لگی تھیں۔ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے اولین اجلاس کا انتظام ہو رہا تھا۔ ساری دنیا سے ایک سو ۱۰۰ ماہرین اسلامیات لاہور پہنچ چکے تھے۔ گھاس پر ایک طرف کرسیاں ڈالے ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی کے شعبہ عربی کے اراکین بیٹھے ہوئے تھے۔ "کیا آپ کلوکیم کی ڈوکومنٹری بتائیں گی؟" ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"مسٹر امجد علی سال بھر کی چھٹی پر ہیں۔ ان کی جگہ رسالہ ایڈٹ کر رہے ہیں۔ کلوکیم اس کے لیے کور کریں گے۔ اور بجد خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر میسنوں ' رچرڈ فرائی اور ڈاکٹر گرین بام جیسے لوگوں سے تبادلہ خیالات کا موقع ملے گا۔ اور پروفیسر حتی۔"

"خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے" ان صاحب نے کہا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کی صبح کلوکیم کا اجلاس منعقد ہوا۔ سوویٹ وفد کے مولانا اسماعیل مخدوموف بخاری نے انتہائی خوش الحانی سے تلاوت قرآن مجید کی۔ پہلے روز کا موضوع تھا۔ "اسلامی کلچر کے معنی۔"

میں نے آپا ممن سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمیں کسی پچھلی صدی میں پیدا ہونا چاہئے تھا کہ اس کنفیوژن سے بچتے۔ اسلامی کلچر۔ انڈین کلچر۔ انڈوبرٹش کلچر۔

انڈوبرٹش کولونیل کلچر کی یادگار جم خانہ کلب کے بال روم میں ایک چوڑا زینہ اترتا تھا جس کے پہلو کی دیوار پر برٹش پنجاب کے گورنروں اور اکیڈمی مصوروں کے بنائے مناظر آویزاں تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کی رات جبکہ بال روم رقصاں پاکستانی جوڑوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' بھائی جان جری احمد سید ایک کونے میں اعجاز بٹالوی اور نوبزادہ امتیاز علیخاں سے مصروف گفتگو تھے اچھو اور آپا ممن اس زینے کی آخری سیڑھی پر بیٹھے سامنے کا منظر دیکھتے رہے۔

"ذرا سوچو۔ ابا جان اپنے وقت کے بہترین بال روم ڈانسر سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مسوری کے سوائے میں بال روم ڈانس کا مقابلہ ہوا تھا اس میں ابا جان اور ان کی پارٹنر کسی مہاراجہ کی یوروپین

رانی نے انعام جیتا تھا۔" آپا ممن نے اپنے والد چچا نصیر مرحوم کے متعلق کہا۔

"اس وقت وہ نئے صاحب لوگ تھے۔ ان آج کے صاحب لوگوں سے پینتالیس پچاس پہلے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عجیب بات ہے۔ بڑے ابا اور چاپان کو ہندوستانی اور مغربی موسیقی سی اتنی دلچسپی تھی اور ابا جان بالکل بے نیاز۔"

آرکسٹرا اب "اولڈ لانگ زائن" بجا رہا تھا۔

دفعتاً آپا ممن بولیں۔ "اچھے بھائی اور ایوب بھائی نجانے اس وقت کہاں ہونگے۔ ان کے لئے سال نو بے معنی ہے۔"

"اور ابا جان اور بڑے ابا اور چھوٹ جاپان اور وہ سب۔" اچھو نے آہستہ سے کہا۔

آپا ممن اور اچھو کی والدہ چچی وحیدہ جو ایک صاحب علم خاتون تھیں ایک مرتبہ تذکرہ غوثیہ ذرا محظوظ ہو کر پڑھ رہی تھیں اور اس کا ایک جملہ مجھے پڑھ کر سنایا تھا۔ خدا جس نے تمہارے بزرگوں کو مارا۔ اب تمہاری فکر میں ہے۔

بارہ کا گجر بجا۔ روشنیاں گل ہوئیں۔ ہال میں غل غپاڑہ مچا۔ نیا سال آگیا۔

حاضر ماموں کے لڑکے خواجہ توفیق رفعت نے اپنی ایک نظم میر لکھا تھا۔

DAY LONG AND NIGHT LONG

VOICES RUSH FROM THE MIND

TAKING THE JOY OF UTTERANCE WITH THEM

AND LEAVING CHAOS BEHIND

ONLY A DUMB TERROR BEHIND

STRONG MADMEN O VOICES

TEARING YOUR HAIR AND SIGHING

AND CRYING ON THE WIND

THERE'S ONE NOT A BUNGLER

AND THAT'S TIME THE SLY ANGLER

SEE HIM LAY THE DEAD YEARS

LIKE FISHES IN A ROW

یونیورسٹی ہال میں روز صبح اور تیسرے پہر کے بعد وہ سب جمع ہوتے۔ یوروپ، انگلستان اور امریکہ کے بیس ۲۰ عدد جغادری شرق شناس اور ماہرین اسلامیات اور ترکی، مصر، ایران، عرب ممالک، افغانستان انڈونیشیا، افریقہ، کمیونسٹ چین، کمیونسٹ روس کے مسلمان علماء اور دانشور، اسٹیج پر علامہ اقبال کے پورٹریٹ کے نیچے ایک طویل میز پریس کے لئے بچھی تھی۔ جہاں صحافیوں کے ساتھ میں واحد خاتون بیٹھ

کر ننگ کرتی اور ان بھانت بھانت کی اقوام کے نمائندہ دانشوروں کی صورتیں اور حرکات و سکنات ملاحظہ کرتی۔ کلوکیم کے اختتام پر لاہور کے ایک اخبار نے لکھا کہ علاوہ مذاکروں کے ایک سوئٹر بھی بنا گیا۔ مباحثوں کے دوران کچھ سیاسی گرما گرمی ہوئی۔ ایک بار پانچ افراد کا برطانوی وفد جس میں ڈاکٹر برنارڈ یوئیس اور ڈاکٹر این لیمبرٹ (جو اورینٹل اسکول لندن میں امینہ کو فارسی پڑھا چکی تھیں۔) شامل تھیں واک آوٹ کر گیا۔ دوسری بار ہندوستانی وفد نے جس کے اراکین مولانا عبدالماجد دریا بادی، ہاشم امیر علی، ڈاکٹر زبیر صدیقی اور میر ولی الدین تھے واک آوٹ کیا۔ گویا یہ چاروں شرمندہ ساحل لوگ تھے۔

کلوکیم کے دوران قلعہ لاہور کے شاہ جہاں اور جہانگیر کواڈرینگلز میں اسلامی آرٹ و کلچر کی بین الاقوامی نمائش منعقد ہو رہی تھی جسے ایک مشہور فرانسیسی باستان شناس اور امریکہ کے نامور ڈاکٹر رچرڈ ائینگ ہازن نے ترتیب دیا تھا۔ نوادر گیارہ اسلامی ممالک اور یوروپ اور امریکہ کے عجائب خانوں سے آئے تھے۔ ڈاکٹر ائینگ ہازن نہایت محبت اور احتیاط سے خود قالین اور ظروف اٹھا اٹھا کر سجا رہے تھے۔ ان مغربی اہل دانش کی علمی لگن اور خلوص حیرت انگیز ہے۔ سال نو کی صبح میں فوٹو گرافر لیکر آپا حسنہ اور اچھو کے ساتھ قلعے گئی۔ ایک کمرے میں اقبال پویلین سجایا گیا تھا جس کے لئے علامہ مرحوم کا حقہ چارپائی اور قالین جاوید نے مستعار دیا تھا۔ سارے قلعے میں نوادر کا ایک انتہائی بیش بہا ذخیرہ سجایا جا چکا تھا۔ میں نے فوٹو گرافر سے کہا کہ تصویریں لینی شروع کرے۔ اتنے میں ایک صاحب لپک کر سامنے آئے اور کہا۔ "آپ تصویریں نہیں اتار سکتیں۔"

"کیوں۔؟"

"اجازت نہیں ہے۔"

"کس کی۔؟"

"اوپر والوں کی۔"

"اوپر والے کون ہیں؟" میں نے چراغ پا ہو کر دریافت کیا۔

ان صاحب نے ایک برجی کی طرف اشارہ کیا۔

"ان سے کہیے اپنے دماغ کا علاج کرائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہیں اوپر اپنے دفتر میں۔"

"آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ میں نے بھنا کر کہا۔"

آپا حسنہ اچھو سے آہستہ سے بولیں۔ "اب آئی آفت۔ اب دیکھو یہ کیا کرتی ہیں۔" فوراً آگ بگولہ ہو جانے کی عادت کو ذرا کم کرو۔"

ہم تینوں قلعے کے اس اہلکار کے ساتھ زینہ چڑھ کر دھوپ میں فصیل پر سے گزرتے ایک بڑے کمرے میں پہنچے جہاں سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف فرما تھے۔ اس جگہ جہانگیر کا قلعہ دار بیٹھا کرتا ہوگا۔ میں نے گرج کر پوچھا۔ "یہ آپ کا حکم ہے کہ تصاویر نہ لی جائیں۔"

انہوں نے عینک ماتھے پر سرکائی اور ذرا گھبرا کر مجھے دیکھا۔ "جی ہاں۔"

"آپ کو معلوم ہے نیچے بین الاقوامی نمائش ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"نمائش کا مطلب آپ سمجھتے ہیں؟"

"بات یہ ہے کہ قلعہ ان جگہوں میں شامل ہے جس کی تصویریں نہیں اتاری جا سکتیں۔"

"اس کی تصویریں دیکھ کر دشمن اس پر حملہ کر دے گا؟"

سپرنٹنڈنٹ صاحب بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔

"یہ فوٹو گرافر بھی سرکاری ہے اور رسالہ بھی۔ لیکن آپ کا ریڈ ٹیپ۔ مسخرے پن کی بہترین مثال ہے۔" غصے کے مارے میرا برا حال۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ ضرور تصویریں لے سکتی ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ نے بڑبڑا کر جواب دیا۔

"لیکن آپ پہلے مجھے اپنا وہ قانون دکھایئے جس میں ممانعت درج ہے اور اس کا سن و تاریخ"

آپا حسنہ اور اچھو دروازے کے باہر کھڑی تھیں۔ آپا حسنہ نے اشارہ کیا کہ بات کو نہ بڑھاؤ۔

"شاید انگریز کسی زمانے میں یہ قانون بنا گئے ہوں گے۔ اچھا وہ فائل دکھایئے۔ آپ کے آدمی نے مجھے کس طرح منع کیا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ نمائش۔"

آپا حسنہ نے پھر باہر سے اشارہ کیا۔ میں بھنائی ہوئی باہر آئی نیچے جا کر فوٹو گرافر سے تصاویر کھنچوائیں۔ شام کو گھر جا کر بھائی جان سے کہا۔ "ریڈ ٹیپ کے لطائف میں سے ایک بہترین۔"

"عینی خاتون۔" بھائی جان نے بات کاٹی۔ "ہمیں وہ قصہ معلوم ہو چکا ہے۔ ہمارا خیال ہے آپ کو اگر ڈپلومیٹک سروس میں چودھری ظفر اللہ خاں نے لے لیا ہوتا تو بڑی آفت مچتی ذرا سا TACT سیکھیے۔ بس آپ میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ صرف ایک آنچ کی کسر۔"

"وہ تو بے چارہ قلعے کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ مارے حق گوئی کہ آپ جا کر ایسے لوگوں کو کھری کھری سنا آتی ہیں جو اس وقت تو خاموش رہتے ہیں لیکن بعد میں درپردہ آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔" نواب زادہ امتیاز علی خان نے کہا۔

"میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔" میں نے دہرایا۔ "اور آپ لوگ ہمیں نصیحت کرنے چلے ہیں۔ آپ لوگ کیا کم صاف گو ہیں؟"

بھائی جان اس وقت ڈاکٹر ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ اور ڈاکٹر برنارڈ لوئیس سے تبادلۂ خیالات کر کے آ رہے تھے۔ اور بہت ہونکی ذوری بیٹھے تھے۔ بلحاظ پیشہ کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس تھے۔ دل فلسفے اور اسلامیات میں پڑا تھا۔ خود مفکر اور عالم آدمی تھے مگر حسِ مزاح کی وجہ سے بور فلسفی بننے سے بال بال بچ گئے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پڑھ چکے تھے اور ۱۹۳۶ء وغیرہ کے رسالہ جامعہ میں چند غیر معمولی افسانے لکھے تھے۔ ہم لوگوں کے چندو خانے میں تندہی سے حصہ لیتے تھے۔ مجھ سے بہت دوستی تھی میں مستقل ان سے

جھائیں جھائیں بحثیں کرتی تھی۔ خاندان اور دنیا کے جملہ امور و معاملات کے متعلق اپنی اٹل رائے رکھتے تھے۔ ایک روز ناشتے کی میز پر حسب معمول کسی خاندانی مسئلے پر شدید بحث ہو رہی تھی۔ بھائی جان نے اپنا فیصلہ صادر کیا جو بالکل ناقابل عمل تھا۔ میں نے چڑ کر کہا۔ بھائی جان آپ ایک کتاب لکھیے۔

"HOW TO RUN THE WORLD IN SIX SHORT LESSONS"

بہت محظوظ ہوئے۔ ایک بار پھر دہرایا۔ "عینی خاتون۔ بس آپ میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ صرف ایک آنچ کی کسر۔"

ایک روز میں اپنا ایک طلائی بندہ سارے میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ سارا گھر تلاش میں جتا ہوا تھا۔ بندہ میرے بالوں میں الجھا ہوا ملا۔ اس کے بعد سے اگر گھر میں کوئی چیز گم ہو جاتی بھائی جان فرماتے "عینی خاتون کے ہاتھی ڈباؤ بالوں میں تلاش کر لو' مل جائے گی۔"

بیشتر ذہن پرست لوگوں کی طرح غیر عملی انسان تھے۔ اب آپ نے "شرکت قلم" کے نام سے ایک کو آپریٹیو پبلشنگ ہاؤس قائم کرنے کی اسکیم بنائی تھی۔ ابا جان کے استاد سر طامس آرنلڈ کے بہت مداح تھے۔ "دی پریچنگ آف سلام" عرصے سے آؤٹ آف پرنٹ تھی۔ ایک عدد عالمانہ مقدمہ لکھ کر اسے اپنے پیسے سے شائع کیا تھا۔ کتاب فروخت کرنے کے گر سے ناواقف تھے۔ سارا اسٹاک ایک کمرے میں پڑا تھا۔

"بس عینی خاتون۔ یہ جو آپ نیا ناول لکھ رہی ہیں اسے ہم خود چھاپیں گے۔ آپ خود ہی اسے مصور کیجئے ہر باب میں ایک رنگین تصویر جیسے مغربی ناولوں میں ہوتا ہے۔"

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کتنی لاگت آئے گی۔؟ بے تحاشا۔"

"اللہ مالک ہے۔ بس ہم بہت بڑھیا آپ کی کتاب چھاپیں گے اور یہ جو پبلشر آپ کو بے وقوف بناتے رہتے ہیں ہم ان سے آپ کو بچائیں گے۔ کتابیں کس طرح شائع کرنی چاہئیں اس کے متعلق ہمارے ذہن میں چند نہایت بہترین آئیڈیاز ہیں۔"

"گول کیجئے۔ کہاں چھاپتے پھریں گے آپ ہماری کتاب۔"

"بس اسی بے پروائی کی وجہ سے آپ ہمیشہ نقصان میں رہتی ہیں۔"

"ایک غیر پریکٹیکل آدمی دوسرے غیر پریکٹیکل آدمی کو کیا زریں مشورے دے رہا ہے۔" آپا حسن نے کہا۔

"یہ کون سا لفظ ہے؟" بھائی جان نے دریافت کیا۔

۸ جنوری کو کلوکیم ختم ہونے والا تھا۔ ایک روز میں نے عرب نژاد عیسائی امریکن مورخ پروفیسر فلپ حتی سے جو ایک انتہائی سویٹ بزرگ تھے۔ کوارٹرلی کے لئے خصوصی مضمون کی درخواست کی۔ ڈاکٹر حتی فلیٹیز میں مقیم تھے۔ کہنے لگے۔ "میں آج رات کو مضمون لکھ دوں گا۔ کل شام سات بجے فلیٹیز آ جاؤ مضمون دیدوں گا۔ اس کے بعد مجھے باہر جانا ہے۔"

میں کسی ناگزیر وجہ سے وقت پر ہوٹل نہ پہنچ سکی نہ ان کو فون کر پائی۔ ڈاکٹر حلی ریلپشن کلرک کو مضمون تھما کر باہر جانے کے بجائے اپنا پروگرام منسوخ کر کے پون گھنٹہ برآمدے میں بیٹھے اور ٹہلتے رہے اور جب میں بھاگم بھاگ ندامت سے پانی پانی وہاں پہنچی تو نرمی سے بولے۔ "کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" مضمون بھی ٹائپ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

ضیا محی الدین کے کزن اور اعجاز بٹالوی کے گہرے دوست ڈاکٹر داؤد رہبر غالباً انقرہ یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ کلوکیم کے لئے لاہور آئے تھے۔ کلوکیم کے ایک سیشن میں قرآن حکیم کے متعلق اپنا مقالہ پڑھا۔ سنا ہے بعد میں چند علماء نے اعتراضات کیئے۔ ان کے لاہور سے واپس جانے کے کچھ عرصے بعد اعجاز بٹالوی نے مطلع کیا۔ "داؤد رہبر عیسائی ہو گئے۔ ترکی سے پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ گئے۔ وہاں مع بیوی بچوں کے بپتسمہ حاصل کیا اور باضابطہ پادری بن گئے۔ اب وہ ریورنڈ رہبر کہلاتے ہیں اور اسلامی ملکوں میں تبلیغ مسیحیت کی خاص ٹریننگ حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔"

پھر اعجاز نے فلسفہ چھانٹنا شروع کیا۔ "سوچو داؤد نے کس روحانی کرائسس اور کرب سے گزر کر تبدیلی مذہب کا فیصلہ کیا ہو گا۔"

ہمیشہ کی طرح دنیا عجیب و غریب واقعات سے پر تھی۔"

اسٹیٹ بینک کے فلیٹ میں آپا حسنہ کے ہاں ان کے والدین چچا نثار حیدر زیدی اور پھوپھی حمیدہ (جو آپا ممن کی سگی خالہ تھیں) اور آپا زہرا (جو آپا ممن کی چھوٹی بہن اور آپا حسنہ کی بھاوج تھیں) نہٹور اور علی گڑھ سے اپنی سالانہ وزٹ پر آئی ہوئی تھیں۔ میں حسب معمول قیام لاہور کا زمانہ اسٹیٹ بنک اور لارنس روڈ میں تقسیم کرتی تھی۔ کلوکیم کے چند روز بعد لارنس روڈ سے اسٹیٹ بنک۔

لقمان بھائی کے کمرے میں کتابوں کا انبار جمع تھا۔ ان کی میز پر جگر صاحب کا ایک مجموعہ کلام رکھا نظر آیا۔ بے دھیانی سے اس کے ورق پلٹے۔ ایک مصرعے پر نظر پڑی۔

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
بس ناول کا یہی عنوان ٹھیک ہے آگ کا دریا

ہندوستان سے جگر صاحب ایک مشاعرے کے لئے تشریف لائے تھے۔ جگر صاحب چچا نثار کے پرانے قریبی دوست تھے۔ (اور ان کی بیگم شیرازن نے ۱۹۳۷ء میں نہٹور میں آپا حسنہ کی شادی کے موقع پر ڈھولک کے گیت گائے تھے۔ وہ بہت اچھی گلوکار تھیں۔ وہ بھی کیا بے فکری کا زمانہ ہو گا۔) اب آپا حسنہ نے اسٹیٹ بنک میں اپنے ہاں گرینڈ ڈنر (بقول علی گڑھ والے مرزا سرگزشت گرینڈ پر ہیزی) اور مشاعرہ کیا۔ کراچی سے رتی کشور آئے ہوئے تھے۔ دوسری صبح ہم لوگ پہلو کے برآمدے میں جمع تھے۔ لارنس روڈ سے آپا ممن اور اچھو ۵ آ چکی تھیں۔ سامنے ٹیرس پر بچے شور مچاتے پھر رہے تھے۔ من 'مشن چوزی طویل گیلری میں رولر اسکیٹنگ کر رہے تھے۔ برآمدے میں فرش پر بچھے قالین پر بیٹھی آپا زہرا' آپا حسنہ۔ آپا ممن' اچھو' کشور اور رتی چنڈو خانے میں مصروف تھے۔ اسی دھائیں دھائیں میں دیوار سے لگ کر آگ کا دریا کا ایک

باب لکھنے میں مصروف اور ساتھ ساتھ چنڈو خانے میں شریک رہی۔

رائیٹر لوگ لکھتے ہیں اپنے تخلیقی سفر (یا اسی قسم کی کوئی اور مرعوب کن بات) کے لئے خاموشی اور سکون چاہیئے۔ کچھ ادیبوں کو بلبل کی آواز کنج تنہائی اور صحن چمن وغیرہ درکار تھا۔ یہاں تو ہمیشہ اس طرح لکھا کہ چاروں طرف گھمسان کا رن پڑ رہا تھا اور خود بھی اس رن میں شامل۔

"جبھی تو جیسا لکھا سو لکھا"۔ ایک بگڑے دل نے کہا تھا۔

اچانک یاد آیا۔ آپا حسنہ کہہ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے آتشدان کے لئے ایک پینٹنگ بطور اسکرین۔ آپا حسنہ کے جہازی فلیٹ میں ایک طرف وسیع پر فضا جارجین پولین سا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس کے چمکیلے سرد عنابی فرش پر بیٹھ کر پینٹ کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر دیکھا سامنے اعجاز بٹالوی کھڑے تھے۔ انہوں نے میرے افسانوں کی زبان کی پیروڈی کرتے ہوئے فرمایا۔ "اے بی بی۔ تم جو یہ کر رہی ہو یہ کیا کر رہی ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ موسم سرما کی زرد دھوپ سبزہ زاروں سے سرکتی جا رہی ہے اور الحمرا میں زہرا نگاہ اپنی تازہ غزل سنانے والی ہیں؟"

سفید شلوار قمیض' تراشیدہ بال' زہرہ نگاہ وقار سے چلتی آکر الحمرا کی اسٹیج پر جہاں جگر صاحب اور دوسرے شعرائے کرام فروکش تھے' بیٹھیں اور اپنا کلام سنایا اور سامعین مسحور ہوئے۔

چند سال قبل بدایوں سے آئی ہوئی اس ہونہار شاعرہ کی کراچی میں دھوم مچنی شروع ہوئی تھی۔ جب ایک روز زہرا ممانی نے کہا تھا۔ ہم چاہتے ہیں زہرا نگاہ کو کھانے پر بلائیں۔ مگر ہم ان کو جانتے نہیں۔ تم خود جا کر بلاؤ۔ تمہارے کہنے پر ضرور آ جائیں گے۔"

ایک سیدھی سادی لڑکی اپنے مکان میں چارپائی پر بیٹھی یونیورسٹی کے کسی امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے بتایا میں فلاں ہوں۔ میرے ماموں ممانی کے ہاں دعوت ہے۔ آپ کو مدعو کرنے آئی ہوں۔ لڑکی نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔ اچھا ارے آپ ہیں۔ میں کسی کے ہاں دعوت پر نہیں جاتی مگر آپ خود بلانے آئی ہیں ضرور آؤں گی۔ دعوت کی شام سی فیلڈ روڈ کی کوٹھی کے لان پر انہوں نے اپنا کلام سنایا تھا۔

ان پچھلے چند برسوں میں زہرا نگاہ ایک سیلیبرٹی بن چکی تھیں اور ایک باوقار اسٹیج پریذنس رکھتی تھیں۔

ہال میں بیٹھے سامعین میں چچا نثار حیدر زیدی بھی موجود تھے۔ یو۔ پی کے شہروں میں آل انڈیا مشاعرے منعقد کروانا جن کا محبوب مشغلہ رہ چکا تھا۔ مگر چچا نثار کے زمانے میں خواتین کا اسٹیج پر آکر غزل سرا ہونے کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ حد سے حد خواتین چق کے پیچھے سے اپنا قومی یا نعتیہ کلام سنا دیا کرتی تھیں۔

وقت کی شمع تیزی سے آگے بڑھ چکی تھی۔

"یہ کیا بات ہے میں نے کہا۔ کہ شاعرات میں وہ کنک اور MANNERISM نہیں ہوتے جو بعض

شعرائے کرام کا خاصہ ہیں۔"

اس لئے کہ وہ شراب نہیں پیتیں — آپا زہرا نے کہا — میں نے شہر کے تمام دوست ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا تھا جو جار جین تالار میں جمع تھے ایک گوشے میں نئی شاعرات زیر بحث —

ابھی ہماری سوسائٹی کا عبوری دور ہے — جب مغرب کی قسم کی آزادی یہاں آجائے گی تو ہمارے فنکار خواتین وہی سب کرینگی" — ایک مشہور اخبار نویس نے کہا —

"یعنی شراب اور سگریٹ اور چرس پئیں گی' آوارہ گردی کرینگی اور شعر اور افسانے لکھتی جائیں گی —" مجھے لندن والی اونٹ نما شاعرہ اور ڈی لن طامس کی گرل فرینڈ اور پیرس کی بوہیمیا کی فنکار لڑکیاں یاد آئیں جو دراصل انتہائی دکھی اور اول جلول زندگیاں گذارتی تھیں — اور آئے دن ماہرین نفسیات سے اپنا تجزیہ نفسی کرتی رہتیں تھیں فن نہ ہوا عذاب جان ہو گیا —

"چلمن کے پیچھے محفوظ رہنے ہی میں غالباً خیریت تھی۔" اخبار نویس نے کہا۔

"یا چلمن کے پیچھے قید رہئے یا شراب پی کر لوفری کیجئے۔ درمیانی راستہ آپ کے خیال میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا۔

آپا زہرا کی بچی ہما عرف بچن دوڑتی ہوئی آئی۔ آپا زہرا چونکہ ہندوستان سے آئی ہوئی تھیں ان سے طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ صحافی دوست نے بچن سے اس کا نام دریافت کیا۔

"ہما" اس نے تمیز سے جواب دیا۔

"اوما! لو صاحب۔ نام بھی ہندوانہ رکھے جانے لگے۔"

"ہمارے والد اور بڑے ابا آپا زہرا نے رسانیت سے جواب دیا۔ سارے خاندان کے بچوں کے نام رکھتے تھے۔ جب یہ پیدا ہوئیں وہ لوگ زندہ نہ تھے۔ چنانچہ میں نے بڑے ابا کی ہما خانم پر نام رکھا۔"

بچن اور آپا ممن کی بچیاں نازلی اور دشکا اور آپا حسنہ کی لڑکیاں بنو اور پرو سارے گھر میں آنکھ مچولی کھیلتی پھر رہی تھیں۔ اتنے میں بچن پھر دوڑی دوڑی آئیں اور آپا زہرا سے کہا۔ "آصف لنگور ماموں آئے ہیں۔"

صحافی نے پھر کان کھڑے کیئے

علی گڑھ کے پروفیسر مختار صاحب مرحوم کے بھانجے آصف مسکراتے ہوئے پویلین میں داخل ہوئے بچن اور نازلی نے نہایت ادب اور تمیز سے کہا۔ آصف لنگور ماموں آداب۔"

"جیتی رہو۔" آصف نے اطمینان سے جواب دیا۔ اور مہمانوں کے مجمع میں رل ملے گئے بچیاں واپس چلی گئیں۔

صحافی نے اب تعجب سے آپا زہرا کو دیکھا۔

میں نے کہا۔ "اچھو سے آپ ملے ہیں؟ بیگم خالدہ حیدر انصاری۔ وہ جو اس کونے میں باجرہ سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ شرف ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔"

"بہت خوب۔ تو جب آپ علی گڑھ میں جغرافیہ میں ایم۔ اے کر رہی تھیں۔ ایک شام افریقہ کے لنگوروں کی کتاب زیر مطالعہ تھی۔ اس وقت بے چارہ آصف ٹہلتا ہو آنکلا۔ آپ نے آصف پر نظر ڈالی پھر کتاب کی ایک تصویر کو بغور دیکھا۔ اور سنجیدگی سے بولیں۔ آصف تمہاری کھوپڑی کی ساخت بالکل اس لنگور کی سی ہے۔ اس دن سے موصوف آصف دی لنگور کہلانے لگے۔ مگر علی گڑھ میں جو خطابات دیے جاتے ہیں۔ ان کی روایت یہ ہے کہ ممدوح برا نہیں مانتا بلکہ خندہ پیشانی سے اس نام کو قبول کر لیتا ہے۔ آصف بھی بقراط اور بور صدیقی کی طرح اپنا نام قبول کر چکے ہیں۔ بچوں کا خیال ہے ان کا اصل نام ہی یہی ہے"

بچوں کی ایک نئی پود پروان چڑھ رہی تھی۔ بنو۔ پرو' بھین' تزین' نسرین' رضا' امتیاز بھائی اور چھوٹے عثمان بھائی اور احسان بھائی کے بچے۔ آپا راضیہ اور آپا صدیقہ اور آپا نفیسہ کے چھوٹے بچے آپا ممن کے بچے بھائی کی اولاد نور العین' شہناز' ناہید' جلال حیدر' عدنان' منصور' خاندان کے ان بچوں میں بیشتر اپنے اپنے والدین کے ہمراہ یوروپ اور امریکہ جاتے رہتے تھے لیکن ہندوستان ان کے لئے ایک اجنبی اور انوکھا دیس تھا۔ دوسری طرف ہندوستانی رشتے داروں کی اولاد ایک مختلف ماحول میں بڑی ہو رہی تھی۔ بچن چاچا نہرو کی شیدائی تھیں۔ ہندوستانی بچے ہندی پڑھ رہے تھے۔ پاکستانی بچوں کے لہجے میں پنجابیت سرائیت کرتی جا رہی تھی۔ اگر یہ آہنی پردہ اسی طرح موجود رہا تو کچھ عرصے بعد سگے رشتے دار ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو گئے۔

آپا ممن بھائی جان کی سب سے چھوٹی بچی دردانہ عرف کنو' باپ کی چہیتی تھی۔ وہ خود غیر معمولی طور پر طویل القامت آدمی اسے کندھے پر بٹھائے پھرتے۔ اس زمانے میں ایک انڈین فلمی گیت ریڈیو پر اکثر بجتا تھا۔ ننھے سے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے۔ مٹھی میں ہے تقدیر ہماری' ہم نے قسمت کو بس میں کیا ہے۔ میں اکثر کنو سے کہتی۔ "پیارے بچے پالے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے۔ بھائی جان جن کو فلموں یا فلمی گیتوں سے دور دور کوئی دلچسپی نہ تھی کنو کو گود میں اٹھائے مستقل یہی الفاظ الاپا کرتے۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر فلسفہ شروع کر دیتے۔

"عینی خاتون سوچیے ان بچوں کی مٹھیوں میں کیا کیا ہے۔ اگر ہم کو ابھی سے معلوم ہو جائے۔"

"اگر ایک ایسی مشین ایجاد ہو جو مستقبل کی تصویریں دکھلا دیا کرے۔ شاید سو ۱۰۰ سال بعد ایسا ہو جائے گا۔ اور فرض کیجئے بھائی جان سو ۱۰۰ سال بعد ایسا ہوا کہ جو کچھ لوگ سوچتے ہیں اور ان کے خواب سب سامنے اسکرین پر نظر آنے لگے تو کیسی تباہی مچے گی۔

لوک ناچ کی فلم کب کی تیار ہو چکی تھی۔ ایک صبح میں چچا نثار چچی حمیدہ اور سارے کنبے کو اپنے ہمراہ اسٹوڈیو لے گئی۔ مینجر نے پہلے ایک تازہ پاکستانی فیچر فلم دکھانے کی پیش کش کی۔ پروجیکشن تھیٹر میں صوفے پر بیٹھ کر چچا جان نے بھولپن سے دریافت کیا۔ بی بی کیا سلوچنا کی فلم دکھلائی جائے گی۔

پکچر کے بعد ایک صاحب کہنے لگے"۔ نور جہاں کی نقل لتا نے کی اب لتا کی نقل ساری سنگرز کر رہی ہیں۔"

آپا حسنہ نے کہا۔ "کمال ہے۔ جب ہم لوگ بمبئی میں رہتے تھے۔ شیریں کا ٹج منگا میں۔ ہماری پڑوسن ایک مراٹھن تھی جس کے ہاں ایک دبلی پتلی کم رو سی لڑکی اکثر آیا کرتی تھی۔ مراٹھن اسے میرے پاس بٹھال کر اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ لڑکی بہت اچھا گاتی ہے۔ اور فلموں میں قسمت آزمانے آئی ہے۔ میں نے کبھی اس سے گانے کے لئے بھی نہیں کہا۔ وہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ وہ لڑکی لتا منگیشکر تھی۔ ہماری برابر والی بلڈنگ میں پرتھوی راج رہتے تھے۔ ان کو اذان کی آواز بہت پسند تھی۔ ایک موذن ملازم رکھا تھا جو پانچ وقت ان کے مکان کے سامنے اذان دیتا تھا۔ اکثر وہ اپنے بڑے لڑکے راج کپور کو اردو پڑھنے کے لئے میرے پاس بھیج دیا کرتے۔"

"افوہ۔" بچوں نے کہا جو آنکھیں پھیلائے بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ وہ زیادہ تر کاؤ بوائے فلمیں دیکھتے تھے ہندوستان سے صرف ہندوستانی فلموں کے ذریعہ روشناس تھے جن پر ابھی پابندی نہیں لگی تھی۔

"کوئی ایسا کیمرہ نہیں ایجاد ہو گا جو مستقبل کے علاوہ ماضی کی جھلکیاں بھی دکھلا دیا کرے۔" ایک روز آپا ممن نے کہا۔ "ایک پارٹی میں پچھلے مہینے ایک صاحب ملے۔ بالکل بڑے ابا کے ہمشکل ان کو دیکھتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بھاگی بھاگی ان کے پاس پہنچی۔ ان کی صورت دیکھوں اور زار و قطار روؤں وہ بہت EMBARRASSED نظر آئے۔ میں نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "معاف کیجئے۔ آپ میرے بڑے ابا کے ہمشکل ہیں۔ میں یلدرم کی بھتیجی ہوں۔ آپ بالکل۔

"وہ بے چارے بڑے اخلاق سے باتیں کرنے لگے۔ پنجابی ہیں۔ انہی دنوں یہاں سے مشرق پاکستان جا رہے تھے۔ وہاں کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر۔"

"میرے ساتھ بالکل یہی واقعہ پیش آیا۔ آپا حسنہ بولیں۔ "وہ صاحب ایک تقریب میں ملے۔ میں لپک کر ان کے قریب گئی۔ وہ زینے سے اوپر جا رہے تھے۔ میں بھی فوراً پیچھے ہولی۔ بالکل بڑے ابا کے ہمشکل میں نے بھی ان سے یہی کہا۔

"وہ سوچتے ہوں گے کتنی دیوانی لڑکیاں ہیں۔" آپا ممن نے کہا۔

حمیرا خاتون بی اے علی گڑھ' بنت سید نصیرالدین حیدر مرحوم' اہلیہ جری احمد سید ایک جذباتی اور آزاد روح' قدسی منش' شگفتہ' بشاش اور بھلکڑ۔ صندوقچہ زیورات جس کی الماری میں شکر کے مرتبان کے ساتھ رکھا رہتا تھا کہ تیار ہو کر باہر جاتے وقت بکس کھولنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ملازمین شکر کے ساتھ ایک آدھ عدد بھی اطمینان سے پار کرتے رہے۔ جب صندوقچہ تقریباً خالی ہو گیا تب آپ کو علم ہوا۔ ایک بار بہت سارے دوستوں کو ڈنر پر بلایا۔ بھول گئیں اور اس رات خود کہیں اور چلی گئیں۔ ایک مرتبہ گورنر مغربی پنجاب کے ساتھ بیٹھی یوم آزادی کی پریڈ ملاحظہ کر رہی تھیں۔ بعد میں کہنے لگیں میری سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا لوگ مجھے بار بار کیوں دیکھ رہے ہیں۔ بہت خوش ہوئی کہ آج ہمیشہ سے بھی زیادہ اسمارٹ لگ رہی ہونگی۔ جب گوگلز اتارے تو پتہ چلا کہ چشمے کا ایک شیشہ غائب تھا۔

آپا ممن جیسے لوگ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور عزیز بندے ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد کی ماں کے بجائے ہمجولی اور دوست تھیں۔ ایک روز لاہور میں بریکفاسٹ کی میز پر اپنے نوعمر بیٹوں منی' مشن سے بولیں۔ "تم لوگوں کو کیسا لگتا ہے بڑے ہو کر۔؟ ہر چیز نئی نئی سی لگتی ہو گی۔"

ایسے معصوم فرشتہ صفت لوگ ذرا کاہل بھی ہوتے ہیں۔ جاڑوں کا زمانہ پچھلے برآمدے میں دھوپ میں پلنگ پر ہونگی ڈوری لیٹی تھیں۔ گیلری میں فون کی گھنٹی بجی۔ آپا ممن سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے منی' مشن سے کہا "تم جا کر میری طرف سے بات کر لو۔" انہوں نے جواب دیا۔ نہیں آپ ہی جائیے۔ آپا ممن نے پھر کہا تم میری طرف سے یہ کہدو۔

"جی نہیں اماں۔ آپ خود جائیے۔ دونوں لڑکوں نے انکا پلنگ اٹھایا اور گیلری میں لے جا کر ٹیلی فون کی میز کے پاس رکھ دیا۔ "BRINGING UP MOTHER!" منی نے باچھیں کھلا کر کہا۔

لارنس روڈ پر آپا ممن کی کوٹھی کے پچھواڑے نوابزادہ لیاقت علی خان کے کزن امتیاز علی خان رہتے تھے۔ درمیان کے باڑ کے ادھر آپا ممن کی بھینس بندھی تھی۔ دوسری طرف نوابزادہ صاحب کی بھینسیں جگالی کرتی تھیں۔ امتیاز صاحب دن میں ایک دو بار بھینسوں کے درمیان سے کودتے پھاندتے ہمارے ہاں آ کر اپنے وطن کرنال کے مشدد لہجے میں گپیں ٹھونکتے تھے۔ بھائی جان اور سبط حسن سے بہت پکی دوستی تھی۔ سبط حسن رسالہ لیل و نہار ایڈٹ کر رہے تھے۔ امتیاز صاحب مجھ سے پوچھتے سبط کیا لکھے ہے؟ اچھا لکھے ہے جی۔ "بہت ترقی پسند پڑھے لکھے سیدھے بھولے انسان تھے۔ شاید کیمبرج میں پڑھا تھا۔ مدتوں قبل فرانس سے شادی کر کے لائے تھے بیوی کب کی وطن واپس جا چکی تھی۔

کھانے کی میز پر گھنٹوں بیٹھ کر گپ بازی ہمارے ہاں کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔ امتیاز صاحب کو یہ محفل خوش آئی تھی۔ ایک برفانی صبح ہم لوگ ناشتے کی میز کے گرد متمکن تھے۔ امتیاز صاحب تشریف لے آئے۔ اور جس موضوع پر سلسلہ گفتگو جاری تھا اسی لمحے اسی نکتے پر تندہی سے خیال آرائی میں شامل ہو گئے۔ اسی وقت میز کے سرے پر بیٹھی آپا ممن نے معاً مخاطب الطبع ہو کر چائے میں شکر گھولتے گھولتے باواز بلند سوچنا شروع کیا فرمایا۔ "امتیاز صاحب اتنے تو کالے ہیں اور اتنے بور ہیں سویٹ جبھی تو فرنچ بیوی چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

امتیاز صاحب نے عینک کے پیچھے پلکیں جھپکاتے ہوئے نہایت خاطر جمعی سے آپا ممن ٥ کی بات سنی۔ برا نہ مانا بلکہ اثبات میں سر ہلایا۔

نازلی نے گیلری میں سے آواز دی امی ریڈیو اسٹیشن سے فون آیا ہے۔

مشن نے کہا۔ "امی ساڑھے گیارہ بجے آپ کی ٹاک کی ریکارڈنگ ہے۔ پہلے بھی فون آ چکا ہے۔"

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ آپا ممن نے اکتا کر فرمایا۔ "لکھنا اتنا ضروری کیوں ہوتا ہے۔ ایسے

ہی بول دیں گے۔ آپا ممن لکھنے کے معاملے میں اتنی کاہل تھیں کہ جب ان کے دونوں بیٹے منن، مشن مجھے کراچی خط لکھتے تو آپ انگوٹھے پر روشنائی لگا کر اپنی طرف سے اس کا نشان کاغذ پر ثبت کر دیا کرتی تھیں۔ کچھ دیر بعد میں آپا ممن کے کمرے میں گئی تو دیکھا ملازم لڑکا جھاڑ پونچھ کرنے کے بجائے کھڑا ایل و نہار کے سرورق پر چھپی جنرل سکندر مرزا اور ان کی نئی ایرانی بیگم کی تصویر انہماک سے دیکھنے میں مصروف ہے۔ آپا ممن ٹاک لکھنے کے بجائے کسی اور کام میں مشغول ہو چکی تھیں۔ میں نے پوچھا کیا دیکھ رہا ہے۔ سادگی سے جواب دیا سکندر مرزا اور اودی بیگم۔"

آپا ممن اب ٹاک لکھنے بیٹھیں۔ جانے کیا موضوع تھا۔ نہایت روانی سے رقم کرنا شروع کیا۔

"آج جب ہم اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جنرل اسکندر مرزا اور اودی بیگم۔"

دوبارہ آغاز کیا۔ ایک پیراگراف پڑھ کر سنایا۔ آخری لفظ "کہا" پر ختم ہوتا تھا۔ آپ نے "کہا" بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کیا۔

میں نے گرہ لگائی۔ "ہمارے مراری جب بندرابن سے جا رہے تھے تو گوپیوں نے ان سے کہا۔ آ۔ جانے نہ دینگی، رتھ کے نیچے آ پران تجیں گی۔"

"انور ادھا یہ تم نے کیا کیا۔؟" آپا ممن قلم روک کر بولیں۔ میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔؟ سوال یہ ہے کہ ہار تو پھولوں ہی کا ڈالا جاتا ہے۔" پھر ٹاک لکھنی شروع کی۔ "چنانچہ ایک ماہر تعلیم نے ان سے کہا۔ انور ادھا یہ تم نے کیا کیا۔ اونہ کون لکھے۔ ریڈیو اسٹیشن جا کر لکھ لیں گے۔"

تقسیم سے چند سال قبل بھائی جان بمبئی میں تعینات تھے۔ اور آپا ممن آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے عورتوں کا انگریزی پروگرام کنڈکٹ کرتی تھیں اور ماہر براڈ کاسٹر تھیں۔

ہم لوگ جھٹ پٹ ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ اسٹوڈیو میں بیٹھ کر آپا ممن نے تقریر گھسیٹنی شروع کی۔ سرخ بتی جلی۔ کہا پھر بیساختہ کہ۔ ہا۔ آ۔ میں تبدیل ہو گیا۔ اب ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال۔ شوکت تھانوی نے عینک ماتھے پر سرکا کر بوتھ کے شیشے میں سے جھانکا۔ میں فوراً باہر بھاگی۔ گیلری میں ای نڈ مل گئی جو ان دنوں لاہور آئی ہوئی تھی۔ پوچھا "آپا ممن بھی آئی ہیں؟" میں نے کہا۔ ہاں۔ اس کمرے میں ہیں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے کہا۔ "اندر مت جانا۔ وہ براڈ کاسٹ کر رہی ہیں۔ اور دروازہ کھلتے ہی تمہارے ساتھ ہمارے مراری ہو رادی بیگم پھر داخل ہو جائیں گے۔"

"ہمارے مراری ہو رادی بیگم۔ واٹ دی ہل از گوئینگ اون ہیر؟ آر یو آل رائیٹ؟"

"ہمارے مراری جب بندرابن سے جا رہے تھے"

"اوہ دیٹ!۔" ای نڈ نے فی الفور وہ گیت گنگنانا شروع کر دیا۔

شام کے وقت ای نڈ، خوشحال خاں جدون اور کمانڈر عسکری (ابن سعید) جو ان دنوں لاہور میں موجود تھے۔ ۴۹ لارنس روڈ آئے۔ کچھ دیر بعد بیساختہ دیسی پکچروں کی پیروڈی شروع ہو گئی۔ ای نڈ ہمیشہ

کھڑے ہو کر دروازے پر یا بیٹھ کر میز پر طبلہ بجاتے ہوئے نغمہ سرائی کرتی تھیں۔ میں نے ہونٹ ہلائے۔ ای نڈ نے پلے بیک گایا۔ واحد آڈینس عسکری بیٹھے رہ گئے۔ سارا گھر اداکاری میں مصروف ہو چکا تھا۔ دفعتاً موڈ بدلا۔ سینما سے اسٹیج۔ اداکاروں نے جلدی جلدی لپ اسٹک اور کاجل سے میک اپ کیا۔ مونچھیں بنائی گئیں، منن ایک پلنگ پوش شانوں سے باندھے آغا حشر کی قسم کا مکالمہ ادا کرتے پہلو کے باغ کی سمت کی لاؤنج سے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ ایک پلنگ پوش کا کلوک اوڑھ کر میں نے جواباً ڈائیلاگ شروع کیا۔

گیلری کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں اس طرح کلوک لہراتی ڈائیلاگ بولتی دروازے پر گئی۔ برآمدے میں میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں اور سبط حسن کھڑے تھے جو مجھے اس حلیے میں دیکھ کر بہت متعجب نظر آئے۔

ڈرائینگ روم میں چنڈو خانہ ملتوی کر کے سنجیدہ گفتگو شروع ہوئی۔ بھائی جان نماز مغرب ادا کر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ملازم قہوے کی کشتی لیکر اندر آیا۔ آپا ممن نے فی الفور مکمل ہوسٹس بن کر مہمانوں کی خاطر مدارات شروع کی۔

دودھ کے جگ میں بال پڑ گیا تھا۔ میں نے ملازم سے کہا۔ "یہ جگ کریک ہو گیا ہے۔ دوسرا لاؤ۔"

آپا ممن بھائی جان کی پانچ سالہ بچی دشکا[10] بھولپن سے بولی۔ "واہ جگ تھوڑا ہی کریک ہوتا ہے کریک تو ہم لوگ ہوتے ہیں۔"

"دراصل ہمارے ہاں۔" میں نے میاں بشیر احمد کو سمجھانے کی سعی کی۔ "کریک اور سوئیٹ اور بور کا اس قدر زور ہے کہ اگر بچے یہ تصور کر لیں کہ کریکیت انسانی صفت ہے۔"

بات دراصل یوں تھی کہ ہم لوگوں نے جن میں آپا عذرا، آپا ممن، آپا زہرا آپا حسنہ، اچھو، نور افشاں، نوشابہ اور کشور شامل تھیں اہل دنیا کو پانچ چھ واضح خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ کافی لوگ سوئیٹ تھے۔ چند بور سوئیٹ۔ کچھ بور۔ کچھ کروک۔ کچھ کریک۔ کریک ایک جامع اور پر معنی تو صیفی اصطلاح بھی تھی۔ علاوہ ازیں "سوئیٹ بور" "سوئیٹ کریک"۔ "سوئیٹ کروک"۔ سیریس اصلی کروک"۔ اور "خالص کروک" وغیرہ ذیلی اقسام تھیں۔ "سوئیٹ کروک" وہ لوگ تھے جو مستقل کسی نہ کسی بے ضرر سی کروکیت میں مصروف رہتے تھے۔ علاوہ ازیں کافی سے زیادہ لوگ۔ ہم نے ڈسکور کیا تھا۔ کہ "لو آئی۔ کیو" کے پائے جاتے تھے۔

آپا ممن بھائی جان کے دونوں بے انتہا ذہین اور سیماب صفت لڑکے منن اور مشن جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اور نقالی اور ساؤنڈ افیکٹ کے ساتھ ایکٹنگ کر کے واقعات بیان کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کو مستقل "کریک" کہہ کر مخاطب کرتے تھے جو دونوں بھائیوں کا ایک دوسرے کے لئے زبردست اظہار التفات تھا۔

آپا ممن اور اچھو اور میں جب اپنے کپڑے پہنتے پہنتے بور ہو جاتے۔ ایک دوسرے کی ساریاں پہن کر اتراتے پھرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک ہفتے کے لئے اچانک کسی سرکاری کام سے لاہور آنا پڑا۔ سوچی

کپڑوں کا بکس کون لے جائے۔ وہاں ساریاں تو آپا ممن ہی کی پہنتی ہیں۔ لہٰذا پی۔ آئی۔ اے کے اوور نائٹ بیگ میں فقط تین جوڑی سینڈلز ڈال کر لاہور پہنچی۔ ایئرپورٹ سے جب نمبر ۴۹ لارنس روڈ وارد ہوئی' شام کا وقت تھا اور چاء کی میز پر حسب معمول محفل جمی ہوئی تھی۔ میں نے اوور نائٹ بیگ ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اناؤنس کیا۔ ان کی بار ہم صرف تین جوڑی سینڈلز لیکر آئے ہیں۔"

آپا ممن اور اچھو نے اس نکتے کو بیحد سراہا۔ آپا ممن نے فرمایا۔ "جس پہلو سے غور کرو بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے۔"

اسی وقت ایک ملنے والی آگئیں۔ اچھو نے نہایت جوش سے انہیں بتلایا۔ "ابھی ابھی کراچی سے پہنچی ہیں۔ صرف چار جوڑے جوتے ساتھ لائی ہیں اور سامان کچھ نہیں۔"

نوابزادہ امتیاز علیخاں پلکیں جھپکاتے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ اچھو نے خبر سنائی۔ اکسائیٹمنٹ میں جوتے چار سے چھ جوڑی ہو گئے۔ پھر اچھو نے آپا حسنہ کو فون کیا۔ "بیگ میں صرف آٹھ جوڑی سینڈلز۔"

جاوید اقبال انگلستان سے ڈاکٹریٹ اور بیرسٹری کر کے آچکے تھے اور جاوید منزل میں رہتے تھے اور قانون کی پریکٹس کر رہے تھے۔ انڈر اسٹیٹمنٹ والے برٹش سنس آف ہیومر کے مالک تھے۔ ایک روز فرمایا "چاہتا ہوں فلاں تاریخ کو آپ کی دعوت کروں۔"

میں نے کہا۔ "اس تاریخ کو کراچی واپس جا رہی ہوں۔ ریزرویشن ہو چکا ہے۔"

"ریزرویشن کینسل ہو سکتا ہے۔"

"ریلوے والوں کا کہنا ہے کہ اس کے اگلے دس دن تک جگہ نہیں مل سکے گی۔"

"مگر آپ ریل سے کیوں جا رہی ہیں۔" شہاب صاحب نے پوچھا جو لاہور آئے ہوئے تھے۔

"چند ڈوکومنٹری فلموں کے پرنٹ تیار ہو چکے ہیں ان کے ڈبے ساتھ لے جانے ہیں۔"

"چلئے ابھی ریلوے کے دفتر چلتے ہیں۔ جاوید کو دیکھتے ہی ریلوے والا موم ہو جائے گا۔"

"ایک صدر مملکت کا سکریٹری اور ایک شاعر ملت کا فرزند۔ ان دونوں کو دیکھ کر سارا ٹائم ٹیبل بدلا جا سکتا ہے۔" کسی نے کہا۔

ایسا ہی ہوا۔

جاوید منزل میو روڈ پر جو اب علامہ اقبال" روڈ کہلاتی تھی ایک پرانی وضع کی کوٹھی تھی جس کی وہی اہمیت ہونی چاہئے جو اسٹریٹ فرڈ اون ایون میں شیکسپیئر کے مکان کی ہے۔ لیکن اقبال" بلحاظ پیمانہ وقت ابھی ہم سے اتنے قریب ہیں کہ جاوید منزل جا کر وہ Sense of Awe نہیں پیدا ہوتا تھا جو مثلاً قونیہ میں محسوس ہوتا ہے۔

جاوید نے مجھے علامہ اقبال" کی اسٹڈی دکھائی۔ الماریوں میں ضخیم جلدیں' بڑی میز' پرانی کتابوں کی مہک۔ اس وقت میں چند لمحوں کے لئے ہیبت زدہ سی کھڑی رہی۔

لیکن ڈرائنگ روم میں اپنی مانوس دنیا موجود تھی۔ اعجاز بٹالوی آتشدان سے لگے اس اسٹائل سے کھڑے تھے گویا ساؤتھ کنزنگٹن میں ہنوز مقیم ہیں وہ قدرت اللہ شہاب سے اس مسئلے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ کہ تلیر پرندوں اور یو۔ پی والوں میں کون سی خاصیتیں مشترکہ ہیں۔ آپا ممن اور آپا حسنہ اور اچھو آفتاب احمد سے باتیں کر رہی تھیں۔ ڈائننگ روم سے کشمیری کھانوں کی خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں اچانک ایک صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ "لاہور میں آجکل یہ خبر گرم ہے کہ آپ ایک ہفتے کے لئے یہاں آتی ہیں تو ایک درجن جوڑیاں سینڈلز ساتھ لاتی ہیں۔"

اس وقت منکشف ہوا کہ افواہ اس طرح پھیلتی ہے۔ پر کا کوا۔ تین جوڑی سے بارہ جوڑی۔

لاہور کی کہر آلود راتیں ایک عجیب مسحور کن کیفیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ چھاؤنی میں مرزا ماموں جان (جو ماری پور سے تبدیل ہو کر فوج میں واپس آچکے تھے اور اب پھر کرنل مرزا تھے۔) کی عمد جان لارنس کی وسیع اور عمیق کوٹھی کے گہرے آتشدانوں میں آگ جلتی اور وقت بہت پر سکون اور محفوظ معلوم ہوتا آپا ممن اور نسیمہ ممانی اور ہم کو 'نسیمہ ممانی کا انتائی پر مذاق اور ہینڈسم ہوا باز بھائی اسکواڈرن لیڈر اعظم جان (جو اب عالم بالا کو سدھار چکا ہے) اپنی دلچسپ باتوں سے ہنساتا۔

چھاؤنی اور مال روڈ اور لارنس روڈ کی طرح پرانے شہر کا اپنا رومانس تھا۔ وہاں ایک پر اسرار گلی میں صوفی غلام مصطفٰے تبسم رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کھانے پر بلایا۔ اعجاز نے کہا تم صوفی صاحب کے ہاں ضرور جانا۔ وہ اس محبت سے ایک ایک چیز خود پیش کر کے مہمان کو کھلاتے ہیں کہ ان کے ہاں کھانا بذات خود ایک جمالیاتی اور جذباتی تجربہ ہے۔

ایک شام اعجاز بٹالوی' بھائی جان کے رفیق کار آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس والے آفتاب احمد (جو غالب کے مشہور نقاد بھی تھے اور آڈٹ اکاؤنٹس والے اور غالب والے آفتاب احمد کہلاتے تھے' جو دو متضاد اوصاف تھے) اور شہاب (جو حسب معمول صدر مملکت کے ہمراہ لاہور آئے ہوئے تھے) کے ساتھ دھند سے بھری پیچدار گلیوں سے گزرتے صوفی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ جو اندر سے اور زیادہ افسانوی اور مشرقی معلوم ہوا۔ صوفی صاحب کے گھر کی لڑکیوں نے بڑے خلوص سے مجھے اپنی کشیدہ کاری دکھائی جو میں نے نہایت دلچسپی اور انہماک سے دیکھی اور اعجاز' آفتاب' اور شہاب صاحب کمرے کے دوسرے سرے پر موجود اس منظر کو دیکھ کر بیحد محظوظ ہوئے۔

صوفی صاحب نے اپنے منفرد مخصوص انداز میں ہم لوگوں کی میزبانی کی۔ اس وقت وہ یکلخت ایک میڈیول داستان کے کردار میں تبدیل ہو چکے تھے۔

بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے شہر سے باہر جو نئی "کولونیاں" بن رہی تھیں ان میں سے ایک میں ایک چھوٹی سی کوٹھی بنوالی تھی۔ اور اپنا نفیس رسالہ داستان گو شائع کر رہے تھے۔ ان کے سٹنگ روم میں امرتا شیر گل کا ایک سیلف پورٹریٹ آویزاں تھا جو اشفاق احمد نے ۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں کسی کباڑی سے پانچ روپے میں خریدا تھا۔ اب پنجابی نیشنلزم رفتہ رفتہ بیدار ہوتی جا رہی تھی اور اعجاز وغیرہ کا

کہتا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جس کوٹھی میں امرتا شیرگل رہتی تھی اسے میوزیم بنا دیا جائے۔

اتوار کی ایک روشن صبح آپا ممن اور میں نمبر ۴۹ لارنس روڈ کے بیرونی لان پر دھوپ کھا رہے تھے۔ آفتاب احمد بھی موجود تھے۔ بانو قدسیہ پھاٹک میں داخل ہوتی نظر آئیں۔ آفتاب احمد بید محظوظ ہو کر بولے۔ "آپ کو اپنی Constituency بنالینی چاہیئے۔"

حیف کہ اپنی ادبی Constituency میں نے آج تک نہ بنائی۔

باجرہ مسرور اور احمد علی خاں جیل روڈ پر' خدیجہ مستور اور ظہیر بابر کنال پارک میں رہتے تھے۔ یہ وہی احمد علی خاں تھے جو ۴۸ء میں ایوب بھائی کے ساتھ کھنڈالہ میں آکر رہے تھے۔ اب وہ پاکستان ٹائمز کے اسسٹنٹ اڈیٹر تھے۔ چیف اڈیٹر فیض احمد فیض ایک وسیع کوٹھی کی دوسری منزل پر سکونت پزیر تھے۔

ایک بار فراق صاحب ہندوستان سے آئے ہوئے تھے۔ فیض صاحب کے ہاں ان کا ڈنر تھا۔ میں شدید سردی کی وجہ سے نہیں گئی۔ کچھ دیر بعد فیض صاحب نے اعجاز کو مجھے بلانے کے لئے نمبر ۴۹ لارنس روڈ بھیجا۔ جس وقت میں فیض صاحب کے ہاں پہنچی محفل بقول شخصے اپنے عروج پر تھی۔ عجیب منظر دیکھا۔ آفتاب احمد (جو فراق صاحب کے بہت معتقد تھے)' ہاجرہ' خدیجہ' سبط حسن اور دوسرے احباب حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور فراق صاحب وسط میں قالین پر کھڑے تقریر کر رہے ہیں۔ چونکہ انتہائی عالم سرور میں تھے ان کا ایک لفظ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن نہایت فرحت بخش تقریر تھی۔ اور سب ہمہ تن گوش۔ فیض صاحب کے ڈرائنگ روم میں ستیش گجرال کی بنائی ہوئی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی۔ اس طور پر ہندو پاکستان کے چند منتخب ادیب و فنکار ایک دوسرے سے ذہنی اور سوشل رابطہ رکھتے تھے مگر اس رابطے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ دونوں ملکوں کے مابین نفسیاتی اور سیاسی ڈیڈلاک بدستور موجود تھا اور ابھی دو خونریز جنگیں لڑی جانے والی تھیں۔ مارچ کے مہینے میں ریڈیو پاکستان کے محمود نظامی مرحوم جشن بہاراں منعقد کرتے۔ روشن آراء بیگم آواز کے جادو جگاتیں۔ جشن میں شرکت کے لئے مختار بیگم کی چھوٹی بہن فریدہ خانم ٹھسے سے اپنی طویل کار میں مع سازندوں کے آتیں اور پرانے لوگ آہ بھر کر مختار بیگم اور آغا حشر والے لیجنڈری زمانے کا تذکرہ کرتے۔ (لیجنڈز بھی وقت بناتا ہے۔ آج سے تیس سال بعد خود ہمارے 1950'5 کے دور کو لیجنڈری سمجھا جائے گا!) نجی اور آرٹ کونسل کی محفلوں میں فریدہ خانم' روشن آراء بیگم اور اقبال بیگم گاتیں اور ان محفلوں میں لکھنؤ والی خالہ' عائشہ غلام حسن بٹ کے بہنوئی خلیفہ عبدالحکیم' گلابی جامہ دار کی شیروانی پہن کر شامل ہوتے اور بیگم عبدالحکیم یعنی خدیجہ خالہ مجھ سے اماں کے متعلق بڑی جذباتی باتیں کرتیں۔ "وہ علی گڑھ کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ اور تمہاری اماں کتنی محبت والی ہیں۔ اور کتنی مزیدار باتیں کرتی تھیں۔" اور چچی وحیدہ' عائشہ اور نادرہ اور خدیجہ خالاؤں کے والد جج عبدالغنی کا ذکر کرتیں جو چچا نصیر کے دوست تھے اور عائشہ کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی لارڈ حیات جو ابا جان کے ہم جماعت تھے اور میں اور اچھوہ تعجب سے کہتے۔ "یہ بڑی عمروں کے لوگ مستقل اپنے Past کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں۔"

آپا ممن کی بے انتہا خوبصورت اور بید وسیع کوٹھی کے چاروں طرف بہت بڑا اور سرسبز باغ تھا جس میں صبح گلاب کے بلبلے اڑتے تھے — سامنے لارنس گارڈن جو اب باغ جناح کہلاتا تھا عقب میں نوابزادہ امتیاز علیخاں اور انکا طویلہ۔ بیرونی برآمدے کے سرے پر میرا کمرہ۔ اس کے مقابل میں دوسرے سرے پر منّ' مشن۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں آپا ممن کے روز گارڈن میں کھلتی تھیں صبح منہ اندھیرے جب لان کے گرداستادہ یوکلپٹس کے درختوں پر کہرہ چھایا ہوتا تھا چھاؤنی سے "REVEILLE" کے بگل کی جان لیوا آواز آتی تھی — رات گئے جب مکان اور مکین اور باغ اور چرند پرند اشجار سب سو رہتے تھے۔ دور چھاؤنی میں "RETREAT" کا بگل بجتا کیونکہ دن دن سے بات کرتا ہے اور رات رات کو حکمت سکھاتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ دن اور رات کا انجام کہاں ہے۔

۱۰— چیمبر میوزک

"ہلو۔ اسٹیشن سینما۔ آج کون سی پکچر ہے؟ اچھا ذرا پانچ منٹ بعد شروع کیجئے۔ ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔"

"ہلو۔ اسٹیشن سینما۔ آج کیا دکھا رہے ہیں؟۔"

"اچھا۔ فلم میں کون کام کر رہا ہے؟"۔

"آج آڈری ہیپ برن۔ کل گریگری پک۔" ادھر سے جواب ملتا۔

"اچھا۔ ہلو۔ پرسوں کون سی پکچر ہے!۔ اچھا۔ "No show"۔ اس میں کون کام کر رہا ہے؟۔ کوئی نہیں؟۔ اچھا۔ خیر۔"

ایئرفورس کے دو سینما گھروں میں "ڈیلی چینج" کا دستور تھا۔ رات کے کھانے کے بعد بھاگم بھاگ میدان عبور کر کے دوڑتے ہوئے پکچر جاتے اور ہر طرح کی اچھی بری ہندوستانی اور انگریزی اور امریکن فلمیں ملاحظہ کر کے بے حد و حساب محظوظ ہوتے۔ بچے پابندی سے کاؤبوائے فلم دیکھتے۔ سید مظہر امام کے ہم عمر ماموں سید مظفر نواب نے گیا سے بمبئی جا کر ایک عدد فلم "کھیل" بنائی تھی جس میں ذاتی لاکھوں روپیہ بخیر و خوبی ڈبویا۔ اس فلم میں دیو آنند ہیرو اور حفیظ جہاں بنت میاں عبدالعزیز فلک پیا (جن کے سابق آئی۔ سی۔ ایس۔ حال سی۔ ایس۔ پی۔ شوہر کسی ملک میں پاکستان کے سفیر تھے) ہیروئین تھیں۔ سیکنڈ ہیروئین نگار سلطانہ تھیں۔ نواب میاں یہ فلم لیکر کراچی آئے۔ ہم لوگوں نے جا کر اسے بڑی عقیدت سے دیکھا کہ نواب میاں نے بنائی تھی۔ مظہر میاں اور ان کے بھائیوں نے اپنے دوسرے کاروبار کے علاوہ لالوکھیت میں ایک سینما ہاؤس بھی تعمیر کیا تھا۔ اکثر ہم لوگ موٹروں میں لدپھند کر لالوکھیت جاتے اور نجی لیڈیز باکس میں بیٹھ کر انڈین اور اکادکا پاکستانی فلم دیکھتے۔

عاصم زیدی کہیں سے ایک جوڑا بید بڑھیا بل ٹیریر کا لے آئے تھے۔ روزانہ صبح کے وقت دفتر جانے سے قبل میں ایک گھنٹہ پیانو کی پریکٹس کرتی تھی اس وقت دونوں بل ٹیریر مع اولاد باہر باغیچے میں قطار

اندر قطار بیٹھ کر ہم آہنگی سے بھونکتے۔ ان بے چاروں کو گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ جب بے شمار کتے ہو گئے آپا راضیہ نے کہا۔ "توبہ توبہ اتنے کتے۔ گھر میں فرشتوں کا گزر نہیں ہو گا۔ اب انہیں نکالو۔" ڈان میں اشتہار دیا گیا۔ کراچی سے "پوم پوم ڈارلنگ" والے مسٹر جھن جھن والا کی قسم کے میاں بیوی تشریف لائے۔ سودا بازی شروع کی۔

نور افشاں نے نروس ہو کر کہا۔ "دیکھئے مسٹر ڈھوسا۔"

"مسٹر دوسل۔" انہوں نے تصحیح کی۔

"مسٹر دوسل۔ ہم لوگ پروفیشل تو کتے بیچتے نہیں۔"

ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ اب میں نے اور زیادہ نروس ہو کر کہا۔ "بات یہ ہے مسٹر ڈھوسا۔"

"مسٹر دوسل۔" انہوں نے دوبارہ تصحیح کی۔

"مسٹر دوسل۔ یعنی کہ مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ پروفیشل کتوں کا کاروبار تو کرتے نہیں۔ یعنی بطور بزنس"۔

"یہ چند نفیس کتے حاضر ہیں۔ مناسب معاوضے پر۔" حاتم نے اخلاق سے بات آگے بڑھائی۔

مسٹر و مسز دوسل پانچ چھ کم سن بل ٹیریر اونے پونے خرید کر چلتے بنے۔ بچوں کے والدین نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رونا شروع کیا۔ ان پیارے بچوں کے یکلخت چلے جانے سے ہم سب اداس تھے۔ میں افسردگی سے جا کر پیانو کے سامنے بیٹھی اور ایک الوداعی دھن بجانا شروع کی جس کی آواز میں بل ٹیریر والدین کی آہ و فغاں ڈوب گئی۔

لاہور سے اعجاز حسین بٹالوی نے سفینۂ غم دل کے اسٹائل کی پیروڈی میں خط بھیجا۔ "میں زندگی کے سبز غالیچے پر بے مقصد گھوم رہا تھا۔ کبھی ساری زمین ہماری تھی۔ اب چوہے ویرانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ گرجے کی گھنٹیاں خاموش ہیں۔ کتے بھونکنا بھول گئے۔ کمروں میں خرگوش دوڑ رہے ہیں۔ مندر کا کلس اداس ہے۔ کھیتوں میں وجود کا شور ہے۔ اب کوئی ڈینیل ہمارے فیصلے کے لئے نہیں آئے گا۔ تین لڑکیاں سامنے کے ٹیلے سے اتر کر میری سمت آ رہی ہیں اور فیض بیوی بچوں سمیت نتھیا گلی گئے ہوئے ہیں۔

"اب کون ہے جو زندگی کا دھان پھٹکے گا۔ ہر شخص اس طرح پھر رہا ہے جیسے بوریت اس کا پیدائشی حق ہے۔ لندن میں تقی سید اقتصادیات کی تھیسس کے لئے اعداد و شمار اعداد و شمار جمع کر رہا ہے۔ روح کی بے آرامی کا کوئی علاج نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی مشرق میں رہ رہا ہے یا مغرب میں۔

"آسمان پر چیلیں اسی نحوست اور ویرانی سے اڑتی ہیں۔ اس بے نظری کا کیا ہو گا۔ ماڈل ٹاؤن میں بھلیندے 'کھرنی' اور املتاس کے درختوں پر بہار آ گئی۔ میں اپنی تصوراتی کائنات کو 'وجود کے اس حصے کو جو بھاگا بھاگا پھرتا ہے کیسا لباس پہناؤں۔

"گلیوں میں پھرتے بیمار کتوں اور مظلوم انسانوں سے کون محبت کرتا ہے۔ تجربات سب پیچھے رہ گئے۔ امیدیں' خوف' بدصورتی سب مضحکہ خیز ہے۔ آنکھوں میں جو رنج چھپا ہوا ہے اسے کون دیکھتا ہے۔

یہاں تو ہر شخص زندگی کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر سرود شبانہ بجانا چاہتا ہے۔ کون ہے جو املتاس کے پھولوں کی اور دیکھے۔ اور اعجاز حسین تم جو امریکہ جا رہے ہو تو اس سے وجود کی کشمکش ختم تو نہیں ہو جائے گی۔ خداوندا میری مدد کر۔ دماغ کا دھندلکا سارے میں پھیل گیا۔

"تازہ خداؤں نے مجھ سے کہا تمہارے راستے بند ہیں۔ زندگی کی خوشیاں کیڈی لیک اور اسٹیوڈی بیکر میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ تلاش ختم ہو چکی۔

"زندگی کا بہت لمبا جلوس اداس ہے اور آسمان پر طیارے اڑ رہے ہیں۔ اب ہر طرف سنگینیں ہیں۔ ہلال عید کی شکل کی چھریاں اور۔ اور اسٹوڈی بیکر ایک آخری جھٹکے کے ساتھ آگے جا چکی ہے۔ کیا ہم واقعی اپنی بس مس کر چکے ہیں۔ آنے والے کل کا کون انتظار کرے۔

"ہر طرف بکرے ہی بکرے ہیں۔ دنبے اور مینڈھے اور وادی کاغان کے باریش پہاڑی بکرے۔ سب سر جھکائے کل کا انتظار کر رہے ہیں اور کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ بے زبانو آخر تمہارے آباو اجداد نے پیغمبر ابراہیمؑ کا کیا بگاڑا تھا۔ جب حیوانوں اور جانوروں کے درمیان بھی پیغمبر آنے شروع ہو جائیں گے تو عیدالضحیٰ پر بکرے اسٹرائیک کیا کریں گے۔

لیکن' ایکا ایکی یہ کیسی آوازیں آنے لگی ہیں۔ نمناک کہرہ کمروں میں داخل ہو رہا ہے۔ اب ساری آوازیں ڈوب گئیں۔ ہم سب اکیلے ہیں۔ جنوب میں اڑنے والے پرندوں کی طرح ابھی رات آئے گی اور ہمارے دروازوں پر دستک دے گی اور پرانے مندر کے پروہت دستک سنیں گے۔

'کھڑکی پر گلاب جھک آئے۔ وسعتوں پر حملہ آور ہونے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ پھر بھی ضیاء محی الدین کی تصویر پاکستان کوارٹرلی والے مضمون کے ساتھ چھپ جاتی تو اچھا ہوتا۔ وجود کی سطح پر مختلف اہمیتوں کو خلط ملط کرنا سخت مسخرہ پن ہے۔ کاش انسانوں کو موگرے کے پھولوں سے محبت ہوتی۔

"سڑک کے نکڑ پر کوئی پنشن یافتہ انگریز ابھی تک اپنا اکارڈین بجائے چلا جا رہا ہے۔ اگلی جنگ کب ہو گی؟۔

"On The Whole" تو سبھی اچھے جا رہے ہیں۔ اس کھوئی ہوئی سرزمین پر کیا ہو گا؟ ہر شخص اپنا جنازہ اٹھائے آہستہ آہستہ گذر رہا ہے۔ ہسپتالوں کی خاموش گیلریوں میں لوگ اپنے عزیزوں کے لئے پھول لئے کھڑے ہیں۔ ابھی ہمیں زندہ رہنا ہے۔ چاروں اور انفلوئنزا پھیل گیا۔

"شانتی۔ شانتی۔"

سب اچھے جا رہے تھے۔ شہاب صاحب تصوف کی طرف بھی جا رہے تھے۔ اعجاز امریکہ جاتے ہوئے کراچی آئے۔ ایک شام اندھیرا پڑے۔

ہم لوگ شہاب صاحب سے ملنے گورنر جنرلز ہاؤس گئے۔ گورنر جنرل غلام محمد صاحب کا انتقال چند روز قبل ہوا تھا۔ جن کے شہاب صاحب سکریٹری تھے۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ شہاب صاحب کا وسیع و عریض عالیشان دفتر روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ موصوف میز پر بیٹھے ایک مضمون لکھ رہے

تھے۔ فرمایا۔ "آپ کو معلوم ہے۔ مرحوم و مغفور ولی اللہ تھے۔ میں نے ان کو جذب کے عالم میں دیکھا ہے۔ اپنے مضمون میں مرحوم کی شخصیت کے اسی پہلو پر روشنی ڈال رہا ہوں۔"

"شہاب صاحب۔ بات یہ ہے کہ ہم سب ولی اللہ ہو چکے ہیں۔ یہی تو سارا پرابلم ہے۔" میں نے قصہ مختصر کیا۔ شہاب صاحب نے مضمون پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد ہم لوگ باہر نکلے۔ راستے میں ایک بڑی بھاری دو منزلہ کوٹھی میں شادی ہو رہی تھی۔ شامیانہ لگا تھا۔ برقی قمقمے۔ بینڈ۔ بے شمار کاریں۔ شہاب صاحب نے کار روک کر کہا آیئے لگے ہاتھوں اس شادی میں شرکت کرتے چلیں۔ ایک آدمی سے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "کیوں صاحب۔ یہاں علی قلی خاں کی شادی ہو رہی ہے؟۔"

اس نے دہرایا۔ "علی قلی خاں۔؟ نہیں صاحب۔ یہ تو۔"

"ہمیں تو علی قلی خاں کی شادی میں جانا ہے۔" انہوں نے جلدی سے بات بنائی۔ ہم لوگ آگے بڑھے۔ "علی قلی خاں بھی تصوف کی ایک اصطلاح بن سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

ہم لوگ ماری پور پہنچے۔ چاندنی رات تھی اور گھر کے سارے بچے سامنے بجری پر جمع دوسرے روز منعقد ہونے والے فیملی کرکٹ میچ کے متعلق زور شور سے تبادلہ خیالات میں مصروف تھے۔

"بہت جلد' ایک وقت آنے والا ہے۔ جب یہ بھولے' بشاش بچے بھی بڑے ہو جائیں گے اور علی قلی خاں انہیں پریشان کرے گا۔" اعجاز نے سر ہلا کر کہا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ سویرے سے "فیملی کرکٹ میچ" کی تیاریاں کی جا رہی تھی۔ بچوں پر بے حد جوش طاری تھا۔ صبح نو بجے شہر سے رشتے دار بچوں کی دوسری ٹیم آگئی۔ ہم لوگ ایئر فورس اسٹیڈیم پہنچے۔ نسیمہ ممانی' نورافشاں اور میں باقاعدہ گوگلز لگا کر شیفون کی ساریاں پہنے اس اسٹائل سے میچ دیکھنے کے لئے پویلین میں بیٹھے جس طرح کرکٹ کی شوقین بیگمات ٹسٹ میچ دیکھتی ہیں کیوں کہ بچوں کا اصرار تھا کہ ان کے میچ کو بھی ٹسٹ میچ سمجھا جائے۔ میس سے ریفریشمنٹ منگوائے گئے۔ آپا ممن کے فرزند اکبر' عامر' عزیز سید عرف مُنّی جو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہوئے کراچی میں مقیم تھے ایک فیملی ٹیم کی کپتانی کر رہے تھے دوسری ٹیم کے کپتان خورشید زیدی تھے۔

میچ کی دوسری صبح منی ایک انگلی پر پٹی باندھے گھوم رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا۔؟" کہنے لگے۔ "کل کرکٹ کھیلتے میں فریکچر ہو گیا۔" میں نے گھبرا کر فوراً نورافشاں کو ہسپتال فون کیا۔ "جلدی سے ایمبولنس بھجواؤ۔ مُنّی کی انگلی میں فریکچر ہو گیا۔"

نورافشاں جیپ دوڑاتی جلد از جلد گھر پہنچیں۔ معلوم ہوا منی' خورشید' اسلم اور قمر کے ساتھ سمندر میں پیرنے چٹانوں کی طرف گئے۔ میں اور نورافشاں چٹانوں پر پہنچے۔ منی نے دور سے دیکھ کر اطمینان کے ساتھ ہاتھ ہلا کر ڈبکی لگائی اور غڑاپ سے پانی میں کود گئے۔ نورافشاں نے آواز دی۔ گھبرا کر ساحل پر لوٹے۔ تعجب سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟۔ آپ دونوں اس وقت یہاں اتنی پریشان کیوں کھڑی ہیں؟"

نورافشاں نے بتایا۔

مُنّی نے زور دار قہقہہ لگایا۔ سر ہلا ہلا کر زور سے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہنے لگے۔ "عینی خالہ ایک لائن کے علاوہ ہر لائن میں صاف۔ ہم نے تو ایسے ہی مذاقاً کہا تھا۔ آپ سچ سمجھیں۔ اگر فریکچر ہوتا تو ہم کل سے اب تک یونہی مزے سے گھوم رہے ہوتے؟۔"

میں بہت قائل ہوئی۔ بہت سوچا کہ فہم عامہ کے حصول کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ پھر خیال آیا۔ فہم عامہ اور عقل سلیم' اللہ کی دین ہے۔ اس کی کمی یا فقدان کے متعلق میں یا آپ کچھ کر نہیں سکتے۔ "یہ جو تم اتنی کتابیں پڑھتی ہو اس سے کیا فائدہ ہوا۔" اماں اور آپا راضیہ اکثر سر ہلا کر کہتیں۔ میں حسب معمول مہینے میں ایک آدھ بار بندر روڈ جا کر طامس اینڈ طامس سے تازہ ترین انگریزی کتابوں کے انبار خرید لاتی۔

طامس اینڈ طامس میں الماریوں کے سامنے محمد حسن عسکری اکثر براؤزنگ کرتے مل جاتے اور ہر بات کا جواب ہوں یا ہاں میں دیکر پھر مغربی ادب اور مغربی تنقید کی دنیا میں کھو جاتے۔ عسکری صاحب جن کی انور قریشی سے بہت گہری چھنتی تھی لنگوافون کے ذریعہ فرانسیسی سیکھ رہے تھے۔ ایک شام وہ انور قریشی اور ایک امریکن انٹلکچوئیل کے ساتھ ماری پور تشریف لائے۔ میں نے عسکری صاحب سے کہا اب آپ فرانس ہو آیئے۔ سارتر وغیرہ کو اردو میں متعارف کر کے آپ نے بہت سے نقادوں کا پڑا کر دیا' اب ہر شخص اپنے مضمون میں دس جگہ لکھتا ہے۔ "سارتر نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔" یا "راں بو بڑی معقول بات کہہ گیا ہے۔" اس طرح سارا مضمون مغربی ادیبوں نقادوں کے حوالوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اپنی طرف سے اوریجنل بات کوئی نہیں کہتا۔ آپ تو اوریجنل بات بھی کہتے تھے۔ مگر یہ ساری آگ آپ کی لگائی ہوئی ہے۔ اب آپ خود ذرا پیرس رہ آیئے۔

بے نیازی سے فرمایا۔ "فرانس میں اب کیا رکھا ہے۔ فرانس ختم ہو چکا ہے۔"

اب اتنا گہرا نکتہ پوچھنے کی کس میں ہمت تھی کہ فرانس کس طرح ختم ہو چکا۔

بندر روڈ پر طامس اینڈ طامس کی دوکان سے ذرا آگے کمیاب کتابوں کی ایک دوکان نوادر کا خزینہ تھا جہاں سے میں نے بہت سی نایاب انگریزی کتابیں خریدیں۔ میں سیڑھی لگا کر گھنٹوں ان الماریوں کی چھان بین کیا کرتی۔ اس دوکان میں بہت ہی کم لوگ آتے تھے سوائے کتاب پرست انور قریشی کے ایک معمر کتاب پرست پارسی دوست کے جو مجھے دیکھ کر خوشی سے پوچھتا۔ "کوئی اچھی چوپڑی بانچا۔؟"

اور اچھی چوپڑی بانچنے والے لوگ ہر جگہ بہت کم پائے جاتے ہیں۔ کراچی کی سکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک دوکان میں آپا فاطمہ خاتون کو خیالستان پڑی ملی۔ جس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا۔

مالک اس کتاب کا جانو ساتھ یقیں
طاہر احمد خان ہے بندۂ مسکیں

اور۔ "جو یہ کتاب چرائے گا پچاس جوتے کھائے گا۔"

جاوید منزل۔ علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

۱۹ اپریل ۱۹۵۸ء

"شہاب کئی مرتبہ حضور سے کراچی میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کی اطلاع کے مطابق آج کل آپ شدت سے روزے رکھنے میں مصروف ہیں۔ گویا اگر دفتر میں ٹیلی فون کیا جائے تو پتہ چلتا ہے آپ کسی میٹنگ پر گئی ہیں اور جب گھر پہ فون کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ سو رہی ہیں۔

حسب فرمائش مضمون "اقبال" ۔ ایک باپ کی حیثیت سے۔" ارسال کر رہا ہوں۔ اگر پسند آئے تو اس کا ترجمہ انگریزی میں کر کے پاکستان کوارٹرلی میں شائع کر لیجئے۔ یہ غالباً ۱۹۴۔۔ء کے سویرا میں شائع ہوا تھا۔ اگر وقت ملا تو انشاء اللہ انگریزی میں بھی تحریر کر کے ارسال کروں گا۔ چند ایک پرانے مضمون انگریزی میں لکھے ہوئے پڑے ہیں۔ لیکن پرانے کاغذات ابھی کھولے نہیں۔ اگر کوئی اچھی چیز نکلی ارسال کروں گا۔

میں ۲ یا ۳ مئی کو ایک بار پھر کراچی پہنچ رہا ہوں۔ ایک عشرہ تک قیام ہو گا۔ شہاب اور میں آپ سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اجازت ہو تو۔

میرا ایک ننھا سا بھانجا ہے۔ نام اس کا تحسین ہے جو آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ اسے ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن آپ کو رابعہ بصری" سے کم نہیں سمجھتا۔ باقی ملاقات پر۔"

انور قریشی کا فرائیڈے کلب کبھی جمی مار کر کے ہاں (جو عمر قریشی کے علاوہ ملک کے مقبول کرکٹ کمنٹیٹر تھے۔ اور بعد میں پاکستان کے سفیر ہو کر ماسکو گئے) اور کبھی انور قریشی کے مکان ایئر کانٹج ورک روڈ پر منعقد ہوتا تھا۔ "فرائیڈے کلب" پر ہم لوگ بہت نازاں تھے۔ اس کی شگفتہ اور خیرہ کن ادبی نظریاتی اور سیاسی بحثیں کراچی میں لفٹ ونگ کی کمی پوری کرتی تھیں۔

جاوید کے کراچی آنے پر ایک شام میں' جاوید اور شہاب کو ایئر کاٹج لے گئی جہاں حسب معمول کوئی زبردست نظریاتی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جاوید اقبال سیاسی لحاظ سے کنزرویٹو آدمی تھے۔

"ایک مقالہ بعنوان "فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاست حاضرہ کا جائزہ" ارسال خدمت ہے۔ یہ مقالہ میں نے یوم اقبال' کے موقع پر لاہور مین پڑھا تھا اور بڑا پسند کیا گیا۔

اگر آپ مجھے اور شہاب صاحب کو فرائیڈے کلب میں نہ لے جائیں تو شاید یہ مقالہ کبھی تحریر نہ کیا جاتا۔ گویا آپ کی اور آپ کے چند احباب کی، پاکستان کے بارے میں ناامیدی اور مایوسی کا اظہار اس مقالے کی تشکیل کا موجب بنا۔

اگر ہو سکے تو اسے پڑھ کر ان صاحبان کی نذر کر دیں تاکہ وہ شخصیتیں جو اس مقالے کی تحریر کا باعث بنیں کم از کم اس مقالے کو ایک نظر دیکھ تو لیں۔ اگر یہ مقالہ ان کی ناامیدیوں اور مایوسیوں کا ازالہ کر سکے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری کوشش ناکام ثابت نہیں ہوئی۔

میں انشاء اللہ جون کے شروع میں کراچی آنے کی کوشش کروں گا۔"

(لاہور۔ ۳ مئی ۵۸ء)

نہ ہو نومید۔

شہاب صاحب کی دو منزلہ کوٹھی کلفٹن ایک ایسی سنسان جگہ واقع تھی جس کے آگے ویرانہ اور

سمندر تھا۔

جون کی ایک رات ڈنر کے بعد شہاب صاحب کی لاؤنج میں سب صوفوں سے نکلے فرش پر بیٹھے تھے۔ اعجاز نہایت معتبر شکل بنائے نثار عزیز بٹ سے کچھ تبادلۂ خیالات کر رہے تھے جو پشاور کی ماہر ریاضی اور ناولسٹ خاتون تھی۔ اس کے شوہر اصغر بٹ ریڈیو پاکستان میں تھے اور ڈرامے لکھتے تھے۔ نثار نے ایک عمدہ ناول "نگری نگری پھرا مسافر" لکھا تھا۔ جین آپا' جاوید کو مستقل ڈاڈیڈ کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔ جین آپا ایک امریکن ڈپلومیٹ تھیں اور ہمارے خاندان میں ان کو ایک آنریری کزن کی حیثیت سے کو آپٹ کر لیا گیا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر ذہین اور خوش مزاج اور بحیثیت ایک "بوسٹن برہمن" خاصی قدامت پرست لڑکی تھی۔ شاید اسی وجہ سے ہم لوگوں سے اس کی اتنی پٹتی تھی۔ ایک بیچلر شرمیلا امریکن ڈپلومیٹ اس کا رفیق کار تھا۔ میں اور مسرت جہاں تیموری اس سے جین کی "بات لگانے" میں مصروف تھے اور دونوں ہندوستانی یا پاکستانی لڑکے اور لڑکی کی طرح جھینپ کر سرخ ہو جاتے تھے۔ میری طرح جین کو بھی لوگ بہت فیسی نیٹ کرتے تھے۔ اے ری مائی کیسے کیسے لوگ۔

"چلو۔ پرنس کریم آغا خان کی تخت نشینی دیکھ کر آئیں۔ انوکھی چیز ہو گی۔" ایک مرتبہ جین نے مجھ سے کہا تھا۔ بحیثیت ڈپلومیٹ وہ باقاعدہ ہیٹ اور دستانے پہن کر تیار ہوئی۔ ہم لوگ شہر سے باہر نیشنل اسٹیڈیم میں پہنچے جہاں ڈیڑھ لاکھ خوجہ جمع تھا۔ وزیر اعظم فیروز خان نون موجود تھے۔ اور بائیس سالہ پرنس کریم آغا خان ایک ریوالونگ تخت پر بیٹھے تھے۔ تخت آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا تاکہ سارے خوجگان اپنے حاضر امام کے رخ انور کے درشن کر سکیں۔ بطور انتالیسویں (۳۹) اسمٰعیلی امام نئے آغا خان کو انتالیس بیش قیمت ہیرے نذر کئے گئے۔ آخر میں خوجہ منتظم لڑکیاں مجمع کو کنٹرول کرنے کے لئے لاؤڈ اسپیکر پر گجراتی میں "شانتی راکھو شانتی راکھو" پکار رہی تھیں اور بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔

میڈیول ایران اور مصر سے جدید سندھ اور گجرات اور یوروپ۔ اسمٰعیلی ائمہ کا سفر بھی فیسی نیٹنگ تھا۔

نیشنل اسٹیڈیم سے واپس آ کر ہم لوگ میٹروپول کے برآمدے میں تازہ دم ہونے کے لئے بیٹھے اس وقت بھی ویران ہوائیں چل رہی تھیں اور کواڈرنگل کے باغ میں پتے اڑ رہے تھے۔ اور جین اپنی پکچر ہیٹ اور سفید دستانے پہنے بید کی کرسی پر بیٹھی اس مسئلے پر روشنی ڈال رہی تھی کہ عقائد کی دنیا کس قدر حیران کن ہے اور عقیدے کی تبدیلی سے انسان کی پوری کائنات بدل جاتی ہے۔

"ہاں۔ اخوند بنوں کو دیکھو۔" میں نے نظر اٹھا کر کہا خورشید اخوند آ کر ہماری میز پر بیٹھ گئی۔ اخوند بنوں کے نانا شیخ عبدالرحیم آچاریہ کرپلانی کے سگے بڑے بھائی تھے' جنہوں نے اسلام قبول کر کے عبیداللہ سندھی کی پان اسلامک تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا اور نہایت کٹر پکے دیوبندی مولوی تھے۔

"امریکہ میں سیکڑوں نوجوان ہندو سوامیوں کے چیلے بنتے جا رہے ہیں۔" جین نے کہا

"ایک حاضر امام کا ہونا غالباً ضروری ہے۔ میں نے جواب دیا۔

یونس۔ ایم۔ سعید ایک حسین خاتون کے ساتھ سامنے سے گزرا پھر آکر ہماری میز پر بیٹھ گیا۔ وہ حسین کمسن خاتون ایک بوڑھے دولتمند پنجابی "نائٹ" کی لیڈی تھیں اور لوگ ان کو FEMME FATALE سمجھتے تھے۔ یونس جو ایک بلند قامت خوش شکل دولتمند کشمیری نوجوان تھا۔ اسے بحیثیت "زندگی کے مبصر" کلر فل خواتین کا ذخیرہ جمع کرنے کا شوق تھا۔ اور بہترین نقال تھا۔ جب میں پی۔ آئی۔ آے میں بطور انفرمیشن آفیسر شامل ہوئی یونس نے منہ لٹکا کر کہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ایلیٹ نے بھی تو بنک اف انگلینڈ میں انواع واقسام کے لوگ اس کے دفتر میں بیٹھے ملتے جہاں وہ قالینوں کے خاندانی کاروبار کے علاوہ اپنا انگریزی رسالہ "VISION" ایڈٹ کرتا تھا جسے میں BLURRED VISION کہتی تھی۔ ایک سہ پہر اس کے دفتر میں ایک ذرا فربہ سی خاتون نظر آئیں۔ باہر وکٹوریہ روم پر ان کی کیڈی لیک جگمگا رہی تھی۔

"بیگم فلاں۔" یونس نے تعارف کروایا۔

"پھر میں نے والزلپ مین کو بتلایا۔" وہ کہہ رہی تھیں یونس نے اشارتاً مجھے سمجھایا کہ غور سے ان کی باتیں سنوں اور گرہ میں باندھتی جاؤں۔ وہ ایک عدد انگریزی ناول بھی لکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ "آپ کے ناول کی جائے وقوع کیا ہے؟"

"A WOMAN'S SOUL" انہوں نے رعب سے مطلع کیا۔ پھر وہ اپنی کیڈی لیک ڈرائیو کرتی ہوئی چلی گئیں۔

اب یونس نے پر اسرار شکل بنا کر کہنا شروع کیا۔ "تم کو معلوم ہے یہ کون تھیں۔"

"تمہارے ذخیرے کی ایک کلر فل خاتون مجھے تو کچھ ایڈونچرس سی معلوم ہوئیں۔"

شہر میں افواہ یوں گرم تھی کہ وہ خاتون ملک کے سب سے بڑے اسمگلر کی دوست تھیں۔

"اور کچھ عجب نہیں کہ وہ ناول امریکہ میں چھپ جائے تو تم عش عش کرو۔ بی بی دنیا ایسے ہی لوگوں کے لئے بنی ہے۔"

"دنیا میں یہ سب کس طرح ہوتا ہے؟" میں نے ایک بار پھر متعجب ہو کر پوچھا تھا۔ "یعنی ان کے شوہر کچھ نہیں کہتے؟"

"کیوں کہیں۔ خواہ مخواہ۔؟"

"کمال ہے۔"

"تم۔ تمہاری وہ کیا جگہ۔ تانصور۔"

"نہنور۔"

"اچھا نہنور۔ تم اس کی اخلاقیات کے پیمانے سے آج کی دنیا کو مینی ماپا کرو۔"

"اور عش عش کروں۔"

اس وقت "حاضر امام" کی تخت نشینی سے واپسی پر بہت سے دوست تازہ دم ہونے کی خاطر میٹروپول پہنچ رہے تھے۔ یونس کے آنے کے چند منٹ بعد مورس ڈیمبو اور اس کی بیوی ذورس بھی آکر

ہماری بیٹھ گئے۔ اردو داں مورس، جین کا رفیق کار اور ہفت زبان اور عالم آدمی تھا۔ اور پر خلوص دوست عہد سرسید پر ریسرچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سامنے سے امریکنوں کی ایک ٹولی گزر کر ہال میں گئی۔ جین نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں کوئی پکار رہا ہے۔"

آزوری پام کے ایک گملے کے پیچھے سے مجھے آواز دے رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کی طرف گئی۔ اس نے کہا۔ "دیکھ بھائی جنکشن میں آواگارڈنر کی ماں کا رول مجھے دینے کی بات ہوئی تھی۔ پھر پلٹ کر مجھ سے نہیں پوچھا۔ جارج کوکر وہ سامنے بیٹھا ہے۔ جا کر ذرا اس سے پوچھو تو۔"

میں دوستوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "ابھی لو۔" میں نے ہال کے اندر جا کر اس آدمی سے جو جارج کوکر تھا کہا۔ "معاف کیجئے گا کیا آپ جارج کوکر ہیں؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔"

میں نے مدعا بیان کیا۔ اس نے خوبصورتی سے بات ٹال دی مجھے بڑا افسوس ہوا۔ آزوری پام کے گملے کے پاس منتظر کھڑی تھی۔ میں نے جا کر اسے بتایا۔ اس نے کہا ڈیم اچھا شام کو تم سے ماری پور میں ملوں گی۔ اور پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

اگر آزوری کو یہ رول مل گیا ہوتا تو اسے کتنی خوشی ہوتی۔ وہ ایک نیک دل خوش مزاج جرمن نژاد گوانی خاتون تھی۔ کونسرٹ پیانسٹ رہ چکی تھی۔ برسوں مقبول فلمی رقاصہ رہی تھی اور اداسی سے بتایا کرتی تھی کہ اپنے عروج کے زمانے میں جب وہ ایک بار حیدر آباد دکن گئی تو لوگوں نے اسے گاڑی پر بٹھا کر خود گاڑی کھینچی تھی۔ ہر پرفورمنگ آرٹسٹ کے لئے اس کے زوال کا زمانہ انتہائی اذیت دہ ہوتا ہے۔ آزوری نے ونگ کمانڈر فیاض محمود کے چھوٹے بھائی سے شادی کر لی تھی جو ایک کم سخن فلسفی تھے۔ (فلسفی باتونی ہو ہی نہیں سکتا) ان دنوں وہ اپنے جیٹھ کے ہاں ماری پور میں مقیم تھی۔ اب بھی خوب ناچتی تھی اور بھرت ناٹیم کو "پاک رقص" کے نام سے رائج کرنے میں کوشاں تھی۔ آزوری کو دیکھ کر بعض دفعہ اچانک مجھے نمبر ۲۰ کرزن روڈ دہرہ دون یاد آتا اور پہلو کے برآمدے کے سرے پر دھوپ سے روشن اماں کا دارالمطالعہ اور اس میں رکھے اردو سالے ساقی کے خاص نمبر شاہد احمد کا ترجمہ فاؤسٹ اور سالنامہ نیرنگ خیال جس میں فلم "باغی سپاہی" کی تصاویر چھپی تھیں۔ انیس خاتون اور رقص کے لباس میں نوعمر آزوری اور دہرہ دون میں ہمارے ہاں انیس خاتون کا ایک ریکارڈ "باغی سپاہی" کا موجود تھا۔ "مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں۔ دیکھو تو ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں" اور مدتوں بعد ایک بار کراچی میں ایک سنڈے مورننگ شو میں "باغی سپاہی" دکھائی جا رہی تھی اور میں اور نورافشاں اسے بہت ذوق و شوق سے دیکھنے گئے اور سر میں درد لیکر واپس لوٹے کہ ہر دور گزشتہ کی بعض جھلکیاں اگر دور حاضر میں دیکھی جائیں تو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ ہم لوگ آنے والے زمانے میں کسی ترکیب سے زندہ کر دیئے جائیں تو مضحکہ خیز معلوم ہونگے۔ مگر ایک انسان اپنی زندگی اور اپنے زمانے کے مختلف اور متضاد ادوار کو باآسانی برتتا جاتا ہے۔

ہمارے مکان کے ایک سرے پر دو بید طویل کوریڈور تھے جو سارے بلاکوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے تھی۔ ان کوریڈورز کے درمیان پرائیویٹ سڑک تھی۔ ہمارے بیڈروم کا دریچہ اور گیلری کا سرا ایک کوریڈور میں کھلتا تھا۔ جھٹ پٹے کے وقت افسروں کے بچے وہاں جمع ہو کر کھیلتے تھے۔ اور ان کی مسرور اور جوشیلی آوازوں کا شور بہت خوشگوار ہوتا تھا۔

ایک شام ونگ کمانڈر فیاض محمود (مصنف بے رنگ وبو) کی چودہ سالہ حسین، صحت مند اور دراز قد لڑکی پپانے کھیلتے کھیلتے دریچے کی جالی میں سے جھانک کر رانی گڈو کو آواز دی۔ میں نے ان بچیوں کو پکارا۔ وہ دونوں کمرے میں آکر دریچے میں گئیں اور جالی سے لگ کر پپا سے باتیں کرنے لگیں۔ دوسرے روز پپا سینٹ پیٹرکس اسکول ماری پور کی ٹیم لیکر شہر کے کسی اسکول کے خلاف میچ کھیلنے جانے والی تھی۔ تینوں لڑکیاں کچھ دیر تک دریچے میں کھڑی اس میچ کے متعلق باتیں کیا کیں۔ پھر پپا ہنستی کھلکھلاتی بچوں کے مجمع میں واپس چلی گئی۔ پپا بہت اچھی کھلاڑی اور اپنی ٹیم کی کپتان تھی۔

دوسرے روز صبح ہم لوگ سامنے کے برآمدے میں بیٹھے تھے کہ گڈو اسکول یونیفارم پہنے کتابوں کا بستہ جھلاتی بے تحاشا تیزی سے بھاگتی گھر کی سمت آتی نظر آئیں۔ برآمدے میں پہنچ کر انہوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی ابھی پپا کو اسکول میں کسی نے جان سے مار ڈالا۔"

سارے ماری پوری میں سنسنی پھیل گئی۔ تیسرے پہر کو مرزا ماموں جان کے ڈرائنگ میں بیٹھے رضیہ جعفری، نسیمہ ممانی اور میں اس غیر متوقع اور المناک واقعہ پر اظہار خیال کر رہے تھے کہ نسیمہ ممانی کا ایک پٹھان ملازم اندر آکر بولا۔ بیگم صاحب اسکول کی سب فادریں پولیس والوں سے بات کر رہی ہیں۔ ایک پولیس والا ادھر سے آتا ایک فادر کھمبے کے پیچھے چلی جاتی۔ دوسری فادر نکل آتی۔ فادریں کہتی "وہ لڑکا پاگل تھا جس نے پپا بی بی کو مارا۔

بے چاری پپا کو ایک لڑکے نے کھیل کے میدان میں اچانک چاقو کے کئی وار کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ پپا نے اسے اپنی ٹیم میں نہیں لیا تھا۔ وہ لڑکا شہر سے آیا تھا۔

رات کے وقت ہم لوگ اس جگہ گئے جہاں پپا مرحومہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا تھا۔ باہر ایک بنچ پر اسکی ماں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ آزوری ان کو سنبھالنے میں مصروف تھی۔ لاش لیکر پپا کے گھر آئے۔ بیگم فیاض محمود کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ونگ کمانڈر فیاض محمود گم سم اور مبہوت سارے انتظامات کروانے میں مصروف تھے۔ افسروں کی چند بیگمات نے ایک باتھ روم میں غسل میت دیا بڑا اندوہناک وقت تھا۔

چند روز بعد کسی بچے نے تجویز پپا کی روح بلائی جائے۔ ہم لوگ ڈرائینگ روم میں کیرم لیکر بیٹھے۔ انگریزی حروف تہجی ایک دائرے میں رکھ کر درمیان میں گلاس الٹا رکھا گیا۔ انگلیاں گلاس پر رکھ کر عاصم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "جو نیک روح اس طرف سے گزر رہی ہو۔ مہربانی فرما کر پپا مرحومہ کی روح کو بھیج دے۔

آزوری کی بمبئی کے زمانے کی سابق اینگلو انڈین رقاصہ سہیلی زنوبیہ اب ایک باوقار عالی مرتبت معمر خاتون تھیں جن کے پر مذاق پنجابی شوہر مسٹر علم الدین کلکٹر آف کسٹمز تھے۔ یہ لوگ نسیمہ ممانی ماموں جان کے بہت دوست تھے ان کے ہاں کی دعوتوں میں شہر کے TOP SOCIAL REGISTER کے لوگ شامل ہوتے تھے جن کی تفصیل اور تصاویر زیب النساء حمید اللہ "ان کی والدہ بھی انگریز تھیں۔) کے سوسائٹی رسالے مرر میں شائع کی جاتی تھی۔ اس رسالے نے مجھے ہمیشہ بہت متحیر کیا۔ یہی سارے جگمگاتے لوگ اس قسم کے لوگوں کے لئے اب ایک مغربی اصطلاح BEAUTIFUL PEOPLE مستعمل ہے کراچی جم خانہ سندھ کلب، بوٹ کلب، بیچ لکژی ہوٹل، پیلیس ہوٹل اور میٹروپول ہوٹل کی دعوتوں میں ملتے تھے۔ ان جگموں اور SOCIALITES کی دعوتوں میں گوہا ایک ایرانی نژاد لڑکی نصرت اصفہانی ملا کرتی تھی۔ جو فارسی بولتی تھی۔ (اس کا کلکتے والے ایم اے ایچ اصفہانی سے کوئی رشتہ تھا۔) نصرت کی چھوٹی بہن بہجت اصفہانی ضیاء محی الدین کی طرح کراچی کی شوقیہ انگریزی اسٹیج کی مشہور اداکار تھی۔ پھر نصرت نے ایک ارسٹوکریٹک سندھی نوجوان سے شادی کرلی وہ ابو قریشی کے چھوٹے بھائی عمر قریشی عرف ادمو کا دوست اور برکلے یونیورسٹی میں اس کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اور ادمو اسے زولفی کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اس کا اصل نام ذوالفقار علی بھٹو تھا۔

اور آزوری بتایا کرتی تھی کہ جب خالدہ ادیب خانم ہندوستان آئی تھیں۔ عطیہ فیضی کے ہاں ایوان رفعت مالا بارہل بمبئی میں آزوری نے ان کو اپنا رقص دکھایا تھا اور خالدہ ادیب نے اس کا نام آزوری رکھا تھا۔

"باغی سپاہی" فلم ہمیں مسخرہ پن معلوم ہوا۔ اسی طرح بعض لوگ جو اپنے وقت سے آگے زندہ رہ جاتے ہیں آوٹ آف ڈیٹ معلوم ہوتے ہیں۔ عطیہ فیضی جنہوں نے اپنے زمانے میں دھوم مچا رکھی تھی۔ شبلی اور اقبال" جن کے شدید مداح تھے اور نو عمر لیڈر رم، جن کو جدید ہندوستانی عورت کا آئیڈیل نمونہ سمجھتے تھے اب نصف صدی بعد وہ ایک بوڑھی خبطی سی خاتون جپسیوں کا سا لباس پہنے ہاتھ میں چھتری لئے لوگوں کو ڈانٹتی پھنکارتی پھرتی تھیں انہیں اور ان کے یہودی نژاد شوہر مصور فیضی رحمین اور بہن نازلی بیگم ہرہائی نس آف جنجیرہ کو حکومت نے ایک کوٹھی بنوا دی تھی۔ اپنے مالا بارہل بمبئی والے مشہور مکان ایوان رفعت کی یاد میں اس کا بھی وہی نام رکھا تھا اور وہاں جانے والوں سے ایچ جی ویلز اور برنارڈ شا اور اقبال" سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتی تھیں اور لوگ ان کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ماری پوری میں صبح سویرے جاڑوں کی خوشگوار خنکی میں سے گزرتی ایئر فورس طیاروں کے گڑگڑاتے کی آواز آتی۔ نور افشاں صبح سات بجے تیار ہو جاتی دھوبی اس کا یونیفارم استری کر کے لے آتا۔ وہ جلدی جلدی چائے پی کر ہسپتال روانہ ہو جاتی۔ میں اپنے اطمینان سے نو ساڑھے نو بجے اٹھ کر گیارہ بجے تک شہر دفتر پہنچتی۔ شام کو چھ بجے تک واپس آتی۔ اتوار کے روز سہ پہر کو ٹھیک چار بجے کھانے کے کمرے میں چاء کے برتنوں کی کھنکناہٹ شروع ہو جاتی۔ جو بہت سہانی معلوم ہوتی۔

گلاس گھومتے گھومتے بھاری سا ہوا اور تیزی سے چاروں طرف جانے لگا۔ لیکن الفاظ بے بالکل بے ربط اور بے معنی تھے۔

"پپا کی روح کو تکلیف مت دو۔" مظہر صاحب نے افسردگی سے کہا۔

"اچھا لارڈ بائرن کو بلایا جائے۔" کسی نے تجویز کیا۔

اب مشاہیر کی روحیں بلائیں گئیں۔

ایک "روح" آئی اور ایک غیر مانوس زبان میں شاید ہنگیرین میں کوئی پیغام دے کر چلی گئی۔

"یہ سب فراڈ ہے۔ مظہر صاحب نے اظہار خیال کیا۔ لفظ فراڈ پر مجھے منٹو کا خیال آیا۔ منٹو کی روح بلائی گئی۔ میں نے پوچھا کیا آپ MINTO ہیں۔"

"میرا نام MINTO نہیں MANTO ہے۔" گلاس نے برافروختگی سے کود کود کر لکھا منٹو سے میں کبھی نہیں ملی۔ غالباً ۴۹ء میں ان کا پہلا اور آخری خط میرے پاس آیا تھا کہ میرا ایک جاننے والا پرویز ایک فلم بنا رہا ہے کیا اس میں آپ ہیروئن کا رول ادا کرنا پسند کریں گی۔ میں نے آگ بگولہ ہو کر ان کو دو سطروں کا جواب دیا تھا کہ آپ کو مجھ سے ایسا سوال کرنے کی جرات ہی کیسے ہوئی۔

"اچھا اب رڈولف ویلینٹو کو بلائیں نور افشاں نے کہا۔

مظہر میاں بولے۔" ہم سب غیر شعوری طور پر خود لکھ رہے ہیں۔ برائے مہربانی سب لوگ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر پھر گلاس پر انگلیاں رکھیے۔

آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں۔ اب جو پیغامات لکھے گئے۔ وہ کسی ادق زبان میں تھے جو چیک یا نارویجین نہیں تھی۔

اتنے میں آپا راضیہ کمرے میں آئیں انہوں نے ڈانٹا۔ "بند کرو یہ خرافات۔"

میں نے آنکھوں سے پٹی ہٹا کر کہا۔ "لیکن آپا دیکھیے تو سہی یہ گلاس میں آپ سے آپ ہوا سی کیسے بھر جاتی ہے۔"

"گلاس میں شیطان گھس کر بیٹھ گیا ہو گا۔ بند کرو غلط چیز ہے۔ خلاف شرع توبہ کرو۔

ہم لوگ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

لیکن کسی بچے نے یہ خبر آزوری کو پہنچا دی۔ وہ شام کو آکر رنجیدہ آواز میں بولی۔ "میں پپا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کل شام کو میرے ہاں آنا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

آزوری اپنے جینٹھ کے فلیٹ میں تنہا تھی۔ سارا خاندان پپا کے انتقال کے بعد چند روز کے لئے اپنے وطن پنجاب چلا گیا تھا۔ آزوری کا سوتیلا بیٹا موجود تھا۔ جو پپا کا ہم عمر تھا۔ اس نے اپنی مرحومہ کزن سے "بات" کرنے کی خاطر بڑی احتیاط اور اہتمام سے انگریزی حروف کے کاغذ تیار کر کے رکھے تھے۔ آزوری کے کمرے میں کیرم بورڈ پر گلاس الٹا رکھا گیا۔ بہت کوشش کی گئی۔ مگر پپا نہ آئی۔ اس کے غم زدہ چچا زاد بھائی نے حروف کے ٹکڑے غصے سے ہوا میں بکھیر دیئے۔ وہ ٹکڑے فرش پر بکھرے بہت بے بس اور بیکار

معلوم ہوئے۔

آپا حمن کے فرزند اکبر منن سائنسداں تھے۔ چھوٹے مشن' انگریزی ادب کے دلدادہ۔ ایک روز ان کا خط آیا فلاں انگریز شاعر کراچی آنے والا ہے۔ لاہور نہیں آئے گا۔ اس سے اس کی دستخط شدہ کتاب لے کر مجھے بھیجیۓ۔ میں نے فوراً مک سامپلز کو فون کیا۔ "فلاں شاعر (اب اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے) صرف دو دن کے لئے کراچی آرہا ہے فوراً اس کی دعوت کرو۔" مک سامپلز نے کہا۔ "ابھی لو۔" انہوں نے فوراً سے پیشتر اتنے کم نوٹس پر اپنے ہاں پچاس ساٹھ لوگوں کو شاعر سے ملوانے کے لئے ڈنر پر بلالیا۔ دعوت کے بعد ابو' ماکی' میں اور جین موٹروں کی طرف جا رہے تھے' جب مجمع سے نکل کر ایک امریکن جوڑا ہماری طرف آیا۔ امریکن آدمی نے جین سے کہا کیا آپ ہمیں راستے میں فلاں جگہ اتار سکتی ہیں؟ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ٹپکل' سرخ و سپید سیاہی مائل بھورے بالوں والا امریکن تھا۔ جین نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر آگئی۔ کچھ دیر بعد پچھلی سیٹ پر کسی نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔ اس اجنبی امریکن شخص نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پھر غور سے دیکھا۔ کار کی چھت کی روشنی جلا کر سہ بارہ غور سے دیکھا۔ پھر بولا۔ GEE کیا تم نذر باجی کی لڑکی نہیں ہو۔؟"

وہ امریکن سائنسداں اماں کے ننھیالی کزن علی مہدی نقوی تھے جو تقسیم ہند سے قبل سادات لانکڑی حسنین ماموں کے مکان اتاری کے آنگن میں نیم تلے کھاٹ پر نیم دراز خالص مراد آبادی لہجے میں گپیں ہانکا کرتے تھے۔ 11

بھائی علی مہدی اور ان کی امریکن سائنسداں بی بی لیونورا کچھ عرصے کے لئے نیویارک سے آئے ہوئے تھے۔ ان کو ان کے جائے قیام پر اتارنے کے بعد جین نے مجھ سے کہا۔ "میں سوچ سکتی ہوں کہ جب پچھلی صدیوں میں ہمارے اجداد یورپ سے ہجرت کر کے امریکہ میں آباد ہوئے جب کبھی وہ اپنی "اولڈ کنٹری" جاتے ہونگے تو ان کے رشتے دار ان کی قلب ماہیت دیکھ کر اتنے ہی متعجب ہوتے ہوں گے۔"

"ہاں۔ لیکن وہ زیادہ تر یورپ اور روس کے عیسائی یا یہودی تھے یا آرمینیا اور لبنان کے عیسائی اور بہرحال کلچر میں شامل تھے۔ آج مشرق کے غیر عیسائی لوگ جو وہاں جا کر بس رہے ہیں ان کا کلچر ٹرانسفر کا تجربہ غالباً مختلف ہو گا۔"

"تم نے اپنے اس کزن کو دیکھا۔ وہ بالکل امریکن ہو چکا ہے۔"

"کیونکہ ان کی بیوی بھی امریکن ہے۔" میں نے کہا۔ "علی مہدی بھائی کو کبھی کبھار شروع شروع میں لانکڑی کے آم اور محرم کی مجلسیں یاد آجاتی ہوں گی۔ مگر انسان محض آم اور مجلسوں پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے بارہ سو ۱۲۰۰ سال پہلے کے ایک غریب الوطن چینی شاعر کی نظم ہمیشہ یاد آتی ہے۔ کہ ایک نوجوان بغیر دولت کمائے بغیر عہدے حاصل کیۓ۔ محض موقلم اور سیاہی کی تختی پر گزر نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔" جین نے جواب دیا۔ "ہر انسان کی ذاتی زندگی کی PRIORITIES مختلف ہیں۔ لیکن مثال کے طور پر تم کو یہاں ایک QUEEN BEE کی حیثیت حاصل ہے۔ تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔

"کوئین بی۔؟ مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا۔ لیکن اس حیثیت کے باوجود شاید چلی جاؤں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس پر یاد آیا بلانچ آسٹریلیا جا رہی ہے۔ اس سنیچر اس کی الوداعی دعوت میرے ہاں ہے یاد رکھنا۔

بلانچ ایک برطانوی ڈپلومیٹ تھی۔ دوسرے ہفتے مک ساپلز کے ہاں اس کے الوداعی ڈنر کے موقع پر میزبان نے مہمانوں سے اس کے متعلق لمرک LIMERICK لکھوائے۔ سب لوگ سر جوڑے اور تنہا ڈرائینگ روم میں اور سبزے پر جلدی جلدی لمرک لکھنے میں مشغول ہوئے۔ اسکواڈرن لیڈر افضل نے جو جدید انگریزی ادب کے استاد تھے سب زیادہ پر لطف لمرک لکھا بقراط' ایلس ان ونڈرلینڈ والے والرس کی طرح اداس سے آکر گرینڈ پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ "سب چلے جا رہے ہیں جین کہہ رہی تھیں آپ پھر پر تول رہی ہیں۔ جب میں جاؤں گا میرا لمرک کون لکھے گا۔"

غالب نے کہا تھا میرا مرثیہ

"سب VOIDWARDS جا رہے ہیں۔ اسکواڈرن لیڈر افضل نے مجھے پھر چڑایا۔ یہ VOID WARDS کیا ہوتا ہے۔؟

میرے ایک افسانے "دوسرا کنارا" کا انگریزی ترجمہ کر کے کسی نے شائع کیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو کتنی مرتبہ بتایا ہے۔ کہ وہ ترجمہ میں نے نہیں کیا تھا۔ ویسے اگر غور کیجئے تو یہ ترکیب بری نہیں۔"

VOIDWARDS بقراط نے والرس کی آواز میں دہرایا۔

آنٹ ینسی کمرے کے وسط میں کرسی بچھائے کیک کے سامنے سنجیدگی سے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اپنے دو بچوں کو کیک کے ٹکڑے تھمانے کے بعد کہا۔ "پیارے بچو جاؤ اب اپنا لیسن سیکھو اور اس کے بعد پلنگ میں جاؤ۔"

مس نورا نے چائے بنا کر اپنے بردر مسٹر ایز منڈ اور اپنی آنٹ اینا کو دی۔ مس نورا نے اونچی ساری باندھ رکھی تھی۔ بالوں میں کلپ مسٹر ایز منڈ نے گلے میں شوخ رنگ کا اسکارف ہلکا رکھا تھا۔ مس اینا سیاہ بندکیوں والے ڈھیلے ڈھالے سرخ فراک میں ملبوس تھیں۔ پاؤں میں کھڑاؤں۔ وہ بہت ہی پھینچر تھیں۔

بلند قامت' گورے چٹے خوش شکل اینگلو انڈین مسٹر جان نے سینڈ وچ سرو کیئے مس اینا نے آنٹ ینسی سے پوچھا۔ انکل ولیم کیا پلنگ میں ہے؟"

"ہاں۔ وہ رات تمبولا کھیل کر بہت دیری سے لوٹا۔ ابھی سلیپ کرتا ہے" پھر انہوں نے گیلری میں جا کر آواز دی۔ او پیارے سے ولیم"

انکل ولیم ڈریسنگ گاؤن پہنے ڈرائنگ روم میں آیا۔ سب کو گڈ آفٹر نون بولا۔ مسٹر ایز منڈ مسٹر جان کے ساتھ برآمدے میں گیا۔ وہاں سے آواز دی۔ نورا سسٹر مسٹر صدیکی ادھر آ رہا ہے۔

آنٹ ینسی' یعنی نسیمہ ممانی کا چھوٹا ہوا باز بھائی (اسکواڈرن لیڈر اعظم جان جو اینگلو انڈین مسٹر

جان بنا نورافشاں کے بھائیوں مسٹر ایز منڈ یعنی عاصم اور کیپٹن حاتم زیدی سے (جو اس وقت کیپٹن ٹم تھا۔) "ٹم لیس مین نو مین" کر کے مصروف گفتگو تھا۔ انکل ولیم یعنی گروپ کیپٹن ڈبلو۔ اے مرزا یعنی مرزا ماموں جان (جو ابھی کرنل مرزا بن کر لاہور چھاؤنی نہیں گئے تھے۔) نے دوسرا چرٹ سلگایا۔ اور پاؤں ہلا ہلا کر چھت کو دیکھنے لگے۔

"اینا آنٹی" مس نورا یعنی نورافشاں نے مجھ سے کہا۔ "تھوڑا چائے اور منگواؤ مہربانی کر کر۔"

بور صدیقی اندر داخل ہوئے۔

"ہم لوگ۔" میں نے ان کو مطلع کیا۔ ٹی۔ این۔ سی ہو گئے ہیں۔ یعنی انگریز کے زمانے کے ٹپکل نیٹو کرسچن۔

"کیوں؟"

"ایسے ہی تفریحی"

"سنا ہے آپ بلانچ اور بقراط کو مشترکہ فیرویل ڈنر دے رہی ہیں۔ اگلے ہفتے میں سمجھتا ہوں اپنی تازہ تصنیف' آپ کے دوستوں کو برائے تنقید و تبصرہ اس روز پیش کر ہی دوں۔" انہوں نے کہا۔

"شیور مین۔ میں نے جواب دیا۔

اعظم اندر سے کیمرہ لے آیا اور سارے عیسائی پاڑے کی تصویریں کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈنر کی شام بور صدیقی نے اپنی تصنیف شدہ انگریزی افسانوں کی کتاب کی پہلی کاپی مجھے پیش کی۔ اس پر بڑے اہتمام سے لکھا "HOW SILLY IT IS TO ONE WHO WILL UNDERSTAND"

نورافشاں نے کچھ دیر بعد اس میں اضافہ کر دیا۔

مہمان آنے شروع ہوئے۔ جین نے چپکے سے بور صدیقی کے متعلق مجھ سے دریافت کیا۔ یہ بھی تمہارے کزن ہیں؟"

"نہیں۔" کمانڈر عسکری (ابن سعید) نے میرے بجائے جواب دیا۔ "حالانکہ جب تک اس کے برعکس ثابت نہ ہو میں ہر تیسرے شخص کو ان لوگوں کا کزن سمجھتا ہوں۔" کچھ دیر بعد بور صدیقی نے اپنی تصنیف کی ایک ایک جلد مک ساپلز' نسیمہ ممانی' صبیب' حسینہ' ماکی قریشی' شہاب صاحب' ایڈنا' سید ولی اللہ [12] اور ان کی فرنچ بیوی این ماری' موری ڈیبو' ونگ کمانڈر ڈاکٹر مشرف علی' جیہ بولٹ اور سید مظہر امام کو عطا کی نجانے انہوں نے سارے مجمع میں صرف ان بارہ افراد کو کیوں چنا۔ پھر انہوں نے اعلان کیا کہ اس کتاب کو یوروپ کی سات زبانوں میں ترجمہ کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"آپ کا اسلوب ایسا ہے۔ کہ ممکن ہے ہنگیرین میں آسانی سے منتقل نہ ہو سکے: سڈنی بولٹ نے کہا۔

"کیوں؟ جیمز جوائس کا جاپانی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بور صدیقی نے جواب دیا۔

صبیب "بولے کتاب بہت اچھی چھپی ہے" کہنے لگے۔ گرد پوش کے اسلامی موتیف پر غور کیجئے

عصری فن مصوری میں روح اسلام جھلکنی چاہیئے۔

"بالکل درست آرٹ فوراً آلس سیک آرٹ فورلائیفس سیک کے بعد اب آرٹ فور گوڈز سیک کی اشد ضرورت ہے"۔ کمانڈر عسکری (ابن سعید) نے صاد کیا۔

مرزا ماموں جان دو روز قبل کوئٹہ ہو کر آئے تھے۔ بور صدیقی بولے کمال ہے صاحب بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین صرف تین سال بور کی گئی اور گیس نکل آئی۔

یار تم ہمیں پورے سات برس سے بور کر رہے ہو ابتک کچھ نہ نکلا۔ عسکری (ابن سعید) نے کہا

کچھ دیر بعد بور صدیقی نے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر آہستہ سے مجھے مخاطب کیا۔

آپ اپنے ڈنرز میں بس ہمیشہ انہی سب لوگوں کو بلاتی ہیں۔

"اور کسے بلاؤں؟" میں نے پوچھا

"بھولو پہلوان" بور صدیقی نے سوچ کر کہا۔ آپ کو یہ سنکر تعجب ہو گا کہ بھولو پہلوان بھی ایک قابل قدر ہستی ہے۔"

آپا راضیہ ان دعوتوں کے لئے صبح سویرے سے کھانا پکوانا شروع کرتیں۔ شام پڑے بارہ سالہ اسلم بڑی تندہی کے ساتھ میس سے آئس کریم بالٹیاں اٹھوا کر لاتے۔ مغرب کے بعد سامنے بجری والے میدان میں موٹریں جمع ہونا شروع ہوتیں۔ رات گئے ایک کے بعد ایک کرکے شہر کی طرف روانہ ہو جاتیں۔ پندرہ بیس روز بعد یہی کراؤڈ پھر کسی دوست کے ہاں جمع ہوتا۔ دریا کی بہتی موجوں کی طرح دوستوں کی محفلوں کو دوام حاصل نہیں۔ آج وہ سب لوگ مدتوں سے دنیا کے مختلف گوشوں میں منتشر ہیں اور ایک دوسرے کی خیر خبر سے واقف نہیں۔

ایک روز مظہر میاں نے کہنا شروع کیا حاتم میاں بیٹے جگر صاحب کا کیا عمدہ شعر ہے۔ "آ ہا ہا۔ واہ۔ واہ۔" حاتم نے سرہلا کر پیشگی داد دی۔ ای نڈ پیانو کے اسٹول پر جا بیٹھی۔ اور کہا۔ "ابھی بجاتی ہوں۔"

الفاظ سے پہلے موسیقی

ہمارے استاد گویوں میں پارے کینیڈا جا چکے تھے۔ رمی، عباسی بھائی اور ای نڈ بہت اچھے جا رہے تھے۔ نور افشاں، نسیمہ ممانی خوب خوب گاتی تھیں۔ لیکن رمی کو معقولیت سے گوانا بہت مشکل کام تھا۔ وہ گاتے گاتے کہیں سے کہیں نکل جاتے تھے۔ صرف میں انکو "کنڈکٹ" کرکے گوا سکتی تھی۔ "رمی یہ نہیں۔ دوسرا گاؤ ہمیشہ پیلو میں ریں ریں۔ اچھا الاپ کی ضرورت نہیں، رعب مت ڈالو۔ اب، جس نے بجائی بانسری شروع کرو۔"

رمی جو آرزو لکھنوی اکثر گاتے تھے۔ اپنا پسندیدہ گیت شروع کرتے جس نے بجائی بانسری گیت اسی کے گائے جا۔

"رمی یہ نہیں۔ دوسرا۔ وہ سناؤ۔ وہ والا۔" رمی بے نیازی سے آنکھیں نیم وا کیئے انترہ اٹھاتے۔

اے میری ڈبڈبائی آنکھ دیکھ بندھی رہے یہ دھاک۔ یا شروع کرتے آرزو آرزو کیا ہوا۔ کیا ہوا، چپ ہو کیوں، کچھ کہو، کچھ کہو، فق ہے منہ، زرد رخ، چشم تر۔"

"رمی یہ نہیں وہ پارے والا گاؤ چھپل ندیا۔"

رمی اسی طرح آنکھیں بند کیئے کیئے فوراً پٹڑی بدل دیتے۔ "گھونگٹ والی گھونگٹ کھولو۔ ہمارا جیرا ہے کہ لاگت ناہیں" اچانک دوسری پٹڑی پر نکل جاتے۔ "بادل اتنا ٹوٹ کے برسا ڈوب چلا میخانہ بھی۔"

"رمی BEAT تیز کرو۔ BEAT تیز کرو۔ میں اپنے کونے سے ان کو کنڈکٹ کرنے میں مصروف رہتی۔

دوسری طرف نور افشاں الاپنے لگتیں۔ آؤ کہ مرگ سوز محبت منائیں ہم۔"

آپا نسیمہ کے شوہر عباسی بھائی سے ایک خاص گانا سنا جاتا تھا جو وہ دو آوازوں میں گاتے تھے۔ مردانہ آواز۔ آئینہ دیکھ کے۔ زنانہ آواز۔ وہ کہتے ہیں۔ مردانہ آواز۔ ایسی صورت پہ۔ زنانہ آواز مر گیا کوئی۔

"کیدارا میں سنیئے۔ میں ہانک لگاتی ڈھل چلی رات بکھرنے لگا۔

ایک طرف عاصم مسلسل نغمہ سرا رہتے۔

کبھی ہم لوگ شمعیں روشن کرکے پردے گرا کر گویا PROPER ATMOSPHERE تخلیق کرتے اور مغربی موسیقی کی محفل منعقد کی جاتی۔

آتشدان کے سہارے قالین پر نیم دراز عاصم وائیر ریکارڈ چلاتے رہتے جو وہ ہالینڈ سے لائے تھے اور اس پر مسٹر بینڈ مین تیز بگل اور جرمن فلم اینا کا ایک دلدوز گیت بار بار بجایا جاتا۔

میں پیانو کے سامنے بیٹھ جاتی۔ پسندیدہ دھنوں کی فرمائشیں ہوتیں۔ لاپلوما۔ والگا بوٹ مین کا گیت۔ بلیو ڈینیوب اولڈ لانگ زائین موسیقی کے اوراق پلٹتے پلٹتے قرون وسطیٰ کی جرمنی کے ٹاؤن پایپرز اور ڈلرز شمعوں کی جھلملاہٹ میں سے گزر جاتے۔ اور باہر شام کے آسمان کا رنگ لاجوردی ہو کر سمندر کی سیاہی میں گھلتا رہتا۔

بیتھوون۔ شیرزاندو موتسارات۔ "سرینیڈ" چیکووسکی "گڑیا کا جنازہ" ویبر شکاریوں کا کورس برہمز ترک سپاہی۔"

روندو۔ کارنیول آف وینس۔ اے مڈسمر نائیٹس ڈریم۔ اٹھارویں صدی کے استادوں کی پرچھائیاں۔ وہ استاد جنہوں نے اشیاء کو ان کی اپنی صورت کے بجائے ایک خاص روشنی اور سائے میں مختلف طور پر دیکھایا۔ اپنے اندرونی تجربات کو موسیقی کی تجریدی ہیئت میں ظاہر کیا۔ اور کلاسیکل موسیقاروں کی خالص سنگیت۔ رائن کی وادی۔ بیتھوون۔ آزادی، سکون، گہرائی، قوت۔

دارسا، شوپاں، اداسی۔ وی آنا کے جنگلوں کی کہانیاں فرانز شوبرٹ رومینٹک نغمگی رچرڈ واگنر جرمن نورڈک خداؤں کی گھن گرج سیگفرڈ۔ سیگفرڈ۔ ٹوائیلائٹ اف دی گوڈز۔

پھر یوں ہوا کہ ڈنرز کے بعد جب مہمان کراچی رخصت ہو چکے ہوتے یا چیمبر میوزک [13] کے گھریلو سیشن کے بعد ہم لوگ سونے کے لئے چلے جاتے اور مکان پر خاموشی چھا جاتی۔ تب آدھی رات کے بعد سنسان ڈرائنگ روم میں سے پیانو بجنے کی آواز آنے لگی غالباً شوپاں کا آسیب رات کو آکر شغل کرتا ہے۔ عاصم نے کہا۔ بہت دنوں تک کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک شام نورافشاں کے تیسرے چھوٹے بھائی مصطفےٰ عالم نے کہا۔ آج ہم رات بھر ڈنڈا لے کر پہرہ دیں گے پتہ چل جائے گا۔"

مصطفےٰ عالم آدھی رات کے بعد پیانو کے سامنے جا کر چوکس بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ساز اندر سے بجنا شروع ہو گیا۔ لیکن بھوت نظر نہ آیا۔

ہر دوسرے مہینے اتوار کی صبح ایک غریب مسکین صورت مہذب کیتھولک گوانیز بوسیدہ کوٹ پتلون ہیٹ پہنے اوزاروں کا کرمچی بیگ سنبھالے کراچی کی بس سے اترتا تھا اور آکر پیانو ٹیون کر جاتا تھا۔ جب میں نے بیگم نورخاں [14] سے یہ پیانو خریدا بالکل نیا تھا اور اب بھی بہت اچھی حالت میں تھا۔ جب پیانو رات کے علاوہ دن میں بھی آپ سے آپ بجنے لگا۔ میں نے مسٹر ڈی کوسٹا کو کراچی سے بلوایا۔ انہوں نے حسب معمول اپنے بیگ سے اوزار نکالے اور پیانو کا پچھلا تختہ کھولا۔ دفعتاً چیمبر میوزک کے استاد چوہوں کا ایک خاندان کود کر برآمد ہوا۔ اسلم، قمر، رانی، گڈو اور بھیا کھلکھلا کر ہنستے ہوئے ان کے پیچھے چاروں طرف دوڑے۔ چوہے اچانک غائب ہو گئے ایک فربہ چوہا موسیقی کی کتابوں کے انبار پر جا بیٹھا اور فلسفیانہ نظروں سے لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

چوہے نے کہا۔ دن دن سے بات کرتا ہے رات رات کو حکمت سکھاتی ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کا انجام کہاں ہے۔ میری موسیقی کو حقیر سمجھنے والو میں ایک بے بضاعت چوہا ہوں۔ لیکن سینٹ فرانس [15] کی قسم میں بھی تمہارا کزن ہوں۔ تمہیں کیا معلوم جس سطح پر ہوں وہاں سے بھی میری نگاہ دل وجود کو چیر سکتی ہے۔

"شور اور ہنگامے میں سے پر سکون گزرو۔ اور یاد رکھو کہ امن خامشی میں ہے خود کو جھکائے بغیر سب سے نبھاؤ۔ اپنی سچائی کو شانتی اور صراحت کے ساتھ بیان کرو اور دوسروں کی سنو خواہ وہ لوگ غیر دلچسپ یا کم علم ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ ان کے پاس بھی ان کی کہانی موجود ہے۔

"چھچھورے لوگوں سے احتراز کرو کہ وہ روح کے لئے ناگوار ہیں اور اگر تم نے اپنا موزانہ دوسروں سے کیا تمہارے اندر نخوت یا تلخی پیدا ہو جائے گی اپنے کارناموں اور منصوبوں سے لطف اندوز ہو، اپنے کام اور فرض منصبی میں دل لگاؤ خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو کیونکہ تمہارا ہنر ہی وہ شے ہے جسے گردش ایام کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

"اپنے معاملات میں سوجھ بوجھ سے کام لو۔ کہ دنیا مکرو فریب سے پر ہے۔ لیکن اہل دنیا کے چھل کپٹ سے دل برداشتہ ہو کر اچھے انسانوں کی نیکیوں کو نظر انداز نہ کرو بہت سے لوگ ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نصب العین کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اور ہر جگہ زندگی دلاوری سے معمور ہے۔ تم جو خود ہو وہی رہو

مصنوعی جذبات کا اظہار نہ کرو۔ نہ محبت کے متعلق کلبیت کا رویہ اختیار کرو۔ کیونکہ ساری خشک سالی اور مایوسیوں کے درمیان محبت سدابہار گھاس کے مانند اگتی رہتی ہے۔

"گزرتے برسوں کے مشوروں کو نرم مزاجی سے قبول کرو۔ اور نوعمری کے مشاغل سے وقار کے ساتھ دستبردار ہونا سیکھو۔ اپنی اندرونی قوت کو پروان چڑھاؤ۔ جو کسی اچانک مصیبت کے وقت تمہارے کام آسکے۔ لیکن توہمات سے خود کو پریشان نہ کرو کہ بہت سے خوف اور خدشے درماندگی اور تنہائی کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

"ایک معقول حد تک ضبط و توازن قائم کرنے کے بعد اپنی ذات سے نرمی برتو۔ اپنے اوپر بلاوجہ ظلم نہ کرو اور یاد رکھو کہ زمین کی گھاس اور آسمان کے درخشاں ستاروں کی طرح تم بھی کائنات کے بچے ہو اور چاہے تمہاری سمجھ میں یہ بات نہ آوے مگر کائنات متواتر اور پیہم اپنے اسرار منکشف کر رہی ہے چنانچہ جو بھی تمہارا تصور خدا کے متعلق ہے۔ راضی برضائے پروردگار ہو جاؤ اور زندگی کی پرشور الجھنوں کے درمیان اپنی روح کے ساتھ امن سے رہو۔ کیونکہ اپنی تمام بیہودگیوں اور کلفتوں کے باوجود دنیا بڑی خوبصورت جگہ ہے۔"[16]

کدوش۔ کدوش۔ کدوش [17]

قدوس۔ قدوس۔ قدوس

سنیکٹس۔ سنیکٹس۔ سنیکٹس [18]

برادر موش کا بیان ختم ہوا۔

حوالہ جات

1. جلد اول۔ فصل چہارم۔ باب نمبر1 "فلائنگ آفریدی۔"
2. جلد اول۔ فصل چہارم۔ باب نمبر1 "فلائنگ آفریدی۔"
3. دیکھئے جلد اول۔ فصل سوم' باب نمبر9 "افغان باقی کہسار باقی!"۔ ڈاکٹر شاہ زماں نے اب امریکہ میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ ان کے بھائی سردار شاہ نواز خاں ایران میں پاکستان کے سفیر تھے۔
4. "ڈالن والا" کی زہرہ ڈربی۔
5. "اکثر اس طرح بھی رقص فغاں ہوتا ہے۔ کی بونی ہیروئن"
6. ایک زین ماسٹر کی ہائیکو۔
7. جاپان اور مشرق بعید پر میرا طویل رپورتاژ "ستمبر کا چاند" اسی زمانے میں نقوش لاہور میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اسے پاکستان میں شاید احمد ندیم قاسمی نے کتابی صورت میں شائع کرلیا ہے۔
8. موصوف آج کل بنگلہ دیش میں غالباً ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔
9. ایک مشہور جاپانی ہائیکو شاعر۔
10. وشکا حیدر رسید اس وقت تک لندن اسکول اف کنومکس میں اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کرچکی ہیں۔
11. جلد اول۔ فصل یازدہم باب نمبر3 "ڈیمی پیراڈیز"
12. مشہور بنگالی ادیب اور مصنف "لال شالو" جن کا پیرس میں انتقال ہوچکا ہے۔
13. کلیسا اور تھیٹر کی موسیقی سے مختلف وہ سنگیت جو سولہویں سترہویں صدی میں یوروپ اور انگلستان کے نجی دیوانخانوں میں تین چار سازوں پر پیش کی جاتی تھی پبلک ہال کی اسٹیج پر وسیع پیمانے کے کونسرٹ اور آرکیسٹرا کا روپ انیسویں صدی کے صنعتی دور کی پیداوار ہے۔
14. ائرمارشل نور خاں۔ اب پی۔ آئی۔ اے۔ کے سربراہ ہیں۔
15. اطالوی ولی فرانسس ۱۱۸۲ء۔ ۱۲۲۶ء پرندوں کو "میری ننھی بہنو پکار" کران کے سامنے وعظ کہتے تھے اور "بہن گوریا" کے علاوہ برادر آتش' بھائی سورج وغیرہ ان کا انداز بیان تھا۔
16. سترھویں صدی کے ایک گمنام مصنف کی تحریر جو انگلستان کے ایک پرانے گرجا گھر سے دستیاب ہوئی۔
17. عبرانی
18. لاطینی

فصل پانزدہم

۱۔ حافظا' مخروش!

"بی بی بہت سی باتیں ہیں جن کے متعلق لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ انشاء اللہ کبھی اپنی سوانح حیات لکھوں گا۔ گورنر جنرلز ہاؤس کے ایک ڈنر پر ابا جان کے پرانے دوست عبدالرحمٰن صدیقی نے کہا۔

"مجھے ہمیشہ یہ تعجب رہا کہ راجہ صاحب محمود آباد یہاں کیوں نہ رہے۔ جاکر عراق میں سٹیل ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

"راجہ صاحب۔" عبدالرحمٰن صدیقی نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔ ایک جوشیلے مذہب پرست' اور اینٹی برٹش آئیڈیلسٹ نوجوان تھے تم کبھی ان سے ملی ہو۔"

"جی نہیں جب ابا جان ان کے ساتھ لیگ کا کام کرتے تھے۔ اس وقت میں کافی چھوٹی تھی۔ یہ باتیں تب کہاں پلے پڑتیں مگر یہ بتایئے راجہ صاحب پاکستان میں کیوں نہ رہے۔؟"

"سنو تقسیم سے چند روز قبل نئی دلی اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے۔ ڈنر کی میز پر راجہ صاحب نے قائداعظم سے دریافت کیا۔ پاکستان کا نظام حکومت کیا ہوگا۔

"قائداعظم مرحوم نے پوچھا آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیئے۔ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ اسلامی۔ اور ملت کا سب سے زیادہ دیندار متقی عالم باعمل صالح ترین شخص ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے۔

"یہ تو شیعہ امامت کا تصور ہے۔ میں نے اپنی پلیٹ تپائی پر رکھتے ہوئے عبدالرحمٰن صدیقی سے کہا۔

"قطعی" صدیقی صاحب نے فرمایا۔

"اور اقبال کا مرد مومن۔ میں نے پھر کہا۔

"ہاں قائداعظم نے ارشاد کیا تم بیسوی صدی میں قرون وسطیٰ کے حالات کا تصور کر رہے ہو پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہوگئی۔

"راجہ صاحب بولے سر میں نے اتنے برس مسلم لیگ کی جدوجہد محض ایک اسلامی مملکت اور اسلامی آئین کے نصب العین کو سامنے رکھ کر کی تھی۔

"کون سے اسلام کا؟ اسلام میں بہتر فرقے ہیں۔ قائداعظم نے دریافت کیا راجہ صاحب خاموش ہوگئے۔"

"راجہ صاحب اور قائداعظم دونوں اپنے اپنے نظریے کے لحاظ سے حق بجانب تھے" میں نے عبدالرحمٰن سے کہا۔

اتنے میں چند اور مہمان آکر صدیقی صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ صدیقی صاحب دوسرے روز مشرقی پاکستان کے گورنر ہوکر ڈھاکہ تشریف لے جارہے تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی سال بھر بعد رحلت

فرمائی۔ غالباً اپنی سوانح حیات نہ لکھ پائے۔

راجہ صاحب چند روز کے لئے عراق سے کراچی تشریف لائے اماں کو چچی کہتے تھے جب ان سے ملنے آئے میں نے وہی سوال کیا خاموش رہے پھر بڑی لجاجت سے کہا۔ اکیلا میں ہی قصوروار نہیں ہوں۔

پھر راجہ صاحب نے بتلایا کہ چند روز قبل وہ ہندوستان گئے تھے۔ نئی دلی میں تین مورتی ہاؤس تشریف لے گئے پنڈت نہرو نے ایک بار پھر اپنی اگلے وقتوں کی وضعداری کا ثبوت دیا۔ وہ یہ نہیں بھولے تھے کہ مہاراجہ علی محمد خان اور موتی لعل نہرو میں کتنی گہری یاری تھی۔ جب راجہ صاحب تین مورتی ہاؤس پہنچے پنڈت جی ایک اہم میٹنگ میں مصروف تھے سیکرٹری نے راجہ صاحب کا کارڈ جا کر پیش کیا۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور حاضرین سے کہا معلوم ہے کون آیا ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد فوراً ڈرائنگ روم میں آئے راجہ صاحب سے بحد تپاک اور خلوص سے ملے یہ بھی کہا کہ میں پرانی باتیں فراموش کر دونگا۔ آپ جلاوطن نہ رہئے ہندوستان واپس آ جائیے۔ میں قومیت دیدونگا۔ راجہ صاحب نے اسی اخلاق سے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے سابقہ تعلقے محمود آباد ضلع سیتاپور (اودھ) گئے۔ راجہ صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ "تمہیں معلوم نہیں وہاں میری سابق ہندو رعایا کس قدر خوش ہوئی مجھے دیکھ کر بڑی عقیدت سے کہا سرکار واپس آ جائیے۔"

"جی ہاں۔" میں نے راجہ صاحب کو چڑ کر جواب دیا۔ فیوڈلزم ہمارے جاہل عوام کی گھٹی میں پڑی ہے۔"

راجہ صاحب محمود آباد سے دوسری اور آخری ملاقات چند روز بعد لقمان بھائی کے ہاں ہوئی لقمان بھائی اسٹیٹ بنک آف پاکستان لاہور سے ٹرانسفر ہو کر کراچی آ چکے تھے اور کوئینز روڈ پر ایک بہت جہازی دو منزلہ نئی کوٹھی میں مقیم تھے۔ اماں چند روز کے لئے لقمان بھائی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت لقمان بھائی چہل قدمی کے لئے جاتے تھے چند منٹ بعد راجہ صاحب کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ چھڑی اٹھا ہوا خوری کے لئے نکل گئے راجہ صاحب اماں اور آپا حسنہ سے باتیں کرتے رہے۔ گرے سوٹ' گرے داڑھی اماں نے کہا۔" مجھے یاد آتا ہے ء میں آپ اور مہاراجکمار (راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی) صحن ٹرائسیکل چلاتے پھرتے تھے" رانی صاحبہ اور راجہ صاحب کا بیٹا لکھنؤ میں تھے انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔

راجہ صاحب کہنے لگے۔ میرا بیٹا نہایت قوم پرست ہندوستانی ہے۔

عجیب صورت حال تھی۔

چند روز بعد راجہ صاحب عراق واپس چلے گئے۔ وہاں سے لندن۔ راجہ محمود آباد کے پردادا نے ۱۸۵۷ء میں ملکہ حضرت محل کا ساتھ دیا تھا۔ راجہ صاحب کی انا بچپن میں ان سے کہا کرتی تھی "بھیا۔ انگریزوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا یہ کبھی مت بھولنا۔" برطانیہ کی مخالفت ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور بالآخر برطانیہ ہی میں انہوں نے پناہ لی۔ فیوڈلزم نے اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ ساتھ کردار سازی بھی کی ہے

راجہ محمود آباد نوعمری سے فقیر منش تھے تعلقہ محمود آباد کی سالانہ آمدنی اٹھارہ لاکھ روپیہ تھی اور موصوف خود لڑکپن سے زمین پر کمبل بچھا کر سوتے تھے۔ اب وہ لندن میں اسلامک کلچر سنٹر کے ڈائریکٹر ہو گئے بازار سے سودا سلف خود خرید کر لاتے تھے خود کھانا پکاتے تھے۔ راجہ[1] صاحب تو پھر ایک غیر معمولی قسم کے اور درویش آدمی تھے۔ اس وجہ سے غالباً ابا جان کی ان سے اتنی پٹی۔ لیکن آپ ایک عیاش نواب کے بجائے صوفی صافی ہوں تو بھی کچھ کرتے نہیں بنتی ہے۔ ورنہ آج دنیا کی تاریخ ہی مختلف ہوتی۔

زرعی اصلاحات کا دونوں ملکوں میں بڑا "شور شرابہ" ہے میں محکمے کے لئے زرعی اصلاحات پر ایک ڈوکومنٹری فلم بنانے پنجاب اور سندھ کے گاؤں میں جاتی ہوں جہاں جاگیرداروں اور پیرزادوں کا گہرا تسلط رہا ہے وہی حضرات اب طاقتور سیاسی لیڈر بن چکے ہیں پنجاب کے کسان عموماً خوشحال ہیں۔ سندھ کے خوار وختہ۔

"کیا عجیب بات ہے۔ چند آدمی پیدا ہوتے ہیں اور سارا نظام بدل دیتے ہیں لینن۔ گاندھی۔ جناح اور کس قدر کنفیوژن ہے۔ میں اسکرپٹ کے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہتی ہوں۔ آصفہ ممانی ناشتہ تیار کروا رہی ہیں۔ الن ماموں دریچے کے سامنے کھڑے شیو کرتے جا رہے ہیں اور گنگنا رہے ہیں۔ الن ماموں کتنے بلند پایہ گلوکار ہو سکتے تھے۔ وہ فی الحال حیدر آباد سندھ کے ایک ڈگری کالج کے پرنسپل ہیں۔ صبح کا وقت ہے باہر تیز دھوپ اور اجاڑپن۔ الن ماموں دہرائے جا رہے ہیں کر گیا دیوانہ یارو کر گیا دیوانہ یارو پھر وہ پلٹ کر مجھ سے کہتے ہیں "غازی پور میں تم کو تو یاد نہ ہوگا نذر باجی کے ریذیڈنٹ استاد یوسف خاں ستار پر بین کی دھن بجاتے اور گاتے تھے کر گیا دیوانہ یارو دارا دادا دارا دار دارا دارا بڑی HAUNTING سی دھن اور الفاظ تھے سپیرے کی بین اسے استاد شاید لہرا کہتے تھے باجی کو بھی سکھلائی تھی۔ کر گیا دیوانہ یارو۔

"یہ تو بڑے MYSTICAL الفاظ ہیں۔" میں نے کہا۔

اس وقت پڑوس کے مکان سے ایک سندھی بھجن کی آواز بلند ہوئی۔ اور کھڑتال اور مجیروں کا شور۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پڑوس میں سندھ ہندو رہتے ہیں روز صبح صبح اس طرح گاتے بجاتے ہیں سندھی ہندو بچل سرمست" اور شاہ لطیف" کے بہت معتقد ہیں۔ الن ماموں نے جواب دیا اور تولیہ اٹھا کر منہ دھونے چلے گئے۔ اچانک مجھے شدید اکتاہٹ اور کوفت محسوس ہوئی مولانا روم" اور بچل سرمست" اور سینٹ فرانسس کے باوجود دنیا کے حالات جو ہیں سو ہیں' اور پھر حافظ جی کہتے ہیں کونے میں چپکے بیٹھ جاؤ۔

غسل خانے میں سے الن ماموں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ نیک دل بھولے بھالے محبت کے پتلے الن ماموں میری آمد سے باغ باغ تھے۔ اس پیکر خلوص انسان کی اس دنیا میں کیا قدر و قیمت تھی؟۔

دنیا کے بازار میں خلوص اور محبت وغیرہ کا بھاؤ بہت کم ہے۔ یہ بات بھی حافظ جی وغیرہ کو بہت پہلے

سے معلوم تھی۔

ناشتے کے بعد میں کام پر جانے کو تیار ہوئی۔ دن میں چند ہاریوں سے ملاقات۔ شام کو ایک وڈیرے سے انٹرویو الن ماموں نے فکر مند ہو کر کہا۔ اماں گول کرو وڈیروں کے ہاں کہاں جاتی پھرو گی۔ کتاب میں پڑھ لو۔

"نہیں ماموں میں ان کے گھروں میں جاکر وہاں کا ماحول دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسکرپٹ لکھنے کے لئے۔ میں نے جواب دیا۔

شام کو ایک وڈیرے صاحب باہر جھولا صوفے پر متمکن تھے۔ اور الف لیلوی سے خادم ان کے قدموں میں اکڑوں بیٹھے تھے۔ قرون وسطیٰ کے اس شخص نے مجھے بہت متعجب نظروں سے دیکھا اور سکون اور بے نیازی سے میرے سوالات کے جواب دیئے۔ اقبال کے دہقان کی اگر چغتائی صاحب تصویر بناتے تو اس وڈیرے سے بہتر موڈل ملنا ناممکن تھا۔

ایک دوست کہ اپنے وقت کے عماد الملک یمین الدولہ امیر خسرو تھے کہ بکارِ منصبی بحیثیت معتمد خاص' صدر مملکت 'گوناں گوں متنوع ادوار انہوں نے اندر سے دیکھے۔ (موصوف بحیثیت افسانہ نگار پاکستان کے آسمان ادب پر بطور ایک METEOR کے روشن تھے۔ اور مائل بہ تصوف طبیعت بھی رکھتے تھے۔ آپ کے عقد کی دعوت میں شرکت کے لئے سربراہ مملکت مع نئی بیگم کے تشریف لائے۔ نوشہ نے مجھ سے کہا کچھ دیر بیٹھ کر ان سے باتیں کیجئے۔ جنرل کو ہم لوگ بادشاہ کہتے تھے۔ زوجہ ثانی جن سے حال میں شادی کی تھی۔ ملکہ عالم۔ بادشاہ' ان کی پہلی خوش دامن اور پہلی بیگم کے ابا جان اور اماں کا عہد رفتہ میں بہت میل جول تھا۔ اب زمانہ بالکل مختلف تھا۔ میں نے سوچا مجالس ملوک سے ہمیشہ خائف اور مشتبہ رہنا چاہئے۔ ملکہ نے کچھ اسنوبری دکھائی اور میں نے کوئی اینٹ گرائی۔ عبث عبث۔ کیا ضرور ہے خانہ کی پوزیشن کو اوورکوڈ کرنا۔

بعد کچھ عرصے کے وہ وقت آیا کہ بادشاہ اور اراکین دولت میں بگاڑ پیدا ہوا۔ بعد از خرابی بسیار اچانک ان کو مع نئی ملکہ دارالامارت سے راتوں رات رخصت کیا گیا۔ ہوائی میانے میں سوار ہو کر شہر لندھن پہنچے۔ اور برطانوی ملکیت کے ایک ہندوستانی طعام خانے کے نگراں بنے۔

منکہ بنت میر بندے علی ترمذی ایک معمولی مزدور قلم کی ہوں۔ اقوال مشائخ وصوفیا یاد کرتی ہوں اور عالم تحیر میں ہوں۔ یہ تمہارا سورج جسے تم دیکھتے ہو وہی ہے جو شہریاروں اور حاکموں کے محلات پر طلوع ہوتا تھا۔ پس روئے مبارک بریں فقیر آوردند فرمودند فرزند من ایں فوائید کہ گفتم بنویس [2]

اکتوبر ۵۸ء کی جس صبح مارشل لاء نافذ ہوا میں اور کزن نشو (مس نوشابہ اطاعت حسین جو ان دنوں کراچی یونیورسٹی میں جرنلزم پڑھا رہی تھیں) پرسکون الفنسٹن اسٹریٹ پر اطمینان سے ٹہل رہے تھے معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ "کو" ہو گیا لیکن اس کے فوراً بعد پتہ چلا کہ فوجی افسروں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے حاتم زیدی بحیثیت کیپٹن ملیر چھاؤنی میں تعینات تھے ان کی زیر نگرانی ایک دکان سے اسمگلنگ کا مال برآمد کیا

گیا۔ چند روز بعد نور افشاں نے اپنے ہسپتال جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ تم روز صبح گیارہ بجے اپنے دفتر جاتی ہو وقت پر جایا کرو دفتروں میں دیر پر پہنچنے پر کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔"

چند روز کے اندر اندر سارا کرپشن اور بے قاعدگی معدوم ہوئی لیکن بہت جلد حالات پھر نارمل ہو گئے۔

آپا نفیسہ اور بھائی اطاعت حسین نے امریکہ سے لوٹ کر پی۔ ای۔ سی ایچ۔ ایس میں کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ ایک جس میں خود رہتے تھے ایک وسیع مون اسکیپ جیسے کھڈ کے کنارے تھی۔ آپا نفیسہ کے بچے اسے گرینڈ کینین کہتے تھے۔ سان فرانسسکو میں بھائی اطاعت حسین پاکستان کے کونسل جنرل تھے۔ سر فضل حسین [3] مرحوم کے صاحبزادے میاں عظیم حسین انڈیا کے۔ دونوں مسٹر حسین کہلاتے تھے کونسلر حلقوں اور امریکنوں میں لطیفہ مشہور تھا کہ ہمیشہ یہ یاد رکھو کہ کون سے مسٹر حسین سے کیا بات کہی جائے۔

چودھری ظفر اللہ خاں بدر ممانی کو طلاق دے کہ دوسری شادی کر چکے تھے ایک روز آپا نفیسہ کے ہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی دوسری بیوی جو بہت ہی کمسن تھی ملک سوریہ کی جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتی تھی اور کیمبرج میں پڑھ رہی تھی جب اسے خواب میں بشارت ہوئی کہ وہ چودھری صاحب سے شادی کرے۔

اماں کا ساری عمر سے دلچسپ مشغلہ تھا کہ وہ بغیر کسی بشارت اپنے دوستوں اور عزیزوں اور ان کی اولادوں کی شادیاں کروایا کرتی تھیں ان دنوں وہ آپا نفیسہ کی منجھلی لڑکی رعنا عرف رانی کی نسبت پروفیسر مرزا محمد سعید کے دوسرے بیٹے کمانڈر عسکری کے چھوٹے بھائی آر تھر سے طے کروانے میں منہمک تھیں۔

نشو اور رانی دونوں امریکن یونیورسٹیوں سے پڑھ کر لوٹی تھیں۔ نشو نے انگریزی اور جرنلزم میں دو عدد ایم اے کئے تھے اور اب وہ اور جنرل اسکندر مرزا کی بیٹی نور جہاں مل کر ایک انگریزی رسالہ "دو منزورلڈ" شائع کر رہی تھیں۔ اور نشو بیگم کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں جاکر لیکچر دے آتی تھیں۔

ماکی قریشی کی چھوٹی بہن روشن کافی عرصے سے پیرس میں اسٹیج ایکٹریس بننے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہاں اس نے ایک ڈچ فوٹوگرافر سے شادی کر لی تھی۔ ان دنوں وہ دونوں کراچی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ڈچ فوٹوگرافر کو پاکستان میں عید پر پاکستان کوارٹرلی کے لئے کلر فیچر بنانے کا اسائین منٹ دیا۔ بروز عید الفطر آپا نفیسہ کے ہاں سارے خاندان کی بیگمات اور لڑکیاں زرق برق غرارے پہن کر جمع ہوئیں۔ چچا نثار حیدر زیدی نہٹور سے آئے ہوئے تھے وہ اور بھائی اطاعت پیچوان لے کر بیٹھے پورے تام جھام کے ساتھ عید منانے کی تصویریں کھینچی گئیں ڈچ فوٹوگرافر باغ باغ تھا۔ وہ ساری تصاویر مع روشن کے مضمون کے میں نے کوارٹرلی میں شائع کیں۔ اس کے بعد پاکستانی خواتین کے لباس پر مضمون ماکی قریشی نے لکھا۔ تصویریں اس کے ڈچ بہنوئی نے کھینچیں "موڈلز" نور افشاں اور عاصم کی دلہن اختر اور نور افشاں کے ائرفورس ہسپتال کی نرس اپنے یونیفارم میں وغیرہ وغیرہ۔

مظہر میاں نے سرہلا کر کہا۔ "اب معلوم ہوا نیپوٹزم اس طرح فروغ پاتی ہے۔"

لیکن پاکستان کوارٹرلی میں دوستوں کے مضامین کے علاوہ دنیا بھر کے اہم ترین مصنفوں سے مضامین منگواتی تھی۔ یک سالہ دور ادارت میں مغرب کے عظیم مورخین ڈاکٹر پر سیول اسپیرز' ڈاکٹر ڈی لیسی' اولیری' ڈاکٹر برنارڈ لوئیس' ڈاکٹر رچرڈ ایتھنگ ہازن اور ان کے علاوہ ڈاکٹر جیوسپ ٹوچی "اطالوی آرکیالوجسٹ" پروفیسر آلے زاند روبو زانی' پروفیسر ولفرڈ کینٹ ویل اسمتھ' پروفیسر مس این تھمبٹن' ڈاکٹر کے جے نیومین' ڈاکٹر این ماری شمل' لارڈ پیتھک لارنس' سر ولف کیرو وغیرہ۔ اور پاکستانیوں میں پروفیسر احمد علی' ایم۔ بی احمد' ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی' الطاف گوہر' غلام احمد پرویز' خلیفہ عبدالحکیم' جسیم الدین' سید ولی اللہ' شوکت عثمان' ضیاء محی الدین' خواجہ توفیق رفعت' وغیرہ وغیرہ کے مضامین اس میں شائع کئے یہ ایک مارگ کی طرح کا خوبصورت چمکیلا مصور رسالہ تھا اور بقول شخصے بہت اچھا جا رہا تھا۔

رانی "رعنا اطاعت حسین" کی "آرتھر" سے شادی کے موقع پر جین ایبل نے ڈھولک کے گیت گانے میں مسرت جہاں تیموری کی اخلاقی امداد کی۔

"آرتھر" اور کمانڈر عسکری کے والد پروفیسر مرزا محمد سعید سے باتیں کرنا ہمیشہ ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ خصوصاً جب وہ ہمیں ایران کے اسمٰعیلیوں کے متعلق بتاتے ان کا تبحر حیرت انگیز تھا مرزا محمد سعید کی والدہ سرسید" کے بڑے بھائی سید محمد خان کی نواسی تھیں۔ عسکری کی والدہ روشن خیال پڑھی لکھی بیبیوں کی اماں والی نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ انگریزی بولتی تھیں وہ بھی سرسید" کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور اس رشتے سے کشور کے والد یعنی آپا صدیقہ کے شوہر' بھائی احمد رشید دہلوی ان کے قریبی عزیز تھے عسکری "ابن سعید" کے ہم زلف پروفیسر احمد علی (وہ نوجوان طالب علم جو ۱۹۲۸ء کے آرکیڈیا دہرہ دون میں قریب المرگ نانا نذر الباقر کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔) مصنف انگارے و "ٹوائیلائیٹ ان ڈیلی" چین سے واپس آچکے تھے اور اردو میں بہت کم لکھتے تھے۔

مسرت جہاں تیموری کی والدہ بہادر شاہ ظفر کی سگی پر نواسی تھیں۔ مسرت کو ہم سب مس نی کہتے تھے ایک روز جین ایبل کے ہاں ہم لوگ کسی محاورے پر بحث کر رہے تھے مس نی نے بے پرواہی سے کہا ہوگا۔ لیکن قلعے میں ایسے ہی بولا جاتا تھا۔" کچھ دیر بعد پنجاب کا ذکر کرنے لگیں۔ آفتاب احمد نے محظوظ ہو کر پوچھا۔ "یہ آپ قلعے سے پنجاب کہاں پہنچ گئیں فرمایا۔ ہمارے والد وہاں سرکاری ملازم تھے۔

مزاج میں درویشی اور یکسوئی تھی امریکہ سے کار لیکر آئی تھیں جسے اس انداز سے ڈرائیور کرتی تھیں گویا چوپلے یا رتھ میں بیٹھی ہوں۔

ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی کے ایک کمرے میں محکمے کے آرٹ ڈائریکٹر (افسانہ و ڈرامہ نگار) ناصر شمسی' انور قریشی' مسرت جہاں تیموری اور میں چار بڑی بڑی میزوں کے پیچھے 'دن کا شاہ بڑے کی محفل منعقد کرتے اور دور کی کوڑی لاتے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا تھا۔ مس نی کرسی پر آلتی پالتی مار کر جلوہ افروز ہوتی تھیں۔ جنوری ۵۹ء کی ایک صبح موصوفہ سے کہہ رہی تھی۔ مس نی آج کل بہت سے لوگ انڈیا

میں چھوڑی ہوئی فرضی جائیدادوں کے کلیم داخل کرنے میں مصروف ہیں تم کم از کم لال قلعے کا ہی بالکل جائز کلیم داخل کردو۔"

فرمایا۔ "اماں گول کرو۔"

اس وقت نوابزادہ صاحب آف لوہارو یعنی مرزا جمیل الدین عالی مع ابن (میجر ابن الحسن) وارد ہوئے کچھ عرصہ قبل میں نے موصوف کی کتاب "غزلیں" دوہے 'گیت کے گرد پوش کا ڈیزائن بنا کر مکمل کیا تھا ان کی طبیعت میں آمد ہی آمد تھی۔ شاہ بڑے کے میر محفل اکثر وہی ہوا کرتے تھے۔ عالی نے نہایت ڈرامائی انداز سے ایک ٹائپ شدہ انگریزی تحریر میرے سامنے رکھی۔ ایک لمحہ خاموش رہے پھر گویا ہوئے ہم ایک رائٹرز گلڈ قائم کر رہے ہیں۔ اس پر دستخط کر دیجئے۔ آپ سمیت آٹھ فاؤنڈر ممبرز ہونگے۔

میں نے پینک سے چونک کر بیان پر سرسری نظر ڈالی اور دستخط کر دیئے دوسرے روز وہ بیان اخباروں میں آگیا۔

دفتر میں مس نی حسب معمول آلتی پالتی مارے شال سرسے لپیٹے غرارے میں ملبوس اپنی کرسی پر فروکش تھیں۔ چپڑاسی نے اخبار سامنے لا کر رکھے۔ "میں نے کہا یہ تو میں نے پڑھا ہی نہیں تھا۔"

"قاعدہ ہے کہ آدمی جس کاغذ پر دستخط کرے پہلے اسے پڑھ لے" بقراط نے کہا جو چند منٹ قبل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

میں چند برس قبل نفیس اکیڈمی والوں کو کورے کاغذ پر دستخط کرکے "ہما خانم" مفت عطا کر چکی تھی۔

بقراط نے کافی کی پیالی میز پر رکھ کر بغور وہ بیان پڑھا جس کے نیچے سات ادیبوں کے ساتھ میرا نام درج تھا۔ دریافت فرمایا۔ اس میں کیا خرابی ہے۔

"کچھ نہیں"۔

"آپ سرکاری ملازمت تو بخوشی کر سکتی ہیں۔ مارشل لاء کے زمانے میں رائٹرز گلڈ کے قیام پر اب نظرثانی فرما رہی ہیں۔ گڑ کھاؤ گلگلوں سے پرہیز یا تو پروفیسر محمد حسن عسکری کی طرح اصول پرستی برتیے۔ انہوں نے گلڈ کا ممبر بننے ہی سے انکار کر دیا۔ سنا ہے انہوں نے پوچھا کیا پیغمبروں نے بھی کبھی گلڈ بنائے تھے مزید برآں آپ کو مارشل لاء پر اعتراض ہے تو باہر چلی جائیے۔ ایک سے ایک محب وطن اطمینان سے ملک کو خیرباد کہہ کر انگلستان اور امریکہ اور کینیڈا میں سیٹل ہو رہا ہے۔ کوئی انوکھی بات نہ ہوگی اور آپ تو کوئی ایسی لمبی چوڑی وطن پرست بھی نہیں۔"

"ایک ادیب ساری دنیا کا شہری ہوتا ہے۔" میں نے نہایت رعب داب سے ارشاد کیا۔

"باہر چلی جائیے۔" بقراط نے دہرایا۔

"۵۶ء میں مولانا آزاد نے دلی میں کہا تھا اگر واپس آنا چاہو تو مجھے خط لکھنا لیکن مولانا کا انتقال ہو چکا ہے۔

"اور جیمز فیرل کا کیا ہوا۔ بقراط نے پوچھا۔ جیمز فیرل نے ہمفری بوگارٹ کو لکھا ہے۔"

"ہمفری بوگارٹ۔؟"

"آئی مین ہیوبرٹ ہمفری۔"

سینٹر ہیوبرٹ ہمفری کو ہمفری بوگارٹ سمجھنے والا یہ نون سیریس رویہ ہمیشہ آپ کا پڑا کرے گا۔ بقراط نے سرہلا کر کہا۔

۵۷ء کی گرمیوں میں بزرگ امریکن ناولسٹ جدید (امریکن کلاسیک "STUD LONIGAN" کے مصنف جیمز ٹی فیرل دو روز کے لئے کراچی آئے میٹروپول میں ٹھہرے وہاں کتابوں کے اسٹال پر جلال الدین احمد کی شائع کردہ کتاب THE EXILES (جو "جلاوطن" کا ترجمہ تھا) (ان کے ہاتھ لگ گئی اسے پڑھ کر مصنف سے ملاقات کی امریکہ واپس پہنچ کر ایک عدد مفصل مضمون جلاوطن پر لکھا اس کی نقل بھیجی جس سے اردو کی صورت حال پر ایک مغربی مصنف کے رد عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں پاکستان پی۔ این کلب کراچی نے ساٹھ صفحات کا ایک ناولٹ شائع کیا یہ کتاب اس ملک سے باہر بالکل غیر معروف ہے۔ جلاوطن دراصل ایک نثری نظم ہے..... مصنفہ نے ہوٹل لوبی میں ٹہلتے ہوئے مجھ سے میری اور دوسرے مصنفوں کی کتابوں کی فروخت کے متعلق دریافت کیا۔ اور بتایا اور میں نے اپنے مشہور ناول میرے بھی صنم خانے کے دائمی حقوق اشاعت ایک ہزار روپے (دو سو ۲۰۰ ڈالر) میں فروخت کئے۔

"موازنے عموماً غیر منصفانہ اور عداوت انگیز ہوتے ہیں' خصوصاً دو مختلف زبانوں کے ادیبوں کے درمیان اور ایک کی تعریف اور دوسرے کو کم تر ظاہر کرنا بھی بڑی غلط بات ہے۔ لیکن میں فرانسو' ساگاں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ان دونوں خواتین کے موضوع یکساں نہیں ہیں لیکن مادموزیل ساگاں نے اپنے پہلے ناول Triestesse Bon Jour کی اشاعت کے بعد زبردست کامیابی اور زبردست مالی منفعت حاصل کی اور یہ حد سے حد ایک چلا اور سل ناول ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی مصنفہ نے اچھی تعلیم پائی ہے۔ اور مستقبل میں اچھا لکھ سکے گی۔ اور مس ساگاں خوش قسمت ہیں کہ فرانس میں پیدا ہوئیں اور دنیا کی ایک اہم زبان میں لکھتی ہیں۔ لیکن ایک اردو مصنف کو کیا مواقع حاصل ہیں؟ عالمی ادب سے ہماری واقفیت نامکمل رہے گی کیونکہ ہم غیر معروف زبانوں میں لکھی ہوئی چیزیں نہیں پڑھ پاتے۔

"جلاوطن میں حقیقی کردار تخلیق کئے گئے ہیں اور ایک کھچا کھچ اور بھرپور احساس زندگی کو چند صفحات میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ تکنیک کا پختہ تعمیری شعور موجود ہے۔ کیونکہ پیش کرنے اور سنانے کا انداز اکثر امپرشنسٹک ہے۔"

"اسد اللہ شاہ بخاری کے خیال میں روایت سے رشتے ٹوٹتے جارہے ہیں زیادہ تر نوجوان اردو ادیب اگر وقت سے پہلے مرگئے تو عالم بالا میں قدماء اور اقبال سے مل کر خود کو اجنبی محسوس کریں گے۔ آج

کے مصنف کو نہ صرف یہ کہ نئی چیزوں کے نئے نام دریافت کرنے ہیں بلکہ ان چیزوں کو جو پہلے سے جانی یا محسوس کی گئی ہیں از سرنو پہچاننا اور ان کے نام تلاش کرنے کے لئے کمربستہ ہوتا ہے۔ اردو مصنف ایک ایسی پھیلی ہوئی کمیونٹی میں رہتا ہے جس کی اب تک توضیح نہیں کی گئی۔ ایک دژن ایک فوکس کی تلاش اور ایک مقصد اور آگے دیکھنے کی جسارت اور ہمت اسی کے لئے ضروری ہے۔

"بخاری کے یہ الفاظ اسی حسی ناولٹ پر ایک معنی خیز ابہامی روشنی ڈالتے ہیں کیونکہ قدیم و جدید روایت اور نئے پن مشرق و مغرب نے اس ناول کے نوجوان کرداروں کی زندگیوں کے تانے بانے بنے ہیں۔ پرانی دھنیں اس میں اس طرح رچی ہیں جس طرح ADESTE FIDELIS اور —ERGOTANTUM ہماری چند کہانیوں میں موجود ہیں مصنفہ کے کردار ایک نئی دنیا میں پروان چڑھ رہے ہیں اور نئے اشیاء کی جھلکیاں ان میں نظر آتی ہیں جن کی جلاوطنی خالص جغرافیائی کے بجائے روحانی ہے.... چند اہم نسوانی کردار چند STROKES میں تخلیق کرکے ایک پوری دنیا روشن کی ہے وہ تاریخ میں سے چکرا کر گزرتے ہوئے دل میں روتے جاتے ہیں جذبات کی توسیع اور ان کی نشوونما کا ایک فرسٹ ریٹ ٹیلنٹ مصنفہ کے فن کو جو MASTERY کی حدوں کو چھولیتا ہے مغرب میں متعارف ہونا چاہئے۔[1]"

تالیاں۔

نمبر ۲۵۲ پچاسویں سڑک' نیویارک

۱۹ اگست ۱۹۵۸ء

--------- NEW DIRECTION کے ڈائریکٹر جیمز لالین نے میرا مضمون پڑھنے کے بعد تمہاری کتابوں سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور تمہارے لئے لندن پبلشر نیول آرم اسٹرونگ سے بھی بات کی ہے۔ تم یہ خط ملتے ہی مسٹر آرم اسٹرونگ کو اپنے ناولٹ کی ایک جلد مع میرے مضمون کی نقل کے لئے بھیج دو۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک ادیب کو جو اپنے متعلق BRASH نہ ہو اپنی تخلیقات کے متعلق خود کچھ لکھتے ہوئے جھینپ آتی ہے۔ س علاوہ ازیں زیر تصنیف ناول بھی جلد از جلد ترجمہ کرکے اس کو بھیج دو۔ تم نہ صرف مشرق اور مغرب کے سوالات کا سامنا کر رہی ہو بلکہ ماضی کی طرف بھی دیکھتی ہو جبکہ تم اور تمہاری نسل اسی نئی اور تبدیل ہوتی ہوئی دنیا میں زندہ ہیں۔

جذبات (FEELINGS) کے لحاظ سے تم اہم تخلیقی کام کر سکتی ہو۔ مجھے اس طرح سمجھانے کی اجازت دو اقبال پاکستان کا روحانی باپ تھا۔ WESTERNIZER تھا۔ اس نے فلسفے کا مغرب میں مطالعہ کیا اور مغربی فلسفیوں کے متعلق لکھا۔ اسے صرف دو مفکر پسند آئے۔ ST. THOMAS AQUINAS اور MAX SHOLER (بیسویں صدی کا ایک مابعد الطبیعاتی مفکر جس کا نظریہ مذہبی تھا اقبال جمہوریت پرست بھی تھا' لیکن جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کی مطابقت کے ساتھ رائج کرنا چاہتا تھا۔ آج کل طرز حکومت کے مسائل کے متعلق جو پاکستان میں لکھا جا رہا ہے اور تحریروں اور مباحثوں میں مضمر STIMULATION SHOCK, CHALLENGE سارا کا سارا مغربی ہے۔ آج کی دنیا میں رہنے کے

لئے پاکستانی اور دوسرے ایشیائی اپنے مسائل 'کردار حسیت' ضروریات وغیرہ کے تناظر میں مغربی خیالات کو منظور یا مسترد کر سکتے ہیں ادب میں ان تمام مسائل کو جذبات کے احاطے میں پیش کرنا اہم ہے۔

"مغرب موجود بعد از جنگ عہد سے بہت قبل سے مشرق میں داخل ہو چکا ہے بہت سے امریکن بھی اس مسئلے کو نہیں سمجھتے اور بجائے اسکے کہ اپنے تجربے کو ممکن حد تک دیانت داری کے ساتھ جنوب مغربی ایشیاء والوں کے سامنے پیش کریں' وہ چاہتے ہیں کہ تم لوگ بس ہمیں پسند کرو۔

"میں نے یہاں چند کالجوں میں لیکچر دیتے ہوئے تمہاری کتاب کا مفصل تذکرہ کیا۔ اور تمہارے زیر تصنیف ناول [5] میں ناموں کی تکرار بھی اہم نکتہ ہے۔

جلاوطن میں POETIC INTENSITY ہے۔

بعدازاں ہر دوسرے تیسرے مہینے یہ نیک دل بزرگ لکھتے رہے۔ "تم نے اب تک کتاب نہیں بھیجی میں نے تمہارے متعلق ادبی جلسوں میں تقریریں کیں۔ بحث مباحثے کئے۔ سر ہربرٹ ریڈ کو لندن خط لکھا جو ایک پبلشنگ فرم کے ڈائریکٹر ہیں۔ اور پرل بک سے ملنے والا ہوں جو ایک نہایت بھلی خاتون ہے۔ مگر جب تک میرے پاس تمہارے مسودات اور اس کتاب کی جلدیں نہ ہوں میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہاری OBJECTIVITY اور GRASP OF SOME INTERNAL POINT OF RELATION SHIPS پر یہاں بہت کچھ لکھا اور کہا ہے تمہارے ناول کے ہندو مسلم نوجوان میرے عہد کے نوجوانوں سے اس قدر مختلف ہیں ۱۹۲۶ء میں میں نے شکاگو یونیورسٹی میں سماجی انصاف پر اپنی پہلی تقریر کی تھی اس وقت میرے ہم جماعت دولت مند لڑکے اور لڑکیاں بہت خفا ہوئے پھر میں نے بہت جدوجہد کی زندگی گزاری۔ وہ ڈپریشن کا زمانہ تھا۔

سینیٹر ہیوبرٹ ہمفری میرے دوست ہیں۔ وہ آج ڈیموکریٹک ٹکٹ پر صدارت کا الیکشن لڑنے میں مصروف ہیں۔ میں ان کی سیکرٹری کو خط لکھ رہا ہوں کہ سینیٹر ہمفری اپنی ریاست منی سوٹا کی یونیورسٹی میں تمہیں بلوائیں۔ تم اپنی تعلیمی کوالی فکیشنز وغیرہ کی تفصیلات سیکریٹری کو اس پتے پر فوراً بھیج دو سیکرٹری کے نام خط کی نقل موجود ہے۔"

میں نے بوجہ سستی اور بے پرواہی نہ بے چارے مسٹر فیریل کو کتاب' مسودات وغیرہ بھیجے نہ سینیٹر ہیوبرٹ ہمفری کی سیکرٹری کو یونیورسٹی آف منی سوٹا میں داخلے کے لئے خط لکھا نہ متعلقہ کاغذات روانہ کئے۔ مسٹر فیریل نے متواتر بار بار اس کے متعلق لکھا آخر تھک کر خاموش ہو گئے۔

ضیاء محی الدین ۵۳ء میں لندن چلا گیا تھا رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ میں اداکاری سیکھنے کے بعد ۵۶ء میں پاکستان لوٹا ۵۸ء میں پھر واپس گیا۔ برطانوی قومیت حاصل کر لی۔ اور ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر اسے چھوٹے چھوٹے رول ملنے لگے مئی ۵۹ء میں اس نے مجھے لندن سے لکھا۔

"----- فسانہ آزاد سے شیلا ڈیلینی کے A TASTE OF HONEY تک کیا LET DOWN کیا ہے:۔ جب میں نے فسانہ آزاد (لاہور اسٹیج پر) دیکھا مجھے اس قدر شرم آئی کہ اس کے علاوہ

کوئی رد عمل اس کے سوا نہ ہوا کہ صرف ایک دن بعد میں لندن میں ہونگا۔ سرور کہتی ہے ٹیسٹ آف ہنی اب آرٹ کونسل کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ کاش میں ذرا جلال الدین احمد سے اس مسئلے پر بحث کر سکتا۔ تم جانتی ہو ایک اٹھارہ سالہ لڑکی نے یہ تمثیل لکھی ہے اور نئے وژن اور آج کے نوجوانوں کے تخلیقی کام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مروجہ تصورات کے خلاف برہمی کوئی یا مبالغہ آمیز ڈرامائی گالی گلوچ اس میں موجود نہیں۔ لیکن وسعت اور تصور کے لحاظ سے ایک حساس اور تیکھا ڈرامہ ہے اور میرے خیال میں LOOK BACK IN ANGER سے زیادہ کامیاب رہے گا۔ میں وطن کے کسی انگریزی اخبار میں اس کا تجزیہ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر ہمارے قارئین رومانی کہانیاں پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

"یہاں ایک اور کھیل چل رہا ہے۔ THE LONG AND THE SHORT AND THE TALL ایک سوال پیش کیا جاتا ہے۔ کم علم معمولی فوجی سپاہی ایک جنگی قیدی کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ اس سوال پر بغیر پند و نصائح روشنی ڈالی گئی۔ خود صحیح جواب کے لئے تماشائی کو اپنے ضمیر میں جھانکنا پڑتا ہے۔ دراصل کوئی جواب پیش نہیں کیا جاتا۔

"چنانچہ میں اپنے فرسٹریشن کو اپنے اندر دبائے رکھتا ہوں اور افسوس یہ ہے کہ مجھے خود معلوم ہے میرے یہ رد عمل کچھ عرصے بعد اپنی تیزابیت کھو دیں گے اور جو باتیں میں کہنا یا لکھنا چاہتا ہوں وہ بھول جاؤں گا۔"

"جلاوطن" نامی ناولٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے جیمز ٹی فیریل نے مشرق و مغرب کے تصادم کے متعلق جو لکھا تھا ضیاء محی الدین اس کا ایک نمائندہ تھا۔ اور پسماندہ مشرقی معاشرے کی حالت پر نوحہ زن بھی تھا۔

پھر شانتا راما راؤ نے ای ایم فوسٹر کے "پیسج ٹو انڈیا" کو ڈرامے کی شکل دی۔ ضیاء کو اس میں ڈاکٹر عزیز کا رول ملا۔ اور اس نے پہلے لندن میں اور پھر نیویارک کے براڈوے پر دھوم مچا دی اس کے بعد ضیاء سابق برا فروختہ موجود کامیاب اور مطمئن فنکاروں اور ذہن پرستوں کے ESTABLISHMENT میں شامل ہو سکتا تھا۔ یعنی "سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے" مگر اس نے کچھ عرصے تک اپنی برہمی برقرار رکھی۔

صدیق احمد صدیقی بحیثیت جدید ذہن پرست مغرب میں مطمئن تھے۔ لیکن چونکہ فرنگی محل جامعہ اسلامیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ساختہ پرداختہ تھے' غریب الوطنی کی اندرونی کشمکش کو زیادہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس کشمکش کی سب سے واضح مثال آنیوالے برسوں میں ن۔ م راشد قائم کرنے والے تھے۔

"------ اب میرے کام کی بات سن لیجئے۔ آپ کا دفتر یا شاید امریکنوں کا دفتر [6] میں نے سنا ہے کتابیں لکھواتا ہے ترجمے کرواتا ہے (توے بھرواتا تو ختم ہو گیا۔) اور ادب کی خدمت کرواتا ہے۔ کیا میرا نام کسی رزق کے دانے پر اس سلسلے میں آپ کو لکھا ہوا تو نہیں ملا؟ اگر نہ ملا ہو تو لکھوا دیجئے۔

"اور وہاں دوستوں میں کون کون ہے۔ ایک تو جلال الدین احمد ہیں۔ سلام ضرور پہنچایئے۔ دوسرے شان الحق حقی انہیں بھی بندگی۔ اور اگر ممکن ہو تو کہہ دیجئے کہ "نامہ و پیام نہ سہی آپ کے ارمغان کلام کا اب بھی مستحق ہوں" ممکن ہے کچھ عرصے بعد پاکستان آنا ہو۔ امیدیں بہرحال بندھی ہوئی ہیں۔

نیاز کیش

صدیق

لندن۔ ۲۲۔ اگست ۵۸ء

یہ خط لکھنے کے ٹھیک بیس ۲۰ دن بعد صدیق احمد صدیقی راہی ملک عدم ہوئے۔ ۱۱ ستمبر ۵۸ء کی سہ پہر انہوں نے قائداعظم جناح کی دسویں برسی کا خاص پروگرام اپنی اردو سروس سے نشر کیا۔ اسٹوڈیو سے نکل کر گھر جانے والی بس میں سوار ہوئے۔ ڈبل ڈیکر کی بالائی منزل پر سب سے اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ بس اپنا سفر طے کر کے ٹرمینس پر رکی۔ سارے مسافر اتر گئے کنڈکٹر عورت نے آکر دیکھا۔ ایک برساتی پوش مسافر اگلی سیٹ پر ذرا آگے کو جھکا چپکا بیٹھا ہے۔ کنڈکٹر نے آواز دی۔ مسافر خاموش رہا۔

جگت گرو جگت چچا صدیق احمد صدیقی کی چلتی بس میں حرکت قلب بند ہو گئی تھی اور وہ اپنے صیہون کی تلاش ختم کر چکے تھے۔

۲— ٹاؤن ہاؤس' کنٹری ہاؤس

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں نئے قبرستان کے سامنے اپنے مکان کے برآمدے میں چچا مشتاق احمد زاہدی آرام کرسی پر اس طرح خاموش بیٹھے ملتے' جیسے وہ نمبر ۴ پارک سائیڈ نارتھ قرولباغ میں' اپنے عالیشان مکان کے برآمدے میں' اور اس سے پہلے کوشک قرولباغ کے برآمدے میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر یہاں بھی میں مستقبل کے وہ اول جلو پلان بناتی جو لڑکپن میں امینہ اور میں چچا کے سامنے بنایا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ کے عمل پسند خواتین و حضرات کہاں سے کہاں نکل چکے تھے۔ یہاں کاہلی اور کنفیوژن کا وہی عالم تھا۔ پھر میں دہشت کے ساتھ کہتی۔ "چچا وقت نکلتا جا رہا ہے اور کچھ نہ کیا۔"

چچا نے سرہلا کر جواب دیا۔ ہا" سجاد غریب بھی یہی کہتا تھا۔"

"تو ابا جان ہی نے کیا کر لیا۔ جو انکی صلاحیتیں تھیں ان کے لحاظ سے کچھ بھی نہ کیا۔"

ہاں۔ یہ اس کی ٹریجڈی تھی۔ وہ AMBITIOUS نہیں تھا۔ اور اس کی زندگی کی مجبوریاں تھیں۔ تمہاری زندگی میں تو کوئی مجبوریاں نہیں ہیں۔"

"اچھا چچا۔ بس میں کل ہی دفتر سے استعفیٰ دیکر جاتی ہوں واپس ولایت۔"

ایک بار آمنہ مجید ملک کے ہاں اتوار گزارا جا رہا تھا۔ لنچ کے بعد لوگ باگ فرش پر اور صوفوں پر ہونکی ڈوری بیٹھے تھے۔ زہرا نگاہ کی شادی علی گڑھ والے ماجد علی سے ہو گئی تھی۔ وہ دونوں نیویارک سے چند روز قبل لوٹے تھے۔ ریٹائرڈ مغنیہ فلم اسٹار خورشید بانو اور ان کے انٹلکچوئیل شوہر مسٹر یوسف' کرنل مجید ملک اور آفتاب احمد سے مصروف گفتگو تھے۔ فیض صاحب چند روز قبل تاشقند سے لوٹے تھے جہاں حفیظ جالندھری اور ملکہ ترنم نور جہاں بھی انکے ساتھ تھیں۔ فیض صاحب لطیفے سنا رہے تھے کس طرح حفیظ جالندھری ازبک خواتین کو مستقل خواہرم اور دخترم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ پھر شہر کی ایک خاتون کے تازہ رومانس کا ذکر چھڑا فیض صاحب کو میں نے OVER HEAR کیا۔ میرے متعلق فرما رہے تھے "ان کا یہ خانہ ہی خالی ہے ان سے اس معاملے پر رائے نہیں لی جا سکتی۔" سلو بھی کہتی تھیں۔ "ان کو باتوں ہی سے فرصت نہیں" میں نے کہا۔ "میں نے کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا اور بہت سے اہم مسائل زیر غور رہتے ہیں آمنہ باجی نے پوچھا مثلاً کیا۔؟"

"مثلاً یہی کہ ہم کو کرنا کیا چاہیئے۔ ہم بس ڈی۔ اے۔ الیف۔ پی میں وقت ضائع کر رہے ہیں مثلاً ہم باہر جا کر کسی یونیوسٹی میں ریسرچ کر سکتے ہیں۔

"جب انواع و اقسام کے بہترین مواقع آپ کو پیش کئے جاتے ہیں آپ مارے کاہلی اور کنفیوژن کے انکو نظرانداز کر دیتی ہیں۔" کسی نے کہا۔

"درست۔ مگر اس COMPULSIVE کاہلی اور کنفیوژن کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کے متعلق ہم کچھ کر نہیں سکتے۔

فیض صاحب لاہور واپس جانے والے تھے۔ دوسرے روز صبح ماری پور تشریف لائے میں نے کہا "فیض صاحب عمر عزیز کے دس سال برباد گئے کچھ نہ کیا اماں کی صحت اب بہتر ہو گئی ہے۔ اب میں یہاں سے ازنچھو ہوتی ہوں۔"

وہ اتوار کا دن تھا فیض صاحب شہر واپس گئے۔ شام کو مظہر میاں کے ساتھ میں کراچی روانہ ہوئی ماری پور سے کراچی جانے والی شاہراہ کے کنارے ساحل سمندر پر ایک جگہ مکرانی ملاح اور بڑھئی ایک چوبی کنٹری کرافٹ بنانے میں مصروف تھے۔ جو برسوں سے زیر تعمیر تھا یا شاید نیا جہاز بن کر سمندر میں چلا جاتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا بننا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ شام دفعتاً مجھے اجاڑ اور ویران اور وحشت ناک سی معلوم ہوئی۔ شہر پہنچ کر مظہر میاں نے کوئینز روڈ انٹیلی جنس اسکول پر اتارا اور آگے چلے گئے۔ پیر کی صبح گیارہ بجے دفتر پہنچ کر اپنے کمرے میں گئی مس ٹی' ابو اور ناصر شمسی کسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد میرے لال داڑھی والے چپڑاسی نے اندر آکر کہا۔ آپ کے آنے سے ذرا پہلے شفیق میاں کا فون آیا تھا بیگم صاحب کو جبرجست چوٹ آئی ہے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی کرنل شاہ سول ہسپتال لے گئے ہیں۔

سول ہسپتال کے ایک کمرے میں اماں ایک اونچے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک ٹانگ میں لوہے کی سلاخ لگا دی گئی تھی بڑی بہادری سے تکلیف ضبط کئے اطمینان کے ساتھ عیادت کے لئے آنے والے

عزیزوں سے باتوں میں مصروف تھیں۔

اس صبح دس بجے شفیق کے ساتھ وہ معمول کے مطابق اپنا پندرہ روزہ چیک اپ کروانے اپنے معالج کرنل شاہ کے مطب گئی تھیں۔ وہاں اونچے پلنگ پر سے اترتے میں چوبی سیڑھی پر پیر رپٹا۔ کرنل شاہ فوراً ہسپتال لے کر آئے ایکسرے کروایا۔ معلوم ہوا کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی سول ہسپتال میں دو بہت وسیع بڑھیا وی آئی پی روم مع ذاتی ٹیلیفون موجود تھے۔ ان میں سے ایک خالی تھا دوسرے روز اس میں منتقل کیا گیا۔ رشتے داروں اور دوستوں کا تانتا صبح سویرے سے لے کر رات گئے تک بندھا رہتا۔ ماری پور سے نورافشاں اور ونگ کمانڈر ڈاکٹر مشرف علی آکر اماں کو دیکھتے۔ "جتنے زیادہ ڈاکٹر ہوں اتنا ہی بہتر" اماں اطمانیت سے کہتیں پھر ایک روز ٹانگ کا آپریشن کیا گیا۔ اماں بے انتہا باتونی تھیں پہیوں والے اسٹریچر پر اپریشن تھیٹر کی سمت جا رہی تھیں اور ہمراہ چلنے والے عزیزوں سے متواتر باتوں میں مصروف تھیں۔ نورافشاں بھی سفید ماسک سفید کوٹ پہن کر غڑاپ سے آپریشن تھیٹر کے اندر چلی گئی۔

سب لوگ اماں کی ہمت پر عش عش کر رہے تھے۔ اس پیرانہ سالی میں ہنسی خوشی اتنا بڑا آپریشن کروانے پر تیار ہو گئیں اس نسل کی خواتین غالباً ہر لحاظ سے بڑی باہمت تھیں۔

آپریشن کے بعد پورے تین ماہ تک اماں ٹھاٹھ سے وی آئی پی روم میں فروکش محفل آرائی کرتی رہیں۔ ان کا کمرہ اہل خاندان اور دوستوں کا کلب بن چکا تھا۔ سرجن کی اجازت ملنے پر انٹیلیجنس اسکول کی کاٹیج واپس آگئیں۔-

بندرگاہ کیماڑی کے راستے میں کوئینز روڈ پر انٹیلیجنس اسکول کے سرکاری بنگلے بھی ماری پور کے آفیسرز کوارٹرز کی طرح دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فوجیوں کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ یہاں خفیہ خبررسانی کی تربیت کا اسکول قائم کیا گیا تھا۔ گارڈن روڈ کے بہتر سرکاری جائے رہائش کی ویٹنگ لسٹ پر اپنا نمبر آنے تک کے وقفے میں چند ماہ قبل مجھے انٹیلیجنس اسکول میں ایک کاٹیج الاٹ ہوئی تھی۔ ان بنگلوں کے چاروں طرف سرسبز درخت سرسراتے تھے۔ اور برآمدوں پر "ریلوے کریپرز" پھیلے ہوئے تھے۔ چار کمروں کی اس کاٹیج کے احاطے میں مگنولیا اور انار کے پیڑ کھڑے تھے اور کھپریل پوش کشادہ برآمدے پر املتاس سایہ فگن تھا۔ اماں کے ایک رشتے دار حمید حسن ماموں کا چھوٹا لڑکا شفیق حسن سرے کے کمرے میں مقیم تھا۔ کچھ فاصلے پر اچھو کا بنگلہ تھا جہاں وہ امریکہ جانے سے قبل فروکش تھی۔ پڑوس میں لکھنؤ کی پرانی دوست مہرجبین اور منہاج الدین احمد اور لکھنؤ والے جمیل بھائی اور مایا جمیل سابق مایا سرکار رہتے تھے۔ لقمان بھائی اور آپا حسنہ نزدیک کوئینز روڈ پر اسٹیٹ بنک کی عالیشان کوٹھی میں سکونت پزیر تھے۔ ویک اینڈز اور چھٹیوں میں ماری پور۔ جیسے ہوم میں ہم لیڈی اور لارڈ لوگ کا ایک ٹاؤن ہاؤس ایک کنٹری ہاؤس ہوتا ہے۔

اماں حادثے سے قبل کبھی کبھار لاہور لاکرتی لکھنؤ والے ماموں' ابراہیم خاں اور اختر ممانی کے ہاں ماڈل ٹاؤن' یا تاج و حجاب کے ہاں نمبر ۱۴۰ ایبٹ روڈ یا بھائی حمید علی کے ہاں ریلوے روڈ ہو آتی تھیں۔

حجاب امتیاز علی کے خطوں کا انداز قطعی نہیں بدلا۔ اماں کے نام جس طرز کے خط ۳۲ء کے غازی پور میں مدراس[8] سے آتے تھے بالکل اسی اسٹائل کے ۵۸ء کے کراچی آیا کرتے تھے۔

لاہور — ۳۰ جون ۵۸ء

پیاری خالہ جان عید مبارک

کل یہاں عید تھی۔ کئی دفعہ کل آپ کی یاد آئی۔ اور دل کو سمجھایا کہ میرے اتنے خطوں کا جواب دے چکی ہیں۔ تو اب دو خط تشنہ رہ گئے تو شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر آج ابھی دو منٹ پہلے آپ کا ۲۶ جون کو کوئینز روڈ سے لکھا منظوم محبت نامہ پہنچا۔ آپ ہسپتال سے گھر آگئیں۔ کراچی میں ہوتی تو روز دیکھنے آتی۔ لاہور میں ہوں۔ اس لئے مجھے خیریت کا کم از کم ایک کارڈ ہر تیسرے لکھوا دیا کیجئے۔ ادھر لیڈی ذوالفقار بھی علیل میرے تمام پیاروں کو کیا ہو گیا۔؟

آج دوپہر بارش ہوئی تھی' گرمیوں کی بارش۔ آپ جانیئے جیسے پریوں کے آنسو بہہ رہے ہوں۔ پائیں باغ کے برآمدے میں کتنی دیر تک برسنے والے پانی کو دیکھتی رہی۔ پھر یکایک غمگین سی ہو گئی۔ اٹھ کر خس کا عطر لگایا۔ وحشت دل کا علاج ٹہل کر کیا۔ اتنے میں ایک دوست کا فون کہ نئی کار لی ہے ڈرائیو کو چلو۔ فوراً تیار ہو گئی امتیاز' یاسمین' اور میں اور دوست راوی پر چلے گئے وہ خوابوں اور گیتوں کی جگہ یعنی راوی کے اس پار۔

بلیاں پیار لکھواتی ہیں۔ امتیاز اور یاسمین آداب

لاہور — یکم اگست ۔ ۵۸ء

پیاری خالہ جان

آج رات اگست کا چاند نکلے گا تپتی ہوئی رات ہو گی۔ اور آتشیں جھونکے۔ کوئیل کی آواز تو میری جان ہے آپ کوئل کی کوک سے بیزار کیوں ہیں؟ کہیں بلیوں کی صحبت نے آپ کو کوئیلوں کا دشمن تو نہیں بنا دیا؟

میری تمام بلیاں اس سال تندرست رہیں۔ گزشتہ سال سب بیمار پڑی تھیں۔ گلفام اب تک ٹانک استعمال کر رہا ہے۔ واٹربری پیتا ہے۔ اسے سردیوں میں زکام ہو جاتا ہے۔ گل لالہ بے حد موٹا بلا ہے۔ سوسن اور چاندی کا دشمن ہے۔ جو نازک اندام بلیاں ہیں۔ باقی بلیاں بے چاری نیک ہیں جعفر میاں (طوطا) ان دنوں سنبل (کبوتر) کے دشمن ہو گئے ہیں اپنی مڑی ہوئی چونچ نہیں دیکھتے۔

ہائے آپ نے اپنی تصویر کے بارے میں کتنے بیدردانہ الفاظ لکھ دیئے آپ عصمت والی تصویر میں کسی یوروپین ملک کی مصنفہ معلوم ہو رہی ہیں۔

آپ کیا چلنے پھرنے کے قابل ہو گئیں؟ امتیاز آپ کی ناسازی طبع سے فکرمند رہتے ہیں۔ لیڈی ذوالفقار آپ کو سلام لکھنے کو کہہ گئی ہیں۔ میں کراچی آؤں یا آپ تندرست ہو کر لاہور آئیں گی۔؟

لاہور۔ ۲۲۔ اکتوبر ۵۸ء

--------۔ اب خزاں آنے والی ہے۔ خزاں! خیال تو کیجئے۔ تین دن ہوئے ایک عظیم طوفان بادو باراں لاہور کو ڈرا کر گیا تھا۔ اس رات مجھے ایک ڈنر پر گلبرگ جانا تھا۔ سات بجے گھر واپس آئی تو بجلی غائب۔ یاسمین آرٹ کونسل کے ایک پلے کی ریہرسل میں گئی ہوئی تھی۔ امتیاز ریڈیو اسٹیشن۔ میں گھبرا کر بلیوں کو ڈھونڈنے اندر گئی۔ اتنے میں راجہ غضنفر علی خاں کا فون آگیا۔ آپ لوگ کہاں رہ گئے سب مہمان پہنچ چکے ہیں۔ اسی طوفان میں آجایئے۔

اتنے میں یاسمین اور امتیاز آگئے۔ راجہ غضنفر علی خاں کے ہاں موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر کھایا۔

نجانے اس وقت کون سا پرندہ اس تیزی سے چہچہا رہا ہے کہ قلم رکھ کر اس کی بات سننے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ دیکھ آئی۔ سیاہ فام و دبلا پتلا سا پرندہ ہے نئے نئے پرند آرہے ہیں۔ پرانے جا رہے ہیں کوئل ۱۴ ستمبر کو چلی گئی' آئندہ سال آئے گی۔

عصمت میں سب سے پہلے "ایام گزشتہ" شوق سے پڑھتی ہوں محبت' دلی محبت پر ہیز ترک کرنے کی تاکید دن میں دس مرتبہ زور سے ہنس پڑنے کی تاکید لاہور لینے لینے آنے پر غور کرنے کی تاکید۔

آپ کی حجاب

اگست ۱۹۴۰ء میں ابا جان نے ظالم محبت کی تقریظ میں لکھا تھا عزیزہ حجاب کے افسانوں کے کیریکٹر ایک مستقل خاندان کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ دادی زبیدہ ڈاکٹر گار' سرہارلی جشن زوناش وغیرہ۔ سب سے ہم اس قدر وابستہ ہیں جیسے اپنے عزیز دوستوں اور رشتے داروں سے' اور ان کی سوانح حیات سے ہم کو اس قدر گہرا تعلق ہے جیسا کہ کوہ فیروز' کوہ الماس' کیباس' دریائے ناشپاس کے ساحل یا جزیرہ عباس کے رہنے والوں کو ہو سکتا ہے۔ خدا کرے یہ حضرات رہتی دنیا تک جئیں اور یہ جزیرے اور پہاڑ اور دریا (جنہیں آپ کسی اٹلس میں تلاش نہ کیجئے گا۔) اس آب و گل کے کرے سے کبھی نہ ٹکرائیں۔

آج ۱۹۵۸ء میں نہ صرف دنیائے ادب کا نقشہ بدل چکا تھا بلکہ اردو اٹلس کی نئی سیاسی اور جغرافیائی حدبندیوں کے تعین کو بھی دس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔

حجاب اماں کے نام خطوں میں گزرتے موسموں کے پرندوں کا ذکر کرتی تھیں۔ ادب میں بھی موسم بدل رہے تھے۔ پرانے پرند جا چکے تھے نئے نئے آرہے تھے۔

جنوری ۵۹ء میں ایک روز رائٹرز گلڈ آف پاکستان کا اولین اجلاس نہایت دھوم دھام سے فریر ہال کراچی میں منعقد ہوا۔ یہ برطانوی عہد کی ایک نیم گوتھک عمارت ایک پر فضا باغ کے وسط میں واقع تھی جس میں میوزیم بھی تھا۔ اور جلال الدین احمد اس میں پاکستان آرٹ کونسل کے زیر اہتمام تصاویر نمائش بھی منعقد کرواتے رہتے تھے۔ اس میں ہمارے دوستوں شاکر علی اور زین العابدین کی نمائشیں ہوتی تھیں۔ ملک

کے نوجوان فنکاروں کی نمائش میں اس ناچیز کی چند تصاویر اور پلاسٹر آف پیرس کے "نورافشاں" اور "فیگرین" جو فن مجسمہ سازی کو ناچیز کے صرف دو عدد CONTRIBUTION تھے سجائے گئے تھے۔ اس فریر ہال میں اب رائٹرز گلڈ کے افتتاح لئے جیسے ہی جنرل فیلڈ مارشل ایوب خان تشریف لائے۔ عالی اور شاہد احمد دہلوی تیزی سے میرے پاس آئے کہا" سیڑھی پر جا کر صرف آپ ان کا خیر مقدم کیجئے۔" چنانچہ کیا جنرل ایوب جو حاضر ماموں کے ہاں دہرہ دون الگزنڈرا پیلیس آیا کرتے تھے۔ ایک شاندار ہینڈسم شخص تھے آنکھوں میں نرمی کی جھلک۔ تصویریں کھنچیں۔ لیل و نہار میں شاید وہ تصویریں چھپیں اسے دیکھ کر بعد میں بنے بھائی نے دہلی سے لکھا تمہاری تصویر جنرل ایوب کے ساتھ دیکھی بہت تعجب ہوا۔ جنرل ایوب اندر گئے۔ بالائی منزل کے ہال میں اسٹیج پر چند منٹ بیٹھے۔ پھر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سب نے ری لیکس کر کے جلسے کی کارروائی شروع کی۔ قدرت اللہ شہاب نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ جمیل الدین عالی گلڈ کے سیکرٹری بنے وغیرہ وغیرہ۔ اجلاس کے بعد لوگ باگ ٹکڑیوں میں بٹ کر گپیں کرنے لگے۔ رائٹرز گلڈ کا وجود زیادہ تر دوستوں کے لئے ایک تفریح تھی۔ اس خوش باش رویے کے لئے انگریزی میں کہا جاتا ہے۔ IT'S A LARK برآمدے کے ایک در میں کمانڈر عسکری (ابن سعید) ابن (میجر ابن الحسن) اور الطاف گوہر کے چھوٹے بھائی تجمل حسین باتیں کر رہے تھے۔ ایک باریش بزرگ جناح کیپ شیروانی بیچارے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اور غور سے ہماری چنڈو خانے کی گفتگو سننے لگے۔ ان کے کچھ پلے نہ پڑا اور چند منٹ بعد آگے چلے گئے۔ میں نے عسکری سے پوچھا یہ کون صاحب تھے۔ عسکری نے کہا۔ جسوس"

تمام ادباء و شعراء کے جانے کے بعد ہال میں صرف ہم لوگوں کا گروہ رہ گیا تو ہم سب نے جمیل الدین عالی کے لئے جو گلڈ کے روح رواں تھے۔ "فور ہی از ھے جولی گڈ فیلو" الاپا اعجاز حسین بٹالوی تجمل حسین' ابن کمانڈر عسکری اور مشرق پاکستان کی روزی (بیگم یوسف جمال محمد حسین) نے مختلف النوع گانے بشمولیت "تو چنی لے سرتی کر لیے گئے۔"

روزی[9] ایک شعلہ جوالہ بنگالی انٹلکچوئل خاتون تھیں امریکہ کی تعلیم یافتہ اور کراچی یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ کٹر پاکستانی نیشنلسٹ تھیں۔

گلڈ کے قیام سے بہرحال ملک کی ادبی زندگی میں دفعتاً بڑی چہل پہل ہو گئی۔ رسالہ "ہم قلم" کا اجراء ہوا۔ کرشن چندر نے بمبئی سے عالی کو خط لکھا کہ ہندوستان میں بھی اسی طرح کا ادارہ ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے قائم ہونا چاہئے۔

چند ماہ بعد' لاہور میں گلڈ کی ایک میٹنگ کے بعد میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے ساتھ ہال سے نکل رہی تھی' جب ایک مشہور ڈرامہ نگار ہماری طرف آئے اور کہا میں نے ایک فلم کی کہانی لکھی ہے۔ کل اس فلم کا پریس شو ہے۔ صبح گیارہ بجے فلاں سینما ہال میں آپ تینوں ضرور تشریف لایئے بطور مہمان خصوصی۔ دوسرے روز صبح پونے گیارہ بجے بھائی جان آپا حمن کی طویل کار میں ہم تینوں سینما ہاؤس پہنچے۔ فلم کے مصنف اور ان کے چند فلمی ساتھیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ بہت آؤ بھگت کے ساتھ اوپر لے

گئے۔ ہم تینوں بڑے وقار سے چلتے اوپر بالکنی میں پہنچے۔ مصنف ہم لوگوں کو وہاں بٹھال کر نیچے چلے گئے ان بے چارے کی لکھی ہوئی کہانی معقول رہی ہوگی مگر اس پر بنی فلم بہت ہی ناگفتہ بہ نکلی۔ شاید محمود غزنوی والا ایاز ہاتھی پر بیٹھا مستقل گا رہا تھا۔ ہیروئن نے باٹا کے سینڈل پہن رکھے تھے۔ وغیرہ وغیرہ ہم لوگوں نے مخلا بالطبع ہو کر اس فلم پر تبادلۂ خیالات شروع کئے اور بے اختیار' بے حد ہنسے۔

اچانک اگلی قطار میں بیٹھی ایک فربہ خاتون نے پلٹ کر ڈانٹا "خاموش رہیئے۔"

میں نے کہا "سوری" اور چپ سادھ لی لیکن فلم اتنی تباہ کن تھی کہ خاموش اور سنجیدہ رہنا ناممکن تھا۔ چند منٹ بعد ان خاتون نے ڈپٹ کر کہا کیوں جی؟ میں نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے یہ پکچر بنائی ہے۔ اور آپ اس کی کھلی اڑا رہی ہیں اس کی بد تعریفی کر رہی ہیں کون ہیں آپ لوگ۔؟

"جی۔۔۔؟ ہم۔۔۔۔؟۔۔۔ ہم۔۔۔۔۔" ہاجرہ نروس ہو گئی۔

"سارا پریس یہاں آیا بیٹھا ہے آپ کی باتیں سن کر اس پر کیا اثر ہو گا؟ کیا ریویو لکھے گا وہ؟ میرے چار لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ میری فلم ڈبونے کے لئے آئی ہیں آپ لوگ؟ کس نے بھیجا ہے آپ کو چلی جائیں یہاں سے"

جی۔۔۔؟ ہاجرہ نے بھونچکی ہو کر پوچھا۔

"ہاں جی۔۔۔۔۔ میں نے کہا آپ لوگ ابھی چلی جائیں باہر فوراً۔"

"شاید یہ ہمیں پہچانی نہیں اندھیرے میں بتا دیں؟" خدیجہ نے چپکے سے کہا۔

"اب تو ہرگز مت بتاؤ" میں نے جواب دیا۔

"آپ لوگ جائیں۔" اس دیوی نے دوبارہ ڈانٹا۔

"بہت اچھا چلے جائیں گے" ہاجرہ نے متانت سے جواب دیا۔ ہم لوگ چوروں کی طرح چپکے سے اٹھ کر پچھلے دروازے سے نکلے۔ باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی بیرونی زینے سے نیچے آ کر تانگہ کیا۔ تانگہ سنیما ہاؤس کے سامنے گزرا میں نے ہاجرہ' خدیجہ سے کہا۔ "بی بیو عبرت پکڑو صرف گھنٹہ بھر قبل ہم لوگ کس شان و شوکت سے اسی دروازے پر آ کر اترے تھے۔ اور کیا ہمارا سواگت ہوا تھا۔ اور اب چوروں کی طرح پچھلے دروازے سے نکالے گئے زندگی میں پل کا بھروسہ نہیں۔"

تانگہ ہاجرہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے کہا "فرض کرو یہ خبر کل پریس میں آ گئی۔ ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' قرۃ العین حیدر بوجہ غنڈہ گردی سنیما ہال سے نکال دی گئیں۔"

"اب کیا کریں۔؟" ہاجرہ نے کہا۔

"ہم لوگوں کو واقعی اتنا نہیں ہنسنا چاہیئے تھا مگر مجبوراً ہنسے اس شریف آدمی کو بھی بڑا افسوس ہو گا برا بھی مانیں گے۔ آخر اسکرپٹ تو ان کا ہی تھا۔ ہم کو اس نکتہ کا خیال ہی نہ رہا۔ مگر وہ لیڈی پروڈیوسر بیحد چڑ قنات نکلی۔" میں نے کہا۔

گھر پہنچتے ہی ہاجرہ نے اپنے میاں احمد علی خان اڈیٹر پاکستان ٹائمز کو فون کیا۔ پھر میں نے احمد علی

خاں سے کہا۔ "اس سے قبل کہ یہ خبر پریس میں پہنچ جائے آپ خود ہی چھاپ دیجئے مناسب الفاظ میں۔"

"آپ پر اس واقعے کا کیا ری ایکشن ہوا ہے۔ احمد علی خان نے پوچھا۔

"ہمیں تو بیحد ہنسی آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"بس یہی ری ایکشن اخبار پڑھنے والوں کا ہو گا۔ انہیں بھی بیحد ہنسی آئے گی میرے خیال میں اس معاملے کو اگنور کیجئے۔

"اچھا اگنور کر دیں گے۔" ہاجرہ نے کہا۔

کراچی واپس آنے کے بعد میں نے سنا کہ پروڈیوسر خاتون نے ہاجرہ کے گھر جا کر بہت معذرت چاہی اور کہا۔ "آئے ہائے۔ بہن مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ لوگ ہیں پہلے کبھی آپ کو دیکھا نہیں تھا میں نے اندھیرے میں جانا کالج کی لڑکیاں رولا پا رہی ہیں۔"

عزیز احمد' مصنف گریز' ترک وطن کر کے لندن جا چکے تھے لاہور سے واپس آ کر جس روز دفتر میں پہنچی لنچ سے ذرا پہلے محکمے کے نئے سربراہ غوث صاحب نے مجھ سے کہا۔ "لاس اینجلز یونیورسٹی میں فلمسازی کی تین سال کی ٹریننگ کی ایک بہت عمدہ اسکالرشپ آئی ہے۔ فلاں صاحب اس کے لئے انتخاب کریں گے۔ آپ کو یہ اسکالرشپ ضرور ملنی چاہیئے۔ فوراً ان سے مل آیئے میں بھی انہیں فون کرتا ہوں۔"

میں فی الفور اپنے کمرے میں گئی انور' قریشی' ناصر شمسی اور مس ٹی کو مطلع کیا۔ "بس اب میں امریکہ جا رہی ہوں خدا حافظ۔" اور اپنی میز پر سے بیگ اٹھا کر سرپٹ باہر بھاگی نزدیک کی ایک پارک میں ان صاحب کا دفتر تھا وہ ایک بزرگ اور نامور ہستی تھے اور ابا جان سے ملاقات رہ چکی تھی۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں صوفے پر بیٹھے لنچ کھا رہے تھے۔ میں نے اندر جا کر بشاشت سے کہا۔ "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام بٹی۔ آؤ بیٹھو۔ بسم اللہ کرو۔" ایک رکابی میرے سامنے رکھی۔ "ابھی تمہارے افسر اعلیٰ کا فون آیا تھا۔ تم کو پاکستان کی دیہاتی زندگی کا کوئی تجربہ ہے۔؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن دیہات میں گھومنے کو اگر تجربہ کہا جا سکتا ہے وہ البتہ کافی ہے۔"

"ہوں۔ وہ کس طرح ڈاٹر۔؟"

"کئی مہینے بنگال اور پنجاب اور سندھ کے گاؤں میں گھوم کر دو تین ڈوکومنٹری فلم بنائے ہیں اور زرعی اصلاحات والی فلم کو برلن کے ڈوکومنٹری فلم فیسٹول میں ابھی ایک انعام بھی ملا ہے۔"

"ہوں۔ لو بٹی مولی کے پراٹھے کھاؤ قیمے کے ساتھ۔ اچھا مگر تمہیں پنجاب کی دیہاتی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"پنجاب کی دیہاتی زندگی کے لئے کسی خاص قسم کا کیمرہ اور تکنیک استعمال کی جاتی ہے؟ معاً لندن کے انٹرویو والے گل محمد خاں کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

کہنے لگے۔ "دراصل ہمیں ایسا شخص چاہیئے جو پنجاب کی زرعی زندگی سے بخوبی واقف ہو۔"

میں نے کہا "جی بہت اچھا۔" مولی کا پراٹھا نوش کر کے چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے دفتر واپس۔ ناصر شمسی' ابو اور مس ٹی لنچ کھا کر پریس کلب سے ابھی نہیں لوٹے تھے۔

اس وقت بقراط وارد ہوئے دریافت فرمایا "آپ بہت برافروختہ معلوم ہو رہی ہیں کیا ہوا؟" گوش گزار کیا۔ بولے۔ "آپ نے یہ کیوں کہا کہ دیہاتی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"جب نہیں ہے تو خواہ مخواہ کہہ دیتی؟"

"لیکن برکلے جا کر سینماٹوگرافی میں ایم اے کرنے کے لئے ہل چلانے کے تجربہ کی شرط میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" بقراط نے پائپ سلگاتے ہوئے ارشاد کیا۔

"چھوڑو جی مٹی پاؤ۔" میں نے اکتا کر کہا۔

"یہاں سفارتخانے کے چند اہم امریکن آپ کے اتنے گہرے دوست ہیں ان سے کیوں نہیں کہتیں کہ آپ کو کوئی بڑھیا اسکالرشپ دلوا دیں۔"

"میں اپنے لئے کسی سے نہیں کہتی کہ میرے لئے یہ کر دو وہ کر دو۔ علاوہ ازیں یہ امریکن میرے ذاتی دوست ہیں میں نے کسی اسکالرشپ کی خاطر ان سے دوستی نہیں گانٹھی آپ بھی کیا کمال کی باتیں کرنے لگے ہیں۔" اب مجھے مزید بجید غصہ آ گیا۔

بقراط پائپ کا دھواں اڑا کر کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا۔ "عرض کرنے آیا تھا کہ میں اور بیگم صاحب اگلے مہینے کینیڈا جا رہے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے۔ اس سب کو تینٹ۔ میں سے انہوں نے دفعتاً کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "برین ڈرین اس طرح ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔" یہ اطلاع دیگر بقراط چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے۔

اعجاز بٹالوی لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ ایک صبح مع نقاد ممتاز حسین' عالی اور کمانڈر عسکری دفتر میں وارد ہوئے۔ اعجاز نے فی البدیہہ کہا۔

"ہم سمجھتے تھے کہ کمبخت وہ سرخا ہو گا
حیف صد حیف کہ ممتاز بھی تلیر نکلا"

ممتاز حسین نے فوراً جواب دیا۔ تھا بٹالے کا اعجاز یہ تلیر نکلا۔

کچھ دیر بعد ماکی قریشی آ گئی۔ اس نے قریب آ کر سرگوشی کے لہجے میں نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سنا ہے کولن ولسن پکا فراڈ ہے۔"

ابن انشاء کا فون آیا۔ "سنا ہے آپ کو ڈوکومنٹری فلمز بنانے کی تعلیم کا اسکالرشپ ملنے والا ہے۔"

"غلط سنا ہے" میں نے جواب دیا "مزید برآں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وظیفے کا تعلق محکمہ زراعت سے ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر لالہ موسیٰ میں ہے میں کیا جا کر لالہ موسیٰ میں رہوں گی۔؟"

کچھ عرصے بعد پنجاب میں زبردست سیلاب آیا۔ لالہ موسیٰ اس کی زد میں آ گیا۔ ابن انشاء نے فوراً ٹیلیفون کیا۔ "اب آپ کو لالہ موسیٰ نہیں جانا پڑے گا۔"

"ہمیں کہیں نہیں جانا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔ "کیونکہ وہ اسکالرشپ ایک اور صاحب کو دیدیا گیا ہے جن کا فلمسازی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حیرت کی بات نہیں اس برصغیر میں یہی سب چلتا ہے۔"

"اسی وجہ سے تو ہم چاند نگر کی باتیں کرتے ہیں۔" انشاء جی نے جواب دیا جو ایک انتہائی بھلے انسان تھے۔

صبح دس بجے اچھو کا جہاز بندرگاہ سے آ کر لگا میں اور نشو اس کے انتظار میں چھتریاں لگا کر پیئر کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد گوگلز پہنے دو اسمارٹ خواتین سیڑھی اترتی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک نے ماتھے پر سرخ بندی لگا رکھی تھی۔

اچھو نے بندی والی ہندوستانی لڑکی سے ملوایا۔ وہ شکاگو یونیورسٹی میں اس کی ہم جماعت رہ چکی تھی اور چند گھنٹے بعد اسی جہاز سے بمبئی جانے والی تھی۔ اس نے ذرا خائف نظروں سے مجھے اور نشو کو دیکھا اس کی بڑھیا ساری' بہترین میک اپ اور ہیر اسٹائل پر ہم نے نظر ڈالی۔ آپا عذرا کے گھر کے راستے میں ہندو لڑکی نے مجھ سے کہا امریکہ میں خالدہ اکثر اپنی COUSINS کا گراموفون بجاتی رہتی تھیں۔ وہ سب ایسی ہیں ویسی ہیں بالکل عجوبہ روزگار ہستیاں۔ اور اب جوں جوں جہاز کراچی کے نزدیک پہنچ رہا تھا یہ مجھے اور زیادہ نروس کر رہی تھیں کہ میری کزنز بڑی زبردست اسنوب ہیں۔ اور تازہ ترین فیشن اور اسٹائل میں حرف آخر۔ اپنی بہترین حالت میں ان سے ملنا۔ ورنہ وہ تم سے بات بھی نہیں کریں گی۔ لہٰذا صبح سے میں جہاز کے بیوٹی پارلر میں گھسی ہوئی تھی مگر تم لوگ تو بالکل اسنوب نہیں ہو۔"

گڈ اولڈ اچھو' چنڈو خانے کی ایک مینیجر بخیر و خوبی گھر لوٹ آئی تھی۔ امریکہ اس کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکا

آپا عذرا کے ہاں لنچ کے بعد نشو نے گھڑی دیکھی اور ماکی قریشی کو فون کیا جو ہمارے ساتھ کوٹ ڈیجی جا رہی تھی۔ ماکی سر مورٹی مر ویلر کے ساتھ بھی کھدائی کر چکی تھی۔

"میری کزنز زبردست آرکیالوجسٹ بھی ہیں۔" اچھو نے ہندوستانی لڑکی کو رعب سے مطلع کیا۔ ہم لوگوں نے اس بے چاری کو جو اب خاصی BEWILDERED لگ رہی تھی خدا حافظ کہا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مجھے آرکیالوجی میں دلچسپی ہے۔ اور کوئی بات نہیں۔ نشو جرنلسٹ ہیں۔ اور ہم دونوں کو کوٹ ڈیجی بلایا گیا ہے۔ باہر آ کر نشو نے کار اسٹارٹ کی اور ماکی کو اس کے گھر سے لیتے ہوئے بیرون شہر کا رخ کیا۔

حیدر آباد کے راستے میں ایک میدان میں کیمپ لگا تھا۔ تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک خیمے میں اطالوی باستان شناس سرد بیئر پینے میں مصروف تھے۔ موئن جوڈارو سے قبل کی پونے چھ ہزار سال پرانی "کوٹ ڈیجی کلچر" کی کھدائی جاری تھی۔ چند ڈھانچے ایک خیمے میں رکھے تھے اور ایک ہانڈی میں مہریں۔

"سمیر اور عروق سے جو جہاز ادھر آتے تھے شاید اس کے مسافر ساحل پر اتر کر سیدھے اس طرف آتے ہوں گے۔" ایک اطالوی نے ایک سکے کی مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

کیا پتہ یہ سکے ان جوان بشاش لڑکیوں کے ہوں جو ایک روشن صبح عروق سے جہاز پر یہاں پہنچیں۔

یا بنت الجبل۔ یا بنت الجبل۔

کراچی میں گارڈن روڈ پر جو گاندھی گارڈن کی طرف جاتی تھی۔ (جس کا نام تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔) ایک وسیع قطعہ زمین پر کچھ عرصہ قبل کئی درجن دو منزلہ مکانات مرکزی حکومت کے افسروں کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ ستمبر ۵۹ء میں وہاں ایک گراؤنڈ فلور فلیٹ میں انٹیلیجنس اسکول سے ہم لوگ منتقل ہوئے۔ اسکواڈرن لیڈر' ڈاکٹر نور افشاں امام 'کنٹری ہاؤس ماری پور سے ٹرانسفر ہو کر کراچی کے دوسرے ایئر فورس اسٹیشن پر چلی گئیں۔ جو کورنگی کریک نامی دور افتادہ ساحل پر واقع تھا۔ ان کے کورنگی جانے کے بعد پھوپھی اپی کی بڑی لڑکی فلائیٹ لیفٹننٹ ڈاکٹر فہمیدہ زیدی راولپنڈی سے تبدیل ہو کر ماری پور اسی مکان میں آ گئی۔ یہ وہی فہمیدہ تھی جو بیکٹ ہاؤس الموڑہ کی نرسری میں لمبا سفید فراک پہنے اچھو کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ کنبے کی تیسری فوجی افسر خاتون آپا سلطانہ آرمی میڈیکل کور میں میجر اور لاہور چھاؤنی میں تعینات تھیں۔

خاندان کے تمام سویلین اور فوجی افراد اب عالیشان اور خوبصورت کوٹھیاں بنوانے میں مصروف تھے یا کب کی بنوا چکے تھے۔ میرا نظریہ اس سلسلے میں حسب معمول AMBIVALENCE بے نیازی اور بے پروائی پر مبنی تھا۔ مکان بنوانے کی کیا ضرورت ہے۔ فسوں خیز آشیانے کا کیا ہوا۔ یا "میر قائم علی" اور "نذر باجی" کی مراد آباد اور گورداسپور والی شاندار کوٹھیاں کہاں گئیں۔

"۴۷ء ایک عظیم تاریخی سانحہ تھا جو لاکھوں کو پیش آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہمیشہ کے لئے بے گھر ہو جائے۔" رشتے داروں نے سمجھایا۔

لیکن مولانا آزاد کی بات سے بہت قبل ذہن میں ایک دھندلا سا خیال موجود تھا۔ بس بہت جلد کہیں اور۔ ہندوستان۔ انگلستان۔ فرانس۔ کہیں بھی۔ لیکن اماں کی مسلسل علالت کی وجہ سے ایسا کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور چاروں طرف مکان بن رہے تھے۔

اماں کے ایک نوجوان مراد آبادی عزیز سید آل حیدر عرف بنو میاں محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ پہلے عاصم کے ہاں' آپا راضیہ کے ناظم آباد والے مکان میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد لڈن ماموں مرحوم کی کوٹھی نظام آباد کے ایک حصے میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہ بھی اپنی کوٹھی بنوا رہے تھے۔ ایک روز بنو نے مجھ سے کہا۔ "زمینوں کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور پی اینڈ ٹی کولونی میں سرکاری افسروں کو پانچ پانچ سو گز کے پلاٹ دیئے جا رہے ہیں۔ بہت جلد وہ ایریا شہر کے سب سے زیادہ مہنگے رہائشی علاقوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہاں زمین سونے کے بھاؤ ملے گی۔ تم تو یہ سب کرو گی نہیں میں نے تمہاری طرف سے زمین لے کر فارم بھر دیا ہے بس صرف دستخط کر کے پہلی قسط ادا کر دو۔"

میں نے اکتا کر کہا۔ "کاغذ لائیے۔" دستخط کئے اور روپے کی قسط داخل کروا دی۔ بعد ازاں نمبر ۲۱ ڈی گارڈن روڈ شفٹ ہونے کے ایک ہفتے کے اندر اندر بے چارے آل حیدر نے اپنے محکمے کے کارکن بھیج کر ٹیلی فون لگوا دیا۔ جو اماں کے کمرے میں ان کے پلنگ کے سرہانے رکھا گیا۔

نہایت خوبصورت اور کشادہ فلیٹ تھا۔ اماں کے سرہانے طویل دریچے کے باہر پچھواڑے کے

وسیع قطعہ زمین پر شریفے اور آم کے درخت استادہ تھے۔ جن پر صبح صبح بے شمار چڑیاں چہچہاتی تھیں۔ اماں صبح اٹھ کر چائے پینے کے بعد سب سے پہلے اپنی بہو کو فون کرتیں اور ان سے ملازموں کے مسئلے اور سوشل اور خاندانی گوسپ پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ "دلہن۔ ہاں۔ جیتی رہو۔ گوشت والا آ گیا۔؟ قیمہ مت لینا۔ کل یہاں بھی قیمہ خراب آیا تھا۔ اچھا سنو۔ خیردین کو نکال باہر کرو۔ کارے نہ مسئلے دن بھر اوائی توائی پھرتا ہے۔ ہاں ہاں میں ان کے کوتک بھی دیکھ چکی ہوں۔ اچھا۔؟ ہاں۔ وہ صاحبزادی؟ جی ہاں معلوم ہے۔ کہہ رہی تھیں صبح سے دھاڑے ٹوٹتے رہے۔ پھر بڑی بھاوج کے ہاں دھنا دیکر بیٹھ رہیں ساس سے جھوڑ ہو گئی۔ صاحبزادے کہیں الگ بھوبل جوت رہے ہیں۔ شام کو یہاں آئیں چھدا اتارنے' نئی نائن بانسی کا ننھا۔ خیر۔ وہ۔ ہاں بچہ [10] کیا کر رہا ہے؟ بچے اسکول گئے۔؟ ہاں درزی میرے دو خلتے [11] سی کر دے گیا ہے اسی کو تمہارے ہاں بھیج دوں گی۔ اچھا ذرا بچے کو بلاؤ فون پر۔"

بھابی اور بھائی سے مفصل تبادلہ خیالات کے بعد خانساماں کو بلا کر کھانے کے متعلق احکامات دیتیں۔ دوسرے رشتے داروں اور دوستوں کے فون آتے اور ان سے طویل گفتگو رہتی۔ گیارہ بجے مالی آ جاتا اور اسے باغیچے کے پودوں کے متعلق ہدایات دیتیں۔

"شمش الدین" مالی ضلع اعظم گڈھ کے مہاجر تھے۔ غازی پور کے "سردار عبدل" اور چپراسی جمنا پانڈے مہاراج کے ہمشکل انہی اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ پھلواری میں کام ختم کرنے کے بعد' وہ سر پر سے انگوچھے کی مختصر پگڑی اتار کر' برآمدے کے چمکیلے زرد ٹائلوں والے فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور احمد شاہ خانساماں کو قصص الانبیاء سے فیضیاب کرتے۔ "پھرعون کی بی بی ان سے کہن۔ اے کا پاگل ہوئے ہو موسیٰ کا ہم پالے ہیں۔ ان کا ٹیڑھی آنکھ سے دیکھیو اللہ تالا کا قہر ٹوٹیہے۔ پھر حجرت موسیٰ جو رہن او بیچ سمندر کے اپنا عصا پھینک دیہن کٹاک دینی سے۔"

سرمئی ملیشیا کی شلوار قمیض میں ملبوس سرخ و سپید سرحدی احمد شاہ سر ہلا ہلا کر عقیدت سے قصہ سنتے جاتے اور سبزی کاٹنے میں مصروف رہتے۔ مغربی ماہرین عمرانیات کے لئے یہ منظر ایک لمحہ فکریہ مہیا کر سکتا تھا کہ ساڑھے تین ہزار سالہ قدیم عبرانی اسلامی حکایات کو انڈک سوسائٹی کا ایک ان پڑھ انسان مغربی ایشیائی کلچر پیٹرن سے منسلک' صوبہ سرحد کے ایک ان پڑھ انسان' کو سناتا تھا اور دونوں ان قصوں اور ان کی تلمیحات سے واقف تھے۔

کیا یہ بڑے خوش نصیب لوگ تھے کہ ایمان کامل رکھتے تھے اور کیا یہ ایمان غریبوں کی افیم تھا۔ اس سوال پر اس برصغیر کے دانشور عرصے سے گرما گرم بحثیں کر رہے تھے۔ اور کلچر کے مسائل اور انسانیت کا مستقبل۔

"سوشلسٹ ہیومنزم۔" ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہنا شروع کیا۔

"کمیونزم سے تو ہم واقف ہیں ملک یہ سوشلسٹ ہیونزم کیا چیز ہے۔ بنے بھائی نے نرمی سے کہا۔ دوسرے گوشے میں انور جمال قدوائی اور ڈاکٹر حسین ظہیر مصروف گفتگو تھے۔ کرشن چندر اور سلمٰی صدیقی

حبیب تنویر اور بلونت' گارگی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہی لاہور اور کراچی کے عاقلوں کی محفل جیسی ایک اور محفل میزبان پرکاش نیر سیاہ چشمہ لگائے پر اسرار سا' ایک کونے میں بیٹھا سب کو دیکھ رہا تھا۔ اور میں پرکاش نیر سمیت ان سب کو دیکھ رہی تھی۔

۳۱ دسمبر ۵۹ء کی شام اشوکا ہوٹل نئی دہلی میں پرکاش نیر کے سوئیٹ کے سٹنگ روم میں ملک سے لندن کے بعد آج ملاقات ہوئی۔ بنے بھائی پاکستان سے واپس آ چکے تھے۔ اور آصف علی روڈ پر کیمونسٹ پارٹی کے کیمون میں رہتے تھے۔ جمال قدوائی مغربی جرمنی سے واپس آئے تھے جہاں ان کا لندن کے بعد تبادلہ ہوا تھا۔ پرکاش نیر ان سب کو اکثر جمع کرتا رہتا تھا۔ اور بے انتہا خاطر مدارات کرتا تھا۔ وہ ایک پراسرار شخص تھا جو لوہے کا کاروبار کرتا تھا۔ اور اشوکا اور بمبئی کے تاج میں اپنے سوئیٹ مستقل ریزرو رکھتا تھا اور بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتا تھا۔ پھر اس کے کاروبار میں گھاٹا ہوتا تو اچانک منظر سے غائب ہو جاتا تھا اور اطلاع ملتی کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کلکتے میں فاقے کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ بعد پھر کوئی لمبا ہاتھ مارتا اور اشوکا میں نمودار ہو جاتا۔ اردو پرست تھا۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کی دعوتیں کرتا اور ان کو بڑھیا شرابیں پلانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت۔ وہ خود ان محفلوں میں ایک گوشے میں سیاہ چشمہ لگائے چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔

میں دفتر کی ایک ماہ کی چھٹیوں میں شگفتا اور جمال کے ہاں دلی آئی ہوئی تھی۔ تیسرے پہر کو ہم لوگ دھوپ میں بیٹھتے تھے۔ مردولا سارا بھائی اور سبھدرا جوشی' انیس باجی کشور اور شگفتا سے ملنے چانکیہ پوری آ جاتی تھیں جو مردولا سارا بھائی ہمارے ساتھ دسمبر ۴۷ء میں سرکاری ڈیکوٹا پر لاہور گئی تھیں۔ جمال کی بڑی بہن بیگم انیس قدوائی ممبر راجیہ سبھا ونڈسر پلیس پر رہتی تھیں۔

"ورلڈ ایگری کلچرل فیر میں۔" شگفتا نے ایک روز کہا۔ "انڈمان کا پویلین بالکل اسی اسٹائل کا بنا ہے۔ جیسا ہمارا بنگلہ تھا۔ اس کے اندر ہمارے بنگلے کی تصویر بھی موجود ہے۔ اس میں اب کوئی سرکاری دفتر یا کالج انڈسریز کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ بہت نوسٹلجیا ہوا۔ تم بھی دیکھ آؤ۔"

زرعی نمائش کے میدان میں انڈمان و نکوبار کا پویلین جنوبی ایشیائی وضع کا چوبی بنگلہ کھمبوں پر استادہ تھا۔ اندر دوسری تصاویر کے ساتھ "بڑا بنگلہ" کی تصویر بھی آویزاں تھی۔ کیونکہ آزادی کے بعد اسے ایک دفتر میں منتقل کر دیا گیا تھا اور اس دفتر سے متعلقہ مصنوعات اس پویلین میں موجود تھیں۔ اس "بڑے بنگلے" میں ۱۹۳۰ء میں ہردوئی سے آ کر ابا جان نے بحیثیت اسسٹنٹ ریونیو کمشنر جزائر انڈمان و نکوبار' شگفتا کے والد سردار بلونت سنگھ جسپال سے چارج لیا تھا جو ابا جان کی جگہ ہردوئی چلے گئے تھے۔ یا بنت الجبل!

علی گڑھ میں جرار بھائی (جن کو میں پیشہ قانون کا ونوبا بھاوے کہتی تھی۔) اور آپا زہرا کی بچی ہما عرف بچن کتھک سیکھنے میں مصروف تھی۔ آپا زہرا کے والد چچا نصیر مرحوم کی کوٹھی خیابان' ابا جان کے آشیانہ دہرہ دون کی طرح متروکہ جائیداد قرار پا چکی تھی۔ اور آشیانہ کی طرح اس میں بھی پنجابی شرنارتھی بس گئے تھے۔ "ان دونوں بھائیوں نے کتنے ارمانوں سے یہ کوٹھیاں بنوائی تھیں اور ان میں کتنا کم رہنا نصیب ہوا۔"

آپا زہرا نے کہا۔ "میں پچھلے سال مسوری جاتے ہوئے آشیانہ دیکھنے گئی تھی خوب روئی۔

"اردو شاعری کی باغ سے متعلق ساری تلمیحات ہی منحوس ہیں۔---------- آشیانہ بجلیوں کی زد میں رہتا ہے۔ خیاباں پر خزاں چھا جاتی ہے لوگ باگ حباب لب جو کی طرح سیر چمن دیکھتے ہیں"

رشید احمد صدیقی کے ہاں ڈاکٹر ذاکر حسین تشریف لائے ہوئے تھے جو ان دنوں شاید بہار کے گورنر تھے۔ سلمیٰ بھی ان دنوں علی گڑھ میں تھیں۔

عبداللہ لاج کے برآمدے میں ضعیف العمر' شیخ محمد عبداللہ علیل اور ناتوان دھوپ میں لیٹے ہوئے تھے۔ سماعت میں فرق آ گیا ان کی طویل اور درخشندہ زندگی کا یہ آخری دور تھا۔ انہوں نے بہت سی کتابیں سرہانے سے اٹھا کر مجھے عنایت کیں۔ میں نے ذرا ہچکچا کر ممتاز آپا کو دیکھا۔ ممتاز آپا نے ملائمت سے ان کو سمجھا۔ پاپا یہ ہوائی جہاز سے اتنا وزن نہیں لے جا سکتیں۔ شیخ صاحب ذرا مایوس نظر آئے۔ مجھے بے حد دکھ ہوا۔ پھر انہوں نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے دو اور کتابیں اٹھائیں جو ان کی تصانیف تھیں۔ "سوانح عمری عبداللہ بیگم" اور "خاتم الانبیاء" کتابیں مجھے تھما کر کہا۔ "اپنی اماں کو دیدینا۔"

جناب بیگم صاحبہ۔ تسلیم

اس ایک ماہ کے عرصے میں ہم کو خاتون کے دو تین پرچے تیار کرنے ہیں کیونکہ ہمارا مقصد ہے کہ خاتون اب وقت پر نکلا کرے۔ اس لئے آپ کے پاس لکھتے ہیں کہ آپ کوئی عمدہ اور بڑا مضمون بھیج کر اس کام میں ہماری امداد فرمائیں۔ آپ کی آنکھوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تکلیف نازیبا ہے لیکن مجھے امید ہے تکلیف دہی کو آپ معاف فرمائیں گی۔

مورخہ ۲ مئی ۱۹۰۷ء — فقط نیاز مند

بخدمت بنت نذر الباقر صاحب — شیخ محمد عبداللہ

نوشہرہ چھاؤنی — ایڈیٹر خاتون علی گڑھ[12]

"اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین' پروفیسر علی گڑھ کالج' جسٹس سید امیر علی اور بدر الدین طیب جی اور نوجوانوں میں سید سجاد حیدر اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ تعلیم نسواں کا کوئی حامی نہ تھا۔ ۱۹۰۴ء ہی میں میں نے ارادہ کیا کہ تحریک تعلیم نسواں میں جان ڈالنے کے لئے ایک رسالہ جاری کرنا چاہئے۔ سید سجاد حیدر' سید ابو محمد احتشام الحق اور انعام الحق نے مجھ سے اتفاق کیا۔ رسالے کا نام غالباً سید سجاد حیدر یا خان بہادر سید ابو محمد نے تجویز کیا کہ خاتون ہونا چاہئے۔ خاتون کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔[13]

علی گڑھ کے ایک محلے میں شیخ عبداللہ اور عبداللہ بیگم نے بہزار دقت ایک زنانہ مدرسہ ۱۹۰۶ء میں قائم کیا۔

جس وقت میں ممتاز آپ کے ساتھ عبداللہ لاج سے باہر آئی سامنے میرس روڈ پر بے پردہ سائیکل سوار مسلمان لڑکیوں کا ایک غول بے حد ترقی یافتہ اور بے حد وسیع مسلم گرلز کالج کی طرف رواں تھا۔

۳۔ بوڑھی گنگا

جنوری ۱۹۶۰ء کی ایک تاریک رات۔ نیچے دریا ہندوستان کی سرزمین پر اپنے ابدی سفر میں مصروف۔ پینتیس ۳۵ ہزار فیٹ کی بلندی پر فضا میں اڑتا پی۔ آئی۔ اے کا چارٹرڈ سوپر کونسٹیلیشن ڈھاکہ کی سمت پرواز کر رہا ہے۔ اس روشن طیارے کے اندر جمیل جالبی مستقل اپنے معاصرین کی پان کی گلوریوں سے تواضع کرنے میں مصروف ہیں۔ عالی کی قیادت اور بندوبست میں کراچی کے اہل قلم رائٹرز گلڈ کی پہلی سالگرہ منانے مشرقی پاکستان جا رہے ہیں۔

گنگا میا' کیلاش پربت پر بیٹھے شیوجی کی جٹاؤں یعنی گلیشیروں سے نکلتی ہیں۔ یو۔ پی اور بہار کا لمبا سفر طے کر کے جب مشرقی بنگال میں داخل ہوتی ہیں اور نرائن گنج تک پہنچتی ہیں تو گویا ضعیف ہو چکی ہیں۔ اس لئے اہل مشرقی بنگال ان کو بوڑھی گنگا کہتے ہیں۔ اس صوبے میں انکا دوسرا زیادہ شاعرانہ نام پدما ہے۔

بوڑھی گنگا کے افسانوی کنارے پر' بھٹیالی گانے والے مانجھی' جو دستاویزی فلموں میں پیش کرتے کرتے اب برس گزر گئے۔ اور دیکھتے دیکھتے کنارے پر سے عمر رسیدہ تاریخی ڈھاکہ کی کایا کلپ ہو گئی جدید شاپنگ سنٹر۔ اسپورٹس اسٹیڈیم۔ کنکریٹ کی بلند و بالا عمارات' فیشن ایبل ریستوران' نئی وضع کی کوٹھیاں 'شاہ باغ[14] ہوٹل' غیر ملکیوں سے پر تھا۔ آم کے درختوں سے گھرے سرخ رنگ کے دو منزلہ پریس کلب[15] کے احاطے میں نیا ریستوران بن چکا تھا) اس میں بی بی سی کی پاکستانی بنگلہ سروس والا مغنی عطاء الرحمٰن اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا چہک رہا تھا۔ آرٹ اسکول کی نئی الٹرا ماڈرن عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔ ایک روز میں ہاجرہ' خدیجہ اور جمیلہ ہاشمی کو زین العابدین سے ملوانے لے گئی۔ وہ ہمیشہ کی سی سادگی اور منکسر المزاجی کے ساتھ اپنے دفتر کے جہازی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مختلف اسٹوڈیوز میں ہندو اور مسلمان بنگالی لڑکے اور لڑکیاں خاموشی سے تصویریں بنانے میں منہمک تھے۔ ہم لوگ ایک برآمدے کے دریچے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ نیچے سبزے پر گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ انتہائی پر سکون نظارہ تھا۔

ہاجرہ نے کہا "مصوروں کے لئے آسانی ہے۔ جو تصویر بنا دی۔ دیکھنے والے کو نظر آ گئی۔ الفاظ بہت گڑبڑ کرتے ہیں۔"

میں کھنکاری۔ "ادیب کا قاری سے رشتہ وغیرہ۔ لندن میں ایک بار اعجاز نے مجھ سے کہا تھا یہ جو تم اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ چار سو بیس کرتی ہو۔ میرے خیال میں یہ وہی چار سو بیس کا رشتہ ہوتا ہے۔

عجیب بات ہے تمہاری تحریروں کو کچھ لوگ بیحد پسند کرتے ہیں۔ کچھ بیحد ناپسند۔"

"مجھے ہمیشہ غلط سمجھا گیا۔" میں نے ایک آہ سرد کھینچی۔ ایک گائے گھاس چرتی چرتی ڈھاکہ کلب کی طرف بڑھ گئی۔ "میں سمجھتی ہوں ہاجرہ بی بی کہ میرے کمیونی کیشن سسٹم میں ضروری کوئی نقص ہے۔"

جمیلہ نے کہنا شروع کیا "سارت نے کہا ہے۔"

"ہاں۔ سارت نے ضرور کچھ کہا ہے۔ اب سنو۔ مثال کے طور پر کل ایک صاحب سے جو لاہور سے آئے ہیں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ خاکسار کو ایک نہایت مغربیت زدہ خاتون سمجھتے ہیں۔ تو میں نے سوچا ادب میں الوژن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے سامنے میں نے جاوید سے کہا آج سیٹرڈے نائٹ ہے چلو کلب چل کر ڈانس کریں گے۔ یاد ہے ہم لوگ پیرس میں رات رات بھر ناچا کرتے تھے۔" اس پر جاوید نے کیولیکر فوراً رکھائی سے جواب دیا۔ "وہ تو جب آپ کو مونٹی کارلو کی میزوں سے فرصت ملتی تھی جبھی۔"

"بس بی بی یہ تمہاری بیوقوفی ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "ان صاحب نے یہ نہ جانا ہوگا کہ ان کی لیگ پلنگ کی جاری ہے یہیں کمیونی کیشن کا مسئلہ آ جاتا ہے۔"

"جو نا آ جاتا ہے۔ لوگوں میں شئے لطیف اور سنس آف ہیومر دونوں کی کمی ہے اور کوئی بات نہیں۔"

گائیں گھاس چر کر درختوں میں غائب ہو گئیں۔

جمیلہ ہاشمی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' جاوید اقبال اور اعجاز حسین بٹالوی پنجاب اور صوبہ سرحد کے دوسرے ادباء اور شعراء کے ساتھ ایک اور چارٹرڈ سوپر کونسٹیلیشن میں لاہور سے آئے تھے۔ شہاب صاحب صدر مملکت ایوب خاں کے ہمراہ کراچی سے ڈھاکہ پہنچے۔ شہر میں مقامی اردو داں طبقہ کا اجتماع کثیر تھا۔ (صرف چٹاگانگ میں تین سو اردو شعرا موجود تھے۔!) آٹوگراف لینے کے لئے کالجوں کے لڑکوں' لڑکیوں کی بھیڑ مندوبین کے پیچھے پیچھے چلتی۔ اعجاز بٹالوی نے آٹوگراف دیتے دیتے تھک کر آخر میں لکھنا شروع کیا۔ "ہمیشہ نماز پڑھا کرو۔" "جھوٹ بولنا گناہ ہے۔" "والدین کی اطاعت کرو۔" "پاکستان زندہ باد۔"

بنگالی ادیبوں اور شاعروں میں وہ بہت سارے لوگ ملتے جن کے لئے دس سال بعد اخباروں میں پڑھا کہ مارے گئے کوی جسیم الدین ایک نہایت سوئیٹ ٹپکل بنگالی تھے۔ گلڈ کے جلسوں میں ہمیشہ بنگالی جوش کے ساتھ بحث مباحثے کرتے۔ اپنی بنگلہ نظم سنانے کے بعد فوراً کہتے ٹرانسلیشن' اور اپنی بنگالی لہجے کی انگریزی میں فوراً اس کا ترجمہ سناتے۔

کومیلا چھاؤنی میں میس کے ڈنر کے دوران ایک پنجابی بریگیڈیئر کی بیگم نے مجھ سے اور جمیلہ ہاشمی سے دریافت کیا آپ بھی رائیٹر ہیں۔؟

"جی ہاں ایسے ہی کچھ لکھ دکھ لیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔

"لیکن میں نے تو شمع اور بیسویں صدی میں آپ کے نام کبھی نہیں دیکھے۔"

اس مکالمے سے واضح ہوا کہ ہندوستان کے یہ دو عوامی رسالے پاکستان کے "غیر انٹلکچوئیل" طبقے میں کس قدر مقبول تھے۔

جمیل جالبی جو (ایک انتہائی ثقہ اور نفیس انسان تھے) نزدیک کھڑے تھے۔ فوراً پان کی ڈبیا نکال کر

نہایت بشاشت سے ایک گلوری بیگم صاحب کو پیش کی۔ چند منٹ بعد وہ دوسری طرف متوجہ ہوئیں۔ جمیل جالبی کھلے جا رہے تھے ارشاد کیا" پچھلے چند روز سے ہم سب کی ہر جگہ اس قدر دھوم دھام رہی ہماری انا کا اچانک اس طرح DEFLATE ہونا بیحد المناک ہے۔"

"شکر کیجئے کچھ تو پڑھتی ہیں میں نے ان حکام بالا کے ایسے گھر دیکھے ہیں جہاں ایک کتاب یا رسالہ بقول اماں دوا میں ڈالنے کو نہیں ملتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مزید برآں شمع اور بیسویں صدی میں نہ لکھنا بھی تو ایک قسم کی SNOBBERY ہے۔"

کومیلا میں رات کے وقت دور سے سریلے گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "یہ ضلع۔" ایک پنجابی فوجی افسر نے کہا۔ "تنترک اسرار اور جادو ٹونے کا قدیم مرکز ہے ہمارے جوان اکثر کہتے ہیں آدھی رات کے بعد انکو ایک خوبصورت لڑکی سرخ مٹی کے اکیلے راستوں پر چلتی نظر آتی ہے۔ جو چند قدم آگے جا کر سیاہ بکری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔" پانچ میل دور مینامتی کی نیچی نیچی پہاڑیوں پر بنے قدیم بدھسٹ راجاؤں کے محلوں اور ستوپوں پر پونم کی چاندنی برستی تھی۔ مینامی۔ پراچین بنگال کے اسرار کی ایک اور یادگار مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ادیبوں کے لئے مشرقی بنگال ایک انوکھی دنیا تھی۔

کرنا فلی کے کنارے چٹاگانگ کی ایک ہری بھری پہاڑی پر واقع برہمو آشرم کے مینجر سے میں نے اور جمیلہ ہاشمی نے بھجن سننے کی فرمائش کی۔

مینجر صاحب بیحد خوش لپک کر اس کا انتظام کروانے آگے بڑھ گئے۔

"بڑی غلط بات ہے۔" جاوید اقبال نے کہا "اگر انڈیا میں ہندو سیاحوں کی ٹولی کسی مسجد میں جا کر پیش امام سے فرمائش کرے مسلمانوں سے نماز پڑھ کر دکھلاؤ تو ان کو کیسا لگے گا۔؟"

"یہ انالوجی۔" میں نے کہا۔ صحیح نہیں۔"

"بالکل صحیح ہے۔ جاوید نے جواب دیا۔ ہم سب مینجر صاحب کے پیچھے پیچھے ایک پگوڈا نما مندر کی سمت جا رہے تھے۔

یہ برہمو عبادت خانہ ایک گول بارہ دری نما کمرے پر مشتمل تھا۔ جس کے وسط میں اوم کا آہنی نشان نصب تھا۔ کمرے کے چاروں طرف برآمدہ۔ آشرم کالج کی چند لڑکیاں کمرے میں گئیں۔

"برہمو لوگ موحدین ہیں۔" میں نے اسلامی ادب کے ایک علمبردار سے کہا "اگر آپ یہاں دور سے کھڑے ہو کر ان کا بھجن سن لیں تو زیادہ گناہ نہ ہوگا۔"

لڑکیوں نے ہارمونیم پر ایک بنگلہ بھجن شروع کیا۔ تمام حضرات برآمدے کے نیچے سبزے پر جمع باتوں میں مشغول ہو گئے میں اور جمیلہ بی بی برآمدے کے در میں بیٹھ کر بھجن سننے لگے۔ صرف گجراتی ادیب اور صحافی فخر ماتری (اب مرحوم) برآمدے میں آ گئے۔ بھجن دھیان سے سنتے ہوئے انہوں نے اچانک پر مسرت لہجے میں مجھ سے کہا" میرا بائی" اور اس لمحے وشنیو گجرات کے پڑوسی راجستھان کی میرا نے فخر ماتری سے اپنے کسی بھجن کے بنگلہ ورژن کے ذریعے کمیونی کیٹ کیا۔ جب میں اور جمیلہ بھجن سننے کے بعد برآمدے

سے اترے غالباً ناصر کاظمی نے غالباً انتظار حسین سے کہا۔ ہماری خواتین ہندو ہو جائیں گی۔ بدھسٹ ہو جائیں گی۔ عیسائی ہو جائیں گی مسلمان کبھی نہ ہوں گی۔"

آشرم کی پہاڑی سے نیچے آتے ہوئے جاوید اقبال نے پھر دہرایا۔ بہت غلط بات تھی سیاحوں کی طرح آکر اقلیتی فرقے کے افراد سے فرمائش کرنا کہ اپنی مذہبی رسوم دکھاؤ۔"

کاکس بازار کے ریسٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں ایک صبح موصوف دو نامور ترقی پسندوں کے درمیان صوفے پر بیٹھے تھے۔ فرمایا۔ "مار کسٹوں کے بیچ میں اسلام سینڈوچ ہو گیا۔!"

کاکس بازار میں سمندر کے کنارے انتہائی پکچریسک کاٹجوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ اپنی رنگین چوبی چھتوں اور چوبی حسن کاری کی وجہ سے کسی شمالی روسی فینٹسی کے گھر معلوم ہوتے تھے۔ ان کاٹجوں میں برقی روشنی نہیں تھی۔ اور رات کو لالٹین جلتی تھی اور گھپ اندھیری سیال رات میں سامنے سمندر گرجتا تھا اور تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ یہ ساحلی کاٹیج مجھے کسی شمالی روسی پرستانی کہانی کے گھروندے معلوم ہوئے۔ جمیلہ' ہاجرہ' خدیجہ' تجمل حسین' شاہد احمد دہلوی' جمیل جالبی' جاوید اقبال' ابن انشاء' عالی وغیرہ وغیرہ کو اپنے اپنے انفرادی تصورات میں کچھ اور معلوم ہوئے ہونگے کیوں کہ ہر انسان کی ذاتی کائنات جداگانہ ہے۔

استوائی جنگل میں پوشیدہ ایک بدھ دیہار کے آنگن میں نوجوان بھکشو صبح کے وقت بنچوں پر بیٹھے بڑی اخبارات کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ وہ لوگ ہم لوگوں کی مجموعی ذہنی کائنات سے ایک بالکل مختلف دنیا میں موجود تھے۔ جو ان کے لئے اتنی ہی VALID اور منطقی تھی۔

جس شام ہم لوگ چٹاگانگ واپس جا رہے تھے۔ لوگ باگ کاکس بازار کے اس شور عالم ساحل پر ٹہلنے کے بعد چند قدم دور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ "چلو ہم لوگ ریت پر اپنے اپنے نام لکھتے جائیں۔" کسی نے کہا۔ میں اور جاوید بہت بڑے بڑے حروف میں گیلی ریت پر نام لکھنے میں مصروف تھے۔ جب کسی نے آواز دی جلدی چلیۓ۔ ہم لوگ تیزی سے بھاگتے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ جہاں پی۔ آئی۔ اے کا چارٹرڈ ڈیکوٹا منتظر کھڑا تھا۔ خدیجہ حسب عادت زیر لب کوئی آیت پڑھتی ائر کرافٹ کی سیڑھی چڑھیں ڈیکوٹا زمین سے بلند ہوا۔ اور ساحل پر سے اڑتے ہوئے اوپر اٹھا نیچے گیلی ریت پر لکھے ہوئے نام صاف دکھلائی دے رہے تھے۔ طیارہ سرخ سورج کے سامنے سے گزرتا ایک چمکیلے سرمئی پرند کی مانند چٹاگانگ کی طرف پرواز کرنے لگا۔ پائلٹ نے مجھے اور خدیجہ کو خلیج بنگال کا نظارہ کرنے کے لئے کاک پٹ میں بلایا۔

ریت پر لکھے نام ہوا نے بہت جلد مٹا دیئے ہونگے۔ یا پانی کی موجیں انہیں کھا گئیں ہونگی۔ دس سال بعد ہزارہا زندگیاں اسی آسانی سے اس خطے میں ساحل ہستی سے غائب ہونے والی تھیں۔ اور وقت کی ریت مسلسل اڑتی رہتی ہے۔ نودیرائے اے کل بھانگے۔ اوکل گوڑے۔ ائی تو نودیر کھیلا۔ ندی کا یہ کنارا ٹوٹتا ہے۔ وہ کنارا بنتا ہے۔ یہی تو ندی کا کھیل ہے۔!

چٹاگانگ پہنچ کر ایک ٹولی نے آبی راستوں سے سندر بن کا رخ کیا آدھی رات کو جمیلہ بی بی سلہٹ جانے والی ٹرین پر سوار ہوئیں۔ چند منٹ بعد دوسری ٹرین پکڑ کر میں تنہا ڈھاکہ روانہ ہوئی۔

صبح سویرے جب آنکھ کھلی کوپے کٹا ہوا ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔ ہلکا ہلکا مینہ برس رہا تھا۔ اور پڑیاں اس چمکیلے پانی میں جھلملاتی تھیں۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ تب میں نے ایک بہاری قلی کو جو پڑیاں پھلانگتا ایک طرف کو لپکا جا رہا تھا آواز دی۔ وہ دوڑا آیا میں نے دروازے کی چٹخنی اندر سے کھولنے کی کوشش کی جو نہ کھلی۔ اس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ سامان اتار کر پھرتی سے باہر لے چلا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک سائیکل رکشا میں سوار ہوئی اور نیو سرکٹ ہاؤس پہنچی۔ ہاجرہ اور خدیجہ چند روز قبل چٹاگانگ سے آچکی تھیں۔ نارنجی اور نیلے ہاؤس کوٹ میں ملبوس اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی صبح کی چائے پینے میں مصروف تھیں اور دریچے کے باہر کھڑیا کے چوڑے پتوں پر بارش کے قطرے جگمگا رہے تھے۔

۴۔ دریا میں آگ

اپریل سب سے زیادہ بے رحم مہینہ ہے۔ جو مردہ زمین میں لالہ اگاتا ہے۔ اور یادوں کی خواہشوں سے آمیزش کرتا ہے۔ اور ابر بہاراں کے ذریعہ پژمردہ جڑوں کو جگا دیتا ہے۔[16]

پھر چراغ لالہ 61 ڈی گارڈن روڈ کے باغیچے میں شمس الدین مالی کے لگائے ہوئے کنہار کے پھول لہلہا رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کے باہر استادہ سایہ دار درخت زرد پھولوں سے لدچکا تھا۔ اتوار کے روز بھائی کے بچے گارڈن روڈ آکر املی کے نیچے کرکٹ کھیلتے اور بچیاں اپنے اسکول کے قصے سناتیں۔ اماں کے کمرے میں بھائی' بھابی' بھائی عثمان حیدر آفندی' بھابی محمودہ' منور ممانی اور دوسرے رشتہ داروں کی محفل جمتی۔

جمیل الدین عالی' طیبہ بیگم و بچگان نجی میدان کے سامنے مقابل کی عمارت میں فروکش تھے۔ پڑوس میں شمس العلماء مولوی ممتاز علی مرحوم کی ایک بھانجی اور اماں کی پرانی دوست مسز حمیدہ عزالدین احمد رہتی تھیں جو پہلے وقتوں کی ڈبل ایم اے تھیں۔ لالکرتی لکھنؤ چھاؤنی والی اختر ممانی لاہور سے آکر فرزند اکبر' اسکواڈرن لیڈر ایوب خاں کے پاس' کورنگی کریک میں مقیم تھیں۔ وہ اور پروین بھابھی وہاں سے اسی طرح آتیں جیسے لالکرتی سے فیض آباد روڈ آیا کرتی تھیں۔ لاہور سے باغ و بہار بھائی حمید علی تشریف لاتے۔ الن ماموں اور آصفہ ممانی حیدر آباد سندھ سے آتے رہتے۔ گھر پر صبح سے شام تک آنیوالوں کا تانتا بندھا رہتا۔ یا اماں خود ملنے ملانے چلی جاتیں اب وہ آسانی سے چل پھر رہی تھیں۔

چچا مشتاق احمد زاہدی پی۔ ای۔ سی ایچ ایس میں رہتے تھے۔ جب ستمبر ۴۷ء کی ایک صبح نمبر ۴ پارک سائیڈ نارتھ' قرولباغ دہلی میں ان کا بیش قیمت کتب خانہ جلا اور انہیں مع کنبے پرانے قلعے میں پناہ

گزیں ہونا پڑا اور وہاں سے کراچی آئے۔ ۱۹۶۰ء سے وہ زمانہ بہت دور رہ گیا تھا۔ مگر چچا ذہنی طور پر اب تک ۴۷ء سے قبل کی دلی میں پناہ گزیں تھے۔ فرزند اکبر نورالدین احمد دہلی میں تھے۔ چچا اور چچی چھوٹے بیٹے آصف زاہدی اور ان کے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں رہتے تھے۔ ان کے کمرے میں کتابوں اور دوا کی شیشیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ وہ خود آرام کرسی پر بیٹھے پڑھتے رہتے یا عصمت اور دوسرے رسالوں کے لئے دہلی مرحوم کے متعلق مضامین لکھا کرتے۔ میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتی اور گھنٹوں ان سے باتیں کرتی۔ بھائی جنہوں نے کراچی میں گوشہ نشینی اور کم آمیزی اختیار کرلی تھی۔ صرف چچا زاہدی سے ملنے جایا کرتے تھے۔ چچا ضعیف العمری کی اندرونی تنہائی میں دن گزار رہے تھے 'جب انسان دنیا سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اور دنیا اس سے۔ چچا کے گھر کے سامنے پی۔ ای۔ سی ایچ کا نیا قبرستان تھا۔ یعنی NO SHOW بزنس میں کوئی کام نہیں کر رہا۔

چچا کے گھر کے نزدیک ان کی بیٹی حسنہ' نواسی حسینہ عرف چنی اور اس کے شوہر ڈرامہ نگار انور عنایت اللہ (جو ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے۔) رہتے تھے۔

وسط اپریل ۱۹۶۰ء کے ایک اتوار میں چچا کے ہاں گئی۔ وہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے اس روز چنی کے ہاں جانے کی جلدی تھی۔ جہاں نثار عزیز بٹ اور نور افشاں وغیرہ لنچ کے لئے جمع ہونے والی تھیں۔ چچا مجھ سے کوئی بات کہہ رہے تھے۔ میں گھڑی پر نظر ڈال کر دفعتاً اٹھی۔ چچا چونک پڑے میں نے کہا۔ چچا میں ذرا چنی کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"اچھا۔ اب کب آؤ گی۔؟"

"چچا میں لاہور جا رہی ہوں۔ تین دن کے لئے واپس آکر آؤں گی کسی روز"

"اچھا۔"

"آداب۔"

"جیتی رہو۔" چچا نے ذرا مایوسی کے ساتھ پھر اخبار اٹھالیا۔ اور اپنی تنہائی میں واپس چلے گئے۔ میں تعجلت باہر نکلی۔ لیکن چنی کے گھر پہنچ کر خیال آیا۔ چچا یقیناً سوچتے ہونگے۔ جوان بوڑھوں کے پاس بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی اپنی دنیا علیحدہ ہے بہت پشیمان ہو کر میں نے طے کیا کہ لاہور سے لوٹتے ہی چچا سے ملنے آؤں گی۔

واپسی پر لاہور کی فلائٹ دیر سے پہنچی۔ رات ہو چکی تھی۔ میں نے اماں کو ڈرگ روڈ ائرپورٹ سے فون کیا۔ انہوں نے کہا۔ کل بھائی زاہدی کا انتقال ہو گیا۔

صبح کو میں چچا کے ہاں گئی۔ جو اب "مرحوم" ہو چکے تھے۔ ان کی آرام کرسی خالی پڑی تھی۔ دواؤں اور اخباروں کا انبار اسی طرح کمرے میں موجود تھا۔ اور ایک کھلی کتاب کے اوپر پرانے فیشن کے کیس میں بند عینک۔ چچا سڑک کے اس پار ہاؤسنگ سوسائٹی کے نئے قبرستان میں محو خواب تھے۔ پر خار گورستان میں چاروں طرف کوٹن ٹری کے سفید پھول روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے تھے۔

اس وقت اس شدید پشیمانی کا مجھے احساس ہوا جو چند ماہ قبل علی گڑھ سے روانہ ہونے کے بعد محسوس ہوئی تھی۔ شیخ عبداللہ اپنے لرزتے ہاتھوں سے اٹھا کر مجھے جو کتابیں دے رہے تھے۔ میں انہیں آسانی سے ساتھ لا سکتی تھی۔ کم از کم ان کو خوش کرنے کے لئے اس وقت ہی اس سے لے سکتی تھی۔ پندرہ روز قبل چچا زاہدی کے پاس سے اچانک اٹھ کر چنی کے ہاں فوراً پہنچنے کے بجائے کچھ دیر بعد وہاں جا سکتی تھی۔ لیکن بعد از وقت پچھتاوا اور ندامت اور ملال لا حاصل تھا۔ پرنسپل مشتاق احمد زاہدی زمزم دہلوی ۱۸۹۸ء میں ابا جان کے ساتھ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی بی۔ اے کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۰ء کے روز اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی.....

اتوار کی ایک صبح جمیل الدین عالی کا فون آیا۔ آپ نے آج کا جنگ اور مورننگ نیوز دیکھے۔؟

"ہمارے پاس یہ دونوں اخبار نہیں آتے۔ کیوں۔ کیا ہوا؟ خیریت؟"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں۔"

چند منٹ بعد تشریف لائے۔ دونوں اخباروں میں ایک ہی صاحب کا جن کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ایک طویل بیہودہ مضمون "آگ کا دریا" پر شائع ہوا تھا۔ جو ناول مکتبہ جدید لاہور سے تین ماہ قبل چھپا تھا۔ دو اخباروں میں یکساں مضمون بزبان اردو انگریزی ایک ہی روز چھپنا قابل غور معاملہ تھا۔ میں نے دونوں مضمون پڑھے۔

"یہ کون صاحب ہیں اور یہ کس کی سازش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔" عالی نے کہا۔

"میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ سازش وازش کیا ہو گی۔ اس قسم کے لوگوں کو اگنور کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ کافی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مفسدین کے فتنوں سے ہمیشہ خبردار رہیئے۔"

"لیکن اس فتنہ پردازی کی وجہ ہی کیا ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

اماں اطمینان سے بیٹھی چائے پیتی رہیں۔ ان کے پلنگ کے نزدیک طویل دریچے کے نیچے صوفے پر عالی بےحد پریشان بیٹھے تھے۔ اماں نے جھک کر پلنگ کے نیچے سے ٹوکری کھینچی جس میں وہ ہمیشہ ملاقاتیوں کے لئے کیک پیسٹری دال موٹھ وغیرہ جمع رکھتی تھیں اور اسے "کورچہ" کہتی تھیں جو فارسی لفظ تھا اور غالباً پرانی اردو میں مستعمل ہو گا۔ انہوں نے کہا۔ "جب پردے کی مخالفت میں میری مضمون چھپتے تھے۔ میرے خلاف مولوی اور بیہودہ لوگ اول فول مضمون شائع کیا کرتے تھے۔ یہ ہمارے مسلم سماج کا پرانا وطیرہ ہے۔ اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا اردو اہل قلم کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کی فکر نہیں کرنی چاہئے لو میاں چائے پیو۔"

"میں گلڈ کی طرف سے ان صاحب کو نوٹس بھیجتا ہوں۔ آپ نے مضمون سرسری طور سے پڑھا ہے ذرا غور سے پڑھیئے۔ عالی نے مجھ سے کہا۔

دوسرے روز اردو مضمون کا بقیہ طویل حصہ جنگ میں شائع ہوا۔

ملک اور شہر میں خاصی سنسنی پھیلی۔ احباب اور بہی خواہوں نے گارڈن روڈ آ کر اس مضمون کی وہ اشاعت کی مختلف النوع تہلکہ خیز تاویلیں شروع کیں۔ مختار زمن نے اپنے قانونی مشورے پیش کئے سب بے انتہا پریشان اور برافروختہ تھے۔ راولپنڈی سے ایک دوست نے مطلع کیا معلوم ہوا ہے یہ صاحب پہلے کسی صوبائی وزیر کے پی آر۔ او تھے اور اس سے قبل بھی چند لوگوں کو بلیک میل کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

عالی نے کمال احمد فاروقی (عرف بوبی جو لندن سے قانون پڑھ کر کب کا واپس آ چکا تھا اور بیرسٹری کر رہا تھا۔) سے مشورہ لیا بعد ازاں رائٹرز گلڈ کی طرف سے جنگ میں ایک احتجاجی نوٹ چھپوایا اور مضمون نگار کو نوٹس بھیجا۔ اس دوران میں مضمون نگار نے چند اور لوگوں سے لکھوا کر یا فرضی ناموں سے جنگ میں چند خطوط بطور جواب الجواب شائع کئے کہ گلڈ چند ادیبوں کی میراث بن گئی ہے۔ وغیرہ۔

وہ ایک عجیب و غریب مضمون تھا جس میں یہ بھی انکشاف کیا گیا تھا کہ کمیونسٹ اور ملحد کامریڈ رشید جہاں، مصنفہ کی سگی خالہ تھیں۔

بتاریخ ۸ مئی مضمون نگار نے اس مضمون کے متعلق مصنفہ کے نام معافی نامہ لکھ کر مرزا جمیل الدین عالی کی خامت اقدس میں پیش کیا اور اس کی ایک نقل جنگ میں شائع کی۔

تیسرے پہر کو عالی شاداں و فرحاں تشریف لائے۔ "مغل بچہ" مرزا صاحب نے فرمایا جان پر کھیل کر قول نبھاتا ہے۔ یاد کیجئے ہمایوں نے راجپوت رانی کے لئے کیا کیا تھا۔"

"جزاک اللہ۔" میں نے عرض کیا۔ اسی وجہ سے فدویہ فیوڈل اقدار کی ہمیشہ سے نام لیوا چلی آتی ہے۔"

اس روز سے قصہ رفع دفع ہوا۔ لیکن بہت جلد رفتہ رفتہ پاکستان و ہند میں اس ناول کے متعلق ایک عجیب و غریب MYTH تیار ہونی شروع ہوئی۔

جب بھائی جان جرنل احمد [illegible] نے کہا تھا۔ یہ ناول وہ شرکت قلم کی طرف سے خود شائع کریں گے۔ میں مسودہ لاہور چھوڑ آئی تھی۔ اور سوچا تھا کتابت کروانے سے قبل کبھی لاہور جا کر نظر ثانی کر لوں گی۔

بھائی جان بوجہ عدیم الفرصتی شرکت قلم شروع نہیں کر پائے۔ ایک بار لاہور گئی ہوئی تھی۔ مکتبہ جدید والوں کا نمبر ۴۹ لارنس روڈ اس کے متعلق فون آیا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ مسودے پر نظر ثانی نہیں کی ہے۔ اسی روز اسے اٹھا کر چودھری رشید احمد کے حوالے کیا۔ دسمبر ۵۸ء میں کتابت شدہ مسطر کراچی آئے۔ میں نے تصحیح شروع کی۔ اور جو ردو بدل کانٹ چھانٹ جو ہر مسودے میں عام طور سے کی جاتی ہے؟ اور مسودے میں کرنی چاہئے تھی وہ مسطروں پر کی۔ کہیں کہیں سے جملے اور پورے پورے پیراگراف حذف کئے۔ اور کاپیاں لاہور واپس بھیج دیں۔ وہ اسی طرح چھپ گئیں۔ لہذا کتاب میں جا بجا جملے اور پیراگراف غائب اور بلینک موجود۔ جب ناول کے متعلق بھانت بھانت کی افواہیں گرم ہوئیں ان میں ایک افواہ یہ بھی تھی کہ کتاب کو حکومت نے سنسر کیا ہے۔ (کسی کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ طباعت کے بعد کوئی تحریر صفحے پر سے

غائب نہیں کی جا سکتی)

ایک باب میں میں نے محض دو الفاظ لکھے تھے۔ "ہندوستان۔ ۱۹۴۷ء۔" یعنی تھوڑا لکھے کو بہت جانیے۔ لیکن ایک بوجھ بجھکڑ نے اپنے تبصرے میں تحریر کیا۔ "تقسیم کے متعلق پورا باب مارشل لاء کے سنسر نے حذف کر دیا۔ صرف ایک جملہ باقی بچا ہے۔" سب سے عبرتناک افواہ جو ہندستان میں پھیلی وہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان نے آگ کا دریا کو BAN کر دیا ہے۔

ایک نامور پروفیسر نقاد نے ناول پر ایک توصیفی مضمون لکھا۔ اس میں غلو آمیز تعریف کے اس قدر دریا بہائے کہ پڑھ کر کوفت ہوئی۔ میں نے شاہد احمد دہلوی سے جو اس مضمون کو ساقی میں شائع کر رہے تھے درخواست کی کہ اسے شامل نہ کریں۔ شاہد صاحب بے چارے مان گئے۔ ایک ملازم نے ساقی کے پلندے کھولے اور تمام کاپیوں میں سے وہ تبصرہ پھاڑ کر علیحدہ کیا۔ دو ماہ بعد جب جنگ میں وہ نامعقول مضمون چھپا اور نامور نقاد نے دیکھا کہ اس ناول کے متعلق ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ انہوں نے ایک اور تبصرہ رقم کیا اور پچھلی مرتبہ جتنی تعریفیں کی تھیں اس بار آگ کا دریا میں اتنے ہی کیڑے ڈالے۔ شاہد صاحب نے پھر مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ میں نے کہا اس مرتبہ آپ ضرور اس مضمون کو چھاپئے چنانچہ وہ مضمون ساقی میں شائع ہوا۔

تلمیحات اور علامتوں سے عمومی بے نیازی کی وجہ سے مختلف رسالوں میں مزید عجیب و غریب تاویلیں کی گئیں۔ مصنفہ نظریہ تناسخ کی قائل ہیں۔ مصنفہ بدھسٹ ہیں' ہندو ہیں۔ اسرائیل پرست ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دوسری روایت ہندوستان میں یہ تیار ہوئی کہ مصنفہ کو اس ناول کی اشاعت کے بعد پاکستان میں بچہ پروسیکیوٹ کیا گیا۔ ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور بے چاری کو وہاں سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لینا پڑی۔ اور ہندوستان میں یہ اب تک مشہور ہے کہ پاکستان میں ناول BAN کر دیا گیا تھا۔

ہمارے ریذیڈنٹ فلاسفر اور اولڈ لینڈ مرحوم کے حدی خواں بشیر خاں ڈرائیور یادش بخیر بہت گہری باتیں کرنے کے عادی تھے۔ انگریزی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ اور لفظ NONSENSE کو "نان سین" بروزن تان سین ادا کرتے تھے۔ ایک بار دریافت فرمایا۔ "جب دریا میں آگ لگت ہے۔ مچھلیاں کا کرتے ہیں؟" متوقع تھے جواب ملے گا۔ "پیڑن پر چڑھ جات ہیں۔" لیکن سر ہلا کر قہقہہ لگاتے اور کہتے "کچھ کا روسٹ بن جات ہے باکی ہوا میں اڑ جات ہیں۔"

آگ کا دریا کے سلسلے میں جو ہوائیاں اڑیں اس قسم کی تھیں۔ یعنی وہی اچھو والے تین جوڑی سے ایک درجن سینڈلز۔

نان سین۔

دوسری MYTH یہ تیار ہوئی کہ اس کتاب کی رائلٹی نے دونوں ملکوں میں مصنفہ کو مالا مال کر دیا۔ عبرتناک حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۵۹ء سے لے کر آج تک مکتبہ جدید لاہور نے قطعی "فری" اڈیشن اس ناول کے شائع کئے ہیں اور اٹھارہواں ڈی لکس اڈیشن ساٹھ روپے قیمت کا چھاپ چکے ہیں۔ ہندوستان

میں ۱۹۶۱ء سے اب تک متعدد جعلی اڈیشن لکھنؤ' جالندھر اور جموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان چوروں کو آج تک نہیں پکڑا گیا۔ جدید اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا کثیر الاشاعت ناول ہے جس کی رائلٹی کا ایک پیسہ مصنف کو آج تک نہیں ملا۔ احقر کے ہموطن قائم چاند پوری پہلے ہی کہہ گئے تھے۔

کہ میں یہ کر کے فضولی بہت زیاں دیکھا

اس سے قبل اردو ناولوں کے اولین دور میں مصنفہ کی والدہ کے ناول "اختر النساء بیگم" وغیرہ اور والدہ کی پھوپی اکبری بیگم (والدہ افضل علی) کا مشہور گودڑ کا لال طبقہ اناث میں اس قدر مقبول تھے کہ ہندوستان کے تقریباً ہر اردو داں گھرانے میں وہ موجود تھے۔ مگر ان دونوں خواتین نے بوجہ فیوڈل وضعداری اپنی تصانیف کی رائلٹی لینا خلاف شان تصور کیا تھا۔ وہ دوسری بات تھی۔ وہ زمانہ وضعداری اور فارغ البالی اور تمول کا تھا۔ یہ زمانہ چور ناشروں کی دھاندلی اور بے ایمانی اور چوری اور سینہ زوری اور بد تمیزی کا۔

برسبیل تذکرہ "اداس نسلیں" کے متعلق انٹرویو میں مصنف نے ارشاد کیا کہ وہ عاجزہ کو ایک قابل ذکر ناولسٹ نہیں سمجھتے۔ اس بیان کی روشنی میں یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ "اداس نسلیں" کے متعدد ابواب میں میرے بھی صنم خانے' سفینہ غم دل' آگ کا دریا' اور شیشے کے گھر کے چند افسانوں کے اسٹائل کا گہرا چربہ اتارا گیا ہے۔ خفیف سے رد و بدل کے ساتھ پورے پورے جملے اور پیراگراف تک وہی ہیں۔ لیکن آج تک سوائے پاکستانی طنز نگار محمد خالد اختر کے کسی ایک پاکستانی یا ہندوستانی نقاد کی نظر اس طرف نہیں گئی۔ نہ کسی نے اشارۃً بھی اس کا ذکر کیا[1]۔ کیا یہ MALE CHUAVINISM نہیں ہے۔؟

ایک عزیز جو عالم طیر رکھتا ہے۔ دو سال قبل کراچی سے ٹوکیو جاتے ہوئے سانتا کروز ایئرپورٹ بمبئی پر رکا۔ اس جہت سے کہ دیوانہ رکھتا تھا۔ ایئرپورٹ سے میرے دفتر فون کیا۔ اور باتوں باتوں میں بتلایا کہ یو۔ این کے ایک سروے کے مطابق پاکستان میں شاعری کی کتابوں میں اقبال اور فیض اور نثر میں آگ کا دریا مقبول ترین کتابیں ہیں۔

منکہ بنت بندے علی ترمزی ایک درویش مزاج مزدور قلم کی ہوں' ایک بار پھر عالم تحیر میں ہوں۔

۵۔ پکچر ونڈو

جون ۱۹۶۰ء کے آخری ہفتے میں پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی لاہور پشاور کابل جاتے ہوئے دو چار روز کے لئے کراچی ٹھہرے۔ وزارت اطلاعات و نشریات نے انور قریشی (ابو) کو ان کا میزبان مقرر کیا اور ان کو ابو کے گھر پر ٹھہرایا۔ میری اور رمائی اور ابو کی عید۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی۔ ایک روز انہوں نے کہا۔ "آج میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ دن بھر گھر پر رہ کر بس تم لوگوں سے باتیں کروں گا۔"

وہ ایک منکسر المزاج دیو زاد عالم تھا۔ تاریخ کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے پوچھتے۔ "تمہاری کیا رائے ہے؟۔۔۔ کیا میرا خیال صحیح ہے۔۔۔ اچھا۔۔۔؟ مجھے یہ نہیں معلوم تھا۔"

یہ GENUINE HUMILITY صرف اس پائے کے عالم ہی میں ہو سکتی ہے۔

عبرانی' مسیحی' اسلامی تاریخ پر مجھ سے باتیں کرتے کرتے پوچھنے لگے۔ "ملتان میں میرے ہمنام یوسف گردیزی کا مزار ہے۔ تم وہاں گئی ہو۔۔۔؟"

"شاہ دولہ کے چوہوں" نے پروفیسر ٹوائن بی کو بہت متحیر کیا تھا۔ تاریخ کے تانے بانے کو ملا کر تاریخ کی مجموعیت میں حیرت انگیز ربط پیدا کرنا (جو پہلے سے موجود ہے صرف ہم اسے نہیں پہچانتے) پروفیسر ٹوائن بی کا کمال تھا۔

لنچ کے بعد جب وہ قیلولے کے لئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ ابو خود ایک انگریز اس نے اپنے CLIPPED لہجے میں کہا۔۔۔ "پروفیسرٹی ایٹ فائیو۔۔۔"

پروفیسر ٹوائن بی نے سر خم کیا اور بیڈ روم میں چلے گئے۔ میں نے ابو سے کہا۔ تم نے اچھی پابندی لگا دی۔ ممکن ہے وہ ساڑھے پانچ بجے تک آرام کرنا چاہتے ہوں۔ "ابو بولا۔ "پروفیسر میری طرح انگریز ہے۔ ٹھیک پونے پانچ بجے سو کر اٹھ جائے گا۔۔۔۔"

ٹھیک پانچ بجے پروفیسر ٹوائن بی ڈرائنگ روم میں موجود کھڑے مسکرا رہے تھے۔

رات کے کھانے کے وقت تک ہم تینوں نے پھر ان کا سر کھایا۔ ڈنر کے بعد رات گئے تک وہ باتیں کرتے رہے۔ جب میں چلنے لگی زینہ اتر کر نیچے آئے۔ دیر تک وہاں باتیں کیا کیئے۔ جب کار پھاٹک سے نکلی وہ زینہ کے دروازے میں کھڑے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ ان کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ ہم لوگوں کے لئے تبرک تھا۔ پشاور پہنچ کر پروفیسر ٹوائن بی نے ہم تینوں کو خط لکھے۔۔۔ صد افسوس کہ میرے نام ان کا خط کھو گیا۔ اس میں لکھی ہوئی صرف ایک بات یاد ہے۔۔۔ "میں پشاور یونیورسٹی کیمپس پہنچ گیا ہوں۔۔۔ 'کیمپس' بہت اچھی امریکن اصطلاح ہے۔"

اہل مغرب کے مشرق میں INVOLVEMENT کی ایک سطح اور تھی۔ ہماری جرنلسٹ کزن نشو (نوشابہ اطاعت حسین) کو حکومت نے چند روز قبل ملکہ ایلزبتھ کے ساتھ مغربی پاکستان کے دورے پر بھیجا تھا۔ (اسی زمانے میں شہزادی مارگریٹ اور گروپ کیپٹن ٹاؤن سینڈ کا قصہ چل رہا تھا۔ شہاب صاحب صدر ایوب کے ہمراہ لندن گئے تھے۔ واپس آکر بتایا"۔۔۔ بکنگھم پیلس میں دعوت تھی۔ گروپ کیپٹن ٹاؤن سینڈ بھی موجود تھے۔ بیگم ایوب خاں نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔ ایمی منڈا اے جے نے ایتا رولا پایا دا اے؟" اس دورے میں ملکہ نے انسانوں سے زیادہ گھوڑوں میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

ابو کا چھوٹا بھائی اومو (عمر قریشی) 'کرکٹ کا مشہور مبصر' جو پہلے کراچی ٹائمز کا اڈیٹر تھا۔ پی۔ آئی۔ اے کا چیف پبلک ریلیشنز آفیسر ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے اور نشو سے کہا۔ ہم نے نئے قسم کے ہوائی جہاز اڑا رہے ہیں۔ تم دونوں ذرا مغربی پاکستان کا چکر لگا آؤ۔ اور ہماری فضائی سروس کے اوصاف حمیدہ پر ایک ایک مضمون انگریزی پریس کے لئے لکھ دو۔

صرف چار سال قبل ایئر ہوسٹس لڑکیاں بھرتی کرنے کے سلسلے میں مجھے اور رتی میاں اور حسینہ

فاروق (اب حسینہ صہیب نقوی) کو کتنی دقتیں پیش آئی تھیں۔ لیکن زمانہ سرعت سے ترقی کر رہا تھا۔ اچھے خاندانوں کی لڑکیاں پی۔ آئی۔ اے میں جوق در جوق شامل ہو رہی تھیں۔ ضیاء محی الدین کی بیوی سرور جو نواب بھوپال کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی کراچی لندن فلائٹس پر میزبانی کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اور کراچی ڈھاکہ پرواز کے دوران بنگلہ میں اناؤنسمنٹ کرتی تھی۔

جس وقت نشو اور میں لاہور ایئر پورٹ سے آپا ثمن کے ہاں نمبر ۴۹ لارنس روڈ پہنچے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ باغ میں رات کی رانی معطر تھی۔ سب لوگ باہر لان پر مچھر دانیاں لگائے محو خواب تھے۔ پی۔ آئی۔ اے کی کار کی روشنی پلنگوں پر جا کر پڑی۔ ہم لوگوں نے گھاس پر پہنچ کر زور سے السلام علیکم داغا۔ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک مچھر دانی میں سے آپا زہرا آنکھیں ملتی طلوع ہوئیں جو چند روز قبل علی گڑھ سے ایک ماہ کے لئے تشریف لائی تھیں۔ ایک گرم ایشیائی دوپہر آپا ثمن' آپا زہرا نشو اور میں حجاب امتیاز علی سے ملنے نمبر ۴۰ ایبٹ روڈ گئے۔ نشو اپنے رسالے ویمنز ورلڈ کے لئے حجاب کا انٹرویو کرنا چاہتی تھی۔ بچپن کے بعد اس روز پہلی بار میں ان سے ملی اور وہ مجھے بہت ایکزوٹک معلوم ہوئیں۔ وہ واقعی اردو افسانے و ناول میں ایک انٹرلوپر تھیں۔ اپنی کوٹھی بھی انہوں نے اپنے افسانوں کے اسٹائل میں سجا رکھی تھی۔ ان کا ادب ایک فنٹیسی بلوریں مصنف گلشن تھا۔ گھر میں بلیوں کی ریل پیل جن کا ذکر میں بچپن سے اماں کے نام ان کے خطوط میں سنتی آئی تھی۔ ہم لوگ حسب معمول اپنی نہایت چنڈو خانے کی موڈ میں تھے۔ حجاب کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر سنجیدگی طاری کی۔ نشو کے سوالات کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "میں دو گھنٹے پڑھتی ہوں۔ دو گھنٹے باغ میں گزارتی ہوں۔ دو گھنٹے سوچتی ہوں۔"

میں نے پوچھا"۔۔۔ اتنا سوچنے کے بعد آپ نے کوئی فلسفہ حیات مرتب کیا ہو گا۔۔۔"

کہنے لگیں"۔۔۔ انسانی رشتے داریوں کے متعلق بہت سوچا ہے۔"

اپنی "ادبی تخلیقات" کے متعلق گفتگو کرنے سے مجھے ہمیشہ سے چڑ رہی ہے۔ جب لوگ ان کا تذکرہ مجھ سے کرتے ہیں تو میں عموماً بات ٹال جاتی ہوں۔ کہ یہ تضیع اوقات ہے۔ لیکن آپ کوئی بے انصافی کی بات کہیں تو البتہ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آگ کا دریا کے تذکرے نے مجھے بے پناہ بور کیا (اور اب تک بور کر رہا ہے) اس مرتبہ لاہور میں ایک ڈنر پر کسی نے اس باب کا ذکر کیا جو فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز کے کسی سنڈے اڈیشن میں چھاپا تھا۔ میں نے فیض صاحب سے کہا۔ "اس باب کے ساتھ کی تصویر میں شاہ نصیرہ الدین حیدر نہایت چڑ قنات لگ رہے تھے اور لگتا تھا ابھی ڈنڈ پیل کر چلے آ رہے ہیں۔۔۔"

فیض صاحب کہنے لگے "بھئی بات یہ ہوئی ہم نے تمہیں لکھا بھی تھا کہ وہ ہمارا مصور پہلوان تھا۔ یعنی باقاعدہ اکھاڑے کا پہلوان۔ اور تصویریں بھی بناتا تھا۔"

"یعنی تو بہار عالم دیگری۔۔۔" میں نے کہا۔ کسی نے جنگ والے مضمون کا ذکر کیا۔ ڈنر کے بعد جاوید مجھے اور نشو کو ۴۹ لارنس روڈ پہنچانے آئے۔ نشو یونیورسٹی آف ورجینا کی کوئی بات کر رہی تھی۔

"اس پر یاد آیا۔۔۔" میں نے کہا"۔۔۔ یار لوگوں نے یہ بھی مشہور کر دیا ہے کہ ناول ورجینیا

وولف کی اور لینڈو سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ حد ہے۔"

"اس پر یاد آیا۔۔۔" جاوید نے کار برساتی میں روکتے ہوئے کہا "۔۔۔ کل ایک اردو دان کینیڈین خاتون کہہ رہی تھیں کہ اس کے پہلے حصے میں ایک جگہ ہرمین ہس کے سدھارتھ کی جھلک ہے۔"

"اس پر یاد آیا کہ میں نے سدھارتھ نہیں پڑھی اور دنیا کے کسی بھی قصہ میں کسی بھی قصے کی جھلک ہو سکتی ہے۔ جب شاعری بزبان انگریزی کرتی تھی ماری پور میں' آغا عبدالحمید نے ایک نظم پڑھ کر کہا تھا۔ "وائن ڈارک نائیٹ" ہومر کے وقت سے مستعمل ہے اسے بدل دیجئے۔ اب "وائن ڈارک" کی تشبیہ جب نازل ہوئی اسے میں نے بالکل اوریجنل سمجھا۔ اسی طرح "جب طوفان گزر چکا" میں ڈیرہ دون کی ایک نن ایک سرد رات باہر خرگوشوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے جاتی ہے اور سردی لگ کر مرجاتی ہے۔ پھر کسی نے بتایا کہ بالکل ایسا ہی ایک نن کا واقعہ کسی نے لکھا ہے ولایت میں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اس کے متعلق کیا کیا جائے۔"

"سب خود وجودیت ہے۔" نشو نے کہا۔

"سب خود وجودیت ہے۔" میں نے دہرایا۔

چنانچہ وجود کی لہروں پر تیرتے نشو اور میں مری' پنڈی اور پشاور کا چکر لگا کر کراچی واپس پہنچے۔

چند روز بعد اگست کے مہینے میں جاوید اقبال جو اسلام پر لیکچر دینے کے لئے آسٹریلیا مدعو کئے گئے تھے' سڈنی جاتے ہوئے کراچی آئے۔

ایک اتوار کو ہم سب رشید احمد صدیقی کے فرزند اکبر اقبال رشید (بلحاظ پیشہ بڑے صاحب قسم کے فرم کے ایگزیکٹو' طبعاً رواقی فلسفی) کے ہاں لنچ کے لئے جمع تھے۔ بیحد پر لطف محفل تھی۔ جلال الدین احمد ایک کتاب "بلیک میجک" کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے جاوید سے تجویز آجکل مغرب میں خود وجودیت کے علاوہ کیتھولک وجودیت بھی اچھی جا رہی ہے۔ آپ اسلامی خود وجودیت کا اجراء کر ڈالئے اور اس پر آسٹریلیا میں لیکچر دے آیئے۔ بعد ازاں حنفی خود وجودیت' شیعی خود وجودیت وغیرہ کے ذیلی مدرسہ ہائے فکر قائم کئے جا سکتے ہیں۔ بہت رونق رہے گی۔۔۔" فلسفے میں یہ ہے کہ آرٹ اور ادب کی تنقید کی طرح جو چاہو کہہ دو بات ہمیشہ نہایت وزنی سمجھی جائے گی۔ موڈرن آرٹ پر بقراطی تنقید لکھنے کا مجھے خود وافر تجربہ تھا جو میں اکثر بزبان انگریزی لکھتی یا نشر کرتی تھی۔ (اسلامی نظریاتی قدامت پرستی سے قطع نظر جاوید خود بہت جدید ذہن کے آدمی تھے۔ نہایت جدید ترین تکنیک کے افسانے سویرا (لاہور) میں لکھے تھے۔ بعد میں اس شاہین بچے کی طبیعت ادب کی طرف سے ہٹ گئی۔ آج کل کہا جا رہا ہے کہ "جدید" افسانے صرف پچھلے چند سال میں لکھے گئے ہیں۔)

انہی دنوں میں نے "ایک مکالمہ" میں سبط حسن کو "کامریڈ صفت حسن" اور جاوید کو ڈاکٹر عقاب آفاقی کے روپ میں پیش کیا۔

آسٹریلیا روانگی سے قبل جاوید جب اماں سے ملنے گارڈن روڈ آئے۔ اماں حسب معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے ان سے میر مظہر علی اور شیخ نور محمد کے سیالکوٹ کی باتیں کرتی رہیں۔ یہی باتیں انعام اللہ ماموں مرحوم کے لڑکے اور حاضر ماموں اور اس گمشدہ نسل کے دوسرے نام لیوا کرتے تھے جسے دنیا کی اسٹیج سے غائب ہوئے بھی زمانہ ہو چکا تھا۔ وہ لوگ کب کے جا چکے اور ہمارے گھوڑے پھاٹک پر تیار ہیں اور ہم لوگ جو ابھی سرائے میں موجود ہیں کتنے مگن۔

اسی اگست میں شاہد احمد دہلوی انڈونیشیا جانے والے تھے' میں برائے سیاحت لنکا۔ جمیلہ جو اپنے شوہر کے ساتھ (جو سرسٹہ' ضلع بہاولپور کے ایک بے حد دولت مند سجادہ نشین تھے۔) کراچی آئیں۔ ایک رات جمیل جالبی نے اپنے ہاں فرش پر دستر خوان بچھا کر پرانی دلی کے اسٹائل میں دعوت کی۔ اس رات شاہد احمد دہلوی کی سرائے سے روانگی میں صرف چند سال باقی رہ گئے تھے۔

لنکا سے واپسی پر آتے جاڑوں جب مشرقی بنگال میں فلم بندی ممکن ہو سکتی ہے' ڈھاکہ جہاں رفیق میاں جنیوا سے تبدیل ہو کر آچکے تھے اور نئے "پوش" علاقے "دھان منڈی" کی ایک کوٹھی میں مقیم' اضلاع کو بجلی کو پڑے منسلک کرانے میں مشغول تھے۔

ایک بار پھر کومیلا۔ تقسیم سے قبل کے گاندھی آشرم میں' جہاں اب سول سروس اکیڈمی قائم تھی۔ سبزے پر ایک بنگالی ولیج ڈیولپمنٹ آفیسر' چند دیہاتی گویوں کے ساتھ منتظر' بنیادی جمہوریتوں کے متعلق فلم کے لئے ان گویوں کی کیس ہسٹری کا مطالعہ۔ گویوں کے بعد ایک کلاس میں جا کر زیر تربیت سویلین نوجوانوں سے خطاب۔ جنٹلمین کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ صدر ایوب خاں کی بنیادی جمہوریتوں کے سلسلے میں آپ لوگ کیا کرنے والے ہیں۔

ایک بنگالی مقرر' دو بنگالی مباحثہ' تین بنگالی ایجی ٹیشن' یہاں پوری کلاس موجود تھی۔ اور موضوع "بنیادی جمہوریت" بہت غل مچا۔ میں نے وقتاً خود کو لیکچرر کے رول میں ان سویلین طلباء کو ڈانٹتے پایا "۔۔۔ سب ایک ساتھ نہیں جنٹلمین باری باری۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کا کیا نام ہے۔ ابو المجاہد سرکار۔۔۔ خوب۔ آپ فرمایئے۔"

کلاس سے باہر آ کر ایک بنگالی نوجوان نے بشاشت سے کہا۔ "آپ کیا پکچر بنائے گا۔ یہ پروگرام تو ہم لوگ سبوتاژ کر چکا ہے۔"

یہی خوبصورت کومیلا 71ء میں ایک بھیانک میدان جنگ میں تبدیل ہونے والا تھا۔

کومیلا سے روانہ ہو کر نرسنگھ دی۔ مولوی بازار۔ سلہٹ۔ سری منگل۔ پنچو گنج۔ شمشیر نگر۔

سری منگل کے مانوس ڈاک بنگلے پر پہنچ کر صبح صبح کزن جمیلہ (بنت حاجی سید خلیل احمد بانی ایک آنہ فنڈ برائے تعمیر و مرمت مساجد لکھنؤ) نے جگایا۔ وہ اپنے بنگالی شوہر کے ساتھ دور افتادہ چائے بگان میں رہتی تھی۔ اس کے شوہر ایک ٹی اسٹیٹ کے "بڑے صاحب" تھے۔ ناولٹ "چاء کے باغ" کے لئے مسالہ۔

ایک بار پھر۔۔۔ پانچویں یا چھٹی مرتبہ چٹاگانگ۔ جو برصغیر کے ہر اہم شہر کی طرح دوہری زندگی

گزارتا تھا۔ برطانوی عہد میں دہشت پسند تحریک کا مرکز رہ چکا تھا۔ اب بھی مشرقی پاکستان کے انقلابی گروہ کا گڑھ تھا۔ سنا تھا سینکڑوں نوجوان جیلوں میں بغیر ٹرائل بند تھے۔

اور یہی شہر پاکستانی بحریہ اور ایسٹ پاکستان ریلویز کا بڑا پر فضا مستقر تھا اور (بقول عباس صاحب یہاں کی پہاڑیاں مٹی کی اور آدمی ریلوے کے تھے۔) انگریز فوجی چھاؤنیوں کی طرح' ریلوے افسروں کے رہائشی علاقے نہایت خوبصورت اور شاداب بنا گئے تھے۔ چٹاگانگ برصغیر کے حسین ترین ریلوے سنٹرز میں تھا۔ جہاں بنگلے جنوب مشرقی ایشیائی کولونیل طرز تعمیر کے دلفریب نمونے تھے۔ اور ان میں اماں کے دوستوں کی اولادوں کے کئی کنبے آباد تھے۔ لکھنؤ کے جج مسعود الحسن کی بیٹی صغریٰ اور ان کے میاں مسعود رضا (سید کاظم رضا اور ہاشم رضا کے چھوٹے بھائی) پروفیسر مرزا محمد سعید کی بہن جھنو خالہ کی بیٹی بے بی اور ان کے میاں مسٹر طیب جی' لکھنؤ کے اسحٰق علی مرزا (جو عالیجاہ واصف علی مرزا نواب بہادر مرشد آباد مقیم کلکتہ کے کزن تھے۔) کی لڑکیاں عیدی اور نوروزی بیگم' جن کی بڑی بہن نیازنی بیگم 'بنن باجی کی بھاوج تھیں۔ (میر کمال الدین ترمذی کی نسل دختری کے ایک فرد عالیجاہ میر قاسم علی خان' بنگال کے ٹریجک ہیرو' جن کے کمسن لڑکے لڑکی گل اور صنوبر قلعہ مونگھیر کے محاصرے میں جنگل میں چھپے' بدقسمت باپ کے لئے شیر کی کھال اوڑھ کر کھانا لے جاتے ہوئے لارڈ کلائیو کے ایک افسر کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ میر قاسم علی خان کی اولاد شاید اب بھی بہار میں موجود تھی' میر جعفر علی خان کی اولاد نوابین مرشد آباد۔ نواب محمد رضا خاں' مظفر جنگ نائب ناظم بنگال' اور ٹیپو سلطان کی اولادوں اور شہزادگان مٹیا برج کی طرح انیسویں صدی امپریل برطانوی بنگال کے رومانس کے پروردہ یہ لوگ اپنے زوال پذیر ٹریجک SPLENDOUR کے ہالے میں گھرے کلکتہ میں رہتے تھے۔ ان کنبوں کے کچھ افراد مشرقی پاکستان آچکے تھے۔ سلہٹ میں شہزادہ شجاع کے زمانے کے چند مغل جاگیردار بھی موجود تھے۔ اور یہ جیلوں میں محبوس سیاسی قیدیوں کی دنیا سے ایک بالکل مختلف دنیا تھی اور اسی بنگال میں موجود تھی۔

ان دنوں بحریہ کے کموڈور (اب ایڈمرل) آصف علوی اور سعید بانو بھی چٹاگانگ میں مقیم تھے۔ ان کا بیشتر خاندان لکھنؤ اور کاکوری میں موجود تھا۔ ایک شام سعید بانو کے ہاں (جو آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ میں میری ہم جماعت رہ چکی تھیں۔ فرنگی محل کے حبیب میاں اور دوسرے لکھنؤ والے ڈنر پر جمع ہوئے اور بہت اچھا وقت گزرا۔ تو یہ یو۔ پی کے مغربی پاکستانی' سب بڑے اطمینان سے چٹاگانگ میں اونچے عہدوں پر ہونگی ڈوری بیٹھے اچھا وقت گزار رہے تھے۔ سلہٹ کے چاء کے باغات کے اعلیٰ افسروں کی طرح۔ اور ان کے علاوہ غریب یا متوسط طبقے کے مہاجر بھی "بہاری" کہلاتے تھے۔ شہر میں بے شمار موجود تھے۔ اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ چند سال بعد سورج سوا نیزے پر آیا چاہتا ہے۔ یہ غریب "بہاری" مسلمان بری طرح خانماں برباد ہونے والے تھے۔

کراچی واپس آکر میں نے سلہٹ کے پس منظر کے ساتھ "چائے کا باغ" لکھنا شروع کیا پھر اسے ادھورا چھوڑ کر لنکا کی سیٹنگ میں "سیتا ہرن" شروع کیا۔ ایک روز دفتر میں اس کا ایک باب لکھتے لکھتے اکبر

کے چند اشعار کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ابن انشاء کو فون کیا۔ "وہ کیا ہے۔" میں نے دریافت کیا۔۔۔ "کہ بیٹا کرلے گر تو بی۔اے پاس۔۔۔؟"

انشاء نے فوراً پوری نظم فرفر سنادی۔ اسے قلمبند کر کے فون بند کیا۔ چند منٹ بعد گھنٹی بجی۔ عالی بول رہے تھے۔ فرمایا۔ "آدم جی ادبی انعام کے ججوں کی کمیٹی بن رہی ہے۔ ایوارڈ آگ کا دریا کو ملے گا۔"

"ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں تو یہ انعام لینے سے انکار کردوں گی۔"

"یہ کیا بوگس بات ہوئی؟" عالی نے پوچھا۔ "بوگس" موصوف کا پسندیدہ لفظ تھا۔

"ابھی چھ سات مہینے قبل وہ ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ اب لوگ کہیں گے اشک شوئی کے لئے انعام دے دیا گیا۔ مجھے سمجھا ہے کیا ہرچرن داس؟۔"

"یہ کیا بوگس۔۔۔"

"مزید برآں۔۔۔ اس انعام سے بچنے کا نسخہ خاکسار کے پاس موجود ہے۔ پوچھئے۔۔۔ کیا؟۔۔۔ ناچیز کو ججوں کی کمیٹی میں شامل کرلیجئے۔"

تین چار دن تک اس مسئلے پر عالی سے مزید جھائیں جھائیں ہوئی اور موصوف کو بالآخر میری بات ماننا پڑی۔ میں ایوارڈ کمیٹی میں شامل ہوگئی جس کے صدر بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ بالاتفاق رائے آدم جی ایوارڈ شوکت صدیقی کی "خدا کی بستی" کو دیا گیا۔

دفتر میں ایک روز بلال الدین احمد نے اطلاع دی کہ افواہ ہے کہ ان کی ماموں زاد بہن سلمیٰ صدیقی نے کرشن چندر سے شادی کرلی یا کرنے والی ہیں۔ اور یہ کہ کرشن چندر نے اسلام قبول کرنے کے بعد نکاح پڑھوایا یا پڑھوایا جائے گا۔

دفتر کے کمرے میں اس وقت مولانا عابد شبر بھی موجود تھے۔ موصوف قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے ایک شگفتہ مزاج نوجوان مجتہد اور زہرا مال کے رشتے دار تھے۔ اور ہمارے محکمے کے عربی رسالے کے غالباً مدیر۔ فوراً ان کی مدد سے کرشن چندر کو تہنیتی خط لکھا گیا۔

ابلاد الکراشی   باسم سبحانہ

۱۷ شعبان المعظم ۱۳۸۰ھ

یا اخی د محی السید ابوالادب عبدالاحد صاحب۔ دام مجدکم العالی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ۔ الحمد اللہ والمنہ کہ آپ اس دنیا میں بھی سرخرو رہے اور آخرت کی سرخروئی بھی نصیب ہوئی۔ آمنکم و زوجنکم الجمیلہ علی ہذالمواصلت قدمۃ تم القیس و سلمی فی عصرنا انتم احمرنی ہذاالعالم وجعل اللہ وجھکم احمر فی دار الاخرہ۔2

سنٹرل سکریٹریٹ میں پرانے بلاک کے نزدیک محکمے کی ایک عالیشان سہ منزلہ نئی عمارت تعمیر کی جا چکی تھی اور میرا علیحدہ دفتر کا وسیع و عریض کمرہ اب اس میں تھا۔ روپے میں سو ۱۰۰ پیسے والی کرنسی رائج کی جانے والی تھی۔ اس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے فلم۔ یہ پاکستان کا پہلا کارٹون فلم تھا۔ میں نے تیار کروایا

اسکرپٹ اور کمنٹری لکھی۔ چند نوجوان جرمنی سے کارٹون فلمز کی ٹریننگ لے کر آگئے تھے۔ انہوں نے بہت اچھا کارٹون فلم بنایا۔ ایک حضرت نوح کی قسم کا بوڑھا کرنسی ایجاد کرنے کی فکر میں سمندر کے کنارے تیزی سے ٹہل رہا ہے۔ اچانک اسے کوڑیاں نظر آجاتی ہیں۔

"اب بات ہو رہی ہے اعشاریہ سسٹم کی اور آپ پھر اور یجن پر پہنچ گئیں۔" فلم دیکھنے کے بعد ایک صاحب نے سرہلا کر کہا۔

اوریجن تک پہنچنے کی کوشش سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ گلاس میں ریت تیزی سے گر رہی ہے۔

لاہور۔ نومبر ۶۰ء نمبر ۴۹ لارنس روڈ میں آپا حمن گاجر کا حلوہ بنا رہی ہیں۔ نواب زادہ امتیاز علی خاں بھائی جان اور سبط حسن سے کسی بحث میں مصروف ہیں۔ چھاؤنی میں نسیمہ ممانی ماموں جان کے ہاں بے پایاں اداسی اور الم طاری ہے۔ اور نسیمہ ممانی ماموں جان کا بڑا لڑکا ہنی خون کے سرطان میں مبتلا ہے۔ رات کا وقت باہر پالا پڑ رہا ہے۔ عمیق بیڈ روم میں آتش دان کے اندر آگ روشن۔ سولہ سالہ ہنی پلنگ پر لیٹا ہے۔ اپنی چھوٹی چار سالہ بہن نتاشا کو جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہے۔ اس نے اپنے قریب لٹا رکھا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ مرنے والا ہے۔ جب ابا جان کا انتقال ہوا چندا ممانی نے نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ لکھنؤ میں دوسری رات کہا تھا۔ کاش ایسا ہوا کرتا کہ ایک آندھی چلتی اور اس میں سب ایک ساتھ مر جاتے۔ اس کے چند برس دوسری آندھی چلتی اور دوسری کھیپ ایک ساتھ مرجاتی۔ تاکہ جانے والوں اور پیچھے رہنے والوں کو صدمے نہ اٹھانے پڑتے۔

کراچی میں سردی کی لہر دوڑ رہی تھی اور کوئٹہ کی برفیلی ہوائیں۔ ن۔ م۔ راشد نیویارک سے آئے ہوئے تھے۔ ایک روز باغیچہ دیکھ کر بولے۔ "آپ نے کتنا اچھا باغیچہ بنوالیا۔"

"باغبانی اماں کا شوق ہے۔" میں نے کہا۔ اس وقت باغیچے میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور ان پھولوں کی طرح دنیا میں کیسے رنگارنگ انسان موجود تھے۔ غالب والے ستر ہزار انسان۔

زیادہ تر انسان سویٹ تھے۔ چند کریک اور تھوڑے سے کروک اور کمینے۔ اور منافق۔ اور ایسے لوگ دنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔۔۔ اے ری مائی کیسے کیسے لوگ۔

انسانوں کے علاوہ مکانوں نے مجھے ہمیشہ فیسی نیٹ کیا۔ ہر طرح کے مکان۔ چھوٹے۔ بڑے۔ حویلیاں۔ بنگلے۔ کاٹج۔ فلیٹ۔ جھونپڑے۔ ساری دنیا میں کتنے اربوں مکان ہیں اور ان میں لوگ رہتے ہیں۔ ہر مکان کے اندر ایک منفرد دنیا آباد ہے۔

محض اس تین کشادہ کمروں، دو غسل خانوں، ایک وسیع باورچی خانے، ایک برآمدے والے، گراؤنڈ فلور فلیٹ کی اپنی اندرونی دنیا۔ طویل دریچوں۔ زرد ٹائیلوں والا لمبا برآمدہ، جس کے ایک سرے پر ڈرائنگ روم تھا جس کا ایک دروازہ باہر زرد ٹائیلوں اور سرخ منڈیر والے چبوترے پر کھلتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کے باہر املتاس کا درخت کھڑا تھا۔ ایک برآمدے کے ڈرائنگ روم والے سرے پر غسل

خانہ تھا جس کی کھڑکی کے برابر شریفے کا درخت تھا اور شریفوں پر ہرے طوطے بیٹھے رہتے تھے۔ فلیٹ کے پچھواڑے وسیع قطعہ زمین پر بلند و بالا درخت استادہ تھے۔ ان کے عقب میں احاطے کی اونچی دیوار موسم خزاں میں یہ قطعہ زمین زرد پتوں سے اٹ جاتا تھا۔ دوپہر کے سناٹے میں شمس الدین مالی کی لمبی جھاڑو سرسرانے کی آواز آتی تھی۔ شب مہتاب میں اس پر سکون پلاٹ پر اکادکا خودرو سفید پھول چمکتے نظر آتے۔ گرمیوں میں وہاں خشک پتے اڑتے۔ برسات میں خودرو گھاس اچانک اگ آتی۔ اور ہاتھ ہاتھ بھر اونچی ہو کر ہری ہری اور تروتازہ۔ نمناک ہوا میں چوڑی ندی کی طرح بہتی۔ اور سامنے کے باغیچے میں سال کے بارہ مہینے شمس الدین ٹھیک دس بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک کیاریوں میں مصروف رہتے اور گنگناتے جاتے اور سیمل کے تنے پر کھٹ کھٹ بڑھئی کھٹ کھٹ کرتی اور جھاڑیوں پر سفید اور اودی اور عنابی تیتریاں منڈلاتیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے۔ یہ پھلواری بالکل اجاڑ پڑی تھی۔

فرینک لائیڈ رائٹ کے ہمعصر جرمن معمار فان روئے امریکہ میں پکچر ونڈو رائج کی۔ جس کے سالم پلیٹ گلاس میں سے باہر باغ ایک پینٹنگ کے مانند نظر آتا ہے۔ یا باغ کمرے کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ اگر باہر صحن چمن موجود نہ ہو تو دریچے کے پیچھے ایک بڑی تصویر لگا دی جاتی ہے یا شیشے پر باغ کا منظر اس طرح پینٹ کیا جاتا ہے کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہو۔

نمبر ۱۶ گارڈن روڈ پر کھڑکیوں کے سامنے اونچے درختوں پر زرد اور سرخ اور سفید پھول کھلے تھے اور اس کے آگے میدان تھا، جس کے چاروں طرف اسی قسم کی گلابی عمارتوں میں مزید انسان رہ رہے تھے۔ اور دور پھاٹک کے باہر سڑک پر ٹریفک رواں تھا اور دنیا کے مناظر کیا متنوع اور تحیر انگیز اور دلچسپ اور کرب آفریں اور دہشت ناک اور فسوں خیز تھے اور کیسے کیسے لوگ۔۔۔ ستر ہزار انسان۔

ایک سہانی صبح نمبر ۱۶ ڈی گارڈن روڈ پر شمس الدین مالی کیاریوں میں پانی دے رہے تھے، جب اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑے کھڑے میں نے دفعتاً طے کیا کہ اماں کو علاج کے لئے انگلستان لے جانا چاہئے۔ اور اگر وہاں مستقلاً قیام کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ اماں سے ان کے کمرے میں جا کر کہا۔ فوراً تیار ہوگئیں۔ بولیں۔ "اینچور لائن کو فون کرو۔" ابا جان کی مستقل سیاحتوں کی وجہ سے وہ اینکر لائن سے خوب واقف تھیں اور اسے مذاقاً اینچور لائن کہتی تھیں۔

"تمہارے ابا جان کے کیبن ٹرنک سارے بے چاری حسو کے ہاں لکھنو میں پڑے ہیں۔ نئے خریدنے ہوں گے۔"

میں نے کہا "۔۔۔ وہ یہاں ہوتے بھی تو اتنے پرانے ہو چکے ہوں گے کہ کام نہ آتے۔ اور بہرحال اس وضع کے اسٹیمر ٹرنک اب رائج نہیں ہیں۔"

حسنین ماموں ناظم آباد میں شاہجہاں اور حسن احمد ماموں کے ہاں مقیم تھے۔ چندا ممانی نے گارڈن روڈ آکر اسی احتیاط اور جانفشانی سے پیکنگ شروع کی جس طرح انہوں نے مئی ۴۳ء میں نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ لکھنؤ میں کی تھی۔ میں نے چھ سات سو کتابوں کو دو بڑے صندوقوں میں بھرا۔ چار پانچ سو نسبتاً غیر اہم

کتابیں وہیں چھوڑیں۔ اماں نے چارٹرڈ بنک جاکر اپنی جناتی انگریزی لکھائی میں ٹریولز چیکوں پر دستخط کئے۔ اپنے خرچے پر ولایت کا یہ میرا دوسرا سفر تھا۔

بھائی بھابی اور بچے چند روز کے لئے گارڈن روڈ آگئے۔ ایک شام جمیل جالبی الوداعی دعوت کا کھانا لے کر گارڈن روڈ آئے۔ خدا حافظ کہنے والوں کا ہجوم روز بروز بڑھتا گیا۔

۲۳ فروری ۶۱ء کی صبح اینکر لائن کے لگژری لائنرز کے کیلئے ڈوینا کے ڈیک پر کلثوم بھابی کسٹم افسر کی سفید ساری کے یونیفارم میں ملبوس میز پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ جو ۱۹۳۸ء میں بحیثیت ایم۔ ایل۔ اے' یو۔ پی اسمبلی کے اجلاس کے لئے مراد آباد سے نمبرا' رائے بہاری لال روڈ لکھنؤ آیا کرتی تھیں۔

جہاز کا زینہ ابھی سنسان پڑا تھا۔ خواجہ مظہر القیوم نے اماں کو ڈیک تک پہنچایا۔ وہ تیز نیلی ریشمی ساری پہنے اطمینان سے کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتی خود ہی اوپر پہنچ گئیں۔ وہ ولایت جانے کے خیال سے بہت خوش تھیں۔

جہاز پر صبح دس بجے سے رات کے آخری بھونپو تک رشتے داروں کا تانتا بندھا رہا۔ لوگ کافی حیران تھے کہ اتنا بڑا ہجوم کے پہنچانے آیا ہے۔ اور مستقل چلا آرہا ہے۔ جہاز کا عملہ مسافروں کو پہنچانے والوں کو چار بجے کی چائے سے نوازتا تھا۔ چار بجے ڈائننگ ہال سادات نہٹور ولانکڑی سے پر تھا۔ لاہور سے خدا حافظ کہنے کے لئے آئے ہوئے بھائی حمید علی اور چند عزیز اماں کے کیبن میں موجود تھے۔ اماں نے مہمانوں کو زبردستی چاء پلانے اور خاطریں کرنے کا مرغوب مشغلہ وہاں بھی شروع کر دیا۔ اطمینان سے آواز دی "----احمد شاہ۔ چاء لاؤ---"

اب میں کیا دیکھتی ہوں کہ احمد شاہ بڑے ٹھاٹھ سے چائے کی کشتیاں' پینٹری سے اٹھا اٹھا کر سیڑھیاں چڑھتے کیبن کی طرف بار بار لئے جا رہے ہیں۔ مسافروں کے ہجوم اور روانگی کی افراتفری میں ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ خان صاحب آپ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

رات کے گیارہ بجے جہاز کے آخری بھونپو کے ساتھ رشتے دار جہاز کی سیڑھیاں اترے۔ چندا ممانی نے بہت خوبصورت پشاوری چپلیں پہن رکھی تھیں۔ دن میں کسی وقت میں نے ان کی تعریف کر دی تھی۔ برآمدے میں سب کو خدا حافظ کہنے کے بعد میں نے کیبن میں آکر دیکھا وہ چپل میرے پلنگ کے نیچے موجود تھے۔ میں فوراً باہر گئی۔ اور ریلنگ پر جاکر دیکھا۔ نیچے لیمپ کی روشنی میں حسنین ماموں' منور ممانی' شاہجہاں' پھول اور ثریا وغیرہ کے ساتھ ساتھ چندا ممانی غرارہ پہنے سج سج کھردری زمین پر ننگے پاؤں چلتی پھاٹک کی سمت جا رہی تھیں۔

اچانک پیروں تلے انجن نے گھڑگھڑانا شروع کر دیا۔

۲۰ مئی ۱۹۲۴ کو ایس۔ ایس۔ اکیوبیلا پر انگلستان جاتے ہوئے ابا جان نے اماں کو لکھا تھا۔ "فرسٹ کلاس پارسنوں اور ہندو بیبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب دولت ہندوستانیوں کے پاس آرہی ہے۔ یا زیادہ صحیح یہ کہ اب دولت کا صحیح استعمال انہوں نے سیکھ لیا ہے۔ سیکنڈ اور تھرڈ کلاس میں

عرب ہیں۔ ایرانی ہیں۔ ہندوستانی ہیں۔"

۱۹۲۴ء کی پارسنیں اور ہندو بیبیاں "اپر کلاس" تھیں۔ اب دولت باہر جاکر تجارت کرنے والے نچلے متوسط طبقے اور ورکنگ کلاس ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے پاس آرہی تھی۔ ۱۹۶۱ء کے برطانوی جہاز ایس۔ ایس کیلئے ڈوینا کے فرسٹ کلاس میں انگلستان' امریکہ اور کینیڈا میں بسے ہوئے چند ان پڑھ پنجابی اور سکھ اور ان کے خاندان سفر کر رہے تھے۔ یہ لوگ ڈیک پر دری بچھا کر ہیر گاتے' سنترے کے چھلکے سارے میں بکھیرتے۔ زور زور سے ٹرانزسسٹر بجاتے اور انگریز مسافر خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہتے۔ کسی کا راکب۔ کسی کا مرکب---

۱۹۲۴ء میں جو عرب اور ایرانی تھرڈ کلاس کے مسافر تھے ان کی اولاد نصف صدی بعد اپنے پٹرو ڈالرز کے ذریعہ آدھی دنیا کی معاشیات کو تہ و بالا کرنے والی تھی۔

میری صراحی سے

"۲۴ مئی ۱۹۲۴۔

---- عدن پر تین کشتیاں مسافروں کی ہمارے جہاز پر آئیں۔ عورتیں گوری۔ انگریزی لباس۔ اعلیٰ درجے کے فیشن ایبل سوٹ پہنے مرد۔ سر پر ترکی ٹوپیاں۔ میں سمجھا فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں۔ سب تیسرے درجے میں گئے۔ یہ سب یہودی اور یہودنیں تھیں۔"

۱۹۲۴ء کا ترکی ٹوپی پہننے اور تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والے شرق اوسط کا یہودی اور آج کا مغرور اسرائیلی۔ کسی کا راکب' کسی کا مرکب' کسی کو عبرت کا تازیانہ۔

جہاز پر تیسرے دن اماں نے کہا۔ "میں تو غلتا اتار' ساری باندھ چار دفعہ ڈائننگ ہال نہیں جاؤں گی۔ کپتان سے کہو۔ میرے لئے کھانا چاء کیبن میں بھیجا کرے۔"

"وہ آپ کو خوب چلتا پھرتا دیکھ چکا ہے ہرگز نہ مانے گا۔"

"مانے گا کیسے نہیں۔ میں تو کیبن ہی میں کھاؤں گی۔"

مجبوراً میں نے جاکر کپتان سے بات کی۔

پرانی وضع کے انگریز طرز گفتگو میں اہل لکھنؤ کی طرح بے حد اخلاق و تہذیب برتتے تھے اور مخاطب کی ماں یا بیوی کو "لیڈی مدر"۔ "لیڈی وائف" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ وہ بوڑھا کپتان بولا۔ "لیکن جہاں تک میرا خیال ہے تمہاری لیڈی مدر چلنے پھرنے سے معذور نہیں ہیں۔"

میں نے فریکچر کی داستان گوش گزار کی اور بتایا کہ "دن میں چار مرتبہ ڈائننگ ہال کا زینہ اترنا چڑھنا ان کے لئے دشوار ہے۔"

اس نے کہا۔ "اوہ--- مجھے بے حد افسوس ہے۔ تب تو میں چیف اسٹیورڈ سے ضرور کہہ دوں گا۔"

اس کے بعد گوانی اسٹیورڈ چاروں وقت چائے کھانے کی کشتیاں اماں کے لئے کیبن میں لانے لگا۔

تین چار پاکستانی لڑکے لڑکیاں جو ڈاکٹری اور سائنس کی اعلیٰ ٹریننگ[1] کے لئے لندن جا رہے تھے اور دو ہندوستانی لڑکیاں ارون دھتی اور الویرا ان کے حلقہ احباب میں شامل ہوئیں۔ انہوں نے کیبن میں مجلس آرائی شروع کی پھر انہوں نے اسکاٹش ڈاکٹر سے تعلقات استوار کئے۔ جو ہر تیسرے روز آکر بلڈ پریشر دیکھتا۔
پچھلی مرتبہ جب میں سویز سے گزری تھی اینگلو فرنچ اسرائیلی افواج نے ابھی نہر پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اب سویز نیشنلائز کی جا چکی تھی اور اہل مغرب کی توقعات کے برخلاف نہر کے مصری پائلٹ اور انجینئر نہایت خوش اسلوبی اور مہارت سے سوئز میں سے جہازوں کو لے جانے میں مصروف تھے۔ موسیو ڈی ایپ کا وہ عالی شان مجسمہ جس نے ۱۹۱۱ء میں اباجان کو متاثر کیا تھا توڑ پھوڑ کر برابر کیا جا چکا تھا۔
دوسرے روز صبح اماں ڈیک پر کرسی بچھا کر بندرگاہ کی سیر میں مشغول ہوئیں۔ میں 'الویرا' ارون دھتی اور دوسرے مسافر قاہرہ جانے کے لئے جہاز سے اترے۔

۶۔ دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار

ہرے رنگ کی لگژری کوچ چیک پوسٹ کی بے رونق عمارت کے سامنے کھجور کے جھرمٹ میں کھڑی جھلملا رہی تھی۔ مقابل کی بارک میں سے چند فوجی کھٹ کھٹ کرتے سڑک پر آئے اور اچک کر ایک ٹرک میں بیٹھ گئے۔ کوچ کا ایکٹر نما ڈرائیور رنگین رومال سے اپنی باریک مونچھیں صاف کرتا چاء خانے سے لوٹا۔ سڑک کے سرے پر ایک بالکنی کا دروازہ کھلا اور سیاہ فراک میں ملبوس ایک موٹی عورت نے اخبار کا بڑا سا پڑا بنا کر نیچے پھینک دیا جو ہوا میں آہستہ آہستہ تیرتا ہوا آکر فٹ پاتھ پر گر گیا۔
جیٹی کی سیڑھیوں پر سے یہ سارا منظر سلوموشن کی خاموش فلم معلوم ہو رہا تھا۔
ہم لوگ لانچ میں سے کود کود کر نم زینے پر آگئے اور چبوترے پر چڑھے۔ طویل القامت ٹریول ایجنٹ نے کوچ کا دروازہ کھولا اور سر خم کرکے مسکرایا۔ وہ بڑھیا سوٹ میں ملبوس تھا۔ اور آنکھوں پر اس نے بہت پھیلے ہوئے گوگلز لگا رکھے تھے۔ اس کا خوش مزاج اسسٹنٹ جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے سب سے آخر میں تقریباً پھدکتے ہوئے آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کوچ اسٹارٹ کرنے کے لئے اس نے الاہرام کا بونگا بنا کر ایکٹر نما ڈرائیور کے شانے کو کھٹکھٹایا۔ اس نے ایک انگلی میں سونے کی بھدی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس میں سیاہ پتھر جڑا تھا۔
کوچ بندرگاہ سے نکلی۔ باتوں کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ الویرا اور ڈاکٹر رائے چودھری اور ارون دھتی' دونوں نوجوان پاکستانی ڈاکٹر' پاکستانی پنجابی انجینئر اور اس کی بیوی۔ باقی سب انگریز اور یوروپین۔
کوچ شہر سے نکل کر ریگستان میں داخل ہوئی۔ اب افق کے کنارے کنارے دو پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جن میں سے ایک کی شکل ایک طویل مہیب ممی کی ایسی تھی جس کا پروفائل آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ساقین جنوب کی سمت پھیلے تھے۔

کیا حیران کن بات تھی۔
لمبے ایجنٹ نے مائیکروفون ہاتھ میں لے کر بولنا شروع کیا۔ "آپ لوگ جب دس سال بعد یہاں آئیں گے۔ اس وقت تک انشاء اللہ ہمارا اسوان ڈیم تیار ہو چکا ہوگا۔ اور یہاں سے قاہرہ تک کا یہ اسی میل کا صحرا ایک زرخیز سرسبز و شاداب علاقہ ہوگا۔"
ایک بھدی سی عمارت دھوپ میں چمک رہی تھی۔ لمبے ایجنٹ نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "ہمارے ایک بادشاہ نے جو ہمارے اور سب بادشاہوں سے زیادہ بیہودہ تھا۔ پچھلی صدی میں یہ محل بنوایا تھا۔ ہمارے اس نامعقول حکمراں نے ایک کسان لڑکی کو یہاں بھیڑیں چراتے دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے کئی لاکھ پاؤنڈ کی مالیت کا یہ محل اس چرواہی کے لئے بنوایا جبکہ فلاحین ریگستان کی بھوک میں مرا کئے اور ریتیلی زہر آلود ہوائیں ان کو اندھا کرتی رہیں۔"
"طہٰ حسین۔۔۔" میں نے بے ساختہ کہا۔
مونچھوں والے اسسٹنٹ نے مڑ کر خوشی سے مجھے دیکھا۔
"شہزادی اور فوٹوگرافر کا سنسنی خیز رومانس۔۔۔" پیچھے بیٹھی ایک انگریز خاتون نے ایک زنانہ برطانوی رسالے کا دوسرا ورق پلٹا۔ محل پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ یک بیک سب خاموش ہو گئے۔ اخباروں اور رسالوں کے ورق کھڑکھڑاتے رہے۔ دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔
اچانک گہرا نیلا سمندر عین آنکھوں کے سامنے لہریں مارنے لگا۔ شفاف۔ ٹھنڈا۔ نیلگوں پانی' صحرا کی زرد' تپتی ہوئی ریت کے مقابل میں اس کی نیلاہٹ اور زیادہ بھلی اور فرحت بخش معلوم ہوئی۔
"ہم لوگ اتنی دور نکل آئے مگر ابھی تک سمندر کے کنارے کنارے جا رہے ہیں۔ الویرا نے اظہار خیال۔ لمبا ایجنٹ ریڈیو آن کرنے لگا۔
"ام کلثوم۔۔۔!" میں نے کہا۔
چیچک رو اسسٹنٹ نے دوبارہ مڑ کر خوشی سے مجھ پر نظر ڈالی۔
قاہرہ پہنچ کر ہم لوگ ایک قہوہ خانے میں گئے۔ صحن میں کرسیاں اور میزیں لوگوں سے گھری ہوئی تھیں۔ میں ارون دھتی' الویرا اور ڈاکٹر رائے چودھری ایک کونے میں بیٹھ کر سوڈانی ویٹر کا انتظار کرنے لگے۔ صحن کے شمالی سرے پر ایک بے حد حسین لڑکی سبز رنگ کے فراک میں ملبوس سبز ہیٹ لگائے بہت سے مردوں کے ہجوم میں گھری بیٹھی تھی۔ ہمارا لمبا ایجنٹ بھی وہیں پہنچا ہوا تھا۔ وہ مصری لڑکی لگتا تھا VOGUE کے کسی صفحے سے نکل کر آئی تھی۔
"یہ کون ہو سکتی ہے۔" الویرا نے کہا۔
"تائیس۔ تائب ہونے سے پہلے۔" میں نے جواب دیا۔
کافی دیر بعد ایجنٹ ہماری طرف آیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی جس کا آدھا تنا برطانوی طرز کے پب میں شامل تھا۔ بار پر بیٹھے لوگ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

جواباً وہ بھی مسکرائی۔ ایک درشت چہرے والی عورت، نقلی زیور پہنے تیز تیز قدم رکھتی پاؤڈر روم سے نکلی۔ ہم تینوں ساری پوش لڑکیوں کو غور سے دیکھا اور پہلو کی اندھیری گلی میں اتر گئی۔

ہم لوگ باہر آکر کوچ میں بیٹھے۔

اس وقت ہم نے پہلی بار اس سرخ بالوں والی عورت کو دیکھا۔ وہ سب سے اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ جہاں مونچھوں والا اسسٹنٹ بیٹھتا تھا۔ اس نے کتھئی رنگ کا معمولی کوٹ اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک دفعہ مسکرائی۔ اس نے ہونٹوں پر گہرا رنگ اور پلکوں پر سیاہ روغن لگا رکھا تھا۔ اس کے سراپا میں سب سے زیادہ ممتاز چیز اس کے بال تھے۔ آگ کی طرح دہکتے ہوئے سرخ بال۔ اس کی عمر پینتیس یا چالیس سال رہی ہوگی مگر جس طرح کی زندگی وہ بظاہر گزار رہی تھی۔ اس کی وجہ سے زیادہ عمر رسیدہ معلوم ہو رہی تھی۔ نوجوانی میں یہ عورت بھی سبز فراک والی "ٹائیس" کی طرح بے حد دلکش رہی ہوگی۔ وہ گویا ٹائیس کا مستقبل تھی۔

اب سبز فراک والی لڑکی بھی اندر آگئی اور لمبے ایجنٹ کے پاس بیٹھ گئی۔ مونچھوں والا چیچک رو آدمی سرخ بالوں والی کے پاس آن بیٹھا۔

کوچ روانہ ہوئی، سرخ بالوں والی نے تیز تیز لہجے میں مونچھوں والے سے عربی میں کچھ کہنا شروع کیا۔ مونچھوں والا ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر ہم لوگوں سے کہا "یہ میری بیوی ہے۔" اس پر عورت اور زیادہ خفا ہوئی اور اس نے مزید عربی بولی۔

ڈاؤن ٹاؤن قاہرہ پہنچ کر ہم لوگ ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے اترے اور تتر بتر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد لمبا ایجنٹ باقی لوگوں کی قیادت کرتا دوسرے آرکیڈ میں سے آتا نظر آیا۔ "ٹائیس" اس کے ہمراہ تھی۔ "یہ کون خاتون ہیں؟" الویرا نے پوچھا۔

"میری بیوی۔" ایجنٹ نے اطمینان سے جواب دیا۔

اب سورج ڈھل رہا تھا۔ اہرام کے چاروں طرف حد نظر تک خوشگوار دھوپ۔ قاہرہ کے شہری سائیکلوں، اسکوٹروں اور موٹروں پر لد کر ہوا خوری کے لئے آئے ہوئے تھے۔ شہر فلک بوس جدید عمارتوں کے بعد اہرام یکلخت چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوئے۔ ان گنت مصری ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز اہرام پر چڑھتے اس کی چوٹیوں کی طرف جا رہے تھے یا نیچے اتر رہے تھے۔

سب سے بڑے مقبرے کے دروازے پر ایک خشمناک طویل القامت عبا پوش گائیڈ نے ہمیں آلیا۔ "گڈ ایوننگ میڈیم۔ ای چیٹ لائیک انڈیا وری اولڈ کنٹری۔۔۔ کم ان میڈیم۔ کم اون ان۔۔۔"

اندر نیم تاریک ڈیوڑھی میں ایک جم غفیر موجود تھا۔ غلام گردش میں کچھ دور جا کر الویرا گھبرا گئی۔ "میرا تو دم گھٹ جائے گا۔" اس نے کہا اور الٹے پاؤں باہر بھاگی۔ ہجوم نے دھکا دے کر مجھے اور ارون دھتی کو آگے بڑھا دیا۔ ہم نے بادل ناخواستہ پتلا آہنی زینہ چڑھنا شروع کیا۔ نیچے سنگلاخ چکنی سرمئی دیواریں تہ در تہ تاریک کرے۔ تینوں طرف سے دیواریں اس طرح جھکی آ رہی تھیں جیسے دم گھونٹ دیں گی۔

دیواروں میں برقی روشنی کے ٹیوب لگے تھے۔ ان دیکھے موکھوں میں سے ہوا کی رمق آ رہی تھی۔ چاروں ہاتھوں پیروں پر جھکے تاکہ سر چھت سے نہ ٹکرائے ہم لوگ ہانپتے کانپتے اوپر چڑھ رہے تھے مگر زینہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ آگے اور پیچھے ایک خلقت بھیڑ وہاں اوپر جانے کے لئے کوشاں تھی۔ یا نیچے اتر رہی تھی۔

بالآخر ہم اوپر "کنگز چیمبر" تک پہنچ گئے اس کی تنگ سرمئی دیواروں والے صندوق نما کمرے میں پتھر کا خالی تابوت رکھا تھا۔ کمرے میں ناقابل برداشت حبس طاری تھا۔ میں وحشت زدہ ہو کر الٹے پاؤں واپس بھاگی۔

نیچے اہرام کے باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان، پرندے، ہرے بھرے درخت، ہوا۔ تازہ ہوا۔ ہوا کتنی بڑی نعمت ہے۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔" میں نے منڈیر پر کھڑے ڈاکٹر رائے چودھری سے غصے سے کہنا شروع کیا۔ "کہ میں پانچ ہزار برس کی تاریکی اور دہشت اور گہری اور بعد اور تنہائی کا سفر طے کرکے آ رہی ہوں اور اہرام مصر ایک عظیم الشان فراڈ ہیں۔"

"ٹٹ۔ ٹٹ۔" ڈاکٹر رائے چودھری نے کہا اور ایک طرف کو مڑ گئے۔

دھوپ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ میں وہ ٹیلا اتر کر سڑک پر آئی جس کی دوسری جانب گل رنگ آسمان کے مقابل یکلخت ابوالہول نظر آیا، وہ شفق کی روشنی میں زیادہ، پراسرار، پرسکون اور عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی شکستہ مسکراہٹ میں نرمی تھی اور دردمندی۔ اور جنے کیا۔ ہزاروں برس سے وہ دنیا کا اسی طرح نظارہ کر رہا تھا۔ یا تھی۔ ویسٹ لینڈ کے ٹائی رے سس کی مانند۔

I, TIRESIAS
PERCEIVED THE SCENE AND FORETOLD THE REST 1 TOO
AWAITED THE EXPECTED GUEST
AND I TIRESIAS HAVE FORE SUFFRERED ALL:-

آس پاس چھوٹے اہراموں کے چاروں طرف اوپری طبقے کے مصری لڑکے اور لڑکیاں شہسواری کرتے پھر رہے تھے۔

رفتہ رفتہ سورج ابوالہول کے پیچھے ریت میں ڈوب گیا۔

"اور جنوب کی سمت سے ایک انسان دبے پاؤں آیا اور اسفنکس کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

"لبیک اسفنکس۔۔۔ جولیس سیزر کا سلام قبول کر۔۔۔

اس دنیا میں پیدا ہونے کی وجہ سے جن دنیاؤں سے مجھے جلاوطن ہونا پڑا، ان کی اور ایسے انسانوں

کی تلاش میں' جیسا میں خود ہوں میں ملکوں ملکوں گھوما ہوں۔ مجھے ریوز اور چراگاہیں' آدمی اور شہر دکھلائی دیئے' لیکن کوئی دوسرا سیزر نہ ملا۔ کوئی انسان اپنا جیسا میسر نہ ہوا جو دن کو میرے کارنامے انجام دیتا اور رات کو میرے جیسے خواب دیکھتا۔ سامنے کی چھوٹی سی دنیا میں اے اسفنکس' میرا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا تیرا اس صحرا میں ہے۔ میں عمل کرتا ہوں اور متحیر رہتا ہوں۔ تو دیکھتی ہے اور منتظر ہے۔ میں اوپر نگاہ اٹھاتا ہوں اور میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ نیچے نظر کرتا ہوں اور اندھیرے میں ڈوب جاتا ہوں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ششدر رہ جاتا ہوں۔ جبکہ تو مسلسل سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہے دنیا سے باہر۔ کھوئی ہوئی دنیاؤں کی طرف۔ اس گہوارے کی سمت جہاں سے نکل کر ہم بھٹک گئے۔ اسفنکس۔ تم اور میں نسل انسانی کے لئے اجنبی ہیں لیکن ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں۔ روما ایک دیوانے کا خواب ہے۔ یہ۔ میری حقیقت یہ ہے۔ یہ ستاروں کے ایسے تمہارے چراغ' میں نے گال میں' برطانیہ' میں ہسپانیہ میں' تھلی میں' ہر جگہ دیکھے ہیں۔ چراغ جو تحت الثریٰ میں چھپے ہوئے کسی ابدی نگہبان کو اہم رازوں سے باخبر کر رہے ہیں۔ اس ابدی نگہبان کا مقام میں کبھی نہ پا سکا۔ وہ بالآخر یہاں موجود ہے۔ میری زندگی کے مستقل' اور زندگی جاوید حصے کا پرتو۔ خاموش' سوچتا ہوا لقرئی صحرا میں تنہا۔ اسفنکس۔ اسفنکس۔۔۔۔

"بڑے میاں۔"

"دیوتاؤ۔۔۔۔!!"

"بھاگو نہیں بڑے میاں۔"

"بڑے میاں؟۔۔۔ میں جولیس سیزر ہوں!۔"

"بڑے میاں۔"

"اسفنکس۔۔۔! تم اپنی صدیوں کی عمر چھپاتی ہو۔ میں تم سے کہیں چھوٹا ہوں۔ گو تمہاری آواز لڑکیوں کی ایسی ہے۔"

"جلدی سے اوپر آجاؤ۔ ورنہ رومن تمہیں کھا جائیں گے۔"

"تم کون ہو؟۔"

"کلیو۔۔۔"3

کھٹ۔ کھٹ۔۔۔ میں نے گھبرا کے دیکھا۔ ڈاکٹر رائے چودھری ابوالہول کے ایک پنجے پر پائپ الٹا کر کے جھاڑ رہے تھے۔ اردن دھتی ٹہلتی ہوئی قریب آئی۔ گرے سوٹ میں ایک بزرگ "اولڈ اسکول" مصری جنٹلمین اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے انگریزی میں اپنا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر یوسف مراد ایک یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس پڑھاتے تھے۔ نہایت شائستہ اور ELEGANT ترکی ٹوپی اوڑھے۔ وہ نحاس پاشا اور وفد پارٹی کی گمشدہ دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

"مادموزیل۔ ابوالہول نے شاید آپ کو ڈرا دیا۔" ڈاکٹر مراد نے نرمی سے کہا۔

"نہیں۔ جی ہاں۔ جناب۔" میں نے کنفیوزڈ ہو کر جواب دیا۔ "دراصل میں یہ سمجھ کہ توت

عنخاموں کھٹ۔ کھٹ کر رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر قبل اہرام سے باہر آکر ان کو فراڈ کہا تھا۔ اور ممکن ہے وہ آمن ہوتپ سوئم بھی ہو سکتے تھے یا لارڈ کچنر۔" میں نے سوچتے ہوئے اضافہ کیا۔

"یا جنرل گورڈن۔۔۔" پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔ "سارے نام ماضی میں ایک ہو جاتے ہیں۔ ہیں نا۔" انہوں نے توقف کے بعد کہا۔ وہ ایک پرانے دوست معلوم ہوئے۔ سارے 'اجنبی' وہ سب لوگ جن سے ہم عمر بھر کبھی نہیں ملیں گے' ہمارے دوست ہو سکتے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا "۔۔۔ مثال کے طور پر نفرتی۔۔۔"

"یا کوئن وکٹوریہ۔۔۔" ڈاکٹر رائے چودھری بولے۔

پروفیسر یوسف مراد دردمندی سے مسکرائے گویا سمجھتے ہوں۔

"اور جب انسان مرجاتا ہے تو وہ اور آج سے پانچ ہزار سال قبل مرے ہوئے لوگ ایک ہو جاتے ہیں۔ ہم جب زندہ ہوتے ہیں۔ محض اس وقت تک ہی نئے اور مختلف اور جدید رہتے ہیں۔ یہ بہت خوفناک خیال ہے" میں نے ملول آواز میں اظہار خیال کیا۔

ڈاکٹر مراد نحاس پاشا اور گاندھی جی کا تذکرہ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے بون دویاژ کہا۔ شاید دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لئے۔

جامع محمد علی کی منذیر سے ہم نے شہر کا نظارہ کیا۔ البانوی نژاد خدیو محمد علی جو ڈیڑھ سو برس قبل مصر کو ترقی کے راستے پر کھڑا کر گیا۔ قاہرہ چاروں طرف پھیلا تھا۔ خوبصورت۔ عظیم شہر۔ مغربی افق پر سرخی ابھی باقی تھی۔ الازہر کی عمارت۔ قبطی کلیساؤں کے برج۔ نیو کائیرو کے محلات۔ جامع محمد علی کے احاطے میں سیاحوں کے لئے آمون رع اور ریمسیس کی مورتیاں بک رہی تھیں۔ اذان کی آواز بلند ہوئی اور قاہرہ کے آسمان کے نیچے شفق رنگ' بسیط فضا میں دیر تک لرزاں رہی۔ جس طرح شفاف گلابی پانی میں بلوریں سنگریزہ پھینکنے سے لہروں کا دائرہ دور تک پھیلتا چلا جائے۔

ہم لوگوں نے شیپرڈز ہوٹل جا کر کھانا کھایا۔ اور باہر آکر کوچ میں سوار ہوئے۔ سب سے آخر میں سرخ بالوں والی عورت اپنی جگہ پر آن کر بیٹھی اور اس نے زور سے قہقہ لگایا۔

"یار مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" الویرا نے چپکے سے کہا۔

"نون سنس۔" میں نے BRAVADO کے ساتھ جواب دیا "۔۔۔ ایک نشے میں آؤٹ قاہرہ کی طوائف کے ساتھ آدمی رات کے وقت سفر۔ کس قدر ایڈونچرس بات ہے۔"

کوچ نیل کے پل پر پہنچی۔ دریا پر سے گزرتے ہوئے' سیٹ پر نیم دراز سرخ بالوں والی عورت کے بال ہوا میں اڑنے لگے۔ اور اس نے ان کی مصنوعی لہروں پر ہاتھ پھیرا۔

میری پرنانی کی پرنانی سیاہ بلی تھی۔ سفید مقدس بلی کی بچی۔ اور دریائے نیل نے اسے اپنی ساتویں بیوی بنایا۔ اسی لئے میرے بالوں میں اتنی لہریں ہیں۔ اور اسی لئے میں من مانی کرنا چاہتی ہوں کیونکہ نیل کا پانی میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔4

"اب ہم الف لیلیٰ جا رہے ہیں۔" لمبے ایجنٹ نے مائیکروفون اٹھا کر اناؤنس کیا۔

"آہا۔ سمعیہ گمال!" میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں! سمعیہ گمال---" مونچھوں والے اسسٹنٹ نے مڑ کر بشاشت سے جواب دیا۔ ریڈیو پر چاچاچا شروع ہو گیا۔

سلویٰ۔ جہاں وہ ناچی۔ رقص میں لیلیٰ رہی۔ یحییٰؑ رہے۔ موسیٰؑ رہے۔ میں ہلاک جادوئے سامری۔ لیکن نہیں خواباں کوئی یاں جنس گراں کا۔ عزیز مصر۔ خدیو نحاس پاشا۔ ڈوریا شفیق۔ پراسرار عبدالوہاب۔ سراب۔ سراب۔ سراب۔

مسیح ناصریؑ جناب مریمؑ کی گود میں ننھے، گدھے پر سوار، ہیروڈ کے ظلم سے بچنے کے لئے مصر بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ بیت لحم کا ستارہ۔ لوگ ہیں کہ مستقل ادھر سے ادھر بھاگے پھر رہے ہیں۔ اور ملکوں اور شہروں کی دیواریں ہیں کہ اونچی ہوتی جا رہی ہیں۔ یوگی اینڈوی کو میار۔ یروشلم اور برلن۔ فلسطین سے مصر۔ مصر سے اسرائیل۔ اسرائیل سے جورڈن۔ مصر کے بازار میں یوسفؑ کا پڑا کر دیا۔ خداوند خدا میرا گذریا ہے جو مجھے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا ہے۔ جو مجھے ہری گھاس پر آرام کرواتا ہے اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چلتا ہوں5--- مصر سے کنعان، فلسطین سے یورپ۔ یورپ سے اسرائیل۔ اسرائیل سے جورڈن۔ غازہ میں نابینا--- ابن آدم کو کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں۔ ایلوہی۔ ایلوہی---اور میں موت کے سائے کی وادی میں چلتا ہوں میں ہر بدی سے خوفزدہ ہوں۔ میرا پیالہ لبریز ہے۔

بے چارے پروفیسر یوسف مراد کون تھے۔ مسلمان، عیسائی، یہودی---؟ ابوالہول کے تینوں دکھی بچوں میں سے وہ جو کوئی بھی تھے انہوں نے ٹائی رے سیس کی طرح پہلے سے سب دکھ بھوگ لئے تھے اور پیشن گوئی کر دی تھی۔

یہیں مقبرہ راس حسین ہے۔ اہل بلا کے قبلہ حسین۔

الف لیلے کی اسٹیج پر آرکیسٹرا والے مغموم شکلیں بنائے بیٹھے تھے۔ نائٹ کلبوں کے سازندے عموماً اداس صورت ہوتے ہیں۔ رقص شروع ہو چکا تھا۔ ایک دبلی پتلی رقاصہ "بیلی ڈانس" کے باریک لہنگے میں نیم ملبوس اپنی ٹانگیں ہوا اچھالنے میں مصروف تھی۔ ہم چاروں نے اسٹیج کے کنارے ایک میز کے گرد بیٹھ کر بڑے اسٹائل سے قہوہ منگوایا۔ گویا ہماری ساری عمر اسی طرح بیلی ڈانس دیکھتے اور قاہرہ کے نائٹ کلبوں میں راتیں گزارتے بسر ہوئی ہے۔ اس کے بعد بہت سی رقاصاؤں نے آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ سب کے پیٹ سفید جالی سے ڈھکے ہوئے تھے۔

"ماہ رمضان میں یہ بیہودگیاں۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ اسلامی ملک ہے۔" قریب کی میز پر بیٹھے پاکستانی ڈاکٹر نے کہا---

"لیکن یہ لوگ اپنے پیٹ نہیں ہلا رہی ہیں۔" شارمین نے مایوسی سے کہا"--- بیلی ڈانس میں

پیٹ ہی تو ہلاتے ہیں نا---؟"

"ہم سنا ہے پریذیڈنٹ ناصر حکم دیئے ہیں کی ان لوگ اپنا بدن کو یہ کریں۔ منے اپنا بدن پہلے جتنا کتی چھپاتا تھا اب جیاستی چھپائیں۔ اس لئے نہیں سکتیں---" ارون دھتی نے بنگالی اردو میں جواب دیا۔

"کیا نہیں سکتیں۔؟" میں نے دریافت کیا۔

"پیٹ سہیں ہلاتے سکتیں۔" ارون دھتی نے جواب دیا۔

"بے چاریوں کو سخت فرسٹریشن ہوتا ہوگا--- کہ پیٹ ہی نہیں ہلا سکتیں---" میں نے کہا۔

یہ زیادہ تر یونانی لڑکیاں تھیں۔ اس کے بعد دو لڑکیاں اور آئیں جن میں سے ایک چارلس اول کی ہم شکل تھی، دوسری شکل سے معصوم، ذہین اور حساس معلوم ہوتی تھی۔

"کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہے بے چاری۔" الویرا نے بے دھیانی سے اظہار خیال کیا۔

"خالص مڈل کلاس ردعمل۔ کیا دقیانوسی جہالت کی باتیں کرتی ہو۔ اچھا خاندان۔ برا خاندان۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی برکتیں ہیں بی بی۔ جہاں اس دھڑلے سے عورت کی تجارت کی جاتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ماسکو میں نائٹ لائف ہوتی ہی نہیں سرے سے---؟" میں نے کانٹا ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔

ایک گداز سی پختہ عمر عورت نے آ کر "یا مصطفیٰ"--- "گانا شروع کیا اور ساری رقاصائیں اسٹیج پر لوٹ آئیں اور اس کے ساتھ اس مقبول گیت میں شامل ہو گئیں۔ اب رات کے دو بج رہے تھے۔ ہم تینوں پاؤڈر روم میں گئے اور مشرقی خواتین کو صوفوں پر بے خبر سوتے پایا۔ ادھیڑ عمروں کی بدشکل، بے رنگ خواتین جو عینکیں لگاتی تھیں۔ ان میں سے ایک تیس سال سے مرزا پور میں رہتی تھی۔ ایک نے عمر عزیز کے پچیس سال سیالکوٹ کے ایک گرد آلود قصبے میں گزار دیئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں کیا کھویا تھا۔ کیا پایا تھا۔؟ اور وہ خرانٹ مغنیہ جو اسٹیج پر یا مصطفیٰ--- گا رہی تھی--- اس نے کیا کھویا تھا---؟ کیا پایا تھا---؟

"مس گورڈن--- اٹھئے--" الویرا نے صوفے کے قریب جا کر غیر شعوری طور پر اپنی پرانی "اسکول گرل آواز" میں احترام سے کہا"---اٹھئے---" ہم لوگ واپس چل رہے ہیں۔" وہ چاروں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ہم سب باہر نکل آئے رات خنک تھی۔ سرخ بالوں والی عورت کوچ میں پہلے سے آن بیٹھی تھی۔ اتنی دیر بعد اسے دیکھ کر عجیب یگانگت محسوس ہوئی۔ گویا وہ پرانی دوست ہو۔ ان نیم عریاں مصری رقاصاؤں کے مقابلے میں تو وہ اچھی خاصی مولون معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ زور سے بند کر کے قہقہہ لگایا۔ کوچ روانہ ہوئی۔

اب سڑکیں خاموش تھیں۔ بازار سنسان ہو چکے تھے۔ کوچ نے آبادی چھوڑ کر صحرا کا رخ کیا۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ سویز اسی میل دور تھا۔ لوگ سونے کے خیال سے سیٹوں پر نیم دراز ہو گئے۔ سناٹا چھا

گیا۔ لمبا ایجنٹ ڈرائیور کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا۔ سرخ بالوں والی عورت جھک کر آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگی۔ وہ غالباً بہت تفصیل سے اسے کچھ بتا رہی تھی۔ تقریباً آدھے تک لمبے ایجنٹ سے سرگوشی میں مصروف رہی۔

یکلخت اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ لمبا ایجنٹ اور مونچھوں والا اسسٹنٹ اطمینان سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ پھر اس نے بھی ایک سگریٹ جلایا اور آنسو پونچھے۔ اور سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

سب لوگ سو چکے تھے۔ کوچ صحرا کے عمیق سناٹے میں سے بے آواز خیال کی طرح گزر رہی تھی۔ چاروں طرف وسعت اور تاریکی اور ریت کے ذرے تھے۔ کولتار کی سیدھی سڑک پر سے گزرتی ہوئی روشن کوچ کے اندر مختلف قومیتوں اور رنگوں اور مذہبوں کے مختلف دنیاؤں سے آئے ہوئے اور مختلف دنیاؤں کی سمت جانے والے تمیں مرد اور عورتوں کمبلوں میں لپٹے آنکھیں بند کئے سو رہے تھے یا غنودگی کے عالم میں جہاز پر واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اور صبح کا' اور بریکفاسٹ کے سریلے باجے کا۔ اور روشن سمندر اور اپنے ہم سفروں اور عزیزوں کے مانوس چہروں کا' جو دوبارہ ان کا احاطہ کر لیں گے۔ وہ سب اس وقت سے کچھ پہلے کھو گئے تھے' اجنبی شہر' آسیب زدہ صحرا اور رات اور تکان اور نیم خوابی کا یہ سحر بہت مختصر تھا۔ ابھی یہ ٹوٹ جائے گا۔

سحر ٹوٹ گیا۔ سوئیز کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ دور سے اپنا جہاز دکھائی دیا۔ جسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی گویا وہ اپنا گھر تھا۔ نیچے اتر کر ہم اپنے پاسپورٹ لینے کے لئے چیک پوسٹ کی طرف بڑھے کوچ خالی ہو گئی۔ سرخ بالوں والی عورت سب سے پہلے اتر کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئی تھی۔

کسی نے اس کو خدا حافظ نہیں کہا۔ اس نے کسی کو خدا حافظ نہیں کہا۔ وہ کسی کو دیکھ کر مسکرائی بھی نہیں ہم تینوں جیٹی کی طرف جانے لگے تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر فرنچ میں کہا۔ "مادموزیل۔ آپ نے ایک پیکٹ گرا دیا۔"

"مرسی۔ مرسی بکو۔"

جواباً اس نے سر ذرا سا خم کیا۔ گویا وہ مصری ملکہ تھی۔ مقدس دریا کی بیٹی جس کی رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا تھا۔ مصری پر اسرار راتوں کی ملکہ۔ جو اپنے شاہی وقار اور تمکنت کے ساتھ باہر کی دنیا سے آئی ہوئی ایک حیرت زدہ اجنبی کا شکریہ قبول کرتی ہو۔

مسافر سیڑھیاں اتر کر لانچ میں جا بیٹھے۔ وہ کوچ کے پاس کھڑی رہ گئی۔ وہ اور اس کے دونوں ساتھی۔ لمبا ایجنٹ جو ہر ہفتے صبح و شام اسی طرح جہازوں پر آ کر غیر دلچسپ' دولتمند' احمق' سیانے' عقلمند' قنوطی' بے تکے' بھانت بھانت کے سیاحوں کو ایک ہی انداز ایک ہی الفاظ ایک ہی تعارف کے ساتھ اپنے شہر کی سیر کراتا ہے۔ جس کی خوبصورت اور کمسن محبوبہ شہر میں ایک عالی مقام طوائف ہے۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ سرخ بالوں والی عورت۔ وہ تینوں اسی میل کی صحرائی فاصلہ طے کر کے قاہرہ واپس جائیں گے۔ کس

قسم کے گھر کس قسم کی صبحیں کس قسم کی زندگیاں ان کی منتظر ہوں گی۔

کیونکہ اب پو پھٹ رہی تھی۔ سمندری ہوا بہت سرد تھی۔ جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں مدہم پڑ گئی تھیں۔ کیلے ڈونیا دور کھلے سمندر میں ایک باوقار' مضبوط' مہیب چٹان کی مانند کھڑا تھا اس پر لہراتے ہوئے یونین جیک نے مسافروں کو یقین دلانا چاہا کہ دنیا میں ابھی پائیداری باقی ہے۔ جنگ سوئیز کے باوجود۔

۷۔ رود ٹیمنز

دور سے جبل الطارق نظر آیا۔ اماں بہت مضطرب ہو کر کھڑکی سے لگی اس چٹان کو دیکھا کیں۔ اور اقبال کے اشعار دہراتی رہیں۔ اس پوری نسل کو اقبال' اور اسلامی تاریخ' اور اسلامی تجدید' کے جذبے' اور اپنے ماضی کے ورثے' اور اس کی المناک گمشدگی کا بڑا شدید احساس تھا۔ حالانکہ ان لوگوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ دور حاضر کی کوئی لڑکی میرے خیال میں جبل الطارق کو دیکھ کر متاثر نہیں ہو گی۔ شاید اسے اس چٹان کی معنویت کا علم بھی نہ ہو۔

لیکن ان کی نسل کی یہ ثنویت عجیب و غریب تھی جس میں "کلاس" کی دلچسپیوں کو بھی دخل تھا۔ منزل مقصود پر پہنچنے سے ایک رات قبل فینسی ڈریس بال کے لیے اماں نے نہایت خوشی کے ساتھ ایک انگریز عورت کو جس سے دوستی ہو گئی تھی سوٹ کیس کھول کر اپنی ایک ساری نکال کر دی اور اس سے برطانوی ہند کے کلبوں کا تذکرہ اسی نوسٹیلجیا کے ساتھ کیا جو کولونیل مشرق کے متعلق اس انگریز خاتون کا اپنا نوسٹیلجیا تھا۔

سرد اندھیری رات میں پر شور آئرش سمندر کے افق پر انگلستان کا مدھم ساحل نمودار ہوا۔ کنارے پر نصب سرلائیٹس کی تیز شعاعیں تاریک آسمان کو مختلف زاویوں سے کاٹ رہی تھیں۔ اماں نے برآمدے میں جا کر باہر دیکھا۔ سمندری ہوا کے تھپیڑے بہت ٹھنڈے اور نم تھے اور ان میں سمندری نمک رچا ہوا تھا۔

کیلے ڈونیا لورپول کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ گھٹا ٹوپ بادل۔ سردی۔ بارش کی پیہم پھوار۔

آہا۔ –۔ ہم انگلستان میں موجود ہیں۔!

ریس کورس کے سائز کا کسٹمز ہال مسافروں کا بے تحاشا سامان۔ اس انبار میں سے اپنی کتابوں کے ٹرنک تلاش کر کے طامس کک کے ذریعے فیروز جبیں کے پتے پر لندن بھجوانے انتظام کیا۔ اس کے بعد اماں ریلوے اسٹیشن کا آدھ فرلانگ لمبا پلیٹ فارم طے کر کے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئیں۔ ٹرین دھوئیں سے اٹے سلیٹی لورپول سے نکلی بارش تھی'۔ ٹرین شاداب سبزہ زاروں میں داخل ہوئی۔ مدھم سی دھوپ نکل آئی۔ گاؤں اور قصبوں کے سرخ' دو منزلہ مکانوں کی سرخ چھتیں۔ شمالی سورج کی کرنوں میں جگمگانے لگیں۔ گڑیا کے گھر جیسے مکان حد نظر تک سبزہ زاروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور انگلستان ہمیشہ کی طرح پر

سکون اور دلفریب تھا۔

لندن میں رسل اسکوائیر کا ایک ہوٹل۔۔ ایک روز فیروز جبیں اور رالف رسل کے ساتھ پڑوس میں یونیورسٹی جارہی تھی۔ اورینٹل اسکول کی سیڑھیوں پر عزیز احمد کھڑے ملے۔ ان کو کراچی سے آئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا اور اب کینیڈا کے لئے پر تول رہے تھے۔ کزن محمود احمد زیدی لندن اسکول آف اکنومکس سے چند سال قبل امریکہ جاچکے تھے۔۔۔ تقی احمد سید ہنوز بی بی سی میں تھے۔ چند روز بعد انہوں نے کہا یہ ہوٹل بہت منگا ہے جب تک فلیٹ ملے ارلز کورٹ کے کسی ہوٹل میں آجایئے وہاں رہ کر میڈ اویل کے علاقے میں مکان ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔

"مسٹر مور گنٹن۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"اسرائیل چلے گئے۔ اور آپ کا نمبر ۲۴ گریول پلیس سینٹ جانز ووڈ بھی شاید کسی ہندوستانی نے خرید لیا ہے۔ آپ بھی یہاں ایک مکان کیوں نہیں خرید لیتیں؟" تقی میاں نے کزن آل حیدر کی طرح اطمینان سے دریافت کیا۔

"مکان خرید لوں؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"بہت آسان بات ہے۔ ہم سب نے خرید لئے ہیں۔"

"میرے بس کا روگ نہیں۔ تقی میاں ان لوگوں کی صورتیں ہی اور ہوتی ہیں جو اس قسم کے معقول کام کرتے ہیں۔"

"دور اندیشی اچھی چیز ہے۔"

"میری نظر ہمیشہ سے کمزور ہے۔"

لندن میں کالشیوں کی یلغار کی وجہ سے کلر پرابلم شروع ہو چکا تھا۔ سوہو کے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر میں ایک پوسٹ دولفنڈن ریورٹ تیز و طرار چھوکری نے ایک طویل فہرست پیش کی۔ جس کے صرف چند پتوں کے سامنے (A) لکھا تھا۔ یعنی ایشیائیوں کے لئے پکیڈلی اور اوکسفرڈ سرکس میں قدم قدم پر شناسا پاکستانی ہندوستانی چہرے نظر آرہے تھے۔ انگریز کو برصغیر سے نکال کر جوق در جوق ہندوستانی پاکستانی ذوق و شوق سے اور بعض اوقات غیر قانونی طریقوں سے انگلستان پہنچ کر برطانوی قومیت حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش میں غلطاں و پیچاں تھا۔

ہم لوگ رسل اسکوائیر سے ارلز کورٹ ایک ہوٹل میں منتقل ہوئے جو اتنا ہی منگا تھا۔ ایک شام اماں کمرے میں نماز مغرب ادا کر رہی تھیں۔ میڈ نے ڈاک لاکر دی۔ میں نے پہلا خط کھولا۔ کراچی سے کشور نے اطلاع دی تھی۔ اس کے والد' آپا صدیقہ کے شوہر بھائی احمد رشید دہلوی کا انتقال ہوگیا۔ میں نے خاموشی سے وہ خط جانماز کے پاس رکھ دیا اور باہر چلی گئی۔ بھائی احمد رشید اماں اور ابا جان کے ایک چہیتے بھتیجے داماد تھے۔ وہ ہینڈسم شاندار' رشید بھائی اب تہہ خاک ہوں گے۔ کیا حیرت کی بات تھی آپا صدیقہ اور رشید بھائی ایک غیر معمولی طور پر خوش شکل جوڑا تھا۔

اے سرو باغ حضرت میر جناں مقام۔۔۔ ہم تم کو آج دیتے ہیں اپنے چمن کا پھول۔ ۲۹ء میں ان کی شادی پر ابا جان نے کہا تھا۔

اماں نے نماز ختم کی۔ خط پڑھا اور چپ سادھ لی۔

اسی وقت تقی میاں آگئے۔ انہوں نے کہا "۔۔۔۔ امجد علی چار مکان خرید کر بڑے لینڈ لارڈ بن چکے ہیں۔ ان کا ایک فلیٹ بیز واٹر میں ہے۔ فیض صاحب اس میں رہ چکے ہیں ۵۸ء میں۔۔۔ فوراً لے لیجئے ورنہ اس میں کوئی اور IMMIGRANT آجائے گا۔"

"فیض صاحب اس میں کیا کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"زین پڑھ رہے تھے!" تقی میاں نے محظوظ ہو کر جواب دیا۔

"اگر وہ گراؤنڈ فلور پر نہیں ہے تو میں نہیں جاؤں گی۔" اماں نے حسب عادت شرائط پیش کیں۔

"اور اٹیچڈ باتھ روم ہونا چاہئے۔ کمرے بڑے ہوں۔ یہ انگریز اپنے ملک میں کیا چھوٹی چھوٹی کولکیوں میں رہتے ہیں۔"

بی بی سی والے مسٹر امجد علی کے فلیٹ نمبر ۳۳ سینٹ اسٹیونز گارڈن' بیز واٹر میں منتقل ہونے کے بعد میں نے ایک سہ پہر ڈیپارٹمنٹ آف ایڈورٹائزنگ فلمز اینڈ پبلی کیشنز کراچی کو استعفے لکھ بھیجا۔ دس سال بعد لندن سے اسی محکمے کو میرے استعفے کا دوسرا خط جارہا تھا۔

"ملازمت کا کیرئر ہو تو ایسا۔" تقی میاں نے اظہار خیال کیا۔

"گو فارن ایکسچینج ابھی وافر موجود ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں یہاں کام تلاش کرنا چاہئے فی الحال بی بی سی پائندہ باد۔۔۔" میں نے لفافہ بند کرتے ہوئے کہا۔

بی بی سی کا مشرقی شعبہ' آکسفرڈ سرکس سے براڈ کاسٹنگ ہاؤس' بش ہاؤس منتقل ہو چکا تھا۔ اردو سیکشن میں صدیق احمد صدیقی مرحوم کی کرسی پر کوئی اور صاحب بیٹھے تھے۔ نور محمد چوہان اور محمد علی خاں ملیح آبادی بھی وفات پاچکے تھے عاقل[5] صاحب اور امجد علی ابھی موجود تھے۔ باقی نئے چہرے۔ یاور عباس اب بی بی سی ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین تھے اور ایک گاؤں میں مکان بنوا کر رہتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے قدوم میمنت لزوم کی اطلاع دی۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک مضمون میں "کلچر اور نہیں کلچر" لکھا تھا۔ مطلب واضح تھا۔ یاور عباس بہت محظوظ ہو کر یہ جملہ دہرایا کرتے تھے۔ اب اردو رسم الخط اور انگریزی زبان میں ان کا خط پہنچا۔

۲۴ اپریل ۶۱ء

ہلو عینی۔ جسٹ ریسیوڈ یور لیٹر۔ کم اینڈ اسپینڈ دی ڈے وداس اون سنڈے۔ آئی ول کال فور یو ان مائی کار اباؤٹ ٹن ان دی مورننگ۔

(YANI DAS BAJE)

GHAUSIA SIDDIQUI AUR ATIQ BHI A RAHE HAINPEHLE TUMHEN LAINE او۔ نی۔ پی AOOGA AUR
اینڈ فروم یور پلیس وی ول گو اوور ٹو پک اپ GHAUSIA ول بی ٹائمس ٹو سی یو۔ پچ لوکنگ فورورڈ ٹو۔ وی ول ہیوا ے لونگ چیٹ اون سنڈے

(YANI ITWAR)

NIAZMAND YAVAR.

غوثیہ صدیق احمد صدیقی مرحوم کی بیگم کا نام تھا۔ یاور کی بیوی انگریزی تھیں جن سے یاور نے دوران جنگ جاپان میں شادی کی تھی۔

ضیاء محی الدین نیویارک براڈوے کا ہٹ اسٹار ہونے کے بعد اب ساؤتھ کنگٹن کے ایک بڑھیا فلیٹ میں رہتا تھا۔ آل حسن شیپرڈوبش میں اپنے پرانے فلیٹ میں موجود تھے۔

لندن میں مقیم اماں کے مختلف منہ بولے بھائیوں بہنوں کی اولاد نے نمبر ۳۳ سینٹ اسٹیونز گارڈن آنا شروع کیا۔ حاضر ماموں کے بیٹے اور بھتیجے۔ خالہ امت الوحی کے صاحبزادے اور زبیر بھائی جو صرف چند سال قبل کراچی سے یہاں آئے تھے اور ایک بالکل خود ساختہ ٹائیکون بن چکے تھے۔ لندن سے باہر ان کا کنٹری ہاؤس تھا۔ ایک شاطو لکسمبرگ میں رکھتے تھے۔ یہ لوگ یقیناً حیرت انگیز تھے۔ بہت غور کیا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس قسم کی کامیابی کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

ایک شام پروگرام کرکے بی بی سی سے لوٹی دیکھا مکان کے سامنے پاکستانی ہائی کمشنر کی رولز رائس کھڑی ہے۔ وردی پوش انگریز شوفر پارک کی ریلنگ سے تکا دوسری طرف منہ کئے کھڑا سیٹی بجا رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا لے بھیا۔ اب آئی آفت۔ استعفےٰ کا خط پہنچتے ہی مارشل لاء گورنمنٹ نے کراچی سے ہائی کمشنر مقیم لندن کو ہدایت کی ہوگی کہ پکڑ کر بھجواؤ واپس پاکستان۔ جلدی سے دروازہ کھول کر اندر گئی۔ گیلری میں دو منٹ ٹھٹھک کر سوچا اماں کو کس طرح بتایا جائے کہ انگلستان سے ڈی پورٹ کرنے کا حکم نامہ صادر ہوا ہے۔ ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں قدم رکھا۔ وسطی میز پر بہت بڑا گلدستہ اور اس پر چوکور نیلا لفافہ رکھا تھا۔ اتنے میں اماں غسلخانے سے برآمد ہوئیں۔ کہا "۔۔۔ بے چاری روح افزا کا خط آیا ہے۔ جواب کے لئے ڈرائیور باہر کھڑا ہے۔"

"پیاری خالہ جان۔۔۔" "بھانجی" روح افزا نے لکھا تھا۔ "۔۔۔ کل بی بی سی میں مسٹر امجد علی سے معلوم ہوا کہ آپ لندن تشریف لائی ہیں۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔

اماں نے کہا "۔۔۔ ڈرائیور سے کہہ دو کل شام دونوں میاں بیوی آکر چاء پئیں۔"

اماں اپنے محبوب مشغلے یعنی دوستوں کو چاء پلانے میں منہمک ہو چکی تھیں۔ اور یہ ڈی پورٹیشن کا حکم نامہ نہیں تھا۔

روح افزا بیگم ان نجف علی خاں مرحوم کی نواسی تھیں، جن سے ابا جان نے ۱۹۰۸ء کے دہرہ دون میں سابق امیر کابل کا چارج لیا تھا۔ روح افزا بیگم کے شوہر جو غالباً ان کے کزن تھے جب پیدا ہوئے تھے ابا جان کے نام پر ان کا نام رکھا گیا تھا۔ موصوف اس وقت برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔[6]

اتوار کی سہ پہر جب سجاد حیدر صاحب اور ان کی بیگم تشریف لائے محلے کا انگریز ڈاکٹر اماں کا بلڈ پریشر دیکھ کر واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اماں نے مجھ سے کہا "۔۔۔ اس کی فیس دے دو۔ مگر ایک پاؤنڈ سے زیادہ مت دینا۔ ہر تیسرے چوتھے تو آئے گا۔"

"یہ نیشنل ہیلتھ کا ڈاکٹر ہے فیس نہیں لے گا۔" میں نے کہا۔

"اس سے مفت علاج تو کرواؤں گی نہیں۔ میں نے تو ڈاکٹر ہون کو جو اتنے عزیز دوست تھے ہمیشہ فیس دی۔"

سجاد حیدر صاحب نے نیشنل ہیلتھ اسکیم سمجھانے کی سعی ناکام کی۔ اس اثناء میں ڈاکٹر چلتا بنا۔ دوسرے ہفتے اماں چیک اپ کے لئے سرکاری ایمبولینس پر ہسپتال گئیں۔ وہاں بھی فیس کا مرحلہ پیش آیا۔ کہنے لگیں۔ "بل مجھے دکھاؤ۔ یہ ولایت ہے۔ بہت منگا علاج ہوا۔ پھر بھی کہیں بہت زیادہ نہ اینٹھ لیں۔"

میں نے دوبارہ سمجھایا کہ یہاں سارا علاج معالجہ مفت ہوتا ہے۔ کہنے لگیں "میں تو خیراتی ہسپتال میں علاج کرواؤں گی نہیں۔ بس اس دفعہ تو آ گئی۔ اب فیس والے ہسپتال میں جایا کروں گی۔"

قدرت اللہ شہاب آئے۔

انہوں نے بھی نیشنل ہیلتھ اسکیم کے متعلق سمجھایا۔ اماں نے دریافت کیا۔ "آپ لوگ اپنی خیراتی ہسپتالوں میں مفت کے ڈاکٹروں سے علاج کرواتے ہیں؟"

"بالکل۔"

اماں کچی گولیاں نہ کھیلی تھیں۔ پوچھا۔ "پھر وہ ہارلے اسٹریٹ والے ڈاکٹر کیا ہوئے؟"۔

"وہ سب اسپیشلسٹ ہیں اور بھاری فیس لیتے ہیں۔ آپ کو خدانخواستہ کوئی ایسا مرض تو ہے نہیں جس کے لئے اسپیشلسٹ درکار ہو۔"

بڑی مشکل سے راضی ہوئیں لیکن اب انہیں معلوم ہوا کہ جب بھی محلے کے ڈاکٹر کو فون کرو اس کی غیر حاضری میں پیغام ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ اور وہ یا اس کا لوکم جلد از جلد پہنچ جاتے ہیں۔ یہ انتظام بہت بھایا۔ اوپر سے ایک روز روح افزا بیگم نے کہا سجاد حیدر صاحب لندن سے باہر گئے ہوئے ہیں آتے ہی پاکستان ہاؤس کے میڈیکل ایڈوائزر کرنل فہیم کو دکھلائیں گے۔

ڈاکٹروں کی اس ریل پیل سے اماں نہایت مسرور تھیں۔ ایک روز ایک ہندوستانی اشتراکی دوست ملنے کے لئے آئے۔ میں بی بی سی گئی ہوئی تھی۔ شام کو لوٹی تو دیکھا آپ پریشان حال دل گرفتہ باورچی خانے کے دروازے میں چاء دانی لئے کھڑے ہیں اور اماں کے کمرے میں سجاد حیدر صاحب اور روح افزا چائے نوشی میں مصروف۔ اماں اطمینان سے پلنگ پر لیٹی باتیں کر رہی ہیں۔

اشتراکی دوست نے اشارے سے مجھے بلایا اور گیلری میں لے جا کر آہستہ سے کہا۔۔۔ "میرے ساتھ آج زبردست ایکنونی ہو گئی۔ میرا نام پاکستان کی بلیک لسٹ پر سرفہرست ہے۔ پاکستانی ہائی کمشنر بھی اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل میں اپنے والد سے ملنے لاہور جانا چاہتا تھا ویزہ نہیں ملا۔ ابھی جب میں یہاں پہنچا' آپ کی والدہ نے اطمینان سے کہا۔۔۔ "میاں ذرا چائے تو بنا کر لا دو۔" میں پچھلے ایک گھنٹے سے چائے بنا بنا کر پاکستانی ہائی کمشنر کو پلا رہا ہوں۔ کیک پیسٹری کی کشتیاں اٹھا اٹھا کر باورچی خانے سے ان کی خدمت میں لے جا رہا ہوں۔ ہائی کمشنر صاحب بھی بہت AWKWARD محسوس کر رہے ہیں اور میرا کوفت کے مارے برا حال ہے۔"

میں نے چاءدانی ان کے ہاتھ سے لے کر کہا"۔۔۔ اب آپ ذی الفور انڈر گراؤنڈ ہو جایئے۔" وہ سرپٹ باہر بھاگے۔

چند منٹ بعد صدر دروازے کی گھنٹی بجی میں باہر گئی۔ سیڑھیوں پر جمیل الدین عالی کھڑے تھے۔

"سیدھا ماسکو سے آ رہا ہوں۔"

"اللہ رحم کرے۔ کیا آپ بھی کمیونسٹ ہو گئے؟"

فرمایا۔ "استغفر اللہ۔ سخت بوگس سوال ہے میں بسلسلہ رائٹرز گلڈ ساری دنیا کی ادبی تنظیموں کا مطالعہ کرنے ساری دنیا کے دورے پر نکلا ہوں۔۔۔۔"

اسی وقت طامس کک کا ٹرک فیروز کے گھر سے کتابوں کے جید صندوق لاد کر بینر واٹر پہنچا۔ ٹرک ڈرائیور گورے نے اپنے گورے ساتھی کی مدد سے صندوق اتار کر مکان کے سامنے رکھے اور ہانپتے ہوئے کہا"۔۔۔ بہت وزنی ہیں۔ وہ ایک نگر جا رہا ہے اسے مدد کے لئے بلاتا ہوں۔"

ایک ویسٹ انڈین حبشی مزدور سر جھکائے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ لفظ نگر اس کے کان میں پڑ گیا۔ اس نے پلٹ کر گوروں کو گالی دی۔ گورا ٹرک ڈرائیور اور اس کا میٹ آستینیں چڑھا کر آگے بڑھے۔ چشم زدن میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ میں جلدی سے ایک بوبی کو بلا کر لائی۔ کچھ عرصہ قبل اسی علاقے میں نوٹنگ ہل گیٹ پر زبردست نسلی فساد ہو چکے تھے۔ لیکن لندن میں ایشیائیوں کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک رات دس بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ سیڑھیوں پر آپا حمن' بھائی جان کے فرزند اکبر عمر عزیز عرف منن (جو چند سال قبل ماری پور میں بچوں کے فیملی کرکٹ میچ کی کپتانی کرنے کے دوسرے دن یہاں آ گئے تھے) اور پارے میاں کھڑے تھے۔ پارے ڈاکٹر صلاح الدین حیدر جو ۵۳ء میں کینیڈا گئے تھے ان سے پچھلی بار ملاقات یہیں شہر لندن میں ہوئی تھی۔ اب وہ مک گل یونیورسٹی' مونٹریال میں پڑھاتے تھے اور ایک لیٹوین لڑکی سے بیاہ کر چکے تھے۔ (اس لڑکی کے والد دوسری جنگ عظیم سے قبل برطانیہ میں ملک لیٹویا کے سفیر تھے اور جنگ کے بعد وطن واپس جانے کے بجائے کینیڈا ہجرت کر گئے تھے۔) پارے ۵۳ء کے بعد اب پہلی بار پاکستان جا رہے تھے۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ پارے' منن' تقی سید' فیروز اور اس کے شوہر نشیت مکرجی سب باورچی

خانے میں جمع تھے۔ فیروز کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ کال بیل بجی۔ منن باہر گئے اور ہنستے ہوئے واپس آئے۔ "لمبے لمبے پٹے رکھے دو انگریز لڑکے اشتہار اور پمفلٹ لئے باہر کھڑے ہیں۔ ہم سے کہا۔ تمہیں معلوم ہے امریکہ اور برطانوی امپریلزم بہت جلد ساری دنیا کو نیوکلیر بم سے اڑا دینے والی ہے۔ یہ پڑھو اور ہمیشہ کو نگو اور الجیریا کو یاد کرتے رہو۔"

"نوجوان لفٹ ونگ یہاں بڑھتا جا رہا ہے۔" تقی میاں بولے۔

"پہلے بھی تھا۔۔۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ لیکن اس وقت ویت نام نہیں تھا۔۔۔" منن نے کہا"۔۔۔۔ نوجوان بغاوت پر آمادہ ہیں۔ آپ لوگوں کے زمانے میں آؤٹ سائیڈ کا تصور پیدا ہو چکا تھا مگر اس کے عملی نمونے ابھی سامنے نہیں آئے تھے۔

"نہ آر تھرویسکر جیسا یہودی پلے رائٹ۔ جو ایسٹ اینڈ کی ورکنگ کلاس زندگی ویسٹ اینڈ کی اسٹیج پر دکھلا کر تہلکہ مچاتا ہے۔ اسٹیج' سینما' ادب سب تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ہم لوگ وہیں کے وہیں۔۔۔"

ایک روز روح افزا حیدر نے اماں سے کہا کہ چند پاکستانی بیگمات نے بزم خواتین قائم کی ہے اور ان سے ملنا چاہتی ہیں وہاں تشریف لے چلیں۔ اماں نے جواب دیا۔ "بی بی میں کہاں جاتی پھروں گی رہنے دو۔ میں تو یہاں بس ملکہ کا محل اور بادشاہوں کا قبرستان دیکھوں گی۔ اس کے بعد پیرس جاؤں گی۔۔۔"

پھر کسی نے ایک ادبی محفل میں چلنے کو کہا۔ بولیں "۔۔۔ میاں میں کبھی کراچی کی ادبی محفلوں میں نہیں گئی۔ نئے لکھنے والوں کا انداز اور' دلچسپیاں اور۔ میرا اور۔ ہر لکھنے والے کا ایک زمانہ ہوتا ہے۔ میرا زمانہ دوسرا تھا۔ اب گنتی کا پہرہ ہے۔۔۔ اچھا بٹی فیروز۔۔۔ بادشاہوں کا قبرستان یہاں سے کتنی دور ہے؟"

نمبر ۳۳ سینٹ اسٹیونز گارڈن کے بیرونی وسیع کمرے کے آتشدان پر جنگ واٹرلو کی تصویر آویزاں تھی۔ وکٹورین الماریوں میں ڈریسڈن چائنا کے چرواہے بانسری بجا رہے تھے۔ اور نیلے ولو پیٹرن کی پلیٹیں رکھی تھیں۔ خلیجی دریچے کے باہر کوئی گوالا اپنے چھکڑے پر دم صبح لمبے ایالوں والا گھوڑا ہنکاتا گزرتا تھا۔ دہلیز پر رکھی دودھ کی بوتلوں کے پاس بلی تیزے سے بیٹھی رہتی تھی۔ اماں کے کمرے کے نیچے بیک گارڈن میں سیب کے درخت کے نیچے محلے کی بلیاں جمع ہوتی تھیں۔ پرانا لندن ابھی موجود تھا۔ لیکن بدل گیا تھا۔ پڑوس میں ایک ویسٹ انڈین انجینئر رہتا تھا۔ ایک شام وہ گھر لوٹا۔ اپنے دروازے پر کھڑے کسی گورے سے لڑ پڑا۔ مار اماری شروع ہو گئی۔ میں نے بیرونی دریچے سے دیکھا۔ بوبی سامنے پارک کے کنارے کھڑا چند منٹ تک تماشا دیکھتا رہا۔ پھر اطمینان سے ٹہلتا ہوا آیا۔

ایک شام برٹش میوزیم کی سیڑھیاں اترتے ہوئے تقی میاں نے دریافت کیا۔ "آپ نے برطانوی قومیت حاصل کرنے کے لئے درخواست دے دی۔۔۔؟"

"پنڈت نہرو لندن آنے والے ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد۔۔۔ میرا خیال ہے تقی میاں کہ میں

یہاں سے انڈیا جاتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" تقی میاں نے پائپ سلگاتے ہوئے حسب عادت انڈر اسٹیٹمنٹ دیا۔ "کہ یہ خیال برا نہیں۔"

اس برس یورپ اور انگلستان میں چلے کا جاڑا پڑا۔ پھر بہار آئی 'لطیف' ہلکی پھلکی اور سرکاری طور پر موسم گرما شروع ہوگیا۔ نمبر ۳۳ کے سامنے سینٹ اسٹیونز گارڈن میں چھپی ہوئی بلبل روز شام کو گانے لگی۔ پارک کی دوسری طرف ایک اونچی بھوری دیوار کے پیچھے غالباً کوئی کیتھولک خانقاہ تھی۔ اور بلبل شاید خانقاہ کے باغ میں گاتی تھی۔ بڑی عجیب بات تھی۔ ایلیٹ نے لکھا تھا۔ سیکرڈ ہارٹ' کانونٹ کے باغ میں بلبلیں گا رہی ہیں۔

اماں بران کائٹس میں مبتلا ہوگئیں۔ ذرا بہتر ہونے پر انہوں نے کہا۔ "یہاں سے جانے کو تو جی نہیں چاہتا مگر سردیوں میں پھر پڑ جاؤں گی۔ برف پڑے گی۔"

موقع و محل مناسب جان کر پوچھا۔ "انڈیا چلیے گا؟"

ساری عمر اماں کا یہ وطیرہ رہا کہ معمولی سی معمولی بات پر حجت تکرار کرتی تھیں۔ مگر میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے کہا "۔۔۔ اگر تم جانا چاہتی ہو تو چلی چلوں گی۔ مگر میرے بلڈ پریشر کے لئے کراچی کی طرح معتدل آب و ہوا صرف بمبئی کی ہے۔ بمبئی میں رہوں گی اور کسی شہر میں ہرگز نہیں رہوں گی۔ فی الحال تو۔۔۔" انہوں نے وضو کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ "کراچی جاؤں گی۔ ایمپورلائن کو فون کردو۔"

فصل شانزدہ ہم

ا۔ "اولڈ کیوروسٹی شاپ[1]" کا آخری نیلام

ابا جان اور اماں کے دنیاوی اثاثے کی عجیب و غریب اور BIZARRE تباہی کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابا جان کی کتابیں جو جون ۴۳ء میں نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ سے لال کرتی بھجوائی گئی تھیں۔ اختر ممانی نے بحفاظت رکھیں۔ ان کو اماں نے ۴۵ میں آشیانہ دہردون کے گودام پہنچوا دیا۔ اگست ۴۷ میں وہ ذخیرہ مع دوسرے سامان حاضر ماموں کے اسباب کے ساتھ مال گاڑی سے سیالکوٹ روانہ کیا گیا۔ ٹرین راستے میں لٹ گئی۔ باقی کچھ سامان لال کرتی میں موجود رہا۔ دسمبر ۴۷ء میں جب ابراہیم ماموں نے پاکستان جانے کی تیاری کی۔ اماں نے وہ باقی ماندہ اثاثہ لال کرتی سے لاکر جاپلنگ روڈ حسو باجی[2] کے ہاں رکھوا دیا۔

میرے اور اماں کے ہندوستان واپس آنے کے بعد حسو باجی مستقل لکھتی رہیں آکر اپنی چیزیں لے جاؤ۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔ اکتوبر ۶۷ء میں اماں کے انتقال سے چار پانچ روز قبل حسو باجی کا خط آیا۔ بی بی میں نے بیس برس تمہاری امانت کی حفاظت کی۔ اب میاں[3] یہاں منتقل ہونے والے ہیں اور وہ بڑا کمرہ جس میں تمہارا سامان مقفل ہے اس کی ضرورت پڑے گی۔ اپنی چیزیں لے جاؤ یا اگر کہو تو ان کو نیلام کر دیا جائے۔

میں نے جواب دیا سوائے کروکری اور کٹلری کے ساری چیزیں نیلام کر دیجئے۔ وہ سارا انگڑ کھنگڑ بمبئی میں رکھنے کی جگہ کہاں ہے۔ دراصل مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ بنڈلوں اور صندوقوں میں کیا کیا چیزیں مقفل تھیں۔

فروری ۶۸ء میں جب میں لکھنؤ گئی حسو باجی نے کہا "۔۔۔ اگر تم صرف چار روز پہلے آئی ہوتیں تمہاری چیزیں بچ جاتیں۔ تمہاری اجازت کا خط آچکا تھا۔ پھر بھی میں چیزیں روکے رہی لیکن پچھلے ہفتے اقبال منزل[4] کا بہت سارا سامان فروخت کیا گیا اس کے ساتھ ہی تمہارے چند صندوق اور بنڈل جو بے حد بوسیدہ ہو چکے تھے نیلام والا لے گیا۔ ایک بہت بڑی دری کسی امام باڑے کے لوگوں نے خرید لی۔ چیزیں جو بکیں ان کی فہرست یہ ہے۔" انہوں نے مجھے ایک کاغذ تھما دیا اور رونے لگیں۔

"کروکری کے ساتھ ایک بکس اور تھا اس میں پرانے خطوط تھے۔ مجھے معلوم تھا نذر خالہ نے ان خطوں کو کتنی حفاظت سے رکھا تھا وہ موجود ہے۔" حسو باجی نے کہا۔

میں نے اس نیلام گھر کا پتہ معلوم کیا اور پرانی اسکول فیلو عزیز بانو داراب (جواب وفا لکھنوی کے نام سے مشہور شاعرہ ہیں) کے ہمراہ شہر روانہ ہوئی۔ گلی کے نکڑ پر ایک شخص نے مشتبہ نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پیچ در پیچ گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ شام کا اندھیرا چھا رہا تھا اور بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ گلی کا ماحول کافی ڈراؤنا تھا۔ ہم سائیکل رکشا ایک جگہ رکوا کر پیدل اٹکھ باٹھ کرتے ایک مکان کی ڈیوڑھی پر

پہنچے۔ اندر سے ایک بڑھیا گرگ باراں دیدہ نے سر نکال کر جھانکا۔ پھر ایک دو پلی ٹوپی چگی داڑھی والے بزرگوار نمودار ہوئے۔ شکل سے بالکل فسانہ آزاد کا ایک ناقابل اعتبار کردار معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے کہا "--- مہاراجکمار محمود آباد کے ہاں اقبال منزل سے جو سامان آپ لوگ یہاں لائے ہیں اس میں کچھ باقی ہے یا سب بک گیا؟"

انہوں نے گہری نظروں سے ہمیں جانچا۔ سوچتے ہوں گے دو اکیلی بے پردہ خواتین۔ مہاراجہ محمود آباد کے ہاں کے مال کو پوچھتی ہیں۔ جانے کیا چکر ہے۔ تپاک سے بولے۔ "اندر تشریف لائیے۔" صحن میں سے گزرتے ہوئے انہوں نے اطلاع دی "--- آپ کو کیا خریدنا ہے۔ یہاں بڑے بڑے تعلقہ داروں کے ہاں کی تحفہ چیزیں موجود ہیں۔ امریکن شوق سے خرید کرکے جاتے ہیں۔"

جھاڑ فانوس سے روشن ہال میں داخل ہوئے۔ فرش اور الماریوں میں لٹے ہوئے تعلقہ داران اودھ کے نوادر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ فہرست پرس سے نکالی جو بے چاری حسو باجی نے دی تھی۔ اور ان چیزوں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

پیر فرتوت نے رکھائی سے پوچھا "--- آپ اپنا مقصد بتائیے۔"

میں نے بیوقوفی سے کہا "--- یہ چیزیں میں واپس خریدنا چاہتی ہوں۔"

ان کا رویہ فوراً بدل گیا۔ کھنکار کر جواب دیا۔ "مشکل ہے۔ اقبال منزل سے جو سامان آیا تھا وہ تو سارا ہمارا ایجنٹ کہیں بھجوا چکا ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں۔" اور دوسرے کمرے میں کو بڑھ گئے۔

معاً میری نظر ایک الماری پر پڑی جس کے ایک تختے پر کشمیری فریم میں نانا نذر الباقر مرحوم لندن میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ (اسی طرح کے دوسرے فریم خالی تھے) میں نے شرلک ہومز کے انداز میں بانو سے کہا۔ "ذرا بڑے میاں کو بلانا۔"

واپس آئے۔ میں نے اس فریم کی طرف اشارہ کیا۔ بولے۔ "صاحب۔ ایک بکس میں سے صرف تصویریں ہی نکلیں۔ ان کے فریم بھی گل سڑ چکے تھے۔ ہم تصویروں کا کیا کرتے۔ جو فریم ثابت تھے وہ نکال لئے۔ بکس آنگن میں پھینک دیا۔ نچلے خانے میں کچھ کتابیں بھی تھیں غیر زبانوں کی۔"

"کتابیں۔؟ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ بھی شاید ہمارا ایجنٹ لے گیا۔"

بانو نے چپکے سے کہا۔ "یہ گپ ہے۔ ان کو یقین ہے کہ تم چوگنی قیمت پر ان سے واپس خریدو گی۔"

"ویسے ہمارے پاس نہایت نادر کتابیں موجود ہیں۔ امریکن لے جاتے ہیں۔"

میں نے چڑ کر کہا۔ "امریکنوں کو تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیے۔ اور وہ بکس جو آپ نے پھینک دیئے ہیں وہ دکھلائیے۔"

انہوں نے ایک چھوکرے کو آواز دی۔ وہ لالٹین جلا کر لایا اور ہمیں دوسرے صحن میں لے گیا۔

اب رات کا اندھیرا چھا چکا تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ امرود کے درخت کے نیچے ایک بکری بندھی تھی۔ اس کے قریب بہت سارا کاٹ کباڑ پڑا تھا۔ لالٹین اٹھا کر عزیز بانو نے چاروں طرف دیکھا۔ درخت کے نیچے ہمارے گھر کے پرانے صندوق خالی پڑے تھے۔ معاً مجھے ایک دقیانوسی اور شکستہ اسٹیمر ٹرنک نظر آیا۔ اس کے پہلو پر اینکر لائن کا پرانا سرخ لیبل اب تک چسپاں تھا۔ ٹرنک کا ڈھکنا الگ ہو چکا تھا۔ ذرا سی جنبش سے وہ علیحدہ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ عزیز بانو نے لالٹین کی لو اونچی کی۔ ٹرنک کی اوپری ٹرے میں دوسری تصاویر کے اوپر اماں کا وہ براؤن رنگ کا پورٹریٹ پڑا تھا جو ۱۹۳۶ء میں ابا جان نے دہرہ دون میں ایک انگریز فوٹوگرافر سے جستے پر BAS RELIEF کی کمیاب تکنیک میں بنوایا تھا۔ رشتے داروں کی تصاویر۔ چند پرانے رسالے۔ سات آٹھ کتابیں جن کو کباڑی نے بالکل بے کار سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ دوسرے کیبن ٹرنک میں چینی اطلس کے کرم خوردہ ڈریسنگ گاؤن' ترکی لبادے' لیس کے تار تار پلنگ پوش' کلابتون کی ڈوائلز وغیرہ گلہری کے گودڑ کی صورت میں موجود تھیں۔ اتنے میں وہ صاحب صحن میں تشریف لائے۔ میں نے ہال میں رکھے ہوئے کشمیری فریم اور یہ شکستہ ٹرنک ان سے خریدے۔ چھوکرے نے انہیں باہر لے جا کر سائیکل رکشا پر لادا۔

تین چار مشتبہ قسم کے آدمی اچانک دوسرے صحن سے نمودار ہوئے۔ بانو نے گھبرا کر کہا۔ "اب یہاں سے فوراً نکل چلو---"

بڑے میاں ڈیوڑھی تک آئے اور پھر کہا۔ "میرے پاس چند نادر کتب موجود ہیں۔ ترکی۔ عربی۔ فارسی---"

پراسرار حضرات اب بڑے غور سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ بے انتہا نروس ہو کر میں اور بانو باہر گلی میں اترے۔ رکشا والا اسٹیمر ٹرنک لاد کر ساتھ ساتھ چلا۔ بارش تھم چکی تھی۔ گلی میں ہو کا عالم طاری تھا۔ ایک جگہ پر دو سائیکل سوار لوفروں نے جان بوجھ کر اپنی سائیکلیں رکشا سے ٹکرا دیں اور اتر کر ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ ہم نے اور تیزی سے چلنا شروع کیا۔ گلی اتنی طویل تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

یہ شام بھی کہاں ہوئی۔

۲۔ وزٹنگ کارڈز

"اجل کے ایک سو ہاتھ ہیں۔ اور وہ ایک ہزار راستوں پر چلتی ہے۔ وہ سب کی نظروں کے سامنے آسکتی ہے یا چپکے سے آکر نکل جاتی ہے۔ وہ سرگوشی کرتی آتی ہے۔ یا کھوپڑی پر ناگہانی چوٹ کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ انسان رات کو چراغ لے کر چلتا ہے لیکن نالے میں ڈوب جاتا ہے۔ دن دہاڑے زینہ چڑھتا ہے اور ایک شکستہ سیڑھی پر سے اس کا پاؤں رپٹ جاتا ہے۔ کھانا کھانے بیٹھتا ہے اور---"[5]

باب العلم مولا علیؑ نے کہا تھا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم پر عیاں کر دوں' تمہارا دل دہل جائے گا۔ باؤلے ہو جاؤ گے۔

دسمبر ۱۹۶۳ء۔ اعزاز حیدر عرف منے میاں ابن سید اعجاز حیدر مرحوم۔ عمر چالیس سال۔ شگفتہ مزاج شادی شدہ۔ نواب شاہ (صوبہ سندھ) میں ایئر ڈروم بنوانے میں مصروف۔ موت کا راستہ۔ شہر کی ایک سنسان سڑک۔ تاریک رات۔ ہوائی اڈے کی زمین کے معاوضے کے متعلق زمین کے مالکان کا حکومت سے جھگڑا۔ منے بھائی رات کے وقت کلب سے واپس آ رہے ہیں۔ راستہ میں سن سن گولیاں چلتی ہیں۔ لہولہان' خود جیپ چلاتے ہسپتال پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں۔

اور آپا فاطمہ خاتون کا نوجوان انجینئر بیٹا یوسف کوئٹہ میں کان کنی کے حادثے میں۔

اور جولائی ۱۹۶۸ء ڈاکٹر مظفر علی نقوی عرف ادری ابن غضنفر علی نقوی (لڈن ماموں) تعلیم۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مانچسٹر۔ مشاغل۔ مغربی کلاسیکل موسیقی۔ پیراکی۔ عمر ۳۶ سال۔ شگفتہ مزاج۔ شادی شدہ۔ موت کا راستہ۔ دریائے والگا۔ روس۔ چاندی رات۔ کراچی سے الن ماموں کا خط "۔۔۔ قیامت گزر گئی۔ ادری سائنسدانوں کی ایک کانفرنس کے لئے روس گئے تھے۔ ماسکو کے شمال میں کوئی جگہ دبنا ہے۔ وہاں کانفرنس تھی۔ وہیں ایک رات والگا میں پیرنے گئے۔ زندہ واپس نہ آئے۔ روسیوں نے سرچ لائٹس لگا کر دریا کھنگال ڈالا۔ صبح ہوتے لاش ملی۔ میاں سلمان[6] کو ماسکو ٹرنک کال کیا۔ سلمان آجکل وہاں پاکستانی سفیر ہیں۔ میاں علی نواب جو اب کرنل ہو چکے ہیں۔ ایک ملٹری مشن کے ساتھ اس وقت ماسکو میں تھے۔ وہ تابوت کے ساتھ گئے۔ بیچارے سلمان نے لاڈلے بھانجے کا جنازہ کراچی بھجوایا۔۔۔ رباب[7] کی بہت بری حالت ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اسے اسلام آباد یونیورسٹی میں لیکچرر شپ آفر کر دی ہے۔ بھابی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ سلو انہیں اپنے ساتھ اسکندریہ لے گئی ہیں۔ سلو اور ڈاکٹر شبر حسن آجکل اسکندریہ میں ہیں۔ بڑھاپے میں مجھے ہونہار بھتیجے کا غم دیکھنا تھا۔ جب چاند چھپے گا تو اجالا نہ رہے گا۔۔

دعا گو۔۔ تمہارا غمزدہ ماموں الن۔"

اکتوبر ۱۹۶۹ء پروفیسر تہور علی نقوی (الن ماموں)۔ کراچی کا ایک ہسپتال۔

مئی ۱۹۷۳ء جواں سال سید مظہر امام (نور افشاں کے شوہر)۔ لندن کا ایک ہسپتال۔

دو دور افتادہ بزرگوں کی خط و کتابت۔۔۔۔

سید فرخ حیدر نواب شمس آباد (ضلع فتح گڑھ یوپی۔ انڈیا۔) بنام میجر سید آل حسنین۔ کراچی۔

۱۹۱۴ء یا ۱۵ء میں والد کے ساتھ محمود پور گیا تھا۔ تم گیند سے کھیل رہے تھے۔ میں بھی کھیلنے لگا۔ پھر والد صاحب کے ساتھ شیعہ کالج کے جلسے میں لکھنؤ گیا۔ نذر باجی ہلٹن لین میں رہتی تھیں۔ واپسی میں اسٹیشن پر تم گیس کے غبارے لے کر آئے۔ جن کا اس زمانے میں مجھے بہت جنون تھا۔ پھر تم ۱۹۱۸ء میں شمس آباد ننھی بیگم[8] والدہ پھوپھا معشوق علی خاں کے ساتھ والد کی تعزیت کے لئے آئے۔ اس کے بعد پنجاب میں

اپنے تایا فیض العسکری کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ علی گڑھ کا زمانہ آگیا اور ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے۔ اگر حساب لگاؤ تو ان باتوں کو نصف صدی گزر گئی مگر کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ غور کرو ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ میں تو چلتے چلتے تھک گیا۔ اب آرام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ معلوم نہیں منزل کب آئے گی۔

الن کہاں ہیں۔ علی گڑھ میں ہولا خبطا قسم کے لڑکے تھے۔ اب سنجیدگی آگئی ہوگی۔ بھائی تم نے کیا مزے کی بات لکھی کہ حشر میں سب کو اپنی پڑی ہوگی۔ کون کس کو پہچانے گا اور کون کس سے ملے گا۔۔۔

۲۳ مارچ ۱۹۷۲ء فرخ حیدر شمس آباد

یہ خط عینی بٹی کے ذریعہ تم کو کراچی بھجوا رہا ہوں۔

بھائی فرخ حیدر۔

بھائی[9] مرحومہ کو رب العزت جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور حشر و نشر محمدؐ و آل محمدؐ کے ساتھ ہو۔ آمین۔ ان کے سہو اور گناہ کچھ ہوں تو معاف فرمائیں۔ بندہ مجبور ہے اور گناہ سے محفوظ نہیں۔ سوائے آئمہ طاہرین علیہم السلام کے جن کی ذات بابرکات معصوم ہے۔ اور نسیاں و خطا سے پاک و صاف و مبرا ہے۔ جن سے میں خط لکھواتا تھا وہ نومبر ۷۲ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب جس طرح بھی ممکن ہو تم کو اور عینی کو خود لکھتا ہوں۔ ابھی تک زندہ ہوں۔ اگر نہ رہا تو شاید تم کو اطلاع بھی نہ پہنچے۔ یہ کشمکش کم ہو۔ راستے کھل جائیں۔ صحت ہو جائے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوں تو کوشش کروں گا کہ لبیک کہنے سے پہلے تم سب سے مل لوں۔ بزرگوں کی قبور پر فاتحہ پڑھ لوں۔ بھائی میرے اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ کچھ بھی نہیں' جو کرنا تھا کر لیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو بویا تھا کاٹ رہے ہیں۔ بقول میرزا مرحوم۔۔۔ "ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔"

اس کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ جب بلاوا آجائے اس کے حکم پر عامل ہوں گا۔ خدا حافظ و ناصر

محتاج دعا۔ حسنین۔

یہ آج لکھ لیا۔ آج اسے جدہ پوسٹ کروں گا۔ وہاں سے ایک عزیز عینی بٹی کے پتے پر بمبئی بھیجیں گے وہ تم کو فرخ آباد ری ڈائریکٹ کریں گی۔ "اللہ اللہ کیا انقلاب ہے۔"

مارچ ۱۹۷۵ء۔ وفات میجر سید آل حسنین۔ کراچی کا ایک ہسپتال۔

۱۹۶۷ء۔ ۱۹۷۷ء سید نثار حیدر زیدی' الہ آباد۔ بیگم نذر زہرا سجاد حیدر' بمبئی۔ بیگم فاطمہ صغریٰ وحید الدین حیدر' کراچی۔ بیگم نثار فاطمہ اعجاز حیدر' کراچی۔ بیگم حمیدہ نثار حیدر زیدی الہ آباد' بیگم وحیدہ نصیر الدین حیدر' لاہور۔ سید لقمان حیدر' کراچی۔۔۔ قبرستان خدا کے گھر کے پچھواڑے کے آنگن ہیں۔

از طرف: سید سلطان حیدر (رمی میاں)

پی۔ آئی۔ اے۔

الحمرا اسٹریٹ۔ بیروت۔

٢٧ مارچ ١٩٧٤ء

عینی بی۔ جیتی رہیئے۔

حادثات اور واقعات کی تیز رفتاری سے جی گھبرا جاتا ہے۔ حال میں دو بار لقمان بھائی کی علالت کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا۔ بڑی تکلیف میں تھے۔ ١٩٦٥ء سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ آپریشن کے لئے ڈاکٹروں نے کئی سال قبل مشورہ دیا تھا مگر وہ اسٹیٹ بنک پر بار نہ ہونا چاہتے تھے۔ طبیعت میں قدرتی اضطراب تھا۔ دل کی بیماری اور اضطراب دونوں نے مل کر اپنا کام دکھایا۔

ہم لوگ اتوار کو کراچی سے جہلم میں شرکت کر کے بیروت واپس آئے۔ پارے اور ان کے اہل وعیال سے ملنا ہوا جو کینیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ پورے اکیس سال بعد پارے سے ملاقات ہوئی۔ کراچی میں وہی چہرے تھے' وہی شہر' لیکن حالات کتنے بدل گئے اور کس تیزی سے بدل گئے ہیں۔ یقین نہیں آتا۔

مظہر میاں رخصت ہوئے۔ پھوپھی جان' خالہ جان' رخصت ہوئیں۔ لقمان بھائی رخصت ہوئے۔

ایک سال میں یہ قیمتی پر خلوص ہستیاں ہم سے جدا ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے طفیل ہماری بھی ADVANCE BOOKINING اور ریزرویشن جنت میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ سنا ہے آج کل بڑا رش جا رہا ہے۔ بڑا DEMAND ہے۔۔۔ ہم بیکنگ سے دوبارہ جنیوا گئے۔ وہاں سے بیروت آئے۔ یہاں ہم لبنان' جورڈن' سیریا' سائپرس اور یونان کے لئے ریجنل مینجر ہیں۔ آپ سے باتیں کرنے کے لئے عمر نوح چاہیئے۔ چند روز کے لئے بیروت آجایئے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔

رئی

خواجہ غلام محمد حاضر۔ جواں سال خواجہ مظہر القیوم۔ جواں سال ونگ کمانڈر اعظم جان' سید حمید علی اور ان کے چھوٹے بھائی۔

مجلس ترقی ادب

٢۔ کلب روڈ۔ لاہور

٦ جون ١٩٦٨ء

عینی بہن۔ تسلیم۔

میری دلی خواہش تھی کہ سید صاحب کی ساری تصانیف مجلس ادب کے کلاسیکی سلسلے میں شامل کروں۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے میں جو کچھ جس طرح کرنا مناسب ہو لکھ بھیجئے۔ میں دلی خوشی سے اس پر عمل کروں گا۔ ان کی کتابیں جو غیر ذمہ دار پبلشر بہت بے احتیاطی سے چھاپ رہے ہیں خوشنما ٹائپ میں چھاپوں گا۔

میں نے میرا فضل علی [10] کے متعلق اپنی تقریر ریڈیو سے حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔ ریڈیو کے دفتر کی عمارت بدل چکی ہے۔ پرانی تقاریر کے انبار چھت تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ریڈیو والے سنہ کے ساتھ یہ معلومات بھی مانگتے ہیں کہ تقریر کس مہینے میں ہوئی۔ میرا حافظہ کمزور ہو گیا

ہے۔ نہ سنہ یاد ہے۔ نہ مہینہ۔ ریڈیو کے کئی دوست تقریر تلاش کر چکے ہیں مگر اب تک کامیابی نہ ہوئیں۔

آج غلام عباس صاحب کو کراچی خط لکھ رہا ہوں۔ مل گئی تو ارسال خدمت کروں گا۔

بی بی [11] اپنے خط کے جواب کی منتظر ہیں۔۔۔ والسلام

آپ کا

سید امتیاز علی تاج

(تلخیص)

قتل امتیاز علی تاج۔۔۔ اپریل ١٩٧٠ء

لاہور۔

٨ فروری ١٩٦٩ء

محترمہ معظمہ۔ سلام مسنون۔

آپ کا حق ہے۔ چغتائی آرٹسٹ کی ہر تخلیق حکماً استعمال میں لائیں اور کسی دوسرے کی ایک نہ سنیے۔ آپ کے خط [12] سے ایک دیرینہ آرزو پوری ہوتی ہے۔ آپ کا نیاز۔

آپ کی تخلیق پاکستان کی ملکیت ہے اور اس سے انکار ناممکن ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ ان کی شخصیت' ان کا خلوص ناقابل فراموش تھا۔ بہن آمنہ بیگم مجید ملک کو لکھا تھا۔ وہ تو اپنی دھرتی کی ماتا ہیں۔

میں نے تین تصویریں شبیہ غالب کی صورت میں بنائی ہیں۔ ایک اچنگ اور دو رنگ دار ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی کچھ ہاتھ تھا۔ لیکن کام نہ آئیں۔ اچنگ تو میں نے لالہ مالک رام کو بھیج دیا ہے۔ وہ بھی کوئی نمائش ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ ایک تصویر اور مفصل مضمون نقوش لاہور کو لکھدیا ہے۔ وقت نہیں' ورنہ اوریجنل بھیج دیتا پھر آپ کو اپنے مضمون سے یقیناً اور بھی اطمینان ہوتا۔ مرقع چغتائی سے جو ڈیزائن' جو تصویر آپ کے کام آسکے استعمال میں لائیں۔ اس سے مجھے بھی تسکین ہوگی۔ نقش چغتائی کی ایک جلد الگ رجسٹرڈ پارسل کر رہا ہوں۔

والسلام

مخلص چغتائی

لاہور۔

١٠ مئی ١٩٦٩ء

محترمہ معظمہ۔ سلام مسنون۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ نقش چغتائی کسی کے ہاتھوں شکار ہو گیا۔ وقت پر نہ ملنے کا صدمہ ہے۔ آج دوبارہ ایک اور کاپی انڈرس کر کے ارسال خدمت ہے۔ وصول ہو جائے تو اطلاع ضرور دیں۔ اس دفعہ میں نے آپ کو اپنے چار اوریجنل اچنگ بھی بھیجے ہیں جو آپ کو ایک فنکار کی یاد دلاتے رہیں گے۔ بہت

قیمتی بہت پیارے ہیں۔ فریم کروا کر کسی دیوار پر آویزاں فرمائیں۔

ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ کوئی اخبار' رسالہ 'کتاب نہ ہندوستان جا سکتی ہے اور نہ آسکتی ہے۔ اس لئے آپ کی تمام اشیاء بیگم خدیجہ عمر کو پہنچائی جا رہی ہیں تا کہ کسی صورت آپ تک صحیح سالم پہنچ سکیں۔

ویکلی کا پرچہ مجھے مل گیا تھا۔ میں نے ایک مضمون مرقع چغتائی غالب کے مصور ایڈیشن کے متعلق نقوش غالب نمبر میں لکھا ہے۔ نظر سے گزرے تو ضرور پڑھیں۔ مجھے جب موقع ملتا ہے آپ کے ادب سے مستفید ہوتا ہوں۔ خدا نے آپ کو آپ کے والد' والدہ بزرگواروں کی طرح ایک ایسی انفرادیت بخشی ہے جو آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

والسلام

مخلص چغتائی [13]

وفات عبدالرحمٰن چغتائی۔ لاہور۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء۔

نمبر۱۰۔ علی پور روڈ۔ دہلی۔

۳۱ مئی ۱۹۷۰ء

عزیزی۔ دعا۔

بلی کے انتقال کو اب چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ لیکن مجھے کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنی زندگی ایثار اور قربانی کے ساتھ گزاری۔ اپنی انگریزیت کو نہ صرف ترک کر دیا اور بھلا دیا بلکہ اپنے آپ کو خالص ہندوستانی اور مسلمان بنا دیا۔

معلوم نہیں تمہارا مذہب کے متعلق کیا نظریہ ہے۔ میں تو اسلام پر پورا یقین رکھتا ہوں اس لئے مجھے بہت اطمینان ہے کہ بلی کو مدفن کے لئے نہایت اعلیٰ مقام ملا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان ایک مشہور درگاہ حضرت شیخ کلیم اللہ شاہجہاں آبادی کی جو خواجہ دہلی اور دلی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے قرب میں مزار کے احاطے کے اندر ان کو دفن کیا گیا ہے۔ یہ مولانا ابو الکلام آزاد کی قبر سے جو گورنمنٹ نے بنوائی ہے چند گز قلعہ کی جانب ایک اونچے مقام پر اس کے سامنے ایک SUNKEN باغ ہے جو میرے میئر رہنے کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور جسے میں نے ہی شروع کیا تھا اور جواب بن کے تیار ہوا ہے۔ اور دہلی کے موجودہ دور کے بہترین باغوں میں سے ہے۔ غرضیکہ نہایت پر فضا اور یادگار جگہ ہے اور ہر وقت ہمارے راستے میں ہے۔ تو اتنی دوری بھی نہیں ہے۔

امید ہے تم بخیریت ہو گی۔

دعاگو

نورالدین

وفات نورالدین احمد۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۴ء۔ احاطہ شیخ کلیم اللہ شاہجہاں آبادی میں بلی بھابی کے نزدیک سپرد خاک کئے گئے۔

شاعر نے تاریخ وفات کہی مر گیا دار سے دنیا کو بچانے والا۔

جوار کلیم خدا میں ہے دفن۔ عقیدت کی نسبت ہوئی کامیاب۔

صاف گو' حق پرست' خدا ترس' درویشانہ صفت میں آزاد' مولانا حفظ الرحمٰن اور رفیع احمد قدوائی کے جانشین۔ اصول پرستی کی وجہ سے آزاد ہندوستان میں بڑا سے بڑا عہدہ مل سکتا تھا جو قبول نہ کیا۔۔۔ ہمارا سہارا چلا گیا۔" دلی کے غریب مسلمانوں نے کہا۔

۱۹۳۷ء کوٹھی' قرولباغ [14] دہلی۔ چچا مشتاق احمد زاہدی کے ڈائننگ روم کے آتشدان پر ایک بڑی تصویر۔ ایک خوش شکل نوجوان اور ایک نو عمر' طرح دار متبسم انگریز خاتون۔

۱۹۷۴ء۔ احاطہ شیخ کلیم اللہ شاہجہاں آبادی میں دو مزار۔۔۔

تہران۔

یکم دسمبر ۱۹۷۰ء۔

عینی بی۔ آپ کیا آئیں اور کیا گئیں۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ پاکستان سے کچھ اخبار آئے تو مصطفےٰ زیدی مرحوم کی خودکشی یا قتل کی مزید تفصیلات نظر سے گزریں۔ ان کے تراشے بھیج رہا ہوں۔ شاید یہ اخبار آپ کے دفتر میں آتے ہوں اور آپ کی نظر سے گزرے ہوں۔ بہرحال احتیاطاً آپ کے مطالعے کے لئے منسلک ہیں۔ قتالہ عالم کی تصویر بھی ہے۔

موجودہ پروگرام کے مطابق ۱۴ فروری کو بمبئی پہنچوں گا۔ ویزا کے لئے درخواست دے دی ہے۔ جب یقین ہو گیا تو مزید لکھوں گا۔

مخلص۔

راشد۔

تہران

۱۰ فروری ۱۹۷۱ء

عینی بی۔۔۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ تین مہینے ہوئے جب ویزا کے لئے درخواست دی تھی۔ اب تک کوئی جواب نہیں ملا۔ اور اب جبکہ دوبارہ بے ہودگی شروع ہو گئی ہے۔ ویزا کیا ملے گا۔ آپ پھر تہران کب آرہی ہیں۔ میں ۱۴ مارچ کو پاکستان جا رہا ہوں۔ ۱۹ اپریل کو واپس آجاؤں گا۔ اگر ان تاریخوں کو مدنظر رکھ کر تہران آئیں گی تو دوبارہ ملاقات کا موقع نکل آئے گا۔

مخلص

راشد

وفات ن۔ م۔ راشد۔ لندن۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء

بسم اللہ

مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۷۲ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

عزیزہ سلمہا۔

جزاک اللہ

والسلام

دعاگو

عبدالماجد[14]

مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۳ء

عزیزہ سلمہا۔ السلام علیکم۔

ماہ نامہ آج کل ۱۰ اپریل نمبر۔۔۔۔ شاباش۔۔

ص ۷ حاشیہ[15] مزید تفصیل کی استدعا۔۔۔ والسلام

دعاگو

وفات عبدالماجد دریابادی۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء

کراچی۔

۹ مئی ۱۹۷۵ء

بنی بیگم۔ آداب۔ چند دن ہوئے پدما کا خط آیا۔ جس میں آپ کے ترجمے[16] کا تراشا ملفوف تھا۔ پدما سے ہماری خط و کتابت ہے۔ معصوم سی خط و کتابت۔ جیسی انڈر گریجویٹ لڑکے لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ اور جیسی کہ ہماری عمر کا تقاضہ ہے۔ ہوش کی منزل کو پہنچیں گے تو ان جھمیلوں اور موہ مایا سے گریز کریں گے۔ لو ایک قصہ سنو۔

پچھلے مہینے ماری پور جانا ہوا۔ اپنے عدنی ساتھ لے گئے۔ وہاں ان کے مرشد رہتے ہیں بابا ذہین شاہ تاجی۔ تصوف اور قوالیوں کے بحرنا پیدا کنار کے شناور۔ میرا قلب ابھی جاری نہیں ہوا اس لئے جیسا گیا تھا ویسا لوٹ آیا۔ راستے سے گزرتے ہوئے جس کی شکل اب بالکل بدل گئی ہے۔ پہلی بار آپ کے ہاں ماری پور جانا یاد آیا۔ ۲۵ برس پہلے۔ ایوب احمد کرمانی کے ساتھ۔ پھر ادھر جانے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اب ہماری عمر میں ۲۵ برس اور باقی نہیں ہیں کہ تیسری بار جائیں۔ اور جائیں تو کیوں جائیں۔

آپ نے بڑا کرم کیا کہ میرا مضمون ترجمہ کیا اور زیور طبع سے آراستہ بھی کیا۔ زندہ باشی۔ بعض جگہ ہندوستان کے چند ناموں کا ذکر آیا تو آپ ڈنڈی ضروری مار گئی ہیں۔ سو یہ صحبت کا اثر ہے۔ اب کتاب کو ہند پاکٹ بک والے چھاپ رہے ہیں۔ اس کے جیکٹ کے لئے آپ کچھ لکھ دیں۔ بشرطیکہ

UNDILUTED تعریف میں ہو۔ تو آداب بجا لاؤں۔ یہ جملہ شرطیہ ناحق لکھ دیا میں جانتا ہوں جتنے نقاد صائب نظر رکھتے ہیں وہ میری تعریف پر مجبور ہیں۔ بعض کج فہم اور کم نظر بھی ہوتے ہیں جن کو میری تحریر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

ایک پوراسیٹ اپنی کتابوں کا ایک بی بی کے ہاتھ آپ کے لئے بھیجا کہ بریلی جاکر سپرد ڈاک کر دیں۔ وہ بی بی وہاں جاکر صاحب فراش ہوگئیں گھٹنے پر ضرب آئی۔ جانے کس کی آنکھیں پھوڑنے کے لئے مارا ہوگا۔ اس کتاب کے علاوہ میرے سفرنامے ہیں۔ آوارہ گرد کی ڈائری۔ دنیا گول ہے۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ چلتے ہو تو چین کو چلیے۔ اتنے سفرنامے ہوگئے ہیں کہ اب کہیں باہر جاتا ہوں تو۔ IMMIGRATION والے حلف نامہ لیتے ہیں کہ آکر سفرنامہ نہیں لکھوں گا۔ سال گزشتہ تین بار جاپان گیا۔ ہر بار مسافر کے طور پر دلی کے ٹرانزٹ میں تھوڑی دیر کو اترتا ہوں اور حیرت و حسرت کا مارا پھر جہاز میں آجاتا ہوں۔ دیکھئے کب راستے کھلتے ہیں 'کب سبیل بنتی ہے۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا سو اب ٹھہرا ہے فن ہمارا

سنڈے کے سنڈے ایک کالم جنگ اخبار میں لکھتا ہوں۔ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ بار بار پڑھتا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ساتھ کے کالم میں مرزا جمیل الدین عالی کا عالمانہ اور فاضلانہ کالم ہوتا ہے۔ سنجیدہ اور مقطع لوگ ان کا کالم پڑھتے ہیں۔ قوم کے درد میں ڈوبا ہوا اور اسلام کے نشے میں سرشار ہوتا ہے۔ ویسے یہ ہمارے یار عزیز آج کل نیشنل بنک آف پاکستان کے اگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ ہیں بڑے دھانسو بینکر گنے جاتے ہیں۔

"کیا اردو کی آخری کتاب" میں سے ایک آدھ قسط ویکلی میں اور ہو سکتی ہے؟ آپ جانتی ہیں مجھے شہرت کی تمنا نہیں لیکن قارئین کے پر زور اصرار کا کیا کیا جائے۔ ان چند برسوں میں بہت کچھ ادب عالیہ اس فقیر کے قلم سے سرزد ہوا۔ وہ بزبان انگریزی آپ کے پرچے کی شوبھا بڑھانے اور سرکولیشن گھٹانے کے لئے وقتاً فوقتاً بھیجا جا سکتا ہے۔ جی کڑا کرکے جواب دیجئے۔ یوں تو سفرناموں میں بھی آپ کو بہت سے لولوئے لالہ ملیں گے۔ وہ نظم آپ کو ملی "یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟" اور بھی بہت کلام بلاغت نظام ہے۔ سننے والے میں تحمل کا مادہ ہو۔۔۔ کار لانقہ و نالا نقہ سے یاد کیجئے۔

نیاز کیش

ابن انشا

۱۱ جون ۱۹۷۵ء

"اردو کی آخری کتاب" کے لئے طویل یا مختصر' یا طویل مختصر یا مختصر طویل تعارف' پیش لفظ' بھومکا' پریچے فوراً ترنت لکھ بھیجیں' میرے خط پتر کا جواب بھی ضرور دیں۔"

(میں نے مصروفیت کی وجہ سے نہ خط لکھا نہ کتاب کا تعارف۔ خیال یہ تھا کہ ابن انشاء کہیں بھاگے تھوڑی جا رہے ہیں۔ کبھی بھی ان کے لئے کچھ لکھ دیں گے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ انشاء کے خط بہت جلد ایک

تبرک معلوم ہوں گے۔ انشاء نے جو کتابیں مجھے بھجوائی تھیں وہ بھی آج تک نہیں ملیں۔)

لندن۔

۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء

عینی بیگم۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ ہم بھی یہاں آگئے ہیں۔ آئے تو ہیں تین سال کے لئے لیکن اتنی استقامت ہم میں نہیں ہے۔ دیکھیئے کب بھاگتے ہیں۔ کام ہمارا انڈیا آفس لائبریری سے متعلق ہے۔ کسی دفتر دفتر کی پابندی نہیں ہے۔ آپ سے ملاقات کے امکانات ذرا روشن سمجھئے۔ باقی انقلابات زمانہ کا کیا لکھئے۔ عسکری[17] کا معلوم ہو گیا ہو گا پیرس میں پریس کونسلر ہیں۔ عالی اسمبلی کے لئے بھٹو کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی اور متحدہ محاذ نے ہرا دیا۔ شباب صاحب اسلام آباد میں ہیں۔

اب آپ چنڈو خانے سنائیے۔ سحاب قزلباش روز ملتی ہیں۔ اچھا اب ہمارا مجموعہ "اس بستی کے ایک کوچے میں" قبول کرو اور اسے پسند کرو۔

ابن انشا

وفات ابن انشا۔ لندن کا ایک ہسپتال۔ ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء

بچپن میں ابا جان نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی اور اس سے پہلے کہا تھا۔ "ہم جو بات کہیں آپ اس کے بعد پوچھئے پھر۔۔۔؟"

"بہت اچھا۔" میں نے جواب دیا تھا

"ایک کسان تھا۔ اس نے اپنے کوٹھے میں بہت سا اناج بھر رکھا تھا۔"

"پھر۔؟"

"کوٹھے میں ایک موکھا تھا۔۔۔"

"پھر۔۔۔؟"

"ایک چڑیا اندر آئی' دانہ کھایا اور پھر سے باہر نکل گئی۔۔۔"

"پھر۔۔۔؟"

"دوسری چڑیا آئی۔ اس نے دانہ اٹھایا اور پھر سے اڑ گئی۔"

"پھر۔۔۔؟"

"تیسری چڑیا آئی۔ چوتھی چڑیا آئی۔ پانچویں چڑیا آئی دانہ کھایا اور پھر۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر۔۔۔؟"

میں بہت جلد پیدا ہو گیا تھا یا تم دیر میں پیدا ہوئے۔ میں جا رہا ہوں۔ اور تم داخل ہو رہے ہو۔

تمہارے لئے باغ روشن ہے اور قلعے کے اندر ضیافت تیار۔ تم تازہ وارد مہمان ہو۔ اور میرے روانگی کے گھوڑے تیار ہیں۔ میں اس محل اور باغ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر ذرا پہلے آگئے ہوتے تم کو اس کی سیر کرا دیتا۔ چمنستان میں گلاب فروزاں ہیں۔ تو مجھ جانے والے کے لئے صرف ایک گلاب توڑ دو۔ یہ محل اب تمہارا ہے۔ اور میں بہت دور جانے کہاں جا رہا ہوں اور رخصت کے وقت کے لئے ایک جام لے آؤ۔ اور جب تم بھی روانہ ہو چکے ہو گے تو میں راستے میں کہیں تم کو ملوں گا۔[18]

لوگ دھنک کی طرح غائب۔

ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ قبروں کے کتبے گویا وہ وزٹنگ کارڈ ہیں جو دنیا میں آنے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ اور لاکھوں کروڑوں سیاروں اور دنیاؤں اور ANTI-WORLDS کی اس بیکراں وسعت اور ابدیت میں کیا انسان کی دنیا اور کیا اس کی زندگی۔ کہ زندگی سراپا رحیل بے مقصود۔

کراچی کے ایک فیشن ایبل رہائشی علاقے میں سجاد حیدر یلدرم روڈ اور لقمان حیدر ایونیو بنا دی گئی ہیں!

امام زین العابدینؑ کتنا روئے۔ ساری عمر روتے گزری۔

اور باب العلم مولا علیؑ نے کہا تھا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر اس کا شمہ بھی تم کو بتاؤں تمہارا دل دہل جائے گا۔ باؤلے ہو جاؤ گے۔

اے رب العالمین۔ اے رب العالمین۔۔۔

۴۔ تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا

ستمبر ۱۹۷۳ء شہر مراد آباد سے محمود پور معافی تک جہاں کچی سڑک تھی وہاں کول تار کی شاہراہ پر یو۔ پی ٹرانسپورٹ کی بسیں رواں ہیں۔ مغربی اتر پردیش کے "سبز انقلاب" کی بدولت حد نظر تک ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ منی بس میں میرے برابر بیٹھے ہوئے کزن نے کہا۔ "باجی۔ یہ سارا علاقہ ہمارا تھا۔"

معلوم ہے۔ وہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں۔ تیرے آبا کی نہیں' تیری نہیں۔ میری نہیں۔ یو۔ پی اور سارے ہندوستان میں مسلم اہل حرفہ کا ایک متمول اور ترقی پذیر طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔

دور سے نواب سید عاشق حسین خاں اور نواب سید ابراہیم حسین خاں مرحومین کے آبائی قلعے کے سنگ سرخ کے بلند و بالا کھنڈر نظر آتے ہیں ے بس محمود پور کے بازار میں رکتی ہے۔ اس کے بعد آگے تاریخی قصبے سنبھل سابق صدر مقام مضاف صوبہ اکبر آباد کی طرف چلی جائے گی۔ نوابزادہ کزن اور میں اتر کر ایک سائیکل رکشا پر سوار ہوتے ہیں۔ یہاں پردے دار موٹروں اور پردے دار بہلیوں میں آیا کرتے تھے۔ میں کھلے منہ اطمینان سے بستی میں سے گذرتی کھنڈروں کے نزدیک ایک باقاعدہ ثابت و سالم محل کے پھاٹک پر پہنچتی ہوں۔ کوئی اس بے پردگی پر متعجب نہیں۔ اگر ابراہیم ماموں کی زندگی میں اس طرح آتی وہ

زمین کھود کر زندہ دفن کر دیتے۔ نواب سید ہاشم ملیحان ابن نواب سید حامد علی خان مرحوم ڈیوڑھی پر موجود ہیں۔ اندر محلات میں مختصر پیمانے پر فیوڈل کارخانہ ابھی جاری ہے۔ باہر ٹریکٹر کھڑے ہیں۔

اندر دالان میں تخت پر بیگمات ایک انگریز مشنری بڑھیا سے باتیں کر رہی ہیں۔ بڑھیا مس بلیئر ایک انگریز کرنل کی بہن ہے جو مدتوں سے محمود پور میں رہتی آئی ہے۔

"روس میں" بھائی ہاشم ملیحان کی بڑی بہن مہدی بیگم باجی مجھے اطلاع دیتی ہیں۔ "بنے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ جنازہ دلی لے آئے ہیں۔"

مہدی بیگم کے شوہر' سید وقار حسین' رضیہ سجاد ظہیر کے ایک سنبھلی کزن تھے۔ دوسرے روز ان کا لڑکا سوئیم شرکت کر کے دلی سے واپس آتا ہے۔

"وہ مرحوم تو کیمونسٹ تھے۔ مذہبی رسوم ادا کی گئیں یا نہیں؟" کوئی پوچھتا ہے۔

"جی ہاں۔ ساری مذہبی رسوم ادا کی گئیں۔" اکن میاں جواب دیتے ہیں۔

"اللہ مغفرت کرے۔ بہت نیک آدمی تھے۔" مہدی بیگم باجی کہتی ہیں۔

بنے بھائی جس انقلاب کے خواب دیکھا کیئے وہ تو آیا نہیں لیکن مارکسٹ نظریہ تاریخ کے کچھ عوامل نظروں کے سامنے موجود ہیں۔ چند قدم کے فاصلے پر استادہ قلعہ محمود پور' حیدری ممانی کے پاکستان جانے کے بعد کسٹوڈین نے لے لیا۔ رفتہ رفتہ کھنڈر ہو گیا۔ چھتیں گر گئیں۔ دالانوں' ایوانوں' صحنوں دیوانخانوں اور ترکی حماموں میں گھنا جنگل اگ آیا۔ کمروں میں خود رو زرد اور سفید پھول اور ترو تازہ اونچی اونچی گھاس لہریں مار رہی ہے۔ سید محمود در ملک بنگالہ مراتب یافت دبوطن رسید دبو بکی دجٹ پورہ وغیرہ نج موضع را اقلوط کردہ۔ محمود پور باسم خود کردد۔ پسرش سید داؤد قلعہ و دیگر عمارات آنجا بناساخت۔ ہم مصداق آثار پدیداست صنادید عجم را۔ "سترہویں صدی سے ۱۹۵۲ء تک یہاں پھاٹک پر نوبت بجتی تھی اور ہاتھی جھومتا تھا۔

"بکری کی چھینک" کنور صاحب[19]۔" میر نذر الباقر نے کنور مہیش پرشاد سے کہا تھا۔

مراد آباد۔ "کوٹھی میر قائم علی" کے مقابل آل زہرا نانی مرحومہ کی "اتاری" میں اب نوابزادہ سید حمایت ملیحان ابن نواب سید حامد ملیحان ابن نواب سید عاشق حسین رہتے ہیں۔ "اتاری" کے ایک بالائی کمرے میں جس میں اماں لکھنؤ یا دہرہ دون سے آکر رہا کرتی تھیں۔ ایک الماری میں چند پرانی دستاویزیں اب بھی پڑی ہیں۔ میں حسب عادت پرانے کاغذات کی ٹوہ میں ایک بستہ کھولتی ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا اشٹام پیپر 1825۔ GENERAL TREASURY

منکہ سید محمد داؤد علی خاں والد سید محمد نجم الدین علی خاں مرحوم ساکن و رئیس محمود پور کا ہوں۔ جو میں برضا و رغبت اثبات ہوش و حواس اپنے کے .... اپنی تمام (تفصیل جاگیر) مع جائداد واقع بلدہ مراد آباد حیات اپنی سید محمد علی خاں پسر احد الوارث اپنے کو قابض اور متصرف کر دیا ہے لہٰذا اقرار کرتا ہوں اور لکھے دیتا ہوں کہ مجھ فقیر کے جملہ تمام .... مگر .... (تفصیل جائداد) واقع سری' امام بخش کنیز قابض اور دخیل

رہے .... مبلغ تین روپے تنخواہ برخوردار سید محمد علی خاں وارث جائیداد کا امام بخش کنیز کو حین حیات اوس کے دیتا رہے۔ (وغیرہ۔ وغیرہ) تحریر بتاریخ 25 دسمبر 1856ء

پوائنٹ ملا۔ روپے کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ تین روپے ماہوار پنشن۔ اکبر شاہ ثانی کے ولی عہد ظفر کی سرکار سے ان کے استاد ذوق کو صرف چار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

نواب سید محمد علی خان نے اپنے نواسے سید معشوق علی خان کی پیدائش کے جشن میں گانے والی ایک نامی طوائف کو بطور انعام وہ پورا باغ عطا کر دیا تھا جس میں وہ دعوت منعقد کی تھی۔ مراد آباد میں وہ آج تک "طوائف کا باغ" کہلاتا ہے۔

نومبر 1890ء کا ایک دعوت نامہ۔ بنام سید محمد علی خان

"عالی جناب رفعت ماب نواب معلی القاب امیر کبیر وائسرائے ہندو گورنر جنرل بہادر کشور ہند دام اقبالہ' کا دربار بمقام آگرہ منعقد ہو گا۔ اگر کوئی کافی وجہ معذوری و مجبوری کی نہ ہو تو آپ بھی اس دربار میں شریک ہوں۔"

دوسرا پوائنٹ۔ گویا ایک نیٹو رئیس کے نام مہذب حکم نامہ۔ "اگر کوئی کافی وجہ معذوری و مجبوری کی نہ ہو۔"

ایک اور کارڈ۔ مشفق و مہربان سید محمد علی خان صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ بعد شوق ملاقات ... شریف باد جو کہ دربار عالی جناب مستعاب معلے القاب، جناب نواب لفٹنٹ گورنر و چیف کمشنر بہادر ممالک مغربی و شمالی اودھ دام اقبالہ ... 11۔ مارچ 1893ء بمقام ضلع بانس بریلی قسمت رو ہیلکھنڈ منعقد ہو گا۔ لہٰذا متقصد بخدمت مخلص ہوں کہ تاریخ مذکور الصدر بمقام مذکور پہنچ کر شریک دربار عظمت مدار ہوں۔ اطلاعاً حوالہ خامہ مودب نگار ... نشاط باد۔ مورخہ 23 فروری 1893ء۔ راقم الشوق مسٹر ارم ہارڈی صاحب بہادر۔ کلکٹر ضلع مراد آباد۔

(مہر) نندلال ماتھر۔ ہیڈ کلرک
کلکٹرز آفس۔ مراد آباد

تیسرا پوائنٹ حاکم وقت کی طرف سے خط لکھنے والے منشی نندلال ماتھر کے اجداد اسی شہر مراد آباد میں مغل حکومت کے مراسلے اسی انداز سے فارسی میں تحریک کرتے ہوں گے۔ اور خط کا اردو اسٹائل وہی تھا جس میں ہمارے شیخ ماڑے خاں نے دوران غدر نہٹور سے ایک ہندو چودھری صاحب کو رقعہ بھیجا تھا۔ (جلد اول میں ملاحظہ کیجئے۔)

بستے سے ایک اور اشٹام پیپر برآمد ہوا۔ اماں کے کارندے کی طرف سے لکھا گیا۔ بقلم حسنین ماموں۔ بتاریخ 4۔ نومبر 1931ء اسے پڑھ کر میں آن واحد میں 1936ء جا پہنچی۔ اتاری سے چند قدم کے فاصلے پر آل مصطفےٰ ماموں کا مکان۔ مرحوم بستہ کھول کر اماں سے کہتے ہیں۔ "نذر بیگم یہ لو تمہاری کوٹھی کے مقدمے کے کاغذات۔"

"باجی تمہاری کوٹھی کی نیو کو چیونٹے کھائے ڈال رہے ہیں۔" حسنین ماموں کی آواز۔ "اے ہے یہاں تو بھیرو ناچ رہا ہے۔" منور ممانی کی آواز[20] آل مصطفےٰ ماموں بستے سے اشٹام پیپر نکال کر دستی عینک دائیں آنکھ کے سامنے کرکے پڑھنا شروع کرتے ہیں۔

دستخط ایم مکلیز۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ تاریخ آویزاں کئے جانے اطلاع نامے کے تختہ اطلاع پر۔ 4 نومبر 1931ء مولوی ظہیر عالم وکیل۔ بعدالت جج مراد آباد۔ مساۃ نذر زہرا ڈگری دار بنام مساۃ امام باندی عرف اچھیا بیگم وغیرہ۔

منکہ سید احمد ملیخان ولد سید اسد ملیخان قوم سید ساکن مراد آباد محلہ مغلپورہ حصہ اول کارکن مساۃ نذر زہرا بنت خان بہادر سید نذر الباقر مرحوم زوجہ سید سجاد حیدر خاں وارد کوہ المو‌ژہ ڈگری دار کاہوں۔ چونکہ مطابق ڈگری و نقشہ کے قرعہ رنگ سرخ مجملہ ایک کوٹھی مندرجہ ذیل حسب ذیل ضابطہ مساۃ نذر زہرا ڈگری دار معرفت عدالت منصفی مراد آباد کے پالیا۔ اس لئے یہ دخل نامہ لکھدیا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے۔

تفصیل حدود اربعہ جائداد جس میں سے قرعہ رنگ سرخ پر دخل پایا کوٹھی پختہ 'مع مکان زنانہ و دوکانیں منہدمہ دیائیں باغ بصدر دروازہ' شرقرویہ مع جملہ متعلقات واقع مراد آباد محلہ فیض گنج عقب مسجد قلعہ۔ دستخط سید احمد ملیخان بقلم خود بخط اردو شکستہ تحریر بتاریخ 4۔ ستمبر 1931ء بقلم سید آل حسنین تحریر ہوا۔ گواہ سید آل حسنین وکیل مراد آباد۔ گواہ خان بہادر نواب سید عاشق حسین خانہ محمو پور معافی ضلع مراد آباد۔

"اماں ہم یہ گڑیا کا فراک لے لیں؟" میں کہتی ہوں۔

"لے لو۔ میر قائم علی کی جائداد میں سے شاید یہی چندی تمہاری قسمت میں لکھی ہے[21]۔"

کوٹھی میر قائم علی متصل مسجد قلعہ بعد اسکی مالکہ مساۃ نذر زہرا زوجہ سجاد حیدر مرحوم کے جانے پاکستان ضبط بحق سرکار ہوئی۔ کسٹوڈین سے حاصل کرکے پنجابی مالک نے اسے گرایا' اور اس کی جگہ نئی دو منزلہ کنکریٹ کی عمارت بنالی۔ اس تاریخی کوٹھی کی فقط اونچی چہار دیواری اور پھاٹک باقی رہ گیا ہے۔ بکری کی چھینک۔ کنور صاحب۔

بچپن میں چندا ممانی نے اتاری کے دالان میں رات کے وقت مجھے چڑیا کے بچوں کے متعلق ایک کہانی سنائی تھی۔ چڑیا فریاد کرتی ہے۔ آگ لگی 'جل جائیں گے رنگ' چوں چوں چوں۔ پانی پڑا بہہ جائیں گے رنگ' چوں چوں چوں۔ آندھی چلی اڑ جائیں گے رنگ' چوں چوں چوں۔

چوک سادات لانکڑی میں آغا کربلائی مرحوم والا آبائی امام باڑہ اب شیعہ وقف بورڈ لکھنؤ کی تحویل میں ہے۔ آل مصطفےٰ ماموں اور منور ممانی کا مکان بھی کھنڈر ہو گیا۔ منور ممانی کراچی چلی گئیں۔ اس کے متصل میر مہدی علی اور نانی اشرف جہاں کے مکان میں نواب اور سید ابراہیم حسین خاں مرحوم کے ایک نواس داماد نے برتنوں کا کارخانہ قائم کرلیا ہے اور اور نگھیوں کے لیپ امریکہ ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔ جن

کا آجکل وہاں "کریز" ہے۔

نواب سید عاشق حسین مرحوم کے جس مکان میں حسنین ماموں اور چندا ممانی کی دشدی ۳۲ء میں رچی تھی اس میں اب نواب سید حامد ملیخاں (ابن نواب سید عاشق حسین خان مرحوم) کے نہٹوری داماد سید حسین مہدی رضوی ایڈوکیٹ فروکش ہیں اقبال کی اسرار خودی کا منظوم اردو ترجمہ لکھنے میں مصروف۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کا فلسفے اور مابعد الطبیعات سے کیا رابطہ اور کس نوع کی مطابقت ہے؟ ایک نوابزادہ کزن کارل مارکس کا مطالعہ کر رہا ہے۔

کچھ لوگ فلسفہ اقبال میں زندگی کا حل تلاش کرتے ہیں۔

محلہ لانکڑی والاں سے کافی فاصلے پر شہر کے ایک گنجان محلے نواب پورہ میں ایک بڑی حویلی استادہ ہے اس میں ہماری پھوپی اپی کے صاجزادے بہاء الدین احمد مقیم ہیں۔ انکی شادی نہٹور سے باہر مراد آباد کے قدیم زمیندار خاندان میں ہوئی ہے۔ بھائی بہاء الدین نے نہٹور میں باغ انبہ فروخت کرکے برتنوں کی قلعی کا چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا ہے۔ جسے چلانے کی کوشش ناکام میں منہمک ہیں۔ ان کے خسری حویلی بھی بوسیدہ ہو چکی ہے کہ آمد انکی بھی جاگیر سے ہوئی ہے بند۔

بھائی بہاء الدین اپنی پاکستانی چھوٹی بہنوں فہمیدہ یونس اور زلیخا ذکی سید کے خط مجھے دیئے ہیں۔ جو لندن سے ریٹائرڈ ہو کر آئے ہیں۔ فہمیدہ ایر فورس میں اسکواڈرن لیڈر ہے اور جنگ بنگلہ دیش کے بعد سے دونوں ملکوں کے گھاٹ ہیں وار پار بند۔

بھائی بہاء الدین ایک زمانے میں بیحد پر مذاق زندہ دل اور بذلہ سنج نوجوان تھے۔ انتہائی محبت شعار ہیں اور ہم سارے بہن بھائیوں کے چہیتے۔ ہمارے لڑکپن میں وہ ہم کو قرات سے اپنا "حقہ نامہ" سناتے تھے اور ہم لوگ ہنس ہنس کر لوٹ جاتے تھے۔

"بھائی بہاء الدین حقہ نامہ سنایئے۔" میں ضد کرتی ہوں۔ "وہی۔ الحقہ و چلم و فرشی تڑو تڑو کا دکڑ دکڈ دکاو تمباکو خمیرہ لاپاؤ و قوۃ فقط دال مسورا۔ اور وہ کیا تھا جو پارے میاں بنگالی مولوی صاحب کا میلاد شریف پڑھا کرتے تھے۔ ایکتا زولنگ۔ زولنگ میں ایک تا پوکھر۔ پوکھر میں ایک تافتر۔ فتر میں ایک تامینڈوخ۔ اور وہ مینڈوخ بولا۔ یانبی سلام علیک۔ "دیکھیے ہمیں کتنا یاد ہے۔"

"بی بی کیا سنائیں۔ وہ سب باتیں اب بھول چکے۔" وہ پاندان کھول کر گلوریاں بنانا شروع کرتے ہیں۔ سیادت مآب رفعت پناہ سعد اللہ فدی اورنگ زیب دفرخ سیرپادشاہ غازی کے یہ دو افسردہ احفاد۔ بھائی بہاء الدین اور احقر تذکرہ نویس چپ چاپ بیٹھے پان نوش جان کرنے میں مصروف ہیں۔ دھرا ہے سامنے ایک پیکدان اک تمبول۔

اقبال" ۔ کارل مارکس ۔ بال یو گیشور۔

رسپنا ندی۔ دسمبر ۱۹۷۶ء۔ حکومت اتر پردیش ڈپارٹمنٹ اف ٹورزم کی دعوت پر میں بذریعہ جیپ' اسٹیشن ویگن' کماؤں اور گڑھوال کا دورہ کرتی دہرہ دون پہنچتی ہوں۔ محکمہ کے شائستہ اور مہذب ڈپٹی ڈائریکٹر سریش چندر (جو قصبہ شیرکوٹ' ضلع بجنور کے ایک ماتھر کائستھ ہیں) سرکاری فوٹو گرافر اور ایک چپراسی پر' مشتمل اسٹیشن ویگن دہرہ دون میں داخل ہوکر بال یو گیشور کے نئے محل کے سامنے سے گذرتی ہے۔ دہرہ دون کا یہ راوت بچہ امریکہ کا ارب پتی بے بی گوڈ بن چکا ہے۔ رشی کیش۔ ہردوار۔ دہرہ دون۔ ہر جگہ نروان کے متلاشی مغربی لڑکیوں اور لڑکوں کے نظر آرہے ہیں۔

ڈالن والا کی ایک سڑک پر سے گذرتے ہوئے اچانک ایک پھاٹک پر "ڈاکٹر پی۔ سی۔ ہون" بورڈ دکھلائی دیتا ہے۔ میں اتر کر اندر جاتی ہوں۔

مسز ہون بہت دبلی اور ضعیف ہو چکی ہیں۔ ان کے صاحبزادے بریگیڈیر ہون' جو بھائی کے دوست اور ہم جماعت تھے پوچھتے ہیں "مصطفےٰ کہاں ہیں؟ اور کیا کر رہے ہیں۔" میں بتاتی ہوں۔

"تمہاری اماں کیسی ہیں۔؟" مسز ہون دریافت کرتی ہیں۔

"ان کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوگیا۔ بمبئی میں۔ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء۔"

مسز ہون جو اردو رسم الخط میں لکھا پڑھا کرتی تھیں' افسردگی سے باہر باغ پر نظریں جمادیتی ہیں۔

ایک وقت تھا جب اماں اور مسز ہون دہرہ دون کی سب سے زیادہ خوش لباس اور فیشن ایبل لیڈیز کہلاتی تھیں۔

آتشدان پر ڈاکٹر ہون کا رنگین پورٹریٹ رکھا ہے۔ ان کو گذرے بھی مدتیں ہوگئیں۔

میں کیمرہ سنبھال کر اٹھتی ہوں۔

"اتنی جلدی کہاں جارہی ہو۔؟" مسز ہون پوچھتی ہیں۔

"دھوپ جانے والی ہے۔ میں ذرا اندر روڈ جاکر آشیانے کی تصویریں کھینچ لوں۔ میں ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ اس کے لئے چاہئیں۔"

"آشیانہ"۔ مسز ہون کہتی ہیں۔ "اب وہاں نہیں ہے۔"

"کہاں چلا گیا۔؟"

"کسٹوڈین سے لینے کے بعد نئے مالک نے اسے گرا کر اس کی جگہ نیا مکان بنالیا ہے۔"

ایک زمانے کی روح جس میں نہ دن ہے نہ رات۔

اندر روڈ پر آشیانے کا پھاٹک۔ سامنے کا باغ اور آرچرڈ کاٹ ڈالا گیا ہے۔ سپاٹ میدان پر بجری بچھی ہوئی ہے۔ نئی نکور سفید رنگ کی کوٹھی۔ میں اور مسٹر سریش چندر اور فوٹو گرافر احاطے میں داخل ہوتے ہیں نئی عمارت کے پہلو میں جہاں پہلے ہمارے باورچیخانے کا ڈنگ تھا' چند کرسیاں پڑی ہیں' میز پر چائے کا سامان رکھا ہے۔ ہوت کی جوت ہے۔ شلوار قمیض میں ملبوس شال لپیٹے ایک فربہ خاتون کوٹھی کے اندر سے برآمد ہوتی ہیں۔

"آؤ بہن جی۔ آپ نے کس سے ملنا ہے؟"

"جی کسی سے نہیں۔ ہم لوگ ایک اور کوٹھی کی تلاش میں غلطی سے یہاں آگئے۔ معاف کیجئے گا۔"

"کوئی گل نہیں جی۔ آؤ بیٹھو۔ چاء پیو۔" وہ پنجابی اخلاق اور بے تکلفی سے کہتی ہیں۔

"جی نہیں شکریہ۔ ہمیں مسوری پہنچنا ہے۔ بہت دیر ہو جائے گی۔"

"اتنی سردی میں اس وقت مسوری جارہے ہو آپ لوگ؟ کہاں سے آرہی ہیں آپ؟"

"بمبئی سے۔"

"افوہ اتنی دور سے؟۔ تب تو ضرور بیٹھو بہن جی۔ آرام کرو۔ میرے ہزبنڈ ابھی آتے ہوں گے۔ چائے شائے پیو۔ اپنا ہی گھر سمجھو۔"

ہم لوگ ان کا شکریہ ادا کرکے باہر آتے ہیں۔ باہر پھاٹک پر آشیانے کی تختی اسی طرح موجود ہے۔

ڈوبتے سورج کی روشنی میں میں اس تختی کی تصویر اتار لیتی ہوں۔

لیکن بکری کی چھینک کی عکاسی کبھی کی جاسکتی ہے؟

۴۔ گاگن ندی

یہ گاگن میری ندی ہے۔ جو ضلع بجنور میں تحصیل نجیب آباد کی ترائی کے جنگل سے نکل کر قصبہ نہٹور سے گذرتی ضلع مراد آباد میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں اس کے کنارے لاکڑی آباد ہے۔ علاقہ محمود پور میں سے بہتی ہوئی جاکر شہر مراد آباد سے ذرا آگے رام گنگا میں مل جاتی ہے۔ فقط پینتالیس میل لمبی ندی اس کا سفر بہت مختصر ہے اور اپنے منبع سے تازہ وارد اور شفاف نہٹور پہنچتی ہے۔ گری جا ہماوتی ندیاں جب تک پہاڑوں سے نیچے اترتی ہیں پوتر رہتی ہیں۔ معصوم شیل پتریاں' برف کی بیٹیاں۔ میدانوں سے گذر کر سمندر تک جاتے جاتے دریا درماندہ اور گدلے اور آلودہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی طویل یاترا کے اختتام پر دریا سمندری دلدل بن جاتا ہے۔ دریا کا اور انسان کی زندگی کا سفر یکساں ہے۔ لیکن گاگن پونے دو ہزار میل دور مشرقی سمندر تک پہنچنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ سال کے گھنے جنگلوں میں آگے جاکر خاموشی سے رام گنگا میں شامل ہو جائے گی۔ ایک قانع' غنی' منکسرالمزاج' شانت ندی۔

نہٹور میں اس پر پل بندھا ہے۔ اور کناروں پر اشنان گھاٹ ہیں اور شوالے' خربوزے کے کھیت۔ گاگن ہماری ندی ہے۔ نہٹور کے مسلمانوں اور تیاگی برہمنوں اور کیتھر راجپوتوں اور جینیوں کی گھریلو ندی۔ اس برصغیر کے بڑے بڑے دریا' بڑی بڑی داستانیں سناتے ہیں۔ اس چھوٹی سی ندی نے اب تک آپ کو اس چھوٹے سے قصبے کی کہانی سنائی کیونکہ اس کی بھی ایک کہانی تھی۔ سترہویں صدی کے ایک گمنام انگریز پادری نے انگلستان کے کسی سرسبز قصبے میں اپنے گرجا گھر کے اندر بیٹھ کر لکھا تھا۔

"اپنی سچائی کو شانتی اور صراحت کے ساتھ بیان کرو اور دوسرے کی سنو۔ خواہ وہ لوگ غیر دلچسپ اور کم علم ہی کیوں نہ ہوں۔ کیوں کہ انکے پاس بھی ان کی کہانی موجود ہے۔"

رام گنگا اور گومتی میرے دوسرے دریا ہیں۔ مگر ان کو سب جانتے ہیں۔ بے چاری گاگن غیر معروف ہے گو اس کی دوسری شاخ مالن ایسی خوش نصیب تھی کہ مہا بھارت میں اس کا تذکرہ آیا اور کالیداس شکنتلا ناٹک میں اسے امر کر گئے۔ اپنے اپنے بھاگیہ کی بات ہے۔

تو گاگن کے پاس بھی ایک قصہ موجود تھا اسے ناچیز نے قلمبند کیا۔

دہلی سے نہٹور کی سمت آتے ہوئے قصبے کے نواح میں شاہراہ کے دونوں طرف کنول سے بھری جھیلیں اور آم اور جامن کے خوش منظر باغات۔ مراد آباد سے آنے والی ٹرین نور ظہور کے وقت دھام پور کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے سے قبل سرشار کھیتوں اور شاداب باغوں میں داخل ہوتی ہے۔ سدا سہاگن اور بانس کے جھنڈ' سال کے درخت' جھیلیں' کاٹھ گودام سے لے کر دہرہ دون تک کا یہ سارا زیر ترائی علاقہ اپنے دلکشا مناظر کے لئے مشہور ہے۔ دھام پور سے سات میل دور' چاند' سورج ستاروں' نیلے آسمان یا شفق یا بادلوں سے پر گاگن۔ اس کے کنارے آم کے باغات جھونپڑے۔ مندر۔ بازار۔ بستی۔ محلہ سادات سہ دری۔ غلے کے اندر جھیل جوڑی۔

جنوری ۱۹۷۵ء کی ایک برفیلی شام جھیل جوڑی کے کنارے ایستادہ مسجد میر نبدے علی ترمذی میں سے انصاری صاحبان نماز مغرب ادا کر کے باہر آرہے ہیں۔ بیٹھک سہ دری کے سامنے اس کے نئے مالک کی ایمبیسیڈر کار کھڑی ہے۔ ایک متمول نورباف کے بالا خانے پر ٹیلی ویژن کا اینٹینا۔ ان کا ٹیلیویژن سیٹ نوے میل دور دلی کے ٹی۔ وی پروگرام دھندلے دھندلے منعکس کرلیتا ہے۔

یہ غریب مسکین جلاہے جو پہلے "رعیت" کہلائیں تھے اور گلی میں سے کوئی میر صاحب گذرتے ہوں تو راستہ چھوڑ کر ایک طرف دبک جاں تھے۔ اور سلام علیکم کے بجائے میر صاحبان کو "حضرت سلامت" اور "سلام مالک" کہیں تھے اب دبنگ آواز میں "السلام علیکم میر صاحب" کہتے خود اعتمادی سے سر اٹھائے آگے نکل جاں ہیں۔ دلولہ خیز سماجی انقلاب! سادات کی متروکہ جائداد کے مکانات انہوں نے خرید لئے ہیں۔ جن میں پاور لوم اور کرگھے لگ گئے ہیں۔ سترہویں صدی میں اسی جھیل جوڑی کے کنارے جد امجد میر محمد تقی کا مکان تھا اور سڑک کے اس پار ان کی بنوائی ہوئی کاروان سرائے۔ ان تین صدیوں میں آبادی گنگا کی باڑھ کی طرح بڑھ گئی۔ اور کتنی غربت۔ سرائے میں مفلس کنبے آباد ہیں۔ سیکڑوں ہندو مسلمان بچہ نہٹور کی گلیوں میں رل رہا ہے۔ "مدرسہ فیض العلوم و یتیم خانہ و مسافر خانہ محلہ پیر شہید کلاں" میں دیو بند کے فاضل بے حد غریب نوجوان مولوی انتہائی قلیل تنخواہوں پر بے حد غریب بچے پڑھا رہے ہیں۔

اور نئی اقدار۔ حافظ ابراہیم انٹر کالج میں مسلمان لڑکیاں مخلوط تعلیم حاصل کرنے میں مصروف۔ اور نئی معاشیات۔ جین ساہوکاروں کی قصبے سے باہر ٹیکسٹائل فیکٹری۔ ہمارے جولاہوں کے نئے بڑھیا مشجر کپڑے یوروپ اور امریکہ ایکسپورٹ کئے جارہے ہیں۔

مہاوٹیں شروع ہو گئیں۔ بڑ کے درخت کے نیچے میاں صاحب" کی سرسبز درگاہ پانی میں بھیگ رہی ہے۔ جولاہے اور کاریگر چھتریاں لگائے اینٹوں کے فرش کی طویل گلی میں سے گذر رہے ہیں۔ عہد التمش سے صوفیائے کرام نے ترائی میں تبلیغ اسلام شروع کی تھی۔ خواجہ بدر الدین" (جن کے لیے کماؤں کے مسلم عوام کا عقیدہ ہے کہ کوہ ہمالیہ کی ایک چوٹی پر بدری ناتھ دراصل شیخ بدر الدین کا مزار ہے!) خواجہ عثمان" شیخ احمد" نہراولی۔ جو پارچہ باف تھے۔ یہ تینوں محنت کش بزرگ رسیاں بنتے تھے اور کپڑا بنتے تھے اور انہوں نے کیٹھر میں اشاعت دین کی تھی۔

محلہ قاضیاں میں پندرہویں صدی کے قاضی چمن کے گھر کے متصل وہ مکان ہے جس میں قاضی چمن کے داماد ہمارے مورث اعلیٰ میر حسن ترمذی آن کر رہے تھے۔ عہد مغلیہ سے قبل کے ایک ہاؤس ہولڈر کا گھر۔ یہ مکان آل میر حسن کی ایک شاخ نے اب تک آباد کر رکھا ہے۔ بیشتر حصہ دوبارہ تعمیر کیا جاچکا ہے۔ پندرہویں صدی کی صرف ایک دیوار باقی ہے۔ سامنے امرود کا درخت۔ دالان میں دو عظیم الجثہ تغار رکھے ہیں۔ اسی وضع کے تغار میں سمرقند میوزیم میں دیکھ چکی ہوں۔ سامنے محلہ تیر گراں میں میر حسن کے وفادار تیر گر کی اولاد آباد ہے۔

اس قدیم قصبے نہٹور اور اس کے ایک قدیم محلے کو میں نے اس کتاب کے لئے اپنی عمرانی ریسرچ کا مرکز بنایا تھا۔ اس معاشرتی تصویر کو تاریخ کی روشنی میں دیکھئے۔ تو چند دلچسپ باتیں معلوم ہوں گی۔ شرق اوسط سے مغرب اقصےٰ تک" اسلامی تمدنوں کے راز دارانہ INTERIORISED مکانات" کے متعلق پروفیسر اولیگ گریبر [22] :۔ "بیت دار اور کنبہ جو مشرقی معاشرے کا مرکز تھا۔ خاور میانہ کی دسویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک کی اولین تصاویر اور تحریروں سے ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ کمروں کے درمیان دروازوں کے بجائے پردے' سادہ چھت' منقش دیواریں' زینے کے نیچے گھڑا۔ بچوں کے لئے ڈیوڑھی میں نجی مکتب۔ ڈیوڑھی کا لمبا اندھیرا گلیارہ یا نیم تاریک ہال۔ (تو بھائی امیر حیدر کے مبارک محل کے نیم تاریک داخلی ہال) باہر گلی میں لوگوں کی مسلسل آمدورفت۔ سودا بیچنے والے۔ درویش۔ اجنبی مسافر۔ قصہ گو۔ جائداد کی مقدمہ بازیاں۔ خصوصاً مشترکہ دیوار کے سلسلے میں میر محلہ عموماً شریف یا رئیس یا مقدم اور BLOOD NOBILITY رفتہ رفتہ آل رسولؐ کے افراد میر محلہ۔ مقامات حریری [23] میں قاضی کو بورژوا عرب دکھلایا گیا ہے۔ (تو پندرہویں صدی لودھی ہندوستان میں ہمارے قاضی چمن عرب نژاد۔) لبستی لبستی مشہد۔ قبے۔ مزار' ایران میں امام زادے' تو محض نہٹور میں پانچ درگاہیں۔ سرائیں' شفاخانے' مساجد' مدارس' کتب خانے۔ متمول شہریوں کی دینداری کے مظاہر۔ پبلک عمارتوں پر "الملک اللہ" کندہ کہ ہر چیز اللہ کی ہے۔ شہر کے باہر کارواں سرائے۔ میر محمد تقی کی کارواں سرائے۔ دینداری اور پاکبازی۔ سو اب بھی نہٹور میں نمازیوں سے مساجد آباد۔

اور گو نہٹور کا یہ نیم دیہی معاشرہ صنعتی دور میں پہنچ چکا ہے۔ مقامات حریری کی تصاویر سے اس کا تعلق ایک حد تک بھی موجود ہے اور صرف چند سال اور باقی رہے گا۔

اور مجھے سولہویں صدی مغلیہ مکان ابو الفضل فیضی کا فتح پور سیکری ہمیشہ HAUNT کرتا ہے اس کے کمرے، خنک عقبی تہہ خانہ، جہاں وہ لوگ گرمیوں میں رہتے تھے۔ کمروں کی دیواروں میں چھوٹی چھوٹی الماریاں۔ اور پنجاب اور یو۔ پی کے قصبوں اور چھوٹے شہروں سی گذرتے ہوئے اچانک دلآویز میڈیول مکان نظر آجاتے ہیں۔ اور ان کی خوبصورت ڈیوڑھیاں اور شہ نشین۔

میں سال گزشتہ نہٹور آکر اس کتاب کے لئے تصاویر کھینچ چکی ہوں۔ اس مرتبہ بھی بھائی امیر حیدر اور بھائی کمال احمد اور بھائی شمیم حسین زیدی میرے ہمراہ گلیوں سے گذرتے محلے میں جگہ جگہ لے جاتے ہیں متحیر بچوں کا غول پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ کسی غیر ملکی ٹورسٹ کی طرح دفعتاً کسی جگہ ٹھٹھک کر مکانوں کی تصاویر لیتی جاتی ہوں۔ اس قصبے میں مغل طرز تعمیر کے دلنشیں نمونے موجود تھے۔ ایک گلی کے سرے پر ایک پکچریسک پھاٹک اچانک سامنے آجاتا ہے۔ تیز سبز گھاس کا قطعہ اور سرو کے درخت گویا انیسویں صدی کے کسی ترکی افسانے کا انٹیریر۔ یہ مکان میں باکو' سوویٹ آذر بائیجان اور سمرقند اور پرانی دلی اور لاہور اور ملتان اور مشرقی ایران کے شہروں گناباد اور برجند میں دیکھ چکی ہوں۔ طرز تعمیر اور ایک مخصوص تمدنی فضا اور ایتھوس اور میلیو کی جھلک کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ اور مکمل خاموشی۔ داستان عہد گل راز نظیری۔

"یہ بھی متروکہ جائداد ہے۔" بھائی امیر حیدر کی ملول آواز۔

اور ایک خالص ہندوستانی دیہاتی وضع کا مکان۔ بھائی رضاالدین حیدر جو فرخ سیر بادشاہ غازی کی بزرگوں کو دی ہوئی جاگیر ملک کی باقیماندہ زمین پر سیر کرتے ہیں۔ محلے کی دوسری جھیل ماہی گیران کے کنارے ڈیوڑھی میں بھینسیں۔ اندر کچے دالانوں اور کوٹھوں میں اناج' آنگن میں چکی۔ یہاں بھائی رضا الدین حیدر کی بھانج بہو۔ پولیش نژاد یہودی امریکن مصنفہ لنڈا نیویارک سے آکر رہتی ہے۔ وہ اور اس کا شوہر خالد خاندان نہٹور کی اپنی شاخ اور اس کے پاکستان انخلاء کے متعلق ایک الف لیلوی ناول "ریفیوجی" لکھتے ہیں۔ اور روزانہ دھام پور ٹیکسی بھیج کر تازہ ڈبل روٹی منگواتے ہیں۔ امریکن تمول بے چارے نہٹوری نیٹوز کے لئے حیرت انگیز۔ جس طرح جدید پاکستانی امارت وہاں سے لوٹ کر آنے والوں کے لئے باعث تعجب۔

اخوند امام بخش کے مکان کے در و دیوار میں اور چھت پر اونچی گھاس اور سفید ریشمی پودے اگ آئے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں یہی مکان ایک عام مغل راجپوت مینا تور کا انٹیریر رہا ہوگا۔ دروازوں اور بالا خانے کے دروں پر چقیں یا چھینٹ کے دبیز پردے۔ سفید منقش دیواروں کے طاقچوں میں گلدان خاصدان عطردان عود سوز یا نازک صراحیاں۔ مہتابی پر چاندنی کا فرش۔ رنگین پایوں والے پلنگ گاؤ تکیے۔ پیڑھیاں کم سے کم فرنیچر' اوپر شامیانہ' صحن کی دیوار کے اوپر جھکی آم کی ڈالیاں۔ یا یہی مکان قالینوں کی فراوانی کے ساتھ ایک ایرانی مینا تور کا انٹیریر بن سکتا تھا۔

ہمارے ہاں مکان اخوند امام بخش' حویلی جلال الدین حیدر' مسجد سہ دری' دوسری عمارتوں اور

متمول کلالوں کے سنگ سرخ کے مقبروں میں راجپوت موتیف بھی موجود ہیں۔

۱۹۷۵ء میں خانہ اخوند امام بخش پر عسرت برس رہی ہے اور بے پایاں ویرانی۔ ایک سابق زمیندار عزیز جو چند ماہ پاکستان میں گذار کر آئے ہیں انگنائی میں پڑے کھاٹ پر بیٹھ کر مجھے کراچی کی الف لیلیٰ سناتے ہیں۔ "بی بی۔ آپ کو بھائی نصیرالدین حیدر مرحوم کا پرانا ملازم عبدالرحمن یاد ہے۔؟"

"جی ہاں۔ خوب یاد ہیں۔ ان کی بیوی غوریا اتنی اسمارٹ تھی کہ ہم لوگ اسے لیڈی عبدالرحمن کہتے تھے۔"

"جی ہاں۔ وہی۔ تو عبدالرحمن کے لڑکوں نے دوبئی کویت جا کر خوب پیسہ کمایا۔ کراچی میں کوٹھی بنوالی۔ CARVED فرنیچر سے اسے سجایا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور میں بھابی وحیدہ علیل تھیں۔ کراچی میں عبدالرحمٰن مرض الموت میں مبتلا روزانہ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیلی فون سے لاہور اچھوبی بی کے ہاں ٹرنک کال کر کے بھابی وحیدہ کی خیریت دریافت کرتا تھا۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ کیا غریبوں کو ہمیشہ غریب رہنا چاہیے؟" میں دریافت کرتی ہوں۔ عبدالرحمٰن کے بیٹے محنت کش طبقے سے نکل کر اب نئی بورژوازی میں شامل ہو چکے ہیں۔ عبدالرحمٰن میں اپنے پرانے آقاؤں کے لئے فیوڈل وفاداری موجود تھی۔ طبقات اور انسانوں اور انسانی رشتے داریوں کے بدلتے ہوئے گراف۔

ایک عزیز جو یوپی ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلرک ہے' سائیکل ڈیوڑھی پر' رکھ السلام علیکم کا نعرہ لگاتا ہے جو سنتِ رسولؐ ہے۔ کسی کے گھر میں داخل ہو تو باہر سے آواز دو۔۔ پھر وہ اندر آکر دوسری کھاٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔ پاکستان ریٹرنڈ افسردہ بزرگ کہتے ہیں۔ "کراچی میں میں نے رشتے داروں کی کوٹھیاں دیکھیں۔ ایک سے ایک محل نما عالیشان۔ باغ۔ فوارے۔ برساتی میں دو دو امپورٹیڈ ائیر کنڈیشنڈ موٹریں۔ کمروں میں جھاڑ فانوس۔ وال ٹو وال کارپٹ۔ ٹیلی ویژن۔ سب آئے دن عمرہ اور حج کرنے جاتے ہیں اور حج کر کے آتے ہیں تو سیر تفریح کے لئے یوروپ امریکہ۔ ماشاءاللہ' ماشاءاللہ۔ اور لندن تو ان سب کے لئے گھر آنگن بن گیا ہے۔"

"آپ کو بھی پاکستان چلا جانا چاہیئے تھا۔" میں کہتی ہوں۔

"کیا جاتے اب بہت دیر ہو گئی۔" وہ تاسف سے جواب دیتے ہیں۔

نگڑ دادا اخوند امام بخش کے بوسیدہ مکان کی دیواروں میں اگی گھاس ہوا میں فادر ٹائیم کی داڑھی کی طرح لہرا رہی ہے۔ ابا جان اور ان کے بہن بھائیوں نے اپنا بچپن اسی گھر میں گذارا تھا۔ اسی آنگن میں اچھلتے کودتے تھے۔ اسی زینے میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ درِ دالان کے اندر قطار میں بچھے پلنگوں پر سوتے تھے۔ صبح صبح ان کی نوجوان ماں سعید بانو بیگم اس در میں اکڑوں بیٹھ کر ان شور مچاتے بچوں کے منہ دھلاتی ہوں گی۔ اعجاز۔ صغریٰ فاطمہ۔ سجاد۔ نصیر۔ عنقریب یہ ہونہار بچے بیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔

دور شوالک کی پہاڑیوں اور ڈھاک اور سال اور شیشم کے جنگلوں اور گاگن ندی پر سے بہتی ہوا

آکر اس نیم شکستہ بھورے مکان کی راجپوت وضع کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہی ہے۔ پاکستان کی سیر کر کے آئے ہوئے افسردہ بزرگ اٹھ کر نماز عشاء کے لئے باہر چلے جاتے ہیں۔ گلی کی کیچڑ الانگتے ہیں سر جھکائے مسجد میر بندے علی ترمذی کا رخ کرتے ہیں۔ شاید ان کو اسی بات کا بھی دکھ ہے کہ اس مسجد کی دیکھ بھال اب خوشحال نوربافوں کے ہاتھ میں ہے۔

یہ کیسا گھپلا ہے۔ کیا ہوا تھا؟ تاریخ کا عمر عیار بڑے بڑوں کو غچہ دے گیا۔ باہر جھیل جوڑی پر بڑا سناٹا طاری ہے۔ پر دادا میر احمد علی والی پلکھن ہوا میں سرسراتی ہے۔ جواب شاید اسے بھی معلوم نہیں۔ موسم بہار میں ڈھاک اور مہوا اور کچنار پھولوں سے لد جائیں گے۔

اتر پردیش میں پاور کٹ کی وجہ سے نو بجے رات سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس گھپ اندھیری رات میں ابا جان کی اکلوتی پھوپھی ام سعید بیگم کی بڑی کوٹھی کے کمرے بہت سنسان معلوم ہوتے ہیں۔ عقب میں میاں صاحب کی دو سو سال پرانی درگاہ اور زیادہ پر اسرار۔ گھپ اندھیری رات خالص وقت ہے۔ مہاکال ایسی راتوں میں مالن گاگن کے کنارے بتوں میں چھپے تنترک جوگی اپنے دیوی دیوتا جگاتے ہیں اور درگاہوں میں بیٹھے واقف اسرار عملیات میں مصروف۔ تو ہم سب متواتر ساری زندگی اپنے اپنے عملیات میں مصروف انکے نتائج دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں اور پر امید اور متحیر۔

دہلی میں میری ایک دوست رہتی ہیں ثریا حسین "کانونٹ کی تعلیم یافتہ اور موڈرن۔ انڈین آرمی کے میجر محمود حسین کی بیگم ہر سال اپنی اولاد سے ملنے جاتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی نہایت اللہ والی بھی ہیں اور طویل نمازوں اور وظائف کی عادی۔ ایک بار کہنے لگیں "میں جائداد کے مقدمے کی کامیابی کے لئے ایک جلالی وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ جو مجھے بخش دیا گیا ہے۔ حضرت محبوب الہیؒ کے مزار کے نزدیک آدھی رات کو وظیفے میں مشغول تھی پتہ ہے۔ موکل طرح طرح کی شکلوں میں آکر ڈراتے ہیں تاکہ عامل اپنا وظیفہ چھوڑ دے۔ ورنہ موکلوں پر اس کام کا بوجھ پڑتا ہے۔ تو میں وہ وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ جب اچانک ایک بہت لمبا شخص نمودار ہوا۔ کوٹ پتلون۔ سر پر سولاہیٹ۔ دہکتا ہوا چہرہ آگ کی طرح سرخ۔ بڑے بڑے دانت۔ ہنس رہا تھا۔ پہلے اس نے مزار کا طواف کیا۔ پھر آکر میرے قریب بیٹھ گیا۔ اور بار بار انگریزی میں پوچھے WHAT ARE YOU PRAYING? پھر کسی اجنبی زبان میں بے تکان بولنے لگا۔ اور ساتھ ساتھ ہنستا بھی جائے۔ میں مطلق نہ ڈری اور میں بھی اسے دیکھ کر جواباً ہنسی۔ پھر میں نے حضور کے مزار کی طرف توجہ کی اور حضور سے درخواست کی اسے آپ سنبھالیے۔ وہ اسی طرح بولتا رہا۔ میں نے پرواہ نہیں کی۔ وظیفہ جاری رکھا۔ آخر وہ بور ہو گیا۔ ہاتھ جھاڑے اور اٹھ کر چلا گیا۔"

سولاہیٹ پہنے موکل۔ آتشیں چہرہ۔ کس قدر لرزہ خیز تصور ہے۔ ہیبتناک۔ جتنا اس پر غور کیجئے۔ اور طرح طرح کے موکل ساری زندگی ڈراتے رہتے اور اجنبی زبانیں بولتے ہیں اور ہنستے ہیں۔

گھپ اندھیری رات لیمپ کی روشنی میں ڈنر۔ پھر تاریکی۔ صبح چار بجے سے اطراف میں کرگھے چلیں گے۔ پھر اذان کی آواز بلند ہو گی اور باغوں پر نیلا اجالا پھیلے گا۔ جو مریم کی ردا کا رنگ ہے۔ ابھی تیرگی

کا دریا بہہ رہا ہے۔ اور اس میں عمارتیں۔ گزشتہ انسانوں کے متحیر خواب۔ موہوم سے موجود ہیں۔

دربار غظام کا باقیماندہ شکستہ پھاٹک اور میر بندے علی ترمذی کی ایک بہت قدیم حویلی (جس کے ایک تہہ خانے میں انگریز کنبہ اور دوسرے میں پھانسی کے سزا یافتہ باغی احمد علی غدر کے دوران روپوش رہے تھے۔) جواب ملبے کا ڈھیر ہے۔ وہ تہہ خانے اسی طرح موجود ہیں ان میں کوڑا کرکٹ بھرا ہے۔ اوپر کی عمارت گر جائے۔ تہہ خانے باقی رہتے ہیں۔ گو ان میں کاٹ کباڑ جمع ہو سکتا ہے۔

خان بہادر سید جلال الدین حیدر مرحوم کی متروکہ جائداد حویلی میں بھی پاور لوم چل رہے ہیں۔

ایک اسی سالہ بزرگ عزیز نے کل مجھے بڑے اہتمام سے خط و کتابت کا ایک فائل دکھایا۔ "بی بی۔ میں مسز اندرا گاندھی سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔ اس حویلی کو کسٹوڈین سے جولاہوں نے خرید لیا تھا۔ اسے واپس کر دیا جائے اس میں یلدرم کالج اور لائبریری قائم کروں گا۔"

المناک۔ یہ بزرگ برطانوی قصبہ نہٹور کو "سرکار سنبھل مضاف صوبہ اکبر آباد" لکھتے رہنے والے خواب پرستوں کی اولاد ہیں۔

دادا جان کی حویلی کے نزدیک میر بندے علی ترمذی کے ایک فرزند خان بہادر سید ابو الحسن کے وسیع دو منزلہ مبارک محل میں ان کی اولاد رہتی ہے۔ اس کے عقب میں خان بہادر جلال الدین حیدر کے سب سے چھوٹے بیٹے' خان بہادر ڈاکٹر وحید الدین حیدر کی متروکہ جائداد۔ کوٹھی میں سرکاری دواخانہ قائم ہے۔ اس کے برابر جلال الدین حیدر کے بہنوئی اور خالہ زاد بھائی ڈپٹی سید صغیر حسین کی یہ کوٹھیاں۔ جن ڈپٹی صاحب مرحوم کی بیٹی حمیدہ بیگم اور داماد سید نثار حیدر زیدی ابن خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر مرحوم اب تک پرانے زمینداران کروفر سے فروکش تھے۔ ان دونوں کی حالیہ رحلت کے ساتھ خان بہادروں کا وہ معاشرہ جو ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں وجود میں آیا تھا ختم ہوا[24]۔

بڑی کوٹھی' نشیمن کا جدید وسیع پائیں باغ جس میں آم اور ناشپاتی' اور شریفے اور فالسے اور یوکلپٹس کے جھنڈ سرسراتے تھے اور گلاب اور بیلے کے تختے مہکتے تھے اور پھونس کے سمرہاؤس میں بیٹھ کر جگر مراد آبادی فکر شعر کرتے تھے۔ وہ باغ ایک اجاڑ سپاٹ میدان ہے۔ چچی وحیدہ کے بھٹے کی چند اینٹیں میدان کے کنارے پڑی ہیں۔ ان پر۔ W۔B ثبت ہے۔ وحیدہ بیگم۔ جو عنقریب سرحد پار لاہور کے ایک قبرستان میں اپنا آخری گھر بنانے والی ہیں۔

کائی آلود سنگ و خشت کا وقت۔

سید جرار حیدر ابن سید نثار حیدر زیدی و حمیدہ بیگم اور زہرا جرار حیدر بنت سید نصیر الدین حیدر و وحیدہ بیگم جو نواسے اور نواسی ڈپٹی صغیر حسین اور ام سعید کے ہیں۔ ہائیکورٹ کی چھٹیوں میں الہ آباد سے نشیمن آتے ہیں۔ یہ دونوں مارکسی نظریہ تاریخ کے حامی ہیں۔ اس وقت وہ لوگ الہ آباد میں ہیں۔ سارے میں خاموشی طاری ہے۔

ڈرائنگ روم سے ملحق کتب خانے میں پرانی کتابیں رکھی ہیں۔ وکٹورین دور کی انگریزی اور اردو

کتابیں۔ سادات نہٹور کے اجداد کے متعلق ایک قدیم مخطوطہ۔

"درباب سید محمد یحییٰ محدث۔ شہادت ۱۶۵ بمقام جرجان۔ (یہ صاحب عرب افواج کے ساتھ جار جیا تشریف لے گئے ہونگے) سید احمد۔ مصنف ارشاد الطالبین۔ سید عمر۔ مصنف تفسیر بحرالحقائق۔"

محمد حسن نساب جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں آنکھوں سے کم سجھائی دیتا ہے۔ اپنے پوتے کا ہاتھ تھامے مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ "بی بی سب پاکستان چلے گئے۔ ان کو گئے ہوئے بھی مدت گذر گئی۔ جب سے ہم فاقے کر رہے ہیں۔ آپ کے ہاں کی وہ شادیاں خواب و خیال ہو گئیں۔ جن میں ہم دولہا اور دلہن کے شجرے زبانی سنا کر اپنی روزی کماتے تھے۔ صدیوں تک آپ کے ہاں ہمارا یہی کام رہا۔ اب کیا کریں؟ ہمارے لڑکوں نے فیکٹریوں میں نوکری کرلی ہے۔"

"اچھا کیا۔ شجرے سنانے کی کیا تک تھی۔" فلاں ابن فلاں ابن فلاں چہ بے ہیت۔ مگر اس راجپوت نژاد بوڑھے مسلمان بھاٹ کو کون سمجھائے۔

ایک نوجوان عزیز' سید فرحت حسین سائیکل رکشا چلاتا ہے۔ فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ محمد حسن نساب کے جانے کے بعد پانچ اندھی دھندی میراثن ٹٹولتی ٹٹولتی آکر اندورن صحن میں مولسری کے نیچے بیٹھ جاتی ہیں۔ سروری میراثن کی رشتے دار۔ نہٹور کی آخری میراثنیں۔ "بی بی اب ریڈیو گم ہو رہا ہے۔ آپ سب پاکستان چلے گئے۔" وہی مرثیہ۔ "اور ہمارے لڑکے خود کو میراثی نہیں کہلوانا چاہتے۔ کارخانوں میں مزدوری کر رہے ہیں۔"

"اچھا کر رہے ہیں۔" پھر مجھے خیال آتا ہے لیکن ان میراثنوں کے فن کا خاتمہ ہوا۔ جیسے ان سے پہلے ڈوم بھانڈ اور نقال گئے جو ہمارے بچپن تک موجود تھے اور منفرد فنکار تھے۔

پام کے درختوں والے مردانے صحن میں مستری مبارک حسین مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ بوڑھے عسرت زدہ تقریباً نابینا انقلابی۔ جو اپنا خوشحال کاروبار تج کر بھگت سنگھ سے جا ملے تھے۔ اور نہٹور کے دوسرے انقلابیوں کے ساتھ 1920,S کی دہشت پسند تحریک میں حصہ لیا تھا[25]۔ آج ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔

ایک بوڑھی خادمہ جس کی کمر کمان کی طرح جھک گئی ہے۔ نشیمن کے لیڈیز کورٹ یارڈ کے شاگرد پیشے کی ایک کوٹھری کی دہلیز پر چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ جھکی جھکی آکر کہتی ہے۔ "بی بی کالج پڑھ کر آگئیں؟ اچھو بی بی نے بھی کالج پاس کر لیا؟ وہ کب آئینگی اور حسنہ بی بی۔ عذرا بی بی۔ ممن بی بی۔ طفیل بی بی۔ نفیسہ بی بی وہ لوگ کب آئینگی؟۔" اس ضعیفہ کو وقت کے گزرنے کا مطلق احساس نہیں کیونکہ بوڑھوں کا اندرونی ٹائم سسٹم بالکل مختلف ہوتا ہے۔

چچا نثار مرحوم کے قدیم "میجر ڈومو" حافظ لطیف ان کوٹھیوں اور باغات انبہ اور زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ حافظ جی پہلے ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے ملازم تھے۔ "ڈاکٹر صاحب کا چلتی ٹرین میں انتقال ہو گیا۔ حافظ جی کمپارٹمنٹ میں ہمراہ تھے۔ ان کا سر گود میں لئے بیٹھے رہے تھے جب تک ٹرین کئی گھنٹے

بعد اگلے اسٹیشن پر پہنچی۔ ڈاکٹر انصاری ابا جان اور چچا نصیر کے دوست اور چچی وحیدہ کے معالج تھے۔ ان کی وفات کے بعد حافظ جی ہمارے ہاں آگئے۔ خلافت کے قصے سناتے ہیں۔ جواب ایک افسانوی دور معلوم ہوتا ہے۔

نگینے کے حافظ محمد ابراہیم علیگڑھ میں چچا نثار مرحوم کے ہم جماعت تھے۔ دادا صغیر حسین مرحوم ہی نے کہ جو ہر قابل کے پارکھ تھے ان کو مشورہ سیاست میں جانے کا دیا تھا۔ اور بعد میں شدید سیاسی اختلافات کے باوجود حافظ ابراہیم نے مرتے دم تک چچا نثار سے دوستی نبھائی۔

نہٹور ٹاؤن ایریا کمیٹی کا ہائی اسکول سر ولیم میور کے نام پر قائم تھا۔ آزادی کے بعد حافظ ابراہیم انٹر کالج۔ اور وہ گورنر جنرلوں کی دنیا۔ لارڈ ڈلہوزی (میر بندے علی ترمذی کے بھائی میر نبی بخش جن کے نیٹو اے ڈی۔ سی تھے) اور ہینڈسم اور شاندار لارڈ میو جن کی تصویر سلطان آرا ممانی کے دادا نواب سید احمد علی کے البم میں موجود ہے۔ جو انہوں نے اردو میں دستخط کر کے نواب کو دی تھی۔ "لاڈ میو گورنر جنرل۔ 4,1868 NOV." (فوٹوگرافر کلارنگٹن۔ ریجنٹ اسٹریٹ۔ لندن)

چنانچہ۔ غدر کا شیخ ماڑے خاں۔ اور گورنر جنرل ڈلہوزی اور میو اور میور اور ولنگڈن اور لن لتھ گو اور علی برادران۔ اور مختار احمد انصاری۔ مستری مبارک حسین اور بابا خضر انڈر گراؤنڈ دہشت پسند لیڈر۔ حافظ ابراہیم۔ مسلم لیگ زندہ باد۔

اور اب سامنے سڑک کے دیوار پر جلی اردو حروف میں لکھا ہے نور الہدی (سی پی آئی) کو ووٹ دیجئے۔

بابل کے بادشاہ بخت نصر کے محل کی دیوار پر کیا لکھا تھا جسے قیدی دانیال نبی کو پڑھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔؟

ڈائننگ روم میں عہد رفتہ کی ایک یادگار۔ واحد چوبی تختے سے بنی' بے حد طویل نادر ڈائننگ ٹیبل پر رات کا کھانا چنتے ہوئے ایک اور قدیم فیوڈل ملازم مجھ سے کہتا ہے۔ "بی بی اگر برا نہ مانیئے تو ایک بات کہوں۔ گورنمنٹ نے بھنگی چماروں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ سب ہماری برابری کرنا چاہتے ہیں۔"

صبح ہوئی۔ گھر گھر لذیذ کھانے پکنے شروع ہو گئے۔ غریب' امیر' متوسط الحال سب توفیق سے زیادہ اچھے کھانوں کے شوقین۔ اسی زبان کے چٹخارے نے تباہ کر دیا۔ مسلمانوں کی تہذیب طعام پرست ہے۔ اور شعر پرست۔ نہٹور کی بزم یلدرم ہفتہ وار اور ایک سالانہ آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔

سویرے سے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ جاڑوں کا بوند ساون۔ میں مردانی کوٹھی کے اس برآمدے میں جس کا رخ مولسری والے زنانے صحن کی طرف ہے۔ تخت پر بچھے ایرانی قالین کے اوپر خستہ شاہی فرامین[26] پھیلا کر ان کی نقل کرتی ہوں۔

تخت۔ ایرانی قالین۔ شاہی فرامین۔ سبحان اللہ۔

پہلو کے برآمدے کے سامنے قدیم بوڑھا ملازم کالو کھرپی لئے گھاس کھود رہا ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ خلافت راشدہ کی ابتدائی اشتراکیت اور جس عظیم الشان مسلم کلچر کے ہم نام لیوا ہیں اس کی جاہ پرستی اور ثروت و افلاس کی یہ تفریق اور ہم اس یونیورسل تہذیب کے پروردہ اور مداح۔ ایک پہلو تصوف اور دینداری اور خدا ترسی اور سیدھا پن اور شائستگی اور دوسرا پہلو طاقت و شوکت۔ اسراف دھوم دھڑکے' تکلفات کا شوق اور اکڑ اور ٹیں۔

اور یہ بوڑھا کالو اسی طرح سر جھکائے گھاس کھودتا رہے گا لیکن نور الہدیٰ کو ووٹ نہیں دے گا۔ اور اس کی اولاد کی رہبری کرنے والا بھی کوئی نہیں۔

اس بدقسمت برصغیر کی آزادی کو تیس سال ہونے آئے۔ اب تک کچھ نہ ہوا۔ کیوں نہ ہوا۔ اس صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ وہی زبوں حالی۔ وہی طبقاتی تفریق۔ وہی سب کچھ۔ صرف نام اور عہدے بدل گئے۔ گورنر جنرل لارڈ میو کے انگریز ورثاء کی جگہ لاکھوں کروڑوں کے وارے نیارے کرنے والے رشوت خور۔ تینوں ملکوں میں۔ اور مستری مبارک حسین فاقے کر رہے ہیں۔

بارش تیز ہو جاتی ہے۔ حافظ لطیف سائے کی طرح اندر جا کر عمیق وکٹورین ڈرائنگ روم کے دروازے کھڑکیاں کھول دیتے ہیں۔ سارے میں گہرا سناٹا طاری ہے۔ وجود اور واقعیت کے اتھاہ بھیدوں کی خاموشی۔ باہر بام کے پتوں کی جنبش اور اور سرخ گلابوں پر بارش کی گرتی بوندوں کا لمحہ۔ روشن۔ سرشار پاکیزہ۔ خالص۔

مولسری والے صحن کے سرے پر گلاب کی کیاریوں کے ادھر' زنانی کوٹھی کے ایک کمرے میں چچی وحیدہ اور پھوپھی حمیدہ (جن کے بیاہ ۱۳ء ۔ ۱۴ء میں ہوئے تھے۔ TEEN_AGER "وحیدہ بیگم نہٹور" جن کا روزنامچہ ۱۹۱۱ء کے عصمت میں چھپتا تھا۔) کے جہیز کے ظروف اسی طرح بند رکھے ہیں۔ بھاری بیکار جہیز فیوڈل روایات کی ایک علامت۔ ان کی لڑکیوں کے جہیزوں کے برتن دوسرے کمروں میں مقفل ہیں۔ حسنہ' عذرا۔ حمیرا زہرا۔ وہ لڑکیاں بھی دادیاں نانیاں بن گئیں۔

جھٹ پٹے کے وقت جھیل جوڑی کے کنارے کھڑے ہو کر کان لگاؤ۔ پانچ صدیاں جھک کر باتیں کرتی معلوم ہوں گی۔ ذرا سنو۔ پانی تو پیم گر رہا ہے 2[7]۔

بی بی مہر النساء کیتھلی تافتہ کی سرخ قبا پہنے۔ پالکی ان کی پھاٹک کے اندر گئی۔ زمین کے اندر اتر گئی۔

بی بی جاوید دولت۔ حالت شما چہ طوری خانم؟
بی بی گل رخ۔ گل چہر خاتون۔ ماہ نور بیگم۔
ایک لکڑ پہ بیٹھا مکڑ دن بھر میں رتی رتی کھائے تو پانچ سو برس میں کتنا کھائے۔؟

عیدگاہ کے جنگل میں سید حسن ترمذی کا مزار۔ نیا لپا پتا۔ چاندنی میں چمک رہا ہے۔ بنجارہ چاند تیرتا تیرتا جلال الدین حیدر کے مکان پر آ گیا۔ آسمان کے طاق میں رکھا کنول روشن ہوا۔ روشنی اس کی چار سنسان برجیوں پر پڑی جو وہ اپنے چار بیٹوں کی بیویوں کے لئے بنوا گئے تھے۔ مسرور فاطمہ۔ نثار فاطمہ۔ نذر

زہرا بیگم۔ وحیدہ بیگم۔ فاطمہ صغریٰ۔
پانچوں کی پالکیاں زمین کے اندر اتر گئیں۔
تیرا برس کی نیو۔ گھاس کا لمحہ۔
بی بی جاوید دولت۔ حال شما۔
تجدید الخلق

۵۔ ابر نو بہار

"کار جہاں دراز ہے" جلد دوم کے مسودے میں کچھ کھڑ بڑ ہوئی۔ کاغذات سرسرائے اور دو تیز آنکھیں اور مونچھیں چمکیں۔ وہ ماری پور کے پیانو میں رہنے والا موٹا چوہا تھا جو اتنے عرصے بعد دفعتاً نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے آنکھیں مل کر اسے دیکھا۔ برادر موش[28] نے اس وقت عہد سینٹ فرانسس سے تین سو سال آگے یوروپین نشاۃ ثانیہ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے چوڑے چھجے کی ہیٹ پر بڑا سا نیلا پر لہرا رہا تھا۔ ہیٹ اتار کر اپنا سیاہ مخملیں کلوک گھماتے ہوئے اس نے بڑے اسٹائل سے شیکسپیرین انداز میں سلام کیا۔ اور مونچھوں میں مسکرایا۔ میں نے پلک جھپکی تو وہ اسپیس سوٹ میں نظر آ رہا تھا۔ اور اس نے چاند کے مسافروں کا بلوریں خود پہن رکھا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ شانوں کی پٹیوں پر ایک طرف امریکن اسٹار اینڈ اسٹرائپس دوسری طرف روسی درانتی اور ہتوڑہ اور CCCP کے نشان۔

"سینور۔ تم تو بڑے چلتے پرزے نکلے۔ مگر تم اپنی ٹوپی پر اشوک چکر اور چاند ستارہ بھی ساتھ ساتھ لگاؤ تو کچھ بات بنے۔" میں نے کہا۔

وہ "کار جہاں۔" کے انبار پر جمع کردہ ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گئی وہ اب اپنا وعظ کہنے والا ہے۔

"سنیکٹس۔ سنیکٹس۔ سنیکٹس۔" اس نے کلیسائی گونج کے ساتھ کہا۔

"قدوس۔ قدوس۔ قدوس۔" میں نے دہرایا۔

"تم پر سلامتی ہو سسٹر وومن۔ تم نے ابھی ایک باب پہلے کیا فضول بات لکھی ہے کہ دنیا بے وقعت ہے اور زندگی بے مقصود؟"

"ہے تو سہی۔ اگر آفاق کے تناظر میں دیکھو۔"

"نان سین۔" اس نے بشیر خاں ڈرائیور کی آواز میں کہا۔

"ذرا دنیا کے خوفناک حالات پر نظر کرو۔ صبح کا اخبار پڑھو۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے اتنا لمبا قصہ محض نہٹور اور لانکڑی اور محمود پور کا لکھ ڈالا۔ اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟"

"یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انسانیت مستقل ترقی پذیر ہے۔ ورنہ نئی آدم ابھی صحراؤں اور جنگلوں

میں خاک اڑا رہے ہوتے۔"

"لیکن انسان کے تحت الشعور میں ابھی جنگل کا درندہ۔"

"مت بھولو کہ سینٹ فرانس نے ایک بھیڑیے کو بپتسمہ دیا تھا۔"

"دنیا کے سیاسی حالات دیکھو۔" میں نے دہرایا۔ "یہ سارے سیاسی "ازم" تعصبات، جھگڑے، ذہن کی تاریکیاں اور جالے۔ یہ سب اپنی جگہ ہیں مگر ہیومن ڈیسنسی اصل چیز ہے۔ تم نے اس کتاب میں ہر تیسرے انسان کو "بے حد سوئیٹ" لکھا ہے۔ یعنی کافی انسانوں میں تمہیں ہیومن ڈیسنسی ملی۔ بس وہی اصل چیز ہے۔ اور ہمت اور حوصلہ۔ ان ہی کے بل بوتے پر دنیا اور آگے بڑھے گی۔"

"بھائی چو ہے تم تو نہایت POMPOUS گفتگو کرنے لگے۔"

اب وہ بڑی بقراطیت کے ساتھ ان تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جو میں نے اس جلد میں شامل کرنے کے لئے البموں سے نکالی تھیں۔ "ذہن انسانی کا ارتقاء برابر جاری ہے۔" ڈاکٹر موسیٰ ناک پر عینک جما کر بولے۔ "اگر ارسطو یا شیخ سعدی ٹیلی فون یا ٹیلی ویژن یا ہوائی جہاز ہی دیکھ لیں تو ان کی گھگھی بندھ جائے۔"

"کیا شیخ سعدی یا شیکسپیئر آج کے کسی ٹیکنوکریٹ کے مقابلے میں غبی تھے؟" میں نے بحث کی۔

"تم کو معلوم ہے کمپیوٹر کس طرح کام کرتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ نہ یہ کہ آدمی چاند پر کس طرح پہنچ گیا۔" میں نے جواب دیا۔

"درست یہ سائنس کا زمانہ ہے۔" ڈاکٹر ماؤز برگ نے بچوں کی تصاویر فرش پر پھیلائیں۔ "راحیل۔ روشنک۔ جونو۔ یونیورسٹیاں ان کے ریکارڈوں سے پر۔ لڑکیاں آجکل عجیب و غریب مضامین پڑھ رہی ہیں۔" اور اس نے پاکستانی اخباروں کی سرخیاں دہرائیں۔ "نورالعین، شہناز، ناہید، جلال حیدر، تین بہنیں اور ایک بھائی جنہوں نے سی۔ ایس۔ پی کے مقابلوں میں کامیاب ہو کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔" "اور یہ سارے اسپیس ایج کے بچے۔" کوسمونوٹ موشوف نے کہا۔ "منصور، عدنان، سجاد اور ان کی ساری نسل، ماضی کے HANG_UPS سے آزاد۔" اب وہ جدید امریکن اصطلاحات استعمال کر رہا تھا۔

"کیا یہ اسپیس ایج والے بچے جذبات سے عاری ہونگے؟ یا اس سے اگلی پیڑھی۔؟"

"جذبات اور نظریات اور رویوں کے گراف زمانے کے ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔" ڈاکٹر ماؤزبرگ نے جواب دیا۔ "GENES ایک ہوں مگر دماغ ماحول بناتا ہے۔ مثال کے طور پر-----" پروفیسر موشوف نے کہا۔ پردادی شریف النساء بیگم اور دشکا حیدر رسید۔ شریف النساء بیگم کو شائد اردو لکھنا بھی نہیں سکھایا گیا تھا۔ دشکا بیگم نے لندن اسکول اف اکونمکس سے IN INDIA THE 1930,S. THE COMMUNIST INTERNATIONAL پر پچاس ہزار الفاظ کا مقالہ لکھ کر ڈی فل حاصل کیا۔ (اور یہ دوسری بات ہے کہ پچاس ہزار الفاظ۔ کیونزم ان انڈیا۔ الفاظ۔ الفاظ۔ الفاظ۔) اور آپ کی بھتیجی ناہید حیدر سی۔ ایس۔ پی ٹیکس ایڈمنسٹریشن ٹریننگ سنٹر یونیورسٹی اف سدرن کیلی فورنیا۔ لاس اینجلز، یا مسز

ہما حیدر حسن، کتھک رقص کی استاد۔ یا صبیحہ زیدی ہارورڈ سے بایو کیمسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ یہ سب نوجوان خواتین شریف النساء بیگم کی نگڑ پوتیاں وہ شریف النساء جو نہٹور سے سکندر پور کے راستے میں شیر خوار بچہ پردے دار بہلی سے پھسل کر گر گیا تو چپکی بیٹھی رہیں کہ آواز کی بے پردگی نہ ہو۔ اگر شریف النساء بیگم یا سعید بانو بیگم آپ کو یا اچھو، نور افشاں یا ان نئی پود کی لڑکیوں کو دیکھ لیں تو ان کی بھی گھگھی بندھ جائے۔ اور وہ صرف سو برس قبل موجود تھیں۔ سو برس میں دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ تو خیال فرمایئے۔ کہ اب جس تیز رفتار سے ترقی جاری ہے۔ اگلے سو برس بعد کے حالات اگر آپ یا اچھو یا نور افشاں دیکھ پاویں تو آپ تینوں کی گھگھی بندھ جائے۔ اگر آپ ۲۰۷۸ء میں موجود ہوں۔ گو آپ اور آپکی کزن لوگوں کی طرح آپ کی اس نئی پیڑھی کی لڑکیوں کا بھی فلرٹیشن کا خانہ خالی ہے۔ شاید سو برس بعد بھی آپ کے ہاں کی لڑکیوں کا یہی عالم ہو۔

"بہرحال اس سے قطع نظر۔ اب ادب کو لیجئے۔ جو افسانے آپ کی بھتیجیوں نورالعین اور شہناز نے اپنے لڑکپن میں ساقی میں لکھے۔ ان کا مقابلہ۔ مثلاً۔ تفسیر بحرالحقائق سے کیجئے جو آپ کے کسی جدامجد نے قرون وسطیٰ میں رقم کی تھی یا شہناز حیدر کا یہ افسانہ۔" حضرت موش بجنوری نے ایک پرانا رسالہ اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں 29

رات کی تیرگی میں لرزاں ایک آواز ایسی گونجی جو دراصل بالکل بے آواز تھی۔

صبح ہوگی۔ دوپہر ہوگی۔

زندگی دوبھر

ہوگی

دوبھر ہوگی

زندگی

سمندر اور زمین پر لپٹی تاریکی جمائی لے کر اچانک اٹھ بیٹھی۔ اور راستے کی جانب تکنے لگی۔ جدھر ایک بوڑھا جس کی سرخی مائل بوڑھی داڑھی نیچے آکر پتلی ہو گئی تھی اور اس کے سر کی معمولی جنبش سے زور زور سے ہلتی تھی، وہ اور ایک لڑکا، دونوں ایک بڑے شہر کی سمت جا رہے تھے۔

"شاید طوفان بھی آئے۔ پرند ابھی سے جاگ اٹھے۔" بوڑھے نے متلاطم سمندر کی طرف دیکھ کر اظہار خیال کیا۔ جس پر سفید براق پرندے نیم تاریکی میں تیزی سے چمک جاتے تھے۔

"ابھی اور کتنا سفر باقی ہے۔" نوجوان نے جز بز ہو کر پوچھا۔

"اتنا ہی جتنا میری داڑھی نے میری جوانی سے لے کر آج تک طے کیا ہے۔" بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا۔ نوجوان خاموش ہو گیا

"وہ خناس بڈھا مر گیا؟" نوجوان نے چلتے چلتے ایکا ایکی پوچھا۔

"ہاں۔" اس کے معمر ساتھی نے بدستور سر جھکائے ہوئے کہا۔

پھر وہ دونوں کافی دیر تک خاموشی سے چلتے رہے۔ اور پل کی اونچائی پر آکر لوہے کے جنگلے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ نیچے وسیع نشیب میں ریل کی پڑیاں دھندلکے میں لہرا رہی تھیں اور کبھی کبھی آسمان کے سفید پرندوں کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔

صبح آہستہ آہستہ نمودار ہوئی۔ خواب آلود زمین کے چاروں طرف سیاہ ہالے پڑے ہوئے تھے۔

بوڑھے نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔ "زندگی ایک طویل کہانی ہے۔ جسے میں مختصر بیان کردوں۔ اب سمجھنا تمہارا کام ہے۔"

نوجوان بوڑھے کے اور قریب سرک آیا۔ نزدیک سوئے ہوئے دو آدمی انگڑائیاں لے کر اٹھ بیٹھے۔ یہ بھی اور سب کی طرح لامکان سے آئے تھے۔ چنانچہ ان کی مروّت دھرتی کے اس ٹکڑے کے لئے تھی جس نے انھیں کائنات کی رات میں پناہ دی تھی۔

بوڑھے نے اس رات مجھ سے کہا۔ "تم لڑکی لے لو۔ مگر مجھے باہر جانے کے لئے روپیہ چاہئے۔" سرخ داڑھی والے نے بہت آہستہ سے جنگلے پر جھکے زیتون کے سخت پتوں کو ہلتے دیکھ کر کہا' جن کے چاروں طرف اب ٹڈے پھدکتے پھر رہے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔

صبح تیز ہوتی گئی۔ سورج صاف ہو کر جگمگا اٹھا۔ تینوں آدمی خاموش بیٹھے سرخ داڑھی والے کے الفاظ کے تانے بانے میں الجھے اس سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

"لڑکی خوش ہو گئی ہو گی۔" نوجوان نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر کوئی ایسی خاص نہیں۔ میرے پاس تھا روپیہ۔ اس کے باپ نے کچھ زیادہ رقم تو نہ مانگی تھی۔" وہ پھر ذرا دیر رک گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے لق و دق سنہرے مکان کے اوپر سے ہوا اب زیتون کے پتوں کو چھوتی ہوئی ٹکرا ٹکرا کر گذر رہی تھی۔ مکان کے اندر لوگ چلنے پھرنے لگے۔ نیچے شاید ریل گاڑی کے آنے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔

"تم کو پسند تھی وہ۔" نوجوان نے جنگلے کے تاروں سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اچھی خاصی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں تیار نہ ہوں تو وہ میری اور اپنی خوشی کے لئے خود روپے دے دیگی۔ مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ سختی سے۔ اس رات وہ بہت روئی بھی۔" ایک جھٹکے سے بوڑھا خاموش ہو گیا۔ نشیب کا کہرہ تیز نیلی فضا میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہو رہا تھا۔

"میں نے کہا میں تم کو خرید نہیں رہا۔" بوڑھا جلدی سے بولا۔ نوجوان نے سرہلایا۔

"بڈھا میری بات مان گیا۔ مگر مجھے تاؤ آچکا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ کیوں۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے۔ میری آن رہی نا؟"

"اگر تم آن کو خوشی پر قربان کر دیتے تو کیا برا تھا؟"

"ہاں۔ میرا دل خوشی کے تقاضے کر رہا تھا۔ مگر میرے دماغ میں خناس بھرا تھا۔"

"مگر بابا انسان مسرت کے ایک لمحے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔" نوجوان مستعد ہو کر بولا۔

بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

"اب وہ آگئی ہے شاید۔" نوجوان نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" بوڑھا بولا۔

سامنے پل پر سے بگھی میں ایک جوڑا گزر گیا۔ کھڑکی میں منہ دیے ایک ضعیفہ بیٹھی تھی جس کے چہرے پر کچھ خوشگواری اور کچھ ناگواری کے آثار تھے۔ پیشانی پر شکنیں پڑی تھیں۔ ہونٹ سختی سے بھینچے تھے۔ اور رخساروں پر اس کے جھریاں اس طرح پڑی تھیں جیسے بڑھیا سفید ریشم کو بیدردی سے خراب کر دیا گیا ہو۔ اس کے سفید اور سیاہ بالوں کی پھوار اڑ اڑ کر اس کے نتھنوں پر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں بے رنگ اور دھندلی تھیں۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا کی ہر حسین اور جوان لڑکی کا انت تھی۔

بوڑھے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اور اس چمک کے ساتھ ہی فوراً اس کی آنکھیں بے آب ہو گئیں۔ وہ جلدی سے بولا۔ "چٹان پر سے سمندر کی موج ایک پل میں گذر جاتی ہے۔"

نوجوان اسے تکتا رہا۔

"اب میں نے تمہارے ہر سوال کا جواب دے دیا۔" بوڑھے نے کہا اور اٹھنے کے لئے لکڑی سنبھالی۔

دوسرے دونوں آدمی چپ چاپ بیٹھے بوڑھے کی بے تکی باتیں سننے کے بعد جھنجلا کر جاتی ہوئی بگھی کو بے پروائی سے دیکھنے لگے اور انگڑائی لے کر پھر سو گئے۔"

حضرت موش بجنوری نے رسالہ رکھ کر پان کی گلوری نوش کی اور سگریٹ سلگایا' میں نے کہا۔

"لیکن حضت۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ بحرالحقائق اپنی جگہ پر موجود ہے؟ یہیں پر میرا اور آپ کا بنیادی اختلاف۔"

"ان بچیوں نے افسانہ نگاری کیوں نہ جاری رکھی؟" حضرت موش بجنوری نے میری بات کاٹی۔

"وہ لوگ اپنے دادا یلدرم کی طرح عدالت' کچہری اور سرکاری ملازمت کے فائیلوں میں کھو گئیں۔ لیکن میری بات کا جواب عنایت ہو۔ بحرالحقائق تبدیل ہو چکا ہے؟"

"بے شک۔ وہ وقت یاد کرو جب شہر کول میں شیخ عبد اللہ اور سجاد حیدر اور ان کے نو عمر ساتھی ایک زنانہ مڈل اسکول قائم کرنے کے تگ و دو میں مصروف تھے۔ وہی شہر کول ہے اور سجاد حیدرؔ کے بھائی نصیرالدین حیدر کی نواسی ہما حیدر این سی سی میں قواعد پریڈ کرنے کے بعد کھٹک سیکھتی ہے۔ اور لڑکوں کے مقابلے میں بیت بازی کی ٹرافیاں جیتتی ہے۔ جبکہ اس کی والدہ اور خالاؤں نے مجبوراً سیاہ برقعے کا یونیفارم پہن کر اسی یونیورسٹی میں پڑھا تھا۔ دوسری نواسی رعنا آپ کے نقش قدم پر چل کر موڈرن مصوری کرتی ہے

اور انگریزی میں جدید شاعری۔"

"جدیدیت کی تحریکیں مغربی آرٹ اور ادب میں سو سال سے زائد سے رائج ہیں اور رعنا اور زیبا کی والدائیں آپا عذرا اور اچھو علیگڑھ کے بعد مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھی پڑھ چکی ہیں۔"

"ہاں۔ لیکن بزنس ایڈمنسٹریشن نہیں۔ جو زیبا مک گل میں پڑھ رہی ہے۔ مضامین بدل گئے ہیں۔ پارے کا بیٹا نصف یوروپین' پیانسٹ سکندر حیدر مونٹریال میں الیکٹرونک ستار بھی پسند کر سکتا ہے۔ فرنٹیرز آف نالج وسیع تر ہوتے جارہے ہیں۔ اور یہ ساری نئی "پیڑھی عنقریب اکیسویں صدی میں پہنچنے والی ہے۔ دنیا کو باقی رہنا چاہئے۔" ساتھی موش نے کہا۔ امن کی فاختہ اس کے کندھے پر آبیٹھی۔

ایک رنگین تصویر میں صبیحہ زیدی عرف رانی ایسٹ اینڈ ویسٹ یونیورسٹی کے کیمپس میں کھڑی تھی۔ "ہونولولو ۱۹۶۶ء۔" برادر موش نے سیٹی بجائی۔ "یہ بچی نور افشاں کی چھوٹی بہن بستہ اٹھا کر نادرہ مرزا کے ساتھ روز صبح ماری پور کے سینٹ پیٹرکس اسکول جایا کرتی تھی۔ اور نادرہ نے فرانس کی گرینوبل یونیورسٹی سے تقابلی لسانیات میں ڈگری۔ سید مصطفےٰ عالم۔ کپتان مرچنٹ نیوی۔ مونٹری۔" سیور موشیولی نے دوبارہ سیٹی بجائی۔ "میں چوہا ہوں۔ مگر ہاتھی کا حافظہ رکھتا ہوں۔ یہ صاحبزادے اب کہاں ہیں۔؟"

"اپنا جہاز لئے مغربی کرے کے سمندروں پر گھوم رہے ہیں۔"

"رات کو یہ ڈنڈا لے کر مجھے اور میرے خاندان کو پیانو سے نکالا کرتے تھے۔

SHIP,S CAPTAIN!-–-AYE-AYE–-SIR. اس نے بحری سیلوٹ جھاڑا۔

عجب مسخرہ چوہا تھا۔ اب وہ بحری سلام کے لیے پھر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ "کمانڈر خورشید زیدی! ڈیفنس اتاشی' پاکستان ایمبیسی کولمبو۔ یہ بچہ ماری کی خلیج میں ربر کی ڈونگیاں تیراتا تھا۔ اور کرنل حاتم زیدی' اسٹیشن کمانڈر' پشاور چھاؤنی۔ اور کرنل اسلم زیدی۔ جو سقوط ڈھاکہ کے بعد دو سال ہندوستان میں جنگی قیدی رہا۔ افسوس۔ افسوس۔" موش نے تاسف سے سر ہلایا۔ "آہ۔ کیا المیہ ہے۔ قوموں کا المیہ۔ آہ۔" اب وہ اردو کی ادبی زبان بول رہا تھا۔ پھر اسے یاد آیا۔ "ارے اسلم۔ یہ آئس کریم کا شوقین بچہ ماری پوری میں سے آئس کریم کی بالٹیاں اٹھوا کر لاتا تھا۔ اور ہندوستان میں جنگی قیدی کرنل اسلم زیدی۔ ایک ہی بچہ ہے؟۔ بحر الحقائق۔ اور عمر عزیز سید عرف منی۔ کمپیوٹر سائنٹسٹ۔ نیویارک۔ اور عامر عزیز سید عرف مٹھن ایڈوکیٹ لاہور ہائی کورٹ۔ چنگاجی۔ ای فیر تو اوڈی جنریشن دی گل کرانگے۔ ایمہ منڈا۔ ڈاکٹر صلاح الدین حیدر عرف پارے مک گل یونیورسٹی مونٹریال شعبہ کمپیوٹر ٹیکنولوجی کا پہلا غیر سپید چیئرمین اور موجد اردو عربی فارسی اسکرپٹ جنریٹنگ سسٹم۔ موصوف بزبان فرنسیسی اپنے مضامین پڑھاتے ہیں اور سوربون پیرس کے وزٹنگ پروفیسر۔

برائے فوری اشاعت۔

اوٹاوہ۔ ۲۶ فروری ۱۹۷۲ء

بیشتر مغربی زبانوں میں حروف کی شکلیں الفاظ میں شامل ہو کر بھی برقرار رہتی ہیں۔ اردو فارسی

عربی میں اوسطاً ایک حرف کی چار شکلیں بنتی ہیں۔ مک گل یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایس۔ ایس حیدر کا الیکٹرونک اسکرپٹ جنریٹنگ سسٹم ہر لفظ میں حرف کی پوزیشن پہچان کر مطلوبہ شکل بتا دیتا ہے۔ یہ چھوٹا سا سیاہ ڈبہ ٹائپ رائیٹر۔ ٹیلیکس' کمپوزنگ وغیرہ کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس نے اردو رسم الخط کی خوبصورتی کو برقرار رکھا ہے۔ یہ مشین ٹیلی کمیونی کیشن اور کمپیوٹرز IN PUT OUT PUT کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جو نیوز نیٹ ورک پھیلنے والا ہے اس کے سلسلے میں اس کے متعلق گفت و شنید کی جاری ہے۔"

برادر موش نے عینک اتار کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور از سر نو البم کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیپٹن علی نواب فارن برا فیسٹول۔ انگلستان۔ اب جنرل علی نواب! بون ژور مون ژنرال۔"

"مون فریر موسیو موشے نے سینڈ ہرسٹ کے بجائے ST.CYR کے انداز میں کہا۔ "آپا نفیسہ کے ہاں فینسی ڈریس۔ یکم جنوری ۱۹۵۱ء محمود احمد زیدی' اب فل پروفیسر اکنومکس یونیورسٹی اف منی سوٹا۔ اقتصادیات پر متعدد کتابوں کے مصنف۔ آسٹریلیا اور یوروپ کی یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر جولی گڈ۔" برادر موش نے لمبا سا سانس لیکر بالآخر البم بند کیا۔ اور یوں گویا ہوئے۔ "تم سے اگلی پیڑھی اسپیس ایج کی ہے تم لوگ نیو کلیر دور میں پروان چڑھے۔ ہیروشیما تمہارے لڑکپن کا واقعہ ہے اور تم لوگ ۴۷ء کا HOLOCAUST بھی جھیل گئے اور ہائیڈروجن بم کے سائے میں زندہ رہے۔ اور تم لوگوں نے تاریخ کے چیلنج کو قبول کیا۔ اور تم لوگ برے نہیں گئے۔" اب وہ پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی معلوم ہو رہا تھا۔ "دراصل تمہارے بعد والی اس نئی پود کو تو ہندوستان و پاکستان بنے بنائے مل گئے۔ کیا تم کو وہ وقت یاد نہیں جب [illegible]ء میں کمسن نور افشاں نے ماری پور میں ایئر فورس ہسپتال کا فیملی ونگ تن تنہا سیٹ اپ کیا تھا۔ عاصم فلیٹ ۱۶/۳ آفیسرز ریذیڈنس ماری پور میں ایرونوٹیکل انجینئرنگ کی ضخیم کتاب خود بیٹھ کر پڑھتے تھے کہ پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ ایک نوزائیدہ بے سروساماں ملک کا اولین زمانہ۔ آج نور افشاں کراچی میں اپنا ذاتی نرسنگ ہوم اور ہسپتال۔ عاصم برسوں سے لندن میں پی۔ آئی۔ اے کے شعبہ انجینئرنگ کے انچارج' مڈل سیکس کے ان کے مکان میں مہمانوں کی اتنی ریل پیل رہتی ہے۔ کہ میزبانوں کو خود معلوم نہیں ہوتا کون آیا' کون گیا۔ اور عاصم اسی طرح نغمہ سرا۔"

"MELODY SUBSISTS" میں نے کہا۔

"اور۔" ساتھی موش نے بات جاری رکھی۔ "اور نظریاتی جدوجہد کے اس شروع کے دور میں ایوب احمد کرمانی کی بیباک صحافت۔"

"۱۹۵۶ء میں ایوب بھائی کی ٹریجک موت[30] پر فیض صاحب نے لکھا تھا۔

جمے گی کیسے بساط یاراں۔ کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں۔"

"جمے گی کیسے بساط یاراں۔" موش نے دہرایا۔ "کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں۔ سجے گی کیسے شب نگاراں۔ کہ دل سرشار بجھ گئے ہیں۔ وہ تیرگی ہے۔"

"وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں۔ چراغ رہ ہے نہ شمع وعدہ۔"

"کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بجھ گئے ہیں۔ بہار اب کیا کرے گی آکے کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں۔ وہ دل تہ دام بجھ گئے ہیں۔"

اچانک میں نے گرج کر کہا۔ "بول کہ سچ زندہ ہے اب تک۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کزن نوشابہ عرف نشو اور اس کے شوہر اقبال برنی ایڈیٹر آؤٹ لک کی بہادری کا قصہ ایوب خانی مارشل لاء کے دور میں۔؟ نہ ہو نومید۔"

"اور نشو اب خود اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی۔ کلین کاپی۔ ویری کلین کاپی۔" جرنلسٹ والٹر ہاؤس مین نے پنسل کان کے پیچھے واپس رکھی اور چند منٹ کمرے کے پیچھے ہاتھ باندھ کر ادھر ادھر ٹہلے اور پھر فرمایا۔

"جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا' تمہاری جنریشن بہت اچھی گئی۔ اب اپنے احباب کو لو۔ یونس ایم۔ سعید اپنا انگریزی پریس چلاتا ہے۔ اور جلال الدین احمد قاہرہ میں پریس کونسلر۔ انور قریشی روسی معاملات کا ایکسپرٹ' اور ماکی قریشی نامور انگریزی شاعرہ۔ مسرت جہاں تیموری برکی ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی کی افسر اعلیٰ اور جاوید اقبال اب مسٹر جسٹس اقبال جج لاہور ہائیکورٹ۔ ضیاء محی الدین ٹیلی ویژن پر "ضیاء محی الدین شو" میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مرزا جمیل الدین عالی نیشنل بنک آف پاکستان کے ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادبی مورخ' اور اعجاز بٹالوی اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ' اور بھٹو کے سزائے موت کے مقدمہ کا پبلک پروسیکیوٹر اور آفتاب احمد جید اکونومسٹ اور تجمل حسین اور میجر ابن الحسن اور ببلی فاروقی بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ اور جمیلہ ہاشمی اور خدیجہ' ہاجرہ اور نثار عزیز بٹ عمدہ ناولوں کی مصنفہ۔

"شہاب جو ہر دور میں صدر مملکت کے سکریٹری' جنرل یحییٰ خاں کو ان کے معقول مشورے پسند نہ آئے۔ شہاب صاحب کسی طرح پاکستان سے نکل کر پیرس پہنچے وہاں سے۔ اب مرنجان مرنج قدرت اللہ شہاب اچانک ایک پر اسرار مہم جو کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ کسی تدبیر سے موصوف اسرائیل پہنچے ہیں۔ وہاں کسی تدبیر سے عربوں کی زبوں حالی کا فلم کھینچتے ہیں۔ واپس پہنچ کر وہ فلم یونیسکو والوں کو دکھاتے ہیں جس کی بناء پر پی۔ ایل۔ او کے وفد کو پہلی بار مغرب میں حمایت حاصل ہوتی ہے۔ یاسر عرفات کے کہنے پر شہاب صاحب کو پاکستان واپس آنے کی اجازت ملتی ہے۔ اب موصوف اسلام آباد میں اپنی سوانح حیات شہاب نامہ لکھنے میں مصروف۔

"اور کمانڈر عسکری (ابن سعید) پیرس میں پریس کونسلر۔"

"میں نے ایک خط انڈین جرنلسٹ دلیپ مکرجی کے ہاتھ تم کو بھیجا تھا۔ ایک ۷۲ء میں نیویارک سے۔ سنگاپور میں ایک کانفرنس کے لئے آیا ہوں۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ میں اب بہت کم لکھتا ہوں۔ سوائے مورننگ نیوز کے ہفتہ وار کالم کے۔ تمہاری کتابوں کے جعلی ایڈیشن یہاں دھڑا دھڑ بک رہے ہیں۔ آجکل کراچی کی لٹریری کریز فہمیدہ ریاض ہیں جن سے شاید تم انگلستان میں ملی ہو گی۔ جمیل الدین عالی قومی ترانے لکھ رہے ہیں۔ ندیم قاسمی لاہور کے انٹلکچوئیلز کے DOYEN بن گئے ہیں۔ (فیض بہت پر وماسکو

اور بہت کاہل ہیں) نفیس آرتھر' رانی اور ان کے بچے بخیریت ہیں۔ لاہور میں اچھو اور چچی جان سے میری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ سنگاپور اس شہر سے اتنا مختلف ہو گیا ہے جہاں میں پہلی بار ایک نوجوان آر۔ پی۔ آر۔ او کی حیثیت سے آیا تھا اور کہانیوں کا پلندہ ساتھ لایا[31] تھا۔

"لاہور

عزیزہ۔ تمہارا لکھا یہاں پہنچ رہا ہے۔ ہمارا لکھا وہاں نہیں پہنچ رہا۔ یہ تحریر[32] جو مقام عبرت ہے بطور خاص تمہیں بھجوا رہا ہوں۔ پڑھو اور عبرت پکڑو۔ من نہ کردم شما حذر بکنید۔

تمہیں خط لکھنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن خط کم از کم سو دو سو صفحے کا ہونا چاہئے اس سے کم میں کیا بات ہو گی۔

عزیزی قرۃ العین حیدر۔ تم جہاں کہیں بھی ہو واپس آ جاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

"کار جہاں دراز ہے" نقوش میں قسط وار پڑھتا ہوں۔ یہ قصہ اگر تم نہ لکھتیں تو بورنگ ہو جاتا۔

مگر گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند۔

ہم تمہارے خط کے منتظر ہیں اور تمہارے تو ہیں ہی۔

اعجاز"

"کراچی۔ ۶ جنوری ۷۷ء۔

ببلی فاروقی کافی عرصے بیروت میں رہا۔ اب بھی اسلام اس کا خاص موضوع ہے[33] تمہاری کتابیں یہاں فنٹاسٹک قیمتوں پر بکتی ہیں۔ آگ کا دریا کی قیمت ساٹھ روپے ہے۔ مجھے یقین ہے تم کو رائلٹی کا ایک پیسہ نہ ملتا ہو گا۔ ناصر نجمی ابھی ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی میں ہیں۔ قیوم صاحب اور سکندرہ لندن میں۔ مس ٹی (اب مسز برکی) ڈی۔ اے۔ ایف۔ پی کی ڈائریکٹر ہیں۔ مایا جمیل اور جمیل بھائی۔"

ماکی قریشی کا طویل خط برادر ہوش نے ہاتھ سے رکھ دیا اور ذرا اداسی سے بولے "یہ تو آجکل کی خبریں ہیں۔ لیکن وہ لوگ کہاں گئے۔ جو پاکستان نیا نیا بنا تھا اور میو چول ہاؤس کراچی کے فلیٹ نمبر ۹ میں صندوقوں پر آکر بیٹھا کرتے تھے[34]۔

شاہد احمد دہلوی اور رازق الخیری اور سید حمید علی اور شائستہ اکرام اللہ جو اماں سے ملنے۔ وہ کراچی۔ اور آج کا کراچی۔ ایک مختلف دنیا ہے۔

ڈاکٹر شائستہ سہروردی اکرام اللہ سے میں ۴۸ء کے بعد سے آج تک نہیں ملی۔ اس دوران میں انہوں نے پاکستان کا ایک پورا دور دیکھ لیا جس طرح اس سے قبل ایمپائر کا آخری دور دیکھا تھا۔ اگر وہ اپنے MEMOIRS لکھیں اور اپنے سہروردی خاندان کی داستان تو کس قدر فیسی نیٹنگ ہو۔ اپنے کنبے کی چند بزرگ بیبیوں' اخجستہ اختر سہروردی' لیڈی عبداللہ' المامون سہروردی' بیگم شیر بنگال فضل الحق' وغیرہ کے متعلق انہوں نے ایک کتابچہ لکھا تھا۔ جو مجھے چند سال ہوئے آسٹریلیا سے بھجوایا تھا۔ انڈین سول سروس کے اکرام اللہ صاحب برطانوی دور میں انڈیا ہاؤس لندن میں تعینات تھے۔ مئی ۳۷ء میں شائستہ آپا نے شاہ

جارج ششم کے جشن تاجپوشی میں شرکت کی تھی۔ اور اس میں ہندوستان کے نمائندے چودھری سر ظفر اللہ خان تھے۔ اور لاہور میں افضل خالو نمبر ۱۸ اوارث روڈ پر اماں سے کہتے تھے "ظفر اللہ خاں لندن گئے ہوئے ہیں۔" (اسے تلازمہ خیال کہتے ہیں) اور ۱۹۴۰ء میں شائستہ اکرام اللہ نے لندن اسکول اف اورینٹل اسٹڈیز سے اردو میں ڈاکٹریٹ کیا۔ دوران جنگ میں اکرام اللہ صاحب نئی دہلی میں تھے۔ ۴۷ء کے بعد کراچی میں فارن سیکرٹری اور پھر باہر ہائی کمشنر اور سفیر۔ اور شائستہ آپا اقوام متحدہ میں پاکستان کی مندوب اور مراقش میں سفیر اور ان کی لڑکی ثروت کی شادی جورڈن کے ولی عہد شہزاد حسن سے ہوئی تو اس کی خوشی میں اہل کراچی نے شہر کا چراغاں کیا۔ اور حال میں جب ثروت اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان کے دورے پر آئی تھی تو کسی اخبار نے یہ نہ لکھا کہ وہ چیف جسٹس ہدایت اللہ کی بھتیجی اور کلکتے کے سہروردی خاندان کی نواسی ہے۔ اور اکرام اللہ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور کراچی میں شائستہ آپا تنہا ہیں۔ ایک پورا' دور تمیں سال۔

کاشانہ۔ کلفٹن کراچی ۱۲ اپریل ۷۸ء

میری پیاری عینی۔ دعا جب سے تم یہاں سے گئی ہو تمہیں کتنی ہی دفعہ خط لکھنا چاہا لیکن نہ لکھ سکی۔ جب تمہاری ممی گزری ہیں اس وقت بہت دل چاہا لیکن ان دنوں خط و کتابت بند تھی۔ میں تو یہ لکھنا چاہتی تھی کہ تم سے مجھے محبت ہے۔ مجھے تمہارے والدین سے بڑی عقیدت تھی۔ خیالستان میں نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں پڑھا تھا۔ اور پھر بار بار پڑھا "گلستان" میں اس لڑکی کے گھر کا نام کاشانہ تھا۔ میں نے ابا جان سے کہہ کر اپنے گھر کا نام کاشانہ رکھوایا۔ وہ گھر لاکھوں کروڑوں گھروں کی طرح چھوٹ گیا۔ جس کی یاد میں کراچی کے گھر کا نام بھی کاشانہ رکھا تھا۔

تم چلی گئیں۔ ہم نے تمہاری قدر نہیں کی۔ تمہارے جانے سے ہم ایک بیش قیمت چیز سے محروم ہو گئے۔ میں اکثر رازق الخیری صاحب سے تمہاری خیریت پوچھتی رہتی ہوں۔ بے چارے بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ میں اکثر ہندوستان آنے کا ارادہ کرتی ہوں لیکن مسلسل پریشانیاں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ تینوں لڑکیاں باہر ہیں۔ میرا لڑکا مریض ہے۔ پرانے نوکر نہیں رہے۔ نہ کوئی رشتے دار کہ ان پر چھوڑ کر آؤں۔ لیکن پھر بھی اگلے جاڑوں کے شروع میں آنے کا ارادہ ہے۔ کلکتہ اور ناگپور میرا میکہ اور سسرال ہیں۔ بمبئی میں میرے دو دیور احمد اللہ اور سابق چیف جسٹس ہدایت اللہ ہیں۔ احمد کی بیوی پارسن اور میری بہت دوست ہیں۔ کافی دلچسپ ہیں۔ دل چاہتا ہے ان کو تم سے ملواؤں۔
نشاط رحمٰن کے ذریعہ یہ خط بھجوا رہی ہوں۔

فقط تمہاری

(تلخیص) شائستہ آپا

"اور مہر جبیں اور منہاج جو برسوں سے دی آنا میں ہیں اور صحافی احمد حسن پنڈی اور۔" برادر موش کی آواز اچانک اونچی ہو گئی۔ "زندگی کا جلوس لامتناہی ہے۔ راستے میں موڑ آتے ہیں سرنگیں درے' وادیاں' کوہسار جلوس کے کچھ ٹکڑے دفعتاً نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ راہ طے کرتے کرتے پھر سامنے آ جاتے ہیں۔ کنٹربری کے پلگرم جو سرائے میں جمع اپنی اپنی کہانیاں سنا رہے ہیں۔ سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "جب اماں کا انتقال ہوا کسی شہزادہ محمد ضیاء الملک ریاست چترال کا خط عصمت میں چھپا تھا۔ کہ "محترمہ نذر سجاد حیدر کی محبت تو چترال کے پہاڑوں میں بھی تھی۔" تو انسان کہاں کہاں بکھرا ہوا ہے۔ اپنی تحریروں میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے حافظے میں خود دور دراز کے خطوں کی یادوں میں۔"

"ہاں برادر موش نے جواب دیا۔ وہ صفوی ایران یا مغلیہ ہند یا ترکیہ یا جارجیا کے مصور' جو ان گنت خاکے بناتے تھے باغوں' بارہ دریوں' جنگلوں' صحراؤں' شکار گاہوں میں کھڑے اور بیٹھے لوگ آپس میں باتیں کرتے۔ یا روم یا جورڈن کے اموی صحرائی محلات یا بازنطیم کے فرنیسکو' یا قدیم مصر کے' یا اجنتا کے' یا مقامات حریری کے مرقعے یا یوروپ کے مصوروں کی تصاویر ان کے مرد عورتیں بوڑھے جوان بچے وہ سب اور ان کی سوسائٹی اور محفلیں اور کنبے ان سب کے موڈل سچ مچ کے انسان تھے اور وہ لوگ سب ان تصاویر میں موجود ہیں۔ ایک ایک لحظہ۔ منظر۔ ایٹی ٹیوڈ۔ الفاظ جملے۔ مکالمے۔ دن دن سے بات کرتا ہے اور رات رات کو حکمت سکھاتی ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ ان چیزوں کا انجام کہاں ہے۔"

موش نے ایک گہری سانس لی اور پھر گویا ہوا اور GENES کا سفر جاری رہے گا۔ ابو اور ماکی کی پندرہ سالہ بچی ۹ سال کی عمر سے لکھ رہی ہے۔ اور ڈھائی سو صفحے کی کتاب لکھ چکی ہے۔ ای نڈا زابلا تھوبرن کالج میں کارمن میرانڈا کا لباس پہنکر اسی طرح گا کر تہلکہ مچاتی تھی۔ اس کا لڑکا کراچی سے جا کر لندن میں کامیاب پوپ سنگر بن گیا۔ یہ فہرست بہت طویل ہے۔

"اب ہم ان معاملات پر ایک بالکل دوسرے زاویے سے روشنی ڈالیں گے۔" ڈاکٹر موشکی نے پہلو بدل کر بات شروع رکھی۔ "ہم نے تمہارے عزیزوں اور دوستوں اور ان کی اولاد کے کارناموں کا تذکرہ کیا۔ شاید تم کو علم ہو کہ ہم امریکن ماہرین نے انسانوں کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ ACHIEVER اور NON_ACHIEVER اور مورل اس ساری اسٹوری کا یہ تھا کہ انسان کو ایک مضمون میں دل لگانا چاہیئے نہ کہ ہرفن مولا۔ کسی ایک چیز پر پتہ نہ مارا گیا۔ آپ کی یہ کمزوری مشتاق احمد زاہدی مرحوم نے بہت پہلے پہچان لی تھی۔ اور مزید برآں وہ جو آپ کے بہنوئی جری احمد سید کہا کرتے تھے کہ بس ایک آنچ کی کسر۔"

"واہ۔ کتابیں جو لکھ لیں اتنی ساری۔" میں نے برا مان کر کہا۔

"خیر وہ کتابیں جیسی لکھیں سو لکھیں۔" ہوا پور یونیورسٹی کے پروفیسر اور ہوائی یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر جدید نقاد ڈاکٹر موش الزماں قاطعی نے جواب دیا۔ "ہم یہ موضوع تبدیل کریں؟"

"نہیں۔ فرمایئے۔"

"انسان کے یا کوئی اکیڈیمک کارنامے ہوں یا وہ سماجی طور پر UPWARDLY MOBILE

ہو۔"

"افسوس کہ اپ ورڈلی موبائیل ہونے کا میرا مزاج نہیں۔" میں نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔
"اگر انسان حد سے زیادہ DISORGANISED ہو اور کاہل اور TACT اور AMBITION کا فقدان۔"

"یہ چار عناصر ہوں تو۔" میں نے بشاشت کے ساتھ بات کاٹی۔
"تو کار جہاں دراز۔" وہ جھنجلا کر گرجا۔
"مسٹر وو ڈی ایلن۔ اب میں آپ کو ایک فیوچر شوک دوں؟" میں نے اخلاق سے دریافت کیا۔
"ابھی میں خود مستقبل سے نکل کر آیا ہوں۔ میں وقت ہوں جو زندگی کا کاغذ کترتا رہتا ہے۔" اس نے ڈراؤنی آواز میں کہا اور ایک پرانا نامکمل مسودہ دراز سے نکالا۔ "یہ کیا ہے۔ فینٹیسی۔ سائنس فکشن۔؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

"نہیں۔ دراصل۔ ہوا یہ کہ ۱۹۶۰ء میں ڈی۔ اے۔ الیف۔ پی میں اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے میں نے تفریحاً ایک مضمون "اردو ادب کے پچھلے چالیس سال" لکھا تھا جو گویا ۱۹۹۹ء میں قلمبند کیا گیا تھا۔ ایک صبح کمانڈر عسکری (ابن سعید)، جمیل الدین عالی اور تجمل حسین دفتر میں آگئے۔ انہوں نے وہ مضمون پڑھا اور بہت محظوظ ہوئے۔ پھر وہ مضمون پڑا رہا اسے چھپوانے کی نوبت نہیں آئی۔ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ بہت سے صفحات کھو گئے۔ کلچر ٹرانسفر اس کا موضوع تھا۔"
"ہوں۔" پروفیسر موش نے ناک پر عینک جما کر پڑھنا شروع کیا۔

۱۹۹۹ء

۱۹۸۴ء بھی آ کر گذر گیا۔ میں اس وقت جنوبی بحرالکاہل کے اسٹرو اسٹیشن نمبر ۱۶ پر اپنے روکٹ کا خضر آئس لینڈ کی ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا طعامی کیپسول کھا رہا ہوں۔ ساری دنیا میں "عالمی تہذیب کے پچھلے سو سال" اور اکیسویں صدی کی استقبالیہ تقاریب کی وجہ سے زیادہ چہل پہل ہے۔ اس اسپیس اسٹیشن پر بھی ریسرچ اسکالرز کی آمدورفت جاری ہے۔ جو مختلف دانش گاہوں کی طرف جا رہے ہیں۔ کیپسول نگل چکنے کے بعد سگرڈ ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگتی ہے۔ میں غور سے دیکھتا ہوں وہ رسم الخط اردو ہے۔ سگرڈ "اردو ادب کے پچھلے چالیس سال" پر کام کرنے آؤٹر منگولیا جا رہی ہے۔ جب میں بہت چھوٹا تھا ایک شام اپنے فلاڈلفیا کے مینٹ ہاؤس میں پوپ کو ایک گوشے میں آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ ایک اجنبی اسکرپٹ میں لکھے چند خطوط پڑھتے جاتے تھے اور رو رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "تمہاری دادی کے خط ہیں جو میرے نام نہٹور سے آیا کرتے تھے۔ تم ان خطوں کو نہ پڑھ سکو گے۔ بیٹا وقت اور تاریخ کا ایک ستم یہ بھی ہے کہ انسان ایک دوسرے کے لئے گونگے ہو جاتے ہیں۔"

پوپ بحیثیت ایک نو عمر طالب علم ۱۹۴۸ء میں نہٹور سے امریکہ آگئے تھے۔ (نہٹور شمالی ہند کا ایک

گرد آلود فیکٹری ٹاؤن ہے جو نصف صدی قبل سرسبز و شاداب چھوٹا سا خوبصورت قصبہ تھا)
سگرڈ اور میں غالباً اس مذبچری دور کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ عہد ہمارے بزرگوں کے لئے بہت صبر آزما رہا ہوگا جو نیو کلیئرزم کے سائے میں زندہ تھے۔ خصوصاً مغربی ادب کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ کیا روحانی دہشت اس وقت طاری تھی۔ لیکن وہ دور بھی تقریباً پچیس سال بعد ختم ہو گیا۔ برطانیہ کے "برہم نوجوان" آخر میں پکے ٹوری بن چکے تھے۔ جدید طرز تعمیر کے مکان آخر آخر میں ایسے بننے لگے تھے جن میں دیواریں نہیں ہوتی تھیں۔ موڈرن تھیٹر میں اخیر زمانے میں اسٹیج بالکل خالی رہتی تھی۔ ہال بھی خالی رہتا تھا۔ موڈرن ناول اور شاعری کی کتابوں میں سرورق پر صرف کتاب اور مصنف کا نام اندر سب صفحات سادہ یا جیومیٹری کی چند شکلیں۔ جدید اسکلپچر میں پرانے جوتے موزے اور ٹوتھ برش وغیرہ اتنے استعمال کئے گئے کہ کباڑی کی دوکانیں آرٹ اسٹوڈیو نظر آنے لگیں۔

فنکاروں کو جب تصویریں اور مجسّمے بنانے سے اس طرح چھٹی ملی تو انہوں نے داڑھیاں منڈائیں۔ چارخانہ جیکٹ اور کورڈرائے کی پتلونیں ترک کیں۔ خواتین فنکاروں نے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ اور آرٹسٹ لوگ ہرن کی کھالیں اوڑھ کر جنگلوں کی طرف نکل گئے۔ ان کے قافلے ایک زمانے میں اینڈیز اور ہمالیہ اور الپس کی غاروں میں اترتے نظر آتے تھے۔ سنا ہے کہ ایک آدھ آرٹسٹ اب بھی آسٹریلیا کی طرف زندہ ہے۔ آسٹریلیا کے اصل باشندوں اور نیوزی لینڈ کی ماوری گورنمنٹ نے جب سے سفید اقوام کو اپنے وطن سے نکالا ہے وہ خالص "براؤن آسٹریلیا" پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ اس سفید فام آرٹسٹ کو بھی دن کے وقت سڈنی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ وہ پرمٹ لے کر ہفتے میں ایک بار تمباکو خریدنے شہر میں آتا ہے اور سورج ڈھلنے سے پہلے اپنے غار میں واپس چلا جاتا ہے۔

جب میں نے اپنے پوپ کی مادری زبان پڑھنا شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دنیا کی سب سے بد قسمت زبان تھی کہ بہت جھگڑے فساد اس کے متعلق ہوئے۔ ایک وقت تھا کہ دلی[35] والے لکھنؤ[36] والوں سے اور لکھنؤ والے لاہور والوں سے روٹھے رہتے تھے۔ پھر اہل پنجاب نے مطلع کیا کہ دراصل اردو پنجابی ہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ زبانوں کے یہ قضیے برصغیر میں اس طرح ختم ہوئے کہ نئی نسل امریکن بولنے لگی تھی۔ یا کالج کی لڑکیاں اردو اس طرح بولتی تھیں۔ "میں نے آج پنک لپ اسٹک پہنا ہے۔ میں پیانو کھیل رہی تھی جب میں نے کہا کہ میں نے اپنا دماغ تبدیل کر دیا ہے تو اس کا چہرہ گر گیا۔"

آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ امریکن کو ایک زمانے میں "انگریزی" کہا جاتا تھا۔ انگلستان میں جہاں اب صرف امریکن ہی بولی جاتی ہے (سوا اوکسفرڈ اور کیمبرج کے کونوں کھدروں میں زندہ چند دقیانوسی بڈھوں کے جو زبان اور محاورے کا رونا روتے رہتے ہیں) یہ زبان آج سے چند سال قبل تک انگریزی کہلائی حتیٰ کہ برٹش پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ شاہ چارلس سوئم نے اس کا نام بدل کر "امریکن" کر دیا۔ زبان کے لئے روایت کا تسلسل ضروری ہے۔ جہاں تسلسل نہیں ہے تمدن نہیں ہوگا۔
میں اور سگرڈ اس وقت خلائی راکٹ اسٹیشن کے ریستوراں میں کافی پی رہے ہیں۔ ریستوراں کے عظیم

بلوریں گولے کے باہر خلاء میں چاروں طرف جانے والے اسپیس شپ زن زن کرتے گذرتے جاتے ہیں۔ سگرڈ چپکی بیٹھی نزدیک چاند کو دیکھ رہی ہے۔ اس کا خیال ہے چاند اور ستاروں کی معیت میں اس کے ساتھ بیٹھ کر مجھے رومینٹک ہو جانا چاہیئے ۱۹۹۹ء آگیا۔ مگر عورت کی ذہنیت نہیں بدلی۔

"سگرڈ۔" میں نے کہا۔ "میرے لئے کافی بناؤ۔ اور سنو" اے عشق اجی آؤ مہاراجوں کے راجہ۔ ڈنڈوت ہے تم کو۔

"انشا اللہ خاں؟" سگرڈ نے پوچھا۔ اسکالر لڑکی ہے۔ پھر اس نے کہا۔ "مگر کیا عجیب و غریب ہیچری تھی اردو شاعری کی۔ سنو۔

بہار آخر ہوئی ہے قدر کی تربت پہ میلہ ہے
یہاں بیڑی بڑھانے کو ہر ایک دیوانہ آتا ہے

"تم نے اس صدی کے اردو شاعر پڑھے؟"

"ہاں۔ پرانے اور نئے دونوں۔" اس نے بیگ سے فہرست نکالی۔ "سنو

MR. LIVER OF MORADABAD.

MR. HERAT OF SHAHJEHANPUR.

MR. SEPERATION OF GORAKHPUR.

اور ایک پاکستان نوجوان شاعر

MR.BELOVED AUTUMN.

میں چپکا ہو رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہر اردو ادیب خود کو بیحد حساس اور کولن ولسن والا آؤٹ سائیڈر سمجھنے لگا تھا۔ اور خواتین اردو افسانے کے میدان میں پیش پیش تھیں۔ اس دور کی لڑکیاں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ میری ایک عمر رسیدہ پھوپی بتاتی ہیں کہ ان کی ساتھی لڑکیاں ریڈیو سیلون پر ہیمنت کمار کے گانے سن سن کر رومینٹک ہوا کرتی تھیں یا اس قسم کے تخیلی رومان رقم کرتی تھیں کہ ایک ہینڈسم فوجی یا آرٹسٹ سامنے والی کوٹھی میں وائلن بجاتا تھا۔ اور اس سے المناک یا طربناک عشق ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی خیالی لو لائیف ان لوگوں کی تھی۔

ایک اور قسم قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی تھی۔ جو پہلے کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ روایت ہے کہ ضیاء محی الدین نامی اس عہد کے نامی اداکار نے ان کو للکارا کہ تم عام فہم افسانے لکھ ہی نہیں سکتیں۔ انہوں نے اپنا پہلا سیدھا سادا افسانہ "پت جھڑ کی آواز" زیب قرطاس کیا۔ حال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ ان کی ایک سہیلی جمیلہ ہاشمی بفضل خدا ہنوز بقید حیات ہیں اور اپنی خانقاہ کو سرسٹہ سے کوہ الپس پر ٹرانسفر کر چکی ہیں۔ سرسٹہ کی وجہ تسمیہ یہ نہیں تھی کہ وہاں لوگ ہائے موسم گرما میں بیٹھ کر سٹہ کھیلتے تھے بلکہ وہاں ایک درگاہ تھی جس کے سجادہ نشین سے ۱۹۶۰ء میں جمیلہ بی بی نے بیاہ کیا تھا۔ چنانچہ میں اطالوی الپس کے

ایک گاؤں پہنچا اور ایک اسلامی درگاہ کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ جمیلہ ہاشمی کی ضعیف العمر سکریٹری باہر آئیں۔ اونچا سنتی تھیں۔ میں نے کہا۔ "جمیلہ بی بی سے شرف ملاقات حاصل ہو سکتا ہے؟"

"اعتکاف میں ہیں۔"

"اچھا تو آپ ہی قرۃ العین حیدر کے متعلق کچھ بتا سکتی ہیں؟"

"کون؟"

"قرۃ العین حیدر۔"

"قطب الدین ایبک؟" انہوں نے کان پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔ میں مایوس ہو کر اپنے روکٹ کی طرف واپس گیا۔

اردو فکشن میں (اگر میں قرۃ العین حیدر کی زبان استعمال کروں) بیشتر کردار وشی واشی تھے۔ ایشیا کا ادیب' عموماً جیسی معمولی' کم ہمت محدود' مجبور' زندگیاں گذارتا تھا اسی کی جھلک اس کے ادب میں نظر آتی تھی۔ آرٹ' ادب' تھیٹر ہر جگہ اور بجنلٹی بہت ہی کم۔ اہل مشرق ژاں پال سارتر' پکاسو۔ انگمار برگماں' بیکٹ' کاکتو' آرتھر لر' فرانسواساگاں' اور کولن ولسن پر سر دھنتے تھے اور......

مون فریر موش نے اپنی سیاہ فرنچ بیرے اتار کر اپنی سیاہ چوٹی بوتائی پر ہاتھ پھیرا اور مسودہ کترنے میں مصروف ہو گئے۔ گویا سمپلزم کی زبان میں سمجھایا کہ ہر تحریر کا انجام یہ ہے۔

مجھے اس ڈیکیڈنٹ ویسٹرن یوروپین کی یاس پرستی پر بہت غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ "یہ مضمون میں نے اٹھارہ سال قبل لکھا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ اس دوران میں نہٹور اور لانگڑی اور محمود پور کی نئی پود آدھی سے زیادہ مغرب میں سیٹل ہو چکی ہے۔"

تم لوگ بھی فٹ لوز ہو چکے تھے۔ پارے میاں کینیڈین ہیں۔ محمود زیدی امریکن۔ رمی آسٹریلین۔ تقی میاں برطانوی۔ قومیتیں بدل گئیں۔"

"ہاں اور اب شاجہاں اور حسن احمد ماموں کی لڑکیاں سویڈن میں ہیں۔ ذرا سوچو۔ قلعہ محمود پور سے اسٹاک ہوم۔ اور ظہور ماموں کے لڑکے فرانس کے شہری۔ بہت طویل فہرست ہے۔ اور ان کی طرح ہزاروں نوجوان انڈیا اور پاکستان کے مغرب اور شرق اوسط۔"

"فٹ لوز یا بلند حوصلہ۔؟" چوہا اچک کر ایک بک شیلف میں رکھے تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت" پر جا بیٹھا۔ اور بولا۔ "قرآن شریف میں آیا ہے کہ خوب سیاحت کرو۔ اسی حکم پر عمل کر کے میڈیول عرب ساری دنیا میں پھیل گئے۔"

"یا اخی یا شیخ الموش۔" میں نے جواب دیا۔ اس برصغیر میں لاکھوں کروڑوں باہمت نوجوانوں کو یہ مواقع میسر نہیں۔ مت بھولو توارش موشوف کہ ہم لوگ اتنی دیر سے محض ایک PRIVILEGED طبقے کے افراد کی مختلف پیڑھیوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔"

"توراش اپنا حیدر دا۔ اس معاملے کے لئے تم کو مزید ریسرچ کرنا ہوگی۔" چوہے نے کہا اور ایک

خیال کی طرح جیسے اچانک نمودار ہوا تھا اسی طرح چھلانگ لگا کر غائب۔

میں دشت [37] لوط کے کنارے کھڑا ہوں۔ کس طرف جاؤں۔ موت کہیں بھی۔ کسی راستے سے آسکتی ہے۔ چمکیلے خنجر کا وار۔ زہر کا بلوریں پیالہ۔ زنداں کے دروازے پر جلاد کی دستک۔ اڑتے ہوئے طیارے میں ہائی جیکر کا بم۔ شہری گوریلا کا حملہ۔ فضائی آلودگی سے پیدا شدہ مہلک امراض۔ سیاسی' مذہبی' لسانی فساد۔ جنگ۔ نیوکلیر دھماکہ۔

ممکن ہے زندہ بھی رہ جائیں۔ فرات سے جیحوں اور جیحوں سے جمنا' اور جمنا سے گاگن تک کا راستہ کچھ کم دشوار گذار تھا؟

اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اور دشت لوط کے کنارے تیل کی پائپ لائن جاری ہے۔
رب المشرقین و رب المغربین کی دنیا بڑی حیران کن ہے۔ کون کون کدھر نکل گیا' کیسی کیسی اجنبی اقوام کے درمیان جابسے۔ ایک وقت تھا کہ ہم آل میر حسن ترمذی قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں خاموشی سے رہتے تھے۔

سامنے دیوار پر دانیال نبیؑ کو نظر آنے والے پر اسرار حروف کی مانند عیسوی اور ہجری کیلنڈر آویزاں ہے اس پر ایک چٹان اور پھلوں کی تصویر کے اوپر لکھا ہے۔ "اور تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

آج اس جلد دوم کا آخری صفحہ لکھنے کی تاریخ ۲۱۔ اگست ۱۹۷۸ء مطابق ۱۶۔ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ۔ فقط سوا سال بعد ۱۹۸۰ء ہوگا۔ اور پانچ سال بعد جارج اورویل کا 1984۔
۱۱۸۰ء میں میر کمال الدین ترمذی" نے اپنے شہر ترمذ کو خیرباد کہہ کر اپنا سفر شروع کیا تھا۔

۶۔ دریانورد مغنی کا گیت

دوستو۔ جلد اول میں ۳۰۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی داستان تاجیک نژاد افسانہ خواں نے میڈیول مورخ' صوفی تذکرہ نگار' درباری وقایع نویس' فیوڈل داستان گو' وکٹورین ناولسٹ' سیاسی کالم نویس' اور اردو افسانہ نگار کے روپ میں آ آکر آپ کو سنائی۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۸ء تک کا قصہ اپنا اور پاکستانی رشتے داروں اور دوستوں کا جلد دوم میں رقم کیا گیا۔ جلد سوم میں ۱۹۶۲ء سے تادم تحریر' داستان کشور ہند' یہاں کے اعزا اور احباب کی اوپر والے اسٹیج ڈائرکٹر نے اگر چاہا تو پیش کی جاوے گی۔

جب کراچی میں امریکن کال گرل اینی اوکلے کے متعلق ANNIE GET YOUR GUN نامی میوزیکل آیا تھا۔ ناچیز کو اسی طرح مخاطب کیا جانے لگا تھا۔ توگوناں گوں ایڈونچرز کے اختتام پر وائیلڈ ویسٹ کی روایت کے مطابق کاؤگرل گھوڑے پر سوار 'گٹار بجاتی ٹیکنی کلر شفق میں چلی جاتی ہے۔
یا خچر پر بیٹھی کنٹربری کی ست گام پلگرم۔ یا میر محمد تقی کی سرائے نہٹور کا بھاٹ داستان سرا۔
یا شہر ترمذ سے باہر جیحوں پر فکر کی کشتی نازک رواں اور دریا بہ دریا' یم بہ یم گھومنے والا تاجیک قصہ خواں عود اٹھا کر۔

حوالہ جات

1. چارلس ڈکنز کے ایک ناول کا نام۔ دیکھئے جلد اول فصل دہم باب 9 "اولڈ کیوری سٹی شاپ اور پلکرمز پروگریس۔"
2. بیگم نذیر حسین، سروزیر حسن کی چھوٹی صاحبزادی۔
3. حسو باجی کے داماد چھوٹے مہاراج کمار محمود آباد۔
4. مہاراجہ سر علی محمد خان (تعلق دار محمود آباد) کی جونیئر رانی صاحبہ اور حسو باجی کی سمدھن کا مکان۔
5. ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ "کلیسا میں قتل" (مترجم ق۔ ح۔ مطبوعہ نیا دور کراچی 1960ء)
6. سلمان احمد علی۔
7. اوری کی دلہن۔ لڈو پھوپھی کی لڑکی حال مقیم کینیڈا۔
8. نواب سید عاشق حسین خاں (محمود پور) کی بیگم۔ نوابزادہ معشوق علی خان کی شادی نواب فرخ حیدر کی پھوپھی نواب سلطنت آراء بیگم سے ہوئی تھی۔
9. نواب سلطنت آراء بیگم۔
10. میں نے "کار جہاں دراز ہے" (جلد اول) کی تیاری شروع کر دی تھی اور امتیاز بھائی سے افضل خالو مرحوم کے متعلق معلومات منگوائی تھیں۔
11. حجاب امتیاز علی۔
12. میں نے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں چغتائی صاحب کی چند تصاویر کو ری پروڈیوس کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ افسوس کہ میری چغتائی صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔
13. چغتائی مرحوم میرے لئے عمل چغتائی (مصور کلام اقبال) رکھ گئے تھے جو ان کے صاحبزادے نے کچھ عرصہ قبل علی سردار جعفری کے ہاتھ مجھے بھجوایا۔
14. دیکھئے جلد اول فصل نہم۔ باب 5 "جرس غنچہ کی صدا" صفحہ 355۔
15. جب کار جہاں دراز ہے۔ (جلد اول) آج کل میں بالاقساط چھپنا شروع ہوا۔
16. میں نے "اردو کی آخری کتاب" کا جو انشاء نے کراچی سے بھجوائی تھی تلخیص و ترجمہ کر کے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں شائع کیا تھا۔
17. کمانڈر عسکری (ابن سعید)
18. ہنری وان ڈائیک کی ایک نظم۔
19. قول علیؑ "خدا کی قسم دنیا میرے نزدیک بکری کی چھینک سے بھی کم وقعت ہے۔" دیکھئے جلد اول

فصل پنجم باب 10۔ "فلائنگ آفریدی۔"

20. جلد اول فصل نہم باب 2 "سوہنی"
21. جلد اول فصل نہم باب 2 "سوہنی"
22. پروفیسر اولیگ گریبر (ہارورڈ یونیورسٹی) "شہر اور شہری۔" دی ورلڈ آف اسلام۔ "مرتبہ ڈاکٹر برنارڈ لوئیس۔
23. بغداد اسکول 1237ء یعنی یہ تصاویر ہلاکو خاں کے حملے سے صرف اکیس سال قبل بنائی گئی تھیں۔
24. جلد اول فصل اول باب 12 "نصیحت کا کرن پھول۔"
25. دیکھئے جلد اول۔ فصل دہم باب 4 صفحہ 407۔
26. جلد اول۔ فصل اول باب 4 "وقائع عالمگیری۔"
27. دیکھئے جلد اول۔ فصل اول باب 9 "باغی سپاہی۔"
28. جلد دوم فصل چہاردہم۔ باب 8 "چیمبر میوزک۔"
29. از شہناز حیدر مطبوعہ گفتگو بمبئی 1968ء
30. دیکھئے فصل چہاردہم باب 3 "شاہ جور سالو۔" ایوب احمد کرمانی مرحوم کا یہ مرثیہ دست تہ سنگ میں شامل ہے۔
31. کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید) تلخیص و ترجمہ از انگریزی۔
32. "پاکستان کے معاشرے پر مارشل لاء کے اثرات۔" از اعجاز حسین بٹالوی۔ ایک مقالہ جو قائداعظم سیمینار میں زیر صدارت صادق حسین قریشی گورنر پنجاب 4 جنوری 1975 کو لاہور میں پڑھا گیا۔
33. دیکھئے فصل دوازدہم باب 7۔ "درویشان غوغائی۔"
34. جلد دوم فصل دوازدہم "کارٹ ریڈ وڈ رنگ۔"
35. جمہوریہ ہند کا پایہ تخت اور ایک عظیم الشان پنجابی شہر۔
36. سندھیوں کا مشہور شہر جو اودھ میں دریائے گومتی کے کنارے آباد ہے۔
37. ملاحظہ کیجئے جلد اول۔ فصل اول باب اول۔ "فرات وجیہوں۔"

قرۃ العین حیدر کی معرکتہ الآرا تصانیف

چاندنی بیگم

قرۃ العین حیدر

گیان پیٹھ انعام یافتہ ادیبہ قرۃ العین حیدر کا نیا ناول ''چاندنی بیگم'' اُن کے بے مثال تخیل اور مشاہدے نیز اُن کے جادو نگار قلم کا نیا شاہکار ہے۔ وہ اُردو کی واحد فکشن نگار ہیں جن کے ناولوں میں رزمیے کا ٹھاٹ ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے گذشتہ ناولوں کی طرح ''چاندنی بیگم'' بھی بظاہر چند کرداروں سے وابستہ واقعات و مقدرات کی کہانی ہے۔ مگر یہ کہانی ہماری زندگی کا مفہوم متعین کرنے والی مختلف جانی اور انجانی حقیقتوں کی کہانی بھی ہے۔ ایک غیر معمولی تخلیقی طاقت کے ساتھ قرۃ العین حیدر نے ہمیں یہ کہانی سنائی ہے۔

صفحات: ۴۲۷ قیمت: ۲۵۰ روپے

گردشِ رنگِ چمن

قرۃ العین حیدر

گردشِ رنگِ چمن بھی قرۃ العین حیدر نے تفہیم و تعبیر کا جو زاویہ بنایا ہے پر پیچ ہے، بہت بلیغ اور تہہ دار، فوق التاریخ، اور ایک آفاق گیر تخلیقی تناظر تک، اس زاویے کی جہتیں کثیر ہیں۔ اس کا عکس زندگی کے ہر منظر پر پڑتا ہے۔ یہ ناول بھی محض دلی، لکھنؤ، کلکتہ اور جے پور یا چند کرداروں کی کہانی نہیں ہے۔ مناظر افراد اور ان کے جذباتی و سماجی سبق کی حیثیت یہاں خفیہ اشاروں کی ہے۔ کھل جا سم سم کے جادوئی کلمے کی طرح یہ اشارے پڑھنے والے کو سامنے کی جانی پہچانی دُنیا سے آگے بھی لے جاتے ہیں اور اسے اسرار بھری اس کائنات کا رنگ روپ دکھاتے ہیں۔ جو مسلسل اور مستقل ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اردو فکشن کو ایک نئے معیار اور اعتبار کے ایک ایسے نئے نقش سے مزین کیا ہے جسے اُردو فکشن کی روایت کا سب سے روشن باب کہنا چاہئے۔

قیمت: ۳۵۰ روپے

آگ کا دریا

''گیان پیٹھ انعام یافتہ''

قرۃ العین حیدر

اُردو کے افسانوی ادب میں زندگی کے سرچشموں کے نئے رجحانات کا احساس دلانے والے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ'' کچھ کتابیں چھپتے ہی ایک زندہ کلاسیک اور کچھ لکھنے والے جیتے جی ایک لیجنڈ بن جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور'' آگ کا دریا'' اسی زُمرے میں شمار کئے گئے۔ یہ ایسے نیا شناس نامہ تھا ہماری دُنیا اور غیر مختتم تماشہ کا'' بعض نقادوں نے اس نئے شناس نامے کی ایسی تعبیریں کرڈالیں جو قرینِ قیاس ہوتے ہوئے مصنفہ کی نظر میں بے حقیقت ہے۔ اس تازہ ایڈیشن میں پہلی بار مصنفہ نے اس ناول کی علت نمائی پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے متعلق کچھ نئے عرضِ مصنف کی بہت ضرورت تھی۔

صفحات: ۶۴۳ قیمت: ۳۰۰ روپے

داماں باغباں

(مجموعہ خطوط)

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر اُردو ادب کی وہ کوہِ ہمالیہ ہیں جس کے وادیٔ سبز میں ہیئت، اسلوب، فکر، تاریخ، تہذیب کی کھیتی لہلہاتی ہے۔

''داماں باغباں'' قرۃ العین حیدر، سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر کے نام لکھے ہوئے مشاہیر کے خطوط کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ جس کی روشنی میں ہم عینی آپا کی ادبی اہمیت کا عمیق جائزہ لے سکتے ہیں۔

صفحات: ۶۸۴ قیمت: ۵۰۰ روپے

کوہِ دماوند

قرۃ العین حیدر

کوہِ دماوند قرۃ العین حیدر کے ان رپورتاژ کا مجموعہ ہے جو پاکستان میں الگ الگ نام سے شائع ہوئے ہیں۔ کافی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد اُن تمام رپورتاژ کو یکجا شکل میں پیش کرنے کی ہمت کی گئی ہے۔ ان رپورتاژوں میں جہاں قرۃ العین حیدر کے نادر اسلوب سے شناسائی ہوتی ہے وہیں رپورتاژ کے فن کی باریکیاں بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ اُردو ادب میں اپنے طرز کا پہلا رپورتاژ ہے جس کے ذریعے مختلف ممالک کی تہذیبی، سماجی، سیاسی و مذہبی سیر بھی کی جاسکتی ہے اور تاریخ کو واقعات کے آئینے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

'کوہِ دماوند': صفحات: ۳۴۴ قیمت: ۲۹۰ روپے

'ستمبر کا چاند'

(رپورتاژ)

صفحات: ۴۰۰ قیمت: ۳۲۵ روپے

کفِ گل فروش

(ایک صدی کی ادبی تصاویر)

مرتبہ : قرۃ العین حیدر

(زیرِ طبع)

قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

قرۃ العین حیدر کو اُردو فکشن کے معماروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ اُن کے افسانے و ناول صرف قصہ گوئی یا داستان طرازی نہیں اور نہ صرف وقت گزاری اور حظ انگیزی کا وسیلہ ہیں اُن کے ناولوں میں کئی جہان اپنی پوری تاب و توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں تخلیقیت کا عمل اس قدر توانا ہے کہ وہ جب جس طرح صورتِ حال چاہتی ہیں ایسی کامیابی کے ساتھ پیدا کردیتی ہیں کہ قاری ان محلوں، ان مکانوں اور اُن کرداروں کو تلاش کرنے لگتا ہے۔

وہ اُردو کی پہلی ناول نگار ہیں جو اپنے ناولوں کی صورتِ حال میں پہلے خود ایک زندگی گزار لیتی ہیں اس کے بعد اسے لفظوں میں ڈھالتی ہیں کردار و واقعہ کی جزیات پر ان کی نگاہ اتنی گہری اور گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جیسے ہر جگہ وہ خود سانس لے رہی ہوں اور ہر واقعے اور ہر کردار پر اُن کی عینی شہادت کی مہر ثبت ہوگی۔

صفحات: ۵۹۲ قیمت: ۳۵۰ روپے

کے وادیٔ سبز میں ہیئت، اسلوب، فکر، تاریخ، تہذیب کی کھیتی لہلہاتی ہے۔

''دامانِ باغباں'' قرۃ العین حیدر، سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر کے نام لکھے ہوئے مشاہیر کے خطوط کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ جس کی روشنی میں ہم عینی آپا کی ادبی اہمیت کا عمیق جائزہ لے سکتے ہیں۔

صفحات: ۶۸۴ قیمت: ۵۰۰ روپے

کوہِ دماوند

قرۃ العین حیدر

کوہِ دماوند قرۃ العین حیدر کے ان رپورتاژ کا مجموعہ ہے جو پاکستان میں الگ الگ نام سے شائع ہوئے ہیں۔ کافی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد اُن تمام رپورتاژ کو یکجا شکل میں پیش کرنے کی ہمت کی گئی ہے۔ ان رپورتاژوں میں جہاں قرۃ العین حیدر کے نادر اسلوب سے شناسائی ہوتی ہے وہیں رپورتاژ کے فن کی باریکیاں بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ اُردو ادب میں اپنے طرز کا پہلا رپورتاژ ہے جس کے ذریعے مختلف ممالک کی تہذیبی، سماجی، سیاسی و مذہبی سیر بھی کی جاسکتی ہے اور تاریخ کو واقعات کے آئینے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

'کوہِ دماوند': صفحات: ۳۴۴ قیمت: ۲۹۰ روپے

'ستمبر کا چاند'

(رپورتاژ)

صفحات: ۴۰۰ قیمت: ۳۲۵ روپے

کفِ گل فروش

(ایک صدی کی ادبی تصاویر)

مرتبہ : قرۃ العین حیدر

(زیرِ طبع)

قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

قرۃ العین حیدر کو اُردو فکشن کے معماروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ اُن کے افسانے و ناول صرف قصہ گوئی یا داستان طرازی نہیں اور نہ صرف وقت گزاری اور حظ انگیزی کا وسیلہ ہیں اُن کے ناولوں میں کئی جہان اپنی پوری تاب و توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں تخلیقیت کا عمل اس قدر توانا ہے کہ وہ جب جس طرح صورتِ حال چاہتی ہیں ایسی کامیابی کے ساتھ پیدا کردیتی ہیں کہ قاری ان محلوں، ان مکانوں اور اُن کرداروں کو تلاش کرنے لگتا ہے۔

وہ اُردو کی پہلی ناول نگار ہیں جو اپنے ناولوں کی صورتِ حال میں پہلے خود ایک زندگی گزار لیتی ہیں اس کے بعد اسے لفظوں میں ڈھالتی ہیں کردار و واقعہ کی جزیات پر ان کی نگاہ اتنی گہری اور گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جیسے ہر جگہ وہ خود سانس لے رہی ہوں اور ہر واقعے اور ہر کردار پر اُن کی عینی شہادت کی مہر ثبت ہوگی۔

صفحات: ۵۹۲ قیمت: ۳۵۰ روپے

جلد اوّل

جلد دوم

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LALKUAN, DELHI-6 (INDIA)